

دروں کے سچا

خان آصف



مگر دریا برات

پروردگارِ بحر و بر
اے مالکِ جن و بشر
تالِعِ ترے شمس و قمر
ہر شے ترے زیرِ اثر

پروردگارِ بحر و بر
پروردگارِ بحر و بر

معبود تُو ہی بالیقین
تیرے سوا کوئی نہیں
کیا آسماں اور کیا زمیں
ختم ہے جہاں سب کی جبین

بس ایک تیرا آستان
بس ایک تیرا سنگِ در
پروردگارِ بحر و بر
پروردگارِ بحر و بر

وہ طائرانِ خوش نوا
وہ لہلہاتے سبزہ زار
وہ ذرّۂ ناچیز ہو
یا کوہساروں کی قطار
شیخ کرتے ہیں تری
سب بے حساب و بے شمار

غافل ہیں ہم انساں مگر
پروردگارِ بحر و بر

تُو واحد و برحق بھی ہے
تُو قادرِ مطلق بھی ہے
یا رب بحق مصطفیٰ
تُو بخش دے اپنی خطا
اس اُمتِ مظلوم کو
اس اُمتِ مرحوم کو

دے زندگی کر زندہ کر
پروردگارِ بحر و بر

ہیں وقت کے خواروں میں ہم
آفات کے غاروں میں ہم
لگتی ہیں اپنی بولیاں
رُسوا ہیں بازاروں میں ہم
بے شک سرفہرست ہیں
تیرے گنہگاروں میں ہم
پھر بھی ہے یہ قرآن میں
یعنی تیرے فرمان میں
لَا تَقْنُتُوا لَا تَقْنُتُوا
ستار تُو غفار تُو

پہچان ہے رحمت تری
ہے شان تیری درگزر
پروردگارِ بحر و بر

پھر سامنے فرعون ہے
خون رنگ ہے دریائے نیل
پھر آتشِ نمرود کی
زد میں ہے اولادِ خلیل

فتنہ گروں کی چال سے
واقف ہے تُو ربِ جلیل

پھر سے ابابیلوں کو بھیج
پھر آگ کو گلزار کر
پروردگارِ بحر و بر

اک حشر ہے چاروں طرف
دشمن کھڑے ہیں صف بہ صف
کیا بت پرستوں سے گلہ
اپنے بھی ہیں خنجر بکف
موسیٰ و عیسیٰ کے خدا
اسلام ہے سب کا ہدف
احساس دے، توفیق دے
پھر جذبہٴ صدیق دے
پھر سے کوئی خیبر شکن

پھر بھیج دے کوئی عمر
پروردگارِ بحر و بر
پروردگارِ بحر و بر

(خان آصف)

سلام

سلام اس پر جو آیا اور آنے کے لئے آیا
عرب کا نام تھا لیکن زمانے کے لئے آیا
سلام اس پر جفاکاروں سے جس نے منہ نہیں موڑا
سلام اس پر جو خود ٹوٹا، کسی کا دل نہیں توڑا
سلگتی ریگزاروں کو محبت کی ہوائیں دیں
کہ وہ رحمت لقب تھا، اس لئے سب کو دعائیں دیں

سلام اس پر جو غیروں کے لئے دامن بھگوتا تھا
سلام اس پر جو اُمت کے لئے راتوں کو روتا تھا
مسلمان تو مسلمان ہیں یہ دنیا کو یقین آیا
کہ ایسا محسنِ انسانیت کوئی نہیں آیا
غلاموں کی گواہی کیا کہ ختم الانبیاء کیا ہیں
خدا ہی جانتا ہے بس محمد مصطفیٰ کیا ہیں

مستطاب

خدا کا خاص اک احسان ہیں یہ اولیاء اللہ
زمانہ جسم ہے اور جان ہیں یہ اولیاء اللہ
کسی جابر، کسی ظالم کے آگے یہ نہیں جھکے
کہ ایسے صاحب ایمان ہیں یہ اولیاء اللہ
دعائیں سب کو دیتے ہیں، کسی سے کچھ نہیں لیتے
کہ اپنے وقت کے سلطان ہیں یہ اولیاء اللہ
یہ جس بستی سے اُٹھ جائیں، وہ بستی خاک ہو جائے
گناہ گاروں پہ اک احسان ہیں یہ اولیاء اللہ

فہرست

3	حضرت خواجہ حسن بصری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
58	حضرت بابزید بسطامی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
150	حضرت ابراہیم بن ادہم <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
175	حضرت صابر کلیری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
201	حضرت گیسو دراز <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
249	حضرت شیخ سلیم چشتی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
278	حضرت بابا بلھے شاہ <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
372	حضرت شیخ حسین لاہوری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
488	حضرت میراں حسین زنجانی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
525	حضرت سلیمان تونسوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
556	حضرت بری امام قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
600	حضرت شاہ دولہا گجراتی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
626	حضرت شاہ عبداللطیف بہشانی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
669	حضرت عبداللہ شاہ غازی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>

پیش لفظ

رسالت کا سلسلہ ختم ہوا..... مگر کارِ رسالت جاری ہے۔ اور حشر اٹھائے جانے تک جاری رہے گا۔ خیر و شر کی کشمکش کا سلسلہ اُسی دن سے شروع ہو گیا تھا، جب ابلیس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ رائدہ درگاہِ مہر ادا کیا تھا..... پھر ایسا ہی ہوا۔ اولادِ ابراہیمؑ پر حسی چلی گئی۔ کچھ صراطِ مستقیم پر چلی اور کچھ شیطان کے فریب میں آکر سیدھے راستے سے بھٹک گئی۔ اللہ ارحم الراحمین ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا منصف و عادل بھی ہے۔ اُس کی ذاتِ اقدس یہ کیسے گوارا کرتی کہ وہ اپنے بندوں کو ”شیطانِ الرجیم“ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔ اُس نے بھٹکی ہوئی انسانیت کے لیے انبیاء بھیجے۔ اللہ کے اِن منتخبِ انبیاء نے گمراہوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلایا، جنہوں نے اپنی سماعتیں کھلی رکھیں اور اپنے روحانی رہبروں کی آوازیں سنیں۔ انہیں اُن کی بھولی ہوئی منزل یاد آگئی اور وہ اپنے رب کی بے مثال رحمت کے سائے میں لوٹ آئے اور راہِ نجات پا گئے۔

اسلام کے آفاقی پیغام پہنچانے اور بے حس و مُردہ انسانیت کو زندگی بخشنے کا کارنامہ عظیمِ انبیاء علیہم السلام، خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ کے بعد اللہ کے دوستوں اور محبوبین نے انجام دیا۔ یہ وہ پوریائشیں لوگ تھے، جو دنیاوی زرو جواہر اپنی ٹھوکروں میں رکھتے تھے۔ دلوں کو فتح کرنے والے یہ وہ فاتحینِ زمانہ تھے، جنہوں نے انسانوں کے دلوں کو تلواریں سے نہیں، اپنے حُسنِ عمل سے جیتا۔

کفر و جہالت کے گھپ اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی مخلوق کو ایمان و یقین کی روشنی سے منور کرنے والے، بربادی و ذلت کے شہنجوں میں جکڑی ہوئی بے دست و پا انسانیت کو رہائی دینے والے، زنگ آلود دلوں کے قفل کو ضربِ لا الہ سے توڑنے والے، شیخِ ہدایت دکھانے والے، نفرت و تعصب کے زخموں سے پُور نسلِ آدمؑ کے مسیحا ہیں۔ یہ لوگ، روشنی کے سفیر ہیں یہ لوگ، رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور اللہ کے دوست ہیں۔

مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ نے اللہ کے ان ہی محبوبین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

آگِ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں

زندگیِ مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

میرے والد محترم، خان آصف کو ان ہی اولیاء اللہ کی غلامی کا شرف حاصل تھا۔ والد گرامی کے الفاظ من و عن پیش کر رہی ہوں۔

”میں اولیائے کرام پر پانچ ہزار سے زیادہ صفحاتِ تحریر کر چکا ہوں۔ شاید یہی میری زندگی کا آخری دور ہے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ میں نے ابھی کسی حاکمِ وقت کا قصیدہ نہیں لکھا۔ جن شخصیات پر لکھا، وہ سب کے سب اللہ کے محبوب تھے اور میرے مخدوم۔ دعا ہے کہ ان کا ذکر کرتے کرتے قصہ تمام ہو جائے۔

لکھنا ہی مقدر ہے بہرِ رنگ لکھیں گے

کانغہ نہ ملے گا تو سرِ سنگ لکھیں گے

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ والد محترم نے اللہ کے محبوبین کی خدمت کو ہی اپنا مقصدِ حیات بنالیا تھا۔ انہوں نے مسلمان اولیائے کرام کو ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرح طلسمی اور جادوئی کردار نہیں بنایا۔ بلکہ ان کی حیات مبارکہ اور خدماتِ عالیہ کے روشن اور حقیقی پہلو اُجاگر کئے۔

کچھ عرصہ پہلے القریش پبلی کیشنز کے مالک محمد علی صاحب کافون میرے پاس آیا۔ اُن کے بے حد اصرار پر میں نے والد صاحب کے اولیائے کرام پر وہ تمام مضامین جمع کئے جو ”اللہ کے سفیر“ اور ”اللہ کے ولی“ میں اشاعت سے رہ گئے تھے۔

پھر اللہ کی بے پناہ کرم نوازی اور محمد علی صاحب کی محبتوں اور عنایتوں کے سبب یہ کارہائے عظیم پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اور آج اولیاء اللہ کی بارگاہِ اقدس میں میرے والد کا ایک اور نذرانہ عقیدت ”دلوں کے مسیحا“ کے نام سے پیشِ خدمت ہے۔

یہ جس بستی سے اٹھ جائیں، وہ بستی خاک ہو جائے
گناہ گاروں پہ اک احسان ہیں یہ اولیاء اللہ

(اسماء خان آصف)

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

آج ہم تاریخ اسلام کے ایک نہایت خوں رنگ باب سے اپنے مضمون کا آغاز کر رہے ہیں، جس میں اہل ایمان کے لیے زلا دینے والے مناظر بھی ہیں..... عبرت آمیز واقعات بھی..... اور شدید مایوسی کے عالم میں دلوں کو تقویت بخشنے والی مثالیں بھی۔

یہ 65ھ کا زمانہ ہے، جب اموی خاندان کا ایک فرد عبدالملک بن مروان، خلافت کے عظیم منصب پر فائز ہوا اور فوراً مدینہ منورہ پہنچا۔ پھر اُس نے سرکارِ دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس منبر پر کھڑے ہو کر اس طرح عامۃ المسلمین کو مخاطب کیا۔

”لوگو! میری بات بہت غور سے سنو..... خدا کی قسم! میں کمزور خلیفہ نہیں ہوں (عبدالملک بن مروان کا یہ ارشاد خلیفہ سوم امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف تھا) اور نہ میں خاطر مدارات کرنے والا سخن ساز خلیفہ ہوں (عبدالملک بن مروان کا یہ اشارہ اپنے محترم دادا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف تھا، جو ذہانت و فراست اور تدبیر کے حوالے سے تاریخ اسلام میں ممتاز ترین مقام رکھتے ہیں)

یہ دونوں حوالے دینے کے بعد اموی خلیفہ نے نہایت سخت لہجے میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ ہم حکمرانوں سے تو فرمائش کرتے ہو، لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ خدا کی قسم! اگر آج کے بعد کسی نے مجھ سے زہد و تقویٰ کی فرمائش کی تو اس کے کاندھوں پر سر باقی نہیں رہے گا۔“

اسلامی دنیا کے مشہور عالم حضرت علامہ ابوبکرؒ نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کی اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ ”یہی پہلا منحوس دن اور مسلمانوں کا پہلا بادشاہ تھا، جس نے عام مسلمانوں کی زبانیں کاٹ دیں۔“

اسی عبدالملک بن مروان نے برسرِ عام ظلم کی سرپرستی کی اور حجاج بن یوسف جیسے سنگدل انسان کو اسلامی معاشرے پر مسلط کیا، جس کا تعلق ”قبیلہ بن ثقیف“ سے تھا۔ حجاج بظاہر عراق کا عامل (گورنر) تھا، لیکن اس کے ظلم و تشدد سے مملکت اسلامیہ کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں تھا۔ اُس کی شمشیر ستم، بے نیام ہوئی تو لاکھوں اہل ایمان اپنے خون میں نہا گئے۔ قتل تو بہر حال قتل ہے۔ وہ ایک عام مسلمان کا قتل ہو یا کسی مردِ کامل کا..... اللہ کے یہاں دونوں قابلِ گرفت ہیں۔ تاہم جب کسی صاحبِ کردار پر تیغ جھانپنی جاتی ہے تو یہ خونیں منظر دیکھنے والے زیادہ حساس اور جذباتی ہو جاتے ہیں۔ بہت ممکن تھا کہ بعد از مرگ حجاج بن یوسف کی رسوائیوں میں کمی واقع ہو جاتی اگر اُس کے نامہ اعمال میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کا قتل درج نہ ہوتا۔ خلیفہ اول حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

کے حقیقی نواسے..... اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھانجے، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا کے فرزند کا قتل اتنی آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اگر حجاج بیک وقت لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر ڈالتا اور صرف حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نرمی کا سلوک روا رکھتا تو آج اس کے نام سے نفرت کرنے والے اپنے جذبوں کے اظہار میں اس قدر شدت پسند نہ ہوتے۔

اس منظر کی ہولناکی کا اندازہ کون کر سکتا ہے، جب حجاج بن یوسف کی منجفیقوں نے حرم کعبہ پر سنگ باری کی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے عبدالملک بن مروان کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ نتیجتاً حجاج بن یوسف کی فوج آپ کے تعاقب میں تھی۔ اور آپ مجبوراً خانہ کعبہ کی حدود میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ دنیاوی جنگ کے نقطہ نظر سے اہل دنیا پتھروں کی اس بارش کو جائز قرار دے سکتے ہیں، مگر حجاج بالآخر مسلمان تھا، انتہائی ناگزیر حالات کے باوجود ایک کلمہ کو کی حیثیت سے سنگ باری کا فرمان جاری کرتے ہوئے اس کی زبان کو لڑکھڑانا چاہیے تھا اور اپنا ہاتھ بلند کرتے وقت اس کے جسم پر لرزش طاری ہو جانی چاہیے تھی۔ ایک مسلمان کے لئے رب کعبہ کا اتنا خوف تو لازمی ہے، ورنہ ایمان کے باطل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ حجاج بن یوسف نے اپنے اور حرم کعبہ کے درمیان کسی رشتے کو قائم نہیں رکھا۔ ایک عام شخص بھی جانتا ہے کہ مسلمانوں کے آداب جنگ بھی دنیا کی دوسری قوموں سے یکسر مختلف ہیں۔ کتنی بھی اذیت ناک اور جذباتی صورت حال ہو، مگر ایک مسلمان فاتح کا فروبوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ انتہا یہ ہے کہ مفتوحہ علاقے کے سبزہ زاروں کو بھی نذر آتش نہیں کر سکتا اور پھر خانہ کعبہ تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی مقدس ترین تعمیر تھی اور زمین پر اللہ کا پہلا گھر تھا۔ دنیا میں سب سے بڑی ادب گاہ کو منجفیقوں کا ہدف بنانے کے بعد وہ کون صاحب دل ہے جو حجاج بن یوسف کے اس اقدام کو بدترین شقاوت قلبی کی مثال قرار نہیں دے گا۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر ہم اس سنگ باری کی طرف سے چشم پوی بھی کر لیں تو تاریخ نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر غلبہ حاصل کرنے کے باوجود حجاج بن یوسف ایک شکست خوردہ انسان تھا۔ خانہ کعبہ کا محاصرہ تقریباً چھ ماہ جاری رہا۔ اس طویل عرصے میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے تمام ساتھی آپ کو چھوڑ کر حجاج بن یوسف کے اطاعت گزاروں میں شامل ہو گئے تھے۔ بعض روایات میں تو یہاں تک درج ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹوں نے بھی ہتھیار ڈال کر عامل عراق سے امان طلب کر لی تھی۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان اور حجاج بن یوسف یہ چاہتے تھے کہ رسالت مآب حضرت محمد ﷺ کی محبت کے سائے میں پرورش پانے والا جانا باز، ایک آمر وقت کی طرف سے بھیجی ہوئی سونے کی بیڑیاں پہن لیتا اور معافی نامہ داخل کرا کے عافیت کے سائبان میں داخل ہو جاتا۔ مگر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے تنہا رہ جانے کے باوجود طاقت و اقتدار کی ٹہنی کر دی۔ پھر جب میدان جنگ میں آپ کا روشن و تابناک چہرہ لبو لہبان ہو گیا تو حجاج بن یوسف کے سپاہیوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بارعب و پر جلال آواز سنی۔ آپ ایک عجیب لہجہ و آہنگ کے ساتھ یہ رجزیہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

”ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں، جو پشت پر زخم کھاتے ہیں اور ایڑیاں ان کے خون سے رنگین ہو جاتی ہیں۔ ہم وہ ہیں کہ ہمارا خون ہمارے بچوں پر گرتا ہے۔“

پھر ایسا ہوا، خون کی دھاریں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے چہرہ مبارک کو گل رنگ کرتی ہوئی سینے کی طرف بڑھیں اور آخر میں صحابی رسول ﷺ کے پائے استقامت کو رنگین کر گئیں۔

حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ کر خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دربار میں بھیج

دیا۔ بعض روایات کے مطابق حجاج نے کئی دن تک حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی لاش کو مکہ معظمہ کے سب سے بڑے چوراہے پر لٹکائے رکھا تا کہ اہل شہر کے دلوں پر اس کی ہیبت قائم ہو جائے۔ پھر بھی اس کے سفاک جذبوں کی تسکین نہیں ہوئی تو وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مادر گرامی حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کے پاس پہنچا اور انتہائی غضب ناک اور تحقیر آمیز لہجے میں ان محترم خاتون سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تیرے بیٹے نے میرا حکم نہیں مانا، میں نے اس کی دنیا خراب کر دی۔“

حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ پیرانہ سالی کے سبب بینائی سے محروم ہو چکی تھیں۔ حجاج بن یوسف کی آوازیں کر آپؓ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ پھر انتہائی استقامت اور جرأت کے ساتھ عامل عراق کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ”حجاج! میرے بیٹے کی سانسیں اتنی ہی تھیں، جو شمار کی جا چکیں۔ تو اپنی بد نصیبی پر ماتم کر کہ عبداللہ بن زبیر نے تیری عاقبت خراب کر دی۔ وہ عاقبت، جس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔“

اہل دنیا تو یہی کہیں گے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ حجاج بن یوسف نے جو کچھ کیا، وہ سیاست و منطق کی نگاہ میں درست تھا مگر اسی دور میں تاریخ کے صفحات پر ایک اور مرد بے باک کا چہرہ ابھرتا ہے۔ وہ خراسان کا عامل عبداللہ بن خازم تھا۔ خلیفہ بد الملک بن مروان نے اسے دولت و اقتدار کی پیشکش کرتے ہوئے ایک خط تحریر کیا تھا۔ ”ابن خازم! اگر تم میری اطاعت قبول کر لو تو میں ہمیشہ تم پر مہربان رہوں گا اور خراسان دس سال تک تمہاری جاگیر میں رہے گا۔“

عبداللہ بن خازم نے اس وقت تک صریحاً انکار نہیں کیا تھا۔ مگر وہ دل سے عبداللہ بن مروان کی بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ اسی دوران حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا سرتن سے جدا کر کے دربار خلافت میں بھیج دیا تھا۔ عبداللہ بن مروان نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے صحابی رسول ﷺ کا سراپن خازم کے پاس خراسان بھیج دیا یہ کیسا وحشیانہ کھیل تھا، جو اہل اقتدار ایک ایسے شخص کے ساتھ کھیل رہے تھے، جس سے اللہ راضی ہو چکا تھا۔

جیسے ہی ابن خازم نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا سر مبارک دیکھا، اُس پر وحشت سی طاری ہو گئی۔ پھر اس نے خلیفہ عبداللہ بن مروان کے قاصد سے چیخ کر کہا۔ ”حق تعالیٰ کی قسم! اب تو میں کسی بھی حال میں تمہارے خلیفہ کی اطاعت نہیں کروں گا۔ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ عبداللہ کا خط نکل جاؤ۔“

والی خراسان عبداللہ بن خازم کو شدید حالت غضب میں دیکھ کر عبداللہ بن مروان کا قاصد خوف زدہ ہو گیا اور اس نے دربار میں کھڑے کھڑے خلیفہ کا پورا خط نکل لیا۔ اپنے حکم کی تعمیل ہو جانے کے بعد عبداللہ بن خازم دوبارہ انتہائی قہر ناک لہجے میں قاصد سے مخاطب ہوا۔

”اگر میری راہ میں آدابِ سفارت مانع نہ ہوتے تو میں اب تک تجھے قتل کرا چکا ہوتا۔“

اس کے بعد ابن خازم نے ایک بڑا طشت منگوایا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر مبارک کو غسل دیا، خوشبو لگائی، کفن پہنایا۔ اور اس صحابی جلیل کی نماز جنازہ پڑھی۔ پھر جب ابن خازم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اُس کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے اور وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر جب شدتِ جذبات میں اعتدال پیدا ہو گیا تو ابن خازم نے پورے اعزاز کے ساتھ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا سر مبارک اُن کے اہل و عیال کے پاس مدینہ منورہ بھیج دیا۔ یہ ایک کھلی سرکشی اور بغاوت تھی۔ نا طاقی کے باوجود ابن خازم نے خلیفہ عبداللہ بن مروان کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم

کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اگر اہل دل سوچیں تو یہ ایک غیر معمولی جرأت مندانہ اقدام تھا۔ ابن خازم نے دادی مرگ میں محصور ہوئے بھی ایک صحابی رسول ﷺ کے احترام کا حق ادا کر دیا تھا۔ جس طرح حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر کی پوری قیمت وصول کرتے ہوئے اپنے مادی جاہ و حشم میں اضافہ کر لیا تھا، اسی طرح ابن خازم بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نواسے کی بے کفن لاش فردخت کر کے اپنے محلات کے میناروں کو بلند کر سکتا تھا۔ مگر یہی انسانی فطرت کا فرق ہے۔ حجاج عہد توڑ دینے والا تھا۔ اور ابن خام اپنی شہ رگ پر تگوار کا دباؤ محسوس کرتے ہوئے بھی ایضاً عہد کرنے والا تھا۔ اسی عہد کی پاسداری کا نتیجہ تھا کہ انجام کار ابن خازم بھی قتل ہوا اور اس کا سر خلیفہ عبدالملک بن مروان کے سامنے پیش کیا گیا۔ عبدالملک ہو یا حجاج..... حکومتِ دقت کا کوئی بے ضمیر و فادار ہو یا باغی عبداللہ بن خازم، بالآخر کسی کے کاندھے پر سرباتی نہیں رہا۔ مگر تاریخ کے صفحات پر بلندی و پستی کا ایک معیار قائم ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا یہ الم ناک واقعہ 73ھ میں پیش آیا۔

اسے تاریخ کا اتفاق کہیں یا اللہ تعالیٰ کی خاص مصلحت کہ حضور اکرم ﷺ کے حقیقی نواسے حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک یزید ابن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت میں کاٹا گیا۔ اور بعد از انبیاء افضل البشر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حقیقی نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا سر عبدالملک بن مروان کے دورِ خلافت میں تن سے جدا کیا گیا۔ اور یہ دونوں حکمران، اموی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

حجاج بن یوسف کے نزدیک یہ اتنا عظیم الشان کارنامہ تھا، جس پر وہ آخری سانس تک نازاں رہا۔ پھر جب اسے عراق میں شورش کا لگام ہوا تو وہ کوفہ کی طرف بڑھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شکست نے حجاج کی حکمرانی کے خمار کو اس قدر تیز کر دیا کہ وہ ایک عامل (گورنر) ہوتے ہوئے بھی اپنی ذات کو فاتحِ عالم کے آئینے میں دیکھنے لگا تھا۔ 75ھ میں کبر و غرور کی عجیب رفتار کے ساتھ حجاج کوفہ میں داخل ہوا۔ انسانی جہوم سے ”اللہ اکبر“ کی صدا ابھری۔ نہ جانے وہ کون خدا کا بندہ تھا، جو شدید عالم جبر میں بھی اپنے اللہ کی کبریائی کر رہا تھا۔ یہ ایک مخصوص نعرہ ہے جو موجودہ سیاہ کاریوں کے دور میں بھی مسلمان بلند کرتا ہے۔ حجاج کے سامنے بھی کسی جاں سوختہ کی یہی وارفتگی ظاہر ہو گئی تھی۔ حجاج بن یوسف اس نعرہ سرمدی کی لے کو برداشت نہیں کر سکا۔ اور پھر اس نے اہل کوفہ کو اس طرح مخاطب کیا کہ مذہبِ دلت کے تمام ردِ اہل کو پامال کر ڈالا۔ حجاج نے نخوت و تکبر کی ساری حدود کو عبور کرتے ہوئے کہا۔

”اے عراق کے باغی باشندو!..... اے منافقو!..... اور اے برے اخلاق والو!..... میں نے تکبیر کی ایک آواز سنی ہے۔ مگر یہ وہ تکبیر نہیں، جس سے اللہ کے راستے میں ترغیب دلائی جاتی ہو بلکہ اس کا مقصد صرف لوگوں کو خوف زدہ کرنا ہے اور انسانی صفوں میں انتشار پھیلانا ہے۔ میں نے خوب جان لیا ہے کہ یہ ایک غبار ہے، جس کے پردے میں بڑی ہولناک آندھی آنے والی ہے۔ کیا تم میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جو اپنے ضعف و ناتوانی کے باوجود خاموشی کے ساتھ گھر بیٹھے اور اپنے خون کو مفت نہ بہائے۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں عنقریب تمہیں ایسی سزا دوں گا جو موجودہ زمانے کے لئے عذاب اور آئندہ نسلوں کے لئے عبرت ثابت ہوگی۔“

حجاج بن یوسف، اہل کوفہ کی غیرت و حمیت پر دشنام کے تازیانے برسا رہا تھا۔ اور مجمعِ عام میں تہر و غضب کا یہ اظہار صرف اس لئے تھا کہ اہل کوفہ دہشت میں مبتلا ہو کر اپنے گھروں میں چھپ جائیں۔ اور ان کے دلوں پر ”اموی حکومت“ کی ہیبت طاری ہو جائے۔ یہ ایک جاہلانہ سیاسی چال تھی، جس کے ذریعے حریفوں اور مخالفوں کو اس قدر

ہر اسل کرنا تھا کہ پھر ان کے ذہنوں میں کوئی حرف انکار اور روح کی گہرائیوں میں کوئی جذبہ احتجاج زندہ نہ رہے۔ اپنے اس منصوبے کو زیادہ اثر انگیز بنانے کے لئے حجاج بن یوسف مسلسل مخلوق خدا پر ظلم ڈھاتا رہا۔ عالم اسلام کے ایک مشہور محدث اور فقیہ فرماتے ہیں۔

”ایک بار حجاج بن یوسف جمعہ کے دن دوپہر کے وقت مسجد میں پہنچا اور منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگا۔ عام طور پر خطبہ میں ایسی تقریریں کی جاتی ہیں، جن میں اہل ایمان کے لئے نصیحت آمیز باتیں ہوتی ہیں یا پھر مذہب کے حوالے سے اہم نکات کی تشریحات پیش کی جاتی ہیں۔ مگر عامل عراق، منبر کے احترام اور خطبے کی حقیقت سے بے خبر تھا۔ وہ کبھی شام والوں کا ذکر کر کے ان کی تعریفیں کرتا اور کبھی عراق والوں کا نام لے کر ان کی تذلیل کرتا۔ حجاج بن یوسف کا یہ خطبہ اس قدر طویل ہو گیا کہ مسجد کے میناروں پر دھوپ کی سرخی کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت حجاج نے مؤذن کو اذان دینے کا حکم دیا اور پھر اہل ایمان نے جمعے کی نماز ادا کی۔ اس کے فوراً بعد ہی مؤذن نے عصر کی اذان دی اور عامل عراق ہی نے عصر کی نماز پڑھائی۔ مغرب کی اذان ہوئی اور اس نماز میں بھی حجاج بن یوسف ہی لوگوں کا امام تھا۔ نہ وہ اللہ سے ڈرتا تھا اور نہ مخلوق سے شرماتا تھا۔ اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی ذات تھی اور نیچے ایک لاکھ سپاہی..... کوئی اس سے کہنے والا نہ تھا کہ اے شخص! نماز کا وقت جا رہا ہے۔“

ان واقعات کے راوی مشہور محدث اور فقیہ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جنہیں تصوف کی دنیا میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے شہرت دوام حاصل ہے۔



حسن آپ کا نام تھا اور ”ابوسعید“ کنیت۔ اور والد کا نام یسار تھا۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے والدین غلام تھے۔ اس سلسلے میں مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے والد ”میان“ کے قیدیوں میں سے تھے۔ رنجِ بنت نصر نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ دوسری روایت میں ہے کہ ان کے والدین ایک انصاری کے غلام تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کے مہر میں بنو سلمہ کو دے دیا تھا۔ پھر ان مہربان خاتون نے دونوں کو آزاد کر دیا تھا۔

تیسری روایت جو بہت زیادہ معتبر ہے، اس کے مطابق حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے والد یسار، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے غلام تھے اور آپ کی والدہ، جن کا نام خیرہ تھا، اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی کنیز تھیں۔ اس تقربِ خاص کی وجہ سے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تربیت پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جب آپ کی والدہ خیرہ کسی کام سے باہر چلی جاتیں اور آپ بھوک سے بے قرار ہو کر رونے لگتے تو اُمّ المؤمنین انہیں اپنا دودھ پلا دیتیں۔ مشہور عالم حضرت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ میں جو غیر معمولی فصاحت اور حکمتیں پائی جاتی ہیں، وہ سب اسی مقدس دودھ کا صدقہ تھیں۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح تاریخِ پیدائش کسی کو معلوم نہیں۔ تمام معتبر تاریخوں اور روایتوں سے بس اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تقریب دو سال پہلے مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ یکم محرم 24ھ کو مقام شہادت پر فائز ہوئے۔ اس طرح 22ھ آپ کا سال ولادت قرار پاتا ہے۔

اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے تعلق سے خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو دوسری ازواجِ مطہرات کے گھروں میں

بھی آنے جانے کے مواقع میسر آتے تھے۔ اس سلسلے میں خود آپؐ کا اپنا بیان ہے۔
 ”حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک، میں ازدواجِ مطہرات کے کھروں میں بے تکلفانہ آتا جاتا تھا۔
 اس وقت میری عمر 13 سال تھی۔“

حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ نہایت حسین و جمیل انسان تھے۔ اس سلسلے میں مشہور روایت ہے کہ جب آپؐ پیدا ہوئے تو والد محترم نے آپؐ کو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا۔ نو مولود کو دیکھ کر خلیفہ ثانی نے بے اختیار فرمایا۔

”اس بچے کا نام حسن رکھو کہ اس کا چہرہ حسین ہے۔“

اس طرح حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ کو دو منفرد اعزاز حاصل ہوئے تھے۔ ایک یہ کہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کی تربیت فرمائی۔ دوسرے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپؐ کا نام رکھا۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش اور بچپن کے سلسلے میں دوسری روایات بھی بہت زیادہ شہرت پا گئی ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ صوفیائے کرام کے حالات و واقعات کے حوالے سے مشہور بزرگ حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ”تذکرۃ الاولیاء“ بہت شہرت رکھتی ہے۔ اگرچہ حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل اور روحانیت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، لیکن ”تذکرۃ الاولیاء“ میں حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے کچھ ایسے واقعات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو حقیقتاً درست نہیں۔ مثال کے طور پر بچپن میں ایک دن حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ نے رسالتِ تاب حضرت محمد ﷺ کے پیالے کا پانی پی لیا..... پھر جب سرد روکھن حضرت محمد ﷺ نے دریافت فرمایا کہ میرے پیالے کا پانی کس نے پیا ہے تو جواباً حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔
 ”وہ پانی حسن نے پیا ہے۔“

اُمّ المؤمنین کا جواب سن کر حضور اکرم حضرت محمد ﷺ نے فرمایا۔ ”اس بچے نے جس قدر پانی میرے پیالے سے پیا ہے، اسی قدر میرا علم اس میں منتقل ہو گیا۔“

اسی انداز کی ایک اور روایت بھی ”تذکرۃ الاولیاء“ میں موجود ہے۔ ایک دن سرد روکھنات حضرت محمد ﷺ، حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس وقت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ آپؐ کی گود میں تھے۔ اُمّ المؤمنین نے خواجہ حسن کو سرکارِ دو عالم حضرت محمد ﷺ کی آغوشِ مبارک میں دے دیا۔ حضور اکرم حضرت محمد ﷺ نے خواجہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ ”تذکرۃ الاولیاء“ کے مصنف کے بقول یہ رسالت پناہ حضرت محمد ﷺ کی دعاؤں ہی کا صدقہ ہے کہ حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ کو روحانیت میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ حضرت خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ تو ایک عالم و فاضل صوفی تھے۔ تاریخ اسلام کا معمولی حکم رکھنے والا ایک شخص بھی بہت آسانی کے ساتھ ان دونوں روایات کی تردید کر سکتا ہے۔ کیونکہ حضور اکرم حضرت محمد ﷺ 10ھ میں اپنے خالقِ حقیقی کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہو گئے تھے اور خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ 22ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر ان دونوں واقعات کا ظہور کس طرح ممکن ہے؟ ہمارے خیال میں حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت رکھنے والے کسی شخص نے ان بے بنیاد روایات کو ”تذکرۃ الاولیاء“ میں شامل کر دیا ہے۔



حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ ایسے مبارک زمانے میں پیدا ہوئے تھے جبکہ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد بقیدِ حیات تھی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ اصحابِ بدر کی زیارت و صحبت سے بھی فیض یاب

ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت بھی ایسے مقام پر ہوئی تھی، جہاں دن رات علم کے چرچے رہتے تھے۔ اور خود آپؒ میں بھی اتنی ذہانت و صلاحیت موجود تھی۔ نتیجتاً حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ علم و عمل کے اعلیٰ درجات تک پہنچے۔ ”طبقات ابن سعد“ کے مصنف علامہ ابن سعد نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

”حسنؒ بلند مرتبہ عالم، نیک حصّات، عبادت گزار، خوبصورت اور انتہائی خوش بیان شخص تھے۔“

مشہور عالم حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

”حسنؒ حافظ قرآن، علم کا سمندر، نفس کے فقیہ، بڑی شان والے، بے نظیر، پسندیدہ وعظ کہنے والے، خوب صورت فصیح کرنے والے اور خیر کے تمام کاموں میں سردار تھے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کی تعلیم شدید محنت اور انتہائی شوق سے حاصل کی تھی۔ مشہور بزرگ ابو بکر الہذلیؒ فرماتے ہیں:

”ایک دن مجھ سے سفاح نے دریافت کیا کہ تمہارے حسنؒ اس بلند مرتبے کو کس طرح پہنچ گئے؟ میں نے جواباً کہا کہ حسنؒ نے بارہ برس کی عمر ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ جب تک ایک سورۃ کی تفسیر و تاویل اور اس کی شان نزول معلوم نہیں کر لیتے، اس وقت تک دوسری سورۃ نہیں پڑھتے تھے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعت ان بزرگوں سے کی، جو مدینہ منورہ میں مرجع خلائق تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ، (حضرت امام مالکؒ کے والد محترم) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”حسنؒ سے دریافت کرو۔ ان کے حافظے میں سب کچھ محفوظ ہے۔ ہم تو بھول گئے۔“

مشہور بزرگ حضرت عاصم الاحول رحمۃ اللہ علیہ اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”میں نے امام شعبیؒ سے عرض کیا کہ میں بصرہ جا رہا ہوں۔ اگر کوئی کام ہو تو مجھے بتائیے۔“

جواباً حضرت شعبیؒ نے فرمایا۔ ”جب تم بصرہ پہنچو تو حسنؒ کو میری طرف سے سلام کہنا۔“

حضرت عاصم الاحولؒ نے حضرت امام شعبیؒ سے دریافت کیا۔ ”میں نے حسنؒ کو آج تک نہیں دیکھا۔ پھر کس طرح انہیں پہچانوں گا؟“

حضرت امام شعبیؒ نے فرمایا۔ ”جب تم بصرہ میں داخل ہو تو یہ دیکھنا کہ وہاں سب سے زیادہ خوبصورت اور بارعب شخص کون ہے۔ بس وہی حسن ہوں گے۔“

حضرت عاصم الاحولؒ کا بیان ہے کہ پھر ایسا ہی ہوا جیسا کہ حضرت امام شعبیؒ نے فرمایا تھا۔ جب میں جامع مسجد بصرہ میں داخل ہوا تو میں نے دور سے دیکھا کہ خانہ خدا کے ایک گوشے میں انسانوں کا جھوم ہے جو ایک شخص کے سامنے انتہائی ادب کی حالت میں دست بستہ بیٹھا ہے۔ پھر جب میں قریب پہنچا تو میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسا وجہہ و تکلیل انسان تھا، جس کے چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ یہی حسن بصریؒ تھے، جو اس قدر دل کش لہجے میں وعظ بان کر رہے تھے کہ سننے والوں پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔

واضح رہے کہ حضرت امام شعبیؒ، امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے پہلے استاذ گرامی تھے۔ آپؒ ہی کی نصیحت اور

ترغیب پر حضرت امام ابوحنیفہؒ، علم حاصل کرنے کی طرف مائل ہوئے۔ ورنہ اس سے پہلے آپؒ اپنے والد محترم کے ساتھ بازار جایا کرتے تھے جو کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق جب حضرت علیؑ اپنے دور خلافت میں بصرہ تشریف لائے اور نماز کے لئے جامع مسجد میں داخل ہوئے تو حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو وعظ بیان کرتے دیکھا، پھر قریب آکر دریافت کیا۔ ”نو جوان! تم عالم ہو یا طالب علم؟“

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے عرض کیا۔ ”میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ جو کچھ رسالت مآب ﷺ سے مجھ تک پہنچا ہے، وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہوں۔“

خواجہ حسن بصریؒ کا عجز و انکسار دیکھ کر حضرت علیؑ فرمایا۔ ”نو جوان! تم شائستہ کلام ہو۔ حق تعالیٰ تمہارے کلام کو قبولیت عطا فرمائے۔“

پھر جب حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو بتایا گیا کہ وہ کسی عام بزرگ سے ہم کلام نہیں، بلکہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے انہیں گفتگو کا شرف بخشا ہے تو خواجہ حسن بصریؒ بڑے والہانہ انداز میں کھڑے ہو گئے اور ”باب العلم“ کے دامن سے لپٹ گئے۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی یہ عقیدت اور وارفتگی دیکھ کر حضرت علیؑ نے فرمایا۔ ”نو جوان! تم کیا چاہتے ہو؟“

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔ ”امیر المومنین! مجھے طہارت سکھائیے۔“

پھر حضرت علیؑ نے خواجہ حسن بصریؒ کو ”صوری اور معنوی“ دونوں طہارتوں کی تعلیم دی۔ یعنی شریعت کے ساتھ طریقت کے اسرار و رموز بھی سکھائے۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں طریقت ”باطنی تعلیم“ کو کہتے ہیں۔ اور باطنی علم وہ ہے، جس سے اہل ظاہر باخبر نہیں ہو سکتے۔ الغرض حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو حضرت علیؑ سے بیعت کا شرف حاصل ہے۔

بعض روایات کے مطابق آپؑ نے حضرت امام حسنؑ سے بھی روحانی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ حضرت علیؑ کے ایک اور خلیفہ حضرت خواجہ کمیل بن زیادؒ بھی تھے جو اپنی ریاضت اور کرامات کے لئے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ، حضرت خواجہ کمیل بن زیادؒ کی روحانی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوئے۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد حضرت خواجہ کمیل بن زیادؒ کو شہنشین ہو گئے تھے اور خاص خاص مریدوں کو تعلیم دیتے تھے۔ اگرچہ حضرت خواجہ کمیلؒ کو شدید ریاضت و عبادت نے تھکا ڈالا تھا اور آپؒ کو وقت کی سیاست سے کوئی دلچسپی بھی نہ تھی، لیکن حجاج بن یوسف نے حضرت خواجہ کمیل بن زیادؒ جیسے خانقاہ نشین بزرگ کو بھی معاف نہیں کیا۔ یہاں تک کہ حجاج کے حکم پر آپؒ 82ھ میں شہید کر دیئے گئے۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ فطرتاً ایک نہایت رقیق القلب انسان تھے۔ پیر و مرشد حضرت خواجہ کمیل بن زیادؒ کی موت نے آپؒ کو اس قدر غم زدہ کر دیا تھا کہ مہینوں تک اپنے استاد کو یاد کر کے زار و قطار رویا کرتے تھے۔ اور پھر جب ساری دنیا محو خواب ہوتی تھی تو حضرت خواجہ حسن بصریؒ نصف شب کے سنائے میں سجدہ ریز ہو کر بہت دیر تک یہ مخصوص دُعا کیا کرتے تھے۔

”اے اللہ! تو اپنے بندوں کو بنو ثقیف کے اس فاجر سے نجات دے۔“

واضح رہے کہ حجاج بن یوسف کا تعلق قبیلہ ”بنو ثقیف“ سے تھا۔ اور حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا اشارہ بھی

اسی طرف تھا۔

پھر انہی دنوں ایک اور الم انگیز واقعہ پیش آیا، جس نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا رہا سہا مبر و قرار بھی چھین لیا اور آپؒ دنیا سے متنفر ہو گئے۔



حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا شمار افضل ترین تابعین میں ہوتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ اکثر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس وعظ میں تشریف لاتے۔ دونوں بزرگوں میں عالمانہ اور دوستانہ مراسم تھے۔ جب حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ مجلس سے رخصت ہونے لگتے تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے انتہائی عقیدت مندانہ لہجے میں کہتے۔

”امام! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نہایت پرسوز لہجے میں فرماتے:

”سعید! میں تمہیں بس تین نصیحتیں کرتا ہوں۔ تم ان پر زندگی بھر سختی کے ساتھ عمل کرنا۔ ایک یہ کہ بادشاہوں کی بساط پر ہرگز قدم نہ رکھنا چاہئے۔ چاہے وہ انتہائی شفقت و مہربانی سے پیش آتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ بیٹھنا۔ خواہ وہ اپنے وقت کی عابدہ و زاہدہ ہی کیوں نہ ہو اور تم اسے کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہو۔ تیسرے یہ کہ کبھی مزامیر (ساز) نہ سننا۔ اگرچہ تم ”مردان مرد“ کا درجہ ہی کیوں نہ رکھتے ہو۔ اس لئے کہ یہ تمام چیزیں فتنے اور آفت سے خالی نہیں، کبھی نہ کبھی زخم لگائی دیتی ہیں۔“

پھر وقت نے ایک عجیب کروٹ لی اور حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے فتنے میں مبتلا ہو گئے جب 81ھ میں عبدالرحمن بن اشعث نے حجاج بن یوسف کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ اس کی فوج میں شامل ہو گئے۔ عام مسلمان پہلے ہی حجاج بن یوسف کے ظلم و ستم سے نالاں تھے۔ عبدالرحمن بن اشعث نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور عوام الناس کو ایک جابر اور سفاک انسان کے خلاف اکسایا۔ نتیجتاً بہت سے لوگ اس کی فوج میں شامل ہو گئے۔ بڑے بڑے علماء حجاج کی مخالفت میں عبدالرحمن بن اشعث کے ہموار تھے اور ان علمائے کرام میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔

بغاوت کی خبر سن کر حجاج بن یوسف نے ایک بڑی فوج کے ساتھ عراق سے کوچ کیا۔ اس وقت عبدالرحمن بن اشعث سیستان میں مقیم تھا۔ دونوں کے درمیان دو ماہ تک جنگ ہوتی رہی۔ اور اس جنگ میں عبدالرحمن بن اشعث کا پلہ بھاری رہا۔

یہ صورت حال دیکھ کر خلیفہ عبدالملک بن مروان کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں اس جنگ میں حجاج بن یوسف، شکست سے دوچار نہ ہو جائے۔ اس لئے خلیفہ نے فوراً ہی ایک بڑی فوج عامل عراق کی مدد کے لئے روانہ کر دی۔ اب دونوں لشکروں میں اسلحے اور سپاہیوں کی کثرت کے اعتبار سے کوئی تقابل نہیں تھا۔ انجام کار حجاج بن یوسف اور عبدالرحمن بن اشعث کی فوجوں میں ”دیر جماجم“ کے مقام پر گھمسان کارن پڑا۔ ابن اشعث کو شکست فاش ہوئی اور وہ بھاگ کر دوبارہ سیستان چلا گیا۔ یہ سیاسی احتجاج بے نتیجہ ثابت ہوا تھا۔ مجبوراً حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ بھی مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے مکہ معظمہ چلے گئے۔ حجاج بن یوسف، حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ اس لئے اس نے فوراً ہی مملکت کے تمام علاقوں میں فرمان جاری کر دیا کہ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ جہاں بھی نظر آئیں، انہیں گرفتار کر کے عراق بھیج دیا جائے۔

حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ کچھ دن تک مکہ معظمہ میں مقیم رہے، مگر سرکاری جاسوس آپ کے تعاقب میں تھے۔ آخر ایک دن مکہ معظمہ کے عامل (گورنر) خالد بن عبداللہ قشری نے آپ کو گرفتار کر کے حجاج بن یوسف کے پاس بھیج دیا۔

پھر اس عظیم محدث اور فقیہ کی جان لینے کے لئے مقتل آراستہ کیا گیا۔ اس قتل گاہ میں تمام خوشامدی اور بے ضمیر اراکین سلطنت جمع تھے اور عامل عراق کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد حجاج بن یوسف بڑے طمطراق کے ساتھ مقتل میں داخل ہوا۔ اس کی پیشانی پر پل پڑے ہوئے تھے اور چال انتہائی متکبرانہ تھی۔ پھر وہ اپنی شان اقتدار دکھانے کے لئے آہستہ آہستہ چلتا ہوا حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ ایک طرف شمشیر کی طاقت تھی اور دوسری طرف قلم، جو بظاہر بہت کمزور نظر آتا تھا۔ مگر یہ وہی قلم تھا، جس کی قسم اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کھائی ہے۔ ہم اپنے قارئین کی معلومات میں گراں قدر اضافے کیلئے وہی تاریخی مکالمات درج کر رہے ہیں، جو آج سے 1330 سال پہلے ایک مقتل میں قلم اور شمشیر کے درمیان ہوئے اور جن کی گونج قیامت تک سنائی دیتی رہے گی۔

عامل عراق حجاج بن یوسف نے حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ کے قریب آ کر انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”تیرا نام کیا ہے؟“

عظیم محدث اور فقیہ نے جرات مندانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”میرا نام سعید ہے۔“

”تو جھوٹ بولتا ہے۔“ حجاج کے لہجے میں غرور کے ساتھ غصہ بھی شامل تھا۔ ”تیرا نام سعید نہیں، شقی ہے۔“

عربی زبان میں سعید مبارک کو کہتے ہیں۔ اور شقی کا مفہوم ہے بد بخت اور سنگ دل۔ حجاج بن یوسف نے حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ کے لئے طعناً ”شقی“ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ مگر حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ، حجاج بن یوسف کی مادی طاقت سے متاثر ہوئے اور نہ اس بے ہودہ طعنے سے۔ آپ نے اسی بے باکانہ لہجے میں جواب دیا۔

”تمہاری بہ نسبت میری والدہ محترمہ میرے نام سے زیادہ واقف تھیں۔“

حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ کی یہ استقامت دیکھ کر حجاج بن یوسف کا غصہ کچھ اور بھڑک اٹھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”تیری ماں بھی بد بخت تھی اور تو بھی۔“

حجاج کا چیخ و تاب دیکھ کر حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھر آیا۔ پھر آپ نے اسی بے نیازانہ لہجے میں فرمایا۔

”کون سعید ہے اور کون بد بخت؟ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو ہے۔“

ایک محدث و فقیہ کا جواب سن کر حجاج بن یوسف پر ہذیبانی کیفیت طاری ہو گئی۔ ”میں تیری دنیا کو بھڑکتی ہوئی آگ سے بدل دوں گا۔“

حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ پر حجاج بن یوسف کے غصے کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ آپ نے اسی مطمئن لہجے میں فرمایا۔ ”اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ عمل تمہارے اختیار میں ہے تو میں تمہیں اپنا معبود بنا لیتا۔“

حجاج بن یوسف کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مقتل میں کھڑے ہو کر بھی حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ اس قدر ثابت قدم رہیں گے۔ اس نے دوبارہ چیختے ہوئے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم میری تصدیق کرو۔“

حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا۔ ”اگر میں تمہیں محبوب رکھتا تو ہرگز تمہاری تکذیب نہ کرتا۔“

حجاج بن یوسف کا غصہ عروج کو پہنچ چکا تھا۔

”تو بد بخت بھی ہے اور کم فہم بھی۔ میں نے تجھے زندگی کی مہلت بخشی تھی، مگر تیری جہالت نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ خدا کی قسم، اب میں تجھے قتل کئے بغیر نہیں رہوں گا۔“

حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ پر حجاج بن یوسف کی اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور آپؑ نے اسی سرشاری کے لہجے میں کہا جو ایک مرد مومن کے شایانِ شان ہوتا ہے۔

”اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو وقت مقرر فرما دیا ہے۔ میں اسی وقت اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا۔ نہ ایک لمحہ پہلے، نہ ایک لمحہ بعد۔“

حجاج بن یوسف کا خیال تھا کہ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ موت کو اتنے قریب دیکھ کر خوف زدہ ہو جائیں گے اور اس کی عدالت میں معافی نامہ داخل کر کے اس سے رحم کی درخواست کریں گے۔ مگر جب عظیم و جلیل محدث و فقیہ کی زبان اور پائے استقامت میں ہلکی سی لرزش بھی پیدا نہیں ہوئی تو اس نے حسبِ عادت حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

عادل عراق کا فرمان سن کر حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حجاج بن یوسف کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز میں کلمہ شہادت پڑھا، پھر انتہائی پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”اے حجاج! تم اسے میری طرف سے اچھی طرح یاد کر لو۔ یہاں تک کہ حشر میں میری اور تمہاری دوبارہ ملاقات ہو۔“

یہ کہہ کر حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ ہنسنے لگے۔

ایک مرد مومن کا یہ انداز دیکھ کر حجاج بن یوسف ایک بار پھر غضب ناک ہو گیا۔ ”اب تجھے کس بات پر ہنسی آ رہی ہے؟“

حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے جواب فرمایا۔

”مجھے اس بات پر ہنسی آ رہی ہے کہ تم اللہ کے معاملے میں کس قدر دیدہ دلیری اور گستاخی سے کام لے رہے ہو۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ اپنی بردباری کا کیسا عظیم الشان مظاہرہ کر رہا ہے۔“

یہ کہہ کر حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ انتہائی باوقار انداز میں چلتے ہوئے اپنی قتل گاہ کی طرف بڑھے۔ حجاج بن یوسف بھی ساتھ ساتھ تھا۔ پھر جب حضرت سعید رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر پہنچے، جہاں ایک دراز قامت اور طاقت ور جلاؤ، شمشیر بے نیام لئے کھڑا تھا تو حجاج بن یوسف کے لئے ایک کرسی بچھا دی گئی، تاکہ وہ جابر و سفاک انسان بیٹھ کر ایک مرد مومن کے قتل سے لطف اندوز ہو سکے۔ قتل ہونے سے پہلے حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے قبلہ رو ہو کر دعا کرنی چاہی، مگر حجاج بن یوسف نے اپنی طاقت اور نفرت کا آخری مظاہرہ کرنے کے لئے سپاہیوں کو حکم دیا۔

”اس کا زخ قبیلہ کی طرف سے پھیر دو۔“

سپاہیوں نے حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ مبارک قبلہ کی سمت سے پھیر کر اس طرف کر دیا، جدھر حجاج بن یوسف نہایت متکبرانہ انداز میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے عادل عراق کی طرف دیکھتے ہوئے با آواز بلند قرآن کریم کی یہ آیت مقدسہ تلاوت کی۔

(ترجمہ) ”تم جس طرف بھی اپنا رخ کرو گے، اللہ اُدھر ہی ہو گا۔ بے شک اللہ اوسعیت والا اور علم والا ہے۔“

جیسے ہی حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے قرآن مقدس کے یہ الفاظ ادا ہوئے، جلاؤ کی شمشیر فضا میں لہرائی اور دوسرے ہی لمحے حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا سر مبارک زمین پر آگرا۔ اور پھر قتل میں موجود ہر شخص نے کلمہ طیبہ کی گونج سنی۔ اللہ جانے کہ یہ آواز سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے سر سے آ رہی تھی یا کوئی ہاتھ غیبی ایک عظیم تابعی

کے ایمان کی تصدیق کر رہا تھا۔

پھر ایک عجیب اور محیر العقول واقعہ پیش آیا۔ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے جسم مبارک سے اس قدر خون نکلا کہ بہتا ہوا حجاج بن یوسف کی کرسی تک پہنچ گیا۔ یہ ایک ناقابل یقین منظر تھا۔ عامل عراق بدحواسا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے عراق کے تمام بڑے بڑے طبیبوں کو جمع کر کے اس واقعے کی توجیہ طلب کی۔ بیشتر طبیب اس مشکل مسئلے کا کوئی عقلی حل پیش نہ کر سکے۔ مگر ایک حکیم نے یہ راز فاش کرتے ہوئے کہا۔

”اب تک آپ نے جتنے لوگوں کو قتل کر دیا ہے، موت کے خوف سے ان کے خون کی بڑی مقدار قتل سے پہلے ہی خشک ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت سعید ابن جبیر کا معاملہ ان مقتولین سے یکسر مختلف تھا۔ طبی اصول کے مطابق انتہائی خوشی کی حالت میں انسانی خون کی مقدار پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ قتل سے پہلے حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نہایت اطمینان اور سرشاری کے عالم میں تھے۔ نتیجتاً ان کے جسم سے بہت زیادہ خون نکلا۔“

قرآن کریم میں مرد مومن کی اس کیفیت کو ”قلب مطمئن“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کا یہ واقعہ 94ھ میں پیش آیا۔ بعض مؤرخین کے مطابق شہادت کے وقت حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی عمر 53 سال تھی اور بعض کے نزدیک 49 سال تھی۔ شہادت سے پہلے حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے پُرسوز لہجے میں یہ دعا کی تھی۔

”اے میرے اللہ! میرے بعد تو حجاج کو کسی مومن پر مسلط نہ کرنا۔“

پھر جب حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کی خبر بصرہ پہنچی تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ شدت غم سے زار و قطار رونے لگے۔ اور پھر آپؒ نے روتے ہوئے سجدے میں یہ دعا کی۔

”اے اللہ! تو جس طرح سب سے بڑا رحیم و کریم ہے، اسی طرح تیری ذات بے نیاز سب سے بڑی منتقم بھی ہے، ہم بہت کمزور ہیں، مگر تو قوی العزیز ہے۔ بنو ثقیف کے اس فاسق، فاجر (حجاج) سے سعید کے قتل کا بدلہ لے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سجدے میں بار بار یہی دعا کرتے رہے۔ پھر جب آپؒ نے سر اٹھایا تو ریش مبارک آنسوؤں سے تر تھی۔ اس کے بعد حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”حق تعالیٰ کی قسم، اگر اس زمین پر رہنے والے تمام انسان سعید کے قتل میں شریک ہوتے، تب بھی اللہ ان کو منہ کے بل دوزخ میں جھونک دیتا۔“

پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے فوراً بعد حجاج بن یوسف بے خوابی کے اذیت ناک مرض میں مبتلا ہو گیا۔ پوری مملکت اسلام کے بہترین طبیبوں نے عامل عراق کو نیند لانے والی انتہائی قیمتی دوائیں استعمال کرائیں مگر حجاج کی پلک تک نہیں جھپکتی تھی۔ مجبور ہو کر طبیبوں نے اسے بے ہوشی کی دوائیں دینا شروع کر دیں۔ ان دواؤں کا بس اتنا ہی اثر ہوتا کہ تھوڑی دیر کے لئے حجاج کی آنکھ لگ جاتی تھی۔ پھر وہ یکایک اٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتا اور انتہائی دردناک لہجے میں چیخنے لگتا۔

”میں ابن جبیرؒ کے معاملے کو کیا کروں؟ کوئی ہے جو مجھے سعید سے بچالے؟“

دراصل واقعہ یہ تھا کہ جب بھی حجاج بن یوسف کی آنکھ لگتی تو وہ بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک سمندر دیکھتا۔ پھر اچانک کسی طرف سے حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ خون میں نہائے ہوئے نمودار ہوتے اور حجاج بن یوسف کا گریبان پکڑ کر پوچھتے۔ ”اے دشمن خدا! تو نے مجھے کیوں قتل کیا تھا؟“

یہ خوف ناک منظر دیکھ کر حجاج بن یوسف کی آنکھ کھل جاتی اور وہ چیخنے لگتا۔ ”ہے کوئی جو مجھے سعید ابن جبیرؒ سے

بچا لے؟“

حاج بن یوسف چھ ماہ تک بے خوابی کی اسی اذیت ناک بیماری میں مبتلا رہا۔ اور پھر 95ھ میں اسی طرح چیخے چیخے مر گیا۔

حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حاج بن یوسف کی شمشیر قہر ناک کا ہدف بننے سے پہلے سرِ مقتل یہ دعا فرمائی تھی۔ ”اے اللہ! میرے بعد حاج کو کسی مردِ مومن پر مسلط نہ کرنا۔“

اس دعا میں اہل ایمان کے لئے ایک خاص نکتہ پوشیدہ ہے۔ اصولی طور پر حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کو یہ دعا مانگی چاہئے تھی کہ حق تعالیٰ انہیں عاملِ عراق کے جبر و ستم سے محفوظ رکھے۔ حالانکہ ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ ”مستجاب الدعوات“ بزرگ تھے۔ مگر آپؑ نے آخری سانس تک اپنے لئے حق تعالیٰ سے کچھ نہیں مانگا۔ اگر دعا کی تو عاتلہ السلیمین کے لئے۔ یہی بزرگانِ دین کی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساری دعائیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کی بھلائی کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اہل ایمان کی سلامتی کے لئے دعا مانگی۔ اور اپنی ذات کو یکسر فراموش کر دیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی دعا قبول ہوئی اور حاج بن یوسف اس واقعے کے بعد کسی دوسرے مسلمان کو قتل کرنے کا حکم جاری نہ کر سکا۔ وہ خود ایک عذاب ناک مرض میں گرفتار ہو گیا۔ اس طرح حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ حاج بن یوسف کے دو حیات میں آخری مقتول تھے۔

بعض معتبر روایات کے مطابق حاج بن یوسف پر ایک دن میں کئی کئی بار سکرات (نزع) کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اہل خانہ اور خدمت گار سمجھتے تھے کہ عاملِ عراق مر گیا۔ مگر کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ جاتا تھا۔ اور گڑگڑا کر یہ خصوصی دعا مانگتا تھا۔

”اے اللہ! یہ سب لوگ یک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں کہ تُو مجھے معاف نہیں کرے گا۔ لیکن تُو غفار اور کریم ہے۔ ان کم حوصلہ اور تنگ دل لوگوں کو اپنی شانِ کرم دکھا دے، تجھے کوئی روکنے والا نہیں۔ اور تُو مجھ جیسے گناہ گار کو بھی معاف کر سکتا ہے۔“

جب حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ کو اس واقعے کی خبر ملی تو آپؑ نے بے اختیار فرمایا۔

”بد بخت اپنی چرب زبانی سے اللہ کو فریب دے کر عاقبت بھی سنوارنا چاہتا ہے۔“



حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نوعمری میں تاریخ اسلام کے حوالے سے بڑے جاں گذر مناظر دیکھے۔ جب آپؑ کی عمر مبارک صرف 18 سال تھی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کا انتہائی الم ناک واقعہ پیش آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ کے استاد گرامی بھی تھے اور باطنی علم کی نسبت سے پیر و مرشد بھی۔ پھر 50ھ میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی روحانی تعلیمات سے بھی فیض یاب ہوئے تھے۔ پھر آپؑ کے دوسرے پیر و مرشد حضرت خواجہ کمیل بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ نے حاج بن یوسف کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا۔ ابھی حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ کے دل کا زخم تازہ تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔ پھر 94ھ میں افضل ترین تابعین حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حاج بن یوسف کے سجائے ہوئے مقتل کو اپنے خون سے رنگین کر دیا۔ یہی وہ جاں گذار واقعات تھے، جنہوں نے حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ جیسے رقیق القلب امام اور صوفی کو اس قدر متاثر کیا کہ آپؑ کا دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ اور پھر آپؑ اپنی درس گاہ میں گوشہ نشین ہو کر مخلوقِ خدا کو مذہبی علوم اور روحانیت سے فیض یاب کرتے رہے۔

صوفیائے کرام کے اکثر تذکروں میں یہ روایت بڑے وثوق اور یقین سے پائی جاتی ہے کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ابتدا میں جواہر کی تجارت کیا کرتے تھے۔ نتیجتاً اس زمانے میں آپ ”حسن لولوی“ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ (واضح رہے کہ ”لولو“ عربی زبان میں موتی کو کہتے ہیں۔ اسی پیشہ ورانہ تعلق سے آپ ”حسن لولوی“ کہلائے) اسی روایت میں نمایاں طور پر تحریر ہے کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے جواہر کی تجارت سے بہت مال دوزر کمایا اور شاندار امیرانہ زندگی بسر کی۔ پھر جب عشق الہی کا غلبہ ہوا تو آپ نے سارا مال و اسباب اللہ کی راہ میں لٹا دیا اور اہل دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ تنہائی میں چلے گئے۔ اس کے بعد آپ نے شدید عبادت و ریاضت اور مجاہدات کئے۔ دن رات یاد الہی میں مصروف رہتے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو کسی شخص نے کسی بھی وقت بے وضو نہیں دیکھا۔ پھر جب آپ ”درجہ کمال کو پہنچ گئے تو لوگوں کو اپنے فیض روحانی سے سیراب کرنے لگے۔

ہمارے نزدیک جواہر کی تجارت اور امیرانہ زندگی بسر کرنے کی روایت کمزور اور بے حقیقت ہے۔ ”شذرات الذہب“ کی روایت کے مطابق مشہور بزرگ حضرت ابوبکر الہندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کبھی کوئی درہم کسی تجارت پر نہیں لگایا اور نہ کوئی سرکاری عہدہ قبول کیا۔ آپ اپنے شاگردوں اور مخاطبین کو اسی کام کی نصیحت فرماتے تھے، جس پر خود عمل پیرا ہوتے تھے۔ اگر کسی کو کسی چیز کے ترک کرنے کا حکم دیتے تو پہلے خود اسے چھوڑ دیتے۔ گویا آپ نے زندگی بھر اس آیت مقدسہ پر عمل کیا۔

(ترجمہ) ”اے ایمان والو! لوگوں سے وہ بات کیوں کہتے ہو، جس پر خود عمل نہیں کرتے۔“

حضرت ابوبکر الہندی رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کے مطابق حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کبھی کوچہ تجارت میں قدم نہیں رکھا۔ ایک عام فہم سی بات ہے کہ اگر اپنے آغاز جوانی میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جواہر کے اتنے بڑے تاجر بن گئے ہوتے تو پھر محدثین کرام اور فقہائے عظام کی درس گاہوں میں جانے کے لئے وقت کہاں سے نکالتے۔ ہمارے خیال میں ”حسن لولوی“ نام کے کوئی اور بزرگ ہوں گے، جن کو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سمجھ لیا گیا۔ دیگر روایات کی موجودگی میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس سلسلے میں تذکرہ نگاروں کو مغالطہ ہوا ہے۔

اس ذیل میں ہم ایک اور مثال پیش کرتے ہیں کہ اکثر تذکرہ نگار کسی بزرگ یا تاریخی شخصیت کے بارے میں تحقیق و جستجو کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور ایسی باتیں تحریر کر جاتے ہیں، جن کی کوئی حقیقت اور بنیاد نہیں ہوتی۔ پھر تذکرہ نویسوں کی یہ بے احتیاطی نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور بے خبر عوام ان قصے کہانیوں کو عین حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ صوفیاء کے حلقے میں یہ روایت بہت شہرت پا گئی ہے کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ مشہور خاتون صوفی حضرت رابعہ بصریؒ کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ ہفتہ میں ایک بار بہت بڑی جلسہ گاہ میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت رابعہ بصریؒ بھی ایک عظیم محدث اور فقیہ کی مجلس عام میں پابندی کے ساتھ تشریف لایا کرتی تھیں۔ اگر کبھی حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ آپ کو اپنی مجلس میں نہ دیکھتے تو خاموش رہتے اور بعض روایتوں کے مطابق اس روز وعظ ہی نہ فرماتے۔ دوسرے الفاظ میں آپ کی یہ مجلس عام حضرت رابعہ بصریؒ ہی کے لئے آراستہ ہوتی تھی۔ ایک بار کچھ تھکے حضرات نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا۔

”آپ کی بزم عرفان میں بڑے بڑے جید علماء و صلحاء حاضر ہوتے ہیں۔ پھر اگر ایک ضعیف نہیں آئی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ درپردہ ان حضرات کا مدعا یہ تھا کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ حضرت رابعہ بصریؒ کی غیر موجودگی میں بھی اپنا وعظ جاری رکھیں۔

ان حضرات کا یہ سوال سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے جواب فرمایا۔ ”جو شربت ہاتھیوں کے حوصلے کے

مطابق تیار کیا گیا ہے، وہ چیونٹیوں کے سینے میں کیوں کر ساکتا ہے۔“

بے شک، ان الفاظ میں روحانیت اور معرفت کا ایک بڑا نکتہ پوشیدہ ہے۔ مگر اسے کیا کہا جائے کہ حضرت رابعہ بصریؒ کے حوالے سے یہ روایت ہی بے بنیاد ہے۔ تمام معتبر مؤرخین کے مطابق حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے 110ھ میں وفات پائی اور حضرت رابعہ بصریؒ 97ھ میں پیدا ہوئے۔ اس طرح حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے انتقال کے وقت حضرت رابعہ بصریؒ کی عمر صرف 13 سال تھی۔ اور یہ وہ زمانہ ہے، جب بصرہ میں شدید قحط پڑ گیا تھا اور غربت و افلاس کے سبب ان کے عزیزوں نے انہیں کسی مال دار تاجر کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ اور وہ یتیم و یمین کی اپنے آقا کی خدمت پر مامور تھی۔ پھر حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی مجلس وعظ میں کس طرح تشریف لاتیں؟ اور پھر یہ کہ وہ کم سنی کے دور میں ضعیفہ کیسے ہو گئیں؟ اب اہل نظر خود ہی اندازہ کر لیں کہ کم علم لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے تاریخی حقائق کے ساتھ کیسا عجیب مذاق کیا گیا ہے۔ یہ روایت عظیم صونی حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی مشہور تصنیف ”تذکرۃ الاولیاء“ کے اردو ترجمے میں موجود ہے۔ اتفاق سے فارسی نسخہ ہمارے سامنے موجود نہیں، ورنہ اس روایت کی حقیقت ظاہر ہو جاتی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ روایت غلطی سے تذکرۃ الاولیاء میں شامل ہو گئی ہے۔ ہمیں حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ جیسے عالم و فاضل صونی سے اس لغزش قلم کی توقع رکھنی نہیں چاہئے۔ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ تو وہ جاں باز صونی ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے آپؒ کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو، غزالیؒ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحرگاہی



اسی طرح حجاج بن یوسف کے حوالے سے بھی حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے بارے میں ایک روایت بہت مشہور ہے کہ عامل عراق بھی آپؒ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ”تذکرۃ الاولیاء“ میں تحریر ہے کہ ایک بار حجاج بن یوسف شمشیر برہنہ لئے اپنے سپاہیوں کے ہمراہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی مجلس وعظ میں داخل ہوا۔ اُس وقت بڑے بڑے علماء آپؒ کی مجلس میں حاضر تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ایک عالم نے اپنے دل میں کہا۔

”آج حسن بصریؒ کے زہد و تقویٰ کا امتحان ہے۔ وہ ایک ظالم و جابر عالم کے احترام میں کھڑے ہوتے ہیں یا ایک آمر وقت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا درس جاری رکھتے ہیں۔“

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے ایک اُچھٹی سی نظر حجاج بن یوسف پر ڈالی اور وعظ میں اس طرح مشغول ہو گئے کہ آپؒ کی ظاہری کیفیت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ نہ چہرے کا رنگ بدلا، نہ زبان میں ہلکی سی لرزش آئی۔ آپؒ نے شمشیر بکف حجاج بن یوسف اور اُس کے سپاہیوں کو عام سامعین سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ حجاج بن یوسف کچھ دیر تک دروازے میں میں کھڑا حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی ظاہری کیفیات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر خاموشی کے ساتھ حاضرین مجلس کی سب سے آخری قطار میں بیٹھ گیا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ پورے کیف و جذب کے ساتھ اسرارِ حقیقت بیان کرتے رہے۔

اور پھر جب حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا وعظ ختم ہوا تو حجاج بن یوسف بہت تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس مسند کی طرف بڑھا، جہاں حضرت خواجہ حسن بصریؒ تشریف فرما تھے اور وعظ بیان کر رہے تھے۔ عامل عراق کو اپنے اتنے قریب پا کر بھی حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے اندازِ نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں

ہوئی۔ حجاج والہانہ جھکا اور اُس نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔ پھر آپ کے ہاتھ کو بلند کرتے ہوئے حاضرین مجلس سے مخاطب ہوا۔
 ”اگر تم کسی مردِ خدا سے ملنا چاہتے ہو تو حسن کو دیکھ لو۔“

اس روایت سے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مومنانہ جرأت و استقامت کا اظہار تو ہوتا ہے، مگر حجاج بن یوسف جیسے شقی القلب انسان کی عقیدت عقل و فہم سے بالاتر تھی۔ وہ کسی مردِ خدا کو پہچانتا ہی کب تھا کہ اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیتا۔ تاریخ کے اوراق میں یہ معتبر روایات آج بھی محفوظ ہیں کہ ایک بار حجاج بن یوسف نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی اور خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ (حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم) کی بھرے دربار میں توہین کی اور آپ کی گردن مبارک پر وہ مہر لگا دی، جو مجرموں کی گردن پر لگائی جاتی تھی۔

حجاج بن یوسف، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے عظیم و جلیل صحابی کے فتوؤں کا مذاق اٹھاتا تھا کہ جنہیں نقل کرنا بھی ہمارے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ تاریخ اسلام کا علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کس شان کے صحابی ہیں۔ آپ نو عمری ہی میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر رہا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند سے جگاتے، جوتے پہناتے اور مسواک پیش کرتے۔ اکثر روایتوں کے مطابق آپ کا شمار بھی اہل بیت میں ہوتا ہے۔ ام ابن عبد البر کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود بھی ”عشرہ مبشرہ“ میں شامل ہیں۔ ایک موقع پر سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قرآن کریم چار اشخاص سے سیکھو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابی بن کعب اور حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہ۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت عبداللہ بن مسعود کو ”علم کی کھلی“ کہا کرتے تھے۔

حجاج بن یوسف کے سلسلے میں ایک روایت یہ بھی موجود ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی ”قرأت“ کا بھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اب اہل نظر خود ہی اندازہ کر لیں کہ حجاج بن یوسف کس طرح کسی مردِ خدا کو پہچان سکتا تھا اور کس طرح حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کو بوسہ دے سکتا تھا؟

ایک بار خلیفہ عبد الملک بن مروان نے عاملِ عراق سے پوچھا۔ ”حجاج! تیری اپنے بارے میں کیا رائے ہے؟“
 جواباً حجاج بن یوسف نے کہا۔ ”امیر المومنین! سچ تو یہ ہے کہ میں سخت کینہ پرور اور حاسد انسان ہوں۔ کسی شخص کو اذیت میں مبتلا دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔“

حجاج بن یوسف کا جواب سن کر خلیفہ عبد الملک بن مروان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اس طرح تو تیرا رشتہ شیطان سے ملتا ہے۔“

حجاج بن یوسف کی لذیت ناک موصلی سے 9 سال پہلے دستِ قضا نے 86ھ میں خلیفہ عبد الملک بن مروان کی قبائے حیات تار تار کر دی۔ عبد الملک کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا ولید اسی غرور و تکبر کے ساتھ تختِ خلافت پر بیٹھا۔ اپنے باپ کی طرح ولید نے بھی حجاج بن یوسف کی سرپرستی کی۔ اس تعاون کی بنیادی وجہ خلیفہ ولید بن عبد الملک اور حجاج بن یوسف کی فطرتوں میں یکسانیت تھی۔ ظلم، ظلم کا شریک تھا اور تشدد کے دو دھارے ایک ہی رفتار کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ خلیفہ ولید اپنے باپ عبد الملک بن مروان سے بھی زیادہ جابر اور اذیت پسند تھا۔ اس نے عوام الناس کے دلوں پر اپنی ہیبت قائم کرنے کے لئے حجاج بن یوسف کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ نتیجتاً اہل ایمان کا خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں نظر آتا تھا۔

عبدالملک بن مروان کی موت کے بعد عامل عراق تقریباً 9 سال زندہ رہا۔ اس عرصے میں حجاج بن یوسف نے بس ایک ہی تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ اس نے تین بار تیسرے سندھ کے لئے فوجی مہم روانہ کی۔ پہلی بار عبداللہ بن نہیان سندھ پر حملہ آور ہوئے اور شہید ہو گئے۔ دوسری بار بدیل بن طہفہ نے لشکر اسلام کی قیادت کی، مگر عبداللہ بن نہیان کی طرح آپ بھی منصب شہادت پر فائز ہوئے۔ تیسری بار حجاج بن یوسف نے اپنے سولہ سالہ داماد محمد بن قاسم کو سندھ روانہ کیا اور اس کم سن سالار نے عظیم الشان فتح حاصل کی۔ بظاہر حجاج بن یوسف کے نامہ اعمال میں بس یہی ایک نیکی نظر آتی ہے کہ اس کی وجہ سے سندھ کے کفرستان میں شمع حرم کا نور پھیلا۔

تمام معتبر مؤرخین کے مطابق جب حجاج بن یوسف کا آخری وقت آیا تو وہ بار بار ایک ہی جملہ دہراتا تھا۔ ”میں ولید ہی کی اطاعت پر زندہ رہا، اسی کی اطاعت پر مر رہا ہوں اور اسی کی اطاعت پر قیامت میں اٹھوں گا۔“ ان روایات کی موجودگی میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حجاج بن یوسف، حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس وعظ میں حاضر ہوا تھا اور اس نے دست بوسی کے لئے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو ”مرد خدا“ کہہ کر پکارا تھا۔ حضرت خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے ”تذکرۃ الاولیاء“ میں یہ روایت بھی موجود ہے۔

حجاج بن یوسف کے انتقال کے بعد کچھ لوگوں نے اسے خواب میں دیکھا کہ میدان حشر آراستہ ہے اور عامل عراق کسی کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر کسی نے پوچھا کہ یہاں کیا ڈھونڈ رہا ہے؟ جواباً عامل عراق نے کہا۔ ”میں اُس جلوۂ خداوندی کا متلاشی ہوں جسے ”موحدین“ تلاش کیا کرتے ہیں۔“ اب اہل نظر خود ہی اندازہ کریں کہ یہ کیسا خواب ہے۔ حجاج بن یوسف نے اپنی زندگی ہی میں ایسے موحدین کو قتل کرا دیا تھا، جن کے سیرت و کردار میں اُسے جلوۂ خداوندی نظر آسکتا تھا۔

آخر میں ہم حجاج بن یوسف کی شخصیت کے حوالے سے ایک ایسی روایت پیش کرتے ہیں کہ جس کا راوی سب سے زیادہ معتبر اور ثقہ ہے۔ یہ خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ کا تعلق بھی بنو امیہ کے خاندان سے تھا۔ اس امر پر تمام فقہاء، علماء اور مؤرخین متفق ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مختصر دور حکومت میں خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اسی لئے آپ کو پانچواں ”خلیفہ راشد“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ حجاج بن یوسف کا تعلق بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ہی کے خاندان سے تھا۔ پھر جب آپ ”سند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو برسرِ دربار اپنے پیشرو حکمرانوں کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا۔

”ولید بن عبدالملک شام میں، حجاج بن یوسف عراق میں، عثمان جاز میں اور قرہ مصر میں۔ واللہ ساری دنیا ظلم سے بھر گئی۔“

اور پھر ایک دوسرے موقع پر اپنے رشتہ دار حجاج بن یوسف کی مذمت ان الفاظ میں کی کہ اس جرأت اور بے باکی اور حق بیانی کی چند مثالیں ہی دنیا کی پوری تاریخ میں مل سکیں گی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تمام اراکین سلطنت کے سامنے با آواز بلند فرمایا۔

”اگر تمام پیغمبروں کی امتیں مل کر اپنے اپنے زمانے کے بدکاروں کو جمع کریں اور ہم صرف حجاج بن یوسف کو ان کے مقابلے پر لائیں تو حق تعالیٰ کی قسم! ہمارا پلہ بھاری رہے گا۔“

ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی گواہی کے بعد کسی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ خود حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حجاج بن یوسف کی موت کی خبر سن کر بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیئے تھے اور حاضرین مجلس کے سامنے نہایت رقت آمیز لہجے میں یہ دعا مانگی تھی۔

”اے اللہ! جس طرح تُو نے اس شخص کی زندگی کا دروازہ بند کیا، اسی طرح اس کے جاری کردہ نظام کو بھی ختم فرما دے۔“

پھر ایک سال بعد ہی 96ھ میں فرشتہء اجل نے ولید بن عبد الملک کی سانس بھی غصب کر لیں۔ اس طرح جو روحنا کی یہ طویل زنجیر ٹوٹی اور جبر و تشدد کی آہنی کڑیاں بکھر گئیں۔



ان خوں رنگ مناظر کے تسلسل نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو پہلے ہی گوشہ نشین بنا دیا تھا۔ پھر کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ آپؒ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی کم ہو گئی۔ اس سلسلے میں یہ عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سیر و سیاحت کی غرض سے روم تشریف لے گئے۔ ایک دن کسی جنگل سے گزر رہے تھے تو آپؒ نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جنگل کے قریب ایک طویل و عریض دلکش سبزہ زار تھا اور اس سبزہ زار کے درمیان میں ایک خوبصورت قبر موجود تھی، جو بظاہر کسی امیر و کبیر شخص کا مقبرہ نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سبزہ زار میں دُور تک مختلف رنگ کے خیمے نصب تھے۔ ان خیموں کے اندر بہت سے لوگ موجود تھے مگر ہلکی سی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ فضا پر ایک عجیب سا پُر ہول سناٹا طاری تھا۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اس پُر اسرار منظر کو دیکھنے کے لئے کچھ دیر ٹھہر گئے۔

اچانک ایک خیمے سے سو کے قریب سپاہی برآمد ہوئے اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ چلتے ہوئے اس خوبصورت مقبرے کے قریب آئے۔ پھر ان تمام سپاہیوں نے مقبرے کے گرد تین چکر لگائے۔ وہ سب کے سب خاموش تھے اور ان کے چہروں پر رنج و الم کے گہرے سائے لرز رہے تھے۔ چکر ختم کرنے کے بعد ان تمام سپاہیوں نے اپنی شمشیریں بے نیام کیں اور صاحب مقبرہ کو سلامی پیش کی۔ اس کے بعد ان سب فوجیوں نے بیک زبان زور زور سے کچھ کہا اور اپنے خیموں کی طرف واپس چلے گئے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ زیادہ فاصلے پر تھے، اس لئے سپاہیوں کی آواز نہ سن سکے۔

تھوڑی دیر بعد دوسرے خیمے سے وہ لوگ باہر آئے جو اپنے لباسوں اور داڑھیوں سے راہب یا عالم نظر آتے تھے۔ وہ لوگ مقبرے کے قریب پہنچ کر تھوڑا سا خم ہوئے اور پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیئے۔ سپاہیوں کی طرح ان راہبوں نے بھی اپنی زبانوں سے کچھ کلمات ادا کئے اور اُداس چہوروں کے ساتھ واپس چلے گئے۔

راہبوں کے جانے کے بعد تیسرے خیمے سے وہ لوگ نمودار ہوئے جو اپنے حلیوں سے طبیب اور حکیم نظر آتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی مقبرے کے قریب پہنچ کر سپاہیوں اور راہبوں کی طرح کچھ الفاظ ادا کئے اور غم زدہ چہروں کے ساتھ اپنے خیموں کی طرف لوٹ گئے۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بڑی حیرت کے ساتھ یہ تمام مناظر دیکھ رہے تھے۔ پھر چوتھے خیمے سے حسین و جمیل کنیزیں باہر آئیں جن کے سروں پر زرد و جاہر سے بھرے ہوئے خوان رکھے ہوئے تھے۔ ان خوبصورت کنیزوں نے مقبرے کے سات چکر لگائے۔ پھر زرد و جاہر سے بھرے ہوئے خوان اس طرح الٹ دیئے کہ جیسے وہ اشرفیاں اور ہیرے، صاحب قبر پر نچھاور کئے جا رہے ہوں۔ اس کے بعد کنیزوں نے اپنے سروں کے بال کھول دیئے اور سینہ کوبی کرنے لگیں۔ پھر کچھ دیر مانتی رسم ادا کر کے اپنے خیمے کی طرف واپس چلی گئیں۔

اب سبزہ زار میں صرف ایک خیمہ باقی رہ گیا تھا۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا تجسس بڑھ گیا تھا کہ اس خیمے سے کون برآمد ہوتا ہے۔ یہ خیمہ جو اپنی ظاہری شان و شوکت میں دوسرے خیموں سے زیادہ نمایاں نظر آتا تھا۔ ابھی

حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ سوچ ہی رہے تھے کہ اس خیمے سے ایک طویل قامت اور وجہہ شخص باہر آیا، جو اپنے لباس اور وضع قطع سے بادشاہ نظر آتا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ تھے، جن کے جسموں پر قیمتی پوشاکیں تھیں اور وہ دست بستہ اس شخص کے عقب میں چل رہے تھے۔ پھر وہ بادشاہ اپنے امراء کے ساتھ مقبرے کے قریب آیا۔ بہت دیر تک کھڑا آنسو بہاتا رہا، پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور آنسو بہاتا ہوا تھکے قدموں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ پھر جب تمام خیمے اکھاڑ دیئے گئے اور سب لوگ واپس چلے گئے تو حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ مقبرے کے قریب آئے، وہاں ایک عمر رسیدہ شخص موجود تھا، جو بظاہر مقبرے کا مجاور اور خدمت گار نظر آتا تھا۔ حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص سے پوچھا۔

”یہ صاحبِ قبر کون ہے؟ اور یہاں آنے والوں کا اس سے کیا تعلق ہے؟“

بڑھے مجاور نے انتہائی غمزہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

”اس مٹی کے نیچے سونے والا، یہاں کا جواں مرد شہزادہ تھا، جو چند سال پہلے ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا۔ آج اُس کی پہلی برسی ہے۔ کاش! تم نے شہزادے کو دیکھا ہوتا۔ وہ شجاعت اور مردانہ وجاہت کا ایک ایسا دلکش پیکر تھا کہ آج بھی اُس کی تصویر نظروں میں گھومتی رہتی ہے۔ ہر سال آج ہی کے دن سب لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں اور شہزادے کے حضور میں اپنی اپنی معذرت پیش کرتے ہیں۔“

حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ نے کسی قدر حیرت کے ساتھ مقبرے کے مجاور سے سوال کیا۔ ”یہ لوگ معذرت کیوں پیش کرتے ہیں؟ کیا ان کی کسی کوتاہی کے سبب شہزادے کی موت واقع ہوئی تھی؟“

حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ کا سوال سن کر مقبرے کا مجاور رونے لگا۔ ”بس اسی کا تو افسوس ہے کہ کسی سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ ہم سب مل کر شہزادے کو روکتے رہے، مگر یہ وزاری کرتے رہے۔ مگر شہزادے نے کسی کی نہیں سنی۔ اُسے جانا تھا اور وہ چلا گیا۔ اُسی صدمہ عظیم کی یاد تازہ کرنے کے لئے سب سے پہلے فوجی مقبرے پر حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں۔“

”اے ہمارے جانناز شہزادے! اگر جنگ کے ذریعے تیری موت ٹل سکتی تو ہم اس قدر قتال و جدال کرتے کہ زمین انسانی خون میں ڈوب جاتی اور تجھے فرشتہ اجل کے طاقتور بازوؤں سے چھین کر تجھے خیرے محل میں واپس لے آتے۔ مگر اس کائنات کے مالک سے کوئی جنگ نہیں کر سکتا۔ اس لئے انسانی مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے ہماری حذرت قبول کر اور ہمیں معاف کر دے۔“

اس کے بعد روم کے بڑے بڑے علماء اور راہب شہزادے کی قبر پر آ کر اظہارِ ندامت کرتے ہیں۔ ”اے ہمارے جواں مرد ولی سلطنت! ہم تجھ سے شرمندہ ہیں کہ ہماری ریاضت و عبادت اور دعائیں تیرے کسی کام نہ آ سکیں۔ اگر زہد و تقویٰ موت کے راستے کو روک سکتا تو ہم اپنی زندگی بھر کے نیک اعمال تجھے بچانے کے لئے قربان کر دیتے۔ مگر افسوس، موت کا سفر کسی سے نہیں رک سکتا۔“

پھر اس ملک کے تمام طبیبانِ حاذق، شہزادے کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں۔ ”حکمت کی کسی کتاب میں موت کا نسخہ موجود نہیں۔ اگر روئے زمین پر ایسی کوئی جڑی بوٹی موجود ہوتی تو ہم تجھے عین عالمِ شباب میں مرنے نہیں دیتے۔“

اس کے بعد حسین و جمیل کنیریں زرد و جاہر کے خوان لٹاتی ہیں اور ماتم کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ ”اگر دنیا کا حُسن و جمال اور زرد و مال تیری زندگی کا صدقہ ہوتا تو ہم سب تجھ پر سے قربان ہو جاتے۔“

سب سے آخر میں غم زدہ باپ اور لاوارث بادشاہ، وزیروں کے ہمراہ اپنے اکلوتے بیٹے کی قبر پر آتا ہے اور گریہ وزاری کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”اے میرے محبوب بیٹے! اگر تاج و تخت دے کر بھی تیرے آخری سفر کو روکا جاسکتا تو یہ شگستہ درنجور باپ کلاہ و سپاہ کے ساتھ اپنی جان دے کر بھی تیرے پیروں کی زنجیر بن جاتا۔ مگر صدمہ حیف! کوئی تدبیر انسانی تقدیر کو نہیں بدل سکتی۔“

آخر میں بادشاہ اپنا ہاتھ بلند کر کے بیٹے سے رخصت کی اجازت چاہتا ہے۔ ”اے میری نسل کی آخری نشانی! آئندہ سال تک تجھ پر ہمارا سلام ہو۔ اگر زندہ رہے تو پھر اگلے برس تجھے اپنی فریادوں اور شکلوں کے نذرانے پیش کر دیں گے۔“

عیسائی مجاور کی زبانی یہ الم ناک واقعہ سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پر شدید رقت طاری ہو گئی۔ ”تذکرۃ الاولیاء“ کی روایت کے مطابق اس کے بعد آپ نے قسم کھائی کہ زندگی بھر نہیں بنیں گے۔ ہنسنا یا خوشی کا اظہار کرنا اسلامی نقطہ نظر سے ایک جائز فعل ہے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم محدث اور فقیہ ایک حلال شے کو اپنی ذات پر حرام کرنے کی قسم نہیں کھا سکتے تھے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ خشیت الہی کے سبب آپ بہت زیادہ رویا کرتے تھے۔ کسی شخص نے اسی زمانے کے مشہور عالم حضرت یونس بن عبید سے سوال کیا۔

”شیخ! کیا آپ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرح عمل کرتا ہو؟“

حضرت یونس بن عبید نے جواباً نہایت عقیدت مندانہ اور پُر جوش لہجے میں فرمایا۔ ”تم عمل کی بات کرتے ہو، میں نے تو ان جیسا گفتگو کرنے والا بھی نہیں دیکھا۔“

حضرت یونس بن عبید کا اشارہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت علم اور بے مثال فصاحت و بلاغت کی طرف تھا۔

ایک اور موقع پر حضرت یونس بن عبید نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا۔ ”حسن“ جب آتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی دوست کو دفن کر کے آرہے ہیں۔ پھر جب مجلس میں بیٹھتے تو اس قدر اُداس نظر آتے تھے کہ جیسے وہ ایک قیدی ہوں اور ان کے قتل کا حکم جاری کر دیا گیا ہے۔ اور جب حسن کے سامنے دوزخ کا ذکر کیا جاتا تو ان پر ایسی دہشت طاری ہو جاتی تھی کہ گویا دوزخ ان کے سوا کسی کے لئے پیدا ہی نہیں کی گئی ہے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی گریہ وزاری دیکھ کر ایک شاگرد نے عرض کیا۔

”شیخ! آپ تو ان صاحبانِ تقویٰ میں سے ہیں کہ لوگ جن کی عبادت و ریاضت کی مثال دیتے ہیں۔ پھر آپ

اس قدر کیوں روتے ہیں؟“

اپنے شاگرد کا سوال سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بہت زیادہ مغموم نظر آنے لگے پھر نہایت پُر سوز لہجے میں فرمایا۔ ”اللہ ان لوگوں کو خشن ظن کے لئے اجر عظیم عطا فرمائے کہ وہ مجھے مفتی اور عبادت گزار سمجھتے ہیں۔ میں تو اس دن کو یاد کر کے روتا ہوں کہ جس روز مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو اور میدانِ حشر میں حق تعالیٰ اس کی گرفت کر کے یہ فیصلہ فرمادے۔ ”حسن! ہماری بارگاہ میں تیرا ایک سجدہ بھی قبول نہیں۔ تیرے روزے، تیرے حج اور تیری قربانیاں سب بے وقعت ہیں۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ان ارشادات گرامی کو ایک اُردو شاعر نے بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔

ایسی بے ترتیب مت پڑھنا خدا کے واسطے

روز محشر جو اٹل ماریں ترے منہ پہ نماز
پھر دوسرے موقع پر جب کسی شخص نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسلسل گریہ و زاری کا سبب دریافت کیا تو آپ نے روتے ہوئے فرمایا۔

”میں نے محمد بن کعب سے سنا ہے کہ ایک صاحب ایمان اپنے کسی گناہ کی وجہ سے برسوں جہنم میں پڑا رہے گا۔ اس روز سے میں دن رات یہی دعا کرتا ہوں کہ اس شخص کی جگہ مجھے دوزخ میں ڈال دیا جائے اور حق تعالیٰ اسے بخش دے۔ کیونکہ مجھے اپنے بارے میں یہ توقع نہیں ہے کہ ایک ہزار سال تک بھی چھٹکارا حاصل کر سکوں گا۔“
ایک بار بصرہ میں ایسا شدید قحط پڑا، دریا اور تالاب خشک ہو گئے۔ بہت زیادہ گہرے کنوئیں بھی اس حالت کو پہنچ گئے کہ اُن سے کچھ نما گدلا پانی آنے لگا۔ بہت قریب تھا کہ بصرہ کے لوگ پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتے، اس آفت کو ٹالنے کے لئے مختلف مقامات پر ”نماز استسقا“ ادا کی گئی۔ مگر بارش تو کجا، آسمان پر ابر کا ہلکا سا ٹکڑا تک نظر نہیں آیا۔ بالآخر دو لاکھ افراد ”نماز استسقا“ پڑھنے کے لئے شہر کے باہر جمع ہوئے اور طے پایا کہ امامت کے لئے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی جائے۔ پھر جب معززین شہر اس التجا کے ساتھ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے بے اختیار فرمایا۔

”حسن تمہاری امامت کے قابل کہاں؟ کسی پرہیزگار شخص کو تلاش کرو تا کہ تمہارے سروں سے یہ مصیبت ٹل جائے۔“

معززین شہر بہت دیر تک درخواست کرتے رہے مگر جب حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہوئے تو کچھ لوگ ایک تخت لائے اور آپ کو اس پر زبردستی بٹھا دیا۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اپنے عقیدت مندوں کو بار بار منع کرتے رہے۔

”لوگو! تم نہیں جانتے کہ حسن کی حقیقت کیا ہے۔ مگر میں خوب جانتا ہوں کہ میں کون ہوں؟ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ تمہیں میری ذات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔“

عقیدت مندوں نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اس عذر کو تسلیم نہیں کیا اور اپنے کاندھوں پر تخت اٹھائے ہوئے اُس جگہ پہنچ گئے، جہاں انسانی ہجوم اُس عظیم محدث اور فقیہ کی آمد کا منتظر تھا۔ پھر جب تخت زمین پر رکھا گیا تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ زار و قطار رو رہے تھے۔ پھر اسی حالت میں آپ نے انسانی ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”لوگو! اگر تم بارش کی تمنا رکھتے ہو تو مجھ گناہ گار کو اس شہر سے نکال دو۔ تم پر آنے والی یہ مصیبت میرے ہی گناہوں کا نتیجہ ہے۔“

ابھی آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ یکایک مشرق کی جانب سے ایک سیاہ بادل اٹھا اور پورے آسمان پر چھا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بصرہ اور گرد و نواح کے علاقے جل تھل ہو گئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ عظیم صوفی بزرگ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ ایک بار بسطام میں اتنا شدید قحط پڑا کہ انسانوں کی ہلاکت کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ کئی بار نماز استسقا پڑھی گئی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آخر شہر کے بڑے بڑے لوگ حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے اور غم زدہ لہجے میں عرض کرنے لگے۔

”شیخ! آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نمازِ استسقا ادا کی گئی ہو اور آسمان سے ابرِ کرم نہ برسا ہو۔“
معززینِ شہر کی بات سن کر حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”آخر آپ حضرات کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

”ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ زمینی اور آسمانی آفتیں گناہوں کی زیادتی کے سبب نازل ہوتی ہیں۔“ بسطام کے ایک امیر و کبیر شخص نے عرض کیا۔

”یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے۔“ حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ”یہی اللہ تعالیٰ کی سنت (طریقہ) ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان خود ہی اپنی جانوں پر مظالم ڈھاتے ہیں۔“

”نمازِ استسقا اور توبہ و استغفار سے واپس ٹل بھی تو جاتی ہیں۔“ بسطام کے دوسرے معزز شخص نے عرض کیا۔
”اس شہر میں یقیناً ایسا کوئی گناہ گار موجود ہے، جس کی وجہ سے ہماری توبہ قبول نہیں ہوتی اور دعائیں بابِ اثر تک پہنچنے نہیں پاتیں۔ آپ اپنے کشف سے اُس گناہ گار کی نشاندہی فرمادیں تاکہ اُسے شہر سے نکال کر باقی لوگوں کو بچا لیا جائے۔“

اُس شخص کی بات سن کر خشیتِ الہی سے حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ مبارک زرد ہو گیا اور انتہائی پُر زور لہجے میں فرمانے لگے۔ ”تم درست کہتے ہو۔ یہ ساری مصیبت اُسی ایک گناہ گار انسان کی وجہ سے ہے۔ اور میں اسے خوب پہچانتا ہوں۔“

حاضرینِ خانقاہ کے چہرے مسرت سے کھل اُٹھے۔ ”تو پھر بتائیے کہ وہ سیاہ کار انسان کون ہے؟ تاکہ ہم اس سے نجات حاصل کر کے اللہ کی رحمت سے فیض یاب ہو سکیں۔“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ مجلس سے اُٹھے اور اپنے حجرے میں چلے گئے۔

حاضرینِ مجلس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ یہ جاننے کے لئے سخت مضطرب تھے کہ آخر اس شہر کا سب سے بڑا گناہ گار کون ہے؟ بعض افراد کے چہروں پر بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحبِ کشف و کرامت بزرگ ہیں۔ اگر شیخ نے اپنی روشن ضمیری سے ان میں سے کسی کا نام لے دیا تو وہ پورے بسطام کے سامنے ذلیل و رسوا ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر اُن لوگوں پر شدید وحشت طاری تھی۔

آخر کچھ دیر بعد حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے حجرہ مبارک سے اس طرح باہر تشریف لائے کہ آپؑ کے ہاتھ میں وضو کا لوثا تھا، دائیں کا ندھے پر نماز کا مصلیٰ اور بائیں کا ندھے پر اوڑھنے کی چادر تھی۔ حاضرینِ خانقاہ حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو اس حالت میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ آپؑ کے ظاہری انداز سے صاف نظر آ رہا تھا کہ جیسے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کسی سفر پر روانہ ہو رہے ہوں۔

حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرینِ خانقاہ پر ایک نظر ڈالی اور انتہائی پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ”لوگو! تم جاننا چاہتے تھے کہ اس شہر کا سب سے زیادہ گناہ گار شخص کون ہے اور جس کی مصیبت کے سبب اللہ تعالیٰ نے آسمان کے دہانے بند کر رکھے ہیں اور تم اُس کی بارشِ کرم کے لئے ترس رہے ہو۔“ یہ کہہ کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے۔

خانقاہ کی فضا پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ہر شخص کی نظریں آپؑ کے چہرہ مبارک پر مرکوز تھیں۔ مختصر سے سکوت کے بعد حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ دوبارہ حاضرین سے مخاطب ہوئے۔

”جو لوگ مجھے جانتے ہیں، سو جانتے ہیں۔ اور جو نہیں جانتے، وہ جان لیں کہ اس شہر کا سب سے بڑا گناہ گار

میں ہوں۔ مطمئن رہو کہ جیسے ہی میرے قدم بسطام کی حدود سے نکلیں گے، تمہارے سروں سے یہ آفت نکل جائے گی اور آسمان اپنے دہانے کھول دے گا۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی خانقاہ کے دروازے سے نکل گئے اور تیز رفتاری کے ساتھ چلنے لگے۔

حاضرین پر کچھ دیر تک سکے کی سی کیفیت طاری رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ اُن کے ذہن ماؤف ہو گئے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں زائل ہو گئی ہیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ خود کو اس شہر کے سب سے بڑے گناہ گار کی صورت میں پیش کریں گے۔ پھر جب بہت دیر بعد ان کے حیرت و سکوت کی یہ کیفیت ختم ہوئی تو وہ سب لوگ خانقاہ سے باہر آئے اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو تلاش کرنے لگے۔ مگر شیخ کا دُور دور تک پہنچنا نہیں تھا۔

پھر تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر عام ہو گئی کہ حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ کے لئے یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور جا رہے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی اہل بسطام شدید اذیت و کرب میں مبتلا ہو کر اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور مختلف راستوں پر حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو ڈھونڈنے لگے۔ مگر شیخ کسی کو نظر نہیں آئے۔ آخر لوگوں نے شدید بے قراری کے عالم میں دوڑنا شروع کر دیا۔

پھر اہل بسطام کو حضرت شیخ بایزید رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت نظر آئے جب آپ شہر کی حدود سے نکل کر جنگل میں قدم رکھ چکے تھے۔ عقیدت مندوں نے دوڑ کر آپ کا دامن پکڑ لیا اور گریہ و زاری کرنے لگے۔

”شیخ! ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ آپ چلے گئے تو بسطام میں کیا باقی رہ جائے گا؟“

عقیدت مندوں کے غم زدہ چہرے اور بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”میں تو تمہاری بھلائی کے لئے ہی یہاں سے جا رہا ہوں۔ شہر کے معزز و محترم لوگ کہتے ہیں کہ یہ قحط شدید کسی ایک گناہ گار کے اعمال کا نتیجہ ہے اور وہ گناہ گار میں ہوں۔ اس لئے میرا چلا جانا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“

”آپ سے زیادہ معزز و محترم کون ہے؟“ لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ ”آپ کی موجودگی میں تو بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرمادے۔ لیکن اگر آپ چلے گئے تو ہمیں یقین ہے کہ پورا بسطام قبرستان بن جائے گا۔ جانا تو ہمیں چاہئے۔ مگر ہم اُس کے عذاب سے بچ کر کہاں جائیں گے؟“

لوگوں کی یہ گریہ و زاری دیکھ کر حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ پھر آپ نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور نہایت رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔ ”اے علیم وخبیر! یہ لوگ مجھ سے حُسن ظن رکھتے ہیں، انہی لئے معزز و محترم کہہ کر پکار رہے ہیں۔ مگر تُو خوب جانتا ہے کہ بایزید کون ہے؟“

یہ کہہ کر حضرت شیخ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور شہر کی جانب واپس چل دیے۔ ابھی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ یکایک مغرب کی طرف سے سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا اٹھا اور پورے بسطام پر محیط ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیز بارش شروع ہو گئی۔



حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے عجیب عجیب انداز سے غیبی ہدایات ملتی تھیں۔ ایک بار آپ نے اپنی مجلس وعظ میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”جب میں چار افراد کے بارے میں سوچتا ہوں تو حیرت زدہ رہ جاتا ہوں۔ پہلا عنث (بیچڑا)، دوسرا بدست شرابی، تیسرا ایک نو عمر لڑکا اور چوتھا ایک شادی شدہ عورت۔“

جب حاضرین مجلس نے حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ سے اس قول کی وضاحت چاہی تو آپؑ نے انتہائی پرسوز لہجے میں فرمایا۔

”ایک بار میں کسی کام سے جا رہا تھا تو میری نظر ایک منٹ پر پڑی۔ اُس کی شکل و صورت دیکھتے ہی مجھے عجیب سی ناگواری اور کراہیت کا احساس ہوا۔ پھر جب میں نے راستہ بدل کر گزر جانا چاہا تو اُس منٹ نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔

”حسن! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ میرے قریب آؤ، ایک کام کی بات سنتے جاؤ۔“

میں اُس کے طرزِ مخاطب پر حیران رہ گیا۔ پھر جب میں منٹ کے قریب پہنچا تو منٹ نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”اب تک کسی کو میری حالت کا علم نہیں۔ لیکن تم جیسے انسان کو مجھ سے گریزاں نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے عاقبت کی خبر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو ہے۔“

یہ کہہ کر وہ منٹ تیزی کے ساتھ چلا گیا۔ دوسرے راہ گیر اُس کا مذاق اڑاتے رہے اور میں بہت دیر تک راستے میں کھڑا یہی سوچتا رہا کہ وہ کون تھا؟ اور مجھ سے کیا کہہ گیا ہے؟“

پھر حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ نے بدستِ شرابی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں ایک دن کسی کام سے جا رہا تھا تو مجھے ایک بدستِ شرابی نظر آیا، جو صاف راستہ چھوڑ کر کچھڑ میں چل رہا تھا۔ نشے کی زیادتی کے سبب اس کی یہ حالت تھی کہ بار بار لڑکھڑاتا تھا مگر فوراً ہی سنبھل جاتا تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ کچھڑ میں گر کر زخمی نہ ہو جائے۔ اسی خیال کے تحت میں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میرے بھائی! ہوش و حواس سے کام لو، سنبھل کر چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم گر پڑو۔ پھر تمہارے پٹے بھی خراب ہو جائیں گے اور چوٹ بھی لگ جائے گی۔ بلکہ ایسا کرو کہ کچھڑ کی راہ چھوڑ کر صاف راستے پر آ جاؤ۔“

میری بات سن کر وہ بدستِ شرابی چلتے چلتے رک گیا اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔

”امام! میرے اندر تک یہ کچھڑ بھری ہوئی ہے، پھر مجھے صاف راستے سے کیا کام؟ اور اگر میں گر بھی گیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ اکیلا ہی تو گردوں گا۔ مگر آپ اپنا بہت خیال رکھیں، ایک ایک قدم نہایت احتیاط سے اٹھائیں۔ اگوشہا خواستہ آپ گر گئے تو پوری قوم اس دلدل میں پھنس جائے گی۔“

یہ کہہ کر وہ بدستِ شرابی اسی طرح لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ مگر میں اسے آج بھی فراموش نہیں کر سکا ہوں۔ جب بھی خیال آ جاتا ہے تو یہی سوچتا رہتا ہوں کہ وہ بدستی کی حالت میں بھی کس قدر ہوشیار تھا۔

اس کے بعد حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ نے اس نوعمر لڑکے کے واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں ایک بار سرِ شام کسی راستے سے گزر رہا تھا تو ایک نوعمر لڑکا سامنے سے روشن چراغ لئے ہوئے نظر آیا۔ میں نے اس لڑکے کو روک کر پوچھا۔ ”بچے! تم یہ روشنی کہاں سے لائے ہو؟“

میرا سوال سن کر لڑکے نے بہت غور سے میری طرف دیکھا، پھر اس نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”میں آپ کے اس سوال کا جواب بعد میں دوں گا کہ میرے پاس روشنی کہاں سے آئی تھی؟ پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں کہ وہ روشنی کہاں چلی گئی؟“

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں اس لڑکے کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا اور وہ لڑکا کچھ دُور جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔“

آخر میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس شادی شدہ عورت کا واقعہ سنایا، جسے آپؐ زندگی بھر فراموش نہ کر سکے۔

”میں ایک دن اپنی خانقاہ میں بیٹھا تھا کہ ایک خوبصورت نوجوان عورت روتی ہوئی داخل ہوئی۔ اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور لباس بے ترتیب تھا۔

”شیخ! میرا شوہر میری طرف سے مسلسل بے رغبتی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ آپ کو خدا کا واسطہ، کوئی ایسی دعا کر دیں کہ وہ میری طرف پہلے کی طرح متوجہ ہو جائے اور میری گمشدہ خوشیاں واپس لوٹ آئیں۔“

میں نے عورت کے سوال کا جواب دینے سے پہلے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بی بی! تم نے اپنے سر پر چادر تو ڈال لی ہوئی۔ اس طرح بے حجابانہ گھر سے نکلتا کسی مسلمان عورت کے لئے جائز نہیں۔“

میری بات سن کر اس عورت نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ ”شیخ! میں کیا کروں؟ مجھے اپنے شوہر سے اس قدر محبت ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کا اندازہ کر ہی نہیں سکتا۔ میں پاگل سی ہو گئی ہوں، مجھے اپنی جان کا ہوش ہے اور نہ تن بدن کا۔ میں نہیں جانتی کہ چادر کسے کہتے ہیں اور لباس کیا ہوتا ہے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ”اس عورت کی بات سن کر میں نے اپنے دل میں کہا۔ اے حسن! اگر تو بھی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی دوستی میں ایسی ہی محویت سے کام لیتا تو تجھے یہ ہی نہیں چلتا کہ اس عورت کے سر پر چادر ہے یا نہیں؟

بعض تذکرہ نگاروں نے اس روایت کو ذرا مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق، جب حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اُس عورت کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”خاتون! اپنے سر پر چادر تو ڈال لی ہوئی۔“ تو اُس عورت نے بے اختیار جواب دیتے ہوئے کہا۔

”شیخ! میں تو ایک دنیا دار عورت ہوں، پھر بھی اپنے شوہر کی محبت میں اندھی ہو رہی ہوں۔ مگر آپ کو تو عشق الہی کا دعویٰ ہے، پھر آپ کو کیسے نظر آ گیا کہ میرے سر پر چادر ہے یا نہیں؟“



ایک دن حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ دریائے دجلہ کے کنارے اس خیال سے تشریف لے گئے کہ وہاں پوری یکسوئی کے ساتھ تنہائی میں ذکر الہی کر سکیں۔ مگر آپؐ جیسے ہی وہاں پہنچے کہ ایک بے ہودہ منظر دیکھ کر آپؐ کی طبیعت سخت مکدر ہو گئی۔ ایک جوان سال جشی ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ دریا کے کنارے بیٹھا تھا۔ شراب کی بھری ہوئی صراحی اُس کے سامنے رکھی ہوئی تھی اور وہ اُس میں سے پیالہ بھر بھر کر خود بھی پی رہا تھا اور عورت کو بھی پلا رہا تھا۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں نفرت کی لہری اٹھی اور آپؐ نے زیر لب فرمایا۔

”یہ کیسے ظالم اور بے خبر لوگ ہیں کہ کھلے عام احکام شریعت کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ کیا انہیں اپنے انجام کی خبر نہیں؟“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کچھ دیر تک دل ہی دل میں دونوں کو ملامت کرتے رہے، پھر آپؐ نے ارادہ کیا کہ اُس جوان سال جشی اور ادھیڑ عمر عورت کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔ یہ سوچ کر آپؐ اُن دونوں شریبوں کی طرف بڑھے۔ پھر جیسے ہی قریب پہنچے، یکایک دریا میں انسانی چینیں گونجنے لگیں۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے گھبرا کر دریا کی طرف دیکھا۔ کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک کشتی ڈوب رہی تھی، جس میں چھ افراد

سوار تھے اور وہ بار بار مدد کے لئے پکار رہے تھے۔

نوجوان حبشی نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”محترم بزرگ! آئیے، مخلوقِ خدا کی کچھ خدمت کریں اور ڈوبتے ہوئے انسانوں کو بچالیں۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تیرنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے آپؑ نے نوجوان حبشی سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں تیرا کی کے فن سے واقف نہیں۔ بس دُعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ اپنے فضل و کرم سے ان غرق ہونے والوں کو بچالے۔“

یہ کہتے وقت حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے چہرہ مبارک پر شدید اذیت و کرب کے آثار نمایاں تھے۔ ”اس وقت ان مجبور انسانوں کو آپ کی دُعا کی نہیں، جسمانی مدد کی ضرورت ہے۔“ نوجوان حبشی نے کہا اور آٹا ٹانا دریا میں گود گیا۔ اس کے ساتھ ہی شراب پینے والی عورت بھی یہ کہتے ہوئے آگے بڑھی۔

”اے خدا! ان کی مدد فرما۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کنارے پر کھڑے ہوئے بڑی حسرت سے اُس نوجوان حبشی کو دیکھتے رہے، جو ڈوبتی ہوئی کشتی کے مسافروں کو ایک ایک کر کے پانی سے نکالتا رہا۔ جب پانچ مسافر عافیت کے ساتھ ساحل پر پہنچ گئے تو حبشی نے اُن سے کہا۔

”کیا اس کشتی میں بس آپ ہی لوگ سوار تھے؟“

پانچوں مسافروں نے بیک زبان انتہائی دردناک لہجے میں کہا۔ ”ہمارا ایک ساتھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ شاید سرکش موجوں کی نذر ہو گیا۔ اللہ اُس کی مغفرت کرے۔“

یہ سننے ہی نوجوان حبشی دریا میں اس طرح گود پڑا جیسے کوئی مگر مجھ اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ پھر اُس نے غوطہ کھا اور پانی کی سطح سے غائب ہو گیا۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ایک انسان کی ہلاکت پر نہایت آزرده تھے۔ اور پانچوں مسافروں کا یہ حال تھا کہ وہ شدتِ غم سے زار و قطار رو رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد نوجوان حبشی اُس چھٹے مسافر کو اپنے طاقتور بازوؤں میں اٹھائے ہوئے پانی سے باہر آیا۔ ڈوبنے والے شخص کے پیٹ میں کافی پانی بھر گیا تھا، مگر ابھی اُس کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ تمام لوگوں نے مل کر اُس شخص کو اٹا کیا، یہاں تک کہ سارا پانی نکل گیا اور زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر کشتی کے تمام مسافروں نے مل کر بہت عاجزی کے ساتھ اُس حبشی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”اگر آج تم نہ ہوتے تو ہم سب موت کی خوراک بن چکے ہوتے۔“

”ہرگز نہیں۔“ نوجوان حبشی نے انتہائی اثر انگیز لہجے میں کہا۔ ”میں نہیں ہوتا تو بچانے والا کسی اور کو بھیج دیتا۔“

حقیقی مددگار بس وہی ہے، اس کے سوا کوئی نہیں۔“

نوجوان حبشی کی باتیں سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پر شدید حیرت طاری تھی۔ کہاں وہ شراب پینے کا منظر اور کہاں یہ عارفانہ گفتگو؟ ابھی حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ نوجوان حبشی آپؑ سے مخاطب ہوا۔

”آئیے محترم بزرگ! کچھ لمحے ہم گناہ گاروں کے ساتھ بھی گزاریں۔“ یہ کہہ کر نوجوان حبشی اُس طرف بڑھا، جہاں کچھ دیر پہلے عورت اور وہ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ خاموشی سے اُن دونوں کے

پیچھے چلتے رہے۔ آپؐ نے دل میں سوچا کہ انہیں نصیحت کرنے کا یہی مناسب ترین موقع ہے۔

پھر جب حضرت خواجہ حسن بصریؒ وہاں پہنچے تو ایک خوبصورت چادر پر شراب کی صراحی اور پیالوں کے ساتھ کچھ پھل اور کھانے کی دیگر اشیاء بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کشتی کے مسافروں کو پانی سے نکالنے کے سبب نوجوان جشیؒ سر سے پاؤں تک بری طرح بھیگا ہوا تھا۔ اُس نے اسی حال میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو مخاطب کر کے کہا۔

”اس وقت آپ میرے مہمان ہیں، اس لئے آپ کی تواضع مجھ پر فرض ہے۔ کچھ دیر تشریف رکھیے، پھر باتیں ہوں گی۔“

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو وہاں بیٹھنے میں شدید کراہیت محسوس ہوئی کیونکہ اُس جگہ کچھ دیر پہلے شراب پی جا رہی تھی۔ ”مجھے ایک ضروری کام ہے، اس لئے میں ٹھہر نہیں سکتا۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کو کیا ضروری کام ہے۔“ نوجوان جشیؒ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جسے خود اپنی خبر نہیں، وہ کسی دوسرے کا حال کیا جانے کا؟“ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا لہجہ نرم تھا، مگر اس سے تنگی جھلک رہی تھی۔ ”میں تم دونوں سے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ.....“

ابھی حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ نوجوان جشیؒ درمیان میں بول اٹھا۔ ”آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا، کہ ہم دونوں شراب نہ پیئیں۔“ نوجوان جشیؒ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

”یقیناً، میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں کہ جو شے حرام کر دی گئی، سو کر دی گئی۔ شراب کا چھپ کر پینا بھی گناہ ہے اور سرعام پینا تو احکام حق سے بغاوت بھی ہے۔“

”مگر احکام شریعت سے بغاوت تو اُسی وقت ہوگی، جب ہم شراب نوشی کے گناہ کے مرتکب ہوئے ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے نوجوان جشیؒ ہنسا اور اس کے ساتھ ہی وہ اذیت عورت بھی پہنے لگی۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو نوجوان جشیؒ کی اس بے باکی پر بڑا تعجب ہوا اور آپؐ نے کسی قدر ناگوار لہجے میں کہا۔

”پھر تم دونوں کچھ دیر پہلے کیا کر رہے تھے؟“ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے ہاتھ کا اشارہ شراب کی صراحی اور پیالوں کی طرف تھا۔

”ہم تو حق تعالیٰ کی بیش بہا نعمت کا استعمال کرتے ہوئے اُس رازقی عالم کا شکر ادا کر رہے تھے۔“ یہ کہہ کر جشیؒ نوجوان جھکا اور شراب کی صراحی کے ساتھ ایک پیالہ بھی اٹھا لیا۔ پھر اُس نے پیالہ جرا اور حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ ہے اللہ کی وہ نعمت، جس سے مخلوق خدا سیراب ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ اگر اپنی اس نعمت کو روک لے تو کرۂ ارض پر بسنے والا ایک ایک جاندار تڑپ تڑپ کر مر جائے۔“

یہ منظر دیکھ کر حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پیالے میں شراب کی جگہ صاف و شفاف پانی موجود تھا۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو حیرت و ندامت میں گم پا کر نوجوان جشیؒ نے انتہائی کیف و جذب کے عالم میں کہا۔ ”یہ تو محض ایک امتحان تھا کہ آپ کی چشم باطن کھلی ہوئی ہے یا ابھی تک بند ہے۔“

پھر اُس نے امیرِ عمر عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری والدہ محترمہ ہیں۔“
حقیقی صورتِ حال جان کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو اس قدر شرمندگی ہوئی کہ آپؒ پسینے میں نہا گئے۔
حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو خاموش دیکھ کر نوجوان حبشی نے انتہائی عاجزانہ لہجے میں کہا۔
”بالفرض اگر میں شرابی اور بدکار بھی ہوں تو اللہ کی شان بڑی عجب ہے کہ اُس نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں
چھ لوگوں کی جان بچا سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری اس خدمتِ خلق کے بدلے میں میرے سارے گناہ معاف
کر دے گا۔“

نوجوان حبشی کی گفتگوں کو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جیسے فصیح البیان محدث و فقیہ کی زبان لگ گئی ہو کر رہ گئی تھی۔

”میں آپؒ پر اعتراض نہیں کر رہا ہوں، بلکہ ایک خاص نکتہ بیان کر رہا ہوں۔“ نوجوان حبشی دوبارہ حضرت خواجہ
حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مخاطب ہوا۔ ”بے شک! پورے عراق و شام میں آپؒ کے زہد و تقویٰ کی شہرت ہے، مگر سچ تو یہ
ہے کہ آپ اللہ کے ایک ڈو بتے ہوئے بندے کو نہ بچا سکے۔“ یہ کہہ کر نوجوان حبشی مڑا اور اپنی والدہ سے کہنے لگا۔
”بس اب چلیے۔ مجھے اور بھی ضروری کام ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے نوجوان حبشی نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔
حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ مضطرب ہو کر آگے بڑھے اور نوجوان حبشی کا ہاتھ پکڑ کر انتہائی رقت آمیز لہجے
میں فرمانے لگے۔ ”اے نوجوان! جس طرح تُو نے حق تعالیٰ کے کرم سے چھ ڈو بتے ہوئے انسانوں کی جان بچائی
ہے، اسی طرح نوح و غرور سے میری جان بھی بچا دے۔“
حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی التجاسن کر نوجوان حبشی سیدھا ہوا اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی
طرف اٹھا کر بڑے پُر سوز لہجے میں دعا کی۔

”اے اللہ! تمام امور خیر تیری ہی طرف سے ہیں۔ اور تُو ہی اپنے بندوں کو ہدایت دینے والا ہے۔ بے شک!
تیری ذات پاک ہے اور ہم ظالموں میں سے ہیں۔ رحمت تیری شان ہے اور غم و درگزر تیری پہچان۔ اپنی اسی شان
کرم کے صدقے میں حسن کو نو بصریت عطا فرما۔“

نوجوان حبشی کی اس دعا کے دوران حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ زار و قطار رو رہے تھے۔ پھر اُن دونوں ماں
بیٹے نے اپنا سارا سامان سمیٹا اور دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بڑی حیرت سے
اُن دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے اُس وقت آپؒ کی زبان مبارک سے یہ کلمات جاری تھے۔
”اے علام الغیوب! اپنے رازوں کو بس تُو ہی جانتا ہے۔ ہماری بدگمانیوں کو معاف فرما۔ ہم بے بصیرت اور کم
نظر لوگ کسی کو نہیں پہچان سکتے کہ کون کس حال میں اور کون کس رنگ میں ہے؟“

ابھی حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ دعا مانگ ہی رہے تھے کہ ایک بار پھر آپؒ کو شدید حیرت سے دوچار ہونا
پڑا۔ دریائے دجلہ کا ساحل دُور تک دیران پڑا تھا اور وہ دونوں ماں بیٹا یکایک کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اب حضرت
خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پر یہ حقیقت ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ دونوں ”رجال الغیب“ میں سے تھے، جنہیں قدرت نے آپؒ
کو خصوصی ہدایت اور چھ افراد کی جان بچانے کے لئے بھیجا تھا۔ ”رجال الغیب“ اُن مردانِ غیب کو کہا جاتا ہے، جو
اللہ کی طرف سے دنیاوی امور کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ یہ جماعت بحکم خدا انسانوں کو آفات سے بچائی بھی
ہے اور انہیں حادثات سے دوچار بھی کرتی ہے۔

”تذکرۃ الاولیاء“ کی روایت کے مطابق اس واقعے کے بعد کسی نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو مسکراتے

ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ ہنسنا تو بہت دور کی بات ہے۔ آپ کے سوز و گداز اور رقت قلبی میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ راہ چلتے ہوئے کسی کتے کو دیکھ کر بھی رونے لگتے اور بے اختیار فرماتے۔ ”حسن! کہیں ایسا نہ ہو کہ تو اس کتے سے بھی کمتر قرار پائے۔“

جب کچھ لوگوں نے آپ کا یہ قول سنا تو ایک دن مجلس وعظ کے دوران کسی شخص نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سوال کر ڈالا۔ ”امام! کتا تو ایک ناپاک جانور ہے۔ پھر آپ اُس حیوان سے اپنا مقابلہ کیوں کرتے ہیں؟“

یہ سوال سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ پھر آپ نے با آواز بلند فرمایا۔ ”اگر مجھے عذاب الہی سے نجات مل گئی تو پھر میں کتے سے بہتر ہوں۔ ورنہ ایک کتا حسن جیسے ہزار گناہ گار انسانوں سے افضل ہے۔“



ایک بار حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس وعظ آراستہ تھی۔ اور اس وقت بصرہ کے بڑے بڑے علماء اور فقہاء آپ کی محفل روحانی میں موجود تھے۔ امام نے حسب روایت پہلے اللہ کی کبریائی بیان کی، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر درود و سلام بھیجا۔ اس کے بعد اپنا وعظ اس طرح شروع کیا۔

”صاحبان نظر! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کتے میں دس خصلتیں ایسی ہیں، جو بہت کم انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ایسا انسان جو ان خصلتوں سے یکسر عاری ہے۔ اُس آدم زاد سے ایک کتا ہزار درجہ بہتر ہے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی دلوں میں اُتر جانے والی آواز سن کر پوری مجلس پر اس قدر گہرا سناٹا طاری ہو گیا کہ کچھ لوگوں کو اپنے دلوں کی دھڑکنیں تک سنائی دینے لگیں۔ آج حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کا موضوع اور انداز ہی کچھ اور تھا۔ پھر آپ نے کتے کی اُن دس خصلتوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

”لوگو! تم جس حیوان کو ناپاک سمجھ کر اُس سے دُور دُور رہتے ہو، اُس کی پہلی خصلت یہ ہے کہ وہ بھوکا رہتا ہے اور یہ ”صالحین“ کی علامت ہے۔ کتے کی دوسری خصلت یہ ہے کہ اُس کا کوئی ذاتی مکان نہیں ہوتا اور یہ ”موتوکلین“ کی علامت ہے۔ تیسری خصلت یہ ہے کہ وہ رات کو بہت کم سوتا ہے اور یہ علامت شب زندہ دار لوگوں کی یعنی ”محبتین“ کی ہے۔ کتے کی چوتھی خصلت یہ ہے کہ اُس کی کوئی جائیداد نہیں ہوتی اور وہ اپنے بعد کوئی میراث نہیں چھوڑتا۔ یہ صفت ”زاہدین“ کی ہے۔ پانچویں خصلت یہ ہے کہ کتا اپنے مالک سے کبھی بے وفائی نہیں کرتا۔ خواہ وہ کتنا ہی رنجیدہ ہو اور مالک اُسے کتنا ہی مارے۔ یہ علامت ”صادقین“ کی ہے۔ اُس کی چھٹی خصلت یہ ہے کہ وہ سب سے ادنیٰ جگہ پر بیٹھتا ہے اور یہ صفت ”متواضعین“ کی ہے۔ کتے کی ساتویں خصلت یہ ہے کہ جب اُس کے سونے کی جگہ چھن جاتی ہے تو وہ خاموشی سے دوسری جگہ چلا جاتا ہے اور یہ علامت ”راضیین“ (ہر حال میں راضی رہنے والوں) کی ہے۔ آٹھویں خصلت یہ ہے کہ اُسے مارنے یا جھڑکنے کے بعد پیار کریں یا اُس کے سامنے زوٹی کا ٹکڑا ڈال دیں تو وہ سب کچھ بھول کر زوم ہلانے لگتا ہے اور یہ علامت ”خاشعین“ (عاجزی اور گریہ کرنے والوں) کی ہے۔ کتے کی نویں خصلت یہ ہے کہ جب اُس کا مالک کھانا کھا رہا ہوتا ہے تو وہ دُور بیٹھ کر چپ چاپ دیکھتا رہتا ہے اور یہ صفت ”ساکین“ کی ہے۔ اور اُس کی دسویں خصلت یہ ہے کہ جب وہ کسی جگہ کو چھوڑ دیتا ہے تو پھر بھی اُس کا خیال نہیں کرتا اور یہ نشانی ”مجردین“ کی ہے۔



حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے مشاہدے کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے سبق حاصل کرتے اور پھر خود اُس پر عمل پیرا ہوتے۔

ایک دن آپ نے اپنی مجلس وعظ میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”لوگو! میرے نزدیک ایک بکری، انسان سے زیادہ ہوشیار اور فرمانبردار ہے۔ چرواہے کی ایک آواز سن کر وہ گھاس چرنا چھوڑ دیتی ہے اور گھر واپس جانے کے لئے بھاگتی ہوئی آکر دوسری بکریوں کے ساتھ ریوڑ میں مل جاتی ہے۔ مگر افسوس، انسان کیسا بے خبر اور ظالم ہے؟ اُس کی ہدایت کے لئے کتنے انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے، کتنی کتابیں نازل کی گئیں اور کتنے صحیفے اُتارے گئے..... مگر انسان اپنی خواہشات کا اتنا بڑا غلام ہے کہ آقائے کائنات کا بار بار حکم سن کر بھی معصیت کاری سے باز نہیں آتا۔“

ایک بار مجلس وعظ میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے کسی معتقد نے آپ سے سوال کیا۔ ”امام! براہ کرم ہمیں بتائیے کہ معرفت میں آپ کا کیا مقام ہے؟“

یہ سنتے ہی حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یکایک بہت زیادہ رنجیدہ نظر آنے لگے۔ پھر آپ نے انتہائی افسردہ لہجے میں فرمایا۔

”مجھ سے میرے مقام کے بارے میں سوال مت کرو۔ یہ پوچھو کہ میرا حال کیا ہے؟“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا وہ عقیدت مند خود بھی ایک عالم و فاضل شخص تھا۔ دوبارہ اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور آپ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کرنے لگا۔

”تو پھر اپنا حال ہی بتا دیجئے کہ حال ہی انسان کا مقام ہوتا ہے۔“

”تو پھر اے عزیز! میرا حال سنو۔“ یہ کہتے کہتے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پر رقت طاری ہو گئی۔ ”میں بد نصیب مسافر ہوں کہ جسے ایک طویل سفر درپیش ہے۔ جو کنارے پر کھڑا ہے اور جس نے اپنی کشتی اپنے ہی ہاتھوں پر باد کر دی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ وہ مسافر کس طرح دریا پار کرے؟“

ایک دن حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کسی خادم سے فرمایا۔ ”آج دل چاہتا ہے کہ بازار کی فیرا روٹی اور تلی ہوئی مچھلی سے روزہ افطار کیا جائے۔“ ممنوعہ ایام کے علاوہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ روزہ سے رہا کرتے تھے۔

آپ کا حکم سنتے ہی خادم فوری طور پر بازار چلا گیا۔ پھر جب اُس نے افطار کے وقت بازار سے لائی ہوئی لذیذ مچھلی اور روٹی حضرت شیخ کے سامنے رکھی تو آپ نے نہایت تعجب کے ساتھ خادم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”یہ تم کیا اٹھا لائے؟ بھلا ایک درویش کو ان لذیذ غذاؤں سے کیا کام؟“

یہ سنتے ہی حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا خادم پریشان نظر آنے لگا اور اُس نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

”شیخ! آپ ہی نے تو بازار سے ان چیزوں کے لانے کا حکم دیا تھا۔“

خادم کے جواب نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو شدید حیرت میں مبتلا کر دیا۔ پھر آپ نے انتہائی افسردہ لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا میں نے تمہیں یہ چیزیں لانے کا حکم دیا تھا؟“

خادم نے بھی اسی حیرت زدہ مگر پر زور لہجے میں عرض کیا۔ ”امام! میں آپ کے حکم کے خلاف اپنی مرضی۔“

کس طرح یہ کام انجام دے سکتا تھا؟“

دوسری بار بھی خادم کا یہی جواب سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور

کے ساتھ ہی آپؐ کے چہرہ مبارک پر اذیت و کرب کے آثار بھی نظر آنے لگے۔
 ”تم سچ کہہ رہے ہو کہ میں نے ہی تمہیں یہ چیزیں لانے کا حکم دیا تھا؟“ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اپنے سوال کو دہرایا۔

خادم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ بار بار ایک ہی سوال کیوں کر رہے ہیں۔
 ”شیخ! مجھے ایک معمولی سی بات کے لئے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”میرے عزیز! تم سچ کہتے ہو۔ تمہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے ہی نفس نے مجھے فریب دیا ہے۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے ایک زور کی چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔

یہ منظر دیکھ کر خادم سخت پریشان ہوا اور حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتا رہا۔ مگر آپؐ بہت دیر تک اسی طرح بے سدھ پڑے رہے۔ پھر جب ہوش آیا تو خادم کو حکم دیا۔ ”میرا وہی سامان افطار لے کر آؤ۔“ حضرت خواجہ حسن بصریؒ اکثر جو کی روٹی اور نمک کے پانی سے روزہ افطار کیا کرتے تھے۔ اگر کبھی کوئی عزیز یا دوست دعوت کرتا تو میزبان کا دل رکھنے کے لئے تھوڑا سا گوشت اور حلوہ بھی کھا لیا کرتے تھے۔ مگر اپنے گھر میں آپؐ کی غذا بہت ہی سادہ تھی۔ پھر جب خادم، جو کی روٹی اور نمک کا پانی لے کر آیا تو آپؐ نے اسی ذوق و شوق کے ساتھ روزہ افطار کیا۔

پھر جب عشاء کی نماز کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور خانقاہ کے خادم گہری نیند سو گئے تو حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اپنا حجرہ بند کر لیا اور فجر کی اذان تک سجدے کی حالت میں گریہ و زاری کرتے رہے۔

”یا ارحم الراحمین! اپنی بے پناہ اور بے مثال رحمت کے صدقے میں میرے نفس کی سرکشی کو معاف فرما دے۔ تُو ایسا عطا کرنے والا ہے کہ تیرے در سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ میں بھی تیری اسی بخشش و عطا پر یقین رکھتا ہوں کہ تُو اپنے عاجز بندے حسن کو درویشوں کی فہرست سے خارج نہ کرنا۔“

پھر حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اپنے نفس کو لذت طلب کرنے پر سخت سزا دی اور مسلسل چالیس دن تک روزے رکھے۔ یہاں تک کہ ایک رات حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے خواب میں یہ صدائے غیبی سنی۔

”حسن! تجھے خوشخبری ہو کہ تیرا نام درویشوں کی فہرست میں بلند مقام پر ہے۔ مگر اپنی یہ گریہ و زاری نہ چھوڑنا کہ ہمیں تیرے آنسو اور دل شکستگی کے یہ انداز بہت پسند ہیں۔ درویشوں کی اسی ادائے خاص کو علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں نہایت دلکشی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

تُو بجا بجا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

بالآخر اسی شدید ریاضت و عبادت، عجز و انکسار اور گریہ نیم شبی نے حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو ولایت کے درجہ عظیم پر فائز کیا اور آپؐ کی ذات سے کشف و کرامات کا اظہار ہونے لگا۔



حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے پڑوس میں شمعون نامی ایک آتش پرست رہتا تھا۔ آپؐ اکثر اُس کے پاس جاتے اور اسے قبول اسلام کی تلقین فرماتے۔ مگر شمعون ہر بار آپؐ سے ایک ہی سوال کرتا۔
 ”حسن! آپؐ مجھے اپنا مذہب اختیار کرنے کی دعوت کیوں دیتے ہیں؟ حالانکہ میں بھی اس کے جواب میں کہہ

سکتا ہوں کہ آپ اپنا مذہب اسلام ترک کر کے آگ کی پرستش شروع کر دیں۔“

شمعون کی بات سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نہایت نرم و شیریں لہجے میں فرماتے۔ ”سب سے پہلی بات یہ کہ اسلام نے پڑوسی کے بہت سے حقوق مقرر کئے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ بھوکا ہے تو دوسرے شخص کے لئے کھانا حرام ہو جاتا ہے۔ میں اسی حق کو ادا کرتے ہوئے تمہیں اس آگ سے بچانا چاہتا ہوں، جو انسانی اندازوں سے کہیں زیادہ دردناک عذاب دینے والی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی بے خبری کے سبب بتابی کے راستے کی طرف جا رہا ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسے پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کرے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل سن کر وہ ہنسنے لگتا اور نہایت استہزاء سے انداز میں کہتا۔ ”میری یہ ساری ریاضت اسی لئے ہے کہ آگ مجھ سے راضی ہو جائے اور مرنے کے بعد میرے جسم کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے شمعوں کو قائل کرنے کے لئے انتہائی طاقتور دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”وہ آگ تجھے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے، جسے تو خود اپنے ہاتھ سے روشن کرتا ہے۔ اور اگر تو اسے بجھانا چاہے تو پانی کے چند لوٹے تیرے اس چھوٹے سے آتش کدے کو چند لمحوں کے اندر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیں گے۔“

مگر جب قرآن حکیم کے الفاظ میں انسانی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے جائیں اور ان کے دلوں پر قفل لگا دیئے جائیں تو پھر اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ یہی حال ان بت پرستوں کا بھی ہے، جو اپنے ہاتھوں سے بت تراشتے ہیں اور ان پتھروں کے مجسموں کو کارسازِ عالم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ اتنے بے دست و پا اور مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے سروں پر بیٹھنے والی کھیوں اور پرندوں کو بھی نہیں اڑا سکتے۔ اور اگر ان کے پجاری ہتھوڑا لے کر اپنے معبودوں کو توڑنا چاہیں تو وہ بت اپنا دفاع تک نہ کر سکیں اور ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں۔ یہی حال آتش پرست شمعوں کا بھی تھا۔ جب اُس سے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کا جواب نہ بن پڑا تو وہ شدید بیزارگی کے انداز میں آپ کو جھڑک دیتا۔

”مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا کہ کون صحیح راستے پر ہے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، شمعوں کے اس جارحانہ اور تحقیر آمیز طرزِ عمل پر مسکراتے لگتے اور پھر یہ کہتے ہوئے تشریف لے جاتے۔ ”تم کچھ بھی کہو، مگر میں اپنے پڑوسی کو مصیبت میں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔“

پھر اسی طرح دن گزرتے رہے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ حسبِ معمول شمعوں کو آتش پرستی ترک کر کے خدائے واحد کا کلمہ پڑھنے کی تلقین کرتے رہتے، مگر وہ آگ کا پجاری اپنی ضد پر قائم رہتا۔ آخر ایک دن حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پڑوسی کو مناظرے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا۔

”مجھے بتاؤ کہ تم کب سے اس آگ کی پرستش کر رہے ہو؟“

شمعون نے انتہائی خفیہ لہجے میں جواب دیا۔ ”اس وقت میری عمر 70 سال ہے۔ چونکہ میرے باپ دادا بھی آگ کے پجاری تھے، اس لئے میری عبادت کی عمر بھی 70 سال ہے۔“

شمعون کا جواب سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں فرمایا۔

”میں نے حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہیں کی۔ آج ہم دونوں اپنے اپنے

معبودوں کو پکارتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس کا معبود، کس کی مدد کو آتا ہے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر شمعوں کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وہ آپ کی

گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس چھوٹے سے آتش کدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو شمعوں کے گھر کے ایک گوشے میں روشن تھا۔

”میں تیرے اس خدا کے وجود اور حقیقت سے انکار کرتا ہوں۔ اگر تیرا یہ معبود سچا ہے تو مجھے میرے انکار کی سزا دے۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا دست مبارک بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔

یہ منظر دیکھ کر چند لکھوں کے لئے شمعوں کے چہرے پر خوف کے سائے لرزنے لگے۔ اسے یقین تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں آگ کے شعلے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کو بھون ڈالیں گے۔ مگر جب وہ بھڑکتے ہوئے شعلے ایک مرد مومن کے ہاتھ کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکے تو آتش پرست شمعوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ جمال کی حالت میں رہتے تھے۔ مگر اس روز آپ کا رنگ جلال اس قدر شدید تھا کہ دلکش چہرہ آگ ہی کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ پھر آپ نے اپنے پڑوسی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تُو دیکھ رہا ہے کہ میرا نرم و نازک ہاتھ کتنی دیر سے شعلوں کی لپیٹ میں ہے۔ کیا یہ آگ میرا ایک بال بھی جلا سکتی؟“ شمعوں نے اسی سکتے کی حالت میں اپنے سر کو نشی میں جنبش دی۔ فرط حیرت و استعجاب سے اُس کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تُو خوب جانتا ہے کہ میں تیرے خدا کے وجود کا منکر ہوں۔ تو پھر اپنے خدا سے التجا کر کہ وہ ایک منکر کے ہاتھ کو جلا ڈالے۔“ آتش پرست، حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ بظاہر ایسا نظر آ رہا تھا کہ جیسے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر اُس کی قوت گویائی ہی سلب ہو گئی ہے۔

پھر جب حجت تمام ہو چکی تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا۔ شمعوں نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ امام کا ہاتھ جلنا تو درکنار، اس پر دھوئیں کا بھی ہلکا سا ٹکس تک نہیں تھا۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پڑوسی کو حیرت میں گم پا کر اسی پُر جلال لہجے میں فرمایا۔

”اب اپنا ہاتھ اس آگ میں ڈال کہ تُو 70 سال سے جس کی پرستش کر رہا ہے۔ پھر میں دیکھوں کہ تیرا خدا تیرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر شمعوں کے حیرت و سکوت کی تمام کیفیت زائل ہو گئی اور اس کے چہرے پر وحشت و خوف کا رنگ نمایاں نظر آنے لگا۔

”میں اس آگ کو نہیں چھو سکتا کہ یہ مجھ کو جلا ڈالے گی۔“

یہ ایک حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی حالتِ جلالِ عائب ہو گئی اور آپ نے اپنے روایتی تبسم اور شیریں لہجے کے ساتھ شمعوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”میرے بھائی! اسی لئے تو میں تم سے قبولِ اسلام کی درخواست کر رہا ہوں۔ اگر تم کلمہ طیبہ پڑھ لو تو مجھے اپنے خدائے واحد کی رحمت پر یقین کامل ہے کہ یہ آگ تمہیں بھی کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔“

آتش پرست نے اپنی کھلی آنکھوں سے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ زندہ کرامت دیکھی تھی اور مذہبِ اسلام کی حقانیت کا قائل ہو گیا تھا۔ مگر قبولِ اسلام کے سلسلے میں اُس کی خاندانی روایت اڑے آئی۔ شمعوں نے انتہائی شکستہ لہجے میں کہا۔

”خُش! تمہارا قول بجا ہے۔ مگر میرا دل مجھے ایسا کرنے سے روک رہا ہے۔“
 آتش پرست کا جواب سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حسبِ عادت مسکراتے ہوئے فرمایا۔
 ”آخر تمہارا دل تم سے کیا کہتا ہے؟“

شمعون نے کسی قدر اُداس لہجے میں اپنے چھوٹے سے آتش کدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔
 ”یہ آگ کے شعلے بار بار مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تُو 70 سال تک ہمارے ساتھ رہا، اب ہمیں اچانک چھوڑ کر
 کس راستے پر جا رہا ہے؟ اسی طرح میں اپنے باپ دادا کی آوازیں سن رہا ہوں۔ وہ مجھ سے بار بار یہی کہہ رہے
 ہیں۔ ”شمعون! موت کے خوف سے اپنے بزرگوں کی روش چھوڑ رہا ہے۔ یہ تو انتہائی بزدلی کی علامت ہے۔“
 حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر جاتے جاتے یہ بھی فرماتے گئے۔ ”تم اپنے
 بزرگوں کی روش چھوڑ دو یا نہ چھوڑو۔ مگر ہم کسی بھی حال میں اپنے پڑوسی کو نہیں چھوڑیں گے۔“
 پھر اسی طرح کچھ دن اور گزر گئے۔ آخر وقت معلوم آچینچا۔ ایک دن کسی خادم نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ
 سے عرض کیا۔

”آپ کا پڑوسی شدید اذیت و کرب میں مبتلا ہے۔ شاید اُس کی موت قریب آگئی ہے۔“
 اُس وقت حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس وعظ آراستہ تھی اور آپ ایک خاص موضوع پر تقریر فرما رہے
 تھے۔ خادم کی بات سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ انتہائی اضطراب کے عالم میں مسند سے اٹھ کھڑے ہوئے اور
 حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”انشاء اللہ، اس موضوع پر کل گفتگو ہوگی۔ ہم اس وقت اپنے پڑوسی کی عیادت کو جا رہے ہیں۔“
 پھر جب حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ شمعون کے گھر پہنچے تو اُس پر زرع کی سی کیفیت طاری تھی۔ آتش پرست
 کا چہرہ اس قدر سیاہ ہو گیا تھا کہ جیسے اُسے آگ نے جلا ڈالا ہو۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے شمعون کے قریب
 جا کر نہایت جذب و سوز کے عالم میں فرمایا۔

”میرے عزیز! بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ تمہاری سانسیں شمار کی جا چکی ہیں۔ مگر ابھی تھوڑا سا وقت باقی بچا ہے۔
 اس مختصر ترین فرصت و مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خدائے واحد پر ایمان لے آؤ۔ آگ کے انکار کے ساتھ
 زندگی بھر کے گناہوں سے توبہ کر لو۔“

”حسن! یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص جس نے تمام زندگی اپنے آقا کی نافرمانی کی ہو، وہ صرف زبان سے دو
 لفظ ادا کرنے پر معاف کر دیا جائے۔ میری عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔“ شمعون پر سکرات کی حالت طاری تھی، اس
 لئے اُسے بولنے میں شدید دشواری پیش آرہی تھی۔

’میرے عزیز! تمہاری عقل ایک دڑے کے برابر ہے۔ اور اس کائنات کے مالک کا کرم کائنات کی وسعتوں
 سے بھی زیادہ لاحدود ہے۔ اس لئے اپنی عقل کو استعمال کرنے کے بجائے بخشش و نجات کا معاملہ آقا کے رحم و کرم پر
 چھوڑ دو۔“ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نہایت دردمندانہ لہجے میں اپنے پڑوسی کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔
 آخر کچھ دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد شمعون نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اسلام
 لانے کے لئے ایک عجیب شرط پیش کر دی۔

”اگر تم اللہ کے نام ایک خط تحریر کر دو تو میں ایمان لے آؤں گا۔“

”کیسا خط؟“ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے چونک کر اپنے پڑوسی سے پوچھا۔

”اللہ کے نام ایک سفارش نامہ لکھ دو کہ اس شخص کو معاف کر دیا جائے کہ جس نے زندگی بھر آگ کو اپنا معبود سمجھ کر اس کی عبادت کی ہے۔“ شمعون نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً آتش پرست کے نوکروں سے کاغذ اور قلم لانے کے لئے کہا۔ پھر آپ نے کاغذ پر یہ مختصر تحریر لکھ دی۔

”الہ العالمین! میں آپ کی قدرت اور رحمت پر یقین کامل رکھتا ہوں۔ میرے پڑوسی کے سارے گناہ معاف فرما دیجئے کہ آپ کے سوا کوئی مشکل کشا اور مددگار نہیں۔“

یہ لکھ کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے وہ کاغذ آتش پرست کے ہاتھ میں دے دیا۔

شمعون نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا سفارش نامہ لے کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور زار و قطار روتے ہوئے بولا۔ ”حسن! بے شک تم اپنے قول کے سچے اور وعدے کے کئے ہو۔ تم نے اپنے پڑوسی کو مصیبت کے وقت تنہا نہیں چھوڑا۔ حالانکہ میں نے زندگی بھر تمہارے ساتھ بڑا حقیر آمیز سلوک کیا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

”اگر تمہیں معاف نہ کرتا تو تمہارے گھر آتا ہی کیوں؟“ شمعون کی بات سن کر حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

اس کے بعد اس آتش پرست نے آگ پر لعنت بھیجی اور تین بار با آواز بلند کلمہ شہادت پڑھا اور ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے بولا۔

”اے اللہ! میں تجھے بالکل نہیں جانتا۔ مگر میرا پڑوسی حسن کہتا ہے کہ تو تمام انسانوں کے قیاس و گمان سے بھی کہیں زیادہ رحیم و کریم ہے۔ میں نے اسے بار بار آزمایا ہے، مگر حسن نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس لئے میں تجھے رحیم و کریم مانتا ہوں۔ بس مجھے معاف فرما دے کہ میرے پاس معافی مانگنے کا وقت بھی نہیں ہے اور مجھے الفاظ بھی نہیں ملتے۔“

شمعون کا یہ انداز دیکھ کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پر بھی شدید رقت طاری ہو گئی۔

اس کے بعد شمعون نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

”حسن! میں نہیں جانتا کہ کب میری سانس رُک جائے۔ اس لئے میں ابھی وصیت کرتا ہوں کہ مرنے کے بعد تم ہی مجھے غسل دینا۔ پھر قبر میں اتار کر اپنا یہ سفارش نامہ میرے سینے پر رکھ دینا۔“

پھر اسی رات پچھلے پہر شمعون کا انتقال ہو گیا۔ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پڑوسی کی وصیت کے مطابق اسے غسل دیا اور خود ہی نماز جنازہ پڑھائی۔ کیونکہ ان سارے انتظامات میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پیش پیش تھے۔ اس لئے بصرہ کے ہزاروں اہل ایمان نے شمعون کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ پھر آپ نے اپنے پڑوسی کو قبر میں اتارا اور وہ سفارش نامہ شمعون کے سینے پر رکھ دیا، جو آپ نے اللہ تعالیٰ کے نام تحریر کیا تھا۔

تدفین کے بعد خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اپنی خانقاہ تشریف لے آئے۔ مگر ایک خیال آپ کو مسلسل پریشان کرتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ساری رات اسی غلش میں مبتلا رہے اور ایک لمحے کے لئے بھی نہ سو سکے۔ بار بار اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے تھے۔

”اے حسن! یہ تم نے کیا کیا؟ تجھے اپنے آپ پر تو قابو نہیں اور تو حق تعالیٰ کے کاموں میں مداخلت کرنے چلا ہے۔ آخر تیری کیا حیثیت ہے جو وہ تجھ جیسے ناکارہ انسان کی سفارش سنے گا۔“

یہ سوچ سوچ کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پر وحشت طاری ہو گئی۔ پھر اسی وحشت نے رقت کا رنگ اختیار

کر لیا تھا اور آپؐ سجدہ ریز ہو کر رات بھر یہ دُعا مانگتے رہے۔

”اے اللہ! تُو عظیم و جبار ہے۔ حسن کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ تیرے ایک بندے کو تیری طرف بلانے کے لئے ایک جھوٹی تحریر لکھ کر دیدے۔“

دوسرے روز بھی سارا دن حضرت خواجہ حسن بصریؒ اپنے حجرے میں پڑے ہوئے روتے رہے۔ لوگ حسب معمول وعظ سننے کے لئے مجلس میں جمع ہوئے۔ آپؒ نے اپنے خادم کو بلا کر فرمایا۔ ”میری طرف سے معذت کر لو۔ آج طبیعت بہت زیادہ خراب ہے، اس لئے وعظ نہیں کہہ سکوں گا۔“

پھر حضرت امام حسن بصریؒ نے تمام نمازیں اپنے حجرے ہی میں ادا کیں اور گریہ و زاری کے ساتھ مسلسل توبہ و استغفار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر تھوڑی دیر کے لئے آپؒ کی آنکھ لگ گئی۔ پھر حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے خواب میں ایک عجیب منظر دیکھا۔

آپؒ کے پڑوسی شمعون کے سر پر تاج زر نگار ہے۔ اور وہ خلعتِ فاخرہ پہنے ہوئے بہشت کے ایک باغ میں محو خرام ہے۔ اس کا چہرہ، جو مرنے سے پہلے سیاہ ہو گیا تھا، نہایت روشن ہے اور فرط مسرت سے دمک رہا ہے۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اسے مخاطب کر کے پوچھا۔

”شمعون! تمہارا کیا حال ہے؟“

”حسن! کیا تمہیں میری ظاہری حالت سے اندازہ نہیں ہو رہا ہے کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں؟“

”وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ مگر تم اس مقام تک کیسے پہنچے؟“ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اپنے پڑوسی سے سوال کیا۔

”میرا حقیقی مقام تو دوزخ ہی تھا، مگر مجھے اس لئے معاف کر دیا گیا کہ میں دنیا سے آپؐ کا سفارش نامہ لے کر آیا تھا۔ واقعی، آپؐ نے ایک پڑوسی کا حق ادا کر دیا۔ اب آپؐ پر کوئی بار نہیں رہا۔ اس لئے اپنا سفارش نامہ واپس لے لیجئے۔“ یہ کہہ کر شمعون نے ایک کاغذ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی طرف بڑھا دیا۔ آپؒ نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

اس کے ساتھ ہی حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی آنکھ کھل گئی اور آپؐ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ جو سفارش نامہ آپؐ نے شمعون کی قبر میں رکھا تھا، وہ اس وقت آپؐ کے ہاتھ میں موجود تھا۔

یہ حیران کن منظر دیکھ کر حضرت خواجہ حسن بصریؒ فوراً سجدہ ریز ہو گئے پھر رورود کر عرض کرنے لگے۔
”آج مجھے یقین آ گیا کہ جب تُو 70 سال تک آگ کی پرستش کرنے والے کو ایک بار کلمہ طیبہ پڑھنے پر معاف کر سکتا ہے تو پھر اسے اپنے فضل و کرم سے کس طرح محروم رکھے گا جو تجھے 70 سال سے مسلسل پکار رہا ہے۔“



بصرہ کے مشہور قاری ابو عمروؒ اپنے مکتب میں لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ بعض روایتوں میں درج ہے کہ ابو عمروؒ فنِ قرأت میں امام کا درجہ رکھتے تھے۔ اسی لئے دُور دراز کے مقامات سے بڑے بڑے علماء بھی آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تاکہ قرأت کے اسرار و رموز سے واقف ہو سکیں۔

ایک دن ابو عمروؒ کا مدرسہ شاگردوں سے بھرا ہوا تھا اور آپؒ درس دے رہے تھے کہ اچانک سولہ سترہ سال کا ایک حسین و جمیل لڑکا آپؒ کے مکتب میں داخل ہوا۔ جیسے ہی ابو عمروؒ کی نظر لڑکے کے چہرے پر پڑی، بس دیکھتے ہی وہ

گئے۔ آپؐ نے آج تک ایسے دلکش نقش و نگار رکھنے والا انسان نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو۔ ابو عمروؓ اس لڑکے کو اتنی محویت کے عالم میں دیکھ رہے تھے کہ اُن کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔ پھر جب ابو عمروؓ کے دوسرے شاگردوں نے استاد کا استغراق دیکھا تو ان کی نظریں بھی اس نوخیز اور بے پناہ حُسن رکھنے والے لڑکے کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

درس گاہ میں موجود تمام لوگ ایک عجیب صورت حال سے دوچار تھے۔ پھر وہ لڑکا آہستہ آہستہ چلتا ہوا ابو عمروؓ کے قریب آیا اور نہایت شیریں لہجے میں کہنے لگا۔

”میں نے آپؐ کی قرأت کی بہت شہرت سنی ہے۔ کیا آپ مجھے قرآن حکیم کی تعلیم دے سکیں گے؟“
ابو عمروؓ کی محویت کا وہی عالم تھا، جیسے آپؐ نے لڑکے کی بات سنی ہی نہ ہو، بس اُس کا چہرہ دیکھے جا رہے تھے۔
اجنبی لڑکے نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔ ”میں آپؐ سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے شاگردی کا اعزاز بخشیں گے؟“

جب دوسری بار اجنبی لڑکا، ابو عمروؓ سے کسی قدر بلند آواز میں مخاطب ہوا تو آپؐ کی محویت اور سکوت کی کیفیت ختم ہوئی اور بڑی وارفتگی کے لہجے میں کہنے لگے۔
”یقیناً میں تمہیں اپنا شاگرد بناؤں گا اور قدرت کی طرف سے مجھے جس قدر علم بخشا گیا ہے، وہ سب تمہیں سکھا دوں گا۔“

ابو عمروؓ کا یہ طرزِ مخاطب دیکھ کر حاضرین کو شدید حیرت ہوئی۔ آپؐ نے آج تک اپنے کسی شاگرد سے اس قدر والہانہ لہجے میں گفتگو نہیں کی تھی۔

”تو پھر میں کل آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔“ اجنبی لڑکے نے نہایت شائستہ لہجے میں عرض کیا۔
”کچھ دیر بیٹھو۔ یہاں میرے قریب آؤ۔“ ابو عمروؓ نے اس لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو حاضرین مکتب کی پچھلی قطار میں بڑے ادب کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ابو عمروؓ نے اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے ایک شاگرد سے کہا۔

”تم ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور ہمارے نئے شاگرد کو بیٹھنے کے لئے جگہ دو۔“
استاد گرامی کا حکم سن کر پرانے شاگرد نے دل میں ناگواری کا احساس کیا کہ ایک نئے لڑکے کی اس قدر آؤ بھگت کی جا رہی ہے اور میری طویل خدمات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ ابو عمروؓ نے جس شاگرد کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا تھا، وہ خود بھی بصرہ کا ایک عالم و فاضل شخص تھا۔ بہر حال وہ استاد گرامی کے حکم پر عمل کرتے ہوئے جبر داکراہ کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔

ابو عمروؓ دوبارہ اس لڑکے سے مخاطب ہوئے۔ ”میرے قریب آؤ۔“
”شیخ محترم! اس وقت میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ کل آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔“ اجنبی لڑکے نے جواب دیا اور بے نیازانہ چلتا ہوا در سے سے نکل گیا۔

لڑکے کے جاتے ہی حاضرین مکتب نے شیخ ابو عمروؓ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آپؐ بہت زیادہ اُداس نظر آنے لگے تھے۔

اس اجنبی لڑکے کے جاتے ہی شیخ ابو عمروؓ نے اپنا درس بھی ختم کر دیا اور اٹھ کر اپنے حجرے میں چلے گئے۔ جاتے وقت آپؐ نے طبیعت کی ناسازی کا عذر پیش کیا تھا۔

شیخ ابو عمروؓ کے جاتے ہی نوجوان شاگرد آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ کچھ یہی حال بالغ نظر اور پختہ شاگردوں کا بھی تھا۔ اُن کی آنکھوں میں بھی کئی سوال نمایاں تھے مگر زبانیں خاموش تھیں۔

شیخ ابو عمروؓ اس اجنبی اور حسین و جمیل لڑکے کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اگرچہ آپؓ کی نیت میں کوئی فحش واقع نہیں ہوا تھا، لیکن دل کی حالت دگرگوں ہو گئی تھی۔ آپؓ کی آنکھوں کے سامنے بار بار اُسی اجنبی لڑکے کا دلکش چہرہ اُبھر آتا اور آپؓ سرد آہ کھینچتے ہوئے خود کو مخاطب کر کے کہتے۔

”ابو عمرو! یہ ایک دن کیسے گزرے گا؟ تُو نے اُس کے گھر کا پتہ ہی پوچھ لیا ہوتا کہ خود اس کے پاس چلا جاتا اور اپنی مضطرب آنکھوں کو سکون پہنچا لیتا۔“

شیخ ابو عمروؓ کی عجیب حالت تھی۔ آپؓ نے اپنی ساری نمازیں بھی اسی اضطرابی کیفیت میں ادا کیں۔ عبادت کے دوران بھی اس اجنبی لڑکے کا چہرہ آپؓ کی آنکھوں کے سامنے اُبھر آتا تھا۔ شیخ ابو عمروؓ کی رات بھی اسی بے چینی کے عالم میں جاگتے ہوئے گزری۔ آپؓ ایک لمحے کے لئے بھی نہ سو سکے۔

• پھر نماز فجر ادا کرنے کے بعد شیخ ابو عمروؓ وقت سے پہلے ہی اپنی درس گاہ میں پہنچ گئے اور اجنبی لڑکے کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ پھر حسب معمول دوسرے شاگردوں نے باری باری آنا شروع کر دیا۔ شیخ ابو عمروؓ کی بے چینی کا وہی عالم تھا۔ آپؓ کی نظریں مستقل دروازے پر مرکوز تھیں۔ آنے والے شاگرد استاد گرامی کو سلام کر کے اپنی اپنی نشست پر بیٹھتے رہے، مگر شیخ ابو عمروؓ کا یہ عالم تھا کہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھے اور آنے والے کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی شاگرد کے سلام کا جواب تک نہیں دیا کہ آپؓ کو اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ پابندی کے ساتھ آنے والے تمام شاگرد مکتب میں جمع ہو گئے تھے اور درس شروع ہونے کے منتظر تھے۔ لیکن شیخ ابو عمروؓ اُسی محویت کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر تک تمام شاگرد درس شروع ہونے کا انتظار کرتے رہے، مگر جب شیخ ابو عمروؓ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تو آپؓ کے ممتاز اور عالم و فاضل شاگرد نے اپنی نشست پر کھڑے ہو کر نہایت ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔

”شیخ محترم! تمام طلباء حاضر ہو چکے ہیں۔ اب کوئی آنے والا نہیں رہا۔“

اپنے شاگرد کی بات سن کر شیخ ابو عمروؓ اس طرح چوکے جیسے آپؓ کو اچانک گہری نیند سے بیدار کر دیا گیا ہو۔ شیخ ابو عمروؓ کے چہرے سے کسی قدر ندامت کا رنگ نمایاں تھا۔ پھر آپؓ نے اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”بسم اللہ! کل ہم نے کہاں تک قرآن کریم کی تلاوت کی سعادت حاصل کی تھی؟“

جواباً ایک شاگرد کھڑا ہوا اور اُس نے بڑی خوش الحانی کے ساتھ ان آیات مقدسہ کی تلاوت کی، جو گزشتہ روز کے درس میں پڑھی گئی تھیں۔

آگے کی آیات شیخ ابو عمروؓ کو پڑھنی تھیں۔ تاکہ شاگردین قرأت کے اسرار و رموز سے باخبر ہو سکیں۔ شیخ ابو عمروؓ نے قرأت سے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم..... اور پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی۔ مکتب کے درو دیوار اور شاگردوں پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ خوش الحانی میں دُور دُور تک آپؓ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اور ان دو آیات کی تلاوت کے بعد شیخ ابو عمروؓ خاموش ہو گئے۔ تمام شاگرد آنکھیں بند کئے دوزانو بیٹھے تھے۔

پھر جب کچھ دیر تک مکتب میں سناٹا چھایا رہا اور ابو عمروؓ کی آواز نہیں اُبھری تو شاگردوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ استاد گرامی بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ شیخ ابو عمروؓ کی آنکھوں سے وحشت کا رنگ نمایاں تھا اور پورا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ شاگرد یہ صورت حال دیکھ کر ٹھہرا گئے اور استاد کی مزاج پرسی کرنے لگے۔

”شیخ! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ مکتب میں بیک وقت کئی شاگردوں کی آوازیں ابھریں۔
 ”ہاں! میں مزید تلاوت نہیں کر سکتا۔“ شیخ ابو عمروؒ کی آواز لرز رہی تھی۔

”تو پھر آپ آرام فرمائیں۔“ ایک شاگرد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم کسی طبیب کو لے کر آتے ہیں۔“
 شیخ ابو عمروؒ اُسی وحشت و اضطراب کے عالم میں مند سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”مجھے کسی طبیب کی ضرورت
 نہیں۔ انشاء اللہ! تھوڑی دیر میں طبیعت سنبھل جائے گی۔ کل مقررہ وقت پر درس شروع ہو گا۔ آج میں آپ سب
 حضرات سے معذرت چاہتا ہوں۔“

کچھ شاگردوں نے نگہداشت اور خدمت کے لئے رُکنا چاہا تو شیخ ابو عمروؒ نے انہیں منع کر دیا۔
 ”اب میں اتنا بیمار بھی نہیں ہوں کہ اپنا کام بھی نہ کر سکوں۔ بس، کسی قدر تھکن ہے جو تھوڑا آرام کرنے سے
 جاتی رہے گی۔“

یہ کہہ کر آپ اپنے حجرے میں چلے گئے اور اندر سے دوازہ بند کر لیا۔
 شیخ ابو عمروؒ ایک عظیم قاری ہونے کے ساتھ ساتھ حافظِ قرآن بھی تھے۔ آپ کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ جب
 رمضان المبارک میں قرآن حکیم سناتے تو شاید ہی کسی مقام پر آپ کی زبان لڑکھڑاتی یا کوئی آیت بھول جاتے۔ کمرہ
 بند کرنے کے بعد شیخ ابو عمروؒ نے قرآن کریم کی تلاوت کرنا چاہی، مگر اپنی زبان سے ایک آیت مقدسہ بھی ادا نہ کر
 سکے۔ کیونکہ ”الحمد“ سے لے کر ”ولئیس“ تک پورا قرآن کریم آپ کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ بس، بسم اللہ الرحمن الرحیم
 یاد تھا۔ اس کے بعد آپ کا ذہن کورے کاغذ کی طرح تھا۔

شیخ ابو عمروؒ بار بار پڑھنے کی کوشش کرتے مگر ایک آیت بھی یاد نہ آتی۔ پھر آپ نے گھبرا کر اپنا قرآن شریف نکالا
 اور اس کی تلاوت شروع کی۔ شیخ ابو عمروؒ ناظرہ قرآن شریف پڑھتے ہوئے تھے، مگر اس طرح انک انک کر کے جیسے کوئی
 نو عمر بچہ اپنا سبق یاد کر رہا ہو۔ یہ صورت حال دیکھ کر شیخ ابو عمروؒ رونے لگے۔

”اے اللہ! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا میری عقل زائل ہوتی جا رہی ہے؟“

شیخ ابو عمروؒ ظہر کی اذان تک مسلسل کوشش کرتے رہے۔ قرآن شریف بند کر کے کلام الہی کو پڑھتے تو ایک لفظ
 بھی یاد نہ آتا۔ پھر نماز پڑھنے کھڑے ہوئے تو ایک آیت قرآنی کی بھی تلاوت نہ کر سکتے۔ مجبوراً رکوع و سجدہ کیا اور
 سلام پھیر لیا۔ اب شیخ عمروؒ کو یقین آ گیا تھا کہ آپ قرآن مجید بکسر بھول چکے ہیں۔ دنیا کے سارے معاملات اسی
 طرح ذہن میں تازہ تھے۔ تمام دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام یاد تھے۔

شیخ ابو عمروؒ کوئی دن تک اسی کیفیت سے دوچار رہے۔ شاگرد باقاعدگی سے حاضر ہوتے۔ مگر آپ طبیعت کی خرابی
 کا بہانہ کر کے انہیں ٹال دیتے۔ اس افتادناگہانی نے شیخ ابو عمروؒ کے ذہن سے اس نوعمر، حسین و جمیل لڑکے کا خیال
 بھی نکال دیا تھا، جس نے دو دن کے لئے آپ کا صبر و قرار چھین لیا تھا۔

شیخ ابو عمروؒ عجب اذیت و کرب میں مبتلا تھے۔ کس سے اپنا دکھ بیان کرتے۔ یہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی تھی کہ
 آپ پورا قرآن کریم بھول چکے ہیں۔ آج تک تو کسی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ ابو عمروؒ پر اللہ کا
 عذاب نازل ہوا ہے۔ بالآخر حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تنہائی میں اپنی رودادِ اہل
 بیان کی۔

حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”ابو عمرو! تمہارے سینے میں ایک ہی چیز رہ سکتی تھی۔ کلام الہی کا نور یا
 اس حسین و جمیل لڑکے کا خیال۔“

اس انکشاف پر شیخ ابو عمروؒ کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ راز، جس سے صرف آپؐ ہی باخبر تھے، امام حسن بصریؒ کو کیسے معلوم ہوا؟

ابھی ابو عمروؒ اسی حیرت و استعجاب میں مبتلا تھے کہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ دوبارہ آپؐ سے مخاطب ہوئے۔
”ابو عمرو!..... اللہ کا شکر ادا کرو کہ ابھی تمہیں دو کلمات یاد ہیں۔“

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور بسم اللہ الرحمن الرحیم کی طرف اشارہ کیا تھا، جو ابھی تک شیخ ابو عمروؒ کو یاد تھے۔

شیخ ابو عمروؒ، حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو عظیم محدث اور فقیہہ تسلیم کرتے تھے۔ مگر آپؐ کے کشف و کرامات اور روحانی طاقت کو نہیں مانتے تھے۔ لیکن جب ایک مرد درویش کی یہ روشن ضمیری دیکھی تو شیخ ابو عمروؒ رور و کر عرض کرنے لگے۔

”امام! جب آپ میری بیماری جانتے ہیں تو پھر دو ابھی عنایت کر دیجئے۔ ورنہ میری دنیا بھی خراب اور آخرت بھی برباد۔“

حافظ قرآن کے بارے میں اکثر روایتیں موجود ہیں کہ اگر کوئی حافظ قرآن، کلام الہی کو حفاظت کے ساتھ قبر میں لے گیا یعنی مرتے وقت اُسے قرآن مجید یاد رہا تو قیامت کے دن حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کے ماں باپ اور دادا، پردادا کو بخش دیا جائے گا۔ اس کے برعکس جس نے قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد دنیا میں کلام الہی کو بھلا دیا، وہ آخرت میں اندھا اٹھایا جائے گا۔ شیخ ابو عمروؒ نے دنیا اور آخرت کی اسی بربادی کی طرف اشارہ کیا تھا۔
شیخ ابو عمروؒ کی گریہ و زاری دیکھ کر حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا۔ ”آج ساری رات توبہ و استغفار کرو۔ کل میرے پاس آنا۔ دیکھیں، حق تعالیٰ تمہاری نجات کا کون سا راستہ نکالتا ہے۔“

شیخ ابو عمروؒ، حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا شکریہ ادا کر کے اپنے گھر چلے گئے اور رات بھر گریہ و زاری کے ساتھ توبہ و استغفار کرتے رہے۔ پھر جب دوسرے دن شیخ ابو عمروؒ، حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان سے سوال کیا۔

”ابو عمرو! اب تمہارا کیا حال ہے؟ بھولا ہوا سبق یاد آیا؟“

”امام! اب بھی میری وہی کیفیت ہے۔ دنیا کی ساری باتیں یاد ہیں، مگر قرآن کریم کی ایک آیت بھی ذہن میں محفوظ نہیں۔“ شیخ عمروؒ نے روتے ہوئے عرض کیا۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر اُداس لہجے میں فرمایا۔

”ابو عمرو! تمہاری بیماری کی دوا میرے پاس نہیں۔ میں تو ایک بہت ہی معمولی طبیب ہوں۔ اگر کوئی چھوٹا مرض ہوتا تو میرے نسخے سے دُور ہو جاتا۔“

”امام! پھر میرا کیا ہو گا؟“ شیخ ابو عمروؒ نے روتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں لا علاج ہوں؟“

”میری نظر میں ایک بہت بڑا طبیب ہے۔“ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے شیخ ابو عمروؒ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ”انشاء اللہ! تم اُن کی دوا سے ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

اس کے بعد حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اس طبیب کا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

”حج کا زمانہ قریب ہے۔ پہلے تم حج ادا کرو، پھر ”مسجد حنیف“ میں جاؤ۔ وہاں تمہیں ایک بزرگ عبادت میں مصروف نظر آئیں گے۔ پھر جب وہ عبادت سے فارغ ہو جائیں تو تنہائی میں اُن کے سامنے اپنا معاملہ پیش کرنا،

انشاء اللہ! بامراد ہو جاؤ گے۔“

شیخ ابو عمروؒ نے حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی ہدایت کے مطابق پہلے حج کی سعادت حاصل کی، پھر ”مسجد حنیف“ پہنچے۔ مسجد میں داخل ہونے تک شیخ ابو عمروؒ کا ذہن دوسووں اور پریشان خیالات میں گھرا ہوا تھا۔ کبھی یہ سوچ کر خوش ہو جاتے کہ ان بزرگ کی دعا سے ناقابل بیان اذیت و کرب سے نجات پا جائیں گے۔ اور کبھی یہ سوچ کر اُداس ہو جاتے کہ اگر وہ طبیب بھی میرے مرض کی دوا نہ کر سکے تو پھر کیا ہوگا؟ آخر اسی ذہنی کشمکش کے ساتھ شیخ ابو عمروؒ ”مسجد حنیف“ میں داخل ہوئے پھر آپؒ نے ان بزرگ کو تلاش کرنا چاہا تو ایک گوشے میں انسانی ہجوم نظر آیا، جو ایک نورانی صورت بزرگ کے گرد جمع تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث شیخ ابو عمروؒ کو ان بزرگ کے صحیح خدوخال بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ کیونکہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی خاص ہدایت تھی کہ ان بزرگ سے بالکل تنہائی میں بات کی جائے۔ مجبوراً شیخ ابو عمروؒ مسجد کے دوسرے گوشے میں کھڑے ہو گئے اور انتظار کرنے لگے کہ کب انسانی ہجوم وہاں سے بٹے اور آپؒ ان بزرگ کے سامنے اپنا ماجرا بیان کر سکیں۔

شیخ ابو عمروؒ کافی فاصلے پر کھڑے دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ انہیں بزرگ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع میسر آجائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد شیخ ابو عمروؒ نے دیکھا کہ ایک اور بار لیش بزرگ جو سفید لباس پہنے ہوئے تھے، مسجد کے کسی گوشے سے نمودار ہوئے اور ان بزرگ کی طرف بڑھے جو اپنے عقیدت مندوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے۔ آنے والا شخص شاید زیادہ محترم تھا کہ اسے دیکھتے ہی سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ کھڑے ہونے والوں میں وہ بزرگ بھی شامل تھے، جن کی تلاش میں شیخ ابو عمروؒ ایک طویل سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ پھر سب لوگ بیٹھ گئے اور کچھ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ پھر اسی دوران ظہر کی اذان ہوئی اور کچھ دیر بعد نماز کے لئے جماعت کھڑی ہو گئی۔ شیخ ابو عمروؒ کو سب سے پچھلے صف میں جگہ ملی۔ نماز میں بھی شیخ عمروؒ کی وہی حالت تھی۔ امام کی آواز پر رکوع و سجود کرتے رہے مگر آپؒ کو قرآن کریم کی کوئی آیت مقدسہ یاد نہیں آئی۔ پھر نمازِ ظہر ختم ہوئی اور لوگ سنتیں ادا کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اب وہ بزرگ مسجد کے ایک مخصوص گوشے میں تنہا بیٹھے تھے۔

شیخ ابو عمروؒ بے تابانہ آگے بڑھے اور سلام عرض کر کے بزرگ کے سامنے دو زانو بیٹھ گئے۔

بزرگ نے شیخ ابو عمروؒ سے آنے کا مقصد پوچھا تو آپؒ نے زار و قطار روتے ہوئے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ شیخ ابو عمروؒ کی بات سن کر بزرگ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر تک زیر لب پڑھتے رہے۔ شیخ ابو عمروؒ کے چہرے پر شدید وحشت و مایوسی برس رہی تھی۔ بار بار سوچ رہے تھے کہ کہیں یہ بزرگ بھی انہیں لا علاج قرار نہ دے دیں۔ بالآخر بزرگ نے آنکھیں کولیں اور اپنے دونوں ہاتھوں پر تین بار کچھ پھونکا۔ اس کے بعد بزرگ نے تین بار شیخ ابو عمروؒ کے سر سے لے کر پاؤں تک اپنے دونوں ہاتھ پھیرے۔ پھر اپنے ہاتھوں کو آہستہ سے جھٹکا جیسے عام انسان اپنے کمزوروں سے گرد جھاڑنے کے لئے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہیں۔ پھر ان بزرگ نے اپنی شہادت کی انگلی شیخ ابو عمروؒ کے دل پر رکھی اور تین بار پھونکا اور بہت آہستہ لہجے میں فرمایا۔

”میرے بھائی! اب تم کیا محسوس کر رہے ہو؟“

بزرگ کی بات ختم ہوتے ہی شیخ ابو عمروؒ کو یوں محسوس ہوا کہ ایک تیز روشنی دماغ سے ہوتی ہوئی ان کے دل میں اتر گئی۔ ذہن پر زور دیا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے آپ کے سامنے قرآن کریم کھلا رکھا ہو۔ شیخ ابو عمروؒ نے اپنی یہی کیفیت بیان کر دی۔

بزرگ کے ہونٹوں پر ایک دلاؤیز تبسم ابھر آیا۔ پھر انہوں نے شیخ ابو عمروؒ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”بسم اللہ! سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرو۔ تاکہ ہم بھی خوش الحانی سے فیض یاب ہو سکیں۔“

شیخ ابو عمروؒ نے قرأت کے ساتھ سورۃ فاتحہ کی تلاوت شروع کی۔ آج آپؒ کی آواز میں کچھ عجیب ہی سوز و گداز شامل تھا۔ پوری مسجد گونج اٹھی اور بزرگ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر جب سورۃ فاتحہ کی تلاوت ختم ہوئی تو شیخ ابو عمروؒ بے اختیار روئے لگے۔

”اگر آپ میرے حق میں دعائے خیر نہ فرماتے تو میں اسی عذاب ناک حالت میں دنیا سے گزر جاتا۔“

بزرگ نے دوبارہ شیخ ابو عمروؒ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نہایت دالہانہ انداز میں فرمایا۔ ”ابو عمروؒ تمہیں یہ نعمت عظیم مبارک ہو۔ مگر مجھے اتنا ضرور بتا دو کہ تمہیں میرا پتہ کس نے دیا تھا؟“

شیخ ابو عمروؒ سیدھے ہوئے اور انتہائی متشکرانہ لہجے میں عرض کرنے لگے۔ ”حق تعالیٰ امام حسن بصریؒ کو اجر عظیم عطا فرمائے کہ ان ہی کی رہنمائی سے میں آپ تک پہنچا۔“

یہ سنتے ہی بزرگ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”کیا حسن نے تمہیں میرا پتہ بتایا تھا؟“ بزرگ نے پُر جلال لہجے میں پوچھا۔

شیخ ابو عمروؒ گھبرا گئے۔ مگر اظہار حقیقت کے سوا آپؒ کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ ابو عمروؒ نے اپنے الفاظ دہرا دیئے۔

”حسن نے مجھے دنیا کے سامنے زسوا کیا ہے تو میں بھی اس کا پردہ چاک کئے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔“

بزرگ کی آواز بلند اور تڑپتی مگر اس سے ایک خاص محبت و عقیدت بھی جھلک رہی تھی۔ ”حسن تو خود تمہارا اعلان کر سکتا تھا۔ پھر اس نے تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا؟ وہ مجھ سے بڑا طبیب ہے۔ کیا تم حسن کو جانتے ہو؟“

شیخ ابو عمروؒ نے شدید حیرت زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”بے شک! وہ ایک بڑے محدث اور فقیہ ہیں۔“

”محدث اور فقیہ تو دوسرے بھی ہیں، مگر حسن ان سب سے مختلف ہیں۔“ بزرگ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم اس مسجد میں کتنی دیر سے موجود ہو؟“

”میں کئی گھنٹے سے انتظار میں کھڑا تھا کہ آپ کو تنہائی میں اپنی درخواست پیش کروں۔“

”تو کیا تم نے نہیں دیکھا کہ نماز ظہر سے پہلے حسن یہاں آئے تھے اور نماز ادا کر کے بصرہ واپس چلے گئے۔“ بزرگ نے کہا۔

شیخ ابو عمروؒ نے اسی حیرت کے عالم میں عرض کیا۔ ”میں نے کسی شخص کو آپ کے پاس آتے ضرور دیکھا تھا، مگر فاصلہ اتنا زیادہ ہونے کی وجہ سے میں آنے والے کی صورت نہ پہچان سکا۔“

”وہ حسن ہی تھے۔“ بزرگ نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”حسن اکثر اسی مسجد میں نماز ظہر ادا کرتے ہیں اور کچھ دیر

میرے پاس بیٹھ کر بصرہ چلے جاتے ہیں۔ تم جب واپس اپنے گھر جاؤ تو تمام اہل بصرہ کو بتا دینا کہ حسن کون ہیں۔“

پھر جب شیخ ابو عمروؒ اپنی کشیدہ دولت عظیم حاصل کر کے بصرہ لوٹے اور حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی خدمت میں شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو امام نے انہیں دیکھتے ہی بے اختیار فرمایا۔

”ابو عمرو! تمہیں یہ کامیابی مبارک ہو۔ مگر ان بزرگ نے میرے بارے میں جو کچھ کہا، اسے فراموش کر دو۔“



حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی ذات گرامی سے بے شمار کرامات کا اظہار ہوا۔ ایک بار آپؒ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں آپؒ کے کچھ ساتھیوں کو شدت کی پیاس لگی۔ اتفاق سے

تمام لوگوں کے کوزے پانی سے خالی ہو چکے تھے۔ دوستوں نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے صورت حال بیان کی تو آپؒ نے فرمایا۔

”جب اس ذات پاک نے ہمیں گھر آنے کی دعوت دی ہے تو کھانے پینے کا انتظام بھی وہی کرے گا۔“
ابھی درویشوں کا یہ مختصر قافلہ تھوڑی ہی دُور گیا ہو گا کہ سامنے ایک کنواں نظر آیا۔ لوگ بے تابانہ اس طرف بڑھے تو قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ کنواں بہت گہرا ہے اور پانی نکالنے کے لئے رسی اور ڈول بھی موجود نہیں ہے۔ دوستوں نے بڑی بے چاری کے عالم میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا۔
”پانی تو موجود ہے مگر اسے حاصل کرنے کے لئے ذرائع میسر نہیں۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”کچھ دُور اور چلو۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا کوئی کنواں مل جائے، جہاں پانی بھرنے کا سامان بھی موجود ہو۔“

لوگ پیاس کی شدت سے نڈھال ہو رہے تھے، اس لئے فوراً ہی زمین پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ ”ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”تمہاری طرح میں بھی تو پیاسا ہوں۔ اور میرے پاس پانی کا ذخیرہ کرنے کے لئے کوزہ بھی نہیں ہے۔“

ساتھیوں نے شکایتا عرض کیا۔ ”آپ کا کیا ہے؟ نہ آپ کو بھوک لگتی ہے اور نہ پیاس۔ ہم میں اتنی قوت برداشت نہیں ہے۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر آپؒ نے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
”جب میں نماز کے لئے کھڑا ہوا جاؤں تو تم لوگ خوب سیراب ہو کر پانی پی لیتا۔ تاکہ اپنا سفر جاری رکھ سکو۔“
یہ کہہ کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کی نیت باندھ لی۔

ساتھیوں نے سوچا کہ نماز سے پانی کا کیا تعلق ہے؟ ابھی ان کے ذہن مختلف دوسو سو میں مبتلا تھے کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سجدے میں چلے گئے۔ پھر ساتھیوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا کہ اس گہرے کنوئیں کا پانی اچانک اُبل پڑا ہے۔ پیاسوں نے جی بھر کے پانی پیا اور آپس میں باتیں کرنے لگے کہ سب لوگ اپنے اپنے کوزے بھر لیں۔ کیا خبر کہ آگے بھی ہمیں ایسی ہی دُشواری پیش آئے۔

پھر جیسے ہی حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ساتھی نے اپنا خالی کوزہ بھرنے کی کوشش کی تو یکایک کنوئیں کا پانی اسی گہرائی میں واپس چلا گیا۔

پھر جب حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے سلام پھیرا تو آپؒ کے ساتھیوں نے یہ حیرت ناک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

”آپؒ کے سجدے میں جاتے ہی کنواں یکایک اُبل پڑا تھا۔ پھر جب ہم نے اپنی پیاس بجھا کر اگلی منزل کے لئے پانی کا کچھ ذخیرہ کرنا چاہا تو پانی اسی سطح پر پہنچ گیا۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ساتھیوں کی بات سن کر فرمایا۔

”تم لوگ فقیری کا دعویٰ بھی کرتے ہو اور کل کے لئے سامان خورد و نوش بچا کر بھی رکھنا چاہتے ہو۔ یہ عمل اہل فقر کے لئے جائز نہیں۔ تم نے حق تعالیٰ کی ذات پر توکل اور اس کی رزاقی پر یقین رکھنے کے بجائے اپنی عقل اور تدبیر پر بھروسہ کیا، اس لئے محرومی تمہارا مقدر بنی۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو یہ کنواں اسی طرح اُبلتا رہتا اور اس دشت و بیابان

میں اللہ کی مخلوق اس سے سیراب ہوتی رہتی۔“

اس انکشاف پر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں کو اپنی اس غلطی کا شدت سے احساس ہوا اور وہ اظہارِ ندامت کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

پھر دوسرے دن لوگوں کا کھانے کا سامان بھی ختم ہو گیا اور وہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھوک کی شکایت کرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ آپ اپنی روحانی طاقت سے ان کے لئے روٹی فراہم کریں۔ ساتھیوں کی بات سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے چہرہ مبارک پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ اور آپ نے کسی قدر سخت لہجے میں فرمایا۔

”معاذ اللہ! کیا میں رازقِ عالم ہوں جو تم مجھ سے کبھی روٹی مانگتے ہو اور کبھی پانی؟ میں اسی لئے تمہیں اپنے ہمراہ لانا نہیں چاہتا تھا کہ ایک بے سرو ساماں شخص سے اپنا بوجھ نہیں اٹھاتا وہ اتنے لوگوں کا بار گراں کیسے اٹھائے گا۔“

دراصل واقعہ یہ تھا کہ بصرہ کے کچھ غریب لوگ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوا کرتے تھے یہاں تک کہ انہیں امامؑ سے قربت ہو گئی تھی۔ پھر جب حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حج پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ لوگ بھی آپ کے ہمراہ جانے کے لئے غمگین ہو گئے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں بہت سمجھایا کہ وہ اس طویل سفر کی صوبتیں برداشت نہیں کر سکیں گے، مگر ان لوگوں کا ایک ہی اصرار تھا۔

”آپ کی صحبتِ بابرکت میں کوئی مشکل، مشکل نہیں رہے گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی دعاؤں کے طفیل ہمارا حج بھی بارگاہِ الہی میں قبول ہو جائے گا۔“

ان لوگوں کی مسلسل التجاؤں نے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو مجبور کر دیا اور آپؑ انہیں حج بیت اللہ کے سفر میں اپنے ساتھ لے چلنے پر رضامند ہو گئے۔ پہلے پانی کا واقعہ پیش آیا اور اب آپ کے ساتھی بھوک کی شکایت کر رہے تھے۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سن کر ساتھیوں کے چروں پر گہری اُداسی چھا گئی۔ اور پھر وہ خاموشی کے ساتھ باقی سفر طے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اُن سب سے آگے آگے چل رہے تھے۔ اگرچہ دوسرے ساتھیوں کی طرح خود بھی بھوکے تھے، مگر آپؑ کی رفتار سے کسی نقابست اور کمزوری کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ بار بار پلٹ کر اپنے ہمراہیوں کی طرف دیکھتے تو آپؑ کو یوں محسوس ہوتا کہ وہ لوگ جبراً قدموں کو کھینٹ رہے ہیں۔

کچھ دُور جا کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ٹھہر گئے اور مُڑ کر دوبارہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوئے۔ ”دیکھو! میں تمہیں اسی لئے منع کرتا تھا۔ خود بھی تکلیف میں مبتلا ہو اور مجھے بھی مسلسل اذیت پہنچا رہے ہو۔“ اتنا کہہ کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھ گئے۔ آپؑ کی تیز رفتاری کا وہی عالم تھا۔

پھر درمائدہ ساتھیوں نے کچھ دُور چل کر دیکھا کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ زمین کی طرف جھکے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث وہ لوگ یہ نہیں سمجھ سکے کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کیا کر رہے ہیں۔ مگر انہیں اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ امامؑ جھکی ہوئی حالت میں زمین سے کچھ اٹھا رہے ہیں۔ پھر چند لمحوں بعد حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سیدھے کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

پھر جب بھوک سے نڈھال شرکائے سفر قریب آ گئے تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا دست مبارک اُن کی طرف بڑھایا۔ آپؑ کے ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں۔ وہ کھجوریں برابر سب ساتھیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ سب

کے حصے میں دو دو کھجوریں آئیں۔ ایک کھجور خود آپؐ نے اپنے پاس رکھتے ہوئے فرمایا۔
 ”خلاق عالم نے ہم فقیروں کی حالت پر غیب سے یہ رزق عطا فرمایا ہے۔ اسے کھاؤ اور اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔“

پھر جیسے ہی ایک ساتھی نے وہ کھجور منہ میں رکھی تو اسے ایک عجیب سی لذت کا احساس ہوا۔ ایسی لذت جو آج تک اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی کھجور کھانے سے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر جب اس شخص نے کھجور کھا کر اس کی گٹھلی زمین پر پھینکنی چاہی تو سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ گٹھلی نہیں تھی بلکہ سونے کا ایک چھوٹا ٹکڑا تھا۔ پھر گھبرا کر دوسرے لوگوں نے بھی اپنی کھجوریں کھائیں اور ان کی گٹھلیاں بھی سونے کی تھیں۔ مگر جب حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کھجور کھائی تو اس کی گٹھلی عام گٹھلیوں جیسی تھی۔ اسے دیکھ کر آپؐ نے فرمایا۔
 ”مجھ فقیر کے لئے یہی کافی ہے۔“

اس کے بعد آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی۔ ”جب کوئی بازار قریب آجائے تو ان سونے کے ٹکڑوں کو فروخت کر کے اپنا سامان ضرورت خرید لینا۔ مگر خبردار! بصرہ پہنچ کر کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کرنا۔“



اس واقعے کے بعد حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کئی حج کئے۔ مگر آپؐ نے کسی شخص کو اپنا شریک سفر نہیں بنایا۔ خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق تصنیف ”تذکرۃ الاولیاء“ کی روایت کے مطابق ایک بار عظیم صوفی بزرگ حضرت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم ہوا کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ حج کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپؐ نے ایک خط کے ذریعے یہ درخواست پیش کی۔

”اگر امام مجھے اس مقدس سفر میں اپنے ساتھ لے چلیں تو میں اسے اپنی زندگی کی بہت بڑی سعادت سمجھوں گا۔“
 حضرت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب پڑھ کر حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے بے باکانہ انداز میں جواب تحریر فرمایا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں کہ مجھ عاجز و ناتواں سے آپؐ کی اس خواہش کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ میں نے زندگی بھر یہی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ستاری کے پردے میں اپنے روز و شب بسر کروں۔ اگر آپؐ اس طویل سفر میں میرے ہمراہ ہوں گے تو یقیناً میری ذات پر پڑا ہوا پردہ ہٹ جائے گا اور آپؐ میرے بہت سے عیبوں سے واقف ہو جائیں گے۔ آپؐ نے مجھ سے جو حسن ظن رکھا ہے، حق تعالیٰ اس کے بدلے میں آپؐ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکا۔ کسی ایسی خدمت کے بارے میں تحریر فرمائیے، جسے یہ فقیر انجام دے سکے۔“

حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا نامہ گرامی پڑھ کر حضرت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ بہت دیر تک روتے رہے۔ پھر آپؐ نے نہایت جذب و عقیدت کے لہجے میں فرمایا۔
 ”امام! عجز و انکسار تو آپؐ پر ختم ہے۔“

ہم اس واقعے کی صحت سے انکار نہیں کرتے۔ مگر ہمارے خیال میں یہ کسی دوسرے بزرگ کا واقعہ ہے، جو حضرت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ عظیم و جلیل محدث حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں گزرے ہیں۔ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ، حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے 54 سال بعد یعنی 164ھ میں پیدا ہوئے تھے۔



اسی طرح اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نام کئی خط تحریر فرمائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے انتقال کے بعد 99ھ میں منصب خلافت پر فائز ہوئے تھے اور آپ نے ایسا عادلانہ اور شرعی نظام رائج کیا تھا، جس نے خلافت راشدہ کے دور کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اسی لئے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو ”پانچواں خلیفہ راشد“ بھی کہا جاتا ہے۔ آپ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے عالمانہ اور عارفانہ مقام سے واقف تھے، اس لئے ایک بار آپ نے خط میں تحریر فرمایا۔

”امام! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے، جو میرے تمام امور میں معاون ثابت ہو سکے۔“

جواب میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا۔ ”اگر حق تعالیٰ تمہارا معاون نہیں ہے تو پھر کسی بھی انسان سے معاونت اور خیر و فلاح کی توقع نہ رکھو۔“

پھر خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نام دوسرا خط تحریر کیا۔

”براہ کرم مجھے کوئی تو نصیحت فرمائیے۔“

”ایک ذی ہوش انسان کے لئے یہ اشارہ کافی ہے کہ وہ اس دن کو اپنے قریب تر سمجھے، جس دن یہ ساری کائنات فنا ہو جائے گی اور صرف آخرت باقی رہے گی۔“



جب اموی خلیفہ یزید بن عبدالملک نے عمر بن ہبیرہ کو خراسان اور عراق کا عامل (گورنر) بنایا تو اس نے حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ وہ ان سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ پھر جب اپنے وقت کے یہ تینوں عظیم محدث اور فقیہ، عامل خراسان و عراق سے ایک مخصوص کمرے میں ملے تو عمر بن ہبیرہ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آپ قرآن کریم کی اس آیت مقدسہ کے مفہوم سے اچھی طرح واقف ہیں، جس میں باری تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اولی الامر (حاکم) کی اطاعت کرو۔“ یہ کہہ کر عمر بن ہبیرہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

عامل عراق و خراسان کی بات سن کر حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ چپ رہے۔ مگر حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”ہم لوگ تو بحکم خدا اس آیت مقدسہ کے مفہوم سے باخبر ہیں۔ لیکن آپ اپنا مقصد بیان کیجئے کہ کتاب الہی کو کیوں درمیان میں لایا جا رہا ہے؟“

عمر بن ہبیرہ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”یزید بن عبدالملک، اللہ کا خلیفہ ہے۔ اور اللہ نے اسے اپنے بندوں پر اپنا نائب بنایا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بندوں سے خلیفہ کے احکام کی تعمیل کا وعدہ لیا ہے۔ آپ حضرات یہ بھی جانتے ہیں کہ خلیفہ وقت نے مجھے اپنا نائب مقرر کیا۔ اب آپ مجھے قرآن و سنت کی روشنی میں مشورہ دیجئے کہ میں یزید بن عبدالملک کے احکام پر کہاں تک عمل کروں؟“

اس سے پہلے کہ ان عظیم فقہاء کا جواب تحریر کیا جائے، قارئین کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کون بزرگ تھے؟ حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ خواب کی تعبیر بیان کرنے میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ معتبر روایتوں کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کے ذریعے حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کو یہ خصوصی علم بخشا تھا۔

حضرت امام شعیؒ کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آپؑ ہی نے سب سے پہلے امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کو حصول علم کا مشورہ دیا تھا۔ حضرت امام شعیؒ کا مزید تعارف یہ ہے کہ حجاج بن یوسف کے خلاف چلنے والی تحریک میں آپؑ بھی شامل تھے۔ حجاج نے کچھ دن تک حضرت امام شعیؒ کو قید خانے میں رکھا، پھر اس شرط پر رہا کر دیا کہ آئندہ اس کے خلاف ایک حرف بھی اپنی زبان پر نہیں لائیں گے۔ اس کے بعد حضرت امام شعیؒ ہمیشہ کے لئے گوشہ نشین ہو گئے تھے اور یہ کہہ کر ظالم حکمرانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا کہ اللہ ہی ان سے نجات دینے والا ہے۔

عمر بن ہبیرہ کا سوال سن کر حضرت ابن سیرینؒ اور حضرت امام شعیؒ نے مبہم جوابات دیئے۔ تاکہ وہ آمرانِ وقت کے ظلم و تشدد سے محفوظ رہ سکیں۔ مگر حضرت امام حسن بصریؒ نے اس نازک موقع پر بھی اپنی جراتِ اظہار کی روش تبدیل نہیں کی اور عاملِ خراسان و عراق سے صاف صاف کہہ دیا۔

”آپ پر لازم ہے کہ یزید بن عبد الملک کے معاملے میں اللہ سے خوف کریں۔ لیکن اللہ کے معاملے میں خلیفہ وقت سے بالکل نہ ڈریں۔ کیونکہ حق تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ وہ آپ کو یزید سے محفوظ رکھ سکتا ہے، مگر یزید آپ کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔ وہ دن بہت قریب ہے کہ خالق کائنات ایک فرشتہ بھیجے گا جو آپ کو اس تخت سے اتار کر اور وسیع و عریض محل سے نکال کر ایک تنگ قبر میں ڈال دے گا۔ اس وقت نیک عمل کے سوا کوئی شے آپ کے کام نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس لئے بادشاہ بناتا ہے کہ وہ اس کے دین اور بندوں کی خدمت کرے۔ مجھ فقیر کے پاس آپ کے لئے بس ایک ہی مشورہ ہے کہ حکومت کی طاقت کے ذریعے اللہ کے دین اور اس کے بندوں پر سوار ہونے کی کوشش نہ کریں۔ حق تعالیٰ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ اس کے بندے اسی کی مخلوق کے سامنے اظہارِ عبودیت کریں۔“

حضرت امام حسن بصریؒ کا جواب سن کر عمر بن ہبیرہ کو سکنتہ سا ہو گیا۔ اور آپؑ اُسے اسی حیرت کے عالم میں چھوڑ کر اپنے گھر تشریف لے گئے۔



حضرت خواجہ حسن بصریؒ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی خاص عبرت حاصل کیا کرتے تھے، جنہیں بڑے بڑے علماء ایک بہت ہی معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔

ایک بار کچھ لوگوں نے آپؑ سے شکایتا عرض کیا کہ فلاں شخص باجماعت نماز ادا نہیں کرتا اور لوگوں سے ملنے سے گریز کرتا ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت خواجہ حسن بصریؒ اس شخص کے پاس پہنچے۔ پہلے باجماعت نماز ادا کرنے کی فضیلت بیان کی اور پھر نہایت نرم و شیریں لہجے میں اس شخص سے سوال کیا۔

”میرے عزیز! آخر وہ کون سی مجبوری ہے جو تمہیں مسجد تک لے جانے اور اپنے بھائیوں سے ملاقات کرنے سے روکتی ہے؟“

حضرت امام حسن بصریؒ کا سوال سن کر اس شخص نے انتہائی شکستہ اور غمزدہ لہجے میں عرض کیا۔

”امام! آپ کو کیا معلوم کہ میں کتنا برا اور گناہگار انسان ہوں۔ میں اس لئے مسجد نہیں جاتا کہ میری وجہ سے اللہ کے دوسرے بندوں کی نمازیں خراب ہوں گی۔ اور اس لئے لوگوں سے نہیں ملتا کہ میرا برا سایہ ان پر پڑے گا۔ اس لئے گھر کے ایک گوشے میں پڑا گر یہ وزاری کرتا رہتا ہوں۔ عجب نہیں کہ وہ ذاتِ بے نیاز کسی دن میری طرف بھی نظر کرم کر ڈالے اور مجھ گناہگار کو بھی معاف کر دے۔“

یہ سنتے ہی حضرت خواجہ حسن بصریؒ پر رقت طاری ہو گئی۔ اور آپؑ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اے شخص! تو اس حسن بصری سے بہتر ہے، جو باجماعت نماز پڑھتا ہے اور لوگ جسے اپنا امام کہتے ہیں۔“
 ایک بار مجلس وعظ کے دوران ایک شاگرد نے عرض کیا۔ ”امام! شخص آپ کی بہت برائیاں کرتا ہے۔“
 شاگرد کی بات سن کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کا پورا نام اور پتہ پوچھا، پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ مشغول ہو گئے۔

دوسرے دن حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کھجوروں کا ایک طباق بھر کر اس شخص کے پاس بھیجا اور اس کے ساتھ ہی خط بھی روانہ کیا، جس میں یہ عبارت تحریر تھی۔

”میرے عزیز! مجھے خبر ملی ہے کہ آپ نے اپنی نیکیاں میرے ثلثمۃ اعمال میں منتقل کر دی ہیں۔ میری زبان میں اتنی طاقت نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں اور نہ میرے مالی حالات ایسے ہیں کہ میں اس احسان کا بدلہ دے سکوں۔
 پھر بھی کچھ کھجوریں نذر کے طور پر بھیج رہا ہوں، براہ کرم انہیں قبول فرمائیے۔“

حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا خط پڑھ کر وہ شخص رونے لگا۔ پھر اس نے غیبت جیسے قبیح فعل سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغ کا یہ انداز قرآن کریم کی اس آیت مقدسہ کے مطابق تھا۔
 (ترجمہ) ”لوگوں کو بلاؤ، پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی بات کے ساتھ۔“

اسی طرح ایک دن کسی شاگرد نے عرض کیا۔
 ”امام! چھ لوگ آپ کی مجلس میں صرف اس غرض سے آتے ہیں کہ دوران وعظ آپ کی تقریر میں غلطیاں تلاش کر سکیں۔“

جواب میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”ایسے لوگوں کی باتوں کا برانہ مانا کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جب اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق و رازن ہونے کے باوجود مخلوق کی بدگمانی اور بدزبانی سے نہیں بچا تو میری اور تمہاری کیا حیثیت ہے۔ ہر انسان کو چاہئے کہ وہ تعریف و ستائش اور لعنت و ملامت سے بے نیاز ہو کر اپنا ”عمل خیر“ جاری رکھے۔“



ایک بار ایک بدوی جو بہت کم پڑھا لکھا تھا، اس نے حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
 ”میں نے آج تک آپ جیسا صابر و زاہد انسان نہیں دیکھا۔“

جواباً حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”میرے بھائی! میرا زہد (پرہیزگاری) رغبت کی وجہ سے ہے اور میرا صبر بے صبری کے باعث ہے۔“

اس بدوی نے حیرت زدہ لہجے میں عرض کیا۔

”امام! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

”میرا زہد صرف اس لئے ہے کہ آخرت میں داخل جنت ہو کر عیش کروں۔ اور میرا صبر دوزخ کی آگ کے ڈر سے ہے۔ اور یہ عین بے صبری کی علامت ہے۔ حقیقی صبر و زہد وہ ہے، جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے

ہو اور جس میں اپنے نفع و نقصان کا کوئی خیال نہ ہو۔“

یہی وہ صفات عالیہ تھیں، جن کے سبب حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ روحانیت کے درجہ کمال تک پہنچے۔ ایک

بار آپ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”تم لوگ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی طرح ہو۔“

یہ سنتے ہی تمام لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک اُٹھے۔ حضرت امام حسن بصریؒ نے فوراً ہی اپنے قول کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

”تم صرف شکل و صورت میں صحابہ کرامؓ کے مانند ہو، عمل میں نہیں۔ اگر تم ان پاکباز ہستیوں کو دیکھتے تو انہیں دیوانہ سمجھنے لگتے۔ اور اگر وہ نفوسِ قدسیہ تمہارے دلوں کا حال جان لیتے تو تم میں سے کسی ایک کو بھی مسلمان قرار نہ دیتے۔“

ایک بار کسی شخص نے آپؐ سے سوال کیا کہ اسلام اور مسلمان کی مختصر تعریف کیا ہے؟ جواب میں حضرت امام حسن بصریؒ نے فرمایا۔

”اسلام کتابوں میں ہے اور مسلمان قبروں میں۔“

ایک بار کسی شخص نے کسی مسئلے کے بارے میں کہا کہ فقہاء یوں کہتے ہیں۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اس سے پوچھا۔

”تم نے کسی فقیہہ کو دیکھا بھی ہے؟“

اس کے بعد خود ہی فرمایا۔

”فقیہہ وہ ہے، جو دنیا سے پرہیز کرے۔ ہر وقت اپنے گناہوں اور عیبوں پر نظر رکھے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ احکامِ شرعی کا آمینہ دار ہو۔ وہ کسی حاکم کے دروازے پر کھڑا ہونے کے بجائے اللہ کے آستانے پر سجدہ ریز ہو۔ کسی مسئلے میں فتویٰ دیتے وقت دربارِ خلافت کے بجائے خانہ کعبہ اور سرورِ کونین ﷺ کے روضہ اقدس کی طرف دیکھے کہ اس سلسلے میں قرآن و سنت کا کیا حکم ہے؟“



ایک بار عاملِ عراق، عمر بن ہبیرہ حکومتی انتظامات کے سلسلے میں بصرہ کے دورے پر آیا۔ پھر اُس نے ایک سرکاری عمارت (گورنر ہاؤس) میں کئی دن تک قیام کیا۔ عمر بن ہبیرہ کی آمد کی خبر سنتے ہی بصرہ کے بہت سے علماء اُس سے ملاقات کے لئے گورنر ہاؤس پہنچے اور محافظ کے ذریعے اپنی اپنی درخواستیں عاملِ عراق کی خدمت میں ارسال کیں۔ ان ساری درخواستوں کا تقریباً ایک ہی منہبوم تھا۔

”ہمارا اشار بصرہ کے جید علماء میں ہوتا ہے۔ ہماری پہلی خواہش یہ ہے کہ ہم اُس شفیق و مہربان شخص کی زیارت کر سکیں، جو حجاج بن یوسف جیسے جابر و سفاک انسان کے بعد ہمارا حاکم مقرر کیا گیا ہے۔ دوسرے ہمارا فرض ہے کہ ہم عاملِ عراق کو ان مسائل کے بارے میں بتا سکیں، جن سے اہل بصرہ دوچار ہیں۔“

علمائے بصرہ کی طرف سے دی جانے والی درخواستوں کا انبار دیکھ کر عمر بن ہبیرہ مسکراتا اور پھر ان درخواستوں کو اپنے مشیروں اور مصاحبوں کی طرف بڑھا دیتا کہ با آواز بلند پڑھیں۔

پھر جب ایک ایک درخواست پڑھی جاتی تو اس دوران عمر بن ہبیرہ مسلسل ہنستا رہتا۔ پھر اپنے مشیروں کو حکم دیتا کہ یہ ساری درخواستیں پھاڑ دی جائیں۔ عاملِ عراق کا حکم سن کر کوئی مصاحب یا مشیر کہتا۔

”آپ ان سے ایک ملاقات تو کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی نظروں میں کچھ ایسے مسائل ہوں، جن سے آپ کے کارندے واقف نہ ہوں۔“

مشیر کی بات سن کر گورنر عمر بن ہبیرہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ پھر اُس نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

”کتب اور مدرسے کے ایک گوشے میں گم رہنے والوں کا اہل شہر کے مسائل سے کیا واسطہ؟ میں خوب جانتا ہوں کہ ان کے مسائل کیا ہیں؟ جنہیں حل کرنے کے لئے یہ بے قرار و مضطرب نظر آرہے ہیں۔ یہ علماء میرا دیدار اس لئے کرنا چاہتے ہیں کہ میں انہیں اپنا مقرب بنا کر ان کے وظائف مقرر کر دوں۔“

”انہیں ایک ملاقات کا شرف تو بخش دیجئے کہ آخر یہ علماء اور فقہاء کی جماعت ہے۔ آپ کے لئے ایک عامل کی حیثیت سے ان کا اتنا احترام تو ضروری ہے۔“ دوسرے مشیر نے گورنر عمر بن مہیرہ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا۔

”کوئی عالم ہو تو اُس کا احترام کروں۔“ اپنے مشیر کی بات سن کر عمر بن مہیرہ بہت زور سے ہنسا۔ تمام مشیر اور مصاحب بڑی حیرت سے اپنے حاکم کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

پھر یکایک عمر بن مہیرہ سنجیدہ ہو گیا اور نہایت اثر انگیز لہجے میں بولا۔

”بصرہ میں تو بس ایک ہی عالم ہیں، امام حسن..... میں نے اُن سے ملاقات کے لئے کئی بار پُر زور درخواست کی تھی، تب کہیں وہ کچھ دیر کے لئے تشریف لائے تھے اور نہایت جرأت و بے باکی کے ساتھ مجھے وہ فصاحت کر کے چلے گئے، جس کی طرف آج تک کسی عالم یا فقیہ نے ہلکا سا اشارہ تک نہیں کیا تھا۔ گفتگو کے دوران مسلسل میری نظریں امام کے چہرے پر مرکوز رہیں، مگر میں نے اُن کی آنکھوں میں کسی سوال کا ڈھنڈلا سا عکس تک نہیں دیکھا اور نہ اُن کی زبان سے کوئی حرف آرزو ادا ہوا۔ پھر امام اس طرح بے نیازانہ اُٹھ کر چلے گئے کہ جیسے وہ کسی بہت ہی معمولی انسان سے ملاقات کر کے واپس جا رہے ہوں۔“

گورنر عمر بن مہیرہ کی زبان سے یہ انکشاف سن کر اُس کے تمام مصاحب اور مشیر حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر وہ سب کے سب بے اختیار پکار اُٹھے۔

”بے شک! ابھی زمین پر اللہ کے ایسے بندے موجود ہیں، جو مالکِ حقیقی کے سوانہ کسی سے ڈرتے ہیں اور نہ کسی بندے کے سامنے اپنا دست سوال دراز کرتے ہیں۔“

ادھر گورنر عمر بن مہیرہ کے خصوصی کمرے میں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور ادھر گورنر ہاؤس کے دروازے پر بہت سے علمائے بصرہ اس انتظار میں کھڑے تھے کہ کب اُن کی درخواست منظور ہوتی ہے اور کب عراق و خراسان کا عامل انہیں اپنی خلوت میں طلب کرتا ہے۔ اس افسوس ناک صورتِ حال کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ گورنر ہاؤس کے سامنے کوئی سائبان تک نہ تھا اور یہ علمائے بصرہ صبح سے شام تک دھوپ میں کھڑے چلتے رہتے تھے اور پھر اندھیرا ہونے ہی اپنے گھروں کو ناکام و نامراد لوٹ جاتے تھے۔ اس طویل انتظار کے دوران اُن کی نمازیں تک قضا ہو جاتی تھیں۔ اگر اتفاق سے عمر بن مہیرہ کو کسی ضروری کام سے باہر جانا ہوتا تو وہ خاموشی کے ساتھ گورنر ہاؤس کے پچھلے دروازے سے نکل جاتا اور کشمکش کا شکار یہ علماء یہی سوچتے رہتے کہ اب اُن کی باری آنے والی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیاب اُن میں سے کسی کا نام پکارے اور وہ اُس وقت وہاں موجود نہ ہو۔ اسی خیال سے کوئی عالم اپنی جگہ جھوٹنے کے لئے تیار نہ ہوتا اور چپ چاپ کھڑا موسم کی سختیاں برداشت کرتا رہتا۔ اس سے بڑا تحقیر آمیز سلوک کیا ہو گا کہ گورنر عمر بن مہیرہ نے اُن علماء سے چند لکھوں کے لئے ملنا تک گوارا نہ کیا۔

ان علماء میں بیشتر وہ واعظین تھے، جو محفلوں میں غیر معتبر روایتیں بیان کر کے کم علم مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ابھارا کرتے تھے اور حاکمِ وقت کی شان میں تہیدے پڑھا کرتے تھے۔ مگر اس ہجوم میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل تھے، جن کا واقعتاً بڑے علماء اور فقہاء میں شمار ہوتا تھا۔ اپنے تمام تر علمی فضائل کے باوجود یہ حضرات بھی مالِ دنیا کی محبت اور ظاہری شان و شوکت کی طلب میں گرفتار تھے۔ اسی لئے کئی دن سے گورنر ہاؤس کے باہر کھڑے عمر بن

ہیرہ کی چشم کرم کے منتظر تھے۔

جب حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو علماء کی اس جماعت کے بارے میں معلوم ہوا تو آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔ پھر آپ اپنا وعظ نامکمل چھوڑ کر مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے گورز ہاؤس پہنچے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر تمام علماء نظریں چرانے لگے۔ آج آپ کی ظاہری حالت ہی کچھ اور تھی۔ امام کا دلکش چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اُن علماء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”تم لوگ اپنے سینوں میں پاک علم رکھتے ہو، مگر پھر بھی ان غلیظ لوگوں کے پاس جانا چاہتے ہو؟“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ ارباب اختیار کی طرف تھا۔

”اللہ تعالیٰ تمہاری جانوں کو تمہارے جسموں سے الگ کر دے کہ تم نے اہل علم کو رسوا کیا۔ حق تعالیٰ کی قسم! اگر تم اس چیز سے جو ان امیروں کے پاس ہے، بے نیاز ہو جاتے تو جو کچھ تمہارے پاس ہے، اس کی طلب میں یہی لوگ تمہارے دروازوں پر کھڑے ہوتے۔ مگر افسوس! تم نے دنیا کو مطلوب و مقصود بنا لیا۔ پھر دنیا نے تمہیں گدا سمجھ کر اپنے دروازے بند کر لئے۔ اب بھی دقت ہے، یہاں سے بھاگ جاؤ اور علم کی آبرو بچالو۔ رازقی عالم کے سوا کوئی دینے والا نہیں۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نہایت شیریں گفتار بزرگ تھے، مگر آج آپ کے لہجے سے نفرت و غضب کی آگ برس رہی تھی۔ اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ آپ علم کی رسوائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

ایک موقع پر وعظ کے دوران حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو دیکھا ہے، جن کی نظروں میں دنیا اتنی بے وقعت تھی، جتنی تمہاری نظروں میں تمہارے اپنے پیروں کے نیچے کی خاک ہے۔ میں نے اُن بزرگوں کو بھی دیکھا ہے کہ جن کے گھر رات آتی تو بس اتنی غذا ہوتی کہ جس سے بس وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکتے تھے۔ مگر حق تعالیٰ کی قسم! وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ اُسی غذا میں سے دوسرے بھوکوں کو بھی کھلاتے تھے اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ ساری غذا دوسروں کو چلی جاتی اور خود بھوکے رہ جاتے۔ وہ اللہ کے راستے میں جو کچھ دیتے تھے، اس کے سب سے زیادہ مستحق تو وہ خود ہوتے تھے۔“

ایک اور موقع پر حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”اے مسلمانو! قرآن حکیم کے بعد اب کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس لئے تم پر لازم ہے کہ دنیا کو فروخت کر کے آخرت خرید لو۔ میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتا رہا ہوں کہ جس میں کسی طرح بھی نقصان نہیں ہے۔ لیکن اگر تم نے آخرت بیچ کر دنیا خرید لی تو اس میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔ نہ دنیا حاصل کر سکو گے اور نہ آخرت۔“

مسلمانوں کے موجودہ حالات کی روشنی میں حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول مبارک حقیقت کے کس قدر قریب ہے۔

ایک اور موقع پر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”اے آدم کے بیٹے! تجھ پر افسوس ہے۔ کیا تُو اپنے اندر اللہ سے جنگ کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟“ پھر آپ نے اپنے قول کی وضاحت اس طرح فرمائی۔

”احکام الہی سے منہ پھیرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی بندہ اللہ سے جنگ کر رہا ہے۔“

قرآن کریم کی بعض آیات بھی انسان کی اسی سرکشی اور بغاوت کی طرف کھلا اشارہ کرتی ہیں۔

ایک بار حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ کرام اور اپنی مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اللہ اُن سے راضی ہوا، وہ برق رفتار گھوڑوں پر سوار بہت آگے چلے گئے۔ اور ایک ہم ہیں کہ کمزور دنا تو اُن خچروں پر سوار ہیں، جو زخمی کمر کی وجہ سے ایک قدم اٹھانے پر بھی قادر نہیں۔“

ایک موقع پر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”تم ایک شخص کی عداوت کے بدلے میں ہزاروں آدمیوں کی دوستی بھی نہ خریدو۔ دنیا تمہاری سواری ہے۔ اگر تم اس پر سوار ہو گئے تو یہ تمہیں سلامتی کے ساتھ منزل تک لے جائے گی۔ لیکن اگر دنیا تم پر سوار ہو گئی تو یقیناً تمہیں راستے میں ہلاک کر کے چھوڑے گی۔“



حضرت امام حسن بصریؒ کی پوری زندگی مسلمانوں کا انتشار اور اُن پر ٹوٹے ہوئے مصائب دیکھتے ہوئے گزری تھی۔ آپؒ کی نوعمری میں مسلمانوں کے اندر ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا تھا جو ”خارجیوں“ کے نام سے مشہور ہوا۔ اور پھر اس فرقے نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ پھر یہ تحریک اس قدر طاقت پکڑ گئی کہ ہزاروں اہل ایمان اُن کی خوں آشام ششیروں کی خوراک بن گئے۔ خارجیوں ہی کے منصوبے کے مطابق ایک ہی وقت میں حضرت علیؑ، حضرت امیر معاویہؓ اور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ پر حملے کئے گئے اور ان حملوں میں حضرت علیؑ شہید اور حضرت امیر معاویہؓ شدید زخمی ہوئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کے دھوکے میں اُن کے ایک دوست کو قتل کر دیا گیا۔ پھر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جوانی کے زمانے میں جانا بن یوسف اور خلیفہ ولید بن عبد الملک کی سفالیاں دیکھیں، جن کے باعث آپؒ کو روپوش ہونا پڑا تھا۔

یہ ان ہی دنوں کا واقعہ ہے، جب حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ روپوشی اور انتہائی گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اتفاق سے ایک دن آپؒ پر ایک خارجی کی نظر پڑ گئی۔ اُس نے تصدیق کرنے کے لئے آپؒ سے پوچھا۔

”کیا تم ہی امام حسن بصریؒ ہو؟“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اُس خارجی کے سوال کا مفہوم نہ سمجھ سکے اور آپؒ نے حسبِ عادت نہایت عاجزی و سادگی کے ساتھ فرمایا۔

”میرے عزیز! حسن بصریؒ تو میں ہی ہوں، مگر امامت کے لائق نہیں۔ اگر لوگ میرے بارے میں ایسا سوچتے ہیں تو یہ اُن کی ذاتی رائے ہے اور میں اس سے بری الذمہ ہوں۔“

خارجی کے چہرے پر خوشی کا رنگ ابھر آیا۔ ”میں بہت دنوں سے تمہاری تلاش میں تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج تم سے ملاقات ہو گئی۔“

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اُس خارجی کے اندازِ گفتگو سے یہی سمجھے کہ وہ کوئی ضرورت مند ہے۔ اس لئے آپؒ نے بھی جواباً اظہارِ مسرت کرتے ہوئے فرمایا۔

”میرے عزیز! مجھے بتاؤ کہ تم میری جستجو میں کیوں تھے؟ شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔“

یہ ایک اُس خارجی کا طرزِ گفتگو بدل گیا اور اُس نے انتہائی تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا تم ولید بن عبد الملک کی خلافت پر ایمان رکھتے ہو؟“

حضرت امام حسن بصریؒ ایک لمحے میں سمجھ گئے کہ یہ شخص حکومت کا کوئی جاسوس ہے۔ مگر پھر بھی آپؒ نے اپنی روایتی جرأت و گفتار کی روش نہیں بدلی اور اسی استقامت کے لہجے میں جواب دیا، جس کے لئے آپؒ پوری دنیا کے اسلام میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ ”جہاں تک میرے ایمان کا تعلق ہے تو میں صرف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور اکرم ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہوں۔“

حضرت امام حسن بصریؒ کا جواب سن کر وہ خارجی کچھ پریشان سا نظر آنے لگا، مگر پھر فوراً ہی لہجہ بدل کر بولا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ تم ولید بن عبد الملک کی خلافت کو جائز سمجھتے ہو یا ناجائز؟“

حضرت خواجہ حسن بصریؒ ہمیشہ وقت کی سیاست سے بہت دور رہتے تھے، اس لئے اس بار بھی آپؒ نے اپنا دامن بچاتے ہوئے فرمایا۔ ”مجھ اکیلے انسان کے جائز و ناجائز سمجھنے سے ولید بن عبد الملک کی خلافت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“

حضرت امام حسن بصریؒ نے نہایت تدبیر و ذہانت سے ایک بہترین منطقی دلیل پیش کرتے ہوئے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ خارجی آپؒ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔

”امام! مجھے الفاظ کے پیچ و خم میں نہ الجھائیں۔“ خارجی کا لہجہ مزید درشت ہو گیا۔ ”میں صرف ایک لفظ میں تمہارا جواب سننا چاہتا ہوں۔ ہاں یا نہیں؟“ کہتے کہتے خارجی کے چہرے سے غصے کا رنگ جھلکنے لگا۔ حضرت امام حسن بصریؒ خارجی کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئے اور آپؒ نے اسی بے باکانہ انداز میں فرمایا۔ ”میں تمہارے اس سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔“

”امام! جواب تو دینا پڑے گا۔“ خارجی نے انتہائی خوف ناک لہجے میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم میرے سامنے زبان نہیں کھولو گے تو پھر خلیفہ ولید بن عبد الملک کے سپاہیوں کے تازیانے تمہیں لب کشائی پر مجبور کر دیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ خارجی تیز رفتاری کے ساتھ جانے لگا۔

اب حضرت امام بصریؒ کو یقین آ گیا تھا کہ وہ شخص خلیفہ وقت کا جاسوس ہی تھا۔ آپؒ نے شدید بے چارگی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھا اور انتہائی پرسوز لہجے میں کہا۔

”اے میرے پالنے والے! میں تو بس تیرے ہی آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں۔ نہ خلیفہ وقت کے دربار میں اپنی حاجت لے کر جاتا ہوں اور نہ امراء سے کوئی غرض رکھتا ہوں۔ پھر یہ لوگ مجھے کیوں ستاتے ہیں؟“

ابھی فضا میں حضرت امام حسن بصریؒ کے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ اچانک ایک تیز انسانی چیخ اُبھری۔ آپؒ نے گھبرا کر دیکھا، کچھ فاصلے پر وہ خارجی اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے دبائے بری طرح چیخ رہا تھا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے اپنے دامن کی یہ تکلیف برداشت نہیں ہوئی اور آپؒ تیز قدموں سے اُس خارجی کی طرف بڑھے۔ مگر امامؒ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ زمین پر گر کر ترپنے لگا۔ پھر جب حضرت خواجہ حسن بصریؒ خارجی کے نزدیک پہنچے تو وہ مر چکا تھا اور اس کے ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خارجی کے دماغ کی رگیں پھٹ گئی تھیں جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

خارجی کا بے جان جسم دیکھ کر حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؒ نے اُس کی لاش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”میرے عزیز! میں نے تیرے مرنے کی دعا نہیں کی تھی۔ بس اپنے مالک سے اتنا عرض کیا تھا کہ یہ لوگ مجھے کیوں ستاتے ہیں۔ اب وہ اپنے رازوں کو خود ہی جانتا ہے کہ اُس نے تیرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا۔ پھر بھی میں

تیرے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تجھے معاف فرمادے۔“
 پھر جب خارجیوں کا قتلہ ختم ہوا تو ”معتزلہ“ کی شرانگیزیوں کا سلسلہ شرع ہو گیا اور بڑی عجیب بات یہ ہے کہ
 ”معتزلہ“ کی تحریک کا بانی حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شاگرد واصل بن عطا تھا۔
 ”خارجیوں“ کا عقیدہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔ اس کے برعکس ”معتزلہ“ کا نظریہ حیات یہ ہے کہ
 گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں، مومن ہے۔ معتزلہ کے عقائد یہ بھی کہتے ہیں کہ ایمان کا تعلق عمل سے نہیں، قلب سے
 ہے۔ انسان اپنے اعمال و افعال کے لئے آخرت میں جواب دہ نہیں۔ معتزلہ اپنے اس عقیدے کی یہ دلیل پیش
 کرتے ہیں کہ انسان مجبور ہے، اپنے افعال پر ”مختار مطلق“ نہیں۔ جواب دہی اُسی سے ہو سکتی ہے، جو اپنے عمل پر پوری
 قدرت رکھتا ہو۔“

ایک دن حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ حسب معمول درس دے رہے تھے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا
 اور اُس نے آتے ہی آپ سے یہ سوال کیا۔
 ”امام! خارجی کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان کتنے ہی
 گناہ کرے، وہ ہر نقصان سے محفوظ رہے گا۔ جیسے کفر کی حالت میں کوئی انسان خواہ کتنے ہی نیک عمل کرے، وہ اسے
 کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“
 اُس شخص کا سوال سن کر حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سوچ میں پڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ حضرت خواجہ حسن
 بصری رحمۃ اللہ علیہ اس شخص کو اپنے مدلل جواب سے مطمئن کرتے، واصل بن عطا چیخنے کے سے انداز میں بول اٹھا۔
 ”میں کہتا ہوں کہ یہ عقیدہ بالکل درست ہے۔“

واصل بن عطا کا یہ جواب جاہلانہ بھی تھا اور انتہائی گستاخی کے مترادف بھی۔ کیونکہ اُس نے بے ادبی کے لہجے
 میں استاد کے سامنے زبان کھولی۔

واصل بن عطا کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور آپ نے انتہائی
 سخت اور ناگوار لہجے میں اپنے شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
 ”تُو ہمارے حلقے سے دُور ہو جا۔“

واصل بن عطا نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ متکبرانہ انداز میں چلتا ہوا حضرت امام
 حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی درس گاہ سے نکل کر چلا گیا۔

کچھ روایتوں کے مطابق حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا شاگرد عمر بن عبید بھی واصل بن عطا کے ساتھ
 چلا گیا، جو اُس کا ہم خیال تھا۔ پھر اُس نے پورے دُور و شور کے ساتھ اپنی تحریک چلائی، جو ”معتزلہ“ کے نام سے
 مشہور ہوئی۔ ”معتزلہ“ کا مطلب ہے دُور ہو جانے والے، الگ ہو جانے والے۔ چونکہ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے
 واصل بن عطا کو حکم دیا تھا کہ ”ہمارے حلقے سے دُور ہو جا۔“ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے اس نئے فرقے کو ”معتزلہ“
 کے نام سے موسوم کیا۔

الغرض حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تمام زندگی سیاسی فتوں اور بدعقیدہ انسانوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ مگر
 آپ نے کسی مادی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ پھر 4 محرم 110ھ کو 88 سال کی عمر میں اس عظیم و جلیل محدث و
 فقیہ نے برسرِ وفات پائی۔

آپ کے انتقال سے چند روز قبل کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ ایک پرندہ آسمان سے اُتر آیا اور اس نے مسجد کا

ایک کنگورہ اپنی چونچ میں اٹھالیا۔ پھر جب اُس شخص نے اپنا خواب حضرت امام محمد بن سیرینؒ کے سامنے بیان کیا تو آپؒ کے چہرہ مبارک پر گہری اُداسی چھا گئی۔ کچھ دیر تک غور کرنے کے بعد امامؒ نے غم زدہ لہجے میں فرمایا۔
”اگر تمہارا خواب سچا ہے تو پھر امام بصریؒ کا انتقال ہو جائے گا۔“

حضرت امام ابن سیرینؒ علم تعبیر میں خاص شہرت و مہارت رکھتے تھے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک ہفتے بعد حضرت خواجہ حسن بصریؒ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اور بڑی عجیب بات یہ ہے کہ حضرت امام حسن بصریؒ کے انتقال کے سو اٹھ مہینے بعد حضرت امام محمد بن سیرینؒ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ ایک نقصانِ عظیم تھا کہ ملتِ اسلامیہ مختصر ترین عرصے میں حدیث و فقہ کے دو بڑے اماموں سے محروم ہو گئی۔

پھر جب حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا جنازہ اٹھا تو اس میں اس قدر لوگ شریک ہوئے کہ بصرہ کی جامع مسجد میں عصر کی نماز کے لئے ایک نمازی بھی موجود نہیں تھا۔ مشہور عالم ابن عماد حنبلیؒ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

”بصرہ کی تاریخ میں آغازِ اسلام سے لے کر امام حسن بصریؒ کے انتقام تک یہ پہلا موقع تھا کہ جامع مسجد میں کسی وقت کی نماز ادا نہ کی گئی ہو۔“

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام الناس حضرت امام حسن بصریؒ کو کس قدر محبوب رکھتے تھے۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا علمی ورثہ یہ ہے کہ حضرت ایوب سختیائیؒ، حضرت قتادہؒ، حضرت عطاء بن سائبؒ، حضرت یونس بن عبیدؒ، حضرت منصور بن زاذانؒ، حضرت مجاہدؒ، حضرت عطاء بن ابی رباحؒ اور حضرت طاؤس بن کیسانؒ جیسے عظیم محدث و فقیہ آپؒ کے شاگردوں میں شامل تھے۔

بعض روایتوں کے مطابق امام حسن بصریؒ پہلے صوفی بزرگ تھے۔ اسی لئے آپؒ کو ”شیخ الشیوخ“ کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ تصوف کا مشہور سلسلہ ”چشتیہ“ آپؒ ہی سے جاری ہوا۔ شاید اسی وجہ سے ”خواجہ“ کا لفظ آپؒ کے اسم مبارک کا حصہ بن گیا ہے۔



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جنگ قادسیہ لڑی گئی۔ مسلمانوں کا مقابلہ اُس وقت کی سپر پاور ایران سے تھا۔ جدید ترین ہتھیار، بے پناہ اسلحے کے ذخائر، دیوبیکر ہاتھیوں کی طویل قطاریں..... مادی وسائل کا انبار۔ ہم سب سے بڑھ کر ایران کا اپنا علاقہ۔ عرب سپاہی جو معمولی وسائل کے ساتھ سینکڑوں میل کا صحرائی سفر طے کر کے ایرانی علاقے میں پہنچے تھے اور اپنے سے بہت زیادہ طاقتور دشمن کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ جنگی مبصرین کا اندازہ تھا کہ دونوں ملکوں کی عسکری قوت میں کوئی توازن ہی نہیں تھا۔ ایرانی لشکروں کے سامنے اسلامی فوج کی وہی حیثیت تھی، جو کسی کوہ گراں کے سامنے ریت کے کسی ٹیلے کی ہوتی ہے۔ اہل فارس، طاقت کے نشے میں جیج رہے تھے۔ ”سومار کا گوشت کھانے والے اور اونٹ کا دودھ پینے والے ہم جیسے شائستہ تہذیب اور زور آور انسانوں کا مقابلہ کس طرح کریں گے؟“

سومار، گوئے کو کہتے ہیں جو چھپکلی کے انداز کا ایک جانور ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں قلعہ کی فصیل پر چڑھنے کے لئے اسی جانور کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ سومار کی پیٹھ میں رستی باندھ کر اسے قلعے کی دیوار کی طرف اُچھال دیا جاتا تھا اور پھر وہ چھوٹا سا جانور دیوار کو اپنے پنجوں سے اس طرح پکڑ لیتا تھا کہ اگر رستی پر بیک وقت دو تین آدمی بھی چڑھ جاتے تو سومار کے پنجوں کو چھڑایا نہیں جاسکتا تھا۔ اہل ایران نے عربوں کی تحقیر کرنے کے لئے ”سومار“ کے گوشت کا طعنہ دیا تھا، تاکہ اہل اسلام کی غربت و افلاس کا مذاق اُڑایا جاسکے۔

پھر ان ہی سومار کا گوشت کھانے والوں اور اونٹ کا دودھ پینے والوں نے ایک ہی دن میں سپر پاور کی بھلائی اُلٹ دی۔ تاج کسریٰ، مکہ گویوں کی شوکروں میں تھا اور قصر کسریٰ کے مینارے زمین بوس ہو چکے تھے۔ پھر ہزاروں سال سے روشن آتش کدے بھجے گئے اور آگ کے پجاریوں نے وحدہ لا شریک کا پاک نام لے کر اپنی پیشانیاں زمین پر رکھ دیں اور خاتم النبیین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کر لیا۔

یہ حق تعالیٰ کا معروف ترین اصول ہے کہ وہ مُردے سے زندہ کو..... زندہ سے مُردے کو..... رات سے دن..... اور نافرمانوں سے فرمانبرداروں کو نکالتا ہے۔ ٹھکست ایران کے بعد اللہ کا یہی قدیم ترین اصول نئے انداز سے فروزاں ہوا۔ آتش پرستوں کی نسل سے ایسے جانباں پیدا ہوئے جو خدائے واحد کے پرستار تھے اور جنہوں نے خدمتِ اسلام کے لئے اپنی جانیں اللہ کے ہاتھ فروخت کر دی تھیں۔ یہ بھی ایک ایسے ہی سرفروش کی سرگزشت ہے، جو آگ کے پجاریوں کے خاندان میں پیدا ہوا۔ مگر اس کے سینے میں حق پرستی کی آگ روشن تھی اور اسی آگ نے

باطل کے سارے خس و خاشاک جلا ڈالے تھے۔



قدیم ایران کا ایک صوبہ قوس ہے، جو عمومی شہرت نہیں رکھتا۔ اسی صوبے کا ایک شہر بسطام ہے اور ایک دن اس شہر میں ایک مرد درویش مجمع عام کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

”لوگو! بے نیازی اللہ کی صفت خاص ہے اور اسی ذات بے نیاز نے مجھے بھی دنیا سے بے نیاز کر دیا ہے۔ میں اندھیروں میں بھٹکتے والا ایک عام انسان تھا، مگر اس کی بخشش و عطا کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اس نے مجھے اپنے نور سے سرفراز کیا۔ تاریکی کو روشنی میں بدل ڈالا اور مجھے بے شمار اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔“

لوگ دم بخود تھے اور ان پر مرد درویش کے کلام کی ہیبت طاری تھی۔

اسی جہوم میں ایک عالم حسین بن عیسیٰ بھی تھے جو بہت نور سے مرد درویش کی تقریر سن رہے تھے۔

مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد وہ مرد درویش دوبارہ عوامی مجمع سے مخاطب ہوا۔

”لوگو! میری بات نور سے سنو۔ میں نے یقین کی آنکھ سے حق تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ کیا۔ پھر مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میرا نور اس کے سامنے تاریک ہی تاریک ہے..... اور میری بزرگی اُس کے جلال کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ وہ لطیف ہی لطیف تھا اور میرے وجود میں کثافت ہی کثافت تھی۔“

مجمع پر سناٹا طاری تھا۔ بسطام کے لوگ مرد درویش کے سامنے پتھر کے ستونوں کی طرح کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں گردش کرتا بھول گئی تھیں۔ بس سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اس کے برعکس حسین بن عیسیٰ بہت خوش تھے کہ وہ جس خاص کام سے یہاں آئے تھے، مرد درویش اس کام کو اُن کی مرضی کے مطابق تکمیل تک پہنچا رہا تھا۔

مرد درویش کی پُر جلال آواز ابھری۔

”میں نے اپنے اس نور اور اس کے نور کا موازنہ کیا تو یہ اندازہ ہوا کہ سب کچھ اس کے صدقے میں تھا۔ میری تمام عبادت و ریاضت میں اس کی مرضی کا فرما تھی۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو حق کی تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا۔

”جب تک ہم کام کرنے کی طاقت عطا نہیں کرتے، اس وقت تک کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ حقیقی فاعل صرف ہم ہیں۔ ہمارے ہی ارادے سے ساری چیزیں ظہور پذیر ہوتی ہیں اور پھر ہماری ہی مرضی سے فنا ہو جاتی ہیں۔ ہمارا ارادہ ہی سب کچھ ہے اور اس کائنات میں ہماری مرضی کے سوا کچھ نہیں۔“

مرد درویش کے کلام کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ سارا مجمع بے خود سا کھڑا تھا۔ خود بسطام کے نامور عالم حسین بن عیسیٰ جو اپنے ایک مخصوص منصوبے کے ساتھ یہاں آئے تھے، اس درویش کی گفتگو کے حصار میں گم ہوتے جا رہے تھے۔

درویش کی زبان ابھی تک نہیں لڑکھرائی تھی۔ حسین بن عیسیٰ نے دل ہی دل میں کہا۔ ”یہ تو بڑی متوازن گفتگو کر رہا ہے۔“

ابھی حسین بن عیسیٰ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ مرد درویش کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔

”پھر حق تعالیٰ نے میری ہستی فنا کر کے مجھے بقا کا مقام عطا کیا اور میں نے اپنی خودی کا بے حجابانہ مشاہدہ کیا۔ تم لوگ اس بات کو یوں سمجھو کہ میں نے اللہ کو اللہ کے ذریعے دیکھا۔“

معرفت کے اسرار و رموز کی گفتگو تھی اور وہ بھی بہت پیچیدہ۔ عام لوگ، مرد و رویش کی باتوں کا مفہوم کیا کرتے وہ تو ایک عارف کی تقریر میں کھوئے ہوئے تھے۔ یکایک ہجوم میں سے کسی شخص نے سوال کیا۔
”شیخ! کیا آپ کو معراج کی سعادت نصیب ہوئی ہے؟“

مرد و رویش نے جواب دیا۔

”ہاں! مجھے معراج ہوئی۔ مگر میری معراج ایک جاہل کی معراج تھی۔ میں اللہ کی حقیقت میں گم ہو کر گونا گونا اور جاہل بن گیا تھا۔ پھر میں نے اپنے نفس کی سرکشی کو درمیان سے فنا کر کے ایک عرصہ وہاں قیام کیا۔ پھر حق کی طرف سے مجھے ازلی علوم کی آگاہی بخشی گئی۔ اور زبان کو گویائی اور آنکھوں کو نور عطا کیا گیا۔ اسی نور کے ذریعہ میں نے ہر شے میں اُس کی ذات کی جلوہ گری دیکھی۔ اور اس کے علم سے علم حاصل کیا۔ پھر مجھ سے ارشاد کیا گیا۔
”تو سب کے ساتھ بھی ہے اور سب سے جدا بھی۔ تجھے وسائل کے بغیر سارے وسائل حاصل ہیں۔“
میں نے بارگاہ رب ذوالجلال میں عرض کیا۔

”مجھے ان چیزوں سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ اور میں تیرے سوا کسی شے کو عزیز نہیں رکھتا۔ مجھے تیرے وجود بغیر اپنا وجود ناپسند ہے۔ بلکہ میں تیرے وجود کا قیام اسے وجود کے بغیر چاہتا ہوں۔“
حکم ہوا۔ ”اعتدال کی حد سے نکل جا، تاکہ تیری کوششیں ہمارے لئے پسندیدہ ہو جائیں۔“
میں نے عرض کیا۔ ”خود میری تمنا بھی یہی ہے کہ تیرے راستے میں خود کو مٹا ڈالوں اور پھر تیری بزمِ نازِ رسائی حاصل کرنے کی کوشش کروں۔“

ارشاد ہوا۔ ”ایسا ہی کر۔ ہم تجھ سے راضی ہو جائیں گے۔“

انسانی ہجوم، مرد و رویش کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر الفاظ کی روح تک عام انسانوں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ حسین بن عیسیٰ کی آنکھیں درویش کے چہرے پر مرکوز تھیں اور دماغ درویش کی تقریر کے ہر پہلو پر پرواز کرتا۔ آخر وہ مرحلہ آ گیا، جس کی حسین بن عیسیٰ کو تلاش تھی۔
مرد و رویش نے نہایت پُر جوش لہجے میں کہا۔

”مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری ذات نقص و عیب سے پاک ہے۔“

ابھی خانقاہ کی فضا میں ان الفاظ کی گونج باقی تھی کہ حاضرین مشتعل ہو کر کھڑے ہو گئے۔ پھر ہر طرف ایک بات کا شور مچا دینے لگا۔

”یہ کفر ہے۔ سراسر کفر ہے۔“

خانقاہ کا احترام مجروح ہو گیا تھا۔ درویش کی درس گاہ کسی بازار کا منظر پیش کر رہی تھی۔ حاضرین کا یہ رنگ دیکھ کر درویش کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ اس نے اپنے عصا کو زور سے زمین پر مارتے ہوئے کہا۔
”تمہارا کفر تمہارے ساتھ اور میری روشنی میرے ساتھ۔“

”یہ روشنی نہیں، کھلا ہوا اندھیرا ہے۔“ مجمع نے چیخ کر کہا۔ اب ان کی عقیدت، غصے میں تبدیل ہو گئی تھی۔
”میں کسی کو نہیں روکتا اور کسی کی پروا بھی نہیں کرتا۔“ درویش حالتِ جلال میں بول رہا تھا۔ ”جو لوگ اس روشنی کے حصار سے باہر جانا چاہتے ہیں، وہ اپنے کفر میں واپس چلے جائیں۔“

”مت سنو اس شخص کی باتیں۔“ بیک وقت سینکڑوں انسانوں کا شور بلند ہوا۔ ”یہ ہمارے عقائد کو کفر کا نام دیتا ہے اور اپنے کافرانہ خیالات کو ایمان سے منسوب کرتا ہے۔ یہ خود اندھیرے میں کھڑا ہے اور ہمارے روشن مکالموں کو

ظلمت کدے کے نام سے پکارتا ہے۔ اپنے گھروں کو لوٹ چلو اور کانوں کو بند کر لو۔ اگر تم لوگ اسی طرح خانقاہ میں آ کر اس کی تقریریں سنتے رہے تو ایک دن گمراہ ہو جاؤ گے۔ استغفار کرو اور اس شخص کی طرف اپنی پیٹھ موڑ لو۔“

عقیدت مندوں کا جہوم اپنے دلوں میں کدورت کا غبار لئے اور چہروں پر نفرت کے گہرے رنگ سجائے منتشر ہو گیا۔ مگر حسین بن عیسیٰ بیٹھے رہے۔

دراصل واقعہ یہ ہے کہ بہت دن سے مرد درویش کے بارے میں یہ خبریں گرم تھیں کہ اس کی تقریریں گمراہ کن ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے عوام ایک نئے فتنے کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ نتیجتاً شہر کے حاکم نے حسین بن عیسیٰ کو معاملے کی تفتیش کے لئے درویش کی خانقاہ میں بھیجا۔ حسین بن عیسیٰ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے اور منصب قضا پر فائز تھے۔ حسین بن عیسیٰ نے لوگوں کی سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہیں کیا اور بہ نفس نفیس درویش کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ بہت دیر تک درویش کے افکار و خیالات سنتے رہے۔ پھر جب حاضرین مجلس، درویش پر کفر کا الزام عائد کرتے ہوئے چلے گئے تو حسین بن عیسیٰ، درویش سے مخاطب ہوئے۔

”شیخ! میں نے تمہاری ساری گفتگو سنی، جو عام انسانوں کی فہم سے بالاتر تھی۔“

”مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ دیا۔“ مرد درویش کی بے نیازی کا وہی عالم تھا۔ ”مجھے روشنی دکھانا تھی، سو دکھا دی۔ اب اگر کوئی نادان تاریک گڑھے کی طرف چلا جائے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”شیخ! تم میرے منصب سے تو واقف ہو؟“ حسین بن عیسیٰ نے ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں! میں تمہیں خوب جانتا ہوں کہ تم قاضی شہر حسین بن عیسیٰ ہو۔“ درویش نے بے تکلفانہ جواب دیا۔

”تو پھر تم میری ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے ہو گے؟“ حسین بن عیسیٰ نے مرد درویش سے سوال کیا۔

”ابھی تک اپنی ذمہ داریوں ہی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا ہوں تو پھر تمہاری ذمہ داریوں کو کس طرح سمجھ سکتا ہوں؟“ درویش کے لہجے میں وہی سر مستی تھی، جس کے لئے وہ ایک خاص شہرت رکھتا تھا۔ ”اپنا مطلب بیان کرو اور

مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

”تمہیں تمہارے حال پر کیسے چھوڑ دوں؟“ حسین بن عیسیٰ نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”میں یہی پوچھتے تو آیا

ہوں کہ آخر تم کس حال میں ہو؟“

”تم میرے حال کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔“ درویش نے بے زاری کے ساتھ کہا۔

بات اُلجھتی جا رہی تھی۔ اس لئے قاضی شہر حسین بن عیسیٰ نے صاف صاف کہا۔ ”شیخ! ابھی کچھ دیر پہلے تم نے

ہزاروں انسانوں کے سامنے بے عیب ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔“

درویش نے کوئی جواب نہیں دیا۔

حسین بن عیسیٰ دوبارہ مخاطب ہوئے۔ ”شیخ! تمہیں اپنے بارے میں یہ انکشاف کیسے ہوا کہ تمہاری ذات تمام

نقائق اور عیوب سے پاک ہے؟“ یہ کہہ کر حسین بن عیسیٰ اپنی نشست سے اٹھے اور منبر کے قریب جا کر بیٹھ گئے،

جہاں وہ مرد درویش اپنے تمام تر عارفانہ جلال کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔

درویش نے ایک اچھتی ہوئی نگاہ سے قاضی شہر کی طرف دیکھا اور اسی بے نیازانہ انداز میں کہا۔

”اے شخص! مجھے تیری حالت نامرادی پر افسوس ہے کہ اب تک تُو نے جس قدر پڑھا، وہ سب رائیگاں گیا اور تُو

نے جتنے لوگوں کو پڑھایا، وہ بھی ضائع ہوا۔ نہ خود پڑھ سکا اور نہ دوسروں کو تعلیم دے سکا۔ کبھی تُو نے اس بات پر غور

کیا کہ یہ کیسی محرومی ہے؟“

قاضی شہر حسین بن عیسیٰ علمائے ظاہر میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ مگر ایک درویش کی یہ جارحانہ گفتگو برداشت کر سکا اور ناخوشگوار لہجے میں پوچھ بیٹھے۔

”شیخ! یہ تم میرے بارے میں کہہ رہے ہو؟ تمہیں خبر بھی ہے کہ میں نے کن مدرسوں میں پڑھا ہے اور اپنے طالب علموں کو کس طرح درس دیتا ہوں؟“

قاضی شہر کی بات سن کر مرد درویش کا لہجہ کچھ اور بھی بے باک ہو گیا۔ ”تم نے اب تک جتنی کتابیں پڑھیں اور جتنی اپنے شاگردوں کو پڑھائی ہیں، ان میں صرف الفاظ تھے۔ علم نہیں تھا۔ علم تو کسی اور شے کا نام ہے تمہارے حلقہ ادراک سے باہر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ علم کسے کہتے ہیں اور وہ کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ مثلاً تمہاری طرح بے علم تھا اور بہت دنوں سے مجھے اس کنجی کی تلاش تھی، جس سے علم کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ آخر تھک گیا۔ پھر ایک دن میں نے عاجز ہو کر بارگاہِ ذوالجلال میں عرض کیا۔

”تو میری مجبوری کا سبب بخوبی جانتا ہے۔“

پھر حق تعالیٰ نے میرے قلب کی تاریکی اور نفس کی کثافت دور کر دی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میری جا کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور میں اس کے فضل و کرم میں ملیں ہوں۔“

پھر اللہ جل شانہ نے مجھ سے فرمایا۔ ”تو اور کیا چاہتا ہے؟“ میں نے عرض کیا۔ ”تیرا حقیر بندہ، تجھ سے کبھی کو طلب کرتا ہے۔ تو مجھے اپنا تقرب عطا کر کے ماسواے نیاز دلا دے۔“

درویش کی گفتگو سن کر قاضی شہر حسین بن عیسیٰ کے چہرے کا رنگ بگڑتا جا رہا تھا۔ اب تک وہ اپنے غم برداشت کر رہے تھے۔

”تجھے حق تعالیٰ نے اور کیا کیا عطا فرمایا.....؟“ قاضی شہر کی آواز سے انتہائی تلخی نمایاں تھی اور لہجہ نہایت آمیز تھا۔

درویش نے بڑی عاجزی کے ساتھ جواب دیا۔

”کوئی عقل اُس کی کرم نوازیوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ میرے سر پر کرامت کا تاج رکھ کر کہا گیا کہ تُو نے قیام دیکھ بھی لیا ہے اور پا بھی لیا ہے۔“

جیسے ہی درویش کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، قاضی حسین بن عیسیٰ غضب ناک ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ”تو کی قسم! تُو مسلمان نہیں رہا۔ کوئی شخص ظاہری آنکھ سے حق تعالیٰ کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔“ قاضی شہر نے درویش پر کڑا فتویٰ عائد کر دیا۔

اگرچہ درویش کی یہ عادت تھی کہ وہ سخت سے سخت بات کا بھی برا نہیں مانتا تھا، بسطام کے بہت سے کم فہم لوگ اس کے بعض اقوال پر کفر کا الزام لگاتے تھے، مگر وہ ہر بار مسکرا دیتا تھا۔ آج جب قاضی شہر نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ تُو کافر ہو گیا تو درویش کی آتش جلال بھڑک اٹھی۔

”میری طرف دیکھ!“ درویش نے قاضی شہر حسین بن عیسیٰ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”کیا تیری نظریں میرے چہرے کی تاب لا سکتی ہیں؟“

قاضی شہر نے بڑی حقارت کے ساتھ درویش کی طرف دیکھا، پھر ناگہاں ایک چیخ ماری اور منبر کے قریب بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

حسین بن علیؑ نے قرآن کریم کی اس آیت مقدسہ کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ دیا تھا، جس کا مفہوم ہے کہ دنیا کا کوئی انسان (جن میں انبیائے کرام بھی شامل ہیں) ظاہری آنکھ سے اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کر سکتا۔ قاضی شہر اپنے شرعی دعوے میں حق پر تھے، مگر اللہ ہی جانتا ہے کہ حسین بن علیؑ نے درویش کے چہرے پر کیا بات دیکھی تھی کہ بے ہوش ہو گئے۔



اس دوران بسطام کے درویشوں کو پتہ چلا کہ قاضی حسین بن علیؑ اس مرد درویش کے خلاف کفر کا فتویٰ دینے والے ہیں تو وہ بھی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ قاضی شہر بے ہوش پڑے تھے۔ درویشوں نے حیرت سے حسین بن علیؑ کی طرف دیکھا، پھر صاحب خانقاہ سے پوچھا۔

”شیخ! قاضی صاحب کا یہ حال کس طرح ہوا؟“

مرد درویش پر جلال کی کیفیت اب بھی غالب تھی، اسی عالم میں فرمایا۔

”یہ میری ناممکن بات سن کر بے ہوش ہو گیا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اللہ کی پاکی اور کبریائی بیان کر اور میری طرف دیکھ! میں نے بھی اپنے رب کی تسبیح کی تھی اور اس کی کبریائی کے قصیدے پڑھے تھے۔ اس کے صلے میں مجھے ایسے طاقتور بازو عطا کئے گئے، جن کے ذریعے میں نے عزت کے میدان پر پرواز کی اور قدرت کی بے مثال صنائی کا مشاہدہ کیا۔ پھر اس ذات بے نیاز نے مجھ پر ایک اور کرم فرمایا۔ اللہ نے اپنی قوت و زینت سے مجھے قوت و زینت بخشی۔ اس کے بعد میرے لئے توحید کا دروازہ کھول دیا اور فرمایا۔

”اب تیری رضا، ہماری رضا ہے اور تُو ہمارے اوصاف سے وابستہ ہو گیا ہے۔“

علمائے ظاہر اس مرد درویش کے ان ہی اقوال پر اعتراض کرتے تھے اور غور و فکر کے بغیر کفر کا فتویٰ دے دیا کرتے تھے۔ جب بندہ تسلیم و رضا کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ اس پر عجیب عجیب انداز میں احسان فرماتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس مرد درویش نے بھی تو اسی منزل تسلیم و رضا کی بات کی تھی۔ مگر قاضی حسین بن علیؑ اپنے زعم آگہی میں ان عارفانہ کلمات کی گہرائی کو سمجھ نہیں سکے۔ اور جہاں تک بندے کا اللہ کی صفات سے متصف ہونے کا معاملہ ہے تو خود حدیث مبارکہ میں اس طرف کھلا اشارہ موجود ہے۔

”ہم اُس کی آنکھ، کان اور زبان بن جاتے ہیں۔“

مرد درویش نے بھی یہی بات کہی تھی، مگر قاضی حسین بن علیؑ کو اس نکتے کا ادراک نہ ہو سکا۔

صاحب خانقاہ نے مہمان درویشوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”توحید کا دروازہ کھل جانے کے بعد مجھے نئی زندگی بخشی گئی اور مکمل آزمائش کے بعد دریافت کیا گیا۔

”کون و مکاں کس کے ہیں؟ موجودات پر کس کا حکم نافذ ہے؟ اور مختار کل کون ہے؟“

میں نے بعد از بجز و انکسار عرض کیا۔ ”میرے معبود! یہ اوصاف تیرے سوا کسی اور میں نہیں ہو سکتے۔“

”پھر جس وقت مجھے تہر کی نظر سے دیکھا گیا تو میری ہستی فنا ہو گئی اور میں نے صبر و سکون کا لباس پہن لیا۔“

دراصل صبر و سکون ہی کی وجہ سے مجھے یہ مراتب و درجات عطا ہوئے۔“
عجیب گفتگو تھی۔ مہمان درویشوں کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

صاحبِ خانقاہ نے فرمایا۔ ”پہلے میرے قلب میں ایک دریچہ کھولا گیا، پھر اس نے مجھے توحید کی زبان عطا کر کے میرے قلب کو اپنے نور سے معمور کر دیا اور اپنی صفت گری سے میری آنکھیں خیرہ کر دیں۔ اور اب میں اس کرم سے بات کرتا ہوں اور انسانوں کے درمیان چلتا پھرتا ہوں۔ اسی کی بخشش و عطا سے مجھے وہ زندگی ملی ہے کہ لے لئے موت کا وجود ہی نہیں ہوتا۔“

ایسی جانگداز تقریر تھی کہ مہمان درویشوں پر رقت طاری ہو گئی۔ صاحبِ خانقاہ خاموش ہو گیا۔ اہلِ دل جماعت کچھ دیر تک روتی رہی۔ پھر جب ان سوختہ جانوں کی حالت کچھ سنبھلی تو صاحبِ خانقاہ نے فرمایا۔
”اب اس کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ مخلوق تیرے دیدار کی طالب ہے۔“

مجھ ناچیز نے بارگاہِ ذوالجلال میں عرض کیا۔
”میں تو تیرے سوا کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن اگر تو چاہتا ہے کہ تیری مخلوق میرا نظارہ کرے تو میں ہوں۔ مگر پہلے مجھے حسن و جمال سے آراستہ کر دے تاکہ اہلِ دنیا مجھ میں تیری صفات کا مشاہدہ کر سکیں اور میرا درمیان سے منقطع ہو جائے۔“

حق تعالیٰ نے میری التجاس لی اور مجھے تمام عالم کے سامنے پیش کر دیا۔
”مرحبا..... مرحبا!“ مہمان درویش بے ساختہ پکار اٹھے اور پوری خانقاہ تعریف و ستائش کی آوازوں سے گونجی۔ اس دوران قاضی شہر حسین بن عینی بے ہوش ہی رہے۔

دراصل وہ مرد درویش ”ہمہ دوست“ کا قائل تھا۔ یعنی ہر شے میں اللہ تعالیٰ ہی کی جلوہ گری ہے۔ بعد میں نظریے کو ”وحدت الوجود“ کا نام دیا گیا۔ شیخ اکبر حضرت محی الدین عربی رحمہ اللہ اس فلسفے کے بہت بڑے شارح اور صوفیاء کا دوسرا گروہ اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ”وحدت الشہود“ پر زور دیتا ہے۔ بہر حال، یہ صوفیاء کا اہم مشاہدہ اور تجربہ ہے، جسے عام مسلمان کا ذہن سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور پھر بات الجھ کر رہ جاتی ہے۔

مشہور بزرگ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ خود بھی اسی نظریے پر کار بند تھے مگر عام مجلسوں میں اس موضوع پر کسوخت ناپسند کرتے تھے۔ آپ کا قول مبارک ہے کہ عام کلمہ گو یوں کے سامنے ”توحید“ کے اسرار و رموز بیان کئے جائیں کہ اس قسم کی باتیں ان کے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو ذہنی انتشار بڑھ جائے گا اور سچ و تاب کا شکار ہو جائیں گے۔ ایک بار حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے شاگرد خاص حضرت ابو بکر شبلی نے عام مجلس میں ”توحید“ کے موضوع پر گفتگو کی اور پھر حضرت شیخ کو خبر ہوئی تو آپ نے شبلی کو سختی سے منع کر دیا کہ آئندہ اس احترام کو یاد رکھئے۔ پھر حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ اس معاملے میں اس قدر محتاط ہو گئے تھے کہ آپ نے انتقال پہلے واضح الفاظ میں وصیت فرمادی تھی۔

”میری ساری تصانیف اور مکتوبات میرے ساتھ قبر میں دفن کر دینا۔“

ایک عام مسلمان پر ہی کیا منحصر ہے، بڑے بڑے علمائے ظاہر بھی اس حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے۔ نتیجتاً ان پر کفر کا فتویٰ عائد کر دیا جاتا ہے، جو معرفت حق کے راستے میں اپنے مشاہدات بیان کرتے ہیں۔ قاضی شہر حسین عینی کو بھی اسی مشکل کا سامنا تھا۔ وہ اس مرد درویش کی گفتگو کو سمجھنے سے قاصر رہے اور جوشِ جذبات میں ایک بار مسلمان کو کافر کہہ بیٹھے، جس کی ریاضت و عبادت مثالی حیثیت رکھتی تھی۔

مہمان درویشوں نے قاضی حسین بن عیسیٰ کی طرف دیکھا، جو خانقاہ کے فرش پر بے سدھ پڑے تھے۔
 ”شیخ! عقل کی درست گاہوں میں بیٹھنے والا، مکتب عشق کے آداب سے کس طرح واقف ہو سکتا ہے؟“ ایک
 درویش نے صاحب خانقاہ سے کہا۔ ”یہ آپ کے مقام معرفت سے بے خبر ہے، اس لئے اسے معاف فرمادیں۔“
 مسلمان درویش کی درخواست سن کر صاحب خانقاہ منبر سے اُتر اور حسین بن عیسیٰ کے قریب پہنچ کر بولا۔
 ”قاضی حسین! اٹھو۔“

مرد درویش کا اتنا کہنا تھا کہ حسین بن عیسیٰ نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک ان پر حیرت و سکوت کی
 کیفیت طاری رہی، پھر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ پھر جیسے ہی مرد درویش کی طرف دیکھا، قاضی بسطام پر لرزہ طاری ہو گیا۔
 ”شیخ! تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“ حسین بن عیسیٰ نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے
 بارے میں کچھ اور نہیں کہتا، لیکن بسطام کے لوگ تمہیں برا آدمی سمجھتے ہیں، اس لئے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ
 اس شہر سے نکل کر کسی بھی گوشہٴ ارض میں سا جاؤ۔“

مرد درویش نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اپنا اسباب سمیٹا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسباب ہی کیا تھا۔ ایک
 مُصلہ، ایک جوڑا کپڑے اور پانی کا ایک برتن۔ پھر جب وہ بسطام کی حدود سے نکلنے لگا تو اس نے شہر کے درو دیوار
 پر نظر ڈالی اور بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

”کتنا اچھا ہے یہ شہر، جس کا برا آدمی میں ہوں۔“

جس نے سینکڑوں بار کفر و زندقہ کی تہمتیں اٹھانے اور ہزاروں اذیتیں برداشت کرنے کے بعد اہل شہر کو دعائیں
 دیں، وہ مشہور بزرگ حضرت شیخ بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ تھے۔



حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ، قومس کے شہر بسطام میں پیدا ہوئے۔ قومس، ایران کا صوبہ تھا۔ بسطام کا ایک محلہ
 ”موبدان“ تھا، جسے یہ شرف حاصل ہے کہ اسی محلے کے ایک گھر میں سلطان العارفين حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ
 نے آنکھیں کھولیں اور تقریباً دس سال تک یہاں کے راستوں اور گلیوں کو اپنے وجودِ مسعود سے رونق بخشی۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ پیدائش میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ آپ 128ھ
 میں پیدا ہوئے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے 73 سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا اور آپ
 268ھ میں دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اس طرح وفات کے وقت آپ کی عمر شریف 133 سال ہوتی ہے، جو
 صریحاً غلط ہے۔

کچھ مؤرخین نے 131ھ اور کچھ تذکرہ نگاروں نے 136ھ کو سالِ ولادت قرار دیا ہے۔ تحقیق کی روشنی میں یہ
 تاریخیں بھی درست نہیں۔ اگر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سال وفات کو درست مان لیا جائے تو پھر 188ھ ہی
 آپ کی تاریخ پیدائش طے پاتی ہے اور یہ حقیقت کے قریب تر ہے۔ جن لوگوں نے 128ھ کو حضرت بایزید
 بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا سالِ ولادت قرار دیا ہے، وہ اس تاریخ کے پیچھے ایک خاص مقصد رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ ہر سلسلہ
 روحانی کے کچھ عقیدت مند اس قدر جذباتی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بزرگوں کی شان بڑھانے کے لئے ان کے ناموں
 کے ساتھ غلط واقعات بھی منسوب کر دیتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک شدید جذباتی عمل ہوتا ہے، اس لئے ایسا کرتے وقت
 ان لوگوں کو ہوش نہیں رہتا اور وہ اپنی خواہشات کے سیلاب میں بہہ کر نادانی کے ساحل پر پہنچ جاتے ہیں۔
 عقیدت مندوں کے اس گروہ نے یہ بات پہلے سے طے کر لی تھی کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق امام

اہل بیت حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے ضرور ثابت کرنا ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ حضرت بائزید بسطامی علیہ السلام کے زمانہ پیدائش کو پیچھے کی طرف لوٹایا جائے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے 148ھ میں وصال فرمایا تھا۔ اس طرح اگر حضرت بائزید بسطامی علیہ السلام کی پیدائش 128ھ میں دکھائی جائے تو دونوں بزرگوں کی ملاقات ثابت کی جا سکتی ہے۔ اس وقت حضرت بائزید بسطامی علیہ السلام کی عمر مبارک بیس سال ہوتی اور ایک نوجوان سالک، فقہ کے ایک بوڑھے امام کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تھا۔ بس یہی وہ منظر نامہ تھا، جو ایک خاص منصوبے کے تحت لکھا گیا تھا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت بائزید بسطامی علیہ السلام 188ء میں پیدا ہوئے تھے اور اس وقت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے انتقال کو چالیس سال ہو چکے تھے۔

آپ کا خاندانی نام ”طیفور“ تھا۔ یہ ایک غیر مانوس لفظ ہے اور اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ ایرانی النسل تھے۔ آپ کی کنیت ابو یزید تھی، جو غالباً کثرت استعمال سے بائزید ہو گئی۔

حضرت بائزید بسطامی علیہ السلام کے والد محترم کا نام عیسیٰ تھا۔ سروشان آپ کے دادا تھے، جن کا تعلق آتش پرستوں کے خاندان سے تھا۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ جنگ قادسیہ نے ایران اور مجوسیوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا اور اب یہ علاقہ اسلام کے زیرِ نگیں تھا۔ سروشان، اسلام کی حقانیت اور رواداری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے عمر میں صدیوں سے قائم آتش کدے کو بجھا دیا اور خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قبول اسلام کے بعد سروشان کا نام ”آدم“ رکھ دیا گیا تھا اور بعض تذکرہ نگاروں نے اس روایت سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ حلقہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کا نام سروشان ہی تھا۔

بعض محققین کے مطابق سروشان کا اسلامی نام علی تھا۔ اس سلسلے میں علامہ ابن خلکان کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ علامہ کے مطابق حضرت بائزید بسطامی علیہ السلام کے دو بھائی آدم اور علی تھے اور دونوں بڑے عابد و زاہد تھے۔ الغرض ان تمام تر اختلافات کے باوجود حضرت بائزید بسطامی علیہ السلام کے مورث اعلیٰ آتش پرست تھے۔ مگر جب حق تعالیٰ کی طرف سے اس خاندان کو ہدایت پہنچی تو بزرگوں کے معبد کی آگ بجھا کر اپنے سینے میں توحید کی آگ روشن کر لی۔

حضرت بائزید بسطامی علیہ السلام کے والد عیسیٰ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک پرہیزگار اور عابد انسان تھے۔ کسی تاریخ یاتذکرے سے حضرت بائزید علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی معلوم نہیں ہو سکا۔ تاہم وہ بھی ایک خدا رسیدہ خاتون تھیں۔ ابھی حضرت بائزید بسطامی علیہ السلام کی پیدائش کو چند مہینے ہی گزرے تھے کہ عیسیٰ انتقال کر گئے۔ کسی خاندان کے سرپرست کا رخصت ہو جانا متعلقین کے لئے قیامتِ صغریٰ سے کم نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ مگر حضرت بائزید علیہ السلام کی ام محترم ایک حوصلہ مند خاتون تھیں۔ بڑی ہمت سے اس جاں گداز حادثے کو برداشت کیا اور اپنے کم سن بچے کو محسوس تک نہیں ہونے دیا کہ وہ باپ کے سائے سے محروم ہو چکا ہے۔

ایک بچے کے لئے شیشی سے بڑھ کر کوئی دوسری مصیبت نہیں ہوتی۔ اگر باپ دولت کے انبار بھی چھوڑ کر مر جائے، تب بھی دنیا کا کوئی رشتہ اس محرومی کا ازالہ نہیں کر سکتا۔

دولت اور وسائل سے زیادہ ایک بچے کو باپ کی شفقت و محبت اور نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں بار بار یتیموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ قدرت کا عجیب راز ہے کہ جن بزرگوں نے تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے، ان میں سے اکثر کے دلوں پر یتیمی کا زخم روشن تھا۔

حضرت امام مالک علیہ السلام دو سال کے تھے کہ آپ کے والد محترم صحابی رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ انتقال فرما گئے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت ادریسؒ اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے، جب امامؒ کی عمر مبارک تین چار سال تھی۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے تین سال کی عمر میں یتیمی کا صدمہ برداشت کیا۔
غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی بہت کم عمری میں والد محترم کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔
حضرت بابا فرید الدین مسعود رحمۃ اللہ علیہ شکر رحمۃ اللہ علیہ بھی تین چار سال کے تھے کہ والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ آپؒ کے پیر و مرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ دو سال کی عمر میں یتیم ہوئے۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت سید احمد بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس وقت عالم فانی سے رخصت ہوئے، جب محبوب الہیؒ کی عمر پانچ سال تھی۔

جگہ کی کمی کے باعث دوسرے حوالے پیش نہیں کئے جاسکتے، ورنہ اس عنوان کے تحت ایک طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔ غالباً حق تعالیٰ اپنی اس قدرت کو اس لئے ظاہر فرماتے ہیں کہ عام مخلوق پر خالق کائنات کی شانِ رزاقی ظاہر ہو جائے۔ اور جو لوگ ظاہری اسباب کو کامیابی کی بنیاد سمجھتے ہیں، انہیں بھی یقین آجائے کہ اللہ کی ذات بے نیاز ہے۔ علامہ اقبالؒ کے بقول :-

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حُسنِ معنی کو
کہ فطرت آپؐ کر لیتی ہے، لالے کی حنا بندی!

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اسی لئے یتیم کیا گیا کہ ایک بے سہارا بچے کو جان ہو کر ”سلطان العارفین“ بننا تھا۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کی معاشی حالت کیا تھی، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کتابوں میں اس قدر تحریر ہے کہ والدہ محترمہ آپؒ کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دستورِ زمانہ کے مطابق اپنی تعلیم کا آغاز ایک مسجد سے کیا۔ وہاں ایک استاد آپؒ کو قرآن کریم پڑھاتے تھے۔ اس وقت غالباً حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر مبارک دس سال کے قریب تھی۔
ایک دن آپؒ سورہ لقمان کی ایک آیت پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔

”طیفور! آگے پڑھو۔“ استاد گرامی نے اپنے شاگرد کو خاموش پا کر کہا۔ (طیفور آپؒ کا خاندانی نام تھا)

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بعد احترام عرض کیا۔ ”استاد محترم! اس آیت مقدسہ کے معنی کیا ہیں؟“
جواباً استاد گرامی نے فرمایا۔ ”اللہ بندوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کا شکر ادا کیا کریں۔“

یہ سن کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت غیر ہو گئی۔ استاد گرامی نے پریشان ہو کر اپنے کم سن شاگرد کی طرف دیکھا۔ ”طیفور! کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے استاد سے گھر جانے کی اجازت مانگی اور اپنی تختی مدرسے میں چھوڑ کر والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شفیق و غمگسار ماں نے بیٹے کو نادقت گھر آتے دیکھا تو بے قرار ہو کر پوچھنے لگیں۔ ”طیفور! تمہاری آنکھوں سے آنسو کیوں جاری ہیں؟ اور چہرے کا رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے پورا واقعہ بیان کیا اور مادر گرامی کے قدموں سے لپٹ کر عرض کرنے لگے۔
”اللہ تعالیٰ کا حکم سننے کے بعد میں نے اپنا جائزہ لیا تو مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ میں بیک وقت دو آقاؤں کی

خدمت کرنے کے لائق نہیں ہوں۔ اس لئے آپ کی خدمت میں یہ درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں کہ یا تو مجھے اللہ سے مانگ لیجئے تاکہ میں مکمل طور پر آپ کا ہوا جاؤں..... یا پھر مجھے اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیجئے تاکہ میں پورے انہماک کے ساتھ اس کی بندگی کر سکوں۔“

اس قدر نومری میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات کہی تھی۔ والدہ محترمہ نے بے قرار ہو کر بیٹے کو سینے سے لگالیا، پھر بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔

”طبیور! میں اللہ کے لئے اپنے حق سے دستبردار ہوتی ہوں۔ اب تم جاؤ اور صرف اللہ کے بن کر رہو۔“
والدہ محترمہ کی بے مثال محبت دیکھ کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ رونے لگے۔ ”میں اس زبان سے آپ جیسی مہربان ماں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔“

پھر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ والدہ محترمہ کی دعاؤں کے سائے میں بسطام سے رخصت ہوئے۔



تاریخی روایات کے مطابق حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ اپنے وطن بسطام سے شام اور اس کے نواحی علاقوں میں تشریف لے گئے۔ پھر علم کی تلاش میں قریب بہ قریب، کوچہ بہ کوچہ اور شہر بہ شہر پھرتے رہے، مگر کسی مستند کرمے سے ان ممالک کی نشاندہی نہیں ہوئی۔

تذکرۃ الاولیاء کے مصنف حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سوتیرا اساتذہ سے علم ظاہری و باطنی حاصل کیا۔ استادوں کی کثرت سے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی طلب علم کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے..... مگر حیرت کی بات ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے حضرت شیخ کے اساتذہ کے نام ظاہر نہیں کئے۔ اور جن استادوں کے بارے میں واضح طور پر کہا گیا ہے، تاریخ سے ان روایتوں کی تصدیق نہیں ہوئی۔

مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور بزرگ حضرت خواجہ حبیب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی فیض روحانی حاصل کیا ہے۔ اگر ہم اس روایت کو تاریخ کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کریں تو بڑی عجیب صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ 188ھ میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت خواجہ حبیب رحمۃ اللہ علیہ 156ھ میں دہا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اگر ہم ”تذکرہ“ کے مصنف محمد سعید کی روایت پر اعتبار کریں تو حضرت خواجہ حبیب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات 9 رمضان المبارک 120ھ کو اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے زمانے میں ہوئی۔ حضرت خواجہ حبیب رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام حسن بصریؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس تاریخی حقیقت کی روشنی میں اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے روحانی طور پر حضرت حبیب رحمۃ اللہ علیہ سے اکتساب فیض حاصل کیا ہو۔ ظاہری طور پر آپ کو ملاقات اور شاگردی کا اعزاز حاصل نہیں تھا۔

اسی طرح اکثر تذکرہ نگاروں نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو اہل بیت کے مشہور امام حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم اپنے مضمون کے آغاز میں تاریخی حوالوں سے ظاہر کر چکے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت سے چالیس سال قبل انتقال فرما چکے تھے۔ اس لئے ظاہری طور پر دونوں بزرگوں میں استادی اور شاگردی کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ یہاں بھی وہی روحانی فیض کا معاملہ ہے۔ اس سلسلے میں مغل شہزادے داراشکوہ کا بیان درست ہے۔ داراشکوہ اپنی مشہور تصنیف ”مقیات الاولیاء“ میں لکھتا ہے:

”حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے اویسی ہیں۔ اور آپؑ نے غائبانہ طور پر امامؑ

سے فائدہ اٹھایا ہے۔“

اولیٰ سے مراد حضرت اولیس قرنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جو رسالت پناہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عشق کرتے تھے۔ حضرت اولیس قرنی، سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پاک کی وجہ سے کہ تم اپنی ماں کی خدمت میں مصروف رہو، حضرت اولیس قرنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے شرف حاصل نہ کر سکے۔ پھر بھی اس محرومی اور دُوری کے باوجود حضرت اولیس قرنی کو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ روحانی حاصل رہا۔

مولانا عبدالرحمن جامی کے بقول۔

”تو جامہ رسانید اولیس قرنی را“

(آپ کی شانِ کریمانہ تو یہ ہے کہ آپ نے اولیس قرنی کے لئے اپنا لباس مقدس بھیجا)
اس واقعے کے بعد سے تصوف میں یہ رسم خاصی مشہور ہو گئی ہے کہ اگر کوئی زندہ بزرگ، کسی مرحوم بزرگ سے والہانہ محبت کرتا ہے تو وہ اس بزرگ کا ”اولیٰ“ کہلاتا ہے۔ شہزادے داراشکوہ نے اسی وجہ سے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا ”اولیٰ“ قرار دیا ہے۔

جن تاریخ نویسوں نے تحقیق سے کام نہیں لیا، وہ ”صادق“ کے نام سے مغالطے میں پڑ گئے۔ دراصل حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استاد کا نام شیخ صادق تھا۔ تذکرہ نگاروں نے شیخ صادق کو غلطی سے حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سمجھ لیا۔

”تذکرۃ الاولیاء“ میں حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ میں شیخ صادق نام کے بھی ایک استاد تھے۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ ایک طویل مدت تک حضرت شیخ صادق کی خدمت میں حاضر رہ کر علم و عرفان حاصل کرتے رہے۔

ایک دن نمازِ عصر کے بعد حضرت شیخ صادق کا درس جاری تھا کہ شام ہو گئی اور چاروں طرف اندھیرا پھیلنے لگا۔ استاد نے اپنے شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”طیفور! زرا چراغ اٹھلاؤ اور اسے روشن کر دو۔“

”استاد محترم! چراغ کہاں رکھا ہے؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بعد احترام عرض کیا۔

”فلاں طاق میں۔“ حضرت شیخ صادق نے فرمایا۔

”وہ طاق کہاں ہے؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی ادب کے ساتھ دوبارہ عرض کیا۔

حضرت شیخ صادق نے بڑی حیرت کے ساتھ اپنے شاگرد کی طرف دیکھا۔ ”طیفور! تمہیں یہاں آئے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں، مگر اتنا بھی نہیں معلوم کہ طاق کہاں ہے؟“

”میں تو صرف آپ کا چہرہ مبارک دیکھتا ہوں اور آپ کا کلام سنتا ہوں۔“ حضرت بایزید بسطامی نے نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں عرض کیا۔ ”مجھے آپ کے سوا کسی شے سے غرض نہیں۔ میں کسی طرف بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ یہاں تک کہ اپنے گرد و پیش بھی میری آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔“

شاگرد کی بات سن کر استاد کے چہرے پر محبت اور روشنی کا ایک عجیب رنگ اُبھر آیا۔ پھر حضرت شیخ صادق نے نہایت جذب کے عالم میں فرمایا۔

”طیفور! اگر تمہاری حالت یہ ہے تو اب تم بسطام واپس جاسکتے ہو۔ تمہیں علم بھی حاصل ہو چکا اور عرفان بھی۔“

ذوقِ علم اور احترامِ استاد کی یہ بہترین مثال ہے۔



مشہور انگریز مستشرق، پروفیسر آر۔ اے نکلسن نے ایک مقالہ تحریر کیا تھا، جسے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی تحت 1906ء میں چھاپا گیا تھا۔ پروفیسر نکلسن اپنے مقالے میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں۔ ”تصوف میں شیخ بایزیدؒ کے استاد ایک کرد تھے۔“ پروفیسر نکلسن نے کرد استاد کا نام تحریر نہیں کیا۔ آگے چل کر پروفیسر صاحب لکھتے ہیں۔ ”تصوف اور طریقت اختیار کرنے سے پہلے شیخ بایزید بسطامیؒ فقہاء ”اصحاب الرائے“ کے مسلک تھے۔ پھر جب آپؒ نے صوفیانہ طریق اختیار کر لیا تو اپنے آپ کو کسی خاص مذہب کی پابندی سے آزاد کر لیا۔“

”اصحاب الرائے“ فقہاء کے اُس گروہ کو کہتے ہیں، جو کسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے اپنی رائے کو بھی اہم دیتے ہیں۔ یہ لوگ کسی شرعی مسئلے کو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ اسی لئے ”صاحبان اجتہاد“ کہلاتے ہیں۔ دوسرا گروہ اُن فقہاء کا ہے، جو تمام مسائل کو ”قرآن و حدیث“ کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اگر انہیں کتاب اور حدیث رسولؐ میں کسی مسئلے کا واضح حل نظر نہیں آتا تو وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور مذکورہ مسئلے کو کسی حل بغیر تشنہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور مسائل سے یہ کہہ کر معذرت کر لیتے ہیں۔

”اس سلسلے میں قرآن و حدیث خاموش ہیں، اس لئے ہم بھی کوئی جواب نہیں دے سکتے۔“

جب ”اصحاب الرائے“ کی مقبولیت عام ہوئی تو فقہاء کے دوسرے گروہ نے ان حضرات پر الزام تراشی شروع کر دی کہ یہ لوگ قرآن و حدیث کے مقابلے میں اپنی رائے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ایک جارحانہ اور غلط منصفانہ تبصرہ تھا، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ”اصحاب الرائے“ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس قبیل کے فقہاء قرآن و حدیث کے فیصلوں پر اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اصحاب الرائے میں سب سے زیادہ شہرت امام محبوبیت حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوئی۔ اسی لئے امام اعظم کے لقب سے شہرت دوام کے منصب عظیم پر فائز ہوئے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول مبارک ہے۔

”میں سب سے پہلے کسی مسئلے کا حل قرآن کریم میں تلاش کرتا ہوں۔ اگر وہاں کوئی واضح دلیل نہیں ملتی تو قرآن و حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتا ہوں۔ اگر وہاں بھی مذکورہ مسئلے کا جواب موجود نہیں ہوتا تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اعمال مبارکہ کا مطالعہ کرتا ہوں۔ پھر جب ان تینوں مقامات پر خاموشی پاتا ہوں تو اجتہاد کرتا ہوں۔“

اجتہاد ہی کو ”رائے“ کہا جاتا ہے۔ اپنے اجتہاد کے بارے میں خود حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ یہ ہے۔

”اگر میری کوئی رائے قرآن و حدیث کے خلاف نظر آئے تو اُسے دیوار پر مار دو۔“

پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ”اصحاب الرائے“ اپنے اجتہاد کو قرآن و حدیث پر ترجیح دیتے تھے۔ یہ حق تہمت ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے مصنف کے بقول حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فقہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔

آپؒ نے حضرت عین الدین شامیؒ سے خلافت حاصل کی، مگر کسی کتاب میں ان بزرگ کے تفصیلی حالات موجود نہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ کی فہرست میں ایک نام حضرت شیخ ابوعلی سندھیؒ کا بھی ہے۔ مگر ان

بزرگ کے بارے میں تمام تذکرے خاموش ہیں۔

حضرت بایزید بسطام رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے اساتذہ سے علم ظاہری اور فیض روحانی حاصل کیا۔ مگر آپ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی کو اپنا حقیقی استاد سمجھتے تھے۔ ایک بار آپ کی مجلس روحانی آراستہ تھی۔ بڑے بڑے مشائخ خدمت میں حاضر تھے۔ ایک بزرگ نے سوال کیا۔

”شیخ! آپ کے علم کا مخزن کیا ہے؟“ یعنی علم کس استاد سے حاصل کیا؟

جواب میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”دوسرے مردوں نے مردوں سے علم حاصل کیا، اس لئے باقی نہ رہا..... اور ہم نے ”حی القیوم“ سے سیکھا، جو زندہ جاوید ہے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول مبارک سے مخالف علماء کو دو غلط فہمیاں ہوئیں۔ ایک یہ کہ حضرت شیخ کا کوئی استاد نہیں تھا، اس لئے وہ اپنے آپ کو ”اسی“ سمجھتے تھے۔ حالانکہ اسی لقب تو صرف رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے..... اور پوری کائنات میں یہ اعزاز کسی دوسرے انسان کو حاصل نہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ وہ علم باقی نہیں رہتا، جسے حق تعالیٰ کی تائید حاصل نہ ہو۔

علماء کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم و آگہی پر غور کرتے تھے۔ یہ بھی انتہائی کم نظری کی دلیل ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم پر تکبر نہیں، حق تعالیٰ کی بے مثال بخشش عطا پر اس کا شکر ادا کرتے تھے۔ اللہ نے انہیں ”علم لانی“ کی وافر مقدار سے سرفراز کیا تھا، اس لئے اُس دور کے علمائے ظاہر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے حذر رکھتے تھے اور مختلف الزامات تراشتے رہتے تھے۔ ان ہی الزامات میں سے ایک الزام کفر کا بھی تھا، جس کی بنیاد پر حضرت شیخ کو شہر بدر کیا گیا۔

”علم لانی“ اس علم کو کہتے ہیں، جو کتابوں اور استادوں کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ اپنے جس بندے کو چاہتا ہے، براہ راست عطا کر دیتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے جس علم کا ذکر کیا کرتے تھے، وہ عام علم نہیں تھا۔ دراصل علم وہ ہے، جو عمل کے تابع ہوتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے بارے میں سب سے مختصر اور سب سے جامع بات کہی ہے۔ ”سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی عالیہ وہی ہے، جسے قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔“

یہی وجہ تھی کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو سورۃ بقرہ یاد کرنے میں بارہ سال کا طویل عرصہ لگ گیا تھا۔ اس بات کی وضاحت علمائے کرام نے اس طرح کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علم کے ساتھ عمل بھی سیکھا تھا۔ مشہور اور جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ”ہم صحابہ نے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھا تو علم و عمل کو ساتھ ساتھ سیکھا۔“

حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے حصولِ علم کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”میری عمر کے تیس سال مجاہدات میں گزرے۔ مگر میں نے اپنے اوپر علم اور اس کی متابعت یعنی عمل سے بڑھ کر کوئی چیز سخت اور دشوار نہیں دیکھی۔“

حضرت امام ابوالقاسم تشری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے علم کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

”شیخ بازیدؒ نے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے پورا قرآن کریم معنوں کے ساتھ حفظ اور زبانی یاد کر لیا۔ معنی سے یہاں مراد دیکھے ہوئے علم پر عمل کرنا ہے۔ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان تین چار سال قرآن حکیم حفظ کر لیتا ہے۔ بعض غیر معمولی ذہین انسانوں نے بہت مختصر مدت میں بھی کتاب الہی کو اپنے ذہن محفوظ کر لیا ہے..... مگر حضرت بازیدؒ بسطامیؒ نے کم و بیش 66 سال میں قرآن کریم حفظ کیا۔ یہ حفظ قرآن کی کیفیت ہے کہ آپؒ جس آیت مقدسہ کو یاد کرتے تھے، اس پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے۔ اسی ایک واقعے سے اندازہ جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ بازیدؒ بسطامیؒ کس شہان کے بزرگ تھے۔



حضرت بازیدؒ بسطامیؒ نے فقہ کے ساتھ حدیث رسول ﷺ کا عمل بھی حاصل کیا تھا۔ متعدد سیرت نامہ کے مطابق حضرت بازیدؒ بسطامیؒ احادیث پاک کے ایک ثقہ راوی تھے۔ مشہور بزرگ سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”کشف المحجوب“ میں اور حضرت امام شوانیؒ ”طبقات کبریٰ“ فرماتے ہیں۔

”آنحضرت ﷺ سے شیخ بازیدؒ کی بیان کردہ روایات عالی ہیں۔“

ایک دن اپنی مجلس میں حضرت بازیدؒ بسطامیؒ نے سرور کونین ﷺ کی یہ حدیث مبارکہ بیان کی۔
”رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بے شک! یہ بات یقین کی کمزوری ہے کہ تُو اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کو مار کرے۔ اللہ کے دیئے ہوئے رزق پر لوگوں کی تعریفیں بیان کرتا پھرے..... اور اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی چیز عطا کرے تو تُو لوگوں کی برائی بیان کرے (مفہوم یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی فاعل حقیقی ہے، وہی رازقِ عالم ہے۔ اُس کے کوئی مادی ہستی، کسی کو کچھ دینے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اسی لئے حق تعالیٰ ہی شکر اور تحریف کا مستحق ہے) بے شک اللہ کا رزق ایسا ہے کہ جسے کسی حرص کرنے والے کی حرص اور کسی ناگواری سمجھنے والے کی ناگواری روک نہیں سکتی۔ بخیر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور جلال سے کام لیتے ہوئے طمانیت اور فرحت کو رضا اور یقین میں رکھا اور حزن و دکھ کو شک اور ناراضی میں رکھ دیا ہے۔“

آقائے دو جہاں ﷺ کی اس حدیث مبارکہ میں اسلام کے تین بنیادی نکات کی مختصر تفسیر پیش کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ جب انسان کسی دوسرے انسان سے فیض پاتا ہے تو اُس کی شان میں بڑے بڑے عہدے دے دے۔ حالانکہ جس شخص نے اُسے مادی فائدہ پہنچایا ہے، وہ بھی درپردہ اللہ کے کرم کا صدقہ ہے۔ مزید یہ کہ جو کچھ کسی ضرورت مند کی حاجت روائی کر رہا ہے، اسے بھی اللہ تعالیٰ ہی نے بخشش و عطا کے قابل بنایا ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے سوال کرے اور پورا نہ ہو تو وہ شخص دوسرے شخص کی برائی بیان کر پھرے۔ حالانکہ اللہ ہی کے حکم سے کسی سوالی کو کچھ ملتا ہے۔ اور اللہ ہی کے حکم سے اس کے دست سوال کو جھک جاتا ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی کامیابی پر اپنے ہم جنسوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ حقیقتاً وہی کارساز ہے۔ اور وہی اپنے بندوں کی مرادیں بر لاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی انسان کا مقصد پورا نہ ہو سکے تو وہ متعلقہ افراد کی برائی نہ کرے بلکہ صبر سے کام لے۔ اس لئے کہ اس کام کی تکمیل مشیت الہی میں نہ تھی۔

دوسرے یہ کہ حرص کرنے والے انسانوں کی ناگواری اللہ کے انداز تقسیم کو بدل نہیں سکتی۔ تمام جن و انس ال کے قدرت و جبروت کے سامنے مجبور محض ہیں۔ جس شخص کو حق تعالیٰ سرب بلند کرنا چاہتا ہے، اسے جنوں اور انسانوں

کے سارے قابل مل کر بھی پست نہیں کر سکتے۔ اور اسی طرح جب وہ خلاق عالم کی پر ذلت و بربادی مسلط کرنا چاہتا ہے تو ساری کائنات مل کر بھی اسے نحوست و رسوائی کے دائرے سے نکال نہیں سکتی۔

تیسرے یہ کہ انسان کی طہانیت و فرحت کا انھار رضائے الہی اور یقین میں ہے۔ اور جو لوگ شک کرتے ہیں، رنج و ملال اُن کا مقدر ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی اسی حدیث پاک پر عمل کرتے ہوئے گزری۔ آپ متوکل تھے، صابر تھے، شاکر تھے اور حق تعالیٰ کی ذات پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے۔ اسی طرح حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ پر نہ صرف عمل پیرا تھے بلکہ تارکِ سنت کا چہرہ تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ آپ "عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم" سے اس قدر سرشار رہتے تھے کہ آپ کی جذباتی کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ علامہ اقبال کے بقول۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام!

میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی آپ کی ولایت کی بنیاد تھی اور اسی عشق کے طفیل حضرت بایزید بسطامی "سلطان العارفین" کے منصب تک پہنچے تھے۔ یہ وہ لقب نہیں، جیسا کہ آج کل کے مرید اپنے پیروں کے ناموں کے ساتھ "القابات" کی ایک طویل فہرست چسپاں کر دیتے ہیں۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ بھی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو "سلطان العارفین" کے لقب سے یاد فرماتے تھے اور اپنی زبان مبارک سے یہ لفظ ادا کرتے وقت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا سر مبارک احترام سے جھک جاتا تھا۔



کسی تاریخ سے یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تھا تو اُس وقت سلطان العارفین حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کس شہر میں سکونت پذیر تھے۔ مگر اس واقعے کی صحت میں کوئی کلام نہیں کہ تمام معتبر تذکرہ نگاروں نے اسے تواتر کے ساتھ اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ایک دن حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس روحانی آراستہ تھی۔ کسی خدمت گار نے عرض کیا کہ فلاں مقام پر کوئی خدا رسیدہ بزرگ رہتے ہیں۔ پھر اس شخص نے ان بزرگ کی اس قدر تعریف کی کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بے قرار ہو کر فرمایا۔

"ہم اس مردِ حق کی زیارت کو ضرور جائیں گے۔"

"شیخ! وہ جگہ تو یہاں سے بہت دُور ہے۔" دوسرے خدمت گار نے عرض کیا۔

"وہ مقام کتنی دُور ہو گا؟" حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خادم سے پوچھا۔

"کوئی دو ماہ کی مسافت پر۔" خدمت گار نے عرض کیا۔ "اور راستہ بھی دُشوار گزار ہے۔"

"اگر وہ جگہ تمام عمر کی مسافت پر بھی ہو اور اس راہ میں ہزار مشکلات بھی ہوں، تب بھی ایک مردِ حق کے دیدار کی ہلکی سی جھلک بھی زیادہ قیمتی ہے۔" یہ کہہ کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا مصلہ اٹھایا اور ان بزرگ کی زیارت کے لئے اپنے ایک مرید کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔

حضرت شیخ ابو ابراہیم بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلسل دو مہینے تک اپنا سفر جاری رکھا اور بہت سی صعوبتیں برداشت کر کے اس شہر پہنچے، جہاں وہ بزرگ قیام فرماتے تھے۔ بزرگ کے عقیدت مندوں نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو بتایا کہ شیخ ابھی ابھی نماز کے لئے مسجد تشریف

لے گئے ہیں۔

ان بزرگ کے لئے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے تاثر میں مزید اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ آپ کو خود بھی نماز بے پناہ عشق تھا۔

حضرت شیخ تیز رفتاری سے مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ان بزرگ کے قریب پہنچ گئے۔ بزرگ پشت حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تھی۔ آپ کے مرید کا بیان ہے کہ پیر و مرشد کے چہرہ مبارک پر سرشار رنگ اس طرح نمایاں تھا، جیسے انہیں نعمت غیر مترقبہ حاصل ہو گئی ہو۔ بزرگ مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر ان دوران انہوں نے قبلے کی طرف منہ کر کے تھوکا اور مسجد کے دروازے میں داخل ہو گئے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑھتے ہوئے قدم اچانک رک گئے اور آپ نے اپنے خدمت گار کو مخاطب کر فرمایا۔ ”واپس چلو!“

مرید، پیر و مرشد کے حکم پر حیرت زدہ رہ گیا۔ ”اور بزرگ کا دیدار؟“

”بس، دیدار ہو چکا۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔

خادم اس صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسے مسافر کو دیکھا تھا، جو نے منزل تک پہنچنے کے لئے دو ماہ کی طویل مسافت طے کی تھی اور موسم کی بے شمار سختیاں جھیلی تھیں۔ اور اب اس مسافر منزل پر پہنچ کر آسودہ ہونے کے بجائے واپس جا رہا تھا۔ خادم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ حضرت شیخ سے اپنی واپسی کا سبب دریافت کر سکتا۔

”کم سے کم بزرگ کو سلام ہی کر لیں۔“ مرید نے جھجکتے ہوئے عرض کیا۔ دراصل وہ خود بھی ان بزرگ زیارت کا شوق رکھتا تھا۔

”میں اُس شخص کو کیسے سلام کر لوں، جسے یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ جدھر منہ کر کے تھوک رہا ہے، اُدھر قبلہ ہے۔“

اگرچہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی شیریں کلائی مشہور تھی، لیکن اس وقت گفتگو کرتے ہوئے آپ کے لہجے سے شدید نفی جھلک رہی تھی۔

پیر و مرشد کے اس جواب کے بعد مرید کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خدمت گار کو ذہنی کشاکش کا شکار پا کر فرمایا۔ ”یہ شخص جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب زندگی میں ایک ادب اور سنت پر محفوظ نہیں ہے تو یہ اپنی ولایت کے دعوے میں کیونکر محفوظ اور قابل اعتماد ہو سکتا ہے؟“



اسی طرح حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ تصوف کی دنیا میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔

”شیخ! مجھے بیعت سے سرفراز کر دیجئے۔“

”درویشی ایک کارِ دشوار ہے۔ تم اس کی نزاکتوں اور دشواریوں کو برداشت کر سکو گے؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے نووارد شخص سے دریافت کیا۔

”میں یہ بات طے کر کے آیا ہوں کہ اپنی بقیہ زندگی اسی آستانے پر گزار دوں گا۔“ وہ شخص بہت زیادہ پرجوش اور پُر عزم نظر آ رہا تھا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کے طالب کو بہت سمجھایا مگر جب وہ مسلسل اصرار کرتا رہا تو آپؑ نے اسے قلعہ ارادت میں شامل کر لیا۔
پھر وہ شخص بہت ذوق و شوق کے ساتھ اپنے شیخ کی خدمت گزاری میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے۔

ایک دن عجیب بات ہوئی کہ وہ مرید حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا۔
”شیخ! مجھے اجازت دیجئے۔“

”کسی سفر پر جا رہے ہو؟“ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرید سے سوال کیا۔
”سفر پر نہیں، آپ کی خانقاہ سے جا رہا ہوں۔“ مرید نے خلاف معمول بیزاری کے لہجے میں کہا۔ ”اور ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ہونٹوں پر عارفانہ ہنس اُبھر آیا۔ ”آئے کیوں تھے جو واپس جا رہے ہو؟“
حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا۔

”آپ کی روحانیت کے بہت قصے سنے تھے۔“ رخصت ہونے سے پہلے مرید کے چہرے پر پیر و مرشد کے لئے رنگ عقیدت کا عکس تک نہ تھا۔

”پھر تم نے اُن قصوں میں کوئی صداقت دیکھی؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اُسی شفیق و مہربان لہجے میں پوچھا۔

”آپ تو روحانیت سے بالکل خالی ہیں۔“ مرید کا طرز گفتگو غیر مودبانہ تھا۔

”تم روحانیت کسے سمجھتے ہو؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اُس شخص سے پوچھ رہے تھے، جو کئی سال تک آپؑ کی صحبت میں رہنے کے باوجود عقل کے فریب سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا تھا۔

”روحانیت صرف کرامت کا نام ہے۔“ مرید کا انداز کلام مرید گستاخانہ ہو گیا تھا۔ ”میں اُسی کرامت کی تلاش میں آپ کے در پر آ رہا تھا۔ مگر افسوس! میرے کئی سال رائیگاں گئے۔“

”ہمیں خود بھی تمہارے وقت کی بربادی کا افسوس ہے۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بے مثال ضبط و تحمل اور عجز و انکسار کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ”کچھ دیر بعد تو تم چلے ہی جاؤ گے، مگر اس سے پہلے ہمارے ایک سوال کا جواب دیجئے جاؤ۔“

مرید نے حیران ہو کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھا۔

”تم کئی سال خانقاہ میں رہے اور کھلی آنکھوں سے فقیر کے روز و شب کا مشاہدہ کیا۔“ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”کیا تم نے کبھی اس عاجز کو شریعت اور سنت کے خلاف کوئی کام کرتے ہوئے دیکھا؟“

مرید بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس کا ذہن مختلف راستوں پر سفر کر رہا تھا اور وہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ایک لمحے کا جائزہ لے رہا تھا۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد اس نے کہا۔

”اظہار کرامت نہ سہی، لیکن آپ شریعت کے پوری طرح پابند ہیں۔“ کرامت کی جستجو میں ایک عارفِ کامل سے بدگمان ہونے والے مرید نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے عاملِ شریعت و سنت ہونے کا اعتراف کر لیا۔

”پھر تم مجھ سے کون سی کرامت کا اظہار چاہتے تھے؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت پرسوز لہجے میں فرمایا۔

کرامت کے طلب گار مرید کی آنکھوں کے سامنے سے حجابات اٹھ گئے اور وہ پیر و مرشد کے قدم لپٹ گیا۔



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بظاہر عامل سنت تھے۔ مگر حقیقتاً آپ رحمۃ اللہ علیہ فدائے سنت تھے۔ عالمین سنت تو بے لیکن حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ عاشق سنت تھے اور اسی عشقِ وارفتہ نے آپ کو اس قدر سرفراز کیا کہ عارف سلطان کہلانے لگے۔

جس شخص کی زیارت کے لئے آپ نے چار ماہ کی طویل مسافت اختیار کی اور پھر محض اس پناہ پر ملاقات نہ کی کہ وہ ایک تبارک سنت تھا۔ ممکن ہے کہ اس بزرگ سے وہ غلطی سہواً سرزد ہو گئی ہو۔ مگر حضرت بسطامی کی غیرتِ عشق نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ پھر جب خدمت گاروں نے عرض کیا کہ آپ عام لوگو معاملات میں تو اتنے سخت نہیں۔ اُن سے دن رات کتنی ہی سنتیں ترک ہوتی رہتی ہیں۔“ جواب میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”ان میں سے اکثر تو بے خبر ہوتے ہیں۔ اور جو باخبر ہو کر سنت ترک کرتے ہیں، گناہ کے مرتکب ہوتا ہے۔ پھر بھی اُن کے گناہ اُن کی ذات تک محدود رہتے ہیں۔ عام معاشرے کے لئے زیادہ ضرر رساں ثابت نہیں ہے۔ مگر جب کوئی شخص اپنے پیچھے ہزاروں عقیدت مند رکھتا ہے اور پھر منبر پر بیٹھ کر کوئی غلط بات کہتا ہے تو عوام پر زیادہ اثرات قبول کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ غلطی ایک جہت بن جاتی ہے۔ اور پھر غلطیوں کا سلسلہ دراز جاتا ہے۔ اس لئے جسے منبر پر بیٹھ کر جلوہ آرائی کا شوق ہو، پہلے اپنے آپ کو شریعت اور سنت کے لباس سے کرے، پھر مند پر بیٹھ کر کہے کہ لوگو! میری طرف دیکھو۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ جس مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے، وہ آپ کے گھر سے کچھ فاصلے پر واقع ساری زندگی گزار دی، مگر آپ نے مسجد کے احترام میں اُس راستے پر کبھی نہیں تھوکا۔ جب بھی نماز پڑھنے کے گھر سے نکلتے، آپ کا چہرہ مبارک خوف سے زرد ہوتا۔ کسی مرید نے آپ سے اس کیفیت کے بارے میں پوچھا۔ فرمایا۔

”جب کوئی غلام، آقا کے دربار میں حاضر ہوتا ہے تو اُس کی یہی حالت ہو جاتی ہے۔“

ایک روایت کے مطابق حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس سال تک ایک مسجد کی مجاوری کی تھی۔ آپ ہاتھ سے خانہ خدا میں جھاڑو لگاتے اور مسجد کو آئینے کی طرح صاف و شفاف رکھنے کی کوشش کرتے۔

بعض مؤرخین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ وہی مسجد تھی، جو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کے قریب آباد ”تذکرۃ الاولیاء“ میں حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ مسجد کے دروازے پر پہنچتے، گھبرا کر رُک جاتے اور کچھ دیر تک دوتے رہتے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو شیخ نے فرمایا۔

”میں اپنے آپ کو حاضہ عورت کی طرح پاتا ہوں، جو مسجد میں جانے سے ڈرتی ہے کہ کہیں خانہ خدا کا نہ کر دے۔“

یہ احتسابِ نفس اُن ہی صوفیائے جانباز کا حصہ ہے، جو شریعت و سنت کے راستے میں سرفروشی کی تمنا نہ کرتے۔ اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اُن سرفروشوں کے امام تھے۔



خوف الہی اور عشق رسول ﷺ ہی حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے عمل کی اساس تھی۔

قرآن کریم کی ایک آیت مقدسہ کے ذریعے حق تعالیٰ اپنے بندوں پر خوف کا مفہوم اس طرح ظاہر فرماتا ہے۔
”بے شک! اللہ سے وہی ڈرتے ہیں، جو زیادہ علم والے ہیں۔“ (۳۵/۱۸)

برصغیر کے مشہور ریاضی داں اور دانشور علامہ عنایت اللہ مشرقی ایک بار ماہر فلکیات پروفیسر ولیم جیمز سے ملے۔ پروفیسر نے اس موضوع پر ایک طویل تقریر کی کہ اللہ کو سب سے زیادہ اہل علم ہی جانتے ہیں۔ تقریر ختم کرنے کے بعد پروفیسر جیمز نے اپنے مہمان کی تواضع کے لئے چائے پیش کی۔ چائے پینے کے دوران علامہ عنایت اللہ مشرقی اپنے میزبان سے مخاطب ہوئے۔

”پروفیسر! علم فلکیات پر آپ کی تحقیقات لائق ستائش ہیں۔ مگر پھر بھی ہماری مذہبی کتاب کی ایک آیت سن لیجئے۔“
پروفیسر ولیم جیمز نے حیرت سے علامہ عنایت اللہ مشرقی کی طرف دیکھا۔ پروفیسر اپنے علم میں ایک بحرِ ذخار تھا۔ تمام دنیا کے طالب علم ”فلکیات“ کے موضوع پر ولیم جیمز ہی سے رجوع کرتے تھے۔ اب علامہ مشرقی نے قرآن کریم کا حوالہ دیا تو پروفیسر حیرت زدہ رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ چودہ سو سال پہلے نازل ہونے والی کتاب ”فلکیات“ کے مشکل ترین مسائل کا احاطہ کس طرح کرے گی؟

ایک عیسائی کی حیثیت سے وہ بائبل (انجیل مقدس) کا بار بار مطالعہ کر چکا تھا، مگر اس نے کسی مقام پر بھی اس آسمانی کتاب میں ”آسمان کے مسائل“ پر ہلکا سا اشارہ بھی نہیں پایا تھا۔ غرض اسی حیرت کے عالم میں اس نے علامہ عنایت اللہ مشرقی سے وہ آیت مقدسہ سنانے کے لئے کہا۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی کا بیان ہے کہ جیسے ہی انہوں نے آیت مقدسہ کا ترجمہ کیا، پروفیسر ولیم جیمز کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔ کچھ دیر تک وہ سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا، پھر بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں بولا۔
”عنایت اللہ! جس راز کو جاننے کے لئے میں نے اپنی ساری عمر بسر کر دی اور بڑھاپے کی حدوں میں داخل ہونے کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اللہ سے وہی لوگ زیادہ ڈرتے ہیں جو زیادہ علم رکھتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے پیغمبر ﷺ اسی تھے، بالکل پڑھے لکھے نہیں تھے۔ پھر وہ مشکل ترین نکتے پر کس طرح پہنچے؟ یقیناً یہ نازک بات ان کے خدا نے انہیں بتائی ہوگی۔ میں نہیں جانتا کہ متعصب عیسائی پادری، پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں کیا کہتے ہیں، مگر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں کہ محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول تھے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ بھی اللہ تعالیٰ سے اس لئے ڈرتے تھے کہ زیادہ علم والے تھے..... اور اسی علم نے آپ کو اپنے نفس کا احتساب کرنا سکھایا تھا۔

ایک دن کسی شخص نے عرض کیا۔ ”شیخ! مجھے وہ چیز سکھا دیجئے، جس کے ذریعے نجات حاصل ہو جائے۔“
حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ نے فرمایا۔ ”صرف دو باتیں یاد رکھو اور باقی سب کچھ فراموش کر دو۔ تمہارے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ اللہ اپنے بندے کے ہر فعل سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر فعل سے بے نیاز ہے۔“

اس قول مبارک کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی بندہ دن رات عبادت کرتا ہے اور پھر سمجھتا ہے کہ اس نے عمل کی معراج حاصل کر لی تو یہ اُس کی بھول ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی حدیث پاک ہے۔ ”میں اُس کی اتنی عبادت نہ کر سکا، جتنا کہ عبادت کا حق تھا..... اور

میں اُسے اتنا نہ پہچان سکا، جتنا کہ پہچاننے کا حق تھا۔“

جب خیر البشر اور سردار انبیاء علیہ السلام کا یہ اعتراف موجود ہے تو پھر باقی لوگوں کی عبادت اور معرفت کی اتنی چیز باقی رہ جاتی ہے کہ اگر اللہ اپنے فضل و کرم سے قبول کر لے تو سب کچھ ہے ورنہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ حضرت بسطامی رحمہ اللہ نے اللہ کی جس بے نیازی کا ذکر کیا ہے، حضرت امیر خسرو رحمہ اللہ نے اُسی شانِ بے نیازی کو اپنے ایک شعر میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔

گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بردت

دامن عزت ترا گرد زوال کے رسد

(اگر تیرے جاہ و جلال کے دروازے پر تمام جن و انسان جل کر خاک ہو جائیں، تب بھی تیرے عزت و دامن تک زوال کا غبار نہیں پہنچ سکتا)

یہی وہ خوفِ الہی تھا کہ جس کے سبب مسجد میں داخل ہوتے وقت حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے جسم پر طاری ہو جاتا تھا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ نے کئی حج ادا کئے اور بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

ایک بار حج کے لئے تشریف لے گئے تو عجیب کیفیت تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سجدہ کرتے تھے اور آپ رقت طاری ہو جاتی تھی۔ ہم سفروں نے آپ کی یہ حالت دیکھی تو حیران ہو کر پوچھا۔
”شیخ! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“

جواب میں حضرت بایزید بسطامی نے فرمایا۔ ”اللہ کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں۔“

”اس طرح تو ہم لوگ دقت پر نہیں پہنچ سکیں گے۔“ ساتھیوں نے عرض کیا۔

”تمہیں کس نے روکا ہے؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ نے اُن لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا، جو سفر حج میں آپ کے ہمراہ تھے۔

”ہمیں آپ کی سجدہ ریزی کی وجہ سے ٹھہرنا پڑتا ہے۔“ ہم سفروں کا لہجہ کسی قدر شکایت آمیز تھا۔

”تمہیں ٹھہرنے کے لئے کس نے کہا ہے؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ نے فرمایا۔ ”یہ کسی دنیوی بادشاہ کا

دربار تو ہے نہیں کہ دوڑتا ہوا چلا جاؤں۔ میں تو اسی طرح بارگاہِ ذوالجلال میں حاضر ہوں گا۔ جسے جانا ہے، وہ چلا جائے۔“

اس سخت کوشی کا متحمل کون ہو سکتا تھا؟ آخر تمام ساتھی چلے گئے اور حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ قدم قدم پر رزمِ بندگی ادا کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ آپ کے تمام ہم سفروں کا خیال تھا کہ اگر حضرت شیخ اسی طرح سجدہ کرتے رہے تو حج کا زمانہ گزر جائے گا اور آپ کئی سال بعد مکہ معظمہ پہنچیں گے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے شرکائے سفر دنیا دار انسان تھے اور ظاہری اسباب کی بنیاد پر اندازے قائم کیا کرتے تھے۔ اُن کی رسائی کے مطابق اُن کے اندازے بھی درست تھے۔ مگر وہ لوگ اس وقت حیران رہ گئے، جب حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ شریکِ حج تھے اور اُن کی آنکھوں کے سامنے طواف میں مصروف تھے۔

واضح رہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ نے اپنا طریق کار نہیں بدلا تھا۔ آپ نے اسی طرح قدم قدم پر سجدہ کرتے ہوئے طویل فاصلہ طے کیا۔ اب یہ اُس ذاتِ بے نیاز کی شانِ قدرت ہے کہ جس کے حکم پر حضرت بایزید بسطامی، اے اللہ! میں حاضر ہوں..... اے اللہ! میں حاضر ہوں کی گردان کر رہے تھے۔ اُسی قادرِ مطلق نے زمین کی

”مٹاپوں کو کھینچ دیا تھا اور طوالت کو اختصار میں بدل ڈالا تھا۔ یہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بڑی کرامت تھی، مگر آپؑ نے اراداً اس کا اظہار نہیں کیا۔



ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ حج کے ارادے سے روانہ ہوئے مگر چند منزلیں طے کر کے واپس لوٹ آئے۔ خدمت گاروں کو پیر و مرشد کی واپسی پر شدید حیرت ہوئی۔ ایک خادم نے جھجکتے ہوئے عرض کیا۔

”شیخ! آپؑ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”اللہ کے فضل سے میں تندرست و توانا ہوں۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”مگر کیا تم میرے چہرے پر بیماری کے آثار دیکھ رہے ہو؟“

”میں یہی سمجھا کہ شاید بیماری کی وجہ سے آپؑ نے حج کا ارادہ ملتوی کر دیا۔“ خدمت گار نے عرض کیا۔

خادم کی باتیں سن کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے تبسم فرمایا۔

”میں تو حج کی نیت لے کر گھر سے نکلا تھا، مگر ایک شخص نے میرا ارادہ بدل دیا۔“

خدمت گار نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔

”یہاں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو پیر و مرشد کا ارادہ بدل سکتا ہے؟“

”تمہیں پتہ نہیں کہ اللہ کے کیسے کیسے بندے ہیں اور کن کن حالوں میں پھر رہے ہیں۔“ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ابھی میں نے مشکل سے اپنے سفر کی چند منزلیں طے کی ہوں گی کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا اور میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا، وہ کیا چاہتا ہے؟

جواب میں اُس اجنبی شخص نے کہا۔

”بایزید! میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا۔ بس اتنا پوچھتا ہوں کہ تو اللہ کو بسطام میں چھوڑ کر کیوں جا رہا ہے؟“

حضرت بایزید بسطامی نے اپنے مریدوں اور خادموں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”میں اس شخص کے سوال کے جواب میں بسطام لوٹ آیا ہوں۔“

اس واقعے سے قارئین کو یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ ایک اجنبی شخص کے کہنے سے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حج کا ارادہ تبدیل کر دیا تھا۔ حضرت شیخؒ حج تو کئی بار کر چکے تھے، اس لئے حج کا فریضہ آپؑ کے ذمے باقی نہیں تھا۔ اجنبی شخص کی اچانک آمد ایک ہدایت غیبی تھی، جس کے ذریعے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر معرفت کا ایک اہم راز ظاہر کیا گیا تھا۔ اور وہ راز یہ تھا کہ رب کعبہ ہر جگہ موجود ہے۔ جیسا کہ ایک بزرگ کا فرمان ہے۔

”تم گھر کو دیکھتے ہو اور میں گھر والے کو دیکھتا ہوں۔“



اسی طرح حج کے حوالے سے ایک اور اہم واقعہ تاریخوں میں مذکور ہے۔ ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ حج کے لئے تشریف لے جا رہے تھے کہ اچانک راستے میں ایک اجنبی شخص مل گیا اور آپؑ سے پوچھنے لگا۔

”شیخ! کہاں جا رہے ہو؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ شخص کہنے لگا۔ ”تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟“

”میں سود بنا رہا ہوں۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب فرمایا۔

”شیخ! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں عیال دار بھی ہوں اور مفلس بھی۔“ اجنبی شخص نے کہا۔ ”اگر آپؑ وہ رقم

میرے حوالے کر دیں تو دونوں کام ہو جائیں گے۔ ایک طرف میری ضرورتیں پوری ہو جائیں گی اور دوسری طرف آپ کا حج بھی ہو جائے گا۔“

اجنبی شخص کی بات سننے ہی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بے اختیار ہو گئے۔ ”سچ کہا تم نے..... سچ کہا تم نے!“ اتنا کہہ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ اس دوران آپ کی زبان پر ایک بات تھی کہ سچ کہا تم نے۔ پھر جب سات چکر مکمل ہو گئے تو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ساری رقم نکال کر اس شخص کے قدموں پر رکھ دی، پھر بڑے عاجزانہ لہجے میں فرمایا۔

”میں شکر گزار ہوں کہ تمہاری وجہ سے میرا حج بھی ہو گیا اور میں راستے کی دشواریوں سے بھی بچ گیا۔“ وہ شخص رقم لے کر خوش خوش اپنے گھر چلا گیا اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شہر بسطام لوٹ آئے۔ یہ واقعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مجرد انکساری اعلیٰ ترین مثال ہے۔ آپ کچھ کہے بغیر بھی وہ رقم اس شخص کے حوالے کر سکتے تھے۔ مگر اس طرح اُسے اپنی تحقیر محسوس ہوئی۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اجنبی شخص کے گرسدات لگائے اور اُس کا شکر یہ ادا کیا۔ یہ محض ایک غریب و محتاج انسان کی دلجوئی کے لئے تھا۔ ورنہ شریعت و سنت کا فخر ترین عامل اپنے مذہبی فریضے کو خوب جانتا تھا۔ سرور کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مقدس ہے۔

”اپنے بھائی کے لئے مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔“ اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دینی بھائی کے لئے صدقہ عظیم پیش کیا تھا۔



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات مبارکہ میں کئی بار بیت اللہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ مگر مرتبہ آپ کا مشاہدہ نیا ہوتا تھا۔

فرماتے ہیں۔ ”جب میں پہلی بار حج کے لئے روانہ ہوا تو میں نے گھر کو اچھی طرح دیکھا، مگر گھر والا نظر نہیں آیا۔ میں سمجھا کہ ابھی میرا حج قبول نہیں ہوا ہے۔“

”پھر دوسری بار مکہ معظمہ پہنچا تو میں نے گھر بھی دیکھا اور گھر والے کو بھی۔“ یہ روحانی درجات کی بلندی طرف اشارہ ہے۔ ایک سال کے دوران قوت مشاہدہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔

پھر تیسرے حج کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”جب تیسری مرتبہ بیت اللہ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا تو میں نے گھر والے کا خوب مشاہدہ کیا، لیکن مجھے گھر کہیں نظر نہیں آیا۔“



ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ حج کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں آپ کو ایک انسان کھوپڑی نظر آئی۔ یہ ایک عام گزرگاہ تھی۔ قبرستان کا کوئی علاقہ نہیں تھا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حیرت سے اس کھوپڑی کی طرف دیکھا۔ پھر آپ انسانی سر کے قریب پہنچے۔ کھوپڑی پر یہ عبارت تحریر تھی۔

”وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں کیونکہ وہ عقل نہیں رکھتے۔“

یہ عبارت پڑھتے ہی حضرت بایزید نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔

آپ کے ہم سفر سخت پریشان ہوئے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بہت دیر تک راستے میں بے ہوش پڑے رہے۔ پھر جب ہوش آیا تو آپ نے بڑے والہانہ انداز میں اُس کھوپڑی کو بوسہ دیا اور رقت آمیز لہجے میں فرمانے لگے۔

”یہ کسی ایسے صوفی کی کھوپڑی ہے، جو ذکر الہی میں دنیا و مافیہا سے اتنا بے خبر ہو گیا تھا کہ نہ اُس کی زبان نہ

تھی جس سے وہ حق تعالیٰ کا ذکر کرتا، نہ کان رہے تھے جس سے وہ اللہ کی بات سنتا۔ اور نہ اُس کی آنکھ رہی تھی، جس سے وہ اللہ کا جمال دیکھتا۔“

اس واقعے کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ کھوپڑی ایک ایسے انسان کی تھی، جس کے بارے میں خود قرآن کریم نے فرمایا۔

”یہ وہ لوگ ہیں، جو بہرے ہیں، گونگے ہیں اور عقل نہیں رکھتے۔“

یہ قرآنی آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جو پیغمبر اسلام ﷺ کی بات سننے اور سمجھنے سے قاصر تھے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے کھوپڑی پر تحریر شدہ عبارت سے دوسرا مفہوم اخذ کیا۔ آپ کے نزدیک وہ اس صوفی سوختہ جان کی کھوپڑی تھی، جو ذکر الہی میں اس قدر غرق ہو گیا تھا کہ اپنی گویائی، ساعت اور بصارت کی تمام صلاحیتیں کھو بیٹھا تھا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ مفہوم سے ایک اور اشارہ بھی ملتا ہے کہ صوفی کو ایسا ہی ہونا چاہئے، حکمت عملی کے سامنے اپنی عقل کی نفی کر دے۔ غیر اللہ کے بارے میں کوئی حرف اپنی زبان پر نہ لائے اور گونگا ہو جائے۔ صرف کلام الہی اور احکام الہی سننے اور ماسوا کے شور کی طرف سے اپنی سماعتیں بند کر کے ہمیشہ کے لئے بہرا ہو جائے۔ اور اسی طرح ایک بار جلوہ حق دیکھنے کے بعد اپنی آنکھوں پر دنیا کے تمام نظارے حرام کر لے اور بقیہ زندگی ایک نابینا کی طرح گزار دے۔

اصغر گونڈوی کے بقول۔

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے، بیکار ہو جائے



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قدر ریاضتیں اور مجاہدے کئے کہ ان کا تحریری احاطہ ممکن نہیں۔ اور ان میں بعض تو ایسے عجیب ہیں کہ ان کے متعلق سوچتے ہوئے انسانی عقل عاجز آ جاتی ہے۔ پھر بھی ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے، جسے بڑے بڑے مشائخ اور صوفیاء نے تواتر کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ”ایک بار نصف شب کو میرے دل میں خیال آیا کہ میں آدمی رات ذکر الہی میں جاگ کر گزاروں گا..... مگر میرے نفس نے میری مخالفت کی۔ مجھے نفس کی سرکشی پر غصہ آ گیا اور میں نے قسم کھالی کہ اسے اس جرم کی سزا میں سال بھر تک پانی نہیں دوں گا۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا اور سال بھر تک اپنے نفس کو پانی کے ایک قطرے کے لئے ترساتا رہا۔“

قدیم طب یونانی اور جدید میڈیکل سائنس اس واقعے کو عدل اور مشاہدے کی بنیاد پر تسلیم نہیں کرے گی۔ مگر کرامت تو نام ہی اس کا ہے کہ انسانی عقل عاجز آ جائے اور فہم و ادراک دیر تک ٹھوکریں کھانے کے بعد اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کے وجود مطلق کی دلیل دیتے ہوئے ایک شاعر نے کہا تھا۔

ذہن میں جو گھر گیا ، لا انتہا کیوں کر ہوا

جو سمجھ میں آ گیا، پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

اسی طرح اگر ایک ولی اللہ کی کرامت انسانی عقل کی گرفت میں آگئی تو پھر وہ کرامت کس طرح ہوئی؟

سائنس کی جدید ترین ایجادات، تاریخ، جغرافیہ، ادب، منطق اور فلسفے کے ان اساتذہ کی بھی سمجھ میں نہیں جو اپنے اپنے شعبوں میں کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ سائنس، مادی دنیا کی ”صوفیہ“ اور سائنس دان مادی ولی ہیں۔ اُن کی کرامات کو دیکھتے سب ہیں، مگر سمجھتے بہت کم ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سال بھر پانی نہ پینے کے واقعے کو حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے مثنوی میں اس طرح بیان کیا ہے۔

”جب بایزیدؒ نے اپنے اندر نماز کی طرف سے کابلی محسوس کی تو پانی سے پرہیز اختیار کیا۔

اس مرد دانے اپنے مرض کا سبب زیادہ پانی پینے میں پایا تھا۔

بایزیدؒ نے کہا کہ میں ایک سال تک پانی نہیں پیوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا..... اور اللہ نے برداشت کرنے کی طاقت عطا فرمائی۔“ (ترجمہ)



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مجاہدات کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔

”میں نے بارہ سال تک اپنے نفس کو ریاضت کی آگ میں ڈال کر تپایا..... اور اسے ملامت کے ہتھوڑے مسلسل کوٹتا رہا۔ اس طرح میرا قلب آئینہ بن گیا۔“

”پھر پانچ سال تک مختلف عبادتوں کے ذریعے اس پر قلبی چڑھاتا رہا۔“

”پھر ایک سال میں نے خود اعتمادی کی نظر سے اپنے نفس کا مشاہدہ کیا تو اس میں تکبر اور خود پسندی کا مادہ

پایا۔“

”پھر میں مسلسل پانچ سال تک اپنے نفس کو دنیاوی آلائشوں سے بھی بچاتا رہا اور اس میں موجود گناہوں کا

دھو تا رہا تا کہ وہ صاف شفاف ہو جائے۔ میں نے اس کام میں شدید ترین محنت کی۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے

میں کامیاب ہو چکا ہوں..... مگر جب میں نے اس میں خلل کا نظارہ کیا تو سب کے سب مغرور نظر آئے۔“

”اب وقت آ گیا تھا کہ میں ان سب سے ترک تعلق کر لوں۔ چنانچہ میں نے نماز جنازہ پڑھی اور ان سب

اس طرح کنارہ کش ہو گیا، جیسے لوگ قیامت تک کے لئے مُردے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ پھر مجھے واصل الہی

مرتبہ حاصل ہو گیا۔“

نفس کشی کی سخت ترین منزل سے گزرنے کے بعد ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس کے بارے میں

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”میں خلوت میں تھا کہ چند ساعتوں کے لئے یہ خیال میرے ذہن پر مسلط ہو گیا کہ شدید ترین ریاضتوں

مجاہدوں نے مجھے شیخِ وقت کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔“

پھر دوسرے ہی لمحے ایک اور خیال ابھرا، جس نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو تنبیہ کی کہ ایسا سوچنا

گھبر کی علامت ہے۔ اس خیال کے آتے ہی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بے قرار ہو گئے اور آپؒ نے فرما سان کہ

گیا۔ پھر ایک مقام پر پہنچ کر آپؒ نے دعا کی۔

”اے مالکِ بحر و بر! جب تک ٹوکسی ایسے کامل بندے کو نہیں بھیجے گا، جو مجھے میری حقیقت سے آشنا کر دے

اس وقت تک میں تکبیل پڑا ہوں گا۔“

جب حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ اپنے شہر بسطام سے روانہ ہوئے تھے تو ایک خدمت گار بھی آپؒ کے پیچھے بیٹھا

عام طور پر جب حضرت شیخؒ کسی دوسری جگہ جانے کا ارادہ کرتے تھے تو کسی نہ کسی خادم کو بھی ہمراہ لے لیتے تھے۔ مگر اس بار آپؒ خاموشی سے روانہ ہوئے۔ اتفاق سے ایک خدمت گار نے پیر و مرشد کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تو وہ خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ دراصل وہ خدمت گار یہ جانتا چاہتا تھا کہ اس بار حضرت شیخؒ نے اس قدر رازداری کیوں برتی ہے؟ پھر جب حضرت بایزید بسطامیؒ ایک دریا کے کنارے فروکش ہو گئے تو خدمت گار نے سامنے آ کر خدمت عالیہ میں سلام پیش کیا۔

”تم کیوں آئے ہو؟“ حضرت بایزیدؒ نے ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔
”محض اس خیال سے کہ شیخؒ تنہا ہوں گے، شاید میری ضرورت پیش آ جائے۔“ خدمت گار نے دست بستہ عرض کیا۔

”تم واپس جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا۔ ”تمہیں کیا معلوم کہ اس وقت مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔“
خدمت گار، حکم شیخؒ سے مجبور تھا، بادل ناخواستہ واپس چلا گیا۔
اور حضرت بایزیدؒ اس دیرانے میں تنہا رہ گئے۔



حضرت بایزید بسطامیؒ تین دن تک اس دیرانے میں پڑے رہے۔ اس دوران آپؒ ایک ہی دُعا کرتے رہے۔

”اے مالک کون و مکاں! تو اپنے اُس کامل بندے کو میرے پاس بھیج، جو مجھے میری حقیقت سے روشناس کرا سکے۔ اگر تو نے میری راہنمائی نہیں کی تو میں اسی طرح اس دشت میں بڑا رہوں گا۔“
حضرت بایزید بسطامیؒ کی تین راتیں اسی گریہ و زاری میں گزر گئیں۔

آخر چوتھے دن اُس سنسان مقام پر ایک شتر سوار نمودار ہوا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اُس اجنبی شخص کو ہاتھ سے رُکے کا اشارہ کیا۔

جیسے ہی حضرت بایزید بسطامیؒ کے ہاتھ میں جنبش ہوئی، اونٹ کے پاؤں زمین میں دھنسے لگے۔ جو شخص اونٹ پر سوار تھا، اُس نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی کھلی آنکھ بند کر لوں اور بند آنکھ کھول دوں تاکہ بایزیدؒ سمیت پورا بسطام غرق ہو جائے۔“

یہ سن کر حضرت بایزید بسطامیؒ حیران رہ گئے۔ پھر آپؒ نے شتر سوار سے پوچھا۔ ”تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“

”نادان بچوں کی طرح ضدیں کرتے ہو۔“ شتر سوار نے انتہائی خشکی لہجے میں کہا۔ ”اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آ رہا ہوں؟“

”جب تم آگے ہو تو پھر میری خاطر تمہیں بتانا ہی ہو گا۔“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اصرار کرتے ہوئے فرمایا۔

”بایزید! جب تم نے حق تعالیٰ سے دعا کی تھی، اُس وقت میں یہاں سے تمہیں ہزار میل دُور تھا۔“ شتر سوار نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اور اب میں سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں۔“

”پھر میرے سوال کا کیا جواب ہے؟“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے پُر شوق لہجے میں پوچھا۔

”تمہارے سوال کا ایک ہی جواب ہے۔“ شترسوار نے تنبیہ آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اپنے قلب کی سخت نگرانی کرتے رہو۔ ورنہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ابھی اُس اجنبی سے کچھ اور پوچھنا چاہتے تھے مگر وہ شترسوار اچانک غائب ہو گیا۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ ”اُس روز مجھ پر یہ راز کھلا کہ اُن کے جاں سوختہ کہاں کہاں ہیں اور کس کس حال میں ہیں۔“

اس کے بعد حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ چالیس سال تک مسجد میں مقیم رہے۔ اس مدت میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ مسجد کی دیوار کے سوا کسی چیز سے ٹیک نہیں لگائی۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ ”میں نے چالیس برس تک عام انسانوں کی غذا نہیں چمکی۔ کیونکہ میرا رزق کہیں اور سے آتا تھا۔ میں اس دوران بڑی سختی کے ساتھ اپنے قلب کی نگرانی کرتا رہا۔ اس کے بدلے میں نے غور سے دیکھا تو ہر سمت بندگی اور خدائی نظر آئی۔ پھر میں نے مکمل تیس سال حق تعالیٰ کی جستجو میں بسر کئے پھر اللہ کو طالب اور خود کو مطلوب پایا۔ اب تیس سال سے میری یہ کیفیت ہے کہ جب میں اللہ تعالیٰ کا نام لینا چاہوں تو پہلے تین بار اپنی زبان کو دھو لیتا ہوں۔“



ایک اور موقع پر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”لوگ مسلسل دو سو سال تک معرفت کے کشن میں سرگم رہتے ہیں، پھر کہیں جا کر انہیں گل مراد حاصل ہوتا ہے۔ مگر حق تعالیٰ کا مجھ پر یہ کرم خاص ہے کہ مجھے وہ پھول اپنا ہی میں حاصل ہو گیا تھا۔“

ایک دن حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس روحانی آراستہ تھی۔ کسی فقیہ نے حضرت بایزید سے پوچھا۔

”شیخ! آپ کے علم کا ماخذ کیا ہے؟ اور وہ علم آپ کو کس نے سکھایا ہے؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب فرمایا۔ ”میرے علم کا ماخذ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور عطا ہے اور سکھانے والا

بھی وہی علام الغیوب ہے۔“

اس کے بعد حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”سرور کونین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مقدس ہے کہ جو شخص اس چیز پر عمل کرتا ہے، جسے وہ جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے ایسے علم کا وارث بنا دیتا ہے جس سے وہ واقف نہیں ہوتا۔“

گزشتہ سطور میں ہم بسطام کے قاضی حسین بن عیسیٰ کا ذکر کر چکے ہیں، جنہوں نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اقوال سن کر آپ پر کفر کا فتویٰ عائد کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو شہر بدر ہونا پڑا تھا۔ ان ہی قاضی بن عیسیٰ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن انہوں نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا۔ ”شیخ! تمہاری معرفت کی حقیقت کیا ہے؟“

جواب میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”میں نے تیس سال تک ”وحدانیت“ کی فضا کا مشاہدہ کیا۔ پھر تیس سال تک میں نے ”الوہیت“ کی فضا کو بہت غور سے دیکھا۔ اور پھر میں تیس سال تک یکتائیت کی فضا میں پرواز کرتا رہا، اس طرح جب نوے سال مکمل ہو گئے تو میں نے بایزید کو دیکھا اور محسوس کیا کہ جو عالم نظروں سے گزرا ہے، وہ بایزید نے ہی دیکھا ہے۔ پھر میں چار ہزار مراتب طے کرنے کے بعد اولیاء اللہ کے کمال تک پہنچا۔ اس بلندی کو دیکھ کر میں نے یہ تصور کر لیا کہ شاید اتنا عظیم مرتبہ کسی کو حاصل نہ ہوا ہو۔ میں کچھ دن تک اسی مغالطے میں

رہا۔ پھر مجھ پر یہ عجیب انکشاف ہوا کہ میرا سر ایک نبی کے قدموں کے نیچے ہے۔ اس وقت میں نے اس حقیقت کو سمجھا کہ ولایت کی انتہا، نبوت کی ابتدا ہوتی ہے..... اور نبوت کی انتہا سے کوئی انسان آگاہ نہیں ہو سکتا۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ انتہائی جذب کے عالم میں بول رہے تھے اور خانقاہ کے درو دیوار پر آپ کی ہیبت طاری تھی۔ ”پھر اُس مقام سے جب میری روح جنت، دوزخ اور ملائکہ کے مشاہدے کے لئے روانہ ہوئی تو وہاں مجھے انبیاء کرام علیہم السلام سے نیاز حاصل ہوا۔ پھر میری روح، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کے لئے آگے بڑھی۔ میں نے دیکھا کہ آگ کے دریا میں سے ایک راستہ گزر کر آگے جاتا ہے اور جہاں وہ راستہ ختم ہوتا ہے، وہاں سے نور کے ہزاروں تجلیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تجلیات کی وجہ سے میری روح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ پاک سے محروم رہ گئی اور مجھ پر ہیبت کے باعث غشی طاری ہو گئی۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں نے فوراً ہی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں سلام پیش کیا۔ اس طرح مجھے اللہ تعالیٰ کا قرب تو حاصل ہو گیا، لیکن اس کے محبوب تک میری رسائی نہ ہو سکی..... کیونکہ اللہ تو ہر بندے کے ہمراہ اور قریب ہے اور ہر بندہ اپنی بصیرت کے مطابق اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اُسی وقت نصیب ہوتی ہے، جب بندہ لا الہ الا اللہ کی منزل سے گزر جائے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا ذاتی مشاہدہ ہے، جس کی وضاحت بڑے سے بڑا عالم بھی نہیں کر سکتا۔ دیگر صوفیائے کرام نے بھی اسی انداز کے مشاہدات بیان کئے ہیں، جن کے بارے میں علماء کے طبقے کی طرف سے ایک ہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ صوفیاء کے بیانات ناقابلِ فہم ہیں۔ بعض علماء اپنی تنگ نظری کے سبب صوفیاء کے وجود ہی سے منکر ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی علماء کا یہ انکار اس شکل میں ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیاء کا فرقرار پاتے ہیں۔ ہم اس مشکل ترین بحث میں نہیں الجھتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم اس کے اہل بھی نہیں۔ تاہم حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی اس گفتگو سے ایک نتیجہ کسی ذہنی خلفشار اور ایک ترڈ کے بغیر اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم رسالت کے کس درجہ عظیم پر فائز ہیں..... اور آپ کے دیدار کی سعادت کن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ بے شمار لوگوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب کی حالت میں دیکھنے کا شرف حاصل کیا ہے..... اور اُن میں سے بہت سے افراد کسی خاص روحانی حیثیت کے حامل نہیں ہوتے۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کریمانہ ہی جدا ہے۔ جب کوئی گناہ گار غلامِ شدت سے یاد کرتا ہے تو آپ اُسے بھی سرفراز فرما دیتے ہیں..... مگر کوئی ایک شخص بھی آپ کے مبارک حلیے اور نورانی خدو خال کے بارے میں تفصیلات بیان نہیں کر سکتا۔ بس اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خواب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے شرف یاب ہو رہا ہے..... اور جہاں تک صوفیائے کرام کا تعلق ہے تو وہ خود بھی روحانیت کے بلند درجے پر فائز ہوتے ہیں، اس لئے شوقِ دیدار میں آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور تابِ جمال نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا تھا، جسے آپ نے صوفیانہ اصطلاحات کے ساتھ بیان کر دیا تھا۔ ہم میں سے کتنے مسلمان سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضر ہوتے ہیں۔ مگر جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حاضر ہوئے تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

ان ہی واقعات کی بنیاد پر ایک فارسی شاعر نے نعتِ مبارک تحریر کی تھی، جس کا مشہور شعر ہے۔

اوب گاہیت زہر آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

(روضہ رسول کریم ﷺ آسمان کے نیچے اس زمین پر ادب کا وہ مقام ہے، جو عرش سے بھی زیادہ نازک ہے اور اسی مقام پر حضرت بایزید بسطامیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ جیسے بزرگ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے)



ایک بار حضرت بایزید بسطامیؒ آدھی رات کے وقت شہر سے باہر نکلے۔ اکثر لوگ گہری نیند سو رہے تھے اور ہر طرف دلکش چاندنی چمکی ہوئی تھی۔ بہت خوبصورت موسم تھا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں۔
”میں قدرت کی رعنائیوں میں گم ہو گیا۔ بہت دیر تک حق تعالیٰ کے انعام و اکرام پر غور کرتا رہا اور اہل دنیا کی ناشکر گزاریوں پر افسوس کرتا رہا کہ وہ کیسے بے خبر سو رہے ہیں؟ پھر جب میں نے بارگاہ ذوالجلال کی طرف نظر کی تو اس کے پہلو میں اٹھارہ ہزار عالم ایک ذرہ محسوس ہوئے۔“

یہ منظر دیکھ کر حضرت بایزید بسطامیؒ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر آپؒ نے بلند آواز کے ساتھ عرض کیا۔ ”اے اللہ! تیری کائنات اتنی وسیع اور اس قدر تنہائی؟“
غیب سے آواز آئی۔ ”جس نے سمجھا، وہ جاگتا رہا اور جو نہیں سمجھا، وہ سو گیا۔“
”الہی! تیری بارگاہ اتنی عظیم ہے اور اس قدر خالی؟“

غیب سے جواب آیا۔ ”جو ناشفستہ رُو ہیں، وہ اس بارگاہ کے لائق کیسے ہو سکتے ہیں؟“
ناشفستہ رُو سے مراد ہے، بغیر ڈھلے ہوئے چہرے۔ یعنی وہ چہرے، جو آنسوؤں سے نہیں دھوئے گئے۔ کیونکہ بارگاہ ذوالجلال میں وہ چہرے زیادہ پسندیدہ ہوتے ہیں، جو اشکوں سے دھوئے جاتے ہیں۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے وضو کے پانی سے اپنے چہرے صاف نہیں کئے اور نماز عشق ادا نہیں کی، وہ چہرے بارگاہ خداوندی کے قابل نہیں ہوتے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے دو بار صدائے غیب سنی تو آپؒ کو خیال آیا۔ ”اس وقت دریائے رحمت جوش میں ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بہتر موقع بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ کیوں نہ بارگاہ حق میں تمام مخلوق کی بخشش کا سوال کروں؟“

اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں۔ ”ابھی میں اللہ تعالیٰ سے اُس کی تمام مخلوق کی مغفرت کے بارے میں التجا کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے خیال آیا، شافع محشر تو رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں خاموش ہو گیا اور میں نے حق تعالیٰ سے عامتہ المسلمین کی بخشش کے لئے کوئی درخواست نہیں کی۔“

کچھ دیر تک فضا پر گہرا سکوت طاری رہا۔ پھر تیسری بار وہی صدائے غیب سنائی دی۔ ”بایزید! اللہ کے حبیب ﷺ کے ادب کی وجہ سے تمہارا نام بلند کر دیا گیا۔ اب قیامت تک کے لئے تمہیں سلطان العارفین کے لقب سے یاد کیا جائے گا۔“

پھر ایسا ہی ہوا۔ ساڑھے گیارہ سو سال گزر جانے کے بعد حضرت بایزید بسطامیؒ کی محبوبیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ہر طبقے کے صوفیاء آپؒ کو سلطان العارفین کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔



حضرت بایزید بسطامیؒ احترام و عشق رسول ﷺ کے حوالے سے اولیائے کرام کی جماعت میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ عشق رسول ﷺ تو ایمان اور عقیدت کا آخری معیار ہے کہ اس معیار پر پورا اترے بغیر کسی

مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ ”مسلمانوں کی جانوں پر رسول اللہ ﷺ کا حق زیادہ ہے۔“ یعنی ایک مسلمان کے لئے سب سے بڑا اعزاز یہی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے حبیب ﷺ کے لئے بے دریغ اپنی جان قربان کر دے۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ ”اے پیغمبر ﷺ! جب تک یہ لوگ دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں آپ کو حکم نہیں بتا لیتے، اُس وقت تک اُن کا کچھ قبول نہیں ہے۔“ یعنی جب تک دنیا و آخرت کے تمام معاملات میں سرکارِ دو عالم ﷺ کی ذاتِ پاک کو مرکزِ ہدایت نہیں بنالیا جاتا، اُس وقت تک انفرادی یا اجتماعی طور پر فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

مثال کے طور پر ایک بار سرورِ کونین ﷺ کی خدمتِ اقدس میں ایک مسلمان اور ایک یہودی اپنا مقدمہ لے کر حاضر ہوئے۔ رسالتِ مآب ﷺ نے دونوں فریقوں کے دعوے سنے اور یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ مسلمان، حضور اکرم ﷺ کی بارگاہِ اقدس سے اٹھا اور یہودی کو لے کر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت عمرؓ نے اُن دونوں کی آمد کا سبب پوچھا تو مسلمان کہنے لگا۔

”میرے اور اس یہودی کے درمیان ایک معاملہ فیصلہ طلب ہے۔ میں اس مقدمے میں آپ کو منصف بنانا ہوں۔ آپ جو فیصلہ کریں گے، مجھے قبول ہوگا۔“ حضرت عمرؓ نے مسلمان سے فرمایا۔ ”اپنے مقدمے کی تفصیلات پیش کرو، اس کے بعد ہی میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں گا۔“

اس سے پہلے کہ مسلمان، حضرت عمرؓ کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کرتا، یہودی درمیان میں بول پڑا۔ ”اے عمرؓ! ابنِ الخطاب! پہلے میری بات سن لو، بعد میں اس شخص کی گفتگو پر دھیان دینا۔“ حضرت عمر فاروقؓ، یہودی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”میں تمہارے پاس آنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ شخص زبردستی مجھے یہاں لایا ہے۔“ یہودی نے مسلمان فریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کچھ دیر پہلے تمہارے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور محمد (ﷺ) نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تھا۔“

حضرت عمر فاروقؓ نے حیران ہو کر اپنے ہم عقیدہ شخص کی طرف دیکھا اور ناگوار لہجے میں فرمایا۔ ”پھر تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

”عمرؓ! میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ حضور اکرم ﷺ معاملاتِ دنیا کو زیادہ نہیں سمجھتے۔“ مسلمان نے اپنے رسول ﷺ کے فیصلے سے انحراف کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں معاملاتِ دنیا کا زیادہ ادراک ہے، اس لئے اپنا مقدمہ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔“

حضرت عمرؓ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔ ”کچھ دیر انتظار کرو۔ میں ابھی تمہارے مقدمے کا فیصلہ کرتا ہوں۔“ حضرت عمرؓ نے مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اور تیزی کے ساتھ گھر کے اندر چلے گئے۔

پھر تھوڑی دیر بعد اس طرح تشریف لائے کہ چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور دستِ مبارک میں برہنہ تلواری تھی۔ ”اے شخص! میں نے تیری رُوداد سن لی اور اب حقائق کی روشنی میں تیرے مقدمے کا فیصلہ کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر آپ نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور دوسرے ہی لمحے مسلمان کا کٹا ہوا سر زمین پر پڑا تھا۔

پھر مسلمانوں کے حلقے میں ایک شور مچ گیا۔ حضرت عمرؓ پر ایک مسلمان کے قتل کا الزام تھا۔ مقتول کا اقارب اور دوسرے برگزیدہ مسلمان، حضرت عمرؓ سے قصاص طلب کر رہے تھے۔
 ”عمر! تم نے ایک مسلمان کو ناحق قتل کیوں کیا؟“ سرور کونین ﷺ نے اپنے جلیل القدر صحابی سے کہا۔

”میرے ماں باپ آپ پر قربان! میں نے کسی مسلمان کو نہیں، ایک منافق کو قتل کیا ہے۔“ حضرت عمرؓ نے کہا۔

دوسرے صحابہؓ نے حجت کی۔ ”جو شخص علی الاعلان کلمہ طیبہ پڑھتا ہے، وہ منافق کس طرح ہو سکتا ہے؟“
 ”جو شخص سرکارِ دو عالم ﷺ کے کسی حکم کو نہیں مانتا، وہ میرے نزدیک منافق کے سوا کچھ نہیں۔“
 حضرت عمرؓ نے اس طرح فرمایا کہ آپ کا چہرہ مبارک یقین کی روشنی سے فروزاں تھا۔
 یہ ایک مشکل ترین مسئلہ تھا، جسے حق تعالیٰ نے وحی کے ذریعے حل فرمایا۔ ”مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود جو حق و باطل میں خوب فرق کرتے ہیں۔“

اس آیت مقدسہ کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ ”فاروق“ کے لقب سے سرفراز ہوئے اور یہ بات واضح ہو کر سرور کونین حضور اکرم ﷺ کے کسی بھی حکم کی صریحاً خلاف ورزی کرنے والا مردود ہے۔
 یہ واقعہ ہم نے اس لئے قلم بند کیا ہے کہ گزشتہ کئی سالوں سے پاکستان جیسے اسلامی ملک میں خود ساختہ مغرب زدہ حلقوں کی طرف سے بعض شرعی احکام کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر چور کے ہاتھ کاٹنا، سر اکو وحشیانہ دور کی سزا سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور دو عورتوں کی گواہی کو خلاف عقل و فطرت قرار دیا جا رہا۔ مزید ستم یہ ہے کہ اس قسم کے مذاکروں کو پاکستانی جینٹلمن سے بھی ٹیلی کاسٹ کیا جا چکا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا ایک شعر ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ ہم محمد مصطفیٰ ﷺ سے وفا نہیں کر رہے ہیں۔ اور اس بے وفائی کا نتیجہ ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ جہاں آقائے دو جہاں ﷺ کے احکام کو ناقابل عمل قرار دیا جاتا ہے، وہاں تو ایسی ہی ذلت و بے نازل ہوتی ہے کہ ہم کاسہ گدائی لئے در بدر بھٹک رہے ہیں اور کوئی ہمیں بھیک دینے والا بھی نہیں۔
 اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی ساری زندگی سخت ترین ریاستوں اور مجاہدوں میں گزارتا ہے لیکن اگر وہ دائرہ پر کسی ایک سنت کو بھی ترک کر دیتا ہے تو اُس کی ولایت کا کوئی اعتبار نہیں۔ ولایت تو عالمین سنت کا انعام ہے۔
 حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بھی صوفیاء کی اُس جماعت کے سرخیل تھے، جو زندگی بھر عشق رسول ﷺ سے سرشار رہے اور پھر اسی آگ کو اپنے سینوں میں روشن کئے ہوئے دنیا سے چلے گئے۔



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پہلی بار حج کے لئے مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور آپؐ نے پورے وثوق کے ساتھ ارکانِ حج ادا کئے۔ پھر اس سرزمین مقدس پر کچھ دن قیام کرنے کے بعد واپس جانے لگے تو ساتھیوں نے پوچھا۔
 ”شیخ! کیا آپ آقائے دو جہاں حضور اکرم ﷺ کے روضہ اطہر کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ حاضر نہیں ہو گئے؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ساتھیوں کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور واپسی کے سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

آپ کے ساتھیوں نے آپ کے اس طرز عمل کو بڑی حیرت سے دیکھا اور دوبارہ وہی سوال کیا۔ ”شیخ! آپ تو بہت بڑے عاشق رسولؐ اور عامل سنت ہیں، پھر آپ روضۂ اقدس کی زیارت کئے بغیر واپس کیوں جا رہے ہیں؟“

”تم اپنے کام سے کام رکھو اور مجھے میرا کام کرنے دو۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے سوال کا جواب دینے سے گریز اختیار کر رہے ہیں۔

ساتھی مسلسل اصرار کرتے رہے۔ ”شیخ! آپ جب تک ہمارے سوال کا واضح جواب نہیں دیں گے، ہم یہی پوچھتے رہیں گے کہ آپ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار اقدس میں حاضری دیئے بغیر واپس کیوں جا رہے ہیں؟“

”ابھی تم لوگوں نے مجھے عاشق رسولؐ کہہ کر پکارا ہے۔“ یہ کہتے کہتے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ آبدیدہ ہو گئے۔ ”اگر میں عاشق ہوں تو پھر مجھے واپس ہی لوٹ جانا چاہئے۔“

تمام درویش آپ کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔ ”شیخ! آپ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا واسطہ، اس نکتے کی وضاحت فرمادیجئے۔“

آخر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دل کی بات کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اور آپ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اپنے طریقے بدل ڈالو مگر میرے نزدیک یہ عمل رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کے خلاف ہے کہ مدینہ منورہ کی زیارت کو مکہ معظمہ کی زیارت کے ماتحت کر دیا جائے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر تمام درویش حیرت زدہ رہ گئے اور حضرت شیخ مکہ معظمہ سے واپس لوٹ آئے۔

پھر دوسرے سال حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ خراسان سے براہ راست مدینہ منورہ پہنچے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار اقدس میں حاضری دینے کے لئے اس طرح آگے بڑھے کہ آپ کی زبان پر درود شریف جاری تھا اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔ پھر جیسے جیسے روضۂ اطہر قریب آتا جا رہا تھا، حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ آپ کسی ادنیٰ غلام کی طرح دست بستہ تھے، نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار رواں تھا۔ یہاں تک کہ آپ تاجدارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ایک نظر روضۂ اطہر کی طرف دیکھا اور بے ہوش ہو گئے۔

پھر بہت دیر تک آپ پر بے ہوشی کی کیفیت طاری رہی۔ اسی دوران حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”بایزید! اٹھو اور واپس جا کر اپنی والدہ کی خدمت کرو۔“

اس کے ساتھ ہی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو ہوش آ گیا۔ آپ نے خدمت اقدس میں سلام پیش کیا اور اپنے وطن بسطام کی طرف روانہ ہو گئے، جہاں آپ کی والدہ ماجدہ، بیٹے کی جدائی کے سبب نہایت شکستہ اور غمناک حال ہو چکی تھیں۔

مشہور عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں بھی اسی انداز کی روایت عام ہے۔ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے عشق کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی کوئی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک نام لیتا، آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پھر جب اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے غزوہٴ احد میں رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہونے کی خبر

سنی تو اس قدر روئے کہ بے حال ہو گئے۔ پھر آپؐ نے اپنے سارے دانت توڑ ڈالے۔ حضرت اولیس قرنیؓ کئی بار خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے کی کوشش کی، مگر ہر مرتبہ والدہ محترمہ کی بیماری آڑے آ جاتی تھی۔ ایک شوق دیدار اس قدر بڑھا کہ والدہ ماجدہ کو بیماری کے عالم میں چھوڑ کر حضور اکرم ﷺ کی زیارت کے لئے اپنے روانہ ہو گئے۔ ابھی مشکل سے ایک منزل بھی طے نہیں کی ہوگی کہ راستے میں نیند آ گئی۔ پھر آپؐ نے حالتِ غلابہ میں فخرِ موجودات ﷺ کو دیکھا۔ سرورِ کائنات ﷺ فرما رہے تھے۔

”اولیس! تم واپس جاؤ اور اپنی والدہ کی خدمت کرو۔ تمہاری حاضری قبول ہو گئی۔“

حضرت اولیس قرنیؓ واپس لوٹ آئے کہ آقائے نامدار ﷺ کا حکم یہی تھا۔ پھر کئی سال تک بیمار ماں کی تیمارداری کرتے رہے۔ اسی دورانِ رسالت پناہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور حضرت اولیس قرنیؓ کے شوقِ دیدار کی ظاہری تکمیل نہ ہو سکی۔ کچھ روایتوں کے مطابق وصال سے پہلے سرورِ کونین ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ کو حکم دیا تھا کہ آپؐ کا لباسِ مبارک حضرت اولیس قرنیؓ کو پہنچا دیا جائے۔ مگر کسی معتبر تاریخ سے اس روایت کی کوئی سند نہیں ملتی۔ تاہم حضرت مولانا عبدالرحمن جانیؒ نے اپنی مشہور نعت میں اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تو جامہ رسانید اولیس قرنیؓ را

(آپؐ کی شانِ کرم تو یہ ہے کہ آپؐ نے اولیس قرنیؓ کے لئے اپنا جامہ مبارک ارسال کیا)



حضرت بایزید بسطامیؒ ایک طویل عرصے کے بعد اپنے وطنِ بسطام واپس لوٹ رہے تھے۔ آپؒ پر خوشی اور سرشاری کی دہری کیفیت طاری تھی۔ ایک تو والدہ محترمہ کی خدمتِ عالیہ میں حاضری اور دوسرے حضور اکرم ﷺ کا حکم۔ آپؒ پر نشاط و انبساط کا عجیب سا غلبہ تھا۔ حالانکہ حضرت بایزید بسطامیؒ تنہائی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جیسے ہی آپؒ بسطام کے گرد و نواح میں پہنچے، لوگوں میں شور مچا گیا۔ ہر طرف ایک ہی جہجہہ تھا۔

”بایزید آرہے ہیں..... بایزید آرہے ہیں۔“

اور پھر جب حضرت بایزیدؒ بسطام کی حدود میں پہنچے تو ایک خلقتِ آپؐ کے استقبال کے لئے حاضر تھی۔ حضرت بایزیدؒ بسطامیؒ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ”انسانوں کا ہجوم دیکھ کر میرے نفس کو بے حساب خوشی حاصل ہوئی۔ پھر جب وہ مسرت و کیف کی لذت سے مخمور ہو گیا تو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”بایزید! تو مخلوقِ خدا کا ہجوم دیکھ رہا ہے۔ یہ ایک عارفِ کامل کے استقبال کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ واقعی تو نے روحانیت میں بہت ترقی کر لی ہے اور اب تو بڑا شیخ ہو گیا ہے۔“

”میرا نفس سرخوشی کے عالم میں مجھوم رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے نفس کے فریب میں آ جاتا، حق تعالیٰ نے میری دستگیری فرمائی۔ وہ رمضان کا مہینہ اور دن تھا۔ ابھی افطار میں دیر تھی۔ میں نے اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا۔

”تیری یہ خوشی بہت عارضی ہے۔ میں اسے تادیر قائم نہیں رہنے دوں گا۔“

اس دورانِ عقیدت مندوں کا ہجوم حضرت بایزیدؒ بسطامیؒ کے قریب پہنچ چکا تھا اور جوشِ جذبات میں برکت حاصل کرنے کے لئے کوئی آپؐ کے دستِ مبارک کو بوسہ دے رہا تھا اور کوئی پیر، بن کو چوم رہا تھا۔

ایک حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پیر بن کی جیب سے ایک روٹی نکالی اور اسے کھانا شروع کر دیا۔ یہ منظر دیکھ کر عقیدت مندوں کے جہوم کو سکتہ سا ہو گیا۔ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ بھی روزہ ترک کر سکتے ہیں۔ مگر وہ حقیقت تھی، فریب نظر نہیں تھا۔ لوگوں نے کئی بار آنکھیں مل کر دیکھا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ واقعتاً روٹی کھا رہے تھے۔

چند لمحوں کی بات تھی۔ جوش عقیدت، شدت غضب میں تبدیل ہو گیا اور محبت نے ناپسندیدگی کا رنگ اختیار کر لیا۔ ”شیخ! یہ کیا ہے؟“ بیک وقت کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

”جو کچھ تمہاری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بے نیازانہ فرمایا۔

”شیخ! تمہیں معلوم ہے کہ ہم نے تمہاری ملاقات کے شوق میں اپنا کتنا وقت برباد کیا ہے؟“ ایک شخص نے با آواز بلند کہا۔ مگر اس کے لہجے سے بخفی نمایاں تھی۔

”میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میرے لئے اپنا وقت برباد کرو۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

”انسوس! میں کیسے فریب نظر میں مبتلا تھا؟“ اس شخص نے چیخ کر کہا۔ ”جو رمضان المبارک کے روزے نہیں رکھ سکتا، وہ معرفت کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے؟“

”شیخ! اگر آپ روزے نہیں رکھتے تو کلم سے کم رمضان المبارک کا احترام ہی کر لیا ہوتا۔“ دوسرا شخص حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ پر طعنہ زن ہوا۔ ”کسی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر کھالیا ہوتا۔ مسلمان کا بھرم تو رہ جاتا۔“

پھر تیسرے شخص نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ”شیخ! ولایت کا دعویٰ بھی کرتے ہو اور سر عام تماشا بھی دکھاتے ہو؟“

غرض جتنے منہ تھے، اتنی ہی باتیں۔ لوگوں نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی ولایت کو ماننے سے انکار کر دیا اور مختلف انداز میں طعنہ زنی کرتے ہوئے واپس جانے لگے۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے واپس جاتے ہوئے جہوم کو پکارا۔ ”میرے ہاتھوں کو بوسہ نہیں دو گے؟ میری عبا کو چوم کر سعادتیں اور برکتیں حاصل نہیں کرو گے؟“

انسانی جہوم میں سے اکثر لوگوں نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی آواز سنی، مگر کوئی پلٹ کر نہیں آیا۔ بس کہنے والے یہی کہتے رہے۔ ”ہم نے ایک ایسے شخص کے شوق و دیدار میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیا، جو روزہ شکن بھی ہے اور شعار اسلام کا احترام بھی نہیں کرتا۔“

الغرض حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدت مندوں کی بھیڑ اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئی۔ بس چند قلیل ارادت مندرہ گئے، مگر انہیں بھی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس طرز عمل پر شدید حیرت تھی۔

”تو نے سن لیا کہ وہ تیرے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں نے تجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ میں تیری خوشی کو زیادہ دیر برقرار نہیں رہنے دوں گا۔ تیرے غرور کی یہی سزا ہے کہ لوگ تیرا مذاق اڑائیں اور پھر تجھے دھتکارتے ہوئے چلے جائیں۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے قلیل ارادت مند اور خدمت گار خاموشی سے آپ کی گفتگو سن رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یقیناً کوئی خاص بات ہے، جسے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا ہے۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں اپنے ارادت مندوں کو

مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”لوگ خود بھی ظاہر میں ہوتے ہیں اور ان کی عقیدتیں بھی نہایت سچی ہوتی ہیں۔ افسوس! وہ یہ بھی نگہ جا کہ مسافر پر روزہ فرض نہیں ہوتا۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ سفر میں تھے اس لئے آپؑ نے روزہ نہیں رکھا تھا۔ مگر ظاہر بینوں کی نظر آزمانے کے لئے اور اپنے نفس کی سرکشی کو زیر کرنے کے لئے آپؑ نے جان بوجھ کر سینکڑوں انسانوں کے روٹی کھائی اور لوگوں کے اعتراضات کا نشانہ بنے۔

ایک بار آپؑ واقعتاً روزے سے تھے، مگر جب عقیدت مندوں کا ہجوم آپؑ کے دیدار کے لئے آستانہ حاضر ہوا تو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح دروازے پر نمودار ہوئے کہ روٹی کا نوالہ کھا رہے تھے۔ مندوں کی بھیڑ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہوئی واپس چلی گئی۔ لوگوں کے جاتے ہی حضرت بایزید بسطامی نے ایک گوشے میں روٹی کا لقمہ تھوک دیا اور اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”مجھ سے تیری یہ خوشی برداشت نہیں ہوتی کہ لوگ تجھے شقی اور پرہیزگار کہہ کر پکاریں اور تُو اپنی توبہ غرور و تکبر میں مبتلا ہو جائے۔“



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ آپؑ کئی سال بعد والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے، اس لئے آپؑ پر شدید جذباتی کیفیت طاری تھی۔ جسم لرز رہا تھا اور دل کی دھڑکنیں بے زور گئی تھیں۔ جس نے درہم تیشی مبر و استقامت کے ساتھ گزارا..... آفات و مصائب کی وادی پُر خار کو ہٹتے پڑے کیا..... اور جو اپنی پوری زندگی میں ایک لمحے کے لئے بھی اُمرائے وقت سے مرعوب نہیں ہوا..... مگر جب مرد بے نیاز اپنی والدہ محترمہ کے حضور میں پہنچا تو شاخِ گل کی طرح کپٹنے لگا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر دستک دینا ہی چاہتے تھے کہ مادرِ گرامی کی آواز سنائی دی۔ وہ عابدہ و زابدہ خاتون رات کے اندھیرے میں فرزند کے لئے خلاقی عالم سے روشنی مانگ رہی تھیں۔

”اے بے مثال بخشش و عطا والے! اگر تیرا کرم شامل حال نہ ہو تو تیرے یہ عاجز بندے صحرائے الم میں رہ جائیں اور غموں کی تیز دھوپ انہیں جلا ڈالے۔ بے شک! تُو ہی ہمارا محافظ ہے۔ تُو ہی دنگیر اور تُو ہی مشکل میں اپنے غریب الوطن بیٹے کے لئے تجھ سے تیرے کرم کے سائبان کا سوال کرتی ہوں۔ تُو اُسے اپنے دامن میں پناہ دے دے کہ تیرے دامنِ رحمت کے سوادوں میں جہان میں کوئی پناہ گاہ نہیں۔ اس کی طرف سے اپنے بندوں کے دل خوش کر دے۔ اُسے اپنے بے شمار خزانوں میں سے آگہی کی اتنی دولت عطا فرما دے کہ وہ کسی کا نہ رہے۔ اور میرے بیٹے طیفور کے حالات کو اتنا سنو کہ اُسے نجات حاصل ہو جائے۔“

والدہ محترمہ کی دُعا اس قدر اثر انگیز تھی کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ جیسے صاحبِ دل بزرگ اپنے آپ نہ رکھ سکے اور ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے۔ پھر کچھ دیر بعد حالتِ اضطراب میں کسی قدر کمی آئی تو آپؑ دروازے پر دستک دی۔

والدہ محترمہ، دُعا سے فارغ ہو چکی تھیں مگر وہ اپنے بیٹے کی یادوں میں اس قدر گرم تھیں کہ پہلی دستک کی آواز سن سکیں۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ چند لمحوں تک انتظار کرتے رہے۔ پھر جب اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو نے دوبارہ دستک دی۔ اب کی مرتبہ دستک کی آواز پہلے سے زیادہ تیز تھی۔

”کون ہے مجھی؟“ جواب میں والدہ محترمہ کی رندھی ہوئی آواز ابھری جسے سن کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ شدت جذبات کے سبب آپ پر رقت طاری تھی۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دروازے پر کھڑے کھڑے والدہ ماجدہ کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا، اس لئے بے قرار ہو کر بولے۔ ”مادر گرامی! میں ہوں، آپ کا غریب الوطن بیٹا طیفور۔“ حضرت بایزید بسطامی کی آواز پر بھی رقت کا غلبہ تھا۔

”طفیور یہاں کہاں ہے؟“ والدہ محترمہ پر استغراق کی کیفیت طاری تھی، اس لئے بیٹے کی آواز کو نہ پہچان سکیں اور بے اختیار بول اٹھیں۔ ”طفیور تو یہاں سے بہت دور ہے۔“

”اُمّ محترم! دروازہ کھول لے۔ طفیور، قدم بوسی کے لئے بے قرار ہے۔“

بعض روایتوں کے مطابق حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی شفیق و مہربان ماں سے پچھڑے ہوئے تیس یا تیس سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ والدہ ماجدہ نے بیٹے کی آواز پہچان لی تو گھبرا کر انھیں اور دروازہ کھول دیا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بے قرار ہو کر مادر گرامی کے قدموں سے لپٹ گئے اور دوبارہ آپ پر شدید رقت طاری ہو گئی۔

”بیٹے طیفور! اٹھو۔“ مادر گرامی بار بار کہتی رہیں مگر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اُن مبارک قدموں سے لپٹے ہی رہے۔

”آج مجھے اپنی محرومیوں کا اندازہ ہوا۔“ جذبات سے مغلوب ہو جانے کے سبب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے الفاظ بمشکل ادا ہو رہے تھے۔ ”میں اپنی جنت سے کتنی دور چلا گیا تھا۔“

”طفیور! تم مجھ سے دور کہاں تھے؟“ والدہ ماجدہ پہلے ہی صدمہ فراق کے باعث اشک بار تھیں۔ اب بیٹے کو تیس سال بعد قدموں سے لپٹا ہوا پایا تو بہتے ہوئے آنسوؤں میں اور بھی شدت آگئی۔ ”تم میری آنکھوں میں رہتے تھے، میرے دل میں موجود تھے اور جب بھی آنکھ اٹھا کر دیکھتی تھی تو گھر میں بھی ہر طرف تم ہی تم نظر آتے تھے۔“

”مگر میں تو اپنی جنت سے دور تھا۔“ مادر گرامی کے دریائے محبت کی طغیانی دیکھ کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کسی بچے کی طرح بلک اٹھے تھے اور بدستور اُن کے قدموں سے لپٹے ہوئے تھے، جن کے نیچے اہل ایمان کی جنت آباد ہے۔

”طفیور! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتی۔“ والدہ محترمہ نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

اب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی جذباتی کیفیت کا اندازہ ہوا۔ آپ نے والدہ محترمہ کے پاؤں چھوڑ دیئے اور گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر اُس محترمہ ہستی کو کہ جس کا دنیا میں کوئی نعم البدل موجود نہیں، سہارا دے کر گھر کے اندر لائے۔ اس کے بعد جب آپ نے چراغ کی روشنی میں والدہ محترمہ کے سرایا کا جائزہ لیا تو یہ تکلیف دہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ مادر گرامی نہ صرف بہت زیادہ کمزور ہو گئی ہیں بلکہ ان کی کمر بھی جھک گئی ہے۔

پھر جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضعیف و ناتوانی کا سبب پوچھا تو والدہ محترمہ نے فرمایا۔ ”بیٹے! میں تو گوشت و پوست سے بنی ہوئی ایک کمزور انسان ہوں۔ اگر جدائی کا یہ صدمہ کسی پہاڑ کو برداشت کرنا پڑتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے دُہرا ہو جاتا۔“

مادر گرامی کی داستان فراق سن کر ایک بار پھر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر شدید رقت طاری ہو گئی اور آپ والدہ ماجدہ سے اپنے تصور کی معافی مانگنے لگے۔

”اس میں تمہارا کیا قصور ہے طیفور!“ بے پناہ حوصلہ رکھنے والی ماں نے کانپتے ہاتھوں سے بیٹے کے آدے ہوئے کہا۔ ”میں نے تو اپنی خوشی سے تمہیں اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اب میں کس زبان سے شکایت کروں؟ پھر حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مادر مہربان کے مبارک قدموں سے لپٹے بہت دیر تک روتے رہے تک کہ والدہ محترمہ کو نیند آگئی اور آپ بھی اُن کے پیروں پر سر رکھ کر سو گئے۔ حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ہیں کہ وہ عجب رات تھی، جب ایک فرقت زدہ ماں نے تیس سال بعد سکون و اطمینان کی سانس لی۔ معرفت میں کوچہ بہ کوچہ اور قریب بہ قریب پھرنے والے ایک بیٹے پر معرفت الہی کے عجیب اسرار ظاہر ہوئے۔ دوسرے دن حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی والدہ ماجدہ کو گھر کی کسی چیز سے ٹکراتے ہوئے دیکھا تو ہو کر پوچھا۔ ”کیا آپ جسمانی طور پر بہت زیادہ کمزوری محسوس کر رہی ہیں؟“

”بفضل خدا ابھی میں چلنے پھرنے سے معذور نہیں ہوئی ہوں، مگر بیٹے! مجھے قریب کی چیزیں صاف آتیں۔ اس لئے کبھی کبھی ٹھوکر لگ جاتی ہے۔“ والدہ محترمہ نے بیٹے کے سوال کا واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ اس وقت حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو احساس ہوا کہ مادر مہربان کی پینائی بڑی حد تک زائل ہو چکی۔ آپ نے بسطام کے ایک ماہر طبیب سے مشورہ کیا تو اس نے بتایا۔

”خاتون بہت زیادہ روتی رہی ہیں، اس لئے آنکھوں کے باریک اعصاب متاثر ہو چکے ہیں۔ اب بحال ہونا بہت دشوار ہے۔“

حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی مادر مہربان نے بیٹے کی جدائی میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی سزا تھی۔ نتیجتاً آنکھوں کی روشنی زائل ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

ان تمام باتوں کا حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر اس قدر اثر ہوا کہ آپ والدہ محترمہ کی زندگی میں بسطام کسی بزرگ کی زیارت کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔ حالانکہ آپ نے نقض مشائخ کے دیدار کے لئے سفر بھی اختیار کئے تھے۔ اب اگر کوئی سنا بھی یہ اطلاع دیتا کہ فلاں شہر میں فلاں بزرگ تشریف لائے ہیں تو ہائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے۔

”مجھے والدہ محترمہ کی زیارت کافی ہے۔“

اب آپ کی ریاضت یہی تھی کہ ہر وقت والدہ ماجدہ کی خدمت میں موجود رہتے۔ ایک انتہائی سردرات کے ابتدائی حصے کا واقعہ ہے کہ مادر گرامی سوتے سوتے اُنھیں اور آپ نے بیٹے طلب کیا۔ اتفاق سے گھر میں ذرا سا بھی پانی موجود نہیں تھا۔ حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی غفلت ماجدہ سے معذرت طلب کی اور پانی بھرنے کے لئے دوڑتے ہوئے دریا کی طرف چلے گئے۔ پھر جب آپ واپس آئے تو والدہ محترمہ دوبارہ گہری نیند سو چکی تھیں۔ حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے میں پانی بھرا اور والدہ ماجدہ کے سر ہانے کھڑے ہو گئے۔ موسم اس قدر شہد تھا کہ خون رگوں میں جتا ہوا رہا تھا۔ مگر حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ایک ہی زاویے سے پانی لئے کھڑے رہے۔ آخر کئی گھنٹے بعد ماں جاگیں تو بیٹے کو اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ پھر جب آپ نے حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے پانی لے کر پیا تو محسوس ہوا کہ بیٹے کا ہاتھ برف کے مانند سرد ہو رہا ہے۔

”بائیزید! تم کب سے کھڑے ہو؟“ والدہ ماجدہ نے پوچھا۔

”بہت دیر ہو گئی!“ حضرت بائیزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔

”تم نے مجھے اٹھا کیوں نہیں لیا؟“ والدہ ماجدہ نے سوال کیا۔

”آپ کے آرام میں خلل پڑ جاتا..... اس خیال سے خاموش رہا۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔

”تو پھر خود بیٹھ جاتے۔“ والدہ محترمہ نے فرمایا۔

”اگر میری آنکھ لگ جاتی تو آپ کو زحمت ہوتی۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔

بیٹے کا جذبہ خدمت گزاری دیکھ کر مادر مہربان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر آپ نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے فرمایا۔

”اے اللہ! میں بایزید سے راضی ہوں۔ تو بھی اس سے راضی ہو جا۔“



ایک رات حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ اُس رات آپ اپنی والدہ محترمہ کی

خدمت میں حاضر تھے۔ والدہ ماجدہ نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”طیفور! اب میں سونا چاہتی ہوں۔ تم ایسا کرو، نصف دروازہ کھول دو اور خود بھی جا کر سو جاؤ۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے مادر مہربان کے حکم پر عمل کیا اور دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے۔

”اب کیوں کھڑے ہو؟“ مادر گرامی نے پوچھا۔

”جب آپ محو خواب ہو جائیں گی تو میں بھی اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤں گا۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ

نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا۔

”بیٹے کی بات سن کر والدہ ماجدہ نے کروٹ لے لی اور تھوڑی دیر بعد گہری نیند سو گئیں۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ

رحمۃ اللہ علیہ ساری رات دروازے کے پاس بیٹھے جا گئے رہے۔

پھر فجر کی اذان سے ذرا دیر پہلے مادر گرامی کی آنکھ کھلی تو وہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو بیدار اور مستعد پا کر

حیران رہ گئیں۔

”طیفور! کیا تم ساری رات جاگتے رہے ہو؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے والدہ محترمہ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس نظریں جھکائے اور

دونوں ہاتھ باندھے خاموش کھڑے رہے۔

مادر مہربان بے قرار ہو کر بستر سے اٹھیں اور انتہائی مضطربانہ لہجے میں پوچھنے لگیں۔ ”طیفور! مجھے بتاؤ کہ تم رات

بھر کیوں جاگتے رہے؟“

”آپ کا حکم تھا کہ کمرے کے دروازے کو آدھا کھلا رکھا جائے۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے سر جھکائے

ہوئے عرض کیا۔ ”میں اس خیال سے رات بھر جاگتا رہا کہ کہیں ہوا کا کوئی جھونکا دروازے کو بند نہ کر دے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سن کر والدہ ماجدہ نے فرمایا۔ ”میں نے تو تمہیں یہ حکم بھی دیا تھا کہ دروازہ

کھول کر خود بھی سو جاؤ۔ پھر تم نے میرے دوسرے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کی؟“

”مادر مہربان! مجھے اس کا بے حد قلق ہے، مگر میں بھی کیا کرتا؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے وقت آمیز

لہجے میں کہا۔ ”ایک حکم کا تعلق آپ کی ذات اور دُعا سے تھا اور دوسرے کا میری ذات سے۔ چنانچہ میں نے پہلے حکم

کا امتثال کیا اور اسی پر ساری رات عمل پیرا رہا۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا پیش کردہ جواز سن کر ائمہ محترم و بزرگین نے پھر آپؑ نے بے اختیار اپنے بیٹے کو اپنے سینے

سے لگایا اور بارگاہِ ذوالجلال میں یوں عرض کرنے لگیں۔

”اے مالکِ ارض و سما! اے میرے اللہ! میرے بیٹے پر بھی نجات اور عافیت کا دروازہ کھول دے۔ اے کبھی ایسا کوئی گناہ سرزد ہو جائے جو تیری جناب میں انتہائی ناپسندیدہ ہو، تب بھی تُو اپنی رحمت کا دروازہ بنا کر تُو ہی غفار ہے اور تُو ہی رحیم ہے۔“

اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ”میں جس شے کی خاطر تیس سال تک سرگرداں رہا، اسے ایک رات جاگنے کے بعد صبح کے وقت پایا۔“



والدہ محترمہ کی اسی بے مثال خدمت نے حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کو زہد و تقویٰ اور معرفت کی بلند یوں تک پہنچانے کے تقویٰ کا عجیب حال تھا، ایک بار مشہور بزرگ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ کو ایک خط لکھا۔ ”شیخ! آپ کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے جو ایک ہی ازلی جام پی کر اس قدر مست ہو گیا ہو کہ بے خودی ابد تک ختم نہ ہو سکے؟“

جواب میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا۔ ”یہاں ایک ایسا انسان بھی موجود ہے، جو ازل سے بحرِ بے کراں پی کر بھی یہی کہتا ہے کہ کچھ اور مل جائے۔“

حضرت یحییٰ بن معاذؒ اور حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ کے درمیان کافی خط کتابت ہوئی جس سے معرفتِ اہم نکات ظاہر ہوئے۔ ہم اس خط کتابت کا ذکر آگے چل کر کریں گے، مگر اس سے پہلے قارئین کو مختصر طور پر بتاتے چلیں کہ حضرت یحییٰ بن معاذؒ کون بزرگ تھے؟

حضرت یحییٰ بن معاذؒ صوفیائے کرام میں پہلے صوفی ہیں جو باقاعدہ منبر پر وعظ فرمایا کرتے تھے اور آپؒ کوئی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ پھر دل انسانوں کے سینوں میں بھی شکاف پڑ جاتے تھے۔



حضرت یحییٰ بن معاذؒ نہایت سخی بزرگ تھے۔ جو لوگ نذر و تحائف پیش کرتے، آپؒ انہیں اُسی وقت ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیتے۔ اگر کبھی کوئی سائل آتا اور دستِ طلب دراز کرتا اور اتفاق سے حضرت یحییٰ بن معاذؒ پاس دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو آپؒ کسی سے قرض لے کر سائل کی ضرورت پوری کر دیتے۔ آپؒ نماز، حاجیوں، فقراء، صوفیاء اور علماء کا بہت خیال کرتے تھے۔ اگر ان لوگوں میں سے آپؒ کو کسی کی ضرورت کا پتا جاتا تو خود ہی قرض لے کر ان کے گھروں تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ آپؒ ایک لاکھ کے مقروض ہو گئے۔ اس زمانے کے حساب سے یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ آخر قرض دینے والوں نے غنا شروع کر دیئے۔

اکثر لوگ اس راز سے واقف تھے کہ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے اپنی ذات کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا یا۔ فاقہ کشی کے عالم میں کئی دن گزر جاتے تھے اور حلقہ نشینوں کو اس بات کی خبر تک نہیں ہوتی تھی کہ ان کا بھوک کی ناقابلِ برداشت تکلیف سے مسکراتے ہوئے گزر رہا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کچھ کم ظرف قرض والوں نے یہ بات مشہور کر دی تھی کہ حضرت یحییٰ بن معاذؒ قرض لے کر اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور قرض کی بردقت ادا نہیں کرتے۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ کسی قرض دینے والے نے اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے معذرت پیش کی تو وہ شخص ایسے الفاظ میں برا بھلا کہنے لگا کہ آپؒ کو شدید تکلیف پہنچی۔ پھر اسی اذیت میں

دن گزر گیا۔ یہاں تک کہ شب جمعہ آگئی۔ اسی مبارک رات میں حضرت یحییٰ بن معاذ کو سرور کوئین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

”اے یحییٰ! رنجیدہ نہ ہو کہ تیرا غم دیکھ کر میں بھی غمگین ہو جاتا ہوں۔ اب تجھے چاہئے کہ ہر شہر میں جا کر وعظ بیان کر! میں ایک شخص کو حکم دے دوں گا کہ وہ تجھے تین لاکھ درہم دیدے۔“

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ پاک نے حضرت یحییٰ بن معاذ کی ساری اذیتیں دُور کر دیں۔ آپؐ سب سے پہلے نیشاپور پہنچے۔ یہاں کے لوگ حضرت یحییٰ بن معاذ کی وعظ گوئی کی تعریفیں پہلے ہی سن چکے تھے، اس لئے لوگوں کی بڑی تعداد جمع ہو گئی۔ حضرت یحییٰ بن معاذ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور نہایت پُر سوز لہجے میں فرمایا۔

”اے نیشاپور کے لوگو! میں اللہ کے رسول ﷺ کے حکم پر شہر بہ شہر وعظ گوئی کے لئے نکلا ہوں۔ تمہیں معلوم ہوتا چاہئے کہ میں ایک لاکھ درہم کا مقروض ہوں۔ اور سرکارِ دو عالم ﷺ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ ایک شخص میرا سارا قرض ادا کر دے گا۔“

حضرت یحییٰ بن معاذ کا اتنا کہنا تھا کہ مجمع میں سے تین افراد اٹھے اور منبر کے قریب پہنچ کر کہنے لگے۔

”میں آپ کی خدمت میں پچاس ہزار درہم پیش کر دوں گا۔“ ایک شخص نے کہا۔

”میں اپنی حیثیت کے مطابق چالیس ہزار درہم نذر کر سکتا ہوں۔“ دوسرے شخص نے کہا۔

”اور میں دس ہزار درہم آپ کے حوالے کر سکتا ہوں۔“ تیسرے شخص نے کہا۔

ایک لاکھ درہم کی رقم پوری ہو چکی تھی، مگر حضرت یحییٰ بن معاذ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ ”اللہ آپ حضرات کو اس خُسنِ سلوک کے بدلے میں جزائے عظیم دے۔ مگر میں یہ رقم اس لئے قبول نہیں کر سکتا کہ میرے آقا ﷺ کے فرمانِ مقدس کے مطابق یہ تمام رقم ایک ہی شخص ادا کرے گا۔“

اس کے بعد حضرت یحییٰ بن معاذ نیشاپور سے بلخ تشریف لے گئے۔ پھر ایک مجلس وعظ میں آپؐ نے توغمری (امارت) کے موضوع پر انتہائی اثر انگیز تقریر کی۔ مجلس میں ایک صاحبِ ثروت انسان بھی موجود تھا۔ اُس نے آپ کی خدمت میں ایک لاکھ درہم پیش کئے۔ آپ نے اس رقم کو قبول کر لیا۔

جب یحییٰ بن معاذ مجلس سے رخصت ہونے لگے تو ایک بزرگ نے آپؐ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”شیخ! درویشی کے مقابلے میں توغمری کی فضیلت بیان کرنا آپ کے شایانِ شان نہیں۔“

حضرت یحییٰ بن معاذ نے بزرگ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا کہ آپ کا معاملہ کچھ اور تھا۔ پھر جب حضرت یحییٰ بن معاذ بلخ روانہ ہوئے تو راستے میں قزاقوں نے آپؐ کی ساری رقم لوٹ لی۔ اس وقت حضرت یحییٰ بن معاذ کو خیال آیا کہ یہ واقعہ ان ہی بزرگ کے قول کی وجہ سے پیش آیا ہے۔ بظاہر یہ بہت بڑا حادثہ تھا، مگر حضرت یحییٰ بن معاذ کے دل پر ہلکا سا بھی عکسِ ملال نہیں آیا اور آپؐ بلخ سے نکل کر ”ہری“ کے علاقے میں پہنچے۔

آپؐ کی آمد کی خبر سن کر بہت سے صاحبانِ دل جمع ہو گئے۔ مجلس میں ”ہری“ کا حاکم اور اُس کی دین دار بیٹی بھی موجود تھے۔ حضرت یحییٰ بن معاذ منبر پر نمودار ہوئے اور اپنا خواب بیان کیا۔

پھر جیسے ہی حضرت یحییٰ بن معاذ خاموش ہوئے، حاکم ہری کی پردہ دار بیٹی اپنی جگہ سے اٹھی اور منبر کے قریب پہنچ کر عرض کرنے لگی۔

”شیخ! مجھے بہت بے چینی سے آپ کا انتظار تھا۔“

”تمہیں میرا انتظار کیوں تھا؟“ حضرت یحییٰ بن معاذ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس لئے کہ جس رات آقائے نامدار ﷺ کو آپ نے خواب میں دیکھا تھا، اُسی رات میں بھی سرکارِ ﷺ کی زیارت سے شرف یاب ہوئی تھی اور سرکارِ دو عالم ﷺ نے مجھے آپ کے قرض کی ادائیگی کا حکم دارِ حاکم ہری کی بیٹی نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

”میں نے آقائے دو جہاں ﷺ کا حکم سن کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں خود وہاں جا کر شیخ یحییٰ کا ادا کر دوں۔ جواب میں رسالت پناہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ خود یہاں آئے گا..... اس لئے آپ سے میری درخواست ہے کہ صرف چار دن تک یہاں وعظ فرمادیں۔“

حاکم ہری کی صاحبِ زادی کی بات سن کر حضرت یحییٰ بن معاذؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر نہایت لہجے میں عرض کرنے لگے۔ ”اپنے غلام کی کیسی لاج رکھی۔ بے شک! یہ آپ ہی کی شان ہے۔“

اس کے بعد حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے شہر ہری میں مسلسل چار دن تک وعظ فرمایا اور اس قدر اثر انگیز لہجے بولے کہ لوگوں کے دلوں کی دنیا زبردہ ہو گئی۔ بڑے بڑے فاسق و فاجر، گناہوں سے تاب ہو گئے۔

پھر جب حضرت یحییٰ بن معاذؒ رخصت ہونے لگے تو اس نیک سیرت اور صاحبِ دل امیرِ زادی نے اونٹ آپ کے ہمراہ کر دیئے۔ یہ تمام اونٹ دینار و درہم سے بھرے ہوئے تھے۔

وطن پہنچ کر حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے اپنے صاحبزادے کو ہدایت کی کہ تمام قرض کی ادائیگی کے بعد چلے جائے، اسے فقراء میں تقسیم کر دینا کہ میرے لئے اللہ کی ذات بہت کافی ہے۔

اس واقعے کے چند روز بعد ہی ایک دن حضرت یحییٰ بن معاذؒ نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد زمین پر گر پڑے ہوئے مناجات میں مشغول تھے کہ کسی بد بخت نے ایک وزنی پتھر آپ کے سر پر مارا۔ چوٹ انتہائی مہلک لگی۔ لئے جریانِ خون کے سبب جانبر نہ ہو سکے اور اسی خون آلودہ حالت میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ حضرت بن معاذؒ کی شہادت کا یہ الم ناک واقعہ 285ھ میں پیش آیا۔ آپؒ کے جسدِ مبارک کو نیشاپور لے جا کر سپردِ خاک دیا گیا۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ تہران کے جنوب مشرق میں واقع ایک شہر ”رے“ میں پیدا ہوئے۔



ایک بار حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ کو ایک خط تحریر کیا، جس میں یہ مختصر سی عبارت درج ہے: ”شیخ! میں آپ کو ایک راز بتانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں یہ راز اُس وقت بتاؤں گا، جب ہم دونوں جنت میں اپنے نیچے کھڑے ہوں گے۔“

حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے اس خط کے ساتھ اپنے ایک مرید کو ایک روٹی بھی دی اور ساتھ ہی یہ تاکید کی: ”شیخ! اس روٹی کو ضرور تناول فرمالیں کہ یہ زم زم کے پانی سے آغا گوندہ کر بنائی گئی ہے۔“

حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا مرید، پیر و مرشد کی عطا کردہ دونوں چیزیں لے کر حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت حاضر ہوا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا خط پڑھا اور روٹی کے بارے میں مرید کی زبانی ارسالِ پیغام سنا۔ پھر آپؒ نے کسی تامل کے بغیر ایک عظیم صوفی کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔

”شیخ! یاد رکھو کہ جہاں حق تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے، وہاں جنت اور طوبی دونوں موجود ہوتے ہیں۔ رہا آپ کا عنایت کردہ روٹی کا سوال تو انتہائی معذرت کے ساتھ میں وہ روٹی واپس کر رہا ہوں۔ زم زم کے پانی سے آغا گوندہ ہنے کی فضیلت تو اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن یہ بات کون بتائے کہ گندم کا جو بیج بویا گیا تھا، وہ حلال کا تھا؟ یا

کے حلال ہونے میں شک ہے۔“

حضرت یحییٰ بن معاذؒ کے مرید نے حضرت بایزید بسطامیؒ کا خط پیر و مرشد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے سلطان العارفین کا خط بغور پڑھا اور بے اختیار پکار اٹھے۔ ”شیخ! اب آپ کا دیدار مجھ پر فرض ہو گیا ہے۔“ یہ کہہ کر حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے اسی مرید کو اپنے ساتھ لیا اور حضرت بایزیدؒ سے ملاقات کے لئے بسطام روانہ ہو گئے۔

پھر جب آپؒ بسطام پہنچے تو رات ہو چکی تھی، اس لئے بایزیدؒ کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا اور ایک سرارے میں ٹھہر گئے۔

پھر دوسرے دن نماز فجر ادا کرتے ہی حضرت بایزید بسطامیؒ کے مکان پر حاضر ہوئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ، قبرستان تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ آپؒ کو خدشہ تھا کہ اگر حضرت بایزید بسطامیؒ کہیں اور چلے گئے تو پھر یہ طویل سفر رائجاں جائے گا۔ اس لئے حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے مقامی لوگوں سے قبرستان کا پتہ دریافت کیا اور تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

پھر جب حضرت یحییٰ بن معاذؒ قبرستان پہنچے تو حضرت بایزید بسطامیؒ کو ایک جگہ اس حالت میں کھڑے ہوئے دیکھا کہ آپؒ کی آنکھیں بند تھیں اور آپؒ پر گہرے استغراق کی کیفیت طاری تھی۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے محسوس کر لیا کہ حضرت شیخ ساری رات اسی حالت میں کھڑے رہے ہیں۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ دبے قدموں کے ساتھ آگے بڑھے اور حضرت بایزید بسطامیؒ کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر اسی حالت میں بہت دیر گزر گئی، یہاں تک کہ سورج سر پر آگیا اور ہر طرف تیز دھوپ پھیل گئی۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے دیکھا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ اچانک جھکے اور سجدہ ریز ہو گئے۔ سجدے کی یہ حالت بھی بہت طویل تھی۔ اچانک حضرت بایزید بسطامیؒ کی آواز اُبھری۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ گوش بر آواز ہو گئے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ دعا مانگ رہے تھے۔

”اے اللہ! تجھ سے ایک قوم نے تجھ کو طلب کیا۔ تُو نے اپنے بے پناہ اور بے مثال فضل و کرم کے صدقے میں اس قوم کی دعا قبول کر لی۔ پھر تُو نے اسے پانی پر چلنا، ہوا میں اُڑنا، زمین کو طے کرنا اور ماہیت کو بدل دینا بطور کرامت سکھایا اور وہ قوم اس پر راضی بھی ہو گئی۔ مگر میں ان تمام باتوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“

حضرت بایزید بسطامیؒ کی دعا سن کر حضرت یحییٰ بن معاذؒ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر جب حضرت شیخ، دعا سے فارغ ہو کر کھڑے ہوئے تو حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے آگے بڑھ کر آپؒ کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ پر جذب کی سی کیفیت طاری تھی، اس لئے فرمانے لگے۔ ”تم کون ہو؟ مگر جو بھی ہو، ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی سلامتی کے سائے میں رہو۔“

حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے عرض کیا۔ ”یہ میں ہوں، مخدوم کا درباری، یحییٰ بن معاذؒ۔“

”درباری نہیں، میرے محترم مہمان۔“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا اور بڑے والہانہ انداز میں حضرت یحییٰ بن معاذؒ سے ملے، پھر اپنے معزز مہمان کو لے کر گھر آگئے اور خوب خاطر مدارات کی۔

پھر حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے آپؒ سے دریافت کیا۔ ”شیخ! رات کیسے گزری؟“

جواب میں حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ نے مجھے بیس مدارج عطا کرنے چاہے تھے، مگر وہ سب

کے سب جاب کے درجات تھے۔ اس لئے میں نے انہیں قبول نہیں کیا۔“

حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے بڑی حیرت سے اپنے میزبان کی طرف دیکھا، پھر فرمایا۔ ”شیخ! جب اللہ تعالیٰ آپؒ پر

اس قدر مہربان تھا تو آپ نے اس سے معرفت طلب کیوں نہیں کی؟“
یہ سنتے ہی حضرت بایزید بسطامیؒ نے ایک ایسی جگر گداز چیخ ماری کہ پوری خانقاہ گونج اٹھی۔ ”خاموش! یحییٰ بن معاذ! خاموش ہو جاؤ۔“

”مخدوم کا حکم ہے تو خاموش ہو جاؤں گا مگر یہ خلش ہمیشہ دل میں موجود رہے گی کہ شیخ نے معرفت کیوں مانگی؟“ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے عرض کیا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے جواب فرمایا۔ ”یحییٰ! اگر تمہیں حضرت آدم علیہ السلام کی صفات، حضرت جبرائیل کا تقدس، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خلعت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شوق، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پاکیزگی اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی محبت، سب کچھ عطا کر دیا جائے، تب بھی تم خوش نہ ہو گے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں اس لئے تم اللہ سے صرف اللہ کو طلب کرو، تاکہ پھر کسی چیز کی خواہش باقی نہ رہے۔“



حضرت شفیق بلخی صوفیائے کرام میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپؒ مشہور بزرگ حضرت ابراہیم بن آدمؒ کا غلیفہ تھے اور آپؒ کے کردار کی خاص پہچان تھی۔ ایک مرتبہ بلخ میں شدید قحط پڑا۔ حضرت شفیقؒ بازار سے گزر رہے تھے تو اچانک آپؒ کی نظر ایک غلام پر پڑی جو بہت زیادہ خوش نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ اس وقت فاقہ کشی کے سبب لوگوں کے چہرے اور گمرویران نظر آتے تھے۔ اس عالم میں آپؒ نے اس غلام کو بہت زیادہ مسرور اور خندہ زبان تو اسے راستے میں روک کر کہا۔

”بلخ کے لوگ تو قحط سے برباد ہو گئے اور تو اس طرح سر بازار قرض کر رہا ہے۔“

حضرت شفیق بلخیؒ کی بات سن کر غلام مسکرایا اور اس نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا۔

”ایک نہیں، ایک ہزار قحط بھی پڑ جائیں تو مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ میرے آقاؐ پاس بہت غلہ موجود ہے اور وہ مجھے کسی بھی حال میں بھوکا نہیں رکھے گا۔“ یہ کہہ کر غلام اُسی مستانہ روی کے ساتھ گھبرا گیا۔

حضرت شفیق بلخیؒ کچھ دیر تک اس غلام کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر اپنی خانقاہ لوٹ آئے اور انتہائی رنڈ آمیز لہجے میں دعا کرتے ہوئے کہا۔

”اے اللہ! جب ایک غلام کو اپنے آقاؐ کی بخشش اور عطا پر اس قدر مجبور رہے تو میں تیری ذات اقدس پر کمال نہ اعتماد کروں۔ جب کہ تو مالک الملک ہے اور دنیا کا ہر جاندار تیرے ہی کرم کا محتاج ہے۔“ اس کے بعد حضرت شفیق بلخیؒ نے انتہائی سختی کے ساتھ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور توکل کے حوالے سے ایک خاص شہرت حاصل کی۔ پہلے آپؒ تجارت کے سلسلے میں شہر بہ شہر جایا کرتے تھے مگر غلام کی نصیحت سن کر آپؒ نے تجارت چھوڑ دی اور محنت مزدوری کر کے گزراوقات کرنے لگے۔

بلخ کا ایک رئیس آپؒ کا عقیدت مند تھا۔ ایک دن تنہائی میں کہنے لگا۔ ”شیخ! آپؒ یہ محنت مزدوری چھوڑ دیں۔“

”آخر تم کس وجہ سے مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو کہ میں مزدوری ترک کر کے اپنی روزی سے محروم ہو جاؤں؟“

حضرت شفیق بلخیؒ نے عقیدت مندر رئیس کے مشورے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

”شیخ! میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ محنت مزدوری کی وجہ سے لوگ آپؒ کو کمتر تصور کرتے ہیں اور یہ بات مجھے پسند نہیں۔“ عقیدت رئیس نے اپنی بات کی توجیہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس کے سوا کوئی اور ہنر تو آتا نہیں۔ اگر مزدوری بھی چھوڑ دوں تو پھر زندگی کی ضرورتیں کیسے پوری کروں گا۔“ حضرت شفیق بلخیؒ نے فرمایا۔

”اس کا انتظام میں کئے دیتا ہوں۔“ عقیدت مند رئیس نے عرض کیا۔ ”آپ ماہانہ اخراجات کی رقم مجھ سے لے لیا کریں۔“

حضرت شفیق بلخیؒ نے انتہائی مبروت محل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”جس شخص نے محنت و مزدوری کی فضیلت کو نہیں سمجھا، اُسے معرفت ترک کر دینی چاہئے۔“

حضرت شفیق بلخیؒ کا ارشاد گرامی سن کر عقیدت مند کے چہرے پر ندامت کے آثار ابھر آئے۔ ”شیخ! میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں تو اس طرح آپ کی خدمت کرتا چاہتا ہوں۔“

حضرت شفیق بلخیؒ نے فرمایا۔ ”اگر مجھے پانچ چیزوں کا خوف لاحق نہ ہوتا تو شاید میں تمہاری درخواست پر غور کرتا۔ پہلے یہ کہ مجھے رقم دینے سے تمہاری دولت میں کمی واقع ہوگی۔ دوسرے میرے پاس سے رقم چوری ہو جانے کا بھی خطرہ ہے۔ تیسرے یہ کہ بلاوجہ پابندی کے ساتھ رقم دیتے دیتے کسی دن تمہارے دل میں دولت کے ضیاع کا ملال ہونے لگے۔ چوتھے ممکن ہے کہ میرے اندر کوئی عیب پیدا ہونے کی وجہ سے تمہاری عقیدت، نفرت میں تبدیل ہو جائے، میرا ماہانہ وظیفہ بند کر دو۔ اور پانچویں یہ کہ اگر چاروں خوف ختم بھی ہو جائیں تو میری حیثیت ایک بھکاری سے زیادہ نہیں ہوگی۔“

ان ہی دنوں حضرت شفیق بلخیؒ کا ایک مرید حج کے لئے جا رہا تھا۔ راستے میں بسطام پڑتا تھا۔ مرید نے حضرت بایزید بسطامیؒ کی بہت شہرت سنی تھی۔ اس لئے دیدار کی غرض سے خانقاہ میں حاضر ہوا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نہایت شفقت سے پیش آئے۔ پھر آپؒ نے گفتگو کے دوران اس شخص سے دریافت کیا۔ ”تم کسی بزرگ سے بیعت بھی ہو؟“

”میں حضرت شفیق بلخیؒ سے بیعت ہوں۔“ اس شخص نے عرض کیا۔

”تمہارے مرشد کے اعمال و اقوال کیا ہیں؟“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے پوچھا۔

مرید نے فخر کے لہجے میں کہا۔ ”میرے مرشد کا عمل یہ ہے کہ وہ مخلوق سے بے نیاز ہو کر متوکل علی اللہ ہو گئے ہیں۔“

”یہ تو عارف کی پہلی پہچان ہوتی ہے۔“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے سناٹسی لہجے میں فرمایا۔

”اور میرے مرشد کا قول یہ ہے کہ اگر بارش نہ ہونے کی وجہ سے اناج قطعاً پیدا نہ ہو، تب بھی میں توکل ترک نہیں کر سکتا۔“ مرید نے بعد افتخار اپنے مرشد کا قول بیان کیا۔

”یہ تمہارے مرشد کا قول ہے؟“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں! یہ مرشد کا معروف قول ہے۔“ مرید نے اس طرح جواب دیا کہ اس کے لہجے سے غرور کی جھلک نمایاں تھی۔

”تو پھر تمہارے مرشد راستے ہی میں بھٹک گئے۔ پھر انہیں منزل کس طرح مل سکتی ہے؟“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔

سلطان العارفین کی بات سن کر حضرت شفیق بلخیؒ کے مرید کی حالت متغیر ہو گئی اور اُس کے چہرے پر ناگواری کا رنگ ابھر آیا۔ ”میرے مرشد کامل ہیں اور اس قول سے بہتر کوئی دوسرا قول ہو ہی نہیں سکتا۔“

”جب تم حج کے بعد اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہو تو انہیں میرا پیغام پہنچا دینا کہ صرف دو روز ٹھہر لے اللہ کو کیوں آزار ہے ہو؟“

”اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ جب انہیں بھوک لگا کرے تو وہ کسی سے مانگ کر کھالیا کریں۔ صوفیاء کا بہن کر تو کل کو کیوں رسوا کر رہے ہیں؟ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں ان کی وجہ سے پورا شہر تباہ نہ ہو جائے۔“

مرید شدید ناگواری کے عالم میں خانقاہ سے اٹھ کر چلا گیا۔ اُسے اپنے مرشد کے بارے میں حضرت بسطامیؒ کی رائے پسند نہیں آئی تھی اور یہ ایک فطری ردِ عمل تھا۔ ہر شخص اپنے حوالوں اور نسبتوں کو دوسروں کے اور نسبتوں سے ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہے۔ ہر دور میں ایسے بہت کم لوگ گزرے ہیں، جو عقیدت کے حصار سے خارجیت کا چہرہ دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اگر انسان اس فطری کمزوری کا شکار نہ ہوتا تو آج پوری دنیا حلقہ اسلام داخل ہو چکی ہوتی۔ اس راستے میں بس ایک سوچ مانع ہے کہ ان کے باپ دادا کا مذہب کچھ اور تھا..... اسلام کسی اور بات کی دعوت دیتا ہے۔ حضرت شفیق بلخیؒ کے مرید کی بھی یہی حالت تھی کہ اُسے اپنے پیر مرشد کے قول پر ناز تھا، حضرت بایزید بسطامیؒ نے اس قول کی نفی کر دی تھی۔

الغرض مرید نے حج ادا اور حضرت شفیق بلخیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت بایزید بسطامیؒ کا پیغام سنا دیا۔ حضرت شفیق بلخیؒ، سلطان العارفین کے الفاظ پر غور کرنے لگے۔

”شیخ! مجھے بایزید بسطامیؒ کی یہ بات ہرگز پسند نہیں آئی۔“ مرید نے ناگوار لہجے میں کہا۔

”تم خاموش ہو جاؤ!“ حضرت شفیق بلخیؒ نے اپنے مرید کو تسبیحہ کی۔ ”تمہیں کیا معلوم کہ شیخ نے مجھے کیا پیغام ہے؟“

اس کے بعد حضرت شفیق بلخیؒ بہت دیر تک مراقبے کی سی حالت میں بیٹھے رہے، پھر مرید کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”شیخ نے سچ کہا۔“

پیر مرشد کے ارشاد گرامی پر مرید حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کی عقیدت کا محل آن کی آن میں زمین بوس ہو گیا۔ ”تم نے شیخ سے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ اگر میرے شیخ میں یہ خانی ہے تو پھر آپ کا مرتبہ کیا ہے؟“ مرید کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً ہی بسطامیؒ روانہ ہو گیا اور حضرت بایزیدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا۔ ”میں نے آپ کا پیغام اپنے مرشد کے گوش گزار کر دیا تھا۔“

”پھر تمہارے مرشد نے کیا کہا؟“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اس مرید سے پوچھا جو بہت خفا نظر آ رہا تھا۔ ”میرے مرشد نے فرمایا ہے کہ اگر مجھ میں یہ عیب موجود ہے تو پھر آپ کا مرتبہ کیا ہے؟“ مرید کے لہجے شدید ناگواری کی جھلک نمایاں تھی۔

”اب یہ تمہارے پیر مرشد کی دوسری نادانی ہے کہ وہ بایزید سے اس کا مرتبہ پوچھ رہے ہیں۔“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔

”تم میرا جواب صحیح طور پر منتقل نہ کر سکو گے، اس لئے کاغذ پر تحریر کئے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر آپؒ نے اپنے ایک خدمت گار سے کاغذ اور قلم طلب کیا، پھر یہ عبارت تحریر کی۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم“

بایزید کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس کے بعد کاغذ کو تہہ کیا اور مرید کے حوالے کر دیا۔ حضرت شفیق بلخیؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ کا خط دیکھا اور

با آواز بلند کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ایک بار ایک صحابی کسی دوسرے شہر سے اونٹ پر سوار ہو کر سرور کو نین ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ان سے دریافت کیا۔

”تمہارا اونٹ کہاں ہے؟“

صحابی نے عرض کیا۔ ”اللہ کے توکل پر باہر چھوڑ آیا ہوں۔“

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ”توکل اس کا نام نہیں ہے۔“

”آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان۔ تو پھر توکل کیا ہے؟“ صحابی نے عرض کیا۔

آقائے کائنات ﷺ نے فرمایا۔ ”پہلے اپنے اونٹ کو مضبوط رستی اور مضبوط کھوٹے سے باندھو، اس کے بعد اللہ

پر توکل کرو۔“

سرکارِ دو عالم ﷺ کے فرمانِ مقدس کے مطابق حقیقی توکل یہ ہے کہ مسلمان بہترین ظاہری وسائل رکھنے کے باوجود دل سے اقرار کرے کہ وہ اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب معرکہ آرائی کا وقت آئے تو بہترین اسلحہ جمع کرے، بہترین صف بندی کرے اور جنگ کے تمام معروف اصولوں پر عمل پیرا ہو..... اور پھر جب لڑائی کا وقت آئے تو دل کی گہرائیوں سے اعلان کرے کہ وہ اپنے اللہ پر توکل کرتا ہے۔ اس کا نام توکل نہیں کہ اسباب ظاہری کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ بھوک مٹانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے دست و بازو کے ذریعے غذا کا انتظام کرے۔ اللہ کا یہ مزاج نہیں کہ وہ نعمتوں سے بھرے ہوئے خوانِ آسمانوں سے اُتار دے۔ ایک بار اس نے بنی اسرائیل کے لئے اپنے اس نظام کو بھی بدل ڈالا تھا..... مگر نتیجہ.....؟ یہودی سب سے بڑے ناشکر گزار ٹھہرے اور پھر ہمیشہ کے لئے رائدہ درگاہ قرار پائے۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ زمین پر اُس کا فضل تلاش کیا جائے۔ پھر جب فضل تلاش کر لے تو اقرار کرے کہ وہ اپنے اللہ پر توکل کرتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اسی توکل کی طرف اشارہ کیا تھا۔



اسی قسم کا واقعہ مشہور بزرگ حضرت ابوتراب بخشنیؒ کے ایک مرید کے ساتھ پیش آیا تھا۔

حضرت ابوتراب بخشنیؒ، خراسان کے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ آپ نے چالیس مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت عظیم حاصل کی۔ آپؒ نے ایک طویل عرصے تک شدید ریاضتیں کیں اور بے آرامی کی زندگی بسر کی۔ حضرت ابوتراب بخشنیؒ کی شدتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ جب اپنے دوستوں میں کوئی عیب دیکھتے تو بے قرار ہو جاتے اور توبہ و استغفار میں اضافہ کر دیتے۔ ایسے واقعات پر آپؒ فرماتے۔

”میری ہی نخوت کی وجہ سے ان لوگوں میں یہ عیب پیدا ہوا ہے۔“

حضرت ابوتراب بخشنیؒ اپنے مریدوں کو یہ نصیحت فرماتے کہ ریاکاری سے ہمیشہ پرہیز کرنا۔

ایک بار آپ کے ایک مرید پر کئی وقت کا فاقہ گزر گیا۔ آخر اس نے مجبور ہو کر سڑک پر پڑے خربوزے کے ایک حٹکلے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ جب حضرت ابوتراب بخشنیؒ کو اس واقعے کا علم ہوا تو آپؒ نے اپنے مرید کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”اس صورت میں تجھے تصوف حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں نے تو اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا ہے کہ میرا ہاتھ حرام

شے کی جانب نہیں بڑھے گا۔“

قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تم بھوک کے عالم میں حالتِ اضطراب کو پہنچ جاؤ تو مردار کھا سکتے ہو۔ مگر خبردار! اس مردار خوری کو اپنی عادت نہ بنالینا۔ حضرت ابو ترابؓ بخشی کا وہ مرید بھی حالتِ اضطراب کا تھا اور خربوزے کے چھلکے کا شمار مردار چیزوں میں بھی نہیں ہوتا۔ مگر وہ راہِ سلوک کا مسافر تھا، اس لئے حضور ابو ترابؓ بخشی نے انتہائی سخت لہجے میں تنبیہ کی اور پھر اپنی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ سناتے ہوئے فرمایا۔

”تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایک بار انڈا اور روٹی کھانے کی خواہش کی تھی اس وقت میں ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ اتفاق سے راستہ بھول کر ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں کچھ قافلے والے لیٹے اور شور مچا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب لوگ میری طرف بڑھے اور مجھے پکڑ لیا۔

”میری ہے وہ شخص۔ اس نے ہمارا سامان چرایا ہے۔“ کئی لوگ زور زور سے چیختے لگے۔

”ابھی میں ان لوگوں کی اس حرکت پر حیران ہی ہو رہا تھا کہ چاروں طرف سے میرے سر پر ڈنڈے پڑنے لگے۔ میں نے اپنی صفائی پیش کی مگر کوئی بھی میری بات سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ڈنڈوں کی ضربوں سے میرا پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ اچانک کسی طرف سے ایک بوڑھا شخص نمودار ہوا اور اس نے مجھے پہچان لیا۔

”اپنے ہاتھ روک دو۔“ بوڑھے شخص نے چیختے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا سامان نہیں چرا سکتے۔“

مارنے والوں نے بوڑھے شخص سے پوچھا۔ ”تم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہو کہ اس نے ہمارا سامان نہیں چرایا ہے۔“

”میں انہیں جانتا ہوں، یہ بہت بڑے بزرگ ہیں۔“ ایک شخص نے درمیان میں حائل ہوتے ہوئے کہا۔

نوجوانوں کے اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے آگئے اور وہ لوگ مجھ سے معافی مانگنے لگے۔ پھر میری مرہم پٹی کی گئی۔

”مجھے تم سے کوئی شکایت اس لئے نہیں ہے کہ میرے نفس نے ذلت کا مزہ خوب چکھ لیا۔ میں نے ان لوگوں کو معاف کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد وہ بوڑھا شخص مجھے اپنے گھر لے گیا اور کچھ دیر بعد اُس نے مہمان نوازی کے طور پر میرے سامنے کھانا پیش کیا، مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ انڈا روٹی میرے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ مجھے کھانے میں تامل ہوا تو ایک صدائے غیبی سنائی دی۔

”اب کھانا کھالے۔ تجھے تیری خواہش کی سزا مل گئی۔ مگر یاد رکھ کہ سزا پائے بغیر تیرے نفس کی خواہش بھی پوری نہیں ہوگی۔“

حضرت ابو ترابؓ بخشی ایک مستجاب الدعوات اور صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ ایک بار آپؓ اپنے ارادت مندوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ لوگوں کو پیاس بھی لگ رہی تھی اور نماز کا وقت بھی آ گیا تھا۔ مگر پانی کا ذرہ نہ نک پتہ نہیں تھا۔ آخر تمام مریدوں نے آپؓ سے پانی کے انتظام کی درخواست کی۔

حضرت ابو ترابؓ بخشی نے اپنے عصا سے زمین پر ایک لکیر کھینچ دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس جگہ سے پانی کا ایک چشمہ اُبل پڑا۔

حضرت ابو ترابؓ بخشی نے پوری زندگی نفس کشی میں بسر کی۔ آپؓ کے عقیدت مندوں میں بڑے بڑے ائمہ شامل تھے۔ مگر آپؓ کسی کی نذر قبول نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار کسی صاحبِ ثروت عقیدت مند نے آپؓ سے عرض کیا۔

”شیخ! کوئی حاجت ہو تو فرمائیے۔“

”تم میری حاجت پوری کرو گے؟“ حضرت شیخ ابو ترابؓ بخشی نے فرمایا۔ ”جو سب کی حاجتیں پوری کرتا ہے مجھے تو اس سے بھی اس کے سوا کوئی حاجت نہیں کہ بس وہ مجھ سے راضی ہو جائے۔“

حضرت ابو ترابؓ بخشتی کا انتقال بصرہ کے ایک ریگستان میں ہوا اور کسی مرید کو اس المناک واقعے کی خبر تک نہ ہو سکی۔ برسوں بعد ادھر سے کسی قافلے کا گزر ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ آپ ہاتھ میں عصا لئے قبلہ رو کھڑے ہیں۔ جسم مبارک خشک ہو گیا تھا، مگر اس کی ظاہری حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اور سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ کوئی صحرائی درندہ آپ کی طرف پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ پھر لوگوں کو اطلاع پہنچی تو نماز جنازہ پڑھی گئی اور آپ کی تدفین مکمل ہو گئی۔

حضرت ابو ترابؓ بخشتی کا ایک مرید آپ کے فیضانِ نظر سے روحانیت کے بلند مقام تک پہنچ گیا تھا مگر آپ اس سے یہی فرماتے تھے۔

”اب تجھے شیخ بایزید بسطامیؒ کی محبت درکار ہے کہ اس کے بغیر تیری تکمیل نہیں ہوگی۔“

مرید کو اپنے مرشد کی غلامی پر ناز تھا، اس لئے بڑے بے نیازانہ انداز میں کہتا۔ ”شیخ کے طفیل مجھے سب کچھ حاصل ہو گیا۔“ پھر بولا۔ ”مجھے ان کی محبت سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟“

پھر ایک دن وہ اپنے پیر و مرشد کے ہمراہ حضرت بایزیدؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت شیخؒ پانی بہرنے کے لئے دریا کی طرف گئے ہوئے تھے۔ حضرت ابو ترابؓ بخشتی اور آپ کا مرید حضرت شیخؒ کی تلاش میں نکلے۔ کچھ دور چل کر دونوں بزرگوں نے حضرت بایزیدؒ کو آتے ہوئے دیکھا۔ حضرت ابو ترابؓ بخشتی کے چہرے پر گہری مسرت کا رنگ اُبھر آیا۔

”شیخ تشریف لارہے ہیں۔“

مرید نے غور سے حضرت بایزید بسطامیؒ کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا تو اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

حضرت بایزیدؒ نے قریب پہنچ کر حضرت ابو ترابؓ بخشتی کو سلام کیا اور ان کے مرید کی طرف دیکھا۔

”شیخ! یہ کون ہیں؟“

ابھی حضرت ابو ترابؓ بخشتی جواب دینے بھی نہیں پائے تھے کہ مرید زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور چند لمحوں میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

”شیخ! آپ کی تو ایک ہی نظر نے اس کا کام تمام کر ڈالا۔“ حضرت ابو ترابؓ بخشتی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”ابو تراب! اس کے اندر کشف کا ایک مقام خالی رہ گیا تھا۔“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”وہ مقام اسے

ابھی ابھی حاصل ہوا تھا مگر یہ برداشت نہ کر سکا۔“



حضرت شیخ ابوسعیدؒ ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ جب حضرت بایزید بسطامیؒ کی کرامات کا شہرہ عام ہوا تو حضرت شیخ ابوسعیدؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ کی روحانی آزمائش کی غرض سے طویل سفر طے کر کے شہر بسطام پہنچے۔ پھر آپؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ سے باریابی کی اجازت چاہی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے صوفیانہ روایات کے مطابق مہمان کا درجہ جوشِ استقبال کیا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت ابوسعیدؒ سے رکی گفتگو کرتے رہے۔ پھر جب یہ باتیں طویل پکڑ گئیں تو حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے فرمایا۔

”شیخ! میں نے دنیا داری کی گفتگو کے لئے اتنا طویل سفر اختیار نہیں کیا ہے۔“

”پھر آپ نے کس لئے زحمت کی ہے؟“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے جواب فرمایا۔

”میں روحانیت کے موضوع پر آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے اپنی آمد کا مقصد

بیان کرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر شیخ ایہ سمجھ لیجئے کہ آپ کا طویل سفر رائجاں گیا۔“ حضرت بایزید بسطامیؒ اپنی قوت کشف کے حضرت شیخ ابوسعیدؒ کے دل کا حال جان گئے تھے۔ مگر پھر بھی صوفیانہ رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چشم پوشی کا کام لے رہے تھے۔

”میرا سفر رائجاں کیوں گیا؟“ حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس لئے کہ میں نے اپنی روحانیت تمہارے ہم نام ابوسعیدؒ کے حوالے کر دی ہے۔“ حضرت بایزیدؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔

”میرا ہم نام؟“ حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے ایک بار پھر حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں، وہ میرا مرید ابوسعید راعیؒ ہے۔“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”بہت دنوں سے اسی نے روحانیت کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ انشاء اللہ! وہ تمہیں ہر طرح مطمئن کر دے گا۔“ حضرت شیخ ابوسعیدؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ کی گفتگو کے محرکوں نہ سمجھ سکے اور یہ سوچتے ہوئے خانقاہ سے اچلے گئے کہ جب پیر ہی انہیں مطمئن نہ کر سکا تو پھر مرید کس طرح مطمئن کر سکے گا؟

پھر جب حضرت شیخ ابوسعیدؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ کے مرید خاص حضرت شیخ راعیؒ کی خدمت میں ہوئے، اس وقت حضرت شیخ راعیؒ نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت شیخ ابوسعیدؒ اس انتظار میں کھڑے رہے کہ حزن راعیؒ عبادت سے فارغ ہوں اور پھر ان کی روحانیت کا مشاہدہ کر سکیں۔ تھوڑی دیر بعد حضرت شیخ راعیؒ نماز سے فارغ ہوئے تو اپنے مہمان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”شیخ! انتظار رکھیں۔“

حضرت ابوسعیدؒ، حضرت شیخ راعیؒ کے سامنے بیٹھ گئے۔ انہوں نے حضرت بایزید بسطامیؒ کے مرید خاص کو دیکھا، مگر حضرت ابوسعیدؒ کو حضرت شیخ راعیؒ کی ظاہری شخصیت میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔

”شیخ! کیا چاہتے ہیں؟“ حضرت شیخ راعیؒ نے مسکراتے ہوئے اپنے مہمان سے پوچھا۔

”نماز انکور۔“ حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ حالانکہ وہ انکوروں کا موسم نہیں تھا۔

”شیخ! بے موسم کے پھل کی خواہش کیوں کرتے ہو؟“ حضرت شیخ راعیؒ نے فرمایا۔ ”میں آپ کے لئے

کہاں سے لاؤں؟“

”جب شیخ بایزیدؒ کی روحانیت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو تو پھر بے موسم کا پھل لانا ہی ہوگا۔“ حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے فرمایا۔ حضرت شید ابوسعید راعیؒ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

”شیخ! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میں ایک فقیر و ناتواں انسان، پیر و مرشد کی روحانیت کا بار گراں اٹھاؤں ہوں؟ بھلا کی چوٹی نے بھی کسی پہاڑ کا بوجھ اٹھایا ہے؟“

”آپ کے بارے میں شیخ بایزیدؒ تو یہی کہتے ہیں۔“ حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے فرمایا۔

”یہ تو پیر و مرشد کا احسانِ عظیم ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنے غلاموں کی عزت رکھ لیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ راعیؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر آپؒ نے حضرت شیخ ابوسعیدؒ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”جب مرشد کا حکم ہے تو پھر آئیے، آپ کی خدمت میں تازہ انکور پیش کروں۔“

اس کے ساتھ ہی حضرت شیخ راعیؒ خانقاہ سے اٹھے اور حضرت شیخ ابوسعیدؒ کو ساتھ لے کر اپنے حجرہ خاص میں

شریف لائے۔

پھر حضرت شیخ رائی نے اپنے قریب رکھی ہوئی ایک پتلی سی چھڑی اٹھائی اور اسے دو حصوں میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد ٹھوڑی سی زمین کھود کر چھڑی کا ایک ٹکڑا حضرت شیخ ابوسعیدؓ کے قریب نصب کیا اور دوسرا اپنے نزدیک گاڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھڑی کے دونوں ٹکڑوں پر انگور کی سرسبز بیلئیں نمودار ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ٹھوڑی سی دیر میں دونوں انگور کی بیلئیں جبرے کے کمرے کی چھت کو چھونے لگیں۔

حضرت شیخ ابوسعیدؓ نے بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ دونوں بیلوں میں انگور کے خوشے لٹک رہے تھے..... مگر دونوں میں فرق یہ تھا کہ جو نیل حضرت شیخ ابوسعیدؓ کے قریب تھی، اس کے انگور سیاہ تھے۔ اس کے برعکس جو نیل حضرت شیخ رائیؓ کے نزدیک تھی، اس کے انگور نہایت سفید اور خوش رنگ تھے۔

”شیخ! مجھے تازہ انگور تو مل گئے، مگر یہ تفریق سمجھ نہیں آئی۔“ حضرت شیخ ابوسعیدؓ نے حیرت زدہ لہجے میں فرمایا۔
”یہ ہم دونوں کی نیتوں کا فرق ہے جو انگوروں کے رنگ کے ذریعے نمایاں ہو گیا ہے۔“ حضرت شیخ ابوسعیدؓ نے شیخ رائیؓ کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔

”شیخ! مجھے تو صدق و یقین کا درجہ حاصل ہے۔“ حضرت شیخ رائیؓ نے اس سکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اس لئے میرے انگوروں کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ ان کی خوش رنگی اور لطافت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کے برعکس آپ میرے شیخ کا امتحان لینے کی غرض سے بسطام تشریف لائے تھے۔ میرے پیر و مرشد نے اپنی اعلیٰ ظرفی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بات کو ٹالنے کی کوشش کی، مگر آپ اپنی ضد پر قائم رہے اور میری آزمائش کے لئے یہاں چلے آئے۔ حق تعالیٰ قادر مطلق بھی ہے اور بے نیاز بھی۔ اس لئے اس ذات پاک نے انگوروں کی ان بیلوں کے ذریعے ہم دونوں کی قلبی کیفیات ظاہر فرمادی ہیں۔“

حضرت شیخ رائیؓ کی بات سن کر حضرت شیخ ابوسعیدؓ نہایت شرمندہ ہوئے اور پھر عرض کرنے لگے۔ ”شیخ! ازراہ محبت اپنی کوئی نشانی عطا فرمائے۔“
حضرت شیخ رائیؓ نے اپنا کمبل مہمان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”شیخ! یہ آپ کی نذر کر رہا ہوں، مگر اس کی حفاظت فرمائیے گا۔“

حضرت شیخ ابوسعیدؓ بسطام سے چلے گئے۔ مگر حضرت شیخ بازیدؓ کے سلسلے میں اُن کا ذہن صاف نہیں ہو سکا۔ وہ اپنے مریدوں اور خدمت گاروں سے یہی کہتے رہے۔

”شیخ بازیدؓ تو اتنی زیادہ روحانیت کے حامل نہیں، مگر ان کے مرید شیخ رائیؓ ایک صاحب کرامت بزرگ ہیں۔“ یہ ایک عجیب بات تھی کہ شیخ ابوسعیدؓ کی نظروں میں حضرت شیخ رائیؓ تو محترم تھے، مگر حضرت بازیدؓ بسطامیؓ صاحب کرامات نہیں تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ حضرت بازیدؓ بسطامیؓ کرامات کے اظہار کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ اگر حضرت شیخ ابوسعیدؓ، حضرت بازیدؓ بسطامیؓ کی کرامت کو سمجھنا چاہتے تو یہی ایک اشارہ کافی تھا کہ حضرت بازیدؓ بسطامیؓ نے ان کے دل کی بات سمجھ لی تھی اور یہ کہہ کر انہیں اپنے مرید کے پاس بھیج دیا تھا کہ بہت دنوں سے شیخ رائیؓ نے میری روحانیت کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ بہر حال، یہ حضرت شیخ ابوسعیدؓ کا اپنا انداز فکر تھا۔ تاہم وہ حضرت شیخ رائیؓ کے دیئے ہوئے کمبل کو اپنے سینے سے لگا کر رکھتے تھے۔

اور پھر اسی سال حضرت ابوسعیدؓ حج کے لئے مکہ معظمہ حاضر ہوئے۔ اس وقت بھی حضرت شیخ رائیؓ کا دیا ہوا کمبل اُن کے کاندھوں پر موجود تھا۔ پھر جب حضرت شیخ ابوسعیدؓ میدانِ عرفات میں پہنچے تو حیرت انگیز طور پر وہ کمبل غائب

ہو گیا۔

حضرت شیخ ابوسعیدؓ نے ارکان حج ادا کئے اور واپسی میں دوبارہ حضرت شیخ رائیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس سے پہلے کہ آپ حضرت شیخ رائیؒ کو مکمل کے گم ہو جانے کی خبر دیے، ایک ناقابل یقین منظر آپ کی آنکھوں سامنے تھا۔ حضرت شیخ ابوسعیدؓ نے جو مکمل میدان عرفات میں کھویا تھا، وہی مکمل حضرت شیخ رائیؒ کے پاس موجود اس سے پہلے کہ شیخ ابوسعیدؓ کچھ کہتے، حضرت شیخ رائیؒ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”شیخ ابوسعید! یاد رکھو کہ جس نے شیخ بائزیدؒ کی خدمت کی، اللہ کے حکم سے اسے سب کچھ مل گیا۔“

حضرت شیخ ابوسعیدؓ کے چہرے پر ندامت کے آثار نمایاں ہو گئے۔

”شیخ! یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آپ ایک خدمت گار کی روحانیت کو تو تسلیم کرتے ہیں، مگر خودم کی عظمت نہیں پہچانتے۔“ حضرت شیخ رائیؒ نے حضرت شیخ ابوسعیدؓ کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”جیسے آپ کرامت سمجھتے ہیں، وہ بھی حضرت شیخ بائزیدؒ بسطامیؒ کا فیضانِ صحبت ہے۔“

اس واقعے کے بعد حضرت شیخ ابوسعیدؓ، حضرت بائزیدؒ بسطامیؒ کی روحانی عظمتوں کے قائل ہو گئے۔



حضرت بائزیدؒ بسطامیؒ کا شمار اُن صوفیائے کرام میں ہوتا ہے، جو زندگی بھر نہ صرف علماء کی تنقید کا ہدف رہے بلکہ خود صوفیاء کی بھی ایک تعداد نے اُن کی مخالفت کی۔ یہ اختلاف محض نارسائی کی بنیاد پر تھا۔ حضرت بسطامیؒ معرفت کے جس مقام پر فائز تھے، اس کا سمجھنا ایک کارِ دشوار تھا۔ نتیجتاً ظاہر میں اور سہل پسند علماء آسمانی حضرت شیخ پر کفر کے فتوے عائد کر کے انہیں شہر بدر کر دیا کرتے تھے۔ علمائے بسطام کے اسی طرزِ عمل کی وجہ سے کبھی عام لوگ بھی آپؒ کی شان میں گستاخی کر جایا کرتے تھے۔

بسطام میں ایک نماز گزار رنگ ریز رہا کرتا تھا اور وہ عام مجلسوں میں حضرت شیخ بائزیدؒ کی کرامات کا بہت مذا اڑایا کرتا تھا۔

ایک دن ایک شخص نے اُس رنگ ریز سے پوچھا۔

”آخر تو حضرت بائزیدؒ بسطامیؒ کے ساتھ ایسا تحقیر آمیز سلوک کیوں رکھتا ہے؟“

رنگ ریز نے جواباً کہا۔ ”میں تو وہی کہتا ہوں جو محسوس کرتا ہوں۔“

”کیا تجھے حضرت بائزیدؒ کی ذات سے کوئی تکلیف پہنچی ہے؟ یا تو محض مخالفت کی بنیاد پر ایسی باتیں کرتا ہے؟“

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔

”مجھے شیخ بائزیدؒ سے کوئی ذاتی پرہاش نہیں ہے۔“ رنگ ریز نے کہا۔ ”میں تو بس اُن کی کرامات کا منکر ہوں۔“

”اس انکار کی وجہ؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”حضرت بائزیدؒ کی جن کرامات کا پورے بسطام میں شہرہ ہے، ایسی کرامتیں تو میں بھی دکھا سکتا ہوں۔“ رنگ ریز نے فخریہ لہجے میں کہا۔

”پھر تجھ میں اور بائزیدؒ میں کیا فرق ہے؟“ اس شخص نے ایک اور سوال کیا۔

”بس اتنا فرق ہے کہ اُن کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“ رنگ ریز نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”پتہ نہیں“

وہ کس زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔“

پھر اس رنگ ریز کی باتیں بسطام میں اس قدر عام ہو گئیں کہ حضرت بائزیدؒ کے عقیدت مندوں اور خدمت

گاردن کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ کئی بار بعض مریدوں نے حضرت شیخ کی توجہ اس طرف دلائی کہ وہ رنگ ریز آج کل بہت ہڈیان بک رہا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے ہر بار ایک ہی جواب دیا۔
”بایزید کے خلاف بھی تو کوئی بولنے والا ہو۔ اس سے انسان کے نفس کی سرکشی کم ہوتی ہے۔“

پھر ایک دن وہی رنگ ریز، حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔
حضرت شیخ نے رنگ ریز کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”کیا اپنی کرامت کا اظہار کرنے آیا ہے؟“
یہ سنتے ہی وہ رنگ ریز غش کھا کر گر پڑا اور تین دن تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ چوتھے دن اسے ہوش آیا، پھر اس نے غسل کیا اور دوبارہ حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

”اب میری باتیں سمجھ میں آئیں؟“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے رنگ ریز کو مخاطب کر کے فرمایا۔
رنگ ریز کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اُس نے شرمسار ہو کر سر جھکا لیا۔
”تمہارے دماغ میں زیادہ باتیں سامنے کی گنجائش نہیں ہے۔“ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”بس اتنا یاد رکھو کہ ہاتھی کا بوجھ کسی گدھے پر نہیں ڈالا جاسکتا۔“

اس کے بعد رنگ ریز نے حضرت بایزید بسطامیؒ کی کرامات کا مذاق اڑانا بند کر دیا۔ وہ اکثر لوگوں سے کہا کرتا تھا۔ ”شیخ بایزیدؒ کی ایک بات میری سمجھ میں آگئی ہے..... اور وہ بات میرے لئے کافی ہے۔“



اسی طرح بسطام میں ایک اور شخص بھی حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ کی روحانی عظمتوں کا منکر تھا۔ جب دوسرے لوگ اُس کے انکار کا سبب دریافت کرتے تو وہ انتہائی بے باکانہ لہجے میں جاب دیا۔

”اللہ کے ولی کی پہچان یہ ہے کہ وہ ایک عام انسان پر بھی قدرت کے اسرار و رموز ظاہر کر سکتا ہے۔ اگر شیخ بایزید بسطامیؒ مجھے کھلی آنکھوں سے اللہ کی کوئی نشانی دکھادیں تو میں نہ صرف انہیں ولی تسلیم کر لوں گا، بلکہ خود کو ان کی غلامی میں بھی پیش کر دوں گا۔“

وہ شخص اس ارادے سے کئی بار حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا مگر آپؒ نے اُس کی طرف ایک مرتبہ بھی چشم التفات سے نہیں دیکھا۔ نتیجتاً اُس شخص کے انکار میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ پھر وہ بسطام کے قلی لوچوں میں تشہیر کرنے لگا کہ شیخ بایزیدؒ ایک عارف کامل ہرگز نہیں بلکہ ایک مسد نشیں ہیں اور انہوں نے اپنے گرد عقیدت مندوں کا میل لگا رکھا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کے کانوں تک یہ بھی خبریں پہنچیں اور آپؒ فرماتے۔ ”وہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ بایزید حقیقتاً کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس انکار کے باوجود وہ شخص کبھی کبھی حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن سینکڑوں عقیدت مند، مجلس میں موجود تھے۔ وہ منکر شخص بھی پچھلی قطار میں کہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک حضرت شیخ بایزیدؒ نے اُس کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں فرمایا۔ ”اے شخص! تم میرے قریب آؤ۔“
وہ شخص حیرت میں ڈوبا ہوا حضرت بایزید بسطامیؒ کے نزدیک پہنچا تو آپؒ نے فرمایا۔ ”کیا تمہارے دل میں

اب بھی مشاہدہ حق کی تمنا موجود ہے؟“
”یہ تمنا تو مجھے ہر وقت بے چین رکھتی ہے۔ مگر کیا کروں کہ یہاں کوئی مرد حق ہی نہیں جو مجھے مشاہدہ حق کرا سکے۔“ اُس شخص کی دریدہ دہنی کا وہی عالم تھا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”فلاں پہاڑ پر میرا ایک دوست رہتا ہے۔ تم وہاں جا کر اس سے درخ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری برسوں کی تمنا تکمیل پا جائے۔“

اس شخص نے شدید بے قراری کا مظاہرہ کیا اور بھاگتا ہوا پہاڑ تک پہنچا۔ پھر پہاڑ کی چوٹی تک پہنچے پسے پسے ہو گیا۔ اس نے اپنی تمنا کی تکمیل کے لئے یہ ساری صعوبت برداشت کی تھی۔

”مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ اس نے چاروں طرف نظر کی اور خود کلامی کے انداز میں ہانپتے ہوئے ”شیخ بایزیدؒ نے مجھ سے جھوٹ بولا؟“ وہ شخص ایک عارفِ دوراں سے بدگمان ہونے لگا۔ ”شیخ کو یہاں

ضائع کرنے اور مجھے بے وقوف بنانے سے کیا حاصل ہوا؟“ بدگمانیوں کا سلسلہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ پھر اُس شخص نے اتمامِ حجت کے لئے بلند آواز میں نکارا۔ ”شیخ بایزیدؒ کے دوست! تم کہاں ہو؟“

دیران پہاڑی پر اُس شخص کی آواز گونج کر رہ گئی۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد اُس شخص نے دواہرے۔ اس بار بھی فضا میں آواز کی گونج ابھری اور چند لمحوں بعد ڈوب گئی۔ وہ شخص کچھ دیر تک اُس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر جب آنے والا نہیں آیا تو اُس نے ایک بار پھر دل کے زور سے چیخنے ہوئے کہا۔

”شیخ بایزیدؒ کے دوست! تم کہاں ہو؟“

اس بار بھی اُس شخص کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ اچانک پہاڑی کے ایک گوشے سے ایک خوفناک نمودار ہوا۔ اس شخص پر اڑدھے کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ بے ہوش ہو کر پہاڑی پر گر پڑا اور بہت دیر تک رہا۔ حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ کا دوست تو آیا تھا، مگر وہ شخص اُس کی دہشت برداشت نہ کر سکا۔

پھر جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ موت کے خوف سے اُس کی آنکھ کی پٹلیاں رہی تھیں۔

اُس شخص کا خیال تھا کہ اڑدھے نے اُسے ڈس لیا ہو گا مگر جب زہر کی کوئی علامت نظر نہیں آئی تو قہقہے جانا خیال سے اس کے جسم میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور وہ پوری رفتار سے بھاگ کھڑا ہوا۔

پھر جب وہ شخص حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؒ نے اُس سے پوچھا۔

”میرے دوست سے ملاقات ہو گئی؟“

”شیخ! وہاں تو کوئی انسان موجود نہیں تھا۔“ اس شخص پر ابھی تک دہشت طاری تھی۔ ”وہاں تو میں نے خوفناک اڑدھے کو دیکھا، جس کی ہیبت سے مجھ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ پھر بڑی مشکل سے جان بچا کر یہاں پہنچا ہوں۔“

”وہی اڑدھا تو میرا دوست تھا۔“ حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”بڑی عجیب بات ہے کہ تم مخلوق اس قدر خوف زدہ ہو گئے، مگر خالق کے ہیبت و جلال نے تمہارے دل پر بھی کوئی اثر نہیں کیا۔ کیا اسی حوصلے پر تم مجھ سے اللہ کی قدرت و معرفت کے اسرار و رموز دریافت کرنے آئے تھے؟“

اپنی زندگی کے اس عجیب و غریب مشاہدے اور تجربے سے گزرنے کے بعد اس شخص کے ذہن کی ساری ختم ہو گئی تھی۔ نتیجتاً وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے اسے خاموش پا کر فرمایا۔ ”پہلے مخلوق کے اسرار و رموز کو سمجھو، پھر خالق کے بارے میں سوچنا۔“

وہ شخص، حضرت بایزید بسطامیؒ کی بارگاہِ جلال سے اس طرح اٹھا کہ فرطِ ندامت سے اس کا پورا جسم عرق

تھا۔ پھر اہل بسطام نے دیکھا کہ اس شخص کی عادتیں اور شب و روز یکسر بدل گئے تھے۔ وہ ہر وقت اللہ کی تخلیقات کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن اپنی ذات سے بھی بے خبر ہو گیا۔



حضرت احمد حضرویہؒ، خراسان کے عظیم الشان بزرگوں میں سے تھے۔ آپؒ کو مشہور بزرگ حاتم اصمؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا، لیکن ایک طویل عرصے تک آپؒ حضرت ابو تراب بخشیؒ کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوتے رہے تھے۔ کسی شخص نے مشہور بزرگ حضرت ابو حفصؒ سے پوچھا۔

”شیخ! آپ کا احمد حضرویہؒ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

جواب میں حضرت شیخ ابو حفصؒ نے نہایت عقیدت کے ساتھ فرمایا۔ ”میں نے شیخ حضرویہؒ سے زیادہ باحوصلہ اور صادق الاحوال کسی صوفی کو نہیں پایا۔“

حضرت احمد حضرویہؒ کے بارے میں حضرت شیخ ابو حفصؒ کا یہ قول بہت شہرت رکھتا ہے۔ آپؒ اکثر مجلسوں میں فرمایا کرتے تھے۔

”اگر شیخ احمد حضرویہؒ نہ ہوتے تو مروت و فتوحات کا ظہور ہی نہ ہوتا۔“

حضرت احمد حضرویہؒ ہمیشہ فوجی لباس میں رہتے تھے۔ ایک بار سفر حج کے دوران آپؒ کے پاؤں میں کانٹا چھ گیا اور آپؒ نے اس خیال سے وہ کانٹا نہیں نکالا کہ اس طرح تو کل متاثر ہو جائے گا۔ نتیجتاً حضرت شیخ احمدؒ کا پاؤں متورم ہو گیا اور آپؒ اسی حالت میں لنگڑاتے ہوئے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور شدید تکلیف کے باوجود ارکانِ حج ادا کئے۔ واپسی میں لوگوں نے اصرار کر کے آپؒ کے پاؤں سے وہ کانٹا نکال دیا۔ پھر جب شیخ احمد حضرویہؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؒ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”شیخ احمد! جو اذیت تمہیں دی گئی تھی، وہ کہاں گئی؟“

جواب میں حضرت شیخ احمد حضرویہؒ نے فرمایا۔ ”شیخ! میں نے تو اپنے اختیار کو اس کے تابع کر دیا تھا۔“

حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کا جواب سن کر حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”شیخ! خود کو صاحب اختیار تصور کرنا کیا

شرک میں داخل نہیں؟“

حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کے چہرہ مبارک پر ندامت کا رنگ اُبھر آیا اور پھر نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

”شیخ! میں آپؒ کی سی نظر کہاں سے لاؤں؟“

ایک رات حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کے ہاں ایک چور داخل ہو گیا۔ مگر پورے گھر کی تلاشی لینے کے بعد اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ پھر جب وہ ناکام و نامراد واپس جانے لگا تو اچانک حضرت شیخ احمد حضرویہؒ مکان کے صحن میں نمودار ہوئے اور چور کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

”یہ تو ایک درویش کا گھر ہے۔ تم نے ناحق زحمت کی۔“

مالک مکان کو سامنے پا کر چور بھاگنے لگا تو آپؒ نے فرمایا۔ ”میں تمہیں پکڑوں گا نہیں۔ مجھے تمہاری محنت رایگاں جانے کا بہت افسوس ہے، اس لئے تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ میرے ساتھ مل کر ساری رات عبادت کرو۔ مجھے اس عبادت میں جو کچھ صلہ ملے گا، وہ تمہاری نذر کر دوں گا۔“

چور کی ضرورت بھی شدید تھی۔ اور اس نے ایسا مالک مکان بھی آج تک نہیں دیکھا تھا، اس لئے وہ ٹھہر گیا اور حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کے ساتھ رات بھر عبادت میں مشغول رہا۔

پھر جب صبح ہوئی تو حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کا ایک عقیدت مند حاضر ہوا اور اُس نے بطور نذرانہ خدمت میں پیش کئے۔ حضرت شیخ احمدؒ نے وہ سارے دینار چور کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا۔
”یہ تو صرف ایک رات کی عبادت کا معاوضہ ہے۔“

حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کا ارشاد گرامی سن کر چور پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ رونے لگا۔ پھر اس نے آپؒ حق پرست پر توبہ کی اور خدمت گاروں میں شامل ہو گیا۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ چور کا شمار بلند مقام پر ہونے لگا۔

اسی طرح ایک دن ایک شخص حضرت احمد حضرویہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بہت دیر تک اپنے اظہار کار و نثار تارہا۔ آخر اُس کی گریہ و زاری سن کر حضرت شیخ احمدؒ نے فرمایا۔
”دنیا میں جتنے امکانات پیش ہو سکتے ہیں، ان سب کو الگ الگ پرچیوں پر لکھ کر ایک لوٹے میں ڈال دو۔ لوٹا میرے پاس لے آؤ۔“

اس شخص نے حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کے حکم کی تعمیل کی اور پرچیوں سے بھرا ہوا لوٹا لا کر آپؒ کے سامنے رکھا۔ حضرت شیخ احمدؒ نے لوٹے میں ہاتھ ڈال کر ایک پرچی نکالی۔ اس پر چوری کا پیشہ درج تھا۔ ”میرے سے تو تمہیں چوری کا پیشہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس طرح تمہاری غربت دور ہو جائے گی۔“
وہ شخص حضرت احمد حضرویہؒ کے حکم پر حیران رہ گیا۔ ”شیخ! میں چوری کا پیشہ اختیار کروں؟“ اُس کی زبان بمشکل یہ الفاظ ادا ہوئے۔

”ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہے۔“ حضرت احمد حضرویہؒ نے فرمایا۔ ”اس لئے تم بھی آزاد ہو۔ مگر تقدیر کا اسی طرف ہے۔“

وہ شخص، حضرت احمد حضرویہؒ سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا، اس لئے چوروں کے گروہ میں شامل ہوا۔ دراصل وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ فرمودہ شیخؒ میں آخر ایسا کون سا راز پوشیدہ ہے۔ پھر جب وہ چوروں اور فاجر جماعت میں شامل ہوا تو معاشرے کے اُن بدترین مجرموں نے اس شخص سے حلف لیا کہ وہ ہر حال میں ان احکام کی تعمیل کرے گا۔

پھر ایک دن چوروں کے اسی گروہ نے ایک بہت دولت مند آدمی کو اغوا کر لیا۔ اس کے طلائی ہار اور انگوٹھیں لیں اور نئے چور کو حکم دیا کہ اس المادر شخص کو قتل کر دیا جائے۔

نئے چور نے اپنے گروہ کے سردار سے حجت کی۔ ”ہمارا پیشہ چوری ہے۔ لوگوں کو قتل کرنا ہمارا کاروبار نہیں۔“
”تم ابھی نئے نئے اس جماعت میں شامل ہوئے ہو۔“ چوروں کے سردار نے وحشیانہ لہجے میں کہا۔ ”ہم لو کہ مال لوٹنے کے بعد انہیں قتل کر دیا کرتے ہیں، تاکہ ہمارے جرم کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔“
نیا چور اپنی جماعت کی اس سفاکی پر لرز کر رہ گیا۔ ”اب تمہارا کام یہی ہے کہ تم لوگوں کو قتل کیا کرو۔“ سردار نے نئے چور کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”رات میں کسی وقت اُس المادر شخص کا کام تمام کر دو اور لاش کسی جھاڑی میں پھینک دو۔“

نیا چور خاموش ہو گیا۔ وہ اب تک اس جماعت کو محض چوروں کی جماعت سمجھ رہا تھا۔ مگر آج اس پر ان لوگوں کی درندگی کا راز فاش ہو گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک شدید ذہنی کشاکش کا شکار رہا۔ آخر اُس نے ایک جرأت مندانہ فیصلہ اور رات کے وقت تلوار لے کر سردار کے خیمے میں داخل ہو گیا۔

”میں تمہیں صرف چور سمجھتا تھا، مگر حقیقتاً تم ایک درندے ہو۔ اور آج رات میں مخلوقِ خدا کو اس درندگی سے نجات دلا دوں گا۔“ یہ کہہ کر نئے چور نے اپنے سردار کا سر قلم کر دیا۔

دوسرے چوروں نے یہ خوف ناک صورت حال دیکھی تو وہ دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر وہ نیا چور اُس مالدار شخص کے پاس پہنچا، جسے قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔

”میں تمہیں آزاد کرتا ہوں اور اس عمل کی معافی چاہتا ہوں، جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔“ نئے چور نے سارا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

وہ مالدار شخص، مجبوری کے تحت چور بن جانے والے ایک سادہ دل انسان کے اس بیان سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ پھر وہ امیر و کبیر شخص نے چور کو اپنے گھر لے گیا اور اس قدر انعام و اکرام سے نوازا کہ اُس کا دامن مراد بھر گیا۔

پھر وہ شخص حضرت شیخ احمد حضردیہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! اب میں ایک آسودہ حال شخص ہوں۔ مگر چوری کا پیشہ اختیار کرنے کا راز مجھ میں نہیں آیا۔“

”قدرت کے رازوں کو قدرت کے لئے چھوڑ دو۔“ حضرت شیخ احمد حضردیہؒ نے فرمایا۔ ”تمہیں غربت و افلاس سے نجات مل گئی، بس تمہارے لئے یہی مقام شکر ہے۔“

پھر اُس شخص نے اپنی ساری زندگی عبادت و ریاضت میں گزار دی۔ یہ حضرت شیخ احمد حضردیہؒ کا فیضانِ نظر تھا، جو عجیب رنگ میں ظاہر ہوا۔

ایک بار ایک بزرگ حضرت شیخ احمد حضردیہؒ کے یہاں تشریف لائے۔ آپؒ نے ازراہِ مہمان نوازی اس رات سات شمعیں روشن کیں۔ بزرگ نے حضرت شیخ احمدؒ کے اس عمل پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

”شیخ! آپ کے یہ تکلفات، تصوف کے سراسر منافی ہیں۔“

حضرت شیخ احمد حضردیہؒ نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ فرمایا۔ ”شیخ! میں نے تو یہ تمام شمعیں صرف اللہ تعالیٰ کے لئے روشن کی ہیں۔ اگر آپ کسی شمع کو خلافِ تصوف سمجھتے ہیں تو اسے خود ہی بجھا دیں۔“

حضرت شیخ احمدؒ کی بات سن کر بزرگ آگے بڑھے اور ایک شمع کو بجھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر وہ ساری رات اسی کام میں مصروف رہے، مگر ایک شمع کو بھی نہ بجھا سکے۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔ حضرت شیخ احمد حضردیہؒ نے بزرگ کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی، پھر آپؒ مہمان بزرگ کو لے کر ایک گر جا کے دروازے پر پہنچے، جہاں ایک آتش پرست بہت بڑا دسترخوان بچھائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اور دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے سجے ہوئے تھے۔

”شیخ! میرے ساتھ کھانا کھائیے اور مجھے میزبانی کا شرف بخشیے۔“ حضرت احمد حضردیہؒ کو دیکھ کر آتش پرست نے کہا۔

”اللہ کا دوست اور اللہ کا دشمن ایک دسترخوان پر کس طرح کھانا کھا سکتے ہیں؟“ حضرت شیخ احمد حضردیہؒ نے فرمایا۔

یہ سنتے ہی آتش پرست نے ایک زوردار چیخ ماری اور حضرت شیخ احمدؒ کے قدموں میں جھک گیا۔ ”تو پھر مجھے اپنا دوست بنا لیجئے۔“

اس کے بعد وہ آتش پرست اور اُس کے 69 ساتھی حضرت شیخ احمد حضردیہؒ کے دستِ حق پرست پر مسلمان ہو گئے۔

پھر اسی رات حضرت شیخ احمد حضرویہؒ نے خواب میں صدائے غیب سنی۔ ”احمد! تُو نے ہمارے لئے مارا روشن کیوں اور ہم نے تیرے ہی ویلے سے سترِ قلوب کو نورِ ایمانی سے منور کر دیا۔“

حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ تمام معتبر کتابوں میں درج ہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے: ”میں نے انسانوں کو جانوروں کے مانند چارہ کھاتے دیکھا ہے۔“

یہ سن کر مجلس میں بیٹھے ہوئے کسی شخص نے پوچھا۔ ”شیخ! کیا آپ اُن انسانوں میں شامل نہیں تھے؟“ حضرت شیخ احمد حضرویہؒ نے جواب میں فرمایا۔ ”میں بھی اُن انسانوں میں شامل تھا، مگر فرق یہ تھا کہ کھاتے ہوئے خوشی سے اُچھل کود رہے تھے..... اور میں چارہ کھاتے وقت رو رہا تھا۔“

وفات سے پہلے حضرت شیخ احمد حضرویہؒ ستر ہزار دینار کے مقروض تھے۔ آپ کی سخاوت مشہور تھی اور قرضہ صدقات و خیرات کرنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ پھر جب حضرت شیخ احمدؒ بسترِ مرگ پر دراز ہوئے تو قرضوں نے شدت کے ساتھ تقاضا شروع کر دیا۔ لوگوں کی دل آزار باتیں سن کر حضرت شیخ احمدؒ نے نہایت رقت اور میں دعا فرمائی۔

”اے غفور الرحیم! تُو میری حالت زار کو خوب جانتا ہے۔ میں تو اسی وقت تیری بارگاہِ کرم میں حاضر ہوئے جب لوگوں کے قرض سے سبک دوش ہو جاؤں۔ کیونکہ میری زندگی تو تیرے بندوں کے پاس رہن رکھی ہوئی ہے جیسے ہی حضرت احمد حضرویہؒ کی دعا ختم ہوئی، دروازے پر ایک بُر جلالِ آواز سنائی دی۔“ تمام لوگ اہانہ لے لیں۔“

یہ آواز سنتے ہی حضرت شیخ احمدؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”بے شک! وہ اپنے نام لیواؤں کو اہانہ سامنے شرمسار نہیں ہونے دیتا۔“

پھر جب تمام لوگ اپنا اپنا قرض لے چکے تو حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کی وحدانیت اور حضور اکرمؐ کو ابی دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حضرت احمد حضرویہؒ نے بلخ کے سردار کی صاحبزادی حضرت فاطمہؒ سے شادی کی تھی اور یہ شادی خود فاطمہؒ کے اصرار پر ہوئی تھی۔ شادی کے بعد آپ بھی اپنے شوہر کے ساتھ مشغولِ عبادت رہا کرتی تھیں۔ حضرت احمد حضرویہؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت فاطمہؒ بھی شوہر کے ساتھ حضرت بایزید بسطامیؒ کی خانقاہ میں دونوں میاں بیوی کافی دنوں تک مقیم رہے۔ حضرت فاطمہؒ کی عادت وہ حضرت بایزید بسطامیؒ سے بے باکانہ انداز میں گفتگو کرتی تھیں۔ حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کو اپنی شریکِ جان طرزِ تکلم پسند نہیں تھا۔ ایک دن آپؒ نے تنہائی میں بیوی کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

”فاطمہ! غیر مردوں سے اس طرح گفتگو کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔“

حضرت فاطمہؒ نے شوہر کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”جس طرح خواہشاتِ دنیا کی تکمیل میں آپ میرے ہیں، اسی طرح طریقت کی آرزو میں شیخ بایزیدؒ میرے راز دار ہیں۔ ان ہی کی توجہ سے مجھے دیدارِ الہی نصیب ہے۔“ بیوی کا جواب سن کر حضرت شیخ احمد حضرویہؒ خاموش ہو گئے، مگر انہیں اپنی شریکِ حیات کا یہ طرزِ عمل پسند نہیں تھا۔ آخر ایک دن حضرت بایزیدؒ نے حضرت شیخ احمدؒ کی یہ الجھن ہمیشہ کے لئے دُور کر دی۔ حضرت اپنے شوہر کے ساتھ حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر تھیں۔ اُس روز آپؒ نے گہرے رنگ کی ہنڈی ہوئی تھی۔

حضرت بازید بسطامیؒ معرفت کے کسی خاص موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ اچانک آپ نے حضرت فاطمہؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”فاطمہ! تم نے یہ مہندی کیوں لگا رکھی ہے؟ کیا تمہارے ہاتھوں کا فطری رنگ کافی نہیں ہے؟“
حضرت بازید بسطامیؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت فاطمہؒ یہ کہتی ہوئی مجلس سے اٹھ گئیں۔
”شیخ! آپ نے ابھی تک میرے ہاتھوں اور مہندی پر نظر نہیں کی تھی، اس لئے میں آپ کے نزدیک بیٹھ جاتی تھی۔ مگر آج سے اس مجلس میں بیٹھنا میرے لئے حرام ہے۔“
اس کے بعد حضرت فاطمہؒ شوہر کو لے کر نیشاپور چلی گئیں۔

حضرت بازید بسطامیؒ نے جان بوجھ کر حضرت فاطمہؒ کے ہاتھوں کی مہندی کا ذکر کیا تھا تاکہ انہیں شائستہ انداز میں تنبیہ کیا جاسکے۔ حضرت فاطمہؒ نے حضرت شیخ بازیدؒ کی اس تنبیہ کا خاطر خواہ اثر قبول کیا تھا اور پھر نامحرم مردوں کی مجلسوں میں بیٹھنا ترک کر دیا۔ موجودہ نظام خانقاہی کو بھی اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔



حضرت احمد حضرویہؒ فرماتے ہیں۔ ”میں ایک بار عالم خواب میں حق تعالیٰ کے دیدار سے شرف یاب ہوا۔ اسی دوران مجھے صدائے غیب سنائی دی۔“ ”تم سب لوگ تو ہم سے اپنی ضرورت کی چیزیں طلب کرتے رہتے ہو، لیکن بازید ہم سے ہم ہی کو مانگتا ہے۔“

یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ احمد حضرویہؒ اکثر حضرت بازید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت شیخ احمدؒ اپنے مریدوں کی جماعت کے ساتھ حضرت بازید بسطامیؒ سے ملاقات کے لئے بسطام تشریف لائے۔ حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کے مریدوں میں ایک ایسا مرید بھی تھا، جو سر عام اپنی روحانی طاقت کے مظاہرے کرتا تھا۔ پھر جب حضرت شیخ احمد حضرویہؒ، حضرت بازید بسطامیؒ کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچے تو آپؒ نے اپنے مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”جس میں حضرت شیخ بازیدؒ کے دیدار کی طاقت ہو، بس وہی میرے ہمراہ آئے اور باقی لوگ باہر ٹھہر جائیں۔“
تمام مریدوں نے حضرت بازید بسطامیؒ کے دیدار کی خواہش کا اظہار کیا مگر وہ مرید جو اپنی روحانی طاقت کے مظاہرے کیا کرتا تھا، خانقاہ کے دروازے پر رک گیا۔

پھر جب حضرت شیخ احمد حضرویہؒ، حضرت بازید بسطامیؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو آپؒ نے احترام شیخ کے سب اپنا عصا اس جگہ رکھ دیا، جہاں دوسرے لوگ جوتے اُتارا کرتے تھے۔ پھر جب عارفوں کی یہ جماعت حضرت بازید بسطامیؒ کے روبرو حاضر ہوئی تو آپؒ نے حضرت احمد حضرویہؒ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”شیخ! تم نے اپنے افضل ترین مرید کو باہر کیوں چھوڑ دیا؟ اُسے بھی اندر بلا لو۔“

پھر جب وہ مرید، حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو گیا تو حضرت بازید بسطامیؒ نے حضرت احمد حضرویہؒ سے فرمایا۔ ”شیخ! آپ کب تک دنیا کی سیر و سیاحت میں مشغول رہیں گے؟“

حضرت شیخ احمد حضرویہؒ نے جواباً فرمایا۔ ”شیخ! پانی کے ایک جگہ ٹھہرنے سے اس میں بدبو بھی پیدا ہو جاتی ہے اور پانی کا رنگ بھی بدل جاتا ہے۔“

حضرت شیخ احمد حضرویہؒ کا جواب سن کر حضرت بازید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”شیخ! پھر آپ دریا کیوں نہیں بن جاتے جس کے پانی میں نہ کبھی بدبو پیدا ہوتی ہے اور نہ اُس کا رنگ بدلتا ہے۔“



ایک دن حضرت بایزید بسطامیؒ اپنے مریدوں کو درس دے رہے تھے۔ اچانک آپؒ اپنی نشست پر گئے اور مریدین کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

”اللہ کا ایک دوست آرہا ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ ہم باہر نکل کر اس کا استقبال کریں۔“

پھر حضرت بایزید بسطامیؒ اپنے مریدوں اور خدمت گاروں کے ساتھ خانقاہ سے باہر تشریف لائے۔ بزرگ حضرت ابراہیم ہروئیؒ ایک ٹھوڑے پر سوار تشریف لارہے تھے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے آگے حضرت ابراہیم ہروئیؒ کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور نہایت احترام کے ساتھ اپنی خانقاہ میں لے کر آئے اور عاجزی کے ساتھ فرمایا۔

”شیخ! مجھے اللہ کی طرف سے آپ کے استقبال کا حکم ملا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی ملا ہے کہ بارگاہ میں آپ کو اپنا شفیع بنالوں۔“

حضرت بایزید بسطامیؒ کی بات سن کر حضرت ابراہیم ہروئیؒ نے فرمایا۔ ”شیخ! اگر پہلی شفاعت تمہیں اور شفاعت مجھے عطا کی جائے، تب بھی رسول اکرم ﷺ کی شفاعت کے مقابلے میں ان شفاعتوں کا مرتبہ کیا خاک کے برابر بھی نہیں ہوگا۔“

حضرت ابراہیم ہروئیؒ کا جواب سن کر حضرت بایزید بسطامیؒ بہت خوش ہوئے۔

پھر کچھ دیر دونوں بزرگوں کے درمیان تصوف کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد مہمان کی توڑ لئے دسترخوان بچھایا گیا، جس پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانے موجود تھے۔

کھانے کے دوران حضرت ابراہیم ہروئیؒ نے دل میں سوچا۔ ”صوفیاء کی غذا ایسی نہیں ہوتی۔ بایزیدؒ دوراں کو اس قسم کے لذیذ اور مرغن کھانوں سے پرہیز کرتا چاہئے۔“

حضرت بایزید بسطامیؒ کو اپنے کشف کے ذریعے حضرت ابراہیم ہروئیؒ کے دل کی بات معلوم ہو گئی۔ اور نے دوسرے لوگوں کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا۔

پھر کھانے کے بعد حضرت ابراہیم ہروئیؒ اس بات سے بے خبر تھے کہ اُن کے دل کی بات حضرت بایزیدؒ پر منکشف ہو گئی ہے۔ اچانک حضرت بایزید بسطامیؒ نے حجرے کے ایک گوشے میں جا کر دیوار پر ہاتھ مارا اور یہی دیکھتے دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہو گیا۔

”شیخ! یہاں تشریف لائیے۔“

حضرت ابراہیم ہروئیؒ نے دیوار میں دروازے کے نمودار ہونے کے منظر کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ پھر آپؒ حضرت بایزیدؒ کے قریب پہنچے تو ایک ناقابل یقین منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ حضرت ابراہیم ہروئیؒ نے اُس کے دروازے کے باہر ایک طویل و عریض دریا موجیں مار رہا تھا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنے مہمان بزرگ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”شیخ ابراہیم! آئیے، ہم دونوں الہ میں غسل کرتے ہیں۔“

حضرت ابراہیم ہروئیؒ نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں شیخ! یہ دریا تمہارا ہے اور اللہ نے مجھے یہ دریا بخشا ہے۔“

حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”شیخ ابراہیم! جو کی جو روٹی آپ کی غذا ہے، وہ تو جانور بھی کھاتے ہیں۔“

اس کے باوجود آپ یہ تصور کرتے ہیں کہ عمدہ اور لذیذ کھانا کھانے والا، اہل تقویٰ میں سے نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیے کہ اللہ اپنی نعمتوں کے اظہار کو بھی پسند فرماتا ہے۔“

حضرت ابراہیم ہر وہی اپنے اس خیال پر بہت نادم ہوئے اور آپؐ نے حضرت بایزید بسطامیؒ سے معذرت طلب کی۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کے ارشاد گرامی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کی روٹی کھانے اور گدڑی پہننے سے نہ کسی کو تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور نہ کوئی درویش بن سکتا ہے۔ تقویٰ تو ضبط نفس اور ایثار و قربانی کا نام ہے۔ اور حضرت بایزید بسطامیؒ تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔



حضرت بایزید بسطامیؒ کو یہ مقام یوں ہی حاصل نہیں ہو گیا تھا۔ اوّل و آخر حق تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ..... سرور کوئین حضور اکرم ﷺ سے بے پناہ عشق..... مادر گرامی کا حد درجہ احترام اور خدمت گزاری..... ریاضت و عبادت میں انتہائی مشقت..... ترک ذات اور نفس کشی..... انسانوں کے ساتھ اللہ کی تمام مخلوقات سے محبت..... یہ تھی حضرت بایزید بسطامیؒ کے تصوف کی بنیاد، جس نے آپؐ کو ”سلطان العارفین“ کے مقام تک پہنچایا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کی معرفت کی اساس نماز تھی۔ اور نماز کو ”معراج العاشقین“ کہا گیا ہے۔ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کو یہ معراج حاصل تھی۔

مشہور بزرگ حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) فرماتے ہیں۔ ”حضرت بایزید بسطامیؒ ان بزرگوں میں سے تھے، جو ہمیشہ صاحب مجاہدہ اور محو مشاہدہ رہا کرتے تھے۔ آپؒ عشق الہی کی شدت کے سبب ہمیشہ مدہوش اور مغلوب رہا کرتے تھے۔ لیکن جب نماز کا وقت آتا تو ہوش میں آ جاتے اور نماز ادا کرتے ہی دوبارہ مغلوب ہو جاتے تھے۔“

مشہور بزرگ اور صوفی شاعر حضرت مولانا عبدالرحمن جامیؒ فرماتے ہیں۔ ”حضرت بایزید بسطامیؒ جس خشوع و خضوع سے نماز ادا کرتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں ہی کا حصہ ہے۔ جب حضرت شیخؒ نماز کے لئے بارگاہ ذوالجلال میں کھڑے ہوتے تو شریعت کے احترام اور حق تعالیٰ کی ہیبت کی وجہ سے اُن کے سینے کی ہڈیوں سے آوازیں آیا کرتی تھیں اور لوگ ان آوازوں کو سنا کرتے تھے۔“

حضرت بایزید بسطامیؒ اسی طرح تمام نمازیں ادا کرتے لیکن ہمیشہ یہی سمجھتے کہ نماز کا حق ادا نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں حضرت شیخؒ خود فرماتے ہیں۔

”ساری عمر میری یہ آرزو رہی کہ ایک نماز تو ایسی ادا کر لوں کہ جو حق تعالیٰ کی بندگی کے شایان شان ہو۔ مگر انفس! ایک بار بھی ایسا نہیں کر سکا۔“

ایک رات حضرت بایزید بسطامیؒ نماز عشاء ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ پھر آپؒ نے عشاء کے فرض پڑھنے کے بعد چار چار رکعتیں پڑھنا شروع کیں۔ پھر جب نماز ختم ہوتی تو آپؒ غم زدہ لہجے میں فرماتے۔

”اے اللہ! یہ نماز تیرے قابل نہیں تھی۔ میں دوبارہ تیری بندگی کا اظہار کرتا ہوں، مجھے ہمت عطا فرما۔“

اس کے بعد حضرت بایزید بسطامیؒ نے دوبارہ چار رکعتیں ادا کیں۔ اختتام پر آپؒ کی وہی کیفیت ہو گئی۔ نہایت رقت آمیز لہجے میں عرض کرنے لگے۔

”میرے معبود! یہ نماز بھی تیرے لائق نہیں ہے۔“

مختصر یہ کہ حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اسی طرح ساری رات نماز پڑھتے رہے اور ہر چار رکعت کے خانے ندامت کا اظہار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے دُعا ادا کئے اور پھر رو رو کر عرض کرنے لگے۔

”اے میرے معبود! تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہی عبادت کے لائق ہے۔ تیرے بندے بائزید نے بھرکوش کی کہ وہ تیری شان اور پسند کے مطابق نماز ادا کر سکے..... مگر وہ عاجز تھا اور عاجز ہی رہا۔ جو نماز ادا کیا وہ تیری بارگاہ میں پیش کرنے کے لائق نہیں۔ یہ نماز تو بائزید کی اپنی حیثیت کے مطابق ہے۔ اے جہانوں پالنے والے! اس دنیا میں تیرے بے نماز بندے بھی تو بہت سے ہیں۔ بائزید کو بھی ان ہی میں شمار کر لے۔“

ایک رات حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ عبادت میں مصروف تھے۔ اچانک پوری خانقاہ روشن ہو گئی۔ ایک گوشہ اور ایک ایک دیوار نور میں نہائی ہوئی تھی۔ تمام خدمت گار اور مریدین حیرت زدہ تھے کہ آج تک انہیں ایسی روشنی نہیں دیکھی تھی۔

حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس نور کو دیکھا اور پھر با آواز بلند فرمایا۔

”اگر یہ انیس کی حرکت ہے تو وہ سن لے کہ میں اللہ کی بزرگی اور اُس کی بخشی ہوئی بلند ہمتی کے سبب اس فریب میں نہیں آسکتا۔ اور اگر یہ نور مقربین بارگاہ کی طرف سے ہے تو مجھے ان کی خدمت کا موقع عطا ہو، تاکہ بھی کرامت کا مرتبہ حاصل کر سکوں۔“

ایک رات حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ عبادت میں مصروف تھے۔ اچانک آپ کو بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ اگرچہ آپ کی طبیعت بھی ٹھیک تھی، لیکن ایک نامعلوم سا اضطراب تھا، جس کا ظاہری سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے پورے انہماک اور یکسوئی کے ساتھ ذکر الہی شروع کیا، مگر آپ کو وہ استغراق و لذت حاصل نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ پوری رات اسی کشمکش اور بے چینی میں گزر گئی۔ آخر آپ نے خود کالی انداز میں فرمایا۔

”بائزید! کہیں نہ کہیں دنیا درمیان میں آگئی ہے۔ ورنہ عبادت میں ایسی بے لذتی تو کبھی نہیں تھی۔“

آخر آپ نے بڑی مشکل سے وہ رات بسر کی۔ پھر جب صبح ہوئی تو آپ نے اپنے خادم سے پوچھا۔ ”کہا! میں کوئی چیز موجود ہے؟“

”مخدوم! آپ نے اس سے پہلے تو ایسا سوال نہیں کیا۔“ خادم نے عرض کیا۔

”آج سے پہلے میں نے عبادت میں یہ بے کیفی بھی محسوس نہیں کی تھی۔“ حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

خدمت گار نے پورے کھر کی تلاشی لی تو ایک انگور کا خوشہ نظر آیا۔ خادم اُسے لے کر حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ”مخدوم! انگور کے اس خوشے کے سوا گھر میں کوئی دوسری چیز موجود نہیں۔“

”انگور کا یہی خوشہ تو درمیان میں آ گیا تھا۔“ حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اے کسی ضرورت مند دے دو۔“

پھر جیسے ہی خدمت گار نے وہ انگور کا خوشہ کسی حاجت مند کو دیا، حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر الوار الہی کی بارش ہونے لگی اور وہ ذوقِ عبادت جو کچھ دیر کے لئے کم ہو گیا تھا، اسی شدت کے ساتھ لوٹ آیا۔

حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ ”اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نعمتیں اس لئے عطا فرمائی ہیں کہ

ان نعمتوں کے ذریعے اس کی طرف رجوع کریں۔ مگر افسوس! یہ بے خبر لوگ نعمتوں کے ہجوم میں پھنس کر نعمت دینے والے ہی کو فراموش کر بیٹھے۔“

ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے جذب و شوق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔
 ”اگر ہم عاشقوں سے کہا جائے کہ اپنا نالہ شوق دے دو اور اس کے بدلے میں آٹھوں بہشت اور دونوں جہاں کی جاگیریں لو، جب بھی ہم نالہ شوق دینے پر رضامند نہ ہوں۔ ہم تو اٹھارہ ہزار عالم کو اس ایک سانس کے برابر بھی نہیں سمجھتے، جو حق تعالیٰ کی یاد میں لی جاتی ہے۔“

علامہ اقبالؒ نے اسی آہ سحرگاہی کے بارے میں فرمایا ہے۔

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو، غزالیؒ ہو
 کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحرگاہی



ایک بار ایک شخص حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نصیحت کا طالب ہوا۔
 حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”آسمان کی طرف دیکھو!“
 اس شخص نے آسمان کی طرف دیکھا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا۔ ”تمہیں آسمان میں کیا نظر آیا؟“
 اس شخص نے حیرت زدہ لہجے میں عرض کیا۔ ”شیخ! مجھے تو سورج کے علاوہ آسمان پر کچھ نظر نہیں آیا۔“
 حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”تم اتنا تو جانتے ہو کہ یہ آسمان کس نے پیدا کیا؟“
 ”آسمان کو حق تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔“ اس شخص نے جواباً عرض کیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”جس ذات عزیز و جلیل نے یہ آسمان پیدا کیا ہے، اس کے حلقہٴ بھارت سے ایک حقیر ترین ذرہ بھی پوشیدہ نہیں۔ تم جہاں بھی جاؤ گے، اسی کو اپنا گمراہ پاؤ گے۔ وہ تمہارے ان ارادوں سے بھی باخبر ہے، جو ابھی تک عمل کی دنیا میں ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ پس ہمیشہ اسی سے ڈرتے رہو اور ہانپنا مانی سے بچتے رہو۔“



ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ راستے میں جا رہے تھے۔ اچانک سامنے سے ایک نوجوان بربط بجاتا ہوا آیا۔ وہ نوجوان شراب کے نشے میں بدست تھا اور جھوم جھوم کر گارہا تھا۔
 جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے لاحول کا کلمہ سنا تو ٹھہر گیا اور کہنے لگا۔ ”شیخ! کیا میں شیطان ہوں؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت نرم و شیریں لہجے میں فرمایا۔ ”تم شیطان نہیں ہو، مگر تمہارا یہ عمل شیطانی ہے۔ افسوس! تم اپنی نوجوانی اور توانائی فضول کاموں میں برباد کر رہے ہو۔“
 یہ سنتے ہی نوجوان مشتعل ہو گیا اور اس نے اپنا بربط اٹھا کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سر پر مار دیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا سر پھٹ گیا اور نوجوان کا بربط ٹوٹ کر بکھر گیا۔ راستہ چلنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔ نوجوان گستاخانہ کلمات کہتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ چلا گیا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ آپ اسی حالت میں گھر لوٹ آئے اور سر پر پٹی باندھ لی۔ پھر رات بھر آپ کو یہ خیال پریشان

کرتا رہا۔

”پتہ نہیں، اس نوجوان کو میری بات سے کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی کہ اس نے اپنا بربط تک توڑ دیا۔“

یہ احساس اس قدر شدید تھا کہ حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ رات بھر سو نہیں سکے۔ پھر صبح ہوئی تو آپ رحمۃ اللہ علیہ خدمت گار کو پیسے دیتے ہوئے فرمایا۔ ”بازار جا کر ایک بربط خرید لاؤ۔“

”شیخ! آپ بربط کا کیا کریں گے؟“ خدمت گار نے شدید حیرانی کے ساتھ عرض کیا۔

”تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس پر عمل کرو۔“ حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

پھر جب وہ خدمت گار بازار چلا گیا تو حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے خادم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ”تم جلدی سے ایک طباق حلوہ تیار کرو۔“

کچھ دیر بعد خدمت گار، بربط لے کر آگیا تو حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ایک ہاتھ میں حلوے کا خوان

دوسرے ہاتھ میں بربط لے کر خانقاہ سے باہر تشریف لے جانے کے لئے آگے بڑھے۔ تمام مریدین اور غلام

حضرت شیخ کے اس طرز عمل پر حیرت زدہ تھے۔ ایک خادم نے دست بستہ عرض کیا۔

”مخدوم! یہ دونوں چیزیں مجھے دے دیجئے۔ میں آپ کے ہمراہ چل رہا ہوں۔“

حضرت شیخ بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے انکار کر دیا۔

”یہ میرا بوجھ ہے، جسے کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔“ یہ کہہ کر حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ سے باہر تشریف

لے آئے۔

آپ کو اس نوجوان کے ٹھکانے کا پتہ نہیں تھا، اس لئے مختلف لوگوں سے نوجوان کا گھر معلوم کرتے رہے۔

ہر شخص نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر بہت دیر بعد ایک ایسا شخص ملا، جو اس نوجوان سے واقف تھا۔ اس نے

حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو نوجوان کے گھر کا پتہ بتا دیا مگر اس کے ساتھ ہی اپنی حیرت کا بھی اظہار کیا۔

”شیخ! وہ تو بھولوبلعب میں گرفتار ایک بے ہودہ نوجوان ہے۔ بھلا اس سے آپ کو کیا کام ہو سکتا ہے؟“

”پارسا لوگ بھی تو آخر انسان ہی ہوتے ہیں۔ اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے کام پڑتا ہی رہتا ہے۔“

کہہ کر حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اس طرف روانہ ہو گئے، جدھر اس شخص نے اشارہ کیا تھا۔

کچھ دیر بعد حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دروازے پر دستک دی۔ اتفاق سے اسی نوجوان نے دروازہ

کھولا اور حضرت شیخ کو اپنے سامنے پا کر حیران رہ گیا۔ ”اب آپ مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں؟“ نوجوان کے لہجے

سے انتہائی تعجب کا اظہار ہو رہا تھا۔

”نوجوان! میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنے آیا ہوں۔“ حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا اندازِ تکلم کسی سائل جیسا تھا۔

”میں اُمید رکھتا ہوں کہ تم مجھے ناکام واپس نہیں لوٹاؤ گے۔“

نوجوان کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو مردانہ نشست گاہ مل

لے جا کر بٹھا دیا، پھر کہنے لگا۔

”اب بتائیں کہ مجھ سے کیا کام ہے؟“ نوجوان کے لہجے کی تلخی بدستور تھی۔

حضرت بائزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظر ناراض نوجوان کے چہرے پر ڈالی اور معذرت خواہانہ لہجے میں فرمایا۔

”کل میری وجہ سے تمہاری ایک قیمتی شے کا نقصان ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ بربط وہ تو نہیں ہے، مگر اسی جیسا ہے اور

اسی قیمت کا ہے۔ اسے قبول کر لو تا کہ میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر جائے۔“

نوجوان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اس نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا لایا ہوا ربط ہاتھ میں لے لیا اور حضرت شیخؒ کے سر پر بندھی ہوئی پٹی کو غور سے دیکھنے لگا۔

”اب تم میری بات کو معاف کر دو، جس کی وجہ سے تمہیں اذیت پہنچی تھی اور تم غصے سے بے قابو ہو گئے تھے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے کھلے الفاظ میں معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔

”اور اس زخم کا حساب کون ادا کرے گا، جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے طرز کلام نے نوجوان کو اپنے جرم کا احساس کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”میں اپنے اس زخم کو فراموش کر چکا ہوں اس لئے تمہارے ذمے کوئی حساب نہیں ہے۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

حضرت شیخؒ کی یہ فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی دیکھ کر نوجوان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے کہ میری دی ہوئی چوٹ کو آپ اتنی آسانی سے بھول جائیں؟“ اب نوجوان کے لہجے سے شدید ندامت کا اظہار ہونے لگا تھا۔

”اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو پھر میں تمہارے دروازے پر آتا ہی کیوں؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”میری طرف سے تمہارے ذہن میں جو جتنی پیدا ہو گئی تھی، اب اسے بھی دور کر ڈالو۔ شیرینی ہمیشہ جتنی کو دُور کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے میں تمہارے لئے حلوہ لے کر آیا ہوں۔ تھوڑا سا کچھ لو۔ تمہارے دماغ اور زبان کی کڑواہٹ دُور ہو جائے گی۔“

نوجوان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اس نے آج تک گالی کے بدلے میں یہ دعائیں اور نفرت کے عوض یہ محبت نہیں دیکھی تھی۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے طرز عمل نے نوجوان کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ وہ بے اختیار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔

”شیخ! معافی کا خواستگار تو میں ہوں۔ آپ نے تو مجھے اچھی نصیحت کی تھی، مگر میں نے آپ کو اس کا بہت برا بدلہ دیا تھا۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے نادم و شرمسار نوجوان کو قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ پھر جب اندھیروں میں بھٹکنے والے ایک نوجوان کا سینہ ایک عارفِ کامل کے سینے سے مس ہوا تو برسوں کی ظلمتیں چند لمحوں میں زائل ہو گئیں۔

قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا ارشادِ مقدس ہے کہ نیکیاں، برائیوں کو کھالیتی ہیں۔ اسی طرح حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے قلبِ مبارک سے پھوٹنے والی روشنی نے نوجوان کی زندگی کے اندھیروں کو کھالیا۔ پھر وہ موسیقی کا رسیا اور لہو و لعب کا دلدادہ نوجوان ہمیشہ کے لئے ان خرافات سے تائب ہو گیا اور اس کے دوستوں نے بھی اپنے راستے بدل ڈالے۔



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ معرفت کی دنیا میں سلطانِ العارفین کا درجہ رکھتے تھے، مگر آپؒ کے عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ خود کو ایک عام آدمی سے بھی کمتر سمجھتے تھے۔ مشہور بزرگ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”ایک بار حضرت بایزیدؒ کے زمانے میں شہر بسطام شدید قحط سالی کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہاں تک کہ کنوئیں،

تالاب اور دریا خشک ہو گئے۔ پیاسی زمین چٹختے لگی۔ سبزہ جل کر راکھ ہو گیا اور جانور بھوک اور پیاس سے لگے۔ آخر اہل شہر ایک طویل وعریض میدان میں جمع ہوئے۔ نماز استسقاء ادا کی گئی اور رو کر دعائیں مانگی مگر بارش تو کجا، پتے ہوئے آسمان پر ابر کا کوئی ہلکا سا ٹکڑا بھی دکھائی نہ دیا۔ بسطام کے باشندوں کی مایوسی گزر گئی۔

پھر اسی مایوسی کے عالم میں ایک دن کچھ لوگ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے اور موجود لوگوں سے نماز استسقاء کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ پھر جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچیں تو آپ نے لوگوں سے پوچھا۔

”تم نے نماز استسقاء خشوع و خضوع سے پڑھی؟“

لوگوں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”شیخ! اس قدر خشوع و خضوع سے نماز پڑھی گئی کہ لوگوں کی آنکھوں آنسو جاری ہو گئے مگر آسمانوں کے دہانے نہیں کھلے۔“

”اس کی وجہ؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا۔ ”نماز تو بندے کا آخری سہارا ہوتی ہے۔ مگر کیوں نہ ہوئی؟“

”برے لوگوں کی شامت اعمال کے سبب اللہ نے ہم سے پانی روک لیا ہے۔“ لوگوں نے افسردہ لہجے میں ”یقیناً اس بستی میں کوئی بہت بڑا گناہ کار موجود ہے، جس کی وجہ سے نماز بھی بے اثر ٹھہری اور دعائیں بھی راکھ گئیں۔ جب تک وہ گناہ کار موجود ہے، بسطام میں بارش نہیں ہوگی۔“

جیسے ہی ان لوگوں کی گفتگو ختم ہوئی، حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ سے اٹھے اور باہر جانے لگے۔ لوگوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”شیخ! آپ کہاں چارہ ہیں؟“

”جس کی وجہ سے بسطام میں بارش نہیں ہوتی اور جس کے سبب تمہاری نماز اور دعائیں رازِ گاہ گئیں، وہ گناہ میں ہی ہوں۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

لوگوں نے دست بستہ عرض کیا۔ ”شیخ! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ آپ کے بغیر تو یہ شہر سنسان ہو جائے گا۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اگر میرا وجود ایسا ہی متبرک ہوتا تو تم لوگ بارش سے کیوں محروم رہتے تمہارے لئے میرا چلا جانا ہی بہتر ہے، تاکہ تمہاری زمینیں اور کھیتیاں سیراب ہو جائیں۔“

بالآخر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ شہر کی حدود سے نکل کر کسی اور مقام کی طرف جانے لگے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ شیخ کسی طرح بھی ماننے والے نہیں تو وہ راستے میں لیٹ گئے اور کچھ لوگوں نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا دامن پکڑ لیا۔

”شیخ! اگر آپ ہماری درخواست قبول نہیں کرتے تو پھر ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔“

آخر لوگوں کی التجاؤں نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا اور آپ بسطام واپس لوٹ آئے۔ پھر جیسے ہی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے شہر کی حدود میں قدم رکھا، آسمان کے کناروں سے ہلکا سیاح ابر جھوم کر اٹھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے آسمان پر چھا گیا۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ اور ابھی صبح بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی خانقاہ تک نہیں پہنچے تھے کہ تیز بارش شروع ہو گئی اور برسوں کی مُردہ زمین آن کی آن میں اٹھی۔

ایک سال بعد دوبارہ شہر بسطام قحط سالی کا شکار ہوا۔ لوگ ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت

مشاہدہ کر چکے تھے، اس لئے گروہ درگروہ حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت بائزید بسلامیؒ مراقبے میں تھے۔ لوگ گریہ و زاری کرنے لگے۔

”شیخ! وقت دعا ہے۔ بے زبان جانور بھوکے اور پیاسے مر رہے ہیں۔ اب چند روز اور بارش نہیں ہوئی تو انسان بھی قحط کی لپیٹ میں آجائیں گے۔“

لوگوں کی گریہ و زاری کے باوجود حضرت بائزید بسلامیؒ کی حالت سکوت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھے رہے۔

لوگوں نے ایک بار پھر گریہ و زاری شروع کر دی۔ ”شیخ! یہ ہماری بد اعمالی کی سزا ہے۔ ہم سب گناہ گار ہیں، اس لئے ہماری دعائیں زمین سے بلند ہی نہیں ہوتیں، پھر آسمان تک کیسے پہنچیں گی؟“

حضرت بائزید بسلامیؒ بدستور خاموش رہے۔

”ہم آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ اس شہر میں ایک بندہ ایسا بھی ہے، جو گناہ گار نہیں ہے۔“

لوگوں نے روتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ بندہ بائزیدؒ ہے اور اس کی دعائیں آسمانوں پر سنی جاتی ہیں۔“

جیسے ہی گریہ و زاری کرنے والوں کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت بائزید بسلامیؒ نے آنکھیں کھول دیں اور رونے لگے۔ پھر اتنا روئے کہ ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر آسمان کی طرف منہ کر کے عرض کیا۔

”یا اللہ! میں تو تیرا ہی گناہ گار بندہ بائزید ہوں..... مگر کیا یہ لوگ سچ کہہ رہے ہیں؟“

حضرت بائزید بسلامیؒ کا اتنا کہنا تھا کہ سیاہ بادلوں نے آسمان کو گھیر لیا۔ ابھی لوگ حضرت بائزید بسلامیؒ کی خانقاہ سے اٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ تیز بارش شروع ہو گئی۔



حضرت بائزید بسلامیؒ کی پوری زندگی مخلوق خدا کی خدمت سے عبارت تھی۔ اس سلسلے میں آپؒ مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

حضرت بائزید بسلامیؒ کے پڑوس میں ایک غریب یہودی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اتفاق سے یہودی کو تلاش معاش کے لئے باہر جانا پڑا۔ یہودی کے پیچھے اس کی عورت کے بچہ پیدا ہوا جو ساری رات روتا رہتا تھا۔ حضرت بائزید بسلامیؒ بچے کی گریہ و زاری سن کر بے چین ہو جاتے تھے۔ ایک دن آپؒ اس یہودی کے مکان پر تشریف لے گئے اور عورت سے بچے کے رونے کا سبب پوچھا۔

”یہ اندھیرے کی وجہ سے روتا ہے۔“ یہودی عورت نے جواب دیا۔

”خاتون! تم چراغ کیوں روشن نہیں کر لیتیں؟“ حضرت بائزید بسلامیؒ نے فرمایا۔

یہودی عورت خاموش رہی۔

حضرت بائزید بسلامیؒ نے فرمایا۔ ”جب تک تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گی، اس وقت تک میں واپس

نہیں جاؤں گا۔ آخر چراغ روشن کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟“

آخر یہودی عورت حضرت بائزید بسلامیؒ کے اصرار پر مجبور ہو گئی۔ ”چراغ کہاں سے لاؤں کہ میرے

پاس تو روشنی کے لئے بھی میسے نہیں ہیں۔“

یہودی عورت کی بات سن کر حضرت بائزید بسلامیؒ کا چہرہ مہلک زرد ہو گیا اور آپؒ نے نہایت تاسف

آميز لہجے میں فرمایا۔ ”بایزید! ایسی بے خبری کہ تیرے پڑوسی پر قیامت گزر گئی۔ اللہ کی پناہ! اللہ کی پناہ!“ ہوئے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ واپس چلے گئے۔

پھر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اس یہودی عورت کے گھر کھانے پینے کا سامان لے کر پہنچے اور انتہائی عمدہ خواہانہ لہجے میں فرمایا۔ ”خاتون! میری اس بے خبری پر تم مجھے معاف کر دینا کہ بایزید کے مذہب میں پڑوسی حقوق بہت زیادہ ہیں۔ میں تمہاری اس حق تلفی پر دل سے نادم ہوں۔“

اس کے بعد حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بلاناغہ یہودی عورت کو کھانے پینے کی چیزیں پہنچاتے اور شام کے گھر میں چراغ روشن کر دیتے۔

کچھ دن بعد اس یہودی عورت نے شرمسارانہ لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کا یہ قرض کیسے ادا کروں گی؟“ ”تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہودی عورت کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ”جب تمہارا شوہر پردیس سے واپس آئے گا تو میں اس سے اپنا قرض وصول کر لوں گا۔“

”اور اگر میرا شوہر قرض ادا کرنے کے قابل نہ ہوا؟“ یہودی عورت پر ندامت کے ساتھ خوف بھی طاری ہوا۔ ”تو پھر اسے ایک پڑوسی کا تحفہ سمجھ لیتا۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور اس یہودی عورت کی خاطر کا سلسلہ جاری رکھا۔

پھر کئی ماہ بعد وہ یہودی واپس آیا تو اس کی بیوی نے سارا واقعہ سنا دیا۔ یہودی کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”روشنی تو خود چل کر ہمارے گھر آ گئی۔ پھر مجھے ہم اپنے گھر کو روشن نہ کریں تو یہ ہماری بد نصیبی ہے۔“

اس کے بعد وہ یہودی اپنی بیوی کو لے کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کر لگا۔ ”آپ نے جو روشنی ہمارے گھر میں داخل کی ہے، اسے دلوں تک بھی پہنچا دیتے ہیں۔“

پھر وہ دونوں میاں بیوی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔



ایک دن حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسِ درس آراستہ تھی۔ کسی شخص نے سوال کیا۔ ”شیخ! آپ کا مرثدا ہے؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا۔ ”ایک بوڑھی عورت میری مرشد ہے۔“ اس شخص نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”یہ بات خاص و عام میں مشہور ہے کہ آپ نے بہت بزرگوں سے فیضِ روحانی حاصل کیا ہے۔ پھر ایک بوڑھی عورت آپ کی مرشد کس طرح ہو سکتی ہے؟“

”بے شک! میں نے دوسرے بزرگوں سے استفادہ کیا ہے۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”مگر! بوڑھی خاتون نے مجھے معرفت کا ایک اہم راز سکھایا ہے۔ اس لئے میں انہیں اپنا مرشد ہی سمجھتا ہوں۔“

یہ کہہ کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرینِ مجلس کو اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سنایا۔

ایک دن حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کسی جنگل سے گزر رہے تھے اچانک آپ نے ایک ضعیف خاتون کو دیکھا جو اس قدر ناتوانی کے باوجود اپنے سر پر آثارِ کھلے لئے جا رہی تھی۔ جیسے ہی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ قریب پہنچے بوڑھی عورت نے آپ کو مخاطب کر کے کہا۔

”بایزید! میرا یہ سامان گھر تک پہنچا دو۔“

اس سے پہلے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ضعیفہ کے سر سے آٹا اُتارتے، آپؐ کو ایک شیر جاتا ہوا نظر آیا۔ حضرت شیخؒ نے شیر کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”ادھر آؤ! تم سے ایک خنزوری کام ہے۔“

شیر خاموشی سے سر جھکائے ہوئے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بوڑھی عورت کے سر سے آٹا اُتارا اور شیر کی پشت پر رکھتے ہوئے اس درندے کو حکم دیا۔ ”یہ آٹا ان خاتون کے گھر تک پہنچا دو۔“

شیر خاموشی سے سر جھکائے ہوئے اس راستے پر چلا گیا، جدھر بوڑھی خاتون کا گھر تھا۔

جب شیر آٹا لے کر چلا گیا تو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”آپ مطمئن رہیں، اس شیر کو آپ کا گھریا دے۔“

ضعیف خاتون نے عجیب نظروں سے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور اپنے گھر کی طرف جانے لگیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ چند قدم آگے بڑھے اور بوڑھی خاتون کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”آپ جا تو رہی ہیں، مگر شہر کے لوگوں سے کیا کہیں گی؟“

بوڑھی خاتون نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”میں لوگوں کو بتاؤں گی کہ آج جنگل میں میری ملاقات ایک خود نما خالم سے ہوئی تھی۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ضعیفہ عورت کے جواب پر حیرت زدہ رہ گئے۔ ”میں نے تمہارا کام کیا اور تم نے مجھے خود نما خالم کا خطاب دے دیا؟“

”بایزید! تم خود نما خالم نہیں تو پھر اور کیا ہو؟“ بوڑھی خاتون نے کہا۔ ”قدرت نے شیر کو انسانی بوجھ اٹھانے کے لئے مکلف نہیں بنایا ہے۔ پھر بھی تم نے ایک غیر مکلف پر اپنا بوجھ لا دیا ہے۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو بوڑھی خاتون کے جواب پر شدید حیرت ہوئی۔

”بایزید! تم میں دوسرا عیب یہ ہے کہ تم خود کو صاحبِ کرامت ظاہر کرنا چاہتے ہو۔“ ضعیفہ نے مختصر سے سکوت کے بعد کہا۔ ”اسی کا نام خود نمائی ہے۔“ یہ کہ کر بوڑھی خاتون اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”میں نے اس نصیحت سے اس قدر عبرت حاصل کی کہ آئندہ کے لئے ایسی باتوں کے اظہار سے تائب ہو گیا۔ اسی لئے میں ان خاتون کو اپنا مرشد تسلیم کرتا ہوں۔“

اس واقعے کے بعد حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی کرامت کا اظہار نہیں کیا۔ اگرچہ حضرت شیخؒ ذاتی طور پر کرامت کے اظہار کو پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن پھر بھی کبھی کبھی حالتِ اضطراب میں آپؐ سے کرامت ظاہر ہو جاتی تھی۔ مگر جب سے بوڑھی خاتون نے آپؐ کو خود نما خالم کہہ کر پکارا تھا، اسی روز سے آپؐ اظہارِ کرامت کے سلسلے میں بہت زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔

ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ دریائے دجلہ پر تشریف لے گئے تو پانی جوش مارتا ہوا آپؐ کے استقبال کے لئے آگے بڑھا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دریائے دجلہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”بس دین ٹھہر جا!..... دین ٹھہر جا!“

دوسرے ہی لمحے پانی کی جوش مارتی ہوئی لہریں پُرسکون ہو گئیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ دریائے دجلہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”مجھے تیرے استہلا زہ برابر بھی غرور نہیں ہوگا۔ میں چند لمحوں کی تسکین کے لئے اپنی تیس سالہ ریاضت برباد نہیں کر سکتا۔“

تذکرۃ الاولیاء میں حضرت شیخ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے۔ ”ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ میں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بیویوں کے نان و نفقہ کی زحمّتوں سے محفوظ رکھے..... مگر فوراً ہی دوسرا خیال آیا کہ یہ خواہش حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے۔ یہ سوچ کر میں نے دعا نہیں کی اور اس ذمے داری کو اپنے لئے قائم رہنے دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی سہولت عطا کر دی کہ میرے نزدیک عورت اور دیوار میں کوئی فرق نہیں رہا۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ آپؑ نے دنیا کو دنیا ہی سمجھا اور اسے اپنی ذات پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک زیادہ بیویاں تھیں۔ مگر کسی معتبر روایت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ محترم خواتین کس قبیلے اور خاندان سے تھیں۔ مزید کسی تاریخ سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی کتنی اولادیں تھیں؟

ایک دن کسی شخص نے سرسبز مجلس کہا۔ ”شیخ! فلاں مقام پر ایک بزرگ ہیں، جن کا طریقہ حیات بڑا عجیب ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اس شخص سے پوچھا۔ ”آخر وہ بزرگ کس طریقے پر عمل کرتے ہیں؟“

”وہ بزرگ حقوق العباد کا خیال نہیں رکھتے۔“ اس شخص نے کہا۔ ”وہ خدمت خلق سے بھی پہلو تہی کرنے اس کے باوجود عارفِ کامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ان بزرگ کا حال سن کر فرمایا۔ ”وہ شخص کہ تلاوت قرآن نہیں کرتا..... بھائیوں کے جنازوں میں شریک نہیں ہوتا..... بیماروں کی عیادت کے لئے ان کے گھر نہیں جاتا..... یتیموں کی فرائض نہیں کرتا تو پھر وہ کس منہ سے معرفت کی باتیں کرتا ہے؟ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کیسا بڑا دعویٰ کر رہا ہے۔“

اس کے بعد حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اللہ جس کو دوست رکھتا ہے، اسے تین خصلتوں اور خوبیوں سے نواز دیتا ہے۔

دریاء کی طرح سخاوت کہ اس سے مسلم، غیر مسلم، چرند اور پرند سبھی اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔
سورج کی شفقت کہ جو ہر جاندار کو اپنی روشنی سے نوازتا ہے۔
اور زمین کی تواضع کہ وہ ہر شخص کے لئے پیچھی رہتی ہے۔“



تذکرۃ الاولیاء میں حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ضرورت مند، حضرت بایزید بسطامیؒ سے دعا کی درخواست کرتے تھے تو آپؒ اس طرح دعا فرماتے۔

”اے اللہ! میں بھی ان ہی کی طرح تیرا ایک بندہ ہوں۔ مگر یہ لوگ مجھے واسطہ بنا کر تجھ سے مانگ رہے ہیں۔ تو اپنی مخلوق کی طلب سے خوب واقف ہے۔“

حق تعالیٰ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی آبرورکھتا اور حاجت مندوں کی ضرورتیں

کر دیتا۔

ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے خدمت گاروں اور عقیدت مندوں کے ساتھ کسی جنگل میں تشریف فرما تھے۔ یکایک آپ کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ آپ نے اپنے ہم سفروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”آج ہرنی کا گوشت کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی اس خواہش کا اظہار کئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جنگل کے کسی گوشے سے ایک ہرن بھاگتا ہوا آیا اور حضرت شیخ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

”شیخ! اللہ نے آپ کی سن لی۔“ تمام خدمت گاروں اور مریدوں نے بیک زبان پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”یہ آپ کی کرامت ہے۔“ اتنا کہہ کر خادموں نے ہرن کو پکڑ لیا۔ حیرت انگیز طور پر ہرن نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔

”چھوڑ دو اسے..... چھوڑ دو اسے۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بلند آواز میں فرمایا۔ ”تمہارا شیخ مردود ہو گیا..... تمہارا شیخ مردود ہو گیا۔“ اتنا کہہ کر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ زار و قطار رونے لگے۔

تمام خدمت گار، شیخ کی انگلی باری پر حیران تھے۔ آخر ایک مرید نے دست بستہ عرض کیا۔ ”شیخ! ادھر آپ نے اپنی خواہش ظاہر کی، ادھر حق تعالیٰ نے اس کی تکمیل فرمادی۔ یہ تو محبوبیت کی علامت ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے روتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ تو مردود ہونے کی نشانی ہے۔“ مریدین اور خدام، پیر و مرشد کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”خواہش کا پورا ہو جانا ہی تو بارگاہ دوست سے دُور ہو جانے کی دلیل ہے۔ محبوب حقیقی اپنے عشاق کی آرزوئیں کب پوری کرتا ہے؟ وہ تو ایک ہی دن اپنے چاہنے والوں کی تمناؤں کی تکمیل کرے گا۔ دنیا میں خواہش پوری ہو جانے کا تو ایک ہی مطلب ہے کہ اس نے مجھے اپنی بارگاہِ کرم سے خارج کر دیا ہے۔“

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مریدین کی بات کے جواب میں فرمایا۔ ”محبوب حقیقی کی عادت تو یہ ہے کہ وہ اپنے چاہنے والوں کو ہمیشہ بے قرار اور محروم رکھ کر خوش ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ اپنے اولیاء سے دنیا میں وہی سلوک کرتا ہے جو وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ آخرت میں کرے گا۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدوں کو سلوک کی تعلیم دینے وقت ظاہر و باطن کی یکسانیت پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کا مشہور قول ہے۔

”یا تو وہی کچھ ظاہر کرو، جو درحقیقت تم ہو..... یا ویسے بن جاؤ، جیسا کہ تم خود کو ظاہر کرتے ہو۔ اگر اس کے خلاف کرو گے تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔“

ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ ایک مرید بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ وہ اس طرح راستہ طے کر رہا تھا کہ جہاں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا قدم مبارک پڑتا تھا، مرید بھی اس نشان پر اپنا پاؤں رکھ دیتا تھا۔ اتفاق سے ایک جگہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے مڑ کر دیکھا، مرید اپنے کام میں مصروف تھا۔ حضرت شیخ کو مرید کا یہ عمل کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ چلتے چلتے آپ نے اس سے پوچھا۔

”یہ تم کسی طرح چل رہے ہو؟“

حضرت بایزید بسطامی کا سوال سن کر مرید نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”مرشد کے نقش قدم پر چلنا اسی کو کہتے ہیں۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ خاموشی سے اپنا سفر طے کرتے رہے۔ فرما کر
مرید نے عرض کیا۔

”شیخ! اپنی پوستین میں سے ایک ٹکڑا مجھے بھی عنایت کر دیجئے تاکہ میں بھی اس کی برکات حاصل کر سکوں۔“
حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے مرید کی درخواست کے جواب میں فرمایا۔ ”اگر تم پوستین کی جگہ بایں
بھی پہن لو تو جب تک بایزید جیسے کام نہیں کرو گے، اس وقت تک یہ تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔“



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ صرف انسانوں پر ہی نہیں، جانوروں پر بھی بے حد شفقت فرماتے تھے۔
تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اس کی مخلوق کے ساتھ محبت کرو تو اس حکم میں انسانوں کے علاوہ
چند، پرند یہاں تک کہ حقیقہ کڑے مکڑے بھی شامل ہیں۔ جانوروں کے شکار کو بھی ضرورت کے ساتھ
گیا۔ تفریح اور تسکین نفس کی خاطر جانوروں کا خون بہانا جائز نہیں۔ کثرت گوشت خوری کے سلسلے میں
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے۔

”اپنے ہلکوں (پٹوں) کو جانوروں کا قبرستان نہ بناؤ۔“

اسی طرح ایک صحابی نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان صحابی کے گھر تشریف
تو دروازے پر بندھے اونٹ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مالک کی شکایت کی کہ وہ اسے پیٹ بھر کے کھا رہا
سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے میزبان سے صاف صاف فرمادیا۔

”اللہ کا رسول اُس شخص کی دعوت کیسے قبول کر سکتا ہے جو اپنے پالتو جانوروں کو بھوکا رکھتا ہے؟“

اور وہ مشہور واقعہ تو ہر معتبر تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے کہ جب سلطان محمود غزنوی کا باپ سلطان
تھا۔ ایک دن سلطان شکار کھیلنے کے لئے نکلا تو اسے ایک ہرنی کے ساتھ اس کا خوب صورت بچہ نظر آیا۔
کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ نتیجتاً اس نے ہرنی کے پیچھے گھومنا اڑال دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بچہ تھک گیا اور
باندھ کر اپنے ساتھ لے چلا۔ کئی میل فاصلہ طے کرنے کے بعد سلطان کو ہرنی کا خیال آیا تو اس نے ہرنی
ہرنی اپنے بچے کی محبت میں چند قدموں کے فاصلے سے شکاری کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ماں کی
سلطان کے دل پر شدید اثر ہوا۔ اس نے ہرنی کے بچے کو آزاد کر دیا۔ بچہ چوڑیاں بھرتا ہوا ماں سے جا مل
ہرنی نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر اُس نے سلطان
جیسے وہ بچہ کو چھوڑنے پر اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ ہرنی چلی گئی۔ سلطان کچھ دیر کھڑا ایک ماں کی خوشی
دل سے محسوس کرتا رہا۔ ہرنی پلٹ پلٹ کر اُسے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر
سلطان نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

”سلطان! ایک جانور پر رحم کھانے کے تیرے اس عمل کو حق تعالیٰ نے بہت پسند فرمایا ہے۔ عنقریب تم

جائے گا۔“

سلطان نے ایک ہرنی کے بچے کو آزاد کیا، جس کے صلے میں اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نصیب ہوا۔
مسلمان کے لئے سب سے بڑی سعادت ہے۔ پھر کچھ دن بعد سلطان خود بھی غلامی کی زنجیروں سے آزاد
سرمداری کے منصب تک پہنچا اور ایک طویل عرصے تک اس نے غزنی پر حکومت کی۔ پھر اللہ جل جلالہ نے
غزنوی جیسا بیٹا دیا، جس کی اسلامی خدمات اور عسکری کارناموں کو قیامت تک فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مشہور صحابی اور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک محاذ جنگ سے رخصت ہوتے وقت اپنا خیمہ محض اس لئے چھوڑ دیا کہ اس میں کبوتروں نے انڈے دے دیئے تھے۔

سب سے زیادہ احادیث کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک رات عبادت میں مشغول تھے کہ ایک بلی آپ کی عبا کے دامن پر آکر سو گئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے لباس کا دامن کاٹ کر الگ کر دیا، مگر ایک جانور کی نیند میں ظل نہیں ڈالا۔ اسی روز سے آپ ”ابو ہریرہ“ مشہور ہو گئے۔ جس کا مفہوم ہے، بلی کے باپ۔

ایک بزرگ کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت میں دنیا ترک کر دی اور ایک ویران جنگل میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ روز و شب کا ایک ایک لمحہ یاد الہی میں بسر کرتے۔ یہاں تک کہ گرد و نواح میں اُن کے زہد و ریاضت کی خبریں عام ہو گئیں اور لوگ بیک زبان کہنے لگے کہ ان سے زیادہ عبادت گزار اور متقی انسان کوئی دوسرا نہیں۔

ایک رات وہ بزرگ اپنی ریاضت میں مشغول تھے۔ اس قدر بر فانی ہوائیں چل رہی تھیں کہ رگوں میں خون جتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں کتے کا ایک بچہ سردی سے ٹھہرتا ہوا جھوپڑی کے دروازے پر آ کر چیخنے لگا۔ بزرگ کچھ دیر تک موسم کی سختیاں برداشت کرنے والے جانور کی چیخیں سنتے رہے، پھر بے قرار ہو کر اُٹھے۔ جھوپڑی کا دروازہ کھولا اور کتے کے بچے کو گود میں اٹھا کر اندر لے آئے اور اپنے کمر میں لپیٹ لیا۔ اُن کی حرارت پا کر کتے کا بچہ پرسکون ہو گیا اور کچھ دیر بعد سو گیا۔ بزرگ اسی طرح اُسے کمر میں چھپائے ہوئے رات بھر بیٹھے رہے۔

پھر جب اُن کا انتقال ہو گیا تو دوسرے بزرگ نے انہیں خواب میں دیکھ کر پوچھا۔ ”حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟“

بزرگ نے روتے ہوئے فرمایا۔ ”جب میرا اعمال نامہ داورِ محشر کے سامنے پیش ہوا تو حکم دیا گیا کہ اسے دوزخ میں لے جاؤ۔“

”میں نے تو تیری ایسی عبادت کی ہے کہ ساری دنیا کو چھوڑ دیا۔ پھر میرے ساتھ یہ سلوک کیوں؟“ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اہل دنیا میں تمہاری ریاضتوں کی بہت دھوم تھی۔ لوگ تمہیں تارک الدنیا اور پرہیزگار کہہ کر پکارتے تھے۔ اور اپنی تعریفیں سن کر تمہارا نفس بھی بہت خوش محسوس کرتا تھا۔ تم جس چیز کے لئے عبادت کیا کرتے تھے، وہ تمہیں دنیا میں دے دی گئی۔ اب تم کس منہ سے ہماری محبت کا دعویٰ کرتے ہو؟“

بزرگ نے کہا۔ ”میری ساری ریاضتیں رایگاں گئیں اور محرومی کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ پھر جب میں ہلاکت کے خوف سے لرزتا ہوا واپس جانے لگا تو مجھ سے کہا گیا۔

”تمہارا ایک عمل ہمیں بہت پسند آیا۔ جب ایک سردرات میں تم نے بے قرار ہو کر کتے کے ٹھہرے ہوئے بچے کو اپنے کمر میں چھپا لیا تھا۔ آج تمہیں تمہارے اسی عمل کی وجہ سے بخشا جا رہا ہے۔“

تاریخ اسلام کا وہ بہت مشہور واقعہ ہے، جب رسالت پناہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی شانِ مغفرت کا ذکر فرما رہے تھے۔ کسی صحابی نے عرض کیا۔

”کیا حق تعالیٰ ایک جانور پر رحم کرنے سے بھی کسی بندے کو معاف فرما دیں گے؟“ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک ایسی ہی نکتہ نواز ہے۔ ارحم الراحمین کی شانِ کرم کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔“

ان ہی صحابی نے دوبارہ عرض کیا۔ ”خواہ وہ شخص کتنا ہی گناہ گار ہو۔“

جواب میں آقائے دو جہاں رحمۃ اللہ علیہ نے بنی اسرائیل کی اُس طوائف کا واقعہ بیان فرمایا جو شدید گرمی کے کہیں جا رہی تھی۔ اس نے ایک کتے کو کنوئیں کے نزدیک پڑے دیکھا، جو پیاس کی شدت سے قریب راہ گیر ایک بے زبان جانور کو دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے مگر کسی کو بھی اس کی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ طوائف بھی جاں بہ لب کتے کو دیکھا اور مضطرب ہو کر اپنی سواری سے اتر آئی۔ کنوئیں پر ڈول موجود نہیں تھا۔ طوائف اپنی قیمتی اودھنی میں جوتی باندھی اور تھوڑا تھوڑا پانی بھر کر کتے کے منہ میں ڈالا۔ پھر جب کتے کی پیاس بجھ کر تازہ دم ہو گیا تو طوائف اپنے سفر پر چلی گئی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد آقائے دو جہاں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ کی شانِ کرم یہ ہے کہ مرنا کتے کو پانی پلانے کے سبب ایک طوائف کو بخش دیا گیا۔“



حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بھی خدمتِ خلق کے اس خاص نکتے سے باخبر تھے، اس لئے انسان تو کجا، پر بھی بے حد شفقت فرماتے تھے۔

ایک بار سفر کے دوران حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اونٹ پر بہت زیادہ سامان لا دیا۔ ہم ملز دیکھا تو آپ کے اس عمل پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

”شیخ! جانوروں کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف دینا بزرگی کی شان کے خلاف ہے۔“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب فرمایا۔ ”پہلے تم دیکھو تو کہ اونٹ پر کتنا بوجھ ہے۔“

لوگوں نے بڑی حیرت سے حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی بات سنی اور پھر اونٹ کی طرف غور سے دیکھا۔ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سارا سامان ہوا میں معلق تھا اور اونٹ پر ذرا سا بھی بوجھ نہیں تھا۔

لوگوں کو حیران دیکھ کر حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اگر میں اپنا حال پوشیدہ رکھتا ہوں تو وہ نہیں ہوتی..... اور اگر ظاہر کر دیتا ہوں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ بھلا میں ان حالات میں تمہارے ساتھ بک سکتا ہوں؟“ یہ کہہ کر آپ نے اپنے اونٹ کا رخ دوسری طرف کر دیا اور قافلے سے الگ ہو گئے۔



جانوروں سے محبت کرنے کا ایک اور واقعہ بھی تقریباً تمام معتبر کتابوں میں نظر آتا ہے۔ ایک بار حضرت بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ہمدان میں تھے۔ وہاں کی کسی دکان سے آپ نے قرطم کے کچھ دانے خریدے ”قرطم کسی چھلکا مغز ہوتا ہے“ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ دانے استعمال کر لئے، باقی رومال میں لپیٹ کر بسطامی پھر جب آپ نے دوبارہ قرطم کے ان دانوں کو استعمال کرنے کے لئے کھولا تو اس میں دو چیونٹیاں نظر آئیں۔ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ان چیونٹیوں کو حیرت سے دیکھا اور پھر نہایت افسردہ لہجے میں فرمایا۔

”اپنے مزے کی خاطر تمہیں ناحق تکلیف دی اور گھر سے بے گھر کر دیا۔“

یہ کہہ کر آپ نے دوبارہ رومال باندھا اور ہمدان روانہ ہو گئے۔ اگرچہ بسطامی سے ہمدان کا کافی فاصلہ تھا مگر حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں چیونٹیوں کو لے کر ہمدان پہنچے اور انہیں اسی دکان کے قریب چھوڑ دیا۔ آپ نے قرطم کے دانے خریدے تھے۔ دراصل یہ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ چیونٹیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے کے لئے طویل سفر اختیار کیا۔ اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی نظروں میں ایک حقیر چیونٹی کی بھی کتنی اہمیت تھی۔

جوش ملیح آبادی کے بقول ۔

کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے زمیں کے آگینوں کو
ترے رندوں کو مستی میں بھی اتنا ہوش ہے ساقی

جوش نے تو یہ شعر یوں ہی مستی میں کہہ دیا ہوگا، مگر جہاں تک شعر کے مفہوم کا سوال ہے تو اس کا اطلاق حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگوں ہی کی ذات پر ہو سکتا ہے کہ آپ دو چونیوں کے گھر سے بے گھر ہونے پر بے قرار ہو گئے تھے۔ یہ شدت احساس بزرگانِ دین ہی کا شیوہ ہے..... ورنہ دن رات سینکڑوں جانور عام مسلمانوں کی زد میں آکر ہلاک ہو جاتے ہیں اور انہیں خیال تک نہیں گزرتا۔“



ایک بار حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ سے باہر تھے۔ آپ کی قمیض میلی ہو گئی تھی۔ حضرت شیخ نے وہ قمیض دھوئی۔ اب اسے سکھانے کا مسئلہ تھا۔ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں فکر مند نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ قمیض کو بچانے کے لئے کوئی مناسب جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ آپ کے ساتھی نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”شیخ! اس دیوار میں کیل گاڑ کر اپنا گرتہ لٹکا دیجئے۔“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا۔ ”ایک تو یہ دیوار کسی دوسرے کی ملکیت ہے..... اگر نہ ہوتی، تب بھی میں کیل ٹھوک کر اسے خراب نہیں کر سکتا تھا۔“

قریب ہی ایک انگور کی بیل تھی، حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھی نے عرض کیا۔ ”شیخ! اپنا پیر بن انگور کی بیل پر ڈال دیجئے۔ دھوپ تو ڈی دیر میں اسے خشک کر دے گی۔“

اس بار بھی حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دوست کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا۔ ”یہ انگور کی بیل بھی کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے اور میں اس کے مالک سے اجازت لئے بغیر اسے استعمال نہیں کر سکتا۔“

آخر ساتھی نے سبز میدان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر اس گھاس پر اپنی قمیض بچھا دیجئے۔“

”میں اس ہرے بھرے میدان کو بھی استعمال نہیں کر سکتا۔“ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”شیخ! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“ دوست نے حیران ہو کر کہا۔

”یہ سبز میدان دراصل چوپایوں کی ملکیت ہے۔“ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اگر میں نے یہاں کسی جگہ اپنا پیر بن بچھا دیا تو جانوروں کی نظروں سے گھاس اوجھل ہو جائے گی۔ پھر وہ اپنا چارہ کس طرح استعمال کریں گے؟“

اب دوست کو اندازہ ہوا کہ ایک عارف، اللہ کی مخلوق کے حقوق کے سلسلے میں کس قدر حساس ہوتا ہے۔

پھر حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ گیلی قمیض اپنی پشت پر ڈال لی اور منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ تیز دھوپ میں کچھ دیر بعد قمیض ایک طرف سے خشک ہو گئی تو آپ نے اسے الٹ کر اپنی پشت پر ڈال لیا۔

ایک ایسا ہی واقعہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جنازے میں شریک تھے۔ اتفاق سے قبرستان کے قریب کوئی درخت موجود نہیں تھا اور تدفین میں ابھی بہت دیر تھی۔ قبرستان کے نزدیک ایک مکان تھا، جس کی دیوار کے سائے میں تمام لوگ کھڑے تھے۔ اس کے برعکس حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ چپتی ہوئی دھوپ میں کھڑے تھے۔ جنازے میں شریک لوگوں نے باری باری اصرار کیا۔

”امام! یہاں سائے میں تشریف لے آئیے۔“

حضرت ابوحنیفہؒ نے ہر بار ایک ہی جواب دیا۔ ”میں یہیں دھوپ میں ٹھیک ہوں۔“
جتازے کی تدفین کے بعد جب حضرت امام ابوحنیفہؒ درس گاہ واپس تشریف لے آئے تو ایک شاگرد نے
کیا جو اس جتازے میں شریک تھا۔

”امام! آپ کئی گھنٹے تک تیز دھوپ میں کھڑے ہو کر تکلیف برداشت کرتے رہے، جبکہ وہاں دیوار کا
موجود تھا۔ آخر اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟“

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اپنے شاگرد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ بات سب لوگوں کے
نہیں کہی جاسکتی کہ اس سے نمائش ذات کا پہلو نکلتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس شخص کی دیوار کے سائے میں
لوگ کھڑے تھے، وہ میرا مقروض ہے۔ دھوپ میں جلنے کی تکلیف تو عارضی تھی، سو گزر گئی۔ مگر میں سود کی آگ
جلنے کی ہمت نہیں رکھتا۔“

”سود کی آگ؟“ حضرت امام اعظمؒ کے شاگرد نے حیران ہو کر عرض کیا۔
”وہ شخص میرا قرض دار تھا۔“ حضرت ابوحنیفہؒ نے بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اگر میں اس کے
کے سائے میں کھڑا ہو جاتا تو وہ سایہ سود میں شمار ہوتا۔“
حضرت بایزید بسطامیؒ کی احتیاط بھی تقویٰ کی اعلیٰ مثال ہے۔



ایک بار حضرت بایزید بسطامیؒ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ دریا کے کنارے بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کا
ایک بچھو پر پڑی، جو پانی میں ڈوب رہا تھا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ بے قرار ہو کر آگے بڑھے اور ڈوبے
بچھو کو پانی سے باہر نکال لیا۔ چونکہ ڈنک مارنا بچھو کی فطرت میں شامل ہے، اس لئے حضرت بایزید بسطامیؒ
جیسے ہی بچھو کو پکڑا، اس نے ڈنک مار دیا۔ حضرت مسیحؑ نے انتہائی تکلیف محسوس کی لیکن اظہار نہیں کیا۔
کچھ دیر بعد وہ بچھو دوبارہ پانی میں جا پڑا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ اُسے نکالنے کے لئے آگے بڑھے۔
”شیخ! آپ بھی عجب انسان ہیں۔“ ایک دوست نے کہا۔ ”ایک موذی کو پانی سے نکالنے کی کوشش کر
ہیں۔ اسے ڈوب جانے دیجئے۔“

دوست کی بات سن کر حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”یہ میں نہیں جانتا کہ وہ کوئی موذی ہے یا بے
میں تو ایک ڈوبتے ہوئے جانور کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر حضرت مسیحؑ نے اُس بچھو کو پانی سے نکال
اور بچھو نے اپنی فطرت کے مطابق ڈنک مار دیا۔

چار بار یہی واقعہ پیش آیا۔ آخر دوسرے سے خاموش نہیں رہا گیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”شیخ! آپ کا
ہماری عقل سے بالاتر ہے۔ بچھو ڈنک مارے جا رہا ہے اور آپ اسے نکالنے سے باز نہیں آتے۔“
حضرت بایزید بسطامیؒ نے شدید تکلیف کے عالم میں بھی مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”جب وہ برائی ہے
نہیں آتا تو پھر میں نیکی کرنے سے کیوں باز رہوں؟“



جانوروں کے حوالے سے حضرت بایزید بسطامیؒ کی حیات مبارک کے دو اہم واقعات بھی تاریخ میں
ہیں۔ ایک بار اپنے مریدوں کے ہمراہ ایک تنگ گلی سے گزر رہے تھے کہ اچانک سامنے سے کتا نمودار ہوا اور
بایزید بسطامیؒ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ حضرت مسیحؑ بھی چلتے چلتے ٹھہر گئے اور کتے کی طرف بہت غور سے دیکھا

گئے۔ کتا بھی منہ اٹھائے حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی جانب دیکھتا رہا۔ کچھ دیر اسی حالت میں گزر گئی۔ پھر حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ارادات مندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
 ”اس کتے کے لئے راستہ چھوڑ دو۔“

یہ کہہ کر حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف ہو گئے۔ آپ کی تقلید میں مریدین نے بھی راستہ کھلا چھوڑ دیا۔ کتے نے آخری بار حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور تیزی سے گزرتا ہوا چلا گیا۔
 کتے کے جانے کے بعد ایک مرید نے عرض کیا۔ ”شیخ! اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ پھر آپ نے ایک کتے کے لئے راستہ کیوں کھلا چھوڑ دیا؟ یہ بات خلاف عقل بھی ہے اور خلاف شرع بھی۔“
 حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے مرید کے اس سوال کے جواب میں فرمایا۔ ”یہ بات نہ خلاف عقل ہے اور نہ خلاف شرع۔ انسان اشرف المخلوقات ہے تو اُسے جانوروں کے راستے سے ہٹ جانا چاہئے۔ کتا جانور ہونے کے ساتھ ساتھ کُز د بھی ہے۔ شرع ہمیں حکم دیتی ہے کہ کُز دوں کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔“
 حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مریدین کو عقلی دلائل سے قائل کر دیا تھا۔ پھر جب آپ خانقاہ واپس پہنچے تو مریدین کو راستے کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا۔

”دراصل بات یہ تھی کہ کتے نے مجھ سے ایک عجیب سوال کیا تھا۔“

تمام مریدین حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادِ گرامی پر ہمہ تن گوش ہو گئے۔

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”کتے نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ روزِ ازل مجھے کتا کیوں بنایا گیا اور آپ کو سلطان العارفین کے منصب پر کیوں فائز کیا گیا؟ اس سلسلے میں میرا کیا قصور تھا اور آپ میں ایسی کون سی خوبی تھی؟ کتے کا سوال سن کر میں نے اسے راستہ دے دیا۔ اور اس وقت سے ایک ہی بات سوچ رہا ہوں کہ بازید، خالقِ کائنات کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ بے شک! اُسی نے مجھے انسان بنایا، ایمان بخشا اور اپنی بندگی کی توفیق عطا فرمائی۔ یقیناً میرا مالک مجھے انسان کے بجائے ایک ناپاک جانور بنا کر چھوڑ دیتا۔ اور اگر انسان بھی بنا دیتا تو مسکین کی صفوں میں کھڑا کر کے ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ قرار دیتا۔ اور یہ بات اُس کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہوتی۔“
 اسی طرح ایک بار حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ راستے میں جا رہے تھے کہ اسی انداز کا ایک اور واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا۔ اس وقت حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ تھا تھے۔ اچانک سامنے سے ایک کتا بھاگتا ہوا آیا۔ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے دیکھ کر اپنا دامن سمیٹ لیا۔ کتا جاتے جاتے رک گیا۔ آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”شیخ! آپ نے مجھے دیکھ کر اپنا دامن کیوں بچایا؟ پہلے تو یہ کہ میں بھیگا ہوا نہیں ہوں کہ آپ کو ناپاکی کا خطرہ ہوتا۔ اور اگر بالفرض میں بھیگا ہوا ہوتا تو کسی طرح آپ کے کپڑے ناپاک ہو جاتے تو آپ اپنے لباس کو دوبارہ پاک بھی کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے اس وقت جس تکبر کا مظاہرہ کیا ہے، اسے سات سمندروں کا پانی بھی پاک نہیں کر سکتا۔“

کتے کی بات سن کر حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر کتے کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ ”ٹوچ کہتا ہے۔ اس لئے کہ خیرِ ظاہر نجس ہے اور میرا باطن۔ اس لئے ہم دونوں کو ایک ساتھ رہنا چاہئے تاکہ میرے باطن کو بھی کچھ پاکیزگی حاصل ہو جائے۔“

جواب میں کتے نے کہا۔ ”شیخ! ہم دونوں کا ساتھ رہنا ممکن نہیں۔ کیونکہ میں مردود ہوں اور آپ مقبولِ بارگاہ۔ دوسرے یہ کہ میرے اور آپ کے مزاج میں بہت فرق ہے۔“

”وہ کیا فرق ہے؟“ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے کتے سے پوچھا۔
 ”میں کل کے لئے ایک ہڈی بھی بچا کر نہیں رکھتا اور آپ سال بھر کا غلہ جمع کر لیتے ہیں۔“ کتے نے کہا اور
 سے چلا گیا۔

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سرد آہ کھینچی اور نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”جب میں ایک
 ساتھ رہنے کے بھی قابل نہیں تو پھر اللہ کا قرب کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بہت دیر تک راستے میں کھڑے زار و قطار روتے رہے۔ پھر آسمان کی طرف
 ہوئے فرمایا۔ ”پاک ہے وہ اللہ جو بدترین مخلوق کی باتوں سے بہترین مخلوق کو درس عبرت دیتا ہے۔“

ظاہر پرستوں کو ان دونوں روایتوں پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ ایک کتا، انسان سے گفتگو کس طرح کر سکتا ہے۔

ایک انسان، جانوروں کی زبان کیسے سمجھ سکتا ہے؟ یہ امر واقعہ ہے کہ جانوروں کی جن بے ہنگم آوازوں کو ہم
 سمجھتے ہیں، وہ ان کی باقاعدہ اور معنی خیز گفتگو ہوتی ہے۔ مگر ایک انسان اُن کا ادراک نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے

جلیل القدر پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ معجزہ بطور خاص بخشا تھا کہ آپ تمام جانوروں کی زبان سمجھ
 قرآن کریم میں ایک چیونٹی کے بات کرنے کا ذکر موجود ہے۔ ایک راستے سے حضرت سلیمان علیہ السلام

گزرنا۔ چیونٹی نے اپنی ہم جنسوں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔
 ”تم راستے سے ہٹ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان کا لشکر تمہیں روند ڈالے۔“

قرآن کریم میں واضح طور پر موجود ہے کہ چیونٹی کی بات سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام ہنسے تھے۔
 اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، جانوروں کی زبان سمجھنے کی صلاحیت عطا کر دیتا ہے۔

بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اولیائے کرام کو بھی یہ صفت خاص بخشی گئی تھی۔ اور جہاں تک درس عبرت
 کرنے کا معاملہ ہے تو اُردو کے عظیم شاعر میر تقی میر کا ایک شعر اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
 منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ



حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ دنیا اور آخرت کے معاملات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ دوسرے مولانا
 معمولی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے، حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ انہیں بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی

آپ بہت چھوٹے چھوٹے واقعات سے عبرت حاصل کرتے تھے اور عام لوگوں کو نہایت مؤثر انداز میں
 کے ذریعے سبق دیا کرتے تھے۔

”نوائد الفوائد“ میں حضرت خواجہ امیر حسن سنجری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بیان
 ہے۔ ایک دن مجلس درس آراستہ تھی۔ حضرت محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”ایک بار ایک کفن چور، حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے اس شرم ناک فعل
 توبہ کی۔“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے تاب ہو جانے والے چور سے پوچھا۔ ”تم نے اب تک کتنے مردوں کے
 اتارے ہیں؟“

”تقریباً ایک ہزار۔“ چور نے ندامت سے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

”یاد کر کے بتاؤ کہ اُن مُردوں میں سے کتنوں کے چہرے قبلہ کی طرف تھے اور کتنوں کے چہرے قبلہ سے پھرے ہوئے تھے؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے کفن چور سے دوسرا سوال کیا۔

بڑا عجیب سوال تھا۔ کفن چور بہت دیر تک اپنے حافظے پر زور دیتا رہا۔ آخر اُس نے دل ہی دل میں حساب لگا کر کہا۔ ”شیخ! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، صرف دو مُردے ایسے تھے، جن کے منہ کعبے کی طرف تھے۔“

”اور باقی مُردوں کا کیا حال تھا؟“ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے کفن چور سے ایک اور سوال کیا۔

”باقی لوگوں کے چہرے قبلہ سے پھرے ہوئے تھے۔“ کفن چور نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تم لوگ جانتے ہو، ایسا کیوں ہوا؟ حالانکہ قبروں میں دفن ہونے والے سب کے سب مسلمان تھے؟“

جلس پر سناٹا چھا گیا۔

مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت اثر انگیز لہجے میں فرمایا۔ ”دو اشخاص، جن کے چہرے قبلہ کی طرف تھے، وہ اپنی زندگی میں حق تعالیٰ پر بھروسہ کرتے تھے۔ اس لئے رب کریم نے بعد از مرگ بھی اُن کے چہروں کو اپنی ہی طرف رکھا۔ باقی لوگ اہل دنیا اور ظاہری اسباب پر یقین رکھتے تھے، اس لئے حق تعالیٰ نے مرنے کے بعد اُن کی دیکھیری نہیں فرمائی اور ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر ان کے منہ کعبے کی طرف سے پھر گئے۔ اس لئے کہ زندگی میں ان کے دل اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھرے ہوئے تھے۔“



ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ عجیب تھا۔ اس لئے حق تعالیٰ بھی عجیب عجب انداز سے آپ کو ہدایت فرماتا تھا۔ بسطام میں ایک دیوانہ شخص رہتا تھا۔ راہ گیر اکثر اُسے چھیڑا کرتے تھے۔ مگر اس دیوانے نے کبھی کسی کے پتھر نہیں مارا اور کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ بس وہ ہنستا رہتا تھا اور باتیں کرتا رہتا تھا۔ مگر ایسی باتیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔

ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ راستے سے گزر رہے تھے۔ اس وقت دیوانہ ہاتھ اٹھائے اور آسمان کی طرف منہ کئے دعا مانگ رہا تھا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اُس منجبوط الحواس شخص کی طرف دیکھا اور اپنے ارادت مندوں سے فرمایا۔

”آؤ دیکھیں کہ وہ شخص کیا دعا مانگ رہا ہے۔“

مریدوں نے بیک زبان عرض کیا۔ ”شیخ! وہ تو دیوانہ ہے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”دیوانوں کو بھی سننا چاہئے۔ کبھی کبھی یہ لوگ بھی بہت ہوش کی باتیں کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر آپ اس دیوانے کے قریب تشریف لے گئے۔

دیوانہ بڑے پُرسوز لہجے میں یہ دعا مانگ رہا تھا۔ ”اے اللہ! اے سارے عالم کی طرف نظر کرنے والے! کبھی ایک نظر میرے چہرے کی طرف بھی دیکھ لے۔“

موسم کی سختیوں کے سبب دیوانے کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دیوانے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”آخر تیرے چہرے میں ایسی کون سی خاصیت ہے جو حق تعالیٰ تیری طرف نظر کرے؟“

دیوانے نے رقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ”اپنی بد صورتی کے سبب تو اس سے بار بار سوال کر رہا ہوں کہ ایک نظر میرے چہرے کی طرف دیکھ لے۔ وہ جس روز بھی میری جانب دیکھے گا، یہ تمام سیاہی دُور ہو جائے گی اور چہرہ

خود بخود خوبصورت ہو جائے گا۔“

دوسری روایت میں درج ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دیوانے کو دعا مانگتے ہوئے دیکھا۔
اللہ! میری جانب نظر فرما۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دیوانے کے الفاظ سنے تو اُسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تُو نے اپنے
سے نیک اعمال کئے ہیں جو اُس کی نظرتیری طرف اُٹھے؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر دیوانے نے جواب دیا۔ ”اپنی بد اعمالی ہی کے سبب تو اُس کی نظر
کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ جب اُس کی نظر مجھ پر پڑ جائے گی تو اعمال خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بے اختیار ہو گئے اور نہایت پُرسوز لہجے میں دیوانے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
”بے شک! تُو سچا ہے۔ اُس کی ایک نظر ہی سب کچھ ہے۔ وہی نظر ہمارے چہروں کی سیاہی دھوئی ہے اور ہمارے
ہمارے بگڑے ہوئے اعمال کو سنوارتی ہے۔“



حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ آپ اپنے مریدوں کو اکثر حضرت
بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے تاکہ وہ حضرت شیخ سے فیض روحانی حاصل کر سکیں۔ حضرت ذوالنون
مصری رحمۃ اللہ علیہ نے کئی بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے تحفے بھی ارسال کئے۔ ایک بار آپ نے حضرت
بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک مُصلّہ بھیجا اور ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ اسے قبول کر لیا جائے۔
حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے مُصلّہ واپس کرتے ہوئے فرمایا۔ ”شیخ سے کہہ دینا کہ ہمیں مُصلّہ سے کیا
ہمیں تو اب مسند درکار ہے کہ اُسے نکیہ بنائیں۔“

بعض اہل دانش نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول مبارک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:
”معاملہ نیاز کی حدوں سے گزر گیا ہے اور اب ہم ناز کی حدوں میں داخل ہو چکے ہیں۔“
ہمارے نزدیک یہ تشریح درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر اہل جنت کی نشہ
برخواست کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ ”وہ اپنی مسندوں پر نیک لگائے بیٹھے ہوں گے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کو پیغام دیتے وقت اسی طرف اشارہ کیا تھا کہ
اپنا کام تو ختم کر چکے، اب اللہ کے کرم کے انتظار میں بیٹھے ہیں کہ وہ کب نوازتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص حضرت ابو موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ کچھ دن بعد حضرت ذوالنون
مصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ کے لئے ایک نہایت عمدہ نکیہ بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی درخواست کی کہ یہ نیکر آپ
خواہش کے مطابق ہے، اسے قبول فرمالیجئے۔“

جب حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا ارسال کردہ نکیہ پہنچا تو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہری حالت یہ
کہ جسم مبارک پر ہڈیوں اور کھال کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔ ایسی حالت میں حضرت شیخ کو نرم نیکے کی شدید ضرورت
تھی۔ مگر آپ نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا نکیہ بھی واپس کر دیا۔

”شیخ! آپ کی محبت کا بہت شکریہ۔ مگر جس کی نکیہ گاہ، حق تعالیٰ کا لطف و کرم ہو، اُسے دنیا کے نکیوں سے آرام
سکون حاصل نہیں ہوتا۔“

حضرت ذوالنون مصریؒ اپنے خاص مریدوں کو حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں فیضِ روحانی حاصل

کرنے کے لئے بھیجے، مگر حضرت شیخؒ یار الہی میں اس قدر غرق تھے کہ انہیں اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ نتیجتاً حضرت ذوالنون مصریؒ کے مرید صرف دیدار سے شرف یاب ہو کر واپس آ جاتے۔ ایک بار حضرت ذوالنونؒ کا ایک مرید اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق حضرت بایزید بسطامیؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت شیخؒ اپنے گھر میں قیام فرماتے تھے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ کے مرید نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد حضرت بایزیدؒ دروازے پر تشریف لائے اور آنے والے شخص سے پوچھا۔

”آپ کون ہیں؟ اور کس سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”میں شیخ بایزید سے ملنا چاہتا ہوں۔“ حضرت ذوالنون مصریؒ کے مرید نے بعد احترام عرض کیا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے جواب فرمایا۔ ”بایزید کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ میں تو اُسے نہیں جانتا۔“ وہ شخص کچھ دیر حیران کھڑا رہا اور پھر واپس چلا گیا۔ راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ پیر مرشد نے مجھے کس مجذوب الحال کے پاس بھیج دیا تھا؟ پھر جب اس نے حضرت شیخؒ کی خدمت میں پہنچ کر پورا واقعہ سنایا تو حضرت ذوالنون مصریؒ رو پڑے۔

”میرا بھائی بایزید یقیناً اس جماعت میں شامل ہو گیا ہے جو اللہ کی طرف سرگرم سفر ہے۔“

ایک واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ پوری رات عبادت میں مشغول نہیں رہتے تھے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ نے بھی بسطام میں قیام کے دوران آپ کو نصف شب سے پہلے سوتے ہوئے دیکھا اور ظاہری حالت پر قیاس کر لیا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ شب بیداری کے عادی نہیں تھے۔

مشہور بزرگ حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے ”عوارف المعارف“ میں فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت ذوالنون مصریؒ نے اپنے خادم خاص کو حضرت بایزید بسطامیؒ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا۔

”شیخ! یہ نیند اور راحت کب تلک رہے گی؟ قافلہ تو بہت دُور جا چکا۔“

حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنے عزیز ترین دوست کا پیغام سن کر فرمایا۔ ”میرے بھائی ذوالنونؒ سے کہہ دینا کہ مرد تو وہ ہے جو ساری رات سوتا رہے، مگر جب صبح ہو تو قافلے سے پہلے منزل پر پہنچ جائے۔“

جب حضرت ذوالنون مصریؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ کا پیغام سنا تو بے اختیار فرمایا۔ ”بایزیدؒ کو یہ مرتبہ مبارک ہو۔ افسوس کہ ہمارے احوال تو ابھی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچے۔“



بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے چالیس سال تک کسی سے گفتگو نہیں کی۔ عام طور پر اس روایت کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ تقریباً نصف صدی تک خاموش ہی رہتے تھے۔ انتہائی ضرورت کے مواقع پر کسی سے بات کر لیتے ہوں گے۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ سہلگیؒ اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”چالیس سال تک مخلوق سے گفتگو نہ کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت شیخؒ نے جو کچھ کہا، حق تعالیٰ سے کہا اور جو کچھ سنا، حق تعالیٰ سے سنا۔ یعنی احکام الہی پر عمل کیا اور شیطان کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔“

خود حضرت بایزید بسطامیؒ کا مشہور قول ہے کہ جو شخص اللہ کی معرفت رکھتا ہے، وہ اپنی زبان ذکر الہی کے سوا کسی بات کے لئے نہیں کھولتا۔“

ایک اور موقع پر حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”تیس سال ہونے کو ہیں کہ جب حق تعالیٰ کو یاد کرنا چاہتا

ہوں تو اپنی زبان اور منہ کو تین پانیوں سے دھو لیتا ہوں۔“ تین پانیوں سے مراد ہے تین مرتبہ۔
 کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ساری رات خانقاہ میں بیٹھ کر گزاری۔ مگر
 کے ہیبت و جلال کے سبب ایک بار بھی اس کا نام اپنے ہونٹوں تک نہ لاسکے۔ زبان خشک ہو جاتی اور جسم
 طاری ہو جاتا۔ بار بار یہی سوچتے کہ اس کا مقدس نام اپنی ناپاک زبان پر کس طرح لاؤں؟ بالآخر اسی کنگھڑی
 ہو جاتی۔

مشہور بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ تصوف کے موضوع پر اپنی شہرہ آفاق اور بے مثال
 ”عوارف المعارف“ میں تحریر کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دوستوں سے فرمایا۔
 ”کل رات میں صبح تک یہ کوشش کرتا رہا کہ کلمہ طیبہ کا ورد کروں مگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ایک
 میری زبان سے یہ کلمہ ادا نہ ہو سکا۔“

”شیخ! آخر اس معذوری کی کیا وجہ تھی؟“ دوستوں نے پوچھا۔
 حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”رات بھر مجھے اپنے بچپن کا کہا ہوا ایک جملہ یاد آتا رہا جس کی
 اس قدر وحشت طاری ہوئی کہ میں ذکر الہی نہ کر سکا۔“

”شیخ! پھر اس کا کیا حل ہے؟“ دوستوں نے سوال کیا۔
 حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اس کی تلافی کی بھی ایک ہی صورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ اللہ
 کیا جائے۔“



اسی شدت احساس اور کثرت ریاضت نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ میں بے پناہ ایثار و قربانی اور حلم
 کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ایک بار آپ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔
 ”اگر مجھے تمام مخلوق کے بدلے میں آتش دوزخ کے حوالے کر دیا جائے، تب بھی میں صبر کر لوں گا۔
 مجھے حق تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ ہے اور اس محبت کے دعوے کے بدلے میں یہ سزا کچھ بھی نہیں ہے..... بلکہ
 سمجھوں گا کہ مجھ سے اس کی محبت کا حق ادا نہ ہو سکا۔“

واضح رہے کہ اگر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ صرف اپنے ایثار و قربانی کا ذکر کرتے تو یہ بات نمودار
 غرور و تکبر میں شامل ہو جاتی۔ اس لئے آپ نے اللہ تعالیٰ کی رحمت بے کنار کا ذکر بھی پوری شدت کے ساتھ
 ”اگر اللہ تعالیٰ میرے اور ساری مخلوق کے گناہ بخش دے تو اس کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔“
 حضرت شیخ حاتم رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ آپ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے۔ ”وہ شخص
 میرے مریدوں میں سے نہیں ہے جو قیامت کے دن دوزخیوں کی سفارش نہیں کرے گا۔“

حضرت حاتم رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول مبارک کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ صوفی کو مخلوق خدا کی خدمت کے لئے بہت
 پُر جوش ہونا چاہئے۔ اگر کوئی شخص آفات و مصائب کا شکار ہو تو اس کی اس حد تک مدد کرنا چاہئے کہ وہ رنج و
 نجات پا جائے۔ رہا قیامت کے دن شفاعت کا معاملہ تو اس کا انحصار اللہ کے فضل و کرم پر ہے۔ وہ جسے چاہے
 اعزاز بخشے گا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔ اس ذیل میں ہم مسلمانوں کا ایک ہی
 ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شافع محشر ہیں..... مگر بعض مواقع پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ
 دوسرے برگزیدہ بندوں کو بھی سفارش کی اجازت مرحمت فرمائے گا۔ مگر یہ سفارش ذیلی سفارش ہوگی۔ مثال کے

پر شائع مفسر ﷺ نے حفظ قرآن کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

”قیامت کے دن حافظ قرآن کی شفاعت سے اس کے باپ دادا بخش دیئے جائیں گے۔“

حضرت حاتم اہمؒ نے بھی اپنے مریدوں کے حوالے سے اسی انداز کی شفاعت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

جب ایک مجلس میں کسی شخص نے حضرت حاتم اہمؒ کا یہ قول دہرایا تو حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ ”میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا میرہ وہ ہے جو دوزخ کے کنارے بیٹھ جائے اور جب کسی شخص کو دوزخ میں ڈالا جائے تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بہشت میں پہنچا دے اور خود اس کی جگہ دوزخ میں چلا جائے۔“

حضرت بایزید بسطامیؒ کے اس قول مبارک کا بھی وہی مفہوم ہے کہ صوفی خدمتِ خلق کے لئے وقف ہو کر رہ جائے۔ اور حقیقی صوفی وہی ہے جو دوسرے لوگوں کے مصائب اپنے سر لے لے۔



حضرت بایزید بسطامیؒ پابندِ شریعت بھی تھے اور عاملِ سنت بھی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ عشقِ حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ مقدس سے تھا۔ اور اسی عشق نے آپ کو معرفت کے اسرار و رموز سکھائے تھے۔ اور اسی عشق نے لالہ صحرائی کی تنابندی کی تھی۔ جس دل میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی شمع فروزاں نہیں، وہ منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ جیسا کہ حضرت شیخ مصلح الدین سعدیؒ نے فرمایا۔

خلاف پیہر کے رہ گزید

کہ ہرگز بہ منزلِ نخواہد رسید

(جس نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی سنت کے خلاف راستہ اختیار کیا، وہ ہرگز منزل تک نہیں پہنچے گا)

حضرت شیخ سعدیؒ کے اسی مضمون کو علامہ اقبال نے زیادہ وسیع انداز میں پیش کیا ہے۔

مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ است

اگر بہ اوند رسیدی تمام بویہی است!!

(تو اپنے آپ کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہِ کرم تک پہنچا کہ وہی ذاتِ اقدس دین کا مکمل نمونہ ہے۔ اگر تو

رسالتِ پناہ ﷺ کے آستانے تک نہیں پہنچا تو پھر سمجھ لے کہ تمام بویہی (گمراہی) ہے۔)

حضرت بایزید بسطامیؒ دوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا بھی بے حد احترام کرتے تھے۔ اور یہ احترام ایک مومن کے ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ ایک بار حضرت بایزید بسطامیؒ سے کسی شخص نے انبیاء کرام کے درجات کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔

”حق تعالیٰ کی بارگاہِ کرم سے انبیاء کرام کو جو کچھ عطا کیا گیا ہے، اس مشک سے شہد کے جو قطرے ٹپک رہے

ہیں، وہ اولیاء کا مقدور ہیں..... اور مشک کے اندر شہد کا جو ذخیرہ ہے، وہ انبیاء کرام کا حصہ ہے۔“

اسی طرح ایک بار مجلس میں کسی نے حضرت داتا گنج بخشؒ سے سوال کیا کہ ”انبیاء کرام کا کیا مرتبہ ہے؟“

جواب میں حضرت سید علی ہجویریؒ نے فرمایا۔

”ہمیں انبیاء کرام کے احوال میں کوئی دخل و تصرف نہیں ہے۔ ہم اپنی سطح پر رہ کر ان پاک ہستیوں کے

بارے میں جو کچھ سوچتے ہیں، وہ بہت پست ہوتا ہے۔ دراصل وہ ہمارے ہی خیالات ہوتے ہیں، جو ہماری ذات

کے حصار سے بلند نہیں ہوتے۔ حق تعالیٰ نے اپنے انبیاء پاک کی صفاتِ باطنی کو ایسی بلندی اور ایسے شجرہ پوشیدہ

میں رکھا ہے، جہاں مخلوق کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔“

حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ (داتا گنج بخش) کا قول مبارک بھی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان ہے۔ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ سرور کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کے بغیر کسی کو معرفت حاصل نہیں ہوئی معرفت کے سلسلے میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے عجیب و غریب اقوال تاریخ تصوف کی پیشانی پر جو قیامت تک اہل دل کی رہنمائی کریں گے۔

حضرت سید علی ہجویری کی روایت کے مطابق ایک بار کسی نے سوال کیا کہ معرفت کیا ہے؟ تو حضرت بسطامی نے فرمایا۔ ”تو اچھی طرح جان لے کہ مخلوق کی تمام حرکات و سکنات اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی توکل پر منت ہیں..... اور یہی معرفت ہے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ ”اے حیرت زدہ لوگوں کے رہنما! میری جزا مزید اضافہ فرما۔“ کیونکہ بندہ اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کا جس قدر مشاہدہ کرے گا، اُسی قدر اس کی حیرت بڑے توازن کے ساتھ اس پر معرفت کے راز منکشف ہوں گے۔“

معرفت کے سلسلے میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول مبارک خاص شہرت رکھتا ہے۔ ”دل میں شیری کا ایک ذرہ جنت کے ایک ہزار محلات سے بہتر ہے۔“

ایک بار کسی نے سوال کیا کہ عارف کی صفت کیا ہے؟ تو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”عارف صفت ہے، جو دوزخیوں کی صفت ہے کہ وہ اس آگ میں نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں۔“

یہ بڑی عجیب اور لطیف مثال ہے کہ جس طرح اہل جہنم دوزخ کی آگ میں جلتے رہتے ہیں، اسی طرح عشق کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔

کسی نے پوچھا کہ عارف کیا چاہتا ہے؟ تو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”عارف وہ ہے کہ ذکر میں کبھی وقفہ نہیں کرتا۔ اس کے حق کو ادا کرنے سے کبھی نہیں اُکٹاتا۔ اور اس کے سوا کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔“

مزید فرمایا۔ ”عارف وہ ہے جو حق تعالیٰ کے دیدار کے سوا کسی چیز پر رضا مند نہیں ہوتا۔“

ایک بار عارف کے مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا۔ ”عارف کا سب سے کم درجہ یہ ہے کہ وہ حق صفات و اخلاق سے آراستہ ہو اور عارف کا درجہ کمال یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نوز محبت میں بیچ و تاب کھاتا رہے۔“

کسی نے سوال کیا کہ عارف کے فرائض کیا ہیں؟ تو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”کم سے کم جو چیز عارف کے لئے ضروری ہے، وہ یہ کہ اپنے مال اور ملکیت سے بیزاری کا اظہار کرے حق تو یہ ہے کہ اگر ایک عارف کو دونوں جہاں پر تصرف و اختیار بخش دیا جائے اور وہ ان تمام چیزوں کو کٹھن قربان کر دے، تب بھی یہ ایک حقیر قربانی ہوگی۔“

ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ معرفت اور طریقت میں انسان کے لئے کیا ہے؟

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”مادر زاد دولت..... یعنی پیدائشی طور پر انسان کو یہ نعمت حاصل ہو۔ سوال کرنے والے نے پوچھا کہ اگر مادر زاد دولت نصیب نہ ہو؟

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اگر یہ دولت اس کے مقدر میں نہ ہو تو پھر تو ان جسم ضروری ہے مجاہدے اور ریاضتیں کی جاسکیں۔“

پوچھنے والے نے پوچھا۔ ”اگر تو ان جسم بھی اس کا مقدر نہ ہو؟“

حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”سننے والے کان، تاکہ ان کے ذریعے معرفت سیکھی جاسکے۔“
سوال کرنے والے کہا۔ ”اگر اُسے سننے والے کان بھی میسر نہ ہوں تو؟“

حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”کم سے کم چشم بینا ضرور ہو کہ وہ قدرت کے مظاہر دیکھ کر نصیحت اور عبرت حاصل کر سکے۔“

”اور اگر دیکھنے والی آنکھ بھی نہ ہو تو؟“

حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”پھر اس کے حق میں مرگِ مغافات (اچانک موت) بہتر ہے۔“
ایک بار حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”جو شخص بھی حق تعالیٰ کو جانتا ہے، وہ یا حق کے سوا کبھی زبان نہیں کھولتا۔“

ایک اور موقع پر فرمایا۔ ”معرفت پانے والوں نے جو کچھ پایا ہے، وہ اپنی تمام چیزوں کے ضائع کر دینے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں سے عطا ہونے والی چیز پر قائم رہنے سے۔“

حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ ”ایک بار میں نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی۔ ”اے معبودِ کونین! اے معبودِ کائنات! مجھے بتائیے کہ میں آپ تک کیسے پہنچوں؟“

جواب میں جمدائے غیبی سنائی دی۔ ”پہلے اپنے نفس کو تین بار طلاق دے دے، پھر ہمارا ذکر کر۔“
حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے نفس سے اس قدر دشمنی ہو گئی تھی کہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ”اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے قیامت کے دن پوچھا کہ تیری آرزو کیا ہے تو میں اتنا ہی عرض کروں گا۔“

”اے میرے پالنے والے! مجھے اجازت دیدے کہ میں دوزخ میں جاؤں اور اپنے نفس کو اس آگ میں ایک غوطہ دے آؤں کہ اس کی وجہ سے مجھے دنیا میں بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں۔“

انسانی نفس کی ان ہی ہلاکت خیز ترغیبات کی وجہ سے حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ ”گناہ سے توبہ ایک بار ہے اور طاعت سے توبہ ہزار بار ہے۔“

حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قولِ مبارک کی تشریح یہ ہے کہ ریاضت و عبادت میں تکبر کرنا گناہ سے بدتر ہے۔ اس لئے طاعت کے سلسلے میں ایک بار نہیں، ہزار بار توبہ کرنی چاہئے۔“

تلاشِ حق کے بارے میں حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ ”میں نے تمام ہاتھوں سے اللہ کو ڈھونڈا، مگر جب تک مصیبت کے ہاتھ سے نہ ڈھونڈا، اس وقت تک وہ مجھے نہیں ملا۔ میں تمام قدموں سے اس کے راستے میں گیا، مگر جب تک دل کے قدموں سے نہیں گیا، منزل پر نہ پہنچ سکا۔“

ایک بار کسی نے مجلس میں سوال کیا۔ ”شیخ! آپ کے نزدیک جواں مرد کون ہے؟“

حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”مرد وہ نہیں ہے جو کسی چیز کے پیچھے چلے۔ بلکہ مرد وہ ہے جو کہیں بھی ہو، چیزیں اس کے گرد و دڑیں اور جس چیز سے خطاب کرے، وہ جواب دے۔“

ایک دن کسی شخص نے عرض کیا۔ ”کیا اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنی رضامندی سے بہشت میں نہیں لے جاتا؟“

حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”جب حق تعالیٰ بندے کو اپنی رضا دیتا ہے تو وہ بہشت لے کر کیا کرے گا؟“
(حضرت شیخ کے اس قولِ مبارک کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مقابلے میں جنت کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔)

حضرت بازید بسلامی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عجیب قول ہے، جس کا مشاہدہ ہم لوگ دن رات کرتے ہیں۔ ایک بار آپ

نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”کوئی گناہ تمہیں اس قدر نقصان نہیں پہنچا سکتا، جس قدر کہ ایک بھائی کو ذلیل کرنا۔“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور عجیب قول مشہور ہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ”دوزخ اس لئے عذاب ہے، جو اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتا۔ اور حق شناس لوگ دوزخ کے لئے عذاب ہیں۔ یعنی اٹس اللہ چھو نہیں سکتی۔ اور یہی بات دوزخ کے لئے عذاب ہے۔

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ذاتی طور پر کرامت کے اظہار کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ مگر اضطراری طور پر کبھی آپ سے کرامت ظاہر ہو جاتی تھی۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ دور دراز کے علاقے بھی آپ کے کمالات کے شور سے گونج اُٹھے۔ ایک بار کسی شخص نے ان ہی کرامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا۔

”شیخ! سنا ہے کہ آپ پانی پر چلتے ہیں؟“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اس میں میرا کیا کمال ہے؟ لکڑی کا ایک ٹکڑا بھی پانی پر تیرتا ہے اُسی شخص نے دوسرا سوال کیا۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ آپ ہوا میں اڑتے ہیں؟“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب فرمایا۔ ”تم نے پرندوں کو ہوا میں اڑتے نہیں دیکھا؟“

”مشہور ہے کہ آپ ایک رات میں مکہ معظمہ پہنچ جاتے ہیں۔“ اس شخص نے عرض کیا۔

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”جادوگر بھی ایک رات میں ہند سے دوسرے ملک پہنچ جاتا ہے۔ رہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے جادوگروں کی بہت شہرت تھی۔

آخر اُس شخص نے عاجز آ کر کہا۔ ”شیخ! پھر مردوں کا کیا کام ہے؟“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”مردوں کا اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ وہ صرف حق تعالیٰ کا گائیں۔“

ایک بار کسی سائل نے عرض کیا۔ ”شیخ! اگر آپ کچھ دیر کے لئے خلوص قلب کے ساتھ میری طرف منہ جائیں تو میں اپنا مدعا بیان کروں۔“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب فرمایا۔ ”میں تیس سال سے اللہ سے خلوص قلب کا طالب ہوں مگر حاصل نہ ہو سکا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جب میرا قلب ہی اخلاص و صفا سے خالی ہے تو پھر میں تمہاری طرف کیسے جہنم سکتا ہوں؟“

حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ ”اکثر مجھے خیال آتا تھا کہ میں اللہ کو دوست رکھتا ہوں۔ مگر اپنے اس خیال پر غور کیا تو یہ راز منکشف ہوا کہ میں اللہ تعالیٰ کو دوست نہیں رکھتا بلکہ اللہ تعالیٰ مجھے دوست رکھتا ہے۔ ایک موقع پر حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”اگر اپنی پوری زندگی گزار بھی اچھا کام کر لیتا تو آج خوف زدہ نہ ہوتا۔“

اس واقعے سے اہل نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے عجز و انکسار کا کیا عالم تھا۔ ”سلطان العارفین“ کہتی تھی اور آپ فرماتے تھے کہ میرے نامہ اعمال میں ایک بھی اچھا عمل نہیں ہے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت بازید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد سو جایا کرتے تھے۔ تہجد کے وقت اُٹھتے اور ذکر الہی میں مشغول ہو جاتے۔ آپ کے اسی طرز عمل کو دیکھ کر کچھ لوگ اعتراض کیا کرتے۔

تھے کہ بایزید بسطامی قائم اللیل (رات کو جاگنے والے) بزرگوں میں سے نہیں ہیں۔ اسی اعتراض کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ سے سوال کیا۔ ”شیخ! آپ رات کو نماز کیوں نہیں پڑھتے؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ نے فرمایا۔ ”مجھے دنیا کا چکر لگانے اور لوگوں کی مدد کرنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔“ ”تذکرۃ الاولیاء“ میں حضرت شیخ فرید الدین عطار کی روایت ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے زمانے میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان ایک ہولناک جنگ ہوئی۔ اگرچہ اسلامی لشکر نے بڑی جانیازی کا مظاہرہ کیا لیکن دشمن پر قابو نہ پاسکے۔ پھر یکایک صورت حال پلٹ گئی۔ رومی سپاہی آگے بڑھ کر پے درپے حملے کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اسلامی لشکر کو محاذ جنگ سے پیچھے ہٹنا پڑا اور وہ چاروں طرف سے محصور ہو گیا۔ شکست سامنے تھی۔ یکایک ایک سپاہی زور سے پکارا۔

”شیخ بایزید! لشکر اسلام پر برا وقت ہے۔ آپ حق تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔“ یہ سپاہی حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کا عقیدت مند تھا۔ دوسرے فوجیوں نے اپنے ساتھی کی فریاد نہ مپکار سنی اور حیرت سے کہا۔ ”شیخ بایزید تیری درخواست کیسے سنیں گے؟ وہ تو یہاں سے بہت دور ہیں۔“ دوسرے سپاہی نے کہا۔ ”بالفرض اگر شیخ نے تیری پکار سن بھی لی تو بایزید کی دعائیں کیا کریں گی؟ دشمن غالب آ چکا ہے۔ بس کچھ دیر کی بات ہے، یا تو ہم لڑتے لڑتے شہید ہو جائیں گے یا پھر ہمیں زنجیریں پہنا دی جائیں گی۔ شکست ہمارا مقدر ہو چکی ہے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ سے عقیدت رکھنے والے سپاہی نے کہا۔ ”بے شک ہمارے اعمال تو اس قابل نہیں کہ حق تعالیٰ ہماری التجائیں سنے، مگر وہ شیخ بایزید کی بہت سنتا ہے۔“

”مگر شیخ بایزید تک ہماری درخواست پہنچے کی کیسے؟“ دوسرے سپاہیوں کو اپنے ساتھی کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”جس ذات پاک نے شیخ بایزید کو مقبولیت کے اس مقام تک پہنچایا ہے، وہی ہماری پکار بھی ان تک پہنچائے گا۔“ سپاہی کی عقیدت غیر متزلزل تھی۔ جیسے ہی اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، ایک شعلہ رومی لشکر کے عقب سے نمودار ہوا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ شعلہ بھڑکتی ہوئی آگ میں تبدیل ہو گیا اور آگ رومی سپاہیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ اس آفت ناگہانی پر فاتح لشکر میں سراپیمگی پھیل گئی۔ اب رومی سپاہی مسلمانوں پر حملہ کرنے کے بجائے آگ سے بچنے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں منتشر ہو گئے۔ اسلامی لشکر حیرت زدہ تھا کہ شکست فاش کھلی ہوئی فتح میں کیسے بدل گئی؟

اس واقعے کے تناظر میں حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے جواب کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ جب لوگوں نے پوچھا تھا کہ آپ رات کو نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ اور حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ نے فرمایا تھا کہ مجھے دنیا کا چکر لگانے اور لوگوں کی مدد کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔“



تصوف میں عارف کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک حالت صحو..... جس صوفی پر یہ حالت طاری ہوتی ہے، وہ اپنے ہوش و حواس میں رہتا ہے اور اس کے اعمال ظاہری شریعت و سنت کے مطابق ہوتے ہیں..... دوسری حالت سکر..... یعنی جذب و مستی کی حالت۔ اس حالت میں کبھی کبھی صوفی سے شریعت کے اعمال ظاہری ترک ہو جاتے

ہیں..... کبھی کبھی سکر (مستی) کی حالت صوفی کا مکمل احاطہ کر لیتی ہے۔ ان صوفیاء کو اپنے لباس، غذا اور ہر بھی ہوش نہیں رہتا۔ بعض صوفیاء پر تمام عمر سکر کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اس گروہ کے لوگ مجذب و مجذوب چونکہ مجذب اپنے حال سے بے حال ہوتا ہے، اس لئے اس کا کوئی عمل بھی تقلید کے قابل نہیں ہوتا۔ صوفیاء کی زبان سے جو الفاظ سکر و مستی کی حالت میں ادا ہوتے ہیں اور بظاہر شریعت کے خلاف ہوتے ہیں، ان کو صوفیاء تصوف کی اصطلاح میں ”شطیات“ کہا جاتا ہے۔ اکابر صوفیاء کی ”شطیات“ مشہور ہیں۔ ان کے صحیح فہم کرنا اہل بصیرت کا کام ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی بعض شطیات بھی بہت زیادہ شہرت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر صوفیاء کے حلقے میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول آج بھی موضوع بحث بنایا ہوا ہے۔ ”سجانی ما اعظم شانی“ (میں پاک ہوں اور میری بڑی شان ہے)

تذکرۃ الاولیاء میں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب آپ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ پاک ہوں اور میری بڑی شان ہے تو چند ارادت مندوں نے عرض کیا۔ ”شیخ! آپ نے جو بات فرمائی ہے، وہ شریعت کے سراسر خلاف ہے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مریدوں کی یہ بات بہت غور سے سنی اور پھر فرمایا۔ ”میں نہیں میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہوں۔“

پھر جب مریدوں نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا۔ ”اگر آئندہ اس قسم کا کوئی جملہ میری زبان پر آئے گا کر دینا۔“

روایت ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر دوبارہ جذب و مستی کی وہی حالت طاری ہوئی تو آپ نے ”میں پاک ہوں اور میری بڑی شان ہے۔“

مریدوں نے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق آپ کو قتل کرنے کے لئے چھریوں کے مسلسل وار شروع کر دیے۔ کچھ دیر بعد ہی انہیں احساس ہو گیا جیسے وہ پانی پر چھریاں چلا رہے ہیں اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا جسم پھیلتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ پورا کمرہ جسم سے بھر گیا۔ مریدین خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے اپنے بازو لئے۔ پھر جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ کیفیت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی تو ارادت مندوں نے دیکھا کہ شیخ کمرے کے بجائے محراب میں کھڑے ہیں۔

مریدوں نے حیرت و خوف کے عالم میں پورا واقعہ سنایا تو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے۔ ”بایزید تو میں ہوں۔ تم نے جس بایزید کو دیکھا ہے، وہ کوئی اور تھا۔“

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید خاص اور ”فوائد الفود“ کے مؤلف حضرت خواجہ امیر حسن بختیاریؒ فرماتا ہے کہ جب میں نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ”سجانی“ سنا تو بہت تردد ہوا۔ پھر میں نے حضرت مجرب کی خدمت میں اپنا تردد پیش کیا تو پیر و مرشد نے فرمایا۔

”حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر سجانی کہہ دیا تھا لیکن آخری عمر میں توبہ کر لی تھی اور فرمان میں نے یہ کوئی بھی بات نہیں کہی تھی۔ میں مجوسی ہو گیا تھا۔ اب زار توڑتا ہوں اور از سر نو اسلام کے حلقے میں ہوتا ہوں۔ تجدید ایمان کرتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں..... اور اس کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے رسول ہیں۔“

بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات سکر مستی کے غلبے میں کہی ہوگی۔ اور اس حالت میں کوئی بات قابل گرفت نہیں ہوتی۔ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں۔

”مشائخ صوفیاء کو کبھی فنا اور سکر کی ایسی کیفیات حاصل ہوتی ہیں کہ ایسی حالت کے دوران ان میں عقل و تمیز باقی نہیں رہتی۔ اکثر ایسی حالت میں ان کی زبان سے ایسے کلمات بھی ادا ہو جاتے ہیں جو ہوش میں آنے کے بعد انہیں صریحاً غلط معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ بایزید بسطامی، شیخ ابوالحسن نورانی اور شیخ ابوبکر کو یہ چیزیں پیش آئیں۔“

مشائخ کرام اور علمائے تحقیق نے اس واقعے کی تادیل پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات اپنے بارے میں نہیں کہی تھی بلکہ حق تعالیٰ کا قول دہرایا تھا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی درجات، تواضع اور شریعت کی پابندی کو دیکھتے ہوئے یہی توجیہہ درست نظر آتی ہے۔

شیخ اشونخ حضرت شہاب الدین عمر سہروردی اپنی تصنیف ”عوارف المعارف“ میں تحریر کرتے ہیں۔ ”ہم حضرت شیخ بایزید بسطامی کے بارے میں یہ تصور نہیں کر سکتے کہ اس قسم کے الفاظ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہوں گے بجز اس کے کہ حضرت شیخ نے اللہ کا قول دہرایا ہو۔“

کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے۔ ”سبانی من اعظم شائی“ (میرے اللہ کی ذات پاک کہ جس نے میری شان کو بڑھایا ہے)

بزرگوں کی اس جماعت کا خیال ہے کہ جو لوگ اس وقت موجود تھے، ان سے سننے میں غلطی ہوئی۔ جس سے منہموم بدل گیا اور بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔

طبقات کبریٰ میں حضرت امام عبدالوہاب شہرائی فرماتے ہیں۔ ”کسی نے حضرت شیخ ابوعلی جوزجانی سے پوچھا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی کیا حقیقت ہے؟

جواب میں حضرت ابوعلی جوزجانی نے فرمایا۔ ”ہم حضرت بایزید بسطامی کے صاحبِ حال ہونے کو تسلیم کرتے ہیں اور شاید حضرت شیخ نے سکر کے انتہائی غلبے کی حالت میں وہ الفاظ کہے ہوں۔ جو شخص حضرت بایزید کے مقام سے باخبر ہو نا چاہے، اسے حضرت بایزید جیسا مجاہدہ کرنا چاہئے۔ پھر وہ ان کے کلام کو سمجھ سکتا ہے۔“

واضح رہے کہ حضرت بایزید کا کلام بڑے بڑے علماء کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس لئے آپ پر مختلف اوقات میں کفر کے فتوے عائد کئے گئے اور حضرت بایزید کو سات بار بسطام سے نکالا گیا۔ اس بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ مخالفین نے یا پھر کسی نادان عقیدت مند نے ”قول سبانی“ کو حضرت بایزید بسطامی کے نام سے منسوب کر دیا۔

اپنی تصنیف ”نعمات الانس“ میں حضرت مولانا عبدالرحمن جامی تحریر کرتے ہیں۔ ”شیخ الاسلام حضرت مولانا عبداللہ انصاری فرمایا کرتے تھے کہ حضرت بایزید پر لوگوں نے بہت بہتان (جھوٹ) باندھے ہیں۔“ اس لئے مگمان غالب ہے کہ ”قول سبانی“ بھی ایک بہتان سے زیادہ کچھ نہیں۔



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اس عالم فانی میں 74 سال رہے۔ ایک دن کسی نے پوچھا۔ ”شیخ! آپ کی عمر مبارک کیا ہے؟“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”چار سال۔“

سوال کرنے والے کو شدید حیرت ہوئی۔ ”اور باقی عمر کا حساب کس طرح ہوگا؟“
حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میرے ستر سال تو حجاب میں گزرے ہمارے یہاں حجاب کے سال، عمر میں شمار نہیں کئے جاتے۔ اب چار سال ہونے کو ہیں کہ مشاہدہ حق سے ہوں۔ اس لئے ان چار سالوں کو اپنی عمر میں شمار کرتا ہوں۔“
حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ معرفت میں ”سکوت اور نعرہ زنی“ کا فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”کوئی مرید نعرے مارتا ہے اور آوازیں بلند کرتا ہے تو وہ پانی کے حوض کے مانند ہوتا ہے..... اور جب خاموش موتیوں سے بھر پور دریا ہوتا ہے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بچ کے ایک نوجوان کے سوا مجھے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بار حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ حج کے لئے تشریف لئے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک نوجوان بھی آپ کا ہم سفر ہو گیا۔ پھر کسی موقع پر اس نوجوان نے حضرت بایزید سے پوچھا۔ ”شیخ! آپ کے نزدیک زہد (پرہیز گاری) کی تعریف کیا ہے؟“
”ہمیں جو کچھ ملتا ہے، اسے شکر کے ساتھ کھا لیتے ہیں اور اگر نہیں ملتا تو صبر کر لیتے ہیں۔“ حضرت بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا

حضرت شیخ کی بات سن کر نوجوان نے کہا۔ ”اس میں انسان کا کیا کمال ہے؟ یہ تو ہمارے بچ کے لئے لیتے ہیں۔ کھانے کو مل جائے تو کھا لیتے ہیں اور اگر نہیں ملتا تو خاموش پڑے رہتے ہیں۔“
حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حیران ہو کر اس نوجوان سے پوچھا۔ ”تو پھر تمہارے نزدیک زہد کیا ہے؟“
نوجوان نے نہایت پرسوز لہجے میں کہا۔ ”جب ہمیں نہیں ملتا تو شکر ادا کرتے ہیں اور اگر کچھ مل جاتا ہے کرتے ہیں اور دوسرے ضرورت مندوں کو دے دیتے ہیں۔“
حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے۔ ”بچ کے اس نوجوان نے مجھے دے دی۔“

دراصل یہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا انکسار بھی تھا اور فراخ دلی بھی۔ کبھی آپ ایک کتے سے درکار حاصل کرتے تھے۔ اور کبھی ایک نوجوان کے بارے میں فرماتے تھے کہ میں نے اس سے زہد کا مفہوم سیکھا۔ کبھی ایک بوڑھی عورت کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ میری مرشد ہے۔ الغرض آپ نے دنیا کی حقیر ترین شے چشمِ عبرت سے دیکھا۔ معمولی باتوں سے بھی سبق حاصل کیا۔ یہاں تک کہ آپ سالکوں کے استاد بن گئے۔ عارفوں کے سلطان قرار پائے۔



حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو سب کھانے کی بہت خواہش تھی۔ ایک بار آپ کا کوئی عقیدت مند سب حاضر ہوا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام سب حاضرین میں تقسیم کر دیئے۔ کسی خدمت گار نے عرض کیا۔ ”شیخ! آپ تو سب کھانے کی خواہش مند تھے۔ جب حق تعالیٰ نے آپ کے پسندیدہ پھل کا انتظام کرنا آپ نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“
”خواہش تو اب بھی موجود ہے، مگر میں اپنی اس خواہش کو نفس پر غالب نہیں آنے دوں گا۔“ حضرت بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اگر خواہش، نفس پر غالب آجائے تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔“

ایک اور موقع پر کسی عقیدت مند نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو بہت عمدہ قسم کا سیب پیش کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کچھ دیر تک سیب کو ہاتھ میں لے کر دیکھتے رہے، پھر آپ نے فرمایا۔ ”یہ بہت لطیف ہے۔“
 جیسے ہی آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، ایک غیبی صدا سنائی دی۔ ”سیب کے لئے ہمارا نام استعمال کرتے ہوئے تمہیں حیا نہیں آئی۔“

واقعہ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام ”لطیف“ بھی ہے۔ اس واقعے کے بعد حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی بھر کسی قسم کا پھل نہیں کھایا۔ یہ ضبط نفس اور ریاضت و مجاہدہ کی ایک عجیب مثال ہے۔
 حضرت امیر خسرو کی تالیف ”افضل“ کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے تھے۔ ”کسی شخص نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ اس قدر سخت مجاہدے کیوں کرتے ہیں؟ جواب میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”یہ مجاہدے میں اس لئے کرتا ہوں کہ لوگ مجھے مسلمان سمجھتے ہیں۔ اور جب میں مسلمان ہوں تو مجھے مسلمان کا حق ادا کرنا چاہئے۔“



پھر جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر مبارک 74 سال کے قریب ہوئی تو ایک دن آپ نے عجیب و غریب انداز میں توبہ کی۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ توبہ صوفیائے کرام کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

”تذکرۃ الاولیاء“ میں حضرت شیخ فرید الدین عطار فرماتے ہیں۔ ”حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ستر مرتبہ بارگاہِ خداوندی میں قرب کا شرف حاصل کیا..... مگر ہر بار جب واپس آتے، اپنی پشت پر زنا رو دیکھتے..... اور گھبرا کر اس زنا رو کو توڑ دیتے۔“

(زنا رو اصل کفر و شرک کی علامت ہے۔ ہندو اپنے گلے میں ایک موٹا دھاگا ڈالتے ہیں۔ وہ دھاگا گردن اور پشت سے ہوتا ہوا پیٹ تک آتا ہے۔ ہندی زبان میں اس دھکے کو ”جینو“ اور فارسی میں ”زنا“ کہتے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے زنا رو دیکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ ابھی ان کے ایمان میں کچھ کمی تھی۔

حضرت شیخ فرید الدین عطار تحریر کرتے ہیں کہ جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے آخری دن آئے تو ایک روز آپ محراب میں اس طرح داخل ہوئے کہ پشت پر زنا تھا اور پوستیں پہنے ہوئے تھے۔ پھر آپ نے اپنی کلاہ سر پر رکھی اور بڑے دردناک لہجے میں مناجات کرنے لگے۔

”اے میرے اللہ! میں تیری بارگاہِ کرم میں زندگی بھر کی ریاضتوں کا حوالہ دینے کے لئے حاضر نہیں ہوا ہوں.... میں تیرے حضور میں ساری عمر کے روزوں کا ذکر بھی نہیں کرتا..... اپنی ان نمازوں کو بھی پیش نہیں کرتا، جو میں نے تیرے لئے ادا کیں..... ختم قرآن کا ذکر بھی اپنی زبان پر نہیں لاتا..... مناجات اور تقرب کے ان اوقات کو بھی یاد نہیں دلاتا جو مجھے تیرے کرم سے نصیب ہوئے..... میں اپنے ہر عمل کی نفی کرتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھ سے عبادت کا حق انادیں ہو سکا۔ آج میرے نامہ اعمال میں ندامت اور شرمساری کے سوا کچھ نہیں۔ تیرے بندوں نے مجھے خلعتِ تصوف پہنا دی مگر میں اس پر بھی نازاں نہیں ہوں۔ یہ اعزاز و القاب میرے کسی کام نہیں آئے۔ میرے مولا! تو خوب جانتا ہے کہ میری زندگی کے ستر سال کہاں بسر ہوئے ہیں۔ میں نے آتش پرستی میں اپنے بال سفید کئے ہیں۔ ابھی ابھی میں نے اس زنا رو کو توڑ کر پھینکا ہے جو مجھے زندگی بھر پریشان کرتا رہا۔ میں نے آج ہی حلقہ اسلام میں قدم رکھا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک اور صرف ایک ہے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے

اور رسول ہیں۔“

پھر آپ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔ ”اے تمام جہانوں کے پالنے والے! تیری بخشش اسباب پر منحصر نہیں۔ تیرے دربار میں مقبولیت محض طاعت و زہد کی بنیاد پر نہیں۔ اسی طرح تیرا کسی کو دیکھنا گناہوں پر موقوف نہیں..... اے میرے معبود! میں نے جو کچھ نیکیاں کی ہیں، انہیں فراموش کئے دیتا ہوں۔ میرے ان اعمال پر خط غلو پھیر دے جو تجھے ناپسند ہیں اور تیری بارگاہ میں پیش کئے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ خالق ارض و سما! میں نے دل و دماغ سے غرور، زہد و ریاضت کی گرد و دھواں ڈالی ہے۔ تُو بھی اپنی رحمت بے کلام میرے جسم اور روح سے معصیت کے غبار کو صاف کر دے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کم سنی کے دور میں بہت زیادہ ”اللہ اللہ“ کیا کرتے تھے۔ پھر وہ وقت ذات ”اللہ“ نے آپ کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا۔ ہر شے گم ہو گئی اور بس ذکر الہی باقی رہ گیا۔ آخری لمحات میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بار بار عرض کیا کرتے تھے۔ ”اے میرے اللہ! میں نے تُو نہیں کیا مگر بھول بھول کر..... اسی طرح میں تیری عبادت بھی نہ کر سکا مگر وقفوں کے بعد..... اب جگر جان تیرے سپرد کر رہا ہوں، میری غفلت کا وہی عالم ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں تیری بارگاہ میں کس طرح ہو سکوں گا۔“

پھر سلطان العارفين، اللہ اللہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ”روز الست“ میں دیگر اہل ریحوں کی طرح حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی روح نے بھی خلاق عالم کے سامنے یہی عہد کیا تھا۔ ”بہا میرا رب ہے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے 15 شعبان 261ھ کو اپنا عہد وفا کر دیا۔ بعض مؤرخین نے 234ھ اور کو حضرت شیخ کا سال وفات قرار دیا ہے مگر یہ روایات درست نہیں۔ 261ھ پر اکثر محققین کا اتفاق ہے۔



جب آپ کے انتقال کی خبر عام ہوئی تو بسطام کے لوگ روتے ہوئے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ جن کو بے عقلی اور تنگ نظری کے باعث سات بار شہر بدر کیا گیا، آج اُس کے جنازے میں بے شمار انسان شریک اور بسطام کے درو دیوار شور و ماتم سے گونج رہے تھے۔

حضرت شیخ ابو موسیٰ، حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص بھی تھے اور بھتیجے بھی۔ وصال حضرت ابو موسیٰ بسطام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ جس رات حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، حضرت ابو موسیٰ نے خواب میں دیکھا کہ وہ سر پر عرش کو اٹھائے چل رہے ہیں۔ خواب کی ہیئت سے حضرت کی آنکھ کھل گئی اور آپ فوراً ہی بسطام کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ پیرومرشد سے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کر سکیں۔ پھر جب شیخ ابو موسیٰ بسطام پہنچے تو ایک حشر سا برپا تھا۔ لوگ دیوانہ وار رو رہے تھے اور حضرت بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ حضرت شیخ ابو موسیٰ پر قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ پیرومرشد کی میت کو کاندھا دینا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر شیخ موسیٰ صفوں کو چیرتے ہوئے کی نہ کہ جنازے کی چارپائی کے نیچے پہنچ گئے اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کو اپنے سر پر اٹھالیا۔ پھر جب آفتاب معرفت زیر خاک روپوش ہو گیا تو شیخ ابو موسیٰ کو اپنا خواب یاد آیا۔ خواب میں عرش یہی تھی کہ شیخ ابو موسیٰ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کو سر پر اٹھا کر قبرستان تک پہنچائیں گے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے آبائی وطن بسطام میں محو خواب ہیں۔ یہ خطہ زمین ”گورستان طیفور“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں بڑے بڑے صوفیائے کرام انتہائی عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی روح پر فتوح کو ایصالِ ثواب کرتے ہیں۔ ساڑھے گیارہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اہل نظر کو محسوس ہوتا ہے کہ اس جگہ ایک جاں سوختہ عشقِ الہی آسودہ خاک ہے اور خاک میں عشق کی وہی تاثیر ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مبارک پر ایک قبہ (گنبد) موجود ہے جسے فنِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ قبہ اظہارِ عقیدت کے طور پر تاتاری حکمران الچاقتو نے 700ھ میں تعمیر کرایا تھا۔

ہر زمانے کے مشائخِ صوفیاء نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ کسی شخص نے حضرت جنید بغدادیؒ سے حضرت بایزیدؒ کے مقامِ معرفت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔

”صوفیاء میں شیخ بایزیدؒ کا وہی مقام ہے جو ملائکہ میں حضرت جبریل امینؑ کا۔“

علامہ اقبالؒ بھی اپنے ایک نعتیہ شعر میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو اسی طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب



حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان اولیائے کرام میں ہوتا ہے، جو حقیقتاً تصوف اور درویشی ہیں۔ آپ کے والد محترم شیخ ادہم نیک سیرت ہونے کے ساتھ ساتھ بلخ کے بادشاہ بھی تھے۔ حضرت 179ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔

آپ کی پیدائش پر ایسا جشن منایا گیا کہ اس سے پہلے بلخ کی پوری تاریخ میں ایسی یادگار تقریب کم کی گئی تھی۔ رسم زمانہ کے مطابق حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے ضروری مذہبی تعلیم کے ساتھ فنونِ سپاہ خصوصی مہارت حاصل کی۔ آپ کا شمار اپنے وقت کے بہترین شہسواروں، شمشیر زنوں اور تیر اندازوں میں نہایت وجہہ و شکل انسان تھے۔ جب قیمتی قبا پہن کر اپنی سلطنت کی شاہراہوں سے گزرتے تو دیکھنے والوں لگ جاتی۔ اور جب دلی عہد کی حیثیت سے دربار میں داخل ہوتے تو حاضرین دربار پر آپ کا پُر جلال اور ایک عجیب سارعب طاری ہو جاتا۔

کسی تذکرہ نگار نے معتبر حوالوں کے ساتھ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات تحریر نہیں کی۔ لے آپ کے بیشتر حالاتِ زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ آپ نے ولی عہدی کا دور کس طرح شیخ ادہم کا انتقال کب ہوا؟ اور حضرت ابراہیم نے سلطنت کی ذمے داریاں کب سنبھالیں۔ بس تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ والد محترم کے انتقال کے بعد آپ تخت نشین ہوئے اور نہایت کروفر اور شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔ اگرچہ کسی مستند کتاب سے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے طرزِ حکومت کی نشان دہی ہوتی، لیکن یہ امر طے شدہ ہے کہ دوسرے بادشاہوں کی طرح آپ کیف و نشاط، رقص و سرود اور دیگر لہو لہو کاموں میں ملوث نہیں تھے۔ پھر بھی سیر و شکار کے بہت زیادہ شوقین تھے۔



حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے قصر شاہی سے نکل کر درویشی اور قلندری کے کوچہ ملامت میں داخل ہوئے۔ واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ ایک رات شدید گرمی کے باعث آپ اپنے محل کی چھت پر چھلی ہوا میں بخواب گئے نصف شب کے قریب اچانک آنکھ کھلی تو ایک اجنبی شخص بڑے بے نیازانہ انداز میں چھت پر ٹہل رہا تھا۔ ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ گھبرا کر اٹھے اور اجنبی شخص کے قریب جا کر غضب ناک لہجے میں بولے۔

”تو کون ہے؟“

”مجھے دکھ کر تمہیں اتنی حیرت کیوں ہوئی؟ میں کوئی درندہ یا چوپایہ نہیں، تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں۔“
اجنبی شخص نے نہایت مطمئن لہجے میں کہا۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو اجنبی کے لب و لہجے کی استقامت اور بے تکلفی پر شدید حیرت ہوئی جس کے نتیجے میں آپ کا غصہ اور بڑھ گیا۔ ”میں پوچھتا ہوں کہ سینکڑوں پہرے داروں کی موجودگی میں تو میرے محل کی چھت پر کس طرح آیا؟“

اس سوال کے جواب میں اجنبی شخص کی ہلکی سی ہنسی ابھری۔ پھر اس نے اور بھی زیادہ مطمئن لہجے میں کہا۔ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ میں تو صرف چند پہرے داروں کی موجودگی میں چھت پر آیا ہوں اور تم لاکھوں انسانوں کے ہوتے ہوئے رنج کے تحت پر اکیلے بیٹھ گئے۔ جس ذات نے تمہیں بادشاہ بنایا ہے، اُسی نے مجھے قصر شاہی کی چھت پر بھیجا ہے۔“

اجنبی شخص کا جواب سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا غصہ تو زائل ہو گیا مگر حیرت و استعجاب میں شدت آگئی۔ پھر آپ نے اس سے پوچھا۔

”مگر تو رات کے اندھیرے میں یہاں کیا کرنے آیا ہے؟ یہ وہ وقت ہے کہ جب چور ہی دوسرے کے گھروں میں داخل ہوتے ہیں۔“

اجنبی شخص ایک بار پھر ہنسا۔ ”اگر چور ہوتا تو خزانے کی طرف جاتا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ میرا اونٹ کھو گیا ہے۔ بس اُسی کو تلاش کر رہا ہوں۔“

اجنبی کی بات سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ایک بار پھر غضب ناک ہو گئے۔ ”اتحق انسان! ایک اونٹ، فلک بوس محل کی چھت پر کس طرح چڑھ سکتا ہے؟“

”ابراہیم! جب ایک اونٹ اتنے اونچے محل کی چھت پر نہیں آ سکتا تو پھر زربفت اور کم خواب کا لباس پہن کر ریشمی بستر پر غفلت کی نیند سونے والے کو خدا کس طرح مل سکتا ہے؟ نہ میں اتحق و نادان ہوں اور نہ چور..... بس تمہارا ہمدرد اور حقیقی دوست ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اجنبی شخص چھت کی دیوار کی طرف بڑھا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ بھی تیز قدموں سے اس کی طرف چلے۔

اجنبی شخص نے دیوار پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً اپنے خدمت گاروں کو آواز دی۔ محافظ دستے کے سپاہی گھبرا کر دوڑے۔

”ابھی ایک شخص دیوار سے نیچے کودا ہے۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خدام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”وہ شخص یا تو مرچکا ہو یا پھر شدید زخمی ہوگا۔ وہ کسی بھی حال میں ہو، اسے اٹھا کر میرے سامنے لاؤ۔“
یہ کہہ کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ محل کی چھت سے اتر کر چھت سے اتر کر اپنی مخصوص نشست گاہ میں تشریف لے گئے اور بڑی بے چینی سے اس اجنبی شخص کی لاش یا زخمی جسم کا انتظار کرنے لگے۔

پھر جب محافظ دستے کے سپاہی واپس آئے تو ان کے چہروں پر حیرت کے آثار نمایاں تھے۔ ”ہم نے محل کی دیوار کے نیچے ایک ایک گوشہ دیکھ لیا، مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“

محافظ سپاہیوں کا جواب سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آپ نے محل کے بیرونی حصے کے پہرے داروں کو طلب کر کے پوچھا۔ ”کیا تم لوگ سو رہے تھے کہ تمہاری موجودگی میں ایک شخص محل کی چھت پر چڑھ گیا؟“ حضرت ابراہیم کا لہجہ سخت تھا۔

محل کے صدر دروازے اور بیرونی حصے کے پہرے دار اپنے بادشاہ کا برہم لہجہ دیکھ کر خوف زدہ ہوئے ایک محافظ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”بادشاہ خوب جانتے ہیں کہ یہ غلام حق نمک کس طرح ادا کرتے ہیں۔ ہم میں سے کسی ایک شخص کو ان کے لئے نیند آسکتی ہے، مگر ایک ہی وقت میں تمام خدمت گاروں کو اتنی گہری نیند نہیں آسکتی کہ کوئی چور ان کو بچہ دیوار پر چڑھ کر اندر داخل ہو جائے۔“

محل کے محافظ کی پیش کردہ دلیل میں بہت وزن تھا۔ اس لئے آپ نے محل کے محافظوں سے کوئی اور سوال کیا، بس ہاتھ کے اشارے سے انہیں چلے جانے کا حکم دیا۔ پھر جب بلخ کے بادشاہ کا کمرہ خالی ہو گیا تو اب اضطراب میں اور شدت آگئی۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے باقی وقت میں سونے کی بہت کوشش کی، مگر شخص آپ کی نیندیں اڑا کر چلا گیا تھا۔ آپ بہت دیر تک کروٹیں بدلتے رہے، پھر جب کسی طرح بھی سکیں نہیں ہو تو حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ آپ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور چہرہ مبارک پر فکر و پریشانی اور حیرت و تجسس کے آثار واضح طور پر نمایاں تھے۔ اگر کوئی شخص حضرت بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو اس حالت میں دیکھ لیتا تو یقیناً یہی سوچتا کہ آپ کسی اہم ترین مسئلے سے دوچار ہیں اور اس تلاش کرنے میں غلطیاں و پچپاں ہیں۔

آخر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی پوری رات اسی ذہنی کشمکش میں تمام ہو گئی۔ یہاں تک کہ فجر کی سنائی دینے لگی۔ خوش الحان مؤذن اس خالق کائنات کی کبریائی کا اعلان کر رہا تھا، جو اپنی ذات میں واحد ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے وضو کیا اور اپنے معبود کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ آپ نے نماز کا ظاہری ارکان ترتیب کے ساتھ ادا کئے مگر ذہنی و قلبی یکسوئی حاصل نہ ہو سکی۔ آپ جب بھی سجدے میں جاتے اجنبی انسان کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی۔

”ابراہیم! جب کوئی اونٹ اس چھت پر نہیں آسکتا تو زربفت اور کم خواب کا لباس پہن کر ریشمی ہنجر والے انسان کو خدا کس طرح مل سکتا ہے؟“

پھر صبح ہو گئی اور حسب دستور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ دربار تشریف لے گئے اور وزیروں کی زبانوں سے متعلق مختلف مسائل سنتے رہے اور احکام جاری کرتے رہے۔ مگر حاضرین دربار نے پوری شدت کے ساتھ بات محسوس کر لی کہ بلخ کا بادشاہ خلاف معمول پریشان نظر آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے چہرہ رعب و جلال ظاہر ہو رہا تھا اور نہ لہجے سے شاہانہ لمطراق۔ آخر وزیر اعظم نے بلخ کے بادشاہ سے یہ سوال کر ہی ڈالا۔

”نصیب دشمنان آج حضور کی طبیعت کچھ نامساز معلوم ہو رہی ہے۔ حکم ہو تو شاہی طبیب کو حاضر کیا جائے۔“ دراصل واقعہ یہ تھا کہ حکومتی احکام جاری کرنے کے دوران حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کچھ دیر کے اچانک کھو سے جاتے تھے اور اس کی وجہ وہی اجنبی انسان تھا، جو گزشتہ رات آپ کے محل کی چھت پر اپنا اونٹ کر رہا تھا۔ اندھیرا ہونے کے باعث حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھوں میں اس شخص کے خدو خال نمودار نہیں تھے، مگر سماعت میں اس کی آواز اور گفتگو تازہ تھی۔ اسی وجہ سے آپ کی یکسوئی میں بار بار خلل واقع ہو رہا تھا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہہ کر اپنے وزیر اعظم کو ٹال دیا۔ ”رات زیادہ گرمی ہونے کے سبب نیند نہ سوسکا۔ اسی لئے طبیعت کچھ مکرر سی ہے۔“

اس کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے دربار درخواست کر دیا اور محل تشریف لے گئے۔ وہاں بھی آپ کو ذہنی سکون حاصل نہ ہو سکا۔ ملکہ اور آپ کے نو عمر بیٹے نے مزاج پُرسی کی تو حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کو گزشتہ رات نیند پوری نہ ہونے کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔

دوسرے دن حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے ذہنی انتشار میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک مہینے بعد اونٹ تلاش کرنے والا آپ کے ذہن سے مکمل طور پر محو ہو گیا اور بلخ کا بادشاہ اپنی کچھلی حالت پر لوٹ آیا۔ اہل خانہ اور امراء نے سکون کا سانس لیا۔



پھر ایک دن حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ حسبِ معمول اپنے پورے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے ساتھ تختِ شاهی پر جلوہ افروز تھے کہ یکایک ایک اجنبی شخص دربار میں داخل ہوا اور کسی تھجک کے بغیر تیز قدموں سے چلتا ہوا حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے قریب پہنچ گیا۔ تمام وزراء، امراء اور درباری اس شخص کی بے تکلفانہ آمد پر اور سارے آدابِ شاهی بالائے طاق رکھ کر بلخ کے حکمران کے نزدیک پہنچ جانے پر شدید حیرت میں مبتلا تھے اور کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس اجنبی شخص کو اس گستاخانہ حرکت پر ٹوک سکے۔ ہر شخص کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا جسم مفلوج ہو چکا ہے اور زبان گنگ ہو کر رہ گئی ہے۔

آخر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ہی کو اس اجنبی شخص سے باز پرس کرنی پڑی۔ ”تُو مجھ تک کیسے پہنچا؟ اور تجھے میرے پہرے داروں نے دربار میں کس طرح داخل ہونے دیا؟“

آنے والے اجنبی شخص کا لباس بہت سادہ تھا، مگر چہرے سے ایک خاص روشنی جھلک رہی تھی۔

”اپنے پہرے داروں کی بات نہ کرو۔ وہ مجھے دربار میں داخل ہونے سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے۔“ اجنبی شخص نے بے نیاز لہجے میں کہا۔

”تُو کون ہے؟ اور یہاں کیوں آیا ہے؟“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے لہجے سے آمرانہ جاہ و جلال ظاہر ہو رہا تھا۔

”میرا مختصر تعارف یہ ہے کہ میں ایک مسافر ہوں اور کچھ دن آپ کی سرانے میں قیام کرنا چاہتا ہوں۔“ اجنبی شخص نے ایک باوقار مسکراہٹ کے ساتھ دربارِ بلخ کے خوبصورت درودیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اجنبی شخص کا یہ طرزِ کلام دیکھ کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ غضب ناک ہو گئے۔ ”یہ عالیشان دربار تجھے کوئی سرانے نظر آرہا ہے؟“

اجنبی شخص کی آمد اور اس کے اندازِ گفتگو پر تمام درباری بھی حیرت زدہ تھے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے سوال کے جواب میں اس اجنبی شخص کی پُر جلال آواز اُبھری۔ ”آپ کو اس قدر ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہایت مہربان سکون کے ساتھ میرا ہر سوال سنیں اور اس کا منطقی جواب دیں۔“ یہ کہہ کر وہ اجنبی شخص چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

یہ منظر دیکھ کر حاضرین دربار پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی کہ ایک معمولی انسان شاہِ بلخ سے کس انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا اور اس اجنبی سے کہا۔

”تُو کیا پوچھنا چاہتا ہے؟..... اپنا مدعا بیان کر۔“ انتہائی ضبط کے باوجود حضرت ابراہیم بن ادہمؒ سے تلخی و ناگواری جھلک رہی تھی۔

”تم سے پہلے یہاں کون رہتا تھا؟“ اجنبی شخص نے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کو ایک عام نام مخاطب کیا۔

”مجھ سے پہلے یہ دربار اسی طرح موجود تھا اور آج میں جس تخت پر بیٹھا ہوں، اس پر میرے دادا افروز ہوا کرتے تھے۔“ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کے لہجے سے شاہانہ غرور جھلک رہا تھا۔

”آج کل تمہارے باپ کہاں رہتے ہیں؟“ اجنبی شخص کے گفتگو کرنے کا وہی انداز تھا، جیسے دو کئی سے بات کر رہا ہو۔

”میرے والد محترم کا انتقال ہو گیا۔“ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کے لہجے سے وہی ناگواری جھلک رہی تھی۔

”میرے سوال کا صحیح اور مکمل جواب دیں۔“ اجنبی شخص کے لہجے میں وہی بے نیازی تھی۔

”انتقال کے بارے میں نہیں، ان کے قیام کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا غصہ دوبارہ لوٹ آیا۔ ”اے شخص! تُو مجھے پاگل نظر آتا ہے۔ تجھے معلوم کہ مرنے کے بعد انسان کہاں رہتا ہے؟“

یہ کہہ کر حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے اپنے امراء اور وزراء کی طرف دیکھا اور انتہائی غضبناک حکم دیا۔ ”اس دیوانے کو باہر نکال دو، جو میرا قیمتی وقت برباد کر رہا ہے۔“

شاہِ بلخ کا حکم سنتے ہی تمام وزیروں، امیروں اور دوسرے درباریوں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکے اور انہیں یوں محسوس ہوا، جیسے ان کے جسم پتھر کے ہو گئے ہوں۔

اجنبی شخص نے شاہِ بلخ کے اس حکم کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور اسی بے باکی کے ساتھ دوبارہ مخاطب ہوا۔

”جس طرح تمہارے مسلح سپاہی مجھے اندر آنے سے نہ روک سکے، اسی طرح تمہارے یہ وزیر و امراء نکالنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بس میرے کچھ سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دے دو، پھر میں خودی چلا جاؤں۔“

اجنبی کی بات سن کر حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا سارا غیظ و غضب ختم ہو گیا اور چہرے پر خوف ہلکے سائے لرزنے لگے۔ پھر آپ نے بہت مدہم لہجے میں اجنبی شخص کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میرے والد محترم شیخ ادہمؒ آج کل قبرستان میں رہتے ہیں۔“

”قبرستان میں اُن کا قیام کب تک رہے گا؟“ اجنبی نے دوسرا سوال کیا۔

”جب تک کہ شر برپا نہیں ہو جاتا اور تمام مُردے اپنی اپنی قبروں سے نکال نہیں لئے جاتے۔“ حضرت بن ادہمؒ نے کسی قدر سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اجنبی شخص کی آمد اور اس کے طرزِ عمل نے شاہِ بلخ کا جلال چند لمحوں میں زائل کر دیا تھا۔

”تمہارے باپ سے پہلے یہاں کون رہتا تھا؟ اور اب وہ شخص کہاں رہتا ہے؟“ اجنبی شخص نے کہا۔

”والد محترم سے پہلے میرے دادا معظم یہاں رہتے تھے۔ اور آج کل ان کا بھرا بھرا قبرستان ہے۔“ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے اسی طرح جواب دیا۔ اب آپ کی آواز سے ہلکی سی لرزش بھی نمایاں تھی۔

پھر وہ اجنبی شخص کئی پشتوں کے حوالے سے یہی سوال کرتا رہا اور حضرت ابراہیم بن ادہمؒ اسی طرح

دیتے رہے۔ آخر میں اس شخص نے شاہِ بلخ سے سوال کیا۔

”اپنے بزرگوں کی طرح ایک دن تم بھی ”شہرِ خوشاں“ میں چلے جاؤ گے۔ پھر تمہارے بعد یہاں کون قیام کرے گا؟“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اس اجنبی شخص کی پراسرار گفتگو سے بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ اس لئے آپ نے انتہائی شکستہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میرے بعد میرا بیٹا یہاں رہے گا۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سن کر پہلی بار اس اجنبی شخص کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھرا اور اس نے نہایت نرم و شیریں لہجے میں کہا۔

”میرے بھائی! اسرائائے میں بھی تو یہی ہوتا ہے۔ وہاں کوئی مسافر بس ایک رات ٹھہرتا ہے اور کوئی چند راتیں... پھر مرجھ جاتا ہے۔ سب کے سب اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ جب تمہارے باپ، دادا، پردادا یہاں سے چلے گئے تو پھر تم میری بات کا برا کیوں مانتے ہو اور اپنے اس عالیشان محل کو ”سرائے“ کیوں نہیں سمجھتے؟“ یہ کہہ کر وہ اجنبی شخص مڑا اور تیز قدموں سے واپس جانے لگا۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ گھبرا کر اپنے تخت سے نیچے اتر آئے اور اونچی آواز میں اجنبی شخص سے رُک جانے کے لئے درخواست کرنے لگے۔ مگر اس شخص نے ایک لمحے کے لئے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا اور دربار کے صدر دروازے سے نکل کر باہر چلا گیا۔

اپنے بادشاہ کو ایسا وہ دیکھ کر تمام درباری بھی اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے تھے اور بدحواس نظر آ رہے تھے۔ پھر جب حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے بار بار پکارنے کے باوجود وہ اجنبی شخص نہیں ٹھہرا تو آپ خود اس کے پیچھے بھاگے۔ مجبوراً تمام امیروں، وزیروں اور درباریوں کو بھی اپنے بادشاہ کے تعاقب میں بھاگنا پڑا۔ عجیب منظر تھا۔ پورے قلعے اور محل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ شاہِ بلخ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ایک معمولی انسان کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور آپ کے پیچھے تمام اراکینِ سلطنت اور سپاہی دوڑ رہے تھے۔ درباری امراء کے علاوہ کسی کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ معمولی انسان کون ہے؟ اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اس کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہیں؟ یہ بڑی عجیب اور حیران کن صورت حال تھی کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ پوری طاقت سے دوڑ رہے تھے اور وہ اجنبی شخص عام رفتار سے چل رہا تھا، مگر پھر بھی شاہِ بلخ کی پہنچ سے دُور تھا۔ آخر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

”اے شخص! تجھے خدا کا واسطہ، بس چند لمحوں کے لئے ٹھہر جا اور میری صرف ایک بات سن لے۔“

شاہِ بلخ کی التجا اتنی شدید تھی کہ اس اجنبی شخص کو ٹھہر جانا پڑا۔ پھر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے انکسار کے لہجے میں سوال کیا۔

”میرے عزیز! تمہیں تو چلے ہی جانا ہے۔ مگر کم سے کم اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔“

اجنبی شخص نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میرا نام پوچھنے سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جس کام کے لئے دنیا میں آئے ہو، اسے تیزی سے تکمیل تک پہنچاؤ۔ ورنہ وہ وقت بہت قریب ہے، جب تم بھی اپنے باپ دادا کے پاس چلے جاؤ گے۔ پھر تمہیں مہلت نہیں ملے گی۔“

”یقیناً تم کوئی عام انسان نہیں ہو۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔
میرے سپاہیوں کی آبدار شمشیریں اور طاقتور جسم تمہیں دربار میں داخل نہیں ہونے دیتے۔“
”میری اور تمہاری ایک ملاقات پہلے بھی ہو چکی ہے۔“ اجنبی شخص نے دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ
نے اس ملاقات کو یاد نہیں رکھا تو پھر اپنا نام بتانے اور تعارف کرانے سے کیا حاصل؟“
اجنبی شخص کی بات سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ گہری سوچ میں ڈوب گئے اور اپنے ذہن
لگے کہ یہ ملاقات کہاں ہوئی ہے؟ پھر کچھ دیر بعد اپنے سر کوئی میں جنبش دیتے ہوئے کہنے لگے۔
”میں نے تمہیں اپنی یادداشت اور حافظے کے ایک ایک گوشے میں ڈھونڈ لیا، مگر وہاں اس ملاقات کا
بھی موجود نہیں ہے۔ اس لئے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں تمہیں
ہے۔“

اجنبی شخص کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ پھر اس نے نہایت محبت آمیز لہجے میں
مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
”ابراہیم! ذرا اس گرم اور اندھیری رات کو یاد کرو، جب تم اپنے عالیشان محل کی چھت پر سوتے ہو
وہاں ایک شخص اپنا اونٹ تلاش کر رہا تھا۔“
اجنبی شخص کی زبانی یہ انکشاف سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ پر شدید حیرت طاری ہو گئی۔
کے عالم میں اس شخص نے کہا۔ ”میرا نام خضر ہے۔“
جب شاہ رخ کے حیرت و استعجاب کی یہ کیفیت زائل ہوئی تو حضرت خضر علیہ السلام، حضرت ابراہیم
آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔



حضرت خضر علیہ السلام، اللہ تعالیٰ کے نبی اور برگزیدہ بندے تھے۔ آپ اپنی وسعت علم کی وجہ سے
شہرت رکھتے تھے۔ آپ کی حیات اور وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض صوفیائے کرام
معرفت آپ کی حیات جاوید کے قائل ہیں۔ یعنی حضرت خضر علیہ السلام آج بھی زندہ ہیں اور حق تعالیٰ
اس کے بھٹکے ہوئے بندوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو اور فارسی شاعری میں بارہا ”خضر
ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مرزا غالب کا یہ مشہور شعر
کیا کہا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنا کرے کوئی

علماء کے ایک گروہ کی رائے میں حضرت خضر علیہ السلام پر دوسرے انسانوں کی طرح موت طاری ہوئی
اگر وہ زندہ ہوتے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر ضرور ایمان لاتے اور سرور کوئی
رفاقت میں کفار ان قریش سے جہاد کرتے۔ اہل علم کو اس حمایت کا دعویٰ ہے کہ معتبر روایت کے مطابق خضر
علیہ السلام نہ تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور نہ کسی صحابی سے ملاقات کی۔
حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق جو روایتیں اور حکایتیں بہت زیادہ شہرت رکھتی ہیں، ان کا تعلق قرآن
کے اس واقعے سے ہے جو ”سورہ کہف“ میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے یہ روایت نقل کی ہے
دن حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے عظیم و جلیل پیغمبرؐ

کے دوران اچانک ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اے اللہ کے رسول! ہمیں بتائیے کہ مخلوق خدا میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی نمود و نمائش یا غرور و تکبر کا مظاہرہ کئے بغیر نہایت سادگی سے جواب دیا۔

”اللہ کے تمام بندوں میں سب سے بڑا عالم میں ہوں۔“

حق تعالیٰ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ بات پسند نہیں آئی اور فوری طور پر وحی نازل کی۔

”موسیٰ! مجمع البحرین کے مقام پر ہمارے ایک بندے سے ملو، جو تم سے بڑا عالم ہے۔“

حکم خداوندی سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت نادام ہوئے اور پھر آپ نے بڑے عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔

”اے میرے پروردگار! میں تیرے اس عالم بندے کو کہاں تلاش کروں؟ تو اپنے کرم سے میری رہنمائی فرما۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست سن کر آپ پر دوبارہ وحی نازل ہوئی۔

”موسیٰ! اپنی زنبیل (تھیلے) میں ایک مچھلی لے کر جاؤ۔ جس مقام پر یہ مچھلی گم ہو جائے، وہیں وہ ہمارا عالم بندہ

تمہیں کھڑا ہوا نظر آئے گا۔“

حکم خداوندی کے مطابق موسیٰ علیہ السلام اپنے ایک خدمت گار کے ساتھ روانہ ہوئے، جس کی منزل

”مجمع البحرین“ تھی۔ طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار اپنے تھیلے کا جائزہ لیا، مگر

مچھلی موجود تھی۔ پھر ایک مقام پر اچانک وہ مچھلی آپ کی زنبیل سے غائب ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک نورانی صورت بزرگ کھڑے تھے۔ اور یہی بزرگ حضرت خضر

علیہ السلام تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے عالم بندے کے لقب سے یاد فرمایا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگے بڑھ کر حضرت خضر علیہ السلام سے مصافحہ کیا اور ان کے ساتھ چلنے کی

درخواست کی تاکہ ان کے باطنی علوم سے فیض یاب ہو سکیں۔

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ہمراہ لے چلنے پر رضامندی ظاہر کی۔ مگر اس کے

ساتھ ہی یہ بھی تاکید کر دی۔ ”آپ ہر منظر اور گزرنے والے واقعے کو خاموشی سے دیکھیں گے۔ اور اس بارے میں

مجھ سے کوئی سوال نہیں کریں گے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خاموش رہنے کا وعدہ کیا اور پھر اللہ تعالیٰ کے دونوں برگزیدہ نبی ایک طرف روانہ

ہو گئے۔ حضرت خضر علیہ السلام سب سے پہلے دریا کے کنارے پہنچے اور وہاں کھڑی ہوئی ایک غریب ملاح کی کشتی

میں بہت بڑا سوراخ کر دیا۔

یہ منظر دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام خاموش نہ رہ سکے اور حضرت خضر علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

”آپ نے ایک غریب انسان کی کشتی تباہ کر دی، جس پر اس کی گزر اوقات کا انحصار تھا۔ آخر آپ نے ایسا کیوں

کیا؟“

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کا وعدہ اور اپنی شرط یاد دلائی، جس کے نتیجے میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام خاموش ہو گئے اور یہ سفر جاری رہا۔

کچھ دُور چل کر حضرت خضر علیہ السلام نے ایک نوعمر بچے کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ منظر برداشت

نہ کر سکے اور بے ساختہ پکار اٹھے۔ ”آخر اس معصوم بچے کا کیا قصور تھا، جو آپ نے اُسے زندگی جیسی نعمت سے محروم

کر دیا؟“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے استفسار اور مداخلت پر حضرت خضر علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے برگزیدہ آخری بارتیبہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب اگر آپ نے کوئی سوال کیا تو پھر ہمارے راستے مختلف ہو جائیں گے۔ پھر ایک مقام پر پہنچ کر حضرت خضر علیہ السلام نے ایک ایسی شکت دیوار کی مرمت شروع کر دی، جو گرنے والی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی مضطرب طبیعت کے باعث خاموش نہ رہ سکے اور دیوار کے ٹکڑے کی وجہ پوچھی۔ جس کے جواب میں حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے تینوں اقدامات کی توجیہ پیش کی اور موسیٰ علیہ السلام سے جدا ہو گئے۔ قرآن کریم میں حضرت خضر علیہ السلام کے حوالے سے بس ان تین واقعات موجود ہیں۔

تصوف کے سلسلے میں اکثر مقامات پر حضرت خضر علیہ السلام کی ”حیات جاوید“ اور بندگانِ خدا سے ملاقات ذکر ملتا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ ہمارے قارئین حضرت خضر علیہ السلام کی شخصیت سے واقف ہو جائیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ”کُلْ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ“ کے کلمے کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام رحمہ اللہ رخصت ہو گئے تو پھر حضرت ابراہیم بن ادہم سے دو بار ملاقات کرنے والے بزرگ کون تھے؟ اس سوال کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات کے نظام کو چلانے کے لئے فرشتوں کے علاوہ ”رجال الغیب“ بھی مقرر ہیں۔ یہ مردانِ بزرگ ہیں جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ اللہ ان برگزیدہ ہستیوں کے ذریعے جس کو دینا چاہتا ہے، اسے ہدایت مل جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم کو عجیب انداز سے نصیحت کرنے والے ”رجال الغیب“ کی جماعت ہی سے تعلق رکھتے تھے۔



ان دونوں واقعات نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ حالانکہ ملکہ ہدایت مل چکی تھی، مگر دنیا داری اور سلطنت کے ہنگاموں میں گم ہو کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ حسبِ سابق عیبی نصیحت کو آہستہ آہستہ فراموش کرتے چلے گئے۔ اور پھر بتدریج آپ کی ذہنی کشمکش اور بے قراری میں کی ہوتی چلی گئی اور ایک دن کھویا ہوا سکون واپس لوٹ آیا۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ فطرتاً سیر و شکار کی طرف بہت زیادہ رغبت رکھتے تھے۔ ایک دن آپ خدمت گار سپاہیوں کے ساتھ شکار کے لئے جنگل کی طرف گئے۔ اگرچہ اس وقت دن کا پہلا پہر تھا اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ پھر یکایک تیز آندھی آئی اور ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ کسی کو کوئی نہ رہی اور اندھیرے کے باعث حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کے تمام خدمت گار ادھر ادھر بھٹک کر بہت دور گئے۔ پھر جب آندھی کا زور ٹوٹا اور سورج دوبارہ چمکنے لگا تو حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ نے خود کو جنگل کے گوشے میں تنہا کھڑا پایا۔ ابھی آپ راستے کو سمجھتے اور اپنے خدمت گاروں کو ڈھونڈنے کے لئے ادھر ادھر نظر پڑ رہے تھے کہ ناگہاں ایک غیبی صدا اُبھری، جس سے پورا جنگل لرز کر رہ گیا۔

”ابراہیم! تمہیں دوبارہ جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی گئی، مگر تم پھر بھی نہیں جاگے۔ اب کیا اس وقت تمہارا آنکھیں کھلیں گی، جب فرشتہ اجل سانسِ غصہ کرنے کے لئے تمہارے سر ہانے کھڑا ہو گا؟“

یہ ندائے غیبی سنتے ہی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ پر ایسا لرزہ طاری ہوا، جیسے تیز ہوا میں کسی درخت کی کڑوا شاخ کا پتہ پڑے۔ کچھ روایتوں کے مطابق صدائے غیبی نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کو زیادہ متاثر نہیں کیا۔ اندھیرا چھٹتے ہی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کے سامنے سے ایک انتہائی فریبہ اور جیم ہرن گزرا۔ آپ اسے دبا

کچھ دیر کے لئے حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر آپ کی مہم جو طبیعت اور شکار کے بے پناہ شوق نے جوش مارا۔ جس کے نتیجے میں حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے تیر جوڑ کر کمان کھینچی۔ یکایک وہ ہرن خود بخود رک گیا اور مژد کر شاہ بلخ سے مخاطب ہوا۔

”ابراہیم! کیا تمہیں اس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟“

ہرن کو انسانوں کی طرح بات کرتے دیکھ کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ رک گیا۔

”خبردار ابراہیم!..... اگر مجھے مارا تو خود ہلاک ہو جاؤ گے۔“ یہ کہہ کر ہرن آگے بڑھ گیا اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ سے کمان چھوٹ گئی۔ کسی جانور کا انسان سے گفتگو کرنا خلاف عقل نہیں۔ کیونکہ سارے حیوان اور پرندے گفتگو کرتے ہیں، مگر ان کی اپنی زبانیں ہوتی ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ انسان اپنی لاعلمی کے سبب جانوروں کی زبانوں اور آوازوں کو لائسنی سمجھے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو ہدایت دینی تھی تو ایک ہرن کو وہ زبان عطا کی گئی جسے شاہ بلخ آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔

آخر ان پے در پے اور میر المعقول واقعات کے پیش آنے کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو یقین آ گیا کہ قدرت ان سے کسی اور ہی شے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ آخر آپ خاموشی کے ساتھ شہر کی طرف اکیلے ہی واپس لوٹے۔ ابھی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ آپ سے پچھڑ جانے والے خدمت گار بھی راستے میں نظر آ گئے، جو اپنے بادشاہ کے گم ہو جانے سے بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔

پھر جیسے ہی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ دکھائی دیئے، تمام خدام بے تابانہ دوڑے اور قریب پہنچ کر بیک زبان کہنے لگے۔ ”خدا کا شکر ہے کہ آپ مل گئے۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب نظروں سے اپنے خدمت گاروں کی طرف دیکھا اور نہایت اُداس لہجے میں فرمایا۔ ”میں تم لوگوں کو کہاں ملا ہوں؟ ابھی تک اکیلا بھنگ رہا ہوں۔“

خدمت گار اپنے بادشاہ کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے۔



حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ محل واپس جا کر خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ آپ کے ذہن میں عجیب سا شوز اور دل میں ایک حشر سا برپا تھا۔ کبھی محل کی چھت پر اونٹ تلاش کرنے والا شخص یاد آتا، کبھی دربار میں بغیر اجازت داخل ہونے والے انسان کی شکل نظروں کے سامنے ابھر آتی۔ کبھی جنگل میں گونجنے والی صدائے غیبی سنائی دیتی اور کبھی اس غیر معمولی جسامت رکھنے والے ہرن کی آواز کہ کیا تجھے اس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟

آخر اسی کشمکش میں کھانے کا وقت بھی گزر گیا۔ پھر جب حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کھانے کے کمرے میں تشریف نہ لائے تو آپ کی شریک حیات کو فکر لاحق ہوئی۔ پھر ملکہ بلخ نے شوہر کے کمرے میں داخل ہونا چاہا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ کئی دستکوں کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے دروازہ کھولا۔ ملکہ بلخ، شوہر کا پڑشردہ چہرہ دیکھ کر گھبرا گئیں اور نہایت ننگسارانہ لہجے میں شاہ بلخ کی مزاج پرسی کرنے لگیں۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی افسردہ لہجے میں فرمایا۔

”جنگم! میں اپنی زندگی کے سب سے نازک اور سنگین مسئلے سے دوچار ہوں۔ جب تک اس مسئلے کا حل نہیں ملے گا، اس وقت تک مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میرے مزاج کیسے ہیں۔“

”پہلے کھانا تو کھا لیجے۔ پھر انشاء اللہ ہم دونوں مل کر اس مسئلے کا حل بھی تلاش کر لیں گے۔“ مگر امیز لہجے میں شوہر کی انجھن کو زور کرنا چاہا۔

واج رہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم خاندانی بادشاہ نہیں تھے۔ آپ کے والد محترم شیخ ادہم نظر ثارک تارک الدنیا انسان تھے۔ اور اکثر اوقات جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ مگر اتفاقاً ایک دن پلخ کی شہزادی میں شکار کھیلنے کے لئے آئی۔ یکا یک شیخ ادہم کی نظر اس حسین و جمیل شہزادی پر پڑی تو ساری قلندری ہمارے کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ پھر ایسے وارفتہ ہوئے کہ جنگل چھوڑ کر چلے گئے۔ اور شہزادی کے محل کی دیوار میں پڑ گئے۔ شیخ ادہم کی حالت اتنی غیر ہو گئی کہ شہزادی کے نام کا ورد کرنے لگے۔ بار بار سرد آہ کھینچ لگتے۔ آخر شیخ ادہم کی وحشت و دیوانگی کی خبریں شاہ پلخ کے کانوں تک پہنچیں۔ نتیجتاً شاہ پلخ کے چہرے ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔

وزیروں اور امیروں نے شاہ پلخ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مزید رنگ آمیزی کرتے ہوئے ”حضور والا! ایک معمولی انسان کی وجہ سے شاہی خاندان کی عزت و ناموس کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ کی رعایا بھی سرگوشیوں میں اس واقعے کا ذکر کرنے لگی ہے۔ اس سے پہلے کہ لوگوں کی زبانیں دراز نہ ہوں پگل شخص کو قتل کر کے مکہ فتنے سے نجات حاصل کر لی جائے۔“

آخر شیخ ادہم کو تنہائی میں طلب کر کے شاہ پلخ نے پوچھا۔ ”تم اس گستاخی کی سزا جانتے ہو؟“ شیخ ادہم نے بڑے بے باکانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”عشق گستاخی نہیں، ایک ایسی سعادت ہے جو ہر طرف سے کسی کسی کو بخشی جاتی ہے۔“

شاہ پلخ نے مختلف انداز میں شیخ ادہم کو ڈرایا دھمکایا۔ مگر عشق کسی اندیشے اور خطرے کو خاطر میں نہیں نہیں پلخ کے حکمران کے کہنے پر بار بار زور دو کوب کیا گیا۔ یہاں تک کہ آپ بے ہوش ہو جاتے۔ مگر جب آپ تو آپ یہی کہتے۔

”میرا عشق سچا ہے۔ تم میرے جسم کے ٹکڑے کر دو یا مجھے آگ میں جلا دو۔ مگر میں شہزادی کے عشق کروں گا۔ تو یہ تو گناہ گار کرتے ہیں۔“

جب پلخ کی شہزادی کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ بھی شدید اضطراب کا شکار ہو گئی اور اس نے نرم دہ نبھاتے ہوئے، جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ بہت مدھم لہجے میں اپنے والدین سے کہا۔

”کوئی جھوٹا اور بد فطرت انسان کسی معاملے میں اس تسلسل کے ساتھ استقامت نہیں دکھا سکتا۔ قول کا سچا ہے اور عمل میں دیانت دار۔ میں اسے اپنے شریک سفر کی حیثیت سے قبول کرتی ہوں۔“

شیخ ادہم کے عشق کی کہانی بہت طویل اور پراسرار ہے۔ ہم نے اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف معلومات کے لئے یہ واقعہ بیان کر دیا ہے۔ نتیجتاً دونوں کی شادی ہو گئی۔ شاہ پلخ کی ایک ہی بیٹی تھی، باپ کے بعد وہی تخت کی وارث قرار پائی۔ ایک عورت کی حیثیت سے وہ حکومت کے مشکل کاموں سے عہدہ سکتی تھی، اس لئے شہزادی نے اپنے شوہر شیخ ادہم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

شیخ ادہم کے انتقال کے بعد حضرت ابراہیم تخت نشین ہوئے۔ اس طرح آپ کو ”پلخ“ کی حکمرانہ طرف سے درختے میں ملی تھی۔ ورنہ آپ کے والد محترم ایک عام انسان تھے۔

اور آج اسی سلطنت کا مسئلہ درپیش تھا۔ پھر جب شریک حیات کے بہت اصرار پر حضرت ابراہیم،

اپنی زندگی میں پیش آنے والے تینوں واقعات بیان کر دیئے تو ملکہ بلخ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو ایسا کوئی مشکل کام نہیں۔ آپ حکومت کے ساتھ ”ذکر الہی“ بھی کر سکتے ہیں۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے جواب فرمایا۔ ”ایک وقت میں دو کام نہیں ہو سکتے۔ حکومت یا معرفت؟“ ملکہ بلخ نے خلافت راشدہ اور دوسرے نیک حکمرانوں کی مثالیں پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”ان محترم حضرات نے حکومت بھی کی اور معرفت الہی بھی حاصل کی۔ دنیا میں رہے، مگر دنیا سے الگ..... آگ کے شعلوں سے گزرے، مگر دامن بچاتے ہوئے۔“

”وہ بہت بڑے لوگ تھے۔ اپنے نفس کے خلاف مسلسل جہاد کرنے والے۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کا شوہر بہت ہی کمزور انسان ہے، وہ آگ کے شعلوں کے درمیان سے دامن بچا کر نہیں گزر سکتا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو جل کر راکھ ہو جائے گا۔“

پھر تمام امراء اور وزراء نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی، مگر آپ یہی فرماتے رہے۔ ”میں اپنے دل کو خوب پہچانتا ہوں۔ اس میں اتنی صلاحیت اور طاقت نہیں کہ یہ بیک وقت دونوں امانتوں کا بوجھ اٹھا سکے۔ کسی ایک سے دستبردار ہونا ہی پڑے گا۔ اور میں بلخ کے تاج و تخت سے دستبردار ہوتا ہوں۔“

اس فیصلے کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے آخری بار اپنا دربار آراستہ کیا، تمام امراء اور وزراء کی موجودگی میں اپنے کم سن بیٹے کو تخت پر بٹھایا اور حاضرین دربار کو مخاطب کر کے ایک طویل تقریر کی۔

”میرے جانے کے بعد عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنا۔ حقیقی بادشاہ اسے کہتے ہیں، جو خود کو رعایا کا خدمت گار سمجھے۔ اور جس نے اللہ کے بندوں کو اپنا غلام سمجھا، وہ دین و دنیا دونوں میں ذلیل و رسوا ہوا۔“

اس کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بیوی سے تنہائی میں معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معاف کر دنیا کی زندگی کے اس طویل سفر میں تمہارا ساتھ نہ دے سکا۔“ پھر اپنے کم سن بیٹے کو پیار کرنے کے بعد فرمایا۔ ”اللہ تم پر دنیا اور آخر دونوں کی منزلیں آسان فرمائے۔“

اس کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک انتہائی معمولی کپڑے کا لباس پہنا، کاندھے پر ایک موٹی چادر ڈالی اور پانی کے استعمال کے لئے ایک برتن لے کر بلخ کے عالی شان محل سے رخصت ہوئے۔

وہ بڑا رقت آمیز منظر تھا، جب عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والا بلخ کا بادشاہ، پیادہ پا ایک نامعلوم منزل کی طرف جا رہا تھا۔ با کردار امراء اور خدمت گار اپنے بادشاہ کی اس حالت پر رو رہے تھے۔ مگر خود غرض اور بے ضمیر امراء بہت خوش تھے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے پیچھا چھوٹ گیا اور اب وہ آسانی کے ساتھ بلخ کے کم سن حکمران کو اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا سکیں گے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ دشمنوں اور دوستوں کے احساسات سے بے نیاز، تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ پھر بہت دُور نکل جانے کے بعد آپ ٹھہر گئے آخری بار اپنے عالی شان محل پر نظر ڈالی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث محل کے دروازے پر کھڑے ہوئے لوگ تو نظروں سے اوجھل ہو گئے، مگر قصر شاہی کی بلند دیواریں اور اونچے برج اب بھی دُھندلے دُھندلے نظر آ رہے تھے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہوں کے سامنے شہزادگی سے لے کر بادشاہی تک کے تمام مناظر گھوم گئے۔ پھر یکایک آپ کے سینے میں جذبات کا طوفان اُٹھا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔

ابھی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ماضی کی یادوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ ناگہاں وہی صدائے غیبی سنائی دی،

جسے آپ شکار کے دوران بھی سن چکے تھے۔

”ابراہیم! اب ابتدا ہی میں یہ حال ہے تو اتنا تک کیسے پہنچو گے؟“

ندائے غیبی سنتے ہی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ لرز اٹھے اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ دواگر کر یہ وزاری کے ساتھ یہ دعا مانگی۔

”اے اللہ! میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ بے شک! ہم نے آپ کا ظلم کیا ہے۔ اگر ٹوٹنے والے ہمیں معاف نہیں فرمایا اور ہم پر رحم نہیں کیا تو ہمارا شمار خسارہ پانے والوں میں یقیناً مال و زر اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔ مجھے سیدھا راستہ دکھا اور اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرما۔“

یہ دعا مانگ کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔



یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اولیائے کرام کی طویل ترین مقام پر فائز ہیں۔ آپ کے بعد آنے والے ہر دور کے صوفیائے کرام نے حضرت ابراہیم کو عظیم صوفی قرار دیا ہے۔ مگر اس سلسلے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کسی بھی زمانے کے تذکرہ نگار حالات زندگی ترتیب اور تفصیل سے بیان نہیں کئے ہیں۔ بس چند اہم واقعات ہیں، جنہیں ہر تذکرہ نگار کے اُلٹ پھیر کے ساتھ تحریر کر دیا ہے۔ ہم بھی مجبوراً ان ہی واقعات کی بنیاد پر اس عظیم و طویل خدوخال اُبھارنے کی کوشش کریں گے۔

تخت شاہی چھوڑ کر بلخ سے روانہ ہونے کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کہاں تشریف لائے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بس ایک تذکرے میں اس قدر تحریر ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فقیرانہ بعد جنگل کی راہ لی اور صحرا نوردی کرتے ہوئے آپ نیشاپور کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو یہاں ایک غار نظر آیا، جو اپنی دیرانی اور ہیبت کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت رکھتا تھا۔ آپ کی غار کے بغیر اس بھیا تک غار میں داخل ہو گئے۔ پھر تقریباً نو سال تک شدید ریاضت کرتے رہے۔ پھر جمعے کے جمعے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ غار سے باہر آئے، پھر قریبی جنگل میں جا کر لکڑیاں کاٹنے لگے۔ لکڑیوں کو نیشاپور کے بازار میں فروخت کر دیتے۔ اس کے بدلے میں آپ کو جو رقم ملتی، اس کا نصف میں تقسیم کر دیتے اور اُدھی رقم کی روٹی خرید کر جمعے کی نماز ادا فرماتے اور دوبارہ اسی غار میں داخل ہوا۔ یہ مشغول ہو جاتے۔

اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دن سخت سردی پڑی۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ بھی جم گیا۔ اگرچہ مجبوری کی حالت میں ”تیمم“ کا شرعی عذر موجود تھا مگر آپ کا دل نہیں مانا اور انہیں پانی سے وضو کیا۔ پھر نماز میں مشغول ہو گئے۔ نماز کے دوران حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو خیال وقت آگ ہوئی تو شدید سردی سے چھٹکارا مل جاتا۔ یہ ایک شیطانی دوسوہ یا نفس کا تقاضا تھا؟ علامہ ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اس خیال کو ذہن سے نکالا اور پوری یکسوئی کے ساتھ نماز ادا کرنے لگے۔ آپ کا طویل قیام کرتے تھے۔

کچھ دیر بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو یوں محسوس ہوا، جیسے کسی غیبی ہاتھ نے آپ کو

کھال) پہنادی ہے۔ جس کی وجہ سے شدید سردی کے اثرات زائل ہو گئے۔ پھر جب حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے نماز ختم کی تو آپ نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جسے پوچھ کر سمجھ رہے تھے، وہ ایک اژدھا تھا جو چادر کی طرح آپ کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے مسکراتے ہوئے اژدھے کی طرف دیکھا اور پھر بڑے کیف و جذب کے عالم میں فرمایا۔

”تیرا شکر یہ کہ تُو اپنے خالق کے حکم سے اس کے ایک بندے کی مدد کو آیا۔“
یہ سن کر اژدھے نے اپنے بل کھولے اور ریگلتا ہوا غار سے نکل گیا۔



روایت ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ چالیس سال تک مسلسل گریہ و زاری اور دشت نور دی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک بار آپ مکہ معظمہ کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت کئی بڑے بزرگ حرم شریف کی حدود میں مقیم تھے۔ کسی نہ کسی طرح ان بزرگوں کو خبر ہو گئی کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ مکہ معظمہ کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ نتیجتاً وہ تمام بزرگ حدود حرم سے نکل کر اپنے خدمت گاروں کے ساتھ آپ کا استقبال کرنے کے لئے آگے بڑھے۔

اس وقت حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ انتہائی معمولی لباس میں ایک قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ آپ کو اپنے کشف کے ذریعے یہ راز معلوم ہو گیا کہ بزرگان حرم کیا چاہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نمود و نمائش سے ہمیشہ گریزاں رہتے تھے۔ اس لئے آپ نے خود کو اس قافلے سے الگ کر لیا اور تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ بزرگان حرم کے خدمت گاروں نے آپ کے قریب آ کر پوچھا۔

”اے شخص! کیا تُو جانتا ہے کہ اس قافلے میں شیخ ابراہیم کون ہیں؟“
آپ نے ان لوگوں کی طرف حیرت سے دیکھا اور سوال کیا۔ ”آپ حضرات کو ابراہیم بن ادہم سے کیا کام ہے؟“

”حضرت ابراہیم بن ادہم شیخ زمانہ ہیں۔“ ایک خدمت گار نے نہایت عقیدت سے کہا۔ ”بزرگان حرم ان کے استقبال کے لئے تشریف لائے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس خدمت گار نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا، جہاں کچھ فاصلے پر چند نورانی چہرہ بزرگ کھڑے تھے اور آنے والے قافلے پر ان کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے شیوخ کی جماعت پر ایک نگاہ کی اور ان کے خدمت گاروں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”بزرگان حرم کو دنیا میں کوئی اور کام نہیں ہے جو وہ ایک زندیق (کافر) کے استقبال کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں؟“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ کے لئے ”زندیق“ کا لفظ سن کر تمام خدمت گاروں کے چہروں پر شدید حیرت اور ناگواری کا رنگ ابھر آیا۔ پھر ایک خادم نے انتہائی غضب ناک لہجے میں حضرت ابراہیم بن ادہم سے پوچھا۔

”تُو اُس مرد پاکباز کو کس طرح جانتا ہے؟“
خادموں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھنے کے باوجود حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”بس میں ہی تو تمہارے شیخ زمانہ، ابراہیم کو پہچانتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ اُس زندیق کو کون جانے گا؟“ ابھی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ بزرگانِ حرم کے ایک خدمت گار نے اُن کے چہرہ مبارک پر زور دار گھونسا مارا، جس کے اثر سے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا ہونٹ پھرا خون بہنے لگا۔ پھر دوسرے خدمت گار بھی آپ پر ٹوٹ پڑے اور بیک زبان چیخ چیخ کر کہنے لگے۔

”بد بخت! شیخ زمانہ کو زندیق کہتا ہے؟..... زندیق تو تو خود ہے۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ مبارک لہو لہان تھا۔ مگر آپ مسکراتے ہوئے بار بار ایک ہی جملہ دہراتے تھے۔ ”اللہ کے بندو! میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ ابراہیم زندیق ہے۔“

آخر جب وہ لوگ آپ کو مار پیٹ کر اور باگل قرار دے کر آگے بڑھ گئے تو حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پورا ہاتھ خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ پھر اسی خون آلود ہاتھ کو دیکھتے ہوئے اپنے مخاطب کر کے فرمایا۔

”ابراہیم! تو نے اپنے کئے کی سزا دیکھی؟ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے تجھے تیرے مقصد میں کامیاب نہیں دیا اور تو ”مشائخِ حرم“ کے استقبال سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔“

اس کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ”حدودِ حرم“ میں مقیم ہو گئے۔

ہمیشہ اپنی محنت سے روزی کماتے اور اسی سے اپنا اور اپنے دوستوں کا پیٹ پالتے۔

بلخ کی بادشاہت چھوڑنے کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا زہد و تقویٰ عروج کو پہنچ گیا تھا۔

اسی سلسلے میں روایت بہت زیادہ شہرت رکھتی ہے کہ آپ حدودِ حرم میں کئی سال تک مقیم رہے۔ لیکن اس دوران آپ نے کبھی ”چاہ زم زم“ سے پانی نکال کر نہیں پیا۔ جب کسی مرید نے اس بارے میں سوال کیا تو حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے بے نیازانہ لہجے میں جواب دیا۔

”چاہ زم زم سے پانی بھرنے والا ڈول شاہی خرچ سے تیار ہوتا ہے۔ اور میں شاہی کی تمام نشانیں کو فراموش کر چکا ہوں۔ مجھ میں اتنی استطاعت نہیں کہ اپنے پیسے سے ”ڈول“ خرید سکوں۔ اگر حق تعالیٰ نے میری مالی حالت درست کر دی تو اپنا ڈول تیار کروں گا اور پھر ”زم زم“ کا پانی پیوں گا۔“



حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے یہ روایت بھی بہت مشہور ہے کہ آپ مکہ معظمہ کے قیام کے دوران روزانہ محنت و مزدوری کیا کرتے تھے اور پھر اس سے حاصل کردہ رقم اپنے ساتھی درویشوں پر خرچ کر دیتے تھے۔

ایک دن آپ کو بہت تلاش کرنے کے بعد کوئی کام ملا، جسے تکمیل تک پہنچاتے پہنچاتے بہت رات ہو گئی۔ جب اس محنت کے بدلے میں پیسے ملے تو آپ نے آٹا خریدا نہ چاہا۔ اس وقت تک ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ پھر آپ نے بڑی مشکل سے ایک دکان سے آٹا خریدا اور تیز رفتاری کے ساتھ اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں درویش ساتھی آپ کا انتظار کر رہے تھے۔

پھر جب حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ قیام گاہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر آپ کو بے حد افسوس ہوا کہ تمام درویش انتظار کرتے کرتے بھوکے ہی سو گئے تھے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے جلدی جلدی آٹا گوندھا، پھر آگ جانے لگے۔ شاید لکڑیاں گیلی تھیں، اس لئے آگ پوری طرح جل نہیں پاری تھی۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ بار بار

پھونکیں مارتے، جس کی وجہ سے آنکھوں میں دھواں بھر گیا تھا اور آپ چھینکنے لگتے تھے۔ آخر ان ہی چھینکوں سے ایک درویش ساتھی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے قریب آیا۔ شاہِ بلخ کا برا حال تھا۔ آپ نے پہلی بار کھانا پکانے کی کوشش کی تھی، ورنہ اس سے پہلے بازار سے روٹی لے آتے تھے۔

”شیخ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ ساتھی درویش نے پوچھا۔
 ”میرے بھائی! تم کھانا کھائے بغیر سو گئے تھے۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”میں نے سوچا تھا کہ جب تک تم لوگ سو رہے ہو، میں اس عرصے میں تمہارے لئے کھانا تیار کر لوں۔ مگر آج اپنے ناکارہ پن کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ میں مخلوقِ خدا کے کسی کام نہیں آ سکتا۔“
 حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر وہ درویش بہت شرمندہ ہوا۔ اسی دوران آپ کے ساتھی بھی نیند سے بیدار ہو گئے تھے۔ اس درویش نے دوسرے درویشوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
 ”ہم لوگ شیخ کے بارے میں کیا خیال رکھتے تھے۔ مگر آج تم نے اپنی آنکھوں سے ان کی شفقت و محبت دیکھ لی؟“

دراصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ محنت و مزدوری کر کے جو کچھ کماتے تھے، وہ ان سب درویشوں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ اس لئے ان لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اپنی چھوڑی ہوئی بادشاہت کی یاد تازہ کرنے کی خاطر اس قسم کے مظاہرے کرتے ہیں۔ مگر آج ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے جو منظر دیکھا، وہ ان کی بدگمانیوں کی مکمل نفی کر رہا تھا۔ نتیجتاً سب درویشوں نے بیک زبان حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی بدگمانی کی معافی مانگی اور آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیتے ہوئے نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔
 ”شیخ! واقعاً آپ معرفت کے عظیم منصب پر فائز ہیں۔“

درویشوں کی بات سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم اُبھر آیا۔ ”تم سے یہ بات کس نے کہی کہ میں معرفت کے عظیم منصب تک پہنچ چکا ہوں۔ حالانکہ میرا اپنا خیال ہے کہ میں اس عظیم الشان عمارت کی پہلی سیڑھی پر کھڑا حیرت و پریشانی کے ساتھ اس بلند ترین مینار کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اور برسوں سے یہی سوچ رہا ہوں کہ دوسری سیڑھی پر کس طرح چڑھوں گا؟“
 ”شیخ! یہ بات ہم سے ہماری آنکھوں نے کہی۔“ دوسرا درویش بڑے پُر سوز لہجے میں بولا۔ ”آج ہم نے دیکھا کہ آپ میں بوئے شامی کی بلکی سی ریح بھی باقی نہیں ہے۔ کہاں بلخ کا حکمران اور کہاں ہم بے سروسامان لوگوں کی بے لوث خدمت گزاری۔“

یہ سنتے ہی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ پر شدید رقت طاری ہو گئی۔ اور پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ بارگاہِ ذوالجلال میں پھیلاتے ہوئے عرض کیا۔ ”اے اللہ! تیرے یہ برگزیدہ بندے مجھ گناہ گار کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہیں، تو اسے اپنی شانِ کرم سے سچ ثابت کر دے اور مجھے میرے نفس کی سرکشی سے نجات عطا فرمادے۔“



ایک بار حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ درویشوں کے درمیان بیٹھے تھے کہ ایک درویش نے سوال کیا۔ ”شیخ! آپ نے بندگی کا طریقہ کس سے سیکھا؟“

درویش کا سوال سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ پھر آپ نے انتہائی پُر سوز لہجے میں فرمایا۔ ”میں نے اللہ کی اطاعت کا سلیقہ اپنے ہی ایک غلام سے سیکھا۔ پتہ نہیں، اب وہ کس حال میں ہے اور

کہاں ہے۔ مگر میں اسے کسی وقت فراموش نہیں کرتا۔ اس کی مغفرت کے لئے دعا کرتا رہتا ہوں۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر درویشوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ پھر جب کسی شخص نے اپنا چاہی تو آپ نے تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا۔ ”میں اس وقت بلخ کا بادشاہ تھا اور وہ میری انتہائی غفلت و بے زمانہ تھا۔ ایک دن میں نے ایک غلام خریدا، پھر اس کا نام پوچھا تو غلام نے جواباً بڑے ادب سے کہا۔

”میرا کوئی نام نہیں۔ جس نام سے آقا مجھے پکاریں گے، وہی میرا نام ہوگا۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خرید کردہ غلام سے دوسرا سوال کیا۔ ”تم کیا کھاتے ہو؟“

غلام نے اسی ادب کے ساتھ جواب دیا۔ ”مجھے کسی کھانے کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔ جو آقا کھائیں۔ وہی میری غذا ہوگی۔“

پھر جب حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے غلام سے یہ پوچھا کہ تم کیا پہنتے ہو تو اس غلام نے بے جواب دیا۔ ”میں کسی کپڑے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ بس میرے آقا کی مرضی ہی میرا لباس ہے۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے غلام سے آخری سوال کیا۔ ”اگر تمہاری کوئی خواہش ہو تو بیان کرو۔“

غلام نے اسی نیاز مندانہ لہجے میں عرض کیا۔

”کوئی شخص حقیقتاً کسی کا غلام بن جاتا ہے تو غلام کے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہتی۔ اگر کوئی خواہش رہتی ہے تو بس یہی کہ اس کے آقا کی کیا خواہش ہے؟“

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ پر شدید گریہ طاری ہو گیا۔ پھر جب طہیث اعتدال پر آئی تو آپ نے درویشوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اللہ اس غلام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے کہ اطاعت و بندگی کا حقیقی مفہوم سمجھا گیا۔“



ایک دن حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس درس آراستہ تھی کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر بعد از نماز کیا۔ ”شیخ! جب آپ بلخ کے بادشاہ تھے تو اس وقت بہت سی سواریوں کے مالک تھے۔ مگر آج درویشوں کے گھر میں ایک بھی سواری نہیں۔ پھر آپ زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں؟“

اس شخص کا سوال سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے چہرہ مبارک پر رنگِ جلال ابھر آیا۔ پھر آپ حاضرین مجلس کو انتہائی پُر جوش لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”سننے والے بہت غور سے سن لیں کہ میں ہر چند بادشاہت ترک کر چکا ہوں، مگر میرے دینے والے کسی کا محتاج نہیں رکھا ہے۔ آج بھی میرے پاس چار چار سواریاں ہیں۔“

مجلس میں موجود دوسرے شخص نے بڑی حیرت کے ساتھ سوال کیا۔ ”شیخ! ہم برسوں سے آپ کی خدمت حاضر ہو رہے ہیں۔ مگر آج تک ہمیں کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ ہمیشہ آپ کو پیدل ہی سفر کرتے ہوئے دیکھا۔ اس شخص کے سوال کے جواب میں حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”جب حق تعالیٰ تمہاری آنکھیں روشن کر دے گا تو میری وہ سواریاں تمہیں بھی نظر آنے لگیں گی۔“ پھر آپ اپنی بات کی وضاحت اس طرح فرمائی۔ ”جب مجھ پر کوئی سختی آتی ہے تو میں شکر کی سواری پر بیٹھ کر اپنا سفر جلال ہوں۔ پھر جب اطاعت و بندگی کا وقت آتا ہے تو اخلاص کی سواری اختیار کر لیتا ہوں۔ بحیثیت ایک کزدار کے جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو استغفار کی سواری کام میں لاتا ہوں۔ پھر جب کوئی بلا نازل ہوتی ہے

مہر کی سواری میرے کام آتی ہے۔“
ایک اور موقع پر کسی شخص نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا۔ ”شیخ! مجھے ایسی کوئی نصیحت فرمائیے جو نہایت جامع اور تمام انسانی اعمال کا احاطہ کرتی ہو۔“

اس شخص کی بات سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ دیر کے لئے توقف کیا، پھر فرمایا۔ ”تم نے جسے باندھ رکھا ہے، اسے آزاد کر دو۔ اور جسے برسوں سے بے لگام چھوڑ رکھا ہے، اسے بند کر دو۔“
اس شخص نے بڑی حیرت سے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور عرض کیا۔ ”شیخ! میں آپ کے اس ارشادِ گرامی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔
”تم نے اپنے جس مال کی تھیلیوں کے منہ بند کر رکھے ہیں، انہیں کھول دو اور راہِ خدا میں خرچ کر دو۔ تم گفتگو کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیتے، اس کے لئے اپنی زبان کو بند رکھو۔ کم بولو اور سوچ سمجھ کر بولو کہ تمہارے کس جملے سے بندگانِ خدا کی دل آزاری ہوتی ہے اور تمہارا کون سا لفظ سن کر اللہ تعالیٰ کے بندے خوشی سے ہلکنار ہوتے ہیں۔“

دراصل وہ ایک مال دار شخص تھا، جو نہایت بخل سے کام لیتا تھا اور سوال کرنے والوں کو حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنا منہ پھیر لیتا تھا۔ مزید یہ کہ وہ شخص ہر وقت لوگوں کی غیبت اور ان کے عیب تلاش کرتا رہتا تھا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قوتِ کشف سے اس کے اندر چھپی ہوئی دونوں خوفناک بیماریاں تلاش کیں اور اس کی صحت یابی کے لئے یہ اسیرِ تسخیر تجویز فرمایا۔



ایک دن حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اپنے حجرے میں چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے کہ دروازے پر کھڑے ہوئے ایک شخص نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حالانکہ اس وقت حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ بہت تھکے ہوئے تھے اور کچھ دیر کے لئے آرام کرنا چاہتے تھے، مگر آنے والے کو کوئی ضرورت مند سمجھتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئے اور رسمِ ردائی کے مطابق بڑی گرم جوشی اور محبت کے ساتھ آنے والے کی مزاج پرسی کی۔
اجنبی شخص نے نہایت غمزہ لہجے میں عرض کیا۔ ”شیخ! میں اپنے آپ پر بہت ظلم کر چکا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے نصیحت بھی فرمائیے اور میرا علاج بھی کیجئے۔“

”طیب کا کام دوا تجویز کرنا ہے۔ اور اس دوا کو استعمال کرنا نہ کرنا بیمار کے اختیار میں ہے۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”جب تم حق تعالیٰ کی نافرمانی کرو تو اس کی دی ہوئی روزی نہ کھاؤ۔“

اجنبی شخص نے شدید حیرت کے ساتھ کہا۔ ”پھر کہاں سے کھاؤں؟“
”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ پاک رازقِ عالم بھی ہے۔ وہی زمین پر اور گہرے پانیوں میں بسنے والی اپنی تمام مخلوق کو رزق فراہم کرتا ہے۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم اسی کا کھاؤ اور اسی کے احکام کی خلاف ورزی کرو۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر اس شخص کے چہرے پر ندامت کا رنگ اُبھرا۔ پھر آپ نے اسے دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”جب تم گناہ کا ارادہ کرو تو اس کی مملکت کی حدود سے نکل کر سیاہ کاری میں

ملوث ہو۔“

اس بار اس شخص نے سخت حجبانہ لہجے میں عرض کیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟ جب ساری کائنات ہی اللہ کی اس کی حدود سے کس طرح نکلا جاسکتا ہے؟“

”میرے بھائی! اسی کو تو ظلم کہتے ہیں۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت شفقت آمیز لہجے میں شخص کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ ”اس کی حدود ملکیت میں رہتے ہو اور وہیں دیدہ دلیری کے ساتھ مسلسل رہتے ہو۔ یہ تو مالک کا انتہائی کرم ہے کہ وہ اپنے کرائے دار کی مسلسل بدکاریاں دیکھ کر بھی اسے مکان سے نہیں کرتا۔ تمہیں چاہئے کہ اس مہلت سے فوراً بھرپور فائدہ اٹھاؤ۔ ورنہ وہ وقت بہت قریب ہے کہ جب مکان سے نکل کر دوسرے مکان میں زبردستی پھینک دیئے جاؤ گے۔“ دوسرے مکان سے حضرت ابراہیم بن مراد ”قبرستان“ تھی۔ پھر آپ نے فرمایا۔ ”چوکی نصیحت یہ ہے کہ جب موت کا فرشتہ آئے تو اس سے کہو کہ توبہ کی مہلت دیدے۔“

اس شخص نے شدید پریشانی کے لہجے میں کہا۔ ”فرشتہ اجل نے آج تک کسی کی بات مانی ہے نہ سنے گا؟“

”اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے ”تمہارے لئے پانچویں نصیحت یہ ہے کہ جب قبر میں منکر نکیر آئیں تو انہیں باہر نکال دینا۔“ اس شخص نے کہا۔ ”یہ بھی میرے بس کی بات نہیں۔“

”تو پھر قبر میں جانے سے پہلے ان سوالات کے جوابات تیار رکھو۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے ”اور آخری بات یہ ہے کہ روزِ حساب گناہ گاروں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ تم بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف سے انکار کر دینا۔“

”شیخ! یہ کیسے ممکن ہے؟“ اس شخص نے نہایت شکستہ لہجے میں عرض کیا۔

”تو پھر گناہ کرنا چھوڑ دو۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”ان چھ نصیحتوں کے بعد وہ شخص تمام گناہوں سے تائب ہو گیا..... اور اپنا تمام مال و زر اللہ کے راستے

لٹا دیا۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ”حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف بلاؤ۔“ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل اسی آیتِ قرآنی کی عملی تفسیر تھا۔

جب حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے کشف و کرامت کی شہرت عام ہوئی تو عباسی خلیفہ معتمد باللہ نے انہیں سپاہیوں کو حکم دیا کہ حضرت شیخ کو دربارِ خلافت میں پیش کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ”فتنہ خلقِ قرآن“ نے علمائے اسلام کو شدید اذیت و کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔

”خلقِ قرآن“ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جب خلیفہ ہارون رشید کا چھوٹا بیٹا مامون الرشید منصبِ خلافت پر ہوا تو اس کے گرد ایسے لوگ جمع ہو گئے جو فلسفے اور منطق کے اصولوں پر مذہبی عقائد کو پرکھنے کی کوشش کرتے تھے اس سلسلے میں مناظروں کی بڑی بڑی مجلسیں آراستہ کی جاتی تھیں اور دن رات اس پر طویل مباحثے ہوتے تھے۔ نتیجے میں کم علم مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہونے لگتے تھے۔ خلیفہ مامون رشید کا فطری میلان فلسفے اور منطق کی طرف تھا، اس لئے وہ ان لوگوں کے فریب میں آگیا اور پھر ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا۔

اس بحث کا موضوع تھا۔ ”قرآن حادث ہے یا قدیم؟“ حادث سے مراد فنا ہونے والا۔ اور قدیم کا مفہوم ہے باقی رہنے والا۔ فلسفی گروہ کا دعویٰ تھا کہ قرآن اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، اس لئے قرآن بھی حق تعالیٰ کی مخلوق ہے اور ”ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے“ کے اصول کے مطابق (معاذ اللہ) ایک دن قرآن بھی فنا ہو جائے گا۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید بھی اسی نظریے کا قائل تھا۔ انسان بڑا ہی خود غرض اور ظالم واقع ہوا ہے۔ اگر مامون الرشید اپنے اس نظریے کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھتا تو کوئی قیامت نازل نہ ہوتی، مگر اس نے اپنے علم اور طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے بڑے بڑے علمائے اسلام، محدثین عظام اور فقہائے کرام کو مناظرے کی دعوت دی۔ ان مقتدر ہستیوں نے قرآن وحدیث سے کئی واضح اور روشن دلائل پیش کئے۔ مگر فلسفیوں کا وہ گروہ جسے خلیفہ وقت کی کھلی حمایت حاصل تھی، علمائے اسلام کے پیش کردہ دلائل سے مطمئن نہیں ہوا۔ آخر مامون الرشید نے یہ احکام جاری کر دیئے کہ جو شخص قرآن کو مخلوق تسلیم نہیں کرتا، وہ سزا کا مستحق ہے۔

ابھی مامون الرشید اپنے اس منصوبے پر عمل درآمد نہ کرا سکا تھا کہ فرشتہ اجل نے اسے گھیر لیا۔ عام مسلمان مرتے وقت اپنے گناہوں کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے۔ مگر عباسی خلیفہ نے نزع کا عالم طاری ہونے سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی معتمد باللہ کو منصب خلافت کے لئے نامزد کیا اور اسے قریب بلا کر یہ خاص وصیت کی۔

”تم اس وقت تک سکون سے نہ بیٹھنا کہ جب تک عالم اسلام کا ایک ایک فقیہ اور محدث، قرآن کو ”مخلوق“ تسلیم نہ کر لے۔“

مامون الرشید کی موت کے بعد خلیفہ معتمد باللہ نے اپنے بڑے بھائی کی وصیت پر عمل کرانے کے لئے علمائے وقت پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیئے۔ آخر تشدد سے تنگ آ کر اور اپنی جانیں بچانے کے لئے اہل علم حضرات نے جبراً ”قرآن“ کو مخلوق تسلیم کر لیا۔ مگر اس دور آزمائش میں تنہا حضرت امام احمد بن حنبلؒ ایسے محدث اور فقیہ تھے، جنہوں نے معتمد باللہ کے دربار میں کھڑے ہو کر با آواز بلند فرمایا۔

”قرآن حکیم، اللہ کا کلام ہے۔ جس طرح حق تعالیٰ حی و قیوم ہے۔ اس طرح قرآن بھی فنا نہیں ہوگا۔“ اس انکار کے جواب میں خلیفہ معتمد باللہ نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو ایسی سخت سزائیں دیں کہ جن کے تصور سے بھی عام انسان لرز اٹھتا ہے۔ حضرت امام پر اللہ کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں کہ آپ نے آفات و مصائب کے سامنے سرنہ جھکا کر قیامت تک کے لئے مبر و استقامت کی ناقابل فراموش مثال پیش کر دی۔

یہ بہت ممکن ہے کہ خلیفہ معتمد باللہ نے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کو بھی اسی مقصد سے اپنے دربار میں طلب کیا ہو۔ مگر جب یہ عظیم صوفی دربار خلافت میں داخل ہوا تو خلیفہ کے ساتھ تمام امراء بھی آپ کا حلیہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

”آپ کیا کام کرتے ہیں؟“ معتمد باللہ نے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کی پچھلی پرانی گدڑی کو بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے دنیا و آخرت اس کے طلب گاروں کے لئے چھوڑ دی ہے۔“ آپ نے بے نیازانہ لہجے میں فرمایا۔
 ”آپ کو دنیا سے غرض ہے نہ آخرت سے۔“ عباسی خلیفہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیا دنیا اور آخرت کے علاوہ کسی تیسری شے کا بھی وجود ہے؟“
 ”یقیناً ہے۔“ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے نہایت جذب و کیف کے عالم میں فرمایا۔ ”اور میں اسی یقین

کے سہارے زندہ ہوں۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سن کر خلیفہ معتمد باللہ کی حیرت کچھ اور بڑھ گئی۔ اب اسے اس صوفی کی ذہنی حالت پر شک سا ہونے لگا تھا۔ اسی لئے خلیفہ بغداد نے مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا: ”اب تک تو دنیا کے تمام عالم و جاہل انسان صرف دنیا و آخرت کا ذکر کرتے آئے ہیں۔ ذرا ہم بھی تو نے وہ تیسری شے کس طرح تلاش کی ہے اور اس کا نام کیا ہے؟“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لہجے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا: ”اس شے کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، مگر پھر بھی میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے بتا دیتا ہوں۔ عجب تم! اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہو۔ اور اس شے کا نام ہے ”دیدار الہی“..... میں قیامت کے دن اسی شے کا ہوں۔“ یہ کہہ کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفہ وقت سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ معتمد باللہ نے ہاتھ کے اشارے سے جانے کی اجازت دی تو حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا اور دربار سے تشریف لے گئے۔ پھر ایک اور موقع پر کسی شخص نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے یہی سوال کیا کہ شیخ! آپ کیا ہیں؟ تو آپ نے جواب فرمایا: ”اللہ کے کارندوں کو کسی کام کی حاجت نہیں رہتی۔“



مشہور روایت ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ایک بار کسی دیران غلاتے سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک پریشان حال شخص دریا کے کنارے بیٹھا، آسمان کی طرف منہ اٹھائے ہوئے باتیں کر رہا ہے۔ ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اس کے نزدیک پہنچے اور خاموشی کے ساتھ اجنبی شخص کی گفتگو سننے لگے۔ وہ انتہائی ٹالہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”اے اللہ! میں دن رات تیری عبادت کرتا ہوں۔ تیری خاطر دنیا چھوڑ کر اس دیرانے میں آ چلا۔ شب و روز نہیں بدلے۔ مفلسی کا وہی عالم ہے کہ پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ تُو نے وعدہ کیا ہے۔ درویشوں کی غیب سے مدد فرمائے گا۔ پھر میری دنگیری اور مشکل کشائی کیوں نہیں کرتا؟“

پھر جب وہ اجنبی خاموش ہوا تو حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے سامنے آ کر اسے مخاطب کرتے ہوئے ”اے شخص! کیا تُو خالق کائنات پر طعنہ زنی کر رہا ہے یا تُو نے اس لالچ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت کہ تجھے محنت اور مشقت کے بغیر دنیا کے عیش و آرام میسر آ جائیں گے؟“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر وہ اجنبی شخص حیرت زدہ ہو گیا اور ندامت کے سبب کانپیں نہیں دے سکا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”معلوم ہوتا ہے یہ درویشی مفت میں حاصل کی ہے؟“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا سوال سن کر اس شخص کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ پھر اس نے اُردہ لہجے میں آپ سے پوچھا۔

”کیا درویشی خریدی بھی جاسکتی ہے؟“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی ہرجوش لہجے میں فرمایا: ”کسی اور کا کیا حوالہ پیش کروں کہ خود!

بلخ کی حکومت کے بدلے یہ فقیری خریدی ہے۔ ایک زمانے کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ بلخ کی سلطنت کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر کسی شخص کے پاس ساری دنیا کی بادشاہت ہو اور وہ بادشاہت کے عوض درویشی خرید لے، تب بھی یہ سودا ستارہ ہے۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سن کر اس درویش نے کہا۔ ”اگر اس دشتِ تنہائی میں آپ تشریف نہ لاتے تو شاید میں زندگی بھر درویشی کے منہوم سے ناآشنا رہتا۔“ یہ کہہ کر وہ شخص بھی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا۔



حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی قدم قدم پر رہنمائی فرمائی اور اپنی قدرت سے بڑے عجیب عجیب مشاہدات کرائے۔ ایک بار آپ بیت المقدس پہنچے اور مسجد اقصیٰ میں داخل ہو کر خود کو ایک چٹائی میں چھپا لیا، تاکہ مسجد کے منتظرین کی نظروں میں نہ آسکیں۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی دیرینہ خواہش تھی کہ اس مقدس مقام پر رات بھر تنہائی میں عبادت کریں۔ مگر مسجد اقصیٰ کے منتظرین، عشاء کی نماز کے بعد کسی شخص کو خانہ خدا میں ٹھہرنے نہیں دیتے تھے اور مسجد کے دروازے پر تالا لگا دیا جاتا تھا۔ اسی لئے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تدبیر اختیار کی تھی۔ یہاں تک کہ منتظرین نے مسجد کو خالی پا کر دروازہ بند کیا اور اپنے گھروں کو چلے گئے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ بدستور چٹائی میں لیٹے ہوئے خاموش لیٹے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے کہ کہیں کوئی منتظم واپس نہ آجائے اور آپ کو مسجد میں موجود پا کر باہر نکال دے۔

ابھی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ یکایک مسجد کا دروازہ دوبارہ کھلا اور ایک نورانی چہرہ بزرگ اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے چالیس کمل پوش درویش تھے۔ پھر وہ لوگ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ نورانی چہرہ بزرگ ان کی امامت کر رہے تھے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کچھ پریشان نظر آنے لگے۔ آپ ”مسجد اقصیٰ“ میں چوری جیسے اس لئے ٹھہرے تھے کہ ساری رات تنہائی میں ذکر الہی کر کے سکون قلب حاصل کر سکیں۔ اچانک ان بزرگوں کی آمد نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی تنہائی میں خلل ڈال کر آپ کی اس خواہش کی تکمیل کے امکانات ختم کر دیے تھے۔ پھر بھی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اس اُمید پر چپ چاپ لیٹے رہے کہ شاید اجنبی درویشوں کی یہ جماعت نماز ادا کرنے کے بعد واپس چلی جائے اور آپ کو خلوت میسر آجائے۔

پھر جب نماز ختم ہوئی تو وہ نورانی چہرہ بزرگ، محراب کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئے۔ اور باقی درویشوں نے ان کے سامنے ایک حلقہ سا بنالیا۔ تھوڑی دیر تک مسجد میں خاموشی چھائی رہی، پھر ایک بزرگ نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے نورانی چہرہ بزرگ کو مخاطب کر کے عرض کیا۔

”شیخ! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کی رات مسجد میں باہر کا کوئی شخص موجود ہے۔“

درویش کے اس سوال کے جواب میں بزرگ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”وہ کوئی اور نہیں، بے چارہ ابراہیم بن ادہم ہے۔ جسے چالیس دن سے عبادت اور ذکر الہی میں لذت و کیف حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ بس وہ اسی سکون کی تلاش میں آج کی رات یہاں آیا ہے۔ حق تعالیٰ اسے سکون بخشے۔“

بزرگ کی بات سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ تیزی کے ساتھ چٹائی سے باہر نکلے اور تمام درویشوں کو سلام کر کے ان بزرگ کے پاس باادب بیٹھ گئے اور پُرسوز لہجے میں کہنے لگے۔ ”آپ نے سچ فرمایا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے چالیس دن سے عبادت و ریاضت میں کوئی لذت حاصل ہو رہی ہے اور نہ یکسوئی..... اللہ آپ کا بھلا کرے.....“

بس مجھے اتنا بتائیے کہ اس بے کیفی اور انتشار کا کیا سبب ہے؟“

جواب میں فرمایا۔ ”ابراہیم! یاد کرو وہ دن، جب تم بصرہ کے بازار میں ایک خرما فروش کی دکان خرید رہے تھے۔ جب میوہ فروش نے تمہاری کھجوریں تو لیں تو ایک کھجور گر گئی۔ تم نے اس کھجور کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا۔ حالانکہ تمہاری تول برابر تھی۔ اور وہ اٹھائی جانے والی کھجور اس خرما فروش کی ملکیت۔ فساد اسی کھجور کا ہے۔“

بزرگ کی بات سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر ندامت اور پشیمانی کا گہرا رنگ آئے۔ ہوتے ہی نماز فجر ادا کر کے آپ بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ بصرہ پہنچ کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ فروش سے اس غلطی کی معافی مانگی۔ دکاندار نے سبب پوچھا تو آپ نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ پر مختلف رنگ اُبھر کر ڈوبتے رہے۔ پھر جب حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ خاموش ہوئے تو دکاندار نے کہا۔ ”میں آپ کی اس غلطی کو معاف کر دوں گا..... مگر اس کی ایک شرط ہے۔“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی مضطرب لہجے میں فرمایا۔ ”مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ کھجور کو معاف کر دو، اس کا حساب مجھ سے قیامت میں نہ دیا جاسکے گا۔“

”اگر آپ مجھے اپنے خدمت گاروں کے حلقے میں شامل فرمائیں تو میں اپنی وہ کھجور معاف کرتا ہوں۔ لہجہ پُر جوش تھا اور نہایت عقیدت مندانہ بھی۔“

آخر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اس دکاندار کی شرط مان لی۔ پھر میوہ فروش نے کھڑے کمرے کے سارے میوے غریبوں میں تقسیم کر دیئے اور ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ہولیا۔ اس واقعے سے ایک خاص نکتہ ایمانی ظاہر ہوتا ہے اور وہ ہے حلال کی روزی اور غذا۔



ایک بار حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے سفر میں تھے۔ آپ کو کھانا میسر نہیں آیا۔ شیطان مردود تو ایسے مواقع کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس نے حضرت ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو بھوکا دیکھا تو ایک راہ گیر کی شکل اختیار کر کے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے آیا۔ طنزیہ لہجے میں کہنے لگا۔

”اے بادشاہِ بلخ! کیا سلطنت اس دن کے لئے چھوڑی تھی کہ پھٹے کپڑوں میں در بدر بھٹکتے پھر دو؟“

کی روٹی بھی نہ کھا سکو؟“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حیرت سے اس اجنبی شخص کی طرف دیکھا، جو بظاہر انسان تھا۔ لباسِ بشری میں چھپا ہوا شیطان۔ ”تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟ میں نے تمہیں آج تک نہیں دیکھا۔ ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اس اجنبی شخص سے سوال کیا۔

”مجھ سے زیادہ تمہیں کون پہچانے گا ابراہیم؟ میں تو دن رات تمہاری جستجو میں لگا رہتا ہوں۔“ شیطان۔

طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہی وجہ ہے کہ آج مجھے تمہاری فاقہ کشی کا علم ہے۔“

اس اجنبی شخص کی گفتگو سے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اندازہ کر لیا کہ وہ انسان نما شیطان ہے۔ لے آپ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فریادی لہجے میں فرمایا۔ ”تُو نے دشمن کو دوست کے پیچھے کیوں لگا؟ قرآن کریم میں واضح طور پر اہل ایمان کو اللہ کا دوست قرار دیا گیا ہے اور شیطان کو انسان کا کھلا ہوا دشمن۔“

ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے ان ہی احکام قرآنی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

جواب میں حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے صدائے نبیؐ اس طرح سنی کہ جیسے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہو۔
”ابراہیم! تمہاری جیب میں جو شے موجود ہے، اسے باہر پھینک دو۔ پھر تمہیں سارا راز معلوم ہو جائے گا۔“

نمائے نبیؐ سننے ہی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے گھبرا کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو چاندی کا ایک چھوٹا سا کلوا موجود تھا۔ آپ نے حکم نبیؐ کے مطابق وہ چاندی کا کلوا زمین پر پھینک دیا۔ نتیجتاً شیطان جو انسانی بھیس میں آ کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو درغلانے آیا تھا، فوراً ہی روپوش ہو گیا۔

سیم وزر کے حوالے سے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا یہ واقعہ بھی بہت شہرت رکھتا ہے۔ ایک بار آپ ایک کنویں پر بچے اور طہارت وضو کے خیال سے پانی نکالنے کے لئے کنویں میں ڈول ڈالا۔ پھر جب اسے باہر نکالا تو وہ چاندی کے چمکتے ہوئے سکوں سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے وہ سکے واپس کنویں میں ڈال دیئے اور وضو کا پانی حاصل کرنے کے لئے دوبارہ کنویں میں ڈول ڈالا۔ اس مرتبہ پانی کا وہ برتن سونے کی اشرفیوں سے لبریز تھا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سنہری سکوں کو بھی کنویں میں الٹ دیا۔ پھر جب تیسری بار حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے یہی عمل دہرایا تو پانی کا ڈول نلیم، یاقوت، زمرد، الماس اور دوسرے قیمتی پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے وہ قیمتی ہیرے و جواہر کنویں میں پھینک دیئے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی پرسوز لہجے میں عرض کرنے لگے۔

”اے اللہ! تیرے اس حقیر بندے نے ایسی بہت سی چیزیں لٹا کر تیری محبت حاصل کی ہے۔ اور تو مجھے دوبارہ ان ہی چیزوں کی طرف مائل کرنا چاہتا ہے۔ تیری وحدانیت کی قسم! میں انہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ بس، تو اپنے کرم سے مجھے تھوڑا سا پانی عطا فرما دے تاکہ میں وضو کر کے تیری اطاعت و بندگی میں مشغول ہو سکوں۔“
یہ کہہ کر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے چوتھی مرتبہ کنویں میں ڈول ڈالا۔ اب کی بار وہ ڈول پانی سے لبریز تھا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور وضو کر کے نماز میں مشغول ہو گئے۔



تمام تذکرہ نگاروں نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ آپ اکثر امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس درس میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ بلخ کی بادشاہت ترک کرنے کے بعد آپ کی ظاہری حالت بہت شکستہ و خستہ رہتی تھی۔ بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا کہ عام لوگ، بادشاہ بلخ کو ضرورت مند سوالی سمجھ کر کچھ پیسے دینے کی کوشش کرتے تو آپ مسکرا کر فرماتے۔

”میرے بھائی! تم نے مجھے کوئی مصیبت زدہ انسان خیال کر کے میری طرف محبت کی نظر سے دیکھا، اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری حسن نیت کا اجر دے۔ میں حاجت مند نہیں ہوں۔ اللہ کے بے شمار بندے مجھ سے بھی زیادہ شکستگی کا شکار ہیں۔ تم ان کا خیال رکھو۔“

ایک بار حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اسی خستہ حالی کے ساتھ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس درس میں داخل ہوئے۔ شرکائے مجلس میں سے کچھ افراد نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو حقارت سے دیکھا۔ حضرت امام اعظم نے فوراً ہی یہ بات محسوس کر لی اور با آواز بلند حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”سیدنا! میرے قریب تشریف لائیے۔ آپ کی نشست یہاں ہے۔“

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے الفاظ سن کر ان لوگوں کو اپنے طرزِ عمل پر شدید ندامت ہوئی جنہوں نے بن ابراہیمؒ کو تحارت کی نظر سے دیکھا تھا۔ پھر جب درس ختم ہوا اور حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کر چلے گئے تو ان لوگوں نے حضرت امام اعظمؒ سے دریافت کیا۔

”یہ کون صاحب تھے جنہیں آپ نے اس قدر عزت و اکرام سے نوازا؟“

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے نہایت اثر انگیز لہجے میں فرمایا۔ ”یہ سیدنا ابراہیم بن ادہمؒ ہیں جو ہمدان معروف رہتے ہیں اور ہم لوگ تو دنیا کے دوسرے کام بھی کرتے ہیں۔“

تحقیقی اعتبار سے اس روایت کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کا دربار ہوا تھا اور حضرت ابراہیم بن ادہمؒ 179ھ میں پیدا ہوئے تھے، یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ پورے اسی سال بعد..... پھر یہ ملاقات کیونکر ممکن ہے؟ دراصل وہ مشہور بزرگ، حضرت ابراہیم بن مرشد حضرت خواجہ فضیل بن عیاضؒ تھے۔ جو اکثر حضرت امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں شریک ہوتا۔ تقویٰ کے سبب حضرت امام اعظمؒ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

ان کمزور روایتوں کے باوجود حضرت ابراہیم بن ادہمؒ صوفیائے کرام کی طویل تاریخ میں ممتاز فائز ہیں۔ اور سلسلہ چشتیہ کے تیسرے عظیم بزرگ ہیں، جن کے روحانی کمالات کے سبب تصوف سلسلے نے برصغیر پاک و ہند میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا انتقال 26 جمادی الاول 280ھ میں ہوا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے آپ کا سال وفات قرار دیا ہے۔ آپ کے انتقال کے بعد بے شمار لوگوں نے یہ صدائے نبیؐ کی۔ ”آج دنیا سے امن رخصت ہو گیا۔“

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کے مزار مبارک کے مقام کا تعین نہیں کیا جاسکا۔ کچھ مؤرخین نے خاک بغداد میں آسودہ خواب ہیں۔ اور کچھ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ حضرت لوط علیہ السلام کے مزار مبارک کے قریب آرام فرما ہیں۔“



حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ

جب برصغیر ہندوستان میں شرک اور بت پرستی اپنے عروج کو پہنچ گئی تو قدرت نے احتساب کا عمل شروع کر دیا۔ احتساب کا آغاز اس واقعے سے ہوا، جب سندھ کے بحری قزاقوں نے عرب تاجروں کے قافلے پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں کچھ مسلمان تاجر شہید ہوئے اور کچھ قیدی بنائے گئے۔ ان اسیروں میں ایک مسلمان دو شیزہ بھی تھی، اس کی فریاد عراق کے ایوانوں میں گونجی۔ مسلمان دو شیزہ کی چیخ اس قدر درد بھری تھی کہ عامل عراق، حجاج بن یوسف جیسات مزاج حکمران بھی لرز اٹھا۔ پھر اس نے اپنے سالار عبداللہ بن نبیان کو راجہ داہر کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ اس مرد جانباز نے جام شہادت نوش کیا اور دہیل کے مضبوط قلعے کو سر کرنے میں ناکام رہا۔

پھر حجاج بن یوسف نے اپنے محبوب سالار بدیل بن طہفہ کو عبداللہ بن نبیان کی شہادت اور لشکرِ اسلام کی شکست کا انتقام لینے کے لئے بھیجا۔ بدیل بن طہفہ بڑی جانبازی کے ساتھ لڑے۔ مگر ان کی قسمت میں بھی شہادت رقم کی جا چکی تھی۔ حجاج بن یوسف کو بدیل بن طہفہ کی موت کا اس قدر صدمہ تھا کہ وہ کئی رات سو نہیں سکا۔ آخر عامل عراق نے اپنے بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم کو اس پیچیدہ، پُر اسرار اور خوفناک جنگی مہم پر روانہ کیا۔ اس وقت محمد بن قاسم کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ ابن قاسم نے ”مختیق عروسمک“ سے دہیل کے قلعے میں گہرے شکاف ڈال دیئے۔ سندھ کے حکمران کی بساط اقتدار الٹ دی اور راجہ داہر کا سر کاٹ کر حجاج بن یوسف کے دربار میں بھیج دیا۔

محمد بن قاسم کی فتوحات کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ اس نے تین سال کی مختصر سی مدت میں ملتان تک کے تمام علاقوں کو فتح کر لیا اور اس کے ساتھ ہی بت پرستوں کے دل بھی مسخر کر لئے۔ محمد بن قاسم کے اخلاق عالیہ کا یہ عالم تھا کہ مقامی ہندو اسے خدا سمجھ کر پوجنے کے لئے آمادہ تھے۔ مگر مسلمان سپہ سالار نے انہیں خدائے واحد کا پیغام سنایا۔ پھر اس وقت محمد بن قاسم کو معزول کر کے ”واسط“ کے قید خانے میں ڈال دیا گیا، جب لشکرِ اسلام کی فتوحات کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اگر محمد بن قاسم جیسے صاف کردار جرنیل کو پیش قدمی کی اجازت دے دی جاتی تو پھر برصغیر ہندوستان کی فتح کے لئے سلطان محمود غزنوی کی ضرورت باقی نہ رہتی اور دوسری صدی ہجری کے اوائل ہی میں بت پرستی کا زور ٹوٹ چکا ہوتا۔ مگر دار الخلافہ کے آپسی جھگڑوں نے نہ صرف ان فتوحات کا سلسلہ روک دیا بلکہ ایک عظیم فاتح کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا۔

پھر کئی صدیاں گزر جانے کے بعد ”قراٹھ“ کا قلع قمع کرنے کے لئے سلطان محمود غزنوی ملتان پہنچا۔ ہندوستان کے ہندو راجاؤں نے قراٹھ کو پناہ دی تھی، اس لئے سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔

یہاں تک کہ لشکرِ اسلام نے معرکہ سومنات میں ایک تاریخ ساز اور عظیم الشان فتح حاصل کی اور بتِ اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ مگر محمود غزنوی کے وارث ناکارہ تھے۔ ہندوستان کے باقی حصوں کو فتح بجائے آپس میں کٹ مرے اور باپ کی حاصل کردہ متاعِ گراں بہا کو ضائع کر بیٹھے۔ خاندانِ غزنوی کی بعد بت پرستوں کے نیم جان بدن میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔

پھر ایک طویل عرصے کے بعد خاندانِ غور کے ایک جانباز شہاب الدین غوری نے ہندوستان کا ”جنگِ ترائن“ میں ہندوؤں کے نامور سورما اور راجپوتوں کی آن، سمرات پر تھوی راج چوہان کو شکست شہاب الدین غوری کو یہ شاندار فتح، سلسلہٴ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طفیل حاصل ہوئی۔ پھر شہاب الدین غوری کے غلام، قطب الدین ایک نے دہلی کو فتح کر کے ہندوستان مضبوط اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔



اجمیر کو فتح کرنے کے بعد لشکرِ اسلام، ہردوار کی طرف بڑھا۔ ہردوار، ہندوؤں کا ایک بہت بڑا تہذیبی (متبرک مقام) ہے۔ اس کے قریب ہی پہاڑی علاقہ ڈیرہ دون ہے، جسے ہندوستان کی عسکری تاریخ خاص اہمیت حاصل ہے۔ روایت ہے کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے ایک خلیفہ حضرت امام ابوالمعالیؒ اسلامی لشکر کے ساتھ تھے۔ حضرت امام ابوالمعالیؒ محمدؐ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ درویش گوشہ نشین کی سپاہی جانباز بھی..... آپ کے ایک ہاتھ میں تیغ ہوتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں شمشیر آب دار۔

جب حضرت امام ابوالمعالیؒ محمدؐ بت خانہ ہند کے اس پُر سکون گوشے میں تشریف لائے تو وہاں ہزار پرستوں کا اجتماع تھا۔ دیوتاؤں کے یہ پجاری ہندوستان کے کونے کونے سے سمٹ کر ہردوار میں دریائے کنارے جمع ہوئے تھے اور دن رات جاپ کرتے رہتے تھے۔ اس وقت راجہ کرن یہاں کا حکمران تھا۔ دون اور سہارنپور کے علاقے بھی اس کے زیر اثر تھے۔ پرتھوی راج چوہان کی شکست اور اجمیر و دہلی پر مسلمان قبضے نے راجہ کرن کو خوف و دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔

”کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے گھوڑوں کے سم ہمارے تیر تھ استھان کو بھی روند ڈالیں۔“ لشکرِ اسلام فتوحات کی خبریں سن کر راجہ کرن نے اپنے فوجی مشیروں اور دھرم کے ادھیکار یوں کے سامنے ان خدشات کیا۔

”ہمارا قلعہ بہت بلندی پر واقع ہے۔“ راجہ کرن کے فوجی مشیروں نے کہا۔ ”یہاں تک مسلمان سپاہی قدم پہنچانا اتنا آسان نہیں ہے۔“

”تارا گڑھ کا قلعہ تو اس سے بھی زیادہ بلند تھا۔“ راجہ کرن نے حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

تارا گڑھ، اجمیر میں ایک پہاڑی سلسلہ ہے، جہاں پرتھوی راج چوہان کا مضبوط ترین قلعہ آباد تھا۔ حکمران اپنی اس پناہ گاہ کو ناقابلِ تسخیر سمجھتا تھا۔ مگر جب مسلمان جانبازوں نے یلغار کی تو ہر بلندی ان کے نیچے تھی۔ آج بھی جب غیر مسلم سیاح ادھر آتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آخر اسلامی لشکر قدر دشوار گزار فاصلہ کس طرح طے کیا تھا۔ شہاب الدین غوری کا لشکر انتہائی نشیب میں تھا اور تارا گڑھ سینکڑوں فٹ کی بلندی پر..... یہ گناہگار راقم الحروف بھی اس مقام پر حاضر ہو چکا ہے۔ قلعے کے وسط میں سید حسین خٹک سوار کا حزارِ مبارک ہے اور صحن میں چالیس شہداء کی قبریں ہیں۔ سید حسینؒ اسلامی لشکر کی تباہ

رہے تھے۔ حق و باطل کی اس جنگ میں لشکر اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔ سید حسینؑ اور ان کے چالیس سپاہی شہید ہوئے۔ پھر لشکر اسلام نے اپنی فتح کا نشان ثبت کرنے کے لئے سید حسینؑ ننگ سوار کے جسد مبارک کو قلعے میں اس جگہ لے جا کر سپرد خاک کر دیا، جہاں سمرات پر قہوی راجہ چوہان اپنا دربار سجایا کرتا تھا۔ ہر دروازے کے راجہ کرن نے بھی تارا گڑھ پہاڑ کی اسی بلندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

جواب میں ہر دروازے کے پنڈتوں نے لاف زنی کی۔ ”اجیر میں ہم جیسے دیوتاؤں کے پجاری نہیں تھے۔ ہم دن رات کیرتن اس لئے کرتے ہیں کہ ہر دروازے پر دیوتاؤں کا سایہ رہے۔ کوئی کچھ بھی کر لے، مگر دیوتاؤں کے کسی دشمن کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکے گی۔ آپ چین کی نیند سو جائیں، کالی کے پجاری جاگ رہے ہیں۔“ واضح رہے کہ ہر دروازے سے کچھ فاصلے پر ہندوؤں کی مشہور دیوی، کالی کا مندر واقع ہے۔

اسلامی فتوحات کے حوالے سے راجہ کرن ابھی اپنے خدشے کا اظہار کر رہی رہا تھا کہ چند روز بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ حضرت امام ابوصالحؒ محمدؒ اپنا لشکر لے کر ضلع سہارنپور کے مضافات میں داخل ہوئے۔ آپ نے اسلام کی سنت کے مطابق اپنے سفیر کو راجہ کرن کے دربار میں یہ پیغام دے کر بھیجا۔

”ہمارے اور تمہارے درمیان اس کے سوا کوئی جھگڑا نہیں کہ تم ان چیزوں کو پوجتے ہو، جن کی پرستش جائز نہیں۔ اللہ ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ اگر تم لوگ اس بات کا اقرار کر لو تو پھر ہمارے بھائی اور زندگی کے تمام حقوق میں برابر کے حق دار..... اگر تم ہمارے پیغام کو قبول نہیں کرتے تو پھر صلح کی روش اختیار کرتے ہوئے جزیہ ادا کرو۔ اس کے بدلے میں ہم تمہارے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دیں گے۔“

راجہ کرن نے دوسرے بد دماغ حکمرانوں کی طرح حضرت امام ابوصالحؒ محمدؒ کے پیغام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسلامی سفیر کے ساتھ نہایت تحقیر آمیز رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ کون ہو، ہمارے جان و مال کی حفاظت دینے والے؟ لٹیروں کی طرح ہمارے گھروں میں داخل ہو کر ہمارے عقائد کی دولت لوٹ لیتا چاہتے ہو۔ سلاستی اسی میں ہے کہ چپ چاپ واپس چلے جاؤ۔ ورنہ دیوتاؤں کی یہ سرزمین تمہارا دفن بن جائے گی۔“

حجت پوری ہو چکی تھی۔ حضرت امام ابوصالحؒ محمدؒ نے اپنے لشکر کو حملے کا حکم دیا۔ میدانی جنگ میں اسلامی لشکر کو راجہ کرن کی فوجوں پر غلبہ حاصل رہا۔ آخر راجہ کرن نے وہی پرانی حکمت عملی اختیار کی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ قلعے میں سامان رسد کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا، اس لئے راجہ کرن کے سپاہی سکون و اطمینان کے ساتھ حضرت امام ابوصالحؒ محمدؒ کے لشکر پر تیروں اور پتھروں کی بارش کرتے رہے۔ جس کے نتیجے میں اسلامی لشکر کو شدید جانی نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

جب طویل محاصرے کے بعد کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا تو مسلمان سپاہیوں نے اپنے سالار حضرت امام ابوصالحؒ محمدؒ کی خدمت میں عرض کیا۔ ”دشمن قلعہ بند بھی ہے اور اس کے پاس سامان رسد کے ذخائر بھی ہیں۔ ہم پہاڑی کے نشیب میں ہیں اور قلعہ افراد کا شکار ہیں..... آپ سلطان قطب الدین ایک کو لکھیں کہ وہ تازہ دم فوج بھیجیں۔ موجودہ لشکر حالات میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے گا۔“

حضرت امام ابوصالحؒ محمدؒ کچھ دیر تک اپنے سپاہیوں کے مشورے سنتے رہے۔ پھر آپ نے نہایت بے نیازانہ لہجے میں فرمایا۔

”میں سلطان سے مزید فوجی کمک طلب نہیں کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ حق تعالیٰ اسی مختصر سے لشکر کو عظیم الشان

فتح بخشے گا۔ بس ایک دن کی بات ہے، کل نصرتِ نبی عالم اسباب میں ظاہر ہوگی۔“
یہ کہہ کر حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ اپنے خیمے میں تشریف لے گئے، پھر ساری رات ذکر الہی میں مشغول نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ نے اپنے سپاہیوں کی صف بندی کی اور جلالہٗ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”حق تعالیٰ کا کلام تو وہ ہے کہ اگر اسے پہاڑوں پر نازل کر دیا جائے تو پہاڑ بھی خوف سے رہ جائیں۔ تم اسی ذاتِ پاک کے نام لیوا ہو۔ تم رنج اور خوشی کی حالت میں اسی کو پکارتے رہو۔ مجاہد بن پیچیدہ اور دشوار ہو، مگر وہ اپنے نام لیواؤں کو کسی بھی حال میں سرنگوں نہیں ہونے دے گا۔“
یہ کہہ کر حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ نے اپنے لشکر کو یلغار کا حکم دیا۔

مسلمان سپاہی انجام سے بے پروا ہو کر نعرہٗ تکبیر بلند کرتے ہوئے آگے بڑھے۔
بت پرستوں نے مسلمانوں کا جوش و خروش دیکھا تو پتھروں اور تیروں کی بارش تیز کر دی۔ مختصر یہ سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے۔ حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ شمشیر بے نیام کے ساتھ صفوں کے درمیان گزرے۔ مسلمان سپاہی زخمی ہو کر زمین پر گر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ پر جذب کی کیفیت گئی۔ پھر آپ نے اسی کیفیت میں میں ”لا الہ الا اللہ“ کی ضرب لگائی۔
اچانک راجہ کرن کے قلعہ بند سپاہیوں کو محسوس ہوا، جیسے قلعے کی تمام دیواریں کانپ رہی ہیں۔
حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ پر جذب کی وہی کیفیت طاری رہی تھی اور آپ بار بار فرما رہے تھے: ”سچا۔“

سرزمینِ ہردوار کی لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔
حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ نے آخری بار حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا۔ ”اے قادرِ مطلق! اس قلعہ منہدم کر دے اور مشرکین کی بتائی ہوئی مضبوط دیواروں کو ان ہی پر الٹ دے۔“
ابھی حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ کی بازگشت باقی نہیں تھی کہ شدت آگئی اور چند لمحوں میں مضبوط ترین قلعہ زمین بوس ہو گیا۔ راجہ کرن اور اس کے بیشتر سپاہی اینٹوں کے بلے میں دفن ہو گئے۔ باقی سپاہیوں کو اسلامی لشکر نے گرفتار کر لیا۔
مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ مگر اس کشمکش میں ایک ہندو سپاہی کا تیر حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ کی پست ہو گیا۔ تیر نکال لیا گیا مگر جریانِ خون کے باعث حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ جانبر نہ ہو سکے اور مبارک خون سے رنگین ہو گیا۔ اور پھر آپ اس سرخ لباس اور سرخ چہرے کے ساتھ اپنے خالق کے دربار ہو گئے۔

مجاہدین اسلام نے حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ کے جسدِ مبارک کو راجہ کرن کے قلعے کے وسط میں آٹھ جن لوگوں نے صوفیائے کرام کے حوالے سے تاریخِ ہندوستان کا مطالعہ کیا ہے، انہیں اجیر شریف کے واقعات میں حیرت انگیز مماثلت نظر آئے گی۔ تارا گڑھ (اجیر) کے قلعے میں جانناز صوفی حزن تک سوارِ محو خواب ہیں اور ہردوار کے قلعے میں حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ آرام فرما ہیں۔
جو لوگ اپنے تعصب اور تنگ نظری کے باعث صوفیائے کرام کی گوشہ نشینی پر اعتراض کرتے ہیں، سید حسینؒ اور حضرت امام ابو صالحؒ محمدؒ کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ ان ہی درویشوں کے فن

خانہ ہند میں ایمان کی فصل بہار آئی اور پھر صدی در صدی اور فصل در فصل جس قدر شکوے پھوٹے اور جتنے پھول کھلے، ان سب میں ان ہی شہداء کے لبو کی رنگ آمیزی ہے۔ اور ان ہی صوفیائے جانناز کے خون کی خوشبو لگی ہوئی ہے۔

آج بھی حضرت امام ابو صالح محمدؒ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے لاکھوں زائرین کلیر شریف آتے ہیں اور پھر ”باون درے“ سے گزر کر راجہ کرن کے تباہ شدہ قلعے کی حدود میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد طویل سڑھیاں چڑھ کر حضرت امام ابو صالح محمدؒ کی بارگاہ جلال میں حاضری دیتے ہیں اور اس مرد شہید کی خدمت عالیہ میں سلام عقیدت پیش کرتے ہیں جس کی ایک ہی ضرب ”لا الہ“ نے پتھروں کے مضبوط ترین قلعے کی تمام بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔ ”باون درہ“ کسی شہر یا قصبے کا نام نہیں، دراصل یہ پتھر کے وہ ”باون“ ستون ہیں، جن پر برطانوی دور حکومت میں ایک پل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس پل کے نیچے سے ”رڑکی“ کی مشہور نہر گزر رہی ہے جس کا پانی کئی جون کی شدید گرمیوں میں بھی برف کی طرح ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہ پل جدید فن تعمیر کا ایک عجیب نمونہ ہے۔ پھر جب اللہ کے ایک سرفروش بندے کا پاک خون، خاک کلیر میں جذب ہو گیا اور دلوں کی سنگلاخ زمین سے ایمان کے جتنے پھوٹنے لگے تو دوسرا بت شکن، اجودھن (پاک پٹن) سے سہارنپور کی طرف روانہ ہوا۔ یہ بت شکن، سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم علاء الدین صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

اکثر تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ 592ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر تاریخی حقائق کی روشنی میں ان روایتوں کا جائزہ لیا جائے تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جیلہ خاتونؒ، حضرت بابا فریدؒ کی چھوٹی ہم شیرہ تھیں۔ حضرت بابا فرید الدین مسعودؒ شکر رحمۃ اللہ علیہ 582ھ میں پیدا ہوئے۔ بعض تاریخ نویسوں نے 584ھ کو حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا سال ولادت قرار دیا ہے۔ اگر حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ پیدائش کو درست مان لیا جائے تو پھر حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کی عمروں میں صرف آٹھ یا دس سال کا فرق باقی رہ جاتا ہے، جو کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس لئے 592ھ کو حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کا سال پیدائش قرار نہیں دیا جاسکتا۔

حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم کا اسم گرامی سید عبدالرحیم تھا۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق سید عبدالرحیم کا سلسلہ نسب براہ راست غوث اعظم حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ حضرت بابا فرید الدین مسعودؒ شکر رحمۃ اللہ علیہ نسل فاروق کے امین تھے، اس لئے والدہ محترمہ کی طرف سے حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کا خاندانی سلسلہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ سے مل جاتا ہے۔ حضرت مخدوم کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی ہاجرہؒ تھا جو عام طور پر جیلہ خاتونؒ کے لقب سے مشہور ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بقول جس طرح تمام معاصر تذکرے حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واقعات سے خالی ہیں اسی طرح آپ کے والد محترم سید عبدالرحیم کے بارے میں بھی تمام تاریخی خاموش ہیں، کسی معتبر دستاویز سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سید عبدالرحیم کا معاشی پس منظر کیا تھا؟ کسی علمی ادارے سے تعلق رکھتے تھے یا کسی سرکاری عہدے پر فائز تھے۔

ہندوستانی ادیب ڈاکٹر ظہور الحسن شارب نے اپنی تالیف ”ختم خانہ تصوف“ میں صرف اس قدر اضافہ کیا ہے کہ حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ 19 ربیع الاول کو عالم اسباب میں ظاہر ہوئے اور آپ کا آبائی وطن ہرات تھا۔

بعض تذکروں میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ شیر خوار ہونے کا انداز سے گزرا ہے۔ پہلے سال میں حضرت مخدوم ایک دن چھوڑ کر ماں کا دودھ پیتے تھے۔ اس کی توجہ باہم ہوئے تذکرہ نگار نے لکھا ہے کہ حضرت مخدوم دوسرے دن روزہ رکھتے تھے۔

پھر دوسرے سال میں آپ کا یہ معمول تھا کہ دو دن چھوڑ کر دودھ پیتے تھے۔ گویا دو دن روزہ رکھتے ہمارے نزدیک یہ خوش عقیدگی نہیں، امر واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا کا ہر بچہ ان مخصوص نشانیاں لے کر دنیا میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض بچے شاذ و نادر ہی کسی موقع پر رونے کی حالات میں ہر وقت ہنستے ہی رہتے ہیں۔ ایسے بچوں کے بارے میں بلا خوف تردید یہ بات کہا جاسکتی ہے جو ان کو انتہائی تحمل مزاج اور خوش باش انسان ہوں گے۔ اس کے علاوہ چڑچڑے، رونے والے، سنگ دل اور خود غرض بچے بھی بچپن ہی میں اس قسم کی نشانیاں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ بچے بچے جابجا ہوں گے اس کا فیصلہ بھی کم و بیش بچپن ہی میں ہو جاتا ہے۔ چونکہ حضرت مخدوم علاء الدین کو جوان ہو کر ”صابر“ لے گوارے ہی میں آپ کے ”مبزر“ کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ہمارے نزدیک محیر العقول بات یہ ہوتی ہے کہ مخدوم سرے ہی سے دودھ کو منہ نہ لگاتے اور شیر خواری کا زمانہ گزار دیتے۔ مختصر یہ کہ بچپن ہی میں آپ ان سکنت سے مبر وضبط کی علامتیں نمایاں نظر آتی تھیں۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ عام طور پر بچے ڈیڑھ دو سال کی عمر میں کچھ نہ کچھ بولنا شروع کر دیتے۔ حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ نے چار سال تک اپنی زبان مبارک سے کوئی لفظ ادا نہیں کیا۔ اس کا تذکرہ نگار نے ماں باپ کی پریشانی کا ذکر نہیں کیا مگر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ چار سال کی عمر کو پہنچنے کے خاموش رہنا ایک پریشان کن مرحلہ ضرور ہوگا۔ والدین نے نہیں تو اہالیانِ خاندان نے ضرور سوچا ہوگا عبدالحییم کا بیٹا پیدا اُٹھی گونگا ہے۔ ہم مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر کے حوالے سے یہ واقعہ تحریر کر چکے ہیں۔ چار سال کی عمر تک اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر تمام اراکینِ طہ عہد کو گونگا سمجھنے لگے تھے۔۔۔ خود شہنشاہ جلال الدین اکبر اور مہارانی جودہ بایں کو بھی یقین آ گیا تھا کہ بچہ پیدا اُٹھی طور پر قوت گویائی سے محروم ہے۔ پھر جب بے قرار و مضطرب باپ نے حضرت شیخ سلیم الدین رحمۃ اللہ علیہ جلال میں اپنا غم بیان کیا تو حضرت شیخ نے فرمایا۔

”شہزادہ سلیم بھی بات کرے گا۔ مگر یاد رکھو، ایک وقت میں ایک ہی سلیم بولے گا۔“

پھر جس روز حضرت شیخ سلیم الدین چشتی دنیا سے رخصت ہوئے تو شہزادہ سلیم نے اپنی زبان سے یہ کیا۔

اسی طرح روایت ہے کہ حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زبان مبارک سے جو سب سے پہلا کیا، وہ یہ تھا۔

”لا موجود الا اللہ۔“ (اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے)

عام طور پر مسلمان ماں باپ اپنے بچوں کو کلمہ طیبہ ”لا الہ الا اللہ“ سکھاتے ہیں۔ مگر حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ”لا موجود الا اللہ“ کا ادا ہونا ایک خاص امر الہی کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت کی حیات مبارک کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ راز ظاہر ہوگا کہ آخر حضرت علاء الدین صابر نے ”لا موجود الا اللہ“ کیوں کہا تھا؟

ابھی حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کی عمر شریف پانچ سال تھی کہ آپ کے سر سے والد محترم کا سایہ اٹھ گیا۔ بعض تاریخی روایتوں کے مطابق حضرت سید عبدالرحیمؒ نے 17 ربیع الاول 597ھ کو انتقال فرمایا۔ اس وقت جیلہ خانوں ہرات میں مقیم تھے۔ آپ نے بڑی ہمت سے اس صدمہ جانکاہ کو برداشت کیا۔ کچھ دن تک بیٹے کی تعلیم جاری رکھنے کی کوشش کی مگر یہ سلسلہ مزید جاری نہ رہ سکا۔ آخر آپ مخدوم علاء الدینؒ کو ساتھ لے کر اپنے برادر محترم حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اجودھن چلے آئیں۔ اگر اس واقعے کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جیلہ خانوں کو ہرات میں رہ کر وہ فضا میسر نہیں تھی کہ حضرت مخدومؒ کی پرورش ہو سکتی۔ یا تو اقتصادی حالات خراب تھے یا پھر انہیں سید عبدالرحیمؒ کے خاندان کی اعانت حاصل نہیں تھی۔ مجبوراً آپ طویل سفر طے کر کے اجودھن پہنچیں اور یتیم بچے کو شفقت و مہربان بھائی کے سپرد کر دیا۔

یہ سچ ہے کہ کسی معتبر تاریخ میں حضرت مخدوم علاء الدینؒ کے تفصیلی حالات نظر نہیں آتے۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ یتیم ہوجانے کے بعد اجودھن ہی آپ کی دینی اور روحانی پناہ گاہ تھا۔ بعد میں آنے والے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ حضرت مخدومؒ نے حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی۔ عربی اور فارسی زبانیں سکھنے کے بعد آپ نے فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ میں دستگاہ حاصل کی۔ کوئی تاریخی حوالہ موجود نہ ہونے کے باوجود یہ روایت اس لئے درست ہے کہ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ عظیم صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت عالم و فاضل بزرگ بھی تھے۔ اس لئے اصولی طور پر آپ کے حقیقی بھانجے کو بھی عالم و فاضل ہونا چاہئے تھا۔ حضرت بابا فرید اپنے تمام شاگردوں اور مریدوں کے لئے ظاہری تعلیم بہت ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت شیخ جمال الدین ہانوسیؒ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول مبارک تصوف کی دنیا میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

”جالل شیخ ایک مخرہ شیطان ہے۔“

جب اس قول کی روشنی میں ہم حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کی علمی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو آپ کا ہر مرید علوم ظاہری کے اعلیٰ مناصب پر فائز نظر آتا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ ظاہری تعلیم سے محروم رہ جاتے؟

جیلہ خانوں کچھ دن تک اجودھن میں مقیم رہیں، پھر اپنے شوہر کے وطن ہرات تشریف لے گئیں۔



اس دوران حضرت بابا فریدؒ نے حضرت مخدومؒ کو لنگر تقسیم کرنے کی خدمت پر مامور کر دیا۔ اس سلسلے میں یہ روایت زبان زد خاص و عام ہے کہ حضرت علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ بارہ سال تک لنگر خانے کے منتظم رہے، مگر آپ نے اس طویل عرصے میں ایک دن بھی کھانا نہیں کھایا۔ ”سلسلہ صابریہ“ کے لوگ اس روایت کو بطور فخر بیان کرتے ہیں اور بارہ سال تک غذا استعمال نہ کرنے کو حضرت مخدومؒ کی سب سے بڑی کرامت قرار دیتے ہیں۔ اگر اس روایت کو حرف بہ حرف تسلیم کر لیا جائے تو حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت مافوق الفطرت قرار پائے گی۔ حق تعالیٰ نے مختلف النوع اشیاء اسی لئے پیدا کی ہیں کہ انسان انہیں استعمال کرے اور پھر شکرانے کے طور پر خالق کائنات کی بارگاہ میں سجدہ گزار ہو۔ بے شک! حیوانوں کی طرح شکم پروری کو اسلام جائز نہیں سمجھتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی رہبانیت کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ اہل ایمان غیر مسلم جو میگوں اور سنیا سیوں کے مانند اپنے جسم کو طرح طرح کے آزار پہنچائیں۔

مثال کے طور پر بہت سے ہندو جوگی جس دم (سانس روکنے) کا عمل کرتے ہیں۔ سر کے بل زمین پر جاتے ہیں اور کئی دن تک اسی حالت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ پھر کم نظر لوگ دھوکھا جاتے ہیں اور کے ماہر جوگیوں کو مافوق الفطرت ہستی کا درجہ دے کر انہیں پوجنے لگتے ہیں۔ اس گروہ کے علاوہ ہندوستان میں سنیا سی بھی پائے گئے ہیں، جنہوں نے غذا کے نام پر کوئی چیز استعمال نہیں کی، صرف پانی پر گزارا کیا۔ یہاں وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے۔ ضعف و ناتوانی اس قدر بڑھ گئی کہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ سانس کا ڈورا چلتا رہتا تھا۔ تو ہم پرست لوگوں نے سادھوؤں کی اس حالت کو روحانیت کا کمال سمجھا اور قدموں میں بھینٹ چڑھانے لگے۔

جب غیر فطری اعمال کا ذکر چھڑا ہے تو ایک بات عرض کرتا چلوں کہ میں نے حضرت شیخ بایزید بطنانی ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیا۔ مطالعے کے دوران میں نے تقریباً تمام کتابوں میں یہ روایت مشترک پائی کہ بایزید بطنانی نے اپنے نفس کو سزا دینے کے لئے تین سال تک پانی نہیں پیا۔ ہمارے دیگر مصنفین ہر روایتوں کو انتہائی رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، مگر میں نے قصداً اس واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ دلیل شریعت اور طریقت میں فقر و فاقہ اور نفس کشی کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی صوفی تین سال تک پانی نہ پیئے اور بارہ سال تک کھانا نہ کھائے۔

حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمہ اللہ کے بارے میں جو روایت پورے زور و شور کے ساتھ بیان کی جائے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت بابا فرید رحمہ اللہ نے حضرت مخدوم کو لنگر خانے کا منتظم بنایا تو آپ ضرور درویشوں کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کھانے کے لئے ایک لقمہ بھی نہ بچتا اور آپ لگاتار فاقے سے رہتے اور اپنی اس حالت کو کسی پر ظاہر نہ کرتے۔ نتیجتاً حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمہ اللہ بہت زیادہ کمزور ہو گئے۔

پھر جب ایک طویل مدت کے بعد جیلہ خاتون ہرات سے اجودھن تشریف لائیں تو بیٹے کی ظاہری حالت کر رو پڑیں۔

”علی احمد! یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟..... تم اتنے کمزور کیوں ہو کہ چہرے سے بیمار لگتے ہو؟“

حضرت مخدوم والدہ محترمہ کے اس سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ مجبوراً آپ نے صورت حال بیان ہوئے عرض کیا۔ ”درویشوں کی زندگی تو فقر و فاقے ہی سے گزرتی ہے۔“

جیلہ خاتون اپنے عارف بیٹے کے اس اشارے کو نہ سمجھ سکیں اور مامتا سے مجبور ہو کر برادر محترم کی خراب شکایت کر بیٹھیں۔ ”آپ نے میرے بیٹے کا خوب خیال رکھا۔ اسے پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں دی گئی۔“

حضرت بابا فرید رحمہ اللہ نے بڑی حیرت سے اپنی بہن کی شکایت سنی اور فرمایا۔ ”تمہارا بیٹا علی احمد تو لگاتار خانے کا منتظم ہے۔ اس کے بھوکے رہنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟“

پھر اس کی یہ حالت کیوں ہے کہ وہ سوکھ کر کاٹا ہو گیا ہے اور چہرے سے برسوں کا بیمار نظر آتا ہے؟ خاتون نے عرض کیا۔

حضرت بابا فرید رحمہ اللہ نے اسی وقت اپنے محبوب بھانجے کو طلب کر کے فرمایا۔ ”علی احمد! کیا تم لگاتار استعمال نہیں کرتے؟“

حضرت مخدوم علاء الدین رحمہ اللہ نے بعد احترام عرض کیا۔ ”پیر و مرشد نے لنگر تقسیم کرنے کا حکم دیا تھا۔“

فرمایا تھا کہ میں اپنے شکم کی ضرورت کو درویشوں کی بھوک پر ترجیح دوں؟“
حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مخدومؒ کے اشارے کو سمجھ گئے۔ پھر آپ نے نہایت جذب و شوق کے لہجے میں فرمایا۔ ”میرا علی احمد، صابر ہے صابر۔“
اسی روز سے علی احمد، ”صابر“ کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ پھر حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا یہ لفظ تاریخ تصوف کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو کر رہ گیا۔



بارہ سال تک بھوکا رہنے کی روایت کے ساتھ کچھ دوسری روایتیں بھی حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی سے منسوب ہیں۔

تذکرہ ”انوار اصفا“ کے مطابق حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ اکثر اوقات تنہا رہا کرتے تھے۔ ترک و تجرید کا یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ آپ کا زہد و تقویٰ کمال درجے کا تھا۔ دنیا اور اہل دنیا سے بالکل لا تعلق رہتے تھے۔ ہمیشہ روزہ رکھتے اور درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کرتے۔ زندگی بھر پارہ نہ رہے اور کبھی جوتے نہیں پہنے۔ آپ کو جذب اور استغراق کے باعث اپنی یا غیر کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ بہت کم ہوش میں رہتے تھے۔ اجودھن میں ایک عرصے تک یہ عالم رہا کہ کام سے فارغ ہوتے ہی اپنے حجرے میں چلے جاتے اور ذکر و فکر میں مشغول ہو جاتے۔ اس وقت ایسا جذبہ طاری ہوتا اور ایسا جلال ظاہر ہوتا کہ کسی کو آپ کے قریب جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ماموں حضرت بابا صاحبؒ کے دولہ کے کھیلنے ہوئے حجرے کے قریب پہنچ گئے اور آپ کے نادانستہ جلال کی نذر ہو گئے۔

اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے، مگر کسی معتبر تذکرے میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا صورت حال پیش آئی تھی۔

اس طرح حضرت مخدومؒ کی شادی کا واقعہ ہے، جس سے ”جلال صابری“ کی انتہا ظاہر ہوتی ہے۔ جیلہ خاتون کو اپنے بیٹے کے عشق کی آگ کا اندازہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے جب بھی حضرت مخدومؒ کی طرف دیکھا تو اس ماں کی آنکھوں سے دیکھا جو اولاد کے لئے اپنے سینے میں بہت سے ارمان رکھتی ہے۔ حضرت علاء الدین صابرؒ جوانی کی منزل کو پہنچ چکے تھے۔ اس لئے جیلہ خاتون کی شدید خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں بیٹے کا گھر آباد ہو جائے۔ بعض روایتوں کے مطابق جیلہ خاتون، ضعیف ہونے کے ساتھ بیمار بھی رہنے لگی تھیں۔ نتیجتاً وہ جیتے جی اس فریضے سے بہک دوں ہو جانا چاہتی تھیں۔

آخر ایک دن جیلہ خاتون، حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کرنے لگیں۔ ”میری خواہش ہے کہ آپ علی احمد کو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیں۔“
حضرت بابا فریدؒ، بہن کی بات سن کر خاموش رہے۔

پھر جب جیلہ خاتونؒ نے دوبارہ اپنی خواہش کا اظہار کیا تو حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”تم نے شادی کے سلسلے میں علی احمد کی مرضی معلوم کر لی ہے؟“

”ایک حیا دار بیٹا، ماں کے سامنے کس طرح لب کشائی کرے گا؟“ جیلہ خاتونؒ نے عرض کیا۔ ”اس معاملے میں ماں باپ ہی اولاد کے ترجمان ہوتے ہیں۔“

عارف بھائی کے اظہار حقیقت کو جذباتی ماں اور غریب بہن نے انکار کا ایک مہذب زاویہ سمجھا۔ ”آپ علی احمد

کو اپنی فرزندگی میں قبول کرنے سے اس لئے گریزاں ہیں کہ وہ ایک یتیم اور غریب لڑکا ہے۔“ جمیلہ خاتون شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

بہن کی بات سن کر حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ بے قرار ہو گئے۔ ”خدا کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ صابرؒ غریب و مفلس نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کے شہنشاہوں سے بھی بڑا شہنشاہ ہے۔“

”پھر آپ اپنی صاحبزادی سے علی احمدؒ کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟“ جمیلہ خاتون نے عرض کیا۔

حضرت بابا فریدؒ بہن کی دلجوئی کے لئے اس رشتے پر رضامند ہو گئے۔

پھر ایک دن رسم نکاح کی انتہائی سادہ تقریب ادا ہوئی۔ اور خدیجہ بیگم کو دلہن بنا کر حضرت مخدوم علامہ صابرؒ کے حجرے میں پہنچا دیا گیا۔ خدیجہ بیگم عام طور پر بی بی شریفؒ کے نام سے مشہور ہیں۔

حضرت مخدوم علی احمدؒ نے ایک عورت کو عروسی لباس میں دیکھا تو جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ والدہ ماجدہ

پوچھا۔ ”اُم محترم! یہ کون خاتون ہیں؟ اور ان کا میرے حجرے میں کیا کام ہے؟“

والدہ ماجدہ نے بڑی محبت سے فرمایا۔ ”علی احمدؒ! یہ تمہاری شریک حیات ہیں۔“

تذکرہ نگاروں کے بقول اس وقت حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ حالتِ جلال میں تھے۔ آپ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور نہایت جذب کے عالم میں فرمایا۔

”مادر گرامی! میں تو ایک کا ہو چکا۔ پھر درمیان میں یہ دوسرا کون ہے؟“

جیسے ہی مخدوم علی احمدؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حجرے میں ایک شعلہ بھڑکا اور چٹوڑ مچا۔ دلہن جل کر خاکستر ہو گئی۔

جلال صابری کا یہ عالم دیکھ کر جمیلہ خاتون کو سکتے سا ہو گیا۔ پھر جب بہت دیر بعد ان کے ہوش وحوالہ ہوئے تو وہ زار و قطار روئی ہوئی حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

”یہ سب کچھ میری بے جا ضد کی وجہ سے ہوا۔“ جمیلہ خاتون شدتِ غم سے غڈ حال تھیں۔

”مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔“ جو اس سال بیٹی کی موت پر حضرت بابا فریدؒ نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا

ہوئے فرمایا۔ ”بجلم خدا، فقیر اس راز سے باخبر تھا۔ مگر تم سمجھ رہی تھیں کہ میں علی احمدؒ کی غربت کے سبب اس

سے دامن بچا رہا ہوں۔“

جمیلہ خاتون نے مزید اظہارِ غم کیا تو حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ”صبر کرو۔ مشیت کا یہی فیصلہ تھا اور اس لیے تالے والا کوئی نہیں۔ حق تعالیٰ ہم سب کو استقامت اور حوصلے عطا فرمائے۔“

بھائی کا صبر و ضبط دیکھ کر جمیلہ خاتونؒ کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں اضافہ ہو گیا۔

”میری عزیز بہن! مجھ پر جو گزرتا تھا، سو گز رنگی۔ مگر تمہیں میری نصیحت یہی ہے کہ اپنے بیٹے کو اس کاہ پر چھوڑ دو۔ علی احمدؒ کسی اور ہی منزل کا مسافر ہے۔“

صوفیاء کی مجالس خصوصاً صابریہ کے عقیدت مندوں میں یہ الم ناک واقعہ ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔ تاریخ کے طالب علم کے لئے اس واقعے کو سن و عن تسلیم کرنا بہت دشوار ہے۔

سب سے پہلی بات کہ عام تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت مخدومؒ کی والدہ ماجدہ کا انتقال 614ھ میں ہوا

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضرت مخدومؒ 592ھ کے بجائے 610ھ کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح جمیلہ خاتون کے انتقال کے وقت حضرت مخدوم احمد صابرؒ کی عمر مبارک چار سال تھی۔ اور اس عمر میں شادی کی تقریب

انجام پذیر ہو سکتی ہے۔ لہذا ہمیں تسلیم کرنا ہو گا کہ جلیلہ خاتونؒ کی رحلت کی تاریخ بھی درست نہیں۔ جب اہم تاریخوں کا ہی تعین نہیں تو پھر وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت مخدوم علی احمد صابرؒ کی شادی کا واقعہ کس سال پیش آیا تھا۔

جو لوگ اس واقعے کی صحت سے انکار کرتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر حضرت مخدوم علی احمد صابرؒ حضرت بابا فریدؒ کے داماد ہوتے تو قدیم ترین تذکرے ”سیر الاولیاء“ میں اس اہم ترین سانچے کا ذکر ضرور موجود ہوتا۔ ”سیر الاولیاء“ کی اہمیت یہ ہے کہ اسے سید امیر خورڈؒ نے 752ھ میں تحریر کیا تھا۔ مصنف نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا آخری زمانہ انہی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لئے سید امیر خورڈؒ کے ذہن میں معتبر روایتوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا اور اس وقت کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کے ذہنوں میں حضرت بابا فرید الدین مسعودؒ شکرؒ کے آخری ایام کی بہت سی یادیں محفوظ تھیں۔ اس لئے حلقہ اعتبار میں ”سیر الاولیاء“ کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس بابہ ناز تالیف کے بارے میں اعجاز الحق قدسی فرماتے ہیں۔ ”سلسلہ شیعہ نظامیہ کے متعلق معلومات کی جو شیخ سید امیر خورڈؒ نے روشن کی تھی، اس سے تمام متاخر تذکرہ نگاروں نے اکتساب نور کیا ہے۔ متاخرین کا کوئی تذکرہ ایسا نہیں جس میں ”صاحب سیر الاولیاء“ کی فراہم کی ہوئی معلومات بکھری ہوئی نہ ہوں۔“

سید امیر خورڈؒ نے اپنی تصنیف ”سیر الاولیاء“ میں حضرت بابا فریدؒ کی تین صاحبزادیوں کا ذکر کیا ہے۔ سید امیر خورڈؒ کے والد محترم سید محمد مبارکؒ کے بقول شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فریدؒ کی سب سے بڑی صاحبزادی بی بی مستورہ تھیں جو آخر دم تک پردہ صلاح و عفت و کرامت میں رہیں اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بی بی مستورہ نے شادی نہیں کی تھی۔

دوسری صاحبزادی بی بی شریفہ تھیں، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ان ہی پاکیزہ خاتون سے حضرت مخدوم احمد علی احمد صابرؒ کی شادی ہوئی تھی اور آپ شب عروسی ہی میں جلال صابری کی نذر ہو گئی تھیں۔

”سیر الاولیاء“ کی روایات کے مطابق حضرت بی بی شریفہؒ جو جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد آپ طویل مدت تک حیات رہیں مگر دوسری شادی نہیں کی۔ بیوہ ہونے کے بعد حضرت بی بی شریفہؒ یاد الہی میں اس طرح مشغول ہوئیں کہ ان کی ریاضت و عبادت کو دیکھ کر حضرت بابا فریدؒ فرمایا کرتے تھے۔

”اگر عورتوں کو خلافت دینا جائز ہوتا تو میں بی بی شریفہؒ کو دیتا۔“

ایک اور موقع پر حضرت بابا فریدؒ نے اپنی صاحبزادی کی بلند کرداری کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اگر تمام عورتیں ایسی ہوتیں جیسی کہ بی بی شریفہؒ ہیں تو عورتیں، مردوں پر سبقت لے جاتیں۔“

سیر الاولیاء کی اس روایت سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت بی بی شریفہؒ کی شادی حضرت مخدوم علی احمد صابرؒ کے بجائے کسی دوسرے بزرگ سے ہوئی تھی۔

سید امیر خورڈؒ تحریر کرتے ہیں۔ ”حضرت بابا فریدؒ کی تیسری صاحبزادی بی بی فاطمہؒ تھیں، جن کی شادی مشہور بزرگ حضرت مولانا بدر الدین اسحاقؒ سے ہوئی تھی۔ حضرت مولانا اسحاقؒ کا شمار حضرت بابا فریدؒ کے نامور خلفاء میں ہوتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت مولانا بدر الدین اسحاقؒ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب تک مولانا زندہ رہے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے کسی کو بیعت نہیں کیا۔“

حضرت مولانا بدر الدین اسحاقؒ کا انتقال اجودھن (پاک پٹن) میں ہوا اور آپ اسی زمین میں آسودۂ خاک ہوئے۔ انتقال کے وقت مولانا اسحاقؒ نے دو صاحبزادے خواجہ امامؒ اور خواجہ موسیٰؒ چھوڑے، جو بہت چھوٹے تھے۔

اس طرح حضرت بابا فریدؒ کی تیسری صاحبزادی بی بی فاطمہؒ بھی جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔
حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو حضرت مولانا بدر الدین اسحاقؒ سے ایک تعلق خاص بھی تھا۔ اس لئے
صاحبزادوں کی پرورش کی طرف سے بہت زیادہ پریشان رہتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ
خواہش تھی کہ بی بی فاطمہؒ اور ان کے دونوں بچے کسی طرح دہلی تشریف لے آئیں تاکہ آپ مولانا بدر الدینؒ
کی رفاقت و محبت کا کچھ حق ادا کر سکیں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ دن رات اسی فکر میں مبتلا رہتے تھے کہ
اس قدر تنگ تھا کہ اجودھن تک کا سفر کرنے کے لئے چند روپے بھی میسر نہ تھے۔
آخر ایک دن اس سلسلے میں حضرت محبوب الہیؒ نے امیر خورڈ کے دادا سید محمد کرمانی سے مشورہ کر
اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

سید احمد کرمانی نے جواباً کہا۔ ”ہم سب پر مولانا بدر الدین اسحاقؒ کے بچوں کی دیکھ بھال واجب
مولانا مرحوم نے اکثر اوقات ہم سب کی مدد کی ہے۔“
ابھی محبوب الہیؒ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت سید محمد کرمانیؒ کے دوران یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ
ایک سوداگر نے باریابی کی اجازت چاہی۔ یہ تاجر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ہمسایہ تھا۔ سوداگر کو اس
دورے میں معقول فائدہ ہوا تھا۔ اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں دو اشرفیاں بطور نذر پیش
پھر جب ملتانی تاجر کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا گیا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایک اشرفی حضرت سید
دیتے ہوئے فرمایا۔ ”اسے آپ اپنے استعمال میں لائیے۔“ پھر دوسری اشرفی دے کر فرمایا۔ ”سید صاحب! مولانا بدر الدین اسحاقؒ کے بچوں کے سفر خرچ کے لئے ہے۔ آپ اس خاندان کے محرم ہیں۔ اسی وقت
روانہ ہو جائیے۔ مجھے مولانا مرحوم کے بچوں کی فکر کھائے جا رہی ہے۔“

حضرت سید محمد کرمانی سارے کام چھوڑ کر اسی وقت اجودھن روانہ ہوئے اور پھر کچھ دن بعد حضرت
بدر الدین اسحاقؒ کی زوجہ محترمہ حضرت بی بی فاطمہؒ اور دونوں صاحبزادوں کو لے کر دہلی واپس آئے۔
حضرت بابا فرید الدین مسعودؒ شکرؒ کی صاحبزادی محترمہ اور نواسوں کی آمد کی خبر کوئی عام نہیں تھی۔
تینوں محترم ہمتیاں دہلی کی حدود میں داخل ہوئیں، پورے شہر میں چرچے ہونے لگے۔

کچھ دن بعد دہلی کے کلی کوچوں میں عجیب عجیب چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ پہلے عزیز واقارب اور
گمان ہوا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بی بی فاطمہؒ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ پھر یہ خبر خاص و عام
ہو گئی۔ مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ ریاضت و عبادت میں مشغول ہونے کے سبب ان افواہوں سے بے خبر رہے۔
آخر ایک دن یہ خبر سید محمد کرمانیؒ تک بھی پہنچی جسے سن کر آپ پریشان ہوئے۔ پھر ایک رات تہا
صاحب، حضرت محبوب الہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔

”سیدی! بی بی فاطمہؒ کے دہلی لانے پر لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔“

حضرت محبوب الہیؒ نے بڑی حیرت سے سید محمد کرمانیؒ کی طرف دیکھا۔

”لوگوں کا خیال ہے کہ بی بی فاطمہؒ کو دہلی بلانے سے آپ کا مقصد ہی دوسرا ہے۔“ سید محمد کرمانیؒ نے پوچھا۔

اور افواہوں کی وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا۔

لوگوں کی قیاس آرائیاں سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے چہرہ مبارک پر اذیت و کرب کے آثار ابھرنے
سید محمد کرمانیؒ کے بقول حضرت محبوب الہیؒ بہت دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں بیٹھے اپنی ریش مبارک

پھرتے رہے۔

پھر دوسرے دن علی الصباح حضرت نظام الدین اولیا اپنے چند خدام کے ساتھ حضرت بابا فریدؒ کے مزار مبارک پر حاضری دینے کے لئے اجمودھن روانہ ہو گئے۔

کچھ دن بعد حضرت محبوب الہیؒ دہلی کی طرف عازم سفر ہوئے۔ ابھی آپ راستے میں تھے کہ حضرت بی بی فاطمہؒ کا انتقال ہو گیا۔ بظاہر اس پاکباز خاتون کو کوئی مرض لاحق نہیں تھا۔ حضرت بی بی فاطمہؒ کو ان کے حقیقی چچا حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے مزار مبارک کے باہر ”دروازہ منہ“ میں دفن کیا گیا۔

جس روز حضرت نظام الدین اولیا، دہلی تشریف لائے، اس دن حضرت بی بی فاطمہؒ کا سوم تھا۔ حضرت محبوب الہیؒ حضرت نجیب الدین متوکلؒ کے روضہ مبارک پر حاضر ہو کر حضرت بی بی فاطمہؒ کے سوم میں شریک ہوئے۔

ہم نے ”سیر الاولیاء“ کے حوالے سے حضرت بابا فریدؒ کی تینوں صاحبزادیوں کے مختصر حالات رقم کر دیئے۔ اس معتبر اور مستند تالیف میں حضرت بابا فریدؒ کی چوتھی صاحبزادی کا برائے نام بھی ذکر موجود نہیں۔

عوام میں مشہور ہے کہ حضرت مخدوم علی احمد صابرؒ، حضرت بابا فریدؒ کے داماد بھی تھے مگر تمام تذکرے اس قسم کے واقعات سے خالی ہیں۔



حضرت امام ابو صالح محمدؒ کی شہادت کے بعد سہارنپور، ہردوار اور ڈیرہ دون وغیرہ کے علاقوں میں اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی۔ مگر دولت و اقتدار نے یہاں کے مسلمان حاکم کو کافرانہ عیش و عشرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ جب حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ یہاں تشریف لائے تو قدم قدم پر عدم مساوات، نا انصافی اور معاشی نا ہمواری کے مظاہر موجود تھے۔ حکمران طبقہ اور اس کے کارندے، عوام الناس کی خدمت سے بے خبر صرف اپنی شکم پروری اور نفس پرستی میں مشغول تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شمشیر و سناں کے بجائے چنگ و رباب تھے۔ اور وہ کھلے عام احکام شرعیہ کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔

حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ، کلیر تشریف لائے تو ایک چھوٹی سی سرائے میں ٹھہرے، جس کی مالکہ ایک غریب عورت تھی۔

حضرت مخدومؒ نے کار و لایت کا آغاز اس طرح کیا کہ آپ نماز کی ادائیگی کے لئے جامع مسجد تشریف لے جاتے اور نماز کے بعد حاضرین کو جمع کر کے تقریر فرماتے۔ آپ اپنے وعظ میں حکمران طبقے کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے اور عذاب الہی سے ڈراتے۔ حضرت مخدومؒ کا لہجہ نہایت بے باک تھا۔ اس لئے حراج شہریاری برہم ہوتا چلا گیا۔ پھر ان اوباش امراء نے ایک نئی ترکیب نکالی۔ اپنے کارندے مگر گمراہ بیچ کر کلیر کے باشندوں کو خبردار کر دیا کہ اگر وہ لوگ آئندہ اس درویش کے وعظ میں شریک ہوئے تو انہیں دردناک سزا دی جائے گی۔

کمزور اور بے وسیلہ لوگ، حاکم کلیر کی اس دھمکی سے اس قدر ہشت زدہ ہوئے کہ بعض افراد نے تو جامع مسجد میں نماز پڑھنا ہی چھوڑ دی۔ باقی نمازیوں کا یہ حال تھا کہ نماز ادا کرتے ہی مسجد سے اٹھ کر چلے جاتے۔ حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ نے بڑی حیرت سے لوگوں کی یہ بدلی ہوئی روش دیکھی، پھر بڑے پُر سوز لہجے میں پکارا۔ ”لوگو! تم کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا یہ عمل کیسا خطرناک ہے کہ میں تمہیں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں اور تم منہ

پھیرے دنیا کی جانب بھاگے چلے جا رہے ہو۔“

حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ نے گشتہ لوگوں کو مسلسل آوازیں دیتے رہے، مگر کسی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

جلال صابری اس طرزِ تغافل کو برداشت نہیں کر سکتا تھا..... مگر حضرت مخدوم علی احمد رحمۃ اللہ علیہ منصبِ ولایت سے مجبور تھے۔ پھر بھی آپ نے اشارتاً کلیئر کے باشندوں سے یہ بات کہہ دی۔

”میں تمہیں ایک ایسے عذاب کی خبر دیتا ہوں جو ایک سیاہ اور گہرے بادل کی طرح کلیئر کی فضا کو گھیرے۔ اور وہ بادل برسنے ہی والا ہے۔ اللہ سے ڈرو اور سچے دل کے ساتھ اپنے گناہوں سے تائب ہو۔ شک! اللہ تمہارے اندازوں سے زیادہ معاف کرنے والا ہے۔“

حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ کی یہ تنبیہ بھی رائیگاں گئی۔ عوام تو مجبور تھے۔ حکمران طبقے نے ایک ساتھ کھل کر استہزا کیا۔

”یہ فقیر بے سرو سامان عذاب کی خبر دیتا ہے مگر عذاب لے کیوں نہیں آتا؟“

حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ نے بدست و بدکار امراء کے یہ جارحانہ تبصرے سنے اور آپ مبارک پر رنگ ملال ابھر آیا۔

بالآخر آپ نے اپنے پیرومرشد حضرت بابا فریدؒ کو ایک خط تحریر کیا، جس میں اہالیانِ کلیئر کی بے راہروں حال درج تھا۔

”سیدی! میں ان لوگوں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔ مگر ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ کلامِ نرم و نازک کا اثر نہیں ہوتا۔ ان لوگوں نے میری طرف سے پیٹھ موڑ لی ہے اور اپنی سماعتیں بند کر لی ہیں۔ میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کروں؟“

اپنے محبوب بھانجے اور خلیفہ کا خط پڑھ کر حضرت بابا فریدؒ گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔ بہارِ حالتِ جلال میں حضرت مخدوم علی احمدؒ کے نام ایک مختصر خط تحریر فرمایا۔

”صابر! تم پر واضح ہونا چاہئے کہ کلیئر تمہاری بکری ہے۔ میں تمہیں پورا اختیار دیتا ہوں کہ خواہ تم اس دودھ پیو یا گوشت کھاؤ۔“

بعض بزرگوں نے اس واقعے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت علاء الدین صابرؒ کے اب بیکار عمل سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ آپ اس بکری کا دودھ پینا چاہتے تھے، مگر بکری کی بد قسمتی یہ تھی کہ اس نے بیکار کے سامنے انتہائی سرکشی اختیار کر لی تھی۔

مشہور بزرگ حضرت شیخ الہدیہؒ نے اپنی تصنیف ”سیر الاقطاب“ میں اس روایت کو ذرا مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ شیخ الہدیہؒ کے مطابق حضرت بابا فریدؒ نے جواباً تحریر فرمایا تھا۔ ”کلیئر کی ولایت تمہارے پر ہے۔ تم اختیار ہے۔ جو چاہو، کرو۔“

روایتیں مختلف ہیں مگر دونوں کا منہوم ایک ہی ہے۔

آخر وہ وقت معلوم آ پہنچا، جو سرکشوں کی سرکشی، گمراہوں کی کج روی اور باغیوں کی بغاوت کو ہمیشہ کے لیے کر کے انہیں نشانِ عبرت بنا دیتا ہے۔

حضرت مخدومؒ جس سرائے میں رہتے تھے، آپ نے اس کی مالکہ کو بلا کر فرمایا۔ ”میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں آج تم اپنے بیٹے کو مسجد میں نہ بھیجنا۔“

سرائے کی مالکہ حضرت مخدوم علی احمد صابرؒ کی عارفانہ شخصیت سے ناواقف تھی، اس لئے آپ کی تنبیہ کا سمجھنے سے قاصر رہی اور اپنے بیٹے کو ہدایت نہ کر سکی۔

سراے کی مالکہ کا جواں سال بیٹا نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے جامع مسجد چلا گیا۔
حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ مسجد میں داخل ہوئے اور عین امام کی نشست کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ ابھی آپ کو بیٹھتے ہوئے چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ چند سرکاری کارکن آگے بڑھے اور تحقیر آمیز لہجے میں حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”یہاں سے اٹھ جاؤ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ جگہ حاکم کلیر کے لئے مخصوص ہے؟“

حضرت مخدومؒ نے نہایت صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”خانہ خدا میں امام اور مکرم (بکبیر کہنے والے) کے سوا کسی نمازی کے لئے کوئی جگہ مخصوص نہیں ہوتی۔ پہلے آنے والا اگلی نشست میں جگہ پائے گا اور بعد میں آنے والا پیچھے بیٹھے گا۔“

سرکاری کارندوں نے حضرت مخدومؒ کی کوئی دلیل نہیں سنی اور آپ کو پچھلی صف میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد کچھ اور سرکاری کارندے آئے اور دعویٰ کیا کہ دوسری صف ان کے بیٹھنے کے لئے مخصوص ہے۔ دراصل یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا، جس کے تحت حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیر کرنا تھی۔ انجام کار حضرت مخدومؒ کو اتنی بار اٹھایا گیا کہ آپ مسجد سے باہر جانے پر مجبور ہو گئے۔ وہ کسی عجیب صورت حال ہوگی، جب سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ کو وہاں جگہ میسر آئی جہاں نمازیوں کے جوتے رکھے جاتے تھے۔ سب سے آخر میں حاکم کلیر آیا اور تمام حاضرین مسجد اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ گویا خانہ خدا بھی کسی امیر کا دربار بن گیا تھا۔ حضرت مخدوم علی احمدؒ نے بڑی اذیت کے ساتھ یہ منظر دیکھا۔

پھر امام نے خطبہ پڑھا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ اس کے بعد قیام درکوع کے مرحلوں سے گزر کر نماز کی سجدے میں گئے۔ حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت پُر جلال لہجے میں جامع مسجد کے بلند میناروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”سارا عالم اپنے خالق کے حضور میں اپنی بندگی کا اظہار کر رہا ہے۔ پھر تُو سجدہ کیوں نہیں کرتی؟“

جیسے ہی حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، جامع مسجد کلیر بھی سجدہ ریز ہو گئی۔ مضبوط ترین بنیادیں زمین میں دھنس گئیں اور تمام نمازی بلے کے ڈھیر میں دفن ہو گئے۔

پھر جب یہ خبر شہر میں پہنچی تو ایک کہرام برپا ہو گیا۔ سراے کی مالکہ کا بیٹا بھی نماز پڑھنے گیا تھا۔ وہ دیوانہ وار روتی ہوئی جامع مسجد پہنچی۔ وہاں ہر طرف اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر تھا۔ سراے کی مالکہ یہ ہولناک منظر دیکھ کر چیخ اٹھی۔

”یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ہائے میرا جوان مرگ بیٹا۔“ سراے کی مالکہ کا روئے سخن حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تھا۔

”میں تو پہلے ہی تمہیں خبردار کر دیا تھا۔“ حضرت مخدومؒ نے فرمایا۔ ”پھر تم مجھے الزام کیوں دیتی ہو؟“

”سراے کی مالکہ نے حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی دلیل نہیں سنی۔ وہ بار بار آپ ہی کو اپنے بیٹے کی موت کا ذمے

دار ٹھہراتی رہی۔

آخر حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ سے برداشت نہ ہو سکا۔ آپ نے انتہائی پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”اگر میری وجہ سے تیرا بیٹا ہلاک ہوا ہے تو اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر میں اسے تلاش کر لے۔“ یہ کہہ کر حضرت مخدومؒ نے ایک طرف اشارہ کیا۔

سرائے کی مالکہ بدحواسی کے عالم میں اس طرف دوڑی اور ملے بٹانے لگی۔ پھر یہ منظر دیکھ کر ہلکا سا ہنسٹا ہوا گیا کہ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر میں دب جانے کے باوجود اس کا بیٹا صحیح و سلامت تھا۔ لہذا آج جسم پر چند ہلکی سی خراشیں آئی تھیں۔ سرائے کی مالکہ نے حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی دلت اور گستاخانہ طرز کلام کی معافی مانگی، آپ کے دست مبارک کو بوسہ دیا اور اپنے بیٹے کو لے کر چلی گئی۔



کسی زمانے میں دہلی سے ایک مذہبی جریدہ ”مولوی“ شائع ہوا کرتا تھا۔ اسی رسالے نے آج سے پہلے اپنی 1357ء کی اشاعت میں ”اولیاء نمبر“ شائع کیا تھا۔ جس میں حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک مضمون شائع ہوا تھا۔

رسالہ ”مولوی“ کے بیان کردہ واقعات کے مطابق جامع مسجد کے منہدم ہو جانے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر جلال و غضب کا شدید جذبہ طاری ہو گیا اور ”شمشیر صابری“ بے نیام ہو گئی، جس سے لوگ ہلکا سا انہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ شہر میں ایک دباے عظیم پھیلی جس نے ہر طرف ایک قیامت سی برپا کر دی۔ پھر یہ کہ ایک گھر سے ایک ایک وقت میں دس دس جنازے نکلتے تھے۔ وہ بازار مرگ گرم ہوا کہ بھرے شہر میں بچ گیا۔ لاشوں کو دفنانے والا تک نہیں ملتا تھا۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ جہر جس کا منہ اٹھتا، ہمالیہ مگر بھاگنے والوں کو کہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ جو جس طرف گیا، موت اس کے تعاقب میں گئی۔ چند روز کے ہندوستان کا یہ دولت مند اور بادوق شہر، ہو کا میدان بن گیا۔ جو لوگ جہاں اور جس جگہ مرے، وہیں اپنے گدھ اور دوسرے مردار خور پرندے، انسانی گوشت کھاتے کھاتے اُکٹا گئے۔ پھر انسانی ہڈیاں گل کر رکھ دی گئیں۔

رسالہ مولوی کی اس روایت سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُسرائے کلیر کے ساتھ رہا باشندے بھی حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کو اذیتیں پہنچانے کے عمل میں عکمران طبقے کے ساتھ شامل نہ لے کر ان طبقے کے ساتھ عوام الناس بھی عذاب الہی کا شکار ہوئے۔

دوسری اہم بات یہ کہ حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں شہر کلیر ایک ہولناک وبا کی لپیٹ میں آ گیا صاحب مضمون نے اپنے مقالے میں اس وبا کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ طاعون یا کوئی خوف ناک وبا ہوگی۔ ماضی قریب میں ایسی وباؤں کے زہریلے اثرات سے گاؤں کے گاؤں متاثر ہوتے جاتے تھے۔ میڈیکل سائنس کی انتہائی ترقی کے باوجود کچھ سال پہلے ہندوستان میں بھی طاعون کی وبا پھیلنے نے کچھ دنوں کے لئے پوری مہذب اور ترقی یافتہ دنیا کو لرزہ بر اندام کر دیا تھا۔

خليفة ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانے میں بھی طاعون کی ایک ہولناک وبا پھیلی تھی، جس میں ہزاروں موت کی خوراک بن گئے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی وبا میں عظیم و جلیل صحابی امین الامت حضرت ابوبکر جراح بھی شہید ہوئے تھے۔

بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق شہر کلیر کی تباہی ”جلال صابری“ کا نتیجہ تھی۔ اس کے برعکس علامہ رحمۃ اللہ علیہ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس قسم کی روایتیں تاریخی حوالوں سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ اس لئے ان روایتیں اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے نزدیک اس بے اعتباری کا کوئی منطقی جواز موجود نہیں۔ جب حضرت نوح علیہ السلام اذیتیں پہنچانے کی پاداش میں پوری دنیا کو تباہ کیا جاسکتا ہے تو پھر کلیر کی بربادی صرف قرین قیاس ہی نہیں

حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔ راقم الحروف حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر کئی بار حاضر ہوا ہے۔ اگر ایک عام انسان بھی کھلی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرے تو اسے صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کلیر کی فضاؤں میں ایک عجیب سی آوازی اور دیرانی محسوس ہوگی۔

تصوف کی دنیا میں آنکھ اور عقل سے زیادہ محسوسات کی ضرورت ہوتی ہے۔ محققین نے کلیر کے موضوع پر معتبر اور غیر معتبر روایات کے انبار لگا دیئے۔ مگر اس تاریخی شہر کی موجودہ آوازی اور دیرانی کا سبب بیان نہیں کیا۔ حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کو سو سات سو سال گزر چکے ہیں۔ صدیوں کے اس سفر میں مکانی تعمیرات کا سلسلہ بھی بڑھا اور آبادیاں بھی قائم ہوئیں۔ لاکھوں زائرین عرس مبارک میں شریک ہوتے ہیں، سینکڑوں قوالوں کی آوازیں گونجتی ہیں، مگر پھر بھی ایک عجیب سی خاموشی اور تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل یہ حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت ہے جو اپنی فطرت کے مطابق کلیر کی فضاؤں پر محیط ہے۔ حضرت مخدوم علی احمد رحمۃ اللہ علیہ بچپن سے گوشہ نشین اور تنہائی پسند تھے۔

اب بچپن سے لے کر جوانی تک کی کچھ روایتوں کو دہرایئے۔ پھر حضرت مخدوم کی حیات مبارکہ کے کچھ پہلو واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ نے جب بولنا سیکھا تھا تو آپ کی زبان مبارک سے پہلا کلمہ اس طرح ادا ہوا تھا۔
 ”لا موجود الا اللہ“ (اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے)

لا الہ الا اللہ کا مطلب ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لا مجود الا اللہ میں اللہ کے معبود ہونے کا اقرار بھی پوشیدہ ہے..... اور یہ حقیقت بھی پنہاں ہے کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں کوئی دوسرا موجود نہیں۔ پہلے کلمے میں مہبودوں کی نفی کی جاتی ہے۔ اور دوسرے کلمے میں موجودات کی۔ موجودات کی نفی کرنے والے درویشوں کی زندگی یا تو قلندرانہ انداز میں گزرتی ہے یا پھر ان پر جذب کی شدید کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کا روانہ جذوباں کے امیر تھے۔

تاریخ حضرت مخدوم کو حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا داماد ثابت کرے یا نہ کرے، مگر یہ سچ ہے کہ حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ اپنے اور اللہ کے درمیان کسی تیسری، ہستی کو حائل دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ حضرت مخدوم کا مشہور قول تھا۔
 ”جب میں ایک کا ہو چکا تو پھر یہ درمیان میں دوسرا کون ہے؟“

ہمارا خیال ہے کہ شادی کے معاملے میں بھی حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ نے والدہ محترمہ سے یہی عرض کیا ہوگا..... اور پھر مادر گرامی نے اپنے عارف بیٹے کی شادی کا ارادہ ملتوی کر دیا ہوگا۔

جب ایک درویش کی مزاجی کیفیت یہ ہو کہ وہ اپنی زندگی میں کسی تیسرے کی موجودگی کو برداشت نہ کرتا ہو تو مرنے کے بعد اس کی قبر میں یہی تاثیر جذب ہو جائے گی۔ قبر ہمیشہ صاحب قبر سے پہچانی جاتی ہے۔ صاحبانِ جلال کی مرقدوں سے رنگِ جلال ہی جھلکتا ہے..... اور صاحبانِ جمال کی آرام گاہوں پر پھولوں کی مہک، شبنم کی لطافت اور چاندنی کی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔

حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ تنہائی چاہتے تھے، اس لئے قدرت نے انہیں کلیر کا ویرانہ عطا فرمادیا۔ سلسلہ روز و شب نے بہت سی بتیاں بسا ڈالیں، مگر کلیر کو دیکھ کر آج بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔

کئی بار اس کا دامن بھر دیا، حسنِ دو عالم سے مگر دل ہے کہ اس کی خانہ دیرانی نہیں جانی!

۱۲



”اخبار الصالحین“ کی روایت کے مطابق کلیر کی دیرانی کے بعد حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ چتر کی شدید کیفیت طاری ہو گئی۔ آپ گولر کے درخت کی شاخ پکڑ کر کھڑے ہو جاتے اور کئی گنا دلہنہ سے ریاضت میں مشغول رہتے۔ ہوش آتا تو اسی درخت کے گولر کھا لیتے اور کسی دریائی جھٹے سے پانی کا گرد و لواج کے لوگ زیارت کے لئے حاضر ہونا چاہتے، مگر جلال صابری انہیں آگے بڑھنے سے روک دیتے۔ ایک دن اجودھن (پاک پٹن) میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی مجلس روحانی آرازی میں حضرت بابا فریدؒ نے اپنے مریدین اور خدام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میرے صابر کو کمال زمانہ گزر گیا ہے۔ تم میں سے کوئی ہے جو صابر کو عالم ہوش میں واپس لائے؟“

پاک پٹن کے لوگ پہلے ہی حضرت مخدوم علی احمدؒ کی کیفیت جلال سے واقف تھے، اس لئے فریدؒ کے مریدین اور خدام میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ برقی جلال کا سامنا کر سکے۔ سب سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔

حضرت بابا فریدؒ دوبارہ حاضرین سے مخاطب ہوئے۔ ”کیا تم میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو حاضرین مجلس میں حضرت شمس الدین ترکؒ بھی موجود تھے۔ یہ بزرگ ترکی سے پیر و مرشد اجودھن آئے تھے اور حضرت بابا فریدؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کی درخواست کی تھی۔ حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا تھا۔

”شمس الدین! تمہارا حصہ کلیر میں ہے۔“

موقع غنیمت جان کر حضرت شمس الدین ترکؒ نے عرض کیا۔ ”سیدی! خادم حاضر ہے۔“

”شمس الدین! اگر تم میرے صابر کو عالم نحو (ہوش) میں لے آئے تو پھر انعام کے مستحق ٹھہرے۔“

بابا فریدؒ نے خوش ہو کر فرمایا۔

پھر حضرت شمس الدین ترکؒ نے حضرت بابا فریدؒ کے دست مبارک کو بوسہ دیا اور کلیر شریف کی طرف ہو گئے۔



آخر طویل سفر تمام ہوا اور حضرت شمس الدین ترکؒ کلیر کی حدود میں داخل ہوئے۔ آپ کو کلام ایک عجیب سے ہیبت و جلال کا احساس ہوا۔ حضرت شمس الدین ترکؒ سمجھ گئے کہ یہ جلال صابری کا اثر ہے۔ کلام الہی کی تلاوت شروع کر دی۔ حضرت شمس الدین ترکؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ”طیور“ دیکھتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو دو معجزات بطور خاص عطا کئے گئے تھے۔ ایک یہ کہ لوہا آپ کے دست میں آکر موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور حضرت داؤدؒ اس لوہے سے مختلف ہتھیار بنایا کرتے تھے۔ دوسرا معجزہ شیریں اور اثر انگیز آواز تھی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام ”زبور مقدس“ کی فرماتے تھے تو پوری کائنات پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور آپ کے ساتھ پہاڑ، جنگل، دریا، پرند بھی ہم آواز ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب کوئی شخص انتہائی خوش آواز ہوتا ہے تو اس کی آواز ”لکن داؤدی“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت شمس الدین ترکؒ کو بھی یہ صفت خاص بخشی کی گئی تھی۔ آپ جہ تلاوت قرآن کریم کرتے، پوری محفل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور دلوں میں اس قدر گداز پیدا ہوتا کہ اگر

سے آنسو جاری ہو جاتے۔

حضرت شمس الدین ترک کلام الہی کی تلاوت کرتے ہوئے حضرت علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ گولہ کے درخت کی شاخ پکڑے ہوئے کھڑے تھے اور آپ پر شدید محویت کا عالم طاری تھا۔

حضرت شمس الدین ترک کچھ دیر تک قرآن مقدس کی تلاوت کرتے رہے۔ پھر آپ نے حضرت مخدوم علی احمد صابرؒ کے جسم مبارک میں ہلکی سی جنبش محسوس کی۔

حضرت شمس الدین ترک کو اُمید ہو چلی تھی کہ حضرت مخدومؒ حالتِ سکر (مدہوشی) سے عالم صحو کی طرف لوٹ آئیں گے۔ یکایک آپ نے تلاوت بند کر دی۔

”خاموش نہ ہو کہ یہ کلام ہماری زندگی ہے۔“ حضرت مخدوم علی احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی مگر آنکھیں بدستور بند تھیں۔

حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ کی آواز مبارک سن کر حضرت شمس الدین ترک پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر آپ نے کانپتے ہوئے لہجے میں عرض کیا۔ ”مخدوم! آپ کا یہ خادم ایک کمزور انسان ہے۔ اس لئے زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا۔“ ”کھڑے نہیں رہ سکتے تو پھر بیٹھ کر پڑھو۔“ حضرت مخدوم علی احمد صابرؒ نے فرمایا اور اس کے ساتھ ہی آنکھیں کھول دیں۔

”غلام! آقا کے سامنے بیٹھنے کی جرأت کس طرح کر سکتا ہے؟“ حضرت شمس الدین ترکؒ نے عرض کیا۔ ”اچھا! ہم بھی بیٹھ جاتے ہیں۔“ اتنا فرما کر حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ فرشِ خاک پر تشریف فرما ہوئے۔

”اور تم بھی بیٹھ جاؤ۔ مگر تلاوت کلام الہی جاری رکھو۔“ حضرت شمس الدین ترکؒ بہت دیر تک تلاوت کرتے رہے۔ آپ کی خوش الحانی کا یہ عالم تھا کہ حضرت مخدوم علی احمد رحمۃ اللہ علیہ پر سرشاری کی عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔

پھر جب تلاوت ختم ہوئی تو حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شمس الدین ترکؒ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تمہاری قرأت نے ہماری روح کو تازہ دم کر دیا ہے۔“

”یہ سب حضرت مخدوم کا صدقہ ہے۔“ حضرت شمس الدین ترکؒ نے عرض کیا۔

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“ حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”مخدوم کی خدمت و قربت کا طالب ہوں۔“ حضرت شمس الدین ترکؒ نے عرض کیا۔

حضرت علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طالب کی یہ درخواست قبول فرمائی۔ پھر آپ نے اپنے پیرومرشد حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا حال دریافت کیا۔

”میں شیخ شیوخ العالم کے حکم سے ہی یہاں حاضر ہوا تھا۔“ حضرت شمس الدین ترکؒ نے پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”حق تعالیٰ نے میری یہ خدمت قبول فرمائی اور شیخ شیوخ العالم کی بارگاہ میں سرخرو کر دیا۔“

اس کے بعد حضرت شمس الدین ترکؒ، حضرت مخدومؒ سے اجازت لے کر دوبارہ اجدہن میں حاضر ہوئے اور حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت علی احمدؒ کے ہوش میں آنے کی نوید سنائی۔

”شمس الدین! تمہیں مبارک ہو۔ تم نے بڑا کام کیا۔“ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت مسرت کے عالم میں

فرمایا۔ ”ہم نے تم سے اس خدمت کے صلے میں انعام کا وعدہ کیا تھا۔ اب مانگو، کیا مانگتے ہو؟“
 ”یہ خادم حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت گزاری کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔“ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔
 ”نفس الدین! تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں یہ سعادت حاصل ہوئی۔“ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے چلے جاؤ۔ تمہارا حصہ صابر کے پاس ہے۔“
 حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ کلیر تشریف لائے اور علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔



ایک روایت کے مطابق حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے چوبیس سال تک حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ میں رہے۔ پھر ایک دن حضرت مخدوم نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت سے سرفراز فرمایا اور فرمایا۔
 ”اے اللہ! رحمۃ اللہ علیہ میرا بیٹا ہے۔ تو اسے قبول فرمالے اور اس کے ذریعے میرے روحانی فرمادے۔“
 اس دعا کے بعد حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو پانی پت کی مال فرمائی۔

جواب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔
 ”پانی پت کی ولایت تو حضرت بوعلی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کی گئی ہے۔ پھر یہ خادم وہاں کرا اختیار کرے گا؟“
 ”دراصل پانی پت تمہاری ہی روحانی مملکت ہے۔“ حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں جاؤ گے تو بوعلی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ کہیں اور چلے جائیں گے۔“
 حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت چاہا کہ انہیں پیر و مرشد کی حضوری حاصل رہے۔ مگر حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ نے ہر بار یہی فرمایا۔

”نفس الدین! یہی مشیت الہی ہے۔ جب تم اس دیران جنگل میں رہو گے تو پھر مخلوق خدا رحمۃ اللہ علیہ پہنچاؤ گے؟ کلیر کی حدود سے باہر نکلو۔ بے شمار تشنگان معرفت تمہارے منتظر ہیں۔“
 آخر حکم شیخ سے مجبور ہو کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے پانی پت تشریف لے گئے۔ پھر ایسا ہی ہوا جو مخدوم علی احمد نے فرمایا تھا۔ حضرت بوعلی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پت کا علاہ چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر چلے گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے پانی پت کا علاہ چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر چلے گئے۔
 ”نفس الدین! تمہاری ملازمت اختیار کر لینا۔ مگر اپنے آپ کو دنیا والوں کی نظروں سے چھپائے رکھنا۔ اگر تم لوگوں پر ہماری زندگی کا آخری دن ہوگا۔“



روایت ہے کہ حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے ہوش میں آنے کے بعد حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے حسن آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس واقعے کی تفصیل اس طرح ہے کہ حسن توال ابو دھن سے

ہندوستان کے ان تمام علاقوں میں پہنچا، جہاں حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور عقیدت مند سکونت پذیر تھے۔ حسن قوال جہاں جہاں گیا، اس کی خوب خاطر مدارات کی گئی اور مختلف تحائف سے نوازا گیا۔ آخر میں اسے خیال آیا کہ حضرت بابا صاحبؒ کے محبوب خلیفہ اور بھانجے حضرت مخدوم علی احمد رحمۃ اللہ علیہ کلیر میں مقیم ہیں۔ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ سے دہری نسبت ہونے کے سبب حسن قوال کو امید تھی کہ وہ حضرت مخدومؒ کے آستانہ عالیہ سے بہت کچھ پائے گا۔

الغرض حسن قوال، کلیر شریف پہنچا تو اس شہر کو دیران پایا۔ بہت دیر تک عالم حیرت میں ڈوبا ادھر ادھر کھومتا رہا۔ حسن قوال کا خیال تھا کہ حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ ایک شاندار خانقاہ میں تشریف فرما ہوں گے اور خانقاہ کے دروازے پر عقیدت مندوں اور ضرورت مندوں کی ایک بھیڑ جمع ہوگی۔ مگر جب اس نے ہر طرف خاموشی اور سناٹا دیکھا تو قریب کے گاؤں میں پہنچا اور مقامی باشندوں سے پوچھنے لگا۔

”حضرت شیخ صابرؒ کی خانقاہ کس طرف ہے؟ اور ان کے کیا حال ہیں؟“

ایک ضعیف العمر شخص نے حسن قوال کو بتایا۔ ”شیخ صابرؒ ایک ٹیلے پر گولر کے درخت کے نیچے رہتے ہیں۔ وہیں گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی ہے۔ نہ وہ کسی سے ملتے ہیں اور نہ کوئی ان کے پاس جاتا ہے۔“

حسن قوال اس انکشاف پر حیران رہ گیا۔ ”لوگ شیخ صابر کے پاس کیوں نہیں جاتے؟“

”لوگ تو جانا چاہتے ہیں، مگر شیخ صابر کے رعب و جلال کی وجہ سے کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی۔“ بوڑھے شخص نے حسن قوال کو بتایا۔

یہ سن کر حسن قوال سخت متعجب ہوا مگر اسے خود بھی حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کی غلامی پر ناز تھا۔ اس لئے بے دھڑک اس ٹیلے کی طرف چلا گیا، جہاں حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ مقیم تھے۔

حسن قوال، جھونپڑی میں داخل ہوا، مگر وہاں حضرت علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ موجود نہیں تھے۔ پھر وہ بہت دیر تک جھونپڑی میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ مگر جب حضرت مخدومؒ تشریف نہیں لائے تو حسن قوال، جھونپڑی سے نکلا اور ادھر ادھر آپ کو تلاش کرنے لگا۔ آخر کچھ فاصلے پر حضرت مخدومؒ ایک درخت کے نیچے بیٹھے نظر آئے۔ حسن قوال آپ کے قریب پہنچ کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد حضرت علاء الدین صابرؒ نے آنکھ کھول کر دیکھا اور حسن قوال سے پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“

”بابا فریدؒ کا قوال۔“ حسن نے نہایت ادب سے عرض کیا۔

”کون بابا فرید؟“ حضرت مخدومؒ نے دوسرا سوال کیا۔

حسن قوال کو حضرت مخدومؒ کا یہ طرزِ استفسار پسند نہیں آیا۔ اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”آپ کے شیخ بابا فرید۔“

”میرے شیخ؟“ حضرت مخدومؒ کے چہرے پر بے پناہ مسرت کا رنگ اُبھر آیا۔ ”کیسے ہیں میرے شیخ؟“

حسن قوال نے حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کی خیریت بیان کی۔ حضرت مخدومؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور حسن قوال کو لے کر جھونپڑی میں آئے۔ کچھ دیر تک حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے احباب کے بارے میں گفتگو کرتے رہے، پھر مٹی کی ہانڈی میں سے کچھ گولر نکالے اور حسن قوال کو دیتے ہوئے فرمایا۔

”یہ تمہارا تھمہ ہے۔ اب تم جاؤ۔“

حسن قوال کی ساری امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ وہ ناخوشگوار کی عالم میں حضرت مخدومؒ کے دیئے ہوئے گولر لے کر اجودھن پہنچا۔

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے تمام مریدوں کی خیریت دریافت کی اور آخر میں حضرت مخدومؒ کے متعلق ”میرے صابر سے بھی ملے؟“

حسن قوال نے بڑی بے دلی سے تمام واقعات بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کے پاس تو سالم جھپٹ نہیں۔ بہت مغرور ہیں۔ جب میں نے حضرت کا نام لیا تو کہنے لگے کہ کون بابا فرید؟ جب میں نے بتا دیا کہ شیخ بابا فرید..... تو پھر پہچانے اور مجھ سے پوچھا کہ میرے شیخ کیسے ہیں؟“

حسن قوال کی گفتگو سن کر حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے دو رکعت نماز ادا کی اور حاضرین کو مخاطب کرتے فرمایا۔ ”اللہ کا شکر ہے کہ آج میں شیخ ہو گیا۔“

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد گرامی سن کر حاضرین نے عرض کیا۔ ”اس سے پہلے کیا آپ شیخ نہیں تھے؟“

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”تم نہیں جانتے کہ صابر کون ہے اور وہ کس مقام سے بول رہا تھا؟“

اس کے بعد حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مخدومؒ کے بھیجے ہوئے گولروں میں سے کچھ خود نشانہ فرمایا۔ حاضرین میں تقسیم کر دیئے۔ جس نے بھی وہ پھل کھایا، اس کے نورِ باطن میں ترقی ہوئی۔



حضرت مخدومؒ کے حکم کے مطابق حضرت شمس الدین ترکؒ، سلطان غیاث الدین بلبن کے لشکر میں ایک سوار کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ ایک بار فرمانروائے ہند نے قلعہ ”اوس“ کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا خیال تھا کہ قلعہ چند روز میں فتح ہو جائے گا، مگر محاصرہ طویل پکڑتا چلا گیا اور سلطان کی تمام جنگی تدابیر بے ناکام ہو گئیں غیاث الدین بلبن، ناکامی کی حالت میں واپس جانا نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح اس کی سیاسی ساکھ متاثر ہو۔ ابھی محاصرہ جاری تھا کہ ایک رات آندھی اور بارش کا سخت طوفان آیا، جس سے بلبن کے سپاہیوں کے پڑے اور تمام چراغ بجھ گئے۔ وہ سردیوں کے موسم کی ایک تکلیف دہ رات تھی اور ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا۔ اسی عالم میں ایک سقہ، آگ کی جستجو میں بہت دور تک چلا گیا۔ مگر اسے آگ میسر نہ آئی۔ وہ ناکام ہو کر لوٹ آیا تھا کہ اچانک ایک سمت اُس کی نظر اٹھی اور وہ حیران رہ گیا۔ شاہی سقہ کو کچھ فاصلے پر روشنی نظر آئی۔ وہ حیرت و اضطراب کے عالم میں روشنی کی طرف بڑھا۔ پھر جب شاہی سقہ روشنی کے قریب پہنچا تو اس پر سکہ سالار کا طوفانِ باد و باران میں سلطان غیاث الدین بلبن کا مضبوط ترین خیمہ بھی زمیں بوس ہو گیا تھا..... مگر ایک عام سپاہی معمولی سا خیمہ مکمل طور پر صحیح و سالم تھا اور وہ روشنی اسی خیمے سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔

شاہی سقہ ڈرتے ڈرتے خیمے میں داخل ہوا۔ پھر اُس کی آنکھوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ خیمہ آگ روشن تھی، چراغ جل رہا تھا اور حضرت شمس الدین ترکؒ قرآنِ حکیم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ شاہی سقہ گوشے میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حضرت شمس الدین ترکؒ نے تلاوت روک دی اور شاہی سقہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اگر تمہیں آگ چاہئے تو لے جاؤ۔“

شاہی سقہ، حضرت شمس الدین ترکؒ کے اس کشف پر حیران رہ گیا اور آگ لے کر چلا گیا۔ دوسرے روز شاہی سقہ پھر آیا، مگر حضرت شمس الدین ترکؒ اپنے خیمے میں موجود نہیں تھے۔ سقہ بانیِ حیرت تالاب پر گیا تو اس نے دیکھا کہ حضرت ترکؒ وضو کر رہے ہیں۔ سقہ ایک طرف چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر حضرت شمس الدین ترکؒ وضو کر کے واپس تشریف لے گئے تو سقہ نے اپنی مشک بھری اور حیرت انگیز طور پر پالیا۔

خوب گرم پایا۔

دوسرے دن سقہ حضرت شمس الدین ترک کے وضو کرنے سے پہلے تالاب پر پہنچ گیا۔ پھر جب اس نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو پانی معمول کے مطابق بہت سرد تھا۔ سقہ ایک جگہ چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت شمس الدین ترک تشریف لائے اور وضو کر کے اپنے خیمے میں واپس چلے آئے۔ شاہی سقے نے دوبارہ اپنی مشک بھری تو پانی گرم تھا۔ اب اُسے یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ حضرت شمس الدین ترک کی روحانی برکت کا نتیجہ ہے۔

پھر اُسی روز سقے نے سلطان غیاث الدین بلبن سے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”سرکار! آپ کے لشکروں میں ایک ایسا سپاہی موجود ہے، جس کے خیمے کا چراغ طوفانِ باد و باراں میں بھی روشن رہا..... اور جس کے دستِ مبارک کو چھوتے ہی بخ بستانِ پانی گرم ہو جاتا ہے۔ آپ اس مردِ بزرگ سے قلعہ اوس کی تسخیر کے سلسلے میں دعاؤں کے طالب کیوں نہیں ہوتے؟“

سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے خدمت گار کی زبانی یہ سارے واقعات بڑی حیرت کے ساتھ سنے۔ پھر حضرت شمس الدین ترک کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر دعاؤں کا طالب ہوا۔

حضرت شمس الدین ترک نے فرمانروائے ہندوستان، غیاث الدین بلبن کی درخواست سن کر فرمایا۔ ”جب قدرتِ حق سے یہ راز فاش ہو گیا ہے تو پھر میری کچھ شرائط ہیں۔ اگر آپ وہ شرائط پوری کر دیں گے تو میں قلعہ اوس کی تسخیر کے لئے ضرور دعا کروں گا۔“

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ سلطان غیاث الدین بلبن نے عرض کیا۔

حضرت شمس الدین ترک نے اپنی شرائط پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”پہلی شرط یہ ہے کہ میرا استغنیٰ منظور کیا جائے۔“

”میں یہ کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ میرا لشکر اتنے بڑے بزرگ کے بابرکت سائے سے محروم ہو جائے۔“ سلطان غیاث الدین بلبن نے اُداس لہجے میں عرض کیا۔

”یہ معاہدے کی کھلی خلاف ورزی ہے۔“ حضرت شمس الدین ترک نے فرمایا۔ ”اب اس موضوع پر آپ سے مزید گفتگو نہیں ہو سکتی۔“

سلطان غیاث الدین بلبن، بادلِ ناخواستہ استغنیٰ کی شرط ماننے پر مجبور ہو گیا۔

”دوسری شرط یہ ہے کہ میری تنخواہ اسی وقت ادا کر دی جائے۔“ حضرت شمس الدین ترک نے فرمایا۔ ”اور تیسری شرط یہ ہے کہ میں یہاں سے تین کوس کے فاصلے پر جا کر آپ کے حق میں دعائے خیر کروں گا۔“

الغرض سلطان غیاث الدین بلبن نے اسی وقت آپ کی تنخواہ ادا کر دی۔ پھر جب حضرت شمس الدین ترک سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر جانے لگے تو آپ نے فرمانروائے ہند کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”جب آپ اندازہ کر لیں کہ میں نے تین کوس کا فاصلہ طے کر لیا ہے تو بلا تاخیر قلعے پر حملہ کر دیا جائے۔“

مختصر یہ کہ حضرت شمس الدین ترک نے مقررہ فاصلہ طے کر کے لشکرِ اسلام کے حق میں دعائے خیر فرمائی اور سلطان غیاث الدین بلبن نے قلعہ اوس فتح کر لیا۔

دعا کرنے کے بعد حضرت شمس الدین ترک کے ذہن میں ماضی کا ایک خاص واقعہ تازہ ہو گیا۔ کئی سال پہلے حضرت محمد علی احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے واحد مرید اور واحد خلیفہ کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

”شمس الدین! جب تم اہل دنیا پر ظاہر ہو جاؤ گے تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔“

اس واقعے کے یاد آتے ہی حضرت شمس الدین ترک کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔ ”پیر دمرشد زباں ہو گئے۔“ حضرت شمس الدین ترک نے زیر لب کہا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق جب حضرت شمس الدین ترک کی دعاؤں سے سلطان غیاث الدین ہلال اوس فتح کر لیا تو اسی دن رات کو حضرت ترک نے حضرت مخدوم کو خواب میں دیکھا۔ حضرت علاء الدین رہے تھے۔

”شمس الدین! میں دنیا سے جا رہا ہوں۔ تمہیں لازم ہے کہ جلد از جلد کلیر پہنچو۔“ پھر حضرت شمس الدین ترک اس حالت میں کلیر پہنچے کہ سر سے پاؤں تک تصویر درد بنے ہوئے کرب سے چہرہ دھواں تھا اور آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ مفتی شوکت علی فہمی کی تصنیف ”ہندو پاکستان کے اولیاء“ اور دیگر تذکروں کے مطابق جب حضرت ترک، کلیر شریف لائے تو واقعاً حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ وصال فرما چکے تھے۔ بہت سے شہر، ہجر کے جسم مبارک کو گھیرے ہوئے تھے۔ حضرت شمس الدین ترک کو دیکھ کر وہ خوفناک درندے اپنی جگہ سے اٹھ جھکائے ہوئے جنگل کی طرف چلے گئے۔

حضرت شمس الدین ترک نے چند مقامی لوگوں کی مدد سے حضرت مخدوم کی تجہیز و تکفین کی اور پھر خاک کر دیا۔ حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ 13 ربیع الاول 690ھ کو دنیا سے رخصت ہوئے۔ حضرت شمس الدین ترک پیر دمرشد کے مزار مبارک کی خدمت میں مصروف رہنا چاہتے تھے، مگر علاء الدین صابر کی وصیت تھی کہ وہ تین دن سے زیادہ کلیر شریف میں مقیم نہ رہیں۔ مجبوراً پانی پت چلے گئے۔ روایت ہے کہ حضرت شمس الدین ترک نے 10 جمادی الثانی 716ھ کو وفات پائی۔ دوسری روایت ہے کہ حضرت ترک کی تاریخ وصال 19 شعبان 757ھ ہے۔ ”سیر الاقطاب“ کا بیان ہے کہ آپ نے 736ھ فرمایا۔ ان اختلافات کے باوجود حضرت شمس الدین ترک کی آخری آرام گاہ، پانی پت میں مرقع خالص دعا ہے۔



شعلہ عشق خاک میں روپوش ہو گیا تھا۔ مگر زیر خاک بھی جلال صابری کی وہی آگ روشن تھی۔ مبارک جانے کے بعد بھی حضرت مخدوم کے مرقد مبارک پر ایک برقی جلال چمکتی رہتی تھی۔ بے شمار عقیدت مند زائر لے حاضر ہونا چاہتے تھے مگر برقی جلال کو توڑنا دیکھ کر یہ نام و نامراد لوٹ جاتے تھے۔

”اقتباس الانوار“ کی روایات کے مطابق حضرت مخدوم کی وفات کے بعد سلاطین دہلی نے از سر نو کلیر کا چاہا، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کو زندگی میں تنہائی پسند تھی، اس لئے وصال کے بعد صدیوں تک تنہائی رہے۔ کسی کو مزار مبارک پر آنے کی اجازت نہیں تھی۔

پھر ڈیڑھ سو سال بعد سلسلہ صابریہ کے عظیم بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی، کلیر شریف آباد ہوئے۔ جلال صابری کی برقی اسی انداز سے تڑپ رہی تھی مگر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی بصد عجز و ہلاکت بڑھتے رہے۔

”آقا! میری طرح بے شمار مشتاقان دید حاضری کی سعادت چاہتے ہیں۔ انہیں کب تک محروم رکھا جائے گا؟“ آپ کو رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ! اب تو پردہ جمال میں ظاہر ہو جائیے۔“ انجام کار حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی گریہ و زاری کام آئی۔ آخری بار برقی جلال چمکی اور خاموش ہو گیا۔

پہرائی رات حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمہ اللہ کو خواب میں دیکھا۔ آپ فرما رہے تھے۔

”عبدالقدوس! تو ہمارے سلسلے سے ہے۔ اس لئے تیری درخواست قبول کی گئی۔“
آنکھ کھلی تو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے شکر ادا کیا..... مگر اب ایک اور مشکل درپیش تھی کہ حضرت مخدومؒ کی قبر مبارک کو کہاں تلاش کیا جائے؟ حضرت شمس الدین ترکؒ کی تعمیر کردہ قبر پرچی تھی۔ گردشِ ماہ و سال اور تیز بارشوں کے سبب حضرت مخدومؒ کے مرقد کا نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہر طرف خود رو پودے، خاردار جھاڑیاں اور تادور درخت اُگے ہوئے تھے جن کے سائے میں جنگلی درندوں کا بسیرا تھا۔
روایت ہے کہ اسی خوف ناک جنگل میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے چلہ کشی کی۔ پھر اس طرح درخواست گزار ہوئے۔

”آقا! یہ غلام تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گیا۔ اب آپ ہی اپنے آستانہ مبارک کی نشاندہی فرمائیے۔“
طویل چلہ کشی کے بعد ایک رات حضرت مخدومؒ، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا۔

”اے بے قرار عشق! میرے قریب آ۔ میں یہاں مجھ کو خواب ہوں۔“
دوسرے دن حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اس جگہ پہنچے، جو آپ کو خواب میں دکھائی گئی تھی۔ پھر اسی مقام پر حضرت شیخؒ نے اپنی مگرانی میں ایک پختہ قبر تعمیر کرائی۔ بعد میں آنے والے عقیدت مندوں نے اسی قبر کو موجودہ مزار مبارک کی شکل دے دی جو انتہائی سادہ ہے۔
حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے آستانہ عالیہ کی خدمت کے لئے چند مجاور مقرر کئے اور واپس تشریف لے گئے۔



کچھ عرصے بعد ہندوؤں کی ایک جماعت نے حضرت مخدومؒ کے روضہ مبارک کو منہدم کرنے کی کوشش کی تاکہ وہاں دیوی کا مندر تعمیر کیا جاسکے۔ مجاوروں کو اس قدر زرد کوکب کیا گیا کہ وہ بے چارے گریہ و زاری کرنے لگے۔
”مخدوم! ہم بہت کمزور اور بے وسیلہ انسان ہیں، اس لئے حملہ آوروں کو نہ روک سکے۔ اب آپ خود ہی اپنے روضے کی حفاظت فرمائیے۔“

ابھی مجاوروں کا شور و غل جاری تھا کہ ایک سمت سے ایک شیر نمودار ہوا اور اس نے بہت سے بت پرستوں کو ہلاک کر ڈالا۔ باقی فرار ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد پتھر کے پجاریوں کی ہمت جواب دے گئی اور وہ دیوی کا مندر تعمیر کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے۔

چند سال بعد ایک اور متعصب ہندو جوگی ادھر آیا اور رات کے وقت چھپ کر مزار میں داخل ہو گیا۔ وہ قبر مبارک کو سہارا کرنا چاہتا تھا۔ ابھی ہندو جوگی نے ایک دو اینٹیں ہی نکالی تھیں کہ دم گھٹ کر مر گیا۔
حضرت مخدومؒ مجاوروں کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا۔ ”ہمارے مزار میں ایک کتا مر گیا ہے۔ اسے اٹھا کر باہر پھینک دو۔“

صبح ہوئے ہی مجاور ڈرتے ڈرتے مزار مبارک میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک ہندو جوگی کی لاش پڑی تھی مگر اس کا منہ کسے کی طرح تھا۔

حق تعالیٰ نے اپنے جس دوست کا نام وقت کی پیشانی پر ثبت کیا ہو، اسے کون بے نشان کر سکتا تھا۔
قدیم تذکرے حضرت علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر سے خالی ہیں..... مگر حضرت مخدوم کوکتابوں کی کابینہ
ہے؟ وہ تو کروڑوں انسانوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ ہی وہ بزرگ ہیں، جن کے ذریعہ
نے سلسلہ چشتیہ کو فروغ بخشا۔

حضرت شمس الدین ترک سے ”سلسلہ صابریہ“ کا فیضان جاری ہوا۔ پھر تصوف کے اس عظیم خانوادہ
حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء، حضرت شیخ احمد عبدالحق ردوئی، حضرت شیخ احمد عارف، حضرت شیخ محمد
عبدالقدوس گنگوہی اور حضرت شیخ جلال الدین تھانی سرئی جیسے بزرگ پیدا ہوئے کہ پورا ہندوستان ان کی عظمت
اسیر ہے۔

وہ، جو حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا پیارا تھا، آج بے شمار انسانوں کی آنکھوں کا تارا ہے۔ وہ جو راجہ میں
چاہتا تھا..... اور اپنی اسی خلوت نشینی کے سبب صدیوں گمنام بھی رہا..... مگر پھر چکا تو ایسا چکا کہ آج تک اس
و تاب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جب تک آسمان کی طنائیں ٹھنچ نہیں لی جاتیں..... اور شمس و قمر اپنی کشش
بیٹھتے..... اور زمین کی ناہمواریاں دُور نہیں کر دی جاتیں..... اور قیامت نازل نہیں ہو جاتی..... اہل دل کی
اس کے صبر و جلال کے ذکر سے آباد رہیں گی۔



حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ

یہ نویں ہجری کے آغاز کا واقعہ ہے۔ بت پرست ہندوستان میں ”رام راج“ کا تصور ایک قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ برہمن ہنت، پجاری اور جوگی، اسلام کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لئے عجیب عجیب حربے استعمال کر رہے تھے۔ مگر ”وحدانیت پرستی“ کے سیدھے سادے پیغام نے ”انصاف پرستی“ کے تمام فلسفوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ بت خانے ویران ہوتے جا رہے تھے۔ ”قشقہ و زنا“ کے بندے خاک پر اپنی پیشانیاں رگڑ کر اللہ کی کبریائی اور خاتم النبیین حضور اکرم ﷺ کی رسالت پر گواہی دے رہے تھے۔ اسی دوران ایک مرد خدا، دہلی سے روانہ ہو کر ”کاٹھیاواڑ“ پہنچا، جہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ کافروں اور مشرکوں پر مشتمل تھا۔

”تمہارا تیرتھ استھان (مقام مقدس) کہاں ہے؟“ مسلمان درویش نے کچھ مقامی ہندوؤں سے پوچھا۔ ہندو، مسلمان درویش کو دیکھ کر کچھ گھبرا سے گئے۔ ”وہاں جا کر کیا کرو گے؟“ کاٹھیاواڑ کے بت پرست اس مرد خدا کو تنگ کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ”تمہارا ہمارے تیرتھ استھان سے کیا تعلق ہے؟“

”میں تم لوگوں کا طریقہ عبادت دیکھنا چاہتا ہوں۔“ مسلمان درویش نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”گرناتھ پہاڑ پر ہمارا سب سے بڑا تیرتھ ہے۔“ مقامی ہندوؤں نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو شہر سے کچھ فاصلے پر واقع تھی۔

یہ سن کر مسلمان درویش ”گرناتھ پہاڑ“ کی طرف جانے لگا تو مقامی بت پرستوں نے کہا۔ ”وہاں مت جانا۔ ہلاک کر دیے جاؤ گے۔“

مسلمان درویش نے انداز بے نیازی کے ساتھ ہندوؤں کی طرف دیکھا۔ ”مجھے کون مارے گا؟“

”عام حالت میں شاید تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچتا، مگر اس وقت تو خود ہندوؤں کی جان پر بنی ہوئی ہے۔“ ایک بت پرست نے کہا۔ ”عجیب وقت آ گیا ہے کہ ہندو، ہندو سے لڑ رہا ہے۔ پھر کسی غیر مذہب سے تعلق رکھنے والا کیسے محفوظ رہے گا؟“

”آخر تم کس جنگ کی بات کر رہے ہو؟“ مسلمان درویش نے پوچھا۔

”کاٹھیاواڑ میں دو مذہبی فرقے آباد ہیں۔“ بت پرست نے وضاحت کی۔ ”ایک جین مت“ کے اصولوں پر یقین رکھتا ہے اور دوسرا ”دشنومت“ کے اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ ان دونوں فرقوں کے ماننے والے صدیوں سے

پُر سکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ مگر آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔
 ”اب تو میرا وہاں جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“ یہ کہہ کر مسلمان درویش تیز قدموں سے پہاڑا کون روانہ ہو گیا۔

مقامی ہندو اسے روکنے کی کوشش کرتے رہے، لرزہ خیز انجام سے ڈراتے رہے..... مگر اسے ہانا نہ گیا۔

پھر جب مسلمان درویش، گرنا تھ پہاڑ کے تیر تھ کی حدود میں داخل ہوا تو بڑا ہولناک منظر اُس کی آنکھ سامنے تھا۔ ”دشنومت“ اور ”جین مت“ کے ماننے والے نیزے، تلواریں اور بھالے لئے ہوئے ایک ایک مقابل کھڑے ہوئے تھے۔ بس لمحوں کی بات تھی، سارے ہتھیار استعمال ہوتے اور ہندوؤں کا تیر تھ خون سے رنگین ہو جاتا۔

دونوں فرقوں کے پجاریوں نے ایک مسلمان درویش کو اپنی طرف آتے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ہاں لئے باہمی مناقشت کو فراموش کر کے سوچنے لگے کہ ایک غیر مذہب کا ماننے والا، اُن کے مقام مقدس کیوں داخل ہوا ہے؟ وہ سلطان فیروز شاہ تغلق یا کسی دوسرے مسلمان کا حاکم جاسوس تو نہیں؟ ابھی تمام فکر اور اندیشے میں مبتلا تھے کہ مسلمان درویش، شمشیر بدست اور خنجر بکف، ہندوؤں کے قریب پہنچ گیا۔
 ”آخر تم لوگوں کے درمیان کیا جھگڑا ہے کہ ایک دوسرے کی شہ رگ کاٹنے پر آمادہ ہو؟“ مسلمان درویش

دونوں فرقوں کے پجاریوں سے سوال کیا۔
 ”تم کون ہو درمیان میں آنے والے؟“ بیک وقت کئی تلواریں بلند ہوئیں۔ ”یہ ہمارا اپنا جھگڑا ہے اسے طے کریں گے۔“

”بے شک یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ انسانی خون اتنی ارزانی کے ساتھ بہے۔ مسلمان درویش نے آمادہ جنگ پجاریوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”خون تو بہے گا۔“ ایک بار پھر بہت سی آوازیں گونجیں۔ ”سچ کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹ کو مٹانا ہی ہے۔“ مگر یہ کون طے کرے گا کہ تم میں سچا کون ہے؟“ مسلمان درویش نے دونوں طرف کے پجاریوں سے کہا۔
 ”جن کے کاندھوں پر سر باقی رہیں گے، وہی سچے ٹھہریں گے۔“ پھر کے پجاری غضب ناک لہجے میں عجیب دعوے کر رہے تھے۔

”یہ تو کوئی معیار نہیں ہے کہ جو مر گیا، وہ جھوٹا تھا اور جو بچ گیا، وہ سچا ہے۔“ مسلمان درویش نے انہیں پیش کرتے ہوئے کہا۔

”تم مداخلت کرنے والے کون ہو؟ ہٹ جاؤ ہمارے درمیان سے۔“ جین مت کے پجاریوں نے جواب دیا۔
 ”میں ہی تو فیصلہ کروں گا کہ تم میں سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟“ مسلمان درویش نے پُر جلال لہجے میں چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔

بت پرستوں کے ہجوم میں ایک مرد حق کی یہ جرأت دے باکی بڑی عجیب تھی۔ بڑے بڑے ”تک مددگار“ ترشول بردار پجاری حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہے تھے، جو ان کے تیر تھ استھان میں تنہا کھڑا تھا اور دونوں طرف کے درمیان پیدا ہونے والے تنازع میں خود کو ثالث قرار دے رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے دیوتاؤں کے پرستار اور بحث کر رہے تھے۔ مگر جب اس کا جلال روحانی ظاہر ہوا تو پھر کے پجاری خود ہی پتھر بن کر رہ گئے۔

پھر مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد مردِ حق کے ہونٹوں کو دوبارہ جنبش ہوئی۔ ”میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ کہ سچا کون ہے؟“ مسلمان درویش نے ”دُشمنوت“ کے بڑے پجاری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
پجاری نے مردِ حق کی طرف دیکھا اور اُس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر کانپتے ہاتھ سے ترشول چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

”تم سچے ہو اور میں جھوٹا ہوں۔“ دُشمنوت کا پجاری ہدایانی انداز میں چیخ رہا تھا۔ پھر وہ مسلمان درویش کے قدموں پر جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس فراتے سے تعلق رکھنے والے دوسرے پجاری بھی سجدہ ریز ہو گئے۔
مردِ حق ”جین مت“ کے بڑے پجاری سے مخاطب ہوا۔ ”اب تم بتاؤ کہ سچا کون ہے؟“
جین مت کے پجاری نے بھی وہی جواب دیا اور اپنے چیلوں کے ساتھ زمین پر سر رکھ کر چیخنے لگا۔ ”بس تم ہی سچے ہو..... اور ہم سب جھوٹے ہیں۔“

کچھ دیر پہلے بت پرستوں کے دو فراتے جو اپنے عقائد کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ایک دوسرے کا خون بہانے پر تلے ہوئے تھے، وہ اپنے نظریات کی نفی کر کے ایک مسلمان درویش کی صداقت پر گواہی دینے لگے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان لوگوں نے اس مردِ حق کی آنکھوں میں کیا دیکھا کہ اپنے آباء و اجداد کی صدیوں پرانی تعلیمات فراموش کر دیں اور اس شخص کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلنے لگے، جسے کچھ دیر پہلے وہ جانتے تک نہیں تھے۔
حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور منقبت ہے، جو انہوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں لکھی تھی۔

”چھاپ تلک سب چھین لی، مو سے نیناں ملائے کے“

(ٹوٹے ایک نظر کیا دیکھا کہ میرے ماتھے سے بت پرستی کی ساری نشانیاں مٹا ڈالیں)

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مصرع اس مردِ حق پر بھی صادق آتا تھا۔ جس کے قدموں نے گرنا تھ پہاڑ کے تیر تھ استھان کو بتوں سے پاک کر دیا تھا..... اور جہاں صدیوں سے ”ناقوس“ کی آوازیں گونج رہی تھیں، وہاں اچانک ”اللہ اکبر“ کا نعرہ سردی سنائی دینے لگا تھا۔

جس مسلمان درویش کے دستِ حق پرست پر کاٹھیا داڑ کے ہزاروں ہندو ایمان لائے تھے، وہ سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت سیدنا نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ اکبر، حضرت سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ تھے۔



آپ کا خاندانی نام سید محمد، کنیت ابوالفتح اور لقب صدر الدین تھا۔ عام طور پر آپ خواجہ گیسو دراز کہلاتے تھے۔ اہل دکن جو شیعیت میں آپ کو بندہ نواز بھی کہتے ہیں۔ سید محمد کے مورثِ اعلیٰ ہرات سے دہلی آئے تھے اور اسی مقام پر 721ھ میں آپ کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔ آپ کے والد محترم سید یوسف حسینی المعروف سید راجا کو حضرت نظام الدین اولیا سے ارادت تھی۔ حضرت محبوب الہی کا انتقال 725ھ میں ہوا۔ اس وقت سید محمد کی عمر چار سال تھی۔ حضرت نظام الدین اولیا کا خاندانی نام بھی سید محمد تھا۔ ہو سکتا ہے کہ سید یوسف حسینی نے پیر و مرشد کی محبت و عقیدت میں بیٹے کا نام سید محمد رکھا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سید یوسف حسینی اپنے فرزند سید محمد کو لے کر نظام الدین اولیا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں اور حضرت محبوب الہی نے انہیں اپنی دعاؤں سے سرفراز کیا ہو۔ سید محمد ”حسینی سید“ تھے۔ بیس واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مل جاتا ہے۔

تمام معتبر تذکرہ نگاروں کی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب سید محمد چار سال کے ہوئے تو سید ابوبکر کو لے کر دیوگیر (دکن) چلے گئے۔ (بعد میں دیوگیر کا نام بدل کر دولت آباد رکھ دیا گیا تھا) یہ وہی بادشاہ ہے جس نے حضرت نظام الدین اولیاء دینا سے رخصت ہو چکے تھے اور سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کے بعد سلطان محمد تغلق، تخت ہندوستان پر جلوہ افروز ہو چکا تھا۔

دیوگیر میں حضرت شیخ بابائے نام کے ایک عارف قیام پذیر تھے۔ سید یوسف حسینؒ شب دروازہ ان کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ نتیجتاً انتہائی کم سنی میں سید محمدؒ کے معصوم ذہن پر معرفت کے آثار مرتب ہوئے تھے۔ تمام مستند تاریخوں میں یہ حوالے موجود ہیں کہ سید محمدؒ بچپن ہی سے مذہب کی طرف مائل تھے۔ حضرت شیخ بابائے نام اس کم سن بچے کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے۔ اپنے برابر بٹھاتے اور سید محمدؒ کے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ ایک دن حضرت شیخ بابائے نام نے آپ کے والد محترم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”سید یوسف! تمہارا یہ بچہ اہل ایمان کا پیشوا ہوگا۔ عنقریب بے شمار لوگ اس کی وجہ سے ہدایت پائیں گے۔“ حضرت شیخ بابائے نام زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر سید یوسف حسینؒ مسرور و مطمئن ہو گئے۔

”سیر محمدی“ کی روایت ہے کہ آٹھ سال کی عمر ہی میں حضرت سید محمدؒ نے دینی شغف کا اظہار فرمایا۔ وضو اور نماز میں خاص اہتمام کرتے۔ چھوٹے بچے، سید محمدؒ کی خدمت میں جمع رہتے۔ ان کے رونق گھڑا بھر کر رکھتے اور بہت عزت و تکریم کے ساتھ پیش آتے۔ اگرچہ سید محمدؒ کے ساتھی ان ہی کے کم سن بچے آپ کے ساتھ نہایت عزت و تکریم سے پیش آتے تھے۔ خود حضرت سید محمدؒ بھی مشائخ کی طرح کلمہ عنایت فرماتے تھے۔

حضرت سید محمدؒ کے حقیقی ماموں ملک الامراء سید ابراہیم، دیوگیر (دولت آباد) کے صوبیدار تھے۔ قافلہ روز و شب اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا کہ اچانک سید محمدؒ ایک جاگداز حادثہ سے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر دس سال تھی کہ والد محترم بیمار ہوئے اور مختصر سی علالت کے بعد 731ھ میں گئے۔ حضرت سید یوسف حسینؒ دولت آباد ہی میں سپرد خاک ہوئے۔ آج بھی آپ کے مزار مبارک پر رونق رہتا ہے۔

حضرت سید محمدؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی، جو ایک عالم و فاضل انسان تھے۔ والد محترم سے حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کا ذکر سنتے رہتے تھے۔ نتیجتاً آپ خواجگانِ چشت کے لئے ایک خاص عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ ابھی سید یوسف حسینؒ کے انتقال کو چند روز تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ اور ماموں سید ابراہیم مستوفی کے درمیان رنجش پیدا ہو گئی۔ پھر یہ اختلاف بڑھے کہ سید محمدؒ کی مادر گرامی نے دولت آباد (دکن) کی سکونت ترک کر دی اور اپنے بچوں کو ساتھ لے کر دہلی چلی آئیں۔ اس وقت حضرت سید محمدؒ کی عمر مبارک پندرہ سال تھی۔

آپ جیسے کی نماز پابندی کے ساتھ سلطان قطب الدین ایک کی تعمیر کردہ مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ اکثر حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ اکبر سید نصیر الدین چراغ دہلی تشریف لاتے تھے۔ سید محمدؒ کو کچھ دہلی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ جب تک حضرت شیخ مسجد میں رہتے، سید محمدؒ انہیں مسلسل دیکھتے رہتے مگر یہاں تک تھا کہ قریب جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ بس دُور ہی سے اس مردِ خدا کا دیدار کر لیتے اور دلِ عجیب سی خلش لئے ہوئے گھر لوٹ آتے۔

آخر لوح محفوظ پر جو لکھا تھا، وہ ایک دن زمین پر نازل ہو گیا۔ فاصلے کم ہوئے اور حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے ایک اچھٹی ہوئی نظر سے سید محمدؑ کی طرف دیکھا۔ عارف وقت کی یہ ایک نگاہ جلال، نواد کوچہ عشق کے لئے کافی تھی۔ سینے میں جو چنگاری برسوں سے دہی ہوئی تھی، وہ بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ پھر جب حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی جامع مسجد سے اٹھ کر اپنی خانقاہ کی طرف روانہ ہوئے تو سید محمدؑ بھی آپ کے پیچھے پیچھے چلے۔ یہاں تک کہ معرفت کا یہ نونیز مسافر تاجدارِ چشتیہ کے قدموں میں خم ہو گیا۔

پھر حضرت نصیر الدین چراغ دہلی نے سید محمدؑ کو اپنے حلقہ بیعت میں شامل فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک سولہ سال کے قریب تھی۔ حضرت چراغ دہلی کے مریدوں میں پختہ کار اور عمر رسیدہ افراد بھی شامل تھے۔ لیکن پیر مرشد سید محمدؑ کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

بیعت کے بعد حضرت سید محمدؑ کی خواہش ہوئی کہ وہ مرشد کی دست بوسی کے لئے جلد جلد حاضری دیں۔ لیکن بعض مجبور یوں کے سبب آپ کی یہ آرزو پوری نہیں ہوتی تھی۔ آخر ایک دن حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”سید محمد! تم جب بھی میرے پاس آتے ہو، بے وقت آتے ہو۔ میں اس وقت بلول کر رہا ہوتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تم سے کچھ بات کروں۔“

پیر مرشد کی یہ شفقت دیکھ کر سید محمدؑ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ نہایت رقت آمیز لہجے میں عرض کرنے لگے۔ ”سیدی! میرے لئے یہی شرف کافی ہے کہ میں آپ کے حلقہ غلامی میں شامل ہوں۔“



حضرت سید محمدؑ نے پیر مرشد کی ہدایت کے مطابق عبادت و ریاضت میں بتدریج ترقی کی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے سید محمد اکبرؑ جی نے آپ کے ملفوظات کو ”جوامع الکلم“ کے نام سے مرتب کیا ہے۔ حضرت سید محمدؑ اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں۔

”ایک بار پیر مرشد کے دیدار کے لئے حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی شیخؒ نے فرمایا۔ ”سید محمد! تم صبح کی نماز کے لئے جو وضو کرتے ہو، کیا وہ آفتاب طلوع ہونے کے بعد تک باقی رہتا ہے؟“

میں نے عرض کیا۔ ”جی ہاں! آپ کے صدقے میں باقی رہتا ہے۔“

میرا جواب سن کر پیر مرشد نے فرمایا۔ ”کیا اچھا ہو، جو اسی وضو سے دو گناہ اشراق بھی پڑھ لیا کرو۔“

میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ ”انشاء اللہ! آپ کے صدقے میں ضرور پڑھوں گا۔“

حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ ”اسی کے ساتھ ”شکر النہار“ اور ”استحارہ“ بھی پڑھ لیا کرو۔“

پھر جب میں چند روز اُس کی پابندی کر چکا تو ایک دن پیر مرشد نے فرمایا۔ ”دو گناہ اشراق پڑھتے ہو؟“

میں نے دست بستہ عرض کیا۔ ”حضرت شیخؒ کے صدقے میں بلا ناغہ پڑھتا ہوں۔“

پیر مرشد نے ارشاد فرمایا۔ ”اگر اس میں چاشت کی چار رکعتیں بھی ملا دیا کرو تو نماز چاشت بھی ہو جایا کرے گی۔“

حضرت سید محمدؑ فرماتے ہیں۔ ”میں ہمیشہ رجب کے مہینے میں روزے رکھتا تھا۔ ایک دن حضرت شیخؒ نے پوچھا۔

”سید محمد! کیا تم رجب میں روزے رکھتے ہو؟“

میں نے بعد احترام عرض کیا۔ ”حضرت شیخؒ کے صدقے میں رجب اور شعبان میں روزے رکھتا ہوں۔“

پیر و مرشد نے فرمایا۔ ”اگر ایکس دن اور رکھ لیا کرو تو پورے تین مہینے کے روزے ہو جایا کریں۔“
 میں نے عرض کیا۔ ”انشاء اللہ! آپ کے صدقے میں ایسا ہی کروں گا۔“
 پھر جب میں نے اپنی والدہ محترمہ سے اس بات کا ذکر کیا تو مجھ پر برہم ہو گئیں اور بہت غم گرامی اس وقت تک حضرت شیخ سے بیعت نہیں ہوئی تھیں۔
 میں نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ والدہ ماجدہ سے عرض کیا۔ ”آپ جو چاہیں کہیں، مگر مجھ کو کچھ فرمایا ہے، اس پر عمل کرنے سے باز نہیں آؤں گا۔“

حضرت سید محمدؒ فرماتے ہیں۔ ”میرا معمول تھا کہ میں رمضان المبارک کے بعد شش عبد اللہ تھا۔ (یہ چھ روزے ہیں جو شوال کے مہینے میں مسلسل رکھے جاتے ہیں) ایک دن حضرت شیخؒ کے حاضر ہوا تو فرمایا۔ ”ہمارے خواجگان صوم داؤدی نہیں بلکہ صوم دوام رکھتے ہیں۔ اس لئے تم بھی صوم (منوعہ ایام کے سوا سال بھر روزہ رکھنے کو صوم دوام کہتے ہیں)

حضرت سید محمدؒ نے باطنی تربیت کے علاوہ علوم ظاہری کی تکمیل کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ کچھ عرصے بعد سید شریف الدین لکھنویؒ، مولانا تاج الدینؒ اور مولانا قاضی عبدالمتقنؒ سے پڑھیں۔ پھر جب آپؒ زیادہ کیف حاصل ہونے لگا تو گھر چھوڑ کر ”خطیرہ شیر خان“ کے ایک حجرے میں آکر مراقبہ کرنے حضرت سید محمدؒ نے دس سال تک شدید ریاضتیں کیں۔ خطیرہ شیر خان کے حجرے سے مولانا قاضیؒ یہاں درس لینے جاتے۔ پھر وہاں سے پیر و مرشد کے دیدار کے لئے خانقاہ میں حاضر ہوتے۔
 ایک دن حضرت سید محمدؒ نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے عرض کیا۔ ”اگر پیر و مرشد کا حکم ہو، تو کی تحصیل ترک کر دوں کہ اب ان چیزوں میں دل نہیں لگتا۔“

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے جواباً فرمایا۔ ”ہدایہ، بزوری، رسالہ شمسیہ، کشاف اور مہربان پڑھ لو۔ تم سے ایک کام لینا ہے۔“

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ پیر و مرشد کے ”کام لینے“ سے مراد تصنیف و تالیف کا کام ہے۔ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا اشارہ کس کام کی طرف تھا۔ الغرض انہوں میں حضرت سید محمدؒ علوم ظاہری کی تحصیل سے فارغ ہو گئے اور پھر آپؒ نے سخت مجاہدات شروع کر دیں۔ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ اپنے نو عمر مرید کی ریاضت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ایک مرتبہ حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”ستر برس کے بعد ایک لڑکے نے پھر مجھ میں شوریگی پیدا کر دی ہے اور پہلے زمانے کے واقعات دے دیے ہیں۔“

اس کے بعد سید محمدؒ کے سلسلے میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی شفقت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ایک بار خود پیر و مرشد خطیرہ شیر خان تشریف لے گئے، جہاں سید محمدؒ مقیم تھے۔ پھر حضرت شیخؒ نے اپنے بچے کچھ روپے بھی نذرانے کے طور پر پیش کئے۔ اس واقعے کے بعد پوری دہلی میں حضرت سید محمدؒ کی شہرت اور باکمال صوفیاء اپنی مجلسوں میں بر ملا کہنے لگے۔

”اس شخص کو عین جوانی کے عالم میں پیرانِ کامل کا درجہ حاصل ہے۔“
 پھر حضرت سید محمدؒ کا ذوق ریاضت اس قدر بڑھ گیا کہ انسانی آبادی چھوڑ کر جنگلوں کی طرف نکل

طویل مجاہدوں کے بعد پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس زمانے میں حضرت سید محمدؒ کے معمولات یہ تھے کہ علی الصبح اٹھ کر حضرت شیخ کو وضو کراتے، پھر خود وضو کر کے نماز فجر پابجاعت ادا کرتے اور جب تک پیر و مرشد اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، حضرت سید محمدؒ طالبان حق کو سلوک کی تعلیم دیتے اور جب مرشد کی مجلس منعقد ہوتی تو اس میں شریک ہوتے اور جب درخواست ہوتی اور حضرت شیخؒ اپنے حجرہ مبارک میں جا کر عبادت میں مشغول ہوتے تو حضرت سید محمدؒ بھی ایک گوشے میں بیٹھ کر یا دقن میں مصروف ہو جاتے۔

پھر چاشت کی نماز پڑھ کر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے۔ اس کے بعد کلام پاک کی تلاوت فرماتے۔ ظہر کا وقت آتا تو پہلے خود وضو کرتے، پھر مرشد کو وضو کراتے۔ ظہر کی نماز کے بعد حضرت شیخؒ حجرے میں تشریف لے جاتے تو خود بھی اپنے حجرے میں آکر اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ یہاں تک کہ سہ پہر کا وقت آ جاتا۔

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کی مجلس درس دوبارہ آراستہ ہوتی۔ حضرت سید محمدؒ وضو کر کے اس مجلس میں شرکت کرتے اور پیر و مرشد کے ساتھ عصر کی نماز پڑھ کر مغرب تک تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے۔ پھر مغرب کی نماز اور آؤا میں ادا کر کے عشاء تک طالبان سلوک کو تعلیم دیتے۔ پھر عشاء کی نماز کے بعد تھوڑا سا کھانا تناول فرما کر سو جاتے۔

پھر نصف شب کو بیدار ہو کر پہلے خود وضو کرتے اور اس کے بعد پیر و مرشد کو وضو کراتے۔ جب حضرت شیخ حجرے میں داخل ہو کر یا دقن میں مشغول ہو جاتے تو سید محمدؒ بھی نماز تہجد ادا کر کے حجرے کے باہر دروازے سے پشت لگا کر ذکر الہی میں مصروف ہو جاتے۔ آپ اس وقت بھی پانی کا آفتابہ وغیرہ اپنے ساتھ رکھتے کہ جب پیر و مرشد صبح کی نماز کے لئے حجرے سے باہر تشریف لائیں تو اس وقت وضو کا سارا سامان تیار ملے۔ حضرت سید محمدؒ کے نظام الاوقات کی یہ تفصیل اس لئے بیان کی گئی ہے کہ قارئین کو آپ کی کثرت ریاضت کا اندازہ ہو جائے اور معرفت کے طلب گار اس راز سے بھی باخبر ہو جائیں کہ حضرت سید محمدؒ نے اپنے پیر و مرشد کی کس قدر خدمت کی ہے اور شیخ کی رضا جوئی کا کتنا خیال رکھا۔

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی اپنی ضعیفی اور ناتوانی کے سبب پاکی میں سفر کیا کرتے تھے۔ حضرت شیخؒ کی اس پاکی کو آپ کے دس بارہ خدمت گار اٹھایا کرتے تھے۔ جب سید محمدؒ، حضرت چراغ دہلی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اور حضرت شیخؒ نے سفر کرنا چاہا تو آپ سب سے پہلے پاکی اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے اپنے محبوب مرید کا یہ عمل دیکھا تو بے اختیار فرمایا۔

”سید محمد! تم آل رسول ﷺ ہو۔ اس لئے پاکی نہ اٹھاؤ۔“

پیر و مرشد کا یہ ارشاد گرامی سن کر حضرت سید محمدؒ آبدیدہ ہو گئے۔ پھر نہایت رقت آمیز لہجے میں عرض کرنے لگے۔ ”شیخ عالی مقام! آپ حسی سید ہیں اور میں حسینی۔ آپ بڑے ہیں اور میں چھوٹا۔ آپ مرشد ہیں اور میں مرید۔ آپ مخدوم ہیں اور میں خادم۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخؒ کو ہر طرح کی بزرگی اور فضیلت و عنایت فرما کر واجب تنظیم بنایا ہے تو پھر میں اس خدمت سے کیوں محروم رکھا جاؤں؟“

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے آپ کے جذبہ عقیدت کی یہ سرشاری دیکھ کر فرمایا۔ ”بابا! تم مختار ہو۔ جو

چاہو، کرو۔“

اس کے بعد حضرت سید محمدؒ اپنے پیر و مرشد کی پاکی اٹھانے لگے اور حضرت چراغ دہلی نے پھر کبھی کوئی اعتراض

نہیں فرمایا۔

ایک دن حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر انوارِ پاکی کے لئے پاکی میں سوار ہوئے۔ حضرت سید محمدؒ نے حسب دستور آگے بڑھ کر سب سے پہلے پاکی اٹھائی۔ محمدؒ کے سر کے بال بہت زیادہ لمبے تھے۔ اس لئے اتفاقاً پاکی کے پائے میں پھنس گئے۔ آپ نے فوراً محسوس کی لیکن مرشد کے ادب کے پیش نظر زاویہ تبدیل نہیں کیا اور اسی حالت میں پاکی اٹھائے ہوئے چلے گئے۔ بہت زیادہ دباؤ کے باعث کئی جگہ سے بالوں کی جڑیں ٹوٹ گئیں اور ان سے خون بہنے لگا۔ راستے میں ایک بار بھی حضرت سید محمدؒ نے پاکی کے پائے سے اپنے بالوں کو نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت قطب کے مزار مبارک پر پہنچ کر پاکی سے نیچے تشریف لائے۔ سید محمدؒ کے چہرے کی طرف دیکھا، جولوہیان ہو رہا تھا۔

”سید! یہ کیا ہے؟“ حضرت چراغ دہلی کے لہجے سے نہایت فکر و تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

حضرت سید محمدؒ نے سر جھکائے ہوئے نہایت عاجزی کے ساتھ پورا واقعہ بیان کر دیا۔

”سید محمد! آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟“ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے لہجے سے اذیت و کرب کا لہجہ تھا۔

”پاکی زمین پر رکھ کر اپنے بالوں کو آزاد کر لیا ہوتا۔ کئی گھنٹے تک اس تکلیف میں کیوں مبتلا رہے؟“

”غلام اس وجہ سے اپنا زاویہ تبدیل نہ کر سکا کہ پیر و مرشد کے سکون میں خلل واقع ہوتا۔“ حضرت پیر

سر جھکائے ہوئے عرض کیا۔

اپنے محبوب مرید کا یہ جواب سن کر حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی بے قرار ہو گئے اور پھر نہایت ہنرمند عالم میں یہ شعر پڑھا۔

ہر کہ مرید سید گیسودراز شد

واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

(جو کوئی سید گیسودراز کا مرید ہو گیا، خدا کی قسم! وہ کسی اختلاف کے بغیر عشق باز بن گیا)

اسی دن سے آپ سید محمدؒ کے بجائے گیسودراز مشہور ہو گئے اور پیر و مرشد کا عطا کردہ لقب آپ کی زبان

حوالہ بن گیا۔



سینتیس سال کی عمر میں حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ شدید بیمار ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ نے خون قہقارہ کر دیا۔ دہلی کے کئی نامور طبیبوں اور کئی مشہور حکیموں نے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کا علاج کیا، مگر تمام ناکام ہوئی۔ پھر ایک روز حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی عیادت کے لئے تشریف لائے۔ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی نقاہت کا یہ عالم تھا کہ پیر و مرشد کے استقبال کے لئے اٹھ کر بیٹھ بھی نہ سکے۔ ناتوانی کا احساس کر کے سید رونے لگے۔

”سیدی! یہ کیسی مجبوری ہے کہ غلام اپنے شہنشاہ کا استقبال بھی نہیں کر سکتا۔“ یہ کہتے کہتے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی حالت غیر ہو گئی۔

جب حضرت نصیر الدین چراغ دہلی نے اپنے جاں نثار مرید کی یہ کیفیت دیکھی تو خود بھی بے قرار و مضطرب ہو گئے۔ پھر آپ سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے لاغر و نحیف جسم پر آہستہ آہستہ دست شفقت پھیرنے لگے۔ یہ حضرت پیر دہلی کی مسیحا نفسی کا اثر تھا کہ سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ تیزی سے رُوبہ صحت ہونے لگے۔ اور پھر وہ دن بھی آگیا کہ

اپنے قدموں سے چل کر پیر و مرشد کی خانقاہ تک پہنچے۔

ایک دن حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی مجلس عرفان میں دہلی کے بڑے بڑے علماء اور مشائخ جمع تھے۔ حضرت سید گیسو درازؒ بھی دست بستہ سر جھکائے اگلی صف میں حاضر تھے۔ اچانک حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت شیخ کے احترام کے پیش نظر حاضرین مجلس نے بھی آپ کی تقلید کی۔ اس وقت حضرت چراغ دہلیؒ کھیل اوڑھے ہوئے تھے۔ مجلس میں موجود تمام لوگوں نے دیکھا کہ حضرت چراغ دہلیؒ چند دم آگے بڑھے اور اپنا کھیل اتار کر حضرت سید گیسو درازؒ کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ پھر اپنے محبوب مرید کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر فرمایا۔ ”اگر دنیا میں کوئی شخص محنت کرتا ہے تو یقیناً کوئی چیز اس کی طلب کا مرکز ہوتی ہے۔“

حاضرین مجلس بہت غور سے حضرت شیخ کی گفتگو سن رہے تھے۔

پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا۔ ”سید محمد! میری طرف سے یہ چیز قبول کرو۔“ حضرت شیخ کا اشارہ اس کھیل کی طرف تھا، جو اس وقت حضرت سید گیسو درازؒ کے کاندھے پر موجود تھا۔ وہ کھیل دراصل فرقہ خلافت تھا اور کسی چیز کے قبول کرنے سے پیر و مرشد کی یہ مراد تھی کہ حضرت سید گیسو درازؒ لوگوں سے بیت لیا کریں۔“

حضرت سید گیسو درازؒ، پیر و مرشد کا حکم سن کر خاموش رہے اور سر جھکا لیا۔

”سید محمد! تم نے اسے قبول کر لیا؟“ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے آپ کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے کسی قدر بلند آواز میں فرمایا۔

اب حضرت سید گیسو درازؒ کے لئے خاموشی ممکن نہ تھی۔ آپ نے بہت آہستہ لہجے میں عرض کیا۔ ”غلام نے آقا کی نوازشات کو قبول کیا۔ ہر چند کہ غلام اس عنایت و کرم کا مستحق نہیں تھا۔“

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے تیسری بار فرمایا۔ ”سید محمد! تم نے اسے قبول کر لیا؟“

”خادم نے حضرت مخدوم کے اس عطیہ خاص کو قبول کر لیا۔“ حضرت سید گیسو درازؒ نے بدستور سر جھکائے ہوئے عرض کیا۔ ”ہر چند کہ خادم اس گراں قدر اعزاز کے لائق نہ تھا۔“

اس کے بعد حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے حضرت سید گیسو درازؒ کو دو وصیتیں فرمائیں۔

”اپنے ظاہری اور ادترک نہ کرنا اور میرے متعلقین کے ساتھ رعایت کرنا۔“



ای زمانے میں حضرت سید گیسو درازؒ نے ایک رات اپنے والد محترم کو خواب میں دیکھا۔ حضرت سید یوسفؒ جی اپنے فرزند کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔

”سید محمد! ہمارے مملوک مکان کے صحن میں نیم کے درخت کے نیچے روپوں سے بھرا ہوا ایک حوض ہے اور اسی حوض میں اشرفیوں کی ایک دیگ بھی موجود ہے۔ اٹھو! اور یہ سب دولت نکال کر اپنے استعمال میں لاؤ۔“

حضرت سید گیسو درازؒ نیند سے بیدار ہوئے تو آپ کے چہرہ مبارک سے فکر و پریشانی کی کیفیت نمایاں تھی۔ خود گلابی کے انداز میں فرمانے لگے۔ ”سید محمد نے تو دولت کی طرف پشت کر لی اور دنیا کی تمام لذتوں کو چھوڑ دیا۔ پھر یہ کیا خواب ہے؟ اور مجھے حصولِ سیم و زر کی دعوت کیوں دی جا رہی ہے؟“

حضرت سید گیسو درازؒ بہت دیر تک اپنے خواب کے تمام زاویوں پر غور کرتے رہے۔ یہاں تک کہ فجر کی

اذان ہوگئی اور پھر آپ اپنے خالق کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔

سورج طلوع ہوا تو حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا فیہ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کا خواب سن کر کچھ دیر مراقبہ کیا اور مرید کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”یہ خواب نہیں، بشارت ہے۔ زمین میں پوشیدہ رُح کو نکالو اور اسے اپنے پیر و مرشد کا حکم سن کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے سر جھکا لیا اور خاموش بیٹھ رہے۔ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے آپ کی دلی کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا، اس لئے دوبارہ پھر ”سید محمد! کیا تمہیں اس کام میں کچھ تامل ہے؟“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔ ”سیدی پر غلبہ ترک دنیا کر چکا ہے۔ اب میں سیم و زر کے لئے اپنے دل میں کوئی رغبت نہیں پاتا۔“
حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے بہت غور سے اپنے مرید کی طرف دیکھا۔ سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ میں بڑی مطابقت تھی۔ حضرت شیخ نے آپ کے ترک دنیا پر گواہی دیتے ہوئے فرمایا۔
”بے شک! تم سیم و زر کو پسند نہیں کرتے۔ مگر یہ والد محترم کا حکم ہے۔ پہلے اس زیر زمین گنج پھر اسے اللہ کے راستے میں خرچ کر دو۔ اس طرح تمہیں دہرا ثواب ملے گا۔“

پیر و مرشد کا دوسرا حکم سن کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔ ہر آپ کے ہمراہ اس مکان میں پہنچے اور والد محترم نے خواب میں جس مقام کی نشاندہی کی تھی، اسے کھدوا کر خزانہ کافی گہرائی میں دفن تھا۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے کسی تاخیر کے بغیر سیم و زر کا انبار ضرور دیا۔ پھر غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے دو نقل ادا کئے، اس کے بعد شکر گزاری کے طور پر طولی دعا پڑھ کر فرمایا۔ ”اے اللہ! تیرے ہی حکم سے سید محمد تجھ پر ایمان لایا اور تیری ہی بخشی ہوئی توفیق کے سبب تیرے کیا۔ اور تیری ہی دی ہوئی ہمت سے اس بارگراں کو اٹھایا اور اس مشکل ترین ذمہ داری سے سبکدوش خیبر! تو خوب جانتا ہے کہ تیرے ناتواں بندے میں یہ بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔ اس لئے آئندہ مجھے ایسی آزمائشوں سے محفوظ رکھنا اور ہر آن میری مدد فرمانا کہ تیری دیکھری کے بغیر میں اس عبور نہیں کر سکتا۔“



دنیوی امور کے سلسلہ میں خاندانی چشتیہ کے بزرگوں کی یہ خاص عادت تھی کہ سلاطین و فتنے رسم و راہ نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح دولت دنیا کو بھی اپنے لئے وہال سمجھتے تھے۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ تو انائی اور سچائی کے ساتھ اپنے مشائخ کے راستے پر گامزن تھے۔ نئے نئے انداز سے آپ کے راز انبار پیش کئے جاتے تھے، مگر ہر بار آپ تائید غیبی کے سبب اس آزمائش میں پورے اترتے تھے۔ خواب میں جس خزانے کی بشارت دی تھی، وہ بھی دراصل ایک امتحان تھا۔ حق تعالیٰ کی دیکھری امتحان میں ثابت قدم رکھا اور آپ ”سب سے بڑے فتنے کے جال“ سے بحفاظت نکل آئے۔ (۱۱) مال اور اولاد کو بہت بڑی آزمائش قرار دیا گیا ہے)

کچھ بدن حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اسی انداز کا ایک اور عجب واقعہ پیش آیا۔ ایک بار دہلی میں سخت بارش ہوئی جس سے خستہ اور پرانے مکانات منہدم ہو گئے۔ اس کے آثار

ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ مکان کسی ہندو راجہ کا محل ہو گا۔ طوفانی بارش کے سبب اس مکان کی رہی سہی دیواریں بھی گر گئیں۔ پھر جب بارش رکی تو شاہی محل کا کوئی خدمت گار ادھر سے گزرا۔ کھنڈر کے بلے پر ایک چمک دار تختی پڑی تھی۔ خدمت گار نے آگے بڑھ کر تختی اٹھالی اور سلطان محمد تغلق کی خدمت میں پیش کر دی۔

سلطان محمد تغلق بڑی حیرت سے تانبے کی اس تختی کو دیکھتا رہا، جس پر کوئی عبارت کندہ تھی۔ سلطان محمد تغلق خود بھی ایک عالم و فاضل حکمران تھا۔ بہت دیر تک تختی کا جائزہ لینے کے بعد بس اتنا ہی معطل کر سکا کہ اس تختی کا تعلق ہندوستان کے قدیم راجہ سمرات اشوک کے دور حکومت سے ہے۔ سلطان محمد تغلق نے اس ٹائٹل عبارت کو پڑھنے کی بہت کوشش کی، مگر عاجز رہا۔ آخر فرامزدائے ہند نے آثار قدیمہ کے ماہرین کی جماعت کو دربار میں طلب کیا اور وہ تانبے کی تختی پیش کرتے ہوئے بولا۔

”اس عبارت کو پڑھو۔ یہ کوئی عام کتبہ ہے یا اس میں کوئی راز پوشیدہ ہے؟“

ماہرین آثار قدیمہ کی جماعت بہت دنوں تک اس تختی کے مطالعے اور مشاہدے میں غرق رہی۔ آخر اس جماعت کے کچھ لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس برباد شدہ مکان میں زرد جواہر کا کوئی خزانہ مدفون ہے..... مگر کوئی ماہر یہ نہیں بتا سکا کہ اس طویل و عریض کھنڈر میں سیم و زر کا وہ انبار کس جگہ چھپایا گیا ہے؟ الغرض سلطان محمد تغلق نے حکم دیا کہ خزانہ برآمد کرنے کے لئے پورا کھنڈر کھود ڈالا جائے۔

حکم شاہی کی تعمیل میں ماہرین آثار قدیمہ نے جگہ جگہ کھدائی کی، مگر خزانے کا پتہ نہ چل سکا۔ ناکامی کے بعد ماہرین دوبارہ سلطان محمد تغلق کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔

”جب تک اس خاص مقام کی نشاندہی نہ ہو، اس وسیع کھنڈر میں کھدائی کرنا کارِ لا حاصل ہے۔“

سلطان محمد تغلق اس ناپیدہ خزانے سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے دن رات غور و فکر میں رہنے لگا۔ جب بادشاہ اور اُس کے تمام اہل دانش سوچتے سوچتے تھک گئے تو اچانک اسے حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کا خیال آیا۔ یہ سلطان محمد تغلق کے دور حکومت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ان دنوں سلطان، صوفیاء اور مشائخ کا بہت احترام کرتا تھا۔ پھر اپنے گمراہ مصائبین کی مشاورت کے سبب وہ سیدھے راستے سے ہٹک گیا اور اس نے صوفیوں اور درویشوں کو سخت ازیتیں پہنچائیں۔ اس بحث سے قطع نظر، حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کا خیال آتے ہی سلطان محمد تغلق کا بے قرار ذہن سکون پا گیا اور اس نے اپنے وزراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اب یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”کیا عالم پناہ برالہام ہوا ہے؟“ ایک خوشامدی وزیر نے کہا۔

”ہاں! الہام ہی سمجھو۔“ سلطان محمد تغلق نے کہا اور فوراً ہی حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کے نام ایک خط

تحریر کیا۔

”ماہرین آثار قدیمہ نے دہلی کے ایک کھنڈر میں مدفون خزانے کی نشاندہی کی ہے، مگر وہ لوگ اس خاص مقام کا پتہ لگانے سے قاصر ہیں۔ مجبوراً میں حضرت شیخ سے رجوع کر رہا ہوں۔ حضور اپنے کشف باطن کے ذریعے اس دھبے کا محل وقوع دریافت فرمائیں تاکہ زرد جواہر کے ساتھ دیگر قیمتی آثار بھی مل جائیں اور مخلوق خدا کے کام آئیں۔“ سلطان محمد تغلق نے اپنے خط کے آخر میں یہ بھی تحریر کیا۔ ”اگر یہ دینیہ ہاتھ آگیا تو زرد جواہر کا ایک عشر (دسواں حصہ) حضور کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا جائے گا۔“

جب حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے شاہی قاصد کا لایا ہوا خط پڑھا تو مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”فقیر دل کو

دینیوں سے کیا نسبت ہے؟ درویش کو اپنے نفس کا کھنڈر کھودنے اور گوہر مراد ڈھونڈنے ہی سے فہم نہ آئے۔ خزانوں کا کیا پتہ لگائے گا؟“ یہ کہہ کر حضرت چراغ دہلی نے شاہی قاصد کو خط واپس کر دیا۔ ”سلطان! کہ اُس نے اس کام کے لئے مناسب آدمی کا انتخاب نہیں کیا۔ ماہرین آثارِ قدیمہ اور خالوہ ٹنڈا۔ دینیوں کو تلاش کر سکتے ہیں۔“

شاہی قاصد ناکام و نامراد لوٹ گیا۔ سلطان محمد تغلق نے حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کو دروازہ میں اس وقت تک التجا کرتا رہوں گا، جب تک حضور میری درخواست قبول نہیں فرمائیں گے۔“ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمانروائے ہند کا دوسرا خط پڑھا اور مسکراتے ہوئے عرض کیا: ”بابا! گیسودراز! تم بھی تو سلطان کے شہر میں رہتے ہو، آج اس کا یہ کام آ پڑا ہے۔“ حضرت سید گیسودراز، پیر و مرشد کا اشارہ سمجھ گئے تھے، اس لئے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ ”بابا! تم جاؤ اور سلطان کے کام کو ٹھیک ٹھیک انجام دے دو۔“ حضرت چراغ دہلی نے اپنے پیر مخاطب کر کے فرمایا۔

حضرت سید گیسودراز غم ہوئے، پیر و مرشد کی دست بوسی کے اعزاز سے شرف یاب ہوئے اور کارندوں کے ساتھ کھنڈر کی طرف روانہ ہو گئے۔

پھر حضرت سید گیسودراز پختہ ماہرین آثارِ قدیمہ، شاہی کارندوں اور مزدوروں کے ساتھ ہر زمانے کے قدیم کھنڈر میں داخل ہوئے۔ حیرت انگیز طور پر اس کھنڈر میں ایک طویل و عریض کمرہ دروازہ بردے محفوظ تھا۔ ماہرین آثارِ قدیمہ نے اس کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”شیخ! یہ تانبے کی تختی اسی کمرے کے صحن سے برآمد ہوئی تھی۔“

حضرت سید گیسودراز پختہ کچھ دیر تک اس پراسرار اور طلسماتی تختی کو ملاحظہ کرتے رہے، پھر آہستہ چلتے ہوئے کھنڈر کے صدر دالان میں تشریف لائے اور اس کی چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”وہ خزانہ یہاں دفن ہے۔“

حضرت سید گیسودراز پختہ کا ارشاد گرامی سنتے ہی شاہی مزدور آگے بڑھے۔ مگر آپ نے ہاتھ کے اندر مزدوروں کو روکتے ہوئے فرمایا۔ ”ظہور! تم لوگ اس چھت کو برباد کر دو گے۔“ یہ کہہ کر آپ خود بھی اپنے دست مبارک سے چھت پر ایک گول دائرہ بنایا۔ پھر شاہی مزدوروں کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ”دائرے کے اندر ہی کھودنا، ورنہ چھت خراب ہو جائے گی اور حضرت شیخ فرمائیں گے کہ سید محمد نے ٹھیک کا کام کیا۔“ ماہرین آثارِ قدیمہ اور شاہی مزدوروں کے ساتھ سلطان محمد تغلق کا وزیر خاص بھی کھدائی کے کام کی نگرانی آیا ہوا تھا۔ حضرت سید گیسودراز پختہ کی گفتگوں کر سب کے سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ عمارت اور ارضیات کا وسیع علم رکھنے والے خزانے تک پہنچنے میں ناکام ہو گئے تو ایک گوشہ نشین درویش کی کس طرح رسائی حاصل کرے گا؟

الغرض دربارِ سلطانی سے متعلقہ تمام افراد اسی ذہنی کشش میں مبتلا تھے کہ مزدوروں نے حضرت سید گیسودراز کے کھینچے ہوئے دائرے کے اندر کھدائی شروع کر دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی چھت میں شگاف پڑنے لگا۔ خزانہ کسی دریا کی طرح ابل پڑا۔ ناقابل یقین منظر دیکھ کر حاضرین کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر جب سلطانی کارندوں ہوش و حواس بحال ہوئے تو سلطان محمد تغلق کے وزیر خاص نے حضرت سید گیسودراز پختہ کے دست مبارک

دیتے ہوئے عرض کیا۔

”شیخ! اتنا کرم اور فرمائیے کہ اس سختی کے اسرار و رموز بیان فرما دیجئے تاکہ میں سلطان کے حضور میں سرخرو ہو جاؤں۔“

وزیر خاص کی التجاس کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ مسکرائے۔ ”چلو! تم ہی سرخرو ہو جاؤ۔“ اتنا فرما کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اس طلسماتی سختی کے تمام راز فاش کر دیئے۔

آپ کے ارشادات گرامیٰں کر وزیر خاص اور تمام ماہرین آثار قدیمہ بیک زبان پکار اٹھے۔ ”بے شک! اس طلسمی عقدے کو آپ ہی حل کر سکتے تھے۔“

اپنی تعریف و ستائش سے بے نیاز حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین کو سلام کیا اور خدا حافظ کہہ کر پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

آپ کو دیکھتے ہی حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا۔ ”سید محمد! کام کر دیا؟“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، پیر و مرشد کی بارگاہ عالیہ میں خم ہو گئے اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ عرض کیا۔

”خادم نے خدمت کے مدتے میں ٹھیک ٹھیک کام کر دیا۔“

پھر سلطان محمد تغلق نے وعدے کے مطابق خزانے کا دسواں حصہ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ حضرت چراغ دہلیؒ کچھ دیر تک سیم و زر اور جواہرات کو ملاحظہ کرتے رہے، پھر شاہی کارندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ سید محمد کا حصہ ہے۔ اسے ان کے مکان پر پہنچا دو۔“

جب شاہی کارندے سوئے اور جواہرات سے بھری ہوئی گاڑیاں لے کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر پہنچے تو آپ نے فرمایا۔ ”اس خزانے کو خانقاہ عالیہ واپس لے جاؤ۔“

یہ کہہ کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت شیخؒ کے دامن سے لپٹ کر رونے لگے۔ ”خدمت کے مدتے میں دینے والے نے خادم کو اتنی دولت دی ہے کہ دامن میں نہیں سائی۔“

حضرت سید محمد کا یہ والہانہ شہق دیکھ کر حضرت چراغ دہلیؒ نے دوبارہ فرمایا۔

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد

واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

اس کے بعد حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے سیم و زر کا انبار واپس کرتے ہوئے سلطان محمد تغلق کو پیغام بھیجا کہ یہ ساری دولت غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دی جائے۔



سمرات اشوک کے زمانے کا خزانہ برآمد ہونے کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی کشف و کرامت کے تذکرے عام ہونے لگے۔ مگر گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ یہی فرماتے۔ ”لوگو! میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ مجھ میں جو کچھ ہے، وہ اسی ذات گرامی کا عکس جلال و جمال ہے۔“ حضرت سید محمد رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ اپنے پیر و مرشد کی طرف ہوتا۔

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ بھی اپنے مرید سے اس قدر محبت فرماتے تھے کہ اس ربط خاص کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ وصال سے ایک سال پہلے حضرت چراغ دہلیؒ ”باسور بادی“ کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ جب تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی تو خدمت گاروں نے عرض کیا۔

”سیدی! آپ کی ناسازی طبع کے باعث غلاموں کو سخت تشویش ہے۔ حکم ہو تو کسی طبیب سے رجوع کریں۔“

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے خدام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”طیب کیا کرے گا؟ نہ کہ وہی کرے گا۔ جو میرا طیب ہے، وہ اپنے بندے کا حال دیکھ بھی رہا ہے اور سن بھی رہا ہے۔“

خدام خاموش ہو گئے، مگر ان کے چہروں پر اذیت و کرب کا رنگ نمایاں رہا۔ حضرت سید نصیر الدین چراغ کے مرض میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آخر ایک بار پھر خدام نے دست بستہ عرض کیا۔ ”سیدی! اب ہم مرشد کی یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔“

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر خدمت گاروں سے فرمایا۔ ”اچھا! تم لوگوں کو مانتے تو مجھے سید محمدؑ کے گھر لے چلو!“

”کیا یہ سید محمدؑ آپ کو کسی طیب کے یہاں لے جائیں گے؟“ ایک خدمت گار نے عرض کیا۔

”وہ خود طیب ہیں۔“ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا۔

”سید محمدؑ! تو خود آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر رہتے ہیں۔“ دوسرے خادم نے عرض کیا۔ ”وہ کی ضرورت سے گھر تشریف لے گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔“

”میں ضرورت مند ہوں، اس لئے مجھے خود ہی ان کے گھر جانا ہو گا۔“ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا۔

پھر حضرت چراغ دہلی پالکی میں سوار ہو کر حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ کے یہاں تشریف لے گئے۔

”سیدی! آپ نے زحمت کیوں کی؟“ حضرت سید محمدؑ، پیر و مرشد کی آمد پر حیران تھے۔

”سید محمدؑ! تم بھی جانتے ہو کہ میں ایک مرض میں مبتلا ہوں۔“ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا۔

”میرے ساتھی چاہتے ہیں کہ میں اپنی صحت پر توجہ دوں اور کسی طیب خاص سے علاج کراؤں۔“

”خادم بھی کئی بار عرض کر چکا ہے کہ مخدوم کی یہ تکلیف صاحبانِ نسبت کے لئے سخت اذیت کا باعث ہے۔“

حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ نے عرض کیا۔

”اسی لئے میں اپنے طیب کے پاس آیا ہوں۔“ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا۔

حضرت سید گیسو دراز اور دوسرے خدمت گار، پیر و مرشد کی گفتگو سمجھنے سے قاصر رہے۔

پھر مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد حضرت چراغ دہلی نے حضرت سید گیسو دراز کو دوبارہ مخاطب کر کے فرمایا۔

”سید محمدؑ! تم میرا علاج کرو۔ میں اس بات پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری دعاؤں کے سبب مجھے عطا فرمائے گا۔“

”سیدی! میں مخدوم کا ایک ادنیٰ خدمت گار، ایک بندہ گناہ گار؟“ پیر و مرشد کا حکم سن کر حضرت سید گیسو دراز حیرت و سکوت کی کیفیت طاری ہو گئی۔

”ہاں سید محمدؑ! تم اپنے مرشد کا علاج کرو۔“ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا۔

یہ سنتے ہی حضرت سید گیسو دراز پر رقت طاری ہو گئی۔ پھر اسی عالم میں آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹا دیے۔

حضرت سید گیسو دراز کے پُرسوز لہجے نے حاضرینِ مجلس کو بھی رُلا دیا۔ جیسے ہی دعا ختم ہوئی، حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا۔

”سید محمدؑ! تمہاری دعاؤں کی تاثیر شروع ہو گئی ہے۔ اب میں کچھ افادہ محسوس کر رہا ہوں۔“

حضرت سید گیسو دراز روتے ہوئے عرض کرنے لگے۔ ”مخدوم کی بخشش و عطا کا بھی عجیب انداز ہے۔“

”ہاں، مگر بیماروں سے اپنے لئے دعا کراتے ہیں۔ اس شانِ انکسار اور کریم النفسی کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟“

پیر حضرت سید نصیر الدین چراغِ دہلی خانقاہ تشریف لے آئے۔ واپسی میں حضرت سید گیسو دراز بھی پیر و مرشد کی ہائی اٹھائے ہوئے تھے۔ معتبر روایت ہے کہ حضرت چراغِ دہلی دوسرے دن مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے۔ جس بیماری نے پیر و مرشد کو کم و بیش ایک ماہ سے سخت اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا، وہ اس طرح چلی گئی کہ جیسے کبھی اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

پیر و مرشد کی نگرانی میں حضرت سید گیسو دراز کا روحانی سفر جاری تھا کہ حضرت سید نصیر الدین چراغِ دہلی کا وقتِ آزاگئی۔ حضرت سید گیسو دراز اور دوسرے مریدین نے بصد نیاز عرض کیا کہ طبیبوں سے رجوع کیا جائے۔ مگر حضرت شیخؒ نے فرمادیا۔

”یہ دھرم نہیں ہے جو کسی طبیب کے نسخے سے شفا یاب ہو سکے۔ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، سو میں بھی قریب اس مرحلے سے گزروں گا۔“

حضرت چراغِ دہلی کا ارشاد گرامی سن کر مریدین پر سوگواری چھا گئی اور خانقاہ کے در و بام اُداس نظر آنے لگے۔ حضرت سید گیسو دراز بہت زیادہ بے قرار و مضطرب تھے۔ آپ کے لئے پیر و مرشد سے جدائی کا تصور بھی اذیت ناک تھا۔ حضرت چراغِ دہلی کے دوسرے مرید بھی افسردہ و ملول تھے۔ حضرت سید نصیر الدین چراغِ دہلی کی بیماری لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور ناپائیدار زندگی کا قافلہ منزلِ فنا سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ پیر و مرشد کے وصال کے بعد خلافتِ کبریٰ کا مسئلہ بھی درپیش تھا اور حضرت چراغِ دہلی نے ابھی تک اپنے کسی مرید کو خلیفہ اکبر کے منصب پر فائز نہیں کیا تھا۔ حضرت سید گیسو دراز پیر و مرشد کے بہت زیادہ قریب تھے، اس لئے خود کو خلافتِ کبریٰ کا حقدار سمجھتے تھے۔

حضرت چراغِ دہلی کے دوسرے خلفاء کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں۔
حضرت خواجہ کمال الدین جنہیں اسلام کی تبلیغ کے لئے احمد آباد (گجرات) بھیجا گیا تھا۔ آپ کا حزار مبارک دہلی میں ہے۔ دوسرے خلیفہ حضرت شیخ صدر الدین بھی دہلی میں آسودہ خاک ہیں۔ شیخ معین الدین خورڈ اور شیخ مران الدین پاک پٹن میں محو خواب ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر کا حزار مبارک جون پور میں مرجعِ خلائق ہے۔ حضرت مولانا خواجگی، حضرت شیخ سعد اللہ کیسہ دار اور حضرت شیخ احمد تھانیسری کالپی میں آرام فرما رہے ہیں۔ بہرائچ میں حضرت شیخ محمد متوکل اور لکھنؤ میں حضرت قوام الدین کا روضہ مبارک مرکزِ اہل نظر ہے۔

حضرت سید نصیر الدین چراغِ دہلی کی حالت دم بہ دم بگڑتی جا رہی تھی۔ آخر وصال سے ایک دن پہلے آپ نے اپنے تمام مریدوں اور خدمت گاروں کو طلب کر کے فرمایا۔

”میری سانسوں کا شمار ختم ہونے والا ہے۔ میں تم سب کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں کہ دونوں جہان میں اُسی کی ذات پاک تمہاری مشکل کشا ہے۔“

پیر و مرشد کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر مریدین اور خدام پر گریہ طاری ہو گیا۔ حضرت شیخؒ نے اپنے جاں نادر کو رُخِ دالم کے اس مظاہرے سے منع کیا اور صاف الفاظ میں وصیت فرمائی۔

”جب میری آنکھیں بند ہو جائیں تو پیرانِ چشت کے فرقہٴ خلافت اور دوسرے تہرکات کو میرے ساتھ قبر میں دفن کر دینا۔“

پیر و مرشد کا ارشاد گرامی سن کر مریدوں کو شدید احساسِ محرومی ہوا۔ حضرت سید گیسو دراز کے علاوہ دیگر خلفاء بھی خود کو خلافتِ کبریٰ کا حقدار سمجھتے تھے۔ یہ کوئی حریصانہ جذبہ نہیں تھا۔ ہر مرید اپنی استطاعت کے مطابق حضرت شیخؒ کی باتنی کی خواہش رکھتا تھا۔ آخر کسی کو تو درس گاہ و معرفت کا صدر بننا تھا۔ مگر جب حضرت چراغِ دہلی نے پیرانِ

چشت کے تبرکات کو اپنی قبر میں دفن کرنے کی وصیت کی تو مریدین کی جماعت یہ سوچ کر اُداس ہو گئی کہ اگر حضرت شیخ کی نیابت اور خلافت کبریٰ کے لائق نہیں تھا۔

آخر 17 یا 18 رمضان المبارک 757ھ کو حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی دنیا سے رخصت ہوئے وہ زندگی کی لو تھر تھرائی اور شہر دہلی میں ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ لوگ دیوانہ وار چیختے ہوئے اپنے گھروں سے باہر اور دار الحکومت پر کسی ماتم کدے کا گمان ہونے لگا۔ حضرت چراغ دہلی کے مریدین اور خدام پر مغلوں کے ہاتھ پڑے تھے۔ شدتِ غم سے گھبرا کر بہت سے عقیدت مندوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے تھے۔ سید گیسو دراز بھی رو رہے تھے، مگر آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا، جیسے کوئی شمع بجھل رہی ہے۔ زبان پر شور و فغاں نہیں۔ چہرہ مبارک پر حسرت و یاس کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ اس جانگداز موقع پر آپ نے کمال ضبط کا مظاہر کیا۔ سید نصیر الدین چراغ دہلی نے شادی نہیں کی تھی، اس لئے آپ کے مرید اور خدمت گار ہی آپ کے اہل خانہ تھے۔ حضرت سید گیسو دراز نے خانقاہ کے ادنیٰ ترین خادم کو بھی حضرت شیخ کا قربت دار جان کر اس سے قربت درویشوں کی غم سے نڈھال جماعت کو تسلیاں دیں اور صبر و ضبط کی تلقین فرماتے رہے۔ مگر جب پیر و مرید میں اتارا گیا تو حضرت سید گیسو دراز خود بھی بے حال ہو گئے۔ اشکوں کے سیلاب پر جو بند باندھا گیا تھا۔ پھرا تاروئے کہ آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ حضرت سید گیسو دراز کے ہونٹوں پر نالے تو نہیں تھے، مگر مسلسل برس رہی تھیں۔

جب حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کو مٹی دی جا چکی تو حضرت سید گیسو دراز نے روتے ہوئے فرمایا: ظاہری مجھ گیا کہ یہی مشیت الہی ہے۔ مگر جو چراغ، نور معرفت سے روشن ہوئے ہیں، انہیں قیامت تک مبرا آئے گی۔ میرے مرشد کے کردار کی روشنی بھی بیض فضاؤں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اُجالوں کے طلب گار۔ خلوص نیت کے ساتھ ادھر آئیں گے، حق تعالیٰ میرے شیخ کے طفیل ان کی روحوں کے اندھیرے دور فرما دے گا۔ پھر حضرت سید گیسو دراز تین دن دن تک پیر و مرشد کی قبر مبارک کے پاس اس طرح بیٹھے رہے جس طرح غلام، شہنشاہ کے قدموں میں بیٹھتا ہو۔ اس دوران کسی نے کچھ کھانے کے لئے کہا تو آپ نے انکار کر دیا۔ گھونٹ پانی پر گزارہ کرتے رہے۔

چوتھے دن حضرت سید گیسو دراز، پیر و مرشد کی قبر مبارک سے اُٹھ کر خانقاہ عالیہ میں تشریف لائے۔ ایک ماضی کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ پیر و مرشد یہاں چہل قدمی فرماتے تھے..... یہاں وضو کیا کرتے تھے..... یہاں الہی میں مشغول رہتے تھے اور یہاں بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔ دل پر چوٹ لگی تو زخم پھر خون دینے لگے۔ سید گیسو دراز، پیر و مرشد کی ایک ایک نشانی کو بوسہ دیتے اور رونے لگتے۔ بے شمار لوگ آپ سے تعزیت کر لے آئے مگر آپ نے ہاتھ کے اشارے سے ان کا شکریہ ادا کیا اور جواباً صبر کی تلقین فرمائی۔

پھر مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے اور اس مخصوص جگہ کو دیکھنے لگے، جہاں حضرت سید نصیر الدین چراغ دقت نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ حضرت چراغ دہلی کے بعض خلفاء نے آپ کے سکوت مسلسل کو دیکھ کر کہا۔ ”سید محمد! اتنا غم نہ کرو کہ اپنی ذمہ داریوں کو بھی فراموش کر بیٹھو۔“

”ابھی میرے سینے پر فراقی شیخ کا غم تازہ ہے۔ ذرا اس زخم کو تو بھر جانے دو۔“ حضرت سید گیسو دراز نے رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”میں حضرت شیخ کے صدقے میں اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر ہوں۔“ پانچویں دن حضرت سید گیسو دراز کا دل اس بارونق شہر سے اُچاٹ ہو گیا۔ اور آپ کو دہلی ایک دیرانہ

لگا۔ لگ آپ سے اس اُداسی کا سبب پوچھتے تو بے اختیار فرماتے۔ ”میں جس رُخ روشن کو دیکھ کر جیتا تھا، وہ تو زیرِ خاک سو رہا ہے۔ اب میں کس کی شکل دیکھوں اور کیسے زندہ رہوں؟ وارفتگانِ عشق! میں بھی تمہارے سکون کے لئے دعا کرتا ہوں اور تم بھی سید محمد کے مبر و قرار کے لئے دعا کرو۔“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ مسجد کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کو پیر و مرشد کی وصیت یاد آئی۔ ”جب میری آنکھیں بند ہو جائیں تو پیرانِ چشت کا خرقہ خلافت اور دوسرے تبرکات میرے ساتھ قبر میں دفن کر دینا۔“

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے آخری الفاظ یاد آتے ہی سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔ آپ بے تابانہ اُٹھے اور جماعت خانے کے اس حصے میں تشریف لے گئے، جہاں ایک چارپائی رکھی ہوئی تھی۔ وہ مخصوص چارپائی تھی، جس پر غسل کے بعد حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کا جنازہ رکھا گیا تھا۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کچھ دیر تک اس پلنگ کو دیکھتے رہے۔ پھر آپ نے آگے بڑھ کر چارپائی کے تمام بان نکال لئے۔ خانقاہ میں موجود دوسرے لوگ بڑی حیرت سے سید محمد رحمۃ اللہ علیہ کے اس طرزِ عمل کو دیکھ رہے تھے۔

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے پلنگ کے بان نکال کر چادر کی طرح اپنے گلے میں ڈال لئے۔ پھر ایک نعرہ مرتانہ بلند کیا۔

”سدا رہے نام اللہ کا۔“

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے خلفاء اور خدمت گاروں نے حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کو اس حال میں دیکھا تو حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”سدا یہ کیا ہے؟“

حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت جذب کے عالم میں فرمایا۔ ”یہی میرا خرقہ ہے اور یہی میرا سرمایہ حیات ہے۔“

اس کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور دہلی کی حدود سے نکل کر دکن کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس طویل سفر میں بے شمار واقعات پیش آئے۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے ان بانوں میں سے ایک بان بھی جس پر ڈال دیا، وہ ولی کامل ہو گیا۔



حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ دہلی سے رخصت ہو کر اجیر شریف لائے اور سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حزار مبارک پر حاضری دی۔ تین دن تک مسلسل مراقبے میں رہے اور حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے نفلِ روحانی سے مستفیض ہوئے۔ چوتھے دن اجیر شریف سے رخصت ہونے لگے تو مقامی امراء اور عوام حاضر خدمت ہو کر عرض کرنے لگے۔

”اگر حضور یہاں چند روز اور قیام فرمائیں تو ہم گناہ گار اپنی خوش بختی پر ناز کریں گے۔“

”اب مجھے یہاں ٹھہرنے کا حکم نہیں۔“ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اجیر شریف کے خواص و عوام کی

درخواست نہ کر فرمایا۔ ”حضرت سلطان الہند کا حکم ہے۔ اس لئے غلام کو مجبور تصور کیا جائے۔“

یہ کہہ کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ قصبہ ”سردار شریف“ روانہ ہو گئے۔ یہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند حضرت خواجہ غفر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے حزار مبارک پر فاتحہ خوانی کی اور پھر ناگور شریف لے گئے۔ وہاں آپ نے مشہور بزرگ حضرت قاضی حمید الدین ناگوری کے فرزندوں سے ملاقات کی اور دیگر بزرگانِ دین کے حضرات پر

فاتحہ پڑھی۔ حضرت قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ سلسلہ سہروردیہ میں بیعت تھے لیکن انہیں حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے بھی خرقہ خلافت حاصل ہوا تھا۔ آپ کا حراز مبارک دہلی میں آج بھی مرجع غائِب ہے۔

ناگور کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ احمد آباد (گجرات) تشریف لے گئے اور ایک قبرستان میں نماز اس وقت یہاں حضرت قطب عالم کے خلیفہ شاہ عالم موجود تھے۔ حضرت قطب عالم، حضرت مخدوم جلال گشت کے فرزند تھے۔ جب حضرت شاہ عالم کو کشف باطن سے معلوم ہوا کہ حضرت سید گیسو دراز، احمد آباد تشریف لائے ہوئے ہیں تو آپ بلا تاخیر قبرستان پہنچے اور حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کے غلام در خواست کی۔

”مخدوم! آپ خانقاہ میں تشریف لے چلیں اور بندگانِ خدا کو اپنے دیدار سے مشرف فرمائیں۔“
حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ عالم کی تواضع کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ ”قبرستانِ اقامت گاہ ہے۔“

پھر آپ نماز جمعہ پڑھانے کے لئے احمد آباد کی جامع مسجد میں تشریف لے گئے۔ حضرت سید گیسو نہایت سلیس، عام فہم اور فصاحت سے بھرپور خطبہ پڑھا اور ہزاروں بندگانِ توحید کی امامت کی۔ احمد آباد کا حاکم درویش دوست انسان تھا۔ اس نے نہایت عاجزانہ لہجے میں حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی۔ ”سرکار! احمد آباد کی سکونت قبول فرما کر مجھے اور اہل شہر کو خدمت کا موقع عطا فرمائیں۔“
حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے احمد آباد کے حاکم اور معززین شہر کو بھی وہی جواب دیا۔ ”ابھی مجھے نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر آپ قبرستان واپس تشریف لے آئے۔

عصر کے وقت احمد آباد کا حاکم، قاضی شہر اور دیگر مشائخ کے ہمراہ قبرستان میں حاضر ہوا۔ بیچے سلطنت زرو جواہر سے بھرے ہوئے خوانِ طشت اٹھائے ہوئے تھے۔

”حضرت! یہ حقیر سی نذر قبول فرمائیں۔“ حاکم احمد آباد اور دیگر عمائدین سلطنت بنے عرض کیا۔
حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، حاکم احمد آباد کی درخواست سن کر مسکرائے۔ ”جس شخص کی منزل قبرستانِ سیم وزر کے انبار کو کہاں رکھے گا؟“

جب حاکم احمد آباد نے نذر قبول کرنے کے لئے بہت زیادہ اصرار کیا تو حضرت سید گیسو دراز نے انہیں میں فرمایا۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ دولتِ دنیا، سالک کے لئے رہزن و قزاق کا درجہ رکھتی ہے؟ کیا تم میری متاعِ دین لٹ جائے؟“

شیخ کے فرمودات سن کر حاکم احمد آباد اور معززین شہر نے سر جھکا دیئے۔

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ اپنے عقیدت مندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تمہارا شکر یہ۔ مگر تم لوگ اس حقیقت سے باخبر نہیں ہو کہ میں اس دنیا کو طلاق دے چکا ہوں۔ اب رجوع کی بات باقی نہیں۔“

آخر احمد آباد کے حاکم کی التجا پر آپ نے وہ ساری دولت ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی۔ ہر چہ یہ مندوں کا ہجوم شام تک قبرستان سے رخصت ہوا، حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ رات کے اندھیرے ہی میں سے رخصت ہو کر اپنے طویل سفر پر روانہ ہو گئے۔



روایت ہے کہ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ سیالکوٹ پہنچ کر حضرت شیخ علی لاجپور کے مزار مبارک پر بھی حاضر ہوئے اور فاتحہ خوانی کے بعد پہاڑوں پر تشریف لے گئے تھے۔ پھر اسی پہاڑی سلسلے سے گزرتے ہوئے آپ "اور اکنڈ" کی پہاڑیوں پر پہنچے تھے۔ کچھ دنوں تک اس پُرسکون فضا میں عبادت و ریاضت کرنے کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ "ہر دوڑ" پہاڑ کے نیچے تشریف لائے۔ "ہر دوڑ" کا شمار ہندوؤں کے انتہائی اہم تہ تیہرہ استھانوں (مقامات مقدسہ) میں ہوتا ہے۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کو دو دن سے پانی نہیں ملا تھا، اس لئے آپ "ہر دوڑ" کے گھاٹ پر پہنچے اور پانی پی کر یا د حق میں مشغول ہو گئے۔ عام تحقیق یہی ہے کہ ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا اسی ہر دوڑ پہاڑ سے جاری ہوا ہے۔

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ مراقبے میں تھے کہ چند ہندو، گھاٹ پر اشان (غسل) کرنے کے لئے آئے۔ انہوں نے اپنے تہ تیہرہ استھان پر ایک مسلمان بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو شور مچا دیا۔ "لوگو! دیکھو یہ کیسا از تہ (غصب) ہو گیا۔"

ہندو پجاریوں کا خیال تھا کہ ان کے شور و غوغا سے یہ اجنبی مسلمان بدحواس ہو جائے گا۔ پھر یا تو فرار ہو جائے گا یا ہندوہرم کے سیوکوں سے اپنی غلطی کی معافی مانگے گا..... مگر وہاں تو کوئی ردِ عمل ہی ظاہر نہیں ہوا تھا۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ یادِ الہی میں اس قدر غرق تھے کہ آپ نے ہندو پجاریوں کا شور سنا ہی نہیں۔ آپ بدستور آنکھیں بند کئے، خاموش بیٹھے رہے۔

ہندو پجاری ایک مسلمان کی یہ حالتِ اطمینان دیکھ کر سخت خوف زدہ ہو گئے۔ انہیں حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی پر ایک ایسے جادوگر کا گمان ہونے لگا، جو اپنی طلسماتی طاقت کے سبب ساری دنیا سے بے نیاز تھا۔ ہندو پجاری چہرانی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں ان کا بڑا مہنت (پجاری) آگیا۔ ہندو پجاری کا ہنسی ہوئی آواز میں مہنت کو سارا واقعہ سنانے لگے۔

مہنت نے تحقیر آمیز انداز میں حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور غصے میں بھرا ہوا آپ کے قریب پہنچا۔ پھر اس نے چیخ کر مسلمان درویش کو مخاطب کیا۔ "کون ہو تم؟"

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ پھر اس آواز کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ آپ اس وقت یادِ الہی کی اس منزل میں تھے، جہاں الہی دنیا اور مادیت کے شور کی نفی ہو جاتی ہے۔

مہنت پوری طاقت سے چیخ رہا تھا۔ مگر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی سماعت ان پُرشور آوازوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہو رہی تھی۔ آخر مہنت نے غضب ناک ہو کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے جسم مبارک کو جھنجھوڑ ڈالا۔ آپ نے نہایت اطمینان سے آنکھیں کھولیں اور ایک نظر مہنت کی طرف دیکھا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہندو پجاری نے ایک مردِ حق کی آنکھوں میں کیا دیکھا کہ ایک زوردار چیخ ماری اور زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

اس صورتِ حال نے مندر کے چھوٹے پجاریوں کو خوف و دہشت میں مبتلا کر دیا۔ وہ سب مل کر بری طرح چیخنے لگے۔ "یہ شخص بڑا جادوگر ہے، جس نے ہمارے مہنت کو مار ڈالا۔" پھر وہ مہنت کے بے ہوش جسم کے پاس بیٹھ کر ماتم کرنے لگے۔

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کچھ دیر تک بت پرستوں کا بین سنتے رہے، پھر اپنی جگہ سے اُٹھے اور ہندو پجاریوں سے پوچھنے لگے۔ "آخر تم لوگ اتنی دلخراش چیخوں کے ساتھ کیوں رو رہے ہو؟"

”تم نے ہمارے مہنت کو مار ڈالا اور ہم لوگ اپنے بڑے پجاری کی موت کا سوگ منا رہے ہیں۔“ ہندو ساتھیوں نے لرزتی ہوئی آوازوں میں کہا۔

”کوئی انسان، کسی انسان کو مار نہیں سکتا۔“ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے ہندو پجاریوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”زندگی اور موت کا مالک صرف اللہ ہے جو اپنی ذات میں تنہا ہے۔“

بت پرست، خدائے واحد کے نام سے نا آشنا تھے، اس لئے اپنے جہل اور گمراہی پر اصرار کرتے رہے کسی اللہ کو نہیں جانتے۔ ہمیں تو بس اتنا پتہ ہے کہ تم نے اپنی جادوئی طاقتوں سے ہمارے مہنت کی جان لیوا یہ کہہ کر ہندو پجاریوں نے بین شروع کر دیا۔

”خاموش ہو جاؤ۔“ اب کی بار حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے پُر جلال لہجے میں بت پرستوں کو مخاطب کیا۔ ایک مسلمان ہوں اور مسلمانوں کے نزدیک جادو کی کوئی حیثیت نہیں۔“ اتنا کہہ کر حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ مہنت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بلند آواز میں فرمایا۔ ”اللہ کے حکم سے اٹھ جا۔“

ابھی سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ مہنت اٹھ کھڑا اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ مہنت نے گھبرا کر حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور پھر حضرت قدموں پر سر رکھ دیا۔ وہ بے اختیار چیخ رہا تھا۔ ”میں نے آپ کو پہچان لیا۔ میں نے آپ کو پہچان لیا۔ اندھیر ہو گئے اور میں روشنی کی طرف بڑھ رہا ہوں۔“

مہنت کی یہ پُر جوش گفتگو سن کر حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو؟“ ”میں چاہتا ہوں کہ یہ اندھیرے دوبارہ میری زندگی پر مسلط نہ ہوں۔“ مہنت، حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ قدموں سے لپٹا ہوا رو رہا تھا۔ ”مجھے اپنا غلام بنا لیجئے۔“

”میں تمہیں غلام تو نہیں، اپنا بھائی بنا سکتا ہوں۔“ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔ ”کچھ بھی بنا لیجئے، مگر مجھے اپنے آپ سے جدا مت کیجئے۔“ مہنت کی گریہ و زاری جاری تھی۔

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے مہنت کو پکڑ کر اٹھایا۔ پھر آپ نے مختصر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر پیش کیں اور فرمایا۔ ”اگر تم اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ گے تو تمہاری زندگی سے گمراہی کے اندھیرے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائیں گے اور جس روشنی کو تم اس وقت اپنے قریب محسوس کر رہے ہو، وہ آخری سانس تک تمہارے ساتھ رہے گی۔“

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سی تقریر نے مہنت اور اس کے ساتھیوں کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ دو ہزار دیوتاؤں کی نفی کر کے ایک خدا پر ایمان لے آئے اور ہر دوڑ کے مندروں میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ ہندو مقامی ہندوؤں نے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف کئی منصوبے بنائے اور ناکام رہے۔ آپ کچھ دنوں ہر دوڑ میں مقیم رہے اور اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ اس مختصر سے عرصے میں سینکڑوں بت پرستوں نے اسلام قبول کیا اس طرح کفر کے گڑھ میں ایمان کے دروازے کھل گئے۔

ایک دن حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ ہر دوڑ کے گھاٹ پر تشریف فرما تھے کہ نو مسلم مہنت حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ”مجھے آپ کے صدقے میں دولتِ ایمان نصیب ہوئی ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں نذر پیش کروں۔“

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ خاموش رہے۔

”کیا آپ میری نذر قبول کرنے سے انکار تو نہیں فرمادیں گے؟“ حضرت گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کو خاموش پا کر نو مسلم ہنت نے عرض کیا۔

”ہمارے خوجگان بھی نذر قبول فرماتے ہیں۔“ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”خلوص دل کے ساتھ پیش کی جانے والی نذر ہمیشہ درجہ قبولیت کو پہنچتی ہے۔“

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کو راضی پا کر نو مسلم ہنت آگے بڑھا اور اس نے ایک بڑا سانا ریل حضرت شیخ کے قدموں میں رکھتے ہوئے عرض کیا۔ ”بظاہر یہ ناریل ہے مگر اکسیر سے بھرا ہوا ہے۔“

”اکسیر سے بھرا ہوا ناریل؟“ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے تعجب سے فرمایا۔ ”کیا یہاں کوئی درخت ہے جس میں اس قسم کے ناریل آتے ہیں؟“

نو مسلم ہنت نے نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ”اس ناریل کی اپنی حیثیت کچھ بھی نہیں، مگر میری انتھک تمہیا (ریافت) نے اسے اکسیر بنا دیا ہے۔ اگر میں چاہوں تو اس ناریل سے لاکھوں من سونا تیار کر سکتا ہے۔“ نو مسلم ہنت نے فخریہ لہجے میں کہا۔

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے مسکراتے ہوئے اس ناریل کو اٹھایا، چند لمحوں تک ہر زاویے سے دیکھتے رہے، پھر آپ نے اس ناریل کو بچ کر دریا میں پھینک دیا۔

”شیخ! یہ آپ نے کیا کیا؟“ بے اختیار نو مسلم ہنت کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

”خدائے واحد پر ایمان بھی لاتے ہو اور ان توہمات پر بھی یقین رکھتے ہو؟“ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے نو مسلم ہنت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”انسانی دل میں ایک ہی جذبہ رہتا ہے۔ جذبہ وحدانیت پرستی یا جذبہ توہم پرستی۔ تم نے اللہ کی بخشش و عطا اور رزاقی کے معاملے میں بے یقینی کا مظاہرہ کیا ہے، اس لئے اپنے اس گناہ سے توبہ کرو۔“

نو مسلم ہنت خاموش بیٹھا رہا۔ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی تلقین کے باوجود اس کے چہرے پر اکسیری ناریل کے کھوجانے کا دکھ نمایاں تھا۔

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے نو مسلم ہنت کی دلی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اللہ کے خزانوں میں اکسیر کی کوئی کمی نہیں ہے۔ پھر بھی اگر تمہیں اسی ناریل کی خواہش ہے تو اس جیسے ناریل جتنے چاہو، دریا سے نکال لو۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ نے دریا کی طرف اشارہ کیا۔

نو مسلم ہنت نے گھبرا کر دریا کی جانب دیکھا۔ کنارے پر ہزاروں ناریل تیر رہے تھے اور سب کے سب نو مسلم ہنت کے ناریل کی طرح تھے۔

”جس ناریل کو اکسیر کی صفت دینے کے لئے تم نے اپنی ساری زندگی برباد کر دی، یہ سارے ناریل اس جیسی خوبی رکھتے ہیں۔ کوئی بھی ناریل اٹھا لو اور اس سے حسب خواہش سونا بنالو۔“

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات گرامی سن کر نو مسلم ہنت ندامت کے پسینے میں نہا گیا۔ پھر نہایت بے ہوش لہجے میں عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! آپ بھی دعا فرمائیے کہ اللہ میرے اس گناہ کو معاف فرمادے۔ میں اپنے سینے سے طلب دنیا کو نکال پھینکوں گا اور اسندہ اللہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر ہی عمل کروں گا۔ اب ہر اپنے ماضی سے کوئی رشتہ نہیں۔ بس حال ہی میرا حال ہے، جو حضرت شیخ کی نظر کرم کا صدقہ ہے۔“

جواباً حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے نو مسلموں کی جماعت کو اس طرح تلقین فرمائی۔ ”نفسانی خواہشات کو آگ

سمجھو، جو روح کی سچائی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہیں۔ اور سیم وزر کی خواہش کو زہریلا سانپ جانو جو طالبانِ حق کی کوششوں میں لگا رہتا ہے۔ اللہ نے ہر انسان کے لئے آسمان پر اس کا رزق لکھ دیا ہے۔ وہ بیت کے اندر پانے والے بچے کو بھی اس کا رزق پہنچاتا ہے۔ پھر کے اندر اور آگ میں زندہ رہنے والے بچے کو بھی اپنا رزق حاصل کرتے ہیں، جو جس راستے سے روزی کمانا چاہتا ہے۔ اللہ اسی راستے سے رزق عطا کرتا۔ مسلمان ہیں۔ اس لئے ہمارا عقیدہ راسخ ہونا چاہئے کہ اللہ اہل ایمان کو نیک ذرائع سے پاک رزق عطا فرماتا۔ پھر ایک موقع پر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے ہر دروازے کے نو مسلموں کو ”توکل“ کا مفہوم سمجھاتے ہوئے ”اے رہروانِ اسلام! میری بات غور سے سنو۔ میرے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مہال ابو سعید بن عامرؓ تھے۔ جب انہیں اسلامی بیت المال سے ایک ہزار اشرفیاں ملنے لگیں تو انہوں نے زکوٰۃ انکار کر دیا۔ ”یہ کسی ضرورت مند شخص کو دے دو۔“

جب دوسرے صحابہؓ نے انکار کی وجہ پوچھی تو حضرت ابو سعید عامرؓ نے کہا۔ ”میں نے سرورِ کونینؐ کو مسلم کو فرماتے سنا ہے۔ جب قیامت کے دن سرمایہ داروں کی جماعت آفتاب کی تیز دھوپ میں کڑی حرارت رہی ہوگی، اس مدت سے کہیں پہلے متوکل فقیر جنت میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ جب کوئی دولت مند اس ساتھ جنت میں جانا چاہے گا تو اس سے کہا جائے گا، ابھی ٹھہرو! تمہارا حساب و کتاب باقی ہے۔“ یہ حدیث سنانے کے بعد حضرت ابو سعید بن عامرؓ نے فرمایا۔ ”اس حقیقت کے پیش نظر اگر مجھے ساری دنیا کی دولت دی جائے تو وہ میرے لئے بیکار ہے۔“

ایک دن ان ہی نو مسلموں کے سامنے اسبابِ دنیا اور وسائل کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”ایک بار مشہور بزرگ حضرت ابراہیم خواصؒ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اس سفر میں ایک شگتہ حال لڑکا بھی آپ کا ہم سفر تھا۔

”نو جوان! تم کہاں جا رہے ہو؟“ حضرت ابراہیم خواصؒ نے لڑکے سے پوچھا۔

”مجھے اللہ کے گھر کی زیارت کا بہت شوق ہے۔“ لڑکے نے نہایت پُر اثر لہجے میں کہا۔ ”بس اسی شوق

کے لئے خانہ خدا کی طرف جا رہا ہوں۔“

حضرت ابراہیم خواصؒ نے بڑی حیرت سے اس لڑکے کی طرف دیکھا جو بے سرو سامان نظر آ رہا تھا۔

تمہارے پاس سفر کا کوئی ساز و سامان نہیں ہے۔“ حضرت ابراہیم خواصؒ نے نو جوان سے فرمایا۔ ”تم کوئی

راہ کے بغیر بیت اللہ شریف کس طرح پہنچو گے؟“

”بے شک! میں تمہاری دست و تہی دامن ہوں، مگر مجھے اپنے اللہ کی کار سازی پر یقین ہے۔“ یہ کہنے کے

چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا۔ ”وہی میرا دستگیر ہے۔ وہ مجھے منزل مقصود پر ضرور پہنچائے گا۔“

الغرض جب حضرت ابراہیم خواصؒ سواری کے ذریعے مکہ معظمہ پہنچے تو وہ لڑکا پہلے سے وہاں موجود

دیکھتے ہی حضرت ابراہیم خواصؒ نے فرمایا۔ ”بے شک! تو ہی اپنے بندوں کا کفیل ہے اور تو ہی اپنے بندوں کا

ہے۔“ پھر آپ نے اس لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یقیناً تمہاری عمر کم ہے، مگر توکل بہت زیادہ ہے۔“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور موقع پر اللہ کی شانِ رزاقی کے بارے میں فرمایا۔ ”وہ ممکن ہے“

شخص کو اللہ تعالیٰ ہی رزق بہم پہنچاتا ہے۔ یاد رکھو کہ رزق کی چار قسمیں ہیں۔

(1) رزق مضمون..... وہ روزی ہے، جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے کہ زمین کے ہر جاندار کو

ہار کی ذمہ داری ہے۔

(2) رزق مقدور..... وہ روزی ہے، جو لوح محفوظ میں درج کر دی گئی ہے۔

(3) رزق ملوک..... وہ روزی ہے، جو اللہ نے اپنا مال انسان کے پاس بطور امانت رکھ دیا ہے۔

(4) رزق موعود..... وہ روزی ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ ”جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کے احکام کی تعمیل کرتا رہتا ہے تو پھر اس کا رب اسے ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے، جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

چند روزہ قیام اور نو مسلموں کی تربیت کرنے کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ ہر دوار سے رخصت ہونے لگے تو نسل بہنت اور اس کے ساتھیوں نے عرض کیا۔

”اگر حضور کی اجازت ہو تو یہ خدمت گار بھی اس سفر میں شریک رہیں تاکہ شیخ کی صحبتوں کے طفیل ہمارا تزکیہ نفس ہو جائے۔“

”اس سفر میں کسی کو ساتھ رکھنے کا حکم نہیں ہے۔“ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”تمہارے لئے مناسب یہی ہے کہ ہالہ پہاڑ کے قریب جا کر ”انفاس شماری“ کرو اور عبادت کے ساتھ ساتھ مخلوق خدا کو فیض پہنچاؤ۔“ یہ کہہ کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے نو مسلم بہنت کو گلے سے لگایا۔ بس چند لمحوں کی بات تھی۔ ایک طویل عمر تک بتوں کی پوجا کرنے کے سبب بہنت کے دل و دماغ، جسم اور روح میں جو کٹافیتیں پیدا ہو گئی تھیں، ان کی آن میں دور ہو گئیں اور وہ روشن ضمیر ہو گیا۔



ہر دوار کے علاقے سے نکل کر جنگل کے راستے چلتے چلتے حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، کھنؤ (اودھ) کی حدود میں داخل ہوئے۔ شہری آبادی سے ایک میل پہلے ہی حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی حضرت شیخ قوام الدین چشتی نے آپ کا استقبال کیا۔ حضرت شیخ کو حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی آمد کا علم بذریعہ کشف ہو گیا تھا۔ دونوں بزرگ اس قدر اہلانہ انداز میں ملے کہ حاضرین کو گمان ہونے لگا، جیسے حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ قوام الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ آپس میں قریبی رشتے دار ہوں۔ اہل دنیا کو اس حقیقت کا اندازہ نہیں تھا کہ اللہ کی خاطر قائم کئے ہوئے رشتے تمام رشتوں سے زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ پھر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ قوام الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں شریف لے گئے۔

خانقاہ میں پہنچتے ہی پیر و مرشد حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کا ذکر مبارک چھڑ گیا۔ ماضی کی ایک ایک یاد تازہ ہو گئی۔ پھر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ قوام الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اس قدر روئے کہ دونوں بزرگوں کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

قیام کھنؤ کے دوران ایک دن کشمیریوں کا ایک معزز خاندان آپ سے ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ اسی خاندان کے ایک معزز فرد نے بھد نیاز آپ سے عرض کیا۔

”شیخ! ہمیں کوئی نصیحت فرمائیے۔“

جواب میں حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”ہمیشہ یاد رکھنا کہ جس طرح پیشاب وغیرہ کے خارج ہونے سے ظاہری طہارت جاتی رہتی ہے، اسی طرح اللہ کے سوا کسی دوسری مخلوق کو یاد کرنے کی وجہ سے باطنی طہارت ختم ہو جاتی ہے۔“

پھر چند روزہ قیام کے بعد حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ قوام الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا: "مجھے ایک طویل سفر درپیش ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں نیپال کی طرف جانا چاہتا ہوں۔"

حضرت شیخ قوام الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اُداس لہجے میں عرض کیا۔ "شیخ! ابھی تو آنکھیں بھی پائی ہیں۔ کچھ دن تو قیام فرمائیے کہ طالبانِ دید کے جذبات بہت شدید ہیں۔"

"شیخ! تم تو جانتے ہو کہ میرے لئے کیا حکم ہے؟" حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

حضرت شیخ قوام الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ اصرار نہیں کیا۔ آپ جانتے تھے کہ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ منزل کے مسافر ہیں۔

آخر لکھنؤ کی حدود سے نکل کر آپ دریائے گھاگرہ پر پہنچے۔ برسات کا آخری زمانہ تھا، اس لئے طغیانی آئی ہوئی تھی۔ گھاٹ پر لوگوں کا ہجوم تھا اور تمام کشتیاں جا چکی تھیں۔ اتفاق سے ایک کشتی مانگا کے پار جانے والے لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ ملاحوں نے ان لوگوں سے منہ مانگا کرایہ لے کر کشتی بد قسمتی سے مسافروں میں ایک شخص ایسا بھی تھا، جس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ملاحوں نے انہیں مانگا مگر وہ یہی کہتا رہا کہ میں غریب انسان ہوں۔ مجھے خدا کے نام پر دریا کے پار اُتار دو۔ میرے ہاتھ لئے کچھ نہیں ہے۔ ملاحوں نے اس کی ایک نہ سنی اور پھر اسے پکڑ کر دریا میں پھینک دیا۔

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آپ نے کنارے پر اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تم اس بے آسرا شخص کو ڈوبنے سے بچالو۔"

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی بات سنتے ہی وہ اجنبی دریا میں کودا اور ڈوبتے ہوئے شخص کو نکال کر لے آیا۔

"تم نے اس بے کس انسان کی جان بچائی ہے، اللہ اس کے بدلے میں تمہیں آتشِ دوزخ سے بچے گا۔"

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور اس اجنبی تیراک کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ایک ولی کامل کی دعا کی یہ تاثیر تھی کہ اس شخص کی دنیا ہی بدل گئی۔ کچھ دیر پہلے وہ ایک عام انسان تھا، اب اسے قوت کشف حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر دریا پار کر کہنے لگا۔ "حضور! یہ کشتی گرداب میں پھنس کر کنارے پر واپس آئے گی اور پھر غرق ہو جائے گی۔ ان اللہ کے بندوں کا بہت دل دکھایا ہے۔"

"یہ راز تم پر کیسے فاش ہوا؟" حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ نے آپ کے طفیل مجھے جو بینائی بخشی ہے، میں اسی کے ذریعے دریا کو متلاطم ہوتے اور کشتی کو تباہ رہا ہوں۔"

کب کشتی دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی، اس وقت دریا بڑے سکون حالت میں بہہ رہا تھا۔ مگر اب کا ایک ریلا آیا اور کشتی موجود کے تھپیڑے کھاتی ہوئی ساحل سے اٹکی۔ مسافر، ملاحوں کو برا بھلا کہنے سے اتر آئے۔ پھر جب آخری مسافر بھی کنارے پر آ گیا تو اچانک ایک خوف ناک موج اٹھی اور اس نے سمیت کشتی کو ڈوب دیا۔

کنارے پر کھڑے ہوئے لوگ حیران و پریشان تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ "دن تو اب اس دیرانے میں رات کیسے بسر ہوگی؟"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اس غریب شخص کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا جسے دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔ ”اپنے پانیچے اونچے کر لو اور دریا کے پار اتر جاؤ۔“

”اس نے حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت پر عمل کیا اور آپ کا ہاتھ پکڑے دریا میں اتر گیا۔ خدا کی قدرت کہ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے قدم رکھتے ہی دریا پایاب ہو گیا۔ بس اس میں اس قدر پانی رہ گیا کہ حضرت شیخؒ کے ٹٹے ٹیک رہے تھے۔ آپ کو دریا کے پار جاتے دیکھ کر کنارے پر کھڑے ہوئے ہندو چیخنے لگے۔

”حضور! ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلے۔“

”میرے اس غریب بھائی کے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔“ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

الغرض تمام لوگوں نے بحفاظت دریا پار کر لیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے مغرب کی نماز ادا کی، پھر جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو ان لوگوں میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا، جو اپنی آنکھوں سے دریا کو پایاب ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ کچھ دن حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اس علاقے میں قیام فرمایا اور نو مسلموں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات کا سبق دیا۔ پھر ان لوگوں کو اس شخص کے حوالے کر دیا جو آپ کی دعاؤں سے روشن ضمیری کے درجے تک پہنچا تھا۔ اس کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ بہرائچ تشریف لے گئے اور سید مسعود مالدار غازیؒ کے حمار پر بھی حاضر ہوئے۔

قیام بہرائچ کے دوران حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ دن بھر مقامی مسلمانوں سے ملاقات کرتے اور رات کو حضرت سید مسو مالدار غازیؒ کے حمار مبارک پر حاضری دیتے۔

بہرائچ سے رخصت ہونے کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ بندیل کھنڈ تشریف لے گئے۔ یہاں پر پران ناتھ نام کا ایک جوگی رہتا تھا، جو شعبہ بازی کے فن میں ماہر تھا۔ جب حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ اس علاقے میں پہنچے تو مقامی مسلمانوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی۔

”حضور! ہمیں پران ناتھ جوگی کے فتنے سے بچائیے۔ وہ نئے نئے کرتب دکھا کر سادہ لوح لوگوں کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کی شرانگیزیوں کو نہ روکا گیا تو بہت سے نو مسلموں کے بہک جانے کا اندیشہ ہے۔“

بندیل کھنڈ کے مسلمانوں کی گریہ و زاری سن کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے سکوت اختیار کیا اور پھر نہایت بڑبڑالے لہجے میں فرمایا۔ ”تم لوگ پورے اطمینان کے ساتھ اپنے گھروں کو جاؤ۔ انشاء اللہ! آج کے بعد پران ناتھ جوگی، اہل ایمان کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔“

اس کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ بندیل کھنڈ کے چند مسلمانوں کو اپنے ہمراہ لے کر پران ناتھ جوگی کے مکں پہنچے۔ اس وقت وہ شعبہ باز اپنی کافرانہ ریاضتوں میں مشغول تھا۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے با آواز بلند اسے پکارا۔

”پران ناتھ! باہر آ۔ میں تیرے ساحرانہ کمالات دیکھنے کے لئے بہت دُور سے آیا ہوں۔“

بندیل کھنڈ کے کسی باشندے میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ پران ناتھ جوگی کی تپسیا میں خلل ڈالے۔ مگر جب آج یہ روایت ٹوٹی تو پران ناتھ جوگی غصے سے پاگل ہو گیا اور چیختا ہوا اپنی کنیسا سے باہر نکل آیا۔

”یہ کون گستاخ ہے، جس نے میری پوجا بھنگ کر دی ہے؟“

پران ناتھ جوگی کا ہڈیان سن کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ گستاخ میں

ہوں اور تیری طرف سے اپنی گستاخی کی سزا پانے کا منتظر ہوں۔“

پران ناتھ جوگی نے قہر آلود نظروں سے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھا، مگر فرمایا: "دونوں ہاتھ رکھ کر چیخنے لگا۔ "ہائے میری آنکھیں!" حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے چہرہ مبارک پر نظر نہ کرنا تھا کہ یمنائی زائل ہو چکی تھی۔

"کیا اپنی اسی طاقت پر اہل ایمان کو بہکانے چلا تھا؟" حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔
 "میں تمہاری شکستی پر ایمان لایا۔ تم یقیناً مجھ سے بڑے جوگی ہو۔" پران ناتھ نے زمین پر سر رکھ دیا۔
 "دنیا میں صرف خدائے واحد کی طاقت ہے۔ اس کے سوا کسی طاقت کا کوئی وجود نہیں۔" حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "میں تمہارے اسی ان دیکھے خدا پر ایمان لایا۔" جیسے ہی پران ناتھ جوگی نے اپنی زبان ادا کئے، اس کی آنکھوں کی روشنی بحال ہو گئی۔

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے جوگی کو کلمہ طیبہ کی تلقین کی۔ پران ناتھ نے اللہ کی وحدانیت اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر گواہی دی۔ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بھائی کہہ کر اپنے گلے لگے۔ خدا سے بے غلغلیہ ہوتے ہی پران ناتھ جوگی کے قلب سیاہ میں روشنی کے نئے دروازے کھل گئے۔
 اپنے روحانی پیشوا کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر بندیل کھنڈ کے ہزاروں مسلمان، حضرت سید رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر ایمان لے آئے۔ پھر کچھ دن تک آپ نے نو مسلموں کی جماعت کو اسلامی فہم و شناس کرایا اور اس کے بعد اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔

پران ناتھ جوگی کو دولتِ ایمان سے سرفراز کر کے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ گنڈوانہ پہنچے۔ یہاں تک کہ تبلیغِ اسلام کی۔ اللہ نے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کو خُسنِ صورت و سیرت کے ساتھ خُسنِ کلام بھی عطا کیا۔ تقریریں نہایت سادہ مگر دلکش ہوتی تھیں۔ آپ کی ہر بات دلوں میں اتر جاتی تھی۔ نتیجتاً گنڈوانہ بہت پرست خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔ گنڈوانہ سے رخصت ہو کر حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ لائے۔ یہاں بھی آپ کے فیضِ صحبت سے سینکڑوں ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے۔ پھر آپ نے مختلف جگہں کرتے ہوئے دیوگیر (دولت آباد دکن) کا رخ کیا۔ یہ وہی تاریخی مقام ہے، جہاں حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ والد محترم حضرت سید یوسف حسینؒ نے انتقال فرمایا تھا۔

جب حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ والد محترم کے مزارِ مبارک پر پہنچے تو بے اختیار ہو گئے۔ پھر قبر پر روئے کہ آپ کے آنسوؤں سے قبر کا غلاف بھیگ گیا۔ بڑا جذباتی منظر تھا۔ حاضرین کی آنکھیں بھی لگیں۔ پھر لوگوں نے سنا، حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نہایت رقت آمیز لہجے میں دعا فرما رہے تھے۔
 "یا غفور الرحیم! آپ بھی میرے والد پر اسی طرح کرم فرمائیے جس طرح انہوں نے بچپن میں غنہ کے ساتھ میری پرورش کی تھی۔"

(واضح رہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کو ماں باپ کے حق میں ان ہی الفاظ کے ساتھ حکم دیا ہے)

پھر جب امرائے دکن کو حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی آمد کی خبر ملی تو فرمانروائے دکن، سلطان فیروز نے دیوگیر (دولت آباد) کے حاکم نواب عضد الدولہ کو حکم دیا کہ وہ حضرت گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کرے۔ حاکم دولت آباد جھکے ہوئے سر کے ساتھ آپ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔
 "سیدی! سلطان فیروز شاہ بہمنی نے حضور کو سلام پیش کیا ہے اور حقیر سی نذر بھی گزاری ہے۔ اُلو"

نذرانہ کی قیامی سلطنت دکن کے لئے بڑا اعزاز و شرف ہوگا۔“
حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظر سلطان فیروز شاہ بہمنی کے ان خدمت گاروں کی طرف دیکھا، جو اپنے
ہمالہ، ہیم دراز سے بھرے ہوئے خوان اٹھائے کھڑے تھے۔

”میری طرف سے سلطان کی اس محبت کا شکریہ ادا کرنا۔ مگر درویش ان چیزوں کی کوئی طلب نہیں رکھتا۔“
حاکم دولت آباد نواب عضد الدولہ نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک مردِ حق کی بے نیازی کا یہ عالم دیکھا تھا۔
حضرت سید گیسو دراز کے جلالِ روحانی سے اُس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ”حضور! مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟“
سلطانِ عظم کا حکم ہے کہ میں اس سامانِ نذر و نیاز کو واپس لے کر نہ آؤں۔“
”تمہارے سلطان کا یہ عجیب حکم ہے۔“ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”جس شخص کو یہ نذر پیش کی جا
 رہی ہے اگر وہ اسے قبول ہی نہیں کرتا تو پھر حکم کا نفاذ کس طرح ہوگا؟“
”سرکار! میں یہی تو چاہتا ہوں کہ سلطان کے حضور میں اس خادم کی عزت رہ جائے۔“ نواب عضد الدولہ نے
ہت بڑھ کر عرض کیا۔

”ہاں اس نذر کے قبول کرنے کے بعد درویش کی درویشی ختم ہو جائے۔“ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے
اپنے مخصوص کیم کے ساتھ فرمایا۔ ”سلطان کی مملکت میں آنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ فقیر کی آزادی ہی سلب کر لی
جائے۔“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد گرامی سن کر نواب عضد الدولہ گھبرا گیا۔ ”سرکار! سلطان کا یہ حکم تو اس غلام
کے لئے ہے۔ فرمانروائے دکن نے آپ سے تو عاجزانہ درخواست کی ہے۔ آپ مردِ آزاد ہیں اور آزاد ہی رہیں
گے۔“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان فیروز شاہ بہمنی کے تمام تحائف اور زینتِ اسی وقت ضرورت مندوں میں
تقسیم کرا دیئے۔ پھر نواب عضد الدولہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”سلطان سے کہنا کہ میں نے ان کی نذر قبول کر لی۔ اس کے ساتھ ہی میری درخواست ہے کہ وہ آئندہ مجھے
نگ نہ کریں۔ ایک درویش کی پذیرائی اور تواضع یہی ہے کہ فرمانروائے دکن اسے تنہا چھوڑ دیں۔“

حاکم دولت آباد نواب عضد الدولہ نے حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور خوشی خوشی واپس
چلا گیا۔

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کچھ عرصے تک دیوگیر (دولت آباد) میں مقیم رہے۔ اس دوران آپ روزانہ اپنے
والد ماجد حضرت سید یوسف حبیبی کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوتے اور ایصالِ ثواب کرتے۔
دولت آباد کے قیام کے دوران حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسِ درس پابندیِ وقت کے ساتھ آراستہ ہوتی اور
آپ تامل کے ذریعے تصوف کے اسرار و رموز بیان فرماتے۔



ایک دن حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔
”ایک بزرگ کی شدید خواہش تھی کہ انہیں کسی ولی اللہ کی قربت حاصل ہو اور وہ اس مردِ حق کی روحانیت سے
نفسِ یاب ہوں۔ پھر جب بہت تلاش و جستجو کے بعد کسی ولی سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی تو انہوں نے استخارہ کیا اور
پر دعا کر کے سو گئے۔“

”اے اللہ! اپنے اس عاجز بندے پر کرم کر اور اپنے ولی کی صحبت سے شرف یاب فرما۔“
خواب میں ان بزرگ نے صدائے غیب سنی۔ ”فجر کی نماز میں جو شخص تمہارے دائیں جانب نماز پڑھو، وہی ہمارا ولی ہے۔“

بزرگ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس تصور سے نہایت مسرور و مطمئن تھے کہ آج انہیں ایک ولی اللہ کا دیدار نصیب گا۔ الغرض وہ بزرگ نماز فجر ادا کرنے کے لئے مسجد میں حاضر ہوئے۔ امام نے نماز کی نیت باندھی، بزرگ نے اپنے دائیں جانب دیکھا۔ وہاں کوئی نمازی موجود نہیں تھا۔ بزرگ نے اپنے خواب کو ایک واہمہ سمجھا اور نیت لی۔ چند لمحوں بعد ہی ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور اس صف میں کھڑا ہو گیا، جہاں وہ بزرگ مصروف نماز تھے۔ پھر جب امام نے سلام پھیرا اور ان بزرگ نے اپنے دائیں جانب دیکھا تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ ایک شخص موجود تھا، وہ ان ہی کے محلے کا رہنے والا ایک نوجوان تھا۔ وہ نوجوان پیشے کے اعتبار سے کپڑے رنگ کرتا تھا اور ایک بوڑھے رنگ ریز کا شاگرد تھا۔ بزرگ نے دل ہی دل میں کہا۔

”یہ عام سانچو جو مذہب کا برائے نام بھی علم نہیں رکھتا، ولی اللہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“
بزرگ نے اپنے خواب کو ایک خیال پریشان سے تعبیر کرتے ہوئے، دوسری رات استخارہ کیا۔ دوسری رات بھی جواب آیا۔ ”نماز فجر میں جو شخص تمہیں اپنی دائیں طرف نظر آئے، وہی ہمارا ولی ہے۔“
دوسرے دن بھی جب ان بزرگ نے سلام پھیرا تو وہی نوجوان نظر آیا۔ بزرگ نے ایک بار پھر اپنے نوجوان واہمہ قرار دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ رنگ ریز نوجوان کس طرح اللہ کا ولی ہو سکتا ہے؟ اس میں تو ولایت کی کوئی علامت بھی نظر نہیں آتی۔“

الغرض بزرگ نے تیسری رات استخارہ کیا۔ اس بار بھی وہی صدائے غیب سنائی دی۔ ”نماز فجر میں تمہارے دائیں جانب موجود ہو، وہی ہمارا ولی ہے۔ اسے پہچاننے کی کوشش کرو۔“
تیسرے دن بھی ان بزرگ نے اسی رنگ ریز نوجوان کو دیکھا اور خود کلامی کے انداز میں کہنے لگے۔ ”فریب سماعت ہے۔ اللہ کا ولی ایسا نہیں ہو سکتا۔“

اس کے بعد ان بزرگ نے استخارہ کرنا چھوڑ دیا اور ولی اللہ کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ بڑے شہداء اور اولیاء کے مزارات پر حاضری دی، مگر ان کی دلی مراد پوری نہ ہو سکی۔ آخر ایک دن سڑک کے کنارے کا شدید طوفان آیا۔ پھر جب خوف ناک آندھی کے جھونکے رکے اور گرد و غبار چھٹا تو ان بزرگ نے اپنے آپ کو ایک ایسے ویرانے میں پایا، جہاں انسانی زندگی کے آثار نہیں تھے۔ دو پہر کا وقت ہو چکا تھا۔ بزرگ نے دل میں کہا۔

”کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہاں کوئی مسجد مل جاتی تاکہ میں نماز ادا کر لیتا۔“

ابھی بزرگ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک درختوں کے جھنڈ سے اذان کی آواز سنائی دی۔ بزرگ بہت ہی ہوشیار ہوئے اور دوڑتے ہوئے جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ پھر چند لمحوں تک ان پر شدید حیرت و سکوت کا عالم طاری ہوا۔ بزرگ نے دیکھا کہ درختوں کے درمیان ایک نہایت شاندار پختہ مسجد موجود ہے۔ پھر جب وہ بزرگ مسجد میں داخل ہوئے تو ان کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مسجد کا فرش قیمتی پتھروں سے بنا ہوا تھا اور صحن میں خوبصورت قالین لگے آ رہے تھے۔ مگر کوئی نمازی موجود نہیں تھا۔ بزرگ نے جلدی جلدی وضو کیا اور ظہر کی چار رکعت سنت پڑھنے کھڑے ہو گئے۔

بموجب بزرگ نے سلام پھیرا تو مسجد میں دوسو کے قریب نمازی موجود تھے۔ بزرگ ایک بار پھر حیرت میں جا ہو گئے۔ ”اس دیرانے میں یہ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟“

مسجد میں موجود تمام افراد کے چہروں سے ایک عجیب نور جھلک رہا تھا۔ ان میں اکثر لوگ درویشانہ لباس میں لباس تھے۔ بعض حضرات اپنے ظاہری حلیے سے عالم نظر آ رہے تھے۔ ان کے سروں پر عمامے تھے اور وہ ائمہ جیسی عائلوں کی زینت بن گئے ہوئے تھے۔ ان اجنبی درویشوں اور عالموں کو دیکھ کر بزرگ نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

”یہ سب اللہ کے ولی ہیں۔ اب میری طویل جستجو بار آور ثابت ہو گی اور میں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لوں گا۔“

ابھی بزرگ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ مسجد میں موجود تمام بزرگ اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے اور مسجد کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ بزرگ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مسجد کے اندر داخل ہونے والا وہی رنگریز نوجوان تھا۔ تمام بزرگوں نے نہایت احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوجوان سے مصافحہ کیا۔

”نماز تیار ہے۔ بس آپ ہی کا انتظار تھا۔“ ایک عالم نے آگے بڑھ کر نوجوان سے کہا۔

”مجھے درویش نہیں ہونی؟“ رنگریز نوجوان نے پوچھا۔

”نہیں..... بالکل نہیں۔“

”تو پھر آئے! اپنے اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں۔“ یہ کہہ کر نوجوان آگے بڑھا اور اس نے اپنی بغل میں دبا ہوا منسلک کال کر فرش پر بچھا دیا۔

بمجرع نماز سے فراغت پا کر رنگریز نوجوان واپس جانے لگا تو بزرگ نے اُس کا دامن پکڑ لیا۔ ”مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ نشاندہی کے باوجود میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔“ بزرگ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ”حق تعالیٰ کا لاکھ احسان ہے کہ اس نے تلافی کا موقع عطا فرما دیا۔ اب میں آپ کو اس طرح واپس جانے نہیں دوں گا۔“

مسجد میں موجود دوسرے بزرگ بھی اس منظر کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”میرا دام چھوڑیے اور پہلے آپ دس سنتیں ادا کیجئے۔“ رنگریز نوجوان نے کسی تلخی کا اظہار کئے بغیر مسکراتے ہوئے کہا۔

بزرگ نماز میں مصروف ہو گئے۔ رنگریز نوجوان نے دوسرے بزرگوں سے کہا۔ ”براہ کرم آپ بھی کچھ دیر ٹھہر جائیے۔“

بموجب وہ بزرگ دس سنتیں ادا کر چکے تو رنگریز نوجوان نے کہا۔ ”ان قابل احترام ہستیوں سے بھی ملاقات کر لیجئے۔“

تمام علماء اور درویشوں نے ان بزرگ سے مصافحہ کیا اور دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

بموجب درویشوں کی جماعت چلی گئی تو رنگریز لڑکے نے بزرگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ لوگ جو ابھی یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں، عام انسان نہیں تھے۔ ان بزرگ ہستیوں میں کوئی ابدال تھا اور کوئی لقب۔ اللہ کا شکر ادا کیجئے کہ آپ نے ایسے ایسے جاننا سا لکوں سے ملاقات کی۔“

اللہ کے ولی کی تلاش میں سرگرداں رہنے والے بزرگ کو بڑی ندامت ہوئی۔ ”مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ مجھے معاف فرمادیجئے۔“

”غلطی نہیں، آپ نے مجھ سے بدگمانی کی ہے۔“ رنگ ریز لڑکے نے نہایت شائستہ لہجے میں کہا۔
مجھے حقیر جانا کہ میں ایک رنگ ریز کا شاگرد ہوں۔ کیا ولی کی پہچان یہ ہے کہ وہ کوئی اعلیٰ پیشہ اختیار کرے؟
کے دوست کو کہاں ڈھونڈ رہے تھے؟“
نوجوان کی گفتگو سن کر بزرگ کا سر نہامت سے جھک گیا۔ ان کے دل کی ایک ایک بات، رنگ ریز
روشن تھی۔

نوجوان کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے بزرگ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

خاکسار ان جہاں را بہ حقارت مگر

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

(خاکسار لوگوں کو حقارت کی آنکھ سے نہ دیکھ۔ تجھے کیا معلوم کہ اس گرد و غبار کے اندر کیا شہسوار چھپا ہوا ہے؟)
بزرگ نوجوان بڑے عاجزانہ انداز میں معافی مانگنے لگے۔

”جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے بدظن ہوتا ہے تو وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔“ نوجوان نے
پرسوز لہجے میں کہا۔ ”میں نے آپ کو معاف کیا۔“

”جب آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے تو ہمیشہ کے لئے اپنے حلقہ غلامی میں شامل کر لیجئے۔“ بزرگ نے
سے آنسو جاری تھے۔

”کیا آپ کو اس بات پر یقین آ گیا ہے کہ میں اللہ کا ولی ہوں؟“ رنگ ریز لڑکے نے بزرگ سے کہا۔
”ہاں! مجھے یقین ہے کہ آپ اللہ کے دوست ہیں۔“ بزرگ کے لہجے سے انتہائی عقیدت کا اظہار ہوا۔
”فی الحال تو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“ نوجوان نے کہا۔ ”دوبارہ ملاقات ہوگی تو پھر فرماؤ
کہ میں کون ہوں؟“

”آپ کب واپس آئیں گے؟“ بزرگ نے پوچھا۔

”یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

”پھر آپ سے کہاں ملاقات ہوگی؟“ بزرگ نے دوسرا سوال کیا۔

”اسی شہر میں، جہاں ہم دونوں رہتے ہیں۔“ نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں تو اللہ کے دوست کی تلاش میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔“ بزرگ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
”طوفان نے خدا جانے مجھے کہاں پہنچا دیا ہے۔ میں تو اپنے شہر کا راستہ بھی نہیں جانتا۔“

”جس خدا نے آپ کو یہاں تک پہنچایا ہے، وہی آپ کو آپ کے گھر تک پہنچا دے گا۔“ نوجوان نے کہا۔
عالم جذب میں بول رہا تھا۔ ”جب انسان اس کی دیکھیری پر یقین کر لیتا ہے تو پھر فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور
آسان ہو جاتی ہیں۔“

یہ کہہ کر نوجوان نے اپنے پیرہن کی جیب سے ایک رومال نکالا اور بزرگ کی آنکھوں پر باندھ دیا۔
دور تک اسی حالت میں جائیں گے۔ پھر آپ کو اختیار ہے کہ اپنی آنکھوں سے رومال کھول دیں۔“ نوجوان نے
ہدایت کی۔

بزرگ نے رنگ ریز لڑکے سے مصافحہ کیا اور نہایت عاجزانہ لہجے میں کہنے لگے۔ ”مجھے فراموش نہ کیجئے
”اللہ آپ کی رہنمائی فرمائے اور آپ کو بہ حفاظت آپ کے گھر تک پہنچا دے۔“ نوجوان نے کہا۔

بزرگ بہت احتیاط سے چلتے ہوئے مسجد سے باہر نکلے۔ پھر انہوں نے گھبرا کر اپنی آنکھوں پر بندھا ہوا رومال کھول دیا۔ بزرگ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ نہ وہ صحرا تھا، نہ وہ ٹانڈا مسجد اور نہ وہ صاحبِ کرامت نوجوان۔ بزرگ پر کچھ دیر تک ہیبت طاری رہی۔ پھر جب ان کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو وہ شدید اضطراب کے عالم میں دوڑتے ہوئے رنگ ریز لڑکے کے مکان پر پہنچے۔ وہاں بیکرول انسانوں کا جھوم تھا اور سب کے سب رو رہے تھے۔

”یہ بھیڑ کیوں جمع ہے؟“ بزرگ نے گھبرا کر اپنے قریب کھڑے ہوئے کچھ لوگوں سے پوچھا۔ ”آپ حضرات دیکھ رہے ہیں؟ کیا خدا خواستہ کوئی الم ناک واقعہ پیش آ گیا ہے؟“

”الم ناک واقعہ؟“ یہ کہتے کہتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ”ہم پر تو قیامت گزر گئی۔ اللہ کا دوست ہم سے جدا ہو گیا۔“

”کون اللہ کا دوست؟“ بزرگ پر بھی سراپسیلگی طاری ہو گئی۔

”جسے دنیا والے پہچانتے نہیں تھے۔“ شدتِ غم کے سبب لوگوں کی آوازیں ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

”در اصل اس مکان میں رہنے والا رنگ ریز نوجوان پوشیدہ ولی تھا۔ ابھی ابھی باہر سے آیا تھا اور نماز پڑھ رہا تھا کہ بدے کی حالت میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔“

یہ اندھناک خبر سن کر بزرگ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ وقت کے پیھیڑے کھاتے، موجدوں کے تم سے سہل مراد تک پہنچے مگر پھر بھی پیا سے رہ گئے۔ بار بار ان کی سماعت میں نوجوان کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

”جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے بدظن ہوتا ہے تو وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔“

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ رونے لگے۔ پھر آپ نے برسرِ مجلس نہایت رقت آمیز لہجے میں یہ اشارہ پڑھے۔

مناسب یہ ہے کہ گفتگو نہ ہو بلکہ نظر اور نظر بازی ہو
اور کوئی دوسرا پس دیوار سنتا نہ ہو
میں اس مالکِ زمین و زماں معشوق کو چاہتا ہوں
بس خلوت میں وہ ہو اور میں ہوں، کوئی دوسرا نہ ہو
(ترجمہ)



دولت آباد (دکن) میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ دوبارہ دہلی تشریف لے آئے۔ آپ کی واپسی سے اہل دل کی مجلسوں میں جشن کا سماں پیدا ہو گیا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کو حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی آمد کی خبر ملی تو اس نے اپنے ایک مصاحبِ خاص کو یہ پیغام دے کر آپ کی خدمتِ عالیہ میں بھیجا۔

”خواجه محترم! دہلی کے بادشاہوں سے آپ کے دادا اور والد ماجد کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں، تمام بزرگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور ان حضرات نے خوش حالی کے ساتھ نیک نامی کی زندگی بسر کی۔ میری خدمت میں آئے ہو۔ براہِ کرم اپنے فرائض کو فراموش نہ کیجئے۔“

خواجه نے کہ آپ کا نام بھی امراءِ شاہی کی فہرست میں شامل ہو جائے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو ایسا کوئی

کام تفویض نہیں کیا جائے گا، جو آپ کے موجودہ اوقات و مشاغل میں خلل انداز ہو۔“
حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان فیروز شاہ تغلق کے مصاحب خاص کی گفتگو بہت غور سے سنی۔ پھر فقہ سکوت کے بعد فرمایا۔ ”میری طرف سے سلطان کی یاد فرمائی کا شکریہ ادا کرنا اور کہنا کہ یہ درویش مال و دولت کو آگ اور اڑدھا سمجھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس دن سے میں نے حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کی غلامی کی ہے، اس روز سے کوئی عہدہ اور کوئی منصب اس فقیر کی نظر میں نہیں سماتا۔ پھر بھی میں تمام مسلمانوں کا کلام اور ان کے حق میں دن رات دعائے خیر کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی میرا مالک و مددگار ہے۔ وہ مجھے اس زیادہ دعائے خیر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

جب مصاحب خاص نے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سلطان فیروز شاہ تغلق کے گوش گزار فرما کر دوائے ہندوستان نے بے اختیار کہا۔

”واللہ! سید محمد ایسے ہی ہیں۔ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں۔“



دہلی کے علماء میں مولانا حسین نامی ایک بزرگ تھے، جو حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ان کا ایک داماد بظاہر راسخ العقیدہ مسلمان تھا، لیکن ہر محفل، ہر مجلس میں بزرگان دین کے خلاف بدعتیہ کی کاغذ کرتا رہتا تھا۔ مولانا حسین کو یہ باتیں بہت ناگوار گزرتی تھیں۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو شاید مولانا اس زندگی بھر کلام بھی نہ کرتے، مگر دامادی کے نازک رشتے سے مجبور ہو کر اس نوجوان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے۔

”فرزند! اگر صوفیائے کرام کی شخصیت تمہاری سمجھ میں نہیں آتی تو خاموشی اور گریز اختیار کر لو۔ اللہ کے بندوں پر الزام تراشی کر کے خواستواہ اپنی عاقبت کیوں برباد کرتے ہو؟“

مولانا حسین نے اتمام حجت کے لئے بے شمار مثالیں پیش کیں، مگر صوفیائے کرام کے سلسلے میں بدعتیہ اور ان کے ذہن کے تمام درتچے بند تھے۔ وہ دریشوں کے بارے میں نہایت گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا۔

”میں ان خرقہ پوشوں کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کرتا۔ یہ محض ایک فریب ہے۔ بندگان خدا کو بے وقوف بنانا اور اپنی مندی سجانے کے لئے سراسر ایک نمائش ہے۔ ان مصنوعی بزرگوں کی خانقاہیں مذہبی خدمات انجام دینے کے بجائے اللہ کے دین کو تباہ کر رہی ہیں۔“

مولانا حسین اس بے ادب کی باتیں سنتے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ پھر ایک دن مولانا کا داماد پرخت تنقید کرنے لگا۔ ”آپ بھی ان نقلی فقیروں کی صحبت میں بیٹھ کر گمراہ ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ گیسودراز مریدی اختیار کر لی۔ یہ کیسی احمقانہ روش ہے؟“

اب کی بار مولانا حسین خاموش نہ رہ سکے۔ ان کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ ”فرزند! تم نے میرے ہی مرشد حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا نہیں ہے۔“ مولانا حسین بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے شیخ کا ذکر کرتے تھے۔ ”لوگ خانقاہ کے باہر بڑے عجیب عجیب دعوے کرتے ہیں۔ مگر جب سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے رو برو آتے ہیں ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔“

”پھر مجھے بھی اپنے شیخ کے دربار میں لے چلیے۔“ نوجوان کا لہجہ استہزاء سیہ تھا۔ ”میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ لوگ کس طرح اپنی قوت گفتار سے محروم ہو جاتے ہیں؟“

مولانا حسینؒ کے لئے یہ اچھا موقع تھا۔ نتیجتاً آپ اس سرکش داماد کو حضرت سید محمد گیسو دراز رحمہ اللہ کی خدمت میں لے گئے۔ اس وقت خاندان چشتیہ کے یہ نامور بزرگ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ اکبر ایک تخت پر ٹریف فرماتے۔ سر پر عمامہ تھا اور ہاتھ میں سرخ چڑے کا پنکھا تھا۔ مولانا حسینؒ کے داماد نے حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ کو دیکھا تو دل پر ہیبت سی طاری ہوئی۔ مگر ذہن میں کچی تھی، اس لئے اس مرد جلیل کو آزمانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ”رویش کشف باطن کے بہت دعوے کرتے ہیں۔ اگر گیسو دراز اپنا عمامہ اور پنکھا میرے سپرد کر دیتے ہیں تو بابر کرامت دلی ہیں، ورنہ معرفت کی یہ مجلس بھی ایک فریب ہے۔“

نوجوان کا ذہن مسلسل بھٹکتا رہا اور ایسے ہی کثیف خیالات پرورش پاتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت گیسو دراز رحمہ اللہ کو ظلال آواز نے اس پر آگندہ دماغ انسان کے خیالات کو منتشر کر دیا۔

”مولانا! شہر بغداد میں ایک بازی گر تھا۔“ حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ مولانا حسینؒ کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔ ”وہ بازی گر مجمع کے درمیان ایک گدھے کو کھڑا کر دیتا اور اس کی دونوں آنکھوں پر کپڑا باندھ کر لوگوں کے ہجوم سے کہتا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی کی چیز چرا لے تو میں اسے آسانی کے ساتھ پکڑ سکتا ہوں۔ اس کے بعد مجمع میں سے ایک شخص کسی دوسرے تماشائی کی کوئی چیز چرا لیتا۔ پھر وہ بازی گر گدھے کی ایک آنکھ سے کپڑا ہٹا دیتا اور اس زہت یافتہ جانور سے کہتا کہ فلاں شخص کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے، اسے تلاش کرو۔ گدھا اپنے بازی گر مالک کے حکم پر تمام لوگوں کے جھوم کو سونگھتا پھرتا اور جب چور کے پاس پہنچتا تو اس کے کپڑے اپنے دانتوں سے پکڑ لیتا، پھر اسے کھینچا وہ بازی گر کے پاس لے جاتا۔“ یہ کہہ کر حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔

مجمع پر سکوت طاری تھا اور تمام حاضرین شدید حیرت کے عالم میں گوش بر آواز تھے۔ حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ نے بغداد کے گدھے اور بازی گر کا قصہ بیان کرنے کے بعد مولانا حسینؒ سے مخاطب ہو کر دوبارہ فرمایا۔

”مولانا! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک شخص کوئی کرامت دکھائے تو اس گدھے کے مانند قرار پائے اور اگر ایسا نہ کرے تو بے ہنر کہلائے۔“

جیسے ہی حضرت گیسو دراز رحمہ اللہ کی زبان مبارک سے آخری لفظ ادا ہوا، مولانا حسینؒ نے اپنے داماد پر نظر کی۔ وہ جڑھوں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس کا پورا جسم عرقِ ندامت سے تر تھا۔

اچانک اہل مجلس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ اپنا عمامہ اُتار رہے تھے۔ پھر شیخ نے علامہ اور پنکھا، نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

”صاحب زادے! تمہیں ان چیزوں کی طلب ہے۔ ایک بے کرامت درویش کی طرف سے انہیں بطور تحفہ قبول کر لو۔“

نوجوان پہلے ہی شرمسار تھا۔ جب اس کے دل و دماغ حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ کے سامنے بے نقاب ہو گئے تو پھر اسے ایک اللہ کے ولی کی روحانی قوتوں پر یقین آ گیا۔ یہاں تک کہ اس نے برسر مجلس حضرت گیسو دراز رحمہ اللہ سے رقت آمیز لہجے میں معافی مانگی، اپنے پر آگندہ خیالات سے تائب ہوا اور پھر شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا۔ نہایت پاکیزہ زندگی بسر کی اور ایک دن خود بھی منصب ولایت پر فائز ہو گیا۔ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ ”اگر حضرت گیسو دراز میری خطاؤں کو معاف نہ فرماتے تو میں زندگی بھر کوچہ جہالت میں بھٹکتا رہتا۔“



دہلی میں ایک مذہبی عالم نصیر الدین قاسم تھے۔ ان کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ دہلی کا ایک ایک گوشہ ان کی

شخصیت کا اسیر تھا۔ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے بچے اُن کے زیر تربیت تھے۔ کبھی نصیر الدین ہر پڑھانے کے لئے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ چلے جاتے اور کبھی بچے ان کے مکان پر آ جاتے۔ نصیر الدین قاسم اور حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان ایک خاص ربط پیدا ہو گیا تھا مگر اس قربت مولانا، حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے افکار و عمل میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ مجلسِ سماع منعقد ہوتی تھی اس میں کبھی شرکت نہیں کی۔ انتہا یہ ہے کہ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ میں درس دیتے رہتے اور نصیر اُٹھ کر چلے جاتے۔ جب لوگ ان سے اس طرزِ سلوک کے بارے میں پوچھتے تو صاف کہہ دیتے۔

”میرے اور سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر ساری زندگی بھی ان کی کی تائید کرنے لگے تو میں پھر بھی گیسودراز کے حلقہٴ درس میں نہیں بیٹھ سکتا۔“

سننے والے یہ تمام باتیں حضرت گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے کانوں تک پہنچا دیتے لیکن وہ مردِ قلندر مکر اور ہنر ”ہاں! وہ ایک زبردست عالم ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ ہم نے چند کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں پڑھا۔ پھر ایک عالم ہم جیسے کم علموں کی صحبت میں کس طرح بیٹھ سکتا ہے؟“ اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتے رہے۔ سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے چہرہ مبارک پر کئی دنا گواری کا لٹکا سا عکس بھی نہ ہوتا۔

پھر ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ دہلی میں جو لوگ بھی نصیر الدین قاسم سے واقف تھے، ان کے لئے چونکا دینے والی خبر تھی۔ اپنے تمام تر علم کے باوجود مولانا قاسم، حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ ولایت پر گئے۔ پورے شہر میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ مولانا نصیر الدین قاسم کا جو شاسا بھی ملتا، بڑے طرزِ آمیز لکھنے ہی سوال کرتا۔

”مولانا! آپ تو خود ایک بڑے عالم ہیں، پھر آپ اس شخص کے حلقہٴ ارادت میں کس طرح داخل جس کی تعلیمات کل تک آپ کے لئے قابلِ اعتنا نہیں تھیں۔“

مولانا نصیر الدین قاسم بہت دیر تک خاموش رہتے، آخر جب لوگ زیادہ اصرار کرتے تو بے اختیار کہنے لگے۔ ”میں تم سے اپنی کیفیات کس طرح بیان کروں؟ تم لوگ میری زبان نہیں سمجھ سکتے۔“

پھر ایک دن نصیر الدین قاسم کے استاد کو اپنے شاگرد کے ذہنی انقلاب کی اطلاع ملی تو بہت زیادہ حیران فرمانے لگے۔ ”قاسم! میں نے دورانِ تعلیم ہی تمہیں تنبیہ کر دی تھی کہ تم ان صوفیوں سے کوئی تعلق نہ بنائے۔ بے خبری کے عالم میں سماع کی مجلس آراستہ کرتے ہیں اور مخلوقِ خدا کو بے عمل بناتے ہیں۔ افسوس! ساری محنت برباد کر دی اور نافرمانی جیسے سنگین جرم کے مرتکب ہو گئے۔“

مولانا نصیر الدین قاسم، احترامِ استاد کے پیشِ نظر کچھ دیر ساکت بیٹھے رہے۔ مگر جب استاد نے ان کے لئے مجبور ہی کر دیا تو مولانا ایک خاص عالمِ جذب میں بولنے لگے۔

”بے شک آپ نے مجھے علم کے رموز و نکات سمجھائے، مگر حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے یقین دلایا کہ لے جا کر کھڑا کر دیا۔“ مولانا نصیر الدین قاسم کا لہجہ رقت آمیز تھا اور چہرہ ایک خاص کیفیت کے زیرِ اثر تھا۔ ”آپ نے مجھے عالم بنایا، مگر حضرت سید گیسودراز نے مجھے مسلمان کیا۔“

”تو کیا اب تک تم ایمان نہیں لائے تھے؟“ استاد، شاگرد کا جواب سن کر اچانک غضب ناک ہو گئے۔ ”صرف زبان سے کلمہ پڑھ لیا تھا۔“ مولانا نصیر الدین قاسم نے اسی عالمِ جذب میں فرمایا۔ گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پہنچا تو ایمان، روح کی گہرائیوں تر اُتر گیا اور پھر دل نے بھی اللہ کی کبریٰ

ﷺ کی رسالت کی رسالت کا اقرار کر لیا۔ کوئی کچھ کہے، مگر میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ حضرت سید
ﷺ نے مجھے دولت ایمان بخشی۔ کل تک میں صرف ایک عالم تھا، مگر آج مسلمان ہو گیا ہوں۔ اور یہ سید
ﷺ کا فیض روحانی ہے۔



حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ نے تقریباً چوالیس سال تک دہلی میں قیام فرمایا اور بے شمار بندگانِ خدا کو فیضِ یاب
بہرہِ نبوی کے حملے کے زمانے میں دوبارہ دہلی سے دکن تشریف لے گئے۔ اس مرتبہ آپ نے گلبرگہ کو مستقل
مکانِ کار بنالیا۔

یہاں پہلی بھڑکی کے آغاز کا واقعہ ہے۔ اس وقت فیروز شاہ بہمنی، دکن کا حکمران تھا۔ 815ھ میں فیروز شاہ، شکار کا
پہلے کے گونڈ واہرہ پہنچا اور باغی ہندوؤں کو شکست دے کر اس علاقے کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ تقریباً تین سو ہاتھی پکڑ
کر اپنے تخت کی طرف واپس آیا۔ اسی دوران سلطان فیروز شاہ کو خبر ملی کہ حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ دوبارہ دہلی
لے کر گئے (دکن) تشریف لائے ہیں۔ علم دوست بادشاہ یہ خبر سن کر فوراً ہی فیروز آباد سے گلبرگہ آیا اور تمام عزیز و
اقرب کو حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ کے استقبال کے لئے روانہ کر دیا۔ آخر حضرت شیخ اس طرح شہر میں داخل ہوئے
کہ بڑے اراکینِ سلطنت عقیدت سے سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ خود فیروز شاہ بہمنی بھی حضرت سید
گیسو دراز رحمہ اللہ کے استقبال کرنے والے ہجوم میں بہ نفس نفیس موجود تھا۔ اس نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے
قبضہ کو دیکھا تو قہر سے بے اختیار ہوا لیکن چند ملاقاتوں کے بعد فیروز شاہ کی عقیدت کم
ہونے لگی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ فرمانروائے دکن ظاہری علوم و فنون کا دلدادہ تھا اور حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ
ان چیزوں سے زیادہ شغف نہیں رکھتے تھے۔ نتیجتاً فیروز شاہ، حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ کے حضور کوئی خاص عقیدت
ظاہر نہ کر سکا۔ اس کے برعکس فیروز شاہ کا چھوٹا بھائی احمد خان، حضرت شیخ کا اس قدر معتقد ہو گیا کہ خود کو آپ کا
خام نہ کر پکانے لگا۔

احمد خان نے حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ کے لئے دلکش دیوار و در کی ایک خانقاہ بنوائی اور اکثر اوقات آپ کی
خات میں حاضری دیتا۔ سید گیسو دراز رحمہ اللہ کو سامع کا بے حد شوق تھا۔ احمد خان بھی حضرت شیخ کی خوشنودی حاصل
کرنے کے لئے پابندی سے سامع کی مظلوموں میں شریک ہوتا تھا اور حضرت گیسو دراز رحمہ اللہ کی خانقاہ میں رہنے والے
روشن کو انعامات دیا کرتا تھا۔ اسی پر جوش عقیدت کے سبب حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ بھی برسرِ مجلس احمد خان پر
شفقت فرماتے تھے۔

ایک حالات نے ایک عجیب کروٹ لی۔ 818ھ میں فیروز شاہ بہمنی نے اپنے بیٹے اکبر حسن خان کے سر پر
تاجِ شاهی رکھ دیا اور تمام اراکینِ سلطنت سے اس کے لئے بیعت لی۔ پھر چند معتبر درباریوں کو حضرت سید گیسو دراز
رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیج کر عرضداشت پیش کی کہ حضرت شیخ، اکبر حسن خان کے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔
حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ نے شاهی قاصدوں کی بات کو غور سے سنا اور پھر مختصر سے سکوت کے بعد فرمایا۔
”اے بادشاہ سے کہو کہ جب اکبر حسن خان کے سر پر تاجِ شاهی رکھ دیا گیا تو پھر دنیا میں اسے کس چیز کی ضرورت
ہے؟“ حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ کا جواب سن کر اہل مجلس نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ حضرت شیخ، دکن کے نئے
بادشاہ کے حق میں دعائے خیر سے گریز فرما رہے ہیں۔
شاهی قاصد ناکام و نامراد لوٹ گئے اور فیروز شاہ کو حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ کا جواب منتقل کر دیا۔ فیروز شاہ

خود بھی اہل نظر تھا۔ اس لئے حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے عدم التفات سے فکر میں مبتلا ہو گیا۔ بہت دیر کے عالم میں سوچتا رہا، پھر قاصدوں سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگ دوبارہ حضرت شیخ کی بارگاہ میں رسائی مایل ان سے کہو کہ اکبر کے حق میں اپنی زبان مبارک سے چند دعائیہ کلمات ادا فرمائیں۔ اگر شیخ خاموش رہیں تو تک اصرار کرتے رہنا، جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے۔“

فیروز شاہ کی دوسری درخواست لے کر قاصد ایک بار پھر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے حضور پہنچے اور وہ التجائیں کرنے لگے۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے حسب سابق سکوت اختیار فرمایا۔ قاصد منصوبے کے مطابق کرتے رہے اور جب ان کا اصرار حد سے گزر گیا تو حضرت شیخ نے بر جلال لہجے میں فرمایا۔

”یہ فیروز شاہ کا فیصلہ تھا کہ اس نے اکبر حسن خان کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا۔ مگر قدرت کے لطیف زمین بے خبر ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ معیت الہی نے دکن کی حکمرانی کے لئے احمد خان کا انتخاب کیا ہے۔ خدا کا ہے اور زمین بھی۔ مملکت بھی اسی کی ہے اور تاج و تخت بھی۔ وہ جسے چاہتا ہے، سرفراز کرتا ہے۔ اب بھی اکبر حسن خان کے پرچم تلے جمع ہو جائے تو احمد خان کے اقتدار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ بحکم خدا شاہی اب اگر کوئی خدا سے جنگ کرنا چاہتا ہے تو درویش اُس کی ذہنی روش کو بد لئے سے قاصر ہے۔“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے شاہی قاصدوں کو آخر کار وہ عبارت پڑھ کر سنادی، جو لوح محفوظ پر ایک مرد قلندر کے لہجے کی حرارت سے فیروز شاہ کے نمائندے لرز نے لگے اور پھر گردنیں جھکا کر ہاتھوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔

جب فیروز شاہ نے اپنے قاصدوں کی زبانی حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات سنے تو اسے ٹپٹپٹی۔ بیٹے کی محبت نے اسے جون میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور پھر یہی جنون گستاخانہ تجسس میں تبدیل ہو گیا۔ فیروز شاہ نے قاصدوں کے بجائے چند فوجی سرداروں کو حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا۔ پھر ہندی کا پیغام لے کر پہنچے تھے، دوسرے سفیروں کے ہونٹوں پر حکم شاہی لرزاں تھا۔ فوجی سرداروں نے حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ سے آمرانہ لہجے میں کہا۔ ”شاہ دکن کا حکم ہے کہ آپ ہر کسی اور مقام پر منتقل کر دیں۔“

”آخر کیوں؟“ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت تحمل سے فرمایا۔

”اس لئے کہ خانقاہ، دربار شاہی سے قریب ہے۔ آپ کے مرید شور و غل مچاتے ہیں، جس کے سب کاموں میں خلل پڑتا ہے۔“ فوجی سرداروں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ان کے انداز گفتگو سے طاقت اور جھٹک صاف نمایاں تھی۔

”اس سے پہلے یہی خانقاہ تھی اور یہی مریدوں کی ہاؤ ہو۔ اس وقت شاہ دکن کے امور و سلطنت میں مداخلت تھی۔“ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اتمام حجت کے طور پر فرمایا۔ ”پھر آج کیا ہوا کہ تمہارے فرمانا کی چیزیں بار محسوس ہونے لگیں؟“

”ہمیں تفصیلات کا علم نہیں۔“ شاہی سفیروں کے چہرے سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”حاکم وقت کسی وضاحت کی پابند نہیں ہوتی۔ بس آپ پر یہی لازم ہے کہ کسی تاخیر کے بغیر اس جگہ کو چھوڑ دیں اور ان کی جائیں کہ شاہ دکن کو دوسرے حکم کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔“ آمریت مکمل طور پر بے نقاب ہو چکی تھی۔ ”ٹھیک ہے، ہم تو چلے جائیں گے۔ مگر اس طرح آسانی فیصلوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے مریدوں اور درویشوں نے اپنا سامان لپیٹ لیا۔ قلندروں کا اسباب ہی کیا تھا۔ چند مصلے، چند لباس، چند چادریں اور چند برتن۔ دیکھتے ہی دیکھتے خانقاہ خالی ہو گئی اور حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں خانہ بدوش اولیاء کا مختصر سا قافلہ ایک سمت روانہ ہو گیا۔ پُر مشائی محلات سے بہت دُور حضرت شیخ نے اپنے مریدوں کو ایک کھلے میدان میں قیام کرنے کا حکم دیا۔ فیروز شاہ ہمیشی اپنے حکم کو عملی شکل میں نافذ ہوتے دیکھ کر خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک درویش کو در بدر کر کے اپنی کثافت نفس کے تقاضے پورے کر دیئے تھے اور اب مطمئن انداز میں اکبر حسن خان کی کامیابیوں کے لئے منصوبہ سازی کر رہا تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ ماضی کی ایک شکست کے داغ نے فیروز شاہ کے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ وہ دشمن سے خوف ناک انتقام لینا چاہتا تھا، مگر روز بروز بڑھتی ہوئی ضعفی نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ بے پناہ جسمانی غایت اور نفرتوں کے سرکش جذبے، یہی وہ ہولناک صورت حال تھی، جس نے آخر کار فیروز شاہ کی صحت پر بے اثرات مرتب کئے۔ یہاں تک کہ وہ بہت جلد بسترِ علالت پر دراز ہو گیا۔



اب سلطنت کی زمام کار، شاہِ دکن کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ دلی عہد، اکبر حسن ایک نا تجربہ کار نوجوان تھا، اس لئے بساطِ سیاست کے تمام گوشوں پر نظر نہ رکھ سکا۔ جس کے نتیجے میں فیروز شاہ کے دو غلاموں عین الملک اور بیدار الملک کی فتنہ انگیزیاں رنگ لائیں اور یہ دونوں نمک حرام، سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ اسی دوران کچھ غلاموں نے تنہائی میں فیروز شاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔

”مضور احمد خان مسلسل ناشکر گزاری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اگرچہ وہ آپ کا حقیقی بھائی ہے، لیکن شاہِ دکن کی باری سے فائدہ اٹھا کر تختِ سلطنت پر قابض ہونا چاہتا ہے۔“

غلاموں کی سرگوشیاں سن کر فیروز شاہ ہمیشی کا نحیف و زوار بدن کا پنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ اُبھرنے لگے۔

”تاہن دکن تو احمد خان کا مقدر بن چکا ہے۔“

اب بوڑھے حکمران کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ایک درویش کی پیش گوئی درست ثابت نہ ہو جائے۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے اکبر حسن خان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دُور کرنے کی منصوبہ سازی کرنے لگا۔ فیروز شاہ کے اعصاب پر فرزند کی محبت اس درجہ غالب آ گئی کہ اس نے حقیقی بھائی کی آنکھیں نکالنے کے احکامات صادر کر دیئے۔ خوش قسمتی سے احمد خان کو ایک دن پہلے اس سازش کا پتہ چل گیا۔ نتیجتاً وہ اپنی مختصر سی فوج کو لے کر رات کے اندر سے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا اور پھر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ احمد خان کے ہمراہ اس کا بیٹا علاء الدین بھی تھا۔ احمد خان نے تیزی سے آگے بڑھ کر سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور رونے لگا۔

”میں نے بادشاہت کا دعویٰ کب کیا تھا؟“ احمد خان رقت آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔ ”میں تو اپنے شاہ کے قدموں کا غلام ہوں۔ یہی خانقاہ کا فرش خاک میرا تخت ہے اور یہی ایک گوشہٴ زمیں میری سلطنتِ عظیم ہے۔“

احمد خان بہت دیر تک ہچکیوں کے ساتھ روتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اُس کی پشت پر اپنا دستِ کریم رکھ دیا۔ ”احمد! اُٹھو۔“ سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی پُر جلال آواز گونجی۔ ”آج تم اتنے مضطرب کیوں ہو؟“

جواب میں احمد خان نے سلطان فیروز شاہ بہمنی کی اس سازش کی تفصیلات سنا دیں، جس کے تحت انہوں نے اندھا کر دینے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ خاموشی سے اقتدار کی کشمکش کی داستان سنتے رہے۔ جب احمد خان خانلوں کے آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”جو خود اندھے ہو چکے ہیں، وہ کسی دوسرے کو بینائی سے کیا محروم کریں گے؟ اس فقیر نے تو پہلی بار فیروز شاہ کو لوح محفوظ کی عبارت پڑھ کر سنادی ہے۔ معاذ اللہ! یہ گیسودراز کا فیصلہ نہیں، آسمان کا فیصلہ ہے۔ اب ہے کہ تاج شاہی احمد خان کے سر پر سجایا جائے۔ اب اگر ساری دنیا مل کر اللہ کے فیصلے کو جھٹلانا چاہتی ہے، خیال خام ہے، وحشت ہے، دیوانگی ہے۔ عنقریب وہ لوگ اپنی آنکھوں سے اپنے نظریات کو باطل ہونے میں لیں گے۔“

یہ کہہ کر حضرت گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا عمامہ اتارا۔ خانقاہ کے تمام حاضرین شیخ کے اس طرز عمل کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اچانک سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ مبارک جلال روحانی سے سرخ ہو گیا۔ پھر آپ نے اپنے کندھوں کو مڑے کر دیئے۔ احمد خان قریب ہی دوڑا نو بیٹھا تھا۔ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے عمامے کا ایک ٹکڑا اٹھا کر سر پر باندھتے ہوئے فرمایا۔

”بفضل خدا یہی تیری دستارِ فضیلت ہے اور یہی تیرا تاج شاہی ہے۔ جو کوئی بھی تجھ سے اس امتیاز پر کوشش کرے گا، وہ اپنی آنکھوں سے اپنا حشر دیکھ لے گا۔“

یہ کہتے وقت حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کا لہجہ اس قدر آتشیں ہو گیا تھا کہ اہل مجلس کے جسم اور دروازے بزرگ کی ہیبت سے لرز رہے تھے۔ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے احمد خان کے بیٹے علاء الدین پر نظر ڈالنے کے ایک گوشے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔

”فرزند! ادھر آؤ۔“ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے نوجوان کو پکارا۔ علاء الدین سر جھکائے ہوئے آیا۔ اس کے لئے ایک قدم اٹھانا بھی دشوار تھا۔ بمشکل تمام لڑکھڑاتا ہوا حضرت شیخ کے نزدیک پہنچا اور جلالِ مبارک تاب نہ لاتے ہوئے فرش پر گر گیا۔ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے علاء الدین سے بہت نرم اور محبت آمیز گفتگو کی، تب کہیں جا کر اس کا خوف دور ہوا اور پھر وہ اٹھ کر دست بستہ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا۔ لیکن اب بھی علاء الدین کا چہرہ زرد تھا اور گردن جھکی ہوئی تھی۔ پھر حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے جنبش ہوئی۔ اہل مجلس ساکت تھے۔ حضرت شیخ نے اپنے عمامے کا دوسرا ٹکڑا علاء الدین کے سر پر باندھ دیا۔ فرمایا۔ ”تمہاری بھی یہی دستارِ فضیلت ہے اور یہی تخت شاہی ہے۔“

اس رسم کی ادائیگی کے بعد حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے احمد خان اور اس کے بیٹے علاء الدین سے ”اب تم دونوں بے خطر ہو کر میدان میں نکل جاؤ۔ جب بھی کوئی غیبی اشارہ ہو، اس کے مطابق عمل کرو۔ رحمت تم پر سایہ فگن رہے کہ تمہارے دشمن شکست سے دوچار ہو جائیں اور تم عزت و آبرو کے ساتھ واپس حاصل کر لو۔“

اس کے بعد حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں باپ بیٹے کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ احمد خان نے حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور اپنے چند حامیوں کو لے کر تم سے نکل گیا۔ راستے میں حسن بھری نام کا ایک سوداگر ملا، جو احمد خان کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس نے جب

کے عزائم کا اندازہ کر لیا تو اس طرح پیش آیا، جیسے کوئی طاقت ور بادشاہ کا استقبال کرتا ہے۔ احمد خان، حسن بصری کے اس طرزِ سلوک سے بہت متاثر ہوا۔ پھر بہت جذباتی انداز میں بولا۔

”حسن! میرا آزمائشی وقت ہے۔ میں ایسے نازک لمحات میں تمہاری محبت کا شکر گزار ہو، مگر پھر بھی تمہیں میرا یہ منورہ ہے کہ کسی محفوظ مقام پر روپوش ہو جاؤ۔ ورنہ تم بھی میری وجہ سے سلطان فیروز شاہ کے قہر و عتاب کا نشانہ بن جاؤ گے۔“

حسن بصری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”سرکار! جب آرام و آسائش میں آپ کے زیر سایہ رہا تو مصیبت کے دہشت کیسے ساتھ چھوڑ دوں؟ میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی۔ اب میرا سر دوش پر قائم رہے یا کٹ کر خاک و خون میں ل جائے، میں آپ سے علیحدہ نہیں رہ سکتا۔“

یہ کہہ کر حسن بصری بھی احمد خان کے مختصر سے لشکر میں شامل ہو گیا۔ پھر یہ قافلہ خان پور میں جا کر ٹھہر گیا۔ وہاں احمد خان نے بڑے رقت آمیز لہجے میں دعا کی۔

”اے مالکِ ارض و سما! اگر تُو نے مجھے خاک و دکن پر اقتدار عطا کر دیا تو تیرا یہ عاجز بندہ احمد خان، اس علاقے کو رمل آباد کے نام سے موسوم کر دے گا۔ اور اس کی آمدنی مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، نجف اشرف اور کربلا کے سیدوں کے لئے وقف ہوگی۔“

احمد خان، بارگاہِ ذوالجلال میں گداگروں کے مانند اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھا اور ادھر اس کے فرار کی خبر تک نہیں ملنے لگی اور بیدار الملک کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ فوراً ہی سلطان فیروز شاہ بھمنی کو خبر دی گئی۔ بوڑھے حکمران نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے بیٹے اکبر حسن خان کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا، مگر وہ مقدرات کو نہ بدل سکا۔ پھر ایک طویل فوجی زبانی کے بعد احمد خان کو فتح حاصل ہوئی۔ حضرت سید گیسو راز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عقیدت مند اپنا پرچم بلند کئے ہوئے قلعے میں داخل ہوا اور سیدھا فیروز شاہ کے کمرے میں پہنچا۔ مفتوح حکمران بسترِ علالت پر رنج و الم کی تصویر بنا ہوا لیٹا تھا۔ احمد خان نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر بڑے بھائی کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ سلطان فیروز شاہ بھی احمد خان کی اعلیٰ ظرفی دیکھ کر رونے لگا۔

انجام کار 825ھ میں احمد خان، احمد شاہ بھمنی کے نام سے تختِ دکن پر جلوہ افروز ہوا۔ بارہ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد 838ھ میں احمد شاہ دنیا سے رخصت ہوا۔ احمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین تخت نشین ہوا۔ تقریباً چوبیس سال تک ایک مطلق العنان شہنشاہ کی طرح حکومت کر کے سلطان علاء الدین نے 862ھ میں انتقال کیا۔

موت ایک اہل حقیقت ہے۔ احمد خان کو بھی ابدی نیند آ گئی اور علاء الدین بھی تہہ خاک دفن ہو گیا۔ مگر خدا نے ان دونوں کو اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھایا، جب تک حضرت سید گیسو راز رحمۃ اللہ علیہ کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت نہ ہوگئی۔ یہ کوئی دیو مالائی قصہ نہیں کہ کسی جوگی کے عقیدت مند اسے خیالی طور پر ہوا میں پرواز کرتے دیکھ کر مطمئن ہو جائیں۔ یہ ایک مردِ مومن کی بصیرت کا وہ یادگار واقعہ ہے، جو تاریخِ ہند کے سینے پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گیا ہے۔ اس واقعے کا رادوی کوئی افسانہ نویس نہیں، محمد قاسم فرشتہ جیسا عظیم مؤرخ ہے، جس کی روایتوں کو چشمِ تحقیق میں درجہ اعتبار حاصل ہے۔

اگرچہ حضرت سید گیسو راز رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیرو مرشد حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی طرح کرامت کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن بھرمی آپ کی ذاتِ گرامی سے ایسے بے شمار واقعات منسوب ہیں، جنہیں پڑھ کر عقلِ انسانی دنگ

رہ جاتی ہے۔ یہاں تفصیل کی زیادہ گنجائش نہیں، بس سلطنتِ پہنکی کے دو فرمانرواؤں کی تخت نشینی پرستوں کی عبرت کے لئے کافی ہے۔ اہل سائنس کے برقی آلات زہرہ و مریخ کی کتنی ہی تصاویر زمین پر مگر وہ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی ایک جنبشِ نظر کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس کس میں زماں و مکاں جذب ہو کر رہ گئے تھے۔ اللہ ہی علیم و خبیر ہے کہ وہ معرفت کی کیسی روشنی بھی رہی ہو۔ جگر چاک کر کے حقائق کو تلاش کر لیا تھا۔

آخر سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھ میں وہ روشنی کیوں نہ ہوتی کہ آپ اللہ کے نور سے دیکھتے تھے۔ رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے۔

”مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔“

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ بھی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی فرمانِ مقدس کے مطابق اللہ دیکھتے تھے۔ پھر اسی نور نے آپ کے سامنے صدیوں کو بے حجاب کر دیا تھا۔



ایک دن شاہ رکن احمد خان، حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں خدام کی طرح دست بستہ بیٹھا سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نہایت پُر جوش اور پُر سوز لہجے میں فرما رہے تھے۔

”موجودہ زمانے میں حق پر عمل کرنے کا رواج اٹھ گیا ہے اور لوگوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ بھی گریز کرتے ہیں۔ اسی لئے باطل نے زور پکڑا ہے۔ مزید ستم یہ کہ باطل پرستوں، ریاکاروں، بازوؤں نے شیطانی امور کو حق کہنا شروع کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملکیتیں بدلتی کا شکار ہیں اور دنیاوی امور مسلسل خرابیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر یہ باطل پرست اپنے خود ساختہ خیالات اور عقائد سے توبہ کرنا چاہیں تو ان پر ان کی ”باطل پرستیاں“ واضح ہو جائیں..... اور انہیں بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ان کی اعمال کے سبب نظامِ عالم تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ اس سچ روی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک دن وہ خود اور ان کی حرفِ غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گی۔ کاش! تمام اہل ایمان حق و انصاف کو فروغ دینے کی کوشش تاکہ موجودہ معاملات دنیا مکمل طور پر درست ہو جائیں۔ معاملات کی درستی سے ملکیتیں آباد رہتی ہیں اور حال زندگی گزرتی ہے۔“ یہ کہہ کر حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ دیر کے لئے سکوت اختیار کیا۔ فرمانروائے دکن نے ایک نظر حضرت شیخ کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ حضرت دراز رحمۃ اللہ علیہ کا روئے سخن اسی کی طرف ہے۔

مختصر سے سکوت کے بعد حضرت سید گیسودراز نے دوبارہ اپنی تقریر کا آغاز فرمایا۔

”حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ ایک دن کسی شہر کا عامل (گورنر) اپنے علاقے اور دوسرے تحائف لے کر دربارِ خلافت میں حاضر ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے محصولات بیت المال میں دیئے اور عامل کے پیش کردہ تحائف کو وہیں پڑا رہنے دیا۔ حاضرین دربار، امیر المومنین کے اس طرزِ عمل کا قاصر تھے۔ حضرت علیؑ کچھ دیر تک ان تحائف کو دیکھتے رہے، پھر کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں عامل سے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”امیر المومنین! یہ تمام تحائف بطور خاص آپ کے لئے ہیں۔“ عامل نے عرض کیا۔

”میرے لئے کیوں؟“ حضرت علیؑ کے لہجے کی ناخوشگوار بدستور قائم تھی۔

”آپ ملتِ اسلامیہ کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔“ عامل نے کہا۔ وہ ابھی تک امیر المومنین کی بات کی گہرائی کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔ ”یہ تحائف آپ کی بے لوث خدمات کی نذر ہیں۔“

”تم میری ضروریات کا خیال رکھنے والے کون ہو؟“ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حاکم کو سخت لہجے میں غالب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میری خدمات کا صلہ مجھے بیت المال سے مل جاتا ہے۔ پھر ان تحائف کی کیا حیثیت ہے؟“

حاکم، حضرت علیؑ کی نرمی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، ”امیر المومنین خواہ کتنے ہی انکسار سے کام لیں مگر یہ نذر و تحائف آپ کے شایانِ شان ہیں۔“

اب حضرت علیؑ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور آپ نے خلافِ عادت انتہائی تلخ لہجے میں فرمایا۔ ”اے شخص! اگر یہ تحائف تیری ذاتی آمدنی سے ہوتے تو میں شاید ان کو قبول کرنے کے بارے میں سوچتا۔ مگر ان کی ظاہری قیمت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ظلم کے ذریعے بندگانِ خدا سے حاصل کئے گئے ہیں..... اور تو مجھے سر دربارِ رشوت پیش کرنے کا مذموم عمل انجام دے رہا ہے۔“

امیر المومنین کی پُر جلال کیفیت دیکھ کر وہ حاکم گھبرا گیا۔ حاضرین دربار عالم سکوت میں تھے اور وہ حضرت علیؑ کا نبلسنہ کے لئے بے قرار تھے۔

اچانک خلیفہٴ مسلمین کی بازرب آواز گونجی۔ آپ حاکم کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔ ”اے شخص! تو نے بیک وقت دو جرم کئے ہیں۔ ایک یہ کہ بندگانِ خدا کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر ٹوٹنے پر مال جمع کیا ہے..... اور دوسرا جرم یہ ہے کہ تو نے اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے مسلمانوں کے امیر کو نذر و تحائف کے نام پر رشوت پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے تجھے خیانت، چوری اور رشوت کی پیشکش کے جرم میں گورنری کے معزز عہدے سے برطرف کیا جاتا ہے۔“

وہ حاکم بھی بڑا موقع شناس تھا۔ اس نے حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کا غصہ فرو کرنے کے لئے عرض کیا۔

”امیر المومنین نے میرے حق میں جو فیصلہ دیا ہے، وہ یکسر درست ہے اور انصاف پر مبنی ہے..... مگر سیدی نے اس حقیقت پر غور نہیں فرمایا۔“

”کیسی حقیقت؟“ امیر المومنین نے حاکم سے پوچھا۔

”مسلمانوں کے قافلہ سالار خوب جانتے ہیں کہ ان دنوں کا قیام دو چیزوں پر ہے۔ ایک حق اور دوسرا باطل۔ باطل شیطان ہے اور وہ ہر وقت ہماری تاک میں لگا ہوا ہے۔ میں شیطان کو پکڑ کر امیر المومنین کی خدمت میں لے آیا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو اسے اپنے گھر لے جا کر بند کر دوں۔“

حاکم کی چرب زبانی دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ مسکرانے لگے۔ ”یہ سارا مال باطل ہے اور میں اسے ضرورت مندوں کے گھر میں بند کئے دیتا ہوں۔ غریب اور محتاج لوگ اس شیطان سے زیادہ جارحانہ سلوک کر سکیں گے۔“

یہ کہہ کر حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ نے وہ سارے تحائف ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیئے اور عامل کو انتہائی تنبیہ آمیز لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”تم باطل پرستی کے ذریعے مسلمانوں میں ابتری ڈالنا چاہتے ہو..... اور اللہ تعالیٰ، مسلمانوں کو اچھے قول و فعل کے ذریعے حق کا علمدار بناتا ہے۔ یاد رکھو کہ حق ہمیشہ سربلند ہوتا ہے اور باطل ہمیشہ برباد و سرنگوں رہتا ہے۔ یہ تمہاری پہلی غلطی تھی، اس لئے معاف کیا جاتا ہے۔ اگر آئندہ اس جرم کے مرتکب ہوئے تو شیطان تمہارے گھر میں

مقید نہیں ہوگا بلکہ تمہیں تمہارے عہدہ و منصب سے معزول کر کے حوالہ زنداں کر دیا جائے گا۔“
حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ فرمانروائے دکن اور اس کے امراءے سلطنت کو نصیحت کرنا
سنایا تھا اور درپردہ حکومتوں کے عروج و زوال کے سارے اسباب بنا دیئے تھے۔



ایک اور موقع پر والی دکن اور دوسرے امراءے سلطنت، حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس معرفت
تھے۔ حضرت شیخ نے احمد خان اور دیگر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
”اہل دنیا پر افسوس ہے کہ ان کے اعمال، ان کے اقوال سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتے۔ اگر
سوال کیا جائے کہ اسے دنیا چاہئے یا آخرت؟ تو وہ بے اختیار یہی کہیں گے۔
”ہمیں آخرت چاہئے۔ ہم قرب الہی کے خواہاں ہیں۔“

مگر جب ہم ان کا عمل دیکھتے ہیں تو وہ دن رات حصول زر کی کوششوں میں غرق نظر آتے ہیں۔ اگر
خواہش جائز طریقوں سے ہو تو غنیمت ہے..... لیکن اہل دنیا کا تو یہ حال ہے کہ وہ مال کمانے کے لئے
ناجائز طریقہ بھی نہیں چھوڑتے۔ شب و روز بندگان خدا کے حقوق کا خون کر کے اپنا پیٹ بھرتے رہتے ہیں۔
کا مال کھاتے، کسی کے گھر میں چوری کرتے اور کسی سے بے ایمانی کرتے دقت وہ اللہ سے نہیں ڈرتے
پیچھے بھاگتے وقت انہیں ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس ساری تک و دو کا انجام کیا ہے۔
بعد یوم حساب ہے..... اور حساب لینے والی ذات قہار و جبار بھی ہے اور اس کی آنکھ سے ڈرنے والے
پوشیدہ نہیں۔“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر اس قدر پُر تاثیر تھی کہ حاضرین مجلس کے جسموں پر لرزہ طاری ہوا۔
پھر مختصر سے سکوت کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ فرمایا۔ ”ان دنیا داروں کا یہ حال۔
کے چار پیسے گم ہو جائیں تو ان کی صورتیں قابل دید ہوتی ہیں۔ آنکھوں کی پتلیاں خوف سے کانپنے لگی ہیں۔
اس طرح گڑ جاتی ہیں، جیسے پتھر کی ہو گئی ہیں۔ کچھ کے چہرے شدت غم سے دھواں ہو جاتے ہیں اور کچھ
پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی وقت کی نماز قضا ہو جاتی ہے تو ایک دو بار اُٹھ کر نماز
استغفار پڑھ کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ اکثر لوگ تو استغفار بھی نہیں پڑھتے اور انہیں اپنی نمازیں غفلت
کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ تو دنیا داری میں اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ انہیں خوفِ خدا
بھی یاد نہیں رہتا۔ وہ ممنوعہ اشیاء سے پرہیز نہیں کرتے۔ اگر ”سوز“ کھاتے اور ”شراب“ پیتے دلت لاپتہ
کراہت پیدا ہو جائے تو اور بات ہے، ورنہ وہ اس خیال سے ان چیزوں سے دور نہیں رہتے کہ اللہ تعالیٰ
ہے۔ جو دل خوفِ الہی سے خالی ہیں، ان پر افسوس! ہزار بار افسوس!“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے چھ سو سال پہلے اپنی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا فرمائے تھے۔
شاہد ہیں کہ اس زمانے میں انسان کی کج روی اور گمراہی کا یہ عالم نہیں تھا، جس کا مشاہدہ ہم پندرہویں
میں کر رہے ہیں۔ آپ کے خطبات میں اکثر مقامات پر ایسے اشارے بھی ملتے ہیں، جن سے موجودہ
بھربور عکاسی ہوتی ہے۔ خصوصاً ”شراب اور سوز“ کا معاملہ تو ایسا ہے، جیسے یہ سارے مناظر حضرت پروردگار
کی چشم معرفت پر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ روشن ہوں۔ اہل دنیا کو اس کشفِ باطن پر حیرت ہو کر
نظر جانتے ہیں کہ اللہ اپنے دوستوں کو آنے والے زمانوں کا بھی علم عطا کرتا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔

جس طرح چاہے، سرفراز کرے۔



ایک موقع پر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مریدوں، خدمت گاروں، عقیدت مندوں اور دوسرے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”ساری کائنات مل کر بھی اللہ کی شانِ جلالی و جمالی کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ حق تعالیٰ نے ”سورۂ رحمن“ میں فرمایا ہے ”ہر لہو اس کی نئی شان ہے“ (ترجمہ) اس لئے بندے کو کسی بھی حال میں اس ذاتِ پاک کی کرم نوازی سے بالکل نکل ہونا چاہئے۔“

یہ کہہ کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے شانِ خداوندی کے بارے میں عجیب پُر تاخیر واقعہ سنایا۔

ایک دن ایک بادشاہ کا دربار آراستہ تھا۔ بڑے بڑے اہل دانش جمع تھے۔ بادشاہ کا وزیر بڑا عالم و فاضل اور باذہب انسان تھا۔ بادشاہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تم شان کے معنی بیان کرو۔“

وزیر نے اپنی نشست پر کھڑے ہو کر عجیب عجیب تشبیہات اور مترادفات کے ذریعے لفظ ”شان“ کے معنی اس طرح بیان کئے کہ بادشاہ محظوظ ہوا اور حاضرین دربار، وزیر کی عقل و فراست پر جھوم اُٹھے۔

اس کے بعد بادشاہ نے اپنے وزیر کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اس آیت الہی کے ایسے شگفتہ معانی بیان کرو کہ میری طبیعت فرحت حاصل کرے۔“

ہر چند کہ وزیر اعظم نہایت ذکی و فہیم انسان تھا، مگر بادشاہ کی عائد کردہ شرط نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

”مال جاہ! مجھے ایک دن کی مہلت عطا کریں۔“ وزیر اعظم نے سربراہِ مملکت سے التجا کی۔

”ایک دن کی مہلت کیوں؟“ بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیا اس میں کوئی خاص راز ہے؟“

”آیتِ مقدسہ کے ایسے معانی بیان کرنا، جنہیں سن کر عزت مآب فرحت محسوس کریں، ایک نہایت مشکل کام ہے۔ بس اسی کی مہلت طلب کی ہے۔“ وزیر اعظم نے عرض کیا اور بادشاہ سے اجازت لے کر اپنے گھر چلا گیا۔

وزیر اعظم ایک مشکل مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اس نے آج سے پہلے بے شمار تقریریں کی تھیں، بہت سے سیاسی عقدے حل کئے تھے، مگر وہ مشروط انداز میں آیتِ مقدسہ کی تفسیر کرنے سے عاجز تھا۔ وزیر اعظم شدید اضطراب کے عالم میں ٹپل رہا تھا اور رات گزرتی جا رہی تھی۔

یہ منظر وزیر اعظم کے حبشی غلام نے دیکھا تو نہایت مودبانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔ ”میں نے اپنے آقا کو آج تک اتنا متفکر اور پریشان نہیں پایا۔“

”میں تجھے کیا بتاؤں کہ میں کس الجھن میں مبتلا ہوں۔“ وزیر اعظم نے بیزار اور بے رغبتی سے کہا۔ ”تو میری زبان نہیں سمجھ سکتا۔“

”مجھے اپنی کمزری کا احساس ہے آقا!“ حبشی غلام گڑگڑانے لگا۔ ”میری غیرت گوارہ نہیں کرتی کہ میرے مالک کی بند اڑ جائے اور میں بسترِ استراحت پر جا کر گہری نیند سو جاؤں۔ میری تالیفِ قلب کے لئے کچھ تو فرمائیے۔“

وزیر اعظم نے کئی بار نالے کی کوشش کی۔ جھنجھلاہٹ اور ناگواری کا اظہار بھی کیا۔ مگر حبشی غلام مسلسل التجا کرتا رہا۔ بالآخر وزیر اعظم نے اسے سارا واقعہ سنا دیا اور پوچھا۔ ”اب بتا کہ تو میری کیا مدد کر سکتا ہے؟“ وزیر اعظم کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ وہ دبے لفظوں میں اپنے حبشی غلام کی کم علمی اور بے مائیگی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

”اب آپ مطمئن ہو کر سو جائیں۔“ حبشی غلام نے عرض کیا۔ ”میں انشاء اللہ! بادشاہ سلامت کے آیت مقدسہ کے معانی بیان کر دوں گا۔“

”تو پھر مجھے جلدی بتا!“ غلام کی بات سن کر وزیر اعظم اُچھل پڑا۔
”بھئی نہیں آقا!“ غلام نے بعد احترام کہا۔ ”کل انشاء اللہ دربار میں پہنچ کر بادشاہ سلامت کے آیت الہی کی تفسیر پیش کروں گا۔“

”تو میرا ملازم ہے اور میں تیرا آقا۔“ غلام کے انکار پر وزیر اعظم برہم ہو گیا۔ ”تجھے یہیں بتانا ہوگا۔“
”عالی جاہ کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔“

”بے شک! میں آپ کا غلام ہوں، مگر یہ بات میرے فرائض میں شامل نہیں ہے۔“ آج حبشی غلام ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ لہجے میں بول رہا تھا، جسے سن کر وزیر اعظم کو شدید حیرت ہو رہی تھی۔
”تجھے ہر حال میں میرے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی۔“ وزیر اعظم نے اپنے غلام کو تنبیہ کی۔

”آپ کی خدمت میں کوتاہی کروں تو مجرم ہوں۔ آپ مجھ سے میرے اعمال کا حساب لے سکتے ہیں۔“ غلام نے عرض کیا۔ ”یہ تو میں نے حق نمک ادا کیا تھا کہ آپ کو پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ دربار میں نہیں لے جانا چاہتے تو آپ کی مرضی..... ورنہ اس غلام کی شرط بھی یہی ہے کہ بادشاہ سلامت کے ہی آیت الہی کی تشریح کروں گا۔“

وزیر اعظم نے مختلف انداز میں آقایت کے مظاہرے کئے، مگر غلام ذرا بھی متاثر نہیں ہوا اور وہ اپنی قائم رہا۔

آخر مجبور ہو کر وزیر اعظم اپنے حبشی غلام کو دربار میں لے گیا اور بادشاہ سے عرض کرنے لگا۔ ”عالی مزین کا یہ ادنیٰ خدمت گار تو آیت مقدسہ کی تشریح کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ مگر اس غلام کا دعویٰ ہے کہ وہ حضور اکرمؐ دے گا۔“

بادشاہ اور دوسرے اراکین سلطنت نے حبشی غلام کو بڑی حیرت سے دیکھا۔

”کیا یہ تیرا دعویٰ ہے؟“ فرمانروائے سلطنت نے غلام کو مخاطب کر کے کہا۔

”دعویٰ نہیں عزت مآب!“ یہ کہتے ہوئے حبشی غلام جھک گیا اور اس نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا۔
بعد وہ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”یہ تو ایک حقیر ترین بندے کی سعادت ہے کہ وہ اپنے مالکِ حقیقی کے کامیابی کرنے کی ایک ناکام سی کوشش کر رہا ہے۔“

بادشاہ، حبشی غلام کے طرزِ گفتار سے بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، بیان کرو۔“

حبشی نے دست بستہ عرض کیا۔ ”میرے اللہ کی ہر لمحے نئی شان ہے۔ اس راز کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ قدرت لامحدود ہے اور بندے کی عقل انتہائی محدود۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک محدود ذہن، لامحدود وقول کے کی تعریف بیان کر سکے؟ پھر بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ جلالت کا یہ ادنیٰ سامونوہ ہے کہ وہ دم بھر میں ذاتِ باری شان و شوکت سے کسمپرسی، سرمایہ داری سے مفلسی اور فقری سے دولت مندی، مرض سے صحت اور بیماری سے شفا کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اسی حالت کو ”اللہ کی ہر لمحے نئی شان“ کہتے ہیں۔“

حبشی غلام کا جواب سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ پھر وزیر اعظم کو مخاطب کر کے بولا۔ ”اے خلعتِ وزارت دو کہ یہ اس کا اہل ہے۔“

اپنے فرزندِ اکرام کی عزت و احترام کے لیے اس کی کیفیت میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر وحشی غلام کو اپنے ہاتھ سے خلعت وزارت پہنائی۔

غلام نے خلعت وزارت پہن کر با آواز بلند اپنے اللہ کی کبریائی کی بیان کی اور پھر بادشاہ سے مخاطب ہو کر نہایت فخریہ لہجے میں آیتِ مقدسہ کی تلاوت کی اور بولا۔ ”یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت ہے کہ اس نے میری گردن سے طوقِ غلامی اتار کر مجھے خلعت وزارت بخشی۔ وہ مالکِ بے نیاز ہر لمحہ یہی کرتا رہتا ہے اور شکر ادا کرنے والوں کو زیادہ نوازتا ہے۔“

دراصل وہ وحشی ایک نہایت عالم و فاضل اور متقی شخص تھا، جسے گردشِ روز و شب نے منزلِ غلامی تک پہنچا دیا تھا۔ نہایت مقدس کی برکت سے اس کی زنجیرِ غلامی کٹ گئی اور وہ وزارتِ عظمیٰ کے منصب تک پہنچا۔



ایک دن کی مجلس نے برسرِ مجلس حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا۔ ”ہمارے علمائے کرام، صوفیاء کو بے عمل بھی سمجھے ہیں اور کم علم بھی۔ اپنی درس گاہوں میں لوگوں کے سامنے ان کی تحقیر کرتے ہیں اور درویشوں کی کسی بات کو لائقِ التفات نہیں سمجھتے۔“

”علماء کو اپنے علم کا غرور ہے، اس لئے حجاباتِ نظر کا شکار ہو جاتے ہیں۔“ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا۔ ”صوفیاء، سرتاپا محبت ہوتے ہیں، انکسار کا پیکر ہوتے ہیں..... اور اللہ تعالیٰ عاجزی کو پسند فرماتا ہے، اس لئے ان خاک نشینوں پر اپنی معرفت کے بہت سے اسرارِ منکشف کر دیتا ہے۔“ یہ کہہ کر حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تاریکی و اندھ بیان فرمایا۔

ایک دن حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کسی مقام پر تشریف فرما تھے اور فقہ کا کوئی مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ (راوی کہے کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ، حضرت امام شافعیؒ کے شاگرد تھے) اتفاق سے اسی دورانِ مشہور مولیٰ بزرگ حضرت شبیانِ رائیؒ گزرے۔ حضرت شبیانِ رائیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ بس واجبی اس علم رکھتے تھے۔ انہیں دیکھ کر حضرت امام شافعیؒ اپنے شاگرد سے مخاطب ہوئے۔

”اے اس مسئلے کو شبیانِ رائیؒ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔“

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا۔ ”استاذِ محترم! ان لوگوں سے ایسے دقیق مسائل پر گفتگو کرنا کارِ عبث ہے۔ یہ ایسے افراد کی جماعت ہے، جو ”ہاؤ ہو“ کے سوا کچھ نہیں جانتی۔“

حضرت امام شافعیؒ نے اپنے شاگردِ خاص کا جواب سنا اور پھر حضرت شبیانِ رائیؒ کو آواز دی۔ کتابوں میں تو یہ واقعہ ہی درج ہے، مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ اس طرح ایک بزرگ کو پکارنا حضرت امام شافعیؒ کے شایانِ شان نہیں تھا۔ حضرت امام نہایت متواضع اور مکرر المراج انسان تھے، اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ اپنے شاگرد حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو لے کر آگے بڑھے اور حضرت شبیانِ رائیؒ کے قریب پہنچ کر کہا۔

”آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے۔“

حضرت شبیانِ رائیؒ نے حضرت امام شافعیؒ کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”آپ تو حضرت امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اور خود بھی امامت کے درجے پر فائز ہیں۔ پھر مجھ جیسا کم علم شخصِ فقہ کے مسائل میں آپ کی کیا مدد کر سکا ہے؟“

”آپ کا سخنِ ظن اپنی جگہ، مگر میں اس سلسلے میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔“ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا۔

”جب امام بعد ہیں تو پھر مسئلہ پیش کیجئے۔“ حضرت شبیان رائیؒ کے ہونٹوں پر بدستور ایک موجود تھی۔

”مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی ایک وقت کی نماز قضا ہو جائے اور اسے یاد نہ رہے کہ کس وقت کی تھی تو اس حالت میں نمازی کو کیا کرنا چاہئے؟“

حضرت شبیان رائیؒ نے کسی تامل کے بغیر جواب دیا۔ ”ایسے غافل شخص پر لازم ہے کہ پانچ نماز بالترتیب دوبارہ پڑھے۔“ یہ کہہ کر حضرت شبیان رائیؒ تشریف لے گئے۔

ان کے جانے کے بعد حضرت امام شافعیؒ نے اپنے شاگرد خاص کی طرف دیکھا۔ حضرت امام شافعیؒ تھے اور آپ کے چہرہ مبارک پر حیرت کا رنگ نمایاں تھا۔

اس کے برعکس حضرت امام شافعیؒ نے نہایت مسرت کی کیفیت میں بے قرار ہو کر فرمایا۔ ”جب شبیان رائیؒ جیسے غیر عالم صوفی کا یہ حال ہے تو ان کے مشائخ کا کیا عالم ہوگا؟“

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”قرآن، علم حاصل کرنے کے بعد ادب اور فلسفے کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ پھر نہیں جا کر انسان اس قابل ہوتا ہے کہ میدان میں قدم رکھ سکے۔ جو لوگ احکام شریعت پڑھے بغیر ہندو ویدانت کے انداز میں خود کو صوفی کہلاتے باطل پرست ہیں اور تصوف سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔“



ایک بار حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”شیخ کو چاہئے کہ ہمیشہ ایک کے ساتھ خشک اور فلسفیانہ باتیں نہ کرے۔ بوقت ضرورت کبھی کبھی شگفتہ مزاح بھی کرے۔ بڑی بات کسی کی دل آزاری کا سبب نہ ہو۔ نیز اس کے کسی زاویے سے احکام شریعت پر کوئی حرف نہ آتا ہو۔ بار میرے پیرو مرشد شیخ الشیوخ حضرت سید نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ نے ایک درویش سے پوچھا کہ آپ کے گوتے میں داخل ہوا تھا۔

”یہ بتاؤ کہ سفر کے دوران درویشوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا سلوک روار کھے؟“ دہلی میں نووارد درویش نے عرض کیا۔ ”حضور! سفر کے دوران اکثر فقراء سے میری ملاقات ہوتی چادر، کسی نے خلعت، کسی نے جبہ اور کسی نے دستار عنایت کی۔ مگر افسوس! اب ان میں سے کوئی چیز مجھ پر موجود نہیں۔ میرا تمام سرمایہ چوری ہو گیا۔ اگر سرکار اپنا پیر بن عنایت فرمادیں تو یہ لباس مبارک اپنا چیزوں کا نعم البدل ثابت ہوگا۔“

نووارد درویش کی گفتگو سن کر حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ مسکرائے اور اسی وقت اپنا پیر ان کے اس شخص کے حوالے کیا اور نہایت شگفتہ لہجے میں فرمایا۔ ”چوروں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا تھا، تمہارے ساتھ وہی سلوک روار کھا۔“ پیرو مرشد کا ارشاد گرامی سنتے ہی تمام حاضرین مجلس ہنسنے لگے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت سید گیسو دراز رحمہ اللہ نے فرمایا۔ ”اس قسم کا مزاح گاہے گاہے ظاہر اس طرح کی خوش مزاجی کو طریقت میں بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہاں! شیخ کے لئے ہر وقت ایسا ہونا چاہئے ہے اور ارادت مندوں کے حق میں زہر قاتل۔“



حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس سال کی عمر میں سید احمد بن مولانا جمال الدین مغربی کی صاحب زادی، بی بی رضا خاتون سے شادی کی۔ ان کے بطن سے دو صاحب زادے حضرت سید حسین عرف سید محمد اکبر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سید یوسف عرف سید محمد اصغر رحمۃ اللہ علیہ اور تین صاحب زادیاں تھیں۔ آپ کے دونوں صاحب زادے اپنے وقت کے جد عالم تھے۔

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ اپنے بڑے فرزند سید محمد اکبر کے ظاہری اور روحانی کمالات سے بہت متاثر تھے۔ آپ نے بارہا فرمایا۔ ”اگر محمد اکبر میرا لڑکا نہ ہوتا تو میں اس کے لئے پانی بھر کر لاتا۔“

حضرت سید محمد اکبر نے عربی اور فارسی زبان میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ نے اپنے والد محترم کے لکھنات کو ”جوامع الکلم“ کے نام سے مرتب کیا۔ جب اس کتاب کو حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا تو بے اختیار فرمایا۔

”اگر میں بھی لکھتا تو سید اکبر ہی کی طرح لکھتا۔“

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ اپنے بڑے صاحب زادے سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ آپ نے 811ھ میں سید محمد اکبر کو خلافت عطا کی مگر سات ماہ بعد ہی معرفت کا وہ چراغ بجھ گیا۔ حضرت سید محمد اکبر نے پچاس سال کی عمر میں وفات پائی۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھوں سے بیٹے کو غسل دیا۔ انسانی زندگی میں یہ سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ جب کوئی باپ اپنے بیٹے کو قبر میں اتارتا ہے۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ بھی اس صدمہ عظیم سے دوچار ہوئے۔ مگر آپ نے اہل ایمان کی طرح صبر کا مظاہرہ کیا۔ شدت غم میں آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے، مگر ہونٹوں سے شور فغاں بلند نہیں ہوا۔

حضرت سید محمد اکبر کے انتقال کے بعد آپ نے اپنے چھوٹے صاحب زادے حضرت سید محمد اصغر رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت عطا کی۔

حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب کوئی شخص مرید ہونے کے لئے آتا تو آپ اس کے ہاتھ پر اپنا دست مبارک رکھ دیتے اور فرماتے۔

”تم نے اس ضعیف، اس ضعیف کے خواجہ اور اس ضعیف کے خواجہ کے خواجہ اور اسی سلسلے کے دوسرے مشائخ کے ساتھ عہد کیا کہ اپنی نگاہ اور زبان کی حفاظت کرو گے اور جادۂ شریعت پر قائم رہو گے۔ کیا تم نے قبول کیا؟“

مرید عرض کرتا۔ ”جی ہاں، میں نے قبول کیا۔“

اس کے بعد ارشاد فرماتے۔ ”الحمد للہ۔“ پھر دست مبارک میں قینچی لیتے اور تکبیر کہتے ہوئے داہنی طرف سے کان کے قریب ٹھوڑے سے بال کاٹ دیتے۔ اسی طرح بائیں طرف کے چند بال کاٹتے، پھر تکبیر کہتے ہوئے اسے ایک ٹوپی پہناتے۔ اس کے بعد پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرنے کی تاکید فرماتے۔ جمعہ کو غسل اور نماز کی تعین بخانی کے ساتھ کرتے۔ پھر مختلف اوقات کے لئے نمازیں اور وظائف بتاتے۔ اس کے بعد ایک ایک لفظ پر زور دے کر فرماتے۔

”جس طرح ایک سپاہی کے لئے کمان، تیغ اور سپر وغیرہ ضروری ہیں، اسی طرح ایک صوفی کے لئے ان باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔“

اگر کسی عورت کو سر پہ کرتے تو ایک بڑے پیالے میں پانی لایا جاتا۔ حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہادت کی انگلی پانی میں ڈالتے۔ عورت بھی یہی عمل وہراتی۔ اس کے بعد اسے بیعت کرتے۔ وہ عورت پیالے کا پانی پی جاتی۔

پھر حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ اُس کے سر پر رومال رکھ دیتے۔
اگر عورت جوان ہوتی تو اس کے سامنے چادر ڈال دی جاتی۔ پانی کا پیالہ درمیان میں رکھتے یاں کے
وکیل بناتے اور وہ بیعت کرا دیتا۔ لڑکے اور مرلیض کو مرید نہیں کرتے تھے۔



بے شک! اہل ایمان میں حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا درجہ ہے۔ حضرت شیخ کوٹاہری طور پر
فارسی زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ آپ اعلیٰ درجے کے انشاء پرداز تھے۔ تقریباً بیس تصانیف آپ کے
نتیجہ ہیں۔ ”اسماء الاسرار“ حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ہے۔ اس تصنیف کے بارے میں فرمایا
فرماتے تھے۔ ”میری کتاب ”اسماء الاسرار“ میں باطل کو نہ آگے سے آنے کا موقع ہے، نہ عقب سے۔“
اس کتاب کے متعلق اکثر بزرگوں کا خیال ہے کہ تصوف کے موضوع پر ہندوستان میں اس سے بہتر کتاب
موجود نہیں۔

حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ (گلبرگہ) دکن میں بائیس سال قیام فرما رہے۔ پھر وہ وقت معلوم آیا کہ
شمار روحوں کی کثافت دور کر کے 14 ذی قعدہ 825ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ سلطان احمد شاہ دکنی
کے مزار مبارک پر عالیشان گنبد تعمیر کروایا۔

چھ صدیاں گزر چکیں۔ نہ جانے اہل زر کے کتنے کارواں آئے اور اس طرح لقمہ اجل ہو گئے کہ آج تک
نام لیوا بھی نہیں ہے۔ کون جانے، حکمرانوں کے کتنے قافلے افقِ اقتدار پر طلوع ہوئے اور پھر یوں غروب ہوئے
دھندلا سا نشان تک باقی نہیں۔ مگر ایک حضرت سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ ہیں کہ آپ کے مرقد سے ابھی تک
دوست آتی ہے۔ جس راہ سے آپ گزرے تھے، اس راہ کے سنگریزے آج تک روشن ہیں اور یہ شعاعیں ان
عکس ہیں جو سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ مبارک سے مٹھوٹ رہی ہیں۔



حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ

وہ ہندوستان کا طاقتور ترین حکمران تھا۔ اس نے سیاسی عیار یوں پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور ایوان اقتدار کی باروں کو بلند کرنا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کے دشمن سرنگوں ہو گئے۔ اپنے سینے پر بے شمار فتوحات کے تمغے سجائے۔ بعد وہ عشرت کدہ خاص میں داخل ہوا۔ کنیزیں بہت دیر تک چنگ و رباب پر کیف و نشاط کے نغمے چھیڑتی ہیں۔ رات تیزی سے ڈھلتی جا رہی تھی۔ پھر لالہ خام مطرب، سیسیں بدن رقص رخصت ہو گئے۔ پلکیں نیند سے مل ہو گئیں۔ اب اس کے قدم خواب کی گاہ طرف اٹھ رہے تھے۔ پردہ زرنگار کو جنبش ہوئی اور پھر ایک فاتح کا آہستہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ملکہ ہند جاگ رہی تھی۔ بستر کے پھول آٹچ دے رہے تھے ادا اس کا دل نشیں پردہ چل کر رہ گیا تھا۔

”سو جائے ملکہ عالیہ!“ شہنشاہ نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”کہیں آپ کی یہ بے قراری ہمیں حکومت کے اصول کی طرف سے غفلت شعار نہ بنا دے۔ ہم اپنی اس محرومی کو جام سرخ میں ڈبو دینا چاہتے ہیں۔ مگر آپ کے نو ہمیں اندھیروں کی طرف کھینچ کر لئے جا رہے ہیں۔“

”اُمّی یہ اندھیرے اور بڑھیس گئے ظل الہی!“ ملکہ عالیہ کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔ ”یہ ملکہ مطرب، یہ جشنِ فتح اور یہ رقصِ شمشیر سب کچھ بے کار ہے۔ جانشین کے بغیر محلاتِ شاہی قبرستان بن کر رہ گئے ہیں۔“

”کیا ہم اس حقیقت سے بے خبر ہیں؟“ شہنشاہ کا مخمور لہجہ اچانک تلخ ہو گیا۔ ”ہم ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ مگر تہا ری خاطر بھو کے ننگے انسانوں میں خزانے لٹائے گئے، مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں، مندروں میں بجن گائے گئے..... مگر تخت کا وارث؟“ شہنشاہ کی آواز ڈوبنے لگی۔

”آپ اس فقیر سے اپنے دل کا درد بیان کیوں نہیں کرتے؟“ ملکہ نے مشورہ دیا۔

”وہ گداگر..... جسے ایک وقت کی روٹی میسر نہیں، وہ ہمیں بیٹا عطا کرے گا؟“ بھجتے ہوئے چہرے پر اچانک

جلالی شای اُبھر آیا تھا۔ ”وہ شعبہ باز ہے۔ صرف شعبہ باز۔“

”ساری دنیا اس کے پاس جاتی ہے۔ سب بامراد لوٹتے ہیں۔“ ملکہ نے فرمانروائے ہند کے غرور و تکبر کو

نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”خدا اُس فقیر کی سب لوگوں سے زیادہ سنتا ہے۔“

”ساری دنیا ہمارے درشن کرتی ہے اور ہم اس فقیر کے دروازے پر بھیک مانگنے جائیں گے؟“ ایک بار پھر غرور

کی آندھی چلنے لگی تھی۔ ”ملکہ عالیہ! عزت و وقار کی جس عمارت کو نسلِ تیمور نے اپنا خون دے کر ہم زبیرِ فلک بنا دیا، اسے ایک فقیر کے قدموں میں ڈھیر نہ کیجئے۔ یہ ہماری گزارش بھی ہے اور حکم بھی۔“ قہرِ شامی اپنے عروا پر خاموش ہو گئی۔ فانوس بجھا دیئے گئے اور خواب گاہ میں ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔

شہنشاہ کی آنکھوں سے نیند رخصت ہو چکی تھی اور اس کا ذہن انسانی زندگی کے ناہموار راستوں پر بڑھ کر رہا تھا۔ ٹھوکر میں پڑے ہوئے انسانی سر، خون میں نہائے ہوئے جسم، بوسیدہ بڈی، سڑی ہوئی لائیں، ماتم، چیخیں، فریادیں۔ صراحی، بربط، نغمہ، گناہ۔ بے شمار تصویریں ایک دوسرے میں خلطِ خلط ہو گئیں۔

پھر اس نے عالمِ خواب میں دیکھا، آسمان کو چھونے والی سنگی دیواریں گر رہی ہیں۔ زنجیروں کا لوہا ٹکڑا ہوا اور تمام قیدی، زندان کا دروازہ توڑ کر باہر نکل آئے ہیں۔ ”یومِ حساب“ صورِ اسرافیل چھوٹ کر دیا گیا ہے۔ حشر برپا ہے۔ صدیوں کے اسیر ایک بوڑھے کے دل پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہیں..... اور وہ بوڑھا، ہندو عزت مآب شہنشاہ ہے۔

”بے ادب!“ فرمانروائے ہند چیخا۔

ملکہ ہند گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ”کس کی چیخ تھی؟“ کروڑوں انسانوں پر حکومت کرنے والی عورت کے ہونٹ

رہے تھے۔

”کچھ نہیں۔“ شہنشاہ نے اپنی لرزتی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک بھیاک خواب

تھا۔ آپ سو جائیے۔ خوابوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔“

ملکہ اس جواب سے مطمئن تو نہیں ہو سکی، مگر شہنشاہ کے حضور میں مزید سوالات گستاخی کا سبب بن جاتے۔ خاموش ہو گئی اور رات کے اندھیرے میں اپنی ویران زندگی پر غور کرنے لگی۔ بارہا اس کے ذہن میں ایک غمزدہ بچے کا ہیولا ابھرتا تھا۔ وہ بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ اس بچے کی طرف بڑھاتی..... لیکن دوسرے ہی لمحے سایہ تاریکی میں مدغم ہو جاتا..... اس کے ہونٹوں سے آہ سرد نکلتی اور پھر سینے میں کوئی نازک سی شے ٹوٹ کر ٹکڑے ہو جاتی۔ ملکہ ہند کے کئی بچے ہوئے مگر چند دنوں اور چند مہینوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ کئی ولی عہد سلطنت دیاں لٹا کر چند سانس لے کر پیوندِ خاک ہو گئے۔ ہندوستان کی سب سے طاقتور عورت کے دل پر کئی زخم تھے اور ہر زخم خون ریس رہا تھا۔

آخر تخت کے وارث کی تمنا ایک مستقل عذاب بن گئی۔ سیاست کی نیب رنگیاں، زندگی کی بے وفائی اور سب سے زیادہ ملکہ ہند کی دبی دبی سسکیاں، ایک مطلق العنان حکمران کو ان حالات کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف پڑا۔ اب وہ مغرور انسان اسی فقیر کی خانقاہ کی طرف جا رہا تھا، جسے کچھ دن پہلے اس نے گداگر کہہ کر پکارا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کر رہے تھے کہ ایک شہنشاہ بھی کسی کمبل پوش کا محتاج ہو سکتا ہے؟

”کیوں آیا ہے؟..... کیا آسمانی خدا نے تیری زمین کی خدائی چھین لی؟“ فقیر کے جاہ و جلال کا یہ عالم گرد و پیش کی ہر چیز لرزہ بر اندام تھی۔

بادشاہ کے دل و دماغ جل اٹھے تھے۔ لہجے کی اس گرمی سے پہلی بار اس کے کان آشنا ہوئے تھے۔ ”کہا علاوہ بھی دنیا میں کوئی شخص ایسی گفتگو کر سکتا ہے؟“ اس کے سلگتے ہوئے ذہن نے سوچا۔ واضح رہے کہ ہندو یہ مطلق العنان شہنشاہ، علمی اعتبار سے جاہل شخص تھا۔ اور اس کی اس جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس گمراہ اور عیار مصاحبوں نے فرمانروائے ہند کو ہلاکت و بربادی کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ ان فتنہ گردوں نے

یقین دلا دیا تھا کہ اسے کسی مشکل کشا کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ خود مشکل کشا ہے۔ اُس کی ایک جنبش لب سے لوگوں کے مسائل حل ہوتے ہیں اور انہیں رنج و الم سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ ان منافقوں نے بادشاہ کو یقین دلا دیا کہ وہ اپنے دور کا پیغمبر ہے۔ انجام کار بادشاہ نے یہاں تک فریب کھایا کہ وہ اپنے آپ کو حقیقتاً ”پیغمبر“ اور ”بھگوان کا اوتار“ سمجھنے لگا۔ وہ صبح سویرے ایک ”جھروکے“ میں نمودار ہوتا اور اپنی ہندو عباد کو درشن دیتا۔ ہزاروں بت پرست اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے اور بادشاہ کا دستِ کرم اُن کے سروں پر اس طرح سایہ فکن ہو جاتا، جیسے وہی ہندوستان کے باشندوں کا رازق ہے اور دنیا کی ساری نعمتیں اور دولتیں اُسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

اس دور کے مشہور مؤرخ اور مایہ ناز شاعر، ملا شیری نے اپنے دو شعروں میں بادشاہ کی گمراہیوں کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلے

کز خلّاق مہر پیغمبر جدا خوابِ شدن !!

بادشاہ امسال دعوای نبوت کردہ است

گر خدا خوابِ پس از سالے خدا خوابِ شدن

(یہ اس کے دماغ کی خرابی ہے۔ اگر کسی جاہل کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ وہ پیغمبر کی محبت کو

خلق کے دلوں سے جدا کر دے گا۔ بادشاہ کی گمراہی کا یہ حال ہے کہ اس نے اس سال نبوت کا

دعوٰی کیا ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو اگلے سال وہ خدا ہو جائے گا)

ملا شیری کے بیان کے مطابق نبوت کا دعوٰی کرنے والا اور خدا کی کا خواب دیکھنے والا یہ جاہل حکمران جب ولی مہر سلطنت پیدا نہ کر سکا تو قصر شاہی سے نکل کر ایک فقیر پوریا نشین کی جھونپڑی میں داخل ہو گیا اور پھر اس درویش بے باہنے اپنے روحانی جاہ و جلال کا مظاہرہ کیا تو فرمانروائے ہند اس سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا ایک گہل پوش فقیر، والی ہندوستان سے اس لہجے میں ہم کلام ہو سکتا ہے؟“

”اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا؟“ شہنشاہ کے سوال سے پہلے ہی فقیر بول پڑا۔ ”اب تو یقین آ گیا کہ تیرے

سوا بھی کچھ لوگ اپنے منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ کبھی سنی ہے ایسی زبان؟ کبھی دیکھی ہے ایسی طرزِ گفتار؟“

شہنشاہ کسی پتھر کے مجسمے کے مانند ساکت ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی فقیر کے دستِ جلال نے شاہی قبا

کو تار تار کر دیا ہو اور وہ اپنی رعایا کے ہجوم میں بے لباس کھڑا ہو۔

”واپس چلا جا۔“ فقیر کا انداز کاٹھن تھا۔ ”اگر سجدہ کرنے والوں نے تجھے ایک گداگر کے پاس دیکھ لیا تو پھر

تیری خدائی سے ان کا ایمان اُٹھ جائے گا۔“ فقیر کی شعلہ بیانیوں میں ایک آمر کا پورا وجود جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

نفاذوں پر موت کا سناٹا چھا گیا۔ ایسی ہولناک خاموشی تھی، جیسے کائنات کی نبض رک گئی ہو۔

”درویش!“ آخر شہنشاہ نے سکوت توڑا۔ ”میں بے اولاد ہوں۔ مجھے تخت و تاج کا وارث چاہئے۔“

”اپنے مشیروں سے مانگ۔“ فقیر کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ”ابوالفضل اور فیضی سے طلب کر۔

میں خاندانی گداگر، میرے کفکول میں تو ایک تنکھ (قدیم زمانے کا سکہ) بھی نہیں۔ دولتِ فرزندگی تو آسمانوں پر

تقسیم ہوتی ہے۔“

”سنا ہے تیری دعائیں آسمانوں کے کناروں کو چھو لیتی ہیں۔“ شہنشاہ کی عاجزی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا

تھا۔ ”میرے لئے بھی اپنے ہاتھوں کو اٹھا دے۔ گداگر تو میں ہوں کہ خود چل کر تیرے دروازے تک آیا ہوں۔“
 نے صرف دماغوں پر حکومت کی ہے۔ ٹو دلوں کی مملکت کا شہنشاہ ہے۔“ یہ کہتے کہتے فرمانروائے ہند دروازے
 معرفت کے تاجدار! میری محتاجی پر نظر کر۔ اپنی لازوال محبت کے سمندر سے مجھے بھی چند قطرے بخش دے۔
 روح کی گہرائیوں تک پیاسا ہوں۔“ نازک کلاسی فنا ہو گیا اور غرور شاہی ایک فقیر کی بارگاہ میں جھٹکا جلا گیا۔
 یہ تھا خدائی کے نشے میں غرق مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر۔
 گنجل پوش، بوریا نشیں اور فقیر بے سروسامان تھے حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔



حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے براہ راست تعلق رکھتے تھے۔
 نسب نامہ ساتویں پشت میں سلسلہ چشتیہ کے اس آفتاب سے جا ملتا ہے، جو پاک پتن میں جو خواب ہے۔
 سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے آباء و اجداد ضلع ساہیوال سے ہجرت کر کے مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ میں آباد ہوئے۔
 کچھ دن یہاں قیام کرنے کے بعد صوفیوں کے اس مشہور خاندان نے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ دہلی یز
 نامور بزرگان دین کا مرکز رہا ہے۔ اسی مقام سے رشد و ہدایت کے کئی سورج طلوع ہوئے، جن کی روشنی
 خانہ ہند کی تاریکیاں مکمل طور پر تو ختم نہ ہو سکیں، مگر ان میں ایک گہرا اشکاف یقیناً پڑ گیا۔ طویل عرصے کے
 اور خورشید ابھرنے والا تھا۔ روشنی کی ایک اور تاریخ لکھی جانے والی تھی۔

خاندان فرید کے ایک فرزند حضرت بہاء الدین نے دہلی میں سلوک کی کئی منزلیں طے کیں مگر انہیں
 جماعت میں خاص شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ بظاہر یہ قیاس کیا جا رہا تھا کہ حضرت مسعود گنج شکر کی نسل مبارک
 کوئی صاحب نظر پیدا نہیں ہوگا، جو ہندوستان کے ایک ایک گوشے کو متاثر کر دے۔ شاید اس قیاس آرائی کی
 ہو کہ حضرت بہاء الدین کے بڑے صاحب زادے حضرت شیخ موسیٰ معرفت کی راہ میں درجہ کمال حاصل
 سکے۔ وہ رسم زمانہ کے اعتبار سے علم و فضل بھی رکھتے تھے اور پرہیزگار بھی تھے۔ لیکن دنیا داری نے انہیں
 منزل سے بہر حال دور رکھا تھا اور اسی باعث اکثر کہنے والے کہا کرتے تھے کہ بابا فرید کے خاندان میں
 روشن ہوتے رہتے ہیں مگر کوئی آفتاب پیدا نہیں ہوتا۔ اسی گمان نے یہاں تک شدت اختیار کی کہ لوگ باہر
 چلے گئے اور روشنی کے اس سلسلے کو منطقی انجام کے قریب سمجھنے لگے۔ لیکن یہ محض خیال آرائی تھی۔ مستقبل کا حال
 نہیں جانتا۔ حضرت بہاء الدین کی ریاضتیں جاری تھیں۔ سلسلہ گریہ و زاری بھی قائم تھا کہ 884ھ میں
 انہیں اولادِ نرینہ کی مزید دولت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت شیخ سلیم چشتی دہلی کے ایک قدیم محلے سرائے علی
 میں پیدا ہوئے۔ تحقیق کرنے والوں نے 897ھ کو آپ کا سال ولادت قرار دیا ہے۔ حضرت بہاء الدین نے آپ
 نام سلیم الدین رکھا۔ آپ کی پیدائش کے کچھ دن بعد حضرت بہاء الدین دہلی سے فتح پور بیکری طے آئے اور
 مستقل طور پر یہیں اقامت گزیریں ہو گئے۔

حضرت شیخ سلیم رحمۃ اللہ علیہ گہوارے میں بھی دنیا کے دوسرے بچوں سے مختلف نظر آتے تھے۔ آپ کا
 باوقار چہرہ اس بات کی دلیل تھا کہ آئندہ قدرت کا کوئی کرشمہ ظاہر ہونے والا ہے۔ والدین نے ان کی تعلیم
 پر خصوصی توجہ کی، مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ حضرت شیخ سلیم کی عمر مبارک نو سال کی تھی کہ پہلا باپ
 رخصت ہوئے اور پھر والدہ محترمہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ دنیا کی نظر میں یہ بڑا المناک سا لمحہ قرار
 اقارب بھی سمجھ رہے تھے کہ اب اس معصوم بچے کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ مگر خالق کائنات کا دستور انانوں

لے ناقابل فہم بھی ہے اور عجیب بھی۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت آپ کر لیتی ہے لالے کی حباندی

قدرت نے اپنے اسی قانون کے مطابق شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی پرورش اُن کے بڑے بھائی شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے
کرائی۔ شیخ موسیٰ "آخر ایک عظیم خاندان کے فرد تھے، اس لئے انہوں نے خاندان کی تمام روایتوں کو زندہ رکھا اور
والہانہ محبت کے ساتھ چھوٹے بھائی کی نگہداشت کی۔



جوانی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بڑے بھائی حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ
سے سڑکی اجازت طلب کی۔

حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حیرت سے چھوٹے بھائی کی درخواست سنی۔ "سلیم! تم مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں جانا
چاہتے ہو؟"

"برادر معظم! میرا مقصد سفر سیر و سیاحت نہیں ہے۔" حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں
عرض کیا۔

"جب تمہارا مقصد سیر و سیاحت نہیں ہے تو پھر میرے ساتھ رہو۔" حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "کیا تم
نہیں جانتے کہ میں ایک لمحے کے لئے بھی تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا؟"

"مجھے اس کا احساس ہے۔" حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔
"تو پھر کچھ کرنے کی بات کر کے مجھے کیوں آزر دہہ کرتے ہو؟" حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت افسردہ لہجے میں

فرمایا۔

"مجھ پر بھی یہ منزل فراق بہت گراں گزرے گی، مگر میں حصول لذت یا لذت نفس کے لئے یہ سفر اختیار کرنا
نہیں چاہتا۔" حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔ "میں نے ظاہری علوم
حاصل کر لئے مگر ان کتابوں سے میری روح کی تشنگی زور نہیں ہوئی۔ ہر وقت ایک نامعلوم سی آگ سینے میں بھڑکتی
رہتی ہے۔ یہ سوزش، یہ خلش اور یہ اضطراب مجھے سوئے نہیں دیتے۔ میں ایک مردِ حق آگاہ کی خدمت میں حاضر ہو
کر اپنے دل کا درد بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ میری مسیحا کر سکے۔" آخر حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے
برادر بزرگ کے سامنے اپنے سفر کا مقصد بیان کر دیا۔

"تو پھر یہیں آس پاس اس مردِ حق کو تلاش کرو۔" حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے چھوٹے بھائی کو مشورہ دیا۔ "فتح پور
بکری میں بھی ایسے کئی بزرگ موجود ہیں جو تمہیں سیراب کر کے تمہاری تشنگی کو مٹا سکتے ہیں۔"

"میں نے ان تمام آستانوں پر حاضری دی، جہاں میرے درد کا مداوا ہو سکتا تھا۔" حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ
نے عرض کیا۔

"تو پھر کیا کہا ان بزرگوں نے؟" حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے برادرِ خورد سے پوچھا۔
"سب آستانوں سے ایک ہی جواب ملا۔" حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔ "ہر بزرگ نے

بس یہی کہا کہ تمہارے لئے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ تمہارا مقدر کسی اور سے وابستہ ہے۔"
حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے یہ انکشاف سن کر حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ بہت زیادہ پریشان نظر آنے

لگے۔ پھر طویل وقفہ سکوت کے بعد فرمایا۔ ”تمہارے سوا اس دنیا میں میرا کون ہے سلیم؟“
 ”برادر معظم! مجھے اس بات کا احساس ہے۔“ حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔
 ”تو پھر مجھے چھوڑ کر جانے کے لئے کیوں بھند ہو؟“ حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت رقت آمیز لہجہ میں بہت دنوں سے ایک صدائے غیب سن رہا ہوں کہ کب تک خواب غفلت میں پڑا رہے گا۔“
 سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔ ”اٹھ! اور اپنا راستہ اختیار کر۔ جسے تُو اپنی منزل سمجھ بیٹھا ہے، وہ منزل نہیں ہے۔
 کر! ورنہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

یہ سن کر حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ رونے لگے۔ ”سلیم! ہم مجھے محض اپنا بڑا بھائی سمجھتے ہو؟“
 ”آپ میرے بزرگ بھی ہیں۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔
 ”تو پھر غور سے سنو!“ شدت جذبات سے حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی آواز بے قابو ہو گئی۔ ”یہ حقیقت میرے اور تمہارے ماں باپ ایک ہی تھے، لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا بیٹا سمجھا ہے۔“
 ”مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ جس شفقت و محبت کا مظاہرہ آپ نے فرمایا ہے، وہ ماں باپ کی ہے۔“
 حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ایک لفظ سے اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار ہو رہا تھا۔
 ”سلیم! تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں بے اولاد ہوں۔ مگر مجھے اپنے پروردگار سے اس محرومی کا کوئی غم نہیں۔
 اپنے بندوں کا حال وہی بہتر جانتا ہے۔“ حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ”اب میں اگر تم بھی چلے گئے تو میرے گھر کی دیرانیاں اور بڑھ جائیں گی۔“
 برادر بزرگ کی حالت دیکھ کر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ بھی آبدیدہ ہو گئے۔

کچھ دیر تک فضا سوگوار رہی۔ پھر جب ماحول کی آداسی کسی حد تک کم ہوئی تو حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔ ”برادر محترم! میں آپ کے درد سے واقف ہوں۔ پھر بھی انسان کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔ کون جانے، وہ کس وقت اپنے گناہگار بندوں کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش دے۔ جو حضرت زکریا السلام کا معبود ہے، وہی آپ کا بھی خالق ہے۔ اسے روز و شب کی ہر ساعت میں پکارتے رہیے۔ وہ میرے قلب کے اور ساری کائنات کے تصور سے زیادہ قدرت والا ہے۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے بھائی کی طرح اپنے بھائی کے لئے ایک پیغمبر جلیل حضرت زکریا علیہ السلام کا حوالہ پیش کیا تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام بھی یہی تھے۔ اپنی اسی محرومی سے نجات حاصل کرنے کے لئے آپ نصف شب کے سناٹوں میں اپنے خالق کو پکار رہے تھے۔ اس وقت حضرت زکریا علیہ السلام بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ طبی معیار کے مطابق انسان کی یہ عمر قابل نہیں ہوتی کہ وہ ایک بچے کا باپ بن سکے۔ مزید یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ محترمہ فطری طور پر نابالغ تھیں۔ مگر جب خَلّاقِ عالم نے اپنا فیصلہ نازل کرنا چاہا تو سارے طبعی قوانین دھڑے کے دھڑے رہ گئے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو فرزند کی بشارت دی اور شدید مایوسیوں کے عالم میں حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ جو خود بھی اپنے والد محترم کی طرح عظیم الشان پیغمبر تھے۔

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بڑے بھائی کو تسلی دینے کے لئے تاریخِ آدم کے اسی انوکھے واقعے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”سلیم! میں اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ مگر جب اپنے گناہوں پر نظر کرتا ہوں تو مجھے بہت ہراس ہے۔“ چھوٹے بھائی کی بات سن کر حضرت شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”میں عاجز بھی آپ کے لئے دعا کروں گا۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ میرا باپ آپ کو اپنے در پاک سے نامراد نہیں لوٹائے گا۔۔۔۔۔ مگر پھر بھی میں آپ سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا معاہدہ؟“ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے چونک کر پوچھا۔

”اگر حق تعالیٰ آپ کو فرزند کی دولت سے سرفراز کر دے تو پھر آپ مجھے سفر پر جانے سے نہیں روکیں گے۔“

حضرت شیخ سلیم رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔

”تمہاری جدائی کا غم تو کسی بھی حال میں کم نہیں ہو گا۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ایسا ہو گیا تو میں تمہیں فتح پور سیکری سے جانے کی اجازت دے دوں گا۔“

اس واقعے کے بعد حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ زیادہ تر مسجد میں قیام فرمانے لگے۔

”میں تیرا عاجز و ناتواں بندہ سلیم، بس تیرے در کا سوالی ہوں کہ تُو ہی میرا مغبود ہے۔ تُو ہی میرا سلطان اور تُو ہی میرا شہنشاہ۔ اپنے گداز گروں پر کرم فرما۔ ان کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی لالچ رکھ اور ان کے خالی دامنوں کو اپنی نیتوں اور رمتوں سے بھر دے۔ میں تیری طرف آنا چاہتا ہوں، مگر بڑے بھائی کی محرومیاں اور مجبوریاں دامن کش ہیں۔ اے میرے کریم! اپنے بندے کو اس کشمکش سے نجات دے اور مجھے اپنے دامن رحمت میں چھپالے کہ اس کے سامنے میری کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔“

اس وقت کے تمام طلبیوں کا متفق فیصلہ تھا کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ ”باپ نہیں بن سکیں گے۔ مگر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی گریہ و زاری نے اس تحریر کو دھو ڈالا جو عقل و ہوش کی بنیاد پر رقم کی گئی تھی۔ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی زماں کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔

ایک سال بعد خدا نے نسلِ فرید میں ایک اور فرد کا اضافہ کیا۔ شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی دعائیں قبول بارگاہ ہوئیں اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ ”ایک خوبصورت بیٹے کے باپ بن گئے۔ ان کی خوشی ناقابلِ بیان تھی۔ مگر ساتھ ہی دل میں ایک خلش بھی غمی، جس نے شیخ رحمۃ اللہ علیہ ”کاسکون چھین لیا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا انہیں دن رات دھڑکا لگا رہتا تھا۔ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن بڑے بھائی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دوبارہ سفر کی اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔

”خدا نے آپ کے گھر کے تکلیف وہ سناؤں کو اپنی قدرت سے دُور فرما دیا ہے۔ اس لئے خادم کو بھی خوش دلی کے ساتھ رخصت کی اجازت دیجئے۔“

شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے دل سے مجبور ہو کر اپنے وعدے کے خلاف چھوٹے بھائی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر آپ ہر بار یہی فرماتے رہے کہ میرا فرض مجھے پکار رہا ہے۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔ اور پھر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ بڑے بھائی کی دعاؤں کے سائے میں فتح پور سیکری سے رخصت ہو کر سر ہند تشریف لائے۔

یہاں حضرت مجدد الدین رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی شاگردی اختیار کی اور ظاہری علم کا جو سلسلہ ٹوٹ گیا تھا، اسے دوبارہ جوڑ لیا۔ آپ پیدائشی طور پر انتہائی ذہین انسان تھے، اس لئے مختصر سے عرصے میں سارے مراحل طے کر لئے۔ حضرت شیخ مجدد الدین رحمۃ اللہ علیہ آپ کی شاگردی پر ناز فرماتے تھے اور اکثر درس کے دوران جوشِ جذبات میں کہہ دیا کرتے تھے۔

”خدا نے اے عقلِ سلیم بخشی ہے۔ میرا یہ طالب علم بڑے کارنامے انجام دے گا۔“ استاد کی زبان سے یہ حوصلہ افزا کلمات سن کر آپ کی طلب علم میں مزید اضافہ ہو جاتا اور طویل راتیں اسی شوق و جستجو میں گزر جاتیں۔

حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ جب تک سر ہند میں قیام پذیر رہے۔ حضرت شیخ زین العابدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار

مبارک پر حاضری دیتے رہے۔ سرہند کے قریب بدالی نام کا ایک قصبہ ہے۔ اسی مقام پر مشہور بزرگ آرام فرما ہیں۔ حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ بطور خاص یہاں حاضر ہوتے اور گھنٹوں ریاضت میں مشغول رہتے رخصت ہونے لگتے تو اپنی فلاح کے لئے طویل دعائیں مانگتے۔ ایک رات آپ نے حضرت زین العابدین خواب میں دیکھا۔ فرما رہے تھے۔

”سلیم! تم خاندانِ چشت کا ایسا چراغ ہو، جس کی روشنی سے ایک دن سارا ہندوستان منور ہو جائے گا۔ شاہوں اور امیروں کی صحبت اختیار نہ کرنا۔ کہ ان کی قربت اہل دل کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ دنیا کی تیز ترین آندھیاں بھی نہیں بجھا سکتیں مگر جب اسے ہوائے نفسانی کا ہلکا سا جھوٹکا بھی چھو لیا ہے۔ تاریکی پھیل جاتی ہے۔“

یہ ایک روایت تھی، جسے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے آخری سانس تک اپنے ذہن میں تازہ رکھ کر دولت کے سائے سے بھی دور رہے۔



حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ سرہند سے اپنے مورث اعلیٰ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ زیارت کے لئے اجودھن (پاک پتن) تشریف لے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک اٹھارہ سال تھی۔ کر حضرت شیخ سلیم چشتی، حضرت بابا فرید کے سجادہ نشین شیخ ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی۔ حضرت شیخ ابراہیم نے نوجوان سالک کو بہت غور سے دیکھا اور پھر نہایت شفقت آمیز لہجہ میں ”شیخ زادے! تم ایک رات انتظار کرو۔ پھر جو کچھ غیب سے حاضر ہوگا، میں اسی کے مطابق عمل کروں گا۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی، حضرت شیخ ابراہیم کی گفتگو سن کر خاموش ہو گئے۔ مگر دلی طور پر آپ بہت زیادہ محنت تھے۔ وہ رات شدید کرب میں گزاری اور بار بار یہی سوچتے رہے کہ پتہ نہیں، تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ سعادت میسر بھی آتی ہے یا نہیں؟

اُسی رات حضرت شیخ ابراہیم نے خواب دیکھا، جس میں انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ کسی تال کے کنارے چشت کا خرقہ اور دیگر تبرکات، شیخ سلیم چشتی کے سپرد کر دیں۔

دوسرے دن نماز فجر کے بعد حضرت شیخ ابراہیم نے حضرت شیخ سلیم چشتی کو اپنے حجرۂ خاص میں طلب کیا۔ سینکڑوں افراد کے سامنے بیعت سے سرفراز فرمایا۔ پھر خرقہ خلافت اور دیگر تبرکات ایک نوجوان عارف کے کرتے ہوئے کہا۔ ”شیخ زادے! آپ کو خواجگانِ چشت کی یہ نیابت مبارک ہو۔“

یہ منظر دیکھ کر حضرت شیخ ابراہیم کے بعض مریدوں نے حسد کا مظاہرہ کیا۔ ”ایک ہم ہیں کہ طویل مدت سے مرشد کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔ ہمیں ریاضتوں اور مجاہدوں میں عمر گزر گئی، مگر اس سعادت سے محروم رہے۔ ایک شیخ سلیم ہیں کہ اس کو بچے میں نووارد ہیں مگر انہیں کسی مجاہدے کے بغیر یہاں آئے اور مل گیا۔“

اپنے مریدانِ خاص کی طنز آمیز گفتگو سن کر حضرت شیخ ابراہیم نے فرمایا۔ ”یہ تو مشیتِ الہی ہے کہ ولایت کا تخت و تاج مل جائے اور بوڑھوں کو خاکِ بیری کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے۔ میرے پاس میرے بزرگ امانت محفوظ تھی اور مجھے یہی حکم تھا کہ جب شیخ سلیم آئیں تو یہ امانت اُن کے سپرد کر دی جائے۔ میں نے اپنی فلاح کے احکام کی تعمیل کی ہے۔ اپنی طرف سے کسی جانب داری کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ اب اگر میرا

شیخ سلیم سے حد رکھتا ہے تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ اُس کے اس طرزِ عمل سے نہ آسمان کے فیصلے بدلیں گے اور نہ شیخ سلیم کے منصب و جاہ میں کوئی فرق آئے گا۔ وہ اقلیمِ معرفت کے تاجدار ہیں اور یہ بادشاہی روزِ ازل سے اُن کے مقدس لکھ دی گئی تھی۔“

بہرِ مہم کے ارشاداتِ گرامی سن کر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ آبدیدہ ہو گئے اور حضرت شیخ ابراہیمؒ کے ہاتھ کو بردہ دیتے ہوئے عرض کرنے لگے۔ ”جب آپ نے میرا ہاتھ اپنے مبارک ہاتھوں میں لیا ہے تو میری کسی کوتاہی سے غما ہو کہ یہ ہاتھ جھوڑ نہ دیجئے گا۔“

حضرت شیخ ابراہیمؒ کو اپنے مرید کا یہ انداز اس قدر پسند آیا کہ بے قرار ہو کر فرمانے لگے۔ ”شیخ زادے! اللہ تمہاری دُخیری کرے گا۔ اس کی ذات تمہارے لئے کافی ہے اور بس۔“



حضرت شیخ ابراہیمؒ سے بیعت کے بعد آپ بیت اللہ کی زیارت کے لئے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ راستے میں آپ زہد و ریاضت کی باتیں کرتے رہے۔ ”اے خدا! میں حاضر ہوں۔ اے خدا میں حاضر ہوں۔“ جب خانہ کعبہ پہنچے تو بے اختیار رو پڑے۔ پھر بچکیوں کے درمیان کہا۔ ”میں خوش نصیبوں کا خوش نصیب ہوں کہ تُو نے مجھے یہ سعادت بخشی۔ کون ہے جو تیری مرضی کے بغیر اس راہِ گزر پر قدم رکھے اور کس کی مجال ہے کہ تیرے حکم کے بغیر مسدود رہے اپنی پیاس بجھا سکے۔“ آپ نے گدازِ قلب کے ساتھ فریضہ حج ادا کیا اور پھر دربارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں درودِ سلام پیش کرنے کے لئے مدینہ منورہ کا رخ کیا۔

جیسے جیسے سردِ کوئین صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری آرام گاہ قریب آتی جاتی تھی، آپ کے جسم کی لرزش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وارفتگی شوق کا یہ عالم تھا کہ اس کے اظہار کے لئے دنیا کی تمام زبانوں کے الفاظ ناکافی ہیں۔“

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ دربارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاک کو اپنے چہرے پر ملتے ہوئے روضہ اقدس کے قریب پہنچے اور ایک سوختہ جاں کے لہجے میں سلام پیش کیا۔ پھر یہاں ایک طویل عرصہ تک آپ کا قیام رہا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس روحانی قربت سے آپ نے بے پناہ فیض حاصل کیا۔ پھر آپ زندہ درویشوں اور بزرگوں سے ملنے کے لئے شامِ تشریف لے گئے۔ بعد میں بصرہ اور خراسان کا سفر بھی اختیار کیا۔ بے شمار اہلِ نظر سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ قدم قدم پر دل و نگاہ کو علم کے نور سے روشن کیا۔



پہلے حج سے واپسی کے بعد حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان واپس آ کر فتح پور سیکری میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اس پہاڑی علاقے میں شیر، چیتے اور دوسرے جانور رہتے تھے۔ اس پہاڑ سے ”سنگِ تراش“ سرخ پتھر نکالا کرتے تھے اور انہیں اُمراءِ ہند کے ہاتھوں فروخت کر کے روزی حاصل کیا کرتے تھے۔ یہاں کا سرخ پتھر مشہور تھا، جو دُریوں اور امیروں کے مکانات میں استعمال ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ یہ سنگ تراش بہت ہوشیار تھے اور جنگی درندوں سے محفوظ رہ کر اپنا کام جاری رکھتے تھے..... لیکن پھر بھی کبھی کبھی نہ کوئی سنگ تراش، درندوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ جب ان لوگوں نے ایک ایسے غار میں جو درندوں کا مسکن تھا، ایک سیدھے مادے بزرگ کو سکھ دیکھا تو حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کرنے لگے۔

”بزرگ! اب کو معلوم ہے کہ جہاں آپ قیام پذیر ہیں، وہ جگہ خونخوار درندوں کا بسیرا ہے۔“

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے سنگ تراشوں کی طرف دیکھا، جو بہت زیادہ خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ ”اب

کیا کیا جائے کہ جو مقام درندوں کو پسند ہے، وہی جگہ اس فقیر کو بھی اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔
 ”شیخ! یہ مقام انسانی زندگی کے لئے بہت پرخطر ہے۔“ سنگ تراشوں نے دوبارہ لرزتی ہوئی زبانوں سے
 عرض کیا۔ ”اگر کوئی اجنبی یا بھولا بھٹکا ہوا مسافر ادھر آ جائے تو وہ سلامتی کے ساتھ اپنے گھر واپس نہیں آ سکتا
 کی خوراک بن جاتا ہے۔ ہم بھی بد قسمتی سے اپنے کئی ساتھیوں کو کھو چکے ہیں۔“
 ”تو پھر تم لوگ جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈالتے ہو؟“ حضرت شیخ سلیم الدین رحمہ اللہ
 فرمایا۔ ”تمہیں لازم ہے کہ یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ۔“

”ہم اپنے پیٹ سے مجبور ہیں۔“ سنگ تراشوں نے بیک زبان عرض کیا۔ ”اس پہاڑ سے برآمد ہونے والا
 پتھر ہی ہمارا ذریعہ روزگار ہے۔ اس لئے ہم جانوں پر کھیل کر اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ
 بھوکوں مرجائیں۔“

سنگ تراشوں کا خیال تھا کہ اس پہاڑ اور غار سے متعلق سنگین حقائق کا ذکر سن کر حضرت شیخ علیہ السلام
 چشتی رحمہ اللہ اپنا ارادہ بدل دس گے اور کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائیں گے۔ مگر اس وقت سنگ تراشوں کی جیت
 انتہا نہ رہی، جب حضرت شیخ نے نہایت پرسکون لہجے میں فرمایا۔

”کچھ بھی ہو، درویش کو تو یہی گوشہ عافیت پسند ہے۔ یہاں ہر طرف سکون ہی سکون ہے۔ اس پر کھانا
 عبادت و ریاضت کی لذت ہی کچھ اور ہے۔ تم میری وجہ سے پریشان نہ ہو اور اپنا کام اطمینان سے کرتے رہو۔
 سنگ تراشوں کی جماعت مایوس ہو کر چلی گئی۔ ہر شخص بزرگ کی اس ضد کو نادانی پر محمول کر رہا تھا۔
 خیال تھا کہ شام کے وقت جنگلی درندے اپنے مسکن کی طرف واپس لوٹیں گے اور ایک انسان کو اپنے
 کر..... اس سے آگے سنگ تراش کچھ اور نہیں سوچ سکتے تھے۔

دوسرے دن صبح سنگ تراشوں کی جماعت حسب معمول کام پر آئی اور بزرگ کی تلاش میں غار بگرد
 ہوئی۔ ان لوگوں کو پورا یقین تھا کہ اب تک حضرت شیخ سلیم چشتی رحمہ اللہ درندوں کی خوراک بن چکے ہوں گے
 جب مقامی سنگ تراش، غار کے نزدیک پہنچے تو یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔

حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمہ اللہ نماز میں مصروف تھے اور دوشیر کچھ فاصلے پر اس طرح ٹھلے ہوئے
 حضرت شیخ کی حفاظت کر رہے ہوں۔ شیروں نے سنگ تراشوں کی طرف بھی دیکھا مگر ان کی آنکھوں میں
 نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی پالتو جانور ہوں۔

پھر جب حضرت شیخ سلیم چشتی رحمہ اللہ نماز سے فارغ ہو گئے تو سنگ تراشوں نے آپ کے دست ہلاک
 دیتے ہوئے عرض کیا۔

”شیخ! ہم آپ کو پہچانے نہیں تھے۔ ہماری اس کوتاہی اور کم نظری کو معاف کر دیا جائے۔“
 حضرت شیخ سلیم چشتی رحمہ اللہ کا دست کرم، سنگ تراشوں کے سروں پر سایہ فگن ہو گیا۔ پھر حضور
 جماعت حضرت شیخ کے حلقہ عقیدت میں داخل ہو گئی۔ ان لوگوں نے پہاڑ کی چوٹی پر غار کے قریب چھوڑ
 کر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بنادی۔ اس مسجد کی دیواروں پر آیات قرآنی بڑے دلکش انداز میں نقش کی گئیں
 مسجد کی محرابوں پر سالِ تعمیر 945ھ کندہ ہے۔ یہ عبادت گاہ آج بھی ”مسجد سنگ تراشاں“ کے نام سے مشہور
 سنگ تراشوں نے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمہ اللہ کی اس کرامت کا ذکر مقامی لوگوں سے کیا۔ پھر آپ کی
 باتیں پورے آگرہ میں مشہور ہو گئیں۔ فتح پور بیکری کے گرد و نواح میں راجپوتوں کا ایک قبیلہ ”ملاکانے“ آباد

اس سرگرم قوم کو معلوم ہوا کہ پہاڑ کی چوٹی پر ایک ایسی بزرگ ہستی موجود ہے، جس کی دعاؤں سے ضرورت مندوں کی حاجت رواں ہوتی ہے اور گردشِ روز و شب کے ستارے ہوئے لوگ اپنی دلی مرادیں حاصل کرتے ہیں، تو وہ راہبوت اپنے اپنے اٹھنے ہوئے مسائل لے کر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ حضرت شیخ کی دعاؤں سے راجپوتوں کی مرادیں بر آئیں۔ پھر اس جنگجو اور بہادر قوم نے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی راجپوتیت کا اس قدر تاثر قبول کیا کہ ان کے پتھر دل پکھلنے لگے۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ اس سنگلاخ زمین میں توحید کا بج بھونٹا اور راجپوتوں کا پورا قبیلہ خدائے واحد پر ایمان لے آیا۔

یہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری کرامت تھی، جس کی وجہ سے دوسرے امراء بھی آپ کی طرف متوجہ ہونے لگے۔



یہ وہ زمانہ تھا کہ بہرام کا ایک جاگیردار، فرید خان افغان سیاست پر نمودار ہوا۔ پھر اس مرد جانناز نے منغل شہنشاہ نصیر الدین ہایوں سے پنجہ آزمائی کی اور مغلوں کو شکست فاش دے کر تختِ ہندوستان پر جلوہ افروز ہوا۔ ہمایوں فرار ہو کر ایران پہنچا اور شاہ ایران سے سیاسی پناہ حاصل کی۔ اسی فرار کے دوران صحرائے سندھ کے ایک مقام عمر کوٹ میں ہایوں کے یہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا، جو آگے چل کر تاریخِ ہندوستان میں جلال الدین اکبر کے نام سے مشہور ہوا۔ فرید خان نے ”شیر شاہ“ کا لقب اختیار کیا اور نہایت عدل و انصاف کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرنے لگا۔ شیر شاہ موری کو اس منصبِ عظیم تک پہنچانے میں اس کے قدیم مصاحب، خواص خان کی کوششوں کو بہت زیادہ دخل تھا۔ خواص خان 945ھ میں حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست گزار ہوا۔

”شیخ اپوری دنیا کے ہنگاموں میں ایک عمر بسر ہو گئی۔ اب عاقبت کی فکر دامن گیر ہے۔“

”ہر مسلمان کو سب سے پہلے عاقبت ہی کی فکر کرنی چاہئے۔“ خواص کی التجا کے جواب میں حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، مصائب بھی عارضی ہیں اور خوشیاں بھی عارضی..... مگر آخرت کی کوئی انتہائیں۔ اس کے کیف و نشاط بھی لامتناہی ہیں اور رنج و عذاب بھی لامحدود۔“

”میں اسی لئے تو حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ میری آخرت بخیر ہو جائے۔“ خواص خان نے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا۔

”میں تیری عاقبت کی سلامتی کے لئے دعا کروں گا۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”میں صرف دعاؤں کا طالب نہیں ہوں۔“ خواص خان نے عرض کیا۔ ”آج تک دنیا کے بادشاہوں کی غلامی کرا آباہوں۔ اب میری خواہش ہے کہ اس گردن میں آپ اپنا طوق غلامی پہنا دیں۔“

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد فرمایا۔ ”مگر یہ دنیا تجھے راس نہیں آئے گی۔ اہل ہوس بے عجب چالیں چلیں گے اور تجھے عجیب عجیب انداز میں آزار پہنچائیں گے۔“

”شیخ! میں ایک سپاہی ہوں۔ زندگی بھر اس جسمِ ناتواں پر زخم ہی کھائے ہیں۔“ خواص خان نہایت پُرسوز لہجے میں اپنے دل کا درد بیان کر رہا تھا۔ ”اگر میری قسمت میں مزید حادثات لکھے ہیں تو میں کسی نہ کسی طرح انہیں بھی برداشت کر لوں گا..... مگر آپ مجھے اپنے آستانہ کرم سے ناکام و نامراد نہ لوٹائیے گا۔“

خواص خان کے جذبات کی شدت دیکھ کر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر با آواز بلند فرمایا۔ ”آج سے تم میرے حلقہ ارادت میں شامل ہو۔ اللہ تم پر خواجگانِ چشت کی برکتیں نازل کرے اور

تمہاری عاقبت بخیر ہو۔“

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کے بعد خواص خان کی دنیا ہی بدل گئی۔ اگرچہ سیاست میں شریک تھا، لیکن اُس کا کردار دنیاوی آلودگیوں سے پاک ہو چکا تھا۔

ایک سیاست نے ایک نئی کروٹ لی۔ شیرشاہ سوری اور خواص خان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ ہند نے برگشتہ ہو کر اپنے معتمد خاص کو قید خانے میں ڈال دیا۔ پھر مجبوروں نے یہ خبر بھی دی کہ خواص خان رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہے اور اسے حضرت شیخ کی روحانی معاونت حاصل ہے۔ شیرشاہ سوری کے دن پورے ہوئے اس لئے حضرت شیخ پر بھی اس کا عتاب نازل ہوا۔ آخر بادشاہ کے حکم پر سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو گوالیار کے قید خانے کر دیا گیا۔

یہ ایک انتہائی ناخوشگوار واقعہ تھا۔ مگر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے جانناز صوفیاء کی رسم نبھائی اور دینی زبان پر لائے بغیر حوالہ زندان ہو گئے۔

چوڑ پر قبضہ کرنے کے بعد شیرشاہ، رتھنبور پہنچا۔ اس قلعے کو شیرشاہ نے اپنے بڑے لڑکے عادل خان میں دے دیا تھا۔ یہاں انتظامی امور مکمل کرنے کے بعد شیرشاہ، ہندوستان کے سب سے مضبوط قلعہ کا لنگر بڑھا۔ کالنگر کے مضافات میں پہنچ کر شیرشاہ نے یہاں کے راجہ کو اطاعت گزاری کا پیغام بھیجا، مگر راجہ انکار کر دیا اور اپنے قاصد کے ذریعے کہلا بھیجا کہ اب کالنگر کا فیصلہ جنگ ہی کرے گی۔ شیرشاہ نے قلعہ کا لیا۔

پھر چند روز بعد جنگ شروع ہو گئی۔ شیرشاہ کے سپاہی، بارود سے بھرے ہوئے ڈبوں میں آگ لگا کر قلعے کے اندر پھینک رہے تھے۔ اتفاق سے شیرشاہ اس مقام پر کھڑا تھا، جہاں بارود کے بہت سے ڈبے بدمستی سے ایک ڈبہ قلعے کی دیوار سے ٹکرا کر اُٹ گیا اور ڈبوں کے ڈھیر میں آ کر گرے۔ آٹا فانا بارود کے آگ لگ گئی۔ شیرشاہ اپنے مرشد خلیل خان صاحب ہندوستان کے مشہور دانشمند ملا نظام اور دیر خان ساتھ ساتھ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ فرمانروائے ہند سر سے پاؤں تک جل گیا تھا مگر اس کی جرأت و ہمت تھی۔ شیرشاہ اسی حالت میں مورچے تک پہنچا۔ کچھ دیر بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔ اُمراء کی صفوں میں لڑتے تھے۔ بعض سپہ سالار بھی بدحواس ہو گئے تھے۔ مگر جیسے ہی شیرشاہ کدھوش آتا، وہ با آواز بلند اپنے سپاہیوں کو کر کے کہتا۔

”قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ میں بس یہی منظر دیکھنے کے لئے زندہ ہوں۔“

پھر اپنے اُمراء کوئی ہدایات دے کر محاذ جنگ کی طرف روانہ کیا۔ ”تم میری فکر نہ کرو۔ میں اس دن زندہ مردوں گا، جب تک فتح میرا مقدر نہیں بن جاتی۔“

پھر ایسا ہی ہوا۔ شیرشاہ سوری نے اسی شام قلعہ فتح ہونے کی خبر سنی اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ برطانوی الاؤل 952ھ کا واقعہ ہے۔ شیرشاہ نے اپنے پانچ سالہ دور اقتدار میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیے۔ آثار آج بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کا عہد حکومت اتنا پُر امن تھا کہ اگر کوئی بڑھیا جنگل میں اٹھ کر اپنے سر ہانے رکھ کر سو جاتی تو اسے کسی نگہبان کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایک شاعر نے شیرشاہ کو اس طرح خوبیاں پیش کیا ہے۔

”شیرشاہ وہ تھا کہ جس کے ہیبت و جلال سے شیر اور بکری ایک جگہ پانی پیا کرتے تھے۔“

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ کچھ کم فہم لوگ شیر شاہ سوری کی موت کو حضرت شیخ سلیم الدین چشتیؒ کی بے ادبی قرار دیں گے نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں تاریخی حقیقت صرف اتنی ہے کہ شیر شاہ سوری نے سیاسی ہنگامہ بنانے کی نظر حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کو صرف نظر بند کر دیا تھا۔ اگر وہ اس مرد بزرگ کو کوئی جسمانی اذیت پہنچانے کا ارادہ کرتا تو قدرت نے شیر شاہ سے اس طرح انتقام لیا۔ یہ تو لوح محفوظ کا فیصلہ تھا کہ شیر شاہ بھڑکتے دھنوں کی نذر ہو گیا۔ اُس کی دردناک موت کو حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی نظر بندی کا نتیجہ قرار دینا، بالکل غلط ہے۔ شیر شاہ بذات خود ایک پرہیزگار حکمران تھا اور اس کے عدل و انصاف کی گونج تو رہتی دنیا تک رہی ہے۔ اس کے علاوہ شیر شاہ، بزرگان دین کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ حضرت شیخ چشتیؒ جیسے صوفی کے ساتھ گستاخانہ طرزِ عمل روا رکھتا۔ یہ محض ایک قیاس آرائی ہے۔ اور اگر ہم واضح الفاظ میں یہ شیر شاہ جیسے نیک اور عادل فرمانروا پر ایک تہمت ہے۔



جب شیر شاہ نے وفات پائی تو اس کا بڑا بیٹا اور ولی عہدِ سلطنت، عادل شاہ دُور دراز مقام پر قلعہ رتھنہ میں مقیم تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی جلال خان، دار الحکومت سے زیادہ قریب تھا۔ امراءِ سلطنت نے جلد بازی سے کام لیا اور جلال خان کو ”اسلام شاہ“ کا لقب دے کر تختِ ہندوستان پر بٹھا دیا۔ واضح رہے کہ اسلام شاہ کا لقب زیادہ شہرت نہ لایا۔ شیر شاہ کا چھوٹا بیٹا، جلال خان ”سلیم شاہ سوری“ کے نام سے مشہور ہوا۔

سلیم شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے بڑے بھائی، عادل خان کو ایک خط تحریر کیا۔

”مرد بزرگ! میرا یہ ارادہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ کی موجودگی میں ہندوستان کا اقتدار سنبھالوں۔ تاج و تخت کے منتظر آپ ہی ہیں۔ انتظامی سلسلہ بحال رکھنے کے لئے امراءِ سلطنت نے عارضی طور پر زمامِ حکومت برسرِ پردہ کر دی ہے۔ اگر آپ آگرہ تشریف لے آئیں تو میں تاج و تخت سے دستبردار ہو جاؤں گا۔“

عادل شاہ، چھوٹے بھائی کا خط پاتے ہی آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا اس وقت سلیم شاہ سوری، فتح پور سیکری میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی خانقاہ کے قریب ہی خیمہ زن تھا۔

آز چدر دز بعد دونوں بھائی سیکری کے مقام پر آپس میں ملے۔ پھر دونوں نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضری دی۔ حضرت شیخ نے عادل شاہ اور سلیم شاہ سوری کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

”یہ اللہ کا نظام ہے کہ وہ مخلوق کی خدمت گزاری کے لئے اپنے کسی ایک بندے کو منتخب کرتا ہے۔ پھر اس منتخب بندے پر ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے خالق کی بخشی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور اس کی مخلوق کے حق کو کاٹا نہ رکھے۔ اگر تم دونوں بھائی باہمی اتحاد و خلوص کے ساتھ حکومت کرو گے تو یہ ہندوستان کی رعایا کے حق میں ایک بہتر ہوگا اور خود تم لوگ بھی پُر سکون زندگی گزار سکو گے۔“

عادل شاہ اور سلیم شاہ سوری، حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا شکریہ ادا کر کے واپس چلے گئے۔ حسب وعدہ سلیم شاہ سوری تاج و تخت سے دستبردار ہو گیا۔ مگر عادل شاہ سوری نے چھوٹے بھائی کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ آخر سلیم شاہ نے عادل شاہ کی مرضی کے مطابق اسے بیانیہ کا صوبیدار بنا دیا۔ بیانیہ، آگرہ کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ عادل شاہ کے جاتے ہی سلیم شاہ سوری کے دل میں بڑے بھائی کے خلاف دوسوہ پیدا ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ عادل شاہ کوئی چال چل رہا ہے، ورنہ پورے ملک کا اقتدار حاصل کرنے کے بجائے ایک چھوٹی سی جاگیر، بیانیہ پر کیوں قنات کر لیتا۔ آخر اسی ذہنی خلفشار میں سلیم شاہ سوری نے بڑے بھائی کے خلاف ایک سنگین فیصلہ کیا۔ اپنے

مصاحب خاص، غازی محلہ کو سونے کی بیڑیاں دیتے ہوئے یہ فرمان جاری کر دیا۔

”جس قدر جلد ممکن ہو، عادل شاہ کو بیڑیاں پہنا کر دربار شاہی میں حاضر کر دیا جائے۔“

غازی محلہ جیسے ہی فرمان شاہی لے کر آگرہ سے نکلا، عادل شاہ کے جاسوسوں نے اسے خبردار ارادے نیک نہیں ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی عادل شاہ نہایت عجلت میں بیانا سے نکل کر خواص خان کے پہنچا اور سلیم شاہ سوری کی بدعہدی سے اسے آگاہ کیا۔ نتیجتاً عادل شاہ اور خواص خان اپنے اپنے لنگر کے ساتھ آگرے کی طرف بڑھے۔ ابھی غازی محلہ راستے ہی میں تھا کہ اسے گرفتار کر کے سونے کی گنگیں، جو سلیم شاہ سوری نے اپنے بڑے بھائی عادل شاہ کے لئے بھیجی تھیں۔

اسی دوران حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید قاضی غیاث الدین آپ کی خدمت میں عرض کرنے لگے۔

”شیخ محترم! میری عادل شاہ سوری سے رسم دراہ ہے۔ میں اس کے دربار میں حاضر ہو کر کئی نامرز چاہتا ہوں۔“

”اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ لیکن میں تمہیں بادشاہوں سے رسم دراہ رکھنے کا مشورہ نہیں دیتا۔“

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”میں نے اپنے بزرگوں سے یہی سنا ہے کہ بادشاہوں کی قربت نہیں، ہلاکت ہے۔“

قاضی غیاث الدین، حضرت شیخ کے فرمودات کی گہرائی کو نہ سمجھ سکے اور عادل شاہ سوری کے دربار کے لئے بعد رہے۔ ”شیخ محترم! اگر آپ مجھے اپنا گھوڑا عنایت کر دیں تو یہ بہترین تحفہ ہوگا۔“ عادل شاہ کا بہت شوق ہے۔

اپنے مرید قاضی غیاث الدین کی بات سن کر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کچھ دیر تک غور کرتے رہے۔ قاضی غیاث الدین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں تمہیں اپنا گھوڑا صرف اس شرط پر دے سکتا ہوں کہ شاہ اس پر سواری کرے۔ اگر کوئی دوسرا شخص میرے گھوڑے کو اپنے استعمال میں لائے گا تو یہ بات مال میں بہتر نہیں ہوگی۔“

الغرض قاضی غیاث الدین اپنے پیر و مرشد کا عراقی گھوڑا لے کر عادل شاہ سوری کی خدمت میں خوبصورت تحفہ پیش کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”حضرت شیخ کا فرمان ہے کہ یہ گھوڑا صرف آپ کے استعمال کے لئے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عادل شاہ اسے آپ کے لئے بہت بابرکت ثابت ہوگی۔“

عادل شاہ سوری، گھوڑے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا۔ ”واقعی، یہ بے مثال گھوڑا ہے۔ ابے ہالہ! یہ دیکھنے میں آتے ہیں۔“

اتفاق سے وہاں عادل شاہ سوری کا ایک مصاحب خاص بھی موجود تھا۔ اسے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ عراقی گھوڑا بہت پسند آیا۔ مصاحب خاص نے عادل شاہ سوری سے عرض کیا۔ ”اگر حضور اجازت دلیں تو میں اس گھوڑے پر سواری کر لوں؟“

”نہیں۔ حضرت شیخ نے یہ میرے استعمال کے لئے بھیجا ہے۔“ عادل شاہ سوری نے انکار کر دیا۔

وہ مصاحب بہت منہ چڑھا تھا۔ کہنے لگا۔ ”حضور! میں اسے اپنے مستقل استعمال کے لئے نہیں آگیا۔“

بڑکے حضرت شیخ کی نشانی ہے، اس لئے میں بھی تھوڑی بہت برکات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“
عادل شاہ سوری اپنے مصاحب خاص کی بات کو نہ ٹال سکا اور اس نے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا گھوڑا
خاصی طور پر اپنے مصاحب کو دے دیا۔

قاضی غیاث الدین نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ عادل شاہ سوری کو سمجھانا چاہتے تھے، مگر صورت حال
کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خاموش رہے۔ عادل شاہ سوری کے مصاحب خاص نے عراقی گھوڑے پر سواری
کی۔ مگر کچھ دیر بعد واپس آ کر بولا۔ ”حضور! میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا برق رفتار گھوڑا نہیں دیکھا۔ ایسا لگ
رہا تھا کہ جیسے یہ ہوا کے دوش پر تیر رہا ہے۔“

عادل شاہ سوری، گھوڑے کی تعریف سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے قاضی غیاث الدین کے سامنے حضرت شیخ
سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عنایت خاص کا شکریہ ادا کیا۔

کچھ دن بعد قاضی غیاث الدین، سیکری واپس چلے آئے اور حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو
کر یہ واقعہ بیان کر دیا۔

قاضی غیاث الدین کی گفتگو سن کر حضرت شیخ سلیم چشتی کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔

”انسوس! عادل شاہ نے میرے تحفے کی قدر نہیں کی۔“

قاضی غیاث الدین، حضرت شیخ کا بدلا ہوا لہجہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

”میری ہدایت کے باوجود اس نے اپنے مصاحب کو گھوڑے پر سواری کرنے دی۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ
ایک خاص عالم جذب میں بول رہے تھے۔ ”عادل شاہ نے اس گھوڑے کو کیا سمجھا تھا؟“
حضرت شیخ کا رنگ جلال دیکھ کر قاضی غیاث الدین لرزنے لگے۔ ”شیخ محترم! میں نے عادل شاہ سوری کو
سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس میں میری کوئی تقصیر نہیں ہے۔“

”تمہارے سمجھانے سے کیا ہوتا ہے؟ لوہ محفوظ پر تو کچھ اور ہی لکھا ہے۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ
فرمایا۔ ”اگر وہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھ جاتا تو ہندوستان کا تخت اس کے قدموں کے نیچے ہوتا..... مگر کوئی شخص اپنی
نہرے سے کس طرح جنگ کر سکتا ہے؟ عادل شاہ سوری بھی جنگ ہار گیا اور اقتدار سے محروم ہو گیا۔“

حضرت شیخ کے فرمودات سن کر قاضی غیاث الدین بہت آزرده ہوئے۔ مگر وقت انہوں سے نکل چکا تھا۔
عادل شاہ سوری اپنا لشکر لے کر سلیم شاہ سوری سے جنگ کرنے کے لئے آگرے کی طرف بڑھا۔ جب سلیم شاہ
نے یہ خبر سنی تو اس نے اپنی فوج کو جمع کر کے پُر جوش انداز میں خطاب کیا۔ مگر بد قسمتی سے اس کے سپاہیوں کی
اکثریت عادل شاہ سوری سے جا ملی۔ یہ بڑی سنگین صورت حال تھی۔ سلیم شاہ بدحواسی کے عالم میں قلعہ بند ہو گیا۔
عادل شاہ سوری کو اپنی فتح کا یقین ہو چلا تھا۔ سلیم شاہ سوری کی مایوسی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر اس کے ایک
امیر مٹی خان نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

”آپ حضرت شیخ سلیم چشتی سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟ سنا ہے کہ سینکڑوں انسان حضرت شیخ کی دعاؤں
سے نفع یاب ہوتے ہیں۔“ مٹی خان کی بات سن کر سلیم شاہ سوری کو یوں محسوس ہوا، جیسے گہری تاریکی میں کسی
دستِ نب نے فانوس روشن کر دیا ہو۔ اس نے فوراً ہی اپنے ایک قاصد کو حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں
روانہ کر دیا۔

حضرت شیخ نے قاصد کی زبانی پورا واقعہ اور سلیم شاہ سوری کی درخواست سن کر نہایت پُر جوش لہجے میں فرمایا۔

”انشاء اللہ! اب وقت اس کے ساتھ ہے۔ سلیم شاہ سے کہو کہ پورے اطمینان کے ساتھ قلعے سے باہر آئے۔ چاہا تو باقی لشکر اس سے آ ملے گا۔“

سلیم شاہ سوری نے کچھ پس و پیش کے بغیر حضرت شیخ سلیم چشتی کے حکم کی تعمیل کی۔ قلعے کا دروازہ کھلا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سلیم شاہ سوری گھوڑے پر سوار ہو کر شمشیر لہراتا ہوا قلعے سے باہر نکلا۔ عادل شاہ جاسوسوں نے اسے خبر دی کہ سلیم شاہ سوری مقابلے کے لئے میدان جنگ کی طرف آ رہا ہے۔ پھر جیسے ہی شاہ سوری کے باغی سپاہیوں تک پہنچی، وہ عادل شاہ کے لشکر سے الگ ہو کر اپنے بادشاہ سے جا ملے۔ پھر ایک ساقی ہوا اور کچھ دیر بعد ہی عادل شاہ میدان جنگ سے فرار ہو کر پٹنہ کی طرف چلا گیا۔ تمام معتبر تاریخ بات پر متفق ہیں کہ اگر وہ فرار ہونے کے بعد عادل شاہ سوری کا کوئی پیہ نہیں چلا، اس نے گمائی کی حالت کیسی زندگی بسر کی؟ کب مرا اور کہاں دفن ہوا؟

یہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں کا اثر تھا کہ سلیم شاہ سوری نے کشت و خون کے بغیر تاج شاہی پر سجایا اور نو سال تک کامیابی کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرتا رہا۔



ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مشہور سردار خواص خان، حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا مرید تھا۔ اقتدار کی خواہش نے عادل شاہ سوری کا ساتھ دیا تھا۔ پھر جب عادل شاہ سوری شکست کھا کر فرار ہو گیا تو خواص نے بھی شہری علاقہ چھوڑ دیا اور جنگوں میں چھپ کر زندگی کے باقی دن گزارنے لگا۔ تاج و تخت حاصل کرنے بعد سلیم شاہ سوری کا یہ مزاج بن گیا تھا کہ وہ جب بھی کسی امیر کو طاقت پزیر دیکھتا تو اسے گرفتار کر کے قتل کر دیتا یا پھر قتل کر دیتا۔ بادشاہ کے اسی ظالمانہ سلوک کی وجہ سے خواص خان کئی سال تک روپوش رہا۔ پھر ایک اس در بدری کی زندگی سے تنگ آ گیا اور 959 ہجری میں ”سنبل“ پہنچا۔ اس علاقے کا حاکم امیر تاج خان خواص خان نے امیر تاج خان سے سیاسی پناہ کی درخواست کی، جو قبول کر لی گئی۔ پھر ایک دن امیر تاج خان دھوکے سے خواص خان کو قتل کر دیا۔

خواص کے قتل سے لوگوں میں شدید بے چینی پھیل گئی۔ اس علاقے کی اکثریت، خواص خان کو بہت پائیدار آخر لوگوں کا ایک بڑا بھوم، خواص خان کا جنازہ لے کر دہلی پہنچا اور اسے اس تاریخی شہر میں دفن کر دیا گیا۔ مشہور روایت ہے کہ ہندوستان کے لوگ خواص خان کو دلی سمجھتے تھے۔ جب یہ خبر عام ہوئی تو اکثر لوگ دے الفاظ میں کہا۔ ”خواص خان دلی کا قتل ایک دن رنگ لا کر رہے گا۔“

مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ بھی اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔ ”خواص خان کی موت، شاہ سوری کے لئے انتہائی نامبارک ثابت ہوئی۔ خواص خان 959 ہجری کے آخر میں قتل ہوا تھا اور پھر چند سال بعد 960 ہجری کے شروع میں سلیم شاہ سوری کی پشت میں ایک ذیل (پھوڑا) نکلا۔ بادشاہ نے درد کی شدت سے چین ہو کر فصد کھلوائی۔ اس کے بعد سلیم شاہ سوری محل سے باہر نکلا۔ اس وقت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا ہوتے ہی سلیم شاہ زمین پر گر پڑا۔ خدمت گار اسے اٹھا کر دوبارہ محل میں لے گئے۔ تمام شاہی طبیب، سلیم شاہ کے گرد جمع ہو گئے مگر کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بادشاہ، دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مؤرخ قاسم فرشتہ نے جس بنیاد پر خواص خان کو دلی تحریر کیا ہے، وہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی زینت ہے۔ نتیجہ تھا۔ عادل شاہ سوری نے حضرت شیخ کے گھوڑے کی قدر نہ کی، اقتدار سے محروم ہو گیا۔ سلیم شاہ سوری نے فرار

مانا کہوتا، نتیجتاً خود بھی دردناک بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ یہی قدرت کے راز ہیں۔



وقت کروٹیں بدلتا رہا۔ سوری افغانوں کی حکومت ختم ہو گئی اور مغل شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں اپنے کھوئے ہوئے فن پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ پھر ایک دن ہمایوں بھی لقمہ اجل بن گیا اور اس کی جگہ جلال الدین اکبر تخت نشین ہوا۔ پھر ایک ہی دن بقال کا فتنہ کھڑا ہوا۔ اسی ہنگامہ خیز دور میں حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے ہجرت کا ارادہ کیا۔ اس واقعے سے پہلے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے پایادہ چل کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر 23 حج کئے۔ اب کی بار حضرت شیخ کا ارادہ تھا کہ بحری جہاز کے ذریعے سفر کریں اور مستقل طور پر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لیں۔ بالآخر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے چوبیسواں حج کیا اور پھر دیار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے۔

پھر ایک دن درود و سلام پڑھتے ہوئے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا۔ ”آقا! میری خواہش ہے کہ مجھے اسی شہر مقدس میں موت آئے اور پھر میں اسی ارض پاک میں پیوندِ خاک ہو جاؤں۔“

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ گریہ و زاری کے ساتھ دن میں کئی بار یہی دعا کرتے۔ آخر ایک رات آپ نے درود کو نین صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

”سلیم! تم ہندوستان واپس جاؤ۔ تمہارے لئے یہی مقرر کیا گیا ہے کہ تم دیارِ ہند میں دین اسلام کی تبلیغ کرو اور ملک ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلاؤ۔ انشاء اللہ! تمہاری خواہش پوری ہوگی اور تمہاری قبر کے لئے اُسی زمین کو مدینے کی زمین بنا دیا جائے گا۔“

جب حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھ کھلی تو آپ بے حد مسرور ہوئے۔ سرور کو نین صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر آخری بار درود و سلام پیش کیا اور ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے۔

واپسی میں آپ امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے اور روحانی فیوض و برکات حاصل کیے۔

اس کے بعد حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر ماضی دی۔ اس وقت کے سجادہ نشین آپ کے ساتھ بڑی قدر و منزلت سے پیش آئے۔ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے مہمانِ خصوصی کے طور پر یہاں کئی دن گزارے۔

روایت ہے کہ ایک رات مزارِ مبارک کے سجادہ نشین نے حضرت غوث اعظم کو خواب میں دیکھا۔ آپ فرما رہے تھے۔

”ہمارا فرقہ اور خلافت نامہ، سلیم ہندی کو مرحمت کر دو۔“

جب نمازِ فجر سے پہلے مزارِ مبارک کے سجادہ نشین کی آنکھ کھلی تو وہ بہت حیران ہوئے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ اس بابائے کے بزرگ ہیں۔ الغرض سجادہ نشین نے حضرت غوث اعظم کے حکم کے مطابق فرقہ مبارک، حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو پیش کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑا واقعہ تھا جسے بغداد کے لوگوں نے شدید

حیرت کے ساتھ سنا۔ پھر بہت سے لوگ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے دیدار کے لئے حاضر ہوئے۔

بغداد کے کچھ مقتدر افراد نے سجادہ نشین سے سوال کیا۔ ”حضرت غوث اعظم کا فرقہ مبارک ایک ایسے شخص کو کیوں دیا گیا، جسے ہم جانتے تک نہیں۔ یہاں تو روزانہ سینکڑوں لوگ آتے ہیں، مگر آج تک اس طرح کسی بزرگ

کی تائین نہیں کی گئی۔“

مزار مبارک کے سجادہ نشین نے بغداد کے معزز و مقتدر لوگوں کی شکایت بخورسنی، پھر نہایت عاجزانہ فرمایا۔

”میں تو آستانہ عالیہ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ ہر حال میں سرکار کے حکم کا پابند۔ سیدنا حضرت نوح علیہ السلام تھا کہ خرقہ مبارک، شیخ سلیم ہندیؒ کے حوالے کر دیا جائے۔“
حضرت غوث اعظمؒ کے معتقدین نے یہ سن کر حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے سامنے سر جھکا دیا۔ پھر اُمرائے بغداد نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی پر تکلف ضیافتیں کیں۔ مگر حضرت شیخؒ نے کہیں ایک کمرہ کہیں پانی کا ایک گھونٹ پی کر میزبانوں کے دل رکھے۔ پھر ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
”فقیر کو لذت کام و دہن سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ شرکت تو محض اس لئے تھی کہ آپ درویش کو غمزدگی میں نے جس شخص کے یہاں پانی کا ایک گھونٹ پیا ہے، وہ اپنی جگہ یہی سمجھے کہ میں اس کی دعوت طہارت شریک رہا ہوں۔“

اہل بغداد کو حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا یہ اندازِ قناعت بہت پسند آیا۔ مقامی لوگ چاہتے تھے کہ سلیم چشتیؒ مزید کچھ دن بغداد میں قیام کریں اور اہل طلب کو اپنی روحانی صحبتوں سے فیض یاب ہوا دیں۔ مگر حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے یہ کہہ کر ان لوگوں کو خاموش کر دیا۔

”صاحبانِ دل! آپ حضرات کا یہ عقیدت مندانہ سلوک مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہر قدم پر آپ کی روک رہی ہیں۔ مگر کیا کروں؟ میں تو ایک مسافر ہوں، جسے طویل سفر پر پیش ہے۔ اگر آپ حضرات ساتھ مجھے اجازت دے دیں تو میرا یہ سفر آسان ہو جائے گا۔“

حضرت شیخ کی گفتگو سن کر اہل بغداد مجبور ہو گئے۔ پھر جب حضرت شیخ اس مبارک سرزمین سے روانہ ہوئے آپ کے جسم پر حضرت سیدنا غوث اعظمؒ کا خرقہ مبارک جگمگا رہا تھا۔

روایت ہے کہ بدویوں کی بھی ایک بڑی جماعت حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بے پناہ رکتی تھی۔ جب ان لوگوں نے سنا کہ حضرت غوث اعظمؒ کا خرقہ مبارک ہندوستان جا رہا ہے تو در سب شدید اضطراب میں مبتلا ہو گئے۔ بدویوں نے خانقاہ کے احترام میں تو کچھ نہیں کہا، مگر وہ دل ہی دل سے تاب کھاتے رہے۔ (بدویوں سے مراد عرب کا وہ قبیلہ ہے، جو تہذیب کی شائستگی سے نا آشنا تھا اور چال بازی کر رہا تھا۔)

مختصر یہ کہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے آخری بار حضرت غوث اعظمؒ کی روح کو ایصالِ ثواب صوفیائے بغداد سے ملاقات کر کے ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے۔ بدویوں کی جماعت بڑی خاموشی کے ساتھ آپ کے تعاقب میں تھی۔ پھر جب حضرت شیخ سلیم چشتیؒ بغداد کے مضافات سے لنگر زاری کے مقام پر وہ تمام بدوی سامنے آ گئے۔ اس وقت حضرت شیخ سلیم چشتیؒ حضرت سیدنا غوث اعظمؒ مبارک زیب تن کئے ہوئے تھے۔ بدویوں کے چہروں پر انتہائی ناخوشگوار کاریک نمایاں تھا۔

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے بدویوں کی طرف دیکھا اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”کیا آپ کو مجھ فقیر سے کوئی کام ہے؟“

”بہت ضروری کام۔“ ایک بدوی نے اونچی آواز میں کہا۔

”اگر میں اس لائق ہوا تو انشاء اللہ! تمہارا وہ کام ضرور کروں گا۔“ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے

گناہی کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

”اس کام میں زیادہ محنت اور کوشش کی ضرورت نہیں ہے۔“ دوسرے بدوی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”ایک انسان کو اپنے جسم سے لباس اتارنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔“

”کیا تم میں سے کسی شخص کو لباس کی ضرورت ہے؟“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے بدویوں سے پوچھا۔
 ”یہ ہمارے روحانی پیشوا کا لباس ہے۔“ ایک بدوی نے حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے خرقہ مبارک کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تو مجھے حضرت غوث اعظم کی بارگاہِ کرم سے عنایت ہوا ہے۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے خرقہ مبارک کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

”اسی لباس کو تو دیکھ کر ہم لوگ جیتے ہیں۔“ بدویوں نے بیک زبان کہا۔ ”ہم حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے کسی نمک کو ہذا دے باہر نہیں جانے دیں گے۔“

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے بدویوں کو لاکھ سمجھایا کہ یہ خرقہ مبارک حضرت غوث اعظم کا عطیہ ہے مگر وہ ان بڑے لوگ آپ کی ایک بات کو بھی سمجھنے سے قاصر رہے اور تنبیہ کے انداز میں کہتے رہے۔

”سلامتی اسی میں ہے کہ اس خرقے کو اتار کر ہمارے حوالے کر دو۔“
 آخر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”اگر تمہیں خرقہ مبارک میرے جسم پر نظر آئے تو بے شک اتار لو۔ میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کروں گا۔“

یہ سن کر بدویوں نے ایک زوردار نعرہ مارا کہ ان کی مراد پوری ہو گئی۔ پھر کچھ بدوی، حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے جسم سے خرقہ مبارک اتارنے کے لئے آگے بڑھے، مگر دوسرے ہی لمحے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے جسم پر حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا خرقہ مبارک موجود نہیں تھا بلکہ حضرت شیخ کا اپنا لباس نظر آ رہا تھا۔ تمام بدوی بار بار اپنی آنکھیں ملنے لگے مگر یہ نظروں کا دھوکا نہیں تھا۔ واقعاً حضرت غوث اعظم کا خرقہ مبارک موجود نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے خرقہ مبارک حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے جسم مبارک میں جذب ہو گیا ہو۔ تمام بدویوں کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر تھیں اور جسم پتھر کے مجسموں کی طرح ماکت تھے۔

”میرے بھائیو! اب تو مجھے جانے دو۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے بدویوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
 حضرت شیخ کی آواز سن کر بدویوں کا سکوت ٹوٹا اور پھر انہیں احساس ہوا کہ وہ جس شخص سے جھگڑا کر رہے ہیں، وہ کوئی عام انسان نہیں ہے۔

”ہزاروں انسانوں نے دیکھا کہ حضرت غوث اعظم کا خرقہ مبارک آپ کے جسم پر موجود ہے، پھر وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا؟“

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں نے تو تمہیں اجازت دے دی تھی کہ میرے جسم سے خرقہ مبارک اتار لو۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

”اے کوئی نہیں اتار سکتا۔ اسے کوئی نہیں اتار سکتا۔“ بدوی شدت جذبات میں چیخ رہے تھے۔

”تو پھر مجھے جانے دو۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔
 تمام بدوی گریہ و زاری کرنے لگے۔ ”شیخ! ہم آپ کو پہچانے نہیں تھے۔ خدا کے لئے ہمیں غوث اعظم کے خرقہ

مبارک کا آخری بار دیدار کرا دو۔“

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں کی یہ درخواست قبول کر لی۔ پھر بدویوں نے حیران ہو کر دیکھا کہ شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے جسم مبارک پر خرقہ مبارک کی داہنی آستین نمودار ہوئی، پھر بائیں آستین..... ہرگز نہیں پھر دامن..... یہاں تک کہ پورا خرقہ مبارک ظاہر ہو گیا۔

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کرامت دیکھ کر تمام بدوی زمین پر گر پڑے۔ حضرت شیخ نے انہیں اٹھایا۔

”اب آپ کچھ دن ہمارے مہمان رہیں گے۔“ بدوی جوشِ عقیدت سے سرشار ہو کر چیخ رہے تھے۔

آخر حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ مجبور ہو گئے اور آپ نے بدویوں کی میزبانی قبول کر لی۔ پھر دوبارہ حضرت شیخ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئی۔ تقریباً ایک ماہ بعد حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان روانہ ہوئے۔ ہندوستان پہنچ کر حضرت شیخ سب سے پہلے اپنے مورث اعلیٰ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ مبارک پر حاضر ہوئے۔ آپ نے حضرت غوث اعظم کا خرقہ مبارک حضرت بابا صاحب کے بنادے ہوئے فیض اللہ صاحب کے سپرد کر دیا۔ یہ خرقہ مبارک سفید صوف کا بنا ہوا ہے اور آج تک بطور امانت محفوظ ہے۔



حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو ظاہری علوم میں بھی کمال حاصل تھا اور آپ روحانی اعتبار سے بھی مہربان کے مالک تھے۔ آپ کا کوئی عمل بھی شریعت کے خلاف نہیں تھا۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر خود بھی عمل کرتے۔ دوسروں کو بھی تلقین فرماتے۔ اگر کسی جگہ شرعی احکام کی خلاف ورزی دیکھتے تو انتہائی جرأت کے ساتھ انہیں انظہار کر دیتے۔ آپ کی پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ انتہائی سادہ غذا استعمال کرتے اور رمضان المبارک کے تسلسل کے ساتھ روزے رکھتے۔ کیسی ہی سردی ہو، روزانہ ٹھنڈے پانی سے غسل فرماتے۔ ہمیشہ ایک جگہ پہنتے۔ یہاں تک کہ جاڑے کے موسم میں بھی جسم مبارک پر باریک گرتہ نظر آتا۔ جب آپ خانقاہ میں حاضر ہوتے تو ہر شخص پر گہری نگاہ رکھتے۔ کسی کو سخت الفاظ میں تنبیہ کرتے اور کسی کو محبت آمیز لہجے میں نصیحت فرماتے۔ آپ راہِ سلوک کے مسافر تھے۔ اس لئے ساری زندگی شانِ جمالی میں بسر کی۔ جذب کی کیفیت بہت کم ہوتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آپ سے شاذ و نادر ہی کرامت کا ظہور ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی جو واقعات آپ سے منسوب ہیں، ان میں اہل نظر کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

ایک دن مجلسِ وعظ آراستہ تھی۔ آپ زور و شور سے تقریر فرما رہے تھے۔ ہزاروں عقیدت مند سر جھکا کر خدمت تھے۔ کسی میں بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی طاقت نہ تھی۔ یکایک آپ نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

”لوگو! زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ اپنے اپنے مکانوں کو کشادہ کر لو۔ فقیر کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ لوگوں کہیں جگہ نہیں ملے گی۔“

حاضرین آپ کے طرزِ کلام پر چونک پڑے۔ آج باتوں کا انداز ہی جداگانہ تھا۔ آپ نے دوبارہ فرمایا۔

”اپنے گھروں کے صحن وسیع کر لو، زمین سمٹ رہی ہے۔ شہر کے باشندوں سے کہہ دو۔ وقت گزر رہا ہے۔ افسوس ملتے رہو گے۔ جلدی کرو۔“

وعظ ختم ہو گیا۔ لوگ شدید حیرت کے عالم میں اٹھ کر چلے گئے۔ کسی نے آپ کی تقریر کو معرفتِ کامل حاصل دیا، کسی نے سیاسی انقلاب کی پیش گوئی سمجھا۔ غرض ہر شخص نے اپنے ذہن کی رسائی کی مطابق آپ کی باتوں پر

مفہوم افذاک۔ بہت دن تک شہر میں اسی تقریر کے چرچے ہوتے رہے۔ دنیا داروں نے ہدیان سمجھ کر فقیر کی باتوں کا مذاق اڑایا۔ کچھ لوگوں نے آپ کے الفاظ کی مادی توجیہ کرتے ہوئے اپنے مکانات کا رقبہ بڑھانا شروع کر دیا۔ بشرِ افزا اس تقریر کو یاد نہ رکھ سکے اور پھر آہستہ آہستہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کی بازگشت بھی ختم ہو گئی۔ چند سال بعد فتح پور سیکری میں شاہی عمارات کی تعمیر کا سلسلہ اس قدر تیزی سے شروع ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر سرکاری دفاتر اور رہائش گاہوں سے بھر گیا۔ اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ گونجنے لگے۔

”اپنے اپنے مکانوں کو کشادہ کر لو۔ زمین تک ہوتی جا رہی ہے۔“

اب عام انسان بھی درویش خدا مست کے الفاظ کا مفہوم سمجھ رہا تھا، مگر مہلت ختم ہو چکی تھی اور وقت بہت دُور جا چکا تھا۔



حضرت شیخ سلیم رحمۃ اللہ علیہ کی اور بھی کئی کرامات مشہور ہیں لیکن ان کی دو کرامتیں ایسی ہیں کہ جنہیں دنیا کا بڑے سے بڑا مادہ پرست بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر اپنی فطری جہالت اور درباریوں کی بے جا خوشامد کے باعث اس حد تک گمراہ ہو گیا تھا کہ اس نے دین اسلام چھوڑ کر نیا مذہب ایجاد کر لیا تھا۔ یہ نیا مذہب دین الہی کے نام سے رائج ہوا۔ اس مذہب میں اکبر کو کم و بیش خدا کا درجہ حاصل تھا۔ مملکت کے دو بدعقیدہ وزیروں ابوالفضل اور فیضی نے اس کے ذہن پر تاریکی کے اتنے گہرے پردے ڈال دیئے تھے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس نے غیر اسلامی طریقے پر راجپوت لڑکی جو دھابائی سے شادی کی۔ اپنی ترقی پسندی اور روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مغل شہنشاہ نے مہارانی کو نہ صرف مذہبی آزادی بخشی بلکہ جو دھابائی کی دلجوئی کے لئے اپنے محل کو بھی بت خانہ بنادیا۔ اہل ایمان پر وہ ستم توڑے گئے کہ انہیں سر چھپانے کو پورے ملک میں کہیں جائے نہ تھا۔ شراب اور بدکاری کا عام رواج تھا۔ راجپوت سردار اور نام نہاد مسلمان اسے صرف ایک ہی خواب دکھا رہے تھے اور وہ تھا عظیم الشان سلطنت کا خواب۔ کسی نہ کسی طرح اکبر کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا۔ اس نے اپنے بے شمار دشمنوں کو شکست دی۔ کئی قابل ذکر فتوحات حاصل کیں مگر ایک غم اُسے شب و روز دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ شادی کو طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے بہترین طبیب بلائے گئے۔ سینکڑوں دوائیں تجویز ہوئیں اور پھر اتفاقاً رائے سے تمام حکیموں نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ شہنشاہ وقت، اولاد کی خوشی دیکھنے سے قاصر رہیں گے۔ مہارانی کے کہنے پر ہندو سادھوؤں اور جوگیوں کے کلمات کا سہارا لیا گیا۔ جاودگروں نے بھی اپنی شعبہ بازیوں دکھائیں لیکن سب کچھ رائیگاں گیا اور کوئی تدبیر کام نہ آئی۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اپنوں اور بیگانوں کی حریصانہ نظریں وسیع و عریض سلطنت پر جمی ہوئی تھیں۔ تاج و تخت موجود تھے مگر ان کے وارث کا دُور دُور بھی پتہ نہ تھا۔ مجبوراً اس نے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ کا رخ کیا۔ یہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی پہلی شکست تھی۔

آپ نے اکبر کو اپنی بارگاہ میں داخل ہوتے دیکھا، مگر کسی خصوصی عزت و احترام کا مظاہرہ نہیں کیا۔ شہنشاہ وقت ایک عام ضرورت مند کی طرح آپ کے سامنے بیٹھا رہا اور تقریر و وعظ سنتا رہا۔ جب حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس کام سے فارغ ہو گئے تو اس کی طرف متوجہ ہوئے اور آمد کا سبب دریافت کیا۔ یہ ایک ظاہری رسم تھی، ورنہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ اکبر جیسا گمراہ انسان ایک درویش کی خانقاہ میں کیوں آیا ہے؟ بالآخر اس نے آپ سے تختِ ہندوستان

کے وارث کے لئے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے پہلے اس کے عقائد پر شدید اعتراض کیا۔ اور پھر علم ہند کے ساتھ سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ عالیہ میں حاضری دے۔ اکبر خاموشی کے لئے اس کی خاموشی کا مفہوم سمجھتے ہوئے دوبارہ فرمایا۔

”وہ میرے مرشد اعلیٰ ہیں اور میں ان کے دربار کا ادنیٰ ترین خادم ہوں۔ اس خانقاہ کی یہی رسم ہے کہ پہلے شہنشاہ معرفت کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرے گا اور پھر اس غلام کی جھوپڑی میں داخل ہوگا۔ ٹوٹا اختیار کیا ہے اور شہنشاہ کو چھوڑ کے غلام کے پاس چلا آیا ہے۔ پہلے صحیح راستے کا انتخاب کر، پھر تیرے لئے دعا کروں گا۔“

قدم قدم پر اپنی ذلت و شکست کے مظاہرے دیکھتا ہوا مغل شہنشاہ اٹھا۔ اب وہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ حکم کے مطابق اجیر شریف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اکبر نے تمام بزرگ لوگوں کی شان میں گستاخیاں کی تھیں۔ وہ انہی کی خانقاہوں میں ایک بھکاری کے مانند مسلسل حاضری دے رہا تھا۔ یہ جلال الدین اکبر کی دوسری عمر تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ مغل شہنشاہ، دیار غریب نواز میں پہنچا اور پھر چند عمارتیں تعمیر کرا کے ہمیشہ کے لئے ثبوت چھوڑ گیا۔ یہاں ایک مشہور عمارت ”اکبری دروازہ“ بھی ہے۔ آج بھی لاکھوں زائرین کی نگاہیں اس پر جم جاتی ہیں، جو کافی فاصلے سے دیکھنے کے باوجود نمایاں نظر آتی ہے۔

”خاک پائے سلطان الہند، جلال الدین اکبر۔“

صدیوں پہلے دنیا سے گزر جانے والے فقیر کو سلطان الہند کہتا اور پھر اپنی غلامی کا تحریر اعلان کرنا (دراصل طرح کر آنے والی سلیس، قیامت تک اس اعلان کو دن رات دیکھتی رہیں) یہ اکبر اعظم کی تیسری شکست تھی۔ اجیر شریف سے واپسی کے بعد مغل شہنشاہ دوبار حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اپنی طاقت کا اندازہ کر لیا؟“ یہ لفظوں کا ایک نشتر تھا، جو فرما دوائے ہند کے دل میں اُترتا چلا گیا۔ ”اگر وہ ذوالجلال تیری نسل کا سلسلہ منقطع کر دے تو یہ عظیم الشان سلطنت کہیں کام آئے گی؟ دشمن تیرے منصوبوں کو بے کر کے رکھ دیں گے اور تو کسی قید خانے میں ایڑیاں رگڑ رہا ہو گا یا تیری لاش پھانسی کے تختے پر جمول رہی ہو گی۔ والوں کا اکثر یہی انجام ہوتا ہے۔ زمین پر آہستہ چل کہ تو اسے پھاڑ نہیں سکتا اور گردن جھکا لے کہ تو آسمان بلند نہیں ہو سکتا۔“

آپ کے لفظوں کی تیغ بے نیام دیکھ کر مغل شہنشاہ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کا پورا بدن غلامت کی میں غرق تھا۔ ”شیخ! مجھ پر رحم کرو۔ اب میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں۔ اگر میں کسی قابل ہوتا تو تمہارے آگے کیوں پھیلاتا؟“

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ، اکبر کا یہ جواب سن کر مسکرائے اور پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف دیئے۔ ”اے مالک لوح و قلم! کائنات کی پیشانی پر لکھی ہوئی ایک ایک تحریر تیری ہے۔ تو جسے چاہے، قائم کر، جسے چاہے، مٹا دے۔ کوئی تیرے فیصلوں میں مداخلت کرنے والا نہیں۔ یہ شخص، جلال الدین اکبر نے جو نے ہند کی حکومت بخشی ہے، مجھے تیرا بندہ سمجھ کر میرے پاس آیا ہے۔ اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ مجھ گہکار کو تیری دعا سے نسبت خاص ہے۔ اے رحیم و کریم! اپنی مخلوق کی ان خوش گمانیوں کو قائم رکھ۔ میرے عیبوں کی پردہ پوشی فرما۔ والے اس بے اولاد کو اپنے بے مثال فضل و کرم سے نواز دے۔“

حضرت شیخ اس گریہ و زاری سے دعا مانگ رہے تھے کہ خود اکبر بھی رو پڑا۔

پھر کچھ دن بعد آگرے کے باشندوں نے دیکھا کہ پورا شہر رنگ و نور میں نہا گیا۔ مسرت و شادمانی کا یہ عالم تھا کہ کوئی کوئی کی خبری نہیں تھی۔ مغل شہنشاہ انتہائی وارفتگی کے عالم میں فتح پور سیکری کی طرف جا رہا تھا۔ پھر وہ دیوانہ پڑا اور حضرت شیخ سلیم چشتی رحمہ اللہ کی خانقاہ میں داخل ہوا۔

”شیخ! آپ کی دعاؤں سے تختِ ہندوستان کا وارث دنیا میں آ گیا۔ دلکش اور پُر جلال چہرہ رکھنے والا وارث، اکبر اعظم کا وارث، نسلِ بامیری کا امین، شہنشاہِ ہمایوں کا جانشین میرا فرزند۔“ اکبر اعظم کو اپنے آپ پر قابو نہ رہا تھا اور الفاظ اس کی زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

حضرت شیخ ان تمام باتوں سے بے نیاز آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر حاضرین کے سامنے ایک طویل سجدہ کر دیا۔ ”خالقِ ارض و سما! تیرا یہ احسانِ عظیم ہے کہ تُو نے انسانوں کے ہجوم میں اپنے سب سے عاجز بندے کی امداد کر لی۔ بے شک! تُو اپنے پکارنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔“ دعا سے فادغ ہونے کے بعد آپ نے شہزادے کو خانقاہ میں لانے کے لئے کہا۔

علم کی دیر تھی، شامی خدام، نومو لو کو ریشمی کپڑوں میں لپیٹے ہوئے حاضرِ خدمت ہوئے۔ حضرت شیخ نے شہزادے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بچے کی معصوم شکل دیکھ کر مسکرائے، پھر بلند آواز کے ساتھ اس کے کان میں ”ان دی۔ بادشاہ کسی ستون کی طرح ساکت یہ منظر دیکھتا رہا۔ تمام اسلامی رموز کی ادائیگی کے بعد حضرت شیخ نے شہزادے کی پیشانی پر بوسہ دیا اور یہ کہتے ہوئے اکبر کو اس کی امانت سونپ دی۔

”خدا سلیم کی عمر اور اقبالِ مندی میں اضافہ کرے۔“ آپ نے مغل شہزادے کا نام اپنے نام پر رکھا اور پھر یہی نام تاریخِ ہندوستان کا ایک حصہ بن گیا۔

اکبر اعظم اور مہارانی جودھا کی بے قرار یوں کو قرار آ گیا تھا اور وارثِ تخت کی پرورش جس انداز سے کی جا رہی تھی آج کے لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ماں باپ جوشِ محبت میں دن رات شہزادے کے بستر کا طواف کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ سلیم بڑا ہو گیا اور گھٹنوں چلنے لگا۔ شہنشاہ اور ملکہ کی خوشی ناقابلِ بیان تھی۔ مگر اس وقت ان دونوں کے چہرے اُداس ہو جاتے تھے، جب سلیم اپنی زبان سے کوئی لفظ ادا نہیں کرتا تھا۔ اکبر بہت دیر تک شہزادے سے باتیں کرتا رہا مگر سلیم کے منہ سے کسی قسم کی آواز نہیں نکلتی تھی، حالانکہ اس عمر کے بچے مکمل نہیں تو ٹوٹے ہوئے الفاظ ضرور بولتے ہیں۔ اکبر اعظم، شہزادے کی یہ حالت دیکھ کر اکثر سوچ میں ڈوب جاتا۔ یہ یقیناً ایک فکر نگر علامت تھی۔ محل کے رہنے والے سرگوشیوں میں کہنے لگے تھے۔

”ہندوستان کے تخت کا وارث پیدا کئی گونگا ہے۔“

اڑتے اڑتے کوئی خبر بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی تھی اور وہ اس تصور ہی سے لرز جاتا تھا کہ اس کا بائیں بے زبان ہے۔ بالآخر اس نے بڑی رازداری کے ساتھ شامی طبیبوں کو طلب کیا۔ تفصیلی معائنے کے بعد مارے طبیبوں نے متفقہ طور پر اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا کہ شہزادے کے بات کرنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ لہٰذا کسی حصے میں بے زبان سے کچھ الفاظ ادا بھی ہوئے تو وہ انتہائی مبہم اور غیر واضح ہوں گے۔ اس طبی تشخیص کے ہدایہ پر اکبر کا ذہن مایوسیوں کے اندھیروں میں غرق ہو گیا۔

وقت تیزی سے گزرنا جا رہا تھا، مگر شہزادے کی بے زبانی کا وہی عالم تھا..... خاموشی سے ماں باپ کے چہروں کو دیکھا، ان کی دلچسپ حرکتوں پر مسکراتا لیکن زبان سے کوئی لفظ نہ کہتا۔ بظاہر اس سنگین صورتِ حال کا کوئی علاج غور نہ آیا تو مہارانی جودھا نے شہنشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں بھی حضرت شیخ سے رجوع کرے اکبر کے

تاریک دماغ میں تبدیل سی جل گئی۔ وہ اپنی بدحواسیوں میں حضرت شیخ سلیم چشتی رحمہ اللہ کو بھول ہی گئی۔
”اب کیوں آیا ہے؟“ سلیم چشتی نے اکبر کو اپنے سامنے پا کر اس سے سوال کیا۔

”شیخ! آپ کا شہزادہ بات نہیں کرتا۔ شاہی طبیب کہتے ہیں کہ وہ پیدائش گونگا ہے۔“

اکبر کا لہجہ رقت آمیز تھا اور اس کی آنکھوں سے دنیا کے سب سے مجبور انسان کی بے کی جھک رہی تھی۔

”شاہی حکیم کیا جانیں؟ ان رازوں کو صرف طبیب حقیقی سمجھتا ہے۔“ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمہ اللہ

ہوئے بولے۔ ”مہر کر۔ شہزادہ بولے گا اور خوب بولے گا۔“

حضرت شیخ کا جواب سن کر اکبر مطمئن ہو گیا اور مہارانی جودھا کو بھی اطمینان دلا دیا۔ شاہی کلان

سکون لوٹ آیا۔

دن گزرتے رہے لیکن شہزادے کی حالت میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ اس کی بے زبانی پہلے دن کا

رہی۔ پھر اکبر، عالم وحشت میں خانقاہ کی طرف بھاگا۔

”شیخ! وہ اب بھی نہیں بولتا۔ یہ کیسی روشنی ہے کہ میں پہلے سے زیادہ اندھیروں کا شکار ہو گیا ہوں۔“

”تجھے کیا پتہ کہ یہ کیا راز ہے؟..... بس لکھنے والے نے یوں ہی لکھا ہے کہ ایک رقت میں ایک

سکتا ہے۔“

حضرت شیخ کے چہرہ مبارک سے ناگواری عیاں تھی۔ ”بس بہت ہو چکا۔ آئندہ فقیر کو بریٹان رکھیں

آپ نے منہ پھیر لیا اور اکبر تھکے ہوئے قدموں سے محل واپس آ گیا۔ حضرت شیخ کی گفتگو مغل شہنشاہ

بالآخر تھی۔ وہ تو اتنا ہی سمجھ سکا تھا کہ اب شیخ سلیم چشتی اُسے شرف ملاقات نہیں بخشیں گے۔ یہ ایک

نے دل کا درد سننے سے انکار کر دیا تھا۔

غرض اس کشمکش میں کچھ اور وقت گزر گیا۔ روز بروز شہزادے کی عمر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن اب

بولنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ شہنشاہ اور ملکہ کے علاوہ مغل سلطنت کے تمام ہی خواہ اس اذیت

حال سے دوچار تھے اور انہیں شہنشاہ باہر کی عظیم وراثت کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ آخر جب اکبر

نا اُمیدی کی انتہائی حدوں تک پہنچ گیا تو قدرت کی کرشمہ سازی کا آغاز ہوا۔

آج سلیم نے اپنی زبان سے پہلا لفظ ادا کیا تھا۔ کچھ دیر تک تو اکبر اور مہارانی جودھا کو اپنے کانوں

آیا تھا۔ مگر جب مغل شہزادے نے مسلسل کئی بے ترتیب لفظ ادا کئے تو اکبر اپنے جذبات پر قابو نہ

مسرت سے بے اختیار ہو کر رونے لگا۔ دراصل یہ سلیم نہیں بلکہ مغل سلطنت کا مستقبل بول رہا تھا۔ کلان

ہر طرف کیف اور نشاط کی لہر دوڑ گئی۔ حسن طرب کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔ وزیر و امیر اپنے اپنے گروہ

آئے اور ”ظن الہی“ کو مبارکباد دینے لگے۔ ایک عجیب ہنگامہ تھا، ایک عجیب شور تھا۔

پھر اسی شور میں ایک درباری نے اکبر سے کہا۔ ”حضرت شیخ سلیم چشتی انتقال کر گئے۔“

مسرت و شادمانی کی لہریں تھم گئیں اور درو دیوار ساکت ہو گئے۔ اکبر محل کے ایک گوشے میں مہارانی

اُداس کھڑا تھا اور حضرت شیخ کے الفاظ بار بار اس کی سماعت میں گونج رہے تھے۔

”ایک وقت میں ایک ہی سلیم بول سکتا ہے۔“

آج مغل سلطنت کا نیا وارث، شہزادہ سلیم بول رہا تھا اور خاندانِ چشتیہ کے شبنم فشاں اور شعلہ باغ

بولتے بولتے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے تھے۔ یہ بھی آپ کے کشف کا ایک انداز تھا، جو تاریخ

ناراض باب بن کر رہ گیا ہے۔ اس واقعے کو پڑھ کر بڑے بڑے دانش مند حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ زبان کی کیسی ڈھنگی کہ رویش کے ہونوں سے جو الفاظ ادا ہوئے، وہی عالم اسباب کا مقدر ٹھہرے۔ ایک وقت میں ایک ہی علم ہوا۔ خاندان چشتیہ کا سلیم دنیا سے رخصت ہوا تو خاندان مغلیہ کے سلیم کو قوت گویائی میسر آئی۔

”وزک جہانگیری“ مغل شہنشاہ کی خود نوشت سوانح ہے۔ جہانگیر ایک مقام پر لکھتا ہے۔ ”جب میری پیدائش کا دن قریب آیا تو والدہ کو حضرت شیخ سلیم چشتی کے گھر بھیج دیا گیا۔ حضرت شیخ کا حکم تھا کہ جب تک شہزادہ اس دنیا میں نہ آجائے، اس وقت تک ملکہ ہند گھر سے باہر قدم نہ رکھیں۔“

امید بزم کی بڑی عجیب کیفیت تھی۔ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرما چکے تھے کہ انشاء اللہ تخت ہندوستان کا وارث عنقریب دنیا میں ظاہر ہوگا..... مگر خود جلال الدین اکبر اور مہارانی جودھا سوچ رہے تھے کہ بیٹے کے بجائے بیٹی بھی تولد ہو سکتی ہے۔ وزراء اور امراء بھی اسی قسم کے اندیشوں میں مبتلا تھے۔ اور یہ کوئی غیر فطری بات بھی نہیں تھی۔ کوئی نہیں جانتا کہ پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوگا؟ مگر ایک فقیر بوریا نشین کو اپنے اللہ کی ذات پاک پر یقین کامل تھا کہ اس کی دعائیں بے اثر نہیں جائیں گی۔

شہنشاہ جہانگیر لکھتا ہے۔ ”چار شنبہ 17 ربیع الاول 977ھ کو میری پیدائش حضرت شیخ کے خانہ مبارک میں ہوئی۔ حضرت شیخ نے اپنے نام پر میرا نام سلطان سلیم رکھا۔ والد محترم، حضرت شیخ کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ انہوں نے نشے کی حالت میں بھی مجھے سلطان سلیم یا محمد سلیم کہہ کر نہیں پکارا۔ جب بھی آواز دیتے تھے، ”شبنو بابا“ کہہ کر پکارتے تھے۔“



دوسری کرامت حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بہت عرصے بعد ظاہر ہوئی۔ شہزادہ سلیم، شہنشاہ نور الدین جہانگیر کے نام سے تخت ہندوستان پر جلوہ افروز ہوا۔ مغل شہنشاہ فطرتاً انتہائی جمال پرست انسان تھا۔ اس نے ایک حسین و جمیل شادی شدہ عورت نور جہاں کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ بعض مؤرخین نے یہاں تک تحریر کیا ہے کہ جہانگیری کے حکم پر نور جہاں کے پہلے شوہر علی قلی شیراگلن کو قتل کیا گیا تھا۔ کچھ مؤرخین کا کہنا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر اس سناش سے بری الذمہ تھا۔ قصہ مختصر، جہانگیر نے ایک بیوہ عورت نور جہاں سے شادی کر لی اور پھر یہ حسن بہتی اس حد تک بڑھی کہ مغل فرمانروا کو نور جہاں کے سوا دنیا کی کوئی شے یاد ہی نہیں رہی۔ معتبر روایت ہے کہ جب شہنشاہ جہانگیر، دربار عام منعقد کرتا تھا، اس وقت نور جہاں بھی ریشمی پردوں کے پیچھے اس طرح موجود رہتی تھی کہ اس کا دست نازک جہانگیر کے کاندھے پر ہوتا تھا۔ اس واقعے سے مغل شہنشاہ کے جذبات کی شدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جہانگیر کا یہ شرہ آفاق جملہ بھی تاریخ ہند کے اوراق پر ثبت ہو کر رہ گیا ہے۔

”میں نے ہندوستان کی حکومت ایک جام شراب کے بدلے میں نور جہاں کے ہاتھوں فروخت کر دی۔“

بظاہر ہندوستان کا خود مختار حکمران تھا مگر اس کے دل و دماغ ہر وقت نور جہاں کی غلامی میں مصروف رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ ایک عورت نے مملکت ہند کے پورے سیاسی نظام کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ جسے چاہتی، گمنامی کی بہنوں سے اٹھا کر ہام عروج تک پہنچا دیتی۔ اور جسے چاہتی، اس سے عہدہ و منصب جھین کر اسے ولایت و مبادی کے تاریک غاروں میں دھکیل دیتی۔ یہ خاندان مغلیہ کے وارث کی عجیب بد نصیبی تھی کہ وہ حسن کی شعلہ نشانیوں کے آگے نکل راکھ کا ایک ڈھیر بن کر رہ گیا تھا۔

بے شک انور جہاں ایک نہایت ذہین، حوصلہ مند اور جاں باز خاتون تھی، مگر اس کے سیاسی نظریات سے اندازہ

ہوتا ہے کہ اول و آخر وہ ایک خود پرست عورت تھی۔ اسے صرف اپنے مفادات عزیز تھے۔ وہ مملکت اسلامیہ و یہود سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے دربار شاہی میں صرف انہی لوگوں کو اعلیٰ مراتب ملے۔ نور جہاں کے ہمنوا ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی زمانہ ساز انسان تھے۔ الغرض اسی کشاکش میں نور جہاں منہ چڑھا مصاحب بہت طاقت پکڑ گیا۔ وہ ایک مادہ پرست انسان تھا اور اکثر مواقع پر علماء کی تنقید کا کردار اہل دانش اس سے بیزار رہتے تھے۔ مگر ملکہ نور جہاں کی پشت پناہی کے سبب اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ علماء کی جماعت نے کئی بار کوشش کی کہ وہ شہنشاہ جہانگیر کو اس شخص کی ریشہ دوانیوں سے باخبر کر لیں۔ فرمانروا نے ہر مرتبہ اُن کی بات سنی ان سنی کر دی۔

”ہم نے امور مملکت بھی ملکہ ہند کو سونپ دیئے ہیں۔ وہ بہتر سمجھتی ہیں کہ کسے برطرف کریں اور کسے رکھیں۔“ جہانگیر کا یہ جواب ایک ہوش مند حکمران کے بجائے کسی بد مست عاشق کے مزاج کی عکاسی کیا تو علماء ہند اپنے فرمانروا کے یہ الفاظ سن کر حیرت زدہ رہ گئے۔ اب انہیں یقین ہو چلا تھا کہ بادشاہ جام شراب کے بدلے حکومت ہندوستان، نور جہاں کے ہاتھوں فروخت کی ہے، اسی جام میں ہندوستان تقدیریں بھی غرق ہو کر رہ گئی ہیں۔

نور جہاں کے مصاحب خاص کی سرکشی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن ایک علمی مجلس میں اس کی کرامات کا ذکر چھڑ گیا۔ نور جہاں کا مصاحب خاص بہت دیر تک علماء کی گفتگو سنتا رہا، پھر کہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اولیاء کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

نور جہاں کے مصاحب خاص کو اقتدار کا نشہ تھا، اس لئے وہ حسبِ عادت اپنی دریدہ دہنی کا نشانہ ہوئے بولا۔ ”کیا اولیاء اور کیا اُن کی ولایت؟ یہ سب شعبہ بازیاب ہیں اور جاہل لوگوں کی سادہ لوحی فائدے حاصل کرنے کا پُر فریب ہنر ہے۔“

مصاحب خاص کی بات سن کر ایک عالم نے کہا۔ ”آج تم جس شخص کی مملکت میں اس قدر آسودہ بسر کر رہے ہو، وہ خود بھی ایک بزرگ کی دعاؤں کے صدقے میں پیدا ہوا ہے۔“ عالم کا اشارہ مغل شہنشاہ جہانگیر کی طرف تھا۔ ”اور وہ بزرگ حضرت شیخ سلیم چشتی تھے۔ تمہارا ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ نور جہاں کا مصاحب خاص بزرگوں کی تحقیر کرنے کا عادی تھا، اس لئے وہ اس صورت حال کی نگاہ قاصر رہا۔ جب اس سے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ غضب ناک ہو گیا اور اس کے عظیم بزرگ کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا۔ اتفاق سے اس مجلس میں جہانگیر کے کچھ خدمت گزار تھے۔ نور جہاں کے مصاحب خاص کی گفتگو سن کر خدمت گاروں کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔ مغل شہنشاہ کی خلوت میں داخل ہوا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں عرض کرنے لگا۔ ”مغل الٰہی! آج تو تمہارا گیارہواں سال ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آسمان نہ ٹوٹ پڑے۔“

اس وقت نور الدین جہانگیر، بد مستی کے عالم میں تھا۔ اُس نے دُھندلی آنکھوں سے اپنے خدمت دیکھا۔ ”کیا ہو گیا؟ تو کا نپ کیوں رہا ہے؟“ شراب نوشی کی وجہ سے مغل شہنشاہ کی آواز میں جلی لڑائی کا ”حضور! آقاے نعمت! وہ شخص بر سرِ مجلس آپ کے پیر و مرشد حضرت شیخ کی شان میں گستاخ کیا۔ اسے کوئی روکنے والا نہیں۔“

خدمت گار کی بات سن کر جہانگیر کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ نشے کے باوجود وہ اتنی زور سے چیخا کہ قصر شاہی کے بام دور گونج اٹھے۔

”وہ رویہ، بدکار اور لعنت زدہ شخص کون ہے؟ اسے کسی جانور کی طرح کھینچتے ہوئے مابدولت کے حضور پیش کر دو۔“

آمریت کے دور میں حکم شاہی، انسانی تقدیر ہوا کرتا تھا۔ جہانگیر کی زبان سے چند الفاظ ادا ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کسی شمشیر بدست سپاہی اس مجلس کی طرف دوڑ پڑے، جہاں نور جہاں کا مصاحب خاص، علماء سے جاہلانہ بحث کر رہا تھا۔ پھر اہل شہر نے اپنی آنکھوں سے یہ عبرت ناک منظر دیکھا کہ اس شخص کو نہایت ذلت و رسوائی کے ماتھے پر بادشاہی کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

ملکہ ہند کے جاسوسوں نے اسے خبر کر دی کہ آپ کا سب سے پسندیدہ ترین شخص زیر عتاب آچکا ہے۔ نور جہاں نے بڑی حیرت سے یہ خبر سنی مگر فوراً ہی اس کے خولصورت چہرے سے تعجب کے سارے آثار مٹ گئے۔ اسے اپنے فتن کی طاقت پر حد سے زیادہ اعتماد تھا۔ وہ ایک خاص ادائے محبوبانہ کے ساتھ مغل شہنشاہ کے خلوت کدے میں داخل ہوئی اور بعد ناز و ادا کہنے لگی۔

”غل الہی! آپ نے جس شخص کی گرفتاری کا حکم دیا ہے، وہ میرا پسندیدہ آدمی ہے اور اسے میں نے ہی اس منصب پر پہنچایا ہے۔“

”ملکہ عالیہ! اگر آپ اسے وزارت عظمیٰ کے منصب تک پہنچا دیتیں، تب بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔“ مغل شہنشاہ نے پُر جلال لہجے میں کہا۔ ”ہم نے کسی سیاسی جرم کے سلسلے میں اس کی گرفتاری کا حکم جاری نہیں کیا ہے۔ اس کا گناہ کچھ اور ہے جو ہمارے نزدیک ناقابل معافی ہے۔“

”کچھ بھی سہی، مگر میں اس کی سفارش کر رہی ہوں۔“ نور جہاں نے انتہائی غرور و تمکنت کے ساتھ کہا۔

”آپ درمیان سے ہٹ جائیں۔“ شدت غضب سے مغل شہنشاہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”اگر وہ ہماری ذات کو ہدف ملامت بناتا تو ہم آپ کی درخواست پر اس کی جان بخش دیتے۔ مگر یہ ہمارے پیرومرشد کا معاملہ ہے۔ ہم اس سلسلے میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔“

نور جہاں کھلی آنکھوں سے اپنے شوہر کی غضب ناک حالت کو دیکھ رہی تھی، مگر پھر بھی اسے اپنی عشوہ طرازیوں پر اس قدر یقین تھا کہ وہ حکم شاہی کو بدل ڈالے گی ”کیا غل الہی میری مداخلت کو بھی پسند نہیں فرمائیں گے؟“ نور جہاں بڑی عجیب خوش گمانی میں جھٹلائی۔

”اگر اس شخص کی جگہ آپ بھی ہوتیں تو قہر شاہی اسی انداز سے نازل ہوتا۔“ مغل شہنشاہ کچھ اور غضب ناک نظر آنے لگا تھا۔ ”جس زبان نے پیرومرشد کی شان میں گستاخی کی ہو، وہ اس قابل نہیں کہ اس کا وجود برقرار رہے۔“ یہ کہہ کر مغل شہنشاہ اپنے خلوت کدے سے باہر نکل گیا۔

ملکہ ہند نور جہاں کو اپنی زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ جیسے وہ فرمانروائے ہندوستان کی محبوبہ و نواز نہ ہو بلکہ قہر شاہی کی ایک ادنیٰ کنیز ہو۔

پھر اس فتنہ پرداز شخص کو پابہ زنجیر کر کے مغل حکمران کے سامنے پیش کیا گیا جہانگیر لڑکھڑاتا ہوا کرسی سے اٹھا اور نور جہاں کے مصاحب خاص کے منہ پر تھوک دیا۔

”شینو بابا کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ ابھی تو میں زندہ ہوں۔“ یہ کہہ کر مغل شہنشاہ، سپاہیوں کی طرف مڑا۔

”اس شخص کی ناپاک زبان گدی سے کھینچ لو۔“

حکم شاہی سن کر حاضرین لرزنے لگے کیونکہ گدی سے زبان کھینچنا انتہائی دردناک سزا ہے۔

روایت ہے کہ سزا کی تکمیل سے پہلے نور جہاں نے ایک بار پھر دبے لفظوں میں شہنشاہ سے رحم کی درخواست تھی، مگر جہانگیر نے اسے بڑی بے رحمی کے ساتھ جھڑک دیا تھا۔

پھر وقتِ حساب آپہنچا۔ جہانگیر کا ہاتھ بلند ہوا اور اس اشارے کے ساتھ ہی جلادوں نے مجرم کی گردن سورخ کرنا شروع کر دیا۔ قیدی کی چیخیں کسی ذبح کئے جانے والے جانور سے مشابہہ تھیں۔ نور جہاں نے غصہ دہشت کے باعث وہاں سے ہٹ جانا چاہا لیکن جہانگیر نے اسے یہ کہہ کر روک لیا۔

”ملکہ ہند! آپ یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ میرے پیر و مرشد کی شان میں گستاخی کرنے والے کا حشر ہوتا ہے۔“

کچھ دیر بعد اس بدنہاد شخص کی زبان نکال لی گئی۔ جہانگیر نے مرنے والے پر ہزار بار لعنت بھیجی اور دم جاری کیا۔

”اس کی لاش آگرہ کی پہاڑیوں سے نیچے گھاٹی میں پھینک دی جائے۔ یہاں تک کہ جنگلی درندے اس کا جسم کو کھا جائیں۔“

میرے ذاتی خیال میں یہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی کرامت تھی، جو آپ کے وصال برسوں بعد ظہور پذیر ہوئی۔ مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر کو اکثر مورخین نے ”نور جہاں کا غلام“ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے..... مگر میں اسے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا غلام سمجھتا ہوں۔ اہل نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ حسن پرست اور بادہ نوش حکمران، زندگی بھر اپنے نفس کے زیر اثر رہا، وہ کوئی عبادت گزار شخص نہیں تھا۔ اکثر تاری نگاروں نے جہانگیر کو ایک آزاد خیال انسان قرار دیا ہے، جو بظاہر کسی مذہب پر کار بند نظر نہیں آتا تھا۔ دین الٰہی کی تحریک جلال الدین اکبر کے دور میں شروع ہوئی تھی، جہانگیر کے عہدِ حکومت میں اسے بہت زیادہ فروغ ملا ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ، جہانگیر ہی کے حکم پر باندہ سلاسل ہوئے اور ان کے زنداں کیا گیا۔ جس شخص کی کج روی کا یہ عالم ہو، اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ مگر یہ حضرت شیخ سلیم چشتی کی نگاہ معرفت ہی کا طلسم تھا، جس سے جہانگیر زندگی بھر آزاد نہیں ہو سکا۔ پھر جب عشق کی آزمائش کا وقت آیا تو جہاں کے حسن کا سحر، باطل قرار پایا اور پیر و مرشد کی محبت باقی رہ گئی۔

جوش ملیح آبادی کے پیش نظر تو کوئی اور زاویہ رہا ہوگا، مگر جب ہم تاریخ کی روشنی میں جہانگیر کے حوالے اس مشہور واقعے کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ شعر بے ساختہ یاد آ جاتا ہے۔

کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے زمیں کے آگینوں کو

ترے رندوں کو مستی میں بھی اتنا ہوش ہے ساقی

یہاں ایک اور تاریخی حقیقت کا ذکر کرتا چلوں کہ یہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت کا نتیجہ تھا کہ جہانگیر نے حضرت شیخ مجدد الف ثانی کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ قید سے رہا کیا اور ”دین الٰہی“ کی تحریک کو مکمل طور پر فروغ دینے کے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس فتنہ عظیم سے نجات دلوائی۔ یہ جہانگیر کا ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے، جو دنیا تک قائم رہے گا۔

حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً پینتیس سال کی عمر میں شادی کی۔ خدا کے حکم سے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ بے چوٹے صاحب زادے شیخ تاج الدین کا ڈھائی سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ دوسرے لڑکے کا تفصیلی ذکر کی متعدد تاریخ میں نہیں ملتا۔ بعض کتابوں سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کا نام قطب الدین تھا اور وہ جہانگیر کے در حکومت میں کی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ بڑے صاحب زادے حضرت شیخ بدر الدین آپ کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور ان ہی سے سلسلہ چشتیہ کو فروغ حاصل ہوا۔

بیموں بقال کی فقید انگیزیوں کی وجہ سے آپ کو دوبارہ ہندوستان سے باہر جانا پڑا۔ 962ھ میں مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور چودہ سال کی طویل سیاحت کے بعد 967ھ میں فتح پور سیکری تشریف لائے۔ پھر یہیں 29 رمضان المبارک 979ھ کو آپ خالق حقیقی سے جا ملے۔

آفتاب معرفت زیر خاک روپوش ہو گیا۔ مگر اس کی حیات افزا شعاعیں آج بھی محسوس کی جاتی ہیں۔ دنیا کے گوشے گوشے سے بے شمار انسان تاج محل دیکھنے کے لئے آگرہ پہنچتے ہیں اور اس شخص کی قبر کا نظارہ کرتے ہیں، جس نے یہ عجوبہ روزگار عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اگرچہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر انسانوں کا وہ ہجوم نہیں ہوتا، پھر بھی ہزاروں غیر مسلم، آستانہ عالیہ پر حاضر ہوتے ہیں اور با آواز بلند یہ اعتراف کرتے ہیں کہ فتح پور سیکری کی پہاڑیوں پر سونے والا درویش حقیقی شہنشاہ ہے اور تاج محل کا خالق، شاہ جہاں اپنے وقت میں خاندان چشتیہ کا خادم تھا۔ ادنیٰ ترین خادم۔

جن کی محبت نے انتہائی سرمستی کے باوجود جہانگیر کو ہوش میں رکھا، اس کے مزار سے آج بھی عشق کی روشنی بھوٹ رہی ہے۔ جب کوئی عقیدت مند، فتح پور سیکری کی ایک پہاڑی پر پہنچتا ہے تو اسے حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری آرام گاہ نظر آتی ہے۔ روضہ مبارک کے احاطے کو خالص ”سمندری سیپ“ سے تراش کر اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس میں بظاہر کوئی جوڑ نظر نہیں آتا۔ یہ فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ تقریباً ساڑھے چار سو سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی نقشِ دنگا، کی وہی دلکشی قائم ہے۔ پھر بھی محکمہ اوقاف نے احتیاط کے پیش نظر مزار مبارک کے باہر ایک کتبہ آویزاں کر دیا ہے، جس پر یہ الفاظ تحریر ہیں۔

”براہ کرم دیواروں کو ہاتھ نہ لگائیں، یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں۔“

گردشِ ماہِ وصال نے یقیناً سیپ کی دیواروں کو بوسیدہ کر دیا ہوگا، مگر وہ سوختہ جاں جو زیرِ قبر سو رہا ہے، اس کی روح کبھی بوسیدہ نہیں ہوگی۔



حضرت بابا بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ

پاکستانی پنجاب کا ضلع بہاولپور کئی اعتبار سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے..... مگر برصغیر میں اس علاقے کی شہرت کا سبب حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت مجتہد جیسے عظیم صوفی بزرگ کا مزار مبارک ہے جس سے شہر معرفت کی روشنی طلوع ہوتی رہتی ہے اور دنیا بھر کے اہل دل کے قافلے اسی روشنی کی تلاش میں بہاولپور پہنچے تاکہ وہ اپنے رنگ آلود دلوں کو روشن کر سکیں۔

اسی تاریخ ساز شہر کا ایک قصبہ ”اچ گیلانیاں“ ہے جہاں ”سادات گیلانی“ آباد ہیں۔ گیلان (جیلان) ایک علاقہ ہے، جہاں امام الاولیاء غوث اعظم حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے تھے۔ آپ نسبت خاص سے اس غیر معروف علاقے کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ گیلان ہی کے رہنے والے کچھ بزرگ کر کے اچ (بہاولپور) پہنچے تھے..... اور پھر اسی حوالے سے ”اچ گیلانیاں“ آباد ہوا تھا۔

اسی اچ گیلانیاں کا ایک غریب دیہاتی بچہ، ایک دن کھیتوں میں اپنے مویشی چرا رہا تھا۔ دھوپ نہ تھی آرام کرنے کے لئے ایک درخت کے سائے میں لیٹ گیا اور پھر اسے نیند آ گئی۔ اگرچہ وہاں گرائی نہ کر کے بے لگام ہو جاتے ہیں۔ بچے کے سوتے ہی اس کی فائیں اور بھی نہیں بھی بے قابو ہو گئیں۔ جنگل کی ٹھاسی چرتے تمام جانور قریب کے ایک ہرے بھرے کھیت میں گھس گئے اور فصل کو بری طرح اُجاڑنے لگے۔

یہ کھیت ”اچ گیلانیاں“ کے ایک بااثر شخص جیون خان کا تھا۔ جب اس نے اپنے کھیت کو اُڑتے دیکھا لے کر جانوروں پر پل پڑا۔ بڑی مشکل سے گایوں اور بھیڑیوں کو کھیت سے نکالا۔ اتنی دیر میں جانور کھیتوں کا نقصان پہنچا چکے تھے۔ ان پر قابو پانے کے بعد جیون خان برا بھلا کہتا ہوا چرواہے کی تلاش میں نکلا۔ کھیتوں پر فراٹنگ کے فاصلے پر اسے ایک چھوٹا سا بچہ سویا ہوا نظر آیا۔ جیون خان غضب ناک انداز میں بچے کی طرف ہر اس کا ارادہ تھا کہ وہ بچے کو بھی بری طرح پیٹے گا، تاکہ آئندہ اس کے کھیت جانوروں سے محفوظ رہ سکیں۔ جیون خان، غصے میں بھرا ہوا بچے کے قریب پہنچا..... بچے کو تو اس نے پہچان لیا تھا کہ وہ کس کا لڑکا ہے۔ کرب خوف ناک منظر نے اُس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔

ایک کالا ناگ اپنا چھن پھیلانے بچے کے سر پر موجود تھا..... اور بچہ بے سدھ پڑا تھا۔ جیون خان اندازے کے مطابق کالے ناگ نے بچے کو ڈس لیا تھا۔ وہ اُلٹے پاؤں بھاگا اور بچے کے باپ کو یہ اہم خبر پہنچا کہ اس کا لڑکا اب اس دنیا میں موجود نہیں۔

یہ خبریں کر باپ پر قیامت سی گزر گئی اور وہ بھاگتا ہوا اس جگہ پہنچا، جہاں جیون خان کے بقول اس کا معصوم بچہ مر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں قریب آئے، کالا ناگ انہیں دیکھ کر ایک طرف ریختا ہوا چلا گیا اور نزدیکی جھاڑی میں رہوٹیں ہو گیا۔

غز وہ باپ، بیٹے کے قریب پہنچا اور وحشت ناک انداز میں آوازیں دینے لگا۔ ”عبداللہ..... عبداللہ!“
 بچے کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ باپ نے غور سے دیکھا، بچے کی سانس چل رہی تھی۔ ”عبداللہ!.....
 عبداللہ!“ باپ نے بیٹے کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کا خیال تھا کہ سانپ کے اثر سے بچہ بے ہوش ہو گیا ہے۔
 باپ نے دوسری بار جھنجھوڑا تو بچہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے آنکھیں مل کر باپ کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے
 بابا؟“

باپ کی جان میں جان آئی۔ کچھ دیر تک وہ بچے کے جسم کے مختلف حصوں کو دیکھتا رہا..... مگر کہیں بھی سانپ کے کالے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ باپ نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”دونوں جہانوں کا پالنے والا، تجھے ہمیشہ
 بر ملا محفوظ رکھے۔“

جب جیون خان نے بچے کو صحیح و سلامت پایا تو انتہائی غصے کے لہجے میں باپ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”شاہ جی!
 تمہارا بچہ محفوظ ہے، مگر میرے کھیت پر باد ہو گئے۔“

شاہ جی نے چونک کر جیون خان کی طرف دیکھا۔ ”میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔“
 ”تمہارا یہ لاڈلا، ٹھنڈی چھاؤں میں گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا..... اور اس کے جانور میرا کھیت کھا رہے تھے۔“
 ”کیوں عبداللہ؟..... جیون خان کیا کہہ رہا ہے؟“ شاہ جی نے سخت لہجے میں بیٹے سے پوچھا۔
 ”جیون چاچا غلط کہہ رہے ہیں بابا!“ بچے نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ”میرے جانور کسی کا کھیت نہیں کھاتے۔ وہ
 صرف گھاس چرتے ہیں۔“

”یہ چار دن کا لڑکا مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے، شاہ جی!“ جیون خان کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا تھا۔ ”آپ خود چل کر اپنی
 آنکھوں سے دیکھ لیں کہ میری ہری بھری فصل کس طرح برباد ہوئی ہے۔“

”تم مطمئن رہو جیون خان! اگر تمہارا کھیت میرے بچے کی وجہ سے خراب ہوا ہے تو میں اسے سخت سزا دوں
 گا..... اور تمہارا نقصان بھی پورا کروں گا۔“ یہ کہہ کر شاہ جی نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور جیون خان کے کھیت کی طرف
 بڑے۔

اس وقت جیون خان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب کھیت، میں کسی قسم کی بربادی کے ہلکے سے آثار تک نظر
 نہ آئے۔ جیون خان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا، پھر اسے بہت دُور کھیت کی باز کے نزدیک بچے کے جانور چرتے
 نظر آئے۔

”میرا بیٹا بچ کہہ رہا تھا۔“ شاہ جی نے جیون خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”فصل کی بربادی دُور کی بات
 ہے، یہاں تو کسی جانور کے داخل ہونے کا بھی نشان نظر نہیں آتا۔“
 ”رب ہی جانے کہ کون سچا ہے..... اور کون جھوٹا؟“ جیون خان کے لہجے اور چہرے سے شدید ندامت کا

اظہار ہو رہا تھا۔
 ”میرا بیٹا ہی سچا ہے، میں نے اسے یہی تعلیم دی ہے۔“ شاہ جی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ پھر وہ گہری
 سوچ میں ڈوبے ہوئے گھر چلے گئے۔ خود انہیں بھی اس واقعہ پر بڑا تعجب ہوا تھا۔

یہ مولیٰ چرانے والا بچہ، پنجاب کے مشہور بزرگ حضرت بابا بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جس وقت یہ بچہ ایک سال کا ہوا، اس وقت آپ کی عمر مبارک چھ سال تھی۔

حضرت بابا بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ 1061ھ (1675ء) میں بمقام ”اچ گیلانیاں“ میں پیدا ہوئے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے 1680ء کو آپ کا سال پیدائش قرار دیا ہے۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی حضرت سیدنی شاہ رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ بابا بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب چودہ واسطوں سے غوث اعظم حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ روایتوں کے مطابق آپ کے آباء و اجداد میں سب سے پہلے حضرت شیخ بنگدی محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ 887ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور ”اچ“ میں آباد ہو گئے۔ حضرت سیدنی شاہ محمد بنیادی طور پر ایک عالم تھے مگر بزرگ قدر وال نہیں تھے۔

ایک ایک وقت نے کروٹ لی اور حضرت سیدنی شاہ محمد کے اقتصادی حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے۔ آپ نے اپنے مولیٰ اور گھر بچ کر کسی دوسرے علاقے کا رخ کیا۔ یہ مختصر سا خاندان، جس میں سیدنی شاہ رحمۃ اللہ علیہ اہلیہ اور بچہ عبداللہ شاہ شامل تھے، قریہ قریہ گھومتا رہا مگر کوئی مناسب جگہ نہ مل سکی۔ آخر شاہ صاحب کو ”ملک“ علاقہ پسند آیا اور آپ یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔

ملک وال کے لوگ صلح پسند اور متواضع تھے، اس لئے سیدنی شاہ محمد نے مسجد کی امامت قبول کر لی اور ساتھ ہی چھوٹا سادہ مدرسہ قائم کر کے دینی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ”اچ گیلانیاں“ کے مقالے میں بیان ہے کہ بہتر ذرائع میسر تھے جس کے نتیجے میں شاہ صاحب کو قلمی سکون میسر آیا اور آپ کے علمی جوہر کھلے گئے۔ آپ کے درس میں چند افراد شامل ہوتے تھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قرب و جوار کے لوگ بھی آپ کے شاگرد بننے لگے۔ آپ کے قائم کئے ہوئے کتب میں آپ کے فرزند سید عبداللہ (حضرت بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ) حاصل کرتے تھے۔



”ملک وال“ کے علاقے میں ابھی کوئی سال ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرا ہو گا کہ سیدنی شاہ محمد کی زندگی شریک اور انقلاب آیا۔ جب آپ کے فضل و کمال کی شہرت گرد و نواح کے دیہاتوں میں پہنچی تو ایک صاحب خیر چوہدری پانڈو، شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملک وال کے قریب ایک گاؤں کوٹلی تھا..... اور کوٹلی کچھ فاصلے پر دوسرا گاؤں ”پانڈو کے“ آباد تھا۔ اسے پانڈو کے بھٹیاں کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے ”پانڈو کے“ چوہدری پانڈو نے بڑی محنت سے بسایا تھا۔ نتیجتاً اسی کے نام پر گاؤں کا نام ”پانڈو کے“ پڑ گیا۔

چوہدری پانڈو نے بڑی عقیدت کے ساتھ سیدنی شاہ محمد کی خدمت میں حاضری دی۔ دو تین دن وقفہ رکھا۔ شریک ہوتا رہا، پھر ایک دن عرض کرنے لگا۔

”شاہ صاحب! اگر آپ میرے گاؤں تشریف لے چلیں تو میں اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز سمجھوں گا۔“ اس اعزاز سے تمہارا مقصد کیا ہے؟“ سیدنی شاہ محمد، چوہدری پانڈو کا مفہوم نہیں سمجھے تھے۔

”میں خدمت میں حاضر رہ کر آپ کے علم سے فیض یاب ہو سکوں گا۔“ چوہدری پانڈو کا لہجہ نیاز مندانہ تھا۔

”فیض یاب تو تم اب بھی ہو رہے ہو۔“ حضرت سیدنی شاہ محمد نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”میرا یہ بڑا بڑا مدرسہ سب کے لئے کھلا ہے۔ یہاں خاص و عام کی کوئی تخصیص نہیں۔“

”شاہ صاحب! مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے چالیس پچاس کوس کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔“

پانڈوں کا پانڈو کے میں تقریباً اتنا ہی فاصلہ تھا، جس کی طرف چوہدری پانڈو نے اشارہ کیا تھا۔
 پانڈو صاحب! اگر علم کی آپ کو ضرورت ہے تو میری بات غور سے سنیں کہ علم حاصل کرنے کے لئے لوگوں
 کو کئی طرح کے فاصلے طے کیا ہے۔“ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے باوقار لہجے میں کہا۔

پانڈو صاحب! بار بار یہ مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ میں روزانہ سفر کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ سے درخواست
 ہے کہ میری اس مجبوری کا خیال فرمائیں۔“ چوہدری پانڈو نے دست بستہ عرض کیا۔

پانڈو صاحب! لوگوں کا کیا ہو گا؟“ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے ان چند دیہاتیوں کی طرف اشارہ کیا، جو مدرسے میں
 پڑھنے آتے تھے۔ ”بے شک! آپ ایک صاحب حیثیت انسان ہیں، مجھے زیادہ سے زیادہ مراعات دیں
 کہ میں میرے جسم کو تو سکون حاصل ہو جائے گا..... مگر روح اور مضطرب ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ نے مجھے
 فرمے کہ اس دنیا میں بھیجا ہے، وہ نامکمل رہ جائے گا..... اور روزِ حشر میرے دامن میں شرمندگی کے سوا
 کچھ نہیں ہے گا۔“ یہ کہتے کہتے حضرت سید سخی شاہ محمدؒ کا لہجہ اُداس ہو گیا تھا۔

پانڈو صاحب! میرا وعدہ ہے کہ آپ اپنے مقصد سے دُور نہیں ہوں گے..... بلکہ
 یہ ہو جائے گا۔“

پانڈو صاحب! بات کی مکمل وضاحت کرو۔“ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے فرمایا۔ ”پھر میں اس پر غور کروں گا کہ تمہاری
 بات کمال ہے یا نہیں؟“

پانڈو صاحب! گاؤں پانڈو کے میں ایک مدرسہ تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔“ چوہدری پانڈو نے عرض کیا۔ ”اور یہ مدرسہ
 پانڈو صاحب! میں تعمیر ہو گا، جہاں طالب علموں کو زیادہ سہولتیں میسر ہو گی۔ اور اس طرح میں بھی روزانہ آپ کے
 لئے ایک ٹرک ہو سکوں گا۔“

پانڈو صاحب! لوگ، جو علم کی روشنی سے محروم ہو جائیں گے؟“ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے دوبارہ اپنے شاگردوں کی
 طرف اشارہ کیا، جو ظاہری حالت سے بہت شکستہ اور غریب نظر آ رہے تھے۔

پانڈو صاحب! ان لوگوں کا بھی بندوبست کر دیا ہے۔“ چوہدری پانڈو نے نہایت انکسار کے ساتھ عرض کیا۔ ”آپ
 پانڈو صاحب! شاگردوں کے لئے کسی نئے معلم کا انتظام فرمادیں اور خود میرے ساتھ پانڈو کے تشریف لے چلیں۔“

پانڈو صاحب! کہ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے چوہدری پانڈو کی درخواست قبول کر لی۔ ملک وال کے مدرسے کے لئے نیا
 مدرسہ بنوا دیا اور خود پانڈو کے تشریف لے آئے۔ چوہدری پانڈو نے حسب وعدہ آپ کی خوب خاطر مدارات کی اور
 پانڈو صاحب! کے لئے ایک بہتر مدرسہ تعمیر کیا۔ زندگی میں پہلی بار حضرت سید سخی شاہ محمدؒ کو کسی قدر فراغت نصیب ہوئی
 پانڈو صاحب! جی کے ساتھ تبلیغِ دین و علم میں مصروف ہو گئے۔

پانڈو کے میں آنے کے بعد حضرت سید عبداللہ (حضرت بابا بلے شاہؒ) کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

پانڈو صاحب! باتوں کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ایک یہ کہ بعض تذکرہ نویسوں نے حضرت بابا بلے شاہؒ کے
 تذکرہ کا نام گرامی حضرت سید درویش محمدؒ بھی تحریر کیا ہے۔ شاید سخی شاہ محمدؒ اس لئے مشہور ہو گیا کہ آپ ایک مردِ وحشی
 تھے۔ انتہائی عک دیتی کے باوجود آپ سائل کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ پانڈو کے کا ایک نام پانڈو کے بھٹیاں بھی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت بابا بلے شاہؒ کے
 وطن چرنے کا واقعہ پانڈو کے بھٹیاں میں پیش آیا۔ مگر زیادہ تر راویوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ اس وقت رونما
 ہوا جب آپ اچ گیلانیاں میں مقیم تھے۔

پاؤ کے بھیاں میں حضرت بابا بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ تعلیم جاری تھا کہ آپ ایک دن گھر سے غائب ہوئے اس وقت حضرت بابا بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ساڑھے چھ یا سات سال کے قریب تھی۔ حضرت سید خلی شاہ محمد (رحمۃ اللہ علیہ) مدرسے سے تشریف لائے اور بیوی سے حضرت بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں پوچھا۔

بیوی نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کچھ دیر پہلے تو گھر ہی میں موجود تھا۔“

حضرت شاہ محمدؒ نے آوازیں دیں، مگر جب کوئی جواب نہیں آیا تو آپ، حضرت بابا بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو اہل محلے کے کچھ عرصیدہ لوگوں نے بتایا کہ عبداللہؒ چند لڑکوں کے ساتھ کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ حضرت خلی شاہؒ پریشان ہو گئے اور بیٹے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس باغ میں جا پہنچے، جہاں محلے کے بہت سے بچے کھیل رہے تھے۔ حضرت خلی شاہ محمدؒ نے دیکھا کہ ان کا کسن بیٹا عبداللہؒ اپنے ہم جولیوں سے الگ تھلگ بیٹھا ہے۔ حضرت شاہؒ حضرت بابا بلے شاہ کو سرزنش کرنے کے لئے آگے بڑھے مگر چند قدم چل کر رک گئے۔ ان کی آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

حضرت بابا بلے شاہؒ کی آنکھیں بند تھیں..... ہاتھ میں تسبیح تھی..... اور آپ بڑے والہانہ انداز میں بجا رہے تھے۔

لوکاں دا چپ مالیاں تے بابے دا چپ مال
ساری عمراں مالا پھیری، اک نہ کتھا وال

لوگوں کا مال کھاتے رہے..... اور جو کچھ اللہ نے دیا، وہ بھی خود کھالیا (یعنی اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کیا) ایسی حالت میں ساری عمر تسبیح پھیرتے رہے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا..... یعنی اللہ کی خوشنودی سے محروم رہے۔ ایک تو عارفانہ کلام کی اثر انگیزی، دوسرے حضرت بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے پڑھنے کا انداز..... حضرت سید خلی شاہؒ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور آپ بیٹے کو سرزنش کرنے کے بجائے وہاں کھڑے ہو کر جھومنے لگے۔ حضرت بابا بلے شاہؒ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر بار بار اس شعر کی تکرار کرتے رہے اور حضرت سید خلی شاہؒ وارفتگی بڑھتی رہی۔ پھر جب حضرت بابا بلے شاہؒ خاموش ہوئے تو حضرت شاہ محمدؒ کے جذب میں بھی کمی آئی۔ انہوں نے اپنی آنکھیں کھول کر بیٹے کی طرف دیکھا۔

اگرچہ حضرت بلے شاہؒ نے شعر پڑھنا بند کر دیا تھا، لیکن ان کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ خود بھی کسی خاص کلام کے زیر اثر ہوں۔ حضرت خلی شاہ محمدؒ آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور بڑی محبت سے بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ حضرت بلے شاہؒ نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں۔ باپ کو سامنے پا کر احتراماً خود بھی کھڑے ہو گئے۔ ”بیٹا! تم نے تو سارے گھر کو پریشان کر ڈالا۔“ حضرت خلی شاہ محمدؒ نے حضرت بلے شاہؒ کو گلے لگائے اور نہایت رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”ماں گھر پر رو رہی ہے اور بدحواس باپ تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آ گیا۔“ حضرت بابا بلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ والد محترم کی اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکے، بس ندامت سے سر جھکا کر گھر کے کھڑے رہے۔

حضرت سید خلی شاہ محمدؒ نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور حضرت بلے شاہؒ کو گھر لے آئے۔

کسئی کے زمانے میں حضرت بابا بلے شاہؒ کی ذات گرامی سے وابستہ یہ دوسرا واقعہ تھا، جس نے حضرت خلی شاہؒ کو چونک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر اسی روز تنہائی میں باپ نے بیٹے سے پوچھا۔

”عبداللہ! تم کون ہو؟ آج یہ بات مجھے سچ سچ بتا دو۔“

”میں آپ کا بیٹا عبداللہ ہوں۔“ حضرت بابا بلے شاہؒ نے نہایت معصومیت سے عرض کیا۔
 ”میں اس روز بھی چونک اٹھا تھا، جب تم نے جیون خان کی باتوں کو جھٹلایا تھا۔“ حضرت نخی شاہ محمدؒ (درویش محمدؒ) نے بیٹیوں کے کھیت چرنے والے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جیون خان کی حیرت بتا رہی تھی کہ بیٹوں میں بول رہا تھا..... مگر میں تمہاری وجہ سے خاموش رہا تھا..... اب مجھے بتاؤ کہ اس کی حقیقت کیا تھی؟“
 ”میں کچھ نہیں جانتا بابا!“ حضرت سید عبداللہؒ (حضرت بابا بلے شاہؒ) نے اسی معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔

حضرت نخی شاہ محمدؒ نے زاویے بدل بدل کر اپنا یہی سوال دہرایا۔ مگر حضرت بابا بلے شاہؒ ایک ہی جواب دیتے رہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

آنحضرت نخی شاہ محمدؒ نے بیٹے سے دوسرا سوال کیا۔ ”آج تم جو شعر پڑھ رہے تھے، وہ تم نے کس سے سیکھا؟“
 ”میں اپنے دوستوں کے ساتھ محلے میں کھیل رہا تھا کہ ایک بڑے میاں (بزرگ) یہ شعر پڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔“ حضرت بابا بلے شاہؒ نے عرض کیا۔ ”ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح تھی۔ مجھے وہ شعر فوراً یاد ہو گیا۔“
 حضرت سید نخی شاہ محمدؒ نے اس کے بعد بیٹے سے کوئی سوال نہیں کیا..... اور اپنی بیوی کو تنہائی میں سمجھا دیا کہ وہ آئندہ عبداللہؒ کے ساتھ مختلط طرز عمل اختیار کریں۔

”اس ہدایت کی کوئی خاص وجہ؟“ حضرت نخی شاہ محمدؒ کی اہلیہ نے شوہر سے سوال کیا۔
 ”سید عبداللہؒ کوئی عام بچہ نہیں ہے۔“ حضرت نخی شاہ محمدؒ نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں اس کے سلسلے میں بہت محتاط رہنا ہو گا۔“

بیوی نے بار بار وضاحت چاہی، مگر حضرت سید نخی شاہ محمدؒ (درویش محمدؒ) نے سکوت اختیار کیا۔
 حضرت بابا بلے شاہؒ نے دلکشی کے ساتھ جو پنجابی شعر پڑھا تھا، اس نے ان کے والد محترم کی دنیا ہی بدل ڈالی۔
 نخی شاہ محمدؒ کو کفر فرمایا کرتے تھے۔

”میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اللہ نے میرے معصوم بچے کے ذریعے مجھے نصیحت فرمائی۔“
 اس واقعے کے بعد حضرت سید نخی شاہ محمدؒ کی ریاضت و عبادت میں اضافہ ہو گیا..... اور تسبیح ظاہری کے دانے بڑھ کر کرتے ان پر معرفت کے اسرار و رموز ظاہر ہونے لگے۔



ان دونوں واقعات کو اکثر تذکرہ نویسوں نے حضرت بابا بلے شاہؒ کی کرامات سے تعبیر کیا ہے..... اور بعض نے واضح طور پر تحریر کیا ہے کہ آپ پیدائشی ولی تھے۔ اہل دنیا، پہلے تو کرامت کو مانتے ہی نہیں۔ اور اگر تسلیم بھی کرتے ہیں تو اسے مخصوص ریاضت اور عمر کے ایک خاص حصے سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ اس گروہ کے نزدیک کرامت، شہید ریاضت کا ردِ عمل ہے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کا مقالہ کی استاد کی نگرانی میں تحریر کرتا ہے۔ پھر یہ مقالہ اس بورڈ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، جو کئی اہل علم اور اہلین پر مشتمل ہوتا ہے۔ آخر میں بورڈ فیصلہ دیتا ہے کہ مذکورہ مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد تمام تعلیمی ادارے، مقالہ نگار کو ڈاکٹر تسلیم کر لیتے ہیں۔

بے شک! کرامت بھی صوفیت کی ایک اعلیٰ ڈگری ہے..... مگر یہ ڈگری کسی مرشد کی نگرانی میں کسی مدرسے یا خانقاہ سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ حق تعالیٰ کا ایک عطیہ خاص ہے۔

جسے چاہے، اس کو وہ سرمہ بنا دے

جسے چاہے، اس کو وہ منصور کر دے

یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے، جیسے کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

”ہم جسے چاہتے ہیں، اُسے بغیر حساب رزق عطا کرتے ہیں۔“

ہم اپنے گرد و پیش میں اس آیت مقدسہ کا عملی نفاذ دن رات دیکھتے ہیں..... ایک عالم و فاضل انسانی کے تقاضوں سے آشنا، مخفی، ہمہ وقت روزی کمانے میں مصروف رہتا ہے، مگر اسے مقررہ مقدار سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ایک کمتر شخص بے شمار دولت کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ قدرت کے اہرام کے چہرے سے ہزار کوششوں کے باوجود پردہ نہیں ہٹایا جاسکتا۔

قدرت کے اسی قانون کا اطلاق ”کرامت“ پر بھی ہوتا ہے۔ ایک بزرگ علمی دریافت کے اہل علم ہوتے ہیں، مگر ان سے زندگی بھر کسی کرامت کا اظہار نہیں ہوتا۔ دوسرے بزرگ نہ تو کوئی خاص علم رکھتے اور نہ ریاضت و مجاہدات کی کسی اعلیٰ منزل میں ہوتے ہیں..... مگر ان کی ذات سے بے شمار کرامات نکلتی ہیں۔ ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ چھ سال کی عمر میں حضرت سید عبداللہ (ؑ) کے حوالے سے جو اہم واقعات پیش آئے تھے، دراصل وہ ایک کم سن بچے کی کرامت ہی تھی۔ اکثر تفصیلات بھی موجود ہیں کہ جب جیون خان نے اپنے کھیتوں کو صبح و سلامت پایا تو اسی روز سے وہ حضرت شاہ کا بہت زیادہ احترام کرنے لگا تھا۔ اگر حضرت کسی راستے سے گزرتے اور جیون خان وہاں موجود ہوتا تو ادب کے ساتھ سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا۔ پھر بھی آپ قریب آتے تو بڑے عقیدت مندانہ انداز میں سلام کرتے تھے۔ حق میں دُعاؤں خیر کراتا۔ پھر جب حضرت بابا بلھے شاہ تشریف لے جاتے تو دوسرے لوگوں سے کہتا: ”یہ بچہ اپنے وقت کا دلی ہے۔“

اب رہا پیدائشی دلی کا معاملہ، تو یہ بھی کوئی ایسی انوکھی بات نہیں، جس کی مثالیں مستند تاریخ سے دی جاسکیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شیر خواری کی عمر میں اپنی والدہ محترمہ حضرت مریم کی عصمت و پاکیزگی کی دی..... اور گہوارے (جھولے) میں اس وقت کے بڑے بڑے دانش مندوں سے گفتگو کی۔ معاذ اللہ! بعض دنیا پرستوں کے نزدیک یہ تاریخی واقعات محض طلسمی افسانے ہیں تو پھر چلیں، سائنس میں قدرت کی اس عطائے خاص کا تجزیہ کرتے ہیں۔ کچھ سال پہلے پاکستان ٹیلی ویژن نے اپنے خزانے میں آٹھ سالہ بچے اور اس کے ماں باپ کا انٹرویو دکھایا تھا، جس نے علمی موضوعات پر جواب دے کر ایک بڑے عمر رسیدہ اہل دانش کو عاجز کر دیا تھا۔ اس آٹھ سالہ بچے کی ذہنی سطح پچاس سال کے لوگوں سے زیادہ زیادہ اور حافظہ غیر معمولی تھا۔

آئے دن ٹیلی ویژن پر ایسی خبریں بھی نشر ہوتی رہتی ہیں، جن میں ایک کم سن بچے کو شطرنج کے شاطروں سے کھیلتے ہوئے دکھایا جاتا ہے اور وہ مایہ ناز شاطر اس بچے سے مات کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قدرت کی پیدا کردہ اس صورت حال کو کیا نام دیں گے؟

حضرت امام شافعیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ایک دن محراب حرم کے نیچے کھڑے تقریر فرما رہے تھے اس وقت سینکڑوں انسان جمع تھے اور ان میں اہل علم کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اے حجاز والو!..... اے عراق والو!..... اے نام والو! جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، مجھ سے پوچھ لو۔“

ایک دورانِ مہجور فقیر اور امیر المؤمنین رحمۃ اللہ علیہ حضرت سفیان ثوریؒ ادھر سے گزرے اور حضرت امام شافعیؒ کا بیڑی سنا۔ اس وقت حضرت امامؒ کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔

پھر حضرت سفیان ثوریؒ یہ کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔ ”اللہ تعالیٰ نے آدھی عقل اپنی پوری مخلوق میں تقسیم کی ہے..... اور باقی نصف عقل اس قریبی النسل لڑکے کو عطا کی ہے۔“

اور یہ سب کچھ اسی قانونِ قدرت کے تحت ہے، جس کی وضاحت کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے فرمایا۔ ”ہم نے چاہے ہیں، بغیر حساب رزق عطا کرتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کی اس بخشش و عطا کا اطلاق صرف رزق پر ہی نہیں ہوتا۔ عقل، تدبیر، اقتدار اور ظاہری خُسن ووجاہت کی اسی دائرہ کار میں آتے ہیں۔

خائفِ کائنات کی اسی عطائے خاص کے باعث حضرت بابا بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ بھی پیدا کئی دلی تھے۔



ان دونوں واقعات کے رونما ہونے کے بعد حضرت سید خلی شاہ محمدؒ (درویش محمدؒ) نے بیٹے کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینی شروع کر دی۔ کچھ دن تک اپنے کتب میں پڑھایا، مگر اسے ناکافی سمجھ کر حضرت بابا بلھے شاہؒ کو قصور نہج دیا گیا۔

نصیر اُن دنوں پٹھانوں کا گڑھ تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی علوم کا مرکز بھی۔ جامع مسجد کے خطیب حافظ غلام مرتضیٰؒ نے فضل و کمال کی ہر طرف دھوم تھی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے حافظ صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ

لے لیا اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ مروجہ علوم کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ یہاں آپ نے عربی اور فارسی زبان پر دسترس حاصل کی۔ اکثر تذکرہ نویسوں کے مطابق حضرت بابا بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو ہندی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔

پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ حضرت بابا بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو استادِ گرامی کی بارگاہ سے تکمیلِ علم کی سند مل گئی۔ حضرت حافظ غلام مرتضیٰؒ نے اپنے ہونہار شاگرد کو مبارک دیتے ہوئے فرمایا۔

”عبداللہ! اب تو تم مطمئن ہو؟“

تخصیلِ علم کے دوران حضرت بابا بلھے شاہؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میری روح کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔ استادِ گرامی کا اشارہ اسی طرف تھا۔

”شاہِ امیری عقل تو مطمئن ہو گئی، مگر دل آسودہ نہیں ہوا۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ادب سے سر جھکائے ہوئے عرض کیا۔

”عبداللہ! میرے پاس جو کچھ تھا، میں نے بے دریغ تجھ پر لٹا دیا۔“ حضرت حافظ غلام مرتضیٰؒ نے فرمایا۔ ”تم خود کیل کو کہ میرا دامن خالی ہو چکا ہے۔“

”شاہ! میں تمام عمر آپ کا شکر گزار رہوں گا کہ اس درس گاہ نے مجھے آگہی بخشی..... مگر میرا دل پھر بھی پیاسا ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے لہجے میں عجیب سا کرب شامل تھا۔

حضرت حافظ غلام مرتضیٰؒ کچھ دیر تک شاگرد کی بات پر غور کرتے رہے، پھر آپ نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو بگھمائے ہوئے فرمایا۔ ”عبداللہ! میں ان استادوں میں سے نہیں ہوں جو بیک وقت انسان کے دل و دماغ کو مطمئن

کر سکے۔ میرے پاس تمہارا اتنا ہی حصہ تھا۔ دل کی تشنگی مٹانے کے لئے کوئی دوسرا تلاش کرو۔ نہیں۔
دو تو کسی مرشدِ روحانی کے مطب میں ملے گی۔“

”آپ اس مطب کی نشاندہی فرما دیجئے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے بڑے پرسوز لہجے میں اس درخواست کی۔

”دل کے مسیحا کا ملنا اتنا آسان نہیں ہوتا عبد اللہ!“ حضرت حافظ غلام مرتضیٰؒ نے نہایت شفقت سے گھر سے نکلوا اور ہمت کرو۔ عجب نہیں کہ تم اپنی مراد پا جاؤ۔ ارشادِ ربانی ہے کہ ہم انسان کو وہی کچھ دیتے ہیں کہ وہ کوشش کرتا ہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے کہ وہ صدقِ دل سے تلاش کرنے والوں کو خارج میں بھی اپنا ہاتھ دیتا ہے۔“

الغرض حضرت بابا بلھے شاہؒ محدثِ استادِ گرامی کی دعاؤں کے سائے میں قصور سے رخصت ہوئے۔ ایسے طیبِ روحانی کی تلاش تھی، جو سکونِ دل کی دوا دے سکے۔



کسی تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ قصور سے نکلنے کے بعد حضرت بابا بلھے شاہؒ کہاں تشریف لے گئے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آپ مرشدِ روحانی کی تلاش میں قریہ قریہ گھومتے رہے۔۔۔۔۔ مگر مقدر نے یاد رکھی کہ اس وقت پنجاب اور سندھ کے علاقے میں کئی نامور صوفی موجود تھے۔ لیکن حضرت بابا بلھے شاہؒ ان سے متعلق تھے۔

پھر ایک طویل عرصے تک مرشد کی جستجو میں سرگرداں رہنے کے بعد حضرت بابا بلھے شاہؒ پانڈو کے بھٹیاں تشریف لے آئے۔ بچپن کے دوستوں نے جواب جو ان ہو چکے تھے، آپ کی آمد پر حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ایک عالم ہونے کے باعث غیر معمولی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ بعض بے تکلف شاگردوں کا کیا تھا۔

”عبد اللہ! تُو تو بالکل بدل گیا۔“

وقت کے ساتھ ساتھ انسان بھی بدل جاتا ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ”کل ہم لوگ بچے اور نادان تھے۔۔۔۔۔ آج جو ان اور باشعور ہیں۔ آنے والے زمانے میں نہ جوں رہے۔ شعور۔ گردش اور انقلاب ہی اس دنیا کا مقدر ہے۔“

دیہات کے جاہل دوست، حضرت بابا بلھے شاہؒ کی گفتگو کے اسرار و رموز کو کیا سمجھتے؟ بس یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ”اب تُو مولوی ہو گیا ہے۔ ہماری باتیں تیری سمجھ میں کیسے آئیں گی؟“

پھر کچھ نوجوانوں نے عشقیہ لوک گیت گانا شروع کر دیا۔

پھر ایک شعر پر حضرت بابا بلھے شاہؒ کی حالت غیر ہو گئی۔ دردِ عشق جاگا تو آپ بھی دوسرے لوگوں کی رقص کرنے لگے۔ بچپن کے ساتھیوں نے بڑی حیرت سے آپ کی طرف دیکھا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ رقص میں رقص کر رہے تھے۔

پھر گیت بھی ختم ہو گیا اور رقص بھی۔۔۔۔۔ مگر حضرت بابا بلھے شاہؒ کا رقص جاری رہا۔ پھر جب بہت دیر ہوئی تو رقص کرنے لگے۔ بچپن کے ساتھیوں نے بڑی حیرت سے آپ کی طرف دیکھا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ رقص میں رقص کر رہے تھے۔

”عبد اللہ! تُو کہاں بدلا ہے؟ تُو تو بالکل بدل گیا۔“

”ہاں! شاید میری یہ عادت بدل بھی نہیں سکتی۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ ”پتہ نہیں، کوئی میرے کانوں میں کہتا ہے۔ رخص کر عبد اللہ!..... رخص کر۔“

یہ کہہ کر آپ دوستوں کے درمیان سے اٹھے اور گھر کی طرف جانے لگے۔

آپ کے والد محترم حضرت سید خلی شاہ محمدؒ کے ایک دوست یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے پہلے ہی گھر جا کر اطلاع دی تھی کہ آپ کا عالم وفاضل بیٹا، دیہاتیوں کے ساتھ ناچ رہا ہے۔

پھر جب حضرت بابا بلھے شاہؒ گھر پہنچے تو حضرت خلی شاہ محمدؒ (درویش محمدؒ) نے آپ کو تنہائی میں لے جا کر پوچھا۔ ”عبد اللہ! تم نے تصور میں رہ کر کیا حاصل کیا؟“

”اللہ حافظ صاحب کو جزائے عظیم دے کہ میرا دماغ سکون پا گیا۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے والد محترم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عرض کیا۔

”اور تمہارے دل کا کیا حال ہے؟“ حضرت سید خلی شاہ محمدؒ نے دوسرا سوال کیا۔

”اس کی وہی حالت ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اُداس لہجے میں عرض کیا۔ ”وہی اضطراب، وہی بے قراری اور ہیشت۔ بلکہ اس میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔“

”تم نے اپنے استاد گرامی سے اس کا علاج نہیں پوچھا؟“ بیٹے کی طرف سے والد محترم بھی فکر مند نظر آ رہے تھے۔

”طیب روحانی کے پاس اس کا علاج ہے..... مگر طیب کا پتہ نہیں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے حضرت حافظ غلام نقویؒ کے الفاظ دہراتے ہوئے عرض کیا۔ ”آپ ہی مجھے اس طیب کا پتہ بتادیں۔“

حضرت سید خلی شاہ محمدؒ نے بیٹے کو صبر و سکون کی تلقین کرتے ہوئے ایک وظیفہ بتا دیا۔ ”اسے پابندی کے ساتھ پڑھتے رہا کرو۔ اللہ مشکل کشائی فرمائے گا۔“



حضرت بابا بلھے شاہؒ، والد محترم کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھتے رہے اور مرشد روحانی کی جستجو کی آگ بھی سینے میں سلگتی رہی۔ ایک روز آپ عشاء کی نماز کے بعد والدہ محترمہ کے پاؤں دبا رہے تھے، مگر چہرہ مبارک سے گہری اُداسی نکلتی رہی۔

شفیق دہریان ماں نے بہت غور سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ”عبد اللہ! کیا بات ہے کہ تم میرے پاس ہوتے ہوئے بھی ڈور ڈور رہتے ہو۔“

”نہ تو آپ کے بہت قریب ہوں، مادر گرامی!“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے چونسکتے ہوئے کہا۔ ”جب سے گھر آئے ہو، ہر وقت اپنے خیالات میں غرق رہتے ہو۔ تمہیں کیا دکھ ہے بیٹے! ماں کو کیوں نہیں بتاتے؟“

حضرت بابا بلھے شاہؒ کی والدہ محترمہ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔

فرماں بردار بیٹے نے اپنی الجھن بیان کرتے ہوئے دعاؤں کی درخواست کی۔

والدہ محترمہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ ”عبد اللہ! میں تم سے راضی ہوں۔ اللہ تمہیں کبھی محروم نہیں کرے گا۔ ہمیشہ بامراد رہو گے۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ بہت دیر تک مادر گرامی کے سینے پر سر رکھے روتے رہے۔



پھر اسی رات حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ایک عجیب خواب دیکھا۔

ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی ہے اور حضرت بابا بلھے شاہؒ سفر کر رہے ہیں۔ موسم کی غیتوں کے باعث سایہ دار درخت کی تلاش ہے۔ چلتے چلتے چند درخت نظر آتے ہیں۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ آرام کی خاطر ایک کے سائے میں لیٹ جاتے ہیں۔ شدید چھکن کے باعث تھوڑی دیر بعد ہی آپ کو گہری نیند آ جاتی ہے۔ اتنے میں ایک تخت آسمان کی بلندیوں میں نظر آتا ہے۔ پھر وہ تخت بہت تیزی کے ساتھ زمین پر گرا رہا ہے..... اور اس جگہ آ کر رک جاتا ہے، جہاں حضرت بابا بلھے شاہؒ درخت کے نیچے لیٹے ہوئے تھے۔ نورانی صورت بزرگ جلوہ افروز تھے۔ ان کا جاہ و جلال دیکھ کر حضرت بابا بلھے شاہؒ اٹھے اور قریب جا کر کہان سے سلام کیا۔

”جیتے رہو فرزند!“ اجنبی بزرگ نے دعا دیتے ہوئے فرمایا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”میں سید عبداللہ شاہ بن سید درویش محمد قادری ہوں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے عرض کیا۔

”تم مجھے پہچانے؟“ بزرگ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے نہایت احترام کے ساتھ اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

”میں پانچویں پشت میں تمہارا جد امجد ہوں، سید عبدالکحیم۔“ بزرگ نے نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔

اس وقت شدید پیاس لگی ہے، کہیں سے پانی کا انتظام کرو۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنا مٹی کا پیالہ لے کر دوڑتے ہوئے گئے اور قریب کے گاؤں سے دودھ لے آئے۔

بزرگ سید عبدالکحیمؒ نے دودھ پیا اور پیالہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی طرف بڑھا دیا۔ ”اسے پی لو۔“ پیالہ

تھوڑا سا دودھ باقی تھا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے خوشی خوشی دودھ پی لیا۔

بزرگ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ”اللہ تمہیں سوز عشق بخشنے اور تمہارے سینے کو کھول دے۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے آمین کہا۔

آخر میں بزرگ نے ہدایت کی۔ ”کسی مرشد کامل کی اطاعت اختیار کرو۔“ اس کے ساتھ ہی تخت تیزی

بلند ہوا اور تھوڑی دیر بعد آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔

فوراً ہی حضرت بابا بلھے شاہؒ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ نے گہرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ محض ایک خواب تھا اور

کے بجائے اپنے کمرے میں موجود تھے۔

صبح ہوئی تو حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اپنے والد محترم سے رات کا خواب بیان کیا۔

حضرت سید سخی شاہ محمدؒ کے چہرہ مبارک پر بے پناہ خوشی کے آثار ابھرے اور آپ نے بیٹے کو مخاطب کر

فرمایا۔ ”عبداللہ! تم خوش نصیب ہو کہ تم نے خواب میں اپنے جد امجد کی زیارت کی..... مگر تم سے ایک بھول ہو گئی۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے حیرت زدہ انداز میں والد محترم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جب تمہارے جد امجد نے مرشد کامل کی اطاعت اختیار کرنے کا حکم دیا تھا تو تم نے ان ہی سے دریافت

ہوتا کہ وہ مرشد کامل کہاں ملے گا؟“ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے فرمایا۔

”بابا! میں پوچھنا چاہتا تھا مگر ان کے رعب و جلال کے باعث میری زبان کھل نہ سکی۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ

نہایت تاسف آمیز لہجے میں عرض کیا۔ ”یہ میری کم نصیبی ہے کہ میں نے کیسا سنہری موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔“

”گہراؤ نہیں فرزند!“ حضرت سخی شاہ محمدؒ نے بیٹے کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا۔
 ”مجھے یقین ہے کہ حق تعالیٰ تم پر دوبارہ کرم فرمائے گا۔ تم بہت جلد اپنے مورث اعلیٰ کی زیارت سے ایک بار
 ہرگز فراز ہو گے۔ اگر یہ سعادت میسر آجائے تو اس وقت تک ان کا دامن نہ چھوڑنا، جب تک وہ مرشد کامل کی
 نشاندہی نہ کر دیں۔“

اس دن کے بعد سے حضرت بابا بلھے شاہؒ بڑے پرسوز لہجے میں حضرت عبدالرحمن جامیؒ کی مشہور نعت مبارک کا
 پشتر پڑھا کرتے تھے۔

مشفرف گرچہ شد جامی ز لطفش
 خدایا ایں کرم بار دگر کن

(اگرچہ جامی اس کے لطف سے شرف یاب ہو چکا ہے، پھر بھی اے خدا اس پر دوبارہ یہ کرم کر)
 آفرے بار دعاؤں کے بعد حضرت سید عبدالکحیمؒ دوبارہ خواب میں نظر آئے۔
 حضرت سید عبدالکحیمؒ اب کی بار بھی تخت پر جلوہ افروز تھے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نہایت ادب کے ساتھ آگے
 بڑے اور اپنے جد امجد کے دست مبارک کو بوسہ دیا اور پھر خادموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔
 ”فرزند! تم کسی مرشد کامل کی بارگاہ میں حاضر ہوئے؟“ حضرت سید عبدالکحیمؒ نے بابا بلھے شاہؒ سے پوچھا۔
 ”سیدی! آپ ہی رہنمائی فرمائیں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے عرض کیا۔ ”خادم کی بینائی بھی کمزور ہے..... اور
 پائوں کی تاواں ہیں۔ اس حالت میں مرشد کامل کو کیسے پہچانوں گا؟ اور کس طرح ان کے آستانے تک پہنچوں؟“
 ”شاہ عنایت قادری شطاریؒ کے پاس جاؤ۔“ حضرت سید عبدالکحیمؒ نے مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔ ”شاہ صاحب
 اور میں مقیم ہیں۔ تمہارا روحانی مقصوم ان ہی سے وابستہ ہے۔ ایک بار مرشد کا دامن پکڑ لو تو پھر آخری سانس تک
 نہ چھوڑنا۔ سوالوں کی طرح ان کے آستانہ کرم پر حاضر ہونا۔ وہ جو کچھ عطا کر دیں، اسی پر قناعت کر لیتا۔ یہ
 حالات بہت نازک ہوتے ہیں۔ اگر تمہاری ارادت، عشق میں تبدیل نہ ہوئی تو پھر کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ صرف
 کس کا راستہ ہی منزلی نجات کی طرف جاتا ہے۔ باقی راستے محرومی کے راستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دونوں جہان کی
 معاون اور برکتوں سے سرفراز فرمائے۔“ اس کے ساتھ ہی حضرت سید عبدالکحیمؒ واپس تشریف لے گئے۔



غلاب سے بیدار ہوئے تو حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس وقت آپ کی وہی کیفیت تھی،
 بڑبڑوں کے شدید چھیڑے کھانے والے انھیں کی ساحل کے قریب پہنچ کر ہوتی ہے۔ صبح نماز فجر کے بعد حضرت بابا
 بلھے شاہؒ اپنا خواب والد محترم سے بیان کیا، جسے سن کر حضرت سید سخی شاہ محمدؒ بے حد ہسرور ہوئے۔

”فرزند! تمہیں نشان منزل مبارک ہو۔ اب یہ تمہارے حوصلے پر منحصر ہے کہ تم کتنے عرصے میں اپنا مقصود حاصل
 کرے ہو۔ حضرت شاہ عنایت قادری شطاریؒ کا نام تو بہت سنا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کے کمالات روحانی سے
 باخبر ہوں..... مگر تم مطمئن رہو کہ تمہارے لئے تمہارے جد امجد کی رہنمائی کافی ہے۔ مجھے تو ذاتی تجربات و
 کمالات نے بس اتنا یقین سکھایا ہے کہ طریقت کے راستے میں کبھی بڑے مشکل مقامات آجاتے ہیں۔ اگر تم بھی
 ایلے کی طرح سے دوچار ہو جاؤ تو اپنے مالک سے صبر و استقامت طلب کرنا۔“ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے بیٹے کو کم
 اندیشی نصیحتیں کیں، جو عالم خواب میں حضرت سید عبدالکحیمؒ کر چکے تھے۔

نصف میں سلسلہ قادریہ کا تعلق غوث اعظم حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ہے..... اور ”شطاریہ“

سلسلہ عظیم صوفی بزرگ حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ سے منسوب ہے۔ ”شطار“ کا مفہوم ہے زیادہ تیز اور اس سلسلے کے بزرگ جنگلوں میں رہ کر سخت ریاضتیں کرتے تھے۔ اسی لئے وہ خود کو ”شطاری“ کہتے تھے۔ اس کے صوفیاء اپنا سلسلہ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ سے ملاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جن بزرگوں سے پہلے تصوف کا یہ طریقہ رائج کیا، وہ حضرت عبداللہ شطاریؒ تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب پانچ واسطوں سے بایزید بسطامیؒ سے جاملتا ہے۔

حضرت بابا بلے شاہؒ جن بزرگ حضرت شاہ عنایتؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کے لئے لاہور تھے، وہ دونوں سلسلوں میں بیعت تھے۔ اس لئے ”قادری شطاری“ کہلاتے تھے۔

حضرت بابا بلے شاہؒ لاہور کے قریب پہنچے تو ایک عجیب سا خیال آپ کے دل میں آیا۔ ”یہ ضروری تو نہیں طالب علم کو ہر درس گاہ میں داخل مل جائے۔ اگر حضرت شاہ عنایتؒ نے مجھے اپنے حلقہ بیعت میں شامل کرنے انکار کر دیا تو پھر میں کدھر جاؤں گا؟“ حضرت بابا بلے شاہؒ بہت دیر تک اپنے آپ سے یہی ایک سوال کرتے۔ سوال بہت پریشان کن اور ہمت شکن تھا۔ آخر آپ نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دی۔ ”مجھے مرید کرنے پر صاحب کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ میں ایک عالی نسب سید زادہ ہوں۔“

اس خیال نے حضرت بابا بلے شاہؒ کی بڑی ڈھارس بندھائی اور آپ اطمینان قلب کے ساتھ باقی سزا کے حضرت شاہ عنایتؒ قادری شطاریؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔

اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ درس دے رہے تھے اور خانقاہ میں سینکڑوں طالبان شوق جمع تھے۔ داخل ہوتے ہی حضرت بابا بلے شاہؒ کو محسوس ہوا، جیسے آپ حصار نور میں آ پہنچے ہوں۔ اینٹوں اور پتھروں کے سے بھی ایک مرد خدا کی روحانی تاثیر منکس ہو رہی تھی۔ حضرت بابا بلے شاہؒ نے دل ہی دل میں اپنے ہوا حضرت سید عبدالکلیمؒ کے لئے دعائے خیر کی کہ ان کی رہنمائی کے سبب آپ اپنی منزل مقصود تک آ پہنچے۔ ہجوم پر گہرا سکوت طاری تھا..... اور حضرت شاہ عنایتؒ کی پُر جلال آواز، مجلس عرفاں میں گونج رہی تھی۔ بابا بلے شاہؒ بھی خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔

آخر حضرت شاہ عنایتؒ قادری شطاریؒ کا درس ختم ہوا اور تمام طالبان شوق ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ بس حضرت بابا بلے شاہؒ رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ آپ اپنا مدعا بیان کرتے، حضرت شاہ عنایتؒ نے فرمایا: ”چلے گئے میاں! تم بھی اپنے گھر جاؤ۔“

”میں کہاں جاؤں کہ میرا گھر تو اسی دیوار کے سائے میں ہے۔“ حضرت بابا بلے شاہؒ نے نہایت پُر سوز و غم عرض کیا۔

”ہمیں معلوم ہے کہ تم بہت دُور سے آئے ہو۔“ حضرت شاہ عنایتؒ قادری شطاریؒ نے فرمایا۔ ”مگر ہمارا گھر اس قابل نہیں ہے کہ تمہیں یہاں ٹھہرا سکیں۔“

حضرت بابا بلے شاہؒ نے عرض کیا۔ ”حضور! میں مہمان بننے کب آیا ہوں؟ میں تو خدمت کے لئے ہوں۔“

صاحبزادے! یہی بات تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔“ حضرت شاہ عنایتؒ قادریؒ نے فرمایا۔ ”جب کسے لی جاتی ہے تو اسے معاوضے کے طور پر کچھ دیا بھی تو جاتا ہے..... اور میں ایک تہی دامن انسان ہوں۔ میرے تمہیں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔“

حضرت شاہ عنایتؒ نے اشارات و کنایات میں سب کچھ سمجھا دیا تھا..... مگر حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اس کا ابلاغ نہ ہو سکا۔ آپ نے بے اختیار عرض کیا۔

”میں بلا معاوضہ آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میری مزدوری یہی ہوگی کہ بس آپ ایک نظر مجھے دیکھ لیا کریں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے لہجے میں بڑی وارفتگی تھی۔

حضرت شاہ عنایتؒ نے ایک نظر حضرت بابا بلھے شاہؒ کی طرف دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔ ”میاں! ہمارا یہ دستور نہیں ہے کہ مزدور سے کام تو لے لیں مگر پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا نہ کریں۔“

شاہ عنایتؒ کی طرف سے مسلسل انکار دیکھ کر حضرت بابا بلھے شاہؒ گھبرا س گئے۔ کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو عرض کرنے لگے۔ ”میری مزدوری قرض رہے گی۔ جب آپ کے پاس ہو تو ادا فرما دیجئے گا۔ مگر مجھے اپنی خدمت سے نرم نہ کریں۔“

”انسانی زندگی کا کیا بھروسہ؟“ ایک بار پھر حضرت شاہ عنایتؒ نے انکار کی روش اختیار کی۔ ”اگر موت آگئی تو میں تمہارا قرض ادا کئے بغیر ہی مر جاؤں گا..... اور مجھے یہ گوارا نہیں۔ میرے ذاتی اعمال کا اتنا بوجھ ہے کہ میں نہارے قرض کا بار کیسے اٹھاؤں گا۔“ یہ کہہ کر حضرت شاہ عنایتؒ خانقاہ سے جانے لگے۔

شدید باپوسی کے عالم میں حضرت بابا بلھے شاہؒ آگے بڑھے اور انتہائی دل گرفتہ لہجے میں عرض کرنے لگے۔ ”تو بکھڑے بھارت دی گئی تھی کہ میرا روحانی مقوم آپ سے وابستہ ہے؟“

حضرت شاہ عنایتؒ نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو غور سے دیکھا مگر سکوت اختیار کیا۔

”نہا! میں کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں برسوں بھٹکا ہوں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی آواز سے رقت جھلکنے لگی تھی۔ ”میں آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کی درخواست کر رہا ہوں۔ خدمت سے میری یہی مراد ہے۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ کی التجا کے جواب میں حضرت شاہ عنایتؒ نے فرمایا۔ ”تمہیں خواب میں جو بشارت دی گئی تھی، اسی پر جگہ درست ہے۔ مگر میاں! یہ بھی تو سوچو کہ تم عالی نسب سیدزادے اور میں ایک کم ذات انسان۔“

ال انکشاف نے حضرت بابا بلھے شاہؒ پر سکتے کی سی کیفیت طاری کر دی۔

”سیدزادے! تمہیں میری ذات معلوم ہے؟“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کو بحرِ حیرت میں غوطہ زن پا کر حضرت شاہ عنایتؒ نے قارڈیؒ نے فرمایا۔ ”میں ایک باغبان کا بیٹا ہوں..... اور اپنی قوموں پر فخر کرنے والے اس معاشرے میں باغیوں کو عزت کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اسی لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ جس دروازے پر تم آئے ہو، اس کا ایک مزدوری دینے کے قابل نہیں ہے۔“

ابھی حضرت شاہ عنایتؒ قارڈیؒ کے الفاظ کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ وارفتہ ہو کر آپ کے نزل سے پلٹ گئے۔

”میں اس دنیا کی رسم و راہ کو نہیں جانتا۔ میرے لئے تو آپ ہی مخدوم ہیں..... اور آپ ہی بادشاہ۔“

حضرت شاہ عنایتؒ قارڈیؒ کچھ دیر تک حضرت بابا بلھے شاہؒ کی یہ کیفیت دیکھتے رہے۔ ان کے لہجے میں بڑا خلوص تھا۔ بڑی ہنس تھی۔ آخر حضرت شاہ صاحبؒ ختم ہوئے اور حضرت بلھے شاہؒ کو اٹھا کر گلے سے لگالیا۔

مردمون کا سیدہ انوار الہی کا خزانہ..... اور اسرارِ ربانی کا دفتینہ ہوتا ہے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کو محسوس ہوا کہ جیسے آپ کا ہر جسم کی نادیہ آگ میں جل اٹھا ہے۔ اس کی سوزش سے بے قرار ہو کر آپ نے عرض کیا۔

”مرشدی! یہ کیسی آگ ہے، جس میں میرا تن من سب پھنکا جا رہا ہے۔“

”سید! یہ آگ تو خود تیرے اندر موجود ہے۔ آج تیز ہوا چلی تو دبا ہوا شعلہ بھڑک اٹھا ہے۔“

اس کے بعد حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اپنے حلقہ بیعت میں شامل فرمایا۔
نے ایک قادری کا روحانی مقوم دوسرے قادری سے وابستہ کر دیا تھا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ، حضرت شاہ
جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے اور حضرت شاہ عنایتؒ سلسلہ قادریہ سے روحانی تعلق رکھتے تھے۔

پھر ایک دن تنہائی میں حضرت شاہ عنایتؒ نے اپنے جاں باز مرید کو مخاطب کرتے ہوئے، بڑے ہوشیار
میں حضرت عبدالرحمن جامیؒ کا یہ مشہور شعر پڑھا۔

بندۂ عشق شدی، ترک نسب کن جامی

کندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

(ترجمہ: اے جامی! تو بندۂ عشق بن جا اور اپنے خاندانی تفاخر کو ترک کر دے..... کیونکہ عشق کے راستے

فلاں ابن فلاں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔)

یہ شعر بھی اسی واقعے کی طرف اشارہ تھا، جب حضرت بابا بلھے شاہؒ نے لاہور آنے سے پہلے سوا فاضل

ایک عالی نسب سید زادہ ہوں..... اور مجھے مرید کرنے میں حضرت شاہ عنایت قادریؒ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔



حضرت بابا بلھے شاہؒ کی بیعت کے سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی بہت شہرت رکھتا ہے۔

جب آپ لاہور پہنچے تو اس وقت حضرت شاہ عنایت قادریؒ اونچی مسجد میں پیش امام تھے۔ یہ مسجد ”محلہ دارالعلوم“

میں واقع تھی۔ اس زمانے میں شاہ عنایتؒ کا معمول کچھ اس طرح تھا کہ آپ باقاعدہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے

تھے اور ظہر یا عصر کے بعد درس دیا کرتے تھے۔ یہ درس عمومی نوعیت کا ہوتا تھا۔ مثلاً غسل اور وضو کے طریقے

بندی کے آداب..... نماز کے ظاہری ارکان..... اور دیگر پند و نصائح وغیرہ..... حضرت شاہ عنایت قادریؒ

حاضرین مجلس کے سامنے کبھی تصوف کے اسرار و رموز پر گفتگو نہیں کی..... اور نہ کبھی آپ نے عام دینی مسائل

والے مسلمانوں کو سخت ریاضت اور مجاہدات کی تلقین فرمائی۔

اگر کبھی کوئی شخص اس قسم کا سوال کرتا تو آپ صاف صاف فرماتے۔ ”اللہ تعالیٰ کسی شخص پر اس کے ثمر

زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ریاضتوں اور مجاہدوں کا بوجھ ایک کو بوجھ گراں سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ آپ لوگ خودی

کہ ایک کمزور جسم رکھنے والا شخص ڈھالی تین من کی بوری کا وزن کس طرح اٹھا سکتا ہے؟ وہ تو چند قدم چلے

ہی زمین پر گر جائے گا۔ اس کے برعکس وہ تندرست و توانا مزدور، جسے قدرت نے غیر معمولی طاقت بخشی ہے

اٹھا کر پہاڑ پر بھی چڑھ جاتا ہے۔ عام مسلمانوں کے لئے اسی میں غایت ہے کہ وہ نماز روزے کی پابندی کر

درود شریف و استغفار پڑھتے رہیں۔ یہی ان کا وظیفہ ہے اور یہی ان کی ریاضت۔“

حضرت شاہ عنایت قادریؒ شطاریؒ نماز کی امامت کرنے اور مختصر درس دینے کے بعد اپنی خانقاہ میں ٹہر

جاتے۔ وہاں اہل علم بھی موجود ہوتے..... اور اہل طلبہ بھی۔ خانقاہ میں آپ کا انداز درس بدل جاتا۔ ثریہ

طریقت کے موضوع پر عالمانہ مباحث ہوتے..... اور مریدوں کی روحانی تربیت کی جاتی۔

بیعت کے سلسلے میں حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا ایک خاص انداز تھا۔ جب بھی کوئی شخص مرید ہونے کے

خانقاہ میں حاضر ہوتا تو آپ اسے کھلے الفاظ میں تاکید کرتے۔

”طریقت ایک خارزار ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ لوگ اپنے پاؤں زخمی کر لیں..... اور پھر در ماندہ ہو کر اُدے پاؤں دار تے سے یہ کہتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جائیں۔ عنایت کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس نے نہیں مرداد کیا..... اور ہمارا بہت ساقیتی ”وقت“ برباد کر ڈالا۔“

پھر اہل مجلس کو مخاطب کر کے نہایت رقت آمیز لہجے میں فرماتے۔ ”واقعی، وہ لوگ سچ کہتے ہیں۔ عنایت تو خود کی کی عنایت کا محتاج ہے۔ وہ تو بس بحکم خدا تمہیں راستہ دکھا سکتا ہے..... اور تمہاری کامیابیوں کے لئے دعا کر سکتا ہے کہ کن تعالیٰ تمہیں تمہاری محنت و کوشش کے ثمرات عطا کرے اور تم پر اس دُشوار سفر کو آسان تر کر دے۔“

اُنکو لوگ حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی یہ اثر انگیز تقریر سن کر واپس چلے جاتے..... مگر کچھ طالبان معرفت بضد رہے کہ انہیں حلقہ ارادت میں شامل کر لیا جائے۔ ایسے افراد کے لئے حضرت شاہ عنایتؒ کچھ کڑی شرائط پیش کر رہے۔ اگر وہ لوگ ان شرائط کی تکمیل کر دیتے تو حضرت شاہ صاحبؒ انہیں اپنا مرید بنالیتے۔

جب حضرت بابا بلھے شاہؒ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کی درخواست کی تو حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے حسب دستور ان کے سامنے بھی مندرجہ ذیل شرائط پیش کر دیں۔

”پانچ سو روپے کے طلائی ننگن، پانچ سو روپے نقد، ایک عربی النسل گھوڑا اور ایک زرنگار پوشاک جس کی قیمت پانچ سو گنہ ہو..... میری خدمت میں بطور نذر پیش کرو۔ پھر تمہیں بیعت سے سرفراز کیا جائے گا۔“

حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی پیش کردہ شرائط سن کر حضرت بابا بلھے شاہؒ حیرت زدہ رہ گئے۔ ”شیخ! ان ساری چیزیں حاصل میری استطاعت سے باہر ہے۔ میں تو ایک غریب شخص ہوں۔“

”تمہیں تو غیب سے روزینہ (تنخواہ) بھی ملتی ہے۔“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ، حضرت عنایت قادریؒ کی اس قوت کشف پر حیران رہ گئے۔ غیب سے روزینہ (تنخواہ) ملنے کا انہیں اس طرح ہے کہ جب حضرت بابا بلھے شاہؒ کے جد امجد حضرت سید عبدالکحیمؒ خواب میں تشریف لائے تھے تو آپ نے فرمایا تھا۔

”فرزند! اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمہارا روزینہ دس روپے مقرر کر دیا ہے۔ اب تم فکرِ معاش سے بے نیاز ہو کر مرشدِ کامل کی تلاش کرو۔“

پھر یہ غیب سے مقرر کردہ روزینہ، ہر ماہ کی ایک مقررہ تاریخ کو، نماز کے مصلے کے نیچے سے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو مل جاتا تھا۔ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے اسی روزینے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”شیخ! مجھے دس روپے روزینہ ملتا ہے۔ اگر میں وہ ساری رقم جوڑتا رہوں تو چار سال میں آپ کی صرف ایک ٹرٹ پوری ہوگی۔ یعنی پانچ سو روپے نقد..... باقی شرائط کی تکمیل کے لئے اگر دن رات محنت و مزدوری کروں تو دس ہند سال اور بیت جائیں گے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے چہرہ مبارک پر اذیت و کرب کے سائے لرزنے لگے۔ یہ وہی صورت حال تھی کہ جب برسوں کا دُشوار گزار سفر طے کر کے ایک آبلہ پاسبان سفر، منزل کے قریب پہنچے تو منزل اس سے ہزاروں کوس دُور ہو جائے۔ قارئین پر واضح رہے کہ یہ واقعہ تین سو سال پہلے پیش آیا تھا..... اور اس دن ایک روپے کی قیمت آج کے ایک ہزار روپے کے برابر تھی۔

”تو پھر کسی اور مرشد کا آستانہ دُھونڈ لو۔“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔ ”یہاں بہت سے مولیٰ ہیں، جو تمہیں کسی شرط کے بغیر بھی اپنا مرید بنالیں گے۔“

”ہزاروں دن اور ہزاروں راتیں برباد کر کے تو اس در تک پہنچا ہوں۔ اب یہاں سے اُٹھ کر کہاں جاؤں گا؟“

اپنے دل کا رد بیان کرتے ہوئے حضرت بابا بلے شاہؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
 ”تمہاری حالت کچھ بھی سہی فرزند! مگر میری خانقاہ کا یہی دستور ہے۔ میں اپنی شرائط کی تکمیل کے بغیر کسی بیعت میں شامل نہیں کرتا۔“ یہ کہہ کر حضرت شاہ عنایت قادریؒ اپنے حجرہ خاص میں تشریف لے گئے۔
 حضرت بابا بلے شاہؒ بہت دیر تک تنہا، اُداس بیٹھے رہے۔ پھر آپ خانقاہ سے اُٹھ کر چلے تو یوں محسوس ہوا کہ آپ سے زیادہ شکستہ اور محروم انسان اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔



اس واقعے کے بعد حضرت بابا بلے شاہؒ کا اضطراب عروج کو پہنچ گیا تھا۔ نیند کے ساتھ آپ کی بھوک بھی ختم تھی۔ یہاں تک کہ آپ لاہور کی شہری حدود سے نکل کر دیارے راوی کے کنارے ایک درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ پانچوں وقت کی نماز کی ادائیگی کے بعد آپ ایک ہی دعا فرماتے تھے۔
 ”اے اللہ! اے مشکل کشائے عالم! میری مشکل دُور فرما کہ تیرے سوا کوئی کارساز نہیں۔“



جب بے چینی حد سے بڑھ جاتی تو حضرت بابا بلے شاہؒ کی زبان مبارک پر حرف شکایت بھی آ جاتا..... اور اپنے جد امجد حضرت سید عبدالکَلیمؒ کو عاتبانہ طور پر مخاطب کر کے فرماتے۔
 ”آپ نے بھی مجھے کیسے مرشد کے حوالے کر دیا ہے، جو صوفی ہوتے ہوئے بھی اتنی قیمتی اشیاء طلب کرتے ہیں۔ میں کیسے پوری کروں ان کی شرائط؟ نہ محنت و مزدوری سے اتنی رقم حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کوئی دوا ہزاروں قرض دے سکتا ہے؟“

بعض تذکروں میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ جب حضرت بابا بلے شاہؒ کی مایوسی انتہا کو پہنچ گئی تو آپ نے دربارِ مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اے راوی! کیا ہی اچھا ہو کہ تُو مجھے اپنی لہروں میں چھپالے اور میں شرمندگی سے فکا جاؤں۔ کبھی کبھی حضرت بابا بلے شاہؒ اس طرح بھی سوچتے۔ ”جب کسی مرشدِ کامل کا فیضِ صحبت میری قسمت میں نہیں ہے، پھر ہنگاموں سے بھری اس دنیا میں رہنے سے کیا حاصل؟ ترکِ دنیا کرو اور کسی گوشہ گمنامی میں زندگی کے دن گزار دو۔ اہل دنیا سے طعنہ ناپافت کون سنے؟“

صوفیاء کی اسی ذہنی تکفیش کو مرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ ناپافت

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

آخر اسی ذہنی تکفیش اور اذیت میں کئی روز گزر گئے۔ اور پھر ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت بابا بلے شاہؒ ایک درخت کے نیچے لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے اور آنکھوں سے وہی رنگِ فریاد نمایاں تھا کہ کب تک اس وادیِ عشق میں بیمار دل کے ساتھ تنہا بھٹکوں گا..... اور کب میرا مسیحا آئے گا؟ حضرت بابا بلے شاہؒ ہی خیالات میں غرق تھے کہ یکایک آپ کو ایک پُر جلال آواز سنائی دی۔
 ”لڑکے! میری بات سنو۔“

حضرت بابا بلے شاہؒ گھبرا کر اُٹھے۔ سامنے عربی النسل گھوڑے پر سوار ایک نقاب پوش شخص کھڑا تھا۔ حضرت بابا بلے شاہؒ بے دلی کے ساتھ اُٹھے اور نقاب پوش سوار کے پاس جا کر خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔
 ”مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔“ نقاب پوش نے حضرت بابا بلے شاہؒ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میں ایک سار

ہوں اور دریا میں غسل کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس کے لئے میری اجازت کی کیا ضرورت ہے؟“ حضرت بابا بلے شاہؒ نے بے نیازانہ لہجے میں کہا۔ ”اللہ کی بات ہوئی زمین ہے..... اور اسی کے حکم سے دریا بہہ رہا ہے۔ یہ کسی انسان کی ملکیت نہیں۔ جس کا جی چاہے، پانی پیے۔ اور جس کا جی چاہے، اس میں نہائے۔“

نقاب پوش کو حضرت بابا بلے شاہؒ کی بات بہت پسند آئی۔ ”لڑکے! میری مجبوری یہ ہے کہ میں اس قیمتی پوشاک کو بہن کو غسل نہیں کر سکتا۔ گھوڑے کے فرار ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ اگر تم میری ان چیزوں کی حفاظت کا وعدہ کرو تو میں دریا میں نہالوں۔“

حضرت بابا بلے شاہؒ نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

نقاب پوش سوار نے اپنی پوشاک کی جیب سے ایک تھیلی نکالی اور حضرت بابا بلے شاہؒ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں پانچ سو روپے ہیں۔“

اس کے بعد نقاب پوش نے اپنی لمبی عبا کی آستینیں چڑھا کر سونے کے کنگن اُتارے اور انہیں بھی حضرت بابا بلے شاہؒ کے سپرد کر دیا۔ آخر میں اپنی قیمتی پوشاک اُتاری اور تہ بند پہنے ہوئے دریا میں اُتر گیا۔

حضرت بابا بلے شاہؒ نے غور سے ان چاروں چیزوں کو دیکھا۔ پانچ سو روپے..... سونے کے کنگن..... قیمتی پوشاک..... اور عربی النسل گھوڑا..... حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے مرید بنانے کے لئے یہی چار شرائط تو پیش کی تھیں۔ حضرت بابا بلے شاہؒ نے سوچا اور بڑے خسر آمیز لہجے میں کہا۔

”کاش! یہ تمام اشیاء مجھے میسر ہوتیں تو آج میں دشتِ تہائی میں اکیلا نہ بھٹک رہا ہوتا اور مجھے حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی رفاقت میسر ہوتی۔“

یہ کہہ کر حضرت بابا بلے شاہؒ نے نقاب پوش اجنبی کی طرف دیکھا جو نہایت اطمینان سے نہا رہا تھا۔ اچانک اُس شخص نے غوطہ لگایا۔ حضرت بابا بلے شاہؒ کا خیال تھا کہ وہ ایک ماہر تیراک ہے۔ غوطہ لگانے کے کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اُپ آئے ابھرے گا۔ مگر جب کئی منٹ گزر گئے تو حضرت بابا بلے شاہؒ کو تشویش ہوئی۔ پانی کی سطح پُر سکون تھی..... اور زباب کی ہلچل کا کس تک نہیں تھا۔ پھر کچھ اور وقت گزر گیا لیکن نقاب پوش سوار نمودار نہیں ہوا۔ حضرت بابا بلے شاہؒ کا اضطراب بڑھنے لگا۔ آپ نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور دریائے راوی کے کنارے کنارے اجنبی شخص کی تلاش میں دُور تک چلے گئے۔ پھر اسی مقام پر لوٹ آئے، جہاں اجنبی شخص دریا میں اُترا تھا۔ ظہر سے عصر تک حضرت بابا بلے شاہؒ پر یہی اضطرابی کیفیت رہی۔ آخر آپ کو یقین ہو گیا کہ دریا کی لہروں نے اس نقاب پوش کو آغوشِ لہروں پہنچا دیا ہے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔

”پھر میں ان چیزوں کا کیا کروں؟“ حضرت بابا بلے شاہؒ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

”دوسرے ہی لمحے ایک عجیب خیال آپ کے ذہن میں ابھرا۔ ممکن ہے، قدرت نے اسی طرح میری مشکل کشائی کی ہو..... اور وہ شخص مجھے یہ چیزیں فراہم کرنے ہی کے لئے آیا ہو۔“

اس خیال کے آتے ہی حضرت بابا بلے شاہؒ گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی خانقاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

پھر جیسے ہی آپ لاہور شہر میں داخل ہوئے، کچھ لوگ تیزی سے آگے بڑھے اور انہوں نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ ”بچے اُتر!“ ایک شخص نے ڈانٹ کر کہا۔

”کیوں؟“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تم لوگ کون ہو جو مجھے اس طرح حکم دے رہے ہو؟“
 ”ہم حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے خادم ہیں۔“ کئی لوگوں نے بیک زبان کہا۔ ”یہ گھوڑا ہمارے شاخ ہے جسے چرا کر تم بھاگ رہے ہو۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ گھوڑے کی پشت سے نیچے اتر آئے اور سخت لہجے میں ان لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ”میں چور نہیں ہوں۔ مجھے یہ گھوڑا دریائے راوی کے کنارے ملا تھا۔“

”یہ ساری باتیں شیخ کے سامنے بیان کرنا۔“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے خدمت گاروں نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ایک نہیں سنی اور آپ کو گھیرے میں لے کر خانقاہ پہنچے۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے اپنے خدمت گاروں کا بیان کردہ پورا واقعہ سنا اور ایک خادم کو حکم دیا۔ ”گو۔ کو اس جگہ باندھ دو اور تم لوگ جاؤ۔“

اس کے بعد حضرت شاہ عنایت قادریؒ، حضرت بابا بلھے شاہؒ کو لے کر اپنے حجرۂ خاص میں پہنچے۔ ”اب فرزند! کیا واقعہ ہے؟“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے پانچ سو روپے کی تھیلی، سونے کے ننگن اور غرق ہو جانے والے نقاب پوش کی خدمت میں حاضر ہو رہا تھا کہ خدمت گاروں نے چور سمجھ کر پکڑ لیا۔

”تم چور کیسے ہو سکتے ہو؟“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے ایک مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ”طالب حق ہو۔“

”اللہ اس شخص کی مغفرت فرمائے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اجنبی نقاش پوش کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”میں نے تو یہی سمجھا تھا کہ اس طرح غیب سے میری مدد کی گئی ہے، تاکہ میں آپ کی خدمت کی تکمیل کر کے حلقہٴ ارادت میں شامل ہو سکوں۔“

”ہم بھی اس شخص کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”مگر کیا تم تائیدِ نبی پر یقین رکھتے تھے؟“

”بے شک! مجھے حق تعالیٰ کی تائید و نصرت پر پورا یقین تھا۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ہر جوش لہجے میں عرض کیا۔ ”جب تمہیں تائیدِ نبی پر اتنا ہی یقین تھا تو پھر اپنی زندگی کا خاتمہ کیوں کر دینا چاہتے تھے؟“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے اس مضطرب نوجوان سے پوچھا، جسے مرشدِ کامل کی تلاش تھی..... اور جو مایوس ہو کر موت کی نذر کرنے لگا تھا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ کو سکتہ سا ہو گیا۔ ایک بار پھر ان کے دل کی کیفیت حضرت شیخ پر ظاہر ہو گئی تھی۔ ”دل کی بات اپنے اللہ سے کہی ہوتی کہ مجھے استقامت دے۔“ حضرت شیخ عنایت قادریؒ نے ہر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”دریا سے کیوں کہا کہ اے راوی! تُو مجھے اپنی لہروں میں چھپالے۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے گھبرا کر حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف دیکھا۔

”تمہاری دلجوئی کے لئے اس نقاب پوش کو دریا کی لہروں میں چھینا پڑا۔“

ابھی حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ انتہائی وارفتگی کی حالت میں نشست سے اُٹھے اور آگے بڑھ کر حضرت شاہ صاحبؒ کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ انسان اپنا چہرہ نقاب میں چھپا

ہے، مگر ایک مخصوص ساخت اور رنگ کی وجہ سے اپنی آنکھیں نہیں چھپا سکتا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے بھی نقاب پوش کی آنکھیں پہچان لی تھیں..... اور وہ آنکھیں حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی تھیں۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ، حضرت شاہ صاحبؒ کے قدموں میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہاں انداز میں نامور صوفی شاعر حضرت مولانا عبدالرحمن جامیؒ کا یہ مشہور مصرع پڑھ رہے تھے۔

خود تیغ زد ی برمن نام دگراں کردی
(خود مجھ پر تلوار پہنچی اور دوسروں کے نام کر دیا)

حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور نہایت شفقانہ لہجے میں فرمایا۔ ”میرا اللہ! جب تم ہمارے ہو چکے ہو تو ہم تمہیں اس طرح کیسے چھوڑ دیتے؟ پیر دی ہے، جو اپنے مرید کے ہر مال پر نظر رکھے۔ ایک بار کسی کا ہاتھ پڑے تو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے، جب تک مسافر کو اس کی منزل مقصود تک نہ پہنچا دے۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ بہت دیر تک حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے قدموں میں بیٹھے روتے رہے۔ ”کیا عنایت ہے کہ خود ہی شرائط عائد کیں..... اور جب کسی کو مجبور پایا تو خود ہی ساری شرائط پوری کر دیں۔ کیا انداز عنایت ہے اور کیا شان کرم ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ پر جذب کی کیفیت کے ساتھ ساتھ رقت بھی طاری تھی۔ ”سیدی! میری نظر بہت کمزور ہے، نظر چاہتا ہوں..... دل و دماغ میں دوسو سے اور اندیشے بہت اٹھتے ہیں..... اس لئے یقین کامل کا خواستگار ہوں۔“

”اٹھو! سید عبداللہ!“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے بابا بلھے شاہؒ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ تمہارے اندازوں سے کہیں زیادہ رحیم و کریم ہے..... وہ تمہاری نظر کو رسائی اور گہرائی بھی بخشنے لگا..... اور دل کو حالت یقین بھی۔“

حضرت شاہ عنایت قادریؒ بہت دیر تک حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اپنے سینہ مبارک سے گلے لگائے رہے..... وہ بے جزو اسرار معرفت کا متحین تھا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ کو محسوس ہوا کہ صدا ہانور کی لہریں ہیں، جو آپ کے دماغ سے اُتر کر دل کی گہرائی میں جذب ہو رہی تھیں۔ پھر یکایک آپ کو سینے کے اندر ایک تپش سی محسوس ہوئی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ بے قرار نظر آنے لگے۔ ”کیا ہوا فرزند؟“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے پوچھا۔

”سیدی! بہت زیادہ گرمی محسوس ہو رہی ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

”یہ عشق کی ہلکی ہلکی آنج ہے سید عبداللہ!“ حضرت شاہ عنایتؒ نے اپنے مخصوص عارفانہ تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ”بہن! فراق و مجبوری کی تند و تیز ہوائیں چلیں گی تو یہ آنج لپٹوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ پھر جو ماسوا ہے، جل جائے گا..... اور جوازل سے موجود ہے، وہی باقی رہ جائے گا۔“

”سیدی! میں سکون چاہتا ہوں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے عرض کیا۔ ”عاشق کی معراج یہی ہے کہ وہ دیدارِ یار کے لئے ہر وقت کوچہ محبوب کا طواف کرتا رہے۔“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے فرمایا۔ ”عاشق جانناز کو فراق دوست میں اتنا جلنا چاہئے کہ اس کی سانسیں اور جسم شعلہ بن جائیں۔ اللہ دینا اس شعلے کو دیکھیں تو خاکستر ہو جائیں..... اور پھر اہل طلب کے لئے یہی راہِ اکسیر بن جائے۔ سید

عبداللہ! یہی سوز عشق تمہارا مقدر ہے..... اور یہ آگ بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔“
حضرت عنایت شاہ قادریؒ نے چند الفاظ میں ”نظر اور دل“ کا قلفہ سمجھا دیا تھا۔
اُردو کے منفرد شاعر اصغر گوٹھ دی نے سالکوں اور عارفوں کی اس کیفیت کو بڑے دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے۔

نظر وہ ہے جو اس کون و مکان کے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے، بیکار ہو جائے



حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کرنے کے بعد حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے آپ کو ریاضت کی تلقین فرمائی۔ چونکہ ”شطاریہ“ سلسلے کے بزرگوں کا یہی طریقہ تھا۔ اس خانوادے کے لوگ دن رات الہی میں غرق رہتے..... اور ایسے ایسے مجاہدات کرتے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ بعض نادان اور دنیا دار لوگ تصوف کے ان طریقوں پر علم و آگہی کے بغیر جاہلانہ اعتراض کر دیتے ہیں کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو سخت لادین برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دیتا..... یہ ہندو جوگیوں، رشیوں اور مہنوں کا طریقہ ہے..... رہبانیت ہے۔ مسلمان صوفیاء کے طریقوں کو ہندو سادھو سنتوں کے اعمال سے اس لئے تھمیسہ نہیں دی جاسکتی کہ صوفیائے اکرم خدائے واحد اور خاتم النبیین حضور اکرم ﷺ پر ایمان کامل رکھتے ہیں..... اس کے برعکس سادھو سنت اور رشی مہن ریاضتوں کے باوجود مشرک اور بت پرستی پر اعتقاد رکھتے ہیں..... اور جہاں تک رہبانیت کا تعلق ہے تو اسلام صریحاً اس کی ممانعت ہے مگر فی الاصل یہ حرام نہیں ہے۔ دنیا میں رہنا اور شرعی حدود میں دنیا کے تقاضوں کو پورا کرنا عین اسلام ہے..... لیکن اگر کوئی شخص اس کی استطاعت نہیں رکھتا اور دنیا کے مسائل میں الجھ کر بہک جائے اندیشہ ہے..... تو پھر اس کے لئے ترک دنیا جائز ہے۔

سورہ بقرہ کی آخری آیات میں ارشادِ ربانی ہے۔ ”اللہ کسی کے نفس پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ ڈالتا۔“ انبیائے پاک علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نفس پاک کی قوت جدا ہے..... اولیائے کرام کی طاقت الگ..... عام مسلمانوں کی استطاعت مختلف۔ یہ تینوں طاقتیں ہمبھی برابر نہیں ہو سکتیں۔ حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی پیدائش پہلے ہی اس کی درجہ بندی فرمادی تھی۔ یہی درجہ بندی صوفیائے کرام کی معنوں میں بھی ہے۔ کچھ بہت زیادہ جادو ہیں..... اور کچھ کم..... کچھ پایہ زنجیر کر کے کوچہ و بازار میں پھرائے گئے..... کچھ کے پُر نور چہروں کو سیاہ کر کے ان کے معطر جسموں پر غلاط کے انبار چھینکے گئے..... کچھ کو دار پر کھینچا گیا..... کچھ سر متقل لے جا کر ذبح کر دیے گئے..... کچھ کو زندگی بھر تہتوں کی آگ میں جلایا گیا..... اور کچھ خانقاہ کے گوشے میں بیٹھے سماع سنتے رہے..... مگر سب کے سب مردانِ پاکباز تھے..... صرف ذمے داریاں جدا جدا تھیں اور بوجھ الگ الگ تھے۔ علامہ اقبالؒ نے صوفیائے کرام کی اسی ریاضت و جانبازی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی!!

حضرت بابا بلھے شاہؒ پھر اپنے پیر و مرشد کی اجازت کے بعد لاہور سے جھنگ کی طرف روانہ ہوئے۔ رخصت سے پہلے حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے اپنے جانناز مرید سے فرمایا۔
”سید عبداللہ! اپنے نفس کی طاقت کو آزماؤ۔ کبھی بھوک سے اور کبھی پیاس سے..... کبھی تیز دھوپ سے اور کبھی

نہ سہی ہے۔ ایثار، صبر، قناعت اور توکل، تصوف کی عمارت کے چار ستون ہیں۔ اگر ایک ستون بھی کمزور رہ جائے تو عمارت میں نقص پیدا ہو جاتا ہے..... یا پھر وہ منہدم ہو جاتی ہے۔ بے شک! ہم سب عالم اسباب میں سانس لے رہے ہیں۔ مگر مستبب الاسباب اسی کی ذات پاک ہے۔ غیر کی گلیوں میں زندہ رہنے سے، کوچہ دوست میں رہنا بہتر ہے۔ جاؤ فرزند! تم پر منزل شوق آسان ہو۔

خدا خود میرا سامان است ارباب توکل را

(توکل کرنے والوں کے لئے اللہ خود ہی سبب پیدا کر دیتا ہے)

ہر دم شہ کی دعاؤں اور ہدایتوں کے سائے میں حضرت بابا بلے شاہ جھنگ تشریف لائے اور دریائے چناب کے کنارے خیمہ زن ہو گئے۔ آپ کا خیمہ ایک شکستہ جموہڑی تھی، جسے بانسوں، چٹائیوں اور ٹائلوں کے سہارے کھڑا کیا گیا تھا۔

بعض راتوں کے مطابق حضرت بابا بلے شاہ کئی سال تک دریائے چناب کے کنارے سخت ریاضتوں میں مشغول رہے۔ گرم ہوا کے چھوڑے، سیلاب، ژالہ باری..... غرض آپ موسم کی ہر سختی کو مسکرا کر برداشت کرتے۔ سیاہ اندھیل آب کے نشین (خیمے) کو مسمار کر دیتیں..... مگر آپ تنکا تنکا جمع کر کے دوبارہ اپنا آشیانہ بناتے۔ جنگلی پلان پلان آپ کی گزراوقات تھی۔ پھر جب پھلوں کا موسم گزر گیا تو کئی دن تک درختوں کے پتے کھا کر شکم کی آگ بجلائے۔ پھر ایک روز ایک کسان مکئی کی روٹی اور ساگ لے کر حاضر ہوا۔ حضرت بابا بلے شاہ نے اسے سامانِ غیب قرار کیا..... مگر ایک روٹی کھا کر آپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔

کسان گھبرا گیا۔ ”بابا! شاید تمہیں غریب کا روٹی سالن اچھا نہیں لگا۔“ کسان کے چہرے پر ندامت کے آثار نہ۔

حضرت بابا بلے شاہ نے کسان کی دلجوئی کے لئے فرمایا۔ ”تیری ٹہلی بھی متاع تھی، جوٹو نے میرے سامنے لا کر رکھی۔ تیری مکئی کی روٹی اور ساگ، شاہوں کے مرغ و ماہی سے زیادہ لذیذ ہے۔ رازقی عالم تیری روزی میں رکن ہے۔“

اس واقعے کے بعد قرب و جوار کے دوسرے کسانوں کو بھی حضرت بابا بلے شاہ کی موجودگی کی خبر ہو گئی۔ پھر یہ لوگ اپنے اپنے گھروں سے آپ کے لئے کھانا لانے لگے۔ آپ سب کا دل رکھتے مگر ایک روٹی سے زیادہ بڑھ کر کھاتے۔ حضرت بابا بلے شاہ اکثر روزے سے رہا کرتے تھے۔ افطار میں بہت مختصر سی غذا استعمال کرتے۔

نہ ریاضتوں اور موسم کی سختیوں نے حضرت بابا بلے شاہ کو جلا ڈالا..... اور آپ کا سرخ و سفید رنگ سیاہی مائل ہو گیا۔ حضرت بابا بلے شاہ تنہائی کی زندگی کے عادی نہیں تھے۔ اس لئے آغاز سفر میں پیر و مرشد، والدین، بہنوں اور رشتہ داروں کی بہت یاد آتی۔ کبھی کبھی شدتِ کرب سے بے قرار ہو کر لاہور کی طرف رخ کرتے اور قابانہ طور پر حزن و ماتمیت کا درئی سے درخواست گزار ہوتے۔

”بہن! مجھے سب کچھ گوارا ہے۔ مگر آپ سے جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ دل جٹلائے درد ہے اور نظر تشنہ۔ اگر ہاتھ ہوتا تو دم بوس ہو کر اپنے درد کا درد ماں کر لوں اور آنکھوں کی پیاس بجھا لوں۔“

حضرت بابا بلے شاہ جب بھی فریاد کرتے، اسی روز حضرت شاہ عنايت قادری خواب میں تشریف لا کر فرماتے۔ ”پروردگار! یاد رکھو، سختی کے بعد آسانی..... اور فراق کے بعد وصال۔ ابھی تم نے سختیاں کہاں برداشت کی ہیں کہ یہاں لا محذور رہے ہو..... اور ابھی تم آتشِ فراق میں کب جلے ہو کہ راحت وصال مانگ رہے ہو۔ پہلے خاک تو

ہو جاؤ۔ پھر کوچہ یار کی آرزو کرنا۔“

عالم خواب میں پیر و مرشد کی ہدایت پا کر حضرت بابا بلھے شاہؒ اُداس ہو جاتے..... مگر پھر یہ احساس آپ لذت سے سرشار کر دیتا کہ شیخ میرے حال سے بے خبر نہیں ہیں۔



الغرض شب و روز جدائی کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ دریائے چناب کے کنارے کتنے سال گزرے۔ بس اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی ان شدید ترین ربا نیتوں پر یہ زمانہ دو تین سالوں پر ضرور محیط ہو گا۔ اکثر صوفیائے کرام کی حیات مبارکہ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ برگزیدہ ہستیوں نے اپنے نفس پر قابو پانے کے لئے چلہ کشی ضرور کی ہے..... اور چلہ کشی کی مدت چالیس دن لے کر ایک سال بھی ہو سکتی ہے۔ پھر ایک چلے کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا چلہ بھی ہو سکتا ہے۔ بزرگ تو زندگی بھر کسی غار یا جنگل میں روپوش رہے..... یہاں تک کہ حق تعالیٰ کی جستجو کرتے کرتے خود کی موت ہو گئے۔

ان ہی ریاضتوں کے دوران ایک دن حضرت بابا بلھے شاہؒ کی والدہ ماجدہ، بیٹی کی جدائی سے مجبور ہو گئیں۔ رو کر اپنے شوہر سے کہنے لگیں۔ ”ایسا لگتا ہے کہ عبد اللہ کو گھر سے گئے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔“

”فراق کی ایک ساعت بھی ایک دن کے برابر لگتی ہے..... اور وصال کا ایک دن اس طرح گزر جاتا ہے جیسے ہم نے چند لمحے بسر کئے ہیں۔“ حضرت سید خنی شاہؒ محمدؒ نے اپنی اہلیہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”مجھے عبد اللہ کے پاس لے چلیں۔ میں اسے ایک نظر دیکھ کر واپس آ جاؤں گی۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی والدہ محترمہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور ماں کی مامتا و شوار گزار سفر طے کرنے کے لئے بھی آمادہ ہو گئی۔

حضرت سید خنی شاہؒ محمدؒ نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”بے شک! سید عبد اللہ ہمارا بیٹا ہے۔ مگر اس وقت کے شب و روز پر حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا زیادہ حق ہے۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ کی مادر گرامی اپنے شوہر کی بات سمجھنے سے قاصر رہیں اور سوالیہ نظروں سے حضرت برہنہ محمدؒ کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ہم شاہ صاحب کی اجازت کے بغیر عبد اللہ سے نہیں مل سکتے۔“ حضرت خنی شاہؒ محمدؒ نے بے قرار ماں کو بھان کی ایک اور کوشش کی۔

”کیا استاد کا درجہ ماں باپ سے بھی زیادہ ہو گیا؟“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی والدہ ماجدہ نے معصومیت سے کہا۔

”یہ مقابلے اور درجہ بندی کا مقام نہیں۔“ حضرت خنی شاہؒ محمدؒ کو اپنی بات واضح کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی کیونکہ ان کی اہلیہ نہ تو عالم تھیں اور نہ صوفیاء کے نظام روحانی سے باخبر..... ”استاد اور درس گاہ کا احترام بہر حال ہم پر واجب ہے..... اور پھر حضرت شاہ عنایت قادریؒ عام استاد بھی نہیں ہیں۔ اگر وہ خفا ہو گئے تو عبد اللہ ساری جستجو رائیگاں جائے گی..... اور وہ معرفت کے راستے میں پیا سارہ جائے گا۔ تمہیں کیا معلوم کہ حضرت شاہ عنایت قادریؒ کیسے استاد ہیں؟..... اور تمہارا بیٹا سید عبد اللہ کیا کیا جتن کر کے ان کے آستانہ عالیہ تک پہنچا ہے؟ خدا نخواستہ شاہ صاحب نے عبد اللہ کو اپنے آستانہ کرم سے اٹھادیا..... اور پھر تمہارا بیٹا تشنگام رہ گیا تو اس کی تائیم ذمہ داری ہم پر عائد ہوگی۔“

”تو پھر ہم لاہور چل کر شاہ صاحب سے اجازت حاصل کر لیتے ہیں۔“ شوہر کے سمجھانے سے انہیں استاد

اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔

”اگر عبداللہ کو دنیا والوں سے ملنے کی اجازت ہوتی تو وہ خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکا ہوتا۔“ حضرت یونسؑ شاہ محمدؒ اپنی اہلیہ کو بہت دیر تک سمجھاتے رہے۔ مگر ایک رقیق القلب اور جذباتی ماں کی زبان سے بس یہی الفاظ اُٹھتے رہے۔

”پتہ نہیں، میرا بیٹا عبداللہ کس حال میں ہوگا؟“

آخر ماما کے نا آسودہ جذبوں کو تسکین پہنچانے کے لئے حضرت سخی شاہ محمدؒ ”پانڈو کے“ سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ ”میں شاہ صاحب کی خدمت میں درخواست پیش کرتا ہوں۔ اگر انہوں نے التجا قبول کر لی تو میں خود تمہارے بیٹے مل لوں گا۔۔۔۔۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا کہ وہ کس حال میں ہے۔ میں تمہارے جذبات بھی اس تک پہنچاؤں گا اور اس سے یہ بھی پوچھوں گا کہ وہ تم سے ملنے کب آئے گا؟“

الغرض حضرت سید سخی شاہ محمدؒ ایک بے قرار ماں کو تسلیاں دے کر پانڈو کے سے لاہور پہنچے اور حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر جب آپ نے اپنا تعارف کرایا تو حضرت شاہ عنایت قادریؒ شطاریؒ نے بے ساختہ فرمایا۔

”آپ اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائیں۔ مگر سید عبداللہ کو گھر کی اتنی یاد نہ دلا نا کہ اس کے ارکانِ مغل خلل پڑ جائے۔ میں نے اس کے وحشی قلب کو انتشار کے راستے سے نکال کر یکسوئی کی جس راہ پر گامزن کر دیا ہے، کہیں وہ ماما کی پکار سن کر دنیا داری کے غبار میں گم نہ ہو جائے۔“

حضرت سید سخی شاہ محمدؒ، حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی قوتِ کشف دیکھ کر حیران رہ گئے۔

بہرِ باپ بیٹے، دریائے چناب کے کنارے آمنے سامنے ہوئے۔ حضرت سخی شاہ محمدؒ اپنے فرزند کو نہ پہچان سکے۔ نڈیہ ریاضتوں نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کا ظاہری حلیہ ہی تبدیل کر دیا تھا۔

”یہ تم ہو عبداللہ؟“ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے بیٹے کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”بابا! کیا میں اتنا بدل گیا ہوں؟“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”تمہارا ظاہری رنگ روپ تو فنا ہو گیا۔“ حضرت سخی شاہ محمدؒ نے بیٹے کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے درمیان لے کر کہا۔ ”وہ رنگ تو فنا ہونے ہی کے لئے ہے۔۔۔۔۔ مگر مجھے خوشی ہے کہ حضرت شاہ عنایتؒ نے تمہیں اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا ہے۔ میری دعائیں اور تمہارا ذوقِ طلب رائیگاں نہیں گیا۔“

”والدہ محترمہ اور آپ تو مجھ سے راضی ہیں نا؟“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے لہجے میں غلش فراق نمایاں تھی۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اس راز سے باخبر تھے کہ ماں باپ کی رضا کی کیا اہمیت ہے؟ اہلِ آپ نے اپنے والد محترم سے یہ سوال کیا تھا۔

”بہت زیادہ راضی ہیں۔“ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ”میری رضا تو یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔۔۔۔۔ اور والدہ کی رضا کا یہ حال ہے کہ ان کے شب و روز کا ایک ایک لمحہ تمہاری ہی بلائی کی دعاؤں میں بسر ہوتا ہے۔“ حضرت سخی شاہ محمدؒ نے جان بوجھ کر ایک ماں کی حالتِ زار کا ذکر نہیں کیا۔

والدہ محترمہ کی دعاؤں کا سن کر حضرت بابا بلھے شاہؒ بے قرار ہو گئے اور آپ کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو جاری ہو گئے۔

”عبداللہ! کیا اب بھی تمہارے دل میں دنیا داری کی ترپ موجود ہے؟“ حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے بیٹے کی یہ

کیفیت دیکھ کر سوال کیا۔

”بابا! دنیا داری تو ایک روگ ہے اور اس کا علاج دیر طلب ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے عارفانہ فرمایا۔ ”میرے مرشد نے حکم خدا اس کا علاج شروع کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی مسیحا سے تو میرے دل کی یہ بیماری دور فرما دے گا اور جہاں تک میرے ماں باپ کی رضا اور محبت کا سوال ہے تو یہ نہیں، معرفت کا زینہ ہے جس سے گزرے بغیر بام نصرت تک نہیں پہنچا جاسکتا۔“

بیٹے کا جواب سن کر حضرت سید سخی شاہ محمدؒ بہت خوش ہوئے۔

اس دوران میں کئی کسان اور مزدور، حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔ ”آپ کی دعاؤں سے ہمارے کھیت پہلے سے زیادہ اناج اُگنے لگے..... اور ہماری مزدوریوں میں اضافہ ہو گیا۔“

یہ وہ لوگ تھے، جو ابتدا میں حضرت بابا بلھے شاہؒ کے افکار و سحر کے لئے رُوحی سُوکھی غذا لے کر آتے تھے۔ بیٹے کی روحانیت کا یہ اثر دیکھ کر حضرت سید سخی شاہ محمدؒ پہلے تو بہت خوش ہوئے۔ پھر فکر آمیز لہجے میں عرض کیا۔

بلھے شاہؒ کو سمجھانے لگے۔

”عبداللہ! تم اپنی ان کامیابیوں پر مغرور نہ ہو جانا۔ وہ زمانہ یاد کرو کہ جب تم ایک خوش رنگ پھول نے خوشبو سے خالی۔ مرشد نے اس پودے کی آبیاری کی، جس کی شاخ پر تم کھلے تھے۔ پھر حق تعالیٰ نے تم پر کرم فرمایا۔ تم مہکنے لگے۔ میں نے ایسے بھی بہت سے پھول دیکھے ہیں، جو شدید سخت و ریاضت کے باوجود زندگی بھر خوشبو محروم رہتے ہیں۔“

حضرت سید سخی شاہ محمدؒ نے ایک رات دریائے چناب کے کنارے گزاری۔ پھر دوسرے دن نماز فجر ادا کرنے کے بعد بیٹے کو اپنی دعاؤں سے سرفراز کیا اور پاٹھ و کے کی طرف روانہ ہو گئے۔



حضرت بابا بلھے شاہؒ کے مجاہدات جاری رہے۔ دل پر مسلسل ضربات لگتی رہیں اور عشق کی چنگاریاں بھڑک رہیں۔ آپ کو پیر و مرشد کی جدائی شاق گزرنے لگی۔ ایک رات جب ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا، حضرت بابا بلھے شاہؒ دریا کے کنارے بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور عاتبانہ طور پر پیر و مرشد کو کلاب کے کہنے لگے۔

”سیدی! ایک طالب دیدار کو کب تک جلوؤں سے محروم رکھا جائے گا؟ آنکھیں جل رہی ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ مجھ ہی نہ جائیں۔ پھر تو تاریکی پھیل جائے گی۔ کسے دیکھوں گا اور کیسے دیکھوں گا؟“

حضرت بابا بلھے شاہؒ بہت دیر تک اسی پُر سوز لہجے میں فریاد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ پر نیند غالب آگئی۔ پھر آپ نے خواب میں اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عنایت قادریؒ کو دیکھا۔ شاہ صاحبؒ محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

رہے تھے۔

”سید عبداللہ! اگر تمہاری ظاہری آنکھیں مجھ بھی گھس تو کیا غم؟ حق تعالیٰ، باطن کی آنکھیں روشن کر دے گا۔ تم ہمارا چہرہ نہیں، قدرت کے بے شمار مظاہر دیکھو گے۔ مبر کرو کہ اللہ مبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اکثر یہی ہوتا تھا کہ جب حضرت بابا بلھے شاہؒ صدمہ فراق سے بے حال ہونے لگتے تو پیر و مرشد خوابؑ جلوہ گر ہوتے اور اپنے مرید خاص کو مبر و ہمت کی تلقین فرما کر واپس تشریف لے جاتے۔ اس بار بھی ایسا ہی

حضرت شاہ حیات قادریؒ کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی حضرت بابا بلھے شاہؒ بیدار ہو گئے۔ اگرچہ اندھیری رات تھی لیکن آپ کو اپنے اطراف میں ایک عجیب سی روشنی محسوس ہوئی۔ یہ پیر و مرشد کارو حافی تعریف تھا، جس نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کے بے قرار دل کو تھام لیا..... اور آپ اپنے جسم میں ایک نئی توانائی کا احساس کرنے لگے۔

جرمن ہیروں ایک اور واقعہ پیش آیا، جس سے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔

اکی علاقے میں ایک جاگیردار حافظ برخوردار رہا کرتے تھے۔ عام طور پر جاگیرداروں اور زمینداروں و دولت مندوں کے علاوہ کسی شے سے رغبت نہیں ہوتی۔ زمانہ قدیم ہو یا عہد جدید، جاگیرداروں کی ہوس پرستی اور مظالم کی داستانیں زبانِ زو خاص و عام ہیں۔ اس کے برعکس حافظ برخوردار کو اللہ تعالیٰ نے ایک دل دردمند بخشا تھا۔ دولت کی فراوانی بھی انہیں صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ وہ عالم بھی تھے اور صاحبِ تقویٰ بھی۔ قرب و جوار کے مزدور و کسان، جو حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، ان ہی لوگوں کی زبانی حافظ برخوردار تک بھی پڑھ لکھ کر ایک جواں سال درویش، دریائے چناب کے کنارے طویل عرصے سے خیمہ زن ہے۔

حافظ برخوردار نے اپنے دوستوں سے ذکر کیا۔ ”کیوں نہ اس شخص کا دیدار کریں، جو عہدِ شباب میں دنیا کی بھٹی چھوڑ کر ایک دیرانے میں آ پڑا ہے۔“

”آپ کہاں جائیں گے؟“ ایک دوست نے سخت اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جوگی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جو میدانِ عمل میں ہار جانے کے بعد جنگل کی راہ لیتے ہیں۔ گیر و لباس پہن کر تارک الدنیا ہو جاتے ہیں..... اور حق تعالیٰ کے نذرانوں پر عیش سے زندگی گزارتے ہیں۔ بہت کام چور ہوتے ہیں یہ لوگ۔“

”جنگل کی زندگی اختیار کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔“ حافظ برخوردار نے اپنے دوست کی تاویلات کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔ ”جس طرح ہر پتھر پارس نہیں ہوتا، اسی طرح ہر جوگی کام چور نہیں ہوتا۔ جوگ لینا بھی تو بہت بڑا کام ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ جوگ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔“ دوسرے دوست نے حافظ برخوردار سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ”کارنامہ یہ ہے کہ دنیا والوں کے ہجوم میں رہ کر روحانیت کی معراج حاصل کرے۔“

”اللہ کے بے شمار بندے ہیں اور اپنے اپنے طریقوں سے اظہارِ عشق کرتے ہیں۔“ حافظ برخوردار نے اپنے ہم خیال بنیاد پر دوستوں کو روحانیت کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی۔ ”کسی شخص کو دیکھ بغیر اس کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا، بدگمانی ہے۔ اور بعض بدگمانیاں بہت خوفناک ثابت ہوتی ہیں۔“

دوست یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ”ہم علم میں تو آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے..... مگر ہمیں اس پیری فقیری پر یقین لگتا ہے۔“

جس شخص نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو جوگی کہہ کر پکارا تھا، حافظ برخوردار نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم

اپنا، کچھ قیمتی خائف سجا کر اس جوگی کے پاس چلے جاؤ۔ اگر اس نے قبول کر لئے تو کام چور ٹھہرا۔ اور اگر واپس کر دیے تو مجھ کو ایک اولوالعزم عاشق ہے، جس نے دنیا کو طلاق دے دی ہے۔“

حافظ برخوردار صاحب کے کہنے پر دوستوں نے ایک بڑے خوان میں دو روٹی جوڑے، لذیذ کھانے اور چائے کے بوتلے رکھے۔ پھر یہ کہہ کر دریا کی طرف روانہ ہوئے۔

”ہلو، ایک تماشہ ہی تھی۔“

جب یہ آہستہ حال لوگ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی جھونپڑی کے قریب پہنچے تو آپ دریا کے کنارے نماز پڑھ رہے تھے۔ ان لوگوں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر حضرت بابا بلھے شاہؒ نے سلام پھیرا اور آنے والوں سے اس کی آمد کا سبب

پوچھا۔

حافظ برخوردار صاحب کے دوستوں نے چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ اس فقیر کو فرمائیں گے تو یہ ہمارے لئے بڑی سعادت ہوگی۔“

”صاحبو! اللہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔“ حضرت بابا بلے شاہؒ نے بڑے شیریں لہجے میں فرمایا۔ ”دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ آیا..... اور آپ حضرات اسی دنیا کو سجا کر پھر میرے سامنے لے آئے۔ میں جس کی دعا دیرانے میں آؤ ہوں، وہی میری ضرورتوں کا کفیل ہے۔ ذرا آنکھ کھول کر دیکھیں، اس بستی میں بہت سے مند ہیں۔ ان کا خیال رکھیں۔“

یہ کہہ کر حضرت بابا بلے شاہؒ نے دوبارہ نماز کی نیت باندھ لی۔

حافظ برخوردار کے دوستوں کا خیال تھا کہ جیسے ہی حضرت بابا بلے شاہؒ نماز سے فارغ ہوں گے، وہ دوبارہ قبول کرنے کے لئے اصرار کریں گے..... مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ حضرت بابا بلے شاہؒ نے پہلی بار میں اتنا طویل قیام کیا کہ وہ لوگ کھڑے کھڑے اکتا گئے۔ آخر انہوں نے سمجھ لیا کہ ان کی مذکور قبولیت کی ضرورت نہیں پہنچے گی۔ آخر مایوس ہو کر چلے گئے۔ پھر حافظ برخوردار کی خدمت میں حاضر ہو کر بیک زبان کہا۔

”وہ شخص اپنے ظاہری حیلے سے جوگی تو نظر آتا ہے..... مگر کام چور نہیں ہے۔“

حافظ برخوردار مسکرائے۔ ”دیکھا، آپ لوگ کیسی بدگمانی کا شکار ہو رہے تھے۔“

دوستوں کے چہرے پر ندامت کے آثار ابھر آئے۔

پھر دوسرے دن حافظ برخوردار خود حضرت بابا بلے شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے بڑے انداز میں اپنے مہمان کا استقبال کیا..... اور ایک چٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”آپ قائم و سنجاب (قیمتی ریشمی کپڑوں) پر بیٹھنے والے، اس ٹاٹ پر کیسے تشریف رکھیں گے؟“

”ساز و سامان کی کیا حیثیت ہے؟ میزبان ہی سب کچھ ہوتا ہے۔“ حافظ برخوردار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب میزبان کی مرضی، جہاں چاہئے بٹھائے۔“

حضرت بابا بلے شاہؒ اپنے مہمان کے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر بہت دیر تک دونوں بزرگوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ دونوں نے ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کیں۔ ان نمازوں میں حضرت بابا بلے شاہؒ نے حافظ برخوردار کو امام بنالیا۔

عصر کے بعد ایک دیہاتی مزدور، حضرت بابا بلے شاہؒ کے افطار کے لئے ایک روٹی اور تھوڑی سی ترکاری لے آیا جب وہ شخص واپس چلا گیا تو حافظ برخوردار نے کہا۔

”اگر اجازت ہو تو میں سامان افطار بھیج دیا کروں؟“

حضرت بابا بلے شاہؒ نے دیہاتی کی لائی ہوئی روٹی اور ترکاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں سے زیادہ نہیں۔ فقیر کے شکم میں اتنی ہی غذا ساتی ہے۔“

دوسرے ہی دن حافظ برخوردار، حضرت بابا بلے شاہؒ کے لئے پُر تکلف سامان افطار لے کر حاضر ہوئے۔

”حافظ صاحب! یہ وعدہ خلافی ہے۔“ حضرت بابا بلے شاہؒ نے لذیذ غذاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کے علم کے احترام میں آج تو قبول کئے لیتا ہوں، لیکن اگر آئندہ بھی آپ کا یہی طرز عمل رہا تو فقیر معذرت کر لے گا۔“

ہجرائی دوران میں حافظ برخوردار نے سوال کیا۔ ”کچھ دن پہلے میرے کچھ دوست بھی نذر لے کر حاضر خدمت ہوئے، مگر آپ نے ان لوگوں کو ناکام و نامراد لوٹا دیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”وجہ نقلی، حافظ صاحب!“ یکایک حضرت بابا بلھے شاہ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل گیا اور آپ نے نہایت بے جلال لہجے میں فرمایا۔ ”ان لوگوں کی نیتیں درست نہیں تھیں۔ کیا وہ لوگ مجھے بے خبر سمجھتے ہیں؟ میں ہرگز بے خبر نہیں ہوں۔ حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا غلام بھلا کیسے بے خبر رہ سکتا ہے؟“

حافظ برخوردار چونک اُٹھے۔ حضرت بابا بلھے شاہ کی قوت کشف و کھیر انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جواں سال درویش ”بے خبر اور بے ہنر“ نہیں ہے۔ اس واقعے کے بعد ہی حافظ برخوردار، حضرت بابا بلھے شاہ کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔ ایک عالم دین کا یہ حال دیکھ کر دنیا دار دوست، حافظ صاحب پر طعنہ زنی کیا کرتے تھے۔ ”آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ اپنے سن و سال کو دیکھیں..... اپنے علم اور تقویٰ پر نظر کریں۔“

جواب میں حافظ برخوردار فرماتے۔ ”عمر کوئی پیمانہ نہیں۔ بوڑھے زندگی بھر اس گویے میں ٹھوکریں کھاتے رہے اور جوان لڑکے، رازدار بن گئے۔ یہ سب قسام ازل کی بخشش و عطا پر منحصر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرا کتابی علم زیادہ ہو مگر عبد اللہ کو علم یقین حاصل ہے۔ اور جہاں تک تقویٰ کا سوال ہے تو اس میدان میں بھی میں نے اس نوجوان کو اپنے آپ سے آگے ہی پایا۔“

ہجرائی دن حافظ برخوردار اپنے بیٹے سلطان احمد کو لے کر حضرت بابا بلھے شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلطان احمد، شادی شدہ ہونے کے ساتھ، ایک کم سن بچے کا باپ بھی تھا۔ اگرچہ حافظ برخوردار ایک دیندار انسان نے سلطان احمد، جاگیردارانہ نظام کی بہت سی خرابیوں سے متاثر تھا۔ اس میں رعونت بھی تھی اور بے راہ روی بھی۔ اور دوستوں کے ساتھ راگ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوتا اور اپنا بیشتر وقت سیر و تفریح میں گزارتا۔ حافظ صاحب، بیٹے کی اس روش پر بہت کڑھتے۔ پھر جب سمجھانے کی کوشش کرتے تو سلطان احمد ایک ہی جواب دیتا۔ ”بابا جان! میں ایک رئیس کا بیٹا ہوں..... اور یہی مشغلہ تو رئیسوں کی پہچان ہوتے ہیں۔“

آج وہی گزرا ہوا نوجوان اپنے باپ کے ساتھ حضرت بابا بلھے شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ سلطان احمد کو ان بات پر شدید حیرت تھی کہ اپنے علاقے کا ایک بہت بڑا جاگیردار ایک کمل پوش، فاقہ کش اور جھونپڑی نشین شخص کا احترام کیوں کرتا ہے؟ ابھی وہ اپنے خیالات میں گم تھا کہ حافظ برخوردار نے حضرت بابا بلھے شاہ سے عرض کیا۔ ”سید صاحب! یہ میرا بیٹا سلطان احمد ہے۔ آپ کے سلام کے لئے حاضر ہوا ہے۔“

حضرت بابا بلھے شاہ نے حافظ برخوردار کے صاحبزادے، سلطان احمد کی طرف دیکھا۔ وہ ایک خوب صورت اور بے پروا نوجوان تھا۔ جاگیرداری کے نشے میں سرشار۔ ایک پریشان حال صوفی کو کیا اہمیت دیتا؟“

سلطان احمد نے حضرت بابا بلھے شاہ کو سلام تک نہیں کیا۔

حافظ برخوردار صاحب نے بڑی شدت کے ساتھ اپنے بیٹے کی اس ناروا حرکت کو محسوس کیا مگر خاموش رہے۔

”نوجوان! تمہارا کیا مشغلہ ہے؟“ حضرت بابا بلھے شاہ نے محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔

”سیر و تفریح۔“ سلطان احمد نے غرور کے لہجے میں کہا۔

”سیر و تفریح تو کوئی کام نہیں۔“ حضرت بابا بلھے شاہ نے فرمایا۔ ”جب انسان اپنے فرائض دیانت داری کے اتمام دے چکے تو کچھ دیر کے لئے سیر و تفریح بھی کوئی مضائقہ نہیں۔“

اُس وقت حضرت بابا بلھے شاہ اور حافظ برخوردار کے بیٹے سلطان احمد کی عمروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔

آپ بھی جوانی کی منزل سے گزر رہے تھے، مگر تعلیم اور خصوصاً پیر و مرشد حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی محنت آپ کے دماغ کو کشادہ اور نظر کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ نوعمری کے باوجود آپ کی زبان مبارک پر حرکت جاری رہتے تھے۔

”مجھے کوئی کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ سلطان احمد اپنی جاگیروں پر نازاں تھا۔ ”میرے بہن ہیں۔“

”انسان کو اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے سلطان احمد کے آنے پر کر لیا تھا کہ وہ جاگیردارانہ نظام کا ایک کٹر نمائندہ ہے، جو اللہ کے بندوں پر حکومت کرنے کے سوا کوئی کام جانتا۔ پھر بھی آپ نے صوفیائے کرام کی اس سنت کو جاری رکھا اور نہایت نرم و شیریں لہجے میں سلطان احمدؒ فرماتے رہے۔ ”حق تعالیٰ نے تمہیں ان انسانوں پر اختیار دیا ہے، جو دنیا کی نظروں میں تمہارے کاندھے ہیں۔ یہ شکل و صورت میں تمہاری ہی طرح آدم زادے ہیں۔ ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو..... اور ذات باریؑ کرنے کے لئے پابندی سے نماز پڑھو۔“

سلطان احمد کے چہرے پر بیزاری کا رنگ نمایاں تھا۔ جیسے اسے حضرت بابا بلھے شاہؒ کے پند و نصائحؒ گزر رہے ہوں۔

آخر وہ اکتا کر اٹھ گیا۔ اور پھر باپ سے یہ کہہ کر چلا گیا۔
”بابا جان! صبح میں ٹلاں جنگل میں دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے جا رہا ہوں۔ ہو سکا ہے کہ رات وہیں گزاریں۔“

جاتے وقت سلطان احمد نے رسم زمانہ کے مطابق حضرت بابا بلھے شاہؒ کو سلام بھی نہیں کیا۔ بیٹے کے جاتے ہی حافظ برخوردار نے شدید ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”شاہ صاحب! میں سلطان کی طرف سے اس کی ناشائستگی کی معافی چاہتا ہوں۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے بڑی محبت سے اپنے عمر رسیدہ عقیدت مند کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”حافظ صاحب! آپ کیوں آزرده ہوتے ہیں؟ میں نے تو اس بات کو محسوس تک نہیں کیا۔“
”مگر مجھے تو شہادت سے اس کا احساس ہے۔“ حافظ برخوردار نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”یہ سوچ کر ہی دل دھڑکتا رہتا ہے کہ سلطان احمد میری اولاد ہے۔“

”آپ ہر وقت اپنے رب کی پناہ مانگتے رہیں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے پرسوز لہجے میں فرمایا۔ ”ہم ہماری حقیقت کیا؟ اگر ہم اس کے آگے سجدہ کرتے ہیں تو اسی کے کرم سے..... اگر وہ تو قیاس نہ بننے لگے (شیطان) سجدے سے انکار کر دیتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ ہو جاتا ہے..... اور اگر کسی مومن کی اولاد صالح ہوتی ہے تو اسی کے فضل سے..... جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے نے کیا اور مگر بنی اسرائیل میں جا کھڑا ہوا..... پھر طوفان میں غرق ہو گیا۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اس قدر اثر انگیز لہجے میں قرآن حکیم سے دو مثالیں پیش کیں کہ حافظ برخوردار لگے۔

”شاہ صاحب! یہی سوچ کر تو راتوں کی نیندیں اُڑ گئی ہیں۔ ایک دن جانا تو ہے..... مگر کوئی نہیں جانتا کہ کون سا دن آجائے گا۔ بس آخری حسرت یہ ہے کہ جب میری آنکھیں بند ہوں تو اس سے پہلے سلطان احمد کی آنکھیں

ہجی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے مرنے کے بعد لوگ یہ کہیں کہ حافظ برخوردار نے اپنے بعد کسی نالائق اولاد چھوڑی ہے۔ اگر اس کی اصلاح نہیں ہوئی تو پھر میں قبر میں بھی جلتا رہوں گا۔“ حافظ برخوردار کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی اور اسی رقت کے اثر سے الفاظ بھی صحیح طور پر ادا نہیں ہو رہے تھے۔

ایک بار پھر حضرت بابا بلے شاہؒ نے حافظ برخوردار کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور انتہائی اپنائیت کے لہجے میں فرمانے لگے۔ ”حافظ صاحب! انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ اس دنیا سے نامراد نہیں جائیں گے۔ آپ کا آخری سزا کمرانیوں اور شادمانیوں کا سفر ہوگا۔ آپ اس فقیر کی عزت کرتے ہیں۔ وہ اللہ دونوں جہاں میں آپ کی عزت رکھے گا۔ اب آپ کے حوالے سے سلطان احمد بھی میرا بھائی ہے..... اور مجھے بھی اپنے بھائی کی اس حالت پر دکھ ہے۔“

حافظ برخوردار نے بے قرار ہو کر حضرت بابا بلے شاہؒ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور انتہائی رقت آمیز لہجے میں کہا۔

”شاہ صاحب! مجھ سے وعدہ کیجئے کہ آپ میرے بیٹے سلطان احمد کا ہاتھ نہیں چھوڑیں گے۔“
حضرت بابا بلے شاہؒ ایک بے قرار باپ کی یہ عرض داشت سن کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ خود آپ کے اندر سے یہ آواز آرہی تھی۔

”عبداللہ! کیسے پکڑو گے کسی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ تو خود بہت کمزور اور ناتواں ہیں۔“
حضرت بابا بلے شاہؒ کو خاموش پا کر حافظ برخوردار یہی سمجھے کہ آپ ان کی بات ماننے اور وعدہ کرنے سے گریزاں ہیں۔ ”شاہ صاحب! میں اس وقت تک آپ کا دست مبارک نہیں چھوڑوں گا، جب تک آپ مجھ سے وعدہ نہیں کر لیں گے۔“

حضرت بابا بلے شاہؒ کیسے وعدہ کر لیتے؟ وہ تو خود حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی درس گاہ عشق میں ایک نووارد تھے، ایک طالب علم تھے۔ عشق کے ابتدائی اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کر رہے تھے۔ پھر حافظ برخوردار سے کس طرح کہتے کہ وہ ان کے بگڑے ہوئے بیٹے کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیں گے؟

”حافظ صاحب! ہم سلطان احمد کے حق میں دعائی کر سکتے ہیں۔“ حضرت بابا بلے شاہؒ نے عاجزانہ لہجے میں فرمایا۔ ”بس دعائی پر انسان کو اختیار حاصل ہے۔ اور یہ اختیار بھی حق تعالیٰ کا بخشا ہوا ہے کہ اس کی عطا کے بغیر نہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھتے ہیں اور نہ توبہ کی توفیق ملتی ہے۔ جب اول و آخر بھی وہی ہے..... باطن و ظاہر بھی وہی ہے..... سب بھی وہی ہے..... اور سب کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے تو پھر ہم حالت اضطراب میں ادھر ادھر سرگرداں کیوں پھریں؟ میں بھی اسی مالک ”بزو وکل“ کو پکارتا ہوں..... اور آپ بھی اسی قادر مطلق کی بارگاہ کرم میں اپنا دامن پھیلانے کھڑے رہیے۔“

حضرت بابا بلے شاہؒ کے انداز گفتگو سے حافظ برخوردار ایک بار پھر یہی سمجھے کہ آپ ان کی درخواست پر خصوصی توجہ نہیں دینا چاہتے۔ پھر جب حافظ برخوردار نے اپنے ان اندیشوں کا اظہار کیا تو حضرت بابا بلے شاہؒ نے فرمایا۔

”حافظ صاحب! کیا آپ کا ایک بار کہنا کافی نہیں؟ اس فقیر کے پاس کوئی مزدور یا کسان بھی آتا ہے تو اللہ کا یہ عاجز بندہ عبداللہ حسب مقدور اس کی تواضع میں بھی کمی نہیں کرتا۔ پھر آپ کی محبتوں کا تو بہت زیادہ قرض ہے اس فقیر پر۔“

”پھر آپ مجھ سے وعدہ کیوں نہیں فرماتے؟“ حافظ برخوردار بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہے تھے۔

حضرت بابا بلے شاہ مسکرانے لگے۔ ”حافظ صاحب! وعدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس کام پر قادر ہوں اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حقیقت میں قادر کون ہے؟ وہ جس کو چاہے ہدایت دے..... اور جس کو چاہے طغیانی اور سرکشی کے دریا میں غوطے کھانے کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ دے۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے غلغلہ ناطاتی اور خلاق عالم کی بے پناہ طاقت کا منہ بوم سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ ”ہاں! دعا کا وعدہ ہے۔ اور یہ بغیر اشارہ آخری سانس تک اپنے اس وعدے پر قائم رہے گا۔“

حافظ برخوردار خود بھی ایک پرہیزگار اور عالم و فاضل شخصیت تھے، اس لئے خوب سمجھتے تھے کہ حضرت بابا بلے شاہ صحیح فرما رہے ہیں۔ آخر حافظ صاحب نے اپنے بگڑے ہوئے بیٹے کو سدھارنے کے لئے حضرت بابا بلے شاہ ایک اور درخواست پیش کی۔

”تو پھر سلطان احمد کو اپنے حلقہء ارادت میں شامل فرمائیں۔“

حافظ برخوردار کی نئی درخواست سن کر حضرت بابا بلے شاہ کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور دل آویز قسم اٹھ اٹھی۔ ”ابھی تو خود میرے شیخ نے مجھے اس بات کی سند نہیں بخشی ہے کہ میں ان کا فرماں بردار مرید ہوں..... یا بغیر اشارہ پہن کر دریائے چناب کے کنارے پر اہل دنیا کو فریب دے رہا ہوں۔ جب پیر و مرشد تصدیق فرمادیں گے کہ واقعتاً ان کا مرید ہوں تو پھر کسی کو اپنا مرید بنانے کے بارے میں سوچوں گا..... اور شاید شیخ کی زندگی میں یہ ممکن نہ ہو۔ حافظ صاحب! مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ میرے پیر و مرشد کی موجودگی میں کوئی میرا مرید ہونے کے لئے درخواست پیش کرے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی تشنہ لب شخص اپنی پیاس بجھانے کے لئے پانی کے کیچڑ سے گڑھے سے سوال کرے جبکہ اسی زمین پر صاف و شفاف پانی کا موبہیں مارتا ہوا دریا بھی موجود ہے۔ میرے لئے تو بس یہی ایک اعزاز کافی ہے کہ جب میرے شیخ کی مجلس نورانی آراستہ ہو..... اور ہزاروں طالبانِ حق دست بستہ بیٹھے ہوں..... اور میں سر جھکائے اس بارگاہ کرم میں حاضر ہوں تو مرشد عالی مقام فرمائیں کہ وہ آ رہا ہے، مرید سید عبداللہ۔“ یہ کہتے کہتے حضرت بابا بلے شاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

حضرت بابا بلے شاہ کی یہ کیفیت دیکھ کر حافظ برخوردار بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ آج انہیں اندازہ ہوا کہ نوجوان صوفی اپنے مرشد کے عشق میں کس منزل تک جا پہنچا ہے؟



حافظ برخوردار اپنے بیٹے سلطان احمد کی طرف سے بے حد پریشان تھے۔ جب وہ دوسرے دن شکار سے واپس آ گیا تو حافظ صاحب نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹے! تم نے مجھے بہت مایوس کیا۔ یہی تمہاری تہذیب ہے کہ تم نے اتنے بڑے بزرگ کو سلام کرنا تک گوارا نہ کیا؟“ حافظ برخوردار نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا، جب سلطان احمد اپنے والد کے ساتھ حضرت بابا بلے شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

حافظ صاحب کی بات سن کر سلطان احمد تضحیک آمیز انداز میں مسکرایا۔ ”بابا جان! مجھے تو آپ کے طرزِ عمل حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسے شخص سے روز ملنے جاتے ہیں، جس کا اس معاشرے میں کوئی مقام نہیں۔ آخر اس شخص سے کیا مانگتے جاتے ہیں، جو خود دوسرے لوگوں کی روٹیوں کا محتاج ہے۔“ سلطان احمد بڑی بے باکی سے حضرت بابا بلے شاہ کی ظاہری حالت پر طنز کر رہا تھا۔

حافظ برخوردار نے ہنسنے ہوئے بیٹے کو حضرت بابا بلے شاہ کے مقام روحانی کے بارے میں بہت سمجھایا۔ مگر

جاگیردار زادہ یہی کہتا رہا۔

”زندگی یہ ہے جو میں گزرا رہا ہوں۔“ سلطان احمد نے انتہائی غرور کے لہجے میں کہا۔ ”جو کچھ نظر آ رہا ہے، بس وہی ہے..... اور جو کچھ دکھائی نہیں دیتا، وہ نہیں ہے۔“

دراصل سلطان احمد عام دولت مندوں کی طرح مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے اس فلسفے کا قائل تھا۔

بابر بہ عیش و نشاط کی جستجو کر کہ یہ زندگی دوبارہ نیست

(بابر عیش و نشاط کی جستجو کر کہ یہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی)

حافظ برخوردار، بیٹے کی اس ذہنی کجی پر دل ہی دل میں رو پڑے۔ ”بیٹے! میری خاطر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرو۔“

”بابا جان! میں وہاں ہرگز نہیں جاتا، جہاں میرا دل نہیں لگتا۔“ سلطان احمد نے باپ کی درخواست پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ دل اور روح کی گہرائیوں تک دولت کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”اگر آپ کے خیال میں وہ شخص کچھ دینے پر قادر بھی ہے تو مجھے بھی وہی دے گا، جو اس کے پاس ہے۔ یعنی مجھے بھی اپنے جیسا بنا دے گا۔“

حافظ برخوردار نے مزید گفتگو کی تو سلطان احمد یہ کہہ کر چلا گیا۔ ”اگر وہ ایسے ہی صاحب ولایت ہیں تو مجھے اپنی طرف کھینچ لیں۔“

حافظ برخوردار نے آبدیدہ ہو کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ”اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ بے شک! تُو پاک ہے..... اور میں ظالموں میں سے ہوں۔“



پھر ایک رات حضرت بابا بلے شاہ اپنا مخصوص وظیفہ پڑھتے ہوئے دریائے چناب کے کنارے ہی سو گئے۔ جیسے ان پر نیند طاری کر دی گئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد ہی آپ نے خواب میں دیکھا کہ پیر و مرشد حضرت شاہ عنایت قادری شریف لاتے ہیں۔ شیخ کو دیکھ کر حضرت بابا بلے شاہ ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

”سید عبداللہ! تم نے اپنے مرشد کو شاد کام کر دیا۔ تم فانی الشیخ کی منزل تک آپہنچے ہو..... پھر فانی الرسول!..... اور پھر فانی اللہ!..... حق تعالیٰ تم پر ساری منزلیں آسان فرمائے۔ ایک مرید کو اپنے مرشد سے اتنا ہی خوش عقیدہ ہونا چاہئے۔“

حضرت بابا بلے شاہ ادب سے کچھ اور خم ہو گئے۔ مرشد کامل نے مرید کامل کے سر پر انتہائی محبت سے اپنا دست کمر رکھ دیا۔

”سلطان احمد کا ہاتھ پکڑ لو۔ وہ تمہارا ہی ہے۔ اللہ دیکھیری فرمائے گا۔“

یہ کہہ کر حضرت شاہ عنایت قادری شطاری شریف لے گئے۔

حضرت بابا بلے شاہ کی آنکھ کھلی تو آپ ناقابل بیان مسرت سے سرشار تھے۔ پیر و مرشد نے آپ کی ارادت کو عشق کی سند پیش دی تھی۔ تصوف میں عقیدہ ابتدا ہے..... اور عشق انتہا..... حضرت بابا بلے شاہ نے اسی وقت دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔

دوسرے دن حافظ برخوردار خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت بابا بلے شاہ نے فرمایا۔ ”حافظ صاحب! آپ کو مبارک ہو۔ پیر و مرشد نے اجازت عطا کر دی ہے۔ اب آپ سلطان احمد کو اس فقیر کے پاس لے آئیں۔ اللہ کرم فرمائے گا۔“

”وہ تو درویشوں کا نام سننے کا بھی روادار نہیں ہے۔“ حافظ برخوردار نے ندامت کے لہجے میں کہا۔
 ”میں درویش کہاں ہوں حافظ صاحب؟“ یکا یک آپ کے لہجے سے جلالی روحانی کا اظہار ہونے لگا تھا۔
 تو حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا غلام ہوں۔ سلطان احمد، درویشوں کی آواز نہ سنتا ہو مگر اسے ”شاہ قادری“ کے غلام
 صدا سنتی ہی پڑے گی۔ بس یہی اس کا مقدر ہے۔ آپ جائیں تو سلطان احمد اس آواز کو سنے گا..... اور اس طرف
 سنے گا کہ پھر وقت کے گنبد میں اسے کوئی آواز سنائی ہی نہیں دے گی۔“
 حافظ برخوردار اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر فوراً ہی اپنی حویلی کی طرف چلے گئے۔

اس وقت سلطان احمد اپنے دوستوں کے ہمراہ شکار کے لئے جھنگ کے جنگلوں کی طرف جا رہا تھا۔ صورت حال
 نازک تھی۔ ایک طرف سیر و تفریح کا جنونی شوق..... اور دوسری طرف ایک فقیر بے سرو سامان کی دعوت..... حافظ
 برخوردار سوچ میں پڑ گئے کہ وہ سرکش بیٹے تک حضرت بابا بلھے شاہؒ کا حکم پہنچائیں یا نہیں؟ اس فکر و تردد کی ایک ہی وجہ
 تھی کہ کہیں سلطان احمد، حضرت بابا بلھے شاہؒ کے حکم کو ٹال نہ دے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو حافظ صاحب کو شدید اذیت
 سے دوچار ہونا پڑتا۔

حافظ برخوردار کچھ دیر تک ذہنی کشمکش کا شکار رہے۔ آخر جھجکتے ہوئے انہوں نے اپنی بات کہہ ہی ڈالی۔
 ”بیٹے! تمہیں شاہ صاحب نے یاد کیا ہے۔“
 حافظ برخوردار کا خیال تھا کہ سلطان احمد ان کی بات سن کر بھڑک اٹھے گا۔ مگر حیرت انگیز طور پر وہ سوچ میں پڑ
 گیا۔

”بابا جان! اس وقت تو میں دوستوں کے ساتھ شکار پر جا رہا ہوں۔ کل سہی۔“
 بیٹے کا نرم رویہ دیکھ کر حافظ صاحب کی ہمت بڑھی اور انہوں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ”شاہ صاحب
 ملتے ہوئے چلے جانا۔“
 سلطان احمد نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے دوستوں سے کہا۔ ”تم لوگ بھی میرے ہمراہ چلو۔ شاہ صاحب
 ملتے ہوئے جنگل چلے جائیں گے۔“

پھر یہ سیر و تفریح کے دلدادہ نوجوان اس کبل پوش فقیر کی جھونپڑی میں پہنچے جو دنیا بھر کے عیش و آرام سے
 موڑ کر، دریائے چنا کے کنارے موسم کی سختیاں برداشت کر رہا تھا..... اور اپنے نفس سے مسلسل جنگ لڑ رہا تھا۔
 حافظ برخوردار بھی بیٹے کے ساتھ ساتھ تھے۔ آج انہیں کسی حیرت ناک انقلاب کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔
 سلطان احمد نے جھونپڑی میں داخل ہو کر بڑے ادب کے ساتھ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں سلام عرض
 کیا۔ ”شاہ صاحب! آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے؟“

”عالم باپ کے بے خبر بیٹے! تم کہاں جا رہے ہو؟“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”سیر و شکار
 تمہاری منزل نہیں۔“

بات بات پر اپنے غرور کا مظاہرہ کرنے والا امیر زادہ حیران و پریشان کھڑا تھا۔ ”پھر میری منزل کہاں ہے شاہ
 صاحب؟“

”ہمارے پاس۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اس چٹائی کی طرف اشارہ کیا، جس پر آپ تشریف فرما تھے۔ ”اب
 تم خاندان قادریہ کے ایک معزز رکن ہو۔ کچھ تو اپنے خاندان کی لاج رکھو۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے پُر موز لہجے
 میں فرمایا۔

”شاہ صاحب! آپ چاہیں تو میرے قدموں کو روک دیں۔“ سلطان احمد کے نفس نے پھر شرارت کی۔ ”میں اپنی پسندیدہ بیگم ہوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

”سلطان احمد! تمہیں سب کچھ ترک کرنا ہوگا۔“ یکا یک حضرت بابا بلے شاہ کی حالت جلال نمودار ہوئی۔ ”آج بفضلِ خدا ہم نے تجھے زنجیر پہنا دی۔ اب تیرے قدم ان گلی کوچوں کی طرف نہیں اٹھیں گے۔“

حضرت بابا بلے شاہ کا روحانی فرمان سن کر سلطان احمد مسکرایا۔ ”شاہ صاحب! میں تو جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر سلطان احمد واپس جانے کے لئے مڑا مگر اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی ٹانگیں پتھر کی ہو گئی ہیں۔

”سلطان احمد! اگر تم ہماری محفل سے جا سکتے ہو تو چلے جاؤ۔“ حضرت بابا بلے شاہ کے چہرہ مبارک پر آتشِ جلال روشن تھی۔ ”اگر حق تعالیٰ ہمیں یہ طاقت عطا فرمائیں گے تو ہم روک کر دکھا دیں گے۔“

سلطان احمد کے دوستوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”سلطان! تم خواستہ اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ چلو، دیر ہو رہی ہے۔“

”دیر اسے نہیں، تمہیں ہو رہی ہے۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے سلطان احمد کے دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے زبانی۔

”یہ وقت پر آ گیا۔ تم اپنی فکر کرو۔ شکار کھیلو مگر اپنے نفس کے جنگل میں۔ بے لگام خواہشات پر تیر چلاؤ۔ ابھی نہارے پاس اتنی مہلت ہے کہ دن کے اُجالے میں دنیا کی شکار گاہوں سے مسجدوں کی طرف لوٹ آؤ۔ اگر رات ہوگی تو اندھیرے میں خود کسی شیطانی بھیڑیے کا شکار ہو جاؤ گے۔“

حافظ برخوردار پر بھی ایک لرزہ سا طاری تھا۔ آج پہلی بار انہوں نے ایک قادری سید زادے کو حالتِ جلال میں دیکھا تھا۔

سلطان احمد کے دوست بھی حیرت زدہ تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دریائے چناب کے کنارے پڑے ایک فقیر کے لہجے میں اس قدر جلال ہوگا کہ ان کے دل تک لرز اٹھیں گے۔

”سلطان احمد! تم جا سکتے ہو تو چلے جاؤ۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے اسی پر جلال لہجے میں حافظ برخوردار کے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

سلطان احمد نے، جسے اپنے پیروں کی طاقت سلب ہوتی محسوس ہو رہی تھی، پلٹ کر حضرت بابا بلے شاہ کی طرف دیکھا۔ پہلی بار ایک نامعلوم خوف نے آگھیرا۔ پھر وہ اپنے دوستوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”سلطان احمد! یہ سب شعبہ بازی ہے۔“ ایک دوست نے بلند آواز میں کہا۔ ”تم نفسیاتی مریض ہوتے جا رہے ہو۔ اپنے خیالات کو جھک دو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“

باردوست عیش و عشرت کی محفلوں کی طرف بلا رہے تھے..... اور ایک فقیر بے سرو ساماں اپنی ویران کنیا

(جھونپڑی) میں رہ جانے کی دعوت دے رہا تھا۔ بڑی عجیب کشمکش تھی۔ سلطان احمد اس وقت مرزا غالب کے اس شہر کی محکمہ تصویر بنا ہوا تھا۔

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے

سلطان احمد نے ایک بار پھر حضرت بابا بلے شاہ کی جھونپڑی سے نکل جانے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہا اور لڑکھارہ زمین پر گر پڑا۔ پھر اس پر ایک ناقابلِ بیان دہشت طاری ہو گئی۔ اور وہ دوستوں سے کہنے لگا۔

”تم لوگ جاؤ۔ لگتا ہے کہ اب وہ لوچے اور محفلیں میرے قدموں پر حرام ہو گئیں۔“

سلطان احمد کے دوست اسے مزید درغلنا چاہتے تھے..... مگر حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ان لوگوں پر ایک ڈالتے ہوئے فرمایا۔ ”بس اب چھوڑ دو اس کا پیچھا۔ یہ ہمارا تھا اور ہمارا ہی رہے گا۔“

اللہ ہی جانتا ہے کہ ایک درویش کے سادہ سے الفاظ میں کیا تاثیر تھی کہ وہ امیر زادے خوف زدہ ہو کر کھڑے ہوئے۔

”یہ شخص جادوگر ہے، جادوگر۔“ وہ لوگ بھاگتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

اور حافظ برخوردار کے چہرے پر وہ خوشی تھی، جو ایک لاعلاج مریض کے صحت یاب ہو جانے پر نمایاں ہوئی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور سلطان احمد کے دونوں بازو پکڑ کے اسے اٹھایا..... اور پھر لیا۔ ”سلطان احمد! تم ہمارے تھے اور ہمارے ہی رہو گے۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ کے سینے سے لگ کر سلطان احمد کی حالت غیر ہو گئی۔ پھر وہ بچکیوں سے رونے لگا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حضرت مولانا رومؒ کا یہ شعر انتہائی پر سوز لکھا۔

دست ہر نا اہل بيمارت کند
سوئے مادر آ کہ تيمارت کند

(ہر نا اہل کا ہاتھ تجھے بیمار کر ڈالے گا۔ اس لئے ماں کی طرف آ کہ وہ تیرا علاج کر سکے)

”شاہ صاحب! اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ ہی کا تھا۔ غلطی سے دوسرے لوگوں کے پاس چلا گیا۔“ سلطان احمد نے روتے ہوئے کہا۔ ”میری گستاخیوں کو معاف فرمادیں۔ میں نے آپ کے بارے میں بہت باتیں کہی ہیں۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے سلطان احمد کو اپنے سامنے بٹھا کر فرمایا۔ ”سلطان احمد! اس وقت تم ایک ناچنا تھا، اس لئے تمہاری ہر کوتاہی عمل اور ہر گستاخ کلامی معاف۔ اب حق تعالیٰ نے روشن آنکھیں بخش دی ہیں اور منزل کو پہچانو۔“

پھر یوں ہوا کہ اس گم کردہ راہ نوجوان نے اپنی منزل اس طرح پہچانی کہ سب کچھ چھوڑ کر اس درویشؒ جھوپڑی میں آ پڑا، جس کا سرمایہ عشق جاں سوز کے سوا کچھ نہیں تھا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ سراپا عشق تھے..... اور عشق کبھی پرسکون نہیں ہوتا۔ وہ تو سمندر کی موجوں کی طرح خود متلاطم ہوتا ہے..... اور دوسروں کو بھی مضطرب رکھتا ہے۔ جب سلطان احمد نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کا آستانہ پرکھا دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو گیا۔ عیش و عشرت کی محفلیں ہی نہیں، اپنا گھر بھی چھوٹ گیا۔ خوب صورت نوجوان بہ اور معصوم بیٹے کی یادیں بھی دل سے رخصت ہو گئیں..... اگر کچھ باقی رہا تو شیخ کی محبت۔

جب شوہر کی یہ بے اعتنائی بڑھتی چلی گئی تو ایک دن سلطان احمد کی بیوی نے اپنے خسر حافظ برخوردارؒ عرض کیا۔

”یہ کیسی فقیری ہے کہ ان سے بیوی بچے بھی چھوٹ گئے۔“

حافظ برخوردار اپنی بہو کی شکایت کا مفہوم سمجھتے تھے، اس لئے آپ نے بہت محبت سے سمجھایا۔ ”خدا خدا کرے اس نے سیر و شکار چھوڑے ہیں اور شاہ صاحب کی محبت میں دل لگایا ہے۔ اگر تم گھر کی یاد دلاؤ گی تو ہو سکتا ہے کہ

اسے راگ رنگ کی محفلیں بھی یاد آ جائیں..... اور پھر وہ خدا نخواستہ اپنے ماضی کی طرف لوٹ جائے۔ ذرا صبر سے کام لو۔ سلطان احمد آہستہ آہستہ اعتدال کی منزل میں آ جائے گا۔“

فرماں بردار ہو، مہربان خسر کی نصیحت سن کر خاموش ہو گئی اور اس دن کا انتظار کرنے لگی، جب شوہر اپنے گھر کی طرف لوٹے گا..... اور اپنی بیوی کو اسی محبت کی نظر سے دیکھے گا، جس کا مظاہرہ وہ شادی کے ابتدائی دنوں میں کیا کرتا تھا۔

اسی نکٹش انتظار میں ایک ہفتہ اور گزر گیا مگر احمد سلطان گھر لوٹ کر نہیں آیا، بس پیر و مرشد کی خدمت میں مصروف رہتا تھا۔

ایک دن حضرت بابا بلھے شاہؒ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”سلطان احمد! اب تو تمہیں وہ رنگین محفلیں یاد نہیں آئیں؟“

”اب تو ان کی رنگینوں سے خوف آتا ہے۔“ سلطان احمد نے کسی غلام کی طرح سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”اور بیوی بچے؟“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے دوسرا سوال کیا۔

”ان کی یاد بھی بہت کم آتی ہے۔“ سلطان احمد نے انتہائی مودبانہ لہجے میں عرض کیا۔

”تم حقوق العباد ترک کر رہے ہو اور ایک سالک کے لئے یہ عمل خطرناک ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے تنبیہ کے انداز میں فرمایا۔

سلطان احمد نے سرخم کر دیا۔

مرید کو خاموش پا کر حضرت بابا بلھے شاہؒ نے رسالت مآب ﷺ کی ذات اقدس سے وابستہ ایک خاص واقعہ سنایا۔

”ایک دن حضور اکرم سرور کونین رحمۃ اللعالمین ﷺ اپنی مجلس نورانی میں جلوہ افروز تھے۔ تمام صلبہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین صف بستہ بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کے بارے میں عرض کرتے ہوئے کہا۔“یا رسول اللہ ﷺ! وہ شخص بڑا عبادت گزار اور متقی ہے۔ نماز باجماعت ادا کرتا ہے اور باقاعدگی سے روزے رکھتا ہے۔“

رسالت مآب ﷺ بہت غور سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ پھر جب وہ خاموش ہو گیا تو خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا۔ ”اے شخص! تُو نے اس شخص کو معاملات دنیا میں کیسا پایا؟“

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت بابا بلھے شاہؒ نے سلطان سے فرمایا۔ ”تمہاری نماز و ریاضت اپنی جگہ..... مگر تم معاملات دنیا سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ تمہاری بیوی بھی ہے اور بچہ بھی۔ ضعیف العربا پ بھی ہے..... اور بوڑھے والدین بھی۔ تم پر ان سب کے حقوق ہیں۔ اگر تم یہ سارے حقوق ادا نہ کر سکتے تو قرض دار کہلاؤ گے۔ اور ایک قرض دار انسان کی دنیا میں کیا حیثیت ہے؟ آج لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے..... کل بروز قیامت حق تعالیٰ سے منہ چھپائے گا۔ دنیا میں بھی رسوائی..... اور آخرت میں بھی ذلت و بربادی۔ جاؤ، اپنے گھر کی طرف دیکھو۔“

پیر و مرشد کا حکم تھا، اس لئے سلطان احمد چلا گیا۔

ماں باپ اور بیوی بچے بہت خوش تھے..... مگر سلطان احمد دوسرے دن ہی حضرت بابا بلھے شاہؒ کی جھوپڑی میں لوٹ آیا اور دست بستہ عرض کرنے لگا۔

”شیخ! آپ کے بغیر دل نہیں لگتا۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے بہت غور سے سلطان احمد کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو بڑی مشکل آن پڑی۔“ اور پھر واقفیتاً سلطان احمد کو ایک عجیب سی مشکل نے گھیر لیا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ اُسے مجبور کر کے گھر بیٹھ کر ایک رات گزار کر پھر واپس آ جاتا۔ ہر بار ایک ہی جواز پیش کرتا کہ جہاں میرا شیخ موجود نہ ہو، وہ جگہ ایک روز آتی ہے۔

واضح رہے کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ خود بھی ایک عاشق جانناز تھے..... اور اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ قادیانیؒ کی محبت کے اسیر تھے۔ اس لئے سلطان احمد کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ ڈالا۔ اگرچہ حضرت بابا بلھے شاہؒ دانتہ طور پر ایسا نہیں چاہتے تھے کہ ایک جواں سال شخص اپنی ازدواجی اور دیگر معاشرتی ذمے داریوں سے ہرگز خائفہ ہو کر خانقاہ کے ایک گوشے میں چپ چاپ پڑ جائے۔ لیکن عشق پر کسی کو اختیار بھی تو نہیں۔ پہلے بظاہر ایک چنگاری نظر آتی ہے..... اور پھر وہی چنگاری شعلہ بن کر انسان کے ہوش و خرد بلکہ پورے وجود کو اپنی لپیٹ لیتی ہے۔ سلطان احمد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے سلطان احمد کو سیر و شکار کے لئے ایک نگاہ جلال سے دیکھا تھا..... پھر اسی نگاہ جلال نے فعلہٴ عشق بن کر سلطان احمد کا تن بدن بھونک دیا تھا۔ یہ وہی کیفیت تھی، جس کے بارے میں حضرت امیر خسروؒ نے فرمایا ہے۔

چھاپ تلک سب چھین لی رے مو سے نیناں ملائے کے

(یہ تیری ایک نظر کا کمال ہے کہ تُو نے مجھ سے میری بت پرستی کی ساری نشانیاں چھین لیں)

واضح رہے کہ یہ مشہور منقبت، آج جس کی گونج ساری دنیا میں سنائی دیتی ہے، حضرت امیر خسروؒ اور پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں کہی گئی تھی۔

عشق کی کچھ بھی کیفیت سلطان احمد کے ساتھ بھی تھی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ایک نظر دیکھا اور اُس کی بدلتی گئی۔

پھر یوں ہوا کہ سلطان احمد، دریائے عشق میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ حافظ برخوردار کو چھوڑ کر تمام گھر والے اہالیانِ خاندان اس بات سے شاک کی تھے کہ مرشد نے کیا سبق پڑھایا؟ سلطان احمد اپنی سدھ بدھ ہی کو ابھار کر غیر محتاط عزیزوں نے تو یہاں تک بھی کہہ ڈالا کہ یہ معرفت نہیں، جادوگری ہے۔ حافظ برخوردار، نادان عزیزوں اور دوستوں کی طنزیہ گفتگو سننے مگر خاموش رہتے۔ انہیں معلوم تھا کہ مرزا منزل میں دوہی راستے ہوتے ہیں۔

ایک سالک..... یعنی ہوش میں رہنے والا صوفی۔

دوسرے مجذوب..... عالم حیرت کا مسافر۔ اپنے گرد و پیش سے بے گانہ، جاں سوخت، گریباں چاک۔ حافظ برخوردار کے بیٹے سلطان احمد کی قسمت میں دوسرا راستہ لکھا تھا، سو اسی کو مشیت الہی سمجھ کر قبول کر لیا۔



اسی زمانے میں جب حضرت بابا بلھے شاہؒ، دریائے چناب کے کنارے قیام فرما تھے، ایک نوجوان، فقہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ (یہ جگہ آج کل ضلع فیصل آباد میں شامل ہے) اس نوجوان کا نام حافظ اس نے حضرت بابا بلھے شاہؒ سے بیعت کی درخواست کی۔

”تم کچھ دن یہاں ٹھہر کر انتظار کرو کہ تمہارے مقدر میں کیا لکھا ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے فرمایا کہ درخواست کے جواب میں فرما۔ ”میں اس سلسلے میں با اختیار نہیں ہوں۔ اگر پیر و مرشد نے توجہ فرمائی تو نعم

ہوئے۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ کا جواب سن کر حافظ جمالؒ پر شدید مایوسی طاری تھی۔ مگر وہ بنیادی طور پر حافظ قرآن تھے۔ ان کی نگاہ ان کے بڑے پُرسوز لہجے میں دعا کرتے۔ ”اے زمین و آسمان کے نور! تُو نے اپنے کلام کی روشنی سے مجھے کنور فرمایا..... اب اسی روشنی کے صدقے میں مجھے مرشدِ کامل عطا کر۔“

بہاگتے بہاگتے حافظ جمالؒ کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اسی طرح گریہ و زاری کرتے کرتے کوئی ایک ماہ گزر گیا۔ حافظ جمالؒ روزانہ کئی بار اس اُمید پر حضرت بابا بلھے شاہؒ کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھتے کہ شاید ارضِ لاہور میں ان کی درخواست کی منظوری آگئی ہو۔ اس وقت حضرت شاہِ عنایت قادریؒ لاہور میں جلوہ افروز تھے..... مگر حضرت بابا بلھے شاہؒ کو خاموش دیکھ کر حافظ جمالؒ کا دل بجھ جاتا..... اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے پڑھتے۔

”جمال! تُو اس قابل نہیں ہے کہ حضرت شاہِ عنایت قادریؒ کی مجلسِ معرفت میں شریک ہو سکے۔ اپنے گھر کو نہایت جاگہ کسرامِ ازل نے تیری تقدیر میں یہ سعادت تحریر نہیں کی ہے۔“

مُردہ کی اپنے آپ پریشان خیالات کو جھٹک دیتے۔ ”جمال! تُو یہاں سے اُٹھ کر اور کہاں جائے گا؟ اس دنیا سے نکل کر تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ یہیں پڑا رہ۔ شاید وہ آفتابِ معرفت کسی دن مہربان ہو جائے اور تیرے دل کی تاریکیاں دور کر دے۔“

حافظ جمالؒ کی دن تک اسی ذہنی کشمکش کا شکار رہا۔ بالآخر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں ساری زندگی گزار دیں گے۔ اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ انہیں حلقہ بیعت میں شامل فرمائیں یا اس سے محروم رکھیں۔

ان روز رات کو حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اپنے پیر و مرشد حضرت عنایت قادریؒ کو خواب میں دیکھا، شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”سید عبداللہ! حافظ جمالؒ کو بھی سرفراز کر دو۔ اب وہ ایک در کا پابند ہو گیا ہے۔“

دوسرے دن حضرت بابا بلھے شاہؒ نے حافظ جمالؒ کو سلسلہ قادریہ میں شامل کر لیا۔ پھر کچھ دن تک ان کی روحانی تربیت کے انہیں واپس بھیج دیا۔

حافظ جمالؒ اور سلطان احمد دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے..... دونوں مرشد کے عشق کا دم بھرتے تھے..... مگر ان کی گہرائی اور شدت مختلف تھی۔ حافظ جمالؒ اپنے شیخ سے رخصت ہوئے تو ان کے چہرے پر عکسِ ملال تھا کہ اب جدا ہو رہے ہیں..... مگر ساتھ ہی خوش بھی تھے کہ بامراد ہو کر اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

ان کے برعکس جب حضرت بابا بلھے شاہؒ نے سلطان احمد سے فرمایا کہ تم بھی کچھ دن کے لئے اپنے گھر چلے جاؤ سلطان احمد نے بے اختیار ہو کر عرض کیا۔ ”میرا گھر، میرے مرشد کے قدموں میں ہے۔ میں تو ایک لمحہ فراق بھی شہ نہیں کر سکتا۔ کہاں کی گھڑیاں..... اور کہاں کے دن؟“

اس ہی فرق تھا، سلطان احمد اور حافظ جمالؒ کے عشق میں۔ کسی شاعر نے عشق کی ایسی کیفیت کو اس طرح بیان کیا۔

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے



حافظ جمال کے جانے کے بعد سلطان احمد اکیلے اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ لکڑیاں کاٹ کر لاتے۔ آگ جلاتے اور پھر شیخ کے لئے اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے۔ کئی بار والدہ نے اپنے کو بھیجا کہ وہ سلطان احمد کے بجائے حضرت بابا بلھے شاہ کی خدمت گزاری کے فرائض انجام دیا کریں۔ احمد انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیتے۔

”میں اپنی زندگی میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے مرشد کسی دوسرے کی خدمت میں زیر بار ہوں۔“ جب حضرت بابا بلھے شاہ تک یہ بات پہنچی تو آپ بڑے جذب و شوق کے عالم میں فرماتے۔ ”سلطان احمد قادری بہت غیرت مند ہے۔“

جاڑوں کے موسم میں سلطان احمد پچھلی رات کو اٹھ کر پانی گرم کرتے تاکہ آبِ بخار سے منور نہ ہو۔ پیر و مرشد کو کسی جسمانی اذیت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ آخر شیخ کی اسی محبت نے سلطان احمد کو جانثاری کی طرف پہنچا دیا۔

ایک دن حضرت بابا بلھے شاہ کھانا تناول فرما رہے تھے..... اور سلطان احمد پیچھے کھڑے پنکھا جھول رہے۔ حضرت شیخ نے کھانا ختم کیا، مٹی کے برتن میں کچھ شوربہ باقی تھا۔ حضرت بابا بلھے شاہ نے آدھا شوربہ ڈالا۔ برتن اپنے مرید خاص کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

”سلطان احمد! یہ تمہارا حصہ ہے۔ اسے پی لو۔“

سلطان احمد گھٹنوں کے بل جھک گئے..... اور مرشد کے جھوٹے کو آبِ حیات سے زیادہ گراں قدر سمجھ کر شوربے کا حلق سے اترتا تھا کہ سلطان احمد پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کئی گھنٹے تک دیوانہ وار رقص کرتے۔ پھر شیخ نے ان کے سر پر اپنا دستِ کرم رکھا تو پُر سکون ہوئے۔

اس واقعہ کے بعد سلطان احمد ”مستانہ“ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اکثر خاموش رہتے اور پیر و مرشد مبارک دیکھتے رہتے۔ اگر کوئی پوچھتا کہ سلطان احمد! کیا دیکھ رہے ہو؟ تو رقص شروع کر دیتے۔

جب سلطان احمد کی اس حالت کی خبر ان کے رشتے داروں کو ملی تو انہوں نے حافظ برخوردار سے کہا۔ ”ابا! کو اس دن کے لئے شاہ صاحب کے پاس بھیجا تھا کہ وہ ایک ہوش مند کو دیوانہ بنا کر چھوڑ دیں؟“

حافظ برخوردار بڑے تحمل سے عزیزوں کے اس طرز کو برداشت کرتے اور نہایت مطمئن لہجے میں جواب دیتے۔

”عیش پرست سلطان احمد سے تو ”دیوانہ“ سلطان احمد ہزار درجہ بہتر ہے۔ میں شاہ صاحب کا بے شک ہوں کہ ان کی توجہ سے میرے بیٹے کو دنیا کی ریاکاریوں سے نجات حاصل ہوئی۔“

اہل دنیا کو کیا خبر کہ سلطان احمد کس انداز کے ”مستانہ“ تھے۔ جب کوئی شخص انہیں رقص کرتے دیکھ کر تم کس باپ کے بیٹے ہو اور یہ کیا کر رہے ہو، تو سلطان احمد جواب میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے حضرت خواجہ عثمان ہروٹی کا یہ شعر پڑھ کر دوبارہ رقص شروع کر دیتے۔

مئی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم

مگر نازم بہ این ذوق کہ پیش یاری رقصم

(میں نہیں جانتا کہ جب مجھے دیدار کی سعادت حاصل ہوتی ہے تو میں کیوں رقص کرنے لگتا ہوں۔ اس بات پر ناز ہے کہ میں کسی غیر کے آگے نہیں، اپنے دوست کے سامنے رقص کرتا ہوں)

سلطان احمد مستانہ آخری سانس تک اپنے شیخ حضرت بابا بلھے شاہ کی خدمت میں رہے۔ اس جملے

ہے کہ حضرت بابا بلے شاہ کی زندگی ہی میں سلطان احمد مستانہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت بابا بلے شاہ ان کے بیٹے پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سواتین سو سال گزر جانے کے بعد بھی سلطان احمد شاہ کی اولاد کو حضرت بابا بلے شاہ کے حزار مبارک کی سجادہ نشینی کا اعزاز حاصل ہے۔

برگاہِ دین کے کسی تذکرے میں اس بات کی وضاحت موجود نہیں کہ دریائے چناب کے کنارے حضرت بابا بلے شاہ کی ریاضت اور مجاہدات کا زمانہ کتنے ماہ و سال پر مشتمل ہے؟ مگر حافظ برخوردار، سلطان احمد مستانہ اور حافظ علی دہلوی رحمانی تربیت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت بابا بلے شاہ، دریائے چناب کے کنارے کم سے کم پانچ چھ سال تک ضرور مقیم رہے۔ غالباً یہ وہی زمانہ ہے، جب آپ کے سینے میں عشق کی دہلی دہلی چنگاریاں سلگتی رہیں۔ پھر ان کی چنگاریوں نے اپنے اظہار کا راستہ تلاش کر لیا۔ ایک عارف اور سالک کے اظہار عشق کے دو ہی راستے ہیں۔ پہلے وہ اپنے خالق کی حمد بیان کرے..... اور پھر حبیبِ پاک ﷺ کی ثنا (نعت) جن کی ذات پاک پر اللہ اور اس کے رشتہ بہر وقت درود و سلام بھیجتے رہتے ہیں۔

حضرت سید عبداللہ نے نعتِ مبارک سے اپنی عشقیہ شاعری کا آغاز کیا..... اور بلے شاہ تخلص اختیار کیا۔ پھر اس تخلص کو شہرت و دام حاصل ہوئی اور تاریخ دانوں کے سوا کسی کو یاد نہیں رہا کہ حضرت بابا بلے شاہ دراصل سید بلے قادری ہیں۔

اگر تذکرہ نویسوں نے ایک ہی بات پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت بابا بلے شاہ کو اپنے آپ سے دور رکھنے میں حضرت شاہ عیادت قادری شطاری کا ایک ہی مقصد پوشیدہ تھا کہ معرفت کی منزل کا مسافر جب قریبی رشتوں اور حشری وابستگیوں سے دور رہے گا تو موسمِ تنہائی اسے رلائے گا۔ پھر یہ آنسو سینے میں دہلی ہوئی عشق کی آگ کو بجائیں گے۔ اہل نظر نے مشاہدہ کیا ہو گا کہ جب سورج کی تمازت سے تڑختی ہوئی زمین پر پانی کی چند بوندیں پڑیں تو پانی زمین سے ہلکا سا غبار اٹھتا ہے۔ اسی غبار کو عشق کی زبان میں دھواں بھی کہا جاسکتا ہے۔ پھر جب غبارِ زمین کی قدر تیزی آگئی تو حضرت شاہ عیادت قادری نے اپنے مرید صادق کو لاہور حاضر ہونے کی ہدایت دی۔

دوسرے عجیب تھا، جب حضرت بابا بلے شاہ پیر و مرشد کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہوئے تو اس قدر وارفتہ ہو گئے کہ ہاتھ نہیں رہا۔ اتار دئے کہ آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ بار بار پیر و مرشد سے ایک ہی شکایت کرتے تھے۔

”بیدی! مجھے آتشِ فراق میں کیوں جلایا گیا؟ اور ان لوگوں کو دیدار سے کیوں شرفِ یاب کیا گیا؟“ حضرت بابا بلے شاہ کا اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا، جو ہر وقت پیر و مرشد کی خدمت میں معروف رہتے تھے۔

حضرت شاہ عیادت قادری، حضرت سید عبداللہ (بابا بلے شاہ) کی تالیفِ قلب کے لئے فرماتے۔

”سید عبداللہ! ان میں سے بہت سے قریب رہ کر بھی دور ہیں۔ اور تم دور رہ کر بھی بہت زیادہ قریب ہو۔“

حضرت شاہ عیادت قادری کی اس بات کا مفہوم یہ تھا کہ ”دوری اور قربت“ کبھی کبھی اپنے ظاہری مفہوم میں الجھت نہیں رکھتی۔ ایک مرید اپنے مرشد کی خدمت میں ساری زندگی گزار دیتا ہے مگر اسے معرفت کا انتہائی نام نہان گاہِ ابتدائی صلہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی خدمت گزاری میں وہ غلو صِ عشق اور دیانت داری شامل نہیں ہوتے جو کارگزاری کو معتبر اور مقبول بناتے ہیں۔ اسی لئے وہ قریب رہ کر بھی دور ہی رہتا ہے۔ اسی مضمون کو بلقیہ شاعر نے بڑی مؤثر دلیل کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندرا

اس شعر کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ ایک بار سکندر ذوالقرنین نے حضرت خضر علیہ السلام سے درخواست کی کہ اسے آب حیات کے چشمے تک لے جائیں۔ اس چشمے کے بارے میں روایت ہے کہ جو اس کا پانی پی لے گا وہ اس کی موت واقع نہیں ہوتی۔ حضرت خضر علیہ السلام، سکندر ذوالقرنین کو اس چشمے تک لے گئے جہاں بگڑا حالت میں پڑے ہوئے تھے کہ ان کی عمریں دو دو ہزار سال کی تھیں..... مگر وہ اتنے بوڑھے اور ناتواں تھے کہ جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ بس اُن کی سانسیں چل رہی تھیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے کہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ سکندر ذوالقرنین نے حضرت خضر علیہ السلام سے دریافت کیا۔

”یہ کون لوگ ہیں؟ اور ان کی یہ حالت کس طرح ہوئی ہے؟“

حضرت خضر علیہ السلام نے جواب دیا۔ ”ان لوگوں نے آب حیات پیا ہے، جس کی تاثیر سے یہ مر سکتے..... مگر ان میں انسان کی طبعی زندگی کی تڑپ، حرارت اور طاقت باقی نہیں رہتی۔ اب یہ تمام لوگ ان میں قیامت تک زندہ رہیں گے۔“

سکندر ذوالقرنین نے انسانی زندگی کی یہ بے چارگی اور بے کسی دیکھی تو یہ کہہ کر آب حیات کے ٹپے لوٹ آیا۔ ”مجھے ایسی عمر دوام نہیں چاہئے، جو موت سے بھی بدتر ہو۔“

واضح رہے کہ یہ وہ یونانی سکندر نہیں ہے، جسے سکندر اعظم کہا جاتا ہے۔ سکندر ذوالقرنین وہ مردِ دلیر جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اور آپ ہی نے مخلوق خدا کو یا جوج ماجوج کی قفسہ انگیزیوں سے نکلوانے کے لئے تانبے اور لوہے کی ایک بلند دیوار بنائی تھی، جو تاریخ میں ”سید سکندری“ کے نام سے مشہور ہے۔

مذکورہ شعر کا ترجمہ اس طرح ہے۔ ”جو لوگ پیدا کٹی محروم ہوتے ہیں، انہیں رہبر کامل بھی کوئی فائدہ نہیں سکتا۔ جس طرح حضرت خضر علیہ السلام، سکندر ذوالقرنین کو آب حیات کے چشمے پر لے گئے مگر وہ انہیں باعثِ پیاسا ہی لوٹ آیا۔“

حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے فرمودات کا بھی یہی مفہوم تھا۔ ”قرب رہنے والے دُور ہو سکتے ہیں۔ دُور رہنے والے قریب۔“

اس کے بعد پیر و مرشد نے اپنا دستِ کرم حضرت بابا بلھے شاہؒ کے سر پر رکھتے ہوئے فرمایا۔ ”سید عباد اللہ! آتشِ فراق میں اس لئے جلایا جا رہا ہے کہ ایک دن تم اکسیر بن جاؤ۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ وارفہ ہو کر پیر و مرشد کے قدموں سے لپٹ گئے۔ ”سیدی! مجھے آتشِ عشق میں جلا کر دینا..... مگر اپنے آپ سے جدا نہ کرنا۔ جسمِ فانی کی انتہا یہ ہے کہ ایک دن خاک ہو جائے..... مگر میرا نہ معرانیہ یہ ہے کہ وہ مرشد کے قدموں سے لپٹ جائے، مجھے اس سعادت سے محروم نہ رکھنا۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ کی التجاسن کر حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے نہایت جذب و شوق کے لہجے میں فرمایا۔ ”عبداللہ! حق تعالیٰ نے چاہا تو دونوں جہان میں ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔“

پیر و مرشد کا فرمانِ مبارک سن کر حضرت بابا بلھے شاہؒ کو قرار آ گیا۔



قیام لاہور کے دوران ہی ایک دن حضرت بابا بلھے شاہؒ، حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کے حوازا

مانہ ہوئے۔ وہاں بہت سے زائرین اور طالبانِ شوق جمع تھے۔ ان میں کچھ درویش بھی شامل تھے۔ ایک درویش نے بڑے سوز اور خوش الحانی کے ساتھ حضرت شیخ سعدیؒ کی شعرِ آفاقِ نعتیہ رباعی پڑھی۔

بلغ اعلیٰ بکمالہ
کشف الدجی بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ وآلہ

دوسرے درویش نے فارسی نعت کا یہ شعر پڑھا۔

وصلی اللہ علی نور کز و شد نوہا پیدا
زمین از حب او ساکن، فلک در عشق او شیدا

(مرکارِ دو عالم ﷺ کے نورِ پاک سے بہت سے نور پیدا ہوئے۔ سرورِ کونین کی محبت میں زمین ساکت ہو گئی۔ اور آپ کے عشق میں آسمان دیوانہ ہو گیا)

یہ قاری شعر سینکڑوں سال پہلے کہا گیا تھا۔ اس وقت زمین کے بارے میں سائنسی تحقیق نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے عام نظریہ یہی تھا کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے۔ شاعر نے حضور اکرم ﷺ کی محبت کو زمین کے ساکن ہونے کا بہانہ دیا۔ اس کے برعکس آسمان کے بارے میں حکیمانہ نظریہ یہ تھا کہ وہ گردش کرتا ہے۔ جیسا کہ مرزا غالب نے کہا ہے..... رات دن گردش میں ہیں سات آسماں..... اس لئے شاعر نے آسمان کی گردش کو حضور اکرم ﷺ کے عشق کی وحشت کا نتیجہ قرار دیا۔

تیسرے درویش نے ہندی اور پوربی زبان کی یہ خوبصورت ترین نعت پڑی۔

(ترجمہ) ”بھلا کا باسی من موہن (محبوب) ایک آن میں عرش پر پہنچ گیا۔ اے سکھی! اب میں تجھ سے کیا کہوں لوگوں و مکاں میں کسی دھوم مچی تھی؟ جب اس موہن کے کھ سے پردہ ہٹا تو زمین و آسمان اور فرشتے سب کے سب الہی لقب“ کی شان میں بول اُٹھے کہ اس جیسا کوئی دوسرا نہیں۔“

اس نعتِ مبارک نے حاضرین پر عجیب سی کیفیت طاری کر دی اور حضرت بابا بلھے شاہؒ وجد میں آ گئے، پھر جذبِ الہی کی اسی حالت میں آپ نے اپنی پنجابی نعتِ مبارک خوش الحانی کے ساتھ پڑھی۔

ہن میں لکھا سوہنا یار
جس دے خُسن دا گرم بازار
پیارا پہن پوٹا کاں آیا
آدم اپنا نام دھرایا
احد تے بن احمد آیا
نمایاں دا سردار

(اب میں نے اپنے خوب صورت محبوب (پیغمبرِ اسلام) کے بارے میں لکھا جس کے بے پناہ خُسن کے سبب بازارِ عالم میں عجب رونق ہے۔ میرا پیارا محبوب حسین و دلکش لباس پہن کر آیا اور اس نے اپنا نام آدم رکھا۔ احد (اللہ) کی شان احمد میں جھلکتی ہے۔ اسی لئے میرا محبوب نبیوں کا سردار قرار پایا)

حضرت بابا بلھے شاہؒ کی نعتِ مبارک نے اہلِ محفل کو زلا دیا..... اور خود آپ کی حالت بھی غیر ہو گئی۔ آنکھوں

سے آنسو جاری تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے سرکارِ دو عالم ﷺ کے روضہ اقدس کی زیارت کے بغیر آپ زندگی ایک بار گراں ہے۔

پھر اسی حالت میں حضرت بابا بلھے شاہؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزارِ مبارک سے اٹھے اور اپنے پیروں پر حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرید صادق کی یہ حالت دیکھ کر حضرت شیخؒ نے فرما دیا: ”سید عبداللہ! کیا بات ہے؟“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے روتے ہوئے عرض کیا۔ ”سرورِ کونین ﷺ کے فراق میں تڑپتا ہوں۔ آج حضرت گنج بخشؒ کے مزارِ مبارک کے احاطے میں درویشوں نے اللہ کے حبیب ﷺ کا ذکرِ پاک کیا تو اپنی عمری ہلا گیا۔“

”سرکارِ دو عالم ﷺ کی یاد میں یہ آنسو تمہاری دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہیں۔ میں خوش ہوں کہ حق تعالیٰ تمہاری التجائیں سن لیں۔ اب تم مفلس نہیں رہو گے۔“

: ”سیدی! میں اپنے ان آنسوؤں کو خاکِ مدینہ میں جذب کرنا چاہتا ہوں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ہونے اشکوں میں کچھ اور روانی آگئی تھی۔ ”میرے آقا ﷺ کا فرمانِ مقدس ہے کہ جس نے میری قبر کی زیارت گویا اس نے مجھے زندہ دیکھا۔“

”کیا تم مدینہ منورہ جانا چاہتے ہو؟“ اگرچہ حضرت شاہ عنایت قادریؒ، حضرت بابا بلھے شاہؒ کی باتوں کا مظہر مئے تھے لیکن پھر بھی آپ نے وضاحت چاہی۔

”اب دیدار کے سوا یہ دل مضطرب کسی طرح قرار نہیں پائے گا۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنی جگہ طے کر کے کہ وہ ہر حال میں مدینہ منورہ حاضری دیں گے۔ اسی لئے پیر و مرشد سے اجازت لینے کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے اپنے مرید صادق کے جذبہٴ عشق کا اندازہ کر لیا تھا کہ بابا بلھے شاہؒ نے سوا کسی دوسری بات پر رضامند نہیں ہوں گے۔ اس لئے آپ بہت دیر تک مراقبہ کی سی حالت میں بیٹھے رہے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ اُمید و بیم کی حالت میں بار بار پیر و مرشد کے چہرہٴ مبارک کو دیکھتے رہے اور سوچتے رہے شیخ کی طرف سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

آخر حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے آنکھیں کھولیں..... اور حضرت بابا بلھے شاہؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”سید عبداللہ! تمہیں تمہارے سوال کا جواب تین دن بعد ملے گا..... انتظار کرو۔“

یہ کہہ کر حضرت شاہ عنایت قادریؒ خانقاہ کے عام کمرے سے اٹھ کر اپنے حجرہٴ خاص میں تشریف لے گئے۔ اور حضرت بابا بلھے شاہؒ حیرت و حسرت سے حجرے کے دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر آپ کا ذہن اللہ سے بھر گیا۔

”پیر و مرشد نے اجازت دینے کے لئے تین دن کی مہلت کیوں طلب کی؟ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ مقدس کی حدود میں قدم رکھ سکوں؟ یا سرکارِ دو عالم ﷺ کے روضہ اطہر کی زیارت میرے مقدور ہی میں نہیں ہے سوچ کر حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر آپ نے بڑے پُرسوز لہجے میں اپنے مالک کو پکارا: ”اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں..... اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں..... اپنے ذکر سے ہمارے کو آباد رکھ..... اور اپنے حبیب ﷺ کے روضہ اقدس کے دیدار سے ہماری گناہ گار آنکھوں کو محروم نہ کر کہ ٹوٹی بندوں کا مشکل کشا ہے..... اور تُو ہی دیکھ کر۔“



رات گزر گئی اور دن طلوع ہوا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے ذہن میں وہی سوالات اور اندیشے گردش کر رہے تھے۔
 نوات کے مطابق پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا درس شروع ہوا۔ دیگر
 طالبانِ حق پوری توجہ اور یکسوئی قلب کے ساتھ حضرت شیخؒ کا وعظ سنتے رہے۔ مگر حضرت بابا بلھے شاہؒ کا ذہن ان ہی
 نوات میں الجھ رہا۔

آخر میں ختم ہوا اور حاضرین مجلس اٹھ کر اپنے گھروں کو چلے گئے..... مگر حضرت بابا بلھے شاہؒ اس خیال سے پیر
 اور نیک خدمت میں بیٹھے رہے کہ شاید حضرت شیخ مہربان ہو کر وقت سے پہلے ہی مدینہ منورہ جانے کی اجازت
 دے دیں۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ اپنے مرید صادق کی اس بے چینی سے باخبر تھے۔ اس لئے آپ نے اپنے روایتی
 نمونہ کے ساتھ فرمایا۔

”میر عبد اللہ! خالق کائنات کے یہاں ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان بھی تین دن کا
 فاصلہ مقرر ہو چکا ہے۔ نہ بے مبری اچھی چیز ہے اور نہ وعدہ خلافی۔“
 اپنے دل کا حال منکشف ہو جانے پر حضرت بابا بلھے شاہؒ کے چہرے پر ندامت کے آثار ابھر آئے اور آپ پیر و
 ارشدِ معانی کے خواستگار ہوئے۔

اتفاق کا قافلہ اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا..... اور دوسرا دن بھی گزر گیا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے تجسس
 اور اضطراب کا وہی عالم رہا۔ آخر تیسرا دن بھی گزر گیا اور رات آگئی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے نمازِ عشاء ادا کی اور
 اپنے اور اردو وظائف میں مشغول ہو گئے۔ پھر اسی دوران آپ کی آنکھ لگ گئی۔ یکایک حضرت بابا بلھے شاہؒ نے خود کو
 ایک کی نورانی مجلس میں موجود پایا، جس کے در و بام پر انسانی آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ آپ حیرت زدہ تھے اور سوچ
 رہے تھے۔

”یہ کس کی مجلس ہے اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“

حضرت بابا بلھے شاہؒ کے ان سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ یکایک پوری مجلس ایک خوشبوئے خاص
 سے ملبوس ہوئی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ سنبھل گئے۔ پھر نور کا ایک ہیولا نمودار ہوا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے یہ تواندازہ کر
 پا کہ اس بولے میں کوئی انسانی پیکر موجود ہے۔ مگر نور کی زیادتی کے سبب خدوخال نمایاں نہیں تھے۔

”میر عبد اللہ!“ نورانی پیکر سے آواز ابھری جو انتہائی شیرینی اور حلاوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے گھبرا کر نورانی پیکر کی طرف دیکھا اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ پھر کچھ دیر بعد ہوش
 آئے اور مجلس وہی گئی..... مگر نورانی پیکر موجود نہیں تھا۔ ایک بار پھر حضرت بابا بلھے شاہؒ پر حیرت کا غلبہ ہو گیا۔

ایک ایک گوشے سے آواز ابھری۔ ”مبارک ہو کہ تم سرکارِ دو عالم ﷺ کی زیارت سے شرف یاب ہوئے۔“
 اسی آواز کے ساتھ حضرت بابا بلھے شاہؒ ﷺ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ فرط مسرت سے بے تاب ہو کر خانقاہ سے
 نکلے اور مرشد کے حجرہ خاص میں داخل ہو گئے۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ نمازِ تہجد سے فارغ ہو کر مراقبہ میں مشغول تھے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ جوشِ جذبات
 سے رات بھر حضرت شیخؒ کے استغراق میں خلل ڈالنے کی گستاخی کے مرتکب نہیں ہو سکتے تھے۔ مجبوراً دست بستہ
 اپنے کمانے کھڑے رہے۔

کچھ دیر بعد حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے آنکھ کھول کر آپ کی طرف دیکھا۔ حضرت بابا بلے شاہؒ اچھا لڑکے کے عالم میں آگے بڑھے اور پیر و مرشد کے ہاتھ چوم لئے۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے اپنا شفیق و مہربان ہاتھ حضرت بابا بلے شاہؒ کے سر پر دراز کر دیا..... اور پڑوسو لہجے میں فرمایا۔ ”سید عبداللہ! حق تعالیٰ نے اس عاجز کی لاج رکھی اور تمہیں سرور کونین ﷺ کے بدولت لازوال سے سرفراز فرمایا۔ تم ایک ہی رات میں مفلس سے تو مگر بن گئے۔ اس سرمائے کی حفاظت کیا۔ حضرت شیخ سعدیؒ کا یہ مشہور شعر پڑھا۔

خلاف پیمر کسے رہ گزید

کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

(جس نے بھی پیغمبر اسلامؐ کی سنت کے خلاف عمل کیا، وہ زندگی بھر سفر میں رہنے کے باوجود اپنی منزل تک نہیں پہنچے گا)



اس واقعے کے بعد حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا حکم ہوا کہ ”پانڈو کے“ واپس جائیں۔ اس شہر میں حضرت بابے شاہؒ نے اپنا بچپن گزارا تھا اور یہیں آپ کے والدین اور بہنیں مقیم تھیں۔ ماں باپ نے ایک طویل عرصے کے بعد اپنے کامیاب و کامران بیٹے کو دیکھا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ حضرت بابا بلے شاہؒ کی بہنوں کے بھائی تھے۔ موقع ملے ہی تمام بہنوں نے والدین کو مشورہ دیا کہ حضرت بابا بلے شاہؒ کی شادی کر دی جائے۔ پانڈو فطرت کا تقاضا بھی تھا اور پیغمبر اسلامؐ کی سنت بھی۔ نتیجتاً ایک دن آپ کے والد محترم سید سخی شاہ محمدؒ نے اپنے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

حضرت بابا بلے شاہؒ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا۔ ”شادی ایک زنجیر ہے میں یہ زنجیر پہننا نہیں چاہتا۔“

”شادی تو انبیائے کرام نے بھی کی ہے اور اولیائے عظام نے بھی۔ پھر تمہارے انکار کی وجہ؟“ سید سخی شاہؒ نے مذہبی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ”آخر تم ایک نئی روش اختیار کرنا کیوں چاہتے ہو؟“

”میں ایک مرد آزاد کی حیثیت سے اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر حضرت بابا بلے شاہؒ چلے گئے۔ اور حضرت سید سخی شاہ محمدؒ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ انہیں اپنی نسل بے نشان ہوتی نظر آ رہی تھی۔

جب ماں باپ، حضرت بابا بلے شاہؒ کو شادی کے لئے رضامند نہ کر سکے تو بات آپ کی بہنوں تک چلی گئی۔ ایک بہن نے کہا۔ ”یہ سب کچھ بھائی کے پیر، شاہ عنایت قادریؒ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔“

دوسری نے ماں باپ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ انہیں حکم دیں کہ وہ ویران بستیاں چھوڑ کر شہر دل میں کریں۔ جب انسانوں کے ہجوم میں رہیں گے تو پھر ان کی برسوں پرانی وحشتیں بھی چھوٹ جائیں گی۔“

شادی پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔“ دنیا داری کے اعتبار سے یہ ایک نہایت ہوش مندانہ مشورہ تھا..... مگر سید سخی شاہ سرورؒ نے فرمایا۔ ”میں نے خود سید عبداللہ کو مرشدِ کامل کی تلاش میں بھیجا تھا۔ اب جبکہ اسے مرشد کی خصوصی توجہ حاصل ہو گئی ہے تو پھر کبھی مرشد کی جھٹسلی ترک کر دے؟ بھائی، بہنوں کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ تم لوگ ہی سید عبداللہ کو اپنے رشتوں

محبوبوں کا واسطہ دو۔ شاید وہ اس طرح آمادہ ہو جائے۔“

اس سلسلے میں حضرت بابا بلے شاہ کی شدت دیکھ کر ماں باپ کو یقین تو نہیں تھا کہ یہ معاملہ آسانی سے طے پا جائے گا مگر آپ نے آخری طریق کار کے طور پر اپنی بیٹیوں کو اس طرف رجوع کیا۔

حضرت بابا بلے شاہ کی بہنیں کم عمر بھی تھیں..... اور حالات کے بیچ و خم سے نا آشنا بھی۔ ان کی سمجھ میں براہ راست ایک ہی بات آئی کہ وہ اپنے رشتے کو درمیان میں لے آئیں..... اور انہوں نے اپنی کم عقلی کے سبب اپنی بہن اور قتل کو حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی ذات گرامی کے مقابل کھڑا کر دیا۔

ایک بہن نے بڑے لاڈ کے ساتھ کہا۔ ”بھائی! آپ ہمارے لئے کیا کر سکتے ہیں؟“
 ”جو ایک محبت کرنے والا بھائی کر سکتا ہے۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے کسی دعوے کا سہارا لئے بغیر بہت سادگی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔

”اگر تمہیں ہم سے محبت ہے تو اپنے پیر و مرشد کی محبت کم کر دو۔ اور ماں باپ کی محبت کا حق ادا کرو، جو تمہیں مایہ اولاد دیکھنا چاہتے ہیں۔“

حضرت بابا بلے شاہ، بہنوں کی بات کا مفہوم سمجھ گئے تھے اس لئے آپ نے کم فہم لڑکیوں کو بڑی نرمی اور محبت سے بکھایا۔

”دنیاوی محبت کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ حد کبھی کی ختم ہو گئی۔ میں ایک کا ہو چکا تو پھر درمیان میں کوئی دوسرا کبے آ سکتا ہے؟“

شہرہ جوشی بزرگ اور حضرت بابا فریدؒ کے حقیقی بھانجے حضرت مخدوم علاء الدین صابر کلیریؒ کی والدہ محترمہ نے آپ سے پوچھتے بغیر آپ کی شادی کر دی تھی۔ پھر جب دلہن کو حضرت صابر کلیریؒ کے کمرے میں لایا گیا تو آپ نے نیت زدہ انداز میں والدہ ماجدہ سے عرض کیا۔

”مادر گرامی! یہ کون ہے؟“

والدہ محترمہ نے بڑی محبت سے کہا۔ ”بیٹے! یہ تیری دلہن ہے۔“

اس وقت حضرت مخدوم علاء الدین صابر کلیریؒ عالم جذب میں تھے۔ اپنی دلہن کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی جمال کے لہجے میں فرمایا۔

”میں تو ایک کا ہو چکا۔ پھر یہ درمیان میں دوسرا کون ہے؟“

حضرت صابر کلیریؒ کا اتنا فرماتا تھا کہ دلہن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پاکباز لڑکی راکو کاغیر ہو گئی۔ جلال صابریؒ کی آگ میں جل جانے والی یہ پاکباز خاتون، حضرت بابا فرید الدین مسعودؒ کے شاگردی میں لیا جازا دی تھیں۔

اس کے برعکس حضرت بابا بلے شاہؒ حالت جمال میں تھے مگر طرز انکار وہی تھا۔ ”میں ایک کا ہو چکا تو پھر درمیان میں کون دوسرا کیسے آ سکتا ہے۔“

حضرت بابا بلے شاہؒ کے اس جواب سے آپ کی ہمشیرگان کے دل کو بہت ٹھیس پہنچی۔ شدت جذبات سے مطلب ہو کر بہنیں کہنے لگیں۔ ”اگر آپ اپنے مرشد کی اس محبت کو نہیں چھوڑ سکتے تو پھر ہمیں چھوڑ دیں۔“

حضرت بابا بلے شاہؒ نے دنیاوی رشتوں اور محبتوں کی اسیر کم فہم لڑکیوں کو سمجھانے کی بہت کوششیں کیں..... مگر جب بہنیں اپنی منہ پر قائم رہیں تو حضرت بابا بلے شاہؒ نے نہایت پرسوز لہجے میں فرمایا۔

”اے دنیا! تو نے مجھے عجیب آزمائش میں ڈال دیا مگر بفضل حق تعالیٰ وہ اس آزمائش میں بھی پورا اترے گا۔“

پھر آپ نے اپنی معصوم بہنوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اگر تم مجھ سے یہ کہتیں کہ بھائی! ہماری خاطر اپنی جان دے دے تو میں اپنے مالک سے دُعا کرتا کہ وہ میری بہنوں کی اس خواہش کو پورا کر دے..... مگر شیخ کی محبت کو کرنا میرے بس میں نہیں۔ دنیا اور اس کے حوالے سے تمام رشتوں کو چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر کسی ایسی ہستی کا دردداشت نہیں کر سکتا، جو میرے اللہ اور میرے مرشد کی محبت کے درمیان حائل ہو جائے۔“

ایک بار سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاء کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا گیا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت امیر خسروؒ سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ حاسدین سے تو کوئی زائد! خالی نہیں رہا ہے۔ اسی قبیل کے کچھ افراد نے ایک دن حضرت نظام الدین اولیاء سے عرض کیا۔

”آخر خسرو میں ایسی کون سی بات ہے، جو آپ انہیں محبوبیت کے درجے میں رکھتے ہیں؟“

جواب میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے فارسی کا ایک شعر پڑھا، جس کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

”اگر میری پیشانی پر آ رہ رکھ کر کہا جائے کہ میں ترک کی محبت چھوڑ دوں تو یہ ممکن ہے کہ میں اپنا سر چھوڑ دوں یعنی سر آ رہ سے چروادوں..... مگر ترک کی محبت نہیں چھوڑ دوں گا۔“

حضرت نظام الدین اولیاء محبت میں حضرت امیر خسروؒ کو ترک کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ معرفت سراسر عشق ہے..... اور عشق کا مفہوم ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے..... مگر انداز بدلے رہتے ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے یہاں مرید کی محبت کا مسئلہ تھا اور حضرت بابا بلے شاہؒ کے یہاں پیرو مرشد کی محبت کا معاملہ۔

آخر ماں باپ اور بہنیں، حضرت بابا بلے شاہؒ کی شادی سے مایوس ہو گئے۔ مزید تلخیاں بڑھانے کے بجائے بو سخی شاہ محمدؒ نے اپنی شریک حیات اور بیٹیوں کو ہدایت کی۔ ”عبداللہ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ شاید ہمارے خدا میں یہی لکھا ہے کہ حضرت شیخ بندگی محمدؐ غوثؒ کی نسل بے نشان ہو جائے۔“

عام طور پر نسل انسانی کے تسلسل کا یہی معیار قائم کیا گیا ہے کہ لڑکے سے نسب نامہ آگے بڑھتا ہے۔ لہذا حضرت بابا بلے شاہؒ نے شادی سے انکار کر دیا، اسی لئے سید سخی شاہ محمدؒ نے اپنی نسل کے بے نشان ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

حضرت شیخ بندگی محمدؐ غوثؒ، حضرت بابا بلے شاہؒ کے مورث اعلیٰ تھے۔

بظاہر حضرت بابا بلے شاہؒ ان دنیاوی رشتوں کی بڑھتی ہوئی زنجیر سے محفوظ ہو چکے تھے..... والدین، بہنیں، احباب اور دیگر عزیز واقارب نے آپ سے اس موضوع پر گفتگو کرنی بھی چھوڑ دی..... مگر کبھی کبھی آپ کو ان باتوں کا شدت سے خیال آیا تو بڑے والہانہ اور پُرسوز لہجے میں اپنے ہی یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

بلے نون سمجھاؤں آئیاں، بھیان تے بھر جائیاں

آل نبیؐ، اولاد علیؑ دی، توں کیوں لیاں لایاں

(بلے کو اس کی بہنیں اور بھائیاں سمجھانے آئیں، اے نبیؐ کی آل اور علیؑ کی اولاد، تُو نے یہ بدنامی کیوں مولیٰ! ماں باپ کی خواہش کا احترام نہ کرنا..... اور ایک خاص معاشرتی رسم سے گریز اختیار کر لینا کوئی معمولی بات نہیں تھا۔ حضرت بابا بلے شاہؒ صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی عالم بھی تھے۔ اس لئے اس معاملے کی نزاکت احساس کرتے ہوئے، تنہائی میں اپنے آپ سے کہا کرتے تھے۔

”اے بلے! تُو نبی ﷺ کی آل ہے..... اور سرکارِ دو عالم ﷺ نے بھی شادی کی تھی..... تُو حضرت علیؑ کی

ہے اور حضرت علیؑ کو بھی یہ معاشرتی رسم ادا کرنی پڑی تھی۔ پھر تُو نے انکار کر کے یہ بدنامی کیوں مول لی؟“ یعنی اسلاف کے راستے پر کیوں نہیں چلا؟

ظاہری اسباب و وسائل کی موجودگی میں شادی نہ کرنا، ترک سنت کے زمرے میں آتا ہے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اس بات کا شدت سے احساس تھا..... اور پھر یہی شدت احساس، خلش کا رنگ اختیار کر لیتی تھی۔ پھر اسی خلش میں حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنے آپ سے سوال کیا کرتے تھے۔

”پیغمبر علیہ السلام کی امت ہوتے ہوئے تُو نے ترک سنت کیوں کی؟ اور کُوئے ملامت کا راستہ اختیار کیوں کیا؟“

طالبانِ شوق کو اس سوال کا جواب فارسی زبان کے اس شعر میں مل جائے گا، جو حضرت لعل شہباز قلندرؒ سے منسوب ہے۔

منم عثمان مردندی و یار شیخ منصورم

ملامت می کند خلقے و من برادری رقصم

(میں عثمان مردندی ہوں اور شیخ منصور میرا دوست ہے۔ ساری دنیا مجھے ملامت کرتی ہے اور میں اسے برا ثابت کرتے ہوئے رقص کرتا ہوں۔ ترجمہ)

حضرت لعل شہباز قلندرؒ کا خاندانی نام عثمان تھا۔



ہم گزشتہ اوراق میں بیان کر چکے ہیں کہ ایک راجپوت چوہدری پانڈو نے اپنے نام پر گاؤں ”پانڈو کے بھٹی“ آباد کیا تھا..... اور وہی شخص منت سماجت کر کے حضرت سید مخی شاہ محمدؒ کو یہاں لے آیا تھا۔ پھر حضرت سید مخی شاہ محمدؒ نے اپنی شاندار روزِ محنت سے یہاں ایک مدرسہ قائم کیا۔ حق تعالیٰ نے آپ کے خلوص نیت میں اتنی برکت دی کہ یہ چھوٹا سا مدرسہ ایک دینی مرکز بن گیا۔ اور گرد و نواح کے طالب علم بھی یہاں آ کر فیض یاب ہونے لگے۔ کچھ دن بعد چوہدری پانڈو کا انتقال ہو گیا، مگر وہ اپنے پیچھے مدرسے کی شکل میں صدقہ جاریہ چھوڑ گیا۔

چوہدری پانڈو کی موت کے بعد اس کے بیٹے زمینوں کے مالک بن گئے لیکن انہیں مذہب اور انسانیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دن رات اپنی ملکیت اور جاگیروں کے نشے میں غرق رہتے تھے۔ چوہدری پانڈو کا ایک بھائی سدھار تھا مگر وہ بھی عادتاً ایک مغرور اور ادا باش انسان تھا۔

چوہدری پانڈو کے بیٹے کبھی مدرسے کی طرف آنکلتے تو حضرت سید مخی شاہ محمدؒ ان لوگوں کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے۔ محض اس لئے کہ چوہدری پانڈو مرحوم نے اس دینی مدرسے کی بنیاد رکھی تھی..... اور جب تک وہ زندہ رہا، مدرسے کی مالی مدد بھی کرتا رہا۔ چوہدری پانڈو کے بدست بیٹے، سید مخی شاہ محمدؒ کی اس محبت کو ایک خوشامدانہ عمل سمجھتے اور اپنے دوستوں سے انتہائی غرور کے لہجے میں کہتے۔

”یہ مدرسہ ہمارے باپ نے قائم کیا تھا اور مولوی صاحب کو ملک وال سے لے کر آئے تھے۔“

سید مخی شاہ محمدؒ بڑے حوصلے سے تکبر کے اس مظاہرے کو برداشت کرتے۔ نتیجتاً ایک دن وہ آیا کہ سید مخی شاہ محمدؒ سے چوہدری پانڈو کے بیٹوں اور بھائی سدھار سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ کبھی کبھی ایسا وقت بھی آیا کہ مدرسے کے انتظامات کے لئے شدید مالی ضرورت پیش آئی تو آپ قرب و جوار کے دیہاتوں میں تشریف لے گئے اور اہل خیر کے سامنے مدرسے کی ضرورت بیان کی۔ پھر اللہ کے راستے میں جس نے جو کچھ دیا، اسے قبول کر لیا۔ حضرت سید مخی

شاہ محمد کی بے لوث دینی خدمت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ کے قائم کردہ مدرسے کی تعداد تھی..... مگر آپ کا ذاتی مکان کچا تھا۔ جس کی دیواریں کبھی کبھی تیز بارشوں کے موسم میں گر جایا کرتی تھیں۔ مرمت خود سید خدی شاہ محمد اپنے ہاتھوں سے کیا کرتے تھے یا کچھ شاگرد، استاد کے ساتھ اس کام میں شریک کرتے تھے۔

پھر ایک دن سید خدی شاہ محمد مختصر سی علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حضرت بابا بلھے شاہ نے جدائی کا پہلا زخم کھایا، جس کا تعلق آپ کی عزیز ترین ہستی سے تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد والدہ محترمہ بھی رخصت ہو گئیں۔ حضرت بابا بلھے شاہ کے دل کا زخم کچھ اور گہرا ہو گیا۔ وہ ذات، جس کے قدموں کے نیچے جنت فی طرح چلی گئی کہ ہر طرف غم و اندوہ کا جہنم بھڑکنے لگا۔ اب آپ کو اندازہ ہوا کہ موسم فراق کیا ہوتا ہے؟ دل جانے والوں کی یادوں کا غبار اٹھا تو آنکھیں برسنے لگیں۔ مگر حضرت بابا بلھے شاہ نے اہل دنیا کے سامنے کبہ نہیں کی۔ روئے بھی تو چھپ کر روئے۔

پھر آپ کی دونوں چھوٹی بہنیں بھی انتقال کر گئیں۔ اب صرف بڑی بہن باقی تھیں۔ اس خاندان کی آخر نشانی۔ کسی تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ اندوہناک واقعات کب پیش آئے۔ مگر بعض مبہم روایتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اموات تواتر کے ساتھ واقع ہوئیں۔ سال دو سال کے اندر ہی خاندان قادری کے چار روشن چراغ بج گئے۔ یہ حضرت بابا بلھے شاہ کے لئے سخت آزمائشوں کا زمانہ تھا۔ کئی بار آپ نے لاہور جانے والوں کے قہر و مرشد کی خدمت میں خطوط ارسال کئے۔ خطوط کیا تھے، وارداتِ قلب کی تفسیریں تھیں۔ نامہ ہائے فراق تھے۔ شاخ میں باریابی کی التجائیں تھیں۔

حضرت شیخ عنایت قادریؒ نے خطوط کے جواب میں ایک ہی جملہ تحریر فرمایا۔ ”سید عبداللہ! ابھی پانڈو کے تمہاری ضرورت ہے۔“

جب حضرت بابا بلھے شاہ زیادہ بے قرار ہو جاتے تو پیر و مرشد خواب میں تشریف لا کر فرماتے۔ ”ابھی پانڈو کے میں تمہارا قیام مقدر کر دیا گیا ہے۔“

حضرت بابا بلھے شاہ نے والد محترم سید خدی شاہ محمد کے انتقال کے بعد مدرسے کا انتظام مقامی مولوی صاحب سپرد کر دیا۔ اور خود اپنے اور داد و وظائف کے لئے چھوٹا سا حجرہ بنالیا، جہاں آپ بیشتر اوقات ذکر میں مشغول رہے۔ سلطان احمد مستانہ پہلے ہی سائے کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ تھے۔ بعد میں حافظ جمالؒ بھی پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ”پانڈو کے“ کی یہ خانقاہ صرف تین درویشوں پر مشتمل تھی۔

یہاں کے لوگ بدست چوہدریوں کے زیر اثر تھے..... اور چوہدری کسی درویش کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ نتیجتاً مجبوراً عوام بھی حضرت بابا بلھے شاہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ سلطان احمد مستانہ کو تو اپنا ہوش ہی نہیں تھا..... مگر حافظ جمالؒ کبھی کبھی پیر و مرشد کے حضور میں شکایت کرتے تھے۔

”سیدی! یہاں کے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ امراء دن رات لہو و لعب میں مبتلا ہیں..... اور غریب ان کی غلامی مجبور۔ کوئی حرف حق سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں۔ کب کھلیں گی ان کی آنکھیں؟ اور کب جائے گا ان کا بہرہ و نفع؟“ حضرت حافظ جمالؒ کے لہجے سے دل کا کرب نمایاں ہو گیا۔

اپنے مرید کی باتیں سن کر حضرت بابا بلھے شاہ مسکراتے ہوئے فرماتے۔ ”حافظ جمال! کیا ان لوگوں سے اپنی

پیش کرانا چاہتے ہو؟“

”معاذ اللہ!“ حضرت حافظ جمال گھبرا کر عرض کرتے۔ ”پرستش کے لائق تو ایک ہی ذات ہے..... اور ہم

بے خبر لوگوں کو یہی بتانا چاہتے ہیں۔“

”تو پھر شے سے بے نیاز ہو کر لا الہ الا اللہ کی ضرب لگاتے رہو۔“ حضرت بابا بلھے شاہ نہایت جذب کے عالم میں فرماتے۔ ”ایک دن دل کے صنم خانے مسمار ہو ہی جائیں گے..... اور پھر بے خبروں کو بھی خبر ہو جائے گی۔“

دقت کا قافلہ اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ گزرتا رہا۔

”پانڈو کے بھتی“ کے چوہدری اپنی عیش سامانیوں سے مطمئن تھے کہ کیف و نشاط کا یہ موسم ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور جاگیردارانہ نظام میں جکڑے ہوئے بد حال لوگ یہی سمجھتے رہے کہ لکھنے والے نے ان کی تقدیریں

چوہدریوں سے وابستہ کر دی ہیں۔

اور خانقاہ میں رہنے والے تین درویش ان بے خبروں کو آوازیں دیتے رہے۔ ”سب کچھ فنا ہو جانے والا ہے..... اور باقی رہ جانے والی ذات صرف رب ذوالجلال کی ہے۔“

آخراً ”پانڈو کے بھتی“ کو قحط نے اپنی لپیٹ میں لے لیا..... اور بے خبری کا طلسم ٹوٹ گیا۔ کنوئیں اور تالاب خشک ہو گئے۔ کھیتوں میں آگ لگی تو پیٹ کا دوزخ بھی بھڑک اٹھا۔ صدیوں کے غلام بھوک سے مجبور ہو کر اپنے آقاؤں کی طرف بھاگے۔ گندم، جوار اور کئی کے چند دانوں کے لئے اپنے اپنے کشتوں پھیلائے ہوئے..... مگر چوہدریوں نے دروازے بند کر لئے کہ سرمایہ داری کا ہمیشہ سے یہی مزاج رہا ہے۔

جب قحط زدہ عوام، چوہدریوں سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے حضرت بابا بلھے شاہ کی خانقاہ کی طرف رخ کیا۔ ”شاہ صاحب! ہم بد حالوں کے لئے دعائے خیر فرمائیں۔ اب شکم کی یہ آگ برداشت نہیں ہوتی۔“

جب خانقاہ کے دروازے پر گریہ و زاری کا شور اٹھا تو حضرت بابا بلھے شاہ کے مرید، حافظ جمال باہر آئے اور ناگوار لہجے میں فرمایا۔

”تم نے ساری زندگی ”پانڈو کے“ کے چوہدریوں کی خدمت میں بسر کی ہے، اُن ہی کو ”اُن داتا“ کہہ کر پکارا ہے۔ اب اُن ہی سے رزق مانگو۔“

”اُن کے پاس اتنا اناج کہاں ہے؟ وہ کس کس کو کھانے کو دیں گے؟“ ایک شخص نے کہا، جس کے بدن پر پہلے ہوئے کپڑے جھول رہے تھے۔

”پیسے تو ہیں اُن کے پاس۔ تجوریاں تو بھری ہوئی ہیں چوہدریوں کی۔“ حافظ جمال نے انتہائی ناگوار لہجے میں کہا۔ ”کیا وہ اپنے غلاموں کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ تمہیں چند سکے ہی قرض دے دیں۔“

”وہ دولت کے پجاری ہیں۔ کسی کو ایک آنہ بھی نہیں دے سکتے۔“ دوسرے فاقہ زدہ شخص نے روتے ہوئے کہا۔

حضرت حافظ جمال کو اس بات پر غصہ تھا کہ ”پانڈو کے“ کے لوگوں نے چوہدریوں کے کہنے پر حضرت بابا بلھے شاہ کی شخصیت کو نظر انداز کیا تھا۔ آج جب حافظ جمال نے اُن ہی لوگوں کو خانقاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے دیکھا تو اُن کے جذبات برا بھیتہ ہو گئے اور پھر وہ بری طرح برس پڑے۔ ”تمہیں نظر نہیں آ رہا ہے کہ جب اس مثل دقت میں اونچی اونچی حویلی والے چوہدری تمہارے کسی کام نہیں آسکے تو پھر ہم درویش لوگ تمہیں کیا دے سکتے ہیں؟“

”ہمیں تو صرف شاہ صاحب کی دعائیں چاہئیں۔“ ضرورت مند انسانوں نے بیک زبان کہا۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ حضرت بابا بلے شاہ خانقاہ کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ چند فاقہ زدہ لوگ گھبرا کر آگے بڑھے اور حضرت بابا بلے شاہ کے قدموں پر گر پڑے۔ ”شاہ صاحب! لئے دعا کیجئے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے بھوک سے ہلک رہے ہیں۔ ہمارے بوڑھے دم توڑ رہے ہیں۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے انتہائی پرجلال لہجے میں فرمایا۔ ”پہلے میرے پاؤں تو چھوڑو۔ آخر یہ کیا انداز ہے اللہ کے آگے سر جھکانے ہی سے تو تم پر یہ عذاب نازل ہوا ہے۔“ لوگ سہم کر کھڑے ہو گئے۔

”ہم تمہارے لئے دعا بھی کریں گے اور بفضل حق تعالیٰ دوا بھی دیں گے۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے مہربانی اور مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔ ”تم لوگ ایسا کرو کہ جنگل سے مٹی کھود کر لاؤ اور یہاں ایک اونچا چھوڑا۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے اپنے دائیں طرف اشارہ کیا۔ اس وقت آپ کی خانقاہ نشیب میں تھی۔ جب تک ہوتی تو خانقاہ کے صحن میں برسات کا پانی بھر جاتا اور پھر کئی دن تک آپ اور آپ کے دونوں مرید لڑکھائیں نکالتے رہتے۔

”ہاں، ہاں۔ ہم لوگ چوترا بنا دیں گے۔“ لوگوں نے مضطرب ہو کر کہا۔ ان کے چہوروں پر ایک ہی حال رہا تھا کہ ہمیں اس کام کی مزدوری کیا ملے گی۔ مگر وہ اپنی زبانوں سے دل کی بات کہہ نہیں سکتے تھے۔ لوگوں نے مٹی کھود کر لانے کا اقرار کر لیا تو حضرت بابا بلے شاہ نے فرمایا۔ ”میں اس کام کی اُترت ہو میہ دوں گا۔ تمہیں منظور ہے؟“

تمام لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ آج سے دو سو سال پہلے دوا آنے کی بہت قیمت ہوتی تھی۔ ”کیا تمہیں منظور نہیں ہے؟“ حضرت بابا بلے شاہ نے لوگوں کو خاموش یا کر دوبارہ پوچھا۔ ”شاہ صاحب! یہ تو بہت زیادہ مزدوری ہے۔ ہمیں یقین نہیں آتا۔“ لوگوں نے اپنی حیرت اور خاموشی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”تم اللہ کا نام لے کر کام تو شروع کرو۔ پھر تمہیں اُس کی رحمتوں پر یقین بھی آجائے گا۔“ اتنا فرما کر وہ بلے شاہ اپنے حجرے میں چلے گئے۔ اور فاقہ زدہ لوگ جنگل کی طرف..... تاکہ انہیں شام کو دوا آنے ل سکے۔ پھر وہ اُن پیسوں سے کھانے پینے کی چیزیں خرید سکیں۔



کچھ دیر بعد حافظ جمالؒ شدید حیرت کے عالم میں پیر و مرشد کے سامنے کھڑے تھے ”سیدی! آپ ان لوگوں سے کیا وعدہ کر لیا؟ سو سے بھی زیادہ آدمی ہیں، ہم ان لوگوں کو اتنے پیسے کہاں سے دیں گے؟“

”حافظ جمال! کیا تم رزاقِ عالم ہو؟“ اپنے مرید کی بات سن کر حضرت بابا بلے شاہ نے انتہائی پرجلال لہجے فرمایا۔ ”کیا تم لوگوں کی روزی کا بندوبست کرتے ہو؟“

پیر و مرشد کا سوال سن کر حافظ جمالؒ کا پنے لگے۔ ”سیدی! میری کیا مجال؟ میں تو خود اس کے در کا اندازہ ہوں۔“

”تو پھر بھکاری ہی بنے رہو۔ اسی میں تمہاری عافیت ہے۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے اسی حالت میں فرمایا۔ ”تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ رزاقِ عالم کہاں کہاں سے اپنے بندوں کو روزی عطا کرتا ہے۔“

فری چھوڑ دو۔“ یہ کہہ کر حضرت بابا بلے شاہؒ نے فارسی زبان کا یہ مشہور مصرع پڑھا۔

”فکر ما درکار ما آزار ما“

(میرے کاموں میں میری فکر ہی دراصل میری بیماری ہے)

حافظ جمالؒ لرزتے قدموں سے چلے گئے مگر اُن کے ذہن میں یہ فکر موجود تھی کہ پیر و مرشد اتنے لوگوں کو (دوری کی طرح دیں گے؟



پاٹو کے بٹئی کے فاقہ زدہ لوگ جنگل میں مٹی کھودتے رہے اور اُن کے ذہنوں میں بھی ایک سوال گردش کرتا رہا۔ ”شاہ صاحب کے مکان اور خانقاہ تو خود کچے ہیں۔ لباس بھی غریبوں کا سا پہنتے ہیں۔ پھر ہم لوگوں کو (دوری کہاں سے دیں گے؟“ وہ لوگ ایسا سوچنے میں حق بجانب تھے۔ کیونکہ حضرت بابا بلے شاہؒ کی مالی حالت نہایت معمولی تھی۔

مردور جنگل سے مٹی لے کر آتے رہے۔ یہاں تک کہ سورج ڈھلنے لگا۔ پھر وہ مردوری کی آس لگا کر خانقاہ کے دروازے کے سامنے بیٹھ گئے۔

نوروزی دیر بعد حافظ جمالؒ خانقاہ سے نمودار ہوئے اور مردوروں کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ”پیر و مرشد نے فرمایا ہے کہ سب لوگ عصر کی نماز کے بعد اپنی اپنی مردوری لے لیں۔“

حضرت بابا بلے شاہؒ نے اپنے حجرہ مبارک میں عصر کی نماز ادا کی اور پھر تمام مردوروں کو ایک ایک کر کے اُسی حجرے میں طلب کیا۔

مردور آتا اور آکر سلام کرتا۔ حضرت بابا بلے شاہؒ جواب میں فرماتے۔ ”اللہ تم پر بھی اپنی سلامتی نازل کرے۔“ اُن کے بعد محلے کے نیچے سے دو آنے نکالتے اور مردور کو دے دیتے۔

مردور بڑی حیرت سے اُن پیسوں کو دیکھتا اور خوشی خوشی گھر چلا جاتا۔ حضرت بابا بلے شاہؒ کے مرید خاص، حافظ جمالؒ، دروازے کے قریب کھڑے بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

جب کئی دن تک یہ معمول جاری رہا تو حافظ جمالؒ کو اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔ اب وہ اس راز کو سمجھ گئے تھے کہ پیر و مرشد کو حکم خدا دستِ غیب حاصل ہے۔

”دستِ غیب“ صوفیاء کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ جس کا مفہوم ہے کہ کسی درویش کو ظاہری اسباب کے بغیر فیہم امداد حاصل ہے۔ نبی امداد کا ذریعہ ”رجال الغیب“ ہوتے ہیں۔ رجال الغیب، مردانِ غیب کو کہتے ہیں..... اور مردانِ غیب، اللہ کے پوشیدہ کارندے ہوتے ہیں۔ جو انسانی آنکھ کو نظر نہیں آتے سوائے کسی خاص موقع کے، جب اللہ تعالیٰ انسان کی کھلی آنکھ پر انہیں ظاہر کرنا چاہے۔ اکثر بزرگوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو بھی مردانِ غیب میں شمار کیا ہے۔ ان کے نزدیک حضرت خضرؑ، مردانِ غیب کے سردار ہیں۔ مشہور ہے کہ جب حق تعالیٰ اپنے کسی بندے پر بہت مہربان ہوتا ہے تو حضرت خضرؑ اُس سے ملاقات کرتے ہیں۔

لیکن مردانِ غیب کسی درویش کو ظاہری اسباب کے بغیر روزی فراہم کرتے ہیں۔ اور اسی کو تصوف کی زبان میں دستِ غیب کہا جاتا ہے۔ حضرت بابا بلے شاہؒ کو بھی بفضلِ حق تعالیٰ دستِ غیب حاصل تھا اور اسی وجہ سے آپ اپنے محلے کے نیچے سے پیسے نکال کر مردوروں کو دیا کرتے تھے۔

لوگ جنگل سے مٹی کھود کر لاتے رہے۔ حضرت بابا بلے شاہؒ کا چہرہ ترہ اونچا ہوتا رہا..... اور پاٹو کے بٹئی کے

لوگوں کی غربت دُور ہوتی رہی۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مزدوروں آپس میں دوست تھے۔ وہ تقریباً ایک ماہ سے حضرت بابا بلھے میں عمل دیکھ رہے تھے کہ آپ مصلے کے نیچے ہاتھ ڈالتے اور مزدوروں کی اُجرت نکال کر دے دیتے۔ اُن دنوں دل میں خیال آیا کہ شاہ صاحب کے مصلے کے نیچے کوئی خزانہ موجود ہے۔ پھر ان دنوں نے جنگل میں ایک درخت کے دوران یہ منصوبہ بنایا کہ جب شاہ صاحب سو جائیں تو اس خزانہ کو چوری کر لیا جائے۔

آخر وہ دونوں مزدور اپنی اُجرت لے کر گھروں کو چلے گئے اور پھر عشاء کی نماز کے بعد دوبارہ خانقاہ میں ہوئے۔ حضرت بابا بلھے شاہ کا معمول تھا کہ آپ عشاء کی نماز پڑھ کر دوسرے کمرے میں سو جاتے تھے۔ تہجد کے وقت دوبارہ مصروف عبادت ہو جاتے تھے۔ دونوں مزدور خانقاہ کے ایک گوشے میں چھپے ہوئے تھے جیسے ہی حضرت بابا بلھے شاہ اپنی عبادت کے حجرے سے نکل کر سونے کے کمرے میں تشریف لے گئے۔ دونوں بھی باہر نکلے اور ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ پھر جب انہیں اندازہ ہو گیا کہ حضرت بابا بلھے شاہ سو گئے ہوں گے، مزدور، حجرہ مبارک میں داخل ہوئے۔ پھر انہوں نے چراغ روشن کیا۔ حضرت شیخ کا مصلہ اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ چوروں کا خیال تھا کہ چار نماز کے نیچے پیسے موجود ہوں گے..... مگر وہاں ایک سکہ بھی نہیں تھا۔

پھر اُن احمقوں نے اپنی کدالوں سے اس جگہ کو کھودنا شروع کر دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہاں کوئی خزانہ پوشیدہ نہیں کئی گھنٹے زمین کھودتے گزر گئے۔ یہاں تک کہ اُس جگہ ایک بڑا گڑھا نمودار ہو گیا۔ اب مزدوروں کا اندازہ ہوا کہ وہ بے سود کوششوں میں مصروف ہیں۔ وہاں مٹی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آخر دونوں چور مزدور گمراہ ہو کر انہوں نے اُس گڑھے کو دوبارہ مٹی سے بھرنا شروع کر دیا۔ رات کا باقی حصہ زمین کو ہموار کرتے کرتے حضرت بابا بلھے شاہ کے بیدار ہونے کا وقت ہو گیا تھا۔ کھودی ہوئی جگہ کو اچھی طرح برابر کرنے کے بعد مصلے پر اور دونوں چور حجرے سے نکل گئے۔

اُن لوگوں نے دن بھر مزدوری کی اور عصر کے بعد اپنی مزدوری لینے حضرت بابا بلھے شاہ کی خدمت میں ہوئے۔

حضرت شیخ نے طے شدہ معاہدے کے مطابق تمام مزدوروں کو دو دو آنے دیئے۔ پھر جب اُن دنوں کا تو حضرت بابا بلھے شاہ نے انہیں چار چار آنے دیئے۔

تمام مزدور حضرت بابا بلھے شاہ کے اس عمل پر حیران رہ گئے۔ ”آخر ان لوگوں میں کیا خاص بات ہے جو دُگنی اُجرت دی جا رہی ہے؟“ مزدوروں نے احتجاج کے انداز میں شکایت کی۔

حضرت بابا بلھے شاہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”تم لوگ صرف دن میں کام کرتے ہو..... اور یہ بے بات رات میں بھی مزدوری کرتے رہے ہیں۔ اس حساب سے ان کی اُجرت بھی دُگنی ہونی چاہئے سوا دوا کر دی گئی۔“ حضرت شیخ کا ارشاد گرامی سن کر دونوں مزدور شرم سے زمین میں گڑ گئے۔ اور پھر جب اُن کے حواس ہوئے تو دونوں آگے بڑھ کر حضرت بابا بلھے شاہ کے قدموں پر گر پڑے اور رو کر اپنے جرم کی معافی مانگنے لگے۔ پھر اُن دونوں مزدوروں نے یہ واقعہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کو سنایا۔ پھر اُن نے خیروں کو اندازہ ہوا کہ بابا بلھے شاہ کس شان کے درویش ہیں۔ پانڈو کے گاؤں میں آپ کی یہ پہلی کرامت تھی، جس کا شہرہ دُور دُور بیجا قرب و جوار کے لوگ بھی خانقاہ کے دروازے پر جمع رہنے لگے..... اور حضرت بابا بلھے شاہ انہیں اپنی سے سرفراز کرتے رہے۔



اس واقعے کے بعد چوہدری پانڈو کی اولاد دیں، بھائی سدھار اور اس کے بیٹے، حضرت بابا بلھے شاہؒ کی عظمت و ثناء سے حد کرنے لگے۔ حضرت شیخ تو اکثر اپنے حجرے میں مشغول ذکر الہی رہتے تھے..... مگر گاؤں کے چوہدری زادے اور ان کے ہم نوا دیہاتی، سلطان احمد مستانہؒ اور حافظ جمالؒ کا بہت مذاق اڑاتے۔ جب یہ دونوں چوہدریوں کی بدسلوکی کی شکایت اپنے پیر و مرشد سے کرتے تو حضرت بابا بلھے شاہؒ سنبھلے کے لہجے میں فرماتے۔ ”تم کیسے رو دیش ہو؟ ذرا سی تکلیف پر لوگوں کی شکایت کرنے بیٹھ جاتے ہو؟ مخلوق خدا کے ستم نہیں کر بدانت کیوں نہیں کرتے؟“

سلطان احمد مستانہؒ اور حافظ جمالؒ خاموش ہو جاتے۔

چوہدریوں کا منصوبہ یہ تھا کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ تک آ کر ایک دن پانڈو کے سے چلے جائیں گے..... اور پھر مارے گاؤں پر ان کی چودھراہٹ قائم ہو جائے گی۔ یہی سوچ کر وہ نت نئے انداز سے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو تانے تھے..... مگر آپ ایک صوفی تھے..... اور صوفی کا مسلک یہ ہے کہ اذیتیں دینے والے کو دعائیں دینا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ بھی اسی پر عمل کرتے رہے۔

ہر ایک دن اس درویش کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ برسات کا موسم تھا اور کئی روز سے پانڈو کے میں دیوار دھار بارش ہو رہی تھی۔ پانڈو کے خاندان کے ایک شخص نے شرارتاً حضرت بابا بلھے شاہؒ کے مکان کا پر نالہ گرا دیا۔ آپ کا مکان کچا تھا۔ بارش کا سارا پانی مچن میں جمع ہونے لگا۔ جس کے نتیجے میں ایک دیوار بھی گر گئی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خانقاہ مکان سے کچھ فاصلے پر تھی۔ مکان میں آپ کی بڑی بہن، خاندان کی کسی بوڑھی عورت کے ساتھ تھارتھی تھیں۔

ہر کسی کھلے دار نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دیوار گرنے کے متعلق بتایا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ مکان کا پر نالہ فلاں شخص نے گرایا ہے جس کے باعث گھر کی دیوار منہدم ہو گئی۔ یہ سن کر حضرت بابا بلھے شاہؒ کو شدید اذیت پہنچی اور آپ نے انتہائی جلال کی حالت میں فرمایا۔ ”کیا درویشوں کو آزار پہنچانے والا شخص ابھی تک زندہ ہے؟“

نوروزی در بعد حضرت بابا بلھے شاہؒ کو بتایا گیا کہ جس شخص نے مکان کا پر نالہ گرایا تھا، گھر پہنچتے ہی اُس کے پیٹ میں منہ در در اٹھا اور وہ چند لمحوں میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

تاریخ پر واضح رہے کہ اُس شخص کی موت حضرت بابا بلھے شاہؒ کی بددعا کا نتیجہ نہیں تھی۔ آپ نے تو محض یہ پوچھا تھا کہ کیا ایسا شخص ابھی تک زندہ ہے؟ دراصل یہ ایک مفسد اور فتنہ پرداز شخص سے قدرت کا انتقام تھا جو اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کو دن رات ستایا کرتا تھا۔



چوہدری خاندان نے اپنے ایک جوان سال فرد کی موت کو اتفاقی سمجھا۔ اُن بد مستوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اُس کی موت حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اذیت پہنچانے کے سلسلے میں واقع ہوئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دولت و فائز کے لئے میں غرق اُن لوگوں نے اپنی روش تبدیل نہیں کی اور آئے دن حضرت بابا بلھے شاہؒ کے راستے میں کانٹے بچاتے رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اور عظیم مغل سلطنت کا شیرازہ

بہت تیزی سے بکھر رہا تھا۔ مرکز گزرو ہوا تو صوبے آزادی کے خواب دیکھنے لگے۔ اس سیاسی انتشار کے بہرہ جھوٹی قوموں نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

سکھوں کا مذہبی پیشوا گرو گوند سنگھ، مغل دور حکومت میں ایک باغی سردار کی حیثیت سے قتل ہوا تھا۔ گرو نے اپنے گرو کے قتل کو مذہبی رنگ دے کر حضرت اورنگزیبؒ کو بدنام کرنا شروع کر دیا تھا کہ مغل شہنشاہ متعصب حکمران ہے..... اور وہ سکھوں کی نسل کشی کر کے ہندوستان سے ان کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہتا ہے۔ غلط تشہیر اور الزام تراشی کے باعث سکھ قوم مسلمانوں سے نفرت کرتی ہے۔

جب تک حضرت اورنگزیب عالمگیرؒ زندہ رہے، سکھ اپنی کمین گاہوں میں چھپے ہوئے سازشیں کرتے رہے جیسے ہی عظیم مغل شہنشاہ کی آنکھیں بند ہوئیں، سکھوں نے بھی اپنی طاقت بڑھالی..... پھر اسی قوم کا ایک بدستہ ملتان پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا اور پانڈو کے گاؤں کے قریب خیمہ زن ہوا، جہاں حضرت بابا قیام فرماتے تھے۔

سکھوں کے لشکر میں ایک سپاہی ایسا بھی شامل تھا، جس کا آبائی گاؤں پانڈو کے سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ اُس سپاہی نے اپنے سالار سے کہا۔

”اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں چند گھنٹوں کے لئے اپنے گھر والوں سے مل لوں۔ جنگ کا کیا اثر؟ کون سا رخ اختیار کرے؟ ممکن ہے کہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے یہ میری آخری ملاقات ہو۔“

سکھوں کے سالار نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر سپاہی کو اپنے گاؤں جانے کی اجازت دے دی۔ مگر ساتھ ہی سختی سے یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے گھر قیام نہ کرے۔

سپاہی، لشکر سے جدا ہو کر اپنے گاؤں کی طرف بڑھا۔ اتفاق سے سکھ سپاہی کے گاؤں کا راستہ ”پانڈو“ گزر کر جاتا تھا۔ الغرض وہ سکھ سپاہی، گھوڑے پر سوار ہو کر مسلمانوں کے گاؤں میں داخل ہوا۔ عام طریقہ یہ کہ جب کوئی شہسوار انسانی آبادی سے گزرتا تھا تو گھوڑے سے اتر جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پرانے زمانے میں دیہاتی مکانوں کی دیواریں پتیلی ہوتی تھیں (آج کل بھی اکثر دیہات بناؤں کے اعتبار سے کچھ ایسے ہیں) اگر اس حالت میں گھڑسوار گزرتا تو پتیلی دیواریں ہونے کے باعث گھر کے اندرونی مناظر بھی نظر آتے اور خواتین کی بے پردگی کا بھی احتمال رہتا۔ پانڈو کے گاؤں کی تمام آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی، اس لئے ان کے کچھ نوجوانوں نے سکھ سپاہی سے کہا کہ وہ گھوڑے سے اتر کر باقی راستہ طے کرے۔ “ہماری خواتین کی بے پردہی رہی ہے۔“

سکھ قوم کی اپنی ثقافت اور تہذیب ہے۔ دو سو سال پہلے بھی اُن کے یہاں خواتین کے پردے کا کوئی تصور نہ تھا۔ سکھ سپاہی نے مسلمان نوجوانوں کی بات بے پروائی سے سنی اور گھوڑے پر سوار آگے بڑھتا رہا۔

پانڈو کے بھٹی کے نوجوانوں کو ایک غیر مسلم شہسوار کی یہ بات شدید گراں گزری۔ ایک نوجوان نے بڑی آواز سے بڑھ کر سکھ سپاہی کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور سخت لہجے میں اس سے نیچے اترنے کے لئے کہا۔

سکھ سپاہی نے اس بار بھی مسلم نوجوان کے مطالبے پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ شاید وہ اس نئے نئے پانڈو کے بھٹی کے قریب ہزاروں سکھ سپاہیوں کا لشکر خیمہ زن ہے..... اور یہ چند نوجوان اُس کا کیا کام لیں گے۔ نتیجتاً دونوں میں کچھ دیر ٹکرا ہوئی۔ پھر پانڈو کے بھٹی کے مسلم نوجوان نے سکھ سپاہی کا گریبان پکڑ کر نیچے کھینچا۔ سکھ سپاہی نے تلوار نکال کر مسلم نوجوانوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کوشش کو نامکام بنا دیا۔ پانڈو

ٹا کے نوجوان سکھ سپاہی کی اس دیدہ دلیری پر مشتعل ہو گئے اور اسے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ جہاں یہ ہنگامہ برپا تھا، اس جگہ سے حضرت بابا بلے شاہ کی خانقاہ بہت قریب تھی۔ حافظ جمالؒ یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی پیر مرشد کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ یہ خبر سن کر حضرت بابا بلے شاہ غلب ہو گئے..... گھر اکراٹھے اور بھاگتے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں مقامی نوجوان بڑی تعداد میں جمع تھے اور سکھ سپاہی کو نسل مار رہے تھے۔

جب حضرت بابا بلے شاہ وہاں تشریف لے گئے تو بار بار ایک ہی بات دہرا رہے تھے۔
 ”کیا غضب کرتے ہو؟ کیوں گھر بیٹھے اپنی تباہی کو دعوت دے رہے ہو؟“
 حضرت بابا بلے شاہ سکھ سپاہی کو مزید تشدد کا نشانہ بننے سے بچانا چاہتے تھے..... مگر مسلم جوان بہت زیادہ پُر جوش قرار دے تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

”ہم اسے چھوڑیں گے نہیں بلکہ تڑپا تڑپا کر مار ڈالیں گے۔“
 ”خدا کے لیے میری بات سنو۔“ حضرت بابا بلے شاہ چیخ چیخ کر مشتعل ہجوم کو سمجھا رہے تھے۔ ”یہ ایک فتنہ ہے۔“
 ”ناوشی سے ٹال دو۔“

آخر حضرت بابا بلے شاہ نے بڑی مشکل سے سکھ سپاہی کو پاٹھو کے بھٹی کے غضب ناک نوجوانوں سے چمڑایا۔ اپنے ساتھ لے کر گاؤں کی سرحد تک پہنچے اور سکھ سپاہی کو گھوڑے پر سوار کر کے رخصت کر دیا۔
 ظاہر فتنہ ٹل گیا تھا۔ مگر بے خبر لوگوں کو خبر نہیں تھی کہ اس فتنے کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ جب حضرت بابا بلے شاہ نے مرید حافظ جمالؒ کے ساتھ سکھ سپاہی کو چھوڑ کر خانقاہ کی طرف واپس آ رہے تھے تو چوہدری پاٹھو اور اس کے بھائی سدھار کے بیٹے جی تی منسوبہ بندی میں مصروف تھے۔ یہ جاگیر دار لوگ پہلے ہی ایک درویش کی عزت سے مدد کرتے تھے، اس واقعے نے ان کی کینہ پروری کی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔
 سدھار نے گاؤں کے نوجوانوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تم نے سکھ سپاہی کو زندہ کیوں جانے دیا؟ یہ ہماری عزت کا سوال تھا۔“

”شاہ صاحب درمیان میں آ گئے۔ ورنہ ہم اس کی لاش ہی اس کے گاؤں بھیجتے۔“ نوجوانوں نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا۔

”شاہ صاحب کون ہوتے ہیں ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے والے؟“ سدھار بہت غصے میں نظر آ رہا تھا۔ ”سکھ سپاہی کی جو سزا باقی رہ گئی ہے، وہ شاہ صاحب کو دے ڈالو۔“
 گاؤں کے نوجوان، سدھار کے اس فیصلے پر حیران رہ گئے۔ ایک نوجوان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”شاہ صاحب

گاؤں میں کیا قصور ہے؟“
 ”سارا قصور ان ہی کا ہے۔ گاؤں کے مالک ہم ہیں یا جھوپڑی میں پڑا ہوا وہ فقیر؟ ہمارے ہی بزرگوں نے ان کے باپ کو یہاں پناہ دی تھی۔ اس زمین کے ہم مالک ہیں تو پھر فیصلے بھی ہمارے ہوں گے۔“
 سدھار کے فیصلے کے آگے گاؤں کے نوجوانوں نے سر جھکا دیا۔

”آگے بڑھو اور اس فقیر کو اس مداخلت کی سزا دو۔“ سدھار نے گاؤں کے نوجوانوں کو حکم دیا۔ ”میں تمہارے ماتھوں۔“
 اس سنگدلانہ فیصلے کے بعد سدھار اور چوہدری کے بیٹے اپنے مکانوں سے باہر نکل آئے۔ گاؤں کے نوجوان

بھی ان کے ساتھ تھے۔ پھر سب لوگ اس راستے پر کھڑے ہو گئے، جدھر سے حضرت بابا بلھے شاہ، حافظہ خاں کے ساتھ واپس آرہے تھے۔ پھر جیسے ہی حضرت شیخ انسانی ہجوم کے قریب پہنچے، سدھار اور چوہدری کے بیٹوں نے پر پتھر برسائے شروع کر دیئے۔

حضرت بابا بلھے شاہ نے پُر جلال لہجے میں مشتعل نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”لوگو! تمہیں کیا ہے؟ میں تمہارے راستے کے پتھر ہٹاتا ہوں اور تم مجھ پر ہی پتھر برساتے ہو۔“

حضرت بابا بلھے شاہ کی آواز بے اثر ہو گئی۔ چوہدری اور سدھار کے بیٹے گاؤں کے نوجوانوں کی حوصلہ کرتے رہے۔..... اور جاگیردارانہ نظام کے طلسم میں جکڑے ہوئے لوگ اس شخص پر سنگباری کرتے رہے۔ دشر سے بھری ہوئی ہستی میں خیر اور سلامتی کی علامت تھا۔

اس پورے ہجوم میں بس چوہدری بانڈو کا داماد شیخو ہی حضرت بابا بلھے شاہ کا عقیدت مند تھا۔..... اور اتفاقاً اس وقت اپنی زمینوں پر گیا ہوا تھا۔ پھر کسی شخص نے شیخو کو اس سفاکانہ مظاہرے کی اطلاع دی۔ وہ دوڑتا ہوا اس وقت تک حضرت بابا بلھے شاہ زخمی ہو چکے تھے۔ شیخو وہاں پہنچتے ہی حضرت شیخ کی ڈھال بن گیا۔ حافظہ پہلے ہی شدید زخمی ہو چکے تھے۔

”ظالمو! یہ تو دیکھو کہ تم کس ہستی پر پتھر برسا رہے ہو؟ تمہارے ہاتھ لوٹ کیوں نہیں گئے؟“ شیخو نے گاؤں کے نوجوانوں کو مخاطب کیا۔

سدھار اور چوہدری کے بیٹے شیخو کے آتے ہی واپس چلے گئے۔ کیونکہ وہ اپنے داماد کا سامنا نہیں کر سکتے۔ دوسرے جوانوں کے اٹھے ہوئے ہاتھ بھی نیچے گر گئے۔ وہ لوگ چوہدری خاندان کے داماد کے سامنے سرکشی اختیار کر سکتے تھے۔

شیخو اسی زخمی حالت میں حضرت بابا بلھے شاہ کو لے کر خانقاہ آیا اور اپنے ہاتھ سے زخم صاف کرتے ہوئے ہوا کا خواستگار ہوا۔

”گناہ کوئی کرے اور تم معافی مانگو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟“ حضرت بابا بلھے شاہ نے بے نیازانہ فرمایا۔ ”میرے حال پر چھوڑ دو اور انہیں ان کے حال پر۔“

شیخو واپس چلا گیا تو حضرت بابا بلھے شاہ، خانقاہ جانے کے بجائے اپنے گھر تشریف لے گئے اور اپنی بڑی بیٹی سے فرمایا۔ ”اے میرے ماں باپ کی نشانی! اپنا سامان و اسباب باندھ لو کہ اب پاٹھو کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔ ہمیشہ اپنے قابل احترام چھوٹے بھائی کو زخمی حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں اور اس کی وجہ دریافت کرنے لگیں۔ حضرت بابا بلھے شاہ نے فرمایا۔ ”یہ تو بدن کے زخم ہیں جو شمار بھی ہو جائیں گے مگر دل کے زخموں کو اس ذاتِ باری بصیر کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کوچ کی تیاری کریں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

پھر آپ نے اپنی خانقاہ کا سامان سمیٹا اور ہمیشہ کو لے کر قریب کے گاؤں ”ڈنڈو“ تشریف لے گئے۔ شیخو نے گھر جا کر اپنے سالوں اور سدھار کو بہت سخت ست کہا۔ ”یہ تو شیخ کا احسان ہے کہ وہ فقہ گروں سرکشوں کی اس زمین پر ٹھہرے ہیں۔ کیا ان کے لئے اتنے بڑے ملک ہندوستان میں جگہ کی کمی ہے؟ گلاب جہاں جائیں گے، ہمیں گے۔ سورج ہیں، جہاں سے گزریں گے تیرہ و تار لگیوں کو روشن کر دیں گے۔“

یہ کہہ کر شیخو، حضرت بابا بلھے شاہ کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔..... اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خانقاہ خالی پڑی۔ پھر شیخو نے قریب رہنے والے کچھ لوگوں سے حضرت بابا بلھے شاہ کے بارے میں پوچھا تو پڑوسیوں نے بتایا۔

”شاہ صاحب تو دودھ پیر ہی کو چلے گئے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا بھی کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ جواب ملا شاہ صاحب نے بس اتنا ہی فرمایا۔“

”چوہدریوں کی زمین پر نہیں جا رہا ہوں۔“

شکوہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی اس ہجرت پر شدید صدمہ پہنچا۔ پھر اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں جس بات سے ڈرتا تھا، آخر وہی سامنے آئی۔ ایک شفاف بدن انسان کو کڑھیلوں کی اس رستی سے چلا جانا چاہئے تھا۔“

پھر دوسرے دن صبح ہوتے ہی شیخو، حضرت بابا بلھے شاہؒ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا..... مگر اسے زیادہ سرگرداں نہیں ہونا پڑا۔ حضرت شیخؒ قریب ہی کے گاؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شیخو لوگوں سے پوچھتا ہوا آخر آپ تک پہنچ گیا۔ اس نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی بڑی منت و ساجت کی۔

”آپ کے بغیر تو پاٹھو کے قبرستان نظر آتا ہے۔“ شیخو، حضرت بابا بلھے شاہؒ کے سامنے دست بستہ بیٹھا گریہ و زاری کر رہا تھا۔ ”وہ جانتے ہی نہیں کہ ان بے خبروں سے کیا گناہ سرزد ہو گیا ہے؟ بس میری خاطر انہیں ایک بار صاف کر دیجئے..... اور پاٹھو کے واپس تشریف لے چلیے۔ جب سے حضرت شیخؒ نے ادھر سے رخ پھیرا ہے، یوں لگتا ہے کہ ساری رونقیں اور خوشیاں ہم سے زودھ گئی ہیں۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ فرمایا۔ ”جہاں آج رونقیں ہیں، کل وہاں ویرانیاں ہوں گی.... اور جہاں خوشیوں نے سیرا کیا ہے، کل وہاں غموں کا ڈیرا ہو گا۔“ یہ کہہ کر حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ”سورۂ رحمن“ کی یہ آیت مندرجہ تاوات فرمائی۔

”اِنَّ ذٰلِكَ اِلٰهٌ وَّ اِلٰهٌ اِلٰلٰہُ وَّ اِلٰہُ اِلٰکَرَامِ کَ سوا ہر شے فنا ہو جانے والی ہے۔“ (ترجمہ)

”بے خبروں کی بے خبری نہیں جائے گی..... مگر میں تم سے خوش ہوں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی گفتگو سے ظاہر ہو چکا تھا کہ آپ دوبارہ پاٹھو کے گاؤں تشریف نہیں لے جائیں گے۔

شکوہ بایں ہو کر واپس چلا گیا اور اس نے اپنے خسر اور سالوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت شیخؒ کا اس طرح ناراض ہو کر یہاں سے چلے جانا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے شاہ صاحب کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ اب اس کا ایک ہی مددوا ہے کہ ان سے معافی مانگی جائے۔

اپنے داماد اور بہنوئی کی برہمی دیکھ کر سدھار اور شیخو کے سالوں نے سیاست اور مصلحت پسندی سے کام لیا۔ وہ اپنے اس خالنامہ گناہ پر دل سے شرمندہ نہیں تھے۔ بس شیخو کو خوش کرنے کے لئے دوسرے دن دفتوہ گاؤں پہنچ کر حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سدھار، اس کے بیٹے اور چوہدری کے لڑکے بظاہر شرمندہ سے نظر آ رہے تھے، مگر درد بردہ انہیں جابرانہ فعل پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ وہ تو اپنے داماد اور بہنوئی، شیخو کے خیال سے چلے آئے تھے کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔

”شاہ صاحب! ہم آپ کو واپس لینے آئے ہیں۔“ سدھار نے رسماً کہا۔

”وہ تو تمہاری زمین ہے۔ میں وہاں کیسے جا سکتا ہوں؟“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے درویشانہ روایت اور تواضع کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں تو تمہاری جاگیر میں ایک کراہیہ دار کی حیثیت سے رہتا تھا۔ مالک مکان آئیں گے..... اور پھر مجھے اٹھا دیں گے۔“

”اب آپ کو کوئی نہیں اٹھائے گا۔“ سدھار اور چوہدری کے بیٹوں نے بھی بس دنیا داری کا مظاہرہ کیا۔ اگر انہیں اپنی اس حرکت پر ندامت ہوتی تو پوری سچائی کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے۔ عاجزانہ لہجے میں معافی

مانگتے..... گریہ وزاری کرتے، ایک مرد درویش کو ہر حال میں منانے کی کوشش کرتے۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہ
بس کھوکھلے الفاظ تھے اور بے جان طرز کلام تھا۔

حضرت بابا بلے شاہؒ نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور اٹھ کر گھر کے اندر تشریف لے جانے لگے۔
سدھار اور اس کے بیٹوں بھتیجوں نے دنیا داری کا ایک اور مظاہرہ کیا۔ ”ہم آپ کو زبردستی واپس لے جائیں گے۔“

”فقیر کی مرضی کے بغیر اسے کون یہاں سے لے جاسکتا ہے؟“ اس طویل گفتگو کے دوران پہلی بار حضرت
بلے شاہؒ کے چہرے پر ناگواری کا رنگ اُبھرا۔

”ہم لے جائیں گے۔“ سدھار اور اس کے بیٹے بھتیجے اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت بابا بلے شاہؒ کو دروازے پر
سے پکڑ کر کھینچنے لگے۔ چوہدریوں کے اس انداز میں محبت کے بجائے طاقت اور کثرت کا نشہ تھا۔
آخر حضرت بابا بلے شاہؒ سخت حالتِ جلال میں آگئے اور آپ نے ان سب کے ہاتھوں کو جھک دیا اور
با آواز بلند اپنے یہ پنجابی اشعار پڑھے۔

”اے بلے! اگر تم غازی بنتے ہو تو اپنی کمر سے تلوار باندھ لو..... سب سے پہلے ”پانڈو کے“ میں رہنے والا
رنگرو کو قتل کرو..... اور اس کے بعد کافروں کا قلع قمع کرو..... پانڈو کے برباد ہو گیا۔ شیخوپورہ آباد ہے.....
پر سدھار ہمارا چھائی رہے۔ (ترجمہ)

یہ کہہ کر حضرت بابا بلے شاہؒ اپنے مکان کے اندر تشریف لے گئے۔

سدھار اور اس کے بیٹے بھتیجے جو شیخو کے بار بار کہنے سے حضرت بابا بلے شاہؒ کو کسی طور پر منانے اور پانڈو کے
پانڈو کے لے جانے کے لئے آئے تھے۔ ایک درویش کا یہ جلال دیکھ کر کچھ دیر دم بخود کھڑے رہے، پھر ان کا
رعوت لوٹ آئی۔ سدھار نے بڑے متکبرانہ لہجے میں کہا۔

”یہ شخص جو خود در بدر مارا مارا پھر رہا ہے، مجھے دنیا سے بھیج رہا ہے، ”پانڈو کے“ کو برباد کر رہا ہے۔ لیکن
کہ اس کی بد دعاؤں میں کتنی تاثیر ہے۔“ سدھار اسی قسم کی گستاخانہ باتیں کرتا ہوا واپس چلا گیا۔ ساتھ ہی اس کے
بیٹے اور بھتیجے بھی بے ادبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔



تین دن کی چھٹیاں گزار کر سکھ سپاہی اپنے لشکر میں واپس پہنچا۔ اس کے چہرے اور جسم پر زخموں کے نشان
دیکھ کر سپہ سالار نے اس سے ان سب چوٹوں کا سبب پوچھا۔

سکھ سپاہی نے حرف بہ حرف پورا واقعہ بیان کر دیا۔ ”پورے گاؤں میں بس ایک ہی مہربان شخص تھا کہ
مداخلت کے سبب میری جان بچ گئی..... ورنہ میری لاش پڑی سڑ رہی ہوتی اور تم لوگوں کو پتہ بھی نہ ہوتا۔“

اپنے ساتھی سپاہی پر تشدد کا حال سن کر سکھ فوجیوں کے غصے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ سپہ سالار نے اپنے سپاہیوں
مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مہمان پر حملہ بعد میں کریں گے۔ پہلے ”پانڈو کے“ کے چوہدریوں کا کسٹیاں دیکھ
گے۔ انہیں پتہ تو چلے کہ ایک نیبے آدمی پر ہاتھ اٹھانے کا کیا انجام ہوتا ہے؟“

اس کے بعد سکھ سپاہیوں نے پوری طاقت کے ساتھ ”پانڈو کے“ پر حملہ کیا۔ تمام گاؤں کو آگ لگا دی اور
بیش پوری آبادی کو تہ تیغ کر دیا۔

سدھار اور اس کے بیٹے بھتیجے، سکھ سپاہیوں کی تلواروں کی خوراک بن گئے۔ پانڈو کے بھٹی کے چوہدریوں

مگر بدست نوجوانوں نے ایک فقیر کی حالتِ جمال دیکھی تھی کہ وہ برسوں ذلت آمیز سلوک کو نہس کر برداشت کرتا رہا..... مگر جب اس کی اذیت حد سے گزر گئی اور چہرے پر رنگِ جلال ابھرا تو پوری ہستی کو آگ لگ گئی۔
حضرت بابا بلھے شاہؒ نے یہ جو فرمایا تھا کہ شیخوپورہ آباد رہے..... اور اس پر سد بہار چھائی رہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید موجودہ شیخوپورہ اس شیخو کا آباد کیا ہوا ہے، جو پانڈو کے بھٹی کے مغرور چوہدریوں کا داماد تھا اور حضرت بابا بلھے شاہؒ کا عقیدت مند۔



اس الم ناک واقعے کے بعد حضرت بابا بلھے شاہؒ کا دل اس پورے علاقے سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ آخر آپ اپنی بانی مکتبہ اور دونوں مریدوں سلطان احمد مستانہؒ اور حافظ جمالؒ کے ساتھ لاہور پہنچ کر اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ورد کر عرض کرنے لگے۔

”سیدی! مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دیجئے۔ یہاں سے باہر تو فتنہ و فساد کی آگ بھڑک رہی ہے۔“
”بابا جاسوئی دہی ہے، جو اپنی بلند ہمتی سے اس آگ کو بجھا دے۔“ مرید صادق کی عرضداشت سن کر حضرت شاہ عیادت قادریؒ نے فرمایا۔ ”اگر اس آگ کو نہ بجھا سکے تو کم سے کم اپنے دامن کو تو جلنے سے محفوظ رکھے۔“
”جب تک انسان کو تائیدِ نبی حاصل نہ ہو تو کوئی کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟ سیدی! آپ کا بلھا بہت کمزور ہے۔ اس لئے ہر وقت دعاؤں اور خصوصی توجہ کا طالب ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کسی قیمت پر بھی پیر و مرشد کے قدموں سے الگ ہونے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے خوش ہو کر جاں نثار مرید کو گلے سے لگا لیا۔ ”بلھے! تم جہاں بھی رہو گے، ہمارے ہی لکھاؤ گے..... اور ہماری ہی دعاؤں کے سائے میں رہو گے۔“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ، بابا بلھے شاہؒ کو ہمیشہ یہ عبد اللہ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ مگر آج ”بلھے“ کے نام سے مخاطب کیا، جو محبت کا ایک خاص انداز تھا۔
حضرت بابا بلھے شاہؒ اس طرزِ مخاطب پر فرطِ مسرت سے وارفتہ ہو گئے۔

”بلھے! اب تم قصور چلے جاؤ۔“ پیر و مرشد کا نیا حکم صادر ہوا۔

اور حضرت بابا بلھے شاہؒ، قصور سے بیزار تھے۔

پیر و مرشد کا حکم سن کر حضرت بابا بلھے شاہؒ گہری سوچ میں گم ہو گئے..... اور اس سوچ کی وجہ قصور کا سفر تھا، جاں آپ جانا نہیں چاہتے تھے۔

بعض تاریخ نویسوں نے قصور کا سفر اختیار نہ کرنے کی دو وجوہ بیان کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قصور میں حضرت بابا بلھے شاہؒ کے استادِ گرامی مشہور عالم دین مولوی غلام مرتضیٰ قیام پذیر تھے۔ مولوی صاحب شریعت ظاہری کا اتباع کرنے والے ایک سخت گیر انسان تھے۔ انہیں صوفیاء کی روش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور بعض خانقاہی رسموں کو دل سے اہند کرتے تھے۔ اس کے برعکس حضرت بابا بلھے شاہؒ کا انداز فقیرانہ تھا۔ شعر و شاعری بھی کرتے تھے اور سماعِ تمیز بہت ذوق و شوق سے سنتے تھے۔ مختصر اُستاد اور شاگرد کے طور طریقوں میں نمایاں فرق تھا۔ اس لئے حضرت بابا بلھے شاہؒ، قصور جانے سے گریزاں تھے۔ اگر وہاں جاتے تو یقینی طور پر مولوی غلام مرتضیٰ کا سامنا ہوتا۔ اسی لئے آپ لاہور میں پہلو تپی کر رہے تھے..... اور پیر و مرشد کا حکم سننے کے باوجود خاموش تھے۔

جب حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے اپنے مرید صادق کو قصورات کی دنیا میں گم پایا تو نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”سید عبد اللہ! کیا سوچ رہے ہو؟“

حضرت بابا بلے شاہؒ نے چونکہ کر پیر و مرشد کی طرف دیکھا، پھر فوراً ہی نظریں جھکاتے ہوئے انتہائی احترام کے ساتھ عرض کیا۔ ”سیدی! میری گزارش ہے کہ مجھے کسی اور علاقے میں بھیج دیا جائے۔“

”میں کون ہوتا ہوں بھیجے والا؟“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے جذب کے عالم میں فرمایا۔ ”سید عبداللہؒ ہی تمہاری منزل ہے۔“

تذکرہ نویسوں نے حضرت بابا بلے شاہؒ کے قصور نہ جانے کی دوسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس علاقے کا بہت سرکش اور شر پسند تھے۔ مقامی باشندوں نے اکثر اخلاقی رکیں ترک کر دی تھیں اور دنیا داری کے دام میں لپکے ہوئے۔ لہذا وہاں کی زندگی گزارنے پر راضی ہو گئے تھے۔ اہل قصور کی اسی معاشرتی حالت کو اپنے ایک پنجابی شہر میں طرح بیان کیا ہے۔

”شہر قصور میں نہ کوئی نیک کام کرتا ہے..... نہ سخاوت سے کام لیتا ہے..... اور نہ وہاں کوئی قانون ہے..... مگر پھر بھی مجھے قصور جانا ہے..... کیونکہ میرے مرشد کا یہی حکم ہے۔“ ترجمہ۔

بالآخر حضرت بابا بلے شاہؒ اپنے پیر و مرشد کے حکم کے احترام میں قصور کی طرف روانہ ہوئے۔ اس سفر میں کی بڑی ہمشیرہ اور دونوں مریدان خاص سلطان احمد مستانہؒ اور حافظ جمالؒ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔



قصور پہنچ کر حضرت بابا بلے شاہؒ نے شہری حدود سے باہر قیام کیا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت قیام گاہ گھاس پھوس اور بانسوں پر مشتمل ایک جھونپڑی ہوگی۔ خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی طرح..... اور وہ بھی اپنی فطرت میں خانہ بدوش ہی ہوتے ہیں۔

یہ حضرت بابا بلے شاہؒ کی روحانیت کا اثر تھا کہ گرد و نواح کے لوگ کھنچ کھنچ کر آپ کی جھونپڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ مسائل زدہ عوام اپنی حاجتیں لے کر ایک مرد قلندر کے پاس آتے اور وہ رزاقی عالم کی بارگاہِ کرم میں رہنے لے ہاتھ اٹھا دیتا۔

پھر یوں ہوتا کہ مشکل کشائے عالم اپنے بندوں کی حاجت روائی فرماتا۔ برسوں سے نامعلوم بیمار یوں میں انسان، درویش کے دیئے ہوئے ایک گھونٹ پانی سے شفا یاب ہو جاتے۔ بھوک اور بے روزگاری کے ستارے پر آدم زادوں کو پیٹ بھر روٹی ملنے لگی..... اور جو شریف زادیاں اپنی غربت کی وجہ سے ماں باپ کے کانٹوں پر بیٹھ رہی ہوتی تھیں، وہ حضرت بابا بلے شاہؒ کی دعاؤں سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔

ایک مرد درویش کی یہ کرامات ان خوشبودار پھولوں کی طرح تھیں جو کھلتے ہیں تو فضاؤں کو مہکا دیتے ہیں۔ اور غیر مقامی لوگ قطار در قطار آنے لگے۔

جب حضرت بابا بلے شاہؒ، قصور تشریف لائے تھے تو سب سے پہلے اپنے استاد گرامی مولوی غلام مرتضیٰ صاحبؒ کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوئے تھے۔

مولوی غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے اپنے شاگرد کو دیکھ کر بڑی حیرت سے فرمایا تھا۔ ”سید عبداللہؒ! یہ کیا طبع بنایا۔ مولانا کا اشارہ حضرت بابا بلے شاہؒ کے اس لباس کی طرف تھا، جس سے فقیرانہ شان جھلکتی تھی۔“

”خادم کیا کرتا؟ مجبور نہ!۔ مخدوم نے جس رنگ میں چاہا، رنگ دیا۔“ حضرت بابا بلے شاہؒ کا اشارہ اپنے مرشد حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی طرف تھا۔

”اب یہاں کیسے آئے ہو؟“ مولوی غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے سوال کیا۔

”بہر مرد کا حکم ہے کہ قصور میں قیام کروں۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے عرض کیا۔
 ”پھر تمہیں کس نے روکا ہے؟“ مولوی غلام مرتضیٰ صاحب نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔
 ”شہر ضرور آپ کی مملکت ہے۔“ حضرت بابا بلے شاہ نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔ ”قیام کے
 لیے صاحب مملکت سے اجازت تو لیتی پڑتی ہے۔“
 شاگرد کی اس سعادت مندی پر مولوی مرتضیٰ صاحب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”اللہ تم پر اپنے رحم و کرم کی بارش
 کرے۔“

اتحاد گرامی کی اجازت کے بعد حضرت بابا بلے شاہ نے شہر سے باہر ایک تالاب کے کنارے قیام فرمایا تھا۔ آج
 کئی تالاب کو ”سالانے والا تالاب“ کہتے ہیں۔ پھر جب انسانی طرز معاشرت نے ترقی کی منزلیں طے کیں تو
 ان تالاب کے قریب قصور کا ریلوے اسٹیشن تعمیر کیا گیا۔



بہر یہ قصور کے نواب خاندان تک بھی پہنچ گئی۔ اس وقت پٹھانوں کا ایک قبیلہ، قصور پر حکومت کر رہا تھا اور
 نواب رائے خان، مکران تھا۔ رائے خان کی ایک بہن جو عمر رسیدہ تھی اور بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی، قیمتی نذر لے
 کر اپنے ملازموں کے ساتھ حضرت بابا بلے شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

نام نہاد تکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت بابا بلے شاہ نہایت خوبصورت انسان تھے۔ آپ کی داڑھی کھنی
 اور شرع کے مطابق تھی۔ آنکھیں موٹی موٹی اور دلکش تھیں۔ نقوش تیکھے تھے اور ہر وقت چہرہ مبارک سے ایک خاص
 ہلال کی کیفیت ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ آپ کھلا کرتہ اور تہبند استعمال کرتے تھے۔ جب نواب رائے خان کی بہن
 فوت عالمیہ میں حاضر ہوئی تو حضرت بابا بلے شاہ کی عمر مبارک تیس سال کے قریب تھی۔ گویا بھرپور جوانی کا زمانہ۔
 رائے خان کی بہن نے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا اور پہلی ہی نظر میں حضرت بابا بلے شاہ پر فریفتہ ہو گئی۔
 یہ ایک فتنہ گر محرت تعالیٰ نے حضرت بابا بلے شاہ کو ہر وقت خبردار کر دیا۔

حضرت بابا بلے شاہ سے رائے خان کی بہن کی عقیدت یکایک مادی محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ”بہت دنوں
 سے اپنی رعایا کی زبانی آپ کی میحائی کے قصے سن رہی تھی اور شوق دیدار بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر آپ کے آستانے
 پہنچی۔“ خاتون کے لہجے میں دنیا داری کی لگاؤ تھی اور وہ شائستہ الفاظ میں اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہی
 تھی۔ ”جب آپ کی دعاؤں سے بہت سے مریض شفا یاب ہوئے ہیں تو پھر میری بھی میحائی کیجئے، میں بھی بیمار
 ہوں۔“ خاتون کی گفتگو ذمہ داری تھی۔ اگر کوئی تیسرا شخص وہاں موجود ہوتا تو یہی سمجھتا کہ حضرت بابا بلے شاہ سے میحائی
 کی درخواست کرنے والی خاتون روحانی طور پر بیمار ہے۔ جبکہ اسے درویش کی صورت دیکھتے ہی عشق کا مرض لاحق
 ہو گیا تھا۔

حضرت بابا بلے شاہ سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔

”میرا غلط قصور کے نواب خاندان سے ہے۔“ خاتون نے مختصر سے سکوت کے ساتھ دوبارہ حال دل بیان کرنا
 شروع کیا۔ ”مگر یہاں آکر میں خود کو آپ کی خادمہ محسوس کر رہی ہوں۔“

رائے خان کی بہن کا خیال تھا کہ اس کا حسب و نسب سن کر حضرت بابا بلے شاہ متاثر ہوں گے..... لیکن مرد
 درویش نے کچھ کہنے کے بجائے منہ پھیر لیا۔

خاتون کو آپ کے اس طرز عمل پر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر حضرت بابا بلے شاہ کے

سامنے آگئی اور بڑے والہانہ لہجے میں کہنے لگی۔ ”آج پہلی بار مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی ہے کہ درویشی کا دنیاوی اقتدار کی کوئی حیثیت نہیں۔“ ان الفاظ میں بھی خاتون کا وہی جذبہ عشق پوشیدہ تھا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ کے چہرہ مبارک پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا اور آپ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ خاتون کو حضرت بابا بلھے شاہؒ کے اس طرز عمل سے اذیت پہنچی اور اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا ”بابا بلھے شاہؒ کی درویشی ہے کہ مہمان سوال کر رہا ہے..... اور میزبان کوئی جواب نہیں دیتا بلکہ مسلسل تغافل برت رہا ہے۔“ جیسا مہمان کا سوال، ویسا میزبان کا جواب۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اسی طرح منہ پھیرے ہوئے دیا۔

خاتون چوکی۔ اسے کسی قدر شک ہوا کہ شاید حضرت بابا بلھے شاہؒ اس کے دل کا حال جان گئے ہیں مگر وہ جھٹ کرتی رہی۔ ”میں اپنے سوال کا جواب آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔“ ”اے عزت دار و محترم خاتون! فقیر کا جواب یہی ہے کہ آپ اپنے قیمتی تحائف کے ساتھ واپس تشریف جائیں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے چہرہ مبارک سے وہی ناگواری جھلک رہی تھی۔ ”وجہ بتائے بغیر کسی کی نذر کھڑکھڑانا بھی درویشوں کی شان نہیں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے اس جواب پر رانجھے خان کی بہن سنبھل گئی تھی۔

”اگر اچھی نیت کے ساتھ کوئی شخص سوکھی روٹی بھی لاتا ہے تو درویش اسے نواہوں کی لذیذ ترین غذاؤں سے زیادہ مرغوب سمجھتا ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے فرمایا۔ مگر آپ کا رخ دوسری طرف تھا۔ ”اور اگر نیت دل راز نہ ہوں تو پھر ہیرے جواہرات بھی غلاط کا ایک ڈھیر نظر آتے ہیں۔“ خاتون ایک مرد درویش کی اس قوت کشف پر حیران رہ گئی۔

”آپ مجھے اپنا بیٹا بھی سمجھ سکتی تھیں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ سیدھے ہوئے اور خاتون کی آنکھوں پر براہ راست دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”چھوٹا بھائی بھی سمجھ سکتی تھیں۔ آخر یہ دونوں بھی تو انتہائی محبت اور پنداری رشتے ہیں۔“

اب خاتون کو حضرت بابا بلھے شاہؒ کی روحانیت پر اعتبار آ گیا تھا۔ ایک مرد درویش نے دنیاوی دولت کی کڑی کر دی تھی..... اور مادی جذبات کی بھی۔ آخر حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ان خاتون کی نذر قبول کر لی۔ اور رانجھے خان کی بہن نے آپ کو ”منہ بولا“ بیٹا کہہ کر پکارا۔



اس واقعے کی گونج نواب خاندان میں بہت دُور تک سنائی دی۔ رانجھے خان کو پہلی بار محسوس ہوا کہ دولت، اقتدار سے بڑی بھی کوئی شے اس دنیا میں موجود ہے۔ اور وہ ہے ایک درویش کی شان بے نیازی..... مہر و استغناء ضبط و تحمل..... قناعت اور توکل.....

رانجھے خان کی بہن اکثر حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں قیمتی نذریں لے کر جاتی رہیں..... اور آپ انہیں تکلف کے بغیر قبول کرتے رہے..... مگر اس طرح کہ جیسے ہی منہ بولی ماں، نقد رقم لے کر آتیں، آپ فوراً حافظ جمال یا سلطان احمد مستانہ کو طلب کر کے وہ رقم ان کے حوالے کر دیتے اور فرماتے۔

”اگر ضرورت مند موجود ہوں تو حسب ضرورت یہ رقم ان لوگوں میں تقسیم کر دو..... اور اگر کوئی نہ ہو تو اسے لنگر خانے کی اشیاء خرید لو۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے قصور میں قیام فرماتے ہی ایک چھوٹا سا لنگر خانہ قائم کر دیا تھا، جہاں آہستہ آہستہ بھوکے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مقامی لوگوں کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ایک فقیر، جس کا گھر تنک مات نہیں، وہ کس طرح بھوکے لوگوں کو کھانا کھلا سکتا ہے؟ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کو بہت فربہ حاصل تھا۔

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

(توکل کرنے والوں کے لئے خود اللہ کی ذات پاک ہی ساز و سامان فراہم کرنے والی ہے)

خاتون جب حضرت بابا بلھے شاہؒ کا یہ انداز سخاوت دیکھتیں تو کبھی کبھی سوال کر بیٹھتیں۔ ”آپ کو کچھ اپنا بھی دیا ہے؟“

حضرت بابا بلھے شاہؒ بڑے دلہانہ انداز میں فرماتے۔ ”مجھے میرا اللہ کافی ہے۔“

ای دورانِ رات بچے خان کی بہن نے اپنے بھائی سے ایک قطعہ زمین لے کر اس پر دو مکان تعمیر کرانے شروع کر دیئے۔ ان دونوں مکانوں میں بارہ کمرے، چھ چوہارے، ایک کنواں اور ایک بیٹھک تھی۔ جب سارا تعمیری کام مکمل ہو کر ان تصور کے حاکم کی بہن اپنے منہ بولے بیٹے، حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں پہنچیں۔ ان خاتون کا حقیقی ہم کا تھا، کی مذکرے سے ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض کتابوں میں نواب خاتون درج ہے..... مگر یہ بھی اصلی نام نہیں۔ نواب خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث کچھ تذکرہ نویسوں نے انہیں ”نواب خاتون“ کہہ کر پکارا ہے۔ بہر حال، نواب خاتون نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔

”میری خواہش ہے کہ اب آپ شہر کے اندر تشریف لے چلیں تاکہ دوسرے لوگ بھی آپ کی روحانیت سے نابل بای ہو سکیں۔“

”ہجرانِ سادہ لوح دیہاتیوں کا کیا ہوگا، جو مذہبی تعلیم سے بھی بے بہرہ ہیں اور دنیاوی علم سے بھی نا آشنا؟“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے فرمایا۔

”ان دیہاتیوں کے دماغوں پر صرف جہل کا سایہ ہے، جسے کوئی بھی دنیاوی عالم دُور کر سکتا ہے..... مگر شہر والوں کے تَوَدُل ہی بگڑ گئے ہیں۔“ نواب خاتون نے عرض کیا۔

”جب دل بگڑ جائیں تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ قصور کے ذی حیثیت لوگوں نے کج روی اختیار کر لی ہے، جس کا اثر عام لوگوں پر بھی پڑ رہے ہیں۔ درویشوں کے لئے شہری آبادی سے دُور رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنے زمانہ طالب علمی میں قصور کے شہریوں کا چلن دیکھ چکے تھے، اس لئے ان کے درمیان جانے سے اُڑ بڑاں تھے۔ اب آپ نواب خاتون کو کیا بتاتے کہ پیر و مرشد کے حکم سے یہاں آپڑے ہیں..... ورنہ دلی طور پر انہیں قصور سے کتنے ٹالاں ہیں۔

نواب خاتون نے خود ہدایت پائی تھی تو اپنی قوم کو بھی سیدھے راستے پر دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس لئے بار بار ایک نیا بات پر اصرار کرتی رہیں۔

جہاں میں حضرت بابا بلھے شاہؒ مختلف عذر پیش کرتے رہے۔

آخر جب نواب خاتون مایوس ہو گئیں تو انہوں نے اپنے اور حضرت بابا بلھے شاہؒ کے درمیان قائم ہونے والے رشتے کا ہار اٹھا۔ ”مجھے ماں بھی کہتے ہو..... اور میری بات بھی نہیں مانتے۔“ نواب خاتون کا لہجہ بہت اُداس تھا۔ اس کے بعد حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اپنا مختصر سامان سینٹا اور اپنی بڑی ہمیشہ، سلطان احمد مستانہ اور حافظ جمال

کے ساتھ ان پختہ مکانوں میں تشریف لے گئے جو نواب خاتون نے آپ کے لئے بطور خاص بنوائے تھے۔ جب حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ان کو تعمیر شدہ مکانوں میں قدم رکھا تو نواب خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”میں صرف آپ کی خاطر یہاں آ گیا ہوں، ورنہ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ درویشوں کو شہر سے دور ہی رہنا چاہیے۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے اس فرمان مبارک میں بڑی گہرائی تھی اور عجیب معنی پوشیدہ تھے مگر نواب خاتون عارف کے اشارے کو نہ سمجھ سکیں۔ وہ تو بس اس بات سے خوش تھیں کہ انہوں نے ایک مرد حق کی خدمت میں آسائش کا سامان فراہم کر دیا ہے..... اور معرفت کی وہ روشنی جو دور جنگل میں پھیلی ہوئی تھی، وہ ان کے دل میں آگئی ہے۔

جب ایک مستقل قیام گاہ بن گئی تو حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اپنے مرید خاص، سلطان احمدؒ کو حکم دیا کہ بیوی بچوں کو بھی یہاں لے آئیں۔ چنانچہ سلطان احمدؒ مستانہ نوری طور پر اپنے آبائی شہر روانہ ہو گئے اور اپنے بچوں کو لے کر قصور آ گئے۔ ایک مکان میں سلطان احمدؒ مستانہ صبح اہل و عیال رہتے تھے..... اور دوسرے میں بابا بلھے شاہؒ اور حافظ جمالؒ۔ اس مکان میں ایک مردانہ بیٹھک تھی اور ایک الگ تھلگ کمرہ، جس میں حضرت شاہؒ اپنے اراد و وظائف ادا کرتے تھے۔

نواب خاتون نے اپنے بھائی رانجھے خان سے کہہ کر شہر سے کچھ فاصلے پر ایک مربع زمین مخصوص کرادی اور پھر کچھ دن بعد اسی زمین پر ایک ہال نما عمارت بھی تعمیر کرا دی تھی، جو حضرت بابا بلھے شاہؒ کا ذریعہ کھانا پکانا اور نواب خاتون نے یہ اہتمام اس لئے کیا تھا کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے دریاؤں اور جنگلوں میں اس قدر رہا تھا کہ آپ بہت تنہائی پسند ہو گئے تھے۔ جب حضرت بابا بلھے شاہؒ نے پہلی بار اپنا یہ ڈیرہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے جیسے کسی انسان کو قید سے رہائی مل گئی ہو۔ پُر شور زندگی آپ کے لئے ایک قید خانہ ہی تھی۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنے مکان کے کمرے میں مصروف عبادت رہتے۔ پھر جب اراد و وظائف پورے ہوتے، ڈیرے میں تشریف لے جاتے اور وہاں آنے والوں کو بڑے دل نشین انداز میں مذہبی آداب و احکام دیتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کے درس کی شہرت عام ہو گئی اور گرد و نواح کے لوگ کھینچ کھنچ کر ڈیرے پہنچنے لگے۔

غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی حیات مبارکہ کے معمولات سے ثابت نہیں کر آپ ”سماع“ کی محفل آراستہ کی ہو۔ اس کے باوجود حضرت بابا بلھے شاہؒ بہت ذوق و شوق سے ”سماع“ سنا کرتے حالانکہ آپ سنا بھی ”قادری“ تھے اور سلسلہ تصوف کے اعتبار سے بھی۔ پھر آپ نے ”سماع“ کو کیوں چارم آخری سانس تک اس روایت کو کیوں برقرار رکھا؟ تصوف کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک اہم سوال ہے..... اور اس کا ایک ہی جواب ہے کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے پیرومرشد حضرت شاہ عینیتؒ اسی شدت کے ساتھ ”سماع“ کی رغبت رکھتے تھے۔

اب یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عینیتؒ بھی ”قادری“ تھے۔ پھر ان کے سنا ”سماع“ کیوں کر جائز قرار پایا؟

حضرت شاہ عینیتؒ، قادری سلسلے کے علاوہ شطاریہ، چشتیہ اور سہروردیہ کے سلسلوں میں بھی بیعت فرماتے۔ ”سماع“ صوفیائے کرام کے نزدیک ایک متنازع مسئلہ ہے۔ بعض بزرگ اسے یکسر ناجائز قرار دیتے ہیں۔ بعض صوفیاء چند شرائط کے ساتھ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ شطاریہ اور چشتیہ سلسلے کے بزرگ سماع سنا کرتے۔

لے عزت شاہ حمایت قادریؒ کو بھی سماع سے بے حد رغبت تھی..... اور پھر اسی طرح پیر و مرشد کی روش پر چلتے ہوئے عزت بابا بلے شاہؒ بھی کوچہ سماع کی طرف نکل آئے تھے۔ پھر اسی سماع کی آگ سے آپ کے دل میں عشق کا نور لگا تھا..... اور پھر اپنے اسی عشق کے اظہار کے لئے آپ نے شاعری کو وسیلہ بنایا تھا۔

عزت بابا بلے شاہؒ پابندی کے ساتھ اپنے ڈیرے پر تشریف لے جاتے تھے۔ پہلے پہل قریبی شہر کا کوئی قوال اپنا ہنکار اس نے عارفانہ کلام سنا کر حضرت بابا بلے شاہؒ کو محظوظ کیا۔ نتیجتاً آپ نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ پھر یہ خبر عام ہوئی تو دور دور سے قوال آنے لگے۔ حضرت بابا بلے شاہؒ باری باری سب کا کلام سنتے اور انہیں فرائد کر رخصت کر دیتے۔ واضح رہے کہ وہ محفل سماع، موجودہ قوالی کی طرح نہیں ہوتی تھی کہ نمائش پسند لوگ ہر لمحہ ”کو خوشی کرنے کے لئے قوالوں پر نونوں کی بارش کر رہے ہیں۔“

عزت بابا بلے شاہؒ کی محفل سماع کے آداب یہ تھے کہ حاضرین ادب اور شائستگی کے ساتھ قوالوں کی زبانی مشہور شہزادہ عارفانہ کلام سنتے۔ پھر جب محفل برخواست ہو جاتی تو حضرت بابا بلے شاہؒ قوالوں کو اپنے حجرہ خاص میں لے جاتے اور اپنے دست مبارک سے ایک مخصوص رقم دے کر رخصت کر دیتے..... اور یہ رقم وہی ہوتی جو آپ کو ”تنب“ سے حاصل ہوتی۔

الحق یہ ہے کہ ان کے سروں میں طاقت اور اقتدار کا نقشہ تھا۔ اس لئے دوسرے علاقے جاتے ہوئے، ایک درویش بے سروسامان کی یہ شہرت و محبوبیت برداشت نہ کر سکے۔



اگر کئی آدمی میں یہ روایت ملتی ہے کہ قصور کے لوگوں نے شروع میں حضرت بابا بلے شاہؒ کی آمد پر کوئی توجہ نہیں دی، شاہزادوں کی وجہ یہ ہو کہ ابتدائی دنوں میں درویش کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر جب یہ مقبولیت، محبوبیت و قبولیت کی تو یہاں کے مقامی لوگ، خصوصاً افغان، آتشِ حسد میں جل اٹھے۔ قصور کے افغان، برسرِ اقتدار بھی تھے اور اندر بھی۔ عام دنیا داروں کی طرح وہ دولت و اقتدار کو عزت کی نشانیاں سمجھتے تھے..... اور عزت کی ایک ہی پیمائش یہ تھی کہ حلقہ خدا، ہاتھ باندھے اور اپنے سردوں کو جھکائے اُن کے دروازوں پر کھڑی رہے۔

مگر قصور میں حضرت بابا بلے شاہؒ کی آمد نے دنیا داروں کے اس قانون اور قاعدے کو یکسر بدل ڈالا۔ انسانوں کا زہم و لہجہ اور جاگیر داروں کے دروازوں پر ہونا چاہئے تھا، وہ ایک درویش بے سروسامان کے آستانے پر نظر نہ لگا۔ قصور کے بااختیار حلقوں سے یہی بات برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

آزہ کہ با اثر پٹھانوں نے ایک دن یہاں کے حاکم، نواب رانجھے خان سے شکایت کیا۔

”بلے شاہؒ کی وجہ سے روز بے روز ہمارے اقتدار میں کمی ہو رہی ہے۔ کہیں ایک دن ایسا نہ ہو کہ آپ ہی کی دی ہو زمین پر بسنے والا یہ فقیر پورے علاقے پر قابض ہو جائے..... اور چھوٹی ذات کے لوگوں کو آپ کے مقابلے نہ کرادے۔“

نواب رانجھے خان یہ سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے؟“

”بہت آسان کی بات ہے۔“ پٹھانوں نے حضرت بابا بلے شاہؒ کے خلاف ایسی عقلی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا، ”ہر جاگیردار کے دماغ میں اتر سکتی تھی۔“ ہماری سلامتی اس میں ہے کہ نسلِ انسانی ہمیشہ دو طبقوں میں تقسیم رہے۔ ایک بظہرِ ظہران..... اور دوسرا محکوم۔ ایک فرقہ اعلیٰ ترین..... اور دوسرا پست ترین..... قصور کی رعایا اب تک خود کو بہتر نہیں سمجھتی تھی۔ اگر کبھی اس کے دل میں کوئی احساس پیدا بھی ہوتا تھا تو گردن کا طوق اور پیردوں کی

زنجیریں اسے یہ راز سمجھا دیا کرتی تھیں کہ وہ لوگ صرف غلامی ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ مگر جس روز نے قصور کی زمین پر قدم رکھا ہے، یہاں کی صاف و شفاف فضا، زہر آلود ہونے لگی ہے۔ آج تک ہمارے وہ باتیں نہیں سنیں جو یہ فقیر کہتا ہے۔“

”بلے شاہ کیا کہتے ہیں؟“ نواب رانجھے خان کی حیرت میں لکڑی بہ لکڑی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”رعایا کو حاکم کے برابر کھڑا کرنا چاہتا ہے۔“ ایک پٹھان نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”صدیوں سے غلامی والوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ معزز وہ نہیں ہیں جن کے پاس اونچی حویلیاں، طبل و علم، فوج اور خزانے ہیں۔ بڑے وہ ہیں جو زیادہ نیک ہیں۔“ قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔ ”اللہ کے نزدیک معزز وہ معزز ہیں۔“ تقویٰ (پرہیزگاری) میں زیادہ ہیں۔“

دنیا کے ہر محدث، فقیہ اور صوفی نے اپنی تعلیمات میں اسی کی تلقین کی ہے..... حضرت بابا بلے شاہ! درس میں حاضرین مجلس سے یہی فرمایا کرتے تھے۔

”وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا ہے۔ نگاہِ قدرت سب برابر ہیں۔ قبیلوں، ذاتوں اور فرقوں کی کوئی حیثیت نہیں۔“ دوسرے افغان نے انتہائی مشتعل لہجے میں ”قصور کے حجام، تیلی، جلاہ اور قصائی ہم سب کچھ کلاہ افغانوں کے برابر ہو سکتے ہیں؟ اگر کچھ دن اور اس کی زبان پسندانہ باتوں کا سلسلہ جاری رہا تو قصور کی رعایا اپنے حاکم کے مقابل کھڑی ہو جائے گی۔“

نواب رانجھے خان بھی اپنے ہم قبیلہ افراد کی پُر جوش تقریروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

یہ عرب و عراق اور برصغیر ہندوستان کی عجیب روایت رہی ہے کہ بیشتر حکومتوں نے محدثوں، فقیہوں اور صوفیوں کی شہرت و محبوبیت کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ ہی سمجھا ہے۔ نتیجتاً نواب رانجھے خان بھی اپنے حاشیہ برداروں فریب میں آ گیا..... تاہم اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہمیں بلے شاہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی..... مگر کیا کریں؟ ہماری بہن نواب خاتون کو ان سے بہت قرب

ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے بلے شاہ کی رہائش اور ڈیرے کا انتظام کیا تھا۔“

”آپ اپنی ہمیشہ محترمہ کو سمجھائیں۔“ چند بااثر پٹھانوں نے بیک زبان کہا۔ ”ان کی ایک فقیر سے بڑھ کر

نواب خاندان کے لئے انتہائی ضرر رساں ثابت ہو رہی ہے۔“ حضرت بابا بلے شاہ کا ذکر کرتے ہوئے تمام افغانوں کے لہجے سے شدید جارحیت بھی جھلک رہی تھی..... اور گستاخی بھی۔

پھر جب نواب رانجھے خان نے اس سلسلے میں اپنی بہن نواب خاتون سے بات کی تو وہ برہم ہو گئیں۔ ”میں نے ان کے قدموں کی برکت سے ہزاروں نادیدہ خطرات ٹل رہے ہیں، یہ کم فہم اور نادان لوگ اسی درویش کے دروازے پر لئے خطرہ سمجھ رہے ہیں۔ آپ ان کی باتوں میں ہرگز نہ آئیے گا۔ یہ وہی فتنہ پرداز لوگ ہیں جو سیدھا راجہ والوں کو راہ سے بھٹکایا کرتے ہیں۔“

نواب رانجھے خان اپنی بہن کے سامنے خاموش ہو گیا۔

کچھ دن بعد اسی فتنہ گر اور دنیا پرست جماعت نے نواب رانجھے خان کو دوسرا مشورہ دیا۔ ”اس فتنے سے بچنا

حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ فقیر کو یہاں سے رخصت کر دیا جائے۔“

”یہ اقدام ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ ہم اپنی بیوہ بہن کی دل شکنی نہیں کر سکتے۔“ نواب رانجھے خان نے فخر کے معززین سے معذرت کر لی۔ مگر دلی طور پر وہ خود بھی حضرت بابا بلے شاہ کی ہر دلعزیزی سے ہر اس نظر آہٹ

جب فتنہ پردازوں کا وہ گردہ، نواب رانجھے خان سے مایوس ہو گیا تو اس نے باہم مشاورت کے بعد ایک منصوبہ بنایا۔ ان میں سے اکثر لوگ ایک جاسوس کی طرح حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ٹوہ میں لگ گئے۔ ہر ہر قدم خفیہ طور پر ایک درویش کی عمرانی ہونے لگی کہ کوئی شرعی عیب نظر آجائے تو وہ لوگ مذہب کی بنیاد پر ہنگامہ آرائی کر کے ایک درویش سے نجات حاصل کر سکیں۔

آخر جب حضرت بابا بلھے شاہؒ کے شب و روز کا جائزہ لینے کے بعد شریکین کو درویش کی ذات میں کوئی عیب نظر نہیں آیا تو ان کی نظر تو الیوں اور سماع کی محفلوں پر پڑ گئی جن کا اہتمام حضرت بابا بلھے شاہؒ نہایت ذوق و شوق سے فرمایا کرتے تھے۔

پھر یہ لوگ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو قصور کی جامع مسجد کے خطیب و امام بھی تھے اور بڑے فقیہ بھی۔ یہ فتنہ گرد لوگ اس راز سے بے خبر تھے کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ابتدائی مذہبی تعلیم مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ ہی سے حاصل کی تھی۔ اس طرح دونوں محترم شخصیات کے درمیان استاد و شاگردی کا رشتہ تھا۔

”مولانا صاحب! اگر کوئی مسلمان تو الیاں اور سماع سے تو مذہب کی روشنی میں اس کا یہ فعل کیسا ہے؟“ شر بہنوں نے بڑی عیاری کے ساتھ ایک فقیہ کے سامنے اپنا سوال اٹھایا۔

”سماع کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ اس لئے ممنوع ہے۔“ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے مختصر فرمایا۔

”اگر کوئی صوفی سماع سے؟“ فتنہ گردوں کے اس سوال میں بھی ان کی شاطرانہ ذہنیت پوشیدہ تھی۔

”شرع میں صوفی یا عام مسلمانوں کی کوئی قید نہیں۔ مذہبی احکام سب کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔“ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا اور اس کے ساتھ ہی سوال کرنے والوں سے پوچھا۔

”وہ صوفی کون ہے، جس کے بارے میں تم مجھ سے فتویٰ لینے آئے ہو؟“

”ایک فقیر بلھے شاہؒ ہے جس کے متعلق ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟“ ایک فتنہ گرد نے اپنی تقریر آئینہ لہجے میں کہا۔ ”نواب رانجھے خان نے ترس کھا کر فقیر کو شہر سے باہر ڈیرہ بنانے کے لئے جگہ دے دی تھی۔ اب وہی فقیر، حزامیر (سازوں) کی دھن پر تو الیاں سن رہا ہے..... اور بدست ہو کر رقص کر رہا ہے..... اور مارا دل مسلمان بھی اس کی تقلید میں ناچ رہے ہیں۔ کیا اس کا یہ فعل جائز ہے؟“

”ہرگز جائز نہیں۔“ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے ایک فقیہ کے بے باک لہجے میں فرمایا۔ ”مگر سید عبداللہ، ہمارے اس طرح سن سکتا ہے؟ وہ کوئی جاہل اور بے خبر صوفی نہیں..... بلکہ میرا بابا ہوش شاگرد ہے۔“

”آپ خود چل کر ملاحظہ فرمائیں کہ سماع کے نام پر کیسی کیسی غیر شرعی حرکات ہو رہی ہیں۔“ ایک شریکین نے اپنے لہجے کو ہنس بھرتے ہوئے اس طرح کہا جیسے اس کے دل میں اسلام کا بہت درد ہے اور وہ شریعت کی خلاف ورزی ہونے کو دیکھ کر اس درد کی شدت سے بے قرار ہو گیا ہے۔

حالانکہ جو لوگ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی محافل سماع کے خلاف فتویٰ لینے کے لئے مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، ان کی اپنی ذاتی محفلوں کا یہ حال تھا کہ شادی بیاہ اور دیگر خوشی کی تقریبات میں طوائفوں کا ناچ اس طرح دیکھا کرتے تھے، جیسے یہ راگ رنگ ان کی معاشرت کا ضروری حصہ ہوں اور جسے کسی بھی حال میں نظر انداز نہ کیا جاسکتا ہو۔ آج یہی بے راہ رو لوگ ایک مرد فقیہ کے سامنے ایک صوفی پر ہتھیں تراش رہے تھے۔

مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے ان فتنہ پردازوں کی گفتگو بہت غور سے سنی اور آپ کے چہرہ مبارک پر اذیت و

کرب کا رنگ نمایاں ہو گیا۔

مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کو خاموش دیکھ کر شریںد یہ سمجھے کہ استاد، شاگرد کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ ان فوراً ہی نئی چال چلتے ہوئے بولے۔

”مولانا صاحب! کیا خلق خدا کے لئے سماع کی ان محفلوں کو روکنا جائز ہے؟“

مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا۔ ”ہاں، ایسی محفلوں کو روکنا بھی جائز ہے۔“ دوسری روایت کے مطابق مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے اپنے اس فتوے کو مشروط کرتے ہوئے فرمایا۔ ان محافلِ سماع سے قرب و جوار کے لوگوں کی یکسوئی میں فرق پڑ رہا ہے تو انہیں روکا بھی جاسکتا ہے۔“

تیسری روایت کے مطابق مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے شریںدوں کی گفتگو سے اندازہ کر لیا تھا کہ ان شاگرد، حضرت بابا بلے شاہؒ کے خلاف ہنگامہ آرائی کا آغاز ہو چکا ہے اور حکمران قبیلے کے لوگ ایک معصوم مسلمان جسمانی ایذا پہنچانے کے درپے ہیں۔ اس لئے مولانا صاحبؒ نے دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے سماع کی خط کو روکنے کا فتویٰ دے دیا تھا تا کہ ہنگامہ آرائی کا باب بند ہو جائے اور ان کا ایک عزیز شاگرد، شریںدوں دراز دیتی سے محفوظ رہ سکے۔

چوتھی روایت کے مطابق بعض راوی، سرور کونین حضور اکرم ﷺ کی اس حدیث مبارک کا حوالہ دیتے؟ جس میں پیغمبر اسلامؐ نے ایمان کے ایک خاص درجے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

”اگر تم کسی برائی کو روکنے کی طاقت رکھتے ہو تو اسے روک دو۔“

اس قبیل کے راویوں کے مطابق مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے بھی فرمانِ رسالتؐ کے پیش نظر حضرت بابا شاہؒ کی محافلِ سماع کو روکنے کا فتویٰ صادر کر دیا تھا۔

شریںدوں کی جماعت، اسی فتوے کو لے اڑی۔ پھر یہ لوگ جمع ہو کر قصور کے حاکم، نواب رانجے خان کے پاس پہنچے اور مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کا فتویٰ سناتے ہوئے بولے۔

”ہم شریعت کی آڑ لے کر فقیر کی قوالیوں کی محفلوں پر پابندی لگا سکتے ہیں۔ اس طرح جب فقیر کے غلوں مشغلے میں رکاوٹ پیدا ہوگی تو وہ خود ہی تنگ آکر یہاں سے کہیں اور چلا جائے گا۔“

نواب رانجے خان پہلے ہی حضرت بابا بلے شاہؒ کی مقبولیت و محبوبیت سے سہا ہوا تھا اور ایک مردِ درویش کی کھال سے رخصت کرنے کا کوئی ایسا بہانہ تلاش کر رہا تھا، جس سے اس کی بہن، نواب خاتون کی دل آزاری نہ ہو۔ جب اس کے قبیلے کے بااثر افراد نے ایک معتبر فقیہ کا فتویٰ پیش کر دیا تو اس کے ہاتھ مناسب ترین بہانہ آگیا۔ اور وہ خوش ہو کر بولا۔

”میری طرف سے پوری جازت ہے۔ تم بے روک ٹوک بلے شاہؒ کی محافلِ سماع پر پابندی لگا دو۔ اس طرح نہ پر کوئی حرف نہیں آئے گا اور میں اپنی بہن، نواب خاتون کی گرفت سے محفوظ رہوں گا۔ شہر کے کسی بھی محلے سے آواز اٹھے تو صاف صاف کہہ دینا کہ تم ایک عالمِ دین کے حکم کے مطابق عمل کر رہے ہو۔“

قصور کے شریںد اپنی شاطرانہ چالوں کی کامیابیوں پر بہت خوش تھے۔ انہیں مذہب کے ساتھ ساتھ حاکمِ وقت کی بھی پناہ مل گئی تھی۔ اصولی طور پر تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ مفسدوں کا وہ گروہ حضرت بابا بلے شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا..... اور ایک صوفی کو ایک عالمِ دین کے فتویٰ سے باخبر کر کے اپنا یہ مطالبہ پیش کرتا کہ آئندہ کوئی محفلِ سماع منع نہ ہونے پائے۔ اس کے ساتھ ہی درویش کو یہ تسبیہ بھی کی جاسکتی تھی کہ فتویٰ کی خلاف ورزی کی صورت میں جہا

ہاں کروڑا جاسکتا ہے۔ مگر اخلاقی اور قانونی تقاضوں کی تکمیل تو وہاں کی جاتی ہے، جہاں لوگوں کے دل نفاق، حسد، کدورت اور کھٹ سے پاک ہوں۔ فتنہ پردازوں کے سینے تو کینہ سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ سب لوگ حضرت بابا بلے شاہ کے ڈیرے کے قریب جمع ہوئے اور محفل سماع کے انعقاد کا انتظار کرنے لگے۔

جب سابق اس روز بھی دُور دراز علاقوں سے کچھ مشہور قوال قصور آئے ہوئے تھے۔ آخر محفل سماع کا آغاز ہوا تو انوں کی دل نشیں آوازیں کر قرب و جوار کے لوگ جمع ہونے لگے..... یہاں تک کہ پورا ڈیرہ حاضرین سے بھریا۔

مگر جب محفل رنگ بر آگئی تو فتنہ پردازوں کا یہ گروہ ڈیرے کے اندر داخل ہوا۔ تاریخی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ مسلح تھا اور بعض کے پاس تیر و کمان بھی تھے۔ حضرت بابا بلے شاہ عارفانہ کلام کے معنی و آہنگ میں اس قدر مدہوش تھے کہ آپ کو فتنہ گردوں کے داخل ہونے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

شر پسندوں نے اتمام حجت کے بغیر ایک صوفی کی محفل سماع میں مداخلت کی اور داخل ہوتے ہی حاضرین کو مار پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی پوری محفل میں ان کی کردہ اور پُرشور آوازیں گونج رہی تھیں۔ ”اپنے اپنے گھروں کو بھاگ جاؤ اور آئندہ اس طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھنا..... سماع حرام ہے..... سماع ناچائز ہے..... مذہب میں جو بھی بدعت کا راستہ اختیار کرے گا، اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔“

فتنہ گردوں کے شور اور حاضرین کی چیخ و پکار سے حضرت بابا بلے شاہ ہوش میں آ گئے۔ پھر جب آپ نے آنکھیں کھل کر دیکھ کر یہ منظر دیکھا تو قصور کے شر پسندوں کو بلند آواز میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”لوگو! اللہ کے بندوں پر یہ ستم کیوں کرتے ہو؟ اس کے قہر سے ڈرو اور اس کے غضب کا نشانہ بننے سے بچو۔“ فتنہ پردازوں کی یہ جماعت ایک کمزور اور تنہا صوفی کی آواز کس طرح سختی؟ ان کے دلوں پر تو قفل لگائے جا چکے تھے، انھوں پر پرے ڈال دیئے گئے تھے اور سماعتوں میں بہرے پن کی میخیں ٹھونک دی گئی تھیں۔ دولت و انوار کے نئے میں بدست لوگ آگے بڑھتے رہے اور درمیان میں آنے والے ناتواں لوگوں کو پامال کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ مسلح شر پسند اس مسند تک پہنچ گئے، جہاں حضرت بابا بلے شاہ جلوہ افروز تھے۔

فتنہ پردازوں نے آگے بڑھ کر قوالوں کے حزامیر (ساز) توڑ ڈالے اور انہیں زد و کوب کرنے لگے۔ حضرت بابا بلے شاہ نے قوالوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ان کا کچھ تو خیال کرو..... یہ میرے بہان ہیں..... انہیں میں نے بلایا ہے۔“

شر پسند بیزبان کی دل آزاری کے لئے جمع ہوئے تھے تو پھر وہ مہمانوں کا کیا خیال کرتے۔ کچھ قوال تو مولیٰ چٹائیوں پر کھڑے ہو گئے اور کچھ زخموں سے چور ہو کر دوپٹے پر گر پڑے۔

تمام تاریخی روایتوں کے مطابق حضرت بابا بلے شاہ آخر تک اپنے مہمانوں کا دفاع کرتے رہے۔ ایک روایت سے تو یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ کسی شقی القلب حملہ آور نے حضرت بابا بلے شاہ کے سر مبارک کا ٹائپر کر تیر بھی چلا دیا تھا، جس کے نتیجے میں آپ کی دستار کا ایک پیچ کٹ گیا تھا۔

تاریخی حوالوں سے واضح طور پر تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کشمکش اور مزاحمت میں ایک پاکباز و جانناز صوفی پر باگزنی مکی، مگر ہنگامہ آزاری کی شدت دیکھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت بابا بلے شاہ بھی یقیناً زخمی ہوئے ہوں گے۔

آخر ایک مرد درویش کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے وقت کی دیوار پر لکھی ہوئی ترانہ افغانوں کو پڑھ کر سنا دی۔ حضرت بابا بلے شاہؒ نے نواب رانجھے خان کی حویلی کی طرف رخ کر کے فرمایا۔

کھر کاں چک جولاہے آئے

ہن کی کراں نی میریے ماے

(جلاہے اپنے کرگھے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ اے میری ماں اب میں کیا کروں؟) (ترجمہ)

کسی تذکرہ نویس نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ حضرت بابا بلے شاہؒ نے اپنے اس شعر میں کون سی مخاطب کیا تھا اور کس سے پوچھ رہے تھے کہ اب میں کیا کروں؟ حضرت بابا بلے شاہؒ کی حقیقی ماں تو انتقال کر چکی اور اپنے بیٹے سے بہت دور پانڈو کے گاؤں میں آسودہ خاک تھیں۔ کیا حضرت بابا بلے شاہؒ نے اس اذیت میں ان ہی کو آواز دی تھی؟ یا محاورے کے طور پر ”ماں“ کا لفظ استعمال کیا تھا؟

ان دونوں اندازوں سے قطع نظر ایک اندازہ یہ بھی ہے کہ قصور میں ان کی منہ بولی ماں، نواب خاتون تھیں اور جن کا تعلق نسلی طور پر ان ہی افغانوں سے تھا، جنہوں نے حضرت بابا بلے شاہؒ کی محفل سماں درہم برہم اور آپ کے دل کے ساتھ ساتھ جسم مبارک کو بھی جراثیم پہنچائی تھیں۔ ہمارے نزدیک قرین قیاس یہ ہے کہ حضرت بابا بلے شاہؒ نے اپنی منہ بولی ماں، نواب خاتون ہی کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔ ”جلاہے اپنے کرگھے لے آئے ہیں..... اے میری ماں! اب میں کیا کروں؟“

حضرت بابا بلے شاہؒ کا انداز مخاطب صرف ہمارے اندازہ قیاس ہی پر مبنی نہیں بلکہ اس کی ایک مغربوں دلیل بھی موجود ہے۔ نواب رانجھے خان کی بہن نواب خاتون، حضرت بابا بلے شاہؒ سے صرف عقیدت کی نگاہ سے نہیں بلکہ ایک طرح کی محبت بھی کرتی تھیں۔ انہیں ایک مرد درویش کا احترام ہی نہیں، سکون جسم و جال بھی تھا۔ اسی لئے وہ اپنے بھائی کو بھی سمجھاتی رہتی تھیں..... اور حتی المقدور اپنے قبیلے کے شر پسندوں کی سازشوں کا ناکام بناتی رہتی تھیں۔

اسی طرح حضرت بابا بلے شاہؒ بھی نواب خاتون کی بے حد عزت کرتے تھے۔ پھر جب ایک مرد درویشؒ سمجھانے کے باوجود قصور کے قند پر دواؤں کی جماعت اپنے ظالمانہ ارادوں سے باز نہیں آئی تو آپ نے انہیں کرب کے عالم میں وہ راز فاش کر دیا، جو گردش ایام کے سینے میں پوشیدہ تھا۔

حضرت بابا بلے شاہؒ نے ”فراست مومن“ کے ذریعے ان نادیدہ ہاتھوں کو دکھ لیا تھا، جو قصور کے انوار میں مستقبل لکھ رہے تھے۔ وقت کی دیوار پر لکھی جانے والی تحریر ایک بھیا تک انجام کی طرف نشاندہی کر رہی تھی کہ پڑھ کر حضرت بابا بلے شاہؒ اذیت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اور اس اذیت کی خاص وجہ یہ تھی کہ باقیبھی نے آپ جس قوم کے انجام کے بارے میں خبر دی تھی، نواب خاتون کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا..... اسی لئے حضرت بابا بلے شاہؒ نے بے قرار ہو کر فرمایا تھا۔

”اے میری ماں! اب میں کیا کروں؟ یہ قدرت کا فیصلہ ہے، جسے تمام جن و انس مل کر بھی تبدیل نہیں

کے۔“

شر پسند اپنے منصوبوں اور ارادوں کی کامیابی پر بے حد خوش تھے۔ حضرت بابا بلے شاہؒ کا ذریعہ ویران ہو گا تو چند عقیدت مند ڈرتے ڈرتے آتے اور آپ کا درس سن کر خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ قوالوں نے قصور کی لڑا آنا بند کر دیا تھا کہ انہیں اپنی جانوں کا خطرہ تھا۔ ساز خاموش تھے اور قصور کی فضاؤں پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔

اُنکی آواز نہیں ابھرتی تھی، جس میں عارفانہ کلام کی مہک موجود ہو۔ کبھی کبھی حضرت بابا بلھے شاہؒ پر جذب کی کیفیت طاری ہوتی تو خود ہی اپنا کلام پڑھ کر جھومنے لگتے۔

آزادک انقلاب عظیم نے اس سکوت کو توڑ ڈالا۔ قصور کی طرف آنے والے راستوں سے بڑا گرد و غبار اٹھا۔ لوگوں کی باپوں کا شور سنائی دیا اور پھر وہ طاقتور شہسوار نمودار ہوئے، جنہوں نے قصور کے افغانوں کی ساری باگمیں چھین لیں۔ کسی تذکرے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون لوگ تھے؟ اور اس سیاسی انقلاب کی وجہ کیا کی گئی تھی؟ دالوں نے بس اتنا لکھا ہے کہ جویلیاں نیلام ہو گئیں..... سونے چاندی کے ذخیرے چھین لئے گئے..... اور بحرِ قیلے کے تکبر و مغرور افراد نے اپنے شکم کی آگ بجھانے کے لئے ”کھڈیاں“ لگا لیں اور کپڑا بٹنے لگے۔ ہر جب اسی کپڑے کو فروخت کرنے کے لئے وہ دیہات کے بازاروں کا رخ کرتے اور گلی گلی صدائیں لگاتے تو فسر کے باشندوں کو حضرت بابا بلھے شاہؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ یاد آتے۔

”جاے اپنے گھر گئے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ اے میری ماں! اب میں کیا کروں؟“
بدلتھ تقریباً تین سو سال پہلے پیش آیا تھا۔ قصور کے ان افغانوں کی اولاد آج بھی کھڈیاں چلاتی ہے۔



ایک مرد درویش کی دل آزاری آخر رنگ لائی اور قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے قصور کے نوابوں کے سروں پر ناز کھلا ہی چھین لیا اور ان کے تکبر کی ساری علامتوں کو خاک میں ملا دیا۔ قرآن کریم کی ایک آیت نور کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

”وہ دن جب اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا۔“

ظاہر یہ آیت مقدسہ، قیامت کے ہولناک دن کی نشاندہی کرتی ہے مگر حق تعالیٰ نے اپنے دوستوں (اولیاء) سے وعدہ فرمایا ہے، اس کا اطلاق ہر زمانے پر ہو گا یہ اسی مقدس وعدے کا نتیجہ تھا کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ ہر خوف اور غم سے محفوظ رہے۔ ظلم اور تکبر کے جن لمبے ہاتھوں نے ایک صوبہ کی محفلِ سماع کو درہم برہم کیا تھا، اللہ نے ان ہاتھوں سے زمامِ اقتدار چھین کر کپڑا بننے کی کھڈیاں دے دیں تاکہ شر پسندوں کو ان کی بد اعمالی کے صلے میں اذیت کی بچھڑ اور دیکھنے والوں کو عبرت بھی حاصل ہو۔

اس واقعے میں اہلِ اہل دنیا کے لئے بڑے سبق اور بڑی نشانیاں ہیں۔ مرد درویش کی محفلِ سماع دوبارہ آراستہ ہو گئی اور درویش کو بے توقیر کرنے والوں کے گھر ایسے آجڑے کہ چمکا دڑوں اور اُلوؤں کا مسکن بن گئے۔ دُور دُور سے ہزاروں سال، حضرت بابا بلھے شاہؒ کے ڈیرے پر حاضر ہوتے اور پھر قصور کی فضائیں عارفانہ کلام سے گونجنے لگتیں..... ہمارے درویش آ جاتے اور درخت جھوم اٹھتے۔

مگر وہ دن بھی بڑا عجیب تھا، جب حضرت بابا بلھے شاہؒ سماع سن رہے تھے اور آپ کے مرید خاص، حافظ جمال صاحبؒ نے آکر اطلاع دی۔

”آپ کے استاد محترم، مولانا غلام مرتضیٰ صاحب تشریف لائے ہیں۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے استاد گرامی کی آمد کی خبر سن کر قوالوں کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور خود ڈیرے (ٹانڈہ) کے دروازے پر تشریف لا کر مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کا استقبال کیا۔ پھر آپ نے استاد گرامی کو اپنی مسندِ عالی پر بٹھایا اور خود بائیں جانب بیٹھ گئے۔

”میرے اللہ! ایک فقیر کی نظر میں سماع نا جائز ہے۔ اور نا جائز شے کبھی جائز نہیں ہو سکتی۔“ مولانا غلام مرتضیٰ

صاحب نے اپنے شاگرد، حضرت بابا بلھے شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میری دلی خواہش تھی کہ تم فقیر بنے۔۔۔۔۔ مگر تم نے صوفیاء کی روش اختیار کی۔ اب سوال و جواب کا وقت گزر گیا۔ اور تم جو بننا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ میں نے لوگوں میں تمہاری شاعری کی بہت شہرت سنی ہے۔۔۔۔۔ آج اسی لئے تمہارے ڈیرے پر آیا ہوں۔ تمہارا کلام سنوں۔“

حضرت بابا بلھے شاہ نے عقیدت سے سر جھکا دیا اور پھر استاد گرامی کی فرمائش پر اپنی یہ مشہور کافی، لحن کے سنائی۔

الف اللہ نال رتا دل میرا
میںون ”ب“ دی خبر نہ کائی

”میرا دل“ ”الف“ یعنی وحدت سے بھرا ہوا ہے۔۔۔۔۔ مجھے ”ب“ یعنی دوسرے حرف کی ضرورت نہیں۔“ اور مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے اپنے شاگرد حضرت بابا بلھے شاہ کے اس عارفانہ کلام کو بے حد پسند فرمایا اور کیا جا سکتا ہے کہ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے حضرت بابا بلھے شاہ کا یہ عارفانہ کلام، مزامیر (سازوں) کے گونج ہو گا کہ ایک فقیہہ کا دینی منصب یہی ہوتا ہے۔

بعض غیر معتبر روایات کے مطابق مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے حضرت بابا بلھے شاہ کے ڈیرے پر بارگاہِ سماع میں شرکت کی تھی اور اسی موقع پر اپنے شاگرد کی صوفیانہ شاعری کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ بالفرض اگر ہم اس روایت کو تاریخی حقائق کی روشنی میں درست تسلیم کر لیتے ہیں تو مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ عہدہ و منصب مجروح ہوتا ہے اور ایک فقیہہ کی عالمانہ شان باقی نہیں رہتی۔ یہ واقعہ اسی صورت میں قابلِ قبول ہے کہ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے صرف حضرت بابا بلھے شاہ کے صوفیانہ کلام کی سماعت کی ہو۔

ایک اور روایت کے مطابق کہ جب مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کو حضرت بابا بلھے شاہ کی صداقت کا یقین ہو گیا وہ اپنے شاگرد کے پاس معذرت طلبی کے لئے آئے اور آپ سے آپ کا عارفانہ کلام اور کافیاں سنیں اور پھر استاد شاگرد کا ملاپ ہو گیا۔ اور مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ، حضرت بابا بلھے شاہ کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔ اس روایت میں بھی کئی متنازع باتوں کا نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

راوی کے مطابق جب مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کو صداقت و حقیقت کا علم ہوا تو وہ معذرت کرنے کے لئے حضرت بابا بلھے شاہ کے ڈیرے (خانقاہ) پر پہنچے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کس بات کی معذرت؟ کیا ایک فقیہہ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس نے سماع کے خلاف فتویٰ کیوں دیا تھا؟ معذرت کا مفہوم یہ بھی ہوتا ہے کہ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے فتویٰ واپس لے لیا تھا۔ بلاشبہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض معاشرتی امور میں تفصیلات بیان کرتے وقت سائل سے کوئی خاص نکتہ چھوٹ جاتا ہے، جس کی وجہ سے منطقی طور پر مسئلہ کو غیر شرعی قرار دے دیتا ہے۔ اور جب سائل کو بھولا ہوا وہ مخصوص نکتہ یاد آ جاتا ہے تو مفتی سے دوبارہ مسئلہ کرنے میں پہلا فتویٰ تبدیل ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس حضرت بابا بلھے شاہ کے سماع کا مسئلہ کوئی عام گھریلو مسئلہ نہیں تھا کہ اس میں کوئی خاص کھوجا کرنے سے رہ گیا ہو۔ اور جب وہ نکتہ، مولانا غلام مرتضیٰ کے سامنے بیان کیا گیا ہو تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ اس پر معذرت کرنے کے لئے حضرت بابا بلھے شاہ کی خانقاہ میں تشریف لے گئے ہوں۔ سماع، دین اسلام کا ایک معروف شرعی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے میں کسی خاص نکتے کے پوشیدہ رہ جانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پھر

مقام مرتضیٰ صاحب اپنے شاگرد، حضرت بابا بلھے شاہؒ سے کس بات کی معذرت کرنے گئے تھے؟ معذرت تو کسی لڑکی یا غلطی پر کی جاتی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ روایت بنیادی طور پر غلط ہے یا پھر مصنف سے روایت تحریر کرتے وقت سہواً کوئی غلطی ہو گئی ہو اور الفاظ کے معمولی الٹ پھیر سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو گیا ہو۔

مولانا غلام مرتضیٰ صاحب کے عالمانہ مقام کو پیش نظر رکھتے ہوئے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ایک مذہبی عالم اپنے شاگرد کے پاس معذرت طلب کرنے کے لئے ہرگز نہیں گیا تھا چونکہ اہالیانِ قصور نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی مجلس کو بارہم برہم کرنے کے لئے جبر و تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس کشاکش میں حضرت بابا بلھے شاہؒ زخمی ہو گئے تھے۔ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ اپنی جگہ سمجھتے تھے کہ حاکمِ قصور کی معمولی مداخلت سے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی مجلس آراستہ کرنا بند کر دیں گے۔ غلام مرتضیٰ صاحبؒ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ قصور کے شریعت پرستوں کی آڑ میں ہنگامہ آرائی کر کے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو جسمانی اذیت بھی پہنچائیں گے۔ سماع کے حوالے سے مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ اور حضرت بابا بلھے شاہؒ میں نظریاتی اختلاف ضرور تھا، مگر اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں تھا کہ ایک عالم کو، دلی طور پر اپنے شاگرد سے کسی قسم کی کدورت رکھنا تھا۔ نتیجتاً جب مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کو یہ خبر ملی کہ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو زد و کوب کیا ہے تو ایک درد مند اور صاحبِ دل استاد بے قرار ہو کر اپنے شاگرد کے ڈیرے پر پہنچا اور حضرت بابا بلھے شاہؒ سے اس واقعے پر شدید افسوس کا اظہار کیا۔ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کے اسی اظہارِ افسوس کو بعض غیر ذمے دار راویوں نے ”اظہارِ معذرت“ سے تعبیر کیا۔ ایک عالم دین کو باوجود انہیں تھا کہ جہالت اور سرکشی میں ڈوبے ہوئے یہ لوگ ان کے فتوے کو بنیاد بنا کر حضرت بابا بلھے شاہؒ پر مشق کریں گے۔ اسی لئے جب مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کو فسادِ یوں کی شرانگیز منصوبہ بندی کا علم ہوا تو آپ اپنے گردنِ تالیفِ قلب کے لئے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خانقاہ میں تشریف لے گئے اور یہی وہ موقع ہے جب ایک عالم اپنے شاگرد سے اس کے اشعار سننے کی خواہش ظاہر کی۔ واضح رہے کہ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کی یہ خواہش بے سبب نہیں تھی۔ مولانا جانا چاہتے تھے کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ خود کس قسم کی شاعری کرتے ہیں؟ اور کس ذائقے کے شاعر ہیں۔

بالکل ظاہر جانتے ہیں کہ برصغیرِ پاک و ہند میں پہلے مجلسِ سماع آراستہ ہوئی اور صرف عظیم صوفیاء اس سے رغبت کرتے تھے۔ ہر وقت گزرنے اور روحانی زوال کے ساتھ ساتھ مجلسِ سماع، قوالیوں کی محفل میں تبدیل ہو گئی۔ کم و بے کے صوفی بڑی شدت کے ساتھ اس کی طرف راغب ہوئے۔ آخر میں یہ صورت نمودار ہوئی کہ ”سماع“ کے نام پر عام دھم، قوالی سننے لگا اور ایسی محفلوں میں اس قسم کی نعیتیں بھی پڑھی جانے لگیں۔

اللہ کے پلاڑے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے، لے لوں گا محمدؐ سے

قدیم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس قسم کے اشعار سے ہم حبِ رسول ﷺ کا اظہار کر رہے ہیں یا پھر پیغمبرِ اسلامؐ کی مبالغہ افراطی کو دھت دے رہے ہیں؟

حضرت بابا بلھے شاہؒ کے دور میں اور ان کے زمانے سے پہلے بھی بعض صوفیاء نے جذب و کیف کی حالت میں لہو لہو کے اشعار یا باتیں کہی ہیں، جنہیں سن کر ایک عام مسلمان خوفِ ناک تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کے طور پر مشہور صوفی بزرگ منصور حلاجؒ کے نعرہ انا الحق (میں حق ہوں) کو ہزاروں شعراء نے اپنے اشعار میں

استعمال کیا۔ یہ غیر شرعی رسم آج بھی جاری ہے اور لاتعداد شاعر دانستہ یا اپنے جہل کے سبب ”نالائق“ کے اپنے شعروں میں نظم کر رہے ہیں۔

مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ ایک عالم دین اور فقیہ تھے۔ اس لئے ”سورہ شعراء“ کی آیات نمبر 227 کے مفہوم سے باخبر تھے۔ حق تعالیٰ نے اپنے کلام مقدس میں شاعروں کی اکثریت کے بارے میں فرمایا ہے۔

”اور رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں (یعنی شاعروں کی تقلید گمراہ لوگ ہیں) کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ (شاعر) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں، جن پر غور کرتے سوائے ان لوگوں (شاعروں) کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اور اللہ کو کثرت کیا۔“ ان آیات الہی کی روشنی میں شاعروں کی اکثریت گمراہ ہے اور ان کے خیالات کی پیروی کرنے والے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

جب یہ الم ناک واقعہ پیش آیا، اس وقت حضرت بابا بلھے شاہؒ کی کافیاں شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نے اپنے شاگرد سے اس کا کلام سننے کی فرمائش کی۔ ایک شیخؒ اور دردمند استادؒ تھاکہ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے محتاط روش اختیار کی ہے یا وہ غیر محتاط صوفیوں کے راستے پر چل پڑے ہیں؟ پھر جب حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اپنا عارفانہ کلام، استادِ گرامی کی خدمت میں پیش کیا اور مولانا غلام صاحبؒ نے اسے ”وحدانیت پرستی“ کے جذبات سے سرشار پایا تو اسے بے حد پسند کیا اور اپنے شاگرد کے تخیلات کی بہت تعریف کی۔

اس روایت کا ایک نمایاں حصہ یہ بھی ہے کہ اس طرح استاد اور شاگرد کا ملاپ ہو گیا۔ ان الفاظ سے ہے کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ اور مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ میں سماع کے حوالے سے یا پھر کسی دوسرے مسئلے پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور پھر بابت ترک تعلق تک پہنچ گئی تھی۔ ہم مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ کے مزاج کے بارے میں تو پورے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے بہت کم حالات کتابوں میں ملتے ہیں۔ مگر حضرت شاہؒ کی یہ عادت نہیں تھی کہ وہ اپنے استادِ گرامی سے ترک مراسم کرتے۔ آئندہ آنے والے واقعات سے پتہ چائے گا کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ عشق کی حد تک اپنے استادؒ کو چاہتے تھے اور حقیقی عاشق کا یہ مزاج نہیں ہوتا۔ اپنے محبوب کے در سے خفا ہو کر اٹھ جائے۔ عاشق کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ اگر محبوب اسے اپنی بارگاہِ ناز سے دے تو وہ دروازے پر آکر پڑ جاتا ہے۔ اور اگر اسے دروازے سے بھی ہٹا دیا جائے تو پھر محبوب کی گلیل رہتا ہے..... حضرت بابا بلھے شاہؒ کا بھی یہی مزاج تھا۔



اس دوران وہ واقعہ بھی پیش آیا، جس نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کے دل کی دنیا زیر و زبر کر ڈالی اور انہیں عشق میں پھونک ڈالا۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے داماد اور حقیقی بھتیجے مولوی ظہور محمد کسی کام سے قصور تشریف لے گئے۔ صاحب نے اپنے میزبان کے ہاتھ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی خدمت میں پیغام بھیجا۔ ”میں قصور آیا ہوں اور ملاقات کا مشتاق ہوں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ پیغام سن کر بہت خوش ہوئے اور آپ نے جوابی پیغام میں ”آپ کی ذات مبارک سے مجھے اپنے مرشد کی خوشبو آتی ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ قصور

انہی میں ایک نہایت ضروری کام میں مصروف ہوں۔ اس سے فارغ ہوتے ہی دیدار کے لئے حاضر ہوں گا۔“
اس کے ساتھ ہی اپنے ایک خدمت گار درویش کو یہ ہدایت دے کر پیغام رساں شخص کے ساتھ کر دیا کہ مولوی ظہور صاحب کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔

ضروری کام یہ تھا کہ جس دن مولوی ظہور محمد صاحب، قصور تشریف لائے، اتفاق سے اسی روز غلام مرتضیٰ صاحب کی صاحبزادی کا نکاح تھا۔ خطیب و امام ہونے کے باعث مقامی معززین اور گرد و نواح کے ذی حیثیت شخصوں کی قریب میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ مولانا غلام مرتضیٰ صاحب نے حضرت بابا بلھے شاہ کو بہانہ کی خدمت اور تواضع پر مامور کر دیا۔

لانے کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ نماز عشاء کے بعد نکاح کی رسم ادا ہوئی، اس کے بعد مہمانوں کی ضیافت اٹھ ہوئی اور کچھ گیارہ بجے تک کھانا جاری رہا۔ حضرت بابا بلھے شاہ سارے انتظامات کے نگران تھے، اس لئے آپ ایک لمحے کی فرصت بھی میسر نہ آ سکی۔

اگر راتوں کے مطابق حضرت بابا بلھے شاہ ساری رات انتظامات میں مصروف رہے اور مولوی ظہور محمد صاحب سے بوقت ملاقات نہ کر سکے۔

لیکن روایت کے مطابق مولوی صاحب رات بھر جاگ کر حضرت بابا بلھے شاہ کا انتظار کرتے رہے۔ مگر جب آپ تک تشریف نہیں لائے تو حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے داماد، ظہور محمد صاحب شدید ناراضی کی حالت میں غمزدار کرتے ہی لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔

دوسری روایت کے مطابق حضرت بابا بلھے شاہ رات کے آخری حصے میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے تو بہت کراں شخص کے مکان پر تشریف نہیں لے گئے کہ میزبان اور مہمان دونوں سو گئے ہوں گے۔ بے وقت کسی کو غمزدار کر دینا، درویش کا مسلک نہیں ہوتا۔ اسی احساس کے پیش نظر حضرت بابا بلھے شاہ رات کے باقی حصے میں بے پروا ہو کر نماز فجر ادا کرنے کے بعد مولوی ظہور محمد صاحب سے ملنے کے لئے پہنچے تو معزز مہمان ان سے خفا ہو کر جاکھانا اور حضرت بابا بلھے شاہ کو یہ خبر بھی نہ ہو سکی کہ مولوی ظہور محمد صاحب اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟



اصلی طور پر مولوی ظہور محمد صاحب کو اتنا جلد باز اور تنگ مزاج نہیں ہونا چاہئے تھا کہ وہ اتنے بڑے بزرگ کے داماد بھی تھے اور صاحبِ علم بھی۔ انہیں حضرت بابا بلھے شاہ کا مزید انتظار کرنا چاہئے تھا کہ صورت حال کتنی ہو جاتی۔ یہ وہ سوالات ہیں، جو عام ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں مگر تاریخی کتابوں میں یہ واقعہ اسی طرح درج ہے۔ مولوی ظہور محمد صاحب نے نہایت عجلت سے کام لیا اور لاہور پہنچ کر اپنے مرشد اور خسر محترم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

داماد کو اپنے سامنے پا کر حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے نہایت پُرشوق لہجے میں پوچھا۔ ”میرا بلھا کیسا ہے؟“
”اب وہ آپ کا بلھا نہیں رہا۔“ مولوی ظہور محمد نے ناگوار لہجے میں کہا۔

”دو میرا تھا اور میرا ہی رہے گا۔“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

”اگر وہ آپ کے ہوتے تو آپ کے داماد سے اس طرح بے رُخی اختیار نہ کرتے۔“ مولوی ظہور محمد صاحب نے زبردستی آمیزی کرتے ہوئے کہا۔

”وہ اتنے بڑے درویش ہو گئے ہیں کہ انہوں نے مجھ سے ملنا کسرِ شان سمجھا۔ میں نے ملاقات کے لئے

درخواست کی، مجھ سے وعدہ بھی کر لیا، ساری رات انتظار کرایا مگر ملنے نہیں آئے۔ اس طرح وہ اپنی لائے دکھانا چاہتے تھے تاکہ میں بار بار التجا کروں، پھر کہیں جا کر وہ مجھے شرف باریابی بخشیں۔“ مولانا ظہور محمد اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا۔

واضح رہے کہ حضرت شاہ عنایت قادریؒ اپنے تمام مریدوں میں حضرت بابا بلھے شاہؒ کو سب سے رکھتے تھے۔ تمام روایتوں کے مطابق مولوی ظہور محمد صاحب کی زبانی یہ واقعات سن کر پیر دمر شاہ کا رنگ ہلکا ہوا اور حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ولایت سلب کر لی۔

بعض کتابوں میں یہ واقعہ دوسرے انداز سے تحریر کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق مولوی ظہور محمد صاحب نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کے ڈیرے پر ہی آکر ٹھہرے تھے۔ جب حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے اپنے مرید کو سلب کی تو حضرت بابا بلھے شاہؒ کو فوراً احساس ہو گیا کہ ان کا دامن مرشد کے فیض سے خالی ہو چکا ہے۔ چنانچہ شادی کے کام دھندوں کو چھوڑا اور اپنے ڈیرے پر آئے۔ پھر تمام درویشوں کو جمع کیا اور سلطان احمد ہوئے کہ مہمان کو جانے سے کیوں نہ روکا؟

سلطان احمد مستانہؒ نے عرض کیا۔ ”مولوی ظہور محمد صاحب، نور کے ترکے ہی کسی کو خریدے بغیر چلے حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اپنے ڈیرے کا انتظام، سلطان احمد مستانہؒ کے سپرد کیا اور کچھ عرصے کے خیر باد کہہ دیا۔

یہ عبارت ”اولیائے پاکستان“ سے ماخوذ ہے۔ اور ہم نے اسے حرف بہ حرف نقل کر دیا ہے۔ اس مصنف علامہ عالم تقری ہیں۔ قارئین اس عبارت کی بے ربطی اور تضادات ملاحظہ فرمائیں۔

قصور اور لاہور کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ مولوی ظہور محمد صاحب ابھی راستے ہی میں ہوں کہ عنایت قادری شطاریؒ نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ولایت سلب کر لی اور حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنے استاد کی شادی کے انتظامات چھوڑ کر ڈیرے پر چلے آئے اور پھر قصور سے باہر تشریف لے گئے۔ آخر ان زمانہ میں کیا ربط ہے؟

اس عبارت کو نقل کرنے سے ہمارا ایک ہی مقصد ہے کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے حوالے سے بعض سلسلے میں برائے نام بھی تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اسی لئے صوفیاء کی تاریخ پڑھنے والوں کو شدید ڈنک آتی ہے اور ان کے ذہن اس سوال میں الجھ کر رہ جاتے ہیں کہ کیا غلط ہے اور کیا درست.....؟ اب ہم حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی شدید ناراضی کا جائزہ لیں گے کہ تاریخی اعتبار سے انسانی حیثیت ہے؟

ایک صحابی جہاد میں حصہ لینا چاہتے تھے، مگر کاروباری مصروفیت کی وجہ سے وہ بروقت مجاہدین کے شریک نہ ہو سکے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کے اس عمل پر انتہائی ناراضی کا اظہار فرمایا اور ان سے بات کر دی۔ یہاں تک کہ مذکورہ صحابی کے اہل خانہ اور تمام مسلمانوں کے لئے بھی حکم صادر فرمایا کہ کوئی بھی جہاد سے گفتگو نہ کرے۔ آخر وہ پورے اسلامی معاشرے میں تنہا رہ گئے۔ جدھر بھی جاتے تھے، اہل انکار کر منہ پھیر لیا کرتے تھے۔ وہ صحابی اپنی اس غلطی پر تنہائی میں بہت روتے اور توبہ و استغفار کرتے۔ گزرنے کے بعد سرکارِ دو عالم ﷺ کو وحی کے ذریعے خبر دی گئی کہ ان کی نیت درست تھی، وہ صرف شکار ہوئے۔ اس کے بعد سرورِ کونین ﷺ نے ان صحابی کو معاف فرمایا۔

نصوف کی تاریخ میں بھی ایسی کئی مشہور مثالیں موجود ہیں۔ ایک بار حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شمس، علامہ غلام الدین اولیاء سے ایک معمولی بات پر خفا ہو گئے تھے اور اپنے خلیفہ اکبر سے بات کرنا بند کر دی تھی۔ علامہ محبوب الہی اس واقعے سے اتنے دلبرداشتہ ہوئے تھے کہ ایک دن آپ نے خود کو ہلاک کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔

اسی طرح حضرت شاہ عنایت قادریؒ بھی حضرت بابا بلھے شاہؒ سے خفا ہو گئے تھے۔ یہ ناراضی اس لئے نہیں تھی کہ علامہ بابا بلھے شاہؒ نے پیر و مرشد کے داماد کی پذیرائی نہیں کی تھی۔ حضرت شاہ عنایت قادریؒ اپنے مرید خاص سے ان لئے خفا ہوئے تھے کہ ان کا محبوب مرید، غرور و کبر کی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اگرچہ حقیقت حال یوں نہیں تھی، لیکن مولوی ظہور محمد صاحب نے غلط بیانی سے کام لیا اور حضرت شاہ عنایت قادریؒ کو اس ہستی سے بدگمان کر دیا، جسے اب سے زیادہ چاہتے تھے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ذات گرامی میں غرور و کبر کا شاید تک نہیں تھا۔ اگر اس واقعے کا مزہ بانٹ لیا جائے تو خود مولوی ظہور محمد صاحب اس مرض میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ انہوں نے ایک درویش کی لبرائی کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا اور ایک عالم ہوتے ہوئے بھی بدگمانی سے کام لیا۔

اس واقعے کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ پانڈو کے بھٹی کے چوہدریوں، نصوروں کے نوابوں سے لے کر علمائے ظاہر کی حضرت بابا بلھے شاہؒ انسانی حسد کا شکار تھے اور اسی حسد نے حضرت شاہ عنایت قادریؒ اور آپ کے درمیان پہلوں کی طویل خلیج حائل کر دی تھی۔

ہم اس جاں گداز واقعہ کے سلسلے میں تضاد بیانیوں اور تذکرہ نویسوں کی غیر ذمے داریوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ جہاں تک ولایت سلب کرنے کی بات ہے تو تصوف کی پوری تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ دنیاوی علم کے حوالے سے بھی ایسے بہت سے واقعات نظر آتے ہیں۔ جب ایک استاد اپنے شاگرد سے خفا ہو کر اسے اپنی درس گاہ سے اٹھا دیتا ہے۔ پھر یہ ناراضی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ استاد و شاگرد کی رشتہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ گروہ علم سلب نہیں ہوتا جو استاد نے شاگرد کو منتقل کیا تھا۔ البتہ تعلقات ختم کرنے کے باعث اس علم کی ترویج و ترقی رک جاتی ہے۔

روحانیت کا سلسلہ اس کے برعکس ہے۔ اس مسلک میں مرشد کی خوشنودی اور رضا ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ اور احرام و ادب ہی سارے اعمال کی بنیاد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سرور کونین رحمہ اللہ کے حوالے سے قرآن حکیم لیا ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

اے ایمان والو! اپنی آوازیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مبارک سے پست رکھا کرو۔ ورنہ تمہیں خبر بھی نہیں ہوگی اور تمہارے زندگی بھر کے اعمال صالحہ برباد ہو جائیں گے۔

یہ آیت مقدسہ اس حوالے سے نازل ہوئی تھی کہ جب رسول کریم ﷺ اپنی مجلس نور میں جلوہ افروز ہوتے تھے، اس وقت بعض صحابہ، عام محفلوں کی طرح اونچی آوازیں میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ نتیجتاً اللہ کی طرف سے قیامت تک کے لئے تمام لوگوں کو سخت تنبیہ کی گئی اور انہیں بتایا گیا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا احترام ہی سب کچھ ہے۔ اگر وہ اپنی آواز بغیر ﷺ کی آواز سے بلند رکھتے ہیں تو ان کے اعمال صالحہ کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

پھر یہی آیت الہی اور احرام رسول ﷺ، تصوف کی بنیاد بنے۔ مشہور صوفی بزرگ منصور صلاح، عظیم و جلیل عارف حضرت سیدنا جنید بغدادیؒ کے مرید تھے۔ پھر آپ علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کے لئے دنیا بھر کے علمی مراکز میں تشریف لے گئے۔ اس کے بعد دوبارہ اپنے پیر و مرشد

حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔ ایک دن حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کی مجلسِ انوارِ منصور حلاجؒ نے اپنے پیر و مرشد سے بعض مسائل کے سلسلے میں کچھ سوالات کئے۔ مگر سوالات کا انداز یہ جیسے منصور حلاجؒ، حضرت شیخ جنید بغدادیؒ اور دیگر اہل مجلس پر اپنی علمی برتری ظاہر کرنا چاہتے ہوں۔
الغرض منصور حلاجؒ کے سوالات سن کر ”سید الطائفہ“ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ نے اپنے مرید سے فرمایا: ”منصور! تم میری مجلس میں مسائل بن کر آئے ہو یا میرے علم کا امتحان لینے؟“

روایت ہے کہ یہ بات کہتے ہوئے حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے چہرہ مبارک سے ناگواری کا رنگ چمک اٹھا۔ منصور حلاجؒ نے پیر و مرشد کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چاہتے تو اس تکبر کو صاف کر کے پیر و مرشد کے ذہن و دل میں وقتی طور پر پیدا ہو گیا تھا۔ مگر منصور حلاجؒ نے اس کی زحمت گوارا نہیں کی اور اسے اٹھ کر چلے گئے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے منصور حلاجؒ کے اس طرزِ عمل کو غرورِ علم اور سرکشی سے تعبیر کیا ہے۔ بظاہر حضرت شیخ جنید بغدادیؒ نے اہل مجلس کے سامنے منصور حلاجؒ کے خلاف کچھ نہیں فرمایا مگر ایک بھری محفل میں اپنے پیر و مرشد کی دل آزاری کی۔ اور منصور حلاجؒ بے نیازانہ اٹھ کر چلے گئے۔ پھر اہل زمانہ کہ منصور ایک بار مجلسِ شیخ سے اٹھے تو پھر زندگی بھر کسی جگہ سکون سے نہیں بیٹھ سکے۔ یہاں تک کہ شدید لاشعور بعد انہیں دار پر پہنچ دیا گیا۔

ہم نے روحانی طاقت سلب ہو جانے کے حوالے سے تاریخِ تصوف کا مشہور ترین واقعہ پیش کیا ہے۔ اور بے شمار واقعات موجود ہیں، جب مرشد نے اپنے مرید سے خفا ہو کر اس کی ولایت (روحانی طاقت) سلب کی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا تھا۔ عام لوگ کہتے ہیں کہ حضرت شاہ عنایتؒ کا قصداً اپنے مرید کی ولایت سلب کر لی۔ مگر جو لوگ تصوف کی حقیقت سے واقف ہیں، وہ یہ راز جانتے ہیں کہ کسی عمل سے مرشد کو شدید اذیت پہنچتی ہے تو مرید کی ولایت خود بخود سلب ہو جاتی ہے۔ روحانیت کا عجیب نظام ہے۔ ایک صوفی زندگی بھر ریاضت کرتا ہے، مگر اسے ولایت نصیب نہیں ہوتی۔ دوسرا صوفی اس کی میں چند روز بسر کرتا ہے اور ولایت کی اعلیٰ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

خدا کی دین کا مویٰ سے پوچھئے احوال

کہ آگ لینے کو جائیں، پیسیر مل جائے

جس طرح اچانک یہ نعمتِ عظیم حاصل ہوتی ہے، اسی طرح یکایک چھن بھی جاتی ہے۔ ان تاریخی حقائق کی روشنی میں حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ولایت اُن کے پیر و مرشد حضرت شاہ عنایتؒ قادری شطاریؒ نے نہیں چھنی تھی۔ روحانیت کے ایک خاص قانون کے تحت سلب ہو گئی تھی۔ اور اس کی بنیادی وجہ پیر و مرشد کی دل آزاری تھی۔ حضرت شاہ عنایتؒ قادریؒ کی دل آزاری کے دو اسباب تھے۔ پہلا یہ کہ ان کے داماد، بھتیجے اور مرید نے حضرت شاہ عنایتؒ قادریؒ کو یہ اطلاع دی تھی کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے بہت زیادہ غرور میں ہیں۔ اور مولوی ظہور محمد صاحب نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے دلیل یہ پیش کی کہ اسی غرور کی وجہ سے حضرت بابا بلھے شاہؒ نے ان سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا۔

غرور اور درویشی میں وہی ضد ہے، جو زمین اور آسمان کے فاصلوں کے درمیان ہے۔ جس طرح یہ دونوں نہیں مل سکتے، اسی طرح ”تکبر اور درویشی“ ایک دل کے اندر جمع نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی انسان صوفی کا شاگرد یا مرید بنتا ہے تو اسے پہلا سبق یہی دیا جاتا ہے کہ شدید تیر یا ریاستوں کے سہارے نفس کی ہر گنجائش

جائے اور انسان کو اپنے لاشعور تک ”انانیت“ کو کھرچ کر باہر نکال دیا جائے۔ کیونکہ۔

تکبر عزازیل را خوار کرد

”کبر عزازیل کو ذلیل و رسوا کر دیا۔“ (ترجمہ) عزازیل، شیطان کا اصلی نام ہے۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے

اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

جب حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کے غرور و تکبر کے مظاہرے کے بارے میں سنا تو آپ

آؤدایت پہنچی۔

دوسرا سبب بھی پہلے سبب سے مربوط ہے اور دراصل اسی کا حصہ ہے۔ مولوی ظہور محمد صاحب و حضرت شاہ نیت قادریؒ سے تین نسبتیں حاصل تھیں۔ اسی لئے وہ خود کو اہم ترین شخصیت سمجھتے تھے۔ اور فطری طور پر انہیں ایسا لگنا ہی چاہئے تھا۔

دوسری طرف حضرت شاہ عنایت قادریؒ کو حضرت بابا بلھے شاہؒ کے اُس عشق پر ناز تھا، جو وہ اپنے پیر و مرشد سے لے کر۔ پھر جب اس عشق کا عملی مظاہرہ نہ ہو سکا تو حضرت شاہ عنایت قادریؒ کو شدید قلبی اذیت پہنچی اور حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ولایت سلب ہو گئی۔

اب ہم اس روایت کے دوسرے پہلو پر غور کریں گے کہ مولوی ظہور محمد صاحب کی زبانی یہ واقعہ سن کر حضرت شاہ نیت قادریؒ حالتِ جلال میں آگئے تھے۔ اور آپ نے قصد اپنے مرید خاص کی ولایت اور تمام کمالات روحانی بل کر لئے تھے۔

روایتوں میں یہ بھی درج ہے کہ مولوی ظہور محمد صاحب کے لاہور جانے کے بعد حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنے اہل بیت پر خدمت گاروں کے درمیان تشریف فرما تھے کہ اچانک آپ کو اپنی ذات میں ایک عجیب تغیر اور انقلاب کا احساس ہوا۔ پھر یوں لگا کہ چڑھا ہوا دریا کا ایک اتر گیا ہوا دروہ جگہ اس قدر خشک ہو گئی ہو کہ جیسے یہاں بھی کسی دریا کا جری نہیں تھا۔ تذکرہ نویسوں نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ پیر و مرشد کی نظر پھرتے ہی حضرت بابا بلھے شاہؒ روحانی طور پر اندر سے بالکل خالی ہو گئے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ آپ نے فوری طور پر قصور چھوڑ دیا۔ اور ہندوستان کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس روایت کے مصنف کی بے احتیاطی کا یہ عالم ہے کہ وہ قصور کو دو سو سال پہلے پاکستان کا ہی حصہ سمجھ رہا تھا۔ اس لئے مصنف نے ”ہندوستان“ کا لفظ استعمال کیا۔ بہر حال اس غلطی سے قطع نظر حضرت بابا بلھے شاہؒ قصور کی حدود سے نکل کھڑے ہوئے اور طویل و دشوار سفر طے کر کے آپ گوالیار پہنچے، جہاں مشہور بزرگ حضرت غوث محمد گوالیاریؒ ”مخو خواب“ ہیں۔

حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کا تعلق سلسلہ ”مطاریہ“ سے ہے۔ اور اس مسلک کے لوگ بہت ذوق و شوق سے ملتے جلتے ہیں۔ حضرت محمد غوث گوالیاریؒ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دور کے مشہور صوفی بزرگ ہیں۔ آپ کے جلال و جبروت کا یہ عالم تھا کہ شاہانِ وقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی ذات گرامی سے بے شمار کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ مگر ایک کرامت نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ اور شاید قیامت تک مسلمانوں کے ساتھ ہاتھ بندوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی اس کرامت کا ذکر اسی زور و شور کے ساتھ ہوتا رہے گا۔

گوالیار میں ایک غریب ہندو لڑکا تھا، جو حضرت شیخ محمد غوثؒ کی مجلسِ درس میں آکر بیٹھا کرتا تھا اور حضرت شیخ

کی باتیں بہت غور سے سنا کرتا تھا۔ اس ہندو لڑکے کو بچپن ہی سے گانے کا بہت شوق تھا۔ آواز بہت دلکش تھی۔ موسیقی ایک مشکل ترین فن ہے۔ اور اس کی تعلیم و تربیت نہ صرف دشوار ہے بلکہ مالی اعتبار سے بہت مہنگی ہے۔ وہ ہندو لڑکا، جسے دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں تھی، موسیقی کے ہندو اساتذہ کے پاس جاتا اور اپنے اظہار کرتا۔ مگر وہ لوگ یہ کہہ کر اسے ٹال دیتے۔

”لڑکے! تجھے جس کلا (فن) کا روگ لگ گیا ہے، وہ راجوں مہاراجوں کا شوق ہے۔ ٹوخت و دھڑول۔ سنگیت کا دھیان چھوڑ دے۔“

موسیقی کے استاد اس غریب لڑکے کا دل توڑ دیتے۔ اور وہ مندروں میں جا کر پجاریوں کے گھن گنے پھران ہی بھجوں کی نقل کر کے اپنے گانے کا شوق پورا کرتا۔ پھر وہ جس گلی سے گاتا ہوا گزر جاتا تو لوگ اپنے گھر سے نکل آتے۔ اور لڑکے کی دلکش اور پُر سوز آواز سن کر جھومنے لگتے۔ موسیقی سیکھنے کی دھن میں گن گننے لگے۔ اس لڑکے نے حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی خدمت میں حاضر ہونا ترک نہیں کیا۔ وہ پابندی کے راجہ۔ مسلمان درویش کی مجلس میں آتا اور سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔

”لڑکے! تم یہاں کس غرض سے آتے ہو؟“ ایک دن حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ نے ہندو لڑکے کو پوچھا۔ ”تمہیں تو کسی مندر میں جانا چاہئے۔“

”مجھے آپ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔“ ہندو لڑکے نے بڑی عقیدت سے کہا۔

”تم کرتے کیا ہو؟“ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔

لڑکے نے اپنے شوق کے بارے میں بتایا تو حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ ”ہم بھی تو سنیں کہ تم کیا گانے، حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ سماع کا بے حد ذوق رکھتے تھے، اس لئے آپ نے ہندو لڑکے سے گانے کی فراہمی پھر جب لڑکے نے ایک ہندی بچپن سنایا تو حضرت شیخؒ نے اس کی آواز کی بے حد تعریف کی۔ اور پھر پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے فرمایا۔ ”اب تم موسیقی کے اساتذہ سے یہ فن سیکھو۔ خدا تمہاری آواز ایسی تاثیر پیدا کر دے گا کہ اس کا طلسم پھر کسی سے نہیں ٹوٹے گا۔“ یہ ہندو لڑکا، تان سین تھا جس نے ہندو موسیقی میں لازوال شہرت حاصل کی اور دربار اکبری کے ”نورتنوں“ میں شامل ہوا۔ جب اس کا دامن شہرت سے بھر گیا تو وہ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے دست حق پرست پر مسلمان ہو گیا۔ تان سین کی تبدیلی ہندو فرقہ پرستوں نے بہت شور مچایا کہ اسے جبراً مسلمان کیا گیا ہے۔

تان سین نے ہزاروں ہندوؤں کی موجودگی میں اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ہوش و حواس کے ساتھ اسلام قبول کیا ہے۔ اور یہ حضرت شیخؒ کا فیضانِ نظر ہے، جس نے مجھے سینکڑوں خداؤں نے نکال کر خدائے واحد کے در پر لا کھڑا کیا۔ میرا ایمان، میری زندگی اور میرا فن حضرت شیخؒ کے قد صدقہ ہے۔“

تان سین کے اس اعلان کے بعد فرقہ پرست ہندوؤں کی زبانیں بند ہو گئیں۔ اور اسی روز سے ہا ”میاں تان سین“ کہلانے لگے۔ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے مزار مبارک کے احاطے میں میاں تان بھی قبر ہے۔ یہ عظیم موسیقار زندگی میں بھی حضرت شیخؒ کے قریب رہا اور مرنے کے بعد بھی اسے ”شطاری“ عظیم بزرگ کے قدموں میں جگہ ملی۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ بھی حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے مرید تھے۔ اسی لئے حضرت بابا بلھے

نے کہہ کر راست گوالیار تشریف لے گئے۔

اگر تذکرہ نویسوں نے اس واقعے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ سفر کی بے پناہ صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد بالآخر حضرت بابا بلھے شاہ گوالیار پہنچے اور حضرت شیخ محمد غوثؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوئے۔ گویا پھر بالآخر حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے نام سفارشی خط لینے گئے تھے۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ پر لکھے جانے والے تمام تذکروں میں نمایاں طور پر اس واقعے کا ذکر ملتا ہے، جو تحقیق کی بنیاد پر حرف درست ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کے گوالیار جانے سے پہلے ایک نام نامی بھی پیش آیا تھا، جسے تمام تذکرہ نویسوں نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

ہم نے اس واقعے کی تفصیل کسی کتاب میں نہیں دیکھی۔ اس لئے ساری کڑیاں انسانی فطرت کے اصولوں کے مطابق نہیں جوڑی پڑیں گی۔

تفصیل کے مطابق جب حضرت بابا بلھے شاہؒ پر یہ راز فاش ہو گیا کہ آپ پیر و مرشد کی ناراضی کے سبب اہل بیت سے محروم ہو چکے ہیں تو آپ پر فرض عائد ہوتا تھا کہ قصور سے روانہ ہو کر لاہور تشریف لاتے اور پھر حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہو کر عرض گزار ہوتے۔

”سید امیری کی کس خطا پر مزاج شیخ برہم ہوا ہے؟ اور میں چشم التفات سے کیوں محروم کیا گیا ہوں؟“
پھر اگر پیر و مرشد اپنی ناراضی کا سبب بیان فرماتے تو حضرت بابا بلھے شاہؒ نیاز مندانہ لہجے میں اپنی مجبوری اور بے بسی پر مدح صاحب کی غلط بیانی کی وضاحت کرتے۔

اگر حضرت شاہ عنایت قادریؒ اپنے مرید صادق کی توضیح سننے کے بعد بھی حضرت بابا بلھے شاہؒ ہی کو قصور وار قرار دینے کو ایک سچے مرید پر لازم تھا کہ وہ آستانہ شیخ پر پڑا رہ کر دن رات فریاد کرتا اور دن میں سو بار اپنے قصور کی جانب کا طالب ہوتا۔ پھر جب پیر و مرشد کے دروازے پر گریہ و زاری کرتے کرتے ایک طویل عرصہ گزر جاتا اور مٹی سنوائی نہ ہوتی تو پھر انتہائی شکستگی اور مایوسی کے عالم میں افسر اعلیٰ کا سفارشی خط لینے کے لئے گوالیار کی طرف روانہ ہوتا مگر جب ہم موجودہ تذکروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسے کسی واقعے کی ہلکی سی جھلک بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ بلکہ طرف ہمارے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنے شیخ کے عشق میں فنا ہو چکے تھے اور اسی عشق کے شعل کو باری رکھنے کے لئے آپ نے شادی تک نہیں کی تھی۔ کیونکہ ازدواجی ذمہ داریاں اور اہل و عیال کی نگہداشت حضرت بابا بلھے شاہؒ کو دنیا داری کے امور میں الجھا کر رکھ دیتی اور شیخ کے عشق میں کسی قدر کمی واقع ہو جاتی۔ اس لئے آپ نے اپنے اور شیخ کے درمیان کسی دیوار کو آنے ہی نہیں دیا۔ جب حضرت بابا بلھے شاہؒ کے عشق کا پھل ہو تو پھر پیر و مرشد کی شدید ترین ناراضی کی خبر سن کر آپ لاہور آنے کے بجائے براہ راست گوالیار کیوں تشریف لے گئے؟

اس قسم کے تمام سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ ہمارے تمام تذکرہ نگار درمیان کے ایک اہم ترین واقعے کو کسی وجہ سے نظر انداز کر گئے ہیں۔ اور اسی بے توجہی نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کے عشق کے ربط مسلسل کو توڑ دیا ہے۔

اور وہ واقعہ یہ تھا کہ جب حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اپنے شیخ کی شدید برہمی کی خبر ملی تو آپ کی نظروں میں ساری دنیا اندھیر ہو گئی۔ اور پھر آپ نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سلطان احمد مستانہؒ کو اپنے ڈیرے کا منتظم بنایا اور خود لاہور چلا کر آستانہ شیخ پر حاضر ہوئے، باریابی کی اجازت چاہی۔ مگر شیخ کا حکم تھا کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کو خانقاہ کی پار دیواری کے اندر داخل نہ ہونے دیا جائے۔

حضرت بابا بلھے شاہ دروازے پر کسی غلام یا دربان کی طرح کھڑے ہو گئے کہ پتہ نہیں، کب مالک کی سے بلاوا آجائے؟ کوئی نہیں جانتا کہ حضرت بابا بلھے شاہ مرشد کے آستانے پر کب تک کھڑے رہے؟ کب تک کیا جاسکتا ہے کہ آپ انتظار کی طویل اور صبر آزمائیوں سے گزر رہے ہوں گے۔ پھر بھی مرشد کی طرف سے نہیں آیا۔

آخر دل کا درد، زبان پر آگیا۔ حضرت بابا بلھے شاہ نے ان لوگوں سے رجوع کیا، جو بارگاہِ شاہِ شمسِ مغرب نے کبھی جو دوسروں کی سفارش کیا کرتا تھا، آج وہ خود سفارش کا طلب گار تھا۔ مگر کوئی تدبیر کام نہیں آئی۔ سارے رائیگاں گئے اور حضرت بابا بلھے شاہ کی سزا اپنی جگہ قائم رہی۔ حضرت خواجہ میر دردؒ کے بقول۔

ان لیوں نے نہ کی مسیحا

ہم نے سو سو طرح سے مردیکھا

جب ہر طرف مایوسیوں کا گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا تو ایسی سنگین ساعتوں میں حضرت بابا بلھے شاہؒ کو دروازہ نظر آیا، جو گوالیار کی تاریک فضاؤں کو روشن کر رہا تھا۔ آخر آپ حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے پیر و مرشد حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ احمد رضا خان بریلویؒ کی مشہور زمانہ نعت مبارک منقطع ہے۔

تیری سرکار میں لایا ہے رضا اس کو شفیع

جو مرا غوث ہے، وہ لاڈلا بیٹا تیرا

(اس شعر میں لاڈلے بیٹے سے مراد حضرت امام حسینؑ ہیں)

حضرت بابا بلھے شاہؒ ہر طرف سے مایوس ہو کر حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے مزار مبارک پر اس لئے پہنچے ہوئے تھے کہ اگر اس آستانے سے روحانی امداد مل جائے تو بگڑا ہوا کام بن جائے گا اور حضرت شاہ عنایت قادریؒ اپنے مرشد کا حکم کسی بھی حال میں نہیں ٹالیں گے۔ افسرِ اعلیٰ کے سفارشی خط سے تذکرہ نویسوں کی یہی مراد تھی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے مزار مبارک پر طویل عرصے تک مراقبہ کیا۔ آپ بھر فریاد و فغاں میں مصروف رہتے اور یہ سلسلہ گریب، نیم شب تک جاری رہتا۔ پھر تھک کر مزار مبارک کی جانب سے پاس ہی سو جاتے۔ آخر بہت دن بعد حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ خواب میں تشریف لائے اور فرمایا۔

”سید عبد اللہ! تم اتنے مضطرب کیوں ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

”پیر و مرشد مجھ سے غما ہو گئے ہیں اور دنیا کے ساتھ میری آخرت بھی برباد ہو گئی۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے رو کر اپنی حالتِ زار بیان کی۔

جواب میں حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ نے آپ کو قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا اور دولتِ عرفان عطا کی۔ پھر ارشاد فرمایا۔

”میاں تان سین کی قبر پر جا کر بیری کے درخت کی ڈھائی پیتاں کھاؤ۔ مرشد تم سے راضی ہو جائیں گے۔“

روایت ہے کہ مرنے کے بعد میاں تان سین کی قبر پر بیری کا ایک پودا پھوٹا تھا۔ اور پھر یہ تناور درخت بن گیا تھا۔ خدا جانے یہ روایت کب قائم ہوئی کہ موسیقی سے رغبت رکھنے والے لوگ، میاں تان سین کے مزار پر جانے اور بیری کے درخت کے ڈھائی پتے کھا کر موسیقی کا عرفان حاصل کرتے تھے۔ موسیقی کے دو شعبے ہیں۔ ایک شبنم (تعلقِ آواز سے ہے، جسے ہم ”گلوکاری“ کہتے ہیں۔ اور دوسرے کا مختلف سازوں سے۔ اس طرح جو نفاذ کا رکھتا ہے۔

نہ کا مظاہرہ کرتے تھے، وہ بیری کے درخت کی ڈھائی پیتاں کھا کر زیادہ سریلے ہو جاتے تھے۔ اور جو گلوکاری کا ٹن ٹن کر رکھتے تھے، انہیں ساز بجانے میں مہارت حاصل ہو جاتی تھی۔ اس روایت کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کا انتقال ہو جانے کے بعد، میاں تان سین اپنے مرشد کے مزار مبارک پر حاضر ہوتے اور احاطے میں بیٹھ کر گھنٹوں گایا کرتے تھے۔ یہ نغمہ آرائی توحید، معرفت، عشقِ حقیقی اور وصال و فراق کے نعوں یا گیتوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ کبھی مرشد کی یاد ستائی تو میاں تان سین، فراقیہ گیت چھیڑ دیتے۔ خود بھی روتے اور ماضی حرار کو بھی زلا تے۔ کبھی شرابِ معرفت سے سرشار ہو جاتے تو طریقہ نغمے گانے لگتے۔ مگر ان طریقہ نعوں سے بھی ”بادہ توحید“ ہی کا رنگ جھلکتا تھا۔

حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے وصال کے کافی عرصے بعد میاں تان سین کا انتقال ہوا اور پھر آپ مرشد ہی کے قریب مزار مبارک کے احاطے میں دفن ہوئے۔ جب ہم بہت سی کتابوں میں یہ روایت پاتے ہیں کہ حضرت محمد فوت گوالیاریؒ نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کو میاں تان سین کے مزار پر حاضر ہونے اور ”بیری کے پتے“ کھانے کا حکم دیا تو اندازہ ہے کہ اسی دن سے موسیقاروں میں اس روایت کی بنیاد پڑی۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ سے پہلے بھی حضرت غوث گوالیاریؒ نے کسی دوسرے موسیقار کو بھی یہی بات دی ہو اور اس نے میاں تان سین کے حوالے سے فیضِ روحانی حاصل کیا ہو۔ یا پھر حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ماضی کے بعد اس روایت کی بنیاد پڑی۔ بہر حال! آج بھی پورے ہندوستان کے موسیقاروں میں یہ رسم اپنی پوری توانائی کے ساتھ زندہ ہے کہ جو بھی میاں تان سین کی قبر پر سایہ فلکِ بیری کے ڈھائی پتے کھاتا ہے، وہ ”سریلا“ ہی جاتا ہے اور راگوں کی دنیا میں اس پر نئے نئے انکشافات ہونے لگتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ محض ایک روایت ہے، حقیقت سے دُور تر..... اور افسانے سے قریب تر۔ آپ خود ہی سوچیں کہ اگر ”بیری کے ڈھائی پتے“ کھانے سے کوئی ”بے سُرا“ گانے والا ”سُر“ میں آجائے..... تو پھر ہندوستان میں ہر طرف گش آواز میں گانے والے ہی نظر آتے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ایک ارب کے ملک میں چند لاکھ ایسے سُریلے دکھائی دیتے ہیں، جن پر ہندوستانی موسیقی ناز کرتی ہے۔ ورنہ بھارت کی جتنی بڑی آبادی ہے، ان تناسب سے وہاں ”بے سُروں“ کی تعداد بھی دنیا بھر کے ممالک سے زیادہ ہے۔ آخر ایسا کیوں؟ میاں تان سین کی قبر کی بیری ان بے ہنروں کو ہنرمند اور بے سُروں کو ”سُریلا“ کیوں نہ بنا سکی؟

پھر اس روایت کی اصل کیا ہے؟ ہمارے نزدیک یہ تمام حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کا فیضِ روحانی ہے۔ اس کے سوا نہ بڑی کوئی حقیقت ہے اور نہ اس کے پتوں کی۔ حضرت شیخ غوث گوالیاریؒ اپنی حیاتِ مبارک میں غریب ہندوؤں کے تان سین پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ پھر یہی شفقت رنگ لائی اور تان سین نے ہندو تہذیب ترک کر کے اسلام قبول کیا۔ جب ہندو زادے کو دولتِ ایمانی مل گئی تو حضرت غوث گوالیاریؒ نے تان سین کو دوسری دعا دی کہ وہ فی موسیقی میں لازوال ہو جائے۔ یہ اسی دعا کی تاثیر تھی کہ ہزاروں سال پرانے ہندوستان میں جہاں اہلِ ہندو موسیقی کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں اور جہاں اب تک لاکھوں مایہ ناز موسیقار پیدا ہو چکے ہیں، وہاں میاں تان سین کی شہنشاہیت کیوں قائم ہے؟ میاں تان سین کو اس دنیا سے گئے ہوئے چار سو سال گزر چکے ہیں، پھر ساری ہندو اہلِ بات پر کیوں متفق ہے کہ وہ شہنشاہِ موسیقی تھے۔ ایسے شہنشاہ، جن کی قبر پر بت پرست بڑے والہانہ انداز میں بجدے کرتے ہیں۔

جب میاں تان سین نے اپنا مذہب تبدیل کیا تھا، اس وقت ہندو فرقہ پرستوں نے بڑے ہنگامے اٹھائے تھے

کہ ایک غریب ہندو لڑکے کو جبراً مسلمان بنایا گیا ہے۔ پھر جب 1947ء کے بعد ہندو ”بنیاد پرستی“ اور ”فرقہ باز“ اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے تو میاں تان سین کے حوالے سے حشر برپا کیوں نہیں کیا گیا؟ جہاں جھوٹ بولے، حقائق کو جھٹلانے کا یہ عالم ہو کہ قطب مینار اور تاج محل جیسی شہرہ آفاق عمارتوں کو ہندو راجاؤں کی یادگاریں بنانے کے لئے تحقیقی شے قائم کئے جا رہے ہیں۔ بابری مسجد کو ”رام مندر“ قرار دے کر منہدم کر دیا گیا ہو، اور کوئی ایسا مفید، متعصب ہندو اسکالر کیوں پیدا نہیں ہوا جو ”میاں تان سین“ کو ہندو ثابت کرنے کے لئے ہاتھ نہ پر سیاہی مل دیتا۔ یا کم سے کم اتنا ہی کہہ دیتا کہ ”میاں تان سین“ ایک معمولی موسیقار تھے..... اور ان کے مقابلے میں فلاں ہندو موسیقار عظیم تر تھا۔ یقیناً وہ جھوٹا دعویٰ ہوتا۔ مگر جب جھوٹ اور تہمت ہی کسی قوم کا حلال علم ہو تو پھر ”میاں تان سین“ کی عظمت، فرقہ پرست ہندوؤں کی دراز دستی سے کیوں محفوظ ہے؟ کبھی کسی شخص کو والے نے اس زاویے سے سوچا؟“

شاہ نامہ ایران میں فردوسی نے دیو مالائی حیثیت اختیار کر جانے والے پہلوان رستم کے بارے میں کہا ہے: میں نے اسے اپنی شعری فکر کی طاقت سے ”رستم“ بنایا، ورنہ وہ ”سیستان“ کا ایک عام سا پہلوان تھا۔ میاں تان سین کی بھی یہی صورت ہے۔ وہ مسلمان ہونے سے پہلے ایک عام ہندو موسیقار تھے۔ مگر جب حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی غلامی اختیار کی تو ”خاک“ سے ”اکسیر“ بن گئے۔ اور ہندوستانی موسیقی ”لازوال“ ہونے کی علامت ٹھہرے۔ یہ ایک مردِ کامل کی فیضانِ نظر تھا۔ اور صوفیاء کے مکتب کی کرامت تھی۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنے پیرومرشد حضرت شمس تبریزؒ کے فیضانِ نظر کے بارے میں اس طرح فرمایا ہے۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزیؒ نہ شد

”مولائے روم اس وقت تک مولوی (عالم) نہ بن سکے، جب تک انہوں نے حضرت شمس تبریزؒ کی غلامی اختیار نہ کر لی۔ (ترجمہ)

اسی طرح میاں تان سین بھی اس وقت تک موسیقی کی معراج کو نہ پا سکے، جب تک وہ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی بارگاہِ جلال میں خم نہیں ہو گئے۔

اب اگر ان کی قبر پر آگئے والی ”بیری“ کے پتوں میں یہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے تو اہل دنیا کو تعجب کیوں ہے؟ دراصل بیری کے درخت میں کوئی کمال نہیں..... سارے پیڑ اور پھل یکساں ہوتے ہیں۔ یہ درخت ہوائے دوسرے پیڑوں سے مختلف یوں ہے کہ اس میں بھی ایک مردِ حق کی دعاؤں کا اثر شامل ہے۔ اور وہ مردِ حق، حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

اس روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ”میاں تان سین“ کی بیری کے پتے کھانے والا ہر شخص اس کی فیض یاب نہیں ہوتا۔ یہ ایک خاص روحانی سلسلہ ہے، جو اگر کہیں درمیان سے ٹوٹ جائے تو پھر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میاں تان سین کی قبر کے درخت سے صرف وہ موسیقار استفادہ کرتے ہیں، جنہیں حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی بارگاہِ معرفت سے اجازت ملتی ہے۔ اس روایت کی تشریح یوں ہے کہ جب کوئی موسیقار، حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہو کر دعا کرتا ہے تو اسے خواب میں بشارت ہوتی ہے کہ وہ ”میاں تان سین“ کی بیری کے ”ڈھائی پتے“ کھائے۔ پھر جب وہ حکمِ شیخ کے مطابق عمل کرتا ہے تو اس پر موسیقی کے امر کو

ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص سنی سناٹی باتوں پر یقین کر کے معرفت کے اس دربار کے آداب کا خیال نہیں کرتا تو اس کا فخر و غرور کے سوا کچھ نہیں۔ سائنس کی طرح روحانیت کا بھی ایک کلیہ، ایک قانون اور ایک فارمولا ہے۔ اس کے مطابق عمل کرنے والے با مراد ہوتے ہیں اور خلاف چلنے والے ناکام۔ غسل کی نیت اور تین بار تہنہ پانی پانے والا، اسلامی شریعت میں پاک ہو جاتا ہے۔ اور دن بھر سمندر میں نہانے والا ایک بے عقیدہ شخص کی پاک نہیں ہوتا۔

یہ صورت حال ”میاں تان سین“ کی ذات سے منسوب اس مشہور واقعے کے ساتھ بھی وابستہ ہے۔
میاں تان سین کی قبر پر اگنے والی بیری کی طرح ہندوستان میں ایک اور درخت بھی بہت عجیب ہے، جو انسانی غسل کا جزو کر دیتا ہے۔ یہ ایک نیم کا درخت ہے، جو اجمیر شریف (بھارت) اور تارا گڑھ پہاڑ کے درمیان فوجی راستے پر آج بھی موجود ہے۔ شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج چوہان کے درمیان ہونے والی جنگ زمان میں بہت سے مسلمان سپاہی شہید ہوئے تھے۔ یہ نیم کا درخت ایک شہید کی قبر پر واقع ہے۔ اس درخت کی جو شاخیں اور شاخیں شہید کی قبر پر سایہ فگن ہیں، اس کے پتے بیٹھے ہیں۔ اور جو ڈالیاں، قبر کے رقبے سے الگ ہیں، ان کے پتے نیم کی فطرت کے مطابق انتہائی کڑوے۔ یہ راز آج تک کسی ماہر نباتات کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر ایک کھانا ایسا بھی جانتا ہے کہ یہ درخت، قدرت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اگر نگاہ مرد مومن کی تاثیر، تقدیریں بدل سکتی ہے تو ایک مرد شہید کے خون کی تاثیر سے نیم کی فطرت بھی بدل سکتی ہے۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ پر لکھی جانے والی اکثر کتابوں میں یہ روایت نمایاں طور پر درج ہے کہ میاں تان سین کی بیٹا کے زوال پتے کھانے کے بعد آپ میں نہ صرف موسیقی کا کمال پیدا ہو گیا بلکہ مستقل اضطراب میں بڑی حد تک آگئی۔



بعض روایتوں کے مطابق ایک طویل عرصہ گوالیار میں گزارنے اور حضرت شیخؒ کے فیض روحانی سے شرف یاب ہونے کے بعد حضرت بابا بلھے شاہؒ تصور تشریف لائے اور دوسرے ہی دن لاہور روانہ ہو گئے۔ قصور میں آپ کا ایک راز نام شاید اس لئے تھا کہ اپنے ڈیرے (خانقاہ) کی نگرانی فرمائی ہوگی اور مریدوں کو نئے احکام جاری کئے جائیں گے۔

لاہور پہنچ کر حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اپنے ناراض مرشد حضرت شاہ عنایت قادری شطاریؒ کی بارگاہ کرم میں غریبوں کا ایک عجیب طریقہ اختیار کیا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے سب سے پہلے ان قوالوں سے ملاقات کی، جو حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی محفل سماع میں مستقل طور پر کلام سنایا کرتے تھے۔ تمام روایتوں کی ظاہری ساخت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قوال، حضرت بابا بلھے شاہؒ سے واقف نہیں تھے۔ جب آپ نے حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے حکم سے قصور میں مستقل سکونت اختیار کر لی تو ان قوال، شیخ کی مجلس میں بار بار ہوتے تھے۔ اسی لئے وہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کو نہیں پہچانتے تھے۔

”کل جب تم حضرت شیخ کی بارگاہ میں جاؤ تو ایک مغنیہ (گانے والی) کے فن کی یہاں تک تعریف کرنا کہ حضرت شاہ مطرب کا کلام سننے کے لئے آمادگی ظاہر کر دیں۔“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں انہوں سے درخواست کی۔

”مگر وہ مغنیہ کون ہے اور کہاں ہے؟“ قوالوں نے حیرت زدہ لہجے میں حضرت بابا بلھے شاہؒ سے دریافت کیا۔

”وہ مغنیہ میں ہوں اور تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔“ یہ کہتے کہتے حضرت بابا بلھے شاہؒ کے لہجے سے لہجہ جھلکنے لگا تھا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ کی بات سن کر تمام قوال دم بخود رہ گئے۔ ”تم ایک عورت کے روپ میں حضرت شاہؒ کی قادریؒ کے سامنے جاؤ گے؟“

”میرے عزیز بھائیو! آخر کوئی تو مجبوری ہوگی کہ میں ایک عورت کا روپ دھار رہا ہوں۔“ حضرت بابا نے انتہائی پرسوز لہجے میں فرمایا۔

”تمہاری یہ مجبوری اپنی جگہ، مگر ہم کوئی خطرہ نہیں مول لے سکتے۔“ ایک قوال نے انتہائی بے باکانہ اور جواب دیا اور حضرت بابا بلھے شاہؒ کی درخواست مسترد کر دی۔

”کیسا خطرہ؟“ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے قوال سے پوچھا۔ ”تمہیں تو بس حضرت شیخ کے سامنے اس بزرگ تعریف کر دینا ہے۔ اب یہ میری قسمت کہ حضرت شیخ مجھے طلب فرمائیں یا انکار کر دیں۔“

”کیوں میاں! ہماری عزت اور روزی سے کھیلنے ہو؟“ دوسرے قوال نے برہم ہو کر کہا۔ ”ہم تمہارا جھوٹ بول کر اپنی دنیا اور آخرت خراب نہیں کر سکتے۔ جب حضرت شیخ پوچھیں گے کہ وہ مغنیہ کہاں ہے تو کہنا دیں گے؟ اگر خدا نخواستہ ہماری اس حرکت کو مذاق سمجھ لیا گیا تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے لہجہ بدل بدل کر قوالوں سے التجا کی۔ مگر جب ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تو آپ نے فرمایا۔ ”میں حضرت شیخ کی مجلس عارفانہ میں کوئی غیر نہیں ہوں کہ بھیس بدل کر مذاق کرنے جا رہا ہوں۔ یہ دوسرا شخص مرید ہوں۔ اپنی ایک غلطی کے سبب راندہ درگاہ ہو گیا ہوں۔ شیخ کی ناراضی دور کرنے کے لئے یہ روپ دھار دیکھ رہا ہوں۔ شاید اس حال میں دیکھ کر انہیں مجھ پر رحم آجائے۔“

قوالوں نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کا نام تو بہت سنا تھا..... مگر جب آپ ہی کی زبانی داستانِ فراتؒ کی کہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور حضرت بابا بلھے شاہؒ سے وعدہ کر لیا کہ وہ حضرت شیخ کے سامنے ان کے گناہ کی تعریف کر دیں گے۔

پھر جب دوسرے دن وہ قوال، حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کرنے لگے۔ ”شیخ! ہندوستان کی ایک مشہور مغنیہ ہے۔ اور اپنے فن کا بہت مظاہرہ کر چکی ہے۔ مگر اب اس کی شہرت ہے کہ وہ آپ سے دافن پائے گی۔“

”ہم بھی اسے جانتے ہیں۔“ حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے فرمایا۔ ”مجھے کے دن اس مغنیہ کو گناہ لیتے آنا۔“

جب قوالوں نے واپس آ کر حضرت بابا بلھے شاہؒ کو یہ خبر دی تو آپ اس قدر وارفتہ ہوئے کہ بہت روئے رہے۔

مجلسِ سماعِ آراستہ ہونے میں ابھی کئی دن باقی تھے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے یہ چند روز اس طرح گزار دیے جیسے آپ صدیوں کا سفر طے کر رہے ہوں۔



پھر طویل انتظار کے بعد ساعتِ دیدار آئی۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کا اضطراب حد سے گزر گیا اور آپ نے کہ آگے بڑھ کر مرشد کے قدموں سے لپٹ جائیں۔ لیکن یہ خوف مانع رہا کہ بات بنتے بنتے کہیں بگڑ نہ جائے۔

لگی مراد ساحل پر پہنچ کر ڈوب نہ جائے۔ حضرت بابا بلے شاہؒ نے بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا اور زنا لباس میں قوالوں کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھ رہے۔

مغل سماع کا آغاز ہوا۔ قوالوں نے حضرت شاہ عنایتؒ قادریؒ کی خدمت میں منتخب عارفانہ کلام پیش کیا۔ مغل سماع کی پروپی کیفیت طاری ہوئی، جو عام طور پر ہوتی تھی۔ اگرچہ قوالوں کے پڑھنے کے انداز میں بہت جوش و خروش تھا لیکن مغل میں کوئی غیر معمولی رنگ ظاہر نہ ہو سکا۔

قوالوں کی باری ختم ہونے کے بعد حضرت شاہ عنایتؒ قادریؒ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”وہ مغنیہ ہلہ ہے، جس کے فن کی پورے ہندوستان میں دھوم ہے؟“

حضرت شاہ عنایتؒ قادریؒ کی بات سن کر حضرت بابا بلے شاہؒ قوالوں کی صف سے نکل کر ذرا آگے آئے۔ زانا لباس نے ساز چھیڑے۔..... اور آپ نے اپنا ہی کلام گانا شروع کر دیا۔

شش کی وادی پر خار..... ذوق سفر..... آبلہ پائی..... جذبوں کی آگ..... شدت طلب..... محرومی و فراق..... اور رات قلب کی کچی عکاسی..... مجلس کے در و دیوار پر وجد طاری تھا..... اور حاضرین جھوم رہے تھے۔

حضرت بابا بلے شاہؒ نے یہ رنگ دیکھا تو کھڑے ہو گئے۔ اس وقت اہل محفل کو ایک نئے ساز کی آواز سنائی دے۔ یہ فقیر تھے، جو حضرت بابا بلے شاہؒ کے پیروں میں بندھے ہوئے تھے۔

پھر پوری مجلس اس مشہور ”کانی“ کے معنی و آہنگ سے گونج اٹھی۔

”تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا“

شش کی ضرب بڑی تودل کے تار جھٹھنا اٹھے۔ راہ طلب کے مسافر، سماع کی بہت سی محفلوں میں شریک ہوئے۔ مگر کسی نے یہ کیفیت محسوس نہیں کی تھی۔ کیونکہ اب تک ایسی محفلوں میں قوال ہی شریک ہوئے تھے..... مگر ان خوش زنا لباس میں تھنکھرو باندھے ناچ رہا تھا، وہ کوئی قوال نہیں، ایک جانباز صوفی اور حضرت شاہ عنایتؒ قادریؒ کا محبوب تھا۔

پھر جب حضرت بابا بلے شاہؒ اس شعر پر پہنچے۔

سانوں گھائل کر کے پھر خبر نہ لیا

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

تو حضرت شاہ عنایتؒ قادریؒ نے بے اختیار ہو کر فرمایا۔ ”ہمیں سب خبر ہے کہ ٹو بکھا ہے۔“

یہ سننے ہی حضرت بابا بلے شاہؒ کا قصہ تھم گیا..... اور آپ دیوانہ وار آگے بڑھ کر پیر و مرشد کے قدموں سے ہٹ گئے۔ ”سیدی! میں بکھا نہیں، بھلا (بھولا ہوا) ہوں۔“ یعنی جسے بھلا دیا گیا۔ یہ بھی نیاز مندی کا ایک انداز اور نکتہ کی ایک اداسی۔

حضرت شاہ عنایتؒ قادریؒ نے آپ کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور نہایت جذب کے عالم میں فرمایا۔

”ٹو میرا بکھا ہی ہے۔ اب یہ تیرا سوئے عشق کبھی کم نہیں ہوگا۔“

اس موقع پر بھی تقریباً تمام ہی تذکرہ نویسوں نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تصوف کا ایک خاص اور نادر ترین مرحلہ تھا، جسے دیکھنے والوں نے دنیا داری کی آنکھ سے دیکھا۔

انکڑ کبابوں میں اس واقعے کا اختتام اس طرح تحریر کیا گیا ہے۔

”مرشد نے اٹھ کر آپ کو گلے لگایا اور اس طرح مرشد اور مرید میں صلح ہو گئی۔“

صلح کا لفظ تو وہاں استعمال ہوتا ہے، جہاں دو افراد کے درمیان جنگ جاری ہو۔ گویا ہمارے تذکرہ نویسین خیال میں یہ حضرت شاہ عنایت قادریؒ اور حضرت بابا بلھے شاہؒ کے درمیان کوئی دنیا دارانہ معرکہ تھا، جس کا نام ”صلح“ پر ہوا۔

قرآن کریم میں ایک جگہ کچھ اس طرح ارشاد ہوا ہے۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہیں آزمائش کے بغیر چھوڑ دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ بے شک! ہم تمہیں آزمائیں گے۔ کبھی اولاد اور مال کے نقصان سے اور کبھی دیگر آفات و مصائب میں مبتلا کر کے۔ تاکہ مسیحاؑ ظاہر ہو سکے۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ بھی آزمائش کی اسی سخت ترین منزل سے گزرے گئے تھے۔ حضرت شاہ عنایت قادریؒ بارے میں ہمارے تذکرہ نویسوں کا یہ تاثر یکسر غلط ہے کہ آپ اپنے داماد کی باتوں میں آکر حضرت بابا بلھے شاہؒ خفا ہو گئے تھے اور پھر اپنے مرید خاص کی کرامت سلب کر لی تھی۔ کسی واقعے کی تصدیق کے بغیر اس پر یقین کرنا ایک ہوش مند دنیا دار کا طریقہ بھی نہیں ہوتا۔ جبکہ حضرت شاہ عنایت قادریؒ اپنے وقت کے بڑے عالم گئے، صاحب کشف بزرگ بھی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ حضرت بابا بلھے شاہؒ سے دریافت کے بغیر ان کی باتوں دے ڈالتے کہ محبوب ترین مرید کو پیروں میں گھٹکھرو باندھ کر بھری محفل میں سب کے سامنے ناچنا پڑتا۔ حضرت عنایت قادریؒ اپنی قوت کشف کے سبب صحیح صورت حال سے باخبر تھے۔ اس لئے آپ کی شدید بے وفائی آزمائش کی خاطر تھی..... تاکہ حضرت بابا بلھے شاہؒ اپنے عہد کی سچائی ثابت کر سکیں۔ اور پھر واقعاً ایک عالم گئے ہونے ثابت کر دیا کہ اس کے عشق میں ذرا بھی کھوٹ نہیں تھا۔

بیاجان تماشا کن کہ در انہو جانبازاں

بصد سامان رسوائی سر بازار می رقصم

(اے محبوب! ذرا یہ تماشا تو دیکھ کہ میں جانبازاؤں کے ہجوم میں سر بازار کیسار فص کر رہا ہوں۔ ترجمہ)

اس واقعے کا دوسرا اہم پہلو، حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ولایت اور کشف و کرامت کا سلب ہو جانا ہے۔

تمام تذکرہ نویسوں نے اس واقعے کو کم و بیش ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ”جب حضرت شاہ عنایت قادریؒ داماد اور بھتیجے، مولوی ظہور محمد صاحب نے، حضرت بابا بلھے شاہؒ کی بے توہمی کا ذکر کیا تو شاہ صاحب جلال شانہ اور فوراً آپ کی ولایت سلب کر لی۔“

ولایت سلب ہونے کا مفہوم ہے ”روحانیت سے خالی ہو جانا۔“ جب بھی کوئی صوفی اس نعمت سے محروم ہو، تو اس کے دو اسباب ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ خود صوفی سے ایسا کوئی گناہ سرزد ہو جائے، جس کے اثرات بدنام ریاضت کو برباد کر ڈالیں۔ یہ سزا براہ راست قدرت کی جانب سے ہوتی ہے۔

دوسرا سبب یہ کہ کوئی مرید، مرشد کا نافرمان ہو جائے اور مرشد خفا ہو کر بارگاہِ ذوالجلال میں عرض کرے کہ نافرمان مرید کی روحانی صلاحیت ختم کر دی جائے۔

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ مرشد، زبان سے کچھ نہیں کہتا..... لیکن مرید کی طرف سے کی جانے والی دل آزر رنگ لاتی ہے اور حق تعالیٰ خود ہی اس مرید کو ولایت اور کشف و کرامت سے محروم کر دیتا ہے۔ یہاں اس خوب سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی صوفی اپنے مرید کو ولایت دے سکتا ہے اور نہ چھین سکتا ہے۔ بخشش و عطا نامرادی..... سب اللہ کی طرف سے ہے۔

اس بات کی وضاحت کے لئے ہمیں قرآن کریم کے حوالے سے دو اہم ترین واقعات کو ہمیشہ اپنے ذہن

نار کاٹنا چاہئے۔

جب حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں شیطان مردود سے کہا گیا۔ ”ہماری بارگاہ سے خارج ہو جا“ تو ایسے ہی حق تعالیٰ سے درخواست کی کہ اسے قیامت تک نسل آدم کو گمراہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ مختصر یہ کہ شیطان کو یہ طاقت دے دی گئی کہ وہ انسان کو درغلا کر ہلاکت و بربادی کے راستے پر لگا دے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شیطان پر یہ بھی واضح کر دیا گیا۔

”تو اس سلسلے میں با اختیار ہے۔ لیکن ہمارے خاص بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلے گا۔“
دورانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات مقدس سے تعلق رکھتا ہے۔ عظیم و جلیل پیغمبر کو حکم دیا گیا۔
”موسیٰ! انھوں تک ہمارا پیغام پہنچاؤ..... مگر نرم لہجہ اختیار کرنا۔ شاید وہ ہدایت پا جائے۔“
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی سن کر کسی قدر حیرت کا اظہار کیا تو باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔
”انھوں کو بھی ہم ہی دیتے ہیں، مگر اسے اس کا شعور نہیں ہے۔“
ای طرح ولایت کا حاصل ہونا اور چھن جانا، سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

ہماری تحقیق کے مطابق حضرت بابا بلھے شاہ کی ولایت سلب نہیں ہوئی تھی..... بلکہ ایک مقررہ مدت کے لئے پیر احمد نے اپنی چشم کرم ہٹا لی تھی..... اور یہ ایک صوفی کے لئے سب سے اذیت ناک صورت حال تھی کہ اس کا خدمت یا محبوب اس سے خفا ہو جائے۔

اور تذکرہ نویسوں کا یہ تحریر کرنا بھی شان درویشی کے خلاف ہے کہ جب حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے حضرت بابا بلھے شاہ کو گلے لگا کر فرمایا تھا۔ ”اب تم سے تمہاری ولایت کوئی نہیں چھینے گا۔“

حضرت بابا بلھے شاہ کا قصور سے گوالیار تک کا طویل سفر طے کرنا اور حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کے مزار ہلک پر گریہ و زاری کرنا، بعض اس لئے نہیں تھا کہ حضرت شاہ عنایت قادریؒ آپ کی سلب شدہ ولایت واپس لوٹا دیں..... جاں باز صوفیاء کسی کشف یا کرامت کے لئے اس قدر جاں سوزی سے کام نہیں لیتے۔

ان کی تمام تر ریاضت، رضائے الہی کے حصول کے لئے ہوتی ہے..... وہ ہر حال اور ہر رنگ میں باری تعالیٰ کی قربت اور پناہ ڈھونڈتے ہیں..... پھر اگر کسی وجہ سے یہ قربت، دوری اور مجبوری میں تبدیل ہو جائے تو ایک مائنس جاں سوختہ کی زندگی عذاب مسلسل بن کر رہ جاتی ہے..... پھر وہ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو کر محبوب کی قربت حاصل کرنے کے لئے آگ اور خون کے دریاؤں سے بھی گزر جاتا ہے۔ اس کیفیت کو شہدائے کرام کے حوالے سے باری تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب مقدس میں کم و بیش ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

جب ہم سرخسراہی راہ میں شہید ہونے والوں سے یہ پوچھیں گے کہ آج تم کیا چاہتے ہو؟ تو وہ بے اختیار کہیں گے۔ ”اے اللہ! ہمارے مالک! ہم تجھ سے اس کے سوا کوئی سوال نہیں کرتے کہ تُو ہمیں ایک بار اور دنیا میں بھیج دے اور ہم اسی طرح سرسربیدہ اور اپنے خون میں نہائے ہوئے تیری بارگاہ کرم میں حاضر ہو جائیں۔“ شہدائے کرام کا یہ جواب سن کر روز جزا کا مالک فرمائے گا۔ ”بے شک! ہم جتنی بار بھی تمہیں دنیا میں بھیجیں گے، تم ہر بار یہی عمل دہراؤ گے۔“

اس آیت مقدسہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی مومن بزم، رزم، مسجد، زنداں، مقتل غرض ہر موسم اور فضا میں نکل کر اللہ کی رضا ڈھونڈتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں.....

قرآن کریم کی اس آیت پاک کی تشریح، علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک مشہور شعر میں اس طرح بیان کی ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت ، نہ کشور کشائی

اسی طرح حضرت بابا بلھے شاہ کا دشوار گزار سفر، حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری کے مزار مبارک پر جانری
مسلل گریہ نیم شبی..... بارگاہ شیخ میں شرف یاب ہونے والے قوالوں کی خوشامد اور پھر اہل مجلس کے سامنے
میں گھٹکر و باندھ کر رقص کرنا، اس لئے نہیں تھا کہ آپ کو گم شدہ ولایت حاصل ہو جائے۔ یہ ساری ٹپ ٹپ
فریاد اور فغاں اس لئے تھی کہ شیخ ان کی حالت زار پر نظر کرم فرمائیں۔
پھر جب حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی نظر کرم اٹھی اور آغوشِ محبت وا ہوئی تو ساری گردِ مالِ دل سے اُنکی
تمام غبارِ فراق آنکھوں کے راستے سے پانی بن کر بہہ گیا۔



تصور کی معافی کے بعد حضرت بابا بلھے شاہ کو بارگاہ شیخ میں دوبارہ وہی حضوری حاصل ہو گئی تھی۔
حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی خانقاہ کا طریقہ یہ تھا کہ محفلِ سماع ختم ہونے کے بعد شیرینی تقسیم کی جاتی
حضرت شیخ کبھی ایک مرید کو حکم دیتے اور کبھی دوسرے کو۔ حکم شیخ سن کر مرید اٹھتا اور خاموشی کے ساتھ جانری
برابر سے شیرینی تقسیم کر دیتا۔
ایک دن محفلِ سماع ختم ہوئی تو حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے حضرت بابا بلھے شاہ کو نہایت محبت آمیز لہجہ
مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”بلھیا! آج تم شیرینی تقسیم کرو گے۔“
حضرت بابا بلھے شاہ بڑے ادب و احترام کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھے..... مٹھائی کا خوان اٹھایا
پیر و مرشد سے عرض کرنے لگے۔

”سیدی! مٹھائی کس طرح تقسیم کروں؟“

حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے کسی قدر تعجب کے ساتھ اپنے مرید صادق کی طرف دیکھا اور لگے نہ
ساتھ فرمایا۔ ”سید عبداللہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ مجلس میں جس طرح شیرینی تقسیم ہوتی ہے، تم بھی اسی
تقسیم کرو۔“

”سیدی! خادم کا مطلب ہے کہ یہ مٹھائی کس طریقے پر تقسیم کروں؟ اللہ کی تقسیم پر یا محمد مصطفیٰ ﷺ پر؟“

حضرت شاہ عنایت قادریؒ کی خانقاہ میں ہر ہفتے محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی اور محفل کے خاتمے پر مٹھائی
جاتی تھی۔ مگر آج تک کسی مرید یا خدمت گار نے پیر و مرشد سے یہ سوال نہیں کیا تھا..... حضرت بابا بلھے شاہ کا
سن کر تمام حاضرین مجلس حیران رہ گئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ حضرت شاہ عنایت قادریؒ اپنے مرید کا
سوال کا کیا جواب دیتے ہیں۔ اور حضرت بابا بلھے شاہ مٹھائی کس طرح تقسیم کرتے ہیں۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے حضرت بابا بلھے شاہ کا سوال سن کر فرمایا۔ ”سید عبداللہ! جو اللہ کی تقسیم ہے
اسی طریقے پر یہ مٹھائی بانٹ دو۔“

حضرت بابا بلھے شاہ نے حکم شیخ پر مٹھائی بانٹنا شروع کر دی۔ حاضرین مجلس میں جو شخص حضرت شاہ
قادریؒ کی مسند کے قریب بیٹھا تھا، حضرت بابا بلھے شاہ نے اسے مٹھائی کے چار دانے دیئے۔ پھر دوسرے
صرف ایک دانہ۔

ماہرین مجلس نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی اس تقسیم کو بڑی حیرت سے دیکھا۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ آگے بڑھے اور تیسرے شخص کو نظر انداز کر دیا..... چوتھے کو ایک دانہ دیا اور پانچویں کو اٹھارہ دانے دیے۔ آپ نے کئی آدمیوں کو مسر نظر انداز کرتے ہوئے ایک دانہ بھی نہیں دیا۔ اس کے بعد کسی شخص کو پانچ دانے دیے اور کئی کو تین..... یہاں تک کہ مٹھائی ختم ہو گئی اور خوان خالی ہو گیا۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے بڑی حیرت سے اپنے مرید خاص کی طرف دیکھا اور فرمایا۔
”بلھیا! یہ کیسی تقسیم تھی؟“

حضرت بابا بلھے شاہؒ نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا۔ ”سیدی! آپ ہی نے فرمایا تھا کہ مٹھائی، اللہ کے (اپنے) تقسیم کروں۔ اللہ کی تقسیم تو ایسی ہی ہوتی ہے کہ کسی کو کم..... کسی کو زیادہ... کسی کو کچھ بھی نہیں۔“

حضرت بابا بلھے شاہؒ کے اس جواب پر حضرت شاہ عنایت قادریؒ بہت خوش ہوئے اور حاضرین مجلس نے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ معرفت میں آپ کی نگاہ بہت گہری ہے۔



اس واقعے کے بعد حضرت بابا بلھے شاہؒ مستقل طور پر قصور تشریف لے گئے۔ درمیان میں کچھ دنوں کے لئے ہرم ندی زیارت کو تشریف لاتے اور پھر واپس جا کر تبلیغ و ہدایت کے کام میں مصروف ہو جاتے۔ یہاں تک کہ ۱۱۱ھ میں حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا انتقال ہو گیا۔ یہ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی زندگی کا صدمہ عظیم تھا، جس نے انہیں آپ کو بے قرار و مضطرب رکھا۔

مجلس تاریخ دانوں اور تذکرہ نویسوں کے مطابق حضرت بابا بلھے شاہؒ کو اپنے پیر و مرشد سے ایسا ہی عشق تھا، جیسا حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کو اپنے شیخ حضرت شمس تبریزؒ سے۔ حضرت مولانا رومؒ نے حضرت شمس تبریزؒ کے لفظ میں ایک مخیم، دیوان لکھا تھا۔ محبت کی انتہا یہ ہے کہ غزلیات کے مقطع میں اپنے نام کی جگہ حضرت شمس تبریزؒ کا نام لکھ کر لکھنیں قلب حاصل کرتے رہے۔ اسی طرح حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اپنی کافیوں میں جگہ جگہ پیر و مرشد حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا نام لکھ کر اپنے والہانہ عشق کا اظہار کیا ہے۔

اس بات پر کتب فکر کے نقاد متفق ہیں کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ پنجاب کے سب سے بڑے صوفی شاعر تھے۔ ثمرت اور ہر ہر لہری میں کوئی اور پنجابی صوفی شاعر ان کی برابری کا دعویدار نہیں۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کا اکثر کلام، انہیں کی صورت میں ہے۔ بعض محققین کے مطابق کافی کی ابتدا یا ایجاد حضرت امیر خسروؒ نے کی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے نام سے شاعری کی ایک الگ صنف پیدا ہو گئی۔ بعد میں پنجابی، ملتان، سرانگیسی اور سندھی زبانوں میں بہت سے شعراء نے کافی لکھیں۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ کی شاعری الہامی شاعری تھی۔ آپ کبھی کبھی فنی پابندیوں سے آزاد ہو کر بھی شعر کہتے تھے تاکہ عام آدمی تک بھی درویش کا یہ پیغام پہنچ جائے۔ بعض مقام پر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت بابا بلھے شاہؒ نے بہت زہنی کا ترجمہ پنجابی زبان میں کر دیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

”میں ان بزرگوں کے قربان جاؤں جو زبانی جمع خرچ سے لوگوں کو خوش کر دیتے ہیں، مگر عملاً کچھ نہیں کرتے۔ اگر خیرات بھی کرنا ہو تو قیمتی چیزیں نہیں دیتے، بلکہ معمولی اور کمتر چیزیں دیتے ہیں۔“

فرمانِ کریم میں ایک مقام پر باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”تم ہرگز اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے، جب تک تم اللہ اور پسندیدہ چیزیں خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو، اللہ اسے خوب جانتا

”ہے۔“

حضرت بابا بلے شاہ کا ایک شعر ہے۔ ”انسان کو اپنے دل سے تکبر نکال کر اسے جلا دینا چاہئے اور اس کی کنوئیں میں پھینک دینا چاہئے۔ پھر محبوب حقیقی تجھ سے خود ہی آئے گا۔“

قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے۔ ”یقیناً اللہ تعالیٰ غرور اور تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“
حضرت بابا بلے شاہ فرماتے ہیں۔ ”حکماء کے نزدیک انسان کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا ہیں۔ میرے عناصر اربعہ یہ نہیں ہیں۔ میرے عناصر میں تو خود اللہ ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بچے میں، ہاں باب میں اور موت میں وہی جلوہ گر ہے۔ پھول اور خوشبو میں وہی موجود ہے۔ غرض کہ کائنات کے ہر ذرے میں اسی کا چمک رہا ہے۔“

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔ ”اللہ کی قدرت و وجود کے دلائل تمہارے اندر موجود ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے؟ آخر خاندانِ قادریہ کا نامور فرزند..... مے خانہ معرفت کا مسرت المست..... عاشقِ جانا..... آئینِ کابار..... اٹھا کر سر بازار فص کرنے والا صوفیؒ پاکباز..... 1171ھ میں خاموش ہو گیا۔ انتقال کے وقت حضرت بابا کی عمر مبارک ایک سو دس سال تھی۔ آپ اسی قصور میں آسودہ خاک ہوئے، جس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا۔“

”مجھے حکم مرشد سے مجبور ہو کر وہاں جانا پڑ رہا ہے، جہاں نہ کوئی نیک کام کرتا ہے، نہ سخاوت کرتا ہے اور نہ آئین نافذ ہے۔“

آج اسی قصور میں آپ کی قبر مبارک سے آئین حق کی روشنی پھوٹی ہے..... آپ کے عارفانہ کام سے جو کے دریا بہتے ہیں اور آپ کے سیرت و کردار سے متاثر ہو کر بڑے بڑے بدکار اپنے سیاہ ماضی سے تاب ہو کر مستقبل کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔

حضرت بابا بلے شاہ کا عرس مبارک ہندی مینے ”بھادوں“ کی گیارہ اور بارہ تاریخ کو ہوتا ہے۔ ملک کے عرض سے عقیدت مند جمع ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ”قادری قلندر“ کی بارگاہ میں تلاوتِ قرآن اور درودِ سلام نذرانے پیش کرتے ہیں اور دُائرین کی ایک بڑی تعداد تو ایلوں کے ذریعے اپنی عقیدت کا اظہار کرتی ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا، جب کوئی سارنگی نواز، حرار مبارک کے قریب ہر دلکش ساز نہ بجاتا ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت بابا بلے شاہ کو اپنی زندگی میں ”سارنگی“ بہت پسند تھی۔ روایتوں کے مطابق آپ خود بھی اس مہارت کے ساتھ سارنگی بجا یا کرتے تھے کہ سننے والوں پر وجد کی کیفیت ہو جاتی تھی۔

حضرت بابا بلے شاہ کے استادِ گرامی، مولانا غلام مرتضیٰ فرمایا کرتے تھے۔
”مجھے دو شاگرد ملے ہیں۔ ایک بلے شاہ، جس نے علم حاصل کر کے سارنگی پکڑ لی..... اور دوسرا سید دار جس نے ”ہیر رانجھا“ لکھی اور پھر اسے گانا شروع کر دیا۔“

حضرت بابا بلے شاہ کے وصال کے بعد ایک مفلوج الحال اور در ماندہ شخص حرار مبارک پر کئی سالوں سے دوسے رہا تھا اور اپنے کسی خاص مقصد کے لئے گریہ و زاری کے ساتھ دعائیں مانگا کرتا تھا۔ مگر ایک طویل عرصے کے بعد بھی اسے دلی مراد حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن وہ آنکھیں بند کئے معرُوف دعا تھا کہ مقررہ آواز نے اسے چمکا دیا۔ ایک ناچنے والے والی عورت، حضرت بابا بلے شاہ کے حرار مبارک کے قریب آئی

جنگل میں آواز میں آپ کی ”کافیاں“ گاتی رہی۔ پھر زور زور سے دعا مانگنے لگی۔
 ”اے اللہ! میری مراد پوری کر دے۔“
 دعا مانگنے کے بعد وہ عورت چلی گئی۔

چند روز ہی گزرے تھے کہ وہ گانے والی عورت دوبارہ حزار مبارک پر حاضر ہوئی۔ اس بار وہ اپنے ساتھ لہذینہ کھان سے بھری ہوئی دیکھیں لے کر آئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے گرد بھوکوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ ناچنے والی کی مراد پوری ہو چکی تھی اور اسی خوشی میں وہ غریبوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔

حضرت بابا بلھے شاہ کے حزار مبارک پر برسوں سے دعا مانگنے والے نامراد شخص نے یہ منظر دیکھا تو دل برداشتہ ہو اُکڑا کر رہ گیا۔ جاتے وقت اس نے حزار مبارک پر نظر ڈالی اور ناراض لہجے میں کہا۔
 ”ایک گانے والی، چار دن میں باسراد ہو گئی..... اور میں برسوں سے گریہ و زاری کر رہا ہوں مگر کوئی سنوائی نہیں آکر اور کچھ کارِ بخشنی نہیں کروں گا۔“

مگر جب وہ شخص گھر جا کر سو گیا تو حضرت بابا بلھے شاہ اس کے خواب میں تشریف لائے اور فرمانے لگے۔
 ”اللہ تعالیٰ کو گانے والی کا یہاں بار بار آنا پسند نہیں تھا، اس لئے اس کی دعا قبول کر کے فوراً ہی ٹال دیا..... مگر نہادی گریہ و زاری بہت پسند تھی۔ اس لئے تمہیں بہت دیر تک روکے رکھا۔ اگر تمہیں بھی جلدی ہے تو چلے جاؤ۔“
 دوسرے دن اس شخص کی مراد پوری ہو گئی۔



حضرت شیخ حسین لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے کہ جب ہندوستان کے تین ”فتنہ گر“ شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل فیضی، مغل شہنشاہ کے دربار میں کوئی خاص تقرب حاصل نہ کر سکے تھے۔ اور جلال الدین اکبر نے مذہب ”دین الہی“ کی شرائط کیڑوں سے پاک تھا۔ اکبر کا باپ، شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں عقیدے کے اعتبار سے امام اعظم اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک پر عمل پیرا تھا۔ نتیجتاً جلال الدین اکبر بھی ”فقہ حنفی“ کے احکام پر سختی سے کاربند رہتا تھا۔ غرض کہ دور تھا، جب اکبر ایک راسخ العقیدہ مسلمان حکمران تھا۔

ایک دن جلال الدین اکبر، تخت شاہی پر جلوہ افروز تھا کہ چند شاہی جاسوسوں نے فرماں روا کے ہندوستان اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

”عالم پناہ! لاہور میں حسین نام کا ایک شخص رہتا ہے اور خود کو درویش کہتا ہے۔ مگر اس کی یہ درویشی، مادہ اور بے خبر مسلمانوں کو گمراہی کی طرف لے جا رہی ہے۔“

”کیا وہ کوئی بد عقیدہ مسلمان ہے؟“ شہنشاہ جلال الدین اکبر نے انتہائی برہم لہجے میں اپنے جاسوسوں سے سوال کیا۔ ہر چند کہ اس وقت اکبر کوئی پرہیزگار حکمران نہیں تھا، مگر اپنی حدود سلطنت میں کسی قسم کی بغاوت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”ابھی تک اس درویش کے عقائد تو عوام پر ظاہر نہیں ہوئے، لیکن اس کے ظاہری اعمال کے سبب جال فریب کا شکار ہو رہے ہیں۔“ ایک شاہی جاسوس نے اپنی خبر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس درویش نے لاہور منڈھوا دی ہے۔ سرخ لباس پہنتا ہے۔ اور ایک خوبصورت ہندو لڑکے، مادھو کے ساتھ شراب پی کر سر بازار لڑائی ہے۔“ اکبر خود بھی داڑھی منڈھواتا تھا، شراب بھی پیتا تھا اور خلوت میں حسین عورتوں کے رقص بھی دیکھتا تھا۔ لاہور میں رہنے والے حسین نامی شخص کی اس بے راہ روی کو برداشت نہ کر سکا۔

مغل شہنشاہ نے فوری طور پر لاہور کے کوتوال ملک علی کے تمام فرمان شاہی جاری کر دیا۔ ”اس شخص کو پاب کر کے آگرہ بھیجا جائے۔ مابعد دولت چشم خود اس کا انداز درویشی دیکھنا چاہتے ہیں۔“ آگرہ اس وقت ہندو دارالحکومت تھا۔

فرمان شاہی موصول ہوتے ہی کوتوال ملک علی اس درویش کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، جو بظاہر ”مغل پناہ“ بھی آراستہ کرتا تھا اور فسق و فجور میں بھی مبتلا دکھائی دیتا تھا۔ ملک علی نے درویش کی گرفتاری کے لئے لاہور

اُن کوٹے میں اپنے جاسوس پھیلا دیئے تھے۔ مگر کوتوال شہر ابھی تک اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ملک علی کو جاسوسوں کے ذریعے اچانک اطلاع ملتی کہ وہ درویش، لاہور کے فلاں چوراہے پر اسی ہندو زادے کا ہاتھ بدستی کی حالت میں رقص کر رہا ہے۔ کوتوال شہر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے سپاہیوں کے ہمراہ، برق رفتار ٹوڑے پر سوار ہو کر اس مقام تک پہنچتا تو شاہی جاسوس بھی موجود ہوتے اور راہ گیر تماشاخی بھی کھڑے نظر آتے۔ فرد درویش اور ہندو لڑکا غائب ہوتے۔

کوتوال ملک علی، شاہی جاسوسوں پر ناراض ہو جاتا۔ ”تمہاری آنکھوں نے دھوکا کھایا اور تم نے ایک غلط اطلاع دے کر میرا نہایت قیمتی وقت برباد کر ڈالا۔“

شاہی جاسوس تمسین کھا کر کہتے۔ ”وہ دونوں ابھی یہاں موجود تھے۔ آپ کے آتے ہی غائب ہو گئے۔“
ہمراہ گیر تماشاخی بھی اس بات کی تصدیق کرتے کہ وہ درویش اور ہندو لڑکا، دونوں والہانہ رقص کر رہے تھے۔
کریا ایک نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

کوتوال ملک علی، شاہی جاسوسوں کو ہوشیار اور مستعد رہنے کی ہدایات دے کر واپس چلا جاتا۔
ہر جرب ایسا کئی بار ہوا کہ کوتوال ملک علی اپنے سپاہیوں کو لے کر پہنچتا تو درویش، ہندو لڑکے کے ساتھ ناپتے باغ غائب ہو جاتا۔ آخر شہید جھنجھلاہٹ اور مایوسی کے عالم میں ملک علی نے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے نام ایک نوکر لکھا۔

”ظن الہی! یہ خادم اُس درویش کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے عاجز آ گیا۔ وہ فقیر ہے نہ درویش۔ میں نے تو اس شخص کے بارے میں ایک ہی رائے قائم کی ہے کہ وہ کوئی شعبہ باز ہے یا جادوگر۔“
اتنا کہنے کے بعد ملک علی نے درویش کے اچانک غائب ہو جانے کے واقعات بھی پوری تفصیل سے تحریر کر دیے۔ اور فرماں روا نے ہندوستان کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

شہنشاہ اکبر، ملک علی کو توال کا خط پڑھ کر کچھ دیر تو حیرت کا اظہار کرتا رہا، پھر اس نے دوسرا فرمان جاری کیا۔
”اگر وہ شخص شعبہ باز یا جادوگر ہے تو اس کی گرفتاری اور بھی ضروری ہے۔“
کوتوال ملک علی کی پریشانیاں اور بڑھ گئیں۔ جاسوسوں کی تعداد کے ساتھ ان کی سرگرمیاں بھی تیز کر دی گئیں۔
مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

ہر ایک دن پنجاب کی تاریخ کا اہم ترین پیش آیا، جس نے صورت حال کو بدل ڈالا۔
عبداللہ بھٹی جو عام طور پر ”ڈلا بھٹی“ کے نام سے مشہور ہے، حکومت وقت کا باغی تھا۔ ایک دن گرفتار ہوا۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر کا حکم تھا کہ عبداللہ بھٹی پر قابو پاتے ہی اسے سرعام پھانسی دی جائے۔ نینجٹا عبداللہ بھٹی کے گرفتار ہونے ہی شاہی منادی، لاہور کے گلی کوچوں اور شاہراہوں پر دوڑنے لگے۔

”خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سرکش و نافرمان کا انجام دیکھنے کے لئے بازارِ نخاس میں جمع ہوں۔“
نخاس بازار اسے کہتے ہیں، جہاں گھوڑے، اونٹ، گائے، بیل اور اسی اقسام کے جانور بیچے جاتے ہیں۔

اس اعلان شاہی کے چند گھنٹوں بعد بازار میں تماشاخیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ پھانسی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا اور کوتوال ملک علی، گھر سے نکلنے کے لئے تیاریاں کر رہا تھا۔ عین اسی وقت ایک اور شاہی ہرکارہ پہنچا۔ ملک علی کے لئے شہنشاہ جلال الدین اکبر کا حکم تھا۔

”عبداللہ بھٹی پھانسی پانے سے پہلے جو کلمات ادا کرے، اسے ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔“

حکم شای کے موصول ہوتے ہی کوتوال ملک علی ایک خاص رعوت اور غرور کے انداز میں بازار خاس میں

اور اس نے انسانی جہوم کو متاثر کرنے کے لئے ایک پُر جوش تقریر کی۔
”تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کوئی مجرم یا باغی خواہ کتنا ہی حیر رفا کیوں نہ ہو، قانون کی رسائی اور
سے محفوظ نہیں۔ کچھ دیر میں عبد اللہ بھٹی کی سانسیں غصب کر لی جائیں گی۔ اس منظر کو بہت غور سے دیکھو۔
ہر سرکش و نافرمان کو ایسے ہی عبرت ناک انجام سے گزرنا پڑے گا۔“

ملک علی، عوام کے دلوں میں حکومت کا رعب و جلال اور خوف پیدا کرنے کے لئے نہایت اثر انگیز تقریر کی
تھا۔ اچانک ایک شای جاسوس نے کوتوالی شہر کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔
”آپ کا دوسرا مجرم بھی قریب ہی موجود ہے۔ فوراً ہی اسے زنجیریں پہنا دیجئے۔ کہیں پھر یہ آنکھوں سے
نہ ہو جائے۔“

کوتوال ملک علی نے گھبرا کر پوچھا۔ ”میں نہیں سمجھا کہ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“
شای جاسوس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی ہے وہ جادوگر درویش جو آپ
اقبال مندی کے سبب خود ہی سپاہیوں کے زرنے میں آ پہنچا ہے۔“

کوتوال ملک علی نے گھبرا کر اس طرف دیکھا، جدھر شای جاسوس نے اشارہ کیا تھا۔ انسانی جہوم میں ایک
اور لمبے بالوں والا دراز قامت شخص ایک خوب صورت لڑکے کو دیکھنے میں محو تھا۔ یہ خوب صورت لڑکا، باغی عداوت
کا بیٹا تھا جو اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھ کر زار و قطار رو رہا تھا۔

کوتوال ملک علی نے تقریر ختم کی اور پھر بڑی رازداری کے ساتھ اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ شای سپاہی
طرح دے قدموں آگے بڑھے، جیسے لمبی اپنے شکار پر حملہ آور ہوتی ہے۔ درویش اپنے گرد پیش سے بے خبر
بھٹی کے بیٹے کو دیکھے جا رہا تھا کہ یکایک بہت سے ہاتھ بڑھے اور درویش کو جکڑ لیا گیا۔ اتنے میں کوتوال ملک
بھی وہاں پہنچ گیا اور درویش کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے خندہ زن ہوا۔

”لوگوں کو بہت شعبہ بازیوں دکھاتا تھا۔ ٹو نے میرا ہنر دیکھا؟ اب اپنی جادوگری سے کام لے اور فرار ہو
دکھا۔“

سپاہیوں کی گرفت مضبوط ہونے کے باوجود درویش کے چہرے پر وہی اطمینان جھلک رہا تھا جیسے وہ ہر قید و
سے آزاد ہو۔ ”ہم نے خود اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا ہے اور اس میں بھی قدرت کا ایک راز ہے۔“
”قانون کی گرفت میں آنے والا ہر مجرم یہی کہتا ہے۔“ کوتوال ملک علی نے اپنی کامیابی پر ایک اور فتح کا
پھر اس کے حکم پر درویش کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔

انسانی جہوم جو عبد اللہ بھٹی کی چٹائی کا منظر دیکھنے کے لئے ”بازار خاس“ میں جمع ہوا تھا، اب اس طرف متوجہ
کیا۔ اکثریت اس درویش سے واقف تھی، جو شراب پی کر ڈھول کی تھاپ پر سر بازار رقص کرتا تھا۔ ملک علی کے
سپاہی، درویش کو زنجیروں سے جکڑتے رہے۔

پھر دوسرے ہی لمحے لوگوں کی نظروں کے سامنے ایک ناقابل یقین منظر تھا۔ تمام زنجیریں ٹوٹ کر زمین پر گر
پڑی تھیں۔ اور درویش کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”ٹو نے دیکھ لیا، اپنی تدبیر کا انجام؟“ درویش کے لہجے میں ہوا سرفراہ
اپنے اسی ہنر پر نازاں تھا؟“ درویش نے ملک علی کے کہے ہوئے الفاظ کی کوٹھالی دی۔
”دوبارہ زنجیریں پہناؤ۔“ ملک علی نے غصہ ناک لہجے میں اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

افرنس درویش کو دوبارہ زنجیریں پہنائی گئیں۔ اور ان کا بھی وہی مشر ہوا۔ جیسے نادیدہ ہاتھوں نے ان زنجیروں کو درویش کے جسم سے الگ کر دیا ہو۔
انسانی جہم کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ اور انہیں ایسا ہی لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی بہت بڑے جادوگر کا اہلکار پلپ کیل دیکھ رہے ہیں۔

”مے نے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ جب تک ہم خود زنجیریں نہیں پہنیں گے، اس وقت تک ہمیں کوئی پایہ زنجیر نہیں لگنا۔“ درویش نے انسانی جہم کے سامنے نعرہ مستانہ بلند کیا۔
”میں تیری اس جادوگری کو ختم کر کے ہی رہوں گا۔“ ملک علی پوری طاقت کے ساتھ چیخا۔ اسے انسانی جہم کے ماتے بڑی ذلت محسوس ہو رہی تھی۔

”افرنم مجھے کیوں گرفتار کرنا چاہتے ہو؟“ درویش نے انتہائی قحط کے ساتھ کوتوال شہر سے پوچھا۔ ”میں نے کہتے کا کون سا گناہ کیا ہے؟ کس شہری کو اذیت پہنچائی ہے؟“
”غیر شرعی حرکات کرتا ہے۔“ ملک علی نے قہر آلود لہجے میں جواب دیا۔
”ہندوستان میں غیر شرعی حرکات تو لاکھوں انسان کرتے ہیں۔ پھر انہیں گرفتار کیوں نہیں کیا جاتا؟“ درویش نے برہنہ کہا۔

ایک لمحے کے لئے ملک علی لا جواب سا ہو گیا۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر اس نے درویش پر دوسرا وار کیا۔ ”تو سر عام شراب پی کرنا چتا ہے اور لوگوں کو گناہ کی ترغیب دیتا ہے۔“

”تم اور دوسرے امراءے سلطنت چھپ کر شراب پیتے ہیں۔“ درویش انتہائی مدلل اور ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ ”میں تو شراب پی کر خود ناچتا ہوں، مگر تم تو معصوم لڑکیوں کو نچاتے ہو۔ کیا خلوت میں شراب پینا اور رقص دیکھنا ہوتا ہے؟ پھر تمہارا بادشاہ ان امراءے سلطنت کو گرفتار کیوں نہیں کرتا؟“ اپنے حال میں مست رہنے والے درویش کی زبان، ششیر برہنہ بن چکی تھی۔

”تیرے اندر بھی حکومت کے خلاف بغاوت کے آثار پائے جاتے ہیں۔“ کوتوال ملک علی نے انتہائی مکاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”اب میں تجھے دہرے جرم میں گرفتار کروں گا۔ ایک یہ کہ تو سر عام غیر شرعی حرکات کا رعب ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ امراءے سلطنت کی شان میں گستاخانہ کلمات ادا کرتا ہے، جو آئین حکومت کے مطابق ذاتِ خود ایک بہت بڑا جرم ہے۔“

کوتوال ملک علی کی قہر ناک گفتگو سن کر درویش مسکرایا۔ ”چل! ہم ایک نئے تماشے کے لئے خودی زنجیریں پہن لیتے ہیں۔ تو اپنے دل کی تمام حسرتیں نکال لے۔“

ملک علی نے تیسری بار درویش کو زنجیریں پہنانے کا حکم دیا اور درویش کو مخاطب کر کے بولا۔ ”اگر اب کی بار تو نے اپنے جادو کے زور سے زنجیریں توڑیں تو میں تیرے پیروں میں اپنی میخیں ٹھوک دوں گا۔“

کوتوال شہر کی بات سن کر درویش زور سے ہنسا۔ ”ہماری آنکھیں تو کچھ اور ہی منظر دیکھ رہی ہیں۔“
”کیا منظر؟“ ملک علی نے گھبرا کر پوچھا۔ انتہائی طاقت رکھنے کے باوجود وہ درویش کے جادوئی کلمات سے ہراساں تھا۔

”یہاں کہ ہمیں ہاتھوں کی زنجیریں اور پیروں کی بیڑیاں، پھولوں کے ہار نظر آ رہے ہیں۔“ درویش نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی نظریں کوتوال ملک علی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ ”مجھے ایک منظر اور

بھی دکھائی دے رہا ہے کہ کچھ نادیدہ ہاتھ تمہارے سر میں میخیں ٹھونک رہے ہیں۔“
 درویش کی بات سن کر کوتوال ملک علی غصے سے بے قابو ہو گیا۔ ”تُو نے اپنی معافی کے رہے ہے اگلا ختم کر دیئے۔ میری تباہی کا منظر دیکھنے والی آنکھیں بھی سلامت نہیں رہ سکتیں۔ ان میں سلاخیاں بھر دو اور بیروں میں میخیں ٹھونکوں گا۔“

برائے بادشاہوں نے اپنے حریفوں اور دشمنوں کو اندھا کرنے کا بڑا بے رحمانہ طریقہ ایجاد کیا تھا۔ سلاخ کو آگ کی بھٹی پر رکھ کر تپایا جاتا تھا۔ پھر جب وہ سرخ سرخ ہو جاتی تھی تو اسے مقرب شخص کی آنکھ پر پھیر دیا جاتا تھا۔ لاہور کے کوتوال ملک علی نے درویش کو اسی دردناک سزا کی دھمکی دی تھی۔
 پھر کوتوال شہر کے سپاہی، درویش کو پایہ زنجیر کر کے قید خانے کی طرف لے گئے اور ملک علی، حکومت کے عبد اللہ بھٹی کی طرف بڑھ گیا۔ جو زنجیروں میں جکڑا ہوا، پھانسی کے پھندے کے نیچے کھڑا تھا۔
 کوتوال شہر، مجرم کے قریب آیا اور عبد اللہ بھٹی سے غضب ناک لہجے میں مخاطب ہوا۔ ”تُو نے دیکھی ہے شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی طاقت؟ کہاں ہیں تیرے ساتھی لیرے؟ انہیں آواز دے کہ وہ تجھے چڑا کر جائیں۔“

عبد اللہ بھٹی اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اور موت اسے اپنا خونی دہن کھولے ہوئے سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس لئے اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ مشتعل ہو کر مغلظات کہنے لگا۔ عبد اللہ بھٹی کو جس قدر گالیاں تھیں، وہ سب کی سب شہنشاہ ہند کو غائبانہ دے ڈالیں۔

شاہی جلاد تیزی سے آگے بڑھے اور حکومت کے باغی کو اس کے انجام تک پہنچا دیا۔ کچھ دیر بعد اہل ہند نے یہ لرزہ خیز منظر دیکھا کہ عبد اللہ بھٹی کی لاش، پھانسی کے پھندے پر جھول رہی ہے۔
 عبد اللہ بھٹی کو قبر تک اور درویش کو زندان تک پہنچانے کے بعد کوتوال ملک علی نے شہنشاہ اکبر کے ہاں طویل خط تحریر کیا۔

”کھل الہی! اس غلام نے آپ کے نافرمان، عبد اللہ بھٹی کو خاک میں ملا دیا۔ مگر اس نے مرنے پر ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں حضور والا کے لئے بڑے نازیبا الفاظ استعمال کئے جنہیں لکھتے وقت میرا قلم رہا ہے۔“

اکبر کا حکم تھا کہ عبد اللہ بھٹی مرنے سے پہلے جو کچھ کہے، اسے حرف بہ حرف تحریر کیا جائے۔ کوتوال ملک علی حماقت یہ ہوئی کہ وہ فرمان شاہی کی نزاکت اور گہرائی کو سمجھنے سے قاصر رہا اور جوش میں وہ سارے بے ہوش پوری تفصیل کے ساتھ لکھ گیا، جو عبد اللہ بھٹی نے فرماں دوائے ہندوستان کے لئے استعمال کئے تھے۔

اس کے بعد کوتوال ملک علی نے اس بادہ نوش اور رقا ص درویش کے بارے میں سارے واقعات قلم بند ہوئے لکھا۔ ”اس جادوگر نے کئی بار میری پہنائی ہوئی زنجیریں توڑ ڈالیں..... مگر میں نے حضور کی اقبال سہارا لے کر بالآخر اسے اسیر کر ہی لیا۔ اب وہ بے دست و پا کی حالت میں میرے قید خانے کے اندر ہے اور ہوتو میں اس زندانی کو کھل الہی کے ملاحظے کے لئے دارالحکومت روانہ کر دوں۔“

جب مغل شہنشاہ اکبر نے کوتوال ملک علی کا خط پڑھا تو شدت غضب سے کا پٹنے لگا اور سر درباری ٹرن اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اس مردود کوتوال نے خط لکھتے وقت اس کا لحاظ بھی نہیں کیا کہ وہ ہمارے نام لکھنا ساتھ کیسے کیسے شرم ناک الفاظ تحریر کر رہا ہے۔ کیا ملک علی یہ نہیں لکھ سکتا تھا کہ اس لعنت زدہ باغی نے ہمارا نام

نہایت ادا کئے؟“

اں کے بعد شہنشاہ اکبر نے اپنے ایک معتمد خاص کو لاہور کا کوتوال نامزد کیا اور پھر ملک علی کی موت کا فرمان جاری کیا۔

”اں ہتھار کے دماغ میں اتنی میخیں ٹھونکی جائیں کہ وہ تڑپ تڑپ کر جان دیدے۔“
بلکہ لاہور کے باشندوں کو ”بازار خناس“ میں اس لئے جمع کیا گیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے حکومت کے ایک ہتھکنڈے کا انجام دیکھیں۔

درویشی میدان تھا اور وہی تماشا شائی تھے۔ مگر کردار کے ساتھ ساتھ انداز بھی بدل گیا تھا۔ آج جس شخص کو ”بازار خناس“ میں پہلے زنجیر کر کے لایا جا رہا تھا، چند روز پہلے وہ حکومت ہندوستان کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔
درویش کے ہاتھ اے کوٹوال ملک علی کے نام سے خوب پیچھتاتے تھے۔

بارب ملک علی کے دماغ میں آہنی میخیں ٹھونکی جا رہی تھیں اور اس کی دردناک چیخیں پورے میدان میں گونج رہی تھیں۔ لاہور کے شہریوں کو وہ درویش یاد آ رہا تھا، جس نے قید خانے جانے سے پہلے کوٹوال ملک علی کو با آواز بولنے پر مجبور کیا تھا۔

”مجھے ایک منظر اور بھی دکھائی دے رہا ہے کہ کچھ نادیدہ ہاتھ، تمہارے سر میں میخیں ٹھونک رہے ہیں۔“
جس شخص کو اہل دینا نے شراب نوش، رقاص اور جادوگر کہہ کر پکارا، وہ سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ گنہگار لاہوری تھے۔



حضرت شیخ حسین رحمہ اللہ کے سال پیدائش پر تمام تذکرہ نگار متفق ہیں۔ آپ 945ھ میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت آپ کا مکان لاہور میں نکسالی دروازے کے باہر محلہ ”تل بگھ“ میں تھا۔
”نفیث الغفر“ کے مصنف شیخ پیر محمد، حضرت شیخ حسینؒ کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

”حضرت شیخ حسینؒ کا مشہور نام ڈاہڈا حسینؒ ہے۔ اور ”ڈاہڈا“ پنجاب کے راجپوتوں میں ایک ذات ہے۔
اس روایت کے مطابق شیخ پیر محمدؒ، مادھو لال حسینؒ کے خادم خاص تھے اور مادھو لال حسینؒ، حضرت شیخ حسینؒ کا محبوب غافلہ تھے۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ شیخ پیر محمدؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کے بہت سے معمولات و واقعات یاد رکھے ہوں۔

حضرت شیخ حسینؒ کے مورث اعلیٰ ہندو تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں آپ کے دادا کلسرائے، غلام میں داخل ہوئے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے حضرت شیخ حسینؒ کے دادا کا نام ”گلجس رائے“ تحریر کیا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کا نام گلس تھا اور ”رائے“ ذات تھی۔ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو ایک اور تاریخی حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندوؤں میں ”رائے“ خاندان کا تعلق بنگال سے ہے۔ اور حضرت شیخ حسینؒ کے مورث اعلیٰ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ اس لئے زیادہ صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کے دادا کا نام گلس رائے یا گلجس رائے ہی تھا۔ رائے خاندان سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

”اولیائے لاہور“ کے مؤلف کے مطابق جب کلسرائے مسلمان ہوا تو اس نے ”شیخ الاسلام“ کا خطاب پایا۔
میں نے یہ کہ جب کوئی شخص علم حدیث میں کمال حاصل کرتا تھا تو بعد میں آنے والے لوگ مذکورہ عالم کو ”محدث“ کے لقب یا خطاب سے یاد کرتے تھے۔ فقہ کے عالموں کو ”امام“ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور دیگر علمائے

اسلام کے لئے ”شیخ الاسلام“ کا لقب مخصوص تھا۔ سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت بابا فریدؒ بھی شیخ کہلاتے تھے۔ اسی طرح سلسلہ سہروردیہ کے نامور صوفی حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی ذات گرامی کے لئے بھی ”شیخ الاسلام“ کا خطاب منسوب ہے۔ شاہان وقت اور سلاطین زمانہ کی طرف سے کسی بزرگ کی خدمت و اعتراف کے طور پر ”شیخ الاسلام“ کا خطاب مرحمت کیا جاتا تھا۔

حضرت شیخ حسین لاہوریؒ کے مورث اعلیٰ کو ”شیخ الاسلام“ کا خطاب ملنا بعید از قیاس ہے۔ دراصل راجہ شخص کے دینی یا علمی کارناموں کا انعام ہوتا تھا۔ اور نو مسلم کھسرائے کا کوئی دینی یا علمی کارنامہ کی تاریخ میں نہیں۔ تمام تذکرہ نگاروں نے کھسرائے کے مسلمان ہونے کی روایت تو قلم بند کر دی، مگر کسی مورخ نے اس طرز نشاندہی نہیں کی کہ کھسرائے نے مذہب کی تبدیلی کے بعد کون سا اسلامی نام اختیار کیا؟ ہمارا خیال ہے کہ کھسرائے نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام ”شیخ الاسلام“ رکھا۔ ہمارے اس خیال کو اس روایت سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل برصغیر ہندوستان میں بہت سی چھوٹی بڑی قومیں آباد تھیں۔ پھر جب کوئی بات پر خدائے واحد پر ایمان لاتا تھا تو معاشرے میں اپنی قومی حیثیت کے مطابق اسلامی نام رکھتا تھا۔ اس بات کو یاد رکھا جاسکتا ہے کہ کابل اور غزنی کے گرد و نواح میں ”افغان“ قوم کو برتری حاصل تھی۔ اور پھر ہندوستان میں اس سلطنت کی مستحکم بنیاد رکھنے والا، شہاب الدین غوریؒ بھی افغان تھا۔ اس لئے جب ہندوؤں کی اعلیٰ ترین ”راجپوت“ سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد کلمہ طیبہ پڑھتا تھا تو اسلامی نام کے ساتھ ”خان“ کا لفظ بھی استعمال کرتا کہ مسلمان ہونے کے باوجود اس کی قومی برتری قائم رہے۔ آج بھی بہت سے مسلمانوں میں یہی رسم رائج ہے اور کچھ ناموں کے ساتھ ”ٹھاکر“ اور ”خان“ دونوں الفاظ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کچھ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے اپنے ناموں کے ساتھ صدیقی، قادری، عثمانی، علوی، قریشی، زبیری اور عباسی کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ واضح رہے کہ پاک و ہند میں مہاجر کرام حقیقی وارث بھی آباد ہیں۔ مگر ان کی تعداد محدود ہے۔ انقلاب زمانہ کے باعث ان عظیم خاندانوں میں شمولیت دعویدارہ لوگ بھی ہیں جو قبول اسلام کے بعد قریشی، ہاشمی یا عباسی بن گئے تھے۔ اسی طرح جب ہندوؤں میں چھوٹی ذات کے لوگ مذہب تبدیل کرتے تھے تو اپنی پہچان کو محترم بنانے کے لئے ”شیخ“ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ کے معنی بزرگ کے ہیں۔ ان ہی تاریخی حقائق کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کے دادا کھسرائے ”حلقہ تشع و زار“ سے نکلے اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اپنا نام شیخ اسلام رکھا تھا۔ جسے ہمارے تذکرہ نگاروں نے کسی حقیقت کے بغیر ”شیخ الاسلام“ بنا دیا۔

حضرت شیخ حسین لاہوریؒ کے خاندان اور قوم کے بارے میں جس قدر روایتیں مشہور ہیں، وہ سخت غلطانہ شکار ہیں۔ ”اولیائے لاہور“ کے مؤلف نے لفظ ”ڈاڈا“ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ پنجاب کے راجپوتوں کی ایک ذات (قوم) ہے۔

”بزرگان لاہور“ کا مؤلف تحریر کرتا ہے کہ ”ڈاڈا“ جولاہوں کی ایک ذات ہے۔ کہاں راجپوت اور کہاں جولاہے؟ تاریخ کی اس تضاد بیانی سے قطع نظر شیخ اسلام (کھسرائے) کے یہاں جولاہ کا پیدا ہوا، ماں باپ نے ان کا نام عثمان رکھا۔ کسی بھی تذکرے میں شیخ عثمان کی زندگی کے حوالے سے تفصیلات نظر نہیں آتیں۔ اور اس کی بنیاد وجہ یہ ہے کہ شیخ عثمان ایک سیدھے سادے، غیر معروف مسلمان تھے۔ کپڑاؤں کر اپنے بیوی بچوں کا پہنا ہوا تھا۔ اس لئے لاہور میں عثمان ڈاڈا (جلاہے) کے نام سے مشہور تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ روانہ عام

لڑائی اہل ذات کے فرد نے ایک حقیر پیشہ اختیار کر لیا تو وہی پیشہ اس کی قوم بن جاتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ شیخ اہل کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا ہو۔ بہر حال، اسلام پہلا اور آخری مذہب ہے، جو نہایت شدت کے ساتھ "اتان" اور قومیت کی نفی کرتا ہے۔ اللہ کے نزدیک معیار شرافت یہ ہے کہ "جو زیادہ پرہیزگار ہے، وہی زیادہ گرامی ہے۔"



شیخ عثمان کو حق تعالیٰ نے ایک خوب صورت فرزند عطا فرمایا۔ ماں باپ نے اپنے بچے کا نام حسین رکھا۔ پھر رسم اللہ کے مطابق شیخ حسین کو قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مولانا ابوبکرؓ کے مدرسے میں بھیج دیا۔ مولانا، مولانا دروازے کے محلے میں رہتے تھے۔ یہاں ایک مسجد تھی اور اس سے ملحقہ ایک مدرسہ تھا۔ مولانا ابوبکرؓ، حافظ قرآن بھی تھے اور عالم بھی۔ پانچویں وقت نمازوں کی امامت بھی فرماتے تھے۔ اور بچوں کو دینی تعلیم بھی دیتے۔ حضرت شیخ حسین سات سال کی عمر میں مولانا ابوبکرؓ کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ پھر تین سال کے طویل ایام میں قرآن کریم کے صرف چھ پارے حفظ کئے۔ اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ بڑی حریفانہ حفظ کے مالک نہیں تھے ورنہ اسی سات سال کی عمر میں حضرت امام شافعیؒ نے پورا قرآن کریم حفظ کر لیا۔

نہ اسی وقت کے نامور حفاظ کرام کے سامنے پوری صحت کے ساتھ سامی دیا تھا۔ انہی حضرت شیخ حسینؒ اپنے استاد گرامی مولانا ابوبکرؓ کی نگرانی میں کلام الہی کو اپنے سینے میں محفوظ کر رہے تھے لہذا ایک دن ایک خدارسیدہ بزرگ حضرت شیخ بہلول دریاویؒ، مدرسے میں تشریف لائے۔ حضرت شیخ بہلولؒ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ آپ اپنے وقت کے جلیل و شریف تھے۔ اس سے آپ کے کائنات مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت شیخ بہلولؒ کا حراج سیاحانہ تھا۔ آپ ہمیشہ سیر و سفر میں رہتے تھے۔ انہی نے ایک دن برسر مجلس سوال کیا۔ "شیخ! آپ کو نعمت باطنی کس طرح حاصل ہوئی؟"

جواب میں حضرت شیخ بہلولؒ نے فرمایا۔ "مجھے جو کچھ عطا ہوا، پیر و مرشد کی مہربانی اور سفر کی برکات سے۔"

حضرت شیخ بہلولؒ نے اپنے روحانی سفر کا آغاز حج بیت اللہ سے کیا۔ پھر آپ سرکارِ دو عالم ﷺ کے روضہ فیض پر درود سلام کے لئے حاضر ہوئے۔ اور تقریباً چھ ماہ تک مسجد نبویؐ میں مستغرق رہے۔

اس کے بعد ختم المصلین، رحمۃ اللعالمین ﷺ کی بارگاہ اطہر سے حکم ہوا۔ "اب تم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی بات کے لئے بغداد حاضری دو۔" رسالت مآب ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت شیخ بہلولؒ، حضرت غوث اعظمؒ کے دربار مبارک پر حاضر ہوئے اور ایک سال تک فیض روحانی حاصل کرتے رہے۔ پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے حکم سے تین بزرگوں کی خدمت میں حاضری دیتے رہے۔ آخر میں ایک مجذوب کی خدمت میں حاضر ہوئے، ایک ماہ میں برسوں سے چلے بس تھے۔ کسی تذکرہ نگار نے ان مجذوب کا نام تحریر نہیں کیا ہے۔ حضرت شیخ بہلولؒ ان مجذوب کو مرد حق کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

پھر ایک دن اسی عارف شریف نے حضرت شیخ بہلولؒ کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ "بہلول! اب تم لاہور جا کر عین کی رہنمائی کرو۔"

مرد حق کا اشارہ حضرت شیخ حسینؒ کی طرف تھا، جن کی عمر مبارک اس وقت صرف دس سال تھی۔ اور وہ مولانا کے مدرسے میں قرآن کریم حفظ کر رہے تھے۔

جب حضرت شیخ بہلولؒ لاہور پہنچ کر مدرسے میں داخل ہوئے تو مولانا ابوبکرؒ آپ کے احترام میں کمرے گئے۔ حضرت شیخ حسینؒ بھی استاد گرامی کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضرت شیخ بہلولؒ نے نو عمر طالب علم بہلولؒ کی نظر ڈالی اور مولانا ابوبکرؒ سے پوچھا۔

”مولانا! اس بچے کا کیا نام ہے؟“

جواب میں مولانا ابوبکرؒ نے مودبانہ لہجے میں عرض کیا۔ ”شیخ! یہ میرا شاگرد حسین ہے۔ اور قرآن کریم پڑھتا ہے۔“

حضرت شیخ بہلولؒ، حسین کے نام پر چونکے۔ کیونکہ مرد حق کی بارگاہ سے آپ کو حسین نامی شخص کی ہدایت دیا گیا تھا۔ حضرت شیخ بہلولؒ کا خیال تھا کہ حسین کوئی جوان سال یا پختہ عمر کا طالب حق ہو گا۔ مگر جب آپ نے دس سالہ بچے کو سامنے پایا تو حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

”تو وہ حسین تم ہو، جس کے لئے ہمیں لاہور بھیجا گیا ہے؟“

حضرت شیخ بہلولؒ کا استاد گرامی سن کر مولانا ابوبکرؒ بھی چونکے۔ ”شیخ! بات کیا ہے؟“

حضرت شیخ بہلولؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”ہمیں اس لڑکے کی پیشانی پر کوئی اور ہی تحریر نظر آتی ہے۔ حسین کو مکتبوں اور مدرسوں کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔“

حضرت شیخ بہلولؒ کے اس مبہم جواب سے صاف نظر آ رہا تھا کہ آپ مولانا ابوبکرؒ سے اس راز کو چھپانا چاہتے ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد حضرت شیخ بہلولؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”لڑکے! تم بھلا کے لئے دریا سے پانی لے کر آؤ۔“ اگرچہ مولانا ابوبکرؒ کے مکتب میں پانی کا انتظام تھا، لیکن حضرت شیخ بہلولؒ سے پانی منگوانا بھی شاید کوئی راز تھا۔ اور اس راز کو حضرت شیخ بہلولؒ ہی بہتر سمجھتے تھے۔

حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے استاد گرامی سے اجازت لی اور پانی کا برتن اٹھا کر دریائے راوی کی طرف گئے، جو مدرسہ کے قریب ہی بہتا تھا۔

پانی لانے کے بعد حضرت شیخ حسینؒ نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ اس بزرگ کو وضو کرایا، جس کے سے بھی آپ واقف نہیں تھے۔

وضو کرنے کے بعد حضرت شیخ بہلولؒ نے رب ذوالجلال کی بارگاہ میں اپنے ہاتھ بھی پھیلا دیے اور دالوں کی ”اے اللہ!..... اپنے بندوں کو بے حساب دینے والے!..... میں تجھ سے حسین کے لئے سوال کرتا ہوں۔“

مولانا ابوبکرؒ تو حضرت شیخ بہلولؒ کے الفاظ کی معنویت اور گہرائی سے واقف تھے، مگر حضرت شیخ حسینؒ کے باوجود ایک مرد درویش کے لہجے کے گداز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کو فوری طور پر محسوس ہوا کہ لہریں ہی آپ کے جسم مبارک میں دوڑ رہی ہیں۔



اس کے بعد حضرت شیخ بہلولؒ نے کئی ماہ تک مولانا ابوبکرؒ کے مدرسے میں قیام فرمایا۔ ان دنوں مبارک کا مہینہ آگیا۔ چاند نظر آنے سے دو تین دن پہلے حضرت شیخ بہلولؒ نے مولانا ابوبکرؒ سے فرمایا۔

”مولانا! میری خواہش ہے کہ اس رمضان میں آپ کا شاگرد حسین، تراویح میں قرآن کریم سنانے۔“

مولانا ابوبکرؒ نے بڑی حیرت سے حضرت شیخ بہلولؒ کی طرف دیکھا اور نہایت عجز کے ساتھ کہا۔

”خارج کیسے ممکن ہے؟“ ابھی تو حسین نے صرف سات پارے حفظ کئے ہیں۔“ مولانا ابوبکرؒ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ان میں سے کتنے پارے باقی ہیں۔ جب اس نے تین سال میں سات پارے حفظ کئے ہیں تو پھر ایک ماہ میں باقی کتنے پارے حفظ کرے گا؟

حضرت شیخ بہلولؒ نے تبسم و اغوار کے ساتھ فرمایا۔ ”مولانا! آپ اپنے شاگرد کو اجازت کے ساتھ دعائیں تو پڑھ رہے ہیں کہ پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“

”میری طرف سے اجازت ہے۔“ مولانا ابوبکرؒ نے کہا۔ مگر ان کی آنکھوں میں شدید حیرت کا رنگ بدستور تھا۔ ”میری دعائیں بھی حسین کے ساتھ ہیں۔“

مولانا ابوبکرؒ نے حضرت شیخ بہلولؒ کے احترام میں بظاہر سب کچھ کر دیا تھا۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ حضرت شیخ حسینؒ غیر حفظ شدہ پارے، نماز تراویح میں کس طرح سنائیں گے؟

بالآخر وہ مبارک دن آ گیا، جب حضرت شیخ حسینؒ نے دس سال کی عمر میں سینکڑوں اہل ایمان کی امامت کی۔

برصغیر میں حضرت شیخ بہلولؒ جیسے خدا رسیدہ اور باکرامت بزرگ بھی موجود تھے۔

حضرت شیخ حسینؒ نے نماز تراویح میں نہایت خوش الحانی اور اعتماد کے ساتھ قرآن کریم کا پہلا پارہ سنایا۔ عام لوگ یہ نہ کی بلکہ حافظ کی زبان خور و زور لڑکھڑاتی ہے جسے ”سامع“ درست کر دیتا ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر حضرت شیخ حسینؒ انتہائی روانی کے ساتھ کلام پاک سناتے رہے۔ یہ حضرت شیخ بہلولؒ کی موجودگی کی برکت تھی کہ حضرت شیخ بہلولؒ کی مقام پر نہیں آ سکتے۔..... اور سبک روی سے گزر گئے۔

آخر میں سات پارے سنانے کے بعد حضرت شیخ بہلولؒ کے حجرے میں داخل ہوئے، جہاں آپ تہا تھے اور ذکر الہی مشغول تھے۔

”شیخ محترم! آج رات کیا ہوگا؟“ نو عمر حافظ پریشان نظر آ رہا تھا۔ ”مجھے تو آگے ایک لفظ بھی یاد نہیں۔“

حضرت شیخ حسینؒ کی بے قراری دیکھ کر جو وحشت کے درجے تک پہنچ گئی تھی، حضرت شیخ بہلولؒ نے فرمایا۔

”بسم نے الحمد للہ رب العالمین پڑھا تھا تو کیا اس سے پہلے تمہیں یہ آیت مقدسہ یاد تھی؟“

حضرت شیخ حسینؒ نے جواباً عرض کیا۔ ”پہلے والدین اس آیت مقدسہ کو پڑھتے تھے اور میں دہراتا تھا۔ دو تین بار انوکھ سے یاد ہو گئی۔“

”تمہیں یاد کرنے کی صلاحیت کس نے بخشی؟“ حضرت شیخ بہلولؒ نے کم سن حافظ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اللہ نے۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے نہایت ادب کے ساتھ جواب دیا۔

”تو پھر یقین کر لو کہ جس اللہ نے تمہیں سات پارے حفظ کرائے ہیں، وہی آگے بھی دیکھری فرمائے گا۔“

یہ کہتے ہوئے حضرت شیخ بہلولؒ کے چہرہ مبارک پر ایک عجیب سی روشنی ابھر آئی۔ اور وہ ایمان و یقین کی روشنی تھی۔

”مگر شیخ محترم! مجھے تو قرآن کریم کے سات پارے حفظ کرنے میں تین سال لگے تھے۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے اہل فکر اور ذہن کی رسائی کے مطابق عرض کیا۔

”زند اللہ تعالیٰ، زمان و مکان کی قید سے آزاد اور اسباب ظاہری سے بے نیاز ہے۔“ حضرت شیخ بہلولؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”اگر وہ چاہے تو انسان صدیوں کا سفر ایک لمحے میں طے کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ نہ چاہے تو انسان صدیوں میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس نے صرف ایک لفظ ”مکن“ کہا۔ ہو جا۔ اور پھر

سب کچھ ہو گیا۔ یہ رنگارنگ عالم اور ایسے بے شمار عالم، عدم سے وجود میں آ گئے۔ جو ذات پاک چہلوں میں پیچیدہ اور مشکل ترین چیز تخلیق کر سکتی ہے، کیا وہ ایک رات میں تمہیں اپنے کلام کا ایک پارہ حفظ نہیں کر سکتی؟ حضرت شیخ حسینؒ ایک مردِ خدا کی گفتگو کے اسرار و رموز سمجھنے سے قاصر تھے۔ ”اللہ تو بے پناہ قدرت و شہادتِ محترم! مگر میں اس قابل نہیں ہوں۔“ حضرت شیخ حسینؒ کے لہجے سے فکر و پریشانی جھک رہی تھی۔

”وہ ذات پاک و بے نیاز و عقرب تمہیں بھی اس قابل بنا دے گی۔“ حضرت شیخ بہلولؒ نے نورِ ملامت دیتے ہوئے فرمایا۔ ”حسین! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ ایک عالم اسباب ظاہری کی تلاش میں رہتا ہے اپنے عمل پر ناز کرتا ہے۔ اور صوفی اپنے اعمال کو بے حقیقت سمجھ کر صرف مالک کی رحمت پر یقین رکھتا ہے۔ رات اللہ کی وہی بے مثال رحمت تم پر سایہ فگن ہو گی۔“

اس کے بعد حضرت شیخ بہلولؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کو ہدایت کی۔ ”پہلے اس نیت کے ساتھ وضو کرنا کہ رحمت کے سائے میں کھڑے ہو۔ پھر نمازِ ظہر ادا کرو۔ اس کے بعد دریائے راوی سے میرا کوزہ بھراؤ۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے حضرت شیخ بہلولؒ کی ہدایت پر عمل کیا اور ظہر کی نماز ادا کر کے دوبارہ حضرت شیخ بہلولؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر جب کوزہ لے کر دریا کی طرف جانے لگے تو حضرت شیخ بہلولؒ نے دوسری ہدایت کی۔ ”جب تم میرا کوزہ پانی سے بھر چکو گے تو تمہیں ایک سبز پوش شخص، دریا کے کنارے نظر آئے گا۔ وہی آئندہ کے لئے ہدایت دے گا۔ اس شخص کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو اپنے ذہن میں محفوظ کرو۔“ حضرت شیخ حسینؒ، حضرت شیخ بہلولؒ کے پانی کا کوزہ لے کر دریائے راوی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اگرچہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے، لیکن پھر بھی آپ کا ایک ایک قدم حیرت کی کیفیت میں جکڑا ہوا تھا۔ حضرت شیخ حسینؒ تو بچے تھے، اگر اس موقع پر کوئی عمر رسیدہ شخص بھی ہوتا تو وہ بھی حیرت پر اسراریت کے اس طلسم سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔

حضرت شیخ حسینؒ حیرت و تجسس اور شوق کے انتہائی جذبات لئے دریائے راوی کے کنارے پہنچے۔ آپ مضطرب نگاہوں نے دریا کے اطراف کا جائزہ لیا۔ فضا ساکت اور دیران تھی۔ دور دور تک کوئی انسان تو کجا، نہ پانی پینے والے پرندے اور چرندے تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہر وقت اُچھلنے والی مچھلیاں خاموش تھیں۔ اُجالے میں ہر طرف ایک عجیب سا ”ہو“ کا عالم تھا۔ حضرت شیخ حسینؒ کی بے قرار نظریں اس سبز پوش انسان کو ڈھونڈ کر تھیں، جس کے بارے میں حضرت شیخ بہلولؒ نے ہدایت کی تھی۔ پھر کچھ دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد حضرت شیخ حسینؒ مایوس ہو گئے تو یکایک آپ کی سماعت میں حضرت شیخ بہلولؒ کے الفاظ گونجنے لگے۔

”جب تم میرا کوزہ پانی سے بھر چکو گے تو تمہیں دریا کے کنارے ایک سبز پوش انسان نظر آئے گا۔“ حضرت شیخ حسینؒ کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آپ نے دل ہی دل میں حضرت شیخ بہلولؒ سے مانگی۔ پھر تیزی سے پانی کا کوزہ بھرا اور سیدھے کھڑے ہو کر اپنے دائیں جانب نظر ڈالی۔ دریائے راوی کے کنارے چند گز کے فاصلے پر ایک سبز پوش بزرگ موجود تھے، جنہیں دیکھ کر حضرت شیخ حسینؒ کو کچھ دیر کے لئے سکھ رہا ہوا۔ سبز پوش بزرگ کا چہرہ اس قدر نورانی تھا کہ حضرت شیخ حسینؒ کی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

سبز پوش بزرگ، حضرت شیخ حسینؒ کے قریب آئے۔ اس ملاقات کا حال ایک فارسی شاعر نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ جس کا ترجمہ ذیل میں تحریر کیا جا رہا ہے۔

”بزرگ نے کہا۔ اے لڑکے! تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔ میں اللہ ہی کے حکم سے تیرے پاس آیا ہوں۔“

مطلب (السلام) کی حیثیت سے پہچان لے۔ تاکہ تیرے دل میں کوئی دوسرہ پیدا نہ ہو۔ اپنے دل کو یقین پر قائم اور میری طرف سے کسی قسم کا شک پیدا نہ کر۔ حق تعالیٰ نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں تجھ پر معرفت کے اسرار کو ظاہر کر دوں۔ جب تُو مجھ سے یہ علم سیکھ لے گا تو ہر اس چیز کو پہچان جائے گا، جس کے بارے میں تُو نہیں جانتا۔ مگر تُو اسی کے طور پر اپنے اس کوزے کا پانی میرے ہاتھوں پر بہا دے۔ پھر میں یہی پانی تیرے حلق میں پانی اور تیری آنکھوں کے سامنے سے جابات کے پردے ہٹا کر تیرے دل میں کشف کی صلاحیت پیدا کر دوں۔ تب تک بزرگ (خضر علیہ السلام) کے یہ الفاظ سنے تو والہانہ انداز میں اپنا کوزہ ایک طرف رکھا اور بزرگ کی زبانوں سے پٹ گئے۔ پھر نہایت پرشوق لہجے میں کہنے لگے۔ ”اس کوزے کے پانی کی کیا حیثیت ہے؟ اگر حکم دیا جائے کہ تُو اس کوزے سے اپنے دل و جان بھی قربان کر دوں۔ خضرؑ نے حسینؑ کی یہ حالت دیکھ کر محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”اے تُو میرے قدموں سے اپنا سرو اٹھا۔ پھر قدرت کے عجائبات کا نظارہ کر۔“ (ترجمہ)

حضرت شیخ حسینؑ، حضرت خضر علیہ السلام کے حکم کے مطابق اُٹھے اور اپنے کوزے سے تھوڑا سا پانی سبز پوش بزرگ کے ہاتھ پر ڈالا۔

بزرگ نے اپنے دست مبارک سے پانی کے چند قطرے حضرت شیخ حسینؑ کے منہ میں ڈالے۔
 اسی واقعے کو فارسی شاعر نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔
 آبِ کز فیضِ دستِ خضر چشید

ہر چہ بودش نہاں ، عیاں ہمہ دید

(شیخ حسینؑ نے جو پانی حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ سے چکھا، اس کا فیض روحانی تھا کہ جو کچھ پوشیدہ و پنهان اور کاسب ظاہر و آشکار ہو گیا)

اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے شیخ حسینؑ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اے لڑکے! تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔ اپنے ہاتھ کا سلام کہتا۔“

حضرت خضر علیہ السلام کا اشارہ حضرت شیخ بہلولؑ کی طرف تھا۔

مگر دبیز پوش بزرگ جو دراصل حضرت خضر علیہ السلام تھے، اسی طرح واپس چلے گئے جس طرح تشریف لے گئے۔

حضرت شیخ حسینؑ نے گہرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ دُور تک نظریں دوڑائیں۔ مگر سبز پوش بزرگ کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ حضرت شیخ حسینؑ کچھ دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں کھڑے رہے۔ پھر آپ کو ایک تیز خوشبو نے چونکا دیا۔ حضرت شیخ حسینؑ ایک بار پھر حیرت میں ڈوب گئے اور خود کلامی کے انداز میں فرمانے لگے۔

”یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟ کیا وہ بزرگ خضر علیہ السلام ابھی تک یہیں موجود ہیں؟ مگر میری نظروں سے چھوڑ دیں۔“

حضرت شیخ حسینؑ کچھ دیر تک اسی خوشبو میں الجھے رہے۔ پھر جب یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا تو آپ نے پانی کا کوزہ اٹھا اور مولانا ابو بکرؒ کی خانقاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ نامعلوم خوشبو راستے میں بھی حضرت شیخ حسینؑ کے ساتھ رہی۔ پھر جب آپ حضرت شیخ بہلولؑ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوئے تو حضرت شیخؑ نے بے ساختہ فرمایا۔

”ہاں! ہو حسین! مبارک ہو۔ ہمارا دہوئے، شاد ہوئے۔“

مگر جب حضرت شیخ حسینؑ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا حال پوری تفصیل کے ساتھ سنا تو

حضرت شیخ بہلولؒ کے چہرہ مبارک پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا اور آنکھوں میں نمی سی آنے لگی۔

”حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے اپنے عاجز بندے کی لاج رکھی۔ اور جو کچھ میں نے نور سے مانگا تھا، وہی ظاہر ہوا۔“

حضرت شیخ حسینؒ ایک عارف کے الفاظ کی وسعت و گہرائی کو تو نہ سمجھ سکے۔ مگر اس خوشبو کے بارے میں ہر کر بیٹھے جو آپ کو اس وقت بھی اپنے قرب تر محسوس ہو رہی تھی۔

حضرت شیخ بہلولؒ نے تبسم دلنوا کے ساتھ فرمایا۔ ”یہ اسی علم کی خوشبو ہے، جو ایک بزرگ ترین سنی کا ہے تمہیں بخشا گیا ہے۔ اس خوشبو کی حفاظت کرنا۔ اس اپنے دل میں بسائے رہتا اور دنیا کی نظروں سے چھپا کر آج جو کچھ تمہارے ساتھ پیش آیا ہے، اس کے بارے میں کسی کو ایک حرف بھی نہ بتانا۔“

”اپنے استاد گرامی کو بھی نہیں؟“ حضرت شیخ حسینؒ کا اشارہ مولانا ابوبکرؒ کی طرف تھا۔

”ہاں! مولانا ابوبکرؒ کو بھی نہیں۔“ حضرت شیخ بہلولؒ نے زور دے کر فرمایا۔ ”کسی کو بھی نہیں۔ تمہاری فکر نے جو کچھ دیکھا، سو دیکھا۔ دل نے جو کچھ محسوس کیا، سو محسوس کیا۔ جو کچھ تم نے سنا، سو سنا۔ اور کہنے والے نے سو کہا۔ اس راز کو اپنے دل میں اس طرح چھپا لو، جیسے سمندر کی تہہ میں موتی۔ اگر کوڑے یا پیالے کا پانی جھک پڑے تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس ذات پاک سے عشق کرنا ہے تو سمندر بنو۔ اور آج رات نماز تراویح میں اٹھ پارے کی تلاوت کرو۔“

”شیخ محترم! مجھے تو آٹھویں پارے کی ایک آیت بھی یاد نہیں۔“ یکا یک حضرت شیخ حسینؒ کے چہرے پریشانی کا اظہار ہونے لگا تھا۔

”تم سے ان بزرگ نے کیا کہا تھا؟“ حضرت شیخ بہلولؒ نے حضرت خضر علیہ السلام کی نصیحت یاد دلانے پر فرمایا۔

حضرت شیخ حسینؒ چونک اٹھے۔ جیسے آپ کو بھولا ہوا سبق یاد آ گیا ہو۔ ”میں تمہارے پاس اس لیے آیا کہ تمہارا دل و سوسوں سے پاک ہو جائے۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے حضرت خضر علیہ السلام کے الفاظ یاد ہوئے کہا۔

”پھر یہ دوسرے نہیں تو اور کیا ہے؟“ حضرت شیخ بہلولؒ کے لہجے میں ہلکی سی تنبیہ کا رنگ شامل تھا۔

شیخ حسینؒ نے معصومانہ انداز میں حضرت شیخ بہلولؒ سے معافی مانگی۔ ”شیخ محترم! میں بھول گیا تھا۔“

”اپنے اندر یقین پیدا کرو۔ پھر کچھ بھی نہیں بھولو گے۔“ حضرت شیخ بہلولؒ نے فرمایا۔

پھر شیخ حسینؒ جانے لگے تو حضرت شیخ بہلولؒ نے فرمایا۔ ”فرزند! عصر اور مغرب کے درمیان اٹھو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالو۔“

حضرت شیخ حسینؒ، مولانا ابوبکرؒ کی خانقاہ سے نکل کر مدرسے میں چلے گئے۔ اگرچہ آپ کا دوسرے تو نہیں تھے، لیکن تحریر کی کیفیت اب بھی طاری تھی۔



نماز مغرب کے بعد مولانا ابوبکرؒ، حضرت شیخ بہلولؒ کے حجرے میں تشریف لائے اور انتہائی حیرت زدہ عرض گزار ہوئے۔

”شیخ! آج کی رات میرے لئے بہت پریشان کن ہے۔“

”قل خالی آپ کی مشکل آسان کرے۔“ حضرت شیخ بہلولؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”مگر پریشانی کیا ہے“

”ان رات نماز تراویح میں حسینؑ کس طرح قرآن کریم کی تلاوت کرے گا؟“ مولانا ابوبکرؒ کے چہرے سے نورالہی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”جی طرح دوسرے حفاظ لڑکے تلاوت کرتے ہیں“ حضرت شیخ بہلولؒ نے نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا۔
 ”تو آپؑ کم کے ہر زاویہ اظہار پر قادر ہے۔ صاحب قرآن کے صدقے میں آپ کا شاگرد حسینؑ بھی حافظ قرآن ہے گا۔“

مولانا ابوبکرؒ بھی حیرت و سکوت کی کیفیت سے دوچار، حضرت شیخ بہلولؒ کے پاس سے اٹھ کر اپنے حجرے میں ٹیبلے لائے اور رحمت حق کے نزول کی ساعت سعید کا انتظار کرنے لگے۔

افرنی شہاء کی نماز کا وقت آیا۔ مولانا ابوبکرؒ نے حسب روایت نماز کی امامت کی۔ پھر دُعا مانگ کر پچھلی صف بنائے۔ جہاں حضرت شیخ بہلولؒ موجود تھے اور ان کے بائیں ہاتھ پر شیخ حسینؑ بیٹھے تھے۔

”نزلنا اطمیناً“ حضرت شیخ بہلولؒ، شیخ حسینؑ سے مخاطب ہوئے۔

حضرت شیخ حسینؑ کھڑے ہو گئے۔ حضرت شیخ بہلولؒ نے نہایت شفقت سے شیخ حسینؑ کی پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ”ہاؤ زائد اللہ تمہارے دل و دماغ کو اپنے کلام مقدس کے نور سے روشن فرمادے۔“

حضرت شیخ بہلولؒ اور اپنے استاد گرامی مولانا ابوبکرؒ کی دعاؤں کے سائے میں شیخ حسینؑ آگے بڑھے۔

دُعا ہم تک ساری اور مدرسے کے دوسرے منتظمین، جو اس راز سے واقف تھے کہ شیخ حسینؑ صرف سات سال کے حافظ ہیں، یہ منظر دیکھنے کے لئے بے قرار تھے کہ ایک نو عمر لڑکا، جس نے آٹھواں پارہ حفظ نہ کیا ہو وہ کس رعایت قرآن کرے گا؟

حضرت شیخ حسینؑ نے بڑی خوش الحانی کے ساتھ ”سورۃ فاتحہ“ کی تلاوت کی۔ پھر آٹھواں پارہ اس طرح پڑھنا دیکھا، جسے اس کا ایک ایک لفظ ازبر ہو۔ پھر جب نماز تراویح ختم ہوئی تو مولانا ابوبکرؒ بے اختیار اُٹھے اور اپنے رُکے لگایا۔

حضرت شیخ حسینؑ نے آگے بڑھ کر حضرت شیخ بہلولؒ کے دست مبارک کو بوسہ دیا اور نرم ناک آنکھوں کے ساتھ بارے لگے۔ ”شیخ محترم! آپ کی دعاؤں نے مجھے یقین کی منزل تک پہنچا دیا۔“

فقیر یہ کہ حضرت شیخ حسینؑ نے اسی طرح نماز تراویح میں پورا قرآن کریم سنایا۔ اس دوران کبھی کبھی حضرت بہلولؒ اپنے کم سن مرید سے تلاوت کے بارے میں پوچھتے تو حضرت شیخ حسینؑ عرض کرتے۔

”کئی یوں ہوتا کہ میں پڑھتے پڑھتے اٹکنے لگتا تو ایک نورانی تختی میری آنکھوں کے سامنے روش ہو جاتی۔ اور ہدی آیت مقدسہ سنہری حروف میں تحریر ہوتی۔ پھر میں اس طرح قرآن کریم پڑھنے لگتا، جیسے ناظرہ تلاوت کر رہا ہوں۔“

یہی حضرت شیخ بہلولؒ کی وہ کرامت، جسے لاہور کے سینکڑوں انسانوں نے مجسم ہوتے دیکھا۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے بارے میں بھی معتبر روایات موجود ہیں کہ آپؑ دن میں ایک پارہ حفظ کرتے اور رات کو نماز تراویح میں وہی حفظ شدہ پارہ سنا دیا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ تمام مؤرخ، محقق اور تذکرہ نگار ائمہ پر مشتمل ہیں کہ حضرت ابوحنیفہؒ کا شمار نسل انسانی کے ذہین ترین افراد میں ہوتا ہے اور آپؑ کی قوت حافظہ

بے مثال تھی۔



روایت ہے کہ دس سال کی عمر میں حضرت شیخ بہلولؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کو سلسلہ قادریہ میں بیعت کرائی۔ کئی سال تک اپنے کم سن مرید کی روحانی تربیت کی۔ جس کا دورانیہ اندازاً پانچ سالوں پر مشتمل تھا۔ پھر حضرت شیخ بہلولؒ لاہور سے تشریف لے گئے۔ رخصت ہونے سے پہلے آپ نے حضرت شیخ بہلولؒ نصیحت فرمائی۔

”حسین! ہماری جدائی کا غم نہ کرنا۔ جب عشق تمہارے رگ و پے میں اتر جائے گا تو پھر وصال و فراق جھگڑے خود بخود مٹ جائیں گے۔ اور عشق ہی باقی رہنے والا ہے کہ عشق ہی حقیقتِ ازل ہے۔“

”شیخ محترم! میں تو دریا کے کنارے یہاں کھڑا ہوں۔ اور دریا مجھ سے دور جا رہا ہے۔“ حضرت شیخ بہلولؒ کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ”جب مرشد ہی قریب نہیں ہو گا تو مرید پر عشق کی سرمستیاں اور گہرائیاں کب تک ہوں گی۔“

حضرت شیخ بہلولؒ نے آپ کی تالیفِ قلب کے لئے فرمایا۔ ”ہم تم سے دور نہیں ہوں گے حسین! ہم اندر جو ہر حال میں مرید کی کیفیت سے باخبر رہے۔ قسام ازل نے ہمارے پاس تمہارا اتنا ہی حصہ مقدر کیا تھا۔ تمہیں نعمتیں حضرت محمد سید علیؑ جو بری کی بارگاہ سے عطا ہوں گی۔“ حضرت شیخ بہلولؒ کا اشارہ حضرت داتا گنج بخشؒ کی طرف تھا۔ ”ہم نے حکم خدا تمہیں سید جو بریؑ کے سپرد کیا۔ اور اب وہی بفضلِ تعالیٰ تمہیں مکمل کریں گے۔“ ان بعد حضرت شیخ بہلولؒ لاہور سے رخصت ہو گئے۔



اب ہم حضرت شیخ بہلولؒ کے بارے میں کچھ تاریخی حقائق پیش کریں گے۔ حضرت شیخ حسین لاہور کے حوالے سے جس قدر بھی تذکرے موجود ہیں، ان کے مطابق حضرت شیخ بہلولؒ آپ کے پیر و مرشد تھے۔ مگر حوالہ یہ ہے کہ ہمیں حضرت شیخ بہلولؒ کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ بچپن کہاں گزارا؟ آپ کے اساتذہ کرام کون تھے؟ بچپن کس مدرسے میں گزارا؟ اور جوانی کس بزرگ کی خانقاہ میں بسر کی؟ اکثر تذکرہ نگاروں نے بس اتنا تحریر کیا تھا کہ حضرت شیخ بہلولؒ، فقہ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ماننے والے تھے اور آپ نے طویل سیر و سیاحت کے بعد مختلف بزرگانِ دین کے مزارات پر جا کر دے کر فیضِ روحانی حاصل کیا تھا۔

تمام تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ بہلولؒ کو حضرت امام بریؒ کا خلیفہ اکبر قرار دیا ہے۔ حضرت امام بہلولؒ وصال 1117ھ میں ہوا تھا اور حضرت شیخ بہلولؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کو 955ھ میں بیعت کیا۔ ان تاریخوں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت امام بریؒ دنیا میں تشریف نہیں لائے تھے۔ پھر حضرت شیخ بہلولؒ امام بریؒ کے خلیفہ اکبر کس طرح ہو گئے؟ حضرت شیخ بہلولؒ دسویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ اور حضرت بریؒ بارہویں صدی ہجری کے۔ دونوں بزرگوں کے عہد میں ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کا فرق ہے۔

اس سلسلے میں تذکرہ صوفیائے پنجاب کی ایک اور روایت بھی موجود ہے۔ مشہور محقق اعجاز الحق قدی قریریؒ کہتے ہیں۔

”پادری عبدالباقی نے اپنی کتاب ”صوفیہ سینٹ این شراینٹ“ میں لکھا ہے کہ شاہ لطیف بریؒ حضرت

بن کر بیٹ تھے۔ اور حضرت حیات المیر، حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے سلسلے میں بیعت فرمایاں، حضرت شاہ لطف بری کے مرید بہلول شاہ سے چلا۔

باری عبدالرحمان کی اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے اعجاز الحق قدوسی تحریر کرتے ہیں۔ ”حضرت شیخ بہلول بری کے سلسلے کے جلیل القدر شیوخ میں تھے۔ وہ شاہ بری قادری کے مرید و خلیفہ تھے۔ ”حقیقت الفقراء“ میں حضرت شیخ بہلول دریائی، حضرت شاہ لطف بری کی وفات کے بعد تصوف کے بعض مشکل مسائل حل کرنے کے لئے ”نکاح اشرف“ تشریف لے گئے تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روضہ مبارک پر دو سال تک متکلف رہے۔ پھر کربائے معلیٰ حاضر ہوئے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مزار مبارک پر حاضری دی اور باطنی نماز سے راز ہوئے۔ پھر بغداد حاضر ہوئے اور ایک سال تک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے روضہ مبارک پر قیام کیا۔ حضرت شیخ بہلول نے 983ھ میں وفات پائی۔“ (خزینۃ الاصفاء۔ جلد اول)

”خزینۃ الاصفاء“ اور ”تذکرہ صوفیائے پنجاب“ سے بھی حضرت شیخ بہلول کے تفصیلی حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن کی روٹی میں اگر ہم حضرت شیخ بہلول کو حضرت امام بری کا خلیفہ اکبر تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر یہ بھی ماننا ہوگا کہ امام بری نویں صدی ہجری کے بزرگ تھے۔

نام نہادوں میں تحریر ہے کہ حضرت امام بری مغل شہنشاہ جہانگیر کے دور حکومت میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش 1026ھ ہے۔ پھر آپ اکیانوے سال کی عمر میں 1117ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ ہے۔ 1119ھ میں مغل شہنشاہ بھی عالم فانی کو خیر باد کہہ گیا تھا۔

مغلی غلام سردار لاہوری نے اپنے تذکرے ”حدیقتہ الاولیاء“ میں حضرت امام بری کا سال وفات 964ھ میں بیان کیا ہے۔ اگر یہ تاریخ درست ہے تو پھر حضرت امام بری 873ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور یہ افغان حکمران غلام ابراہیم لودی کا دور حکومت تھا۔ پھر ظہیر الدین بابر نے فرغانہ سے ہندوستان پر یلغار کی۔ اور سلطان ابراہیم لودی کے ساتھ ساتھ راجپوت حکمران رانا سائنگا کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور عظیم مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پھر اسے حضرت امام بری نے مغل شہنشاہ بابر کا دور حکومت بھی دیکھا۔ پھر اس کا بیٹا نصیر الدین ہمایوں سریر رائے سلطنت ہوا۔ ہمایوں نے 963ھ میں وفات پائی۔ اس کے ایک سال بعد حضرت امام بری 964ھ میں اپنے زعمی سے جا ملے۔ اس اعتبار سے حضرت امام بری نے تین حکمرانوں سلطان ابراہیم لودی، ظہیر الدین بابر اور ہمایوں کی ہمایوں کا دور اقتدار دیکھا۔ جبکہ عام تذکرہ نگاروں کا دعویٰ ہے کہ مغل شہنشاہ، شاہ جہاں نے جو اکبر کا پوتا حضرت امام بری کی مقبولیت کو ”بغادت“ سے تعبیر کیا۔ اور پھر اپنے بڑے بیٹے شہزادہ اورنگ زیب عالمگیر کو اسی وقت کے سلسلے میں حضرت امام بری کو سرزنش کرنے کے لئے بھیجا۔ پھر جب عالمگیر، مطلق العنان شہنشاہ بن گیا تو باطنی عقیدت و بندگی کی حیثیت سے حضرت امام بری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صرف یہی نہیں، ہمارے تذکرہ نگاروں نے اورنگ زیب عالمگیر کے دوسرے بیٹے بہادر شاہ اول کو بھی حضرت امام بری کی خانقاہ کے دروازے پر تشریف لے کر دیکھا ہے۔

مغلی حوالوں کی روشنی میں حضرت امام بری کی پیدائش اور وفات کا سلسلہ بہت زیادہ اُلجھ گیا ہے۔ ایک عام رائے اور غالب علمی نہیں، اس دور کا محقق بھی اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتا کہ حضرت امام بری افغان حکمران سلطان ابراہیم لودی کے دور حکومت میں پیدا ہوئے یا مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر کے عہد سلطنت میں۔ 964ھ آپ کا انتقال ہے یا 1117ھ؟ میرے خیال میں آنے والے محققین کے لئے بھی یہ سوالات اسی صورت میں قائم

رہیں گے اور ان کے تسلی بخش جوابات حاصل نہیں ہو سکیں گے۔

اعجاز الحق قدوسی نے اپنی تالیف ”تذکرہ صوفیائے پنجاب“ میں ایک مقام پر تحریر کیا ہے۔
”شاہ لطیف بری کے خلفاء میں شاہ حسین خاص طور پر مشہور ہیں۔ جن کی ”بیٹھک“ حضرت شاہ لطیف بری کے مزار مبارک کے بالکل سامنے ہے۔ اس ”بیٹھک“ پر یہ مصرع لکھا ہوا ہے۔

میرے مرشد کی گلی کی خاک بھی اکسیر ہے

یہاں ”بیٹھک“ سے مراد حجرہ ہے، جہاں شاہ حسین قیام فرمایا کرتے تھے۔ اگر اس مصرع پر غور کیا جائے تو آج کی شاعری محسوس ہوتی ہے۔ اگر ہم اس زاویے سے واقعات کا جائزہ لیں تو حضرت شاہ حسین نے اپنے مرشد کی روحانی عظمت کو اہل دنیا کے سامنے ظاہر کرنے کے لئے یہ مصرع خود تحریر کیا تھا یا کسی شاعر نے ظلم کر لیا تھا؟ اہل نظر کو جان لینا چاہئے کہ ساڑھے چار سو سال پہلے اردو زبان کی یہ شکل نہیں تھی۔ اُس زمانے میں اردو موجود نہ تھی مگر اپنے بہت ہی ابتدائی مرحلے میں۔ آج کے اردو داں حلقے اس دور کی اردو کو آسانی سے پڑھ بھی نہیں سکتے۔ اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ”میرے مرشد کی گلی کی خاک بھی اکسیر ہے“ والا مصرع بعد میں آنے والے کسی عقیدت مند نے حضرت شاہ حسین کے حجرے پر کندہ کر دیا تھا، جو آج بھی موجود ہے۔

بہر حال، اس بحث سے قطع نظر، اکثر تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ شاہ حسین، حضرت شیخ حسین لاہوری ہیں جو عرف عام میں ”شاہ حسین“ کے نام سے مشہور ہیں۔

اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو ایک اور مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اعجاز الحق قدوسی نے ”تذکرہ صوفیائے پنجاب“ میں واضح الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت امام بری کے خلفاء میں ”شاہ حسین“ خاص طور پر مشہور ہیں۔ جب حضرت شیخ بہلول لاہور سے رخصت ہو رہے تھے تو آپ نے اپنے کم سن مرید حضرت شیخ حسین کو روحانی تربیت کے لئے حضرت سید علی جویری (داتا گنج بخش) کے مزار مبارک پر پابندی کے ساتھ حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ یہ ”رسم بیعت“ 955ھ میں ادا ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت امام بری بقیہ حیات تھے۔ حضرت شیخ حسین کے مرید ہونے کے نو سال بعد یعنی 964ھ میں حضرت امام بری کا انتقال ہوا۔ اصولی طور پر حضرت شیخ بہلول کے لئے لازم تھا کہ آپ اپنے مرید شیخ حسین کو لے کر اپنے مرشد حضرت امام بری کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے حضرت بابا فرید الدین مسویشر کاکی دہلی میں مرید کیا اور ایک وظیفہ خاص پڑھنے کے لئے حکم دیا۔ جب حضرت بابا فرید چلے گئے تھے، اسی دوران میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی امیر شریف سے دہلی تشریف لائے۔ چونکہ وظیفہ خوانی کے آداب کے مطابق حضرت بابا فرید چلے گئے تھے، اس لئے حضرت قطب الدین بختیار کاکی اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو لے کر اسی چلے گئے اور اپنے مرید حضرت بابا فرید کے لئے حضرت خواجہ غریب نواز سے دعاؤں کے طالب ہوئے۔ اسی رسم عقیدت و ارادت کے مطابق حضرت شیخ بہلول کو بھی حضرت شیخ حسین کے ہمراہ حضرت امام بری کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے تھا۔ مگر کسی بھی معتبر اور غیر معتبر تذکرے میں ایسا کوئی واقعہ درج نہیں۔ اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ وہ شاہ حسین نہیں ہیں، جن کا حجرہ حضرت امام بری کے مزار مبارک کے سامنے موجود ہے۔

خود حضرت شیخ حسین کے حالات زندگی سے بھی ظاہر ہے کہ آپ کا بیشتر وقت لاہور ہی میں گزرا۔ اگر حضرت شیخ بہلول، حضرت امام بری کے خلیفہ اکبر ہوتے تو حضرت شیخ حسین پوری زندگی میں کم سے کم ایک بار اپنے دارا

ان حضرات امام بری کے مزار مبارک پر ضرور حاضر ہوتے۔ جب ہمیں حضرت شیخ حسینؒ کے حوالے سے ایسا کوئی واقعہ ملتا تو پھر گمان ہوتا ہے کہ حضرت شیخ بہلول دریاہی، سلسلہ قادری کے کوئی اور بزرگ ہیں، جن سے حضرت جنیوارات کا شرف حاصل ہوا تھا۔

ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں بھی اگر ہمارے تذکرہ نگار بعید ہیں کہ حضرت شیخ بہلولؒ، حضرت امام بریؒ کے نظیر اکبر ہیں تو پھر خود تذکرہ نویس بہت بڑی کوتاہی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ ان واقعات کی کڑیاں ملانے سے ہمارے اور اپنے پیچھے کبھی حل نہ ہونے والے سوالوں کا ایک طویل سلسلہ چھوڑ گئے۔ بہر حال اپنی کم مائیگی کے باوجود مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکا، اپنی تمام معلومات یکجا کر دیں۔ قارئین کو لازم ہے کہ وہ تحقیق کے پیچ و خم میں لکھے بغیر بزرگان دین کی سیرت کا مطالعہ کریں کہ وہ کیسے مردانِ جانباز تھے کہ الحاد و کفر کے غلبے کی پروا کئے بغیر ایک ہی خانہ حیات میں اذان دیتے رہے اور گم کردہ راہ انسانوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلاتے رہے۔ جی علی الفلاح (اؤ بھائی کی طرف)۔

حضرت شیخ بہلولؒ کی ہدایت کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ نے حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) کے مزار مبارک پر حاضری دی اور دیر تک کلام الہی کی تلاوت کرتے رہے۔ پھر ایصالِ ثواب کے طور پر تلاوت قرآن مقدس کا ثواب حضرت سید علی ہجویریؒ کی بارگاہ میں پیش کیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ حسینؒ مختلف مدرسوں میں جا کر دینی علم حاصل کرتے رہے۔ بارہ سال تک آپ کا یہی معمول رہا۔ ”حقیقت الفقراء“ کے مولف پیر محمد صاحب کے مطابق ان بارہ سالوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

حضرت شیخ حسینؒ دن میں روزہ رکھتے..... اور رات بھر عبادت الہی میں مشغول رہتے۔ گرمی ہو یا سردی آپ کے لئے ہر موسم یکساں تھا۔ حضرت شیخ حسینؒ نمازِ عشاء کے بعد دریائے راوی میں کھڑے ہو کر اذانِ فجر تک ختم قرآن کرتے۔ پھر قریب کی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے۔ یہاں تک کہ اشراق کا وقت آ جاتا۔ اور پھر آپ مسجد میں نمازِ اشراق ادا کر کے حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) کے مزار مبارک پر حاضری دیتے اور ختم قرآن کا تحفہ مزار کی نذر کرتے۔

”حقیقت الفقراء“ کی روایت کے مطابق اس طویل عرصے میں حضرت شیخ حسینؒ کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ آپ ہمیشہ نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔

ایک دن حضرت شیخ حسینؒ، حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزار مبارک پر مزار قبے میں مشغول تھے کہ یکایک آپ کی آنکھ کھلی۔

پھر حضرت شیخؒ نے خواب میں ایک پیکرِ نورانی کو دیکھا۔ وہ بزرگ حضرت شیخ حسینؒ کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔ ”اے نوجوان! تم نے بارہ سال تک بہت خدمت کی ہے۔ اس کے صلے میں حق تعالیٰ نے تمہیں دلی کامل بنا دیا۔“

یہ مژدہ جانفزاں کر حضرت شیخ حسینؒ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ آپ نے نہایت سرشاری کے عالم میں فرمایا۔ ”شیخ محترم! میں آپ سے تعارف چاہتا ہوں۔“

”میں سید علی ہجویری ہوں۔“ بزرگ نے فرمایا۔ ”سچے اور خوش عقیدہ خدمت گزار ایسا ہی صلہ پاتے ہیں۔ تمہیں بہت بڑا عظیم مبارک ہو۔“

ان الفاظ کی گونج کے ساتھ ہی وہ پیکرِ نورانی، نظروں سے اوجھل ہو گیا اور حضرت شیخ حسینؒ کی آنکھ کھل گئی۔

آپ نے فوراً ہی حضرت داتا گنج بخشؒ کے حزار مبارک کے قریب کھڑے ہو کر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور سید علی ہجویریؒ کی روح پر فُتوح کو ایصالِ ثواب کیا۔

یہ واقعات بیان کرنے کے بعد ”حقیقت الفقراء“ کے مؤلف پیر محمد صاحب نے حضرت شیخ حسینؒ میں چند سطریں تحریر کی ہیں، جنہیں ہم حرف بہ حرف نقل کر رہے ہیں۔

”اگرچہ حضرت شیخ حسینؒ کو بارگاہِ الہی سے یہ سرفرازی حاصل ہو گئی تھی..... مگر آپ نے اپنے معمولات نہیں کئے۔ ”چاشت“ سے لے کر گیارہ بجے تک تلاوت قرآن کرتے۔ پھر کھانا کھا کر کچھ دیر آرام فرماتے کے بعد نمازِ ظہر ادا کرتے اور مختلف مدرسوں میں جا کر ”تفسیر قرآنی“ سماعت کرتے۔ نمازِ عصرے مغرب تک وظائف میں مشغول رہتے۔ افطار کے بعد عشاء تک نفل پڑھتے۔ پھر عشاء کے بعد دریا میں کھڑے ہو کر غزوات کرتے۔ اگر اس دوران حضرت شیخ حسینؒ کو کوئی بیماری بھی لاحق ہو جاتی تو اپنے معمولات ترک نہ کرتے۔ آپ نے چند سال اسی عالم میں گزارے تو ”عبودیت“ کو چھوڑ کر ”ربوبیت“ کے درجے میں جا ملے۔ اور انہوں نے ہو کر بقاء کے مستحق ہو گئے۔ پہلے وہ محبت تھے۔ پھر محبوب بن گئے اور طالب سے گزر کر ”مطلوب“ بن گئے۔ اسی عبادت کو محمد لطیف ملک نے بھی اپنی کتاب ”اولیائے لاہور“ میں من و عن نقل کیا ہے۔

”عبودیت“ سے گزر کر ”ربوبیت“ کے درجے میں چلے جانے کا لفظی مفہوم ایک ہی ہے کہ بندہ اپنا جانا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت شیخ حسینؒ نے اپنی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا نہیں کئے ہوں گے۔ اور اگر انہوں نے کلمات حضرت شیخ حسینؒ ہی کی زبان سے ادا ہوئے ہیں تو وہ ان کی جذب و مستی کی کیفیت ہوگی، جسے بیان کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ باہوش حضرات کو دین اور شریعت کے معاملات میں بہت زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ کے طور پر حضرت منصور حلاجؒ کی زبان سے ایک بار ”انا الحق“ (میں حق ہوں) کے الفاظ ادا ہوئے۔ جس پر لائقِ تعزیر سمجھا گیا۔ اور پھر شدید اذیتیں دے کر قتل کر دیا گیا۔ پھر ہمارے بے راہ روشاعر اور نام نہاد صوفیوں نے حضرت منصور حلاجؒ کے ان الفاظ کو اپنے شعروں اور مجلسوں میں بطور فخر پیش کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہً فریاد و انشوروں نے اس سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور حضرت منصور حلاجؒ کو عظمت کا نشان بنا کر اسلامی عقائد پر کاربند لگانے کی کوشش کی۔ مغرب کے اس پروپیگنڈے کے زیر اثر انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں شدید نفرت پھیل گئی اور کسی حد تک گمراہی کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ آج بھی اگر آپ ایسے مسلمانوں کے حلقے میں جائیں جو خود کو حلاجی یافتہ اور روشن خیال کہتے ہیں، ان کے نزدیک حضرت منصور حلاجؒ روحانی عظمتوں کی دلیل سمجھے جاتے تھے۔

روزِ ازل میں شیطان رجم نے حکمِ خداوندی کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کو مجبور نہیں کیا اور ہمیشہ کے مردود قرار پایا۔ اسی طرح سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار تبلیغ کے باوجود ابوجہل نے اسلام نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ حالتِ جنگ میں شدید زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اور پھر اس کا سر کاٹا گیا۔ دونوں واقعات کو بنیاد بنا کر شاعر انقلاب شہید حسن خان جوش ملیح آبادی نے ایک رباعی کہی تھی، جس کا اردو حسبِ ذیل ہے۔

شیطان و ابوجہل کی عظمت کی قسم

سو بار غلامی سے بغاوت بہتر

آج بھی ہمارے ادبی حلقوں میں جوش ملیح آبادی کے اس شعر کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اور اتفاقاً سے اور سننے والے، سب کے سب مسلمان ہوتے ہیں۔ اسی طرح نام نہاد صوفیوں میں یہ نظریہ عام ہے کہ بندہ اپنی

بات دریافت کے ذیلے ایک خاص منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ منزل ”فنائی اللہ“ کی منزل ہوتی ہے۔ اس کے بعد بندہ بھی خدا کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ (معاذ اللہ)

فنائی اللہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بندہ فنا ہو کر اللہ کی ذات میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ تو کھلا ہوا شرک ہے، جسے ماننے کے لئے ایک روایت کے مطابق اللہ نے ایک لاکھ سے زیادہ پیغمبر اس زمین پر بھیجے۔ جن میں سے بعض لہجے پاک کو تو اپنی جانیں بھی گنوا دینی پڑیں۔ مگر وہ برگزیدہ اور مقدس ہستیاں آخری سانس تک یہی کہتی رہیں۔ ”اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔“

اس بات کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ جب اللہ اپنے کسی رسول کا ذکر کرتا ہے تو پہلے اسے اپنا بندہ قرار دیتا ہے، بعد میں نبی یا رسول۔ علمائے اسلام کے نزدیک الفاظ کی یہ ترحیب اس لئے رکھی گئی ہے کہ بنی نوع انسان، اللہ اور بندے کے فرق کو اچھی طرح جان لے۔

قرآن کریم میں نسلِ آدم کے لئے تین الفاظ بطور خاص استعمال کئے گئے ہیں۔ انسان خالم بھی ہے، جاہل بھی اور جلد باز بھی۔ پھر اسی ظلم، جہل اور جلد بازی نے یہودیوں کو مجبور کیا کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو ”خدا کا بیٹا“ کہہ کر پکارتیں۔ اگر اس رشتے کو مادی طور پر دیکھا جائے تو ایک بیٹا اپنے باپ کی ذات ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ یہودیوں کا یہ عقیدہ، شرکِ عظیم کی علامت ہے۔ کیونکہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو ”اللہ کا بیٹا“ سمجھتے تھے۔ بعد میں یہودیوں کی اسی شرکِ عظیم میں مبتلا ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھنے لگے۔ ایک ارب سے زیادہ یہودی آج بھی اس عقیدے کو اپنی مذہبی فکر کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

حضرت خواجہ حسن بھریؒ سے لے کر غوثِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک صوفیائے کرام میں ”فنائی اللہ“ کا وہ مفہوم رائج نہیں تھا، جسے بعد میں آنے والے صوفیاء نے ”وحدت الوجود“ کے نام سے فروغ دیا پھر ”وحدت الوجود“ کی اتنی تشریحات کی گئیں کہ عام مسلمانوں کے ذہن میں منتشر ہو کر رہ گئے۔ ہم نے حضرت امام برہنہؒ کے مضمون میں ایک بزرگ حضرت شیخ برہانؒ کا ذکر کیا تھا، جن کی خانقاہ کے دروازے پر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسا شرع حکمران بھی دست بستہ کھڑا رہتا تھا۔ حضرت شیخ برہانؒ کے بعض مرید جوشِ عقیدت میں اپنے مرشد کو ”خدا“ کہنے لگے تھے۔ حضرت شیخؒ نے ان سے توبہ کرنے کے لئے کہا۔ کچھ مرید تو اپنے گناہ کا احساس کر کے تائب ہو گئے۔ مگر چند مرید اپنے عقیدے پر مضبوطی سے جے رہے اور تمام تر شدت کے ساتھ یہی کہتے رہے۔

”دینا کچھ بھی سمجھے، مگر ہماری نظروں میں تو آپ خدا ہی ہیں۔“

آخر حضرت شیخ برہانؒ کے کہنے پر قاضی شہر نے ان لوگوں کو قتل کرادیا۔

یہ گمراہی بھی اسی لئے پھیلی تھی کہ تم نظر لوگوں نے ”فنائی اللہ“ کی تشریح غلط کی تھی۔ اس لفظ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بندہ اللہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے اور مادی جوں کے ساتھ وہ اپنی ذات کی بھی نفی کر دیتا ہے۔

حضرت شیخ حسینؒ کی روحانی عظمت بیان کرتے وقت ”حقیقت الفقراء“ کے مؤلف نے بھی انتہائی غیر محتاط طریقہ اختیار کیا۔ اور اپنے مہمدم کے بارے میں تحریر کر دیا کہ وہ عبودیت (بندگی) کو چھوڑ کر ربوبیت (خدائی) کے درجے میں جا ملے۔ اس موضوع پر دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں۔ مگر ہمارا مقصد کسی مباحثے کا آغاز نہیں۔ یہ چند طریق بھی اس لئے تحریر کی گئی ہیں کہ حضرت شیخ حسینؒ کے حوالے سے مذکورہ عبارت کتابوں میں موجود ہے۔ اور بہت سے مفسر لوگ اسی عبارت کو دلیل بنا کر جمع عام میں پیش کرتے ہیں، جس سے انتشار اور خلل پیدا ہوتا ہے۔ اور جہاں تک محبت سے محبوب بن جانے کی بات ہے تو یہ ہرگز قابلِ اعتراض نہیں۔ قرآن کریم میں کئی مقامات

پر اس انداز کی آیات نازل ہوئی ہیں کہ اللہ محسنین سے محبت کرتا ہے۔ اللہ پاک، پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ نے اہل تقویٰ کو اپنا دوست (ولی) کہہ کر پکارا۔ اور یہی بندگی کی انتہا ہے۔



اب ہم حضرت شیخ حسین لاہوریؒ کے وہ واقعات قلم بند کریں گے، جن کا لکھنا ایک نہایت مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ حضرت شیخ حسین لاہوریؒ نے پچیس سال تک شدید عبادت و ریاضت کی۔ ہزاروں بار قرآن مجید مسلسل روزے رکھے۔ پھر ایک دن یکایک آپ کی دنیا بدل گئی اور سرسبز بازار رقص کرنا شروع کر دیا۔ اور اسے شاعر میر تقی میر کا ایک شعر ہے۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، اُن نے تو

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

حضرت شیخ حسین لاہوریؒ نے ماتھے پر قشقہ (چھاپ اور تلک) تو نہیں لگایا اور نہ آپ کسی بت خانے میں بیٹھے۔ مگر شریعت اسلامی کے سارے ظاہری اعمال ترک کر دیئے اور ایسی روش اختیار کی، جو اہل ظاہر کی نظر گناہ گارانہ تھی۔ حضرت شیخ حسینؒ کے ذہنی انقلاب کی حقیقی وجہ کیا تھی؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر وہ آنے والے تذکرہ نگار ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہوئے اور ایسے واقعات کو انتہائی دلچسپ انداز میں بیان کر پیش کیا جن کی پردہ پوشی لازم تھی۔ انجام کار ایسی کتابوں اور مضامین کا انبار لگ گیا، جن کا مطالعہ ایک مسلمان لئے کسی بھی حال میں مفید نہیں ہو سکتا۔ ہم حضرت شیخ حسین لاہوریؒ کے ذہنی انقلاب کی تفصیلات قلم کرنے پہلے حضرت امام اعظمؒ حضرت ابوحنیفہؒ کی زندگی کا اہم ترین واقعہ پیش کرتے ہیں۔

تمام مؤرخ اور تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابوحنیفہؒ نے چالیس سال تک شب بیدار رہ کر اپنے مالک کے آگے سربہ سجود رہے۔ پھر جب کمزوری بڑھنے لگی تو شاگردوں نے اصرار کیا کہ آپ رات کے حصے میں آرام فرما لیا کریں۔ جواب میں حضرت ابوحنیفہؒ نے فرمایا۔

”مجھے دنیا کی ساری تکالیف اور جسمانی اذیتیں گوارہ ہیں، مگر قیامت کے دن اپنے اللہ کے سامنے ہاتھ سے ڈرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہؒ نے اپنے شاگردوں کو وہ واقعہ سنایا، جو زہد و تقویٰ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ ایک دن حضرت ابوحنیفہؒ اپنے ایک بیمار دوست کی عیادت کے لئے کسی محلے سے گزر رہے تھے تو اب بوڑھی برقعہ پوش عورتوں کو گفتگو کرتے ہوئے سنا۔ ایک عورت نے دوسری عورت سے سوال کیا۔

”کیا تم اس شخص کو جانتی ہو، جو ابھی ابھی ہمارے پاس سے گزرا ہے؟“

دوسری عورت نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

پہلی عورت نے انتہائی عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ بڑے متقی اور پرہیزگار۔ مالی

عبادت الہی میں مشغول رہتے ہیں۔“

حضرت ابوحنیفہؒ نے اپنا نام سن کر چلنے کی رفتار آہستہ کر دی۔ پھر جب وہ عورت بات مکمل کر چکی تو آ

قدموں سے اپنے دوست کی عیادت کے لئے اس کے گھر تشریف لے گئے۔

پھر اسی رات حضرت ابوحنیفہؒ نے عشاء کے وضو سے نماز فجر ادا کی اور رات بھر توبہ و استغفار کرتے رہے۔ بعد امام اعظمؒ کا چالیس سال تک یہی معمول رہا۔ آپ کے ایک یہودی پڑوسی کا بیان ہے کہ ابوحنیفہؒ نماز قدر دیا کرتے تھے کہ مجھے ترس آنے لگتا تھا۔

دوں عورتوں کے درمیان میں ہونے والی گفتگو بیان کرنے کے بعد حضرت امام اعظمؒ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا: ”میں جسمانی مشقت سے نہیں ڈرتا۔ مگر اس احساسِ ندامت سے خوف زدہ رہتا ہوں، جب یہ روزِ حشر فلاں روزِ الجلال مجھ سے پوچھے گا۔“

”ابوحنیفہ! تو نے دنیا میں ایسی شکل کیوں بنائی تھی کہ جسے دیکھ کر لوگ دھوکا کھایا کرتے تھے؟“
 بوڑھی عورتوں کی گفتگو سے پہلے حضرت امام اعظمؒ کا معمول تھا کہ رات کے ابتدائی حصے میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ فجر کی نماز کے لئے اُٹھتے اور نمازِ فجر تک مصروفِ عبادت رہتے۔ مگر جب ایک عورت نے آپ کے بارے میں کہا کہ یہ امام ابوحنیفہؒ ہیں، شبِ زندہ دار، سب سے بڑے عبادت گزار۔ تو آپ نے اپنا طریق کار ہی بدل ڈالا۔ اور چالیس سال تک جسمانی آزار برداشت کئے۔ تاکہ ظاہر و باطن یکساں ہو جائیں۔

اس وضاحت کے بعد کہ ہمارے فقہیانِ کرام نے شریعتِ الہی پر کس طرح عمل کیا ہے، ہم حضرت شیخ حسین لاہوریؒ کے اس فکری انقلاب کے حوالے پیش کریں گے، جنہیں ہمارے تذکرہ نگاروں نے بڑے غیر محتاط انداز میں انتہائی رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

تمام تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ کا یہ ذہنی انقلاب اس وقت برپا ہوا جب آپ اپنے استادِ گرامی حضرت شیخ سعد اللہؒ سے ”تفسیرِ قرآن“ کا درس لے رہے تھے۔ حضرت شیخ سعد اللہؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ عالمِ باعمل بھی تھے اور ولی کامل بھی۔ جس روز یہ واقعہ پیش آیا، اُس روز حضرت شیخ حسین لاہوریؒ، حضرت شیخ سعد اللہؒ سے ”تفسیرِ مدارک“ پڑھ رہے تھے۔

درس جاری تھا کہ حضرت شیخ حسین لاہوریؒ اس آیتِ مقدسہ پر ٹھہر گئے۔
 ”اور دنیا کی زندگانی تو کھیل اور مشغلہ ہے..... اور البتہ پرہیزگاروں کے لئے آخرت کا گھر بہتر ہے۔“
 (سورۃ النعام..... آیت 32، ترجمہ)

حضرت شیخ سعد اللہؒ اس آیتِ مقدسہ کی تفسیر بیان فرما رہے تھے کہ یکایک حضرت شیخ حسینؒ درمیان میں بول اُٹھے۔ ”استاذِ گرامی! لہو و لعب (کھیل اور تماشے) سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے؟“
 ”حسین! کیا تم ان الفاظ کا مطلب نہیں جانتے؟“ حضرت شیخ سعد اللہؒ نے فرمایا۔

”جانتا ہوں۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے عرض کیا۔ ”مگر مجھے ان الفاظ کے معانی کے لئے قال نہیں، حال درکار ہے۔“

قال سے مراد زبانی گفتگو اور حال کا مفہوم ہے عمل..... گویا حضرت شیخ حسینؒ اس آیتِ مقدسہ کی عملی تفسیر پا رہے تھے۔

”جب تم لہو و لعب کا مفہوم سمجھتے ہو تو پھر کیوں سوال کرتے ہو؟“ حضرت شیخ سعد اللہؒ نے فرمایا۔ استادِ گرامی کے اندازِ گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بات کو ٹالنا چاہتے تھے۔

”اب میں سمجھ گیا کہ ساری دنیا لہو و لعب ہے۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ حسینؒ نے تالی بجانے کے انداز میں اپنے انگوٹھ ہاتھ مارا۔

اپنے شاگرد کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت شیخ سعد اللہؒ نے فرمایا۔ ”اس آیتِ مقدسہ کے مطلب کو ہوشیار سمجھ سکتے ہیں..... اور ہوشیار وہ ہے جو دونوں جہان میں ہوشیار ہو۔“

حضرت شیخ سعد اللہؒ تفسیر کا درس مسجد میں دیا کرتے تھے۔ استادِ گرامی کی زبان سے ”ہوشیار“ کا لفظ سن کر

حضرت شیخ حسینؒ بے اختیار ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور درس میں شریک ہونے والے دوسرے لوگوں کے رقص شروع کر دیا۔

حضرت شیخ سعد اللہؒ نے بڑے تعجب سے اپنے شاگرد کے اس عمل کو دیکھا۔ دوسرے شرکائے مجلس بھی دیکھتے تھے کہ حضرت شیخ حسینؒ جیسے باخبر اور باہوش انسان کو اچانک یہ کیا ہو گیا ہے؟ حضرت شیخ حسینؒ یہ احساس کئے بغیر کہ حضرت شیخ سعد اللہؒ اور دیگر حاضرین مجلس ان کے بارے میں بارہا یہ ہیں، والہانہ رقص کرتے رہے۔

حضرت شیخ سعد اللہؒ سمجھ رہے تھے کہ یہ شیخ حسینؒ کا اضطراری عمل ہے، جو چند لمحوں میں ختم ہو جائے گا۔ جب شاگرد کا رقص جاری رہا تو استاد نے براہ راست مداخلت کی۔ ”حسین! مسجد میں تمہارا یہ رقص کیا حکمت رکھتا ہے؟“ جواب میں حضرت شیخ حسینؒ نے عرض کیا۔ ”جب علم کے ساتھ عمل نہ ہو تو اس علم سے ناچنا گونا گز ہے۔ شاگرد کا جواب سن کر حضرت شیخ سعد اللہؒ اور دوسرے شرکائے مجلس حیران رہ گئے۔

پھر حضرت شیخ حسینؒ نے فرمایا۔ ”حق تعالیٰ نے جب دنیا کی زندگانی کو لہو و لعب قرار دیا ہے تو مولاؑ سے کوئی بھول نہیں ہوئی ہے..... بلکہ اس کی ساری مخلوق لہو و لعب ہے۔ پس مجھ کو لازم ہے کہ لہو و لعب اختیار تاکہ مخلوق خدا عبث (بیکار) نہ ٹھہرے۔ اگر ہم اس لہو و لعب (کھیل کود) سے انکار کریں تو فضل خدا سے محروم رہیں گے۔ اور جس نے فضل خدا کو کمر وہ جانا، وہ خود مردود و مطلق ہے۔“

حضرت شیخ حسینؒ کی اس گفتگو کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ نے دنیا کی زندگی کو لہو و لعب قرار دیا، تو پھر بندوں کو اس میں کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہئے۔ اور جو کوئی شک کرے گا، وہ مردود قرار پائے گا۔

مگر تذکرہ نگاروں نے جس طرح یہ عبارت نقل کی ہے، اس سے مفہوم بدل جاتا ہے۔ حضرت شیخ حسینؒ الفاظ آج سے 540 سال پہلے کہے تھے۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ پانچ صدیوں کے اس سفر میں روایت کہاں کہاں پہنچی؟ حضرت شیخ حسینؒ کا مفہوم کیا تھا؟ سمجھنے والوں نے کیا سمجھا؟ اور لکھنے والوں نے کیا مطالب کیا؟ ”حقیقت الفقراء“ کے مؤلف نے اس خاص موقع کے حوالے سے حضرت شیخ حسینؒ کی یہ گفتگو کی قدر و قیمت ہے، جسے ان کے بقول بہت ہی کم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے استاد گرامی حضرت شیخ سعد اللہؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”حق تعالیٰ کی ان پاک ایک چھپا ہوا خزانہ تھی۔ جب اس نے چاہا کہ اپنے حُسنِ تجلی کو عیاں کرے تو مخلوق کو پیدا فرمایا، تاکہ وہ اسے جاسکے۔“

دراصل یہ قرآن کریم کی ایک آیت مقدسہ کا ترجمہ ہے۔ جسے حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے استاد محترم کے بیان فرمایا۔

”حقیقت الفقراء“ کے مؤلف کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ نے مزید کہا کہ حق تعالیٰ نے دنیا کو بازی گاہ ہے، اس لئے اس میں یہ بازی رہنا چاہئے۔“

جب حضرت شیخ سعد اللہؒ نے اپنے شاگرد کی یہ باتیں سنیں تو خاموش رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھیں۔ حضرت شیخ حسینؒ کے رقص کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ تمام تذکرہ نگار ایک طرف حضرت شیخ سعد اللہؒ کو عالمِ باعمل اور ولیِ کامل ہیں۔ مگر دوسری طرف اس قدر مجبور ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنے شاگرد کو مسجد میں رقص کرنے سے منع نہ کر سکے۔

بہ فائز رہے ہی میں اپنی سعادت سمجھی۔ یہ واقعہ اپنی حقیقت میں کتنا ہی درست کیوں نہ ہو، مگر ہمارے نزدیک ان موقع پر حضرت شیخ سعد اللہ جیسے عالم دین کا سکوت اختیار کرنا ان کے منصب کے خلاف ہے۔

نہانے کرام کے حوالے سے تو ایسی مثالیں بہت سی مل جائیں گی، مگر چونکہ ہمارا موضوع بحث صوفیائے عظام ہیں اس لئے ہم اپنے قارئین کو تصوف کے کونچے میں لئے چلتے ہیں جہاں ایک قلندر کا روشن چہرہ نظر آتا ہے جسے اپنے جذب و کیف کے سبب روحانیت میں شہرت دوام حاصل ہے۔

یہ قلندر، حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر ہیں۔ آپ محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیا کے زمانے کے قبل مونی ہیں۔ دونوں بزرگوں کے درمیان دوستی اور محبت کی روایتیں بھی مشہور ہیں۔ ان مختصر حوالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت بوعلی شاہ قلندر کس مرتبے اور شان کے صوفی ہیں۔ عام طور پر صوفیائے کرام کو دو درجوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ایک صاحبانِ محو..... اور دوسرے صاحبانِ سکر۔

”محو ہوشاری“ کی کیفیت کو کہتے ہیں۔ اس قبیل کے صوفیاء ریاضت اور مشاہدے کی اعلیٰ ترین منزل تک پہنچ جانے کے بعد بھی جذب و مستی کی حالت سے دور رہتے ہیں اور اپنی پوری عارفانہ زندگی ہوش و ادراک کے تقاضوں کے مطابق گزارتے ہیں۔

”سکر“ کا مفہوم ہے بے خودی، مستی، بے خبری..... اس قبیل کے صوفیاء کبھی کبھی اپنے ہوش میں نہیں رہتے۔ جذبات کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں..... مگر یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے..... اور جن مہینوں پر مستقل ”سکر“ کی کیفیت طاری رہتی ہے، وہ مجذوب کہلاتے ہیں۔

حضرت بوعلی شاہ قلندر کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے، جو نہایت باہوش اور عالم و فاضل تھے..... مگر کبھی کبھی آپ پر جذب و کیف و مستی یعنی سکر کی حالت طاری ہو جاتی تھی..... اور اہل دنیا کی نظر میں ظاہری سلسلہ ہوش منقطع ہو جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر حضرت بوعلی شاہ قلندر اپنے حلیے اور لباس سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ لباس سے بے باقی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حضرت قلندر، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے مشہور بزرگ سرمد کی طرح برہنہ ہونے لگتے تھے۔ انتہائی حالتِ مستی میں بھی حضرت بوعلی شاہ قلندر کی ستر پوشی برقرار رہی۔ یہاں لباس سے بے نیازی کا مفہوم یہ ہے کہ سکر کی حالت میں حضرت بوعلی شاہ قلندر ہفتوں اور مہینوں اپنا لباس تبدیل نہیں فرماتے تھے۔ درہنہ عام ہال میں آپ عہدہ لباس پہنتے اور مسنون طریقے پر خوشبو بھی لگاتے۔ مختصر یہ کہ اسی جذب و مستی کی کیفیت میں حضرت بوعلی شاہ قلندر کی مونچھیں اس قدر بڑھ جاتیں کہ لب مبارک نظر نہ آتے..... اور ایک مردِ مومن کی مونچھوں پر کسی کو کھابندہ جوگی کی مونچھوں کا گمان ہونے لگتا۔ واضح رہے کہ جن داڑھی مونچھوں سے کفار یا دوسری قوموں کی طہارت نظر آئے، وہ اسلام میں جائز نہیں۔

ایک بار حضرت بوعلی شاہ قلندر کی مونچھیں بھی بڑھتے بڑھتے ہندو سادھوؤں کے مشابہہ ہو گئیں۔ اس زمانے میں اہل علم ایک بزرگ حضرت مولانا ضیاء الدین سنائی تھے، جو تصوف کو بھی شریعت ظاہری کا پابند دیکھنا چاہتے تھے۔

ایک دن مولانا ضیاء الدین سنائی اپنے مکتب میں درس دے رہے تھے کہ ایک شخص نے اُٹھ کر کہا۔ ”مولانا! آپ ہم فریب اور چھوٹے درجے کے مسلمانوں کو تو شریعت اور دین کی پابندی سکھاتے ہیں..... مگر ان بزرگوں کو بھولیں گئے جن کی حوام میں بڑی قدر و منزلت ہے۔“ سوال کرنے والے کے لہجے سے وطن و وطن کا رنگ جھلک رہا تھا۔

حضرت مولانا ضیاء الدین سنائی نے اپنا درس روک دیا اور سائل سے بڑے باوقار لہجے میں فرمایا۔ ”دہلی میں

رہنے والا وہ کون سا بزرگ ہے، جو شریعت کی گرفت سے آزاد ہے؟“

”حضرت بوعلی شاہ قلندر!“ سائل نے عرض کیا۔

”کیا ہوا قلندر کو؟“ مولانا ضیاء الدین سنائی نے چونک کر فرمایا۔ ”معاذ اللہ! کیا قلندر نے بے اختیار

اختیار کر لی؟“ حضرت مولانا ضیاء الدین سنائی کے لہجے سے اذیت و کرب کا اظہار ہونے لگا تھا۔

سنائی، حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے جب ایک عام فغان

مجلس حضرت قلندرؒ کی ذات گرامی پر اعتراض کیا تو آپ کو شدید تکلیف پہنچی۔

”حضرت قلندرؒ نے بے دینی کی راہ تو اختیار نہیں کی، مگر اپنا حلیہ ہندو جوگیوں جیسا بنا لیا ہے۔“ اس

اپنی بات کی وضاحت کی۔

یہ سن کر حضرت مولانا ضیاء الدین سنائی اپنا درس نامہ مکمل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور حاضرین کو مخاطب

فرمایا۔ ”شریعت کی پہنچ سے کوئی دور نہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ایک کمزور انسان ہونے کی حیثیت سے

کر راستے میں گر پڑیں..... یا پھر ہمارے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔“

یہ کہہ کر حضرت مولانا ضیاء الدین سنائی اپنے گھر تشریف لے گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد باہر نکلتے

ہاتھ میں بال تراشنے والی پنچنی تھی۔

اس وقت حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ ایک محفلِ سماع میں تشریف فرما تھے..... اور بہت انداز

شوق کے ساتھ کسی فارسی شاعر کا عارفانہ کلام سن رہے تھے۔

حضرت مولانا ضیاء الدین سنائی اپنے چند شاگردوں کے ساتھ محفلِ سماع میں داخل ہوئے۔ آپ کے

شخص بھی تھا، جس نے کہا تھا کہ مولانا، غریب مسلمانوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں..... مگر بااثر لوگوں کا بازو

پر گرفت نہیں کرتے۔“

حضرت مولانا ضیاء الدین سنائی دہلی کے مشہور بزرگ تھے اور احکامِ شریعت پر سختی سے کاربند رہنے کے

سے ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا سنائیؒ کو دیکھ کر حاضرین مجلس سنبھل گئے..... مگر حضرت

قلندرؒ دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھے جھومتے رہے۔

”کچھ دیر کے لئے سماع روک دیا جائے۔“ حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ کی بارعب آواز، مجلس میں

واضح رہے کہ حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ مزامیر (سازوں) کے ساتھ سماع نہیں سنتے تھے۔

حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ کا حکم سن کر عارفانہ کلام پڑھنے والا شخص خاموش ہو گیا..... اور مگر

مجلس بھی ساکت ہو گئے۔ پھر مولانا سنائیؒ، حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے نزدیک پہنچے جو ابھی تک اشعار کی متن

گم تھے۔

”شیخ شرف الدین!“ حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کو آپ کے حقیقی نام

پکارا۔

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے آنکھیں کھول دیں۔ مولانا سنائیؒ کو اپنے سامنے پا کر حضرت قلندرؒ نے

احتراماً کھڑے ہو گئے۔

”شیخ! یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“ حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ نے پر جلال مگر محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

”میرا حلیہ تو وہی ہے، جو آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔“ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے مسکراتے ہوئے

”تمہارا یہ طبع شریعت کی نگاہ میں نازیبا اور نادرست ہے۔“ حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ کے لہجے میں ہلکی سی آغوش تھی۔

”تو ہر مولانا! آپ میرے حلیے کو درست فرما دیجئے۔“ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے ہونٹوں پر وہی تبسم و انوار نظر تھا۔

”شرف الدین! بیٹھ جاؤ۔ تاکہ میں تمہارے اس حلیے کو درست کر سکوں، جس کے بارے میں لوگ آ آ کر شکایتیں کرتے ہیں۔“ حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ کا لہجہ کسی قدر تحکم آمیز تھا۔

کچل ہاتھ پر اس قدر گہرا سکوت طاری تھا کہ حاضرین کو اپنے دلوں کی دھڑکنیں تک سنائی دے رہی تھیں.....
 ان کی آنکھیں ایک ناقابل یقین منظر دیکھ رہی تھیں۔ حضرت بوعلی شاہؒ کے انداز بے نیازی اور شان قلندرانہ کی وہ پارس ہندوستان میں تھی۔ علاء الدین خلجی جیسا باجبروت حکمران بھی حضرت قلندرؒ سے ملاقات کے لئے ترستا نہ تھا۔ کچل ہاتھ کا خیال تھا کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ، مولانا ضیاء الدین سنائیؒ کا تحکم آمیز طرز عمل دیکھ کر حالتِ دلہلی آجائیں گے..... اور ایک نیا قفسیہ اُنھ کھڑا ہوگا۔ مگر اس وقت لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب بوعلی شاہ قلندرؒ خاموشی کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ جھکے اور اپنے پیرہن کی جیب سے بال تراشنے والی چنبی نکالی۔ پھر ایک ہاتھ سے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی ریش مبارک پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے حضرت شیخ شرف الدینؒ کی بڑھی ہوئی بال تراشنے لگے۔

مگر جب مولانا سنائیؒ نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی مونچھیں اسلامی شریعت کے حکم کے مطابق تراش دیں تو انہوں نے فرمانے لگے۔ ”شیخ شرف الدین! شریعت کے دائرے میں آنے کے بعد تم کتنے خوب صورت لگ رہے ہو۔“

یہ کہ حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ واپس تشریف لے گئے اور حاضرین مجلس شدید حیرت کے عالم میں اس بے نظار عالم کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ پانی پٹی پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ آپ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے۔ پھر اپنی ریش مبارک کو پکڑ کر فرمانے لگے۔

”گو گویہ بڑی متبرک داڑھی ہے، جو شریعت کے راستے میں پکڑی گئی ہے۔“

دائیت ہے کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے کئی مواقع پر یہی الفاظ دہرائے..... اور حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ کے ہاتھ پٹن آنے والے اس واقعے کو بڑے اثر انگیز لہجے میں بیان کیا تاکہ جذب و مستی کے راستے میں بھی بہت کم ہر بلندی قائم رہے۔

حضرت شیخ حسین لاہوریؒ کے استاد گرامی حضرت شیخ سعد اللہ مفسر قرآن تھے..... اور ایک مفسر قرآن، مختلف مقام کے اعلیٰ درجوں پر فائز ہوتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ”لہو و لعب“ کے سلسلے میں حضرت شیخ حسینؒ کی بیان کردہ فرمائے حضرت شیخ سعد اللہؒ جیسے عالم اور خدا رسیدہ بزرگ کس طرح مطمئن ہو گئے؟ آپ کے منصب دینی کا تقاضا و نزاکت شیخ حسینؒ کو ان کے فکر و عمل پر فہمائش بھی کر سکتے اور تنبیہ بھی۔ مگر ہمارے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ سعد اللہؒ نے محض مسجد میں حضرت شیخ حسینؒ کے قص پر کوئی شرعی گرفت نہیں کی۔ قص ایک اضطراری نکتہ ہے، جو مرغوشی کے عالم میں کسی بھی انسان پر، کسی بھی وقت طاری ہو سکتی ہے۔ اکثر صوفیائے کرام نے اس

کیفیت کو ”وجد“ اور ”حال“ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ جیسے مذہبی عالم اور دانشمند بھی ایک سر بازار رقص کرنے لگے تھے۔ حضرت مولانا رومؒ کی اس حالت کو ایک فارسی شعر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

بروئے پاک شمس الدین تبریز
سر بازار ملا رقص می کرد

”حضرت شمس الدین تبریزؒ کا چہرہ مبارک دیکھ کر مولانا رومؒ نے سر بازار رقص شروع کر دیا۔“ ترجمہ۔
اگر حضرت شیخ حسین لاہوریؒ پر یہ کیفیت طاری ہوگئی تو کوئی عجب نہیں..... مگر اس موقع پر حضرت شمس الدین جیسے عالم اور مفسر قرآن کا سکوت ضرور حیرت انگیز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت شیخ سعد اللہؒ نے اپنے شاگرد کے عمل پر شرعی گرفت کی ہو۔ مگر ہمارے تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ حسینؒ کی روحانی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے اس واقعے کی درمیانی کڑیاں ہی حذف کر دی ہوں۔ گستاخی معاف! پاک و ہند میں صوفیاء کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے، جو مسجد میں رقص کرنے کو روحانیت کی معراج تصور کرتا ہے۔ پھر جب ان سے سوال کیا جائے کہ یہ کیا ہے تو بڑے فخریہ لہجے میں کہتے ہیں۔

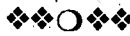
”ہم فرقہ ”ملاحیہ“ کے لوگ ہیں، اس طرح اپنے آپ کو ملامت کر رہے ہیں۔“

جوش عقیدت میں اعتدال سے گزر جانے والے تذکرہ نگاروں اور غیر ذمے دار شاعروں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر شریعت اسلامیہ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مثال کے طور پر اہل ایمان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز موجود ہے۔ قرآن حکیم میں بھی اس حقیقت کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ، انسان کی شرک سے گڑ قریب تر ہے۔ اللہ کے ہر جگہ موجود ہونے کو ایک اُردو شاعر اس طرح بیان کرتا ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے۔

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے، جہاں پر خدا نہ ہو

ہمارے تذکرہ نگاروں نے بھی حضرت شیخ حسینؒ کے رقص کے لئے مسجد ہی کا انتخاب کیا..... اور ہر جوش عقیدت میں حضرت شیخ سعد اللہؒ جیسے عالم شریعت کے لئے یہاں تک تحریر کر دیا کہ حضرت شیخ حسینؒ کے فرمان سن کر ان کے استاد گرامی نے خاموشی ہی میں اپنی سعادت سمجھی۔

آگے چل کر ”حقیقت الفقراء“ کے مؤلف سید پیر محمد صاحب لکھتے ہیں۔ ”بعد میں حضرت شیخ سعد اللہؒ یقین آگیا کہ حضرت شیخ حسینؒ اسی راز کو چھپانے کے لئے علم ظاہری حاصل کیا کرتے تھے۔“



”کتاب بہاریہ“ کی روایت کے مطابق شیخ سعد اللہؒ کے مدرسے کے باہر ایک گہرا کنواں تھا۔ جب حضرت حسینؒ، مدرسے سے باہر نکلے تو آپ کے ہاتھ میں ”تفسیر مدارک“ تھی۔ دوسرے ساتھی طالب علم بھی حضرت حسینؒ کے ہمراہ تھے۔ یکایک حضرت شیخ حسینؒ کنوئیں کی طرف بڑھے اور آپ نے ”تفسیر مدارک“ کنوئیں میں پھینک دی۔

ساتھی طالب علموں کو حضرت شیخ حسینؒ کا یہ عمل ناگوار گزرا اور انہوں نے طعن و تشنیع شروع کر دی۔

”حسین! تم نے یہ کیا کیا؟“ ایک طالب علم نے انتہائی خشکیوں لہجے میں کہا۔

”تمہیں بدمستی میں اتنا احساس بھی نہیں رہا کہ تم کس شے کو کنوئیں میں پھینک رہے ہو؟“ دوسرا ساتھی طالب

بھی غضب ناک لہجے میں بولا۔

”زبان پاک کی تفسیر ہے حسین!“ تیسرے ساتھی نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

حضرت شیخ حسینؒ نہایت صبر و سکون سے ساتھیوں اور دوستوں کی لعن طعن سنتے رہے۔

اہل بیت حضرت شیخ سعد اللہؒ کے شاگردوں کا شور کم نہیں ہوا تو حضرت شیخ حسینؒ نے فرمایا۔ ”میں تو اب اس

بے گزرا“ حضرت شیخ حسینؒ کے ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ اب مجھے اس کتاب کی ضرورت نہیں رہی۔

اپنے ساتھی طالب علموں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اگر تمہیں یہ کتاب (تفسیر مدارک) مطلوب ہے تو لے لو۔“

اب یہ کتاب کہاں مل سکتی ہے؟“ کئی طالب علموں نے بیک زبان کہا۔ ”پانی میں بھیگ جانے سے اس کے

ذرات بکے ہوں گے اور اوراق ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہوں گے۔“

”تم تمہیں یہ کتاب اصلی حالت میں لوٹا سکتا ہوں۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ پھر

”اگر آپ چاہتے ہوئے کنوئیں کو مخاطب کیا۔ ”اے پانی! ہمارے یاراں جانی، کتاب چھیننے سے خفا ہوتے ہیں۔

غیر لازم ہے کہ وہ کتاب صحیح حالت میں ہمارے دوستوں کو لوٹا دے۔“

حضرت شیخ حسینؒ کے ہم کتب ساتھی اس بات پر حیران تھے کہ ”تفسیر مدارک“ کنوئیں کی گہرائی میں اترے

کے لیے بہاؤ لے گی۔ اور پانی میں بھیگ جانے کے بعد وہ صحیح و سلامت کس طرح رہے گی؟

اب حضرت شیخ سعد اللہؒ کے دوسرے شاگرد یہ سوچ ہی رہے تھے کہ یکایک کواں پوری شدت کے ساتھ اہل

اور کتاب پانی کی سطح پر تیرنے لگی۔ حضرت شیخ حسینؒ نے ہاتھ بڑھا کر ”تفسیر مدارک“ اٹھالی اور اسے اپنے

ہاتھ سے اٹھا کر دیا۔

حضرت شیخ حسینؒ کے تمام دوست حیرت زدہ رہ گئے۔ کتاب نہ صرف صحیح و سلامت تھی بلکہ اسے دیکھ کر یوں

لگتا تھا جیسے پانی نے اسے چھوا تک نہ ہو۔



حضرت شیخ حسینؒ کی اس کرامت کا ذکر کرنے کے بعد ہم تاریخ تصوف کا ایک مشہور واقعہ بیان کریں گے، جو

قدیمین کے لئے غور و فکر کی نئی راہیں کھولے گا۔ اس واقعے کا تعلق مشہور صوفیائے کرام حضرت شمس تبریزؒ اور

مولانا جلال الدین رومیؒ کی ذاتِ گرامی سے ہے۔

یہ واقعہ تھا، جب حضرت مولانا رومؒ ترکی میں دربارِ خلافت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اور اسلامی دنیا

آپ کے علم و فضل کا شہرہ عام تھا۔ ترکی کے باشندے حضرت مولانا رومؒ سے اس قدر عقیدت رکھتے تھے کہ جب

حکومت کی سواری میں بیٹھ کر دربارِ خلافت کی طرف روانہ ہوتے تو لوگ آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے

درگاہِ مبارک اہوں پر جمع ہو جاتے تھے۔

ایک دنوں نامور اور جانباز صوفی، حضرت شمس تبریزؒ قونیہ تشریف لائے اور لوگوں سے پوچھا۔ ”یہاں سب

یہاں کون ہے؟“

قونیہ کے باشندوں نے بے اختیار کہا۔ ”مولانا جلال الدین!“

اب حضرت شمس تبریزؒ، حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ خدمت گاروں نے بتایا

مولانا اس وقت اپنے کتب خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کا ذاتی کتب خانہ پورے عالم اسلام میں ایک خاص شہرت رکھتا تھا۔ جب

نئی تبریز کتب خانے پہنچے تو حضرت مولانا رومؒ ایک حوض کے کنارے بیٹھے مطالعے میں غم تھے..... اور آپ

کے قریب فلسفہ، منطق، ریاضی اور علم کلام کے نہایت قیمتی اور نادر نسخے رکھے ہوئے تھے۔ حضرت شمس تبریزؒ قریب پہنچ کر مولانا رومؒ کو سلام کیا۔ حضرت مولانا رومؒ نے سلام کا جواب دیا اور حضرت شمس تبریزؒ سے ان کی آمد کا سبب پوچھا۔

”مولانا! یہاں کے لوگوں سے آپ کے علم و فضل کے بارے میں سنا تو دیدار کے لئے حاضر ہو گیا۔“ حضرت شمس تبریزؒ نے نہایت سادگی کے ساتھ فرمایا۔ اس وقت آپ درویشانہ لباس میں تھے۔

”تشریف رکھیں۔“ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے جواباً فرمایا مگر حضرت شمس تبریزؒ کا ظاہری جلوہ آپ کی آمد کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ”میں اس وقت ایک نہایت اہم باب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہرنا آپ سے بات ہوگی۔“

یہ کہہ کر حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کتاب کے مطالعے میں غرق ہو گئے۔ حضرت شمس تبریزؒ کو حضرت مولانا رومؒ کا یہ انداز بے نیازی پسند نہیں آیا تھا۔ پھر بھی آپ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے، جس کے علم و فضل کی دھوم سارے عالم اسلام میں تھی۔

پھر جب بہت دیر تک حضرت مولانا رومؒ کتاب کے اوراق میں کھوئے رہے اور آنے والے کی طرف متوجہ ہوئے تو حضرت شمس تبریزؒ نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مولانا! یہ کیا ہے؟“

حضرت شمس تبریزؒ کے مخاطب سے حضرت مولانا رومؒ کے انتہاک اور یکسوئی میں فرق آ گیا تھا۔ نتیجاً آپ حضرت شمس تبریزؒ کی یہ مداخلت گراں گزری اور آپ نے ناگوار انداز میں اس شخص کی طرف دیکھا، جو ظاہری طور پر جبہ و دستار سے عاری تھا۔

حضرت شمس تبریزؒ نے حوض کے کنارے رکھی ہوئی حضرت مولانا رومؒ کی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ وہی الفاظ دہرائے۔ ”مولانا! یہ کیا ہے؟“

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے جواباً فرمایا۔ ”یہ وہ ہے جسے تم نہیں جانتے۔“ مولانا رومؒ کے لئے تفاخر کا رنگ نمایاں تھا۔ ”یہ منطق، فلسفہ، ریاضی اور علم کلام کی وہ قیمتی کتابیں ہیں جن تک بڑے بڑے لوگوں کو رسائی ممکن نہیں۔“

حضرت شمس تبریزؒ نے ایک نظر ان اعلیٰ قیمتی اور نادر نسخوں کی طرف دیکھا جو واقعی عام لوگوں کی دسترس بہت دور تھے۔ ”اگر یہ کتابیں چوری ہو جائیں یا برباد ہو جائیں تو پھر آپ کیا کریں گے مولانا؟“

”ان میں بعض کتابیں ایسی ہیں، جن کا دوسرا نسخہ موجود نہیں۔“ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے ان کے لہجے میں فرمایا۔ ”خدا خواستہ اگر یہ کتابیں کھو جائیں تو اس نقصان عظیم کی تلافی ممکن نہیں۔“

”ایسے علم سے کیا فائدہ جو کتابوں کا محتاج ہو..... اور اگر وہ کھو جائے تو دوبارہ نہ پایا جاسکے۔“ یہ کہہ کر حضرت شمس تبریزؒ نے بڑی تیزی سے وہ نادر و نایاب کتابیں اٹھا کر حوض میں ڈال دیں، جو پانی سے بھر اٹھا۔

یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ حضرت مولانا رومؒ کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر جب آپ نے اپنی نہایت کتابوں کو حوض کی گہرائی میں پڑے دیکھا تو آپ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ ”اے شخص! تجھے خبر ہے کہ؟“

اس جاہلانہ حرکت نے کیا عظیم سرمایہ تباہ کر ڈالا؟“ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ ایک عالم دین ہونے کے انتہائی نرم گفتار تھے..... مگر حضرت شمس تبریزؒ کے اس عمل پر غضب ناک ہو گئے۔

”مولانا! اس قدر خفا کیوں ہوتے ہو؟“ حضرت شمس تبریزؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”اگر ہم نے“

خدا کا ہے تو ہم ہی اسے پورا بھی کریں گے۔“

”اب کئی اس نقصان کو پورا نہیں کر سکتا۔“ حضرت مولانا جلال الدین روٹی اسی طیش کے عالم میں بول رہے تھے۔ ”آج کا کام جلا دینا ہے..... اور پانی کا کام روشنائی کو مٹا دینا۔ اب ان کتابوں کی تقدیر بدلی نہیں جاسکتی۔ یہاں سے نکل چکا..... اسے واپس لوٹایا نہیں جاسکتا۔“

حضرت شمس تبریزؒ نے حضرت مولانا رومؒ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے حوض میں اتر گئے۔ ہر ایک ایک کتاب نکال کر حضرت مولانا رومؒ کی طرف بڑھاتے رہے۔ پھر آخری کتاب لے کر خود بھی حوض میں پہنچ گئے۔ حضرت جلال الدین روٹیؒ پر دوبارہ سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ مگر اس کیفیت میں ناقابلِ بہجت اور خوشی کا رنگ بھی شامل تھا۔ حضرت شمس تبریزؒ کا جسم مبارک تو پانی میں تر تھا..... مگر حضرت مولانا رومؒ ہاتھ کتابوں پر پانی کی ایک چھینٹ بھی نہیں پڑی تھی۔

حضرت مولانا جلال الدین روٹیؒ بار بار کتابوں کے اوراق پلٹ رہے تھے..... اور آپ کے ہوش و حواس پر تھیرا ایک غائب تھا۔ پھر کچھ دیر بعد جب آپ کی اس کیفیت میں کچھ کمی واقع ہوئی تو حضرت شمس تبریزؒ کو مخاطب کر فرمایا: ”یہ کیا ہے؟“

حضرت شمس تبریزؒ نے پُر جلال لہجے میں ایک یگانہ روزگار عالم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: ”مولانا! یہ ہے جسے نہیں جانتے۔“ اتنا کہہ کر حضرت شمس تبریزؒ نے نعرۂ حق بلند کیا اور تیز رفتاری کے ساتھ حضرت مولانا کے ہاتھ کی کتب خانے کی حدود سے نکل کر چلے گئے۔

ہماریوں ہوا کہ حضرت مولانا جلال الدین روٹیؒ اپنا سرکاری منصب چھوڑ کر ایک درویش بے سروسامان کی تلاش میں نکل کرے ہوئے۔ جستجو کا یہ سفر اس قدر طویل اور دشوار تھا کہ حضرت شمس تبریزؒ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت مولانا رومؒ کے پیروں میں آبلے پڑ گئے۔ ہزار مشکلات کے بعد منزل آسان ہوئی اور حضرت مولانا جلال الدین روٹیؒ اپنا سارا علم و فضل بالائے طاق رکھ کر حضرت شمس تبریزؒ کے حلقۂ غلامی میں نہ صرف داخل ہو گئے بلکہ ہمیشہ اس حلقہ میں فخر کرتے رہے۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے رومؒ

تا غلام شمس تبریزؒ نہ شد

(مولانا رومؒ اس وقت تک مولوی (عالم) نہ بن سکے، جب تک انہوں نے حضرت شمس تبریزؒ کی غلامی اختیار نہیں کر لی)

کتابیں حوض میں ڈالنے کے بعد جب حضرت شمس تبریزؒ نے فرمایا تھا کہ ہم ہی اس نقصان کو پورا کریں گے تو جواب میں مولانا رومؒ نے اپنی منطق پیش کی تھی کہ پانی میں بھیج جانے والی کتابوں کی تقدیر کو بدلا نہیں جاسکتا..... اور یہاں سے چھوٹے ہوئے تیر کو موڑ کر واپس نہیں لایا جاسکتا۔ پھر جب حضرت مولانا جلال الدین روٹیؒ نے پورے ہوش و حواس اور کھلی آنکھوں کے ساتھ حضرت شمس تبریزؒ کی کرامت دیکھ لی تو اپنی مثنوی میں ایک مقام پر فرمایا۔

اولیاء راہست قدرت از الہ

تیر جستہ باز گردند ز راہ

(اولیاء کو اللہ کی طرف سے یہ قدرت بخشی گئی ہے کہ وہ چھوٹے ہوئے تیر کو راستے سے موڑ کر واپس لاسکتے ہیں) اب ہم حضرت شیخ حسینؒ کے اس واقعے کی طرف رجوع کرتے ہیں، جب آپ نے ”تفسیر مدارک“ کو کونویں

سے نکال کر اپنے ہم کتب دوستوں کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ واقعہ حضرت مولانا رومؒ کے واقعے سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت شمس تبریزؒ کے حوالے سے جو تاریخی واقعہ پیش آیا تھا، وہ دوبارہ اس اسباب میں رونما نہیں ہو سکتا۔ ”تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔“ اس مشہور مقولے کا مفہوم ہی یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے پیش آیا تھا، وہی واقعہ زمان و مکان اور کرداروں کے فرق کے ساتھ 2000ء میں پیش آجائے۔ اس کے ساتھ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ پاک و ہند کے خوش عقیدہ لوگ اپنے سلسلے کی عظمت کو ظاہر کرنے کے ماضی کے واقعات کو حال سے جوڑ دیتے ہیں۔ تاریخ تصوف میں ایسی بہت سی مثالیں نظر آئیں گی۔ ہماری تعمیل مطابق حضرت شیخ حسینؒ کی ذات گرامی سے منسوب یہ واقعہ رونما ہی نہیں ہوا تھا۔

اس کے دو ظاہری اسباب ہیں۔ پہلا یہ کہ ”کتاب بہاریہ“ کے مصنف بہار خان کوئی عالم، محقق یا تاریخ نگار نہیں۔ وہ محض مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر کا ایک درباری تھا۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ روایتوں کے مطابق شاہ جہاں کے بڑے بیٹے داراشکوہ نے اپنی تصنیف ”خطبات دارا“ میں حضرت شیخ حسینؒ متعلق تحریر کیا ہے کہ شہزادہ سلیم اور اس کی والدہ، رانی جودہا بائی، حضرت شیخ حسینؒ کی روحانی طاقت کے قائل تھے۔ چنانچہ شہزادے نے اپنے ایک درباری، بہار خان کو خاص طور پر اس کام کے لئے مقرر کیا تھا کہ وہ حضرت شیخ کی ڈائری (یادداشت) لکھتا رہے۔ پھر یہی ڈائری ”کتاب بہاریہ“ کے نام سے موسوم ہوئی جو حضرت شیخ کے حوالے سے دلچسپ معلومات کی حامل ہے۔

حضرت شیخ سعد اللہؒ سے درس لینے اور تفسیر مدارک کے کنوئیں میں ڈالنے کا واقعہ 981ھ میں پیش آیا تھا۔ مغل شہزادہ سلیم 977ھ میں پیدا ہوا تھا۔ گویا اس وقت سلیم کی عمر صرف چار سال تھی۔ پھر جب حضرت شیخ گرفتار کر کے لاہور سے آگرہ لایا گیا، اس وقت بھی شہزادہ سلیم زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سال کا ہوگا۔ اس 1000ھ میں مغل شہزادہ کس طرح جان سکتا تھا کہ حضرت شیخ حسینؒ کون ہیں اور انہیں جس جرم کے تحت گرفتار کیا گیا ہے؟ کی حقیقت کیا ہے؟

حضرت شیخ حسینؒ کے انتقال کے وقت شہزادہ سلیم کی عمر اکتیس سال تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب سلیم کا نیک حضرت شیخ حسینؒ کے واقعات پہنچے۔ پھر اس نے بہار خان درباری کو حضرت شیخ حسینؒ کے واقعات لکھ مامور کیا۔ واضح رہے کہ اس وقت شہنشاہ جلال الدین اکبر زندہ تھا۔ اس کا انتقال حضرت شیخ حسینؒ کی وفات کے سال بعد 1014ھ میں ہوا تھا۔

یہ وہ نازک ترین دور تھا، جب برصغیر ہندوستان کی فضائیں اکبر کے ایجاد کردہ نئے مذہب دین الہی کے ٹوٹ گونج رہی تھیں۔ اور صحیح العقیدہ مسلمان سخت آزمائشوں میں مبتلا تھے۔

خود شہزادہ سلیم کی حسن پرستی اور شراب نوشی کے قصے زبان زد عام تھے۔ اہل نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک نیک مزاج شہزادے کے اس درباری کا کیا معیار ہوگا، جسے حضرت شیخ حسینؒ کے حالات قلم بند کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ جہاں اکبر کو خوش کرنے کے لئے ”السلام علیکم“ کی جگہ ”جل جلالہ، اللہ اکبر“ کہا جا رہا ہو، مغل شہزادہ جہرہ کے میں بیٹھ کر رعایا کو اپنا دیدار کر رہا ہو..... وہاں بہار خان جیسا درباری ایسے ہی واقعات تحریر کرے گا؟ شریعت کے احکام میں خلل انداز ہوں اور جن سے اسلام کا وقار مجروح ہوتا ہو۔ مختصر یہ کہ تحقیق کے میدان میں یہ خان کی بیان کردہ روایات کو درجہ اعتبار حاصل نہیں۔

”حقیقت الفراء“ کے مصنف سید پیر محمد صاحبؒ ہیں جنہوں نے یہ کتاب 1071ھ میں تصنیف کی تھی

ایک طویل فارسی نظم ہے، جسے حضرت شیخ کی منظوم سوانح حیات کہا جاسکتا ہے۔ حضرت شیخ حسینؒ کا انتقال ۱۰۸۸ھ میں ہوا تھا۔ ”حقیقت الفقراء“ کی تصنیف اور حضرت شیخ حسینؒ کی وفات میں 63 سال کا فرق ہے۔ اس لیے یہ تذکرہ قدیم ترین ہے۔ یعنی واقعات پر ماہ و سال کی اتنی گردنہیں جی ہوگی کہ اسے صاف کرنا دشوار ہو۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ روایتوں کا چہرہ دھندلا ہوتا چلا جاتا ہے..... اور پھر غائبانہ تذکرہ نویسوں کے لئے روایت کے حقیقی خدوخال ابھارنا مشکل ہی نہیں، اکثر و بیشتر ناممکن بھی ہو جاتا۔ اس سلسلے میں سید پیر محمد صاحبؒ کو یہ نوبت حاصل ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کے انتقال کے وقت ان کا بچپن ہو۔ اگرچہ وہ اپنے عہد جوانی سے گزر رہے ہوں گے تو اس وقت ایسے بہت سے بوڑھے موجود ہوں گے، جنہوں نے حضرت شیخ حسینؒ کو دیکھا ہوگا، بلکہ اس سرمست عشق کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوئے ہوں گے۔

فہمی روایتوں کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ لاہوریؒ کے نو ہزار مرید تھے۔ سید پیر محمد صاحبؒ یقیناً کچھ مریدوں سے ملے ہوں گے۔ پھر ان ہی مریدوں کے بیان کردہ واقعات کی روشنی میں انہوں نے ”حقیقت الفقراء“ ترتیب دی۔ حالات کے اس پس منظر میں ہمیں سید پیر محمد صاحبؒ کی تصنیف ہی کو درجہ اعتبار دینا ہوگا..... اور حقیقت ہے کہ ”تفسیر مدارک“ کے کونوئیں میں پھینکنے کا واقعہ ”حقیقت الفقراء“ میں تحریر نہیں۔ صرف بہار خان نے اپنی تہ بہار یہ ”میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے، جو بعد کی تصنیف ہے۔

اس واقعے کی روایتی کو تسلیم نہ کرنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کوئی جاہل صوفی نہیں تھے۔ آپ قرآن مجید کی اور فہم قرآن بھی رکھتے تھے۔ حضرت شیخ حسینؒ کو خبر تھی کہ ان کے ہاتھ میں اللہ کی آخری کتاب کی کفر ہے۔ موجودہ طریقہ تو یہ ہے کہ تفسیر میں پہلے آیات الہی رقم کی جاتی ہیں۔ پھر ان کے معانی درج کیے جاتے ہیں..... اور آخر میں تشریح۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ماضی بعید میں بھی یہی طریقہ رائج ہوگا۔ پھر یہ کس نامکمل نقاد کا حضرت شیخ حسینؒ کا کلام الہی کو کونوئیں میں ڈال دیتے اور اپنے ہم مکتب دوستوں کے سامنے یہ اعلان کرتے۔

”یہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

بڑا نصرت شیخ حسینؒ کو دلی سمجھتے ہیں، انہیں یہ نکتہ اور راز بھی سمجھ لینا چاہئے کہ حضرت شیخ حسینؒ کو ”تفسیر مدارک“ کی تفسیر قرآن کی ضرورت تھی۔ سورہ بقرہ کی ابتدائی آیتوں کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

”اس کتاب مقدس (قرآن) کے سچ کسی شک کی گنجائش نہیں..... یہ پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔“

پھر گامی دلی بنتا ہے..... اور دلی ہمیشہ کتاب مقدس کا محتاج رہتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ حالت سکر و بربادی میں انسان کو اپنے ہوش و حواس پر قابو نہیں رہتا اور اس کی زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ مگر یہ واقعہ جس زمانہ کی تصنیفات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے استاد گرامی حضرت شیخ سعد اللہ سے ملنے کے اور پھر ”تفسیر مدارک“ کے کونوئیں میں ڈالنے تک، حضرت شیخ حسینؒ مکمل ہوش و حواس میں تھے۔ دلی کی بیگانگی یہ تھی کہ بے ہوشی کے عالم میں مالک حقیقی سے اس کا رابطہ نہیں ٹوٹتا۔

مولا نے کرام میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انتہائی خاموشی سے ذکر الہی کرتے ہیں..... اور سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے ”اللہ“ کی آواز آ رہی ہے۔ اس ذکر کو تصوف کی زبان میں ”ذکر خفی“ کہتے ہیں۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ کتب جاری ہو جاتا ہے۔ میں نے بذات خود ایسے کئی مردان خدا کو دیکھا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے کئی دن تہ بہ ہوش رہے..... مگر اس دوران میں ان کی زبان بول اللہ کا نام جاری رہا۔ عشق کی اس کیفیت کو مشہور شاعر جگر

مراد آبادی نے عجیب انداز میں بیان کیا ہے۔

پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف

اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں !!

ہمیں حضرت شیخ حسینؒ سے بھی یہ حُسن ظن رکھنا چاہئے کہ آپ تفسیرِ قرآن کے ساتھ یہ گستاخانہ روئی اختیار کر سکتے تھے۔ حضرت شمس تبریزؒ نے بھی منطق اور فلسفے کی کتابیں حوض میں پھینکی تھیں اور اس کا مقصد حضرتؒ روہ کو یہ سمجھانا تھا کہ ان کتابوں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ علم و آگہی کسی اور ہی شے کا نام ہے۔ پھر حضرتؒ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ انہیں تفسیرِ قرآن کی ضرورت نہیں۔“

تفسیر مدارک کا پورا نام ”مدارک التزیل“ ہے۔ جسے ابوالبرکات، عبداللہ بن احمد بنی نے 710ھ میں تخریر کیا۔ ان تمام واقعات کی روشنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ ”کتاب بہاریہ“ کی یہ روایت ضعیف اور وضع کردہ ہے۔ سے حضرت شیخ حسینؒ کی شانِ ولایت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا..... بلکہ عام مسلمانوں کے ذہن بری طرح متاثر جاتے ہیں۔

بہار خان کی روایت کے مطابق جب حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے ہم مکتب دوستوں کے اصرار پر ”تفسیر مدارک“ خٹک حالت میں کنوئیں سے نکال کر ان کے حوالے کر دی تو شہر لاہور میں آپ کی اس کرامت کا چرچا ہوا۔ پس اسی روز سے حضرت شیخ حسینؒ نے ”لاماعتیہ“ کا طریقہ اختیار کر لیا۔

حضرت شیخ حسینؒ لاہوریؒ کا رنگ ملامت کیا تھا؟ اور فرقہٴ ملامتیہ کسے کہتے ہیں، اس پر ہم مضمون کے آخری تفصیلی بحث کریں گے۔ پہلے حضرت شیخ حسینؒ کی ان کرامات کا ذکر جو خاص و عام میں بہت زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ انسانی معاشرے میں ”کیسیا گری“ اور ”اکسیر“ کا بہت شہرہ ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر آج تک ہمارے لوگ اس جنون میں مبتلا رہے ہیں کہ کسی طرح تانبے کو سونا بنانے کا نسخہ ان کے ہاتھ آجائے..... اور راتوں رات ان کے مالدار ترین انسان بن جائیں۔ تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات نظر آتے ہیں کہ اہل حرص وہوں نے کبرِ نسخہ یا ترکیب حاصل کرنے کے لئے اپنی عمر بھی برباد کی اور دولت بھی لٹا ڈالی..... مگر ناکام و نامراد رہے۔

کیسیا عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مفہوم ہے، ناقص اشیاء میں روح شامل کر کے انہیں کمال کے مرتبہ پہنچانا۔ جب ایک شخص اپنے فن سے ایک عام اور سستی دھات ”تانبے“ کو سونے جیسی قیمتی دھات میں بدل کر ان کے انتہائی مقام تک پہنچاتا ہے تو اسے کیسیا گری کہتے ہیں۔ اسلام کی آمد سے پہلے عرب اور ساری دنیا میں چاند گرہی کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گویا نسلِ آدم، زنگ آلود تانبے کی طرح تھی۔ اللہ کے آخری دین نے اس میں نور پھونکی اور ایک کم ترین دھات کی ماہیت بدل کر اسے سونا بنا دیا۔ اس رعایت سے خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے فرما کریم کو نسخہ کیسیا سے تعبیر کیا ہے۔ مولانا حالیؒ اپنی مایہ ناز شعری تصنیف ”مسدس“ ”مد و جذرِ اسلام“ میں حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و عظمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا

اور اک نسخہ کیسیا ساتھ لایا

حضرت شیخ حسینؒ کے زمانے میں بھی لاہور کے اندر ایک کیسیا گر موجود تھا۔ اس نے عمر عزیز کا بڑا حصہ کے کسی نہ کسی طرح ایک تولہ یا چھوٹی سی مقدار میں سونا بنا لیا..... اور اپنے اس کارنامے پر اس قدر نازاں ہ سارے شہر کو اپنی ہنرمندی کے قصے سناتا پھرتا تھا۔ کئی صراف کے سامنے بھی اپنا بنایا ہوا سونا پیش کیا۔ ان لوگوں

بہاؤ گیارہ گئے سونے کو پرکھا..... اور تصدیق کر دی کہ اس سونے میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔
 پھر جب حضرت شیخ حسینؒ کی روحانیت اور کرامت کا شہرہ عام ہوا تو لاہور کا وہ کیسیا گرا ایک مرد درویش کی
 ذات میں حاضر ہوا اور بطور فقر اپنا بتایا ہوا سونا پیش کیا۔

حضرت شیخ حسینؒ نے کیسیا گرا کے سونے کو بے نیازانہ دیکھا اور سوال کیا۔ ”میرے بھائی! تم نے کیسیا کا نسخہ
 کیا کرنے میں کتنا وقت گزارا؟“

”ہزار دن تامل..... اور ہزار دن سوئے۔“ کیسیا گرا نے اپنی تحقیق و جستجو کو اس طرح بیان کیا جیسے کائنات میں
 بہاؤ گرا کے سوا کسی شے کی کوئی حقیقت نہیں۔

حضرت شیخ حسینؒ بہت غور سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ پھر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”میرے نادان بھائی!
 تم نے سونے کے لئے اتنی زحماتیں برداشت کیں۔ پہلے سیلاب (پارہ) لائے۔ پھر جنگل جنگل مخصوص ٹوٹیوں کی
 ڈن میں سرگرداں پھرتے رہے۔ اس کے بعد اودھوں (گائے یا بھینس کے گوبر) کا دھواں کھاتے رہے۔ پھر کہیں
 بار بار بڑھوسنا تیار کیا۔ اگر ہزار مشقتوں کے بعد سونے کا پہاڑ کھڑا کر لیتے تو کوئی بات بھی تھی۔ کم سے کم دنیا تو
 ڈنڈا بنائی۔ مگر انفس! تم نے اپنی سونے سے زیادہ قیمتی عمر رائیگاں بسر کی۔“

کیسیا گرا کو حضرت شیخ حسینؒ کی بات بہت گراں گزری اور اس نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ ”شیخ! میرے بعد تو
 نے اتنی ہی ڈنڈا بنانے والا بھی کوئی نہیں۔“

کیسیا گرا کی لاف زنی سن کر حضرت شیخ حسینؒ نے تبسم فرمایا۔ ”ابھی تم نے کیسیا گرا کہاں دیکھے ہیں؟“
 ”اگر کوئی ہے تو مجھے اس کا پتہ بتائیں۔“ کیسیا گرا کے لہجے میں وہی غرور تھا۔ ”میں تصدیق کروں گا کہ وہ حقیقی
 بہاؤ گرا ہے یا دنیا کو فریب دینے کے لئے جھوٹ بول رہا ہے؟“

حضرت شیخ حسینؒ نے کیسیا گرا سے مزید گفتگو کرنے کے بجائے اس مٹی کے ڈھیلے کی طرف اشارہ کیا جو سامنے
 پڑا۔ ”اے اٹھا کر لاؤ۔ وہ مٹی کا ڈھیلا خود بتا دے گا کہ یہاں کوئی کیسیا گرا ہے یا نہیں؟“

کیسیا گرا حیرت و تذبذب کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھا اور مٹی کا ڈھیلا لا کر حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں
 ڈنڈا کر دیا۔

حضرت شیخ حسینؒ چند لمحوں تک مٹی کے ڈھیلے کو دیکھتے رہے۔ پھر کیسیا گرا سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔
 ”تمہارے علم کے اصولوں کے مطابق صرف تانبا ہی سونے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقی کیسیا گرا یہ ہے کہ مٹی کو
 مٹا دیا جائے۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ حسینؒ نے اس مٹی کے ڈھیلے پر تھوک دیا۔

کیسیا گرا کو سکتہ سا ہو گیا۔ ایک مرد حق پرست کا لعابِ دہن، افسیر سے بھی زیادہ بُرا تاثیر تھا، جس نے ایک
 مات میں مٹی کو مٹا دیا۔

اس قسم کے واقعات دیگر بزرگانِ دین کے ساتھ بھی منسوب ہیں۔ ایک دن ایک غریب اور بوڑھی عورت،
 حضرت ابافریہ الدین مسعودؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور نہایت غم زدہ لہجے میں اپنی بے چارگی اور افلاس کا
 ذکر کرنے لگی۔

”ہا! میری تین بیٹیاں ہیں، جو شادی کے قابل ہو چکی ہیں۔ مگر میں کسی ایک کے بیاہ کی بھی استطاعت نہیں
 رکھتی۔ دعا فرمائیں کہ اللہ میری مشکل آسان فرمائے۔“

”نا تو! یہاں قریب سے کسی کنکر یا پتھر کا ٹکڑا اٹھا لاؤ۔ اللہ تمہاری مشکل کشائی فرمائے گا۔“ حضرت ابافریہؒ

نے بوڑھی عورت کی رودادِ غم سننے کے بعد فرمایا۔

افلاس زدہ عورت بے تابانہ اٹھی اور ایک پتھر کا ٹکڑا اٹھا لائی۔

حضرت بابا فریدؒ نے پتھر کا وہ ٹکڑا اپنے دست مبارک میں لے کر پہلے بسم اللہ، پھر تین مرتبہ سورۃ (قل ھو اللہ احد) با آواز بلند پڑھی..... اور پتھر کے ٹکڑے پر دم کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پتھر کا ٹکڑا سونے کی میں تبدیل ہو گیا۔ ”اسے بازار میں فروخت کر کے اپنی بیٹیوں کی شادی کے انتظامات کر لو۔“

بوڑھی عورت، حضرت بابا فریدؒ کا شکر یہ ادا کر کے چلی گئی۔ اسے اس وقت دہری خوشی حاصل تھی۔ ایک بڑے کے توسط سے اس کی بیٹیوں کی شادی کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور سونا بنانے کا نسخہ بھی اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ بوڑھی عورت نے گھر جاتے ہی غسل کیا اور مصلیٰ بچھا کر سورۃ اخلاص پڑھ کر ایک بڑے پتھر پر دم کر لی۔ تین بار کی جگہ تیس بار..... اور پھر تین سو بار..... یہاں تک کہ پتھر پر پھونکتے پھونکتے بوڑھی عورت کی سانس بڑھ مگر پتھر کی ظاہری شکل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہ پتھر تھا اور پتھر ہی رہا۔ آخر عاجز ہو کر دوبارہ حزن فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی۔

”بابا! میرے پڑھنے میں غلطی تھی یا پھر سورۃ اخلاص کی تاثیر بدل گئی؟“

بوڑھی عورت کی بات سن کر حضرت بابا فریدؒ مسکرائے۔ ”خاتون! نہ تمہارے پڑھنے میں کوئی غلطی ہوئی، آیات مقدسہ کی تاثیر بدلی ہے۔ غسل کا اہتمام، تلاوت کے آداب، قرأت کا طریقہ..... سب کچھ درست تھا۔ تمہارے منہ میں فریدؒ کی زبان نہیں تھی۔“

یہ حضرت بابا فریدؒ کی زبان ہی کی تاثیر تھی کہ پتھر کا ٹکڑا سونے میں تبدیل ہو گیا۔

اور اسی طرح یہ حضرت شیخ حسینؒ کے لعابِ دہن کا اثر تھا کہ مٹی کے ڈھیلے کی ماہیت اور فطرت بدل گئی۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

علامہ اقبالؒ نے بھی روحانیت کی اسی منزل کی طرف اشارہ کیا ہے۔



روایت ہے کہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے عبدالرحیم خان خاناں کو ٹھٹھہ کی تسخیر کی مہم پر روانہ کیا۔ ان ٹھٹھہ کی بغاوت دارالحکومت کے لئے ایک سنگین مسئلہ بن گئی تھی۔ اس طرح یہ عبدالرحیم خان خاناں کی فہم و فراست امتحان بھی تھا..... اور دربارِ اکبری میں اس کی عزت کا سوال بھی۔ عبدالرحیم خان خاناں ایک لشکرِ جرار لے کر ان سے لاہور پہنچا۔

ان دنوں شیخ مبارک کا بیٹا، شیخ ابوالفضل کسی ضروری کام سے لاہور میں مقیم تھا۔ واضح رہے کہ شیخ مبارک بدعقیدہ انسان تھا۔ جس طرح موجودہ زمانے میں بڑی بڑی حکومتیں اپنے مخصوص ایجنٹ دیگر ممالک میں داخل کرتی ہیں اور ان کے ذریعے یا تو سیاسی انتشار برپا کرتی ہیں..... یا پھر اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرتی ہیں۔ اسی طرزِ سابقہ قدیم میں بھی کچھ لوگ علم و فضل کا لباس پہن کر ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر اختیار کرتے تھے۔ ہمارے طبقے میں شامل ہو کر فرماں روئے وقت کے دربار تک رسائی حاصل کرتے تھے۔ پھر اپنی ریاکاری، خوشنما اور غریب کے ذریعے حکمران کے مزاج میں ذخیل ہوتے تھے..... اور آخر میں اس ملک کی سیاست پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ شیخ مبارک کو بھی جدید سیاسی اصطلاح کے مطابق ”بیرونی ایجنٹ“ کہا جاسکتا ہے۔

یہ شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی ہی تھے کہ جن کی فتنہ گری نے مغل شہنشاہ کو گرفتار کیا۔

جلال الدین اکبر ایک نیا مذہب ”دین الہی“ ایجاد کرنے پر مجبور ہو گیا۔

روایت ہے کہ عبدالرحیم خان خاناں، شیخ ابوالفضل سے ملا..... اور ٹھٹھہ کی مہم کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔

شیخ ابوالفضل اپنے سیاسی تجربات و مشاہدات بیان کرتا رہا..... اور عبدالرحیم خان خاناں کو مناسب مشورے دیتا

۔ پھر ان نے اپنی توثیق کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”شہنشاہ اکبر کے جلال و سطوت اور افواج قاہرہ کی پشت

کے باوجود ٹھٹھہ کی مہم تمہاری آزمائش ہے۔ اس محاذ پر تمہیں اپنی ذہانت کے ساتھ ساتھ انتہائی صبر اور قوت و

ثبات کا مظاہرہ بھی کرنا ہوگا۔“ شیخ ابوالفضل نے مبہم الفاظ میں آئندہ پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر کر دیا تھا۔

ایک استاد کی گفتگو سن کر عبدالرحیم خان خاناں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ناکامی کی صورت میں اسے اپنے

مستقبل کا خاتمہ صاف نظر آ رہا تھا۔ عام دنیا دارانہ رسم کے مطابق دربار اکبری کے دوسرے امراء عبدالرحیم خان

کے جاہ و منصب سے خوش نہیں تھے۔ بعض خوشامدی اور حاسد امیروں نے ہی شہنشاہ جلال الدین اکبر کو مشورہ

فائدہ ٹھٹھہ کی جنگی مہم، خان خاناں کے سپرد کر دے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ عبدالرحیم سے یہ معرکہ سر نہیں ہو

سکتا..... اور پھر وہ دربار اکبری میں اپنی عزت و آبرو گنوا بیٹھے گا۔ خود عبدالرحیم خان خاناں کے استاد شیخ ابوالفضل

بائوں سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ٹھٹھہ کا محاذ ایک مشکل ترین محاذ ہے..... اور سامان حرب و ضرب کی اکثریت کے

جوتائی آسان نہیں ہوگی۔ ان تمام حقائق نے عبدالرحیم خان خاناں کی غیند اڑا دی..... اور وہ رات بھر ٹھٹھہ کی فوجی

مہم کے بارے میں سوچتا رہا۔

پھر دوسرے دن وہ دوبارہ شیخ ابوالفضل کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ ”ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں صرف

ہاں غامہ ہی پر مجبور نہ نہیں کرنا چاہئے۔“

شیخ ابوالفضل نے حیران ہو کر عبدالرحیم خان خاناں کی طرف دیکھا۔ ”اگر تم اسباب ظاہری کی کثرت سے

طعن نہیں تو پھر اور کون سے اسباب تمہیں درکار ہیں؟“

”میں روحانی طاقت کی بات کر رہا ہوں۔“ عبدالرحیم خان خاناں نے بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اگر لاہور میں کوئی بزرگ موجود ہوں تو آپ ان تک میری رہنمائی کریں۔“

”کیا تم روحانی طاقت پر یقین رکھتے ہو؟“ شیخ ابوالفضل کی حیرت بدستور تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عبدالرحیم خان

خاناں ایک اعلیٰ منصب دار ہونے کی وجہ سے روحانی بزرگوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہوگا۔

”خیر نصرت تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔“ عبدالرحیم خان خاناں نے قرآن کریم کی ایک آیت مقدسہ کی

تلاوت کرتے ہوئے کہا۔ ”اور اللہ ان کی زیادہ مستحق ہے، جو اس کے زیادہ قریب ہیں۔“

”خان خاناں! اگر تم بزرگوں سے واقعی عقیدت رکھتے ہو تو میں تمہیں ایک ایسے بزرگ کا پتہ دیتا ہوں، جو اس

سطح میں تمہارے بہت مددگار ثابت ہوں گے۔“ شیخ ابوالفضل نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”یہاں لاہور میں ایک

بزرگ شیخ حسینؒ رہتے ہیں۔ اگر تمہیں ان کی بارگاہ میں کامیابی حاصل ہوگئی تو پھر بہت سی مشکلات دور ہو جائیں

گی۔ اور جب نہیں کم اس جنگی مہم میں شاندار فتح حاصل کر سکو۔“

بزرگ کا نام سن کر عبدالرحیم خان خاناں کے چہرے پر چند لمحوں کے لئے خوشی کا رنگ اُبھرا۔ مگر فوراً ہی فکر کے

آہٹ نظر آنے لگے۔ ”کیا ان بزرگ کی بارگاہ کرم تک رسائی حاصل کرنا کار و دشوار ہے؟“

”عام طور پر شیخ حسینؒ کسی سے ملاقات کو پسند نہیں کرتے۔ آزاد مشرب انسان ہیں۔ اس لئے کسی وزیر و امیر کو

داخل نہیں لاتے۔“ شیخ ابوالفضل نے حضرت شیخ حسینؒ کی مزاحیہ کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ تمہیں

طرح کے انسان ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کون، کس لباس میں ہے اور کیا سوچ رہا ہے؟“ سپاہیوں نے آداب کے مطابق عبدالرحیم خان خانان کو حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

تہاے اندیشے اور مشورے درست..... مگر میں جہاں جا رہا ہوں، وہاں میرا اکیلا جانا ہی مناسب ہے۔“ عبدالرحیم خان خانان، گھوڑے پر سوار ہوا اور اس مکان کی طرف روانہ ہوا، جہاں آج کی رات حضرت شیخ رحمہ اللہ ہوئے تھے۔

حضرت شیخ حسینؒ نے مرید سے اپنا کھانا طلب کیا تو اس نے وہ دونوں پراٹھے بھی پیش کئے جو نہایت ذوق و لہجہ کے ساتھ تیار کئے گئے تھے۔

”ابن علیؑ رکھ دو۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے پراٹھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”فقیر کو ان لذیذ خانا سے کیا غرض؟“

پیر و مرشد کا حکم سن کر مرید کا چہرہ اتر گیا۔ حضرت شیخ حسینؒ نے فوراً ہی اس کی تالیف قلب کے لئے فرمایا۔ یہ لے لے تہاے گھر کی یہ سادہ غذا، دسترخوانِ شاہی پر چنی ہوئی نعمتوں کے انبار سے کہیں بہتر ہے۔ یہ نانا بنائیں نے ایک مہمان کی فرمائش پر تیار کرائی ہیں۔“

اُسی رات کا وقت ہو رہا تھا۔ مرید نے پیر و مرشد کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں عرض کیا۔ ”شیخ! ہاں توکل آئے گا..... اور اس وقت تک یہ روٹیاں باقی ہو جائیں گی۔“

”نہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بس وہ مہمان آنے ہی والا ہے۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے فرمایا اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔

درویش کی غذا سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت مختصر تھی۔ یہ لوگ بہ تقاضائے بشری، زندہ رہنے کے لئے مانتے ہیں۔ اہل دنیا کی طرح کھانے کے لئے زندہ نہیں رہتے۔

حضرت شیخ حسینؒ کا کھانا ختم ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ آپ نے مسکراتے ہوئے اپنے مرید سے کہا۔ ”ہمارا مہمان آگیا۔ اسے احترام کے ساتھ اندر لے آؤ۔“

مرید نے دروازہ کھولا تو ایک دروازہ قامت اور وجیہ شخص، سادہ سے لباس میں کھڑا تھا۔ صاحب خانہ کو اندازہ نہ ہوا کہ آنے والا، دربار اکبری کا ایک اعلیٰ منصب دار ہے..... اور ایک فقیر کے در پر نیاز مندانه حاضر ہوا ہے۔

شیخ ابو الفضل کے مشورے کے مطابق عبدالرحیم خان خانان نے حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں سلام عرض کیا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

حضرت شیخ حسینؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”تشریف رکھیے۔“

عبدالرحیم خان خانان کو حضرت شیخ حسینؒ کے طرزِ کلام پر حیرت ہوئی۔ شیخ ابو الفضل کے کہنے کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ اپنے پاس آنے والوں کو گالیوں سے نوازتے ہیں۔ مگر یہاں تو معاملہ جدا گانہ تھا۔ الغرض اسی بہت میں جلال عبدالرحیم خان خانان، حضرت شیخ حسینؒ کے رو برو فرما کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد مرید نے وہی نانا مرغ، خان خانان کے سامنے لا کر رکھیں جنہیں حضرت شیخ حسینؒ نے بطور نمان تیار کروایا تھا۔ دربار اکبری کے اعلیٰ عہدیدار کو بڑی حیرت ہوئی۔ حضرت شیخ حسینؒ نے اپنی قوت کشف کے

زریعے اس کے دل کا حال جان لیا تھا۔

”شیخ! میں ایک نہایت ضروری کام سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔“ عبدالرحیم خان خانان نے

عاجزی کے ساتھ عرض کیا۔

”بھوکے کو پہلے کھانا کھانا چاہئے۔ بعد میں دوسرے کام۔“ حضرت شیخ حسینؒ کے کلام میں ایک نیا پوشیدہ تھا۔

عبدالرحیم خان خاناں نے وہ پراٹھے کھانا شروع کر دیئے، جن کی خواہش خود اسی نے کی تھی اور حضرت حسینؒ کی روشن ضمیری کو آزمانا چاہتا تھا۔ جب خان خاناں ایک روٹی کھا چکا تو حضرت شیخ حسینؒ نے اسے ہر کرتے ہوئے فرمایا۔

”جب ہم فقیر، تم امیروں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تو پھر ہمیں آزمانے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے؟“ راستے پر..... اور ہم اپنے راستے پر۔“

حضرت شیخ حسینؒ نے عبدالرحیم خان خاناں کی اس سوچ کی طرف اشارہ کیا تھا، جب اس نے یہاں آنے پہلے کہا تھا کہ اگر شیخ حسینؒ واقعی صاحب کشف ہیں تو اسے آج کی رات نان مرغن کھلائیں گے۔ شیخ کی بات سن ہی خان خاناں کے چہرے پر شدید ندامت کے آثار نظر آنے لگے۔ اور اس کا ہاتھ رک گیا۔

”کھانا جاری رکھو۔“ حضرت شیخ حسینؒ کا لہجہ ابھی تک نرم و شیریں تھا۔ ”فقیر امراء کی طرح عجب لڑنے ہوتے۔ یہ شکایت تو بس برائے شکایت تھی۔ اگر تمہاری خاطر داری منظور نہ ہوتی تو پھر تمہیں اس گلی کا راز کب ملتا۔“

عبدالرحیم خان خاناں، سر جھکائے ہوئے کھانا کھاتا رہا۔ پھر جب دربار مغلیہ کا ایک باحیثیت انسان البکتر کے گھر کا کھانا کھا چکا تو حضرت شیخ حسینؒ نے خان خاناں سے اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

”مجھے ٹھٹھہ کے علاقے میں ایک مشکل جنگی مہم درپیش ہے۔“ عبدالرحیم خان خاناں نے درخواست گزار کی لہجے میں اہتمام عاید کیا۔

”فقیر کے پاس نہ تیر و تھر ہے، نہ شمشیر و خنجر۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے فرمایا۔ ”جنگ تو سامان جنگ کے بغیر لڑی جاتی ہے۔“

”میرے پاس سامان حرب و ضرب موجود ہے۔ مگر میں آپ سے روحانی امداد کا طلب گار ہوں۔“ عبدالرحیم خان خاناں نے عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔

”تجھے یہاں آنے سے پہلے کسی نے نہیں بتایا کہ میں ایک سوداگر ہوں۔“ یکایک حضرت شیخ حسینؒ کے لہجے سے رنگِ جلال ظاہر ہونے لگا تھا۔

خان خاناں بذاتِ خود ایک عالم و فاضل انسان تھا۔ مگر ایک درویش کے کلام کی حریت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ شدید حیرت کے عالم میں حضرت شیخ حسینؒ کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا منہ کیا دیکھتا ہے؟“ حضرت شیخ حسینؒ کا رنگِ جلال کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ ”سوداگری کا مطلب ہے خرید و فروخت..... میں تیرے ہاتھ ٹھٹھہ کا پورا علاقہ بیچتا ہوں۔ اگر تجھ میں خریدنے کی قوت ہے تو خرید لے بولی لگا۔“

حضرت شیخ حسینؒ کے اس طرزِ کلام پر عبدالرحیم خان خاناں دم بخود رہ گیا۔ پھر بہت آہستہ سے غصے کی آواز نکالی۔ ”میں آپ کی نذر کے لئے پانچ سو روپے لایا تھا۔“

”نذر کوئی اور شے ہوتی ہے۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔ ”یہ کھلی سوداگری ہے۔ لا، رقم نکال۔“

عبدالرحیم خان خاناں نے وہ تھیلی حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں پیش کی، جسے وہ ہمراہ لایا تھا۔
 ”کہاں لائے ہو؟“ کی روایت کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ لاہورؒ نے پانچ سو روپے کی تھیلی لے کر دربار
 پہنچا۔ بہت بڑے وزیر، عبدالرحیم خان خاناں کو با آواز بلند کئی گالیاں سنائیں۔ پھر انتہائی پرجلال لہجے میں فرمایا۔
 ”اگر ان کو کٹھن نے ملک ٹھٹھہ، پانچ سو روپے کے عوض ہم سے خریدا۔“

عبدالرحیم خان خاناں نے یہی الفاظ دہرا دیئے۔ پھر جب وہ جانے لگا تو حضرت شیخ حسینؒ نے اسے تنبیہ
 کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اپنی فتح کے لئے اب کسی درویش سے درخواست نہ کرنا۔ کیونکہ ملک ٹھٹھہ ہم نے تجھے بخشا
 ہے۔“

عبدالرحیم خان خاناں شدید حیرت و تذبذب کی کیفیت میں ڈوبا ہوا دوبارہ اپنے استاد شیخ ابوالفضل کے پاس
 پہنچا اور اس نے سارا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ سنا دیا۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ شیخ حسینؒ امراء سے اسی طرح پیش آتے ہیں۔ بہر حال، تمہیں فتح کی
 بات مبارک ہو۔“ خان خاناں کی گفتگو سننے کے بعد شیخ ابوالفضل نے کہا۔ ”اب تم بے دریغ ٹھٹھہ پر لشکر کشی کر
 اور تمہارے قدم چومے گی۔“

اگرچہ عبدالرحیم خان خاناں، لشکرِ جرار لے کر محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہوا۔ پھر جب شاہی فوج ملتان پہنچی
 ان کے سرداروں نے خان خاناں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”اس شہر میں ”سلسلہ سہروردیہ“ کے عظیم بزرگ، حضرت
 بہاء الدین زکریاؒ کا مزارِ مبارک ہے..... اور وہاں کے سجادہ نشین ایک بڑے بزرگ ہیں۔ ان کی خدمت میں
 پہنچ کر ان کی ہمارے لئے باعثِ برکت ہوگی۔“

عبدالرحیم خان خاناں کو حضرت شیخ حسینؒ کی ہدایت کا خیال نہیں رہا..... اور وہ جوشِ عقیدت کے ساتھ حضرت
 بہاء الدین زکریاؒ کی ملامتی کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت شیخ کبیرؒ مزارِ مبارک کے سجادہ نشین
 نے آپ کا تعلق حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے خاندان سے تھا۔

عبدالرحیم خان خاناں نے حضرت شیخ کبیرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دو سو روپے کی نذر پیش کی اور ٹھٹھہ کی جنگی
 لہجہ کا یہابی کے لئے درخواست گزار ہوا۔

حضرت شیخ کبیرؒ نے خوش دلی کے ساتھ خان خاناں کی نذر قبول کر لی اور دعا کا وعدہ فرمایا۔
 ”اگرچہ وہ حضرت شیخ کبیرؒ کا ایک خدمت گار شاہی لشکر میں پہنچا اور عبدالرحیم خان خاناں سے عرض کرنے لگا۔
 ”حضرت شیخ نے آپ کو اسی وقت یاد فرمایا ہے۔“

خان خاناں کچھ دیر کے لئے پریشان سا ہو گیا۔ اسے خیال گزرا کہ کہیں حضرت شیخ کبیرؒ پر کوئی ناخوشگوار بات تو
 ٹھٹھہ نہیں ہوگی۔ غرض اسی قسم کے اندیشوں میں مبتلا عبدالرحیم خان خاناں، حضرت شیخ کبیرؒ کی خدمت میں حاضر
 ہوئے۔ حضرت شیخ کبیرؒ نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تمہاری یہ نذر قبول نہیں کی جاسکتی۔“

خان خاناں کی دلی ہوئی روپوں کی تھیلی سامنے رکھی تھی۔

حضرت شیخ کبیرؒ کا انکار سن کر عبدالرحیم خان خاناں حیران رہ گیا۔ ”شیخ! کل تو آپ نے میری نذر قبول کر لی
 تھی..... مگر ایک رات میں کیا ہو گیا؟“

جواباً حضرت شیخ کبیرؒ نے فرمایا۔ ”کل رات میں سویا تو خواب میں حضرت مخدوم بہاء الدین زکریاؒ تشریف
 لائے اور مجھے مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ ”کبیر! یہ نذر تیرے لئے جائز نہیں۔“

میں نے عرض کیا۔ ”نذر پیش کرنے والا خوش عقیدہ ہے، محبت و ارادات کے ساتھ حاضر ہوا ہے۔“
حضرت مخدوم بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ ”خان خانان نے اس نیت کے ساتھ یہ نذر پیش کی ہے کہ ان کی جنگی مہم میں فتح حاصل ہو جائے۔ حالانکہ یہ علاقہ اسے پہلے ہی شیخ حسینؒ کی دعا سے حاصل ہو چکا ہے۔ ان رقم کس کام کے بدلے میں لے رہے ہو؟ اگر اسے دینا ہے تو خالصتاً اللہ کے لئے دے..... ورنہ ہم قیامت کے احسان کے زیر بار رہیں گے۔“

حضرت شیخ کبیرؒ کی زبانی یہ واقعہ سننے کے بعد عبدالرحیم خان خانان کو اندازہ ہوا کہ حضرت شیخ حسینؒ کس پائے کے بزرگ ہیں..... اور ان کا سلسلہ روحانی کہاں تک ہے؟
پھر خان خانان نے ٹھٹھے پر یلغار کی اور حضرت شیخ حسینؒ کی بشارت کے مطابق فتح مند ٹھہرا۔ اس جنگی کامیابی کے سلسلے میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اسے ”خان خانان“ کا خطاب عطا کیا۔
واضح رہے کہ عبدالرحیم خان خانان، اکبر کے اتالیق، بہرام خان کا لڑکا تھا۔ عالم و فاضل، نہایت ذکی لہجہ تاریخ ہندوستان میں دربار اکبری کے جو ”نورتن“ مشہور ہیں، ان میں ایک ممتاز نام عبدالرحیم خان خانان کا بھی ہے وہ ایک جامع الصفات انسان تھا۔ بہترین سالار، مدبر سیاست دان، ادیب اور شاعر..... عبدالرحیم خان خانان کا خاص ہندی زبان میں انتہائی اثر انگیز شعر کہتا تھا۔ ”رحیم“ اس کا تخلص تھا۔ چار سو سال سے زیادہ گزر چکے ہیں آج بھی عبدالرحیم خان خانان، تلسی داس اور سور داس کے بعد ہندی زبان کا سب سے بڑا شاعر ہے..... اور اس حیثیت کو اندیشہ زوال نہیں۔



ایک بار مغربی پنجاب کا علاقہ شدید قحط کی لپیٹ میں آ گیا۔ بڑے بڑے دریا، تالاب اور کنوئیں خشک ہو گئے..... اور فصلیں تباہی کے قریب پہنچ گئیں۔ اندیشہ تھا کہ اگر چند روز اور بارش نہ ہوئی تو پیاس کی شدت سے بولے اور انسان بھی مرنے لگیں گے۔ لوگوں نے کئی بار ”نماز استسقا“ ادا کی اور رو رو کر دعائیں مانگیں۔ نماز کی برکت بس اتنا ظاہر ہوتا تھا کہ یکا یک ابر کا ایک ٹکڑا آسمان پر نمودار ہوتا تھا..... چند بوندیں برساتا ہوا گزر جاتا تھا۔ آخر مقامی باشندوں کی ایک جماعت حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض حال کرنے لگی۔ دعا کیجئے کہ آسمان بارش کے لئے اپنے دپانے کھول دے۔ ورنہ انسانی زندگی کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ لوگوں کی فریاد و فغاں سن کر حضرت شیخ حسینؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ”تم جس اللہ کو پکارتے ہو کی ذات تمہارے اندازوں سے بھی زیادہ بے نیاز ہے۔ ملک بھی اسی کا..... اور رحم بھی اسی کا..... اپنی زمین کو رکھے یا برباد کرے، اس کی جناب میں کون دم مار سکتا ہے۔ تم بھی اسی سے مانگو، جس سے حسین مانگتا ہے۔ تم بھکاری، تم بھی بھکاری..... پھر ایک بھکاری کسی کو کیا دے سکتا ہے؟“

لوگوں نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت شیخ حسینؒ اٹھ کر جانے لگے۔ یکا یک مجمع میں سے ایک مرد اُٹھ اُبھری۔ ”کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو؟ اس کی دعاؤں میں کہاں سے تاثیر آئے گی؟ یہ تو ایک بہر دیا فقریہ حضرت شیخ حسینؒ نے اس شخص کی آواز سنی تو جاتے جاتے پلٹ آئے اور انسانی ہجوم کی طرف دیکھ کر فرمے۔ ”اے شخص! میں تجھے نہیں جانتا، مگر تُو مجھے خوب پہچانتا ہے۔ سچ کہا تُو نے۔ کہاں میں ایک ملاں انسان..... اور کہاں وہ ذات پاک، جس کی تسبیح کائنات کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے۔ کیسے سنے گا وہ میری اللہ ہدایت دے۔ کسی پار سا کا دروازہ تلاش کرو۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ حسینؒ اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔

پہنچا کرانے والے مایوس ہو کر چلے گئے۔

دوسرے دن حضرت شیخ حسینؑ اپنے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ کسی کام سے موضع منڈیانوالہ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے کے ایک بڑے زمیندار، سردار بہادر خان کے آدمیوں نے اسے اطلاع دی کہ شیخ حسینؑ آ رہے ہیں۔ اگر وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھادیں تو بارش ضرور ہو جائے گی۔

سردار بہادر خان فوراً اپنے احباب اور کارندوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور حضرت شیخ حسینؑ سے بارش کی دعا کے لئے درخواست کی۔ آپ نے زمیندار کو بھی ٹالنا چاہا۔ مگر سردار بہادر خان نے ایک نئی چال چلی..... اور حضرت شیخ حسینؑ کے دوستوں کو پکڑ کر اپنی حویلی میں لے گیا۔ ایک روایت کے مطابق سردار بہادر خان نے حضرت شیخ حسینؑ کے دوستوں کو زنجیریں پہنا دی تھیں اور جاتے جاتے کہہ گیا تھا۔

”اگر بارش ہوگئی تو تمہارے دوست رہا کر دیئے جائیں گے..... ورنہ جب تک قحط سالی جاری رہے گی، یہ ان کی قید میں رہیں گے۔“

حضرت شیخ حسینؑ بہت دیر تک گہرے سکوت کے عالم میں کھڑے رہے۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر غم زدہ لہجے میں فرمایا: ”الہی! یہ کیسے لوگ ہیں..... اور تیرے گناہ گار بندے، حسین کو کیا سمجھتے ہیں؟“

سردار بہادر خان نے حضرت شیخ حسینؑ کے دوستوں کو اپنی حویلی میں لے جا کر نظر بند کر دیا۔ علاقے کے دوسرے لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ بعض درد مند افراد نے زمیندار کی اس سنگدلی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

”ان بے چاروں کو کس جرم میں پائے زنجیر کیا گیا ہے؟“

”میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ شیخ حسینؑ کو اپنے دوستوں سے کتنی محبت ہے؟“ سردار بہادر خان نے عجیب و غریب مطلق پیش کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دوستی کی آزمائش کا کون سا طریقہ ہے؟“ ایک شخص نے سردار بہادر خان کے طرز عمل اور بھونڈی دلیل پر حائل کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو کھلا ہوا جبر ہے۔ کمزور لوگوں کے سامنے طاقت کا مظاہرہ ہے۔“

”اگر شیخ حسینؑ کو اپنے دوستوں سے محبت ہوگی تو آسمان سے پانی بھی برس جائے گا۔“ زمیندار سردار خان نے ان شخص کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”کیا بارش برسانا شیخ حسینؑ کے اختیار میں ہے؟“ سوال کرنے والے کے لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی۔ ”اگر شیخ حسینؑ کی دعاؤں میں اتنی تاثیر بھی نہیں تو پھر درویش بنے کیوں پھرتے ہیں؟“ سردار بہادر خان نے فریے لہجے میں کہا۔ ”اب ان کی دوستی کی بھی آزمائش ہو جائے گی اور درویشی کی بھی۔“

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ حضرت شیخ حسینؑ، سردار بہادر خان کی حویلی آ پہنچے اور زمیندار سے اپنے دوستوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

”شیخ! تم میری شرط جانتے ہو۔“ سردار بہادر خان نے بھی اپنے الفاظ دہرا دیئے۔ ”جب تک آسمان کے ہاتھ نہیں کھلیں گے، اس وقت تک تمہارے دوستوں کے پیروں کی زنجیریں بھی نہیں کھلیں گی۔“

”میرے دوستوں کو بلاؤ۔ میں بارش کے لئے دعا کروں گا۔“ آخر حضرت شیخ حسینؑ نے سردار بہادر خان کی شرط مان لی۔

مگر جب دوستوں کو حضرت شیخ حسینؑ کے رو برو لایا گیا تو آپ زمیندار سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”تم نے میرے دوستوں کو اذیت پہنچائی ہے۔ اس لئے ضیافت کا انتظام کرو تا کہ ان کے دلوں کا غبار دھل جائے۔“

”کیسی ضیافت؟“ سردار بہادر خان نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

”نان مرغن اور شیر و شکر کا انتظام کرو۔ میرے دوست خوش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی تم پر مہربان ہو جائے گا۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے نہایت جذب کے عالم میں فرمایا۔ پھر اپنے دوستوں کے ہمراہ دریائے راوی کے کنارے تشریف لے آئے۔

کچھ دیر بعد سردار بہادر خان بھی مطلوبہ اشیاء لے کر پہنچ گیا۔ اس دوران یہ خبر عام ہو چکی تھی۔ قلعہ سالہ مارے ہوئے کسان اور مزدور بھی بارش کی آس لئے دریائے راوی کے کنارے چلے آئے، جو تقریباً خشک ہو گیا تو جب حضرت شیخ حسینؒ کے دوست سردار بہادر خان کی لائی ہوئی چیزیں کھا چکے تو آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

”الہی! حسینؒ اپنے دوستوں کے ساتھ بہت خوش ہے۔ تو بھی اپنے بندوں کی خطاؤں کو درگزر فرما رفق ستاری ہی تیری شان ہے۔ ابر کرم کو برسنے کا حکم دے۔ دیہاتوں کو آباد اور اس کے رہنے والوں کو شاد رکھنا بڑائیاں اور تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں۔“

دریائے راوی کے کنارے موجود لوگوں کی سماعتوں میں ابھی حضرت شیخ حسینؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ ایک تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ پھر مشرق کی طرف سے سیاہ ابر جھوم کر اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ خشک دریا اُبل پڑے۔ دیہی اور شہری علاقے جل تھل ہو گئے۔ اور پیاسی زمینیں سیراب ہو گئیں۔ بعض روایتوں میں زمیندار سردار بہادر خان کا نام سردار بہادر خان بھی درج کیا گیا ہے۔



روایت ہے کہ ایک شخص، حاجی یعقوب مدنی تھا جو حضرت شیخ حسینؒ کو مدینہ منورہ میں رسالت مآب ﷺ کے روضہ اطہر کے سامنے دن رات مراقبہ کی حالت میں دیکھا کرتا تھا۔ کثرت ریاضت کے سبب حاجی یعقوب آپ سے بے حد متاثر ہوا اور اکثر خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ پھر مراسم بڑھے تو حضرت شیخ حسینؒ نے حاجی یعقوب مدنی کے ساتھ کئی بار حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔

اسی طرح ماہ و سال گزرتے رہے۔ پھر یہ شناسائی، دوستی میں بدل گئی۔ اتفاق سے حاجی یعقوب مدنی، لاہور آیا۔ ایک دن وہ بازار سے گزر رہا تھا کہ اسے لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ حاجی یعقوب، انسانی جھوم کے قریب پہنچا تو ایک شخص کو ڈھول کی تھاپ پر دالہانہ رقص کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ حضرت شیخ حسینؒ تھے جنہوں نے حضرت سعد اللہ کے مکتب سے اُٹھنے کے بعد داڑھی منڈوا دی تھی اور طریقہ ”لاماعیہ“ اختیار کرتے ہوئے سر بازار رقص کی شروعات کر دیا تھا۔ حاجی یعقوب مدنی کو رقص کرنے والے کی شکل و صورت کچھ جانی پہچانی نظر آئی۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔

”یہ کون ہے جو اس بے خودی کی حالت میں ناچ رہا ہے؟“

”یہ شیخ حسینؒ ہیں، جو اسی طرح رقص کرتے رہتے ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

حاجی یعقوب مدنی نے شیخ حسینؒ کا نام سنا تو چونک اٹھا۔ پھر کچھ دیر تک اپنے ذہن پر زور دے کر سوچا کہ آخر پہچان گیا کہ یہ وہی شیخ حسینؒ ہیں جن سے مدینہ منورہ میں ملاقاتیں ہوتی تھیں..... اور جو روضہ رسول ﷺ کے قریب منعکف رہتے تھے۔ گزشتہ واقعات یاد آتے ہی حاجی یعقوب مدنی کو شدید اذیت پہنچی کہ آخر ایک بار

نہ کیا اتنا بڑی کہ اس نے اپنا ظاہری حلیہ بدل کر یہ غیر مذہبی روش اختیار کر لی ہے۔
 بڑب حضرت شیخ حسینؒ اپنا قصہ ختم کر کے جانے لگے..... اور لوگوں کی بھیڑ چھٹنے لگی تو حاجی یعقوب تیزی
 سے حضرت شیخ حسینؒ کے قریب پہنچا اور آپ کو مخاطب کر کے بولا۔

”جس کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ عرب میں تو تم بہت پرہیزگار مشہور تھے..... اور ہندوستان میں یہ رنگ؟“
 حضرت شیخ حسینؒ بھی اسے پہچان گئے۔ پھر آپ نے حاجی یعقوب مدنی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”آنکھیں بند
 کر دو دیکھ لے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟“

حاجی یعقوب نے آنکھیں بند کیں تو حضرت شیخ حسینؒ کو عارفانہ لباس میں دیکھا اور اسی طرح حضور اکرم ﷺ
 کے سامنے منکشف پایا۔

پھر ابوہریرہ حاجی یعقوب نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ حضرت شیخ حسینؒ نے فرمایا۔ ”اب تمہارے لئے یہی
 ہے کہ واپس چلے جاؤ۔ جو کچھ تمہاری آنکھوں نے دیکھا، اسے ہمیشہ اپنے سینے میں محفوظ رکھنا۔“

حاجی یعقوب مدنی کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ اس قدر عجیب تھا کہ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ حضرت
 ابوہریرہؓ کی تہیہ کے باوجود وہ شدت جذبات سے مجبور ہو کر چیخ اٹھا۔

”سوائے ساکنان لاہور!..... میری بات سنو۔ یہ شیخ حسینؒ جو سر بازار قص کر رہا ہے، ولی کامل ہے۔ تم اس
 پر اپنی حالت پر نہ جاؤ۔ جب میں ہندوستان روانہ ہو رہا تھا تو میں نے اسے طواف کعبہ میں مصروف دیکھا تھا...
 بعد میں منورہ میں میرا بہت گہرا دوست تھا۔“

حاجی یعقوب مدنی کی آواز سن کر اپنے گھروں کی طرف جانے والے لوگ پلٹ پڑے۔ جب حضرت شیخ
 حسینؒ نے دیکھا کہ راز فاش ہو گیا ہے تو آپ، حاجی یعقوب اور انسانی ہجوم کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

”فقیہ الفقراء“ اور ”کتاب بہاریہ“ کی روایتوں کے مطابق اس واقعے کے بعد حاجی یعقوب مدنی نے
 دن شیخ حسینؒ کو بہت تلاش کیا۔ مگر کہیں آپ کا نشان نہ پایا۔ آخر بہت دن حیران و سرگرداں رہ کر عرب واپس
 لوٹا۔ مکہ معظمہ پہنچ کر حاجی یعقوب کو کچھ خیال آیا تو وہ سیدھا خانہ کعبہ میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ حسینؒ دنیا و
 مائتے فخر طواف کعبہ میں مشغول تھے۔ حاجی یعقوب پر شدید اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ اور وہ اسی مقام پر
 حضرت شیخ حسینؒ کے قدموں میں گر پڑا۔ بعد میں آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا۔

جہاں تک حضرت شیخ حسینؒ کے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں پائے جانے کا سوال ہے تو اہل نظر کو اس پر تعجب
 نہیں ہونا چاہئے۔ آج ہم سیٹلائٹ اور جدید الیکٹرونک سسٹم کے ذریعے اس واقعے کو اپنے گھر میں بیٹھ کر بھی دیکھ
 سکتے ہیں جو ہزاروں میل دور اسی ساعت اور اسی لمحے میں پیش آ رہا ہے۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سائنسی میکنزم
 نہ اس لیے کہ اسی طرح ”روحانی میکنزم“ بھی ہے، جو سائنسی میکنزم سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ مگر اکثریت کو
 کاردار نہیں۔

قرآن کریم کی ”سورہ نمل“ میں تحت بلیقیس کا ذکر موجود ہے، جسے ایک انسان نے ہلک جھپکتے میں حضرت
 نبی علیہ السلام کے دربار میں حاضر کر دیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اس شخص کو کتاب کا علم حاصل تھا۔

اہل تصوف کے عمیق مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اولیائے کرام بھی کتاب کے اس مخصوص علم سے فیض
 پاب ہوئے ہیں اور یہ اسی علم کا کرشمہ ہے کہ برسوں کے فاصلے لحوں میں سمٹ جاتے ہیں۔ حضرت شیخ حسینؒ بھی
 ایسے کرام کے وارث تھے۔ علامہ اقبال کے بقول۔

ولایت ، بادشاہی ، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہے ، فقط اک نکتہ ایمان کی تفسیریں



تمام تذکرہ نگاروں نے ایک ہی روایت کا سہارا لیا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ اپنے استاد گرامی حضرت سعد اللہؒ کے مکتب سے اچانک اُٹھے ، چھبیس سالہ شدید عبادت و ریاضت سے دستبردار ہوئے ، تقریباً کونئیں میں ڈالی ، پورے زور و شور سے نعرۂ مستانہ بلند کیا اور ”ملاعتیہ“ کا طریقہ اختیار کر لیا۔

ہم حضرت شیخ حسینؒ لاہوریؒ کے رنگِ ملامت پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ مگر ہماری مجبوری یہ ہے کہ اگر ہم اختیار کرتے ہیں تو مذہبی معاملات میں ہمارا سکوت ، جرم بن جاتا ہے۔ اور اگر اس فرقت کے بعض مشہور و نامور ظاہری اعمال کا ذکر کرتے ہیں تو شدید روحانی اذیت پہنچتی ہے۔ ہمیں اس ذیل میں قدیم اور جدید تذکرہ نگاروں سے بہت شکایت ہے کہ ان عالم و فاضل حضرات نے اپنی شرعی ذمے داریوں کا احساس نہیں کیا اور جوش و خروش کے ساتھ زورِ بیان کا مظاہرہ کرتے ہوئے بزرگانِ دین کے حوالے سے ایسی روایات کو نہ صرف قلم بند کر دیا بلکہ زیبِ داستاں کے طور پر واقعات میں اس قدر رنگ آمیزی کر دی کہ کم فہم مسلمان انہیں رنگِ حقیقت سمجھ کر ان کے طور پر منتشر ہو جاتے ہیں یا پھر صراطِ مستقیم ہی سے بھٹک جاتے ہیں۔ ایک مسلمان تذکرہ نگار کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ جن واقعات سے اسلامی تعلیمات مجروح ہوتی ہیں یا ان کی نفی ہوتی ہے ، ایسے واقعات کو کتاب میں نہ لے کر کوئی جگہ ہی نہ دی جائے۔ اگر کسی کتاب میں یہ واقعات پہلے سے درج ہیں تو سننے والے کو تذکرہ نگار پر لازم ہے کہ پوری دیانت داری کے ساتھ تحقیق کرے۔ پھر اگر وہ واقعات ، اسلامی شریعت کے قائم کردہ معیارات پر پورے نہیں اُترتے تو انہیں بلا خوف و خطر مسترد کر دے۔ مگر ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ تصوف کے سلسلے میں ”حقیقت“ کا تصور زیادہ کیا جاتا ہے اور حقیقت کی تلاش کم۔ جس کے نتیجے میں ضعیف اور نامعتبر روایات کا انبار لگلا جاتا ہے۔ اب یہ انبار ایک پہاڑ بن گیا ہے۔ پھر ”کوہِ کئی“ کون کرے؟ اور تحقیق کا تیشہ کہاں سے لائے؟

اس سلسلے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ سلاطین و ممالک کی تاریخ ہو یا تاریخِ تصوف ، عام طور پر لکھے والے واقعات کو تحقیق کی آنکھ سے دیکھنے کے بجائے اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ مذہبی واقعات میں بھی انہیں اپنی جذباتی دھڑکنوں کا شور سنائی دے۔ آخر یہ ذاتی خواہشات تاریخی حقائق پر غالب آجاتی ہیں۔ اور پھر واقعات کی صورت بدل جاتی ہے۔ جب موجودہ سیاسی تجربہ نگار اپنی فکری وابستگی اور ذہنی معاملات میں مجبور ہو کر اپنے ممدوح رہنما کے عیوب کو بھی محاسن کے طور پر بیان کرتا ہے۔ مقتول کو بے باگ و دل ”شہید“ قرار دیتا ہے۔ تو پھر ماضی کے تذکرہ نگاروں کو بھی کس طرح غیر جانب دار قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہم آج بھی بہت سے دانشمندیوں اور عالموں کو دنیادی معاملات میں جھوٹ بولتے دیکھتے ہیں۔ تو پھر ماضی کے اہل علم کس طرح اس گورنر سے مستثنیٰ قرار پاسکتے ہیں سوائے ان چند صاحبانِ ہمت کے ، جو زندگی بھر اپنے نفس کے خلاف مصروف رہے۔ اور آخری سانس تک سچائیاں رقم کرتے رہے۔

موجودہ عہد کے انسان کو شکایت ہے کہ حق گوئی و بے باکی کا جنازہ اُٹھ چکا ہے۔ اور ہر طرف صداقت و ایمان کے مزار نظر آتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ :-

تم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

جب اہل طلب، دقیق نظری کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو ان پر یہ عجیب راز فاش ہو جائے گا کہ اس نے ”بار“ اور ”گورکن“ پہلے بھی تھے۔ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے زمانے میں قاضی ابن ابی لیلیٰ ”ایک بڑے زور کے جاتے تھے۔ تمام مؤرخین نے انتہائی اذیت و کرب کے ساتھ یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ حضرت قاضی ابن ابی لیلیٰ صرف اس بنیاد پر حضرت امام ابوحنیفہؒ سے حسد رکھتے تھے کہ امام اعظمؒ کو عوام میں محبوبیت کا درجہ حاصل تھا۔ بے گنس قاضی ابن ابی لیلیٰ کو عوامی حلقوں میں زیادہ قدر و منزلت حاصل نہیں تھی۔

لیکن امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کی مجلس درس آراستہ تھی۔ پھر جب درس ختم ہو گیا تو ایک شخص نے برسر مجلس

”امام آپ کے فقہی نکات کو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے۔ مگر قاضی ابن ابی لیلیٰ آپ کی رائے کو اہمیت نہیں دیتے۔“

حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مبروہ محل مشہور تھا۔ آپ اس شخص کی بات سن کر حسب روایت مسکرائے۔ ”قاضی ابن ابی لیلیٰ کی بات کرتے ہو؟ ان کے نزدیک تو میری ذات کی اتنی اہمیت بھی نہیں، جتنی ان کی بلی کی۔“ یعنی قاضی ابن ابی لیلیٰ حضرت امام اعظمؒ کے مقابلے میں اپنی پالتو بلی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت قاضی ابن ابی لیلیٰ، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے علمی کمالات اور فن پر کوئی مقالہ یا تذکرہ تحریر کرتے تو قدم قدم پر ان کا فطری حسد ہی آڑے آتا۔ پھر حقیقت کس طرح بدلتی؟ اور ہم امام اعظمؒ کے فقیہانہ مقام کا کس طرح تعین کرتے؟ واضح رہے کہ حقیقت بیانی کے راستے میں دو کتاب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہیں۔ ایک حسد اور دوسرے عقیدت۔ حسد، دوسرے انسان کی صفات کو گھٹانے کا حربہ ہے اور عقیدت، مبالغہ آرائی پر مجبور کرتی ہے۔ نتیجتاً اکثر مواقع پر تاریخ، تاریخ نہیں رہتی بلکہ لکھنے والے ذاتی پسند واپسند کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔

تاریخ یا تذکرہ لکھنے کے لئے اہل قلم کا صادق القول اور صاحب کردار ہونا ضروری ہے۔ پستی میں ریگنے والا، نادر ہونے کی آخری حدود کو چھونے والی عقیدت۔ دونوں انتہائی خطرناک ہوتے ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے مؤرخوں اور تذکرہ نگاران ہی دونوں خوف ناک بیماریوں کا شکار تھے۔ یہ امراض اتنے ہی قدیم ہیں، جتنی کہ نسلِ انسانی کا۔ جس سے مغلوب ہو کر قاتیل نے اپنے حقیقی بھائی ہائیل کی شہ رگ پر شمشیر ستم کھینچی تھی۔

یہی حسد ہے، جس سے مغلوب ہو کر یہود و نصاریٰ نے سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کیا۔ وہاب کا پاک نام اپنی مذہبی کتابوں سے کھرچ ڈالا۔ اور توریت و زبور، انجیل مقدس میں تحریف کر ڈالی اور اسی تحریف کے نام پر ملتے ہوئے دونوں قومیں صدیوں سے اسلام کی بیخ کنی میں اس طرح مصروف ہیں کہ جیسے اسلام ان کی کاب سے بڑا مذہب ہی فریضہ ہے۔

لاریہ وہی بے لگام عقیدت ہے کہ جس کے طلسم میں گرفتار ہو کر یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام اور مجاہدین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا ڈالا۔

اہل نظر کو کچھ لیتا چاہئے کہ اعلانِ نبوت سے پہلے اہل مکہ، حضور اکرم ﷺ کو ”صادق“ اور ”امین“ کہہ کر پکارتے تھے۔ بس صاحبِ کردار ہونے کا یہی ایک پیمانہ ہے۔ ہر حال میں سچ بولنا اور امانت کو اس کے حق دار تک صحیح و ثابت ملے بغیر چھوڑ دینا۔ جھوٹ اور خیانت، نسلِ آدم کے لئے سرطان اور ایڈز سے بھی زیادہ مہلک بیماریاں ہیں۔ تاریخ کے بے اثر اور احمق ان ہی خوف ناک بیماریوں کے جراثیم سے متاثر ہو کر سیاست، مصلحت اور جھوٹ کی دستاویز بن کر رہ گئے ہیں۔

ایک دن کسی شخص نے عظیم و جلیل محدث، حضرت امام بخاریؒ سے عرض کیا کہ فلاں شخص، حضور اکرم ﷺ کا ایک حدیث کا راوی ہے۔ یہ سن کر حضرت امام بخاریؒ بے قرار ہو گئے۔ آپ کو اپنے آقا ﷺ کے ارشاد اذکر جمع کرنے کے سوا دنیا کی کسی شے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”وہ شخص کہاں رہتا ہے؟“ حضرت امام بخاریؒ نے سوال کیا۔

”یہاں سے کئی سو میل دور۔“ بتانے والے نے بتایا۔ اس کا خیال تھا کہ حضرت امام بخاریؒ طویل فاصلے سے دشوار گزار سفر پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ مگر ایک عاشق رسولؐ کے لئے فاصلے اور سفر کی دشواریاں کوئی حثیت رکھتیں۔

حضرت امام بخاریؒ، بہ ہزار دقت اس مقام تک پہنچے، جہاں حضور اکرم ﷺ کے ایک قول مقدس کا علم ہوا کرتا تھا۔ پھر جب محدث اعظم کی ملاقات اس شخص سے ہوئی تو وہ ہاتھ میں چابک لئے ہوئے گھوڑے کے قریب کھڑا تھا اور بار بار چابک، تھان پر مار رہا تھا۔ حضرت امام بخاریؒ خاموش کھڑے دیکھتے رہے۔ قوال میں گھوڑا بھاگتا ہوا آیا اور اس شخص نے گھوڑے کو لگام پہنا دی۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ وہ شخص اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کسی کام سے جانا چاہتا تھا اور گھوڑا تھوڑے فاصلے گھاس چر رہا تھا۔ اس شخص کا طریق کاری یہ تھا کہ جب گھوڑے کو دانہ دینا ہوتا تو زور زور سے تھان پر اپنا چابک مار کر گھوڑا اس مخصوص آواز کو سن کر بھاگتا ہوا آتا اور اپنے تھان پر پہنچ کر دانہ کھانے لگتا۔ حضرت امام بخاریؒ نے قوال میں بھی اس شخص نے چابک مارنے کا عمل دہرایا اور تھوڑی دیر بعد ہی گھوڑا بھاگتا ہوا چلا آیا۔ پھر اس شخص نے گھوڑے کو دانہ دینے کے بجائے لگام پہنا دی۔

”آپ نے چابک مار کر اپنے گھوڑے کو کیوں بلایا تھا؟“ حضرت امام بخاریؒ نے اس شخص سے سوال کیا۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ سے باخبر تھا۔

”میں گھوڑے کو دانہ دینے کے لئے یہ طریقہ استعمال کرتا ہوں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”پھر آپ نے اسے دانہ کیوں نہیں دیا؟“ حضرت امام بخاریؒ نے دوسرا سوال کیا۔

”یہ اس کے دانے کا وقت نہیں ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”اس لئے میں نے گھوڑے کو دانہ نہ دیا۔“

بلا یا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ آپ بتائیے کہ کیسے تشریف لائے؟“

”مجھے آپ سے بے حد ضروری کام تھا..... مگر اب نہیں ہے۔“ حضرت امام بخاریؒ نے فرمایا اور دائیں رخا لے جانے لگے۔ راستے میں اس مقامی باشندے نے حضرت امام بخاریؒ سے پوچھا، جو آپ کو ایک حدیث راوی سے ملانے لایا تھا۔

”امام! آپ نے سماعت حدیث کے لئے اتنا طویل سفر اختیار کیا.... راہ کی بہت سی صعوبتیں برداشت کیں اور قولِ رسول ﷺ سے بغیر واپس جا رہے ہیں۔ آخر اس کا سبب؟“

”مجھے حدیث کے اس راوی پر اعتبار نہیں۔“ حضرت امام بخاریؒ نے فرمایا۔ ”جو شخص اپنے جانور کو مارا، مارا، مارا، وہ قولِ رسول ﷺ کے سلسلے میں بھی کسی آمیزش سے کام لے سکتا ہے۔“

اللہ محدثین کرام پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے۔ ان مردانِ جلیل نے راوی اور روایت کو برکے کاہ ترین معیار قائم کر دیا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال دنیا کے کسی تعلیم یافتہ اور متمدن معاشرے میں نہیں ملتی۔ تسلیم کرتے ہیں کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا موازنہ کسی شہنشاہ، فلسفی یا سائنس دان کے قول سے نہیں

اور نہ اس کے بارے میں اتنی تحقیق ممکن ہے۔ مگر اولیائے کرام تو سرکارِ دو عالم ﷺ کے حقیقی وارث ہیں۔ ان کی تاریخ اور سیرت و کردار کے بارے میں لکھتے وقت ہمیں ان ہی اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے جن سے محدثین عظام اور فقہائے کرام کاربند رہتے تھے۔ مگر افسوس! صوفیاء کی تاریخ لکھتے وقت نہ ”علم اسماء الرجال“ کا کیا اور نہ روایت کو پرکھنے کے لئے ”درایت“ سے کام لیا گیا۔ جو کچھ پڑھا، اسے مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کیا اور جو کچھ سنا، اسے قلم بند کر دیا گیا۔ یہ تحقیق کئے بغیر کہ اس واقعے کا راوی ”کذاب“ ہے یا ”ثقة“؟ یہ بات حدیثِ رسول ﷺ کے راویوں کے سلسلے میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ کذاب بمعنی جھوٹا اور ثقہ بمعنی سچا۔ لیکن ایک جماعت کو ”ضعیف“ بھی کہا جاتا ہے جو نہ کذاب کی قبیل میں آتے ہیں اور نہ ثقہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی بیان کردہ روایات کو مجبوری کی حالت میں قبول کر لیا جاتا ہے۔

حضرت شامیؒ کے سلسلے میں بھی راویوں نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ ”تذکرۃ الاصفاء“ کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری فرماتے ہیں۔ ”مغل شہزادے داراشکوہ نے حضرت شیخ کاڑھانیوں کا سردار لکھا ہے۔“

حضرت شامیؒ کے رنگِ ملامت کی تصویر کشی کرتے ہوئے مفتی صاحب لکھتے ہیں۔ ”طریقہ ملامتیہ اختیار کرنے کے بعد حضرت شیخ حسینؒ کوچہ و بازار میں اس طرح پھرتے۔ چار ابرو کا صفایا (داڑھی، مونچھیں اور دونوں ہاتھ کاڑھا دینا)، ہاتھ میں شراب کا پیالہ، سرود و نغمہ چنگ و رباب، تمام قیود شرعی سے آزاد۔ جس طرف نہ لگ جاتے۔“

”تذکرۃ الاصفاء“ کے حاشیے میں اس روایت کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

”شیخ حسینؒ، ملامتیہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد اعلانیہ شراب پیتے اور گانا سنتے۔ طوائفیں ان کی محفل میں آتیں اور ان سے مجلس کو گرماتیں۔ شیخ حسینؒ خود بھی اپنے محبوب و منظورِ نظر، مادھو کے ساتھ رقص کرتے تھے۔ ان کوچہ منڈواتے تھے۔ ان کے حلقہ نشین بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ نماز روزہ کے ساتھ انہیں کوئی منہ نہ دواتے تھے۔ جب تک کوئی شخص داڑھی مونچھ کا صفایا نہ کر دیتا، اس وقت تک اس کو مرید نہ سمجھا جاتا۔ شیخ حسینؒ کو کوئی گانہ نہ تھا۔ شراب کا پیالہ دیتے۔ اگر وہ شراب پی لیتا تو مریدوں میں شمار ہوتا۔ ورنہ اُسے مجلس سے نکلایا جاتا۔ ان ظاہری بدعتوں اور خلافِ شریعت باتوں کے باوجود صاحبِ کرامت ولی سمجھے جاتے۔“

”ہالائے لاہور“ کے مولف نے ”حقیقت الفقراء“ اور ”کتاب بہاریہ“ کی روایتوں کی بنیاد پر حضرت شیخ حسینؒ کے ”طریقہ ملامتیہ“ کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

”جب حضرت شیخ حسینؒ نے تفسیر مدارکِ خشک حالت میں کنوئیں سے نکال کر اپنے ہم مکتب ساتھیوں کو دے دیا تو آپ کی اس کرامت کا شہرہ عام ہو گیا۔ اسی روز سے حضرت شیخ حسینؒ نے طریقہ ملامتیہ اختیار کر لیا تاکہ لوگ سے غرت کریں اور وہ سکون کے ساتھ یادِ الہی میں مشغول رہیں۔ اس وقت ان کی عمر چھتیس برس تھی۔ شیخ حسینؒ (ابو موسیٰ) عبارتِ خانے سے نکلے اور مے خانے کی رونق و زینت بنے۔ آپ رات دن لہو و لعب میں بگڑتے تھے۔ مگر شیخ حسینؒ کا یہ عمل خود کو ذلیل کرنے کے لئے تھا۔ آپ رات کے ابتدائی حصے تک ہنستے کھیلتے۔ پھر اس خیال سے کہ دنیا فانی اور ناپائیدار ہے، نصف شب تک مسکراتے بھی نہیں تھے۔ اور پھر رات کے بعد مسلسل روتے رہتے تھے۔ اس کے بعد دن کے اُجالے میں رندِ مستانہ بن جاتے تھے۔“

”ہالائے لاہور“ ہی میں ایک مقام پر یہ عبارت بھی موجود ہے۔ ”حضرت شیخ حسینؒ کا معمول تھا کہ اکثر

شراب میں مست ہو کر جنگ و رہ باب کی آواز پر رقص کیا کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ اپنے داروں سے چھپا سکیں۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ حضرت شیخ حسینؒ رات کے پچھلے پہر ختم قرآن کیا کرتے تھے۔ ظاہر پرست لوگ، حضرت شیخ حسینؒ پر شدید اعتراضات کیا کرتے تھے۔ اس صورت حال کو شاید یہ ٹوٹا ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

”یہی بگھنہ اکثرے بے راہ
جوش لہو و نسب جولہ

(اکثر بے راہ لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے حسب کے اعتبار سے لہو ہیں اور نسب کے لحاظ سے جولہ) مگر ان دنیا داروں کو خبر نہیں تھی کہ یہ ”جولہ“ نہیں، ”جوئے اللہ“ ہے۔ ہمیں مجبوراً بعض کتابوں کی طرف حروف نقل کرنی پڑیں گی تاکہ ہمارے قارئین، حضرت شیخ حسینؒ کے رنگ ملامت سے واقف ہو سکیں۔ تذکرہ نگار چاہتے تو ان الفاظ میں شائستگی پیدا کی جاسکتی تھی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخؒ کے معمولات اور واقعات کو فخر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جیسے یہی تصوف ہے۔ اور یہی صوفیاء کا اعلیٰ مقام ہے۔ قرآن کریم میں کچھ ایسے افراد کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، جن کے دلوں میں ”نیزہ“ ہوتی تھی اور وہ قرآن کی آیت کے عجیب عجیب مفہوم نکال لیتے تھے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اسی لئے باری تعالیٰ نے ہر ایمان کو یہ دعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔ ”اے رب ہدایت کے بعد ہمارے دلوں میں نیزہ پیدا نہ کر۔“

یہ دعا ایمان کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط ترین حصار ہے۔ اس دعا کا ورد کرنے والے مسلمان، شیطان شر اور گمراہی سے محفوظ رہتے ہیں۔ جس طرح ساری زمینیں اپنی زرخیزی کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتیں، اسی طرح انسانی فطرتوں میں بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اہل ایمان ایک لمحے میں یقین کی انتہائی منزل تک جاتے ہیں..... اور کچھ کلمہ گو زندگی بھر ذہنی کشمکش اور تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی خاص واقعے متاثر ہو کر ”مرتد“ ہو جاتے ہیں۔ یعنی ترک اسلام کر کے کفر کی طرف بڑھ جاتے ہیں، جو حقیقتاً ان کی فطرت آج بھی بہت سے لوگ جو اپنے ظاہری ناموں سے مسلمان نظر آتے ہیں، مغربی فلسفوں اور سائنس کی ملامت و تعلیم سے متاثر ہو کر ایسے حالات اٹھاتے رہتے ہیں۔

”خدا کہاں سے آیا؟..... فرشتے اور جن ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟..... جنت و دوزخ کا کوئی وجود نہیں۔ اگر انسان کو اس دنیا میں عیش و نشاط حاصل ہے تو یہی اس کی جنت ہے۔ اور کوئی انسان اخلاص و محمدی کی زندگی بسر رہا ہے تو یہی اس کی دوزخ ہے..... خدا کا کوئی وجود نہیں..... کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے، وہ سب مادہ کا فرما ہے۔ یہ سارا کار و بار عالم ایک خود کار (آٹومیک) نظام کے تحت چل رہا ہے۔

میں ذاتی طور پر ایسے کئی حضرات کو جانتا ہوں، جو اپنے ناموں کے اعتبار سے مسلمان نظر آتے ہیں اور ان کے افکار کے لحاظ سے شدید انتشار میں مبتلا۔ دراصل ایسے تمام لوگ اسی آیت مقدسہ کی جیتی جاگتی تفسیر ہیں، جن دلوں میں ہدایت کے بعد نیزہ پیدا ہو گئی ہے۔

اُردو کی مشہور ادیب عصمت چغتائی اور نامور شاعر میراجی نے واضح الفاظ میں دیتیں کی تھیں کہ مرنے کے انہیں جلا دیا جائے۔ اگرچہ دونوں ”دانش مندوں“ کی دیتوں پر عمل نہیں کیا گیا، لیکن ان کی ”نیت“ تو ظاہر ہوئی اور ایمان بھی تو ”نیت“ ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ دونوں جانے پہچانے کردار بھی اسی قبل میں آتے ہیں جو پانے کے بعد گمراہ ہوئے تھے۔ یعنی ان کے دلوں میں نیزہ (کجی) پیدا ہو گئی تھی۔

بال نظر بتائیں کہ جن کلمہ گو یوں (برائے نام مسلمانوں) کے دلوں میں ذرا بھی ٹیڑھ ہے، وہ حضرت شیخ کے واقعات پڑھ کر کیا نتائج اخذ کریں گے؟

پہلا کلمہ موفیاء نے ”فرقہ ملائیت“ کا ذکر کیا ہے کہ اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے صوفی اپنے حقیقی اعمال یعنی کیا کرتے ہیں۔ اور اہل دنیا کے سامنے خود کو ایک عام گناہ گار انسان ظاہر کرتے ہیں۔ مگر چونکہ مغل شہزادے نے حضرت شیخ حسین لاہوریؒ کو ”ملائیت“ کے گردہ کا سردار لکھا ہے۔ اس لئے اصولی طور پر ان کا رنگ ان کے دوسرے ”ملائیتوں“ کے مقابلے میں زیادہ تیز اور شوخ ہونا چاہئے تھا۔ نتیجتاً ہمارے تذکرہ نگاروں نے گناہانہ اور سفاکانہ انداز میں تحریر کر دیا۔

غیر مداح کو کونئیں میں ڈالنے کے بعد شیخ حسینؒ کے شب و روز (لہو و لعب) میں بسر ہوا کرتے تھے۔“



اب ہم فرقہ ملائیت کے حوالے سے ایک نہایت اہم نکتے پر علمی بحث کریں گے تاکہ حضرت شیخ حسین لاہوریؒ کی حالت سے فریب کھانے والے لوگ ”ملائت“ کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں۔ مرزا غالب کا ایک دلکش اور معنی خیز

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے

پندار کا ختم کدہ دیراں کئے ہوئے !!

اس شعر میں مرزا غالب نے انسانی فطرت کے ایک خاص پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ اگر ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو انسان غرور و تکبر کی لعنت میں مبتلا نظر آئیں گے۔ خود پرستی کا یہ عالم ہے کہ بعض اوقات تو بہت چھوٹے لوگ اس خوف ناک بیماری کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ جب انسانی فطرت کا یہ حال ہو تو پھر کون ایسا ہے جو پندار کا ختم کدہ ڈھانے کے بعد ذلت و رسوائی کی گلیوں کا طواف کرے۔ بلاشبہ یہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے کہ غلبہ بار بار ہوا اور اہل دنیا اسے گناہ گار کہہ کر پکاریں۔ ایک عالم، جہالت کی تہمت برداشت کرے۔ ایک شراب پیلا شراابی کہلائے۔ اور ایک حافظ قرآن کو طواف النور کا حلقہ نشین قرار دیا جائے۔ کون ہے جو ان تہمتوں کا بار گراں لگائی زندگی کا طویل سفر طے کرے گا۔ اور آخری سانس تک حرف شکایت زبان پر نہیں لائے گا۔

”اہل دنیا میں وہ نہیں ہوں، جو تم سمجھ رہے ہو۔“

کمل اخفائے راز۔ مستقل سکوت اور خاموشی۔ بلکہ تہمتوں کے بھاری پتھر کھا کر مسکراتا اور رقص کرتا۔ یہ ہے ”ملائت“ کا مزاج اور یہ ہیں کوچہ ملامت کے آداب۔ فارسی کا ایک مشہور شعر ہے، جو حضرت خواجہ معین الدین گیلانی کے پیر مرشد حضرت خواجہ عثمان ہردویؒ سے منسوب ہے۔ عام طور پر ”ہردوی“ کو ”ہارونی“ لکھا جاتا ہے جو بالظاہر ہے۔ کچھ اہل علم کی تحقیق کے مطابق یہ فارسی شعر حضرت عثمان مروندیؒ کا ہے، جو عرف عام میں لعل شہباز ہردی کے نام سے مشہور ہیں۔

منم عثمان مروندی و یار شیخ منصورم

ملا مت می کند خلتے ومن برداری رقصم

میں عثمان مروندی ہوں اور میرا دوست شیخ منصور ہے۔ ساری دنیا مجھے ملامت کرتی ہے اور میں اسے برداشت

لے ہوں رقص کرتا ہوں۔ (ترجمہ)

حضرت شیخ حسین لاہوریؒ کی زندگی اسی فارسی شعر کی عملی تشریح ہے۔ ہم مغل شہزادے دارا شکوہ کے اس تبصرے

پر کوئی اعتراض نہیں کرتے کہ حضرت شیخ حسین لاہوریؒ برصغیر پاک و ہند کے منصور حلاج تھے۔ وہ دار پرانے گئے، مگر تہتوں کی صلیب پر آخری سانس تک لٹکے رہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر، حضرت شیخ حسینؒ کا انداز تبلیغ ایک عام مسلمان کو بھی شدید ذہنی الجھنیں دیتا ہے۔ ”غزنیۃ الاصفیاء“ کے حاشیے میں واضح طور پر تحریر ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کی صحبت میں بیٹھے والے ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ داڑھی مونچھ صاف کرائے بغیر کوئی شخص ان کے حلقہ ارادت میں داخل نہ سکتا تھا۔ مرید ہونے والے کو اپنے ہاتھ سے شراب پلاتے تھے۔ اگر وہ شراب پی لیتا تو مرید کہلاتا، روزہ کھانا نکال دیا جاتا۔

مذکورہ کتاب کے حاشیے میں یہ بھی تحریر ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کو نماز اور روزے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ حضرت شیخ حسینؒ کی پوری زندگی میں ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا، جب آپ نے اپنے کسی مرید یا خدمت گزار کو روزے کی تلقین کی ہو۔

تمام مسالک کے فقہائے کرام اس امر پر متفق ہیں کہ قصد نماز ترک کرنے والا کافر ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا مشہور قول ہے کہ اگر کسی مسلمان نے عذر شرعی کے بغیر تین جمعوں کی نماز ترک کر لی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوبارہ کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو۔

عالمیابہ روایت بھی حضرت فاروق اعظمؓ ہی سے منسوب ہے کہ خلیفہ ثانی کسی بے نمازی شخص کو بیکار اذیت و کرب میں مبتلا ہو جاتے تھے اور بے اختیار فرمایا کرتے تھے۔

”میرا جی چاہتا ہے کہ جنگل جا کر لکڑیاں جمع کروں اور پھر اس بے نمازی شخص کے گھر کو آگ لگا دوں۔“ اسلام کے دوسرے اہم ترین رکن کو ترک کر دینا، جس پر ایک مسلمان کی بخشش کا دار و مدار ہے، اور پھر دینی بھی کہلاتا، ہمارے شعور و فہم سے بالاتر ہے۔ حقیقی ”ملامعیہ“ وہ ہوتے ہیں، جو خود کو اہل دنیا کے سامنے بے ظاہر کرتے ہیں۔ مگر چھپ کر نماز پڑھتے ہیں۔

ملا مت کے حوالے سے عظیم و جلیل صوفی، حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ کا ایک واقعہ بہت زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ جب آپ کی بزرگی اور کرامات کا ذکر عام ہوا تو لوگ جوق در جوق آپ کی خانقاہ کی طرف آنے لگے۔ حضرت بایزیدؒ بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ عقیدت مندوں کا ہجوم دیکھ کر میرے نفس نے سرکشی اختیار کی۔ پھر چند لمحوں کے مجھے خیال گزرا کہ میں بہت بڑا صاحب تقویٰ ہوں۔ آخر میں نے اپنے نفس کو اس جرم کی سزا دینے کی ٹھان لی۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ایک دن حضرت شیخ بایزیدؒ بسطامیؒ کے خادم نے اطلاع دی کہ دوسرے شہر سے عقیدت مندوں کی ایک جماعت آپ کے دیدار کے لئے حاضر ہوئی ہے۔ حضرت شیخ بایزیدؒ بسطامیؒ نے یہ خبر سنی اور حجرہ خاص میں تشریف لے گئے، جہاں رات کی ایک باسی روٹی رکھی ہوئی تھی۔ پھر جب حضرت شیخؒ، انسانی جہو سامنے جلوہ افروز ہوئے تو وہی روٹی آپ کے دست مبارک میں تھی۔

انسانی ہجوم نے آپ کو دیکھتے ہی پُر شور نعرہ بلند کیا۔ ”ایک مرد خدا کے دیدار سے ہماری آنکھیں روشن ہو گئیں۔ آج روئے زمین پر آپ جیسا پرہیزگار انسان کوئی دوسرا نہیں۔“

ابھی لوگوں کا یہ شور ختم نہیں ہوا تھا کہ حضرت شیخ بایزیدؒ بسطامیؒ نے روٹی کا ایک ٹوالہ توڑ کر اپنے منہ میں اور اسے چبانے لگے۔

یہ منظر دیکھ کر لوگوں میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ انتہائی عقیدت، شدید ناپسندیدگی میں تبدیل ہو گئی۔ ایک

نہ ہمارے اپنی آنکھوں کو روٹن کرنے والے، شدت جذبات سے مغلوب ہو گئے اور چیخنے لگے۔

”روزہ رکھنے والا ایک شخص، بزرگ کیسے ہو سکتا ہے؟..... افسوس! ہم نے بڑا فریب کھایا۔ دُور دراز کے سفر پر ہماری برداشت کمیں اور اپنا وقت بھی برباد کیا۔ اگر اہل ایمان کی یہی حالت ہے تو پھر کون کس پر اعتبار کرے؟“

اب جب کہ لوگ چلے گئے۔ ان کے چہروں پر شدید ناگواری کا رنگ نمایاں تھا۔ ہر جب خانقاہ کا مہن ایک ایک تنفس سے خالی ہو گیا تو حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنے نفس کو مخاطب کر کے فرمایا: ”اپنی حقیقت پہچانی؟ تیری تعریف میں رطب اللسان لوگ تجھے جھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ اب وہ کبھی تیرے رجون نہیں کریں گے۔ اور میں تیری سرکشی کو ختم کرنے کے لئے آئندہ بھی تجھے ایسی ہی سزا دوں گا۔“

یہ کہ حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ نے رونی کا وہ نوالہ، خانقاہ کے ایک گوشے میں تھوک دیا۔ آپ روزے سے تھے اور کبھی حال میں روزہ نہیں توڑ سکتے تھے۔ صرف اپنے نفس کی شرارت کو ختم کرنے اور اہل دنیا کو دکھانے کے لئے آپ نے رونی کا وہ لقمہ کھایا تھا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کس پائے کے صوفی تھے، اس کا اندازہ فارسی کے اس مشہور شعر سے کیا جاسکتا ہے۔

ادب گاہیت زیر آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

غور اکرم ﷺ کا روضہ اقدس، آسمان کے نیچے ایک ایسی ادب گاہ ہے، جو اپنی حقیقت میں عرش سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں آکر جنید بغدادیؒ اور بایزید بسطامیؒ نے اپنے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔ (ترجمہ)

ال مثال سے واضح ہو جائے گا کہ حقیقی رنگِ ملامت کیا ہے؟

مغل شہزادے دارا شکوہ نے حضرت شیخ حسینؒ کو ”ملا متیوں“ کا سردار لکھا۔ مگر کسی بھی تذکرے میں ایسا کوئی نو موجد نہیں کہ آپ نے طریقہ ”ملا مت“ اختیار کرنے کے بعد نماز پڑھی ہو یا روزہ رکھا ہو۔ حالانکہ ہونا تو یہ ہے کہ آپ روزے سے ہوتے اور اہل دنیا آپ کو ”بے روزہ“ سمجھتے۔ لوگ علی الاعلان کہتے کہ شیخ حسینؒ بے ادب ہیں۔ مگر آپ ظاہر پرستوں کی نظروں سے چھپ کر اپنے خالق حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ ایسی کوئی روایت، تاریخ کے اوراق میں محفوظ نہیں۔ ہاں! کچھ روایتوں سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ رات کے پچھلے پہر بہت رویا کرتے تھے۔ یا پھر قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

اب ایک بہت ہی نازک بات کہ صوفی ”کوچہ ملا مت“ سے گزرتا ہے اور دوسروں کو اس طرف آنے کی تلقین نہیں کرتے۔ ایسے صوفیاء اکثر ”محبذوب الحال“ ہوتے ہیں۔ انہیں اتنا ہوش ہی نہیں ہوتا کہ وہ درس و وعظ کی محفلیں اُتر کر آئیں اور طالبان معرفت کو اپنے حلقہء ارادت میں شامل کریں۔ مگر حضرت شیخ حسینؒ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

”حقیت الفقراء“ کے مؤلف شیخ پیر محمدؒ کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ کے نو ہزار مرید تھے جو اپنے مرشد کے پیچھے سے دونوں جہان کی نعمتوں سے سرفراز ہوئے۔

بعض دوسری روایتوں کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ کے مریدوں کی تعداد سو لاکھ تھی۔ مگر سولہ خلفاء نے شہرت حاصل کی۔ ان میں سے چار کا خطاب ”غریب“ ہے۔ چار کا ”دیوان“، چار کا ”خاکی“ اور چار کا ”بلاول“۔

ان خلفاء کی تفصیل اس طرح ہے۔ پہلا شاہ ”غریب“ موضع رتی ٹھٹھہ میں ہے، جو دُور آباد سے تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ دوسرا شاہ غریب موضع ”سنگوالی“ میں ہے، جو دُور آباد کی ایک تحصیل ہے۔ تیسرا شاہ غریب

”اچیلپور“ میں ہے، جو دکن (ہندوستان) کا علاقہ ہے۔ اور چوتھا شاہ غریب ہزاروی، آپ کے مزار مبارک قریب ہے۔

چار دیوانوں میں سے پہلا دیوان مادھو، دوسرا دیوان گورکھ، لاہور میں آپ کے مزار مبارک کی چوکنڈی مدفن ہے۔ تیسرے دیوان بخشی کی قبر بیجا پور (ہندوستان) میں ہے۔ اور چوتھا دیوان لاہور میں آسودہ خاک ہے دیوان مادھو، حضرت شیخ حسینؒ کا محبوب و مطلوب تھا۔

چار ”خاکیوں“ میں سے پہلا خاکی مولا بخشی ہے۔ دوسرا خاکی شاہ، لاہور میں آپ کے مزار مبارک کے قریب مخو خواب ہے۔ تیسرا خاکی شاہ، وزیر آباد میں اور چوتھا خاکی شاہ حیدر بخشی، دکن (ہندوستان) میں آرام فرما ہے۔ چار بلاولوں میں پہلا بلاول، شاہ رنگ بلاول، دوسرا بدھو بلاول، تیسرا شاہ بلاول، یہ تینوں غلام حضرت حسینؒ کے مزار مبارک کے قریب ہیں۔ اور چوتھے بلاول حیدر بخشی کی قبر دکن (ہندوستان) میں ہے۔

ان تمام تفصیلات سے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا۔ اب اللہ ہی جانتا ہے ان بزرگوں کی تعلیمات کیا تھیں؟ اور عام مسلمانوں پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ تذکرہ نگاروں کے مطابق بزرگ ”فرقہ ملائیت“ سے تعلق رکھتے تھے۔

ہماری ناقص رائے اور نامکمل تحقیق کے مطابق تاریخ تصوف میں کچھ اور بھی ملائتی بزرگ گزرے ہیں مگر ان طریقہ ہدایت یا اندازِ تبلیغ یہ نہیں تھا۔ وہ خود کو ملامت کرتے تھے، کسی دوسرے کو ملامت زدہ بننے کی ترغیب نہیں دیتے تھے۔ ان واقعات کی روشنی میں یا تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ نے فرقہ ملائیت کی باقاعدہ بنیاد رکھ کر رات اپنے فریقے کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کیا۔ اور پھر نو ہزار مریدیوں کو تربیت دے کر تصوف کے ان فریقے کو انتہائی کمال تک پہنچایا۔ یا پھر تصوف میں ایک نیا سلسلہ ایجاد کیا، جو نہایت پرخطر ہے اور کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔



تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ حسینؒ کو تین ناموں سے یاد کیا ہے۔ ایک شیخ حسین لاہوری، دوسرے ملا حسین اور تیسرے مادھو لال حسین۔ مادھو لال ایک خوب صورت برہمن زادے کا نام تھا۔ آخر شیخ حسینؒ نے ہندو لال کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تذکرہ نگار آپ کو مادھو لال حسینؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اب ہم تاریخی روایات کی روشنی میں اس پر بحث کریں گے کہ ایک برہمن زادے کا نام حضرت شیخ کے نام کا حصہ کس طرح قرار پایا؟

”حقیقت الفقراء“ کے مؤلف شیخ پیر محمدؒ کے بقول مادھو لال ایک خوب صورت برہمن زادہ تھا، جو لاہور کے قریب شاہدرہ میں رہتا تھا۔ ایک دن مادھو لال، گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا کہ اتفاقاً حضرت شیخ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ آپ نے اپنے دوستوں سے دریافت کیا۔

”تم لوگ جانتے ہو کہ یہ لڑکا کون ہے؟“

”یہ ایک برہمن زادہ ہے، جو قصبہ شاہدرہ میں رہتا ہے۔“ ایک دوست نے جواب دیا، جو مادھو لال کے حالات سے واقف تھا۔

یہ سنتے ہی حضرت شیخ حسینؒ نے سارے کام چھوڑ دیئے اور کشتی میں سوار ہو کر شاہدرہ جا پہنچے۔ مفتی غلام سرور لاہوری بھی ”حقیقت الفقراء“ کی روایت کو درجہ اعتبار دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ ”نام

انہی کُن و جمال پر نظر پڑتے ہی حضرت شیخ حسینؒ بے خود ہو گئے اور عشق مجازی نے ان کا دل چھین لیا۔ پھر ثناء منظر اب اس قدر بڑھی کہ حضرت شیخ حسینؒ نے لاہور کی سکونت ترک کر دی۔ اور شاہدہ میں مستقل طور پر باہر ہو گئے۔

افسوس منظر اب نے حضرت شیخ حسینؒ کے عشق کو زمانے بھر میں مشہور کر دیا۔ اگرچہ شیخ حسینؒ کا عشق دنیاوی لوگوں سے پاک تھا۔ لیکن دنیا دار لوگ اس عشق کے بارے میں نئے نئے افسانے تراشتے رہتے تھے۔

انسانی کُن و جمال بھی قدرت کا ایک عطیہ خاص ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو مجرے کے طور پر بے پناہ کُن بخشا گیا تھا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) نے اپنی رازدار سہیلیوں کے ہاتھوں میں چاقو بولیں دے دیئے اور حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ باہر آ جاؤ۔ پھر جب معجزاتی کُن رکھنے والے عظیم پیغمبرؐ ہمارے ہوئے تو زلیخا نے اپنی سہیلیوں سے کہا کہ اب تم لیموں کاٹ دو۔ زلیخا کی رازدار خواتین کا یہ حال تھا کہ لیمل نے بے خودی کے عالم میں لیموں کی جگہ اپنی انگلیاں کاٹ دیں اور بے اختیار پکار اٹھیں۔

”یہ انسان نہیں، فرشتہ ہے۔“

کی انسان کا کُن و جمال دیکھ کر ایک صوفی کی آنکھ، اللہ تعالیٰ کی صنای میں کھو جاتی ہے۔ مگر اہل دنیا اپنے بظن کی کثافت کے باعث اس عشق کو دوسرا نام دے دیتے ہیں۔

ایک عظیم صوفی حضرت شیخ حدادؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ انہیں جہاں بھی کوئی خوبصورت لڑکا نظر آ جاتا، تو وہ کُن و جمال کے برقرار رہنے کی دعا میں دے کر آگے بڑھ جاتے۔ پھر جب یہ بات مشہور ہو گئی تو شہر کے غلاموں نے حضرت شیخ حدادؒ کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی رقیق طریقہ اختیار کیا کہ وہ غنڈے پائے پیچھے لگے رہتے۔ حضرت شیخ حدادؒ کچھ دن تک ان ادبائشوں کی اس مذموم حرکت کو خاموشی سے برداشت نہ کرے، پھر ایک دن آپ کو جلال آ گیا۔

قریب ہی ایک لوہار بہت دیر سے لوہے کے ٹکڑے کو تیار رہا تھا۔ حضرت شیخ حدادؒ غصے میں آگے بڑھے اور لوہار کی بل بوتے پر لوہے کے ٹکڑے کو اٹھا لیا۔ لوہار چیختا ہی رہ گیا۔ ”بابا! یہ کیا کر رہے ہو؟“ مگر حضرت شیخ حدادؒ، لوہار کی چیخوں سے بے نیاز لوہے کے اس سرخ ٹکڑے کو چومتے رہے۔ یہ دیکھ کر ٹول پر کسکٹاری ہو گیا۔ لوہے کی آگ نے حضرت شیخ حدادؒ کے جسم کو برائے نام بھی ضرر نہیں پہنچایا تھا۔ ہوس دل کو ایسا لگ رہا تھا، جیسے لوہے کی آگ، حضرت شیخ حدادؒ کے ہاتھوں میں پھول بن گئی ہو۔ حضرت شیخ حدادؒ نے آگ کو کئی بار بوسہ دیا۔

اباں خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور لرزتے ہوئے لہجے میں معافی کے خواست گار ہوئے۔

حضرت شیخ حدادؒ نے وہ لوہے کا ٹکڑا دوبارہ آگ کی بھٹی میں ڈال دیا اور ہوس کاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”میں کسی لڑکے کے دلکش خدو خال کی نہیں، اللہ کی صنای کو بوسہ دیتا ہوں۔“

ان کے بعد حضرت شیخ حدادؒ نے اپنی زبان مبارک سے وہ کلمات ادا کئے، جو تاریخ تصوف میں شہرت دوام پا کر گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

”عشق ایک آگ ہے۔ اور آگ، آگ کو نہیں جلاتی۔“

حضرت شیخ حسینؒ بھی مادھو لال برہمن زادے کے کُن و جمال میں خلاقی عالم کی قدرت کا جلوہ دیکھتے تھے۔ نالی کا ایک پاک نام مصور (صورت گر) بھی ہے۔ جو ایسی ایسی حسین و جمیل شکلیں بناتا ہے کہ جنہیں دیکھ کر

آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ حضرت شیخ حسینؒ بھی مادھو لال کو لگا کر کیفیت سے دوچار ہو گئے تھے۔ مگر ہوس آلود آنکھوں نے اس منظر کو غفلتی جذبات کے آئینے میں دیکھا اور حضرت حسینؒ کے عشق کو دنیا دارانہ رنگ دے دیا۔

حضرت شیخ حسینؒ بھی ایک نہایت اعلیٰ ظرف انسان اور جانباز عاشق تھے۔ مگر کم ظرفوں نے آپ کے جذبہ کیف کو ایک تماشا بنا کر رکھ دیا۔

”اولیائے لاہور“ کی روایت کے مطابق یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ حضرت شیخ حسینؒ، مادھو کے غلبے کے حال بھی ہو گئے..... اور بدنام بھی..... نہ کھانے کی پروا، نہ لباس کا ہوش..... پیہم اضطراب..... مسئلہ جانناں کا طواف..... دن اذیت و کرب کا شکار..... راتیں بے خودی کے عذاب میں مبتلا..... جھڑ جاتے..... انگلیاں اٹھ جاتیں۔“

”کیسے مسلمان ہیں کہ وہ ہندو زادہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا..... اور یہ اس کے لئے کوچہ رسوائی کا غار رہ گئے ہیں۔“

لوگ برسر عام مذاق اڑاتے۔ ”یہ ہیں شیخ حسینؒ، جنہوں نے ایک کافر بچے کے لئے اپنی مذہبی پچاس دی۔“

غرض ان ہی تہمتوں کا بارگراں اٹھا کر حضرت شیخ حسینؒ سر بازار رقص کرتے رہے۔ یار دوست بہت کم آئے۔

”حسین! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ اپنے منصب کا کچھ تو خیال کرو۔ خبر بھی ہے کہ اہل دنیا تمہیں کیا کہتے ہیں۔“

حضرت شیخ حسینؒ دوستوں کی یہ ناصحانہ گفتگو سن کر مسکرا دیتے اور اپنے راستے پر چلے جاتے۔ دروازہ کی قیام گاہ کی طرف جاتا تھا۔

کوئی دوست بہت زیادہ اصرار کرتا تو حضرت شیخ حسینؒ بس اتنا ہی فرماتے۔ ”گزر تو مجھ پر رہی ہے۔ برداشت بھی میں ہی کر رہا ہوں۔ اگر بیمار ہوں تو تم سے چارہ گری کا خواہاں نہیں۔ اور اگر خوار ہوں تو تم سے زنا جاہ کا سوال نہیں کرتا۔“

آخر کوچہ ملامت کا سفر کرتے کرتے کئی سال گزر گئے۔ اور حضرت شیخ حسینؒ کے پاؤں آبلوں سے لبرکت مگر وہ پتھر کا پجاری مادھو، پتھر ہی رہا۔ لچکھلنا تو درکنار، اس میں ہلکا سا گداز بھی پیدا نہیں ہوا۔

پھر ایک دن اچانک لوگوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ حسینؒ، مادھو کے انتظار میں کھڑے، دھوپ میں ملبس تھے۔ تھوڑی دیر بعد مادھو گھوڑے پر سوار ادھر سے گزرا۔ حضرت شیخ حسینؒ کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرایا اور زبانی کہنے لگا۔ ”یہ بھی عجیب دیوانہ ہے۔ نہ دل کا حال کہتا ہے، نہ کچھ طلب کرتا ہے۔“ یہ کہہ کر مادھو نے حضرت شیخ حسینؒ کی طرف دیکھا۔ حضرت شیخ حسینؒ نے بھی اس ہندو زادے پر ایک نظر ڈالی، جس کی خاطر آپ کو کوچہ اور لگاؤ بدنام ہو گئے تھے۔

مادھو کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ حضرت شیخ حسینؒ حسرت زدہ نظروں سے مادھو کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ایک مادھو نے گھوڑے کی لگا میں کھینچ لیں..... اور واپس لوٹ آیا۔ یہ ایک انہونی تھی۔ حضرت شیخ حسینؒ کی ہر بے رحم ہندو زادے کے اس طرز عمل پر حیرت تھی۔ مادھو، گھوڑے سے نیچے اتر آ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

حسینؑ میں سے مخاطب ہوا۔

”کیا بڑے ہو گئے، تم میرے پیچھے حیران دسر گرداں پھرتے رہتے ہو۔“ مادھو کا لہجہ نخت آمیز تھا۔
”مگر میرے پیچھے نہیں بھاگتا، کسی اور کے تعاقب میں رہتا ہوں۔“ حضرت شیخ حسینؑ نے نہایت پرسوز لہجہ

”اگر میں نہیں ہوں تو پھر وہ کون ہے؟“ مادھو نے حیرت سے پوچھا۔

”اُسے نہیں جانتا۔“ حضرت شیخ حسینؑ نے فرمایا۔ ”اور جان بھی نہیں سکتا کہ تو خود پتھر ہے۔ جب پھول بن

گا تو اسے پہچان لے گا کہ وہ کون ہے؟“
”ابو کو نہیں سمجھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے کام سے چلا گیا۔ حضرت شیخ حسینؑ بے خودی کے عالم میں



یہ پہچان موقوف تھا، جب مادھو لال، حضرت شیخ حسینؑ کی طرف متوجہ ہوا تھا اور اس نے آپ سے چند باتیں کی
تھیں۔ اس واقعے کے متعلق تذکرہ نگاروں کی رائے ہے کہ حضرت شیخ حسینؑ کے عشقِ سلسل نے اس پتھر میں غم پیدا
کر دیا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اگر پابندی سے کسی پتھر پر قطرہ قطرہ پانی گراتے رہیں تو ایک دن اس مخصوص
پتھر پر ایک نشان پیدا ہو جاتا ہے۔ جس طرح طویل سجدے کرنے والے مسلمان کی پیشانی پر بندگی کا نشان ابھر آتا
ہے۔ اسی طرح پتھر کی مسلسل سجدوں کی ادائیگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

”اس دن ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت شیخ حسینؑ اپنے مکان میں بیٹھے تھے کہ مادھو لال داخل ہوا اور
نہایت لہجے میں مخاطب ہوا۔“ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھتے ہو کہ لوگوں نے عجیب عجیب کہانیاں بتائی ہیں۔“
”میں تجھے نہیں، کسی اور کو دیکھتا ہوں۔“ حضرت شیخ حسینؑ نے پھر مبہم انداز میں جواب دیا۔
”کون ہے وہ.....؟“ مادھو کے دل پر چوٹ سی لگی۔ حضرت شیخ حسینؑ کی بے نیازی سے اس کا پندارِ حُسن

بہا ہوا تھا۔

”ابھی تو اسے نہیں پہچانتا..... مگر وقت آئے گا کہ تو اسے پہچان لے گا اور دنیا تجھے پہچان لے گی۔“ حضرت شیخ
حسینؑ کی گفتگو میں اس قدر ابہام تھا کہ مادھو لال کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔ لیکن اس میں اتنی تبدیلی ضرور آگئی کہ وہ
حسرتِ شیخ حسینؑ سے ملنے کے لئے بے چین رہنے لگا۔

مگر یہ منظر اب اس قدر بڑھا کہ مادھو لال، جو کبھی حضرت شیخ حسینؑ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا،
اب محض آپ کی صحبت میں رہتا..... اور مختلف امور پر باتیں کرتا رہا۔ اس دوران حضرت شیخ حسینؑ کی نظریں،
ادھال کے حسین چہرے پر مرکوز رہیں۔ کبھی کبھی وہ شوخ لہجے میں حضرت شیخ حسینؑ سے سوال کر بیٹھتا۔

”آپ مجھے نہیں، کسی اور کو دیکھتے ہیں..... مگر کیا دیکھتے دیکھتے آپ کا جی نہیں بھرتا؟“

”وہ ایسا ہی ہے کہ بس اسے دیکھتے رہو۔“ حضرت شیخ حسینؑ پر بے خودی طاری ہو جاتی۔ ”اس کے دیدار سے
فرداں کی باتیں نہیں بھتی۔ جتنا دیکھو، طلب اور بڑھ جاتی ہے۔“

حضرت شیخ حسینؑ کی اس کیفیت کو جگر مراد آبادی نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

اس عشق کے ہاتھوں سے ہرگز نہ مفر دیکھا

اتنی ہی بڑی حسرت جتنا کہ ادھر دیکھا

پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ مادھو لال بھی اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ وہ دن بھر حضرت شیخ حسینؒ کے مکان پر رہتا۔ کبھی کبھی اس کی راتیں بھی وہیں گزرتیں۔ تمام تذکرہ نگاروں نے ایک ہی بات لکھی ہے کہ حضرت شیخؒ بھی شراب پیتے اور مادھو لال کو بھی پلاتے۔ ”فرقہ ملاعتیہ“ کی غلط نشر و اشاعت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ وہ دنیاوی نہیں، معرفت کی شراب ہوتی تھی۔ اہل ظاہر کو کم نظری کے سبب پیالوں میں شراب نظر آتی تھی، مگر دراصل وہ شراب شربت ہوتا تھا۔ ”فرقہ ملاعتیہ“ سے تعلق رکھنے والے صوفی، اپنے اعمال کی کوئی بھی توجیہ کریں مگر یہ شربت امن کا راستہ نہیں ہے۔ اکثر صوفیائے کرام نے اسے انتہائی خطرناک بلکہ ہلاکت خیز راستہ قرار دیا ہے۔

الغرض، مادھو لال کی حضرت شیخ حسینؒ سے دلچسپیاں اتنی بڑھیں کہ شاہد رہ میں آباد برہمن غضب ناک ہو گئے۔ اور ایک دن کئی پنڈت، مادھو لال کے گھر پہنچے اور اس کے ماں باپ سے کہنے لگے۔

”تیرے بیٹے نے ہندو دھرم کی عزت و آبرو خاک میں ملا دی۔ ایک برہمن ہوتے ہوئے مادھو لال ایک مسلمان کے ساتھ کھاتا پیتا ہے۔ اب اس کا دھرم کہاں رہ گیا؟ سب کچھ بھر شٹ (برباد) ہو گیا۔“
 برہمنوں کے شدید احتجاج کو دیکھتے ہوئے ماں باپ نے بیٹے کو بلایا اور سخت لہجے میں کہا۔ ”مادھو! غرو من..... یہ ہندو دھرم کے رشک (محافظ) تیرے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

”میں شیخ حسینؒ سے ملنا نہیں چھوڑ سکتا۔“ مادھو لال نے برہمن پنڈتوں کے اعتراضات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔
 ”آخر تو اس مسلمان کے پاس کیوں جاتا ہے؟ ایک برہمن پنڈت نے مادھو لال سے اس کی اس بات کا سبب پوچھا۔

”یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں شیخ حسینؒ کے پاس کیوں جاتا ہوں۔“ مادھو لال کے لہجے سے صوبھن جھلک رہی تھی۔ ”کوئی نا دیدہ طاقت مجھے اس طرف کھینچے چلے جاتی ہے۔“
 ”تجھ پر اس مسلمان نے جادو کر دیا ہے..... مگر ہم اس جادو کو اتار دیں گے۔“ دوسرے برہمن پنڈت نے نڈن لہجے میں کہا۔ ”ہمیں ایسے منتروں کا اتار آتا ہے۔“

”اگر آپ جیسے گیانی لوگ اس جادو کو اتار سکتے ہیں تو اتار دیں۔“ یہ کہہ کر مادھو لال چلا گیا۔
 مادھو کے جانے کے بعد اس کے ماں باپ نے برہمن پنڈتوں سے کہا۔ ”آپ لوگوں نے دیکھا کہ اس مسلمان جادو کرنے کیسا جادو کیا ہے، ہمارے بیٹے پر؟“

برہمن پنڈت جانتے تھے کہ مادھو کے سر چڑھا ہوا یہ جادو کسی طرح نہیں اترے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں ایک اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ آج مادھو، شیخ حسینؒ سے متاثر ہوا ہے، کل وہ مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔ پھر ایک مادھو کے دو دوسرا مادھو..... اور دوسرے کے بعد تیسرا..... اس طرح ہندو معاشرے میں برہمنوں کی ساکھ کہاں قائم رہے گی؟ آخر ہندو دھرم کے رکھوالے، حضرت شیخ حسینؒ کو اپنے مذہب کے لئے خطرہ عظیم سمجھنے لگے۔ پھر ان پنڈتوں نے مادھو کے ماں باپ کے مشورے سے ایک خوف ناک منصوبہ بنایا۔

”مادھو پر کئے ہوئے جادو کو اتارنے سے بہتر ہے کہ جادوگر کو ہی ختم کر دیا جائے۔“

پھر چند ہندو غنڈوں کو اس کام پر لگا دیا گیا کہ جب مادھو، حضرت شیخ حسینؒ کے مکان میں موجود ہو، اس وقت شیخ حسینؒ پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیا جائے۔

مادھو اپنے ماں باپ اور برہمن پنڈتوں کی اس سازش سے بے خبر، حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں حاضر رہا۔ پہلے کبھی بھی رات کو قیام کرتا تھا، اب مسلسل تین تین راتیں وہیں رہنے لگا۔ مسلح ہندو غنڈے روزانہ ان کے

زمرے میں حضرت شیخ حسینؒ کے قتل کے ارادے سے نکلتے..... مگر جب حضرت شیخ حسینؒ کے مکان کے قریب پہنچے تو دروازہ نظروں سے غائب ہو جاتا۔ ہندو غنڈے ساری ساری رات گرد و نواح میں بھٹکتے رہتے..... اور پھر نام نہاد اداہل آجاتے۔ برہمن پنڈتوں نے ہندو غنڈوں کے اس بیان کو جھوٹ سمجھا..... اور ایک رات خود ان کے ہاتھ حضرت شیخ حسینؒ کے مکان پر پہنچے۔ دو تین سو گز کے فاصلے پر مکان صاف نظر آ رہا تھا۔ مگر جب برہمن ہاتھ مکان کے قریب پہنچے تو حسب سابق دروازہ غائب ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر ہندو پنڈت خوف زدہ ہو گئے۔

پلے سہلے سے منصوبہ ترتیب دیا گیا اور ہندو بد معاشوں کو ہدایت کی گئی، شیخ حسینؒ جہاں نظر آئیں، انہیں باہر قتل کر دیا جائے۔ مسلح غنڈے دن رات حضرت شیخ حسینؒ کے تعاقب میں رہتے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ حضرت شیخ حسینؒ انہیں نظر آجاتے..... مگر جب حملہ کرنے کے لئے قریب پہنچتے تو آپ مسلح افراد کی نظروں سے ہٹ جاتے۔ آخر حضرت شیخ حسینؒ کے دشمن تھک کر مایوس ہو گئے اور ان لوگوں نے پنڈتوں سے صاف صاف کہہ دیا: ”اس نام جادوگر کو قتل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں کسی دن ہم خود ہی اس کے جادو کے زریعہ نہ آجائیں۔“

برہمن پنڈتوں کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ آخر ان لوگوں نے ایک دن مادھو کو دھکی دیتے ہوئے کہا۔ ”تجھے ہٹا لیں۔ اس کی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ہندو دھرم یا اس مسلمان جادوگر کی قریب؟“

”ہو سکتا ہے کہ میں ہندو دھرم چھوڑ دوں..... مگر شیخ حسینؒ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ مادھو لال نے واضح الفاظ میں اپنا جواں دیا۔

برہمن پنڈتوں نے مادھو کو لعنت زدہ قرار دیا اور اٹھ کر چلے گئے۔ غم زدہ ماں باپ، صبر کر کے بیٹھ گئے اور مادھو نام کی باتیں برداشت کر کے حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ اب وہ کبھی کبھی ماں باپ کو دیکھنے فرماتا تھا..... اور مختصر سا وقت گزار کر واپس چلا جاتا تھا۔



ہر ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے مادھو لال کی دنیا بدل ڈالی۔ بیساکھ کے مہینے کی پہلی تاریخ کو مادھو لال نے لنگا میں اشان (غسل) کرتے تھے اور اس غسل کو اپنی نجات کا باعث سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انجمن تاریخ کو لنگا میں نہانے سے سال بھر کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں اور انسان پاک صاف ہو جاتا ہے۔ جب وہ مہینہ قریب آیا تو مادھو کے ماں باپ نے عاجزانہ انداز میں اس سے کہا۔

”بیٹے! ہماری دلی خواہش ہے کہ تُو بھی ہمارے ساتھ لنگا نہالے۔ پھر تیرے سارے پاپ دھل جائیں گے۔“

مادھو کے ماں باپ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اگر شیخ حسینؒ نے ان کے بیٹے پر جادو کیا ہے تو وہ بھی اس غسل سے آزاد ہو جائے گا۔

مادھو نے حضرت شیخ حسینؒ کے سامنے ماں باپ کی اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”میں لنگا نہا کر لنگا نہا کر بھی حاصل کروں گا..... اور ماں باپ کا دل بھی رہ جائے گا۔“

حضرت شیخ حسینؒ کو ایک لمحے کے لئے بھی مادھو کی جدائی گوارا نہیں تھی۔ اس لئے آپ نے مضطرب لہجے میں کہا: ”مادھو! تجھے معلوم ہے کہ دریائے گنگا یہاں سے کتنی دُور ہے؟..... مہینوں کا سفر ہے۔ مجھ سے اتنے دن تیری نہ برداشت نہیں ہوگی۔“

”میں اپنے ماں باپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔“ مادھو نے اس طویل سفر پر جانے کے لئے اصرار کیا۔ ”مگر میں

ان کے ساتھ نہیں گیا تو جھوٹا قرار پاؤں گا۔“
 ”ماہو! تجھے جھوٹا کون قرار دے سکتا ہے؟“ حضرت شیخ حسینؒ کی بے قراری کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ”تو کجا ہے۔“
 ”تو قریب دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی۔“

”تو پھر مجھے اجازت دیجئے۔ کل قافلہ روانہ ہونے والا ہے۔“ ماہو مطمئن نظر آنے لگا تھا۔
 حضرت شیخ حسینؒ گہری سوچ میں ڈوب گئے اور آپ نے آنکھیں بند کر لیں۔
 ماہو اتنی دیر حیرت میں گم بیٹھا رہا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ حضرت شیخ حسینؒ کیا سوچ رہے ہیں؟
 آخر بہت دیر بعد حضرت شیخ حسینؒ نے آنکھیں کھولیں اور ماہو لال کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اپنے باپ سے کہہ دے کہ ٹو غسل کے مقررہ دن دریائے گنگا پر پہنچ جائے گا۔ اور اپنی مذہبی رسمیں ادا کر لے گا۔“
 جب ماہو لال نے اپنے ماں باپ کو بتایا تو وہ برہم ہو گئے۔ ”ٹو مہینے بھر کا سفر ایک دن میں کیسے طے کرے گا؟ شیخ حسینؒ جھوٹ بول رہے ہیں تاکہ تجھے گنگا اشران کی برکات حاصل نہ ہو سکیں اور ٹو اپنے مذہب سے دور نہ چلا جائے۔“

”مجھے شیخ حسینؒ پر اعتبار ہے۔“ ماہو نے ماں باپ کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ ”آپ لوگ روانہ ہو جائیں۔ میں بیساکھ کی پہلی تاریخ کو دریائے گنگا پر پہنچ جاؤں گا اور آپ لوگوں کے ساتھ اشران کروں گا۔“
 ماہو کے ماں باپ اپنے ہم قوموں کے ساتھ لاہور سے روانہ ہو گئے، مگر راستے بھر حضرت شیخ حسینؒ کے لیے نازیبا کلمات استعمال کرتے رہے۔

اس سلسلے میں خود ماہو بھی حیران و پریشان تھا کہ شیخ حسینؒ اسے کس طرح دریائے گنگا تک پہنچائیں گے؟ جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، ماہو کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ روزانہ حضرت شیخ حسینؒ کو یاد دلاتا رہتا تھا۔
 ”وقت کم رہ گیا ہے اور فاصلہ بہت زیادہ ہے۔“

حضرت شیخ حسینؒ جواباً مسکرا دیتے۔ ”یہ بات تیرے سوچنے کی نہیں کہ فاصلہ کس طرح طے ہوگا؟ جس زمانہ پاک نے وقت اور فاصلوں کو بنایا ہے، وہی ہماری سواری کا انتظام بھی کرے گا۔ جب پہلی تاریخ آجائے تو تمہارا دینا۔“

دن گزرتے رہے۔ وقت سمٹتا رہا۔ اور فاصلے بڑھتے چلے گئے۔ ماہو لال پہلے حیرت میں مبتلا تھا، اب بے چینی کا شکار ہو گیا۔ کہاں شاہد رہ (لاہور) اور کہاں دریائے گنگا؟

دوسری طرف ماہو لال کے ماں باپ اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ اب اشران کی رسم ادا کرنے میں صرف ایک دن باقی تھا۔ دونوں بہت خوش تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

”شیخ حسینؒ ایک رات میں ماہو کو یہاں نہیں پہنچا سکتے۔ اب تمام لاہور والوں پر ان کا جھوٹا کل جانا گا..... اور وہ ماہو لال کی نظروں سے بھی گر جائیں گے۔ اس طرح ہمارا بھٹکا ہوا بیٹا، سیدھے راستے پر آ جائے گا۔“
 بیساکھ کی پہلی تاریخ کا سورج طلوع ہوا۔ ماہو لال، حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر غرض کر لگا۔ ”میرے ماں باپ اس وقت دریائے گنگا میں غسل کر رہے ہوں گے۔ میرے لئے کیا حکم ہے؟“ ماہو لال۔
 چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی اور وہ بے یقینی کے دائرے میں کھڑا تھا۔

حضرت شیخ حسینؒ مسکرائے۔ ”تم بھی غسل کر لو۔“ یہ کہہ کر آپ اٹھے اور مکان کے باہر تشریف لائے۔
 ماہو لال کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”خیر! تھک چکے ہو اور میرے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ دو۔ جب تک میں نہ کہوں، اس وقت تک آنکھیں نہ کھولنا۔“
 مادھو لال نے حضرت شیخ حسینؒ کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ تھوڑی دیر بعد مادھو نے حضرت شیخ حسینؒ کی
 آنکھیں آپت میں کھول دیں۔ ”مادھو! آنکھیں کھول دو۔ تمہاری منزل آگئی۔ مگر حقیقتاً یہ تمہاری
 منزل ہے۔“

مادھو لال ابھی تک بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس نے حضرت شیخ حسینؒ کی آواز سنی تو گھبرا کر آنکھیں
 بند کر دیں۔ وہ دیرپائے لنگہ کے کنارے کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے لئے مادھو لال پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔
 بے لگ لنگہ میں غسل کر رہے تھے۔ مادھو لال آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اشان کرنے والوں کو دیکھتا رہا۔ پھر جب
 یقین آ گیا کہ وہ حالت خواب میں نہیں ہے تو بے اختیار حضرت شیخ حسینؒ کے قدموں پر گر گیا۔
 ”شیخ! یہ کیا معاملہ ہے؟“ شدت جذبات سے مادھو لال کی آواز لرز رہی تھی۔

حضرت شیخ حسینؒ نے دونوں بازو پکڑ کر مادھو لال کو اٹھایا اور پھر نہایت پر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”یہ رازِ ربانی
 الہ کا بیان کرنا مناسب نہیں۔ تم اپنے ماں باپ اور ہم مذہبوں کے ساتھ غسل کرو۔ پھر جب فارغ ہو جاؤ تو
 ہال چلے آنا تاکہ تمہیں دوبارہ لاہور پہنچا سکوں۔“

مادھو لال مسرت و سرشاری میں ڈوبا ہوا، ماں باپ کے پاس پہنچا تو وہ بھی حیران رہ گئے۔ ”بیٹا! مادھو! تو کب
 ماں باپ نے بیک زبان سوال کیا۔“

”ابھی ابھی آیا ہوں، شیخ حسینؒ کے ساتھ۔“ یہ کہتے ہوئے مادھو لال بھی پانی میں اتر گیا۔

”تم لوگ لاہور سے کب روانہ ہوئے تھے؟“ حضرت شیخ حسینؒ کا نام سن کر مادھو لال کے ماں باپ کے
 زبان پر کواہی کارگ اُبھر آیا۔

”بل بل دہلی پہلے۔“ مادھو لال کے لہجے سے انتہائی خوشی جھلک رہی تھی۔ ”شیخؒ نے مہینوں کا سفر، لمحوں میں
 کر دیا۔“

ماں باپ کے چہرے بھج گئے۔ اور ان کی رہی سہی اُمید بھی ختم ہو گئی۔ دونوں بت پرستوں کے خیال میں
 بہت شیخ حسینؒ کی جادوگری اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اور اب اس کا کوئی توڑ ممکن نہیں تھا۔

جب مادھو لال غسل کر چکا تو حضرت شیخ حسینؒ اسی طرح اسے واپس لاہور لے آئے۔

مادھو لال کی آنکھوں سے جلابات اُٹھ گئے تھے۔ دوسروں کا سارا غبار دھل گیا تھا اور اب وہ یقین کی منزل پر
 رافعا! آخر ایک دن مادھو نے ”زنار“ توڑ کر پھینک دیا اور اپنے ماتھے سے ”تشفہ“ کھرچ ڈالا۔ اور حضرت شیخ
 حسینؒ کے دستِ حق پرست پر ایمان لا کر حلقہء اسلام میں داخل ہو گیا۔

زنار اس دھگے یا ڈوری کو کہتے ہیں، جو ہندوؤں کی گردن اور کمر کے درمیان پڑی ہوتی ہے۔ اہل ہندو کی نظر
 یہ منسل ڈوری کہلاتی ہے۔ تشفہ وہ مذہبی نشان ہے، جو ہندوؤں کی پیشانیوں پر ہوتا ہے اور نئے عرف عام میں
 ”باپ“ اور ”تلک“ کہا جاتا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ نے اپنے پیر و مرشد، محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی
 نامی ایک منقبت تحریر کی تھی۔ جس کا یہ مصرع لازوال اور آفاقی شہرت رکھتا ہے۔

چھاپ تلک سب چھین لی رے

مو سے نیناں ملائے کے

حضرت شیخ حسینؒ کی نگاہ کیسی تاثیر نے برہمن زادے، مادھو لال کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ زنار توڑ کر پھینک دے

اور اپنے ماتھے سے ”چھاپ تلک“ کے نشانات کھرچ ڈالے۔ تمام تذکرہ نگاروں کی روایت کے مطابق ہندو مسلمان ہو گیا تھا۔ مگر کسی کتاب یا قلمی دستاویز سے پتہ نہیں چلتا کہ قبول اسلام کے بعد مادھو نے کون سا سال اختیار کیا تھا۔ ہر تذکرے میں اس کا ہندوانہ نام مادھو لال موجود ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اکثر تذکروں میں حضرت حسینؑ کو بھی مادھو لال حسینؑ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گویا ”مادھو لال“، حضرت شیخ حسینؑ کے نام کی ایک حصہ تھا۔

مستند کتابوں میں ایسی کوئی روایت بھی نہیں ملتی کہ یہ حضرت شیخ حسینؑ کی وصیت کا نتیجہ ہو۔ بعض کرام، وصال سے پہلے کچھ مخصوص وصیتیں فرمایا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی آخری لمحات میں فرمایا۔

”جسے میری قبر کی زیارت کا شوق ہو، اسے لازم ہے کہ پہلے وہ امیر خسروؒ کے مزار پر حاضر ہو۔“

نتیجتاً آج بھی یہ رسم موجود ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک پر حاضری دینے والے، پہلے امیر خسروؒ کے روضے پر حاضر ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہو سکتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؑ نے بھی مادھو لال کے نام کو اپنے نام کے ساتھ وابستہ کرنا وصیت کی ہو۔ مگر طویل تحقیق کے دوران میں حضرت شیخ حسینؑ کی ایسی کوئی وصیت ہماری نظروں سے نہیں گزری۔ محض خوش عقیدت لوگوں کی کارگزاری ہے کہ مادھو لال کے نام کو حضرت شیخ حسینؑ کے نام کا لازمی حصہ بتا دیا۔ اسلام کے وقت مادھو لال کی عمر اٹھارہ سال تھی۔



یہ وہی خوب صورت لڑکا، مادھو لال تھا، جس کے ساتھ حضرت شیخ حسینؑ، ڈھول کی تھاپ پر سر بازار نقب کرتے تھے۔ پھر یہی مناظر دیکھ کر کسی شاہی کارندے نے مغل شہنشاہ، جلال الدین اکبر کو ایک خط لکھا کہ ”حقیقت الفقراء“ کی روایت کے مطابق اس خط کی عبارت حسب ذیل تھی۔

”لاہور میں حسین نامی ایک فقیر ایسا ہے، جو داڑھی منڈوا کر سرخ لباس پہنتا ہے۔ مادھو نام کے ایک لڑکے کے ساتھ رہتا ہے۔ شراب پی کر سرسبز بازار قفس کرتا ہے۔ اور ان تمام باتوں کے باوجود ولایت کا ڈھول بجاتا رہتا ہے۔“

ہم اس واقعے کی تفصیلات گزشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ لاہور کا کوٹوال ملک علی، حضرت شیخ حسینؑ انتہائی گستاخانہ انداز میں پیش آیا اور پھر آپ کی بددعا سے اس کے سر میں میخیں ٹھونکی گئیں اور وہ اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا۔ اس کے بعد مغل شہنشاہ اکبر نے اپنے دوسرے کارندے کو حضرت شیخ حسینؑ کے پاس بھیجا۔

”غل الہی شہنشاہ اکبر آپ سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔“

”ایک فقیر کو شہنشاہوں سے کوئی نسبت نہیں۔“ حضرت شیخ حسینؑ نے بے نیازانہ فرمایا۔

”شہنشاہ آپ جیسے بزرگ کا دیدار کرنا چاہتے ہیں۔“ شاہی کارندہ، کوٹوال ملک علی کا انجام دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنے لہجے میں مزید شائستگی اور نرمی پیدا کر لی تھی۔

”تمہارے شہنشاہ کو ہماری بزرگی کی ادائپند نہیں آئے گی۔“ حضرت شیخ حسینؑ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

پھر بھی چلتے ہیں۔ ایک تماشہ اور سہی۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ حسینؑ شاہی کارندے کے ساتھ ہوئے۔

پھر جب یہ مرد آزاد ایک شہنشاہ کے سامنے آیا تو اکبر کے ساتھ اس کے مصاحبین خاص بھی حیرت زدہ رہے۔

الان حضرت شیخ حسینؒ کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔

بہت حال دیکھ کر ایک خوشامدی مصاحب نے شہنشاہ اکبر کے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”یہ فقیر، آداب شاہی بخت روزی کر کے نہایت سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہے۔“

”اے مصاحب نے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے خوشامدانہ لہجے میں مزید شدت پیدا کر کے کہہ کر انسان نے یہ گستاخانہ روش اختیار کر کے ظل الہی کے جلال و جبروت کی نفی کی ہے۔“

شہنشاہ اکبر نے اس موقع پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور حضرت شیخ حسینؒ کو مخاطب کر کے بولا۔ ”اے فقیر! یہ کیا ہے؟ غیر شرعی ہونا اچھا نہیں ہوتا۔“

ظلِ عامر دروہاوری نے اپنی مشہور تصنیف ”خزینۃ الاصفیاء“ میں اس واقعے کی منظر کشی اس طرح کی ہے۔

ان حضرت اس حالت میں بادشاہ کے سامنے تشریف لائے کہ آپ کے ایک ہاتھ میں شراب کی صراحی تھی اور دوسرے میں جام۔ حضرت شیخ حسینؒ کو اس رنگ میں دیکھ کر مغل شہنشاہ اکبر نے فرمایا۔

”ہر چند کہ تم سلسلہ قادریہ میں بیعت ہو، پھر یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

حضرت شیخ حسینؒ نے شہنشاہ اکبر کے سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا۔ شراب کی صراحی سے ایک جام بھرا اور شہنشاہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”خود ملاحظہ کر لیجئے کہ اس میں کیا ہے؟“

شہنشاہ اکبر نے حیرت سے دیکھا۔ اس جام میں ٹھنڈا پانی بھرا ہوا تھا۔

حضرت شیخ حسینؒ نے دوسرا جام بھر کر فرماں روا کے ہندوستان کو پیش کیا۔ وہ خالص دودھ سے لبریز تھا۔

ایک ہی لمحے میں ہر بار اس میں سے نئی چیز برآمد ہوتی تھی۔ مغل شہنشاہ کے ساتھ اس کے مصاحبین خاص بھی نازل تھے۔

”فقت الفقراء“ کے مؤلف شیخ پیر محمدؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اکبر بادشاہ، حضرت شیخ حسینؒ کے اس عمل سے نہیں ہوا اور اس نے اپنے شراب خانے سے شراب کی ایک بڑی صراحی اور آٹھ پیالے منگوائے۔ واضح رہے کہ رجب عالمگیر کے سوا تمام مغل شہنشاہ، اعلیٰ طور پر نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شراب پیا کرتے تھے۔

شہنشاہ اکبر نے حضرت شیخؒ کا امتحان لینے کی غرض سے صراحی اور آٹھوں پیالے ان کے حوالے کر دیئے۔

حضرت شیخ حسینؒ نے بادشاہ کے دیئے ہوئے آٹھوں پیالے بھر دیئے۔ مگر ہر پیالے میں مختلف چیزیں تھیں۔

”عذرت اور پھلوں کا رس وغیرہ۔ حاضرین مجلس حیرت زدہ تھے۔ ایک شہنشاہ اکبر کی باز عجب آواز گونجی۔“

”سین! ہم تمہاری اس کرامت پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ کوئی اور کرامت دکھاؤ۔“

حضرت شیخ حسینؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔ ”جس طرح بادشاہ چاہیں۔“

ان کے بعد شہنشاہ اکبر نے حضرت شیخ حسینؒ کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ دروازے پر تالا لگا کر پہرے دار رکھ کر بیٹھے۔ پھر جب مغل شہنشاہ، محل کی طویل راہداریوں سے گزر کر اپنے خاص کمرے میں پہنچا تو نہ ہو کر رہ گیا۔ حضرت شیخ حسینؒ، اکبر کی بیگم کے پاس بیٹھے ہوئے جو گفتگو تھے۔ کسی تذکرہ نگار نے اس کی نقل کی کہ وہ اکبر کی کون سی بیگم تھی۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ اکبر کی ہندو بیوی، مہارانی جودھاتھی، جو آخری مہارانی تھیں۔

سابق مذہب پر قائم رہی۔ اس کی خوشنودی کے لئے اکبر نے اپنے محل میں ایک شاندار مندر بھی تعمیر کرایا تھا۔

حضرت شیخ حسینؒ کو اپنی بیگم سے گفتگو کرتے دیکھ کر تیزی سے پلٹا اور اس جگہ پہنچا، جہاں حضرت شیخ حسینؒ اکبر کے محل میں بند تھے۔ اکبر کے حکم پر متقل دروازہ کھولا گیا۔ ایک بار پھر مغل شہنشاہ پر حیرت و استعجاب کا دورہ سا

پڑا۔ حضرت شیخ حسینؒ راہداری کے ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ”حقیقت الفقراء“ کی روایت کے مطابق، یہ منظر دیکھ کر مغل شہنشاہ اکبر نہایت شرمندہ ہوا اور آگے بڑھ کر حضرت شیخ حسینؒ کے قدموں میں گر پڑا۔ اکبر نے ایک فقیر کی اس کرامت کو دل سے تسلیم کر لیا تھا۔

والی ہندوستان کو اپنے پیروں میں جھکا دیکھ کر حضرت شیخ حسینؒ نے نہایت پر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”ہاشا ہمیں جانے دو۔ ورنہ تمہاری سلطنت ایک آن میں برباد ہو جائے گی۔ حکمرانوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ فقیروں کو تکلیف پہنچائیں۔“

اس واقعے کے بعد شہنشاہ اکبر نے حضرت شیخ حسینؒ کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنے محل میں ٹھہرایا۔ اپنے وزیر خاص شیخ ابوالفضل سے مشورہ طلب کیا۔

”جہاں پناہ! جو لوگ، اللہ کے دروازے کے فقیر ہوتے ہیں، ان سے کچھ بھی بعید نہیں۔“ شیخ ابوالفضل نے دست بستہ عرض کیا۔ ”یہ لوگ ہر طرح اپنی کرامت کا اظہار کر سکتے ہیں۔“

شیخ پیر محمدؒ آگے چل کر تحریر کرتے ہیں۔ ”شہنشاہ اکبر نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ حضرت شیخ حسینؒ رخصت فرمایا اور ہمیشہ ان کا عقیدت مند رہا۔ اکبر کے علاوہ شہزادہ سلیم اور دیگر بیگمات بھی حضرت شیخ حسینؒ سے حد درجہ اعتقاد رکھتی تھیں۔ امراء میں خواجہ دولت خان، عبدالرحیم خان خاناں، مفتی میر عدل اور ابوالفضل، حضرت شیخ حسینؒ کے انتہائی ارادت مند تھے۔ شیخ عبدالرحمنؒ کے بیٹے نے حضرت شیخ حسینؒ کی مہربانوں سے افضل خان کا خطاب پایا۔ جعفر خان، بہار خان، صادق خان، شہباز خان جیسے امراء سلطنت اور بڑے بڑے مہاراجا، حضرت شیخ حسینؒ کے مطیع و فرماں بردار غلام تھے۔ مگر آپ نے کبھی کسی سے اپنی کوئی حاجت بیان نہیں کی۔ بس شراب اور رزم سے کام تھا۔ اور آپ اسی حالت میں پھرتے رہتے تھے۔“

بڑی حیرت کی بات ہے۔ وہ ”حقیقت الفقراء“ کے مصنف شیخ پیر محمدؒ ہوں یا ”کتاب بیماریہ“ کا مؤلف بہار خان۔ ہر تذکرہ نگار، حضرت شیخ حسینؒ کی مختلف کرامات بیان کرتا ہے۔ مگر آخر میں شراب اور رقص پر تان لٹکتا ہے۔ یہ شاید اس لئے ہو کہ ایک صوفی کے رنگ ملامت کو اسی طرح ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال، ہم مذکورہ روایت کو ان کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

شیخ پیر محمدؒ نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کی کرامت دیکھ کر شہنشاہ اکبر ان کے قدموں میں گر پڑا اور ہمیشہ عقیدت کا اظہار کرتا رہا۔ ہمارے نزدیک یہ محض فسانہ طرازی یا مبالغہ آمیز خوش عقیدگی ہے۔ ورنہ کسی معتبر تاریخ نویس اس واقعے کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔

مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کو جن صوفیائے کرام اور علمائے دین سے عقیدت تھی، ان کے اسمائے گرامی بھی مستند کتابوں میں محفوظ ہیں۔ حضرت شیخ نظام الدین ناروٹی اس زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔ ایک بار ان شریف جاتے ہوئے اکبر، حضرت شیخؒ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا تھا۔ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی بارگاہ میں شاہ ہند نیاز مندانہ کھڑا رہتا تھا۔ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ ہی کی دعاؤں سے تخت ہندوستان کا وارث پیدا ہوا تھا۔ اور انہوں نے اظہار عقیدت کے لئے اپنے بیٹے کا نام حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے نام پر سلیم رکھا تھا۔ اکبر کو سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ ناصر الدین عبید احراریؒ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ مغل شہنشاہ، مشہور عالم حضرت عبداللہؒ کے درس حدیث میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اور حضرت شیخؒ کے جوتے اٹھانے کو اپنے لئے سعادت سمجھتا تھا۔ ایسی بہت سی مثالیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ مگر جگہ کی کمی کے باعث ان واقعات کو قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔

نہ کہ حضرت شیخ حسینؒ سے ایسی ہی عقیدت ہوتی کہ وہ ان کے قدموں میں جھک جانے کو اپنے لئے نڈھال دور کا کوئی نہ کوئی مورخ اتنے بڑے واقعے کا حوالہ ضرور پیش کرتا۔
 یہ ممکن ہے کہ شہنشاہ اکبر نے حضرت شیخ حسینؒ کو دار الحکومت آگرہ طلب کیا ہو۔ اور گفتگو کے بعد انہیں
 حجاز کے ساتھ رخصت کر دیا ہو۔ مگر شیخ پیر محمدؒ نے جن واقعات کو بنیاد بنایا ہے، ان سے حضرت شیخ حسینؒ
 کا غلط میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔



نور الدار شاہوہ اپنی تصنیف ”حسنات العارفین“ میں حضرت شیخ حسینؒ کی ایک کرامت کا ذکر کرتے
 ہیں۔
 بادشاہ اکبر نے اپنے ایک وزیر کو لکھا کہ وہ حضرت شیخ حسینؒ کے پاس جائے اور انہیں داڑھی نہ رکھنے
 کی تلقین کرے۔
 حکمرانی کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کی محفل ناؤ و نوش بھی ہوئی
 اب سے لبرائی ہوئی صراحی اور پیالے رکھے تھے۔ اور حضرت شیخ حسینؒ شراب پینے میں مشغول تھے۔ وزیر
 بہت حال دھمی تو دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ اب حضرت شیخ حسینؒ کو سزا دینے میں مزید آسانی پیدا
 ہوگی۔ اور داڑھی نہ رکھنے کے جرم میں شراب نوشی کے گناہ کو بھی شامل کر لے گا۔
 حکمران نے کہ آپ کو ان غیر شرعی حرکات پر سزا دی جائے۔“ وزیر نے عہدہ و منصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے
 ان کے پاس پہنچا۔

حکمران نے کہا؟“ حضرت شیخ حسینؒ نے فرمایا اور شراب سے لبریز پیالہ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔
 شاہی شہنشاہ جلال الدین اکبر کا حکم۔“ وزیر کے لہجے سے ایسی نخوت جھلک رہی تھی، جیسے وہ خود ہی اقلیم
 کا حکمران رہا ہو۔
 حکمران نے کہا؟“ حضرت شیخ حسینؒ نے بے نیازانہ کہا اور وزیر کی موجودگی کو اس طرح نظر انداز کر دیا،
 کہ حکمران ہمارا انسان ہو۔

حکمران نے کہا؟“ وزیر کا لہجہ سخت تھا۔“ مگر یہاں آکر میں نے
 اس کو لڑائی کے گناہ میں مبتلا دیکھا۔ اس لئے تم دوہری سزا کے مستحق ہو۔“
 حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
 حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
 حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
 حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
 حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
 حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
 حکمران نے حکم سن کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

زاویے سے اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ تمام مستند دستاویزات گواہ ہیں کہ مغل شہنشاہ جلال الدین نے اپنی عمر جسے میں داڑھی نہیں رکھی۔ بلکہ جب اس نے اپنا نیا مذہب ”دین الہی“ ایجاد کیا تو داڑھی منڈوانے کو فراموش کر دیا۔ پھر ایک ایسا حکمران، حضرت شیخ حسینؒ کو داڑھی منڈوانے کے جرم میں کس طرح سزا دے سکتا تھا؟ رہا شراب نوشی کا سوال تو ہم اپنے قارئین کی معلومات کے لئے ”دور اکبری“ کے کچھ عبرت ناک واقعات کرتے ہیں۔

مشہور مؤرخ، عبدالقادر بدایونی ”مختب التواریخ“ میں لکھتا ہے۔ ”دین الہی کے مجتہدوں (اہل تشیع) نے اکبر کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اگر اہل حکمت (طبیعیوں) کے طریقے پر شراب پی جائے جسmani کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ شہنشاہ اکبر نے پینے والوں کی سہولت کے لئے دربار عام کے قریب شراب کی ایک دکان کر، مختلف اقسام کی شرابوں کے نرخ (دام) مقرر کر دیئے تھے۔ عبدالقادر بدایونی کے بقول اس دکان کی عورت تھی۔

شراب کی اس دکان کے کھلتے ہی دنیا دار علماء کے جوہر بھی کھلنے لگے۔ ”نوروز“ کی مجلسوں میں اکثر مفتی شراب پیتے تھے۔ شہنشاہ اکبر ان لوگوں کو شراب پیتے دیکھ کر بہت محظوظ ہوتا تھا اور ترنگ میں آکر بہت کرتا تھا۔

در عہد پادشاہ خطا بخش و جرم پوش
حافظ قرا بہ کش شد و مفتی پیالہ نوش

(خطا بخشنے اور جرم سے چشم پوشی کرنے والے بادشاہوں کے عہد میں حافظ اور مفتی دونوں شراب پینے یعنی انہیں سزا کو کوئی خوف نہیں رہا۔ ترجمہ)

عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے کہ عہد اکبری کے ایک عالم، خواجہ اسلمیل کا انتقال کثرت شراب نوشی کے سبب ہوا۔ قاضی عبدالسمیع کو، جن کی داڑھی بہت لمبی تھی، اکبر نے قاضی القضاۃ ”چیف جسٹس“ بنا دیا تھا۔ یہ بڑا بڑا لگا کر شطرنج کی بازیاں کھیلتے تھے۔ کھیل کے دوران مزے لے لے کر حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھتے رہتے تھے۔ جام پر جام چڑھاتے رہتے تھے۔

سحرز ہاتف غییم رسیدہ مژدہ گوش
کہ دور شاہ شجاع است مئے دلیر بنوش

(سحر کے وقت مجھے ہاتف غیبی نے خوشخبری سنائی کہ یہ ایک بہادر شہنشاہ کا دور حکومت ہے۔ اس لئے بہادری کے ساتھ شراب پی۔ ترجمہ)

عبدالقادر بدایونی نے قاضی القضاۃ کی صفات عالیہ بیان کرتے ہوئے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ قاضی کو رشوت کو عین فرض سمجھتے تھے اور سود کے بغیر کسی کو قرض نہیں دیتے تھے۔

جب بڑے بڑے عالم، قاضی اور مفتی، شرابخوری کی لعنت میں مبتلا تھے تو پھر حضرت شیخ حسینؒ کی نوشی پر کون گرفت کرتا؟

جہاں یہ صورت حال ہو کہ ”مستاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی“ وہاں ایک وزیر کو اس لئے لاہور بھیجا ہے کہ وہ حضرت شیخ حسینؒ کو داڑھی منڈوانے پر سزا دے۔ اس چہ بوجھ کی است۔

نعت شام عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ”اخبار الاخیار“ میں شیخ حسن بودلہؒ نام کے ایک بااثر کیا ہے، جو دہلی میں رہتے تھے اور اکثر شہر کے گلی کوچوں میں برہنہ پھرا کرتے تھے۔ اب اگر حضرت شیخ بہار دہلویؒ کرتے تھے تو کون انہیں ہدف تنقید بناتا؟ اور حاکمان وقت کس طرح شرعی عدالت قائم کر لیا کرتے؟

نعت شام عبدالحق محدث دہلویؒ نے ایک اور مجذوب بزرگ، شیخ حسنؒ کا ذکر کیا ہے، جو سلطان سکندر لودھی پر غصے سے اب اگر شیخ حسینؒ، مادھو لال کے عشق میں مبتلا تھے تو اس واقعے کی گونج زیادہ سے زیادہ لاہور کی برائیاں دے سکتی تھی۔ ہمارے نزدیک دربار اکبری میں شور مچنا اور آئین اکبری کا حرکت میں آجانا، بعید از

طرح غفلت نہ تھے، داراشکوہ کی روایت بھی بے اعتبار ہے، جو حضرت شیخ حسینؒ کو لامتنیہ کا سردار کہا



ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کے زمانے میں مخدوم الملک، قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے۔ مخدوم الملک بہت نے جو صاحب کردار بھی تھے اور اپنے دل میں ملت اسلامیہ کا درو بھی رکھتے تھے، ایک دن انتہائی بے ہوشی میں ملے۔

آپ کے دور اقتدار میں اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا جا رہا ہے اور آپ خاموش تماشا بنے ہوئے ہیں۔“
 مجلس میں دیگر شرکائے لاہور بھی موجود تھے۔ قاضی مخدوم الملک کو اپنے دوست کی یہ بے تکلفانہ تنقید بے حد رنجی۔ ”یہ شخص الزام تراشی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔“ قاضی صاحب نے نہایت تلخ لہجے میں جواب دیا۔
 ”اب آپ نہیں جانتے کہ لاہور میں حسین نامی فقیر خود کو مسلمان کہتا ہے..... مگر نہ نماز ادا کرتا ہے اور نہ روزہ نہ آپ اسے سزا کیوں نہیں دیتے؟“ مخدوم الملک کے دوست نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
 ”یہاں شہر لاہور میں بہت سے لوگ مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں۔ با آواز بلند کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں..... مگر نہیں کرتے اور روزہ بھی نہیں رکھتے۔ پھر کیا میں ان سب کے پیچھے تلوار لے کر پھروں؟“ قاضی القضاۃ مخدوم نے اپنی ذات کو بچانے کے لئے پُر زور لہجے میں ایک عقلی دلیل پیش کی۔ ”جگہ جگہ وعظ کی مجالس آراستہ کی ہیں۔ مذکور خدا کو نماز اور روزہ کے فوائد سمجھائے جاتے ہیں۔ پھر بھی مساجد خالی رہتی ہیں اور لوگ بھوک اور بدانتظامی کا دھل ہے؟“ مخدوم الملک نے اُلٹا اپنے بدانتظامی کا ہدف بنا ڈالا۔

”روزہ نہ رکھنا کارِ دیگر ہے..... اور رمضان المبارک کے مہینے میں شاہراہوں پر کھانا پینا امرِ دیگر۔“ دوست نے انداز میں قاضی صاحب کی گرفت کی۔

”یہ ٹک! ایسا شخص سزا کا مستحق ہے۔“ قاضی القضاۃ، مخدوم الملک نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”میں نے عمال (پلی مارٹن) کو حکم دے دیا ہے کہ اگر کوئی فرد اس طرح روزہ کھنی کرتا ہے تو اسے میری عدالت میں لایا جائے۔“

”نعت شام حسینؒ برسوں سے اسی طرح نہ صرف بازاروں میں کھاتا پیتا ہے بلکہ ڈھول کی تھاپ پر رقص بھی کرتا۔“ قاضی صاحب کے دوست نے حضرت شیخ حسینؒ کے معمولات کا نقشہ مؤثر انداز میں کھینچتے ہوئے کہا۔ ”پھر

اسے آج تک آپ کی عدالت میں کیوں نہیں لایا گیا؟ جب ایک عام مسلمان، فرائض ترک کرتا ہے تو اسے اسی کی ذات کو نقصان پہنچتا ہے..... مگر جب کوئی شخص ولایت کا دعویٰ ارہو اور شہر میں اس کے ہزاروں مشہور موجود ہوں تو پھر گمراہی کی مہلک دبا چیل جاتی ہے..... اور آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔“

قاضی صاحب، لا جواب سے ہو گئے۔ مگر پھر بھی انہوں نے اپنے عہدہ و منصب کا بھرم رکھنے کے لئے کاسہارا لیا۔ ”اگر میں اپنی آنکھوں سے اس فقیر کو یہ خلاف شریعت عمل کرتے ہوئے دیکھ لوں تو سزا دینے نہیں چھوڑوں گا۔“

اتفاق سے وہ رمضان ہی کا مہینہ تھا..... اور دوسرے دن ہی حضرت شیخ حسین بازار میں روٹی کھاتے پائے گئے۔ پھر انہوں نے حسب معمول رقص شروع کر دیا۔ حضرت شیخ حسین کا نو مسلم مرید مادھو لال بھی ساتھ تھا۔

مخدوم الملک کو اسی وقت خبر دی گئی۔ قاضی القضاۃ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر گھوڑے پر سوار اپنے راقص لے کر اس بازار میں پہنچے، جہاں حضرت شیخ حسین، مادھو لال کے ساتھ والہانہ انداز میں رقص کر رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔

پھر جیسے ہی قاضی القضاۃ مخدوم الملک بازار میں داخل ہوئے، حضرت شیخ حسین نے آنکھیں کھلیں دوڑتے ہوئے پہنچے اور مخدوم الملک کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

وہاں موجود تمام لوگ جو رقص کے تماشا شائق تھے، حضرت شیخ حسین کے اس بے باکانہ عمل پر دم بخور گئے۔ ”قاضی صاحب! آپ مجھے کس گناہ کی سزا دینے آئے ہیں؟“ حضرت شیخ حسین کی پُر جلال آواز اٹھی۔ مخدوم الملک نے حضرت شیخ حسین کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ان لوگوں سے سوال کیا کہ موجود تھے۔

”کیا تم نے اس فقیر کو، جو ولایت کا دعویٰ رکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے روٹی کھاتے دیکھا؟“ لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے حضرت شیخ حسین روٹی کھا رہے تھے۔ ”کیا کبھی تم لوگوں نے اس ولی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا؟“ قاضی القضاۃ مخدوم الملک کے لہجے نے ابھی جھلک رہی تھی اور غصہ بھی۔

بازار میں بہت سی آوازیں گونجیں..... قاضی صاحب کے سوال کا جواب نفی میں تھا۔ ”اے مدعی ولایت! تُو نے اپنے گناہ کے بارے میں گواہیاں سن لیں؟“ مخدوم الملک کا لہجہ غضب ناک۔ حضرت شیخ حسین قاضی القضاۃ کے مظاہرہ اقتدار سے ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئے۔ آپ نے مخدوم الملک کے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے فرمایا۔ ”قاضی صاحب! شہادتیں بھی مل گئیں اور میرا گناہ بھی ثابت ہو گیا۔ کیا میں سزا سے پہلے ایک اور سوال کا حق رکھتا ہوں؟“

”اجازت ہے۔“ مخدوم الملک کے لہجے سے رعونت نمایاں تھی۔

”اے اسلامی قانون کے جاننے والے! اے قاضی القضاۃ! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اسلامی شریعت کے ارکان ہیں؟“ حضرت شیخ حسین نے اسی پُر جلال لہجے میں مخدوم الملک سے سوال کیا۔

قاضی القضاۃ، حضرت شیخ حسین کے استفسار پر مسکرایا کہ اس سوال کا جواب تو ایک مسلمان کا کم سن بچہ بھی دے گا۔ تاہم مخدوم الملک نے بلند آواز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”توحید و رسالت کا اقرار، نماز، روزہ، زکوٰۃ“

”یہاں ارکان ہیں، جن سے ایمان مکمل ہوتا ہے۔“

”قاضی صاحب! اسلام کا پہلا اور بنیادی رکن توحید و رسالت کا اقرار ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ..... اس نیاپ اور میں دونوں شریک ہیں۔ رہے دو ارکان حج اور زکوٰۃ، وہ آپ نے چھوڑ دیے۔ باقی دو نماز اور روزہ میں نازل کر دیے۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دو ارکان شریعت کا تارک حسین تو سزا کا مستحق ٹھہرے..... اور آپ ٹوڑ دیں۔ مجھے سزا دینے کے لئے کسی ایسے شخص کو بھیجے جو شریعت کے پانچوں ارکان پر عمل کرتا ہو۔“

روایت ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کا جواب سن کر قاضی مخدوم الملک کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اپنے گھوڑے کی لہری اور واپس چلے گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی حضرت شیخ حسینؒ کے طرز عمل پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

کم و بیش تمام تذکرہ نگاروں نے اس روایت کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے..... مگر اندازِ بیاں سے ظاہر ہوتا ہے یہ عقیدہ، حضرت شیخ حسینؒ کے ترک روزہ و نماز کو ایک ملامتی فقیر کی فتح..... اور ترک حج و زکوٰۃ کو قاضی القضاۃ ہشت بھٹتے ہیں۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ حسینؒ کی جس قدر روایات و واقعات بیان کئے ہیں، ان میں سے اکثر شریعت و سنت سے متصادم ہیں۔ مخدوم الملک کا یہ واقعہ بھی اسی زبے دارانہ روش کی مثال ہے۔

کچھ اور کے لئے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ قاضی القضاۃ سے دو ارکان شریعت ساقط ہو رہے تھے..... مگر نہ شیخ حسینؒ جیسے عالم و فاضل بزرگ، ترک نماز کا یہ جواز پیش نہیں کر سکتے تھے۔ معتقدین کہہ سکتے ہیں کہ وہ بدعات سے گزرے تھے، اس لئے اہل دنیا کو دکھانے کی غرض سے یہ دلیل پیش کی۔ اگر ہم اسی اندازہ و قیاس بنیاد پر بات کو آگے بڑھائیں، تب بھی ایک تشکی اور کی باقی رہ جاتی ہے۔

حضرت شیخ حسینؒ سے یہ دو ارکان شریعت نماز اور روزہ ساقط ہو رہے تھے..... اور قاضی مخدوم الملک سے حج و زکوٰۃ اسی کو بنیاد بنا کر حضرت شیخ حسینؒ نے قاضی صاحب کی گرفت کی اور سوال اٹھایا کہ جب ارکان شریعت کرنے میں دونوں برابر کے مجرم ہیں تو پھر ایک شخص سزا کا مستحق کیوں قرار پایا؟ دوسرے الفاظ میں مخدوم الملک اتنے ہی بڑے مجرم تھے اور انہیں خود ہی اپنے آپ کو سزا دینی چاہئے تھی۔

ان روایات کی کمزوری یہ ہے کہ بے شک حج اور زکوٰۃ اسلامی شریعت کے اہم ارکان ہیں..... مگر نماز اور روزہ کو بہ نسبت حاصل ہے۔ درجہ بندی کے اعتبار سے نماز اور روزہ پہلے آتے ہیں..... حج اور زکوٰۃ بعد میں۔ اصولی پر ہونا یہ چاہئے تھا کہ قاضی القضاۃ، مخدوم الملک بھی تارک روزہ و نماز ہوتے۔ پھر حضرت شیخ حسینؒ اسے بنیاد پر ترک روزہ و نماز کا جواز پیش کرتے اور قاضی صاحب کو لائقِ تعزیر قرار دیتے۔

حج ایک ایسی عبادت ہے، جو تمام انسانی حقوق ادا کرنے کے بعد فرض ہوتی ہے۔ حضرت شیخ حسینؒ کے راسخ سے پتہ چلتا ہے کہ عہدے پر فائز ہونے کے سبب مخدوم الملک کی مالی حیثیت بہت زیادہ مستحکم تھی..... اور زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے۔ حضرت شیخ حسینؒ نے قاضی صاحب کی ان ہی دونوں کمزوریوں کو مجمع عام میں مار دیا..... اور شرعی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے چیف جسٹس کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

”جب ہم دونوں مجرم ہیں تو پھر ایک کو سزا کس لئے؟“

ان روایات کا ایک ایسی پہلو قابلِ اعتبار ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ مردِ بے باک تھے..... اور آپ نے جرأتِ ناک آئینے میں حاکم وقت کو اس کا حقیقی چہرہ دکھا دیا تھا۔

ان واقعات سے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کا دور کیسی بے راہ روی کا دور تھا۔

جہاں شرعی عدالتوں کے بعض نگہبان بے دریغ شراب پیتے ہوں اور مخدوم الملک جیسے لوگ صاحب نصاب ہیں کے باوجود زکوٰۃ ادا نہ کرتے ہوں، وہاں انہیں ”قاضی القضاۃ“ کے اہم، حساس اور محترم عہدے پر بٹھا کر آڑھ ہاتھ دیا جاتا تھا۔



تمام تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ حسینؒ کا ذکر چار ناموں سے کیا ہے۔ پہلا شیخ حسینؒ، یہ نام بہت کم نگاروں میں نظر آتا ہے۔ ہم نے اسی نام کو ترجیح دی ہے۔

دوسرا شاہ حسینؒ، یہ نام عام ہے۔ تصوف کی رعایت سے اکثر بزرگوں کے اسمائے گرامی کے ساتھ ”شاہ“ لقب وابستہ کر دیا جاتا ہے۔

تیسرا لال حسینؒ، اس میں ”لال“ مادھو کے نام کا حصہ ہے، جو سلسلہ قادریہ کے ایک جانا بزرگ کے نام کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

روایتی تذکرہ نویسوں نے اپنی کتابوں میں حضرت شیخ حسینؒ کو ”مادھو لال حسینؒ“ کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور اس کی عالمانہ توجیہ پیش کی ہے کہ دونوں بزرگ اپنی زندگی میں ایک تھے..... مرنے کے بعد ایک ہی قبر میں قریب قریب مدفون ہوئے..... اس لئے کتابوں میں بھی دونوں کے ناموں کو یکجا کر دیا گیا۔

ہمارے نزدیک یہ توجیہ کستا خانہ ہے۔ پہلی بار جب کوئی تاریخ کا طالب علم ”مادھو لال حسینؒ“ کا نام دیکھتا تو نہایت حیرت و استعجاب کا اظہار کرتا ہے کہ یہ کیا نام ہے، جس کا بڑا حصہ ہندوؤں کی تہذیب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غالباً اس کو تاہی کا ارتکاب اس لئے ہوا کہ پنجاب اور سندھ میں کچھ عشقیہ لوک داستانیں مشہور ہیں۔ مثلاً راجھا، سکی پنوں، نور جام تماچی اور نوشہرہ فیروز وغیرہ۔ ایران اور مشرق وسطیٰ کے حوالے سے شیریں فریاد اور مجنوں بھی اسی انداز کے عشقیہ افسانے ہیں۔ چونکہ ہمارے بیشتر تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ حسینؒ کو جلال خانہ دکھایا ہے..... اور مادھو لال کو ایک صوفی کا محبوب قرار دیا ہے، اس لئے ایک عام سی عشقیہ داستان کے طور پر دونوں ناموں کو ایک دوسرے کا حصہ بنا دیا ہے۔

تمام عشقیہ لوک داستانوں میں ”محبوب“ کا نام پہلے آتا ہے، اس لئے تذکرہ نگاروں نے بھی مادھو لال کے کو اذیت دی۔

اب ہم شیخ مادھو لال کا ذکر کریں گے، جو ایک مسلمان دردیش کی نگاہ کیسی تاثیر سے خود بھی اکسیر بن گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں آنے والے تاریخ نویسوں، ادیبوں اور شاعروں نے ”مادھو“ کو ایک دیوبالی کردار کر رکھ دیا ہے۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ تبدیلی مذہب کے باوجود مادھو لال نے اپنا آبائی اور ہندوؤں کا نام تبدیل نہیں کیا۔ اور تادم مرگ اسی نام سے پہچانے گئے۔ قبول اسلام کے بعد مادھو لال کے ماں باپ تو مایوس ہو کر بیٹھ گئے..... ہندو مذہب کے اجارہ دار برہمن پنڈت اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آئے۔ بت پرستوں کا یہ گروہ حضرت حسینؒ کے درپے ایذا رہا..... مگر جب ان کے منصوبے ان ہی پر اُلٹ گئے تو وہ مادھو لال کے خلاف صف آرا گئے۔ جان سے مار دینے کی دھمکیاں تو پہلے ہی غیر موثر ہو چکی تھیں۔ بہت سے ہندو غنڈوں کو مادھو لال کے قتل آمادہ کیا گیا..... مگر یہاں بھی حضرت شیخ حسینؒ کی دعائیں اُن کی ڈھال بن گئیں۔ انجام کار برہمن پنڈت منصوبہ بندیوں میں ناکام ہوئے اور پھر مادھو لال کا تعاقب چھوڑ دیا گیا۔

ہونے لگا۔ مادھو لال کی استقامت بھی لائق تعریف ہے۔ جان کے زیاں کا خوف بھی شیخ مادھو کو اسلام کے چھوڑنے پر نہ مائل کیا۔

اسلام کے دو ماہ بعد ہولی اور بسنت کا تہوار آیا۔ شیخ مادھو نے اٹھارہ سال کی عمر میں نیا دین اختیار کیا تھا، جس سے لے کر نو جوانی تک ہولی، دیوالی اور بسنت جیسے تہواروں سے بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ ہولی کا دلچسپ مزاج ہندو لاہور کے گلی کوچوں میں رنگ کی پچکاریاں چھوڑ رہے تھے، ایک دوسرے کے چہروں کو رنگین بنا رہے تھے تو شیخ مادھو کو ایک خلش اور کمی کا احساس ہوا، جس کے زیر اثر وہ اداس نظر

آئے۔ حضرت شیخ حسینؒ نے مادھو لال کی اُداسی کا یہ رنگ دیکھا تو اپنے مریدوں اور خدمت گاروں کو مختلف رنگ کا لکھوا دیا۔

دن اور خدام نے پیر و مرشد کا حکم بڑی حیرت سے سنا، مگر کسی میں استفسار کی جرأت نہیں تھی۔ بازار سے لے کر گھر تک اور الگ الگ طباقوں میں رکھ کر حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔ شیخ مادھو، پیر و مرشد کے سامنے موجود تھے۔ حضرت شیخ حسینؒ نے مٹھی بھر کر شیخ مادھو پر رنگ پھینکا۔ شیخ پیر و مرشد کی محبت کا یہ رنگ دیکھا تو خود بھی دارفتہ ہو گئے۔ اور مٹھیاں بھر بھر کر حضرت شیخ حسینؒ پر رنگ لگائیں۔ ایک مسلمان صوفی کی خانقاہ میں ہولی کا تہوار منایا جانے لگا۔

روایت کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ نے صرف اپنے محبوب مرید، شیخ مادھو کی دلداری کے لئے ہولی کھیلی۔ ہولی روایت ہے کہ جب ہولی کا تہوار آیا تو شیخ مادھو نے بازار سے رنگ خریدے..... اور اپنی محبوبیت کا اظہار کیا۔ حضرت شیخ حسینؒ کے لباس کو گلال سے رنگ دیا۔ گلال ایک مخصوص رنگ ہوتا ہے، جو عام طور پر

دن استعمال ہوتا ہے۔ ہولی روایتوں کے مطابق شیخ مادھو نے حضرت شیخ حسینؒ کی ریش مبارک بھی ہولی کے رنگوں سے رنگ دی۔ یہ کہ جب شیخ مادھو، حضرت شیخ حسینؒ کے حلقہ بیعت میں شامل ہوئے تھے، اس وقت حضرت شیخ حسینؒ اپنے بچوں کے ساتھ اپنی بھنویں بھی منڈا دیا کرتے تھے، اس لئے روایت کا یہ حصہ ضعیف ہے۔

حضرت شیخ حسینؒ کی خانقاہ میں جی بھر کے ہولی کھیلی گئی۔ ایک روایت کے مطابق جب حضرت شیخ حسینؒ نے ہولی کے دن شیخ مادھو کو اداس دیکھا تو آپ نے فوری طور پر خانقاہ میں محفل رقص و سماع منعقد کیا اور مستی کے عالم میں ایک دوسرے پر رنگ ڈالنے لگے۔

اس محفل رقص و سماع میں شیخ مادھو کے علاوہ حضرت شیخ حسینؒ کے دیگر خلفاء میاں شعبان، شیخ ابراہیم، میاں نور علی، محبوب، بہار خان، شعبان ثانی، شیخ عبدالسلام، شیخ شہاب الدین، شیخ کالو، شیخ یاسین اور شیخ صالح بھی ایک تھے۔ یہ تمام حضرات اپنے پیر و مرشد کی اتباع کرتے ہوئے اس محفل رقص و سماع میں شریک ہوئے..... اور دوسرے پر رنگ پھینکنے لگے۔

اس دن کے بعد سے آج تک یہ رسم جاری ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کے مرید بسنت کے دن مزار مبارک پر جا کر گلال (ہولی کا مخصوص رنگ) پھینکتے ہیں۔

”ابوہائے لاہور“ کے مؤلف نے اس غیر اسلامی رسم کو بڑی عقیدت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔
”اس واقعے کے بعد جب تک حضرت شیخ حسینؒ حیات رہے، ہر سال بسنت کے دن خوشی فرمایا کرتے تھے۔“

اسی برکت سے اب تک بسنت کے روز ان کے مزار پر سرود و سماع اور رقص و رنگ اندازی ہوتی ہے۔
 ”اولیائے لاہور“ ہی کی یہ روایت بھی ہے کہ بسنت کے دن رنگ کھیلنے کے دوران حضرت شیخ حسینؒ کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے۔

”مادھو! تیرے ان لواحقین کی بسنت چند روزہ ہے..... اور ہماری تمہاری بسنت ناقیامت قائم رہے گی۔
 یہاں لواحقین سے مراد شیخ مادھو کے سابقہ ہم مذہبوں یعنی ہندوؤں سے ہے۔



”اولیائے لاہور“ ہی کی ایک اور روایت حضرت شیخ حسینؒ کے کمالات روحانی کو ظاہر کرتی ہے..... گویا آغاز و انجام بھی دیگر روایتوں کی طرح حضرت شیخ حسینؒ کی شراب نوشی سے ہوتا ہے۔ گویا مرزا غالب کے قول ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

شیخ مادھو کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کرنے کے بعد ایک دن حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے مرید سے فرمایا:
 ”مادھو! آج ہم اور تم ساری دنیا سے الگ ہو کر ایک تنہا مکان میں شراب وحدت پئیں۔ پھر ہم دلوں کو الہی کا مشاہدہ کریں۔“

”نہیں حضرت! اس میں خوف رسوائی ہے۔“ شیخ مادھو نے پیر و مرشد کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔
 ”کیا خوف رسوائی؟“ حضرت شیخ حسینؒ نے حیرت سے پوچھا۔
 ”اہل دنیا کیا کہیں گے؟“ شیخ مادھو نے اپنے انکار کی وجہ بیان کی۔

”تجھے اہل دنیا کا اتنا خوف ہے؟“ حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے مرید کا انکار سن کر ہر جلال لے کر فرمایا:
 ”مجھے نہیں دیکھا کہ میں ساری دنیا کی تہمتوں کا بار اٹھا کر سر بازار رقص کرتا ہوں۔“
 آخر شیخ مادھو راضی ہو گئے۔ پھر حضرت شیخ حسینؒ انہیں لے کر ”بابو پورہ“ کے ایک مکان میں پہنچے۔
 حضرت شیخ حسینؒ کے ایک مرید، بابو نے آباد کیا تھا۔ یہی بابو پورہ، موجودہ پاکستان میں ”باغبانپورہ“ کے نام سے مشہور ہے۔

”اولیائے لاہور“ کی روایت کے مطابق یہاں بیٹھ کر حضرت شیخ حسینؒ نے شراب پی..... اور پھر اسی کیف و مستی میں شیخ مادھو کو واصلِ جنت کر دیا۔ پہلے ایک بت پرست کے ماتھے سے نقشے (چھاپ ٹک) لگا کر کھرچا..... اور پھر دل سے بھی یادِ صنم مٹا ڈالی۔ اور شیخ مادھو کو کسی محنت و مشقت کے بغیر ولی کامل بنا دیا۔

جس طرح دنیوی علوم کے ماہرین بڑے سے بڑے عقدے کو لکھوں میں حل کر دیتے ہیں، اسی طرح ہر تصوف میں بھی فیض روحانی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں..... مگر ”اولیائے لاہور“ کی اس روایت کا کردار پہلے کہ ایک خاص واقعے کو انتہائی عامیانہ انداز میں رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شیخ مادھو، حضرت شیخ کے حوالے سے پہلے ہی ہندو اور مسلمان، دونوں حلقوں میں بدنام ہو چکا تھا۔ پھر اس نے اپنے پیر و مرشد کے خلاف رسوائی کا اظہار کیوں کیا؟

ایک طرف ہمارے تذکرہ نگار، شیخ مادھو کو مرید صادق کہتے ہیں۔ اور دوسری طرف اسے حضرت شیخ کے سامنے انکار کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ یہ تضاد بیانی ہی روایت کے ضعف کو ظاہر کرتی ہے۔



رومانیت کی تکمیل کے بعد حضرت شیخ حسینؒ نے شیخ مادھو کو راجہ مان سنگھ کی ملازمت کرنے کا حکم دیا۔ راجہ مان سنگھ شاہنشاہ جلال الدین اکبر کے مشہور امراء میں سے تھا۔ اعجاز الحق قدوسی صاحب نے ”صوفیائے پنجاب“ میں راجہ مان سنگھ کے متعلق تحریر کیا ہے کہ اس کی بہن شہزادہ سلیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس رشتے سے راجہ مان سنگھ، شہنشاہ جہانگیر کا سالار (برادر نسبی) تھا۔ ہمارے خیال میں یہ کتابت کی غلطی ہے..... ورنہ مغل تاریخ کا ایک طالب علم بھی ہوتا ہے کہ شاہنشاہ اکبر نے راجہ مان سنگھ کی حقیقی بہن، مہارانی جودھا بائی سے شادی کی تھی..... اور شہزادہ سلیم کا سگا باپ تھا۔

جن دنوں حضرت شیخ حسینؒ نے شیخ مادھو کو ملازمت کا حکم دیا، راجہ مان سنگھ لاہور میں تھا۔ برادر شد کا حکم سن کر شیخ مادھو اُداس ہو گئے۔ جب حضرت شیخ حسینؒ نے اُداسی کا سبب دریافت کیا تو شیخ مادھو فریاد میں کہنے لگے۔ ”پیر و مرشد کے بعد مجھ سے کسی غیر کی غلامی نہیں ہو سکتی۔“

”ہمارے محبوب کسی کے غلام نہیں ہوتے۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے نہایت وارفتگی کے عالم میں فرمایا۔ ”تم بظاہر راجہ مان سنگھ کے ملازم ہو گے، مگر ورنہ اس پر حکومت کرو گے۔“

شیخ مادھو نے دوسرا عند تر اشا۔ ”مجھ سے یہ جدائی برداشت نہیں ہوگی۔“

”انسان کو وصل کی قدر و قیمت اسی وقت معلوم ہوتی ہے، جب وہ صدمہ فراق سے دوچار ہو جائے۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے فرمایا۔ ”مادھو! تیرا وہاں چلا جانا ہی بہتر ہے۔“

حضرت شیخ حسینؒ جو خود کبھی ایک لمحے کی جدائی برداشت نہیں کرتے تھے اور مادھو لال کے پیچھے مارے مارے لڑتے تھے، اب وہی محبوب مرید کو اپنے آپ سے جدا ہونے کا حکم دے رہے تھے۔ شیخ مادھو ”فراق اور فاصلے“ کو ناہل کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے..... مگر یہ سب کچھ ان کی روحانی تربیت کے لئے تھا۔

آخر مرشد کے حکم سے مجبور ہو کر شیخ مادھو نے راجہ مان سنگھ کی ملازمت اختیار کر لی۔ پھر بھی فرائض کی بجا آوری کے بعد جو قہورِ اہمیت وقت ملتا تھا، شیخ مادھو ان لمحات کو حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں گزارتا تھا۔ برق رفتار ٹھوڑے ہوا آتا..... اور پیر و مرشد کا دیدار کر کے واپس چلا جاتا۔

یہ عارضی ملاقاتیں بھی چند روزہ تھیں۔ راجہ مان سنگھ اپنے کام سے فارغ ہو کر دہلی چلا گیا۔ شیخ مادھو لاہور سے لی جاتے وقت بہت روئے۔ مگر حضرت شیخ حسینؒ نے انہیں یہ کہہ کر تسلی دی۔

”بظاہر لاہور اور دہلی میں بہت فاصلہ ہے..... مگر دلوں کی گزرگاہ بہت مختصر ہے۔ میں تم سے دور نہیں رہوں گا۔ بلکہ مجھے اپنے قریب ہی پاؤں گے۔“



راجہ مان سنگھ نے ابھی چند روز ہی دہلی میں گزارے تھے کہ آگرہ سے فرمانِ شاهی آ پہنچا..... جلال الدین اکبر نے اسے صاف صاف تحریر کیا تھا۔

”مان سنگھ! ہمارے مخبروں کی اطلاعات کے مطابق دکن میں شدید بغاوت کے آثار ہیں۔ تم فوراً وہاں پہنچو اور بائیں کی اس طرح سرکوبی کرو کہ سلطنت مغلیہ ہمیشہ تمہاری خدمات کو یاد رکھے۔“ راجہ مان سنگھ نے فوری طور پر جنگی منصوبہ بندی کی..... اور ایک لشکر کثیر لے کر دکن کی طرف روانہ ہوا۔ شیخ مادھو بھی ایک ملازم کی حیثیت سے اس کے ہمراہ تھے۔

”اولیائے لاہور“ کی روایت کے مطابق راجہ مان سنگھ، درویشوں کے حال سے بے خبر تھا..... اور شیخ مادھو کو

ایک عام خدمت گار سمجھتا تھا۔

پھر جب باغیوں سے جنگ چھڑی تو راجہ مان سنگھ ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک سخت ترین فوجی ہم ہے۔ کرنا بہت مشکل ہے۔ پہلا دن تو مزاحمت میں گزر گیا..... مگر دوسرے روز راجہ مان سنگھ کی فوجوں میں ہلاکت گئی۔ بس چند گھنٹوں کی بات تھی..... اگر کچھ دیر اور اسی طرح باغیوں کی یلغار رہتی تو اکبری فوجیں میدان جنگ سے فرار ہو جاتیں۔

بساط کا زار اُلٹتے دیکھ کر راجہ مان سنگھ بدحواس ہو گیا۔ اسے اپنا قصر امارت منہدم ہوتا نظر آیا۔ بھارتی وحشت میں راجہ مان سنگھ نے شیخ مادھو سے کہا۔

”یہی امداد کا وقت ہے۔ اگر یہ گزر گیا تو عزت و جاہ اور عہدہ و منصب کچھ نہیں بچے گا۔ اگر تو فقیر بہتر مدد کر۔“

شیخ مادھو کو راجہ مان سنگھ کے حال زار پر رحم آیا..... اور آپ نے باطنی طور پر متوجہ ہو کر اپنے پیروں کے درمیان شیخ حسین سے روحانی امداد طلب کی۔

”اولیائے لاہور“ کی اس روایت کا بنیادی سقم یہ ہے کہ تذکرہ گار ایک طرف راجہ مان سنگھ کو شیخ حسین کی حیثیت سے بے خبر ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف جب شاہی فوجوں کو شکست ہوئے لگتی ہے تو راجہ مان سنگھ کو فقیر سمجھ کر ان سے روحانی امداد طلب کرتا ہے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی توازن اور رابطہ نہیں ہے۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ جب شاہی افواج، میدان سے فرار ہونے کے بارے میں سوچنے لگیں تو اس دن انہیں منظر کے تصور سے شیخ مادھو کو شدید اذیت پہنچی۔ وہ اوّل و آخر سرکاری ملازم تھے اور حق نمک خواری کے زرائع بادشاہ کی شکست برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ شیخ مادھو اپنی شمشیر باز کے اکیلے میدان جنگ میں گود پڑتے..... اور تنہا باغیوں کے لشکر پر غالب آجاتے..... غرض شیخ مادھو کی اذیت و کشمکش سے دوچار تھے..... اور میدان جنگ کے ایک گوشے میں تصویر رنج و غم بنے کھڑے تھے۔ آخر کار حضرت شیخ حسینؒ کے وہ الفاظ یاد آئے، جو پیر و مرشد نے رخصت کرتے وقت فرمائے تھے۔

”میں تم سے دور نہیں ہوں گا..... ہمیشہ مجھے اپنے قریب ہی پاؤ گے۔“

فرمودات مرشد کے یاد آتے ہی شیخ مادھو کے بجھتے ہوئے ذہن میں ایک برق سی کوندی۔ پھر آپ نے لاہور کی طرف رخ کر کے نہایت دردناک لہجے میں اپنے پیر و مرشد کو پکارا۔

”شیخ! اس وقت آپ کا مادھو شدید اذیت میں مبتلا ہے۔ خدا را اس کی مدد کو آئیے۔“

جس وقت شیخ مادھو نے دکن کے میدان جنگ سے اپنے مرشد کو آواز دی تھی، اس وقت حضرت شیخ حسینؒ میں اپنے دوستوں کے ساتھ عیش و طرب میں مشغول تھے۔

ایک ایک حضرت شیخ حسینؒ اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ کے چہرہ مبارک پر انتہائی فکر و پریشانی کے آثار نظر آئے تھے۔

”شیخ! آپ کا چہرہ اچانک متغیر کیوں ہو گیا؟“ دوستوں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جب مادھو، تکلیف سے دوچار ہے تو پھر میری طبیعت کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے؟ میں ابھی آتا ہوں۔“ حضرت شیخ حسینؒ نے انتہائی کرب ناک لہجے میں فرمایا اور بہت تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئے۔

”تمام دوست حیران و سرگرداں تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔“ شیخ مادھو تو دکن میں ہیں.....

انہوں نے بہت ہی دور ہے۔“ دوستوں کی حیرت کا مفہوم یہ تھا کہ شیخ حسینؑ، مادھو کی تکلیف دور کرنے کے لیے اصول فاصلہ کس طرح طے کر سکتے ہیں؟

نٹاؤ میدان جنگ کے ایک گوشے میں سر جھکائے غم زدہ بیٹھے تھے..... اور اکبری فوجیں تیزی سے پیچھے ہٹ رہی تھیں۔

”ابو! کیا ایک شیخ مادھوؑ نے ایک مانوس آواز سنی اور گھبرا کر اپنے سامنے کی طرف دیکھا۔ حضرت شیخ حسینؑ دو کانٹے پر کھڑے تھے۔ شیخ مادھوؑ دو بانہ دار اٹھے اور پیر و مرشد کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگے۔

حضرت شیخ حسینؑ نے بے قرار ہو کر اپنے محبوب مرید کو اٹھایا اور رونے کا سبب پوچھا۔

”بادشاہ کی فوجوں کو شکست ہونے والی ہے..... اور غم یہ ہے کہ اس لشکر میں آپ کا مادھو بھی شامل ہے۔“ شیخ نے رات آئینہ لہجے میں کہا۔

حضرت شیخ حسینؑ نے مضطرب ہو کر مادھو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور نہایت جذب کے عالم میں فرمایا۔

”لشکر میں میرا مادھو شامل ہے، اسے بفضل خدا کبھی شکست نہیں ہوگی۔“

یہ کہہ کر حضرت شیخ حسینؑ نے شیخ مادھوؑ کو ہدایت کی۔ ”راجہ مان سنگھ سے کہو کہ وہ دوبارہ اپنی صفیں درست کرے..... اور پوری شدت سے دشمن پر دوبارہ حملہ کرے..... مگر خود آسمان پر نظر رکھے۔“

ان ہدایت کے بعد حضرت شیخ حسینؑ، شیخ مادھوؑ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

بلجرب راجہ مان سنگھ نے دوبارہ جنگ شروع کی اور شیخ مادھوؑ کی ہدایت کے مطابق آسمان کی طرف دیکھا تو عجیب منظر دکھائی دیا۔

ہوا آسمان، قلندروں کی فوج سے بھرا ہوا تھا۔ ہر قلندر کے ہاتھ میں شمشیر بے نیام تھی..... اور وہ دشمن کے پہلوؤں کو قتل کر رہا تھا۔

فوجی ہی دیر میں نقشہء جنگ بدل گیا۔ باغیوں کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ جب میدان خالی ہو گیا تو راجہ مان سنگھ نے شیخ مادھوؑ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

”آج سے میں آپ کا غلام ہوں۔“

نٹاؤ میدان بے نیاز نہ کہا۔ ”جب تک تم ہمارے حال سے بے خبر تھے، ہمارا یہاں رہنا مناسب تھا۔ اب مجھے رات دو کہ میں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری دوں۔ پھر اگر شیخ فرمائیں گے تو میں دوبارہ تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“

دراصل یہ حضرت شیخ حسینؑ کی کرامت تھی۔ مگر راجہ مان سنگھ اس فتح کو شیخ مادھوؑ کی دعاؤں کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ اس رائے کی بہت کوشش کی، مگر شیخ مادھوؑ نے راجہ مان سنگھ کی کسی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ اور حضرت شیخ حسینؑ کی بات میں حاضر ہو گئے۔



جب حضرت شیخ حسینؑ نے کوچہء ملامت میں قدم رکھا تھا، اس وقت آپ کی عمر مبارک 36 سال تھی۔ اور اس ناپ اپنی زندگی کے 63 ویں سال سے گزر رہے تھے۔ گویا مسلسل 29 سال حضرت شیخ حسینؑ پر سنگ ملامت

نہی کر برداشت کرتے رہے۔ وہ کون سی زبان تھی، جو حضرت شیخ حسینؑ کے خلاف دراز نہیں ہوئی تھی..... اور وہ نہ ہاتھ تھا، جس نے آپ کے جسم ناتواں پر تازیانہ الزام کے گہرے نشانات نہیں چھوڑے تھے۔ اگر شیخ حسینؑ

کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو آپ سرے پاؤں تک تحقیر اور تنہیک کے نشتروں سے زخمی تھے۔ پھر بھی کبھی اپنے پیارے سے مرہم کے طالب نہیں ہوئے۔ میر تقی میر کا ایک عجیب شعر ہے۔

شمع پہ ایک رات یہ بھاری ہے جس طرح
ہم نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

ایک معمولی سی تنقید پر انسان چراغ پا ہو جاتا ہے۔ مگر جہاں تنقیس اور عیب تراشی کا سلسلہ شروع ہو جائے، وہاں لوگ دست و گریباں ہو جاتے ہیں۔ قطع تعلق بھی کر لیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی آمادہ قتل بھی ہو جاتے ہیں۔ کئی ملامت میں ایک دن گزارنا مشکل ہو جاتا ہے، نہ کہ پاؤں صدی سے زیادہ کا عرصہ۔ یہ حضرت شیخ حسینؒ ہی کا حوالہ تھا کہ آپ ایک سرد جانناز بھی تھے..... اور عاشق سرفروش بھی..... مگر ہر صبح کا انجام شام..... اور ہر شور و غش کا اختتام سکوتِ پیہم..... اور مسلسل سناٹا۔

اول و آخر فنا ، باطن و ظاہر فنا

نقشِ کہن ہو کہ نو منزل ، آخر فنا

حضرت شیخ حسینؒ بھی اس خارزارِ حیات میں چلتے چلتے تھک گئے تھے۔ یعنی رات بہت تھکے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا۔

یہ 1008ھ کا زمانہ تھا اور جمعے کا دن۔ حضرت شیخ حسینؒ اپنے دوستوں کے ہمراہ دریائے راوی کی سرکھلے۔ اس وقت خلاف توقع آپ کے ہاتھوں میں تیر و کمان تھے۔ راوی کے کنارے پہنچے، حضرت شیخ حسینؒ نے دبا کے پار دیکھا، پھر کشتی والے سے کہا۔ ”بھائی! ہمیں اُس پار اتار دے۔“

طالع نے اسے اپنی سعادت سمجھا..... اور حضرت شیخ حسینؒ کو ان کے دوستوں کے ساتھ دریا کے پار اتار دیا۔ حضرت شیخ حسینؒ کچھ دیر تک راوی کے کنارے ٹہلتے رہے اور تکلفِ بیانی کے ساتھ دوستوں سے گفتگو کرتے رہے۔ احباب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یاروں کا یار..... فرقہٴ ملائعہ کا سردار، ہوا کے تیز جھونکے کی طرز پر گزر کر چلا جائے گا..... اور نظروں کے سامنے فراقِ دائمی کی بلند دیوار کھنچ جائے گی۔

اچانک حضرت شیخ حسینؒ کے دستِ مبارک کو جنبش ہوئی..... آپ نے کمان کھینچی اور تیر چھوڑ دیا۔ ابھی وہ لوگ حیرت میں مبتلا تھے کہ حضرت شیخ حسینؒ نے ترکش پر دوسرا تیر چڑھایا اور اسے بھی چھوڑ دیا۔ ایک ہی نشانہ تھا۔ دوسرا تیر بھی کم و بیش پہلے تیر کے قریب جا کر گرا۔ اس کے بعد حضرت شیخ حسینؒ نے اسی نشانے پر نہ تیر بھی چھوڑ دیا۔ تیر اندازی کے وقت حضرت شیخ حسینؒ بالکل خاموش تھے۔ جیسے آپ کسی گہری سوچ میں گم ہوں۔ تیسرا تیر چھوڑنے کے بعد حضرت شیخ حسینؒ دوستوں سے مخاطب ہوئے۔ ”جب حقیقی دوست اپنی طرف بلا۔ تو کیا کرنا چاہئے؟“ حضرت شیخ حسینؒ کا لہجہ بہت پُر سوز تھا اور چہرہ مبارک پر انتہائی سنجیدگی کا رنگ نمایاں تھا۔ دوستوں نے نہایت پُر شوق لہجے میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر دوست وصل کے ارادے سے بلائے جان کے ساتھ جانا چاہئے۔“

حضرت شیخ حسینؒ نے دوستوں کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ”تو پھر میرے“

”الفرق؟“ تمام احباب نے شدید حیرت کے عالم میں بیک زبان کہا۔ ”حقیقی دوست، وصل کے لئے ہے، سوہم جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر آپ تیز رفتاری کے ساتھ اس طرف بڑھے، جہاں چھوڑے ہوئے تیوں تیز زب

نہایت صبر، دریائے راوی کی ریت پر قبلہ رو ہو کر لیٹ گئے۔
 بہت دم بخود کھڑے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حضرت شیخ حسینؒ کیا کر رہے ہیں؟
 حضرت شیخ حسینؒ کی پرسوز آواز ابھری۔ آپ نے توحید و رسالت پر گواہی دی اور آنکھیں بند کر لیں۔
 دن کا سفر اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ مرزا محمد رفیع سودا کے بقول۔
 ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
 دنیا سے گزرتا سفر ایسا ہے کہاں کا



دنِ شام حسینؒ کی وفات کے بارے میں ایک اور روایت بھی مشہور ہے۔ ایک دن آپ کچھ دوستوں اور
 اہل خانہ کے ساتھ شاہدرہ کے قریب ایک مقام پر تشریف لے گئے۔ دوستوں کا خیال تھا کہ آپ حسب معمول
 باتے لے لگے ہیں..... مگر اچانک ایک ایسی جگہ ٹھہر گئے، جو غیر آباد اور دیران تھی۔ حضرت شیخ حسینؒ کچھ
 ناظرین کو بہت غور سے دیکھتے رہے، پھر ہاتھ کے اشارے سے احباب اور خدام کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
 ”یہ لوگوں کو پہچان لو۔ یہاں ہماری آخری آرام گاہ بنے گی۔“

فانی آرام گاہ کا مطلب قبر تھا۔ اور قبر کا نام سن کر تمام دوست اور خدمت گار اُداس ہو گئے۔
 ”یہ تو ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ باقی رہ جانے والی ذات تو بس رب ذوالجلال والا کرام کی ہے۔“
 شیخ حسینؒ نے فرمایا۔ ”یہاں ایک کنواں کھودو اور چاروں طرف سبزہ لگاؤ۔“

ان دوستوں نے گلوں کی لہجے اور غم ناک آنکھوں کے ساتھ عرض کیا۔ ”ہمیں تو آپ کی جدائی کی خبر بھی شاق
 اور مدمتہ فراق کی طرح برداشت کریں گے؟“

فانی کا نکات اور تمام جن و انس مل کر بھی قدرت کے اس عمل کو روک نہیں سکتے۔ حضرت شیخ حسینؒ کے لہجے
 نے اہل خیال نمایاں تھا۔ ”فانی چیزوں سے دوستی کیا..... اور دل کا لگانا کیا؟..... منزل بقاء کی طرف دیکھو.....
 نہایت کو پورے ہوش و حواس کے ساتھ سنو۔“

اہل احباب اور خدام ہمہ تن گوش ہو گئے۔

تھارے دن کے 13 سال بعد دریائے راوی کی موجیں سرکش ہو جائیں گی۔ پانی، کناروں سے اُبل پڑے
 اور دریا کا علاقہ، سیلاب کی لپیٹ میں آجائے گا۔ پھر میرے دوست میری لاش کو نکال کر لے جائیں گے
 (بغیر پتھر) میں دوبارہ دفن کر دیں گے۔ پھر میری وفات کے ایک سال بعد مادھو دوبارہ طویل سفر پر
 گاہل دوران میرے مزار کی سجادہ نشینی کی جگہ خالی رہے گی۔ مادھو بارہ برس بعد پھر آجائے گا..... اور میری
 بہانہ ہوگا۔ یاد رکھنا کہ میرا خلیفہ اکبر، مادھو ہے..... اسے پورے عزت و احترام کے ساتھ تخت خلافت پر
 بیٹھا 35 سال تک میرا سجادہ نشین رہے گا۔ پھر وہ بھی دنیا سے چلا جائے گا۔ اس کی قبر، میری قبر کے برابر تعمیر
 کی جائے گی۔

ان کے بعد حضرت شیخ حسینؒ کا انتقال ہو گیا۔ وہ جمادی الثانی کا مہینہ تھا اور سن عیسوی 1599ء تھا۔ حضرت شیخ
 نے اہل خیال کی خبر سن کر پورے لاہور میں کھرام مچ گیا۔ وہ، جو زندگی بھر حضرت شیخ حسینؒ کو نازیبا کلمات سے
 بچنے والے تھے، ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

حضرت شیخ حسینؒ کے انتقال کی خبر نے ہر خاص و عام کو سو گوار کر دیا۔ پھر آپ کی وصیت کے مطابق بابو پورہ (باغبانپورہ) میں آسودۂ خاک کیا گیا۔

حضرت شیخ حسینؒ کی زندگی کے ابتدائی چھتیس سال امور شرعی کے مطابق گزرے۔ جب آپ باپ کے ساتھ نماز بھی پڑھتے تھے اور روزہ بھی رکھتے تھے۔ حافظ قرآن ہونے کے سبب تراویح میں کلام الہی بھی پڑھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت شیخ سعد اللہ لاہوریؒ سے حدیث کا درس بھی لیتے تھے۔ چھتیس سال کی عمر تک یہ سب ہوتی ہے۔ مگر کسی تذکرے سے پتہ نہیں چلتا کہ آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا؟ اس طرح یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ آپ نے تکمیل سنت کے لئے کہیں شادی کی ہو۔ مجرد کی زندگی بسر کرنے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ فطرتاً مرد آزاد تھے اور مادیت کی کسی زنجیر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ حلقہ شریعت سے کچھ ملامت کی طرف گئے۔ اور ایسے گئے کہ بظاہر شریعت و سنت کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

حضرت شیخ حسینؒ کے حالات زندگی اور سیرت سے آگہی حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف دو ماخذ ”کتاب بہاریہ“ اور ”حقیقت الفقراء“ ہیں۔

کتاب بہاریہ جو دراصل ایک روزنامہ ہے، جسے مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر کے ایک درباری، بہار خان والی ہندوستان کی خصوصی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ اہل نظر اسے زیادہ قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ بہار خان، حضرت حسینؒ کی خدمت میں ہمہ وقت نہیں رہتا تھا۔ اس لئے سنی سنائی باتوں کو اپنے روزنامے میں محفوظ کر دیا کرتا تھا۔ ”کتاب بہاریہ“ کے برعکس ”حقیقت الفقراء“ کو یہ اہمیت اور انفرادیت حاصل ہے کہ اس ”مستحکم تذکرہ“ کے مصنف شیخ پیر محمدؒ، شیخ مادھوؒ کے مرید تھے۔ اس اعتبار سے شیخ پیر محمدؒ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ ان کے دادا پیر تھے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شیخ پیر محمدؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کو اپنے بچپن میں دیکھا ہوگا۔ وہ شیخ مادھوؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے تھے۔ اس وقت حضرت شیخ حسینؒ کو دنیا سے رخصت ہوئے ایک روز گزر چکا تھا۔ اس لئے ”حقیقت الفقراء“ کی اکثر روایات شیخ مادھوؒ کی بیان کردہ ہیں۔ ان دونوں تذکروں سے چلتا ہے کہ جب حضرت شیخ حسینؒ نے تفسیر مدارک کنوئیں میں ڈال کر روزہ اور نماز ترک کئے تو آخری دم تک اسی روش پر قائم رہے۔ ان ہی دونوں کتابوں کی روایات کی بنیاد پر آج بھی حضرت شیخ حسینؒ کے معتقدین ہیں کہ ان کے مخدوم اپنی آخری سانس تک کوچہ ملامت میں گامزن رہے اور پھر اسی طرح خرقہ ملامت زیب تن ہوئے خالق حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ تصوف کی دنیا میں اس روایت کا شور کب تک سنائی دیتا کہ پونے تین سو سال بعد قریب ایک مقالے نے حضرت شیخ حسینؒ کے بارے میں لوگوں کے انداز فکر کو بھی بدل ڈالا۔ یہ مقالہ اگست 1970ء مجلہ ”معارف“ اعظم گڑھ میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار محمد اقبال مجددی تحریر کرتے ہیں۔

”شاہ حسینؒ کی رند مشربی (شراب نوشی) کے قصے تذکرہ نگاروں نے مزے لے لے کر بیان کئے ہیں۔ شاہ حسینؒ نے آخری عمر میں تمام خلاف شرع حرکات ترک کر دی تھیں اور ارکان اسلام کی پابندی کرنے لگے۔ ”معارف الاولایت“ میں تحریر ہے۔

”کہتے ہیں کہ جب شاہ حسینؒ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے تمام غیر شرعی امور ترک کر دیے اور روزہ میں مشغول ہو گئے۔“

حضرت شاہ حسینؒ کا یہ عمل دیکھ کر لوگوں نے پوچھا۔ ”اس میں کیا حکمت ہے؟“

حضرت شاہ حسینؒ نے فرمایا۔ ”میں اس زمین میں جا رہا ہوں کہ اسے اختیار کئے بغیر اور اس کا ساکن ہوئے بزم حاصل نہیں ہوتی۔ میں نہیں جانتا کہ میرا کیا حال ہوگا۔“

”معارج الولایت“ کی روایت کے مطابق حضرت شاہ حسینؒ اسی حالت میں حق سے جا ملے۔

اس روایت کی ظاہری ساخت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ کا انتقال نماز کی حالت میں ہوا..... یا بہ دراز سے تھے۔

”معارج الولایت“، ”حقیقت الفقراء“ کے بعد کی تصنیف ہے۔ اصولی طور پر حضرت شیخ حسینؒ کے آخری ایام ”حقیقت الفقراء“ میں موجود ہونا چاہئے تھا۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اس تذکرے کی بیشتر روایات شیخ مادھوؒ منسوب ہیں اور تمام تاریخوں سے ثابت ہے کہ شیخ مادھوؒ ایک سال تک راجہ مان سنگھ کی ملازمت کرنے کے بعد آئے تھے اور حضرت شیخ حسینؒ کی وفات کے وقت اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر تھے۔

اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ شیخ مادھوؒ حضرت شیخ حسینؒ کے آخری زمانے کے گمراہ بھی تھے اور گواہ بھی۔ ”معارج الولایت“ کے مصنف سے حسن ظن رکھنا چاہئے کہ موصوف نے حضرت شیخ حسینؒ کے آخری لمحات یا غائب کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیخ مادھوؒ جو غلط و غلطی اپنے مرشد کے قریب رہا کرتے تھے، انہوں نے اپنے مرید اور ”حقیقت الفقراء“ کے مولف شیخ پیر محمدؒ کو نہیں بتایا کہ حضرت شیخ حسینؒ وصال سے کچھ عرصہ پہلے اپنے حقیقی رنگ پر لوٹ آئے تھے۔ یعنی شریعت نہ کاربگ۔

شیخ مادھوؒ نے پیر و مرشد کی اس تبدیلی کو جان بوجھ کر دوسرے لوگوں سے پوشیدہ رکھا یا پھر اس واقعے کو اہمیت نہ دے کر بے فکر نظر انداز کر دیا؟ یہ ایک نہایت مشکل سوال ہے، جس کا جواب ہمیں تاریخ کے اوراق سے نہیں ملتا۔ خود شیخ مادھوؒ پر بھی بہت سے مضامین لکھے گئے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے بڑے عجیب عجیب انداز سے اپنے بیابان دکھائے ہیں، مگر کسی نے شیخ مادھوؒ کی نماز اور روزے کا ذکر نہیں کیا۔ رقص و شراب نوشی کی داستانیں ہیں، نہ اور بولی کے افسانے ہیں..... اگر ذکر نہیں ہے تو بس دو بنیادی ارکان شریعت، نماز اور روزے کا نہیں ہے۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ معارج الولایت کے مصنف تک حضرت شیخ حسینؒ کے آخری ایام کی روایت کس ناچنگی؟



جس طرح حضرت شیخ حسینؒ کی ستائیس سالہ ”حیاتِ ملامت“ عجیب ہے، اسی طرح آپ کی وصیت بھی عجیب

نشا اکبرؒ کی الدین عربیؒ کے بارے میں مشہور روایت ہے کہ وفات سے پہلے آپ نے اپنے مریدوں اور تلامذہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

”میں مغرب دینا سے چلا جاؤں گا، لوگ میری قبر ڈھونڈیں گے۔ مگر وہ مجھے بے نشان پائیں گے۔“

نشا اکبرؒ کی بات سن کر مریدوں اور عقیدت مندوں کو شدید اذیت پہنچی کہ ایسا عظیم انسان، بے نشان ہو جائے گا۔

”نشا ایسا کیوں ہوگا؟“ ایک خادم نے غم زدہ لہجے میں عرض کیا۔

”میں نظام قدرت ہے۔“ شاخ اکبرؒ نے فرمایا۔ ”نشان والوں کو بے نشان کرنا..... اور بے نشانوں کو نشان عطا کرنا۔“

میرے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ میں برسوں بے نشان رہوں گا۔ مگر جب سین، شین (س، ش) میں داخل ہوگا تو

لوگوں کو میری قبر کا نشان مل جائے گا۔“

اس پیش گوئی کے کچھ دن بعد شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا انتقال ہو گیا۔ اور عالم اسلام کے بے مثال مبلغ فلسفی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

پھر گردش زمانہ نے واقعتاً شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی قبر کا نشان منادیا۔ لوگ دُور دراز کے علاقوں سے آپ یگانہ روزگار شخص کی آخری آرام گاہ کو ڈھونڈتے ہوئے آتے تھے..... مگر انہیں کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ شیخ کہاں دفن ہیں؟

پھر جب صدیوں بعد ترکی کا سلطان سلیم، شام میں داخل ہوا تو اس نے بہت تحقیق کی اور جنو کے بعد اس کی نشاندہی کی، جہاں شیخ اکبر آرام فرما تھے۔ محی الدین ابن عربی کا مزار مبارک، شام کے دارالحکومت دمشق میں ہے۔ ”س“ سے مراد سلطان سلیم تھا اور ”ش“ سے شام۔ شیخ اکبر نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔ ابن عربی کی آثارِ آفاق تصنیف ”فتوحات مکیہ“ میں یہ واقعہ درج ہے۔

اپنی قبر کے بارے میں حضرت شیخ حسینؒ کی پیش گوئی بھی کچھ اسی انداز کی ہے، جس سے آپ کے بے پناہون کشف کا اظہار ہوتا ہے۔

حضرت شیخ حسینؒ اپنی وصیت میں اس طرف اشارہ کر چکے تھے کہ بارہ سال بعد دریائے راوی آپ کی قبر کو کر لے جائے گا۔ اس لئے مریدین نے مزار مبارک کو ناپختہ ہی چھوڑ دیا۔ اس وقت حضرت شیخ حسینؒ شاہدِ مشرق کی طرف دفن ہوئے تھے۔

روایت ہے کہ شیخ مادھو کو اپنے پیر و مرشد کی موت کا بہت صدمہ تھا۔ وہ اکثر حضرت شیخ حسینؒ کی قبر مبارک سے لپٹے روتے رہتے تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ کے مریدوں کی تعداد سوا لاکھ کے قریب تھی۔ مریدوں کی تعداد کے سلسلے میں یہ ایک غیر محتاط تخمینہ ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد بھی سوا لاکھ بتائی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے جوشِ عقیدت میں حضرت شیخ حسینؒ کے مریدوں اور انبیاءِ الٰہی کی تعداد کو برابر کر دیا ہو۔ ”حقیقت الفقراء“ کے مطابق حضرت شیخ حسینؒ کے نو ہزار مرید تھے اور سولہ خلیفہ مرقوم مرشد کی جدائی کا جو قلق شیخ مادھو کو تھا، وہ کسی دوسرے مرید کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ شاید شیخ مادھو محبت تھی، جس سے متاثر ہو کر حضرت شیخ حسینؒ نے فرمایا تھا۔

”میرے بعد مادھو ہی منہ خلافت کو آراستہ کرے گا۔“

الغرض پیر و مرشد کی قبر پر گریہ و زاری کرتے ہوئے شیخ مادھو کو ایک سال گزر گیا۔

پھر ایک دن حضرت شیخ حسینؒ، شیخ مادھو کے خواب میں تشریف لائے اور اپنے محبوب مرید سے فرمایا۔

”مادھو! تم پر لازم ہے کہ لاہور سے ہندوستان کی طرف سفر کرو۔ بارہ برس تک مان سنگھ کی ملازمت میں

پھر ہمارے پاس آؤ۔“

شیخ مادھو کی آنکھ کھلی تو بہت رنجیدہ خاطر ہوئے۔ لیکن مرشد کا حکم یہی تھا۔ دوسرے دن شیخ مادھو نے غسل پیر و مرشد کی قبر پر حاضر ہوئے۔

”پہلے خود جدا ہوئے، میرے لئے یہ قیامت کیا کم تھی؟“ شیخ مادھو، حضرت شیخ حسینؒ کی قبر مبارک۔

ہوئے بڑے دردناک لہجے میں فریاد کر رہے تھے۔ ”اب دوسرا حکم یہ ہے کہ قبر کے دیدار کو بھی ترس جاؤں

زندہ کیسے رہے گا؟“

مادھو کی دن تک اسی طرح صبح سے شام تک گریہ و زاری کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ پیر و مرشد ترس کھا کر مایوس لے لیں گے۔ مگر تین دن شیخ مادھو نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ آخر سمجھ گئے کہ پیر و مرشد ان کے قیام پر راضی نہیں ہیں۔ آخر شیخ مادھو نے حضرت شیخ حسینؒ کی قبر کی خاک اپنے چہرے پر ملی اور لاہور سے رخصت ہو گئے۔

کی مذکرہ نگار نے اس کی نشاندہی نہیں کی ہے کہ اس وقت راجہ مان سنگھ کہاں تھا؟ چونکہ تقریباً دو سال پہلے شیخ حسینؒ کی دعاؤں سے راجہ مان سنگھ کو دکن کی مہم میں فتح حاصل ہوئی تھی، اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کے بعد راجہ مان سنگھ دکن ہی میں مقیم تھا۔

دکن کے دنوں میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ، شیخ مادھو کو بار بار راجہ مان سنگھ کی نیت میں کیوں بھیجتے تھے؟ ہمارے خیال میں اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ جب حضرت شیخ حسینؒ، مغل شہنشاہ عالمگیر اکبر کے معتوب ٹھہرے تھے اور آپ کو پایہ زنجیر کر کے دارالحکومت آگرہ بھیجا گیا تھا، اس وقت راجہ مان سنگھ نیرشائی میں موجود تھا۔ پھر جب شہنشاہ اکبر نے حضرت شیخ حسینؒ کی مزید آزمائش کے لئے انہیں ایک اہم نیا قید کر دیا تھا..... مگر حضرت شیخ حسینؒ، مقفل دروازے کے باوجود والی ہندوستان کی حرم سرا میں نظر آئے۔ شہنشاہ اکبر آپ کے کمالات روحانی کا دل سے قائل ہو گیا تھا۔

مغل شہزادے داراشکوہ نے اپنی کتاب ”شطحیات“ میں ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ شہنشاہ اکبر کی بیگمات، حضرت شیخ حسینؒ سے بہت زیادہ عقیدت رکھتی تھیں۔ اکبر کی بیگمات میں راجپوت مہارانی جو دھابائی بھی تھی، جو نے مان سنگھ کی حقیقی بہن تھی۔ جب سگی بہن کسی کی شخصیت سے اتنی متاثر ہو تو پھر بھائی کا متاثر ہو جانا بھی بظاہر امر ہے۔

اس سے یہ کہ خود راجہ مان سنگھ نے بھی اپنی آنکھوں سے حضرت شیخ حسینؒ کی کرامات دیکھی تھیں۔ اس لئے وہ مسلمان صوفی کے حلقہ عقیدت میں شامل ہو گیا تھا۔



آخر شیخ مادھو طویل سفر طے کر کے دکن پہنچے۔ اس وقت راجہ مان سنگھ اپنے دربار میں دیگر امراء کے ساتھ تخت باکی خاص گفتگو میں مصروف تھا۔ اچانک درباری نے اطلاع دی۔

”شیخ مادھو لاہور سے آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

راجہ مان سنگھ کے امراء اور دیگر حاضرین دربار، شیخ مادھو سے واقف نہیں تھے، اس لئے ان کا خیال تھا کہ راجہ مان سنگھ، شیخ مادھو کو اس خصوصی اجلاس میں آنے کی اجازت نہیں دے گا۔ مگر اس وقت تمام درباری حیرت زدہ رہے۔ اب راجہ مان سنگھ اپنے تخت سے اٹھ کر تیزی کے ساتھ صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ مجبوراً دوسرے امراء کو اپنی نشستوں پر کھرا ہو جانا پڑا۔

مہر اہل دربار نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ ”اُدلیائے لاہور“ کی روایت کے مطابق جیسے ہی شیخ مادھو دربار میں داخل ہوئے، راجہ مان سنگھ نے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اب اہل دربار کو اندازہ ہوا کہ حاکم دکن کی نظروں میں مادھو کی کیا قدر و منزلت ہے۔

مہر راجہ مان سنگھ نے شیخ مادھو کو اپنے برابر تخت پر بٹھایا اور عرض کرنے لگا۔

”شیخ آپ نے کیسے زحمت کی؟“ راجہ مان سنگھ کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

جواب میں شیخ مادھو نے فرمایا۔ ”ہم تمہاری ملازمت کے خواہاں ہیں۔“

”شیخ! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“ راجہ مان سنگھ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ”نوکر تو میں ہوں آپ کا۔“ غلام..... آپ کسی حاکم کی طرح مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھیں۔ میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک آپ کا مرید رہوں۔“

راجہ مان سنگھ کے اس طرزِ عمل پر تمام امراء اور درباری حیران تھے۔ راجہ مان سنگھ، شیخ مادھو سے اس طرح بیٹھ رہا تھا، جیسے وہ مثل شہنشا جلال الدین اکبر کے سامنے حاضر ہو۔

راجہ مان سنگھ کی عرضداشت سن کر شیخ مادھو نے فرمایا۔ ”ہمارے لئے یہی حکم ہے کہ ہم تمہاری ملازمت میں رہیں۔“

”میری زندگی میں بھی آپ میرے مالک ہیں۔“ راجہ مان سنگھ نے دوبارہ عرض حال کیا۔ ”مرا جاؤں گا تب ہی آپ میرے مالک ہی رہیں گے۔ اگرچہ یہاں اہل اسلام کم ہیں، مگر پھر بھی جو میری اولاد میں سے ہوگا، وہ آپ کا تابع رہے گا۔“

راجہ مان سنگھ نے مسلمانوں کی تعداد کی کمی کے بارے میں جو اشارہ دیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ مان سنگھ، دکن کے اس علاقے میں مقیم تھا، جہاں اہل ہند کی کثرت تھی۔

شیخ مادھو نے راجہ مان سنگھ کی عاجزانہ درخواست سن کر فرمایا۔ ”میں خود نہیں آیا ہوں، پیر و مرشد کا یہی حکم ہے کہ بارہ برس تک تمہارے ساتھ رہوں، پھر لاہور لوٹ جاؤں۔“

”بسر و چشم۔“ راجہ مان سنگھ نے عرض کیا اور سرکاری ملازمین کے دفتر میں شیخ مادھو کا نام بھی لکھ دیا۔ ظاہر ملازمت تھی، مگر درپردہ شیخ مادھو، مخدوم تھے اور راجہ مان سنگھ، خدمت گار۔



حضرت شیخ حسینؒ کے بعض ارشادات و فرمودات، عجائبات کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر جیسے ہی بارہ برس پورے ہونے کا وقت آیا تو اچانک راجہ مان سنگھ بیمار ہوا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرنے سے پہلے راجہ مان نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی۔

”اگر شیخ مادھو تمہارے ساتھ رہنا پسند کریں تو ان کا درجہ، آقا کے برابر ہوگا۔ اور تمہاری حیثیت ایک غلام کی۔“ راجہ مان سنگھ کے بیٹوں نے باپ کا حکم سن کر سر جھکا دیا۔

”اور اگر شیخ صاحب واپس جانا چاہیں تو ان سے رُکنے کی درخواست کرنا۔ اگر مان جائیں تو اسے اپنی سوار سمجھنا۔ اگر نہ مانیں تو زبردستی سے کام نہ لینا۔ بلکہ عزت و احترام اور بڑے انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کر دینا۔ آخر شیخ مادھو کے سب سے بڑے عقیدت مند، راجہ مان سنگھ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ حالات کا یہ زاویہ حیرت انگیز ہے کہ راجپوت حاکم، راجہ مان سنگھ بارہ سال تک شیخ مادھو کے ساتھ رہا، خود کو ان کا غلام کہتا رہا۔ مگر وہ وقت رخصت آیا تو اس کے ماتھے پر بھی چھاپ تلک (بت پرستی کے نشانات) تھے اور دل پر بھی۔ راجہ نے حضرت شیخ حسینؒ کے حوالے سے جن کرامات کا مشاہدہ چشم خود کیا تھا، وہ بھی اسے اسلام اور توحید کی منزل تک نہ سکس۔ زندگی بھر پتھر دوں کا پجاری رہا اور اس کی آخری سانس کسی دیوتا ہی کے نام پر نکلی۔ راجہ مان سنگھ کی زندگی آیتِ مقدسہ کی عملی تفسیر تھی، جس میں باری تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

”بے شک! اللہ جسے چاہتا ہے، اسے ہدایت بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، محروم کر دیتا ہے۔“

راہبان سنگھ کے مرتے ہی شیخ مادھو نے لاہور جانے کا ارادہ کیا۔ راجہ مان سنگھ کے بیٹوں نے باپ کی وصیت نہ مان کر شیخ مادھو سے دکن میں ٹھہر جانے کی درخواست کی، مگر آپ نے انکار کر دیا۔

”ہمارے باپ سے ہمارا یہی عہد و پیمان تھا کہ بارہ سال بعد ہم چلے جائیں گے۔“

راہبان سنگھ کے بیٹوں کی شدید التجا پر شیخ مادھو چند دنوں کے لئے ٹھہر گئے۔

حضرت شیخ حسینؒ کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ اس معاملے میں حضرت شیخ حسینؒ نے مزید اور خلفاء و درگروں میں تقسیم ہو گئے تھے۔

مریدین کی ایک جماعت کا خیال تھا کہ کبھی کبھی کسی بزرگ کی زبان سے جذب کی حالت میں کچھ الفاظ ادا ہو جاتے ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ وہ الفاظ، عملی شکل بھی اختیار کر لیں۔ یہ مرید دے دے لہجے میں اپنے دل کی بات نہ چاہتے تھے کہ وہ خود سجاد و نشینی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ پیر و مرشد کی وصیت سے مکھی بغاوت تو نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن دلوں کی گہرائی میں یہ حسرت پوشیدہ تھی کہ انہیں حضرت شیخ حسینؒ کا خلیفہ اکبر ہونا چاہئے تھا۔ یہی خواہش ان لوگوں میں اپنے ہم خیال مریدوں سے کہہ رہا تھا۔

”ایک ایسی وصیت کی بنیاد پر سجادے (مسند خلافت) کو خالی چھوڑ دیا گیا ہے، جس کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ ہائے رادی، پیر و مرشد کی قبر سے بہت دور بہہ رہا ہے۔ ہر سال اس میں طغیانی آتی ہے، مگر پانی کی سرکش موجیں ہر گز نہیں کرتیں۔“

جب یہ سرگوشیاں عام ہوئیں تو حضرت شیخ حسینؒ کے تمام خلفاء اور مریدین باخبر ہو گئے۔ شیخ محمد صالحؒ، حضرت شیخ حسینؒ کے باخفا مرید تھے، اور اپنے مرشد سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان تک جب یہ خبریں پہنچیں تو بہت زوردار غصہ ہوئے۔ شیخ محمد صالحؒ نے فوری طور پر حضرت شیخ حسینؒ کے تمام خلفاء اور ہوش مند مریدوں کو جمع کیا۔

پہلی مجلس سے مخاطب ہو کر بولے۔

”کی مرید کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ پیر و مرشد کے فرمودات پر نکتہ چینی کرے۔ ان کی زبان مبارک سے جو الفاظ ادا ہو گئے، سو ہو گئے۔ اب ان میں تردد کرنا، عقیدت کی کمی کو ظاہر کرتا ہے یا پھر ہمارے یقین میں کمی آگئی ہے۔“ حضرت شیخ محمد صالحؒ نے بڑی ذہانت اور شائستگی کے ساتھ اپنے پیر بھائیوں کو بات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ یہی شیخ محمد صالحؒ کی گفتگو مکمل ہوئی، شیخ یعقوبؒ نے اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”شیخ صالحؒ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے دل، جذبات عقیدت سے خالی ہوئے ہیں..... اور نہ ہم میں کوئی بے یقینی ہے۔“

”پھر یہ سرگوشیاں کیسی ہیں؟“ شیخ محمد صالحؒ نے براہ راست شیخ یعقوبؒ سے سوال کیا تھا۔ مگر آپ کا ردئے سخن ناہم مریدوں کی طرف تھا۔

”یہ سرگوشیاں نہیں ہیں، ایک تجویز ہے۔“ شیخ یعقوبؒ نے جوابا کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ پیر و مرشد نے اس وقت ہائے رادی کی طغیانی کے حوالے سے یہی مشاہدہ کیا ہو..... مگر خداوند ذوالجلال نے اپنی حکمت و قدرت سے دریا کا زریں طرف موڑ دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بھیدوں کو خود ہی جانتا ہے کہ کب کون سا واقعہ رونما ہوگا..... اور کیا جو انسان کے حق میں بہتر ہے۔“

شیخ یعقوبؒ نے بڑی عالمانہ دلیل پیش کی تھی، جسے سن کر مجلس کے بام و در پر سناٹا چھا گیا۔ سفرے سکوت کے بعد شیخ یعقوبؒ نے اپنی تقریر دوبارہ شروع کر دی۔ ”جو لوگ قرآن حکیم کے بارے میں ناہم رہے، انہیں حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ یاد ہوگا کہ جب نافرمان قوم کے لئے عذاب الہی

مقرر ہو چکا تھا۔ پھر وہ سرکش قوم، عذاب کی خبر سن کر خوف زدہ ہو گئی..... اور اس نے جنگل کا رخ اختیار کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ بد اعمال لوگ، زمین پر اپنے سروں کو رکھے، گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے۔ یوں ہوا کہ عذاب ٹال دیا گیا۔“

شیخ یعقوبؒ کی تقریر پر جوش بھی تھی..... اور مدلل بھی..... شیخ یعقوبؒ، قرآن مقدس سے یہ مثال دے کر کہہ چاہتے تھے کہ آج جو منظر، انسان کو دکھائی دے رہا ہے، کل وہ بدلا بھی جاسکتا ہے۔

شیخ صالحؒ محمدؒ اپنے پیر بھائی، شیخ یعقوبؒ کی گفتگو کا مفہوم سمجھ چکے تھے۔ مگر پھر آپ نے تمام خلفاء اور مریدوں کے سامنے وضاحت چاہی۔ ”شیخ! حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ سنانے سے آپ کی حقیقی غرض کیا ہے؟“ شیخ یعقوبؒ جو خود بھی ”خلافت کبریٰ“ کے دعویدار تھے، مگر پیر و مرشد کی وصیت سے مجبور تھے، اس لئے کلمہ اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ مجبوراً اشاروں اور مثالوں کا سہارا لیتے ہوئے بولے۔

”آخر کب تک ہم دریائے راوی میں سیلاب آنے کا انتظار کریں گے؟“ اپنے بیان کی وضاحت کرنے کے بجائے شیخ یعقوبؒ نے شیخ محمد صالحؒ سے نیا سوال کر ڈالا۔

”جب تک کہ سیلاب آنہیں جاتا۔“ شیخ محمد صالحؒ کا جواب نہایت سادہ تھا۔ مگر ان کے ایک ایک لفظ پر یقین جھلک رہا تھا۔

”اور اگر سیلاب نہیں آیا؟“ شیخ یعقوبؒ نے ایک اور عقلی سوال کیا۔

”مجھے تو پورا یقین ہے کہ حق تعالیٰ میرے شیخ کے فرمودات کو عالم اسباب میں ظاہر کرے گا۔“ یہ کہنے ہی ٹٹو صالحؒ کی آنکھیں آب دیدہ ہو گئیں۔ ”میں اس وقت تک انتظار کروں گا، جب تک سیلاب فوجی مجھے ہمارے گھر لے جاتا۔“ شیخ محمد صالحؒ کی بات کا مفہوم یہ تھا کہ وہ اپنی موت تک دریائے راوی میں سیلاب آنے کا انتظار کریں گے۔ شیخ یعقوبؒ، شیخ محمد صالحؒ کا رنگ عقیدت دیکھ کر لا جواب ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی انہوں نے اپنی عقل کا ہمارا لیا۔ ”ہم نے سیلاب کے انتظار میں تیرہ سال کا طویل عرصہ گزار دیا۔ پھر بھی ہم حالت انتظار میں ہیں۔ اس لئے کہیں بہتر تھا کہ ہم پیر و مرشد کا پختہ روضہ تعمیر کر لیتے..... اور عارضی طور پر کسی خلیفہ کو سجاد نشین بنا کر بٹھادیتے تاکہ رسم عرس جاری ہو جاتی۔“

”اگر آپ حضرات چاہیں تو پیر و مرشد کی قبر مبارک کو پختہ مزار میں تبدیل کر دیں۔“ شیخ محمد صالحؒ نے معاملہ روش اختیار کرتے ہوئے کہا۔ وہ صوفیاء کے اس مسئلے کو دنیا دارانہ مسئلہ بنانے سے گریزاں تھے۔

شیخ محمد صالحؒ کا جواب سن کر شیخ محمد یعقوبؒ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنے منصوبہ پر کامیاب ہو گئے تھے۔

مگر جب کچھ دیر بعد شیخ محمد صالحؒ، حاضرین سے مخاطب ہوئے تو شیخ یعقوبؒ دوبارہ مضطرب نظر آنے لگے۔ ”اور جہاں تک عرس کی رسم ادا کرنے کا معاملہ ہے تو اس کے لئے قبر کا پختہ یا غیر پختہ ہونا ضروری نہیں۔“ شیخ محمد صالحؒ نے اپنے سلسلے کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”پیر و مرشد کی آخری آرام گاہ کا نشان موجود ہے عرس کے لئے کوئی عالیشان مقبرہ بنانے کی کیا حاجت ہے؟“

بہت سے مریدوں نے شیخ محمد صالحؒ کی بات سے اتفاق کیا..... مگر کچھ لوگوں نے شیخ یعقوبؒ کی حمایت کی۔ حضرت شیخ حسینؒ کا مقبرہ تیار کیا جائے اور مناسب ترین شخص کو سجادے (مسند خلافت) پر بٹھایا جائے۔

شیخ محمد صالحؒ کے چہرے پر اذیت کا رنگ ابھر آیا۔ آپ پیر و مرشد کی وصیت کی خلاف ورزی برداشت نہیں

ذی۔ ”اب حضرات میں سجادگی کے لئے مناسب ترین شخص کون ہے؟“ شیخ محمد صالحؒ نے اپنے ان پیر بھائیوں کو جوش یعقوبؒ کے خیالات کی تائید کر رہے تھے۔

”ہمیں کس کا انتخاب، کثرتِ رائے سے کیا جاسکتا ہے۔“ اب کی بار محمودؒ نے جواب دیا۔ محمودؒ کا شمار بھی شیخ حسینؒ کے بڑے خلفاء میں ہوتا تھا۔ ”کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“

”جس کے زہد و تقویٰ پر زیادہ لوگوں کا اتفاق ہو جائے۔“ مجلس میں ایک نئی آواز بلند ہوئی، جوش کا کوئی آواز شیخ کاؤمشی حضرت شیخ حسینؒ کے ممتاز خلفاء میں سے تھے۔ اور اس وقت شیخ یعقوبؒ کی حمایت میں بول رہے

”اور شیخ کی وصیت کا کیا ہوگا؟“ شیخ محمد صالحؒ کے لہجے سے کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”پیر و مرشد نے تو شیخ کو اپنا جادہ نشین قرار دیا ہے۔“

”ایک عارضی انتظام ہوگا۔“ شیخ یعقوبؒ نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا۔ ”شیخ مادھوؒ کے آتے ہی مسند خالی کر دے گی۔“

شیخ محمد صالحؒ صورتِ حال کو سمجھ چکے تھے۔ اس لئے آپ اپنی نشست چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت لمبے میں فرمایا۔ ”اگر تمام مریدین کسی ایک شخص کے انتخاب پر راضی ہو جائیں، تب بھی میں اس کی سجادہ نشینی کو نہیں کروں گا۔ میرے سجادہ نشین صرف شیخ مادھوؒ ہیں۔ میں آخری سانس تک ان ہی کا انتظار کروں گا۔“ یہ کہہ کر صالحؒ مجلس سے چلے گئے۔



ہر دیکھنے والوں نے یہ منظر دیکھا کہ شیخ محمد صالحؒ اپنے پیر و مرشد، حضرت شیخ حسینؒ کی قبر سے لپٹے رو رہے اور نہایت شکایت آمیز لہجے میں عرض کر رہے تھے۔ ”میں آپ کے واسطے سے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مت کا سوال کرتا ہوں۔“

ال واقعے کے کچھ دن بعد ہی بارشوں کا موسم شروع ہو گیا۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ اس سال بھی معمول کے بارش ہوگی۔ مگر اس وقت سارے اندازے غلط ثابت ہوئے، جب آسمان کے کھلے ہوئے دہانے کسی طرح نے میں نہیں آتے تھے۔ پانی کی ایسی جھری لگی کہ آٹھ دن تک سورج نظر نہیں آیا۔ اور ایک لمبے کے لئے بھی ت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ نتیجتاً دریائے راوی میں شدید سیلاب رونما ہوا..... اور پھر پانی کی موجیں حضرت شیخ کی قبر مبارک کی طرف بڑھنے لگیں۔

یہ خبر سن کر حضرت شیخ حسینؒ کے خلفاء اور مریدین میں ہلچل سی مچ گئی۔ اور پھر سب لوگ راوی کی طرف دوڑا دیا۔ کاپانی، حضرت شیخ حسینؒ کی قبر کو چھونے ہی والا تھا۔ فوری طور پر قبر کھولی گئی۔ اس وقت ہزاروں مرید تھے۔

ہر جب حضرت شیخ حسینؒ کی قبر کے اندر جھانکا گیا تو وہاں آپ کا جسد مبارک موجود نہیں تھا۔ انتہا یہ ہے کہ بڑوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ بعض مرید یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ بعض اس قدر غم زدہ ہوئے کہ لگے اور ان کے چہرے دھواں ہو گئے۔

ہندو یہ خبر شہر میں عام ہو چکی تھی، اس لئے وہ ہزاروں خائفین بھی جمع ہو گئے تھے، جو حضرت شیخ حسینؒ کی زندگی و کلمات کیا کرتے تھے اور سرِ عام مذاق اڑایا کرتے تھے۔ خالی قبر دیکھ کر انہیں بھی شدید حیرت ہوئی۔ بعض

جب زبانوں نے یہاں تک کہا۔

”جب ان کی زندگی میں کچھ نہیں تھا تو پھر مرنے کے بعد کیا نظر آئے گا۔“
مخالفین، طعن، تشبیہ کر کے چلے گئے۔ حضرت شیخ حسینؒ کی قبر کو دوبارہ بند کر دیا گیا۔



عجیب اذیت و کرب کا عالم تھا۔ مخالفین، حضرت شیخ حسینؒ کی پیش گوئی کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اور اکثر مریدان پر بے یقینی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس صورت حال سے شیخ محمد صالحؒ ”شدید اضطراب میں مبتلا تھے۔ رات بے روتے رہے اور کروٹیں بدلتے رہے۔ پھر صبح کے قریب ان کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک شیخ محمد صالحؒ نے دیکھا کہ حضرت شیخ حسینؒ کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے مرید کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

”محمد صالحؒ! تم لوگوں کی باتوں سے آزرده خاطر نہ ہو۔ اٹھو..... اور قبر کے اندر اتر کر دیکھو۔ میرا دم قدرت حق سے پھولوں کا گلہ ستہ بن گیا ہے۔ یہی میری لاش ہے۔ اسے جلد وہاں سے نکالو اور بابو پورہ (باغبانپورہ) میں لے جا کر دفن کر دو۔ جلدی کرو..... مگر خبردار! اس گلہ سے کو کوئی سو گھنٹے کی کوشش نہ کرے۔“
شیخ محمد صالحؒ ”شدید حیرت کے عالم میں اپنے پیر و مرشد کی گفتگو سنتے رہے۔

آخر میں حضرت شیخ حسینؒ نے فرمایا۔ ”جسے میرے دیکھنے کی خواہش ہو، اسے لازم ہے کہ وہ ماحول دیکھے۔ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ماحولس آتا ہی ہوگا۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ حسینؒ تشریف لے گئے۔
شیخ محمد صالحؒ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں..... اور چاروں طرف دیکھنے لگے۔ پھر جب نیند کا اثر زائل ہوا تو شیخ محمد صالحؒ کو اندازہ ہوا کہ وہ ایک خواب تھا۔ مگر اس خواب نے ان کی تمام بے قرار یوں کا ازالہ کر دیا۔
سورج نکلنے ہی شیخ محمد صالحؒ نے اپنے تمام پیر بھائیوں کو جمع کیا۔ اور حضرت شیخ حسینؒ کی آخری آرام گاہ پہنچے۔ پھر گورکھ سے پیر و مرشد کی قبر دوبارہ کھولنے کے لئے کہا۔

شیخ یعقوبؒ، میاں شعبانؒ، بابا حاجیؒ، شیخ یلینؒ اور دوسرے خلفاء نے بیک زبان کہا۔ ”اب قبر کو کس لئے کھولا جا رہا ہے؟“

”پیر و مرشد کا یہی حکم ہے۔“ شیخ محمد صالحؒ نے مختصراً کہا اور قبر کے کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ پھر جب ٹی ہٹائی جا چکی تو شیخ محمد صالحؒ قبر میں اترے۔ واقعتاً وہاں پھولوں کا ایک گلہ ستہ موجود تھا۔
بعض روایتوں کے مطابق وہ گلہ ستہ ”گل ریحان“ کا تھا۔ ریحان ایک خاص خوشبودار پھول ہوتا ہے۔

پھر شیخ محمد صالحؒ ”قبر سے باہر آئے اور حضرت شیخ حسینؒ کے تمام خلفاء کو اپنا خواب سنا دیا۔ سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور گلہ ستے کو سو گھنٹے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر شیخ محمد صالحؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پیر و مرشد کا حکم نہیں ہے۔ پھر اس ”گلہ ستے“ کو ایک جنازے کی طرح رکھا گیا۔ اور جنازہ، حضرت شیخ حسینؒ کی وصیت کے مطابق بابو پورہ (باغبانپورہ) لایا گیا۔ جب شیخ محمد صالحؒ اور دوسرے مریدین، حضرت شیخ حسینؒ کا جنازہ لے کر بابو پورہ پہنچے تو ایک اور مشکل سامنے کھڑی تھی۔ حضرت شیخؒ نے اپنی زندگی میں جس جگہ کی نشاندہی کی تھی، وہ دراصل ایک ہندو جوگی، گورکھ ناتھ کا مکان تھا۔

گورکھ ناتھ جوگی نے ایک مسلمان کا جنازہ اور اس کے ساتھ ہزاروں شرکاء دیکھے تو حیران ہو کر کہنے لگے۔ ”یہ کیا ماجرا ہے؟ اور تم لوگ میرے مکان میں کیوں چلے آ رہے ہو؟“
جوگی گورکھ ناتھ نے اس مقام پر کوئی عمارت تعمیر نہیں کی تھی..... بس کچھ جھوپڑیاں سی ڈال رکھی تھیں، جن میں

”ہے چیلوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ جوگی کے سوال کرنے پر شیخ محمد صالحؒ اور حضرت شیخ حسینؒ کے دوسرے خلفاء نے لڑکھانہ سے کہا۔

”ہمارے پیر و مرشد کی وصیت تھی کہ انہیں اسی جگہ دفن کیا جائے۔“

”کیسے ممکن ہے کہ ایک ہندو کے مکان میں کسی مسلمان کو دفن کر دیا جائے؟“ جوگی گورکھ ناتھ نے سخت لہجے میں کہا۔

جوگی کے چیلے بھی اپنے گرو کی حمایت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور تمام اہل ہندو نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”ہمارے گرو لاکھ وصیت کریں، مگر یہ ہماری پوجا پاتھ کی جگہ ہے۔ یہاں کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کی قبر (یا گھر) نہیں بن سکتی۔“

غیر بات اتنی آگے بڑھی کہ قرب و جوار کے بہت سے ہندو بھی جمع ہو گئے اور انہوں نے حضرت شیخ حسینؒ کے قبروں کو شہسار کرنے کے لئے تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”جنازے کی تدفین تو بہانہ ہے۔ تم لوگ اس پردے میں کسی گورکھ ناتھ پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔“

شیخ صالحؒ اور دوسرے خلفاء نے جوگی گورکھ ناتھ، اس کے چیلوں اور دیگر اہل ہندو کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ کسی کی جگہ پر قبضہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ تو محض پیر و مرشد کی وصیت کی تکمیل ہے۔

انہوں میں کچھ ہندو، حضرت شیخ حسینؒ کی تاریخ وفات سے باخبر تھے..... اور یہ بھی جانتے تھے کہ انہیں ہندو میں دیوائے راوی کے قریب دفن کیا جا چکا ہے۔ اس بنیاد پر جوگی گورکھ ناتھ کے حامیوں نے یہ سوال اٹھایا۔ ”شیخ حسینؒ کو دنیا سے گزرے ہوئے زمانہ ہو چکا ہے۔ ان کی قبر دریائے راوی کے کنارے موجود ہے۔ پھر انہیں ہزاروں ایک ہندو کے مکان میں کیوں دفن کیا جا رہا ہے؟ اسی سے تم لوگوں کی بدنیتی ظاہر ہوتی ہے کہ جوگیوں کے قبر پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہو۔“

حضرت شیخ حسینؒ کے مرید، جوگی گورکھ ناتھ اور دوسرے اہل ہندو کو اپنے پیر و مرشد کی وصیت کا مفہوم سمجھانے سے ہمارے تو انہوں نے ایک ظاہری دلیل کا سہارا لیا۔

”جہاں پیر و مرشد کی قبر تھی، اس مقام کو سیلاب کے پانی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مجبوراً ہمیں جنازے کو جگہ نقل کرنا پڑ رہا ہے۔“

جوگی گورکھ ناتھ اس دلیل سے بھی مطمئن نہیں ہوا۔ ”اگر سیلابی پانی نے تمہارے گرو کی سادھی کو متاثر کیا ہے تو جنازہ لے کر میرے ہی مکان کی طرف کیوں آئے ہو؟ لاہور میں بہت سی خالی جگہیں پڑی ہیں، وہاں جنازہ دفن کر دو۔ پھر لاہور میں مسلمانوں کے کئی طویل و عریض قبرستان ہیں۔ ایک جنازے کے لئے بہتر مقام تو وہی ہے۔“

جوگی گورکھ ناتھ اور دیگر اہل ہندو کے دلائل اس قدر مضبوط تھے کہ حضرت شیخ حسینؒ کے خلفاء کوئی جواب نہ دے سکے۔

مجبوراً شیخ محمد صالحؒ کو پیر و مرید کی محبت میں جوگی گورکھ ناتھ سے درخواست کرنی پڑی۔ ”ہمیں صرف قبر کی جگہ دی جائے۔ اس کے بدلے میں تمہیں منہ مانگی قیمت ادا کر دی جائے گی۔“ شیخ محمد صالحؒ نے ہندو جوگی کو بے بیش اس لئے کی تھی کہ وہ ہر حال میں حضرت شیخ حسینؒ کی وصیت پر عمل کرنا چاہتے تھے۔

شیخ محمد صالحؒ کی بات سن کر وہ ہندو تو خاموش ہو گئے، جو گورکھ ناتھ کی حمایت میں جمع ہوئے تھے۔ مگر جوگی اور ان کے چیلوں نے صاف انکار کر دیا اور نہایت درشت لہجے میں کہا۔

”ہم کسی قیمت پر قبر کی جگہ فروخت نہیں کریں گے۔ تم بلا تاخیر جنازے کو کہیں اور لے جاؤ۔“
عجیب تکلیف دہ صورت حال تھی۔ ایک طرف حضرت شیخ حسینؒ کی وصیت اور دوسری طرف جوگی گوروں کا شدید انکار۔ صوفیاء میں جبر اور زبردستی جائز نہیں۔ اگر حضرت شیخ حسینؒ کے مرید، پیرومند کی محبت میں جگہ مکان پر قبضہ کر بھی لیتے تو فتنہ و فساد کا اندیشہ تھا۔ پھر بات عدالت میں بھی پہنچ سکتی تھی۔ ہر چند کہ شہنشاہ اکبرؒ نے شیخ حسینؒ کا عقیدت مند تھا۔ اور اس کی جنبش لب، ہندو جوگیوں کو اپنے مکان سے دست بردار ہونے پر بھی جبر کر سکتی تھی..... لیکن یہ بات تو ہمیشہ کے لئے تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہو جاتی کہ حضرت شیخ حسینؒ جہاں مدفون ہیں وہ ایک بت پرست کی ملکیت تھی۔ اور اس پر زبردستی قبضہ کیا گیا تھا۔

شیخ محمد صالحؒ اور دوسرے خلفاء بہت دیر تک مشورہ کرتے رہے۔ مگر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ جوگی گوروں کا تاہم، اس کے چیلوں اور دوسرے اہل ہندو کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ جنازے کو فوری طور پر ہمارے سے دور لے جایا جائے۔

”اولیائے لاہور“ کی روایت کے مطابق، جو دراصل ”کتاب بہاریہ“ اور ”حقیقت الفقراء“ سے ماخوذ ہے ابھی یہ کشمکش جاری تھی کہ یکایک شیخ حسینؒ کے جنازے سے آواز آئی۔
”گوروں کا تاہم! فلاں جگہ کھودی جائے۔ اگر اس مقام پر تسبیح، مصلیٰ، قرآن شریف اور سرخ دستار نکل آئے تو یہ مکان ہمارا ہے، ورنہ تیری ملکیت کا دعویٰ جائز ہے۔“

یہ پُر جلال آواز سن کر حضرت شیخ حسینؒ کے مریدوں کے چہرے کھل اُٹھے۔ اور اہل ہندو پر خوف طاری ہو گیا پھر جب کچھ دیر بعد جوگی گوروں کا تاہم، اس کے چیلوں اور وہاں موجود اہل ہندو کا خوف کسی قدر کم ہوا تو اس جگہ کو گیا، جس کی طرف حضرت شیخ حسینؒ کی آواز نے اشارہ کیا تھا۔ پھر اس وقت ہزاروں مسلمان اور ہندو حیرت زدہ گئے، جب زمین کی گہرائی سے تسبیح، مصلیٰ، قرآن شریف اور سرخ دستار برآمد ہوئے۔ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر گوروں کا تاہم ہوتا تھا کہ وہ تازہ بہ تازہ ہیں۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے انہیں یہاں لا کر رکھا گیا ہو۔

یہ صورت حال دیکھ کر جوگی گوروں کا تاہم، اس کے چیلے اور دوسرے اہل ہندو حیرت زدہ رہ گئے۔ وہاں موجود لوگوں کو یہ ایک خواب کا سا منظر معلوم ہوتا تھا۔

جوگی گوروں کا تاہم پر کچھ دیر تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر جب اس کی حیرت زائل ہوئی تو اس نے با آواز بلند کہا۔ ”میں اس ثبوت کو تسلیم نہیں کرتا۔“

شیخ محمد صالحؒ اور حضرت شیخ حسینؒ کے دوسرے خلفاء نے سبب پوچھا تو جوگی گوروں کا تاہم نے پُر جوش لہجہ کہا۔ ”ان چیزوں کی تازگی بتا رہی ہے کہ تم نے گزشتہ رات، جب ہم لوگ سوئے ہوئے تھے، زمین کو دو کران اشیاء کو دفن کر دیا۔ اب دعویٰ کر رہے ہو کہ یہ جگہ ایک مسلمان کی ہے۔“ جوگی گوروں کا تاہم نے ایک عقلی دلیل پیش کی۔ ”اگر یہ اشیاء بہت پہلے سے یہاں دفن ہوتیں تو ان پر سال خوردگی اور کہنگی کی کوئی نہ کوئی علامت ضرور ظاہر ہوتی۔ جوگی گوروں کا تاہم کی اس دلیل پر شیخ محمد صالحؒ نے فرمایا۔ ”شیخ کے فرمودات کے مطابق ساری مذکورہ اشیاء زمین کی گہرائی میں دفن تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک رات کا قصہ نہیں ہے۔“ پھر شیخ محمد صالحؒ نے جوگی گوروں کا تاہم کے اس چیلے کو مخاطب کر کے کہا، جس نے وہ مخصوص جگہ بہت محنت کے بعد کھودی تھی۔ ”اے شخص! تو اپنے کو بتا کہ زمین کی کھدائی کرتے وقت تُو نے کیا محسوس کیا تھا؟“

گوروں کا تاہم کے اس چیلے پر حیرت کے ساتھ ساتھ ہلکا سا لرزہ بھی طاری تھا۔ اس نے اپنے گرو اور دیگر اہل

نہ ہوئے کہا۔ ”یہ زمین پتھر کی طرح سخت تھی اور اس کے کھودنے میں مجھے کافی محنت کرنی پڑی تھی۔“
گورکھ لاجپاں ہو گیا۔ مگر پھر بھی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر یہ تمام چیزیں برسوں سے زمین
تحتیں تو پھر اپنی اصلی حالت پر کیوں موجود ہیں؟ مٹی کا مزاج تو یہ ہے کہ وہ اپنے اندر دفن شدہ چیزوں کو چند
کے اندر کھا جاتی ہے۔ پھر ایسا کیوں نہیں ہوا؟“

گورکھ ناتھ کے اس سوال کا جواب، اہل ہندو کے پاس نہیں تھا۔ آخر حضرت شیخ حسینؒ کے خلیفہ، شیخ محمد
بنے پرستوں کے گروہ کو مٹی اور اس کی حقیقت بتاتے ہوئے کہا۔
”اے اولیائے اللہ کے جسم کو نہیں کھا سکتی۔ اسی طرح ان کی استعمال شدہ چیزیں بھی مٹی کے ضرر سے محفوظ رہتی

تھیں۔“ اس بیان کی گہرائی کو جوگی گورکھ ناتھ اور دوسرے اہل ہندو تو نہیں سمجھ سکے، مگر جس چیلے نے
فہمی کی، اس کی آنکھوں پر پڑا سیاہ پردہ ہٹ گیا اور اسے ایمان کی روشن دنیا صاف نظر آنے لگی۔
اب حضرت شیخ حسینؒ کو آپ کی وصیت کے مطابق جوگی گورکھ ناتھ کے مٹھ میں تیرہ سال بعد دوبارہ سپرد
بابا تو جس چیلے نے زمین کھودی تھی، وہ بے اختیار آگے بڑھا اور حضرت شیخ حسینؒ کی قبر سے لپٹ گیا۔
گما بے جونی (روٹی) جس کی تلاش نے مجھے در بدر پھرایا ہے۔ اب میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“
اگلے بعد گورکھ ناتھ کے چیلے نے شیخ محمد صالحؒ کے ہاتھ پر کلمہ پڑھا اور حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ پھر
اسے مخاطب ہو کر بولا۔ ”جو گیان جیتے جاگتے انسان نہ دے سکے، وہ ایک سادھی (قبر) سے مل گیا۔“



روایت میں کئی باتیں قابل غور ہیں جن سے مردان حق کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ برسوں پہلے
گورکھ کے مٹھ میں دفن کی جانے والی چیزوں کا صحیح و سلامت رہنا۔ آج بھی آئے دن اخبارات میں ایسی
اخبار ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں مقام پر بارش کی کثرت سے کوئی قبر کھل گئی..... اور پورا علاقہ ایک عجیب خوشبو
الٹا۔ پھر جب مقامی لوگ اس خوشبو کی تلاش میں گھروں سے نکلے تو ان پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ اس
بو کا خزانہ ایک قبر ہے۔ پھر جب اس قبر میں جھانکا گیا تو وہاں ایک بزرگ، کفن اوڑھے لیٹے تھے۔ بعد کی
معلوم ہوا کہ وہ سو سال پرانی قبر تھی، جس کا کفن تک میلا یا بوسیدہ نہیں ہوا تھا۔
ہا کریم کی ایک آیت مقدمہ کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔ ”عنقریب ہم تمہیں خارج میں بھی اپنی نشانیاں
ملیں۔“

م کے واقعات بھی اللہ کی نشانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۱۱۔ میں دو قبروں کے حوالے سے ایک ایسا تاریخ ساز واقعہ پیش آیا، جس سے متاثر ہو کر لاکھوں عیسائی اور
مسلم میں داخل ہو گئے تھے۔

ت مآب کے دو جلیل القدر صحابہ، حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ، دریائے دجلہ
کو خواب تھے۔ ایک رات والی عراق نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کو خواب میں دیکھا۔ آپ فرما رہے
کی قبروں کو کسی محفوظ جگہ منتقل کر دو۔ دریائے دجلہ کا پانی میرے بھائی جابر بن عبد اللہؓ کو زیادہ متاثر کر

ان نے اس خواب کو محض ایک خیال سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی۔

دوسرے دن حضرت حذیفہ بن یمانؓ دوبارہ حاکم عراق کے خواب میں تشریف لائے اور ان ہی الفاظ پر ہدایت کی۔

والی عراق نے اب کی بار خواب کو اہمیت دی۔ مگر حکومتی مصروفیات کے سبب وہ اپنے خواب کو یاد نہ کر سکا۔ تیسرے دن حاکم عراق کو پھر وہی خواب نظر آیا۔ لیکن اس مرتبہ بھی اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔ آخر چوتھے دن حضرت حذیفہ بن یمانؓ مفتی عراق کی خواب میں تشریف لائے اور فرمایا: ”والی عراق! سلطنتی امور کی انجام دہی میں ہماری بات یاد نہیں رہتی۔ اس لئے آپ ان کی توجہ اس طرف مبذول کر لیں۔“ صبح ہوتے ہی مفتی عراق، والی عراق کے پاس پہنچے اور اپنا خواب بیان کیا، جسے سننے ہی حاکم عراق کے پرشدید ندامت کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر اس نے مفتی عراق سے عرض کیا۔

”میری معلومات کے مطابق تو کسی مسلمان کی قبر کھولنا جائز نہیں۔ اگر آپ فتویٰ دیتے ہیں تو میں اتفاق دیتا ہوں۔“

جواب میں مفتی عراق نے فرمایا۔ ”کوئی فتویٰ موجود ہو یا نہ ہو، یہ ایک جلیل القدر صحابی کا حکم ہے، نے کی ہے بھی نہیں ٹالا جاسکتا۔“

اتفاق سے اس وقت عراق میں برطانوی انجینئر موجود تھے۔ والی عراق نے انگریز انجینئر سے طرہ پرکھا۔ عراق کا خیال تھا کہ دونوں صحابہ کرامؓ کی قبریں پانی سے محفوظ ہیں۔ اپنے اسی خیال کے تحت حاکم عراق نے انجینئر کی رائے معلوم کی تھی۔

مفتی اعظم نے قبروں کی منتقلی پر اصرار کیا تو والی عراق نے کہا۔ ”جب ہمارے پاس ایسے آلات موجود ہیں جن کی مدد سے پانی کے رخ اور بہاؤ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔“

مفتی اعظم خاموش ہو گئے..... اور برطانوی انجینئر، حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ قبروں سے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر کھدائی کرنے لگے..... اور اس وقت حاضرین حیرت زدہ رہ گئے۔ انتہائی گہرائی تک کھودنے کے باوجود پانی کے آثار تک نظر نہیں آئے۔

اس کے بعد مزید فاصلے پر کھدائی کی گئی۔ وہاں بھی پانی کے آثار نظر نہیں آئے۔ پھر یہ فاصلے بڑھتے رہے اور برطانوی انجینئر کی کھدائی جاری رہی۔ پھر حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی قبروں سے فرلانگ کے فاصلے پر پانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی انگریز انجینئروں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”دونوں قبروں کو دریائے دجلہ کے پانی سے کوئی خطرہ نہیں۔“

برطانوی انجینئر کے تجویز کی روشنی میں والی عراق نے مفتی اعظم سے کہا۔ ”میرے خیال سے اب قبروں کی منتقلی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔“

حاکم عراق نے سائنسی بنیادوں پر اپنے فیصلے کا اظہار کیا تھا۔ مگر مفتی عراق نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ ”میں عظیم صحابی رسول ﷺ کے حکم پر عقل کے کسی فیصلے کو ترجیح نہیں دے سکتا، چاہے دنیا بھر کے اہل دانش ایک ہی پر متفق ہو جائیں۔“

الغرض مفتی عراق کے حکم پر حضرت جابر بن عبد اللہؓ اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ کی قبروں کو کھولنے کا اعلان دیا گیا۔

اتفاق سے اس وقت حج کا زمانہ تھا۔ دنیا کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے اہل ایمان، مکہ معظمہ میں

ایمان سننے ہی تمام حجاج کرام نے والی عراق سے درخواست کی کہ وہ قبروں کی منتقلی کی کارروائی کو کچھ دنوں تک روک دیں..... تاکہ وہ بھی صحابہ کرامؓ کی زیارت کا اعزاز حاصل کر سکیں۔

برخبر ماری دنیا میں عام ہو گئی۔ تقریباً ایک سو پینتیس اخباری نمائندے عراق پہنچے۔ اس کے علاوہ بیشتر کے غارت کاری وہاں موجود تھے۔ مادہ پرستوں کا خیال تھا کہ تیرہ سو سال سے زیادہ زیر زمین دفن رہنے جس کی ہڈیاں بھی باقی نہیں رہی ہوں گی، پھر یہ لوگ کس چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کریں گے۔ زمانے میں برطانیہ میں ٹیلی ویژن ایجاد ہو چکا تھا۔ اس لئے ٹیلی ویژن کے ماہرین کی ایک جماعت بھی ٹیلی ویژن اور ایک بڑا اسکریمن نصب کر دیا تاکہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے جسد مبارک کی پوری ایک وقت لاکھوں عوام کو دکھائی جاسکے۔

غرض وہ تاریخ ساز لمحات آئے، جب دھڑکتے دلوں کے ساتھ حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت جابر بن ابی انیسؓ کی کھلی گئیں۔ صحابہ کرامؓ کے جسد مبارک دیکھ کر اہل ایمان کے چہرے ناقابل بیان مسرت سے کھل رہے۔ انھیں غریبوں کے چہروں پر مایوسیوں کا غبار پھیل گیا۔

اسے سنی اندازے اور تجزیات غلط ثابت ہو چکے تھے۔ برطانوی انجینئرز کا دعویٰ تھا کہ دونوں قبروں کو دہلے کے پانی سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ مگر جب صحابہ کرامؓ کی قبریں کھولی گئیں تو دریائے دجلہ کا پانی، جابر بن عبد اللہؓ کے پائے مبارک کو چھو رہا تھا..... اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ کے قدم مبارک سے چند فٹ بڑھ گیا۔

جب دونوں قبریں مکمل طور پر کھول دی گئیں تو انسانی آنکھ پر ایسا منظر موجود تھا کہ جسے دیکھ کر انسانی عقل بال عراق کی مٹی، صحابہ کرامؓ کے اجسام مبارک کو تو کیا چھوتی، ان برگزیدہ ہستیوں کے کفن تک صحیح و سالم تھے۔ زنت حذیفہ بن یمانؓ کی آنکھیں بند تھیں..... مگر حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور یوں دیکھا کہ صحابی رسول ﷺ کسی خوشگوار منظر کو دیکھنے میں مصروف ہیں۔ اس وقت جاپان کا سب سے بڑا ماہر زہنگی موجود تھا۔ وہ حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک دیکھ کر اسی وقت ایمان لے آیا۔ اس جاپانی ڈاکٹر نے دنیا کے نامور صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔

میں نے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے انتقال کر جانے والے انسان کی آنکھوں میں وہ رونق اور چمک دیکھی جو زندہ اور صحت مند انسانوں کی آنکھوں میں بھی موجود نہیں ہوتی۔“

برکے اخباری نمائندوں کی رپورٹس اور برطانوی ٹیلی ویژن کے فلم دکھانے کا یہ اثر ہوا کہ لاکھوں عیسائیوں میں نے اپنا آبائی مذہب بدل ڈالا اور وہ مذہب قبول کر لیا، جس کی مخالفت اور بیخ کنی میں آج تک اور امریکی حکومتیں مصروف ہیں۔

تمام مظاہرے اور واقعات اسی آسمانی حکم کے تابع ہیں، جس میں صاف صاف کہا گیا ہے۔

”انہیں مغرب خارج میں بھی اپنی نشانیاں دکھا دیں گے۔“

جو کہ گورکھ ناتھ کے منہ سے حضرت شیخ حسینؒ کی کچھ نشانیاں صحیح و سالم انداز میں ظاہر ہو گئیں تو اہل دل کو ہونا چاہئے۔ خواجہ حافظ شیرازی کا مشہور شعر ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

شبت است بر جریدہ عالم دوام ما !!

حضرت شیخ حسینؒ کے حوالے سے اس روایت کا کمزور ترین پہلو یہ ہے کہ جب جوگی گورکھ ناتھ نے اپنے مدفن کرنے پر اعتراض کیا تو حضرت شیخ حسینؒ کے جنازے سے آواز آنے لگی۔

کسی مُردہ جسم کا زندہ انسانوں سے گفتگو کرنا خلاف عقل بھی ہے، خلاف فطرت بھی اور خلاف تریبونِ ایک بار جو انسان خاموش ہو گیا، سو ہو گیا۔ اب اسے میدانِ حشر ہی میں اپنے جسم اور ہوش و حواس کے ساتھ اپنی اجازت ملے گی۔

برصغیر پاک و ہند کے ایک اور مشہور بزرگ، حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ کے بارے میں بھی ایسا ہی محیر العقول واقعہ مشہور ہے۔

روایت ہے کہ جب حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا انتقال ہوا تو ان کی تدفین پر بھی دو شہروں کے معتقدین میں کھڑا ہو گیا۔ یہ دونوں شہر، پانی پت اور کرناٹ ہیں، جنہیں جغرافیائی اعتبار سے مشرقی پنجاب میں شامل کیا جاتا ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا مزار مبارک، پانی پت اور کرناٹ دونوں مقامات پر موجود ہے۔ معتبر اور ثقہ روایات کے مطابق حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ، پانی پت میں آرام فرما ہیں۔ پھر اس واقعے کی کیا حقیقت کہ ایک ہی بزرگ کے دو محارات تھوڑے فاصلے پر موجود ہیں۔

روایت ہے کہ اپنے آخری ایام میں حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ پانی پت میں مقیم تھے۔ پھر یہیں آپ اپنے حقیقی سے جا ملے۔ پانی پت سے متصل شہر کرناٹ کے لوگ بھی حضرت قلندرؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ جب پانی پت والوں نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا جنازہ اٹھایا تو کرناٹ کے سینکڑوں معتقدین حرازم ہوئے۔ ”حضرت قلندرؒ، اہالیانِ کرناٹ سے زیادہ محبت فرماتے تھے، اس لئے یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اپنے شیخ کا جنازہ زمین میں آسودہ خاک کریں۔“

اس کے برعکس پانی پت کے لوگوں کی دلیل یہ تھی۔ ”حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے اپنی حیات مبارک کا آخری زمانہ ہمارے درمیان بسر کیا تھا، اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شیخؒ، پانی پت والوں کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔“ قلندرؒ کو کرناٹ کے لوگوں سے زیادہ محبت ہوتی تو وہ تمہارے درمیان موجود ہوتے۔“

پانی پت والوں کا دعویٰ مدلل تھا۔ مگر جہاں انسانی ہوش و حواس پر جذبات اور اندھی عقیدت کا غلبہ ہو، وہاں کوئی دلیل کام نہیں آتی۔ پانی پت کے ذی حیثیت اور ثقہ افراد، کرناٹ والوں کو سمجھاتے رہے۔ مگر جوشِ محبت نے انہیں انہماک و تقصیم کی منزل سے دور رکھا۔

پھر بات یہاں تک بڑھی کہ دونوں طرف سے تلواریں کھینچ گئیں..... اور دیگر آلاتِ حرب و ضرب باہر آئے۔ ۱۱۔ سنگین لمحات بہت قریب تھے کہ جب پانی پت اور کرناٹ کے لوگ آپس میں متصادم ہو جاتے..... اور پھر اہلِ کانچہ خوریزی کی صورت میں ظاہر ہوتا۔

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا جنازہ تیار تھا۔ بس تدفین کی رسم ادا ہونے ہی والی تھی کہ یہ خوف ناک تنازعہ کڑوا گیا۔ کسی ہوش مند کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جذبات کے اس سیلاب کے آگے کس طرح بند باندھا جائے گا۔ پھر حضرت بوعلی قلندرؒ کے جسم مبارک کو حرکت ہوئی۔ پھر آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور کرناٹ کے عقیدت مندوں کو غلبہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”تم لوگ اپنے طور پر تدفین کی تیاریاں کرو۔ خاموشی سے گھر لوٹ جاؤ..... اور کرناٹ جا کر دیکھو کہ وہاں پر جنازہ موجود ہے۔“

حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ کی آواز سن کر کرنال کے لوگوں نے سر جھکا دیئے..... اور چپ چاپ بیٹھ کر لٹ گئے۔

اب وہ لوگ اپنے گھروں کو واپس پہنچے تو حیرت زدہ رہ گئے۔ وہاں حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا جنازہ موجود تھا۔ فقیدت کے ساتھ مقامی باشندوں نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کو کرنال میں سپرد خاک کیا۔

یہ روایت، جس کے مطابق حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا مزار مبارک، پانی پت میں بھی ہے..... اور کرنال

میں قارئین پر واضح کر دیں کہ حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ، امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے مقلد نہیں تھے۔ اور آپ اپنے وقت کے نہایت عالم و فاضل صوفی تھے۔ محبوب الہی حضرت نظام الدین گیلانیؒ سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ اور سلطان علاء الدین خلجی جیسا باجرت حکمران نہ صرف آپ کا احترام کرتا بلکہ ملاقات کا آرزو مند رہتا تھا۔ اب اہل نظر اندازہ کریں کہ ایک ایسے بزرگ کے ساتھ خوش عقیدہ لوگوں کی محبت باقی منسوب کر دی ہیں۔

اب اسی طرح، جب حضرت شیخ حسینؒ کی دوبارہ تدفین کا قضیہ کھڑا ہوا تو خود حضرت شیخ حسینؒ کو زندہ کی طرح جوگی گورکھ ناتھ سے مخاطب ہونا پڑا۔

چنانچہ اپنی جگہ درست ہے، مگر اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ہمارے تذکرہ نگاروں نے ذمہ داری سے عمل کیا۔ بزرگان دین نے وصال کے بعد بھی اپنے خدمت گاروں، مریدوں اور عقیدت مندوں سے کلام کیا۔ کرباب کے ذریعے۔ اللہ اپنی قدرت کے ہر زاویہ اظہار پر قادر ہے۔ مگر یہ اس کا طریقہ نہیں کہ انسان مرنے کے دوبارہ زندوں کی طرح گفتگو کرے۔

جب جوگی گورکھ ناتھ اور اس کے چیلوں نے ہنگامہ آرائی شروع کر دی تو فتنہ و فساد سے بچنے کے لئے شیخ محمد نورؒ نے غطاء، حضرت شیخ حسینؒ کے جنازے کو اٹھا کر جوگی گورکھ ناتھ کی چار دیوای سے باہر لے گئے اور تمام کھانے کی ساری رات جاگتے رہے۔

پھر ان کے قریب شیخ محمد صالحؒ نے خواب میں پیرو مرشد کو دیکھا۔ حضرت شیخ حسینؒ اپنے خلیفہ کو مخاطب کر کے

فرمایا: ”اگر کلاں مقام سے تیج، مصلیٰ، قرآن شریف اور سرخ دستاؤ برآمد ہو جائے تو مکان ہمارا۔ ورنہ جوگی کا دعویٰ

جہاں تصوف میں ایسی بے شمار مثالیں نظر آجائیں گی کہ جب کسی بزرگ کا کوئی مرید کسی شدید مشکل سے دوچار تھا تو اسے ہدایت اور راہنمائی کی گئی۔ مرنے کے بعد بس ایک یہی تعلق باقی رہ جاتا ہے، جسے تصوف کی ”روحانی رابطہ“ کہا جاتا ہے۔

اب حضرت شیخ حسینؒ کی دوبارہ تدفین کے بعد جوگی گورکھ ناتھ شرمندہ بھی ہوا اور سخت پریشان بھی۔ تذکرہ کے بقول جوگی گورکھ ناتھ نے حضرت شیخ حسینؒ کے جنازے کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کیا۔

”اے مکان پر تو آپ کا قبضہ ثابت ہو گیا..... مگر میرے لئے کیا حکم ہے؟ اب میں کہاں جاؤں؟“
 ہمارے تذکرہ نگار، جنازے سے آواز آنے ہی کو کرامت کی معراج سمجھتے ہیں، اس لئے حضرت شیخ حسینؒ اور ان کی جوگی گورکھ ناتھ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

”اب تم پر لازم ہے کہ نلہ چلے جاؤ۔“ نلہ، لاہور ہی میں ایک جگہ ہے، جہاں اُس وقت اہل ہند کی آبادی جوگی گوروکھ ناتھ نے اپنے چیلوں اور سامان کے ساتھ ”مٹھ“ چھوڑ دیا اور نلہ کی طرف چلا گیا۔ ”مٹھ“ زبان میں اس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں سادھو، سنتوں اور جوگیوں کا ڈیرا ہوتا ہے۔

گوروکھ ناتھ کا وہ چیلہ، جو حضرت شیخ حسینؒ کی یہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہو گیا تھا، وہ قبر کے قریب ہی ایک کی طرح فروکش ہو گیا۔ دن بھر پیٹ بھرنے کی حد تک محنت مزدوری کرتا اور پھر حضرت شیخ حسینؒ کی قبر کے قریب کر پڑ جاتا۔ جھاڑو دیتا، چراغ روشن کرتا اور جنگل سے لاکر پھول چڑھاتا۔

جو لوگ حضرت شیخ حسینؒ کے مزار مبارک کی سجادہ نشینی کے خواب دیکھ رہے تھے، انہیں ایک نو مسلم ہندو؛ مرشد کی قبر پر پڑے رہنا شدید ناگوار گزرتا تھا۔ کئی بار حضرت شیخ حسینؒ کے خلفاء نے اس سے پلے جانے کا بھی کہا۔..... مگر وہ یہی کہتا رہا۔

”میں تو ان ہی کو دیکھ کر مسلمان ہوا ہوں..... پھر انہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں؟“ وہ نو مسلم شخص بار بار حضرت حسینؒ کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتا..... اور زار و قطار رونے لگتا۔

پھر ایک دن حضرت شیخ حسینؒ کے خلفاء اور دیگر مریدوں نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس نو مسلم کو ہندو کے مزار کی خدمت سے روک دیا جائے۔ ان مشورہ کرنے والوں میں حضرت شیخ حسینؒ کے خلیفہ شیخ محمد صالحؒ بھی نہیں تھے۔

پھر اسی رات حضرت شیخ حسینؒ کے تمام مریدوں نے اپنے پیر و مرشد کو خواب میں دیکھا۔ حضرت شیخ حسینؒ رہے تھے۔

”تم لوگ اس نو مسلم کی ظاہری حالت کو نہ دیکھو..... اس کے دل پر نظر ڈالو..... آج سے وہ ہمارا دیوان ہے۔ وہ اُس وقت تک خدمت کرتا رہے گا، جب تک کہ ہمارا محبوب مادھو آکر سجادہ نشینی کی مسند کو اپنی بخش دیتا۔“

یہ خواب حضرت شیخ حسینؒ کے خلفاء سے لے کر آپ کے ادنیٰ خدمت گار تک نے دیکھا۔ پھر محمد صالحؒ نے ”اس نو مسلم کے پاس تشریف لائے اور اسے یہ خوشخبری سنائی۔ شیخ محمد صالحؒ کی بات سن کر وہ دُعا وارفہ ہو گیا اور حضرت شیخ حسینؒ کی قبر مبارک سے اپٹ کر رونے لگا۔

”مجھے یقین تھا کہ میری محبت اور عقیدت رائیگاں نہیں جائے گی۔“

پھر وہ نو مسلم ”خاکی دیوان“ کے نام سے مشہور ہوا اور حضرت شیخ حسینؒ کے مزار کا عارضی سجادہ نشین بن گیا۔ اس واقعے میں ایک عجیب نکتہ پوشیدہ ہے۔ صوفیت کی بنیاد، ذہن و دل کی صفائی اور جذبات کی صداقت ہے۔ ایک مرید نہ صرف اپنے مرشد کا فرمان بردار ہوتا ہے، بلکہ مرشد کی ذات سے والہانہ شوق بھی رکھتا ہے۔ نو مسلم جوان کو حضرت شیخ حسینؒ سے بے پناہ محبت تھی، اس لئے وہ ایک ہی رات میں پسندیدہ ٹھہرا۔ لوگوں نے حضرت شیخ حسینؒ کی خدمت میں برسوں گزارے، وہ مرشد کی قربت حاصل نہ کر سکے۔ کیونکہ وہ بنیاد کی شدید طلب رکھتے تھے۔ مگر اس نو مسلم کو صرف حضرت شیخؒ کی ذات سے محبت تھی، اس لئے کسی ریاضت کے اس نے ایک ہی رات میں پیر و مرشد کی قربت حاصل کر لی۔

الغرض حضرت شیخ حسینؒ کے حکم کے مطابق وہ نو مسلم ”خاکی دیوان“ کے نام سے مشہور ہوا اور حضرت شیخؒ کی سجادگی (نیابت) کے فرائض انجام دینے لگا۔

کونسل تک یہ نو مسلم خاکی دیوان، حضرت شیخ حسینؒ کے مزار مبارک پر سجادہ نشین رہا۔ پھر ایک رات اسے بمبلیاٹ ہوئی۔ حضرت شیخ حسینؒ اپنے خاکی دیوان کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔

تیرے ہاں یہ سرخ دستار ہمارے محبوب شیخ مادھوؒ کی امانت ہے۔ جیسے ہی وہ یہاں آئیں، امانت بصدِ خلوص و امان کے پر در کر دینا۔“

بادشاہِ مقررہ پر شیخ مادھوؒ لاہور آئے۔ خاکی دیوان نے نہایت عقیدت کے ساتھ شیخ مادھوؒ کو دستار پیش کر

دیا۔ شیخ حسینؒ کے تمام خلفاء جمع ہوئے۔ شیخ مادھوؒ نے سب کے سامنے ”دستارِ سرخ“ باندھی اور اپنے پیروں کے جانشین قرار پائے۔

شاہِ عالم 1001ھ میں حضرت شیخ حسینؒ کی بیعت سے مشرف ہوئے تھے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ حضرت شیخ حسینؒ کا وصال 1008ھ میں ہوا۔ اس طرح پیر و مرشد کے انتقال کے وقت شیخ مادھوؒ پچیس سال کا دیوان تھے۔ اس کے برعکس حضرت شیخ حسینؒ کے دیگر خلفاء، عمروں میں شیخ مادھوؒ سے کہیں زیادہ تھے۔ لیکن وہ بھی کہ وہ لوگ ”سجادہ نشین“ حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کر رہے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں شیخ مجیدِ افسانہ کی سیادت دل سے قبول نہ ہو..... مگر صوفیت کے تو آداب اور قانون ہی نرالے ہیں۔ نہ یہاں انہیں دیکھا جاتا ہے..... اور نہ کم سنی و بزرگی..... بس مرشد کی نظر اور حکم ہی سب کچھ ہوتا ہے۔



بادشاہی کے سلسلے میں ایک اور روایت بھی بیان کی جاتی ہے، جس کا انداز دوسری روایتوں کی طرح طلسمی اور لہجہ ہے۔ ”حقیقت الفقراء“ اور ”کتابِ بہاریہ“ کے مصنفین کے مطابق جب شیخ مادھوؒ لاہور پہنچے تو خاکی دیوان ہمارے شیخ مادھوؒ کے سر پر سجائی..... اور خود زندہ زمین میں سما گیا۔

ظاہر ہے یہ بات تو تسلیم کی جاسکتی ہے کہ شیخ مادھوؒ کے آتے ہی خاکی دیوان کہیں روپوش ہو گیا اس لئے کہ ان کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ مگر ہمارے تذکرہ نگاروں نے جوشِ عقیدت میں خاکی دیوان کو بھی ایک ولی ثابت کر دیا۔ اور کرامت بھی کیسی کہ ایک زندہ انسان اپنی مرضی سے زمین کے اندر سما گیا..... یہاں سوال ہے کہ کیا ایک انسان اپنی زندگی اور موت پر قادر ہے؟ کہ جب چاہے سانس لینے لگے..... اور جب ناسے گزر جائے۔ خاکی دیوان کا زندہ زمین میں سما جانا، محیرِ العقول ہی نہیں، ناقابلِ یقین بھی ہے۔

زنتِ حسینؒ کے حاتون میں آج بھی یہ کہات مشہور ہے۔ ”مادھو آیا..... اور خاکی سما یا۔“

مالکِ مائے سے بھی مراد ہے کہ شیخ مادھوؒ کے آتے ہی خاکی دیوان زندہ حالت میں زمین کے اندر سما گیا۔ بے نزیک اس واقعے کی محضر، اتنی حقیقت ہے۔ ”آب آمد، تنیم بر خاست۔“ پانی مل جائے تو پھر تیم کی بات رہتی۔ اسی طرح شیخ مادھوؒ کے آجانے کے بعد خاکی دیوان کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ اس لئے وہ پوش ہو گیا..... یا پھر اس کا انتقال ہو گیا۔

نقت الفقراء“ اور ”کتابِ بہاریہ“ کی روایتوں کے مطابق جب حضرت شیخ حسینؒ کی وفات کو پورے تیرہ گئے تو شیخ مادھوؒ نے اپنا کمال دکھایا۔ ہندوستان سے آکر اپنے پیر و مرشد کے مزار پر سجادہ نشین ہوئے۔ پھر بعدِ قدرت الہی سے شیخ مادھوؒ، حضرت شیخ حسینؒ کے ہم شکل بن گئے۔ نقش و نگار کی اس تبدیلی پر دیکھنے ویدِ حیرت تھی۔ حضرت شیخ حسینؒ نے پرانے دوست، شیخ مادھوؒ کو دیکھ کر یہی کہا کرتے تھے۔

”حضرت شاہ حسینؒ نے دوسرا جنم لے لیا ہے۔“

”اولیائے لاہور“ میں من و عن یہی الفاظ تحریر کئے گئے ہیں۔ کسی کا ہم شکل ہونا الگ بات ہے اور دوسرا جنم بالکل مختلف چیز۔ ہندوؤں کے عقیدہ تناخ کے مطابق انسان بار بار پیدا ہوتا ہے اور مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے کبھی کبھی ناپاک جانور کے روپ میں بھی آ جاتا ہے۔ ہر چند کہ تذکرہ نگار کا یہ مقصد نہیں ہوگا۔ پھر بھی ایک سلسلہ بزرگ کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

حضرت شیخ حسینؒ کو 1021ھ میں دوبارہ دفن کیا گیا۔ شیخ مادھوؒ 1056ھ تک مزار مبارک کے سجادہ نشین رہے حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے وصال سے پہلے یہ پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ مادھو پینتیس سال تک سجادہ نشین رہے پھر میرے پاس چلا آئے گا۔ اسی پیش گوئی کے مطابق 1056ھ میں شیخ مادھوؒ کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر 3 سال تھی۔

شیخ مادھوؒ کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ نوعمری میں مسلمان ہو کر حضرت شیخ حسینؒ کے ارادت میں شامل ہوئے۔ اور تمام عمر فنا فی اللہ رہے۔ پھر جب شیخ مادھوؒ کا انتقال ہوا تو تمام دوستوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ اور اپنے مرشد حضرت شیخ حسینؒ کے برابر مدفون ہوئے۔

شیخ مادھوؒ کو اپنے پیر و مرشد، حضرت شیخ حسینؒ سے بے پناہ محبت تھی۔ اکثر لوگوں نے اپنی آنکھوں سے جائگداز منظر دیکھا ہے کہ شیخ مادھوؒ رات کی تنہائی میں پیر و مرشد کی قبر سے لیٹ کر روتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی گریہ و زاری، اتنی رنگ بھی اختیار کر لیتی تھی۔

مولوی نور احمد چشتی نے اپنی تالیف ”تحقیقات چشتی“ میں تحریر کیا ہے۔

”شیخ مادھوؒ اپنے پیر و مرشد، حضرت شیخ حسینؒ کی قبر سے لیٹ کر اکثر یہ اشعار بڑے دردناک لہجے میں پڑھتے تھے۔“

ٹو شدی با وصال حق ہم دم
مادھورا گزشتی در غم
ٹو شدی از جہاں بہ ناز و نعم
مادھو تو شدہ بہ درد دو نیم

”اے دوست! ٹو مجھ سے دُور چلا گیا۔ اور تجھے وصال حق حاصل ہو گیا۔ لیکن مادھو کو غم برداشت کرنے کے لئے اکیلا چھوڑ گیا..... دنیا سے تیرے جانے کا انداز تو یہ تھا کہ ٹو ناز و نعم کے ساتھ رخصت ہوا، لیکن تیرا مادھو، درد و شدت سے دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔“

شیخ مادھوؒ بنیادی طور پر ہندو برہمن تھے۔ اس لئے ان کی مادری زبان ہندی یا سنسکرت تھی۔ فارسی اشعار پڑھنا کا واضح مطلب یہ ہے کہ شیخ مادھوؒ نے مرید ہونے کے بعد فارسی زبان اپنے پیر و مرشد سے سیکھی تھی۔ اور حضرت شیخ حسینؒ ایک عالم و فاضل انسان تھے..... عربی اور فارسی زبانوں پر آپ کو عبور حاصل تھا۔

حضرت شیخ حسینؒ پنجابی زبان کے ایک عظیم شاعر بھی تھے۔ آپ کی شاعری کا بنیادی موضوع ”عشق حقین“ ہے۔ مگر اہل دنیا اس عشق کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ کہیں کہیں اس ملامت کا ذکر بھی ملتا ہے، جس کی قبا آپ زندگی بھر اڑھے رہے۔ حضرت شیخ حسینؒ کا بیشتر کلام ”کافیوں“ پر مشتمل ہے، جسے ڈاکٹر موبہن سنگھ دیوانہ نے شائع کیا ہے۔ پیر و مرشد کی تقلید میں شیخ مادھوؒ بھی پنجابی زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔ شیخ مادھوؒ کی شاعری ایک عام مواد

ان کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ افکار کے بجائے جذبات کی وارفتگی اور عشق کی سرمستی نمایاں ہے۔
ان کے ظہور صوفی شاعر خواجہ میر درد کا ایک شعر ہے۔

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر، جدھر دیکھا

ان خیال کو قدیم و جدید شعراء نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ شیخ حسین کی ایک ”کافی“ کا ترجمہ
پرواز صوفی، شفیق عقیل نے اپنی کتاب ”خیابان پاک“ میں اس طرح کیا ہے۔

میرے دل کے حال کا محرم اے میرے رب تُو
اندرو تُو ہے، باہر تُو ہے، دیکھوں جس ڈھب تُو
تُو ہی تانا، تُو ہی بانا، سب کچھ ہے اب تُو
شاہ حسین کہے بے چارہ، میں ناہیں سب تُو

پاک دہند کے عظیم صوفیاء کی طرح نہ تو حضرت شیخ حسین کے ملفوظات محفوظ ہیں، نہ شیخ مادھو کے ارشادات کا
ہنا ہے۔ شاعری سے ایک صوفی کے خیالات و اعتقادات کا تو اندازہ ہوتا ہے، مگر شعر و سخن کے ذریعے تصوف
میں نازک مسائل اور مشکل مقامات کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔

اس لئے ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ شیخ مادھو نے پینتیس سال کی سجادہ نشینی کے دوران اسلام کے حوالے
رہنمائی کا سلسلہ کس طرح جاری رکھا؟ شیخ مادھو کی تعلیمات کیا ہیں اور اپنی طویل زندگی میں وہ کس طرح
معمل رہے۔ شیخ مادھو کے مرشد حضرت شیخ حسین تو زندگی بھر ”کوچہ ملامت“ کے مسافر رہے۔ بس ایک روایت
بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ حسین اپنے آخری دنوں میں اپنے اعمال ظاہری سے تائب ہو کر نماز اور
میں مشغول ہو گئے تھے۔ مگر شیخ مادھو کے بارے میں ایسی کوئی تاریخی سند موجود نہیں کہ آپ بھی اپنے مرشد کی
آخری سانس تک ”کوئے ملامت“ میں سرگرداں رہے۔ یا پھر آپ نے شریعت ظاہری کا راستہ اختیار کر لیا تھا؟
مغل شہزادے، داراشکوہ نے اپنی تصنیف ”شطحیات“ میں حضرت شیخ حسین کو ”لاماعیہ کا سردار“ لکھا ہے۔ چونکہ
مرشد شیخ حسین کے نائب اور سجادہ نشین تھے، اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آپ بھی اپنے مرشد ہی کے راستے
چل رہے ہوں گے۔

شہزادہ داراشکوہ نے ایک مقام پر یہ بھی تحریر کیا ہے کہ مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر کو شیخ مادھو سے بہت زیادہ
عشق تھا۔ فرماں روا نے ہندوستان کے اپنے ایک منشی بہار خان کو بطور خاص اس کام پر متعین کیا تھا کہ وہ شیخ مادھو
شب و روز کی تفصیلات قلم بند کرے۔ تاریخ ہند سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر ایک رند
بازار میں پرست انسان تھا۔ ملکہ نور جہاں کی محبت میں گرفتاری کے سبب اس پر بد عقیدگی کے سائے بھی پڑنے
لگے۔ اور وہ ایک طویل عرصے تک اپنے گمراہ باپ، شہنشاہ اکبر کے ایجاد کردہ ”دین الہی“ کے بھی زیر اثر رہا
اس لئے شیخ مادھو سے عقیدت رکھنے کا ایک سبب دو رنگ ملامت بھی ہو سکتا ہے، جو حضرت شیخ حسین اور شیخ
دلی خاں پچان تھی۔ مختصر یہ کہ شیخ مادھو کی پینتیس سالہ ”سجادہ نشینی“ کے واقعات صدیوں کے غبار میں گم ہیں۔
فصل عقیدہ لوگوں سے نہایت معذرت کے ساتھ کہ جو تذکرے، بازاروں میں موجود ہیں، ان پر اعتبار نہیں کیا جا
سکتا۔ ان کتابوں کے مطالعے سے حضرت شیخ مادھو کی صوفیانہ شخصیت بھی مجروح ہوتی ہے۔ اور عام مسلمان قارئین کا
خیال متضرر ہوتا ہے۔



اب ہم مغل شہزادے، داراشکوہ کے اس بیان پر تفصیلی بحث کریں گے کہ حضرت شیخ حسینؒ ”نزدیک مغل شہزادے“ سردار تھے۔

سب سے پہلے حضرت شیخ حسینؒ کے پیر و مرشد، حضرت شیخ بہلول قادریؒ کا واقعہ..... ہم پہلے عرض کریں گے کہ حضرت شیخ بہلول دریا کی قادریؒ اپنے کم سن مرید، حضرت شیخ حسینؒ کی روحانی تکمیل کر کے واپس چاہتے تھے۔ اس وقت حضرت شیخ حسینؒ کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس کے بعد مرشد اور مرید کے درمیان ایک طویل اور حائل ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ پھر جب حضرت شیخ حسینؒ ”تفسیر مدارک“ کو مکمل میں ڈالنے اپنے استاد حضرت شیخ سعد اللہ کے مکتب سے اٹھے اور مکمل رنگِ ملامت اختیار کر لیا تو ایک دن کی ٹھنڈی غصہ سے شیخ بہلولؒ سے کہا۔

”آپ کا مرید، شیخ حسینؒ شریعت کے دائرے سے باہر ہو گیا ہے۔ اُس کی خبر لیجئے۔“

بعض روایتوں کے مطابق جب حضرت شیخ حسینؒ کے رنگِ ملامت اختیار کرنے کی خبریں عام ہوئیں تو وقت حضرت شیخ بہلول دریا کی چنیوٹ میں مقیم تھے۔ آپ فوری طور پر لاہور تشریف لائے۔

”کتاب بہاریہ“ کے مصنف، بہار خان منشی کے بقول حضرت شیخ بہلول دریا کی نے لاہور آکر مراقبہ اپنے مرید، حضرت شیخ حسینؒ کی روحانی کیفیت کا مشاہدہ کیا۔ مرشد کو اپنا مرید، واصل بحق نظر آیا۔ اس نے حضرت بہلول دریا کی، حضرت شیخ حسینؒ کو اسی حالت میں چھوڑ کر واپس تشریف لے گئے۔ پھر 983ھ میں حضرت شیخ بہلولؒ کا وصال ہو گیا۔

ہمارے نزدیک مغل شہنشاہ، نور الدین جہانگیر کے منشی، بہار خان کی یہ روایت نامکمل بھی ہے اور نامعتبر بھی۔ نامکمل اس لئے کہ حضرت شیخ حسینؒ کے کوچہ شریعت سے نکل کر ٹوئے ملامت کی طرف چلے جانے کی خبر کوئی مولیٰ خبر نہیں تھی۔ حضرت شیخ بہلولؒ کا لاہور آنا۔ اور صرف مراقبے کے ذریعے اپنے مرید، حضرت شیخ حسینؒ کی روحانی کیفیت سے مطمئن ہو جانا، خلاف عقل ہے۔ یہ ایک مرید کے ”عقائد اور ایمان“ کا مسئلہ تھا، جسے ”مراقبہ“ یا ”مباحثہ اور مذاکرہ“ ایک لازمی اور فطری امر تھا۔ مگر ہمارے تذکرہ نگاروں کا دعویٰ ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ نے صرف چشم تصور سے دیکھا اور اپنے مرید کو ”واصل بحق“ پا کر دوبارہ چنیوٹ تشریف لے گئے۔ ”واصل بحق“ مفہوم ہے ”اللہ کی محبت میں فنا ہو جانا۔“

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرت شیخ حسینؒ یا دالہی میں غرق تھے مگر منشی بہار خان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ”واصل بحق“ کا لفظ حق پر قائم ہونے کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت شیخ حسینؒ کا ظاہری طرزِ عمل، احکام حق کے مطابق نہیں تھا۔

منشی بہار خان کی روایت کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ کا لاہور آنا اور حضرت شیخ حسینؒ ان کے ترک شریعت پر گفتگو کئے بغیر واپس تشریف لے جانا۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ حضرت شیخ بہلولؒ، برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ قادریہ کے نامور بزرگ تھے۔

امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے مسلک سے تعلق رکھنے کے باعث آپ شریعت کے معاملات میں بہت سخت

حضرت شیخ بہلولؒ کو حضرت شیخ حسینؒ کے ”رنگِ ملامت“ اختیار کرنے کا پتہ چل جاتا تو آپ اس طرح ناگوار رہ سکتے تھے۔ جس مرید نے اپنے روحانی بزرگوں کا طریقہ چھوڑ کر نئی روش اختیار کر لی تھی، اس کی طرف ناپسندیدگی کے ساتھ چشم پوشی نہیں کی جاسکتی تھی۔ عقل کسی دلیل کے بغیر تسلیم کرتی ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ نے نبیؐ حسینؑ کو اپنا راستہ بدل لینے پر بہت سمجھایا ہوگا۔ اور اصولی طور پر ان کی اصلاح کی کوشش بھی ضرور کی ہو گی۔ مرشد وہی ہے، جو ہر حال میں اپنے مرید کے حال سے باخبر رہتا ہے۔ اگر صراطِ مستقیم پر چلتے چلتے مرید بڑھو کر جاتا ہے تو اسے سہارا دے کر دوبارہ سیدھے راستے پر گامزن کر دیتا ہے۔ اگر مرید کسی بڑی مشکل میں اپنے مرشد سے اپنی روحانی طاقت کے ذریعے مشکل سے نکال دیتا ہے۔

عزتِ ثوثِ اعظمؒ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مشہور قول ہے۔

”میرے مرید یا میرے مریدوں کے مرید یا ان کے کسی عقیدت مند کی سواری کو ٹھوکر لگ جائے تو عبدالقادر والے اس مشکل سے نکال دے گا۔“ اس کے بعد حضرت عوثؒ اعظمؒ نے فرمایا۔ ”چاہے وہ شخص مغرب ہی جانے ہو۔“ مغرب سے مراد طویل فاصلہ ہے۔

یہ حضرت شیخ بہلولؒ دریاہیؒ اور حضرت شیخ حسینؒ کا تعلق بھی سلسلہ قادریہ سے ہے، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں مہرت شیخ بہلولؒ، حضرت شیخ حسینؒ کو اس حال میں چھوڑ کر واپس چلے جاتے۔

اس ذیل میں ”مرشد و مرید“ کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے تاریخ تصوف کا ایک مشہور واقعہ تحریر کرتے ہیں۔ بد اللہ حضرت جنید بغدادیؒ کا ایک مرید بصرہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ پھر ایک دن شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے، حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے مرید کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ شخص، جس کے شب و روایات میں گزرتے تھے، یکایک اس کا ذہن گناہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور اس خیال سے اس کے دل میں محسوس کی۔ شیطانی وسوسہ اس قدر شدید تھا کہ وہ شخص کسی طرح بھی اپنے خیالِ فاسد پر قابو نہ پاسکا۔ بالکل میں پوری رات تمام ہو گئی۔ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کا مرید صبح اٹھا تو اس نے اپنے اندر ایک ناگوار سی لہجہ کی۔ پھر جب اس نے اپنا خط (داڑھی مونچھ) بنانے کے خیال سے آئینہ دیکھا تو بے اختیار اس کی چیخ ایک خوش شکل انسان کا چہرہ منجھ ہو چکا تھا۔

اے رب العالمین! اہل دنیا مجھے کیا کہیں گے؟ اپنی بگڑی ہوئی صورت لے کر ان کے سامنے کس طرح جاؤں۔ اور در تک میری پارسائی کی باتیں مشہور ہیں۔ لوگ میرے زہد و اتقا کی مثالیں دیتے ہیں۔ اب اگر بصرہ میرے منجھ چہرے کو دیکھیں گے تو یقینی طور پر یہی کہیں گے کہ میری عبادت و ریاضت ایک فریب تھی۔ اس کی آڑ میں چھپ کر گناہ کیا کرتا تھا۔ چوں کہ خلوت میں روند آں کار دیگر می کنند۔“

مرت شیخ جنید بغدادیؒ کا مرید گریہ و زاری کے ساتھ توبہ و استغفا کرتا رہا۔ مگر اس کا بگڑا ہوا چہرہ اپنی اصلی ہوا پس نہیں آیا۔

مرد کے بہت سے لوگ اس کی صحبت میں بیٹھ کر شرعی اور دینی گفتگو سے فیض یاب ہوا کرتے تھے۔ پھر جب ان کو گزرم گیا تو حسب معمول لوگ آنا شروع ہو گئے۔ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے مرید نے شرم و رسوائی کے سے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ اگر کوئی عقیدت مند، دروازہ کھولنے کے لئے التجا کرتا تو وہ شخص غضب ناک یا جواب دیا۔

”مرد لوگ صرف اپنی طلب اور غرض کے بندے ہو۔ میری طبیعت کی ناسازی کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ آج

میں کسی سے نہیں ملوں گا۔“

جواب میں عقیدت مند دوبارہ عرض کرتے۔ ”ہم آپ کی عیادت اور مزاج پر ہی کے لئے تو حاضر ہیں۔ اگر بیمار ہیں تو ہم کسی طبیب کو لے آتے ہیں۔ اور ہماری خدمات کی ضرورت ہے تو ہم حاضر ہیں۔“ اپنا عیب چھپانے کے لئے وہ التجاؤں کا جواب انتہائی درشت لہجے میں دیتا۔ ”مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں میرے لئے میرا اللہ ہی کافی ہے۔“

آخر سارے عقیدت مند مختلف انداز میں چیمگیوئیاں اور سرگوشیاں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے مرید کا پورا دن شدید اذیت و کرب میں گزرا۔ پھر وہ ساری رات اللہ کے غم میں سجدہ ریز رہا اور اپنے اس خیالی گناہ کی معافی مانگتا رہا۔

پھر اس نے نماز فجر ادا کر کے ڈرتے ڈرتے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ نقش و نگار کی سیاہی کی تدرک ہو گئی۔ مگر ابھی وہ اپنے عقیدت مندوں کے سامنے جانے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ عقیدت مند دوسرے دن بھی مقررہ وقت پر آئے، مگر حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے مرید نے یہ کہہ کر انہیں سے ملنے سے انکار کر دیا۔

”ابھی میں تم لوگوں سے ملاقات نہیں کر سکتا۔ میری بیماری بدستور ہے۔ دعا کرو کہ مجھے اس مرض سے نجات حاصل ہو جائے۔“

وہ لوگ تو خود ایک دلی کی دعاؤں کے محتاج تھے، اس کے لئے کیا دعا کرتے؟ ذہن میں سنکڑوں دوسرے اندیشے لئے ہوئے واپس چلے گئے۔

دوسرے دن حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے مرید کی سیاہی کچھ اور کم ہو گئی۔ پھر تیسرے روز اس شخص کا چہرہ اپنا اصلی حالت پر لوٹ آیا اور پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔ بار بار آئینہ دیکھتا تھا اور نہایت رقت آمیز لہجے میں کہتا تھا۔

”یا ارحم الراحمین! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنے بندوں کے درمیان رسوا ہونے سے بچالیا۔“

چوتھے دن حضرت سیدنا شیخ بغدادیؒ کا مرید اپنے عقیدت مندوں اور ملاقاتیوں کا انتظار کر رہا تھا کہ اپنا کمر دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر تیزی کے ساتھ دروازہ کھولا تو ایک اجنبی شخص کو اپنے سامنے موجود پایا۔ آنے والے نے سلام کیا اور کہنے لگا۔ ”میں بغداد سے تمہارے نام حضرت شیخ کا خط لے کر آیا ہوں۔“

پیر و مرشد کا نام سن کر وہ مرید وارفتہ ہو گیا۔ اور اس نے اجنبی شخص کے ہاتھ سے حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کا خط لے لیا اور نہایت عقیدت کے ساتھ مرشد کے مکتوب کو بوسہ دینے لگا۔ پھر جب اُس کی یہ اضطراری کیفیت کم ہوئی تو اجنبی شخص سے بیٹھنے کے لئے کہا۔

”مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ اس لئے میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا۔“ اجنبی یہ کہہ کر چلا گیا۔

اجنبی شخص کے جاتے ہی مرید نے پیر و مرشد کا خط کھولا اور بے تابانہ پڑھنے لگا۔ جب وہ آخری الفاظ تک پہنچا تو اس پر گہری رقت طاری ہو گئی۔ پھر وہ اس قدر رویا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا۔

”میرے عزیز! مجھ سے کیا قصور ہو گیا تھا کہ تم نے مجھے اس کام پر لگا دیا۔ میں تین دن سے دھوپ کا کام کر رہا ہوں۔ اور مسلسل تمہارے چہرے کی سیاہی دھو رہا ہوں۔ یاد رکھو! کہ اہل اللہ کا محاسبہ بہت سخت ہوتا ہے۔ ان کے

کہا: کافعال گزرتا ایسا ہی ہے کہ جیسے وہ گناہ کے مرتکب ہو گئے ہیں۔“

ان واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرشد کو اپنے مرید کے ساتھ کیسا تعلق خاطر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی شیخ کو غلطی کے لئے ”دھولی“ کا فریضہ بھی انجام دینا پڑتا ہے۔ حضرت شیخ حسینؒ کے ساتھ چہرے کی سیاہی کا عجیب فائدہ مگر آپ نے واضح طور پر شریعت کے ظاہری آداب ترک کر دیئے تھے۔ اور سلسلہ قادریہ کی معروف ”تجوار“ ”طاعیہ“ کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ اس صورت حال کے حوالے سے ایک عام انسان کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کو سلسلہ قادریہ کے راستے پر واپس لانے کی کوشش کی تھی؟

جی ہاں! ہمارے سامنے شہنشاہ جہانگیر کے منشی بہار خان کی ایک ہی روایت موجود ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ نے مرید حضرت شیخ حسینؒ کے ذہنی انقلاب کی خبر سن کر لاہور تشریف لائے تھے۔ مگر مراقبہ کے ذریعے یہ لوگ کہ شیخ حسینؒ واصل بحق ہیں، حضرت شیخ بہلولؒ واپس چلے گئے۔

ہمارے نزدیک منشی بہار خان کی یہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ تصوف اور صوفیاء کی تاریخ سے معمولی آگہی رکھنے والے بھی اس راز سے باخبر ہے کہ ایک مرید اپنے سلسلے کے آداب کی مکمل پابندی کرتا ہے۔ اس کی بنیادی بات (اوراد و وظائف) پر پورے خلوص اور اعتقاد کے ساتھ عمل پیرا رہتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیرو کے گزر جانے کے بعد دوسرے سلسلے میں بھی بیعت ہو جاتا ہے۔ بعض صوفیائے کرام، چاروں مشہور سلسلوں (قادیانیہ، چشتیہ اور سہروردیہ) سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر کوئی بزرگ چاروں سلسلوں میں بیعت ہے تو وہ ان سلسلوں کی تعلیمات کا پابند رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی صوفی اپنے ذاتی کمالات روحانی کے باعث اس غیرت و محبوبیت حاصل کر لیتا ہے کہ وہ ایک نئے سلسلے کا بانی قرار پاتا ہے۔ مثال کے طور پر محبوب الہی حضرت بابا بلیہؒ اولیاء سلسلہ چشتیہ کے بزرگ تھے۔ بعد میں آپ کی تعلیمات عالیہ سے متاثر ہو کر بعض صوفیاء نے اپنے بزرگ کے ساتھ ”نظامی“ لکھنا شروع کر دیا۔ چونکہ سلسلہ نظامی کی بنیاد سلسلہ چشتیہ ہے تو وہ بزرگ، نظامی کے ساتھ ”نظامی“ ہی تحریر کرتے تھے۔

ان طرح حضرت شیخ حسینؒ بھی سلسلہ قادریہ میں نہ صرف بیعت تھے بلکہ اس سلسلے کی تعلیمات کے پابند بھی تھے۔ مگر جب آپ نے ملائیوں کا طریقہ اختیار کیا تو حضرت شیخ بہلولؒ پر لازم تھا کہ وہ حضرت شیخ حسینؒ سے شریعت کے سلسلے میں طویل گفتگو کرتے۔ مگر ہمارے تذکرہ نگاروں نے حقائق کو ظاہر کرنے کے بجائے اپنی ذاتی ترقی کا مظاہرہ کیا اور نہایت بے باکی کے ساتھ تحریر کر دیا کہ حضرت شیخ بہلول دریا کی، حضرت شیخ حسینؒ کو اسی پابلاط میں چھوڑ کر چھوٹ واپس چلے گئے۔

حضرت بابا بلیہؒ شاہ بھی سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ تھے۔ اور اپنے وقت کے ایک بڑے فقیہ، مولانا غلام رحیم کے شاگرد تھے۔ پھر جب حضرت بابا بلیہؒ شاہ نے استاد کی تعلیمات کے برخلاف محفل سماع آراستہ کی تو مولانا ذہن نشین نے نفوی جباری کر دیا کہ ایسی محفلوں کو زبردستی بند کر دیا جائے۔

نصوف میں حضرت بابا بلیہؒ شاہ، حضرت عنایت قادریؒ سے بیعت تھے۔ پھر جب ایک معمولی بات پر حضرت نہایت قادریؒ اپنے محبوب مرید، حضرت بابا بلیہؒ شاہ سے ناراض ہو گئے تھے تو مرشد کو منانے کے لئے حضرت بابا بلیہؒ اپنے پیروں میں گھٹکھروا باندھ کر بھری محفل میں ناچے تھے۔

ان مثالوں کی موجودگی میں یہ بات کس طرح تسلیم کی جاسکتی ہے کہ سلسلہ قادریہ کی تعلیمات کو نظر انداز کرنے

پر حضرت شیخ بہلولؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کو تنبیہ یا فہمائش نہ کی ہو۔

قارئین پر واضح ہونا چاہئے کہ مشہور بزرگ حضرت منصور حلاجؒ، سید الطائفہ حضرت سیدنا شیخ جنید بغدادیؒ مرید تھے۔ پھر جب طویل سیاحت کے بعد حضرت منصور حلاجؒ واپس آئے اور اپنے مرشد سے بحث کرنے کے لیے حضرت شیخ جنید بغدادیؒ نے ان پر اپنی خانقاہ کے دروازے بند کر دیئے۔

حضرت شیخ حسینؒ کے سلسلے میں اب دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فرقہ ملائعہ میں شامل ہونے کے بعد حضرت شیخ حسینؒ اور حضرت شیخ بہلولؒ کی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ 983ھ میں حضرت شیخ بہلولؒ وصال ہو گیا۔ اور پیر و مرشد کی وفات کے بعد حضرت شیخ حسینؒ کوچہ ملامت میں پچیس سال تک سرگرم سزاوار 1008ھ میں پھر خود بھی آسودہ خاک ہو گئے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کو ترک شریعت پر فہمائش کی تھی۔ مگر حضرت شیخ حسینؒ نے پیر و مرشد کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا اور اپنے انداز فکر پر قائم رہے تھے۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ جیسے حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے استاد گرامی حضرت شیخ سعد اللہؒ سے ایک آیت مقدسہ کے مفہوم کے سلسلے میں اختلاف کیا تھا اور مدرسے سے ہمیشہ کے لئے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ پھر آپ نے ”تفسیر مدارک“ کوئیں میں دال دی اور اپنے ساتھی طلباء سے بطور فخر کہا تھا۔

”اب مجھے اس کی حاجت نہیں۔ جسے ضرورت ہو، لے لے۔“

ہم حضرت شیخ حسینؒ سے حُسن ظن رکھتے ہیں۔ وہ اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ بہلولؒ کے سامنے یہ انداز اختیار نہیں کر سکتے تھے کہ پیر و مرشد انہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک جائیں۔ اور پھر شیخ اپنے مرید کو اسی حالت میں مجبور واپس چلے جائیں۔

ہمارے نزدیک اس حوالے سے ایک تیسری صورت ہے، جو ”مرشد اور مرید“ کے مخلصانہ تعلقات کو برقرار رکھتی ہے۔ تمام تذکرہ نگاروں نے بالاتفاق تحریر کیا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ نے پچھتیس سال کی عمر میں اپنے استاد گرامی حضرت شیخ سعد اللہ لاہوریؒ کا مکتب چھوڑا۔ یہ 981ھ کا واقعہ ہے۔ منشی بہار خان کی روایت کے مطابق حضرت شیخ بہلول دریاہیؒ نے 983ھ میں وفات پائی۔ شیخ سعد اللہؒ کے مکتب چھوڑنے اور حضرت شیخ بہلولؒ کے زمانہ وفات میں مشکل سے ڈیڑھ دو سال کا وقفہ ہے۔ یہ کوئی طلسمی کہانی نہیں کہ استاد گرامی کا مکتب چھوڑتے ہی حضرت شیخ حسینؒ کوچہ ملامت میں داخل ہو گئے تھے اور آپ کے فرقہ ملائعہ اختیار کرنے کی خبریں چشم زدن میں عام ہو گئی تھیں۔ جنہیں سنتے ہی حضرت شیخ بہلولؒ، چنیوٹ سے دوڑے ہوئے لاہور چلے آئے تھے۔ حضرت شیخ حسینؒ کو شریعت اسلامی کے ظاہری آداب ترک کرنے میں کچھ عرصہ لگا ہو گا۔ پھر ان کی شراب نوشی اور سر بازار قتل کرنے کے افسانے عام ہوئے ہوں گے۔ اور اس کے بعد حضرت شیخ بہلولؒ تک یہ پریشان کن خبریں پہنچی ہوں گی۔ مگر اس وقت تک حضرت شیخ بہلولؒ دنیا سے گزر چکے ہوں گے۔

حضرت شیخ بہلولؒ کی رحلت اور حضرت شیخ حسینؒ کی ترک شریعت کا زمانہ اتنا قریب ہے کہ بہت سے سوالات اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ہماری اپنی تحقیق کے مطابق 981ھ میں حضرت شیخ حسینؒ تکرری اور ذہنی انقلاب سے دوچار ہو گئے تھے اور انہیں فرقہ ملائعہ کا سردار بننے میں کم سے کم پانچ سال ضرور لگے ہوں گے۔ اور اس وقت حضرت شیخ بہلولؒ اس دنیا میں موجود نہیں تھے۔

اگر منشی بہار خان کی اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت شیخ بہلولؒ، حضرت شیخ حسینؒ سے ملے لاہور

بنائے اور پھر اپنے مرید کو کوچہٴ ملامت میں چھوڑ کر واپس چلے گئے تو بات بہت اُلجھ جاتی ہے۔ تذکرہ نگار کو بالکل کہ تصوف میں اپنے سلسلے سے بغاوت کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔ ایسے نازک موقع پر حضرت شیخ بہلولؒ کی شان اور اپنے مرید کی نئی روش کا اثبات، خود ان کی روحانی شخصیت کی نفی کرتا ہے۔ اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ نئے شیخ حسینؒ کو کوچہٴ ملازمت میں بھٹکتے دیکھ کر حضرت شیخ بہلولؒ نے سکوت اختیار کیا ہو اور اپنے مرید کی نئی باطنی ترقی کر دی ہو۔

بہتری صورت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ نے حضرت شیخ حسینؒ کو سمجھایا ہو۔ مگر کوچہٴ ملامت بہانے اپنے پیر طریقت کو بھیجی وہی جواب دیا ہو کہ اب مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ دنیا کی زندگی لہو و لہو۔ اور میں زندگی کے باقی ایام اسی لہو دلب میں بسر کروں گا۔

الحق یہ کہ شاگردی اور مریدی میں ایک نمایاں فرق ہوتا ہے۔ شاگرد ہوتے وقت کوئی طالب علم، استاد کے لئے غفلت نہیں اٹھاتا۔ اس کے برعکس جب کوئی شخص کسی سلسلے میں بیعت ہوتا ہے تو اس کے قول و قرار ایک حلف یا لگائے ہوئے ہیں۔ پھر جب مرید اپنے حلف سے منحرف ہوتا ہے تو بیعت خود بخود فسخ ہو جاتی ہے۔ اگر فسخ نہیں ہوتا تو خلاف ورزی کرنے والے مرید کو روحانی طور پر سزا ملتی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ حضرت شیخؒ نے اپنے پیر و مرشد کو شیخ محمد اللہؒ کی طرح جواب دیا ہو۔ خدا خواستہ اگر وہ ایسا کرتے تو سلسلہٴ قادریہ سے خارج ہو جاتے۔ اور ان کی ہر ایک کرامات سلب ہو جاتیں۔

ہمارے تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ حسینؒ کی بے شمار کرامات کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ سب حضرت شیخ بہلولؒ اور سلسلہٴ قادریہ کا فیض روحانی تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ نے اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ بہلولؒ کے وصال کے بعد ملامتیہ کا طریقہ اختیار کیا۔

نئی بہار خان تو خود ایک رنگین مزاج بادشاہ کا درباری تھا۔ اس نے فرماں روا کے ہند کی شراب نوشی، خُسن پُستی، فیملی سردی کی توجیہ پیش کرتے ہوئے حضرت شیخ حسینؒ جیسے بزرگ کے اعمال میں بھی یہ سارے مشاغل شامل کر دیے۔ اور آخری مثال کے طور پر حضرت شیخ بہلولؒ جیسے ثقہ صوفی کا حوالہ پیش کر دیا کہ وہ بھی حضرت شیخ حسینؒ کے ملامت سے مطمئن تھے۔ ہمارے نزدیک یہ مثنیٰ بہار خان کی جہالت، کذب بیانی اور تہمت طرازی ہے کہ ان کے بارشاد وقت کو خوش کرنے کے لئے سلسلہٴ قادریہ کے دو عظیم بزرگوں کی ذات گرامی سے بے سرو پا افسانے نہ بن کر دیئے۔ اور اسلامی تصوف کو ہندو دیو مالا کے مقابل لا کر کھڑا کر دیا۔



ہمارے یہاں جاہل مسلمانوں اور بے عمل صوفیاء میں ”فرقہٴ ملامتیہ“ کا بہت شہرہ۔ جس بے عمل پیر کو شریعت اور لہجہ کا آئینہ دکھاؤ، اس کے مرید برجستہ ایک ہی جواب دیتے ہیں۔

”ہمارے مرشد نے اپنی ذات پر ”ملا مت“ کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ درندہ در پردہ وہ کچھ اور ہیں۔ دنیا کو بے نمازی قرار دیتے ہیں، لیکن حقیقتاً اپنی روحانی پرواز کے ذریعے خانہٴ کعبہ میں نماز ادا کرتے ہیں۔ بظاہر رمضان المبارک کے پچیس دن کھانا کھاتے ہیں، مگر اصل میں روزے سے ہوتے ہیں۔“

ان رات ناپائے اور خوب صورت لڑکوں کی صحبت میں رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو ملامت کر رہے ہیں۔ شب روز طوائفوں کا رقص دیکھ رہے ہیں اور توجیہ پیش کی جا رہی ہے کہ نفس کشی کر رہے ہیں۔ منشیات کے ہڈوں اور انگلیوں کی قیمتی نذریں قبول کر رہے ہیں اور جواز پیش کیا جا رہا ہے کہ اپنی ذات پر ایک پیسہ خرچ نہیں

کرتے۔ سارا مال و زر غریبوں اور محتاجوں میں لٹا دیتے ہیں۔“

یہ ہیں فرقہ ملائیہ سے تعلق رکھنے والے موجودہ صوفیوں کے دُھندلے سے دُھندلے۔ اگر ہم ان خداؤں کا مزید اُجاگر کرنے کی کوشش کریں تو اہل ایمان، دم بخود رہ جائیں گے۔ اور ان کے قلب حساس پر قیامت کی آواز جائے گی۔ علامہ اقبالؒ کے بقول۔

خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور

کہ بچ کھائے مسلمان کا جلمہ احرام

اب ہم حقائق کی روشنی میں فرقہ ملائیہ کی مختصر تاریخ پیش کریں گے تاکہ عام مسلمانوں کے شکوک و اہمال ہٹا ہو جائیں۔

مشہور عامل سنت اور عظیم و جلیل صوفی حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) اپنی بے مثال اور شہرہ آفاق تصنیف ”کشف المحجوب“ میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

”مشائخ طریقت (صوفیائے کرام) کی ایک جماعت نے ملامت کا طریقہ پسند فرمایا ہے۔ کیونکہ ملامت بے خلوص و محبت کی بہت بڑی تاثیر اور کامل لذت پوشیدہ ہے اور اہل حق، ملامت کے لئے مخصوص ہیں۔“

آگے چل کر سید علی ہجویری، سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”خاص طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ ملت کہ آپ اہل حق کے امام اور مقتدا ہیں۔ پیغمبرِ ملامت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی تمام محبوبانِ خدا اپنے اپنے حلقوں میں نیک نام اور بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ مگر بد برہانِ حق نازل ہوئی، انہیں وحی سے سرفراز کیا گیا اور پھر ان کے فرق مبارک پر دوستی کی خلعت رکھی گئی تو حلقوں۔۔۔ ان کے حق میں زبانِ ملامت دراز کر دی۔ چنانچہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے کاہن، کسی نے شاعر، کسی نے مجنون (دیوانہ) اور کسی نے کاذب تک کہا۔ تعوذ باللہ من هذا الخرافات۔“

کفارِ ان قریش، تبلیغِ اسلام کی ابتداء میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مذموم القابات سے یاد کرتے تھے۔ جس کے جواب میں یہ آیت مقدسہ نازل ہوئی، جو اہل حق اور مومنین کی تعریف میں تھی۔

”بفضلِ خدا یہ زبان درازوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ وہ جسے چاہے، عطا فرمائے۔ اور اللہ کا علم بڑا ہے۔“ (ترجمہ)

حق تعالیٰ کا دستور ہی ایسا ہے کہ جس نے حق کی بات منہ سے نکالی، سارے جہان نے ملامت کی۔ کیونکہ ایسے بندے کے اسرار، ملامت میں مشغول رہنے کے باعث خلق کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہی۔ یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو دوسروں کے دیکھنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ تاکہ ہر شخص کی آنکھ اس کے دوست کے حال پر نہ پڑے۔ اور بندے کو اس سے بھی محفوظ رکھتا ہے کہ وہ اسے دیکھنے کی کوشش کرے اور وہ خود بھی اپنا جمال نہ دکھ سکے۔ کیونکہ وہ غرور اور تکبر کی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے (اللہ نے) خلق کو ان پر ملامت کے لئے مقرر فرمایا۔ اور نفسِ لوامہ (ملامت کرنے والی خصلت) کو ان کے اندر نہاں (پوشیدہ) کر دیا تاکہ بندہ جو بھی کرے، نفس اس پر ملامت کرتا رہے۔ اگر وہ بدی کرے تو اسے بدی پر ملامت کرے۔ اور اگر نیکی کرے تو کوئی نہ ملامت کرے۔

آگے چل کر حضرت سید علی ہجویریؒ تحریر فرماتے ہیں۔ ”راہِ خدا میں یہی وہ اصل قول ہے، جس میں کوئی آواز اور حجاب نہیں ہے۔ اور طریقت کی راہ میں یہ دشوار تر ہے۔ اس لئے کہ کہیں بندہ اپنے کسی غرور میں نہ پھنس جائے!“

حضرت سید علی ہجویریؒ کی تحریر کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، اہل ایمان کو غرور و کبر سے بچانے کے لئے ایسے لوگ بنائے، جو دن رات اہل حق پر ملامت کرتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے اندر ملامت کرنے کا بیج بکھیرا، جس کی ملامت کے باعث بندہ غرور کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔

غور و ظم، اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہیں۔ اسی غرور کی وجہ سے ابلیس، قیامت تک کے لئے رائدۂ شیطانیہ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجود سے انکار کرتے ہوئے یہی تو کہا تھا کہ میں آگ سے بن ہوں۔ اور آگ، خاک (مٹی) سے افضل ہے۔ یہ غرور، عناصر کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ اس لئے پاک ہو گیا۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندگان خاص کو اسی ہلاکت سے بچانے کے لئے ملامت کرنے والوں کو پیدا کیا، تاکہ انسان نجات سے باخبر رہے۔ اور حق تعالیٰ کی رحمت پر نظر رکھے۔



حضرت سید علی ہجویریؒ نے غرور کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے۔ ”غرور دراصل دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اولیٰ کی عزت افزائی اور ان کی تعریف و ستائش سے۔ پہلی صورت میں اہل دنیا اس شخص کے افعال کو پسند کرتے ہیں۔ اور پھر اس کی تعریف و توصیف میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً انسان میں غرور پیدا ہو جاتا ہے۔“ غرور کی دوسری شکل یہ ہے کہ انسان خود ہی اپنے اعمال کو پسند کرتے ہوئے خوش ہونے لگتا ہے۔ یہ ایک خطرناک صورت ہے۔ خود پسندی کے عالم میں انسان کو اپنا عیب بھی ہنر نظر آنے لگتا ہے۔ اور بد صورتی، غلیظ دماغی لگتی ہے۔ انجام کار وہ شخص، غرور اور خود پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

اور پیدا ہونے کے اسباب بیان کرنے کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) کچھ اور اسرار و رموز دہاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے دوستوں پر ان دروازوں کو بند کر دیتا ہے تاکہ ان کے معاملات اگرچہ نیک و برحق ہوں ان کو اپنی طاعت اور قوت کے مقابلے میں کچھ ہی نظر آتے ہیں اور وہ انہیں پسند نہیں کرتے۔ جن کی پناہ سے محفوظ رہتے ہیں۔ لہذا ہر شخص، جو حق کا پسندیدہ ہوگا، خلق اسے پسند نہیں کرے گی۔ اور جو اپنے جسم کو باورِ عبادت کے ذریعے مشقت میں مشغول رکھے گا، حق تعالیٰ اسے تکلیف نہیں دے گا۔“

بطان کی پسندیدگی کے بارے میں حضرت داتا گنج بخشؒ تحریر فرماتے ہیں۔ ”شیطان کو فرشتوں نے بھی مانا۔ نے بھی پسند کیا (جیسا کہ آج لوگوں کی اکثریت، شیطانی تعلیمات پر دل و جان سے کار بند رہتی ہے) اور نے خود بھی اپنے آپ کو پسند کیا۔ مگر چونکہ حق تعالیٰ نے اسے پسند نہیں فرمایا، اس لئے یہ سب کچھ اس کے حق کا سبب بن گیا۔ اس کے برعکس حضرت آدم علیہ السلام کو نہ فرشتوں نے پسند کیا، نہ ابلیس ملعون نے اور نہ آدم نے خود ہی اپنے آپ کو پسند کیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں پسند فرمایا۔

تنوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اے خدا! کیا تُو زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتا ہے، جو اس کے لئے۔ اور خونریزی کرے گا؟“ (ترجمہ)

نعت آدم علیہ السلام کی پیدائش مبارک پر ابلیس ملعون نے کہا۔ ”میں آدم سے بہتر ہوں۔ تُو نے مجھے آگ

سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔“

اور حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بارے میں کہا۔ ”اے ہمارے رب! ہم نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے اور اگر تُو نے ہمیں معاف نہیں فرمایا اور ہم پر رحم نہیں کیا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“ (زبور)
مگر جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پسند کیا تو ان کے حق میں فرمایا۔ ”ان سے بھول ہو گئی، ہم نے ان کی طرف سے ارادتنا فرمائی نہ پائی۔“ (ترجمہ)

اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو خلق کی ناپسندیدگی کا شرہ، اللہ کی رحمت کی شکل میں مل گیا۔ تاکہ کائنات پر رہنے والی تمام مخلوق جان لے کہ ہمارا مقبول، خلق کا مجبور ہوتا ہے۔ اور جو خلق کا مقبول ہو، وہ ہمارا مجبور ہوتا ہے۔
حضرت سید علی ہجویریؒ کے ان ارشادات کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص، اہل دنیا میں مقبول ہوتا ہے، وہ بارگاہِ اہل سے دور ہو جاتا ہے۔ اور جو بظاہر مخلوق کے درمیان غیر معروف ہوتا ہے، وہ بارگاہِ رب ذوالجلال میں محبوب اور پاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ فرماتے ہیں۔ ”اس طرح یقینی طور پر سب کو پتہ چل جائے گا کہ خدا کے دوستوں کی غذا، خلق کی ملامت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں قبولیت کے آثار ہیں۔ اولیاء اللہ کا مذہب ہے کہ ملامت کی ”قربت“ اور ”خصوصیت“ کی نشانی ہے۔ جس طرح وہ قبولِ خلاق (تعریف و ستائش) سے خوش ہوتے ہیں۔ ان طرح وہ ملامت سے خوش رہتے ہیں۔“

ایک حدیث قدسی کے مطابق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل امینؑ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ یہ ارشاد بیان فرمایا۔

”میرے اولیاء، میری رحمت کی چادر ہوتے ہیں جنہیں میرے ساتھ میرے اولیاء ہی پہچانتے ہیں۔“



حضرت سید علی ہجویریؒ نے ملامت کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

پہلی یہ کہ وہ صاحبِ ایمان شخص سیدھا چلے اور اس کے طرزِ عمل میں کسی قسم کی کجی یا الجھاؤ نہ ہو۔ اس کی تسبیح یہ ہے کہ ایک شخص اہل دنیا کے درمیان رہ کر کام کرتا ہے۔ اور شریعت کے کاموں میں مکمل احتیاط برتتا ہے۔ مگر خلق پھر بھی اس پر ملامت کرتی ہے کیونکہ لوگوں کی یہ عام عادت ہے۔ لیکن وہ شخص کسی کی پروا نہیں کرتا اور نہ ہی استقامت کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہتا ہے۔

ملامت کی دوسری قسم ہے کہ انسان اس کا ارادہ کرے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص، لوگوں کے درمیان عزت و شرف بھی رکھتا ہے اور شہرت بھی۔ اس کے دل میں یہ خواہش موجود ہوتی ہے کہ خاص و عام اس کی عزت کریں۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اہل دنیا سے جدا ہو کر یادِ الہی میں مشغول ہو جائے اور خدا پر استقامت اختیار کرے کہ مخلوق اس پر ملامت کرنے لگے۔ اس قسم کی ملامت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ شریعت میں عمل واقع نہ ہو۔ بس لوگ اس سے نفرت کریں اور دور ہو جائیں۔

ملامت کی تیسری قسم ”ترک“ ہے۔ ترک کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے ظاہری اعمال چھوڑ دیے جائیں۔ ایسے شخص کی مثال یہ ہے کہ اس کے دل میں کفر و ضلالت کے خلاف شدید اور طبعی نفرت بھی ہو۔ وہ بظاہر شرعی احکام عمل نہ کرے اور یہ سوچے کہ وہ صرف ملامت کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ پھر ملامت کا یہ طریقہ اس کی عادت بن جائے۔ اس کے باوجود وہ دین میں مضبوط اور اپنے عقیدے میں درست۔ لیکن دکھاوے اور ملامت کے طور پر

مذہب کی خلاف ورزی کرے۔ مثلاً ایسے شخص کو لوگ بے نمازی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ اور وہ خود بھی اپنے بے نمازی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اہل دنیا سے چھپ کر نماز پڑھتا ہے۔ تیسری قسم کے ”لامتی“ کو اہل دنیا کا ذرا بُرا نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ اور شدید ترین طعن و تشنیع کو ہنس کر برداشت کرتا ہے۔

فاری زبان کا ایک نہایت دل آویز اور مشہور شعر ہے جو سندھ کے نامور بزرگ، حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے نام پر ہے۔ حضرت لعل شہباز قلندرؒ کا خاندانی نام عثمان تھا اور آپ ”مروند“ میں پیدا ہوئے تھے۔

منم عثمان مروندی و یار شیخ منصور
ملا مت می کند خلقه و من برداری رقصم

(اے عثمان مروندی ہوں اور میرا یار، شیخ منصور ہے۔ ساری دنیا مجھے ملامت کرتی ہے اور میں سب کچھ برداشت کرتا ہوں۔ ترجمہ)

اے شعر میں ”شیخ منصور“ سے مراد غالباً منصور حلاجؒ ہیں، جنہیں شاید تصوف میں دنیا کا سب سے بڑا لامتی قرار دیا جاتا ہے۔ جنہیں قاضی وقت نے کافر و زندیق قرار دے کر، دار پر کھینچ دیا۔ ایک ایک کر کے تمام اعضاء اٹائے گئے۔ آخر میں آپ کی لاش کو جلا کر، راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی گئی۔ اکثر تاریخیں گواہ ہیں کہ جب تک کہ منصور حلاجؒ زندہ رہے، مسکراتے رہے، رقص کرتے رہے۔ اور بہتا ہوا خون اپنے چہرے پر ملتے رہے۔ اہل مشہور فارسی غزل کا دوسرا شعر ہے۔

تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خونخواری رقصم

(اود قاتل ہے کہ دنیا کو تماشہ دکھانے کے لئے میرا خون بہاتا ہے۔ اور میں وہ بسمل ہوں کہ خونخوار خنجر کے نیچے گھس رہا ہوں۔ ترجمہ)



لامت کے سلسلے میں حضرت سید علی بھوبریؒ نے ایک نہایت اثر انگیز واقعہ تحریر فرمایا ہے۔

شہر صوفی بزرگ حضرت شیخ ابوطاہر حرائیؒ ایک دن گدھے پر سوار، بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک خدمت گار یہاں کام تھا۔ ہوئے ساتھ ساتھ تھا۔ یکایک کسی شخص نے پکار کر کہا۔

”لوگو! کھو! پیر زندیق (کافر شیخ) آ رہا ہے۔ اچھی طرح اسے پہچان لو۔“

حضرت شیخ ابوطاہر حرائیؒ کے مرید نے اس انجبی شخص کی بات سنی تو جوش عقیدت و غضب میں اسے مارنے کے لئے بازار تمام بازار والے بھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ حضرت شیخ ابوطاہرؒ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے مرید کو دھکے دے کر فرمایا۔

”اگر تم نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی تو میں تمہیں ایک نہایت نصیحت آموز چیز دکھاؤں گا، تاکہ تم سختی سے

سزا سن کر مرید ٹھہر گیا۔ پھر جب حضرت شیخ ابوطاہر حرائیؒ اپنی قیام گاہ پر واپس آئے تو آپ نے مرید سے

فرمایا ”میرا فلاں صندوق اٹھا لاؤ۔“

مرید نے فوراً شیخ کے حکم کی تعمیل کی۔ حضرت شیخ ابوطاہرؒ نے صندوق کھولا، جو خطوط سے بھرا ہوا تھا۔ مرید نے

پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق ایک ایک کر کے وہ خطوط پڑھنے شروع کئے، جو حضرت شیخ ابوطاہر حرائی کے ہمنام کئے گئے تھے۔

کسی نے لکھا تھا ”شیخ الاسلام“ کسی نے تحریر کیا تھا ”شیخ زاہد“ اور کسی نے ”شیخ الحرمین“ کے لقب سے یاد کیا تھا۔ جب مرید بہت سے خطوط پڑھ چکا تو حضرت شیخ ابوطاہر حرائی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
 ”یہ سب میرے القاب و خطابات ہیں۔ ہر شخص نے مجھے اپنے اعتقاد کے مطابق مخاطب کیا ہے۔ اگر آپ بے چارے نے اپنے اعتقاد کے بموجب بھرے بازار میں مجھے کوئی لقب دے دیا ہے تو اس میں بگڑنے اور ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟“



حضرت سید علی ہجویری (داتا گنج بخش) ”لامت“ کی ایک اور قسم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
 اگر کوئی شخص، صاحب عزت و منزلت ہوتے ہوئے بھی قصدِ اُلامت کا رنگ اختیار کرے تو اس کا طریقہ یہ ہوگا۔ ایک دن خلیفہ ثالث امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اسے کھجور کے ایک باغ میں مقیم تھے۔ اس دن آپ کے پاس چار سو غلام تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے کسی غلام کو حکم دینے کے بجائے خود ہی درخت کی لکڑیاں کاٹنا شروع کر دیں۔ یہ منظر، غلاموں کے لئے حیران کن بھی تھا اور شدید پریشانی کا باعث بھی۔ آخر ایک ماہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور اس نے دست بستہ عرض کیا۔

”آقا! ہم لوگ کس کام کے لئے ہیں؟“

جواب میں حضرت عثمان غنیؓ نے مختصر فرمایا۔ ”یہ میرا کام ہے اور میں ہی اسے تکمیل تک پہنچا سکتا ہوں۔“
 غلاموں کی تشویش میں اور اضافہ ہو گیا۔ ”کیا آپ ہم سے کسی کو تاہی کے باعث ناراض ہیں؟“ دوسرے غلام کے لہجے میں شدید اضطراب پوشیدہ تھا۔

”میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔“ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا اور درخت سے لکڑیاں کاٹنے میں مشغول رہے۔ پھر لکڑیاں کاٹنے کے بعد امیر المومنینؓ نے اپنے دست مبارک سے گٹھا بنایا۔ سارے غلام نہایت توجہ اور توجہ جینی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

”اب تم لوگ، لکڑیوں کے اس گٹھے کو اٹھا کر میرے سر پر رکھ دو۔“ حضرت عثمانؓ بن عفان نے اپنے غلاموں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

غلاموں کے لئے یہ ایک انتہائی پریشان کن صورتِ حال تھی..... مگر سب کے سب، حکمِ آقا کے سامنے مجبور تھے۔ آخر وہ گٹھا، امیر المومنینؓ کے سر مبارک پر رکھ دیا گیا۔ پھر حضرت عثمان غنیؓ اسی حالت میں پُرہجوم راستوں سے گزرتے رہے۔ بے شمار لوگوں نے عالمِ اسلام کے نہایت معزز و محترم شخص کو اس عالم میں دیکھ کر اپنی خدمات پیش کیں۔ جواب میں حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا۔ ”یہ کام تو میرے غلام بھی کر سکتے تھے۔ مگر میں نے چاہا کہ اپنے نفس آزمائش کروں تاکہ یہ نفس مجھے کسی کام سے باز نہ رکھ سکے۔“



بزرگانِ دین نے عجیب عجیب انداز سے اپنے نفس کو ملامت کی ہے۔ مگر اس طرح کہ ان کی مذکورہ ملامت، شریعت کے کاموں میں خلل انداز نہ ہو سکے۔
 حضرت امام اعمشؒ، امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے استادِ گرامی تھے۔ اور قرآن و حدیث کے ساتھ فقہاء

نہاں تھے۔ آپ، حضرت امام حسینؑ کے یومِ شہادت، 10 محرم 60ھ کو ”دباوند“ میں پیدا ہوئے۔ دباوند کا ایک علاقہ ہے۔

بابا کی جگہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پوتے، حضرت قاسم بن محمدؓ اور دوسرے اکابر محدثین جمع تھے۔ اتفاقاً امام اعمشؒ کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ کو دیکھ کر حضرت قاسم بن محمدؓ نے فرمایا۔

”امام اعمشؒ ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔“
ظہورِ بزرگ، حضرت ابو بکرؓ بن عیلاش، بر ملا فرماتے تھے۔ ”اس میں شک نہیں کہ امام اعمشؒ سید المحدثین ہیں۔“
حضرت امام اعمشؒ کی عظمت پر یہ بڑی گواہی ہے کہ حضرت امام شعیبؒ، حضرت سفیان ثوریؒ اور حضرت سفیان بن عیینہؒ عظیم و جلیل محدثین کا شمار آپ کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔

حضرت امام اعمشؒ کا انتقال 147ھ میں ہوا۔ مرنے سے پہلے آپ نے اپنے چند عزیز و اقارب اور دوستوں کو دیکر فرمایا۔

”جب میں مر جاؤں تو کسی کو میری موت کی اطلاع نہ کرنا۔ اور رات کے اندھیرے میں مجھے اپنے رب کے بارگاہِ کرامت کر دینا۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ لوگ میرا چہرہ دیکھیں اور میرے جنازے میں شریک ہوں۔“
فریقہ کا قول ہے کہ امام اعمشؒ، صاحبِ سنت تھے۔ وہ جس روز دنیا سے رخصت ہوئے، اس کے بعد انہوں نے اپنا غسل نہیں چھوڑا، جو ان سے زیادہ عبادت گزار ہو۔

بہ حضرت یحییٰ تھانؒ کے سامنے امام اعمشؒ کا ذکر کیا تو بے اختیار فرمایا۔ ”وہ بڑے عابد و زاہد تھے۔ نماز ان کے پابند تھے۔ اور ہمیشہ صفِ اول میں رہتے تھے۔“

ان تمام تاریخی حوالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت امام اعمشؒ کیسے پرہیزگار اور شریعت و سنت کے کیسے نے مگر کبھی بھی آپ اپنے نفس کو اس طرح ملامت کرتے تھے۔



حضرت سید علی جویریؒ فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں ملامت کی روش اختیار کرنے کے لئے کسی خلافِ شریعت بات ضرورت ہوتی تھی۔ اور ایسی بات ظاہر کرنی پڑتی تھی، جو عوام کے مزاج کے خلاف ہو۔ مگر جو شخص ”ترک“ لہانے پر ملامت کرے اور کوئی خلافِ شریعت کام کرنے کے بعد یہ کہے کہ یہ عمل میں نے حصولِ ملامت کے لئے کیا ہے تو یہ کلی ہوئی ضلالت و گمراہی ہے۔

حضرت سید علی جویریؒ کے اس قول کی وضاحت یہ ہے کہ ملامتی طبقے کے لوگ، شریعت کے کسی کام کو اس لئے کرتے ہیں کہ اہلِ دنیا اس بے عملی کو دیکھ کر ان پر لعنت و ملامت کریں۔ مگر جب کوئی شخص اپنی زبان سے یہ کہتا ہے کہ اس نے ملامت کے لئے یہ روش اختیار کی ہے تو وہ گمراہی میں مبتلا ہے۔ گویا بات کو چھپانا حقیقی تہ ہے۔ اور اسے ظاہر کر دینا گمراہی۔

اس سلسلے میں حضرت سید علی جویریؒ اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
”ابا ہر مجھے مدعیانِ باطل (جھوٹے دعوے کرنے والوں) کی مجلس میں بیٹھے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے کسی نے کوئی نازیبا حرکت سرزد نہ ہو گئی۔ شرکائے مجلس میں سے کسی دوسرے شخص نے اس پر اعتراض کیا۔ جواب میں نازیبا حرکت کرنے والے شخص نے جواب دیا۔ ”میرا یہ عمل، ملامت کے لئے تھا۔“

لامتی کے جواب میں معترض نے کہا۔ ”تمہارا یہ عذر اور بہانہ نہایت بے ہودہ ہے۔“
 معترض کی بات سن کر لامتی کا چہرہ غیظ و غضب سے سرخ ہو گیا اور سانس پھولنے لگا۔
 لامتی کی یہ حالت دیکھ کر حضرت سید علی ہجویریؒ نے فرمایا۔ ”اے شخص! اگر ملامت میں تیرا دعویٰ درست
 اس آدمی کے اعتراض پر غضب ناک ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ تو تیرے مسلک کو مضبوط کرتا ہے۔ لیکن وہ
 چاہتا ہے اور یہ شخص تجھے ملامت کر رہا ہے۔ پھر تجھے کس بات پر غصہ آیا؟“
 اس کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ نے اس لامتی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اگر کوئی شخص امر حق کی
 دے تو اس کے لئے دلیل و حجت درکار ہوتی ہے۔ اور وہ دلیل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی حاکمیت
 حالانکہ ٹو، لوگوں کو اس طرف بلانا چاہتا ہے۔ مگر جب میں تجھے ظاہری طور پر فرائض کا تارک (نہ کرنا)
 دیکھتا ہوں تو تیرا یہ عمل تجھے اسلام کے دائرے سے باہر کر دیتا ہے۔“
 حضرت سید علی ہجویریؒ کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ بعض ”لامتی“ اپنی نادانی کے باعث اسلام کے
 سے خارج ہو جاتے ہیں۔



بعض تاریخی روایتوں کے مطابق فرقہ ملائیت کے بانی حضرت ابوصالح بن حمدون قصارؒ ہیں۔ حضرت بڑا
 ہجویریؒ آپ کو ”شیخ زمانہ“ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت ابوصالح بن حمدون قصارؒ کا مشہور قول ہے۔
 ”سلاستی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا نام ملامت ہے۔“

اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت سید علی ہجویریؒ فرماتے ہیں۔ ”جب کوئی شخص قصداً ملامت کرنے
 کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر خود کو بلاؤں میں مبتلا کر کے عیش و راحت اور خوش ذائقہ چیزوں کو چھوڑتا ہے تو اس کی نین
 ہوتی ہے کہ جلالت (بزرگی) کا ظہور ہو۔ اور اس طرح اس کی امید بر آئے۔ اور لوگ اس کی عادت سے یزید
 اس سے دور ہو جائیں۔ اور اس کا دل لوگوں کی محبت سے خالی ہو جائے۔ وہ اس حال میں خود کو جس قدر گلائے
 اتنا ہی حق سے واصل (قریب) ہو گا۔ جس سلاستی کی طرف لوگ رغبت کرتے ہیں اور مائل ہوتے ہیں، یہ
 سلاستی سے اتنی ہی نفرت و بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ الغرض اس طرح ایک دوسرے کے عزائم میں تضاد و تعارض
 ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی صفتوں میں کامیاب ہو جاتا ہے۔“

حضرت سید علی ہجویریؒ، حضرت ابوصالح بن حمدون قصارؒ کے بارے میں مزید فرماتے ہیں کہ آپ کا پرکار
 سادات طریقت میں سے تھے۔ آپ کا مسلک و مشرب، ملامت کی نشر و اشاعت تھا۔ فنون معاملات میں پھر
 ابوصالحؒ کا کلام بہت بلند ہے۔ حضرت شیخؒ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

”لوگوں کو جتانے کے مقابلے میں تمہارا علم، اللہ تعالیٰ کے متعلق بہت بہتر ہونا چاہئے۔“

حضرت شیخ ابوصالحؒ کے اس قول کا مفہوم یہ ہے کہ خلوت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا معاملہ اس سے بڑا
 چاہئے، جو تم لوگوں کے ساتھ ظاہر میں کرتے ہو۔ اس لئے کہ راہ حق میں سب سے بڑا حجاب یہ ہے کہ تمہارا
 لوگوں کے ساتھ مشغول ہو۔

اسی مفہوم کو علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔
 جو میں سر بہ سجدہ بھی ہوا، تو زمین سے آنے لگی صدا
 ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نیشاپور میں ”نہر حیرہ“ کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ نوح نامی ایک شخص سے ہوئی۔ نوح اپنی جواں مردی کے لئے پورے نیشاپور میں مشہور تھا۔ میں نے سوال کیا۔

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ ”شیخ! آپ میری جواں مردی کے لئے بڑے ہی باپنی جواں مردی کے متعلق دریافت کرتے ہیں؟“

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ ”حضرت شیخ ابو صالحؒ نے فرمایا۔“

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ ”نوح کا یہ اثر انگیز جواب سن کر حضرت شیخ ابو صالحؒ نے فرمایا۔“

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ ”نوح نے جواب دیا۔“ لہذا میری جواں مردی، ظاہری شریعت کی حفاظت میں ہے۔ اور آپ کی جواں

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ ”نوح نے جواب دیا۔“ لہذا میری جواں مردی، ظاہری شریعت کی حفاظت میں ہے۔ اور آپ کی جواں

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ ”نوح نے جواب دیا۔“ لہذا میری جواں مردی، ظاہری شریعت کی حفاظت میں ہے۔ اور آپ کی جواں

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ ”نوح نے جواب دیا۔“ لہذا میری جواں مردی، ظاہری شریعت کی حفاظت میں ہے۔ اور آپ کی جواں

”ابو ابراہیم بن محمد بن قضا“ فرماتے ہیں کہ ”نوح نے جواب دیا۔“ لہذا میری جواں مردی، ظاہری شریعت کی حفاظت میں ہے۔ اور آپ کی جواں

دوست کی گلی ہی میں ہو گا۔ اور دوست کے دل میں اغیار کا خطرہ نہ ہو گا۔ جب کسی ملامتی کا یہ حال ہو جائے کہ ملامت میں سب سے بڑھ کر لذت پائے گا۔ اس لئے کہ ملامت، عاشقوں کا باغ، محبتوں کی تازگی، شہزادہ راحلہ اور مریدوں کی خوشی کا نام ہے۔ یہ لوگ، دل کی سلامتی کی خاطر ”جن و انس“ کا ہدف ملامت بننا پسند کرتے ہیں۔ اور کوئی مخلوق، خواہ وہ مقرب رشتوں میں سے ہو یا روحانیوں میں سے، ان کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی۔ اُمتوں کے زاہد و عابد طالبانِ حق میں سے بھی کوئی ان کے مرتبے کو نہیں پہنچا۔ سوائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہ اُمتی، جو طریقت کے سالک ہیں۔ اور اپنے دل کو منقطع کر چکے ہیں۔

”مرجھوں“ کی اُمید اور ”قدریوں“ کے خوف کی تشریح کرنے کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) ملامت کے بارے میں عجیب نکتہ بیان فرماتے ہیں اور یہی نکتہ ہمارے مضمون میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ”میرے نزدیک ملامت کی خواہش عین ”ریا“ ہے۔ اور ریا کاری، عین نفاق ہے۔ اس لئے کہ ریاکار ایسی راہ پر چلتا ہے، جس سے وہ مخلوق میں مقبول ہو۔ اور ”ملا متی“ بھی قصدِ ایسی روش اختیار کرتا ہے، جس سے اس سے نفرت کریں۔ یہ دونوں طبقے، خلق (دنیا) ہی میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان سے گزرنے کے لئے سب سے آسان راستہ ہی نہیں ملتا۔ ایک اس راستے پر ہو لیا اور دوسرا، دوسرے راستے پر۔ حالانکہ درویش کے دل میں مخلوقات کے گزر کی گنجائش کہاں؟ جب دل کے آئینے سے خلق کی تصویر محو (غائب) ہو چکی ہو تو یہ دونوں راستوں سے بدلتا جاتا ہے۔ یعنی ریا کاری باقی رہتی ہے اور نہ نفاق کا خطرہ۔ پھر وہ کسی چیز میں گرفتار نہیں رہتا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کے ان ارشاداتِ عالیہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان کا دل، خواہشات کے بھرم سے بھرا ہو جاتا ہے تو قربتِ الہی حاصل کر لیتا ہے۔ اور پھر اسے دنیا کے دام میں گرفتاری کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کے اسی قولِ مبارک کو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید نے بڑے عجیب انداز میں بیان کیا ہے۔ مجذوب اُن کا تخلص تھا۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا، اب تو خلوت ہو گئی



حضرت سید علی ہجویریؒ فرماتے ہیں۔ ایک دن ماوراء النہر میں میری ملاقات ایک ملامتی سے ہوئی۔ جب وہ بہت زیادہ خوش نظر آیا تو میں نے اس سے سوال کیا۔

”اے بھائی! افعالِ بد سے تیری کیا مراد ہے؟“

ملا متی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لوگوں سے گلو خلاصی یعنی اہل دنیا سے نجات حاصل کرنا۔“

میں نے دوسرا سوال کیا۔ ”تم اس نتیجے پر کس طرح پہنچے؟“

ملا متی نے پُرسرت لہجے میں جواب دیا۔ ”ایک دن مجھے خیال آیا کہ مخلوقات تو بہت ہیں۔ اور میری عمر فزونی ہے۔ کس کس سے پیچھا چھڑاتا پھرے گا؟ آخر یہی تدبیر سوچھی کہ ان سب کو یکسر فراموش کر دے، تاکہ یہ تیرے کاموں میں مداخلت نہ کر سکیں۔“

حضرت سید علی ہجویریؒ کے بیان کے مطابق ملامتیوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے، جو ریاضت کے لئے اپنے فرائض ملامت کرتا ہے۔ یہ لوگ پھٹے ہوئے کپڑوں میں خلقت کے درمیان جاتے ہیں تو لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور طرح طرح سے ملامت کرتے ہیں۔ مخلوقِ خدا کی ان حرکتوں سے ملامتی بہت خوش ہوتے ہیں اور اپنے فرائض کو

نہیں۔
 حضرت ابراہیم بن ادہمؒ، تصوف کے گروے میں قدم رکھنے سے پہلے ایک ریاست کے حاکم تھے۔
 زندگی بسر کرتے تھے۔ پھر جب یاد الہی میں مصروف ہوئے تو دنیا کے سارے عیش اور لذتیں ترک کر دیں۔
 کئی عرصے میں ایک شخص نے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ سے عرض کیا۔

”تو کبھی آپ نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی ہے؟“

”جی ہاں، حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے فرمایا۔ ”دو بار۔ ایک بار اس وقت، جب میں کشتی میں سوار تھا۔ میری
 بہان بہت شکست تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور سر کے بال پریشان تھے۔ لباس پھنسا پڑا تھا۔ جس کے باعث
 لوگوں میں مجھے پہچاننے سے قاصر رہے۔ سب کے سب مجھے تحقیر آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میرے
 بڑے بڑے سفر کر رہا تھا۔ وہ اتنا جری اور بے باک تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آیا اور مجھے مخاطب
 کیا۔“

”جب بڑھکائی ہے تو پھر ہمارے ساتھ کشتی میں سفر کیوں کر رہا ہے؟ یہاں سے اتر۔ اور پیادہ پا اپنی منزل
 تک پہنچنے کے لیے اس کی بدبو ہمیں پریشان کر رہی ہے۔“

”مگر میں نے کب کشتی کے تمام مسافروں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔“

”اگر آپ نے میرے بال نوچے۔ یہ منظر دیکھ کر کشتی کے مسافروں نے خوب قہقہے لگائے۔“

”مگر اس سبب ملامت برس رہے تھے۔ اور میرا نفس عجیب سی لذت محسوس کر رہا تھا۔ پھر یہ لذت اس وقت
 ختم ہوئی، جب سفر ہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے مجھے ناپاک کر دیا۔“

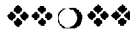
”پھر واقعہ سناتے ہوئے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے فرمایا۔ ”ایک بار میں سفر میں تھا اور سردیوں کا موسم تھا۔
 ایک گاؤں سے ہوا۔ اسی وقت شدید بارش شروع ہو گئی۔ میں نے کسی سائبان میں پناہ لینے کی کوشش کی، مگر
 نہ مل سکی۔ تھک کر گدی پر بیٹھ گیا۔ سرد ہوائیں اور بھیگا ہوا بدن۔ مجھے شدید اذیت محسوس ہونے لگی۔ گاؤں کا
 کوئی شخص مجھے ہرگز نہ کھانا اور اپنے مکان میں پناہ دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ آخر میں نے مسجد کی راہ لی کہ وہ اللہ
 تعالیٰ سے دعا کرتا تھا کہ میری ساری غلطیاں معاف فرمادے۔“

”ابن ابی عمیر نے کہا۔ ”میرا جسم بھی لرز رہا تھا اور زبان بھی۔ میں نے کانپتے ہوئے لہجے میں مؤذن
 سے فرمایا کہ ایک مسافر ہوں اور تھوڑی دیر کے لئے موسم کی سختیوں سے امان چاہتا ہوں۔“

”تو یہ گلابا، خانہ خدا کو بھی ناپاک کر دے گا۔“ مؤذن نے تند و تیز لہجے میں کہا اور دروازہ بند کر کے
 چلا گیا۔“

”ابن ابی عمیر نے کہا۔ ”میرے ساتھ یہی سلوک کیا خدا میں پناہ نہ
 پا سکتا تھا۔ میرے بھیکے ہوئے لباس سے مسجد کی پاکی متاثر ہو گئی۔“

”ابن ابی عمیر نے کہا۔ ”میرے ساتھ یہی سلوک کیا۔ سرد
 موسم تھا۔ میں نے کشتی میں سوار ہو کر سفر کیا۔ آخر ہزار دُشوار یوں کے ساتھ میں نے
 پہنچا۔ وہاں ایک حمام کی بھٹی کے آگے بیٹھ گیا۔ پھر میں نے اپنا دامن آگ پر پھیلا دیا۔ حمام کے دھوئیں
 نے مجھے گرم کیا اور ایک حمام کی بھٹی کے آگے بیٹھ گیا۔ پھر میں نے اپنا دامن آگ پر پھیلا دیا۔ حمام کے دھوئیں
 نے مجھے گرم کیا اور ایک حمام کی بھٹی کے آگے بیٹھ گیا۔“



اسی ملامت کے سلسلے میں حضرت سید علی ہجویریؒ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
 ”ایک بار مجھے بھی ایک مشکل پیش آگئی۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں نے بڑی کوششیں کیں۔
 ناکام رہا۔ اس سے پہلے بھی مجھ پر کچھ ایسی ہی مشکل پڑی تھی۔ اس وقت میں نے حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ کے
 مبارک پر حاضری دی تھی۔ اور حق تعالیٰ نے میری وہ مشکل دور فرمادی تھی۔ اس بار بھی میں نے حضرتؒ کے
 پر حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ چند روز کی حاضری سے میرا کام ہو جائے گا۔ مگر حق تعالیٰ کو کچھ اور
 منظور تھا۔

بالآخر میں نے تین ماہ تک حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ کے مزار مبارک پر چلہ کشی کی۔ ہر روز تین بار ٹل اور تین
 مرتبہ وضو کرتا کہ کسی طرح با مراد ہو جاؤں۔ مگر جب کسی طرح بھی میری وہ مشکل دور نہیں ہوئی تو میں نے خراسان کا
 سفر اختیار کیا۔

پھر میں خراسان کے ایک گاؤں میں پہنچا تو وہاں کسی صوفی کی خانقاہ تھی۔ رات بسر کرنے کی غرض سے اس
 خانقاہ میں پہنچا۔ اتفاق سے وہاں صوفیوں کی ایک جماعت مقیم تھی۔ اب میں خانقاہ میں داخل ہوا تو میرے ہم
 ایک سخت اور کھردری گدڑی تھی۔ ایک ہاتھ میں لوٹا تھا اور دوسرے میں لاشی۔ بس یہی میرا سامان سفر تھا۔ صوفیوں
 کی جماعت نے مجھے حقارت کی نظر سے دیکھا اور کوئی پہچان نہ سکا۔

میں خاموشی سے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ وہ صوفی اپنے رسم و رواج کے مطابق آپس میں گفتگو کرتے رہے۔
 کبھی کبھی میری طرف دیکھ کر اشارہ کرتے کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اور یہ بات درست بھی تھی کہ میں، ان میں سے نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے رات گزارنی تھی، اس لئے مجھ کو
 ہونے کے باوجود میں وہاں ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک صوفی اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قریب آ کر بولا۔

”تمہاری موجودگی اور جگہ کی تنگی کے باعث ہم درویشوں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اس لئے یہاں سے اٹھو
 دروازے کے قریب جا کر پڑ جاؤ۔“

میں نے صوفی کی اس خواہش پر فوری عمل کیا۔ پھر وہ لوگ، خانقاہ کی چھت پر چلے گئے اور میں زمین پر
 بیٹھا رہا۔ چند لمحوں بعد پوری فضا، لذیذ کھانوں کی خوشبو سے مہک اٹھی۔ شاید وہ لوگ، کھانا کھانے کی تیاریاں
 رہے تھے۔ یکایک ایک پھپھوند لگی ہوئی سوکھی روٹی میرے اوپر آ کر گری۔ اس کے ساتھ ہی ایک صوفی نے نیچے
 طرف جھانکتے ہوئے کہا۔ ”بھوکا ہوگا۔ کھانا کھالے۔“

میں نے اس روٹی کو اٹھا کر بہت غور سے دیکھا اور کونے میں رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ خربوزے کھا رہے تھے اور ان کے چھلکے میرے سر پر پھینک کر قہقہے لگا رہے تھے۔

اپنے ساتھ صوفیوں کا یہ طرز عمل دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”یا الہی! اگر میں تیرے محبوبوں کا

پہننے والوں میں سے نہ ہوتا تو ان لوگوں سے اسی وقت کنارہ کش ہو جاتا۔“

پھر وہ لوگ مجھ پر جس قدر ملامت کرتے رہے، میری مسرت اور لذت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس وقت مجھ پر
 حقیقت منکشف ہوئی کہ مشائخ کرام، جاہل لوگوں کو اپنے ساتھ کیوں گوارا کرتے ہیں اور کیوں ان کی ناکوار باز
 کی سختیاں جھیلتے ہیں؟

حضرت سید علی ہجویریؒ اپنی تصنیف ”کشف المحجوب“ میں ”باب ملامت“ کا اختتام کرتے ہوئے تحریر فرما

”پہلی پوری تحقیق و جستجو کے ساتھ ملامت کے احکام۔“

حضرت داتا گنج بخشؒ کے ان ارشادات گرامی کی روشنی میں اندازہ کر سکتے ہیں کہ ”حقیقی ملامت“ کیا اور اس رستے پر چلنا کس قدر خطرناک ہے۔ مرزا غالب کا یہ شعر بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا ضم کدہ ویراں کئے ہوئے



فہم لامع کا تفسیلی ذکر کرنے کے بعد ہم دوبارہ حضرت شیخ حسینؒ کے رنگ ملامت کی طرف آتے ہیں۔ مفتی پور لاہوری کی مشہور تالیف ”غزنیۃ الاصفاء“ کے حاشیے میں تحریر ہے۔

”کتاب دست کا مقصود، ظاہر و باطن کا تزکیہ ہے۔ ولی کی سب سے بڑی کرامت، کتاب و سنت کا اتباع ہے۔ علاوہ جو کچھ بھی ہے، نکسال یا ہر ہے۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت شیخ حسینؒ کے مرشد، حضرت شیخ بہلولؒ کو اپنے نانی حرکات (شراب نوشی اور رقص وغیرہ) کا علم ہوا تو آپ لاہور تشریف لائے اور حضرت شیخ حسینؒ سے فرمایا۔

”اے میرے ساتھ نماز پڑھو اور نماز ہی میں پورا قرآن کریم ختم کرو۔“

نادر قرآن مجید کی تلاوت، امام ہی کرتا ہے۔ اس لئے روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ نے مرید شیخ حسینؒ کو امام بنایا اور ان کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ پھر جب حضرت شیخ حسینؒ ”الم تشرح لک صدرک“ بولے اختیار نفس پڑے اور نماز ختم کر دی۔ مغل شہزادہ، داراشکوہ، حضرت شیخ حسینؒ کے بننے اور نماز ختم کرنا بدل اس طرح پیش کرتا ہے۔

”شیخ حسینؒ نے اس سورہ پاک کا یہ مفہوم سمجھا تھا کہ کیا ہم نے تیرے سینے کو توحید و معرفت سے نہیں اور تجھ پر وہم و اتانیت کا بار نہیں ڈالا، جو تیری پشت کو پست کرتا ہے۔ اور کیا ہم نے تجھ کو ذکر سے مذکور تک پہنچایا۔ اس لئے ہر فنا کے بعد بقاء ہے۔ اور بے شک جس کو ہم نے فنا بخشی، اسے بقاء دے کر ہمیشہ کے لئے دیا۔ یہی جب تُو نے اتانیت اور ہستی موموم سے فراغت حاصل کر لی ہے تو ہماری ہستی پر قائم ہو جا۔ اور اپنے دل کی طرف متوجہ ہو، جو ظاہر و باطن کا رب ہے۔“

روایت ہے کہ اس واقعے کے بعد حضرت شیخ حسینؒ پھر کبھی اپنے مرشد سے نہیں ملے۔ اگر اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ روایت غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت شیخ بہلولؒ لاہور تشریف لائے اور اپنے مرید، مرید کو اصل بحق پاکر نہایت اطمینان کی حالت میں دوبارہ چنیوٹ تشریف لے گئے۔

مرید شیخ حسینؒ کے حالات زندگی اور سیرت کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام روایتیں ایک دوسرے ملام ہیں۔

فہم لامع، داراشکوہ نے حضرت شیخ حسینؒ کو ”لامعیہ کا سردار“ قرار دیا ہے۔ اس لئے وہ واقعات کی عجیب و غریب پیش کرتا ہے۔ اس نے حضرت شیخ حسینؒ کے حوالے سے سورہ الم تشرح کی انتہائی گمراہ کن تشریح ہے۔ داراشکوہ، مثلاً بدخشانی کا مرید تھا۔ اور مثلاً بدخشانی وہ شخص تھا، جو اپنے ناقص علم کے زعم میں آیات قرآنی تاویلات کرتا تھا۔

اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔“ (ترجمہ)

رأیت مقدسہ کی تشریح کرتے ہوئے مثلاً بدخشانی لکھتا ہے۔ ”اے حقیقی ایمان لانے والو! سکر اور مستی کی

حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ اہل سکر (مذہبوں) کی حالت، نماز پڑھنے والوں سے بلند تر ہے۔ اگر مجازی ہے تو نماز کے قریب جانا منع ہے۔ تاکہ نماز آلودہ نہ ہو۔ اس صورت میں نماز کا احترام ہے۔ اور اگر مجازی ہے تو پھر بھی نماز کے قریب ہونا ممنوع ہے۔ اس صورت میں مستی کا احترام ہے۔“

اہل نظر، مثلاً بدخشانی کے دماغ کی فتنہ گری دیکھیں کہ اس نے دونوں صورتوں میں نماز سے چھٹکارا کر لیا۔ حضرت شیخ حسینؒ کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ آپ نے ستائیس سال تک نماز نہیں پڑھی۔ اس لئے داراشکوہ نے ”سورۃ الم نشرح“ کی غلط تشریح کی اور حضرت شیخ حسینؒ کے نیت توڑ دینے کو اس انداز سے پیش کیا کہ مجھے نماز کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اس سورۃ مقدسہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اے حبیبِ محمد ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا۔“ (ترجمہ)

داراشکوہ نے اپنے دل کی کجی اور ذہن کی پستی کے سبب اس آیت مقدسہ کا ترجمہ اس طرح کیا۔ ”اور ہم تجھے تذکر سے مذکور تک نہیں پہنچایا۔“

پھر اپنی طرف سے ان الفاظ کا اضافہ کیا۔ ”پس تُو ہماری ہستی پر قائم ہو جا۔“ اس تشریح سے داراشکوہ کا ایک ہی مقصد تھا کہ حضرت شیخ حسینؒ ”مذکور“ کی منزل تک پہنچ کر اللہ کی ہستی پہنچے ہو گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے نماز ترک کر دی۔

داراشکوہ کے مرشد مثلاً بدخشانی کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے، جسے گراہوں کی محفلوں میں بڑی شہرت حاصل تھی۔

پنچہ در پنچہ خدا دارم
من چہ پردائے مصطفیٰ دارم

”میں نے تو خدا کے پنچے میں پنچہ ڈال دیا ہے۔ پھر مجھے مصطفیٰ ﷺ کی کیا ضرورت ہے۔“ (ترجمہ)
یہ شعر سن کر علمائے کشمیر نے مثلاً بدخشانی کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا تھا۔ اور شہنشاہ شاہ جہاں سے شکایت کی تھی۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس لئے کہ داراشکوہ، شاہ جہاں کا محبوب بیٹا تھا۔ اور مثلاً بدخشانی، داراشکوہ مرشد تھا۔ پھر مذہبی عدالت کیسے قائم ہوتی؟ اور کفر کے فتوے پر کون عمل کراتا؟
آج بھی برصغیر پاک و ہند کے بے شمار، بے خبر مسلمان، داراشکوہ کو مظلوم اور فقیر دوست انسان سمجھتے ہیں۔ مگر کیسا گمراہ اور اسلام دشمن انسان تھا، اس کا اندازہ اہل تحقیق ہی کر سکتے ہیں۔ داراشکوہ، مشہور قادری بزرگ حضرت میاں میر لاہوریؒ کو ”باری تعالیٰ“ کہا کرتا تھا۔

اپنی کتاب ”حسنات العارفین“ کی تمہید میں داراشکوہ لکھتا ہے۔ ”توحید و معرفت کی منازل طے کرتے ہو ایک ایسا مقام بھی آتا ہے، جہاں سالک، کفر و ایمان اور خیر و شر سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر بے خودی کی حالت میں اس کی زبان سے بعض ایسے کلمات بھی نکل جاتے ہیں، جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں اور مذہب سن کر پست فطرت، زہاد خشک اپنی کوتاہ بینی کے سبب کفر سے تعبیر کرتے ہیں اور فتوے دینے لگتے ہیں۔ اسی سے بے گارے میں نے یہ کتاب تحریر کی ہے۔“

شاید یہی وہ فاسد خیالات تھے، جن کے زیر اثر داراشکوہ، حضرت شیخ حسینؒ کو ”ملائیہ کا سردار“ کہا کرتا تھا۔ جبکہ مغل شہزادے کو ”ملائیہ“ کے حقیقی مفہوم سے ذرہ برابر بھی آگہی حاصل نہیں تھی۔

حضرت شیخ حسینؒ ایک عالم و فاضل صوفی تھے، مگر ان کی تصانیف میں سے صرف کافیاں ہی منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ان کے مطابق ان کافیاں میں بھی تحریف کی گئی ہے۔ حضرت شیخ حسینؒ کی ذات گرامی نہ جانے کب تک کافیاں بنی رہتی کہ 1970ء میں محمد اقبال مجددی کا ایک مضمون ”مجلہ معارف“ اعظم گڑھ میں شائع ہوا۔ یہ مجاہد حضرت شیخ حسینؒ کی ایک نامعلوم تصنیف رسالہ ”تہذیب“ کے حوالے سے تھا، جو تقریباً چار سو سال بعد دستیاب ہونے والی زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ حسینؒ کی یہ تصنیف سات فصلوں پر مشتمل ہے۔ جس میں مذہبی و علمی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس رسالے کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شیخ حسینؒ صاحبِ دین و عقیدہ مسلمان تھے۔ لوگوں نے ان کے نام سے فرضی حکایات منسوب کر دی تھیں۔ اور بڑے بڑے

دانشمندان کو سن چکے تھے۔ علامہ فاضل دیوبند نے 1077ھ میں ”اخبار الاولیاء“ تصنیف کی تھی..... اور حضرت شیخ محمد طاہر لاہوریؒ کا یہ قول ہے: ”اگر مجھے علمائے ظاہر کے طعنوں کا خدشہ نہ ہوتا تو میں شاہ حسین لاہوریؒ کے مزار پر حاضر ہوتا اور روحانی مدد لے لیتا۔“

دانشمندان کہے کہ حضرت شیخ محمد طاہر لاہوریؒ کا انتقال 1040ھ میں ہوا تھا۔ اور حضرت شیخ حسینؒ 1008ھ میں وفات ہوئے تھے۔ اس طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ محمد طاہر لاہوریؒ نے اپنے لڑکپن کے زمانہ میں حضرت شیخ حسینؒ کو ضرور دیکھا ہوگا۔ اور اسی مشاہدے کی بنیاد پر وہ اس جانباز صوفی سے انتہائی عقیدت رکھتے، جو کچھ ملامت میں سرگرم سفر تھا۔ اور اہل دنیا اپنی لذتِ نفس کے لئے جس کے نام سے عجیب عجیب ذرائع لاتے تھے۔

تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر مخنجر خونخواری رقصم

”وہ قاتل ہے کہ دنیا کو تماشا دکھانے کے لئے میرا خون بہاتا ہے۔ اور میں وہ زخمی ہوں جو خونخوار خنجر کے زخموں سے مر رہا ہے۔“ (ترجمہ)

(نوٹ) قارئین کرام! صوفیائے کرام کی طویل تاریخ میں حضرت منصور حلاجؒ اور حضرت شاہ حسین لاہوریؒ دو نامور بزرگ گزرے ہیں، جن کی ذات گرامی کے ساتھ ایسی ہزاروں روایات منسوب ہیں کہ جنہیں پڑھ کر ایک عالمِ کلام کا ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔ یہ ایک تھکا دینے والا تحقیقی کام تھا۔ پھر بھی مجھ عاجز و ناقص سے جو کچھ ممکن ہو سکا وہ آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ میں ذاتی طور پر حضرت شاہ حسینؒ سے حسنِ ظن رکھتا ہوں۔ اور آپ حضرات کو بھی اسی ظن میں کرتا ہوں۔ اگر میری کم علمی کے سبب کوئی کوتاہی سرزد ہوگئی ہے تو اللہ مجھے معاف فرمائے اور میدانِ حشر میں حضرت شاہ حسینؒ کے سامنے شرمندگی سے بچائے۔ (آمین)



حضرت میراں حسین زنجانی عجلہ

”بت شکن سلطان محمود غزنوی، دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ پھر اقتدار کے ”بت“ کو حاصل کرنے کے لئے اس کے دونوں بیٹوں میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ آپس کے اس تصادم کا فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہندوستانی پنجاب، کابل کے اثرات سے آزاد ہو گیا۔ سلطان محمود غزنوی کی بے پناہ کوششوں سے اس خطے میں اسلام کا جو چراغ روشن کیا تھا، اس کی کو تھر تھرانے لگی۔ اور باطل پرستوں نے دوبارہ سر اٹھانا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ جو قبول اسلام کے ابتدائی مرحلے میں تھے، ان پر مقامی ہندوؤں اور سکھوں نے بہت مظالم ڈھائے۔ یہاں تک کہ وہ تشدد کے آگے بڑھ کر اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ گئے۔

کچھ نومسلکوں نے برہمنوں کے خوف سے دوبارہ ہندوانہ روش اختیار کر لی۔ مگر دلوں میں کلمہ سہی کو کھانا رکھا۔ وہ دنیا کو دکھانے کے لئے مندروں میں جاتے، بتوں کے آگے سر جھکاتے۔ مگر دل سے یہی اقرار کرتے۔ ”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔“

کچھ اہل ایمان، جو صاحبان استقامت تھے، وہ اعلان اپنے عقائد پر قائم رہے۔ پھر جب بت پرستوں نے ان پر زمین تنگ کر دی تو وہ ملتان کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہ علاقہ، محمد بن قاسم کی سربراہی میں پہلی صدی ہجری کے آغاز میں فتح ہو چکا تھا، اس لئے یہاں مسلمانوں کی اتنی آبادی موجود تھی کہ اہل ہندوان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں آکر ان مہاجر مسلمانوں نے اپنے دینی بھائیوں سے ان لوگوں کی تکالیف بیان کیں، جو کلمہ گو ہونے کے سبب لاہور اور اس کے نواحی علاقوں میں کفار کے تشدد کا شکار تھے۔

ملتان کے مسلمانوں نے یہ دردناک واقعات سنے اور آنسوؤں سے اپنے چہرے بھگو لئے۔ مگر ان مظلوموں کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ ظالم کے اٹھے ہوئے خنجر بکف ہاتھ کو روکنے کے لئے اتنے ہی طاقتور ہاتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملتان کا حاکم، مادی اعتبار سے اتنا طاقتور نہیں تھا کہ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر لاہور پر حملہ کرتا اور ان کلمہ گوؤں کو باطل پرستوں کے چنچر استبداد سے نجات دلاتا۔

پھر بھی اس واقعے سے اتنا ضرور ہوا کہ ملتان کی مسجدوں میں ان لوگوں کے لئے دعائیں کی جانے لگیں، جو سلطان محمود غزنوی کے عہد سلطنت میں مسلمان ہوئے تھے۔ اور پھر ان کے مرتے ہی پنجاب کے راجپوتوں کے مظالم کا نشانہ بن گئے تھے۔

ان دعاؤں میں خالق کائنات کو اس کے رحم و کرم کا واسطہ دے کر کہا جاتا۔ ”تیرے سوا ہمارا کوئی مشکل باز نہیں۔ ان مست ہاتھیوں کی تباہی کے لئے اپنی غیبی ابائیوں کو بھیج۔ اور اپنے نام لبواؤں کی دیکیری فرما۔“

اہل بلقان اسی طرح گریہ و زاری کرتے اور اُدھر پنجاب کے راجپوت اپنی رنگین محفلوں میں قہقہہ زن گناہگاروں نے اپنے علاقے سے اسلام کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ اہل ہند نے سلطان محمود غزنوی کے سترہ نہیں بلکہ پترین شکست کھائی تھی۔ اب اپنی اسی غلامت و ہزیمت کا ردِ عمل ظاہر کرنے کے لئے وہ بے سہارا ٹالوں پر تم ڈھا رہے تھے۔

مگر درجہ خاتم و فلک در چہ خیال (میں کس خیال میں ہوں اور فلک کیا سوچ رہا ہے) کے مطابق پنجاب کے بچے، اسلام کو مٹانے کے دعوے کر رہے تھے اور برصغیر پر اسلام کا نفاذ چاہنے والی ذات پاک اپنی منصوبہ بندی کر رہی تھی۔

نام کے مشہور بزرگ، حضرت ابو الفضل خلیلیؒ نے اپنے ایک مرید کو خرقہٴ خلافت پہنا کر فرمایا۔ ”اے سلسلہٴ بیگے جاننا، فرزندِ اتم پر لازم ہے کہ صنم خانہ ہند میں جا کر اذان دو۔ انہیں حق کی روشنی عطا کرو، جو ہزاروں سال اندھے ہیں۔ اور انہیں شفا بخشو، جو کفر کے جذام میں مبتلا ہیں۔“

حضرت ابو الفضل خلیلیؒ نے اپنے جس مرید کو ہندوستان جانے کا حکم دیا تھا، وہ مشہور بزرگ، حضرت سید میراں زنجانیؒ تھے۔



حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کا سلسلہٴ نسب براہِ راست حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کے دادا کی نام سید علی محمودؒ اور دادا کا نام سید ابو جعفر برقیؒ تھا۔ آپ کے خاندان کے کچھ بزرگ، خلفائے راشدینؓ کی خلافت میں ترک سکونت کر کے عراق میں آئے تھے۔ پھر اسی خاندان کے ایک بزرگ، جو حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے اولاد میں سے تھے، بغداد سے نکل کر زنجان (ایران) میں آباد ہو گئے۔ یہ حضرت ابو جعفر برقیؒ تھے۔

حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ 26 شعبان 347ھ میں زنجان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد نے سید علیؒ کو اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ کسی بادشاہ یا امیر کے دربار میں حاضری دینے کے بجائے آپ کھیتی باڑی کے ذریعے اپنا رزق حاصل کرتے تھے۔ اور آزاد زندگی گزارتے ہوئے دین اسلام کی خدمت میں مصروف رہتے۔ سید حسینؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت، زنجان کی جامع مسجد کے امام کے زیر سایہ ہوئی، جو اُس دور کے بیاد عالم تھے۔ امام صاحب کی صحبت میں رہ کر سید حسینؒ نے قرآن کریم ختم کیا۔ پھر تفسیر، حدیث اور فقہ کی بنیادی مباحث کی۔

پھر ایک دن سید حسینؒ نے اپنے والد گرامی، حضرت سید علی محمودؒ سے عرض کیا۔ ”میں نے قرآن کریم اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ پڑھ لئے، انہیں ذہن میں محفوظ بھی کر لیا۔ مگر اب تک معانی سے آشنا نہیں ہوا۔“

حضرت سید علی محمودؒ نے حیران ہو کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ ”حسین! تم تو باقاعدہ عربی داں ہو۔ پھر معانی کیوں نہیں نہیں آتے؟“

سید حسینؒ نے عرض کیا۔ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ مگر میں نے اب تک وہ نماز ہی نہیں کی، جس میں نماز کہہ سکوں۔“

سید علیؒ نے جواب دیا۔ ”تم اپنے دل و دماغ کو ماسوا سے ہٹا کر حق تعالیٰ کی ذات سے وابستہ ہو کر نماز کرو۔ پھر تمہیں نماز میں حضوری حاصل ہو جائے گی۔ اور حضوری کے بعد تمہیں نماز کا لطف آنے لگے گا۔“

سید حسینؒ نے دوبارہ عرض کیا۔ ”میری اپنی عبادت سے تو کچھ نہیں ہوا بابا محترم! نہ ذہن ایک مرکز پر ٹھہرا اور نہ دل کو یکسوئی حاصل ہوئی۔ میں کسی ایسے شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو سر سے پاؤں تک صابر و شاکر نظر آئے۔ مجھے اس سے پوچھنا نہ پڑے کہ صبر کسے کہتے ہیں اور شکر کی انتہا کیا ہے؟“

سید علی محمودؒ جو اس سال بیٹے کی بات کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔ ”بیٹے! ایسا شخص تو کوئی جاں سونہ غش الہی ہو کر ہے کہ وہ صبر و نماز کی تصویر بن کر رہ گیا ہو۔“

”مجھے کسی ایسے ہی رہنما کی تلاش ہے۔“ سید حسینؒ نے پرسوز لہجے میں کہا۔

”فرزند! رہنمائے کامل، گھر بیٹھے تو نہیں مل جاتا۔“ سید علی محمودؒ نے بیٹے کے ذوق طلب کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بعض لوگ تو اس دشوار ترین راستے کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ گئے اور انہیں زندگی بھر کوئی مرشد درخشاں ملائم بھی مقدر آزمادیکھو۔ اور دینے والے کی بخشش و عطا پر نظر رکھو۔“

آخر سید حسینؒ، والد گرامی سے اجازت لے کر مرشد کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔



سید حسینؒ نے پورا علاقہ چھان مارا۔ اگرچہ اس وقت سرزمین عراق، اہل کمال کا مرکز تھی اور بڑے بڑے فقہاء اور علماء وہاں موجود تھے۔ لیکن سید حسینؒ کا دل کسی درس میں نہیں لگا۔ آپ کو تو کسی ایسے مراد کامل کی تلاش تھی، جس کی ایک نظر ہی دل کی دنیا کو زیر و زبر کر ڈالے۔

آخر بہت دنوں کی سرگردانی کے بعد کسی شخص نے سید حسینؒ کو شام میں رہنے والے ایک بزرگ کا پتہ دیا۔

”حسین! تم جس مراد کامل کی تلاش میں ہو، اس کا ملنا بہت دشوار ہے۔ یہ لوگ بعض اوقات اس حالت میں ملتے ہیں کہ اہل دنیا انہیں ایک عام انسان سے بھی کم تر سمجھتے ہیں۔ وہ سر محفل اپنے علم و فضل کی نمائش نہیں کرتے۔ بس وہ سر سے پاؤں تک عمل ہی عمل ہوتے ہیں۔ تم بھی اس مرادِ باصفا کے آستانے پر دستک دے کر دیکھو۔ جب نبیؐ کے دروازہ کھل جائے۔“

وہ بزرگ، سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے سلسلہ عالیہ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اور آپ کا نام گرامی، ابو الفضل ختمی تھا۔

سید حسینؒ، ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں بغداد سے شام پہنچے۔ اور ایک دن حضرت ابو الفضل ختمیؒ کی بارگاہ میں خاموشی سے حاضر ہو گئے۔

واضح رہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ ان صوفیائے کرام کے گروہ خاص سے تعلق رکھتے ہیں، جنہوں نے بڑے علم و ضبط، ہوش و حواس اور انتہائی احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی۔ اس لئے آپ کے سلسلے کے لوگ بھی شریعت و سنت کے سخت پابند تھے۔ اگر کبھی ان بزرگوں پر جذب و مستی کی کیفیت طاری بھی ہوتی تو اہل دنیا کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ سلسلہ جنیدؒ کے لوگ سماع سے کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے۔

جب سید حسینؒ، حضرت ابو الفضل ختمیؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو طالبانِ شوق کا بڑا اجتماع تھا۔ حاضرین سادہ لباسوں میں سروں کو جھکائے، باادب بیٹھے تھے۔ سکوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی سانسوں کی آوازیں سنائی دے لگتی تھیں۔

کچھ دیر بعد صاحبِ خانقاہ حضرت ابو الفضلؒ داخل ہوئے۔ لوگ اسی طرح اپنی گردنوں کو خم کئے بیٹھے رہے۔

جس کا خیال تھا کہ حاضرین مجلس، شیخ کے احترام میں اٹھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ فوراً ہی اٹھ کر اس وقت نہیں تعجب ہوا کہ جب تمام لوگ اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھے رہے۔ حضرت شیخ ابو الفضلؒ نے ایک نظر اس نوجوان کو دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ پھر خود مسندِ درس پر تشریف لائے۔

مگر وہ عالم عظیم جب مجلسِ نور میں تشریف لاتے تو وہاں موجود تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کھڑے ہو جاتے۔ مگر رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو ادب و احترام کے اس مظاہرے سے منع کرتے۔ حضرت جنید بغدادیؒ صوفی ہوتے ہوئے بھی شریعت و سنت کے سخت عامل تھے۔ اس لئے آپ کی مجلس میں بھی سرور کو نین صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی سنت پر عمل ہوتا تھا۔ بعد میں صوفیائے کرام کی مجلسوں کے انداز بدل گئے۔ فیصل کے احترام میں کھڑا ہونا اگرچہ سنت کے خلاف تھا، لیکن پھر بھی ایک متوازن عمل تھا۔ پھر یہ احترام، عقیدت میں ڈھل گیا۔ اور عقیدت اتنی بڑھی کہ عام طور پر تمام سلسلوں کے لوگ اپنے بزرگوں کے ہاتھوں کو اپنے لئے سلسلہ جشتیہ میں ایک مرید اپنے پیر کے قدموں میں جھک جاتا ہے۔ شاید عقیدت کی اسی زیادتی کو بزرگوار اقبالؒ نے کہا تھا۔

یہ معاملے ہیں نازک، جو تری رضا ہو تو کر

کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

بدھن بھی حضرت شیخ ابو الفضل ختلیؒ کی درس گاہ کے ظاہری آداب دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

پھر حضرت شیخ اب کشا ہوئے۔ اور حکمت و معرفت کا سمندر اُبل پڑا۔ طویل درس کے دوران ایک بار حضرت نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”کیا لوگ مسلمان ہونے کو اتنا آسان سمجھتے ہیں؟“

بدھن اس دافنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے حضرت شیخ صرف مجھ سے خطاب ہیں اور آپ پر میرے دل کی کیفیت عیاں ہو گئی ہے۔

حضرت شیخ ابو الفضل ختلیؒ فرما رہے تھے۔ ”کیا تمہیں وہ آیت مقدسہ یاد نہیں کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جنت سے نکل جانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اب تم اور تمہاری اولاد اتنی آسانی سے اس جنت کو بار بار داخل نہیں ہو سکتے گی۔ پس اے لوگو! اس کھوئی ہوئی جنت کی جستجو کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم غفلت اور لاپرواہی کو اپنا شعار بنا لو۔ اور ہمیشہ کے لئے رائدہ درگاہ قرار دے دیئے جاؤ۔“

حضرت شیخ ابو الفضلؒ کا درس اس قدر اثر انگیز تھا کہ حاضرین مجلس میں سے اکثر لوگ رو پڑے۔ اور ان رونے والوں میں نوجوان طالب، سید حسین زنجائی بھی شامل تھے۔

اس کے بعد سید حسینؒ نہایت پابندی کے ساتھ حضرت شیخ ابو الفضلؒ کے درس میں شریک ہوتے رہے۔ پھر جب درس کا سلسلہ ختم ہوتا تو دوسرے طالبانِ شوق کی طرح سید حسینؒ بھی اپنی قیام گاہ پر واپس چلے جاتے۔ یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ ایک دن مجلسِ درس ختم ہوئی اور حاضرین اٹھ کر چلے گئے تو سید حسین زنجائی خلاف معمول بیٹھے رہے۔

حضرت شیخ ابو الفضلؒ بھی اپنے گھر تشریف لے جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر جب آپ نے ایک نوجوان کو بیٹھے ہوئے پایا تو اسے قریب بلا کر فرمایا۔

”درس تو ختم ہو چکا۔ پھر تم کس کے انتظار میں بیٹھے ہو؟“
سید حسین زنجائی دست بستہ حضرت شیخ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور عرض کرنے لگے۔ ”میں شیخ کی توجہ میں ہوں۔“

”ہماری توجہ تو ایک ایک شریک مجلس پر رہتی ہے۔“ حضرت شیخ ابو الفضل خٹکی نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔
میزبان ہی کیا، جو اپنے کسی مہمان کو نظر انداز کر دے۔“

”میں حضرت شیخ کی خصوصی توجہ کا مستحق ہوں۔“ سید حسین زنجائی نے سرخم کئے ہوئے عرض کیا۔
”تم نے اپنے آپ کو خصوصی توجہ کا مستحق کیسے سمجھ لیا؟“ حضرت شیخ ابو الفضل نے طالبِ شوق سے سوال کیا۔
”ہر شخص اپنا حال بہتر سمجھتا ہے۔“ سید حسین زنجائی نے نہایت اثر انگیز لہجے میں عرض کیا۔ ”آپ کے احترام کرم پر آنے والوں میں سب سے زیادہ غریب اور نادار، میں ہوں۔ اس لئے آپ کی خصوصی توجہ کا طلب گار میں ہی ہوں۔ اب یہ سننے والے پر منحصر ہے کہ وہ میری فریاد سنتا ہے یا نظر انداز کر دیتا ہے۔ میرے پیچھے ہونے والوں کو گو ہر مرد سے لبریز کرتا ہے یا میری کوتاہی کے سبب اپنے دستِ کرم کو روک لیتا ہے۔“
حضرت شیخ ابو الفضل کو ایک نوجوان طالب کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ ”تم آتے رہا کرو اللہ بہتر رزق دے گا۔“
”اور سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔“



پھر ایک دن درس ختم ہوا اور حاضرین مجلس اٹھ کر جانے لگے تو حضرت شیخ ابو الفضل نے سید حسین زنجائی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”نوجوان! تم ٹھہر جاؤ۔“
سید حسین زنجائی، حضرت شیخ کے سامنے دوڑا نو ہو کر بیٹھ گئے۔

”کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟“ حضرت شیخ ابو الفضل نے سید حسین زنجائی سے کئی سوال کر ڈالے۔

سید حسین زنجائی نے مختصر آ عرض کیا۔ ”سید زادہ ہوں، بغداد سے آیا ہوں۔ اور شیخ کے دامن سے وابستہ ہونا چاہتا ہوں۔“

حضرت شیخ ابو الفضل نے سید حسین زنجائی کی بات سن کر فرمایا۔ ”تمہیں ہمارا پتہ کس نے دیا تھا؟“
پھر جب سید حسین زنجائی نے بغداد کے ایک شخص کا حوالہ دیا تو حضرت شیخ ابو الفضل نے سکرانے ہوئے فرمایا۔ ”اللہ اس شخص کو اس کی خوش گمانی کا اجر دے۔ مگر ہم بذاتِ خود ایسے نہیں، جیسا کہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ بڑا ان کا حسن ظن ہے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔“

”اب جو بھی ہے، میں تو اس در پر آپڑا۔“ یہ کہتے ہوئے سید حسین زنجائی رونے لگے۔ ”شیخ! مجھے تو اس بات سے شرم آتی ہے کہ دروازے دروازے پر دستک دیتا پھروں۔ میں نے تو اللہ پر سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔... اے اللہ! مجھ تشنہ لب کی پیاس بجھانی ہے تو اسی در سے میرے لئے معرفت کا آبشار جاری کرے گا۔“

حضرت شیخ ابو الفضل نے خوش ہو کر سید حسین زنجائی کے سر پر اپنے دستِ کرم کا سایہ کر دیا۔ پھر نہایت جذبہ سوز کے عالم میں فرمایا۔

”معرفت میں یقین اور اس پر استقامت ہی سب کچھ ہے۔ سید حسین! تم ہمارے ہو۔ اور انشاء اللہ! ہمارے ہی رہو گے۔ ایسا نہیں ہے کہ اکیلے تم ہی مضطرب تھے اور ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ہم بھی تمہارا انتظار کر رہے

نے والا کب آتا ہے؟ اور کب ہم اس کی امانت اس کے سپرد کرتے ہیں؟“

اس کے بعد سید حسین زنجائی، حضرت شیخ ابوالفضل ختلیؒ کے دستِ حق پرست پر ”سلسلہ جنیدیہ“ میں بیعت ہو کر کثیرہ روحانی اس طرح ہے۔ سید حسین زنجائی، مرید حضرت ابوالفضل ختلیؒ، حضرت ابوالحسن حصریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت سری سقطیؒ، حضرت معروف کرخیؒ، حضرت داؤد طائیؒ، حضرت حبیب بصریؒ، حضرت خواجہ حسن بصریؒ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت سید حسین زنجائیؒ نے اپنے پیر و مرشد، حضرت شیخ ابوالفضل کی خدمت، غلاموں کی طرح کی۔ آپ سفرو و آمدات کے ہمراہ رہتے۔ سامان اٹھاتے۔ سردیوں کے موسم میں پانی گرم کرتے۔ رات کے وقت پیر و مرید کے دروازے پر کسی مستعد چوکیدار کی طرح کھڑے رہتے کہ کب حضرت شیخ کو کوئی ضرورت پڑے اور آپ فوراً اسے تکمیل تک پہنچائیں۔

سید حسین زنجائیؒ کا یہ ذوق و شوق اور جذبہ خدمت گزاری دیکھ کر حضرت شیخ ابوالفضلؒ آپ سے راضی ہو کر فرماتے تھے کہ اپنی عمر میں سید حسین زنجائیؒ سے کئی سخت مجاہدے کرائے۔ اس موقع پر آپ رقت آمیز لہجے میں فرمایا کرتے تھے۔

”شیخ محترم! اگر آپ نے اپنی روحانی طاقت عطا نہیں کی تو میں اس خارزار میں زخمی ہو کر گر پڑوں گا۔“
حضرت شیخ ابوالفضلؒ اپنے مرید کی اس سعادت مندی سے بہت خوش ہوئے اور نہایت سوز و جذب کے لہجے میں فرمایا۔

”فرزند! اس راستے میں تمہا نہیں ہو۔ پیران ”سلسلہ جنیدیہ“ کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“
اس کے بعد حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے فرمایا۔ ”سید حسین! اب تم ایک کمرے میں گوشہ نشین رہ کر یکسوئی حاصل کرو۔“

حضرت سید حسین زنجائیؒ کی ان ریاضتوں کا زمانہ کئی سالوں پر محیط ہے۔ اس دوران آپ کی غذا بھی بہت قلیل رہی۔ بس سوئے جاتے، ہر وقت آپ کی زبان مبارک پر اللہ ہی اللہ تھا۔ مشہور ہے کہ حضرت سید حسین زنجائیؒ، ”نات اللہ“ کا بہت زیادہ ورد کیا کرتے تھے۔

کئی راتوں کے مطابق حضرت سید حسین زنجائیؒ ”شب بیدار“ صوفی تھے۔ آپ اکثر عشاء کے وضو سے فجر تک بیدار رہتے تھے۔

حاجب آپ کی روحانی تربیت مکمل ہو گئی تو ایک دن حضرت شیخ ابوالفضلؒ کے حکم پر ایک محفل خاص منعقد کیا گیا۔ محفل خاص کے مہمان خاص، حضرت سید حسین زنجائیؒ تھے۔ اس تقریب میں سید حسینؒ کو اعزاز خاص سے نوازا گیا۔ تمام مرید صف بستہ بیٹھے تھے کہ حضرت شیخ ابوالفضلؒ داخل ہوئے۔ مرید و خدمت گار اور باادب حاضرین کو اپنی جگہ کھڑا نہیں ہوا کہ یہی اس محفل کا دستور تھا۔

حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے سید حسینؒ کو مریدوں کی صف سے آگے آنے کا حکم دیا۔

برسین اپنی نشست سے اٹھے اور دو زانو ہو کر حضرت شیخ کے سامنے بیٹھ گئے۔

مردودت گار، لکڑی کے ایک بڑے طشت میں خرقة اور دستار لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ ابوالفضل ختلیؒ نے دست مبارک سے جواں سال مرید کو ”سلسلہ جنیدیہ“ کا خرقة خلافت پہنایا۔ پھر سر پر دستار سجائی۔ آج یہاں غالب شوق و معرفت کی سند حاصل ہو گئی تھی۔

اس رسم کی تکمیل کے بعد حضرت شیخ ابوالفضل خٹلیؒ کے ساتھ تمام مریدین، خدمت گار اور دوسرے علماء و علما تقریب میں شریک ہوئے تھے، سب نے خالق کائنات کی بارگاہ کرم میں اپنے دامن پھیلا کر سید حسینؒ کی استغاثہ کے لئے دعائیں کیں۔

پھر اسی محفل میں حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے اپنے مرید سعید کو ”میراں“ کا لقب بخشا۔ بعض اہل علم کے مطابق ولایت و معرفت میں ”میراں“ کا لقب ایک خاص اہمیت اور مقام رکھتا ہے۔ گزرتے ہوئے وقت کے ناخوشی، مرشد کے بخشے ہوئے لفظ نے اتنی شہرت حاصل کی کہ بہت سے لوگ، سید حسینؒ کا اصلی نام بھول گئے۔ اور میراں کے نام سے پکارنے لگے۔

خود خلافت عطا کرنے کے بعد ایک دن حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے سید حسینؒ کو خلوت میں طلب کر کے فرمایا: ”سید حسین! ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت زار پر میرا دل بہت روتا ہے۔ گردشِ وقت نے ایک بار ہم انہیں اسی مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ وہ اپنے ایمانوں کو اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے، کفارانِ پنجاب کے جبر و ظلم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔“ یہ کہتے ہی حضرت شیخ ابوالفضل خٹلیؒ خود بھی آبدیدہ ہو گئے۔ ”تم ہندوستان جاؤ اور ان لوگوں کی دلجوئی کرو، جو ایمان کی طرف آنے کے باوجود ہندو راجپوتوں کی وجہ سے خوف و دہشت میں مبتلا ہیں۔ اور ان لوگوں کو بھی توحید کا پیغام سناؤ، جو ہزاروں خداؤں کے زرخے میں گھرے ہوئے، جہنم کی آگ کا ایندھن بنے جا رہے ہیں۔ تمہاری تبلیغ کا مرکز لاہور ہو گا۔“

حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ ایک مجاہد کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آپ کے چہرے پر جوش کا رنگ نمایاں رہا اور سینے میں عزم کی آگ روشن تھی۔



حضرت میراں حسین زنجائیؒ کا خیال تھا کہ ڈھول بجانے والے ہندو نو جوانوں کا یہ وقتی اور اضطراری عمل ہے جو اسی محلے کے لئے مخصوص تھا۔ مگر جب خدائے واحد کا پیغام سنانے والی یہ مختصر سی جماعت دوسرے محلے میں پہنچی تو وہاں بھی یہی ڈھول بجانے والے موجود تھے۔ حضرت میراں حسین زنجائیؒ نے دوسرے محلے کے ہندوؤں کو مخاطب کرنا چاہا۔ مگر وہاں بھی آپ کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ یہاں تک کہ مبلغِ اسلام کی آواز، ڈھول کے شور و دُوب غنمی۔

پھر حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ جہاں تشریف لے گئے، وہ شوخ و شریر راجپوت نو جوان آپ کے نوازہ میں چلتے رہے۔ یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آ گیا۔ آپ نے قریب ہی کوئی صاف جگہ دیکھی اور اپنا در بچھا کر نماز ادا کرنے لگے۔ حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ اس مختصر سی صف کے امام ہوتے۔ اور مقتدیوں میں آ کے دونوں حقیقی بھائی، حضرت یعقوب زنجائیؒ، حضرت موسیٰ زنجائیؒ اور دوسرے چند خدمت گار ہوتے۔ مقامی ہندو آپ کے طریقہ عبادت کو بہت غور سے دیکھتے اور ایک دوسرے سے سوال کرتے۔

”یہ کیسے لوگ ہیں؟ ان کے سامنے کوئی صورت ہے نہ صورت۔ پھر یہ کس کے آگے سر جھکا رہے ہیں؟“ حضرت یعقوب زنجائیؒ اور حضرت موسیٰ زنجائیؒ، کفارانِ لاہور کا یہ رویہ دیکھ کر بہت آزرده خاطر ہو گئے۔ حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ نے اپنے دونوں بھائیوں اور دوسرے مبلغینِ اسلام کو تسلیاں دیں۔

”شیخ! ہم وعظ و تقریر کی مشقت سے نہیں گھبراتے۔ مگر کوئی ہماری بات سننے کے لئے اپنی سماعت کے دروازے تو کھولے۔“ حضرت یعقوب زنجائیؒ نے انتہائی غم زدہ لہجے میں اہل ہند کی بے حسی کی شکایت کی۔ ”ہم گڑ

کے انساؤں سے نہیں، پتھروں سے اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔“

پہلے بھائی کی بات کے جواب میں حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ نے فرمایا۔ ”یہ وہی لوگ ہیں، بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جن کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے ہیں اور دلوں پر مہر لگا دی

تو قرینہ پر پردے انھیں گے اور نہ مہریں کھلیں گی۔“ دوسرے بھائی حضرت موسیٰ زنجائیؒ نے عرض کیا۔ ”ہم جانتے ہیں، ان کی تقدیرات کے بارے میں فیصلہ کرنے والے؟“

حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”ہمیں تو بس صنم کدہ حیات میں اذان دینے کا حکم ہے، کئی فلاح و خیر کی طرف آتا ہے یا نہیں؟ اس کا علم تو اُس ذاتِ بے نیاز کو ہے، جس کی لامحدود بصارت کے کائنات کا حقیر ترین ذرہ بھی محفوظ نہیں۔“

جی صورت حال سے حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ اور آپ کے رفیقانِ کار گزر رہے تھے، اس کی عکاسی فرماتے اپنے اس شعر میں کی ہے۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی استیوں میں

مجھے ہے حکم اذلا، لا الہ الا اللہ!

بمصر حال مزید خراب ہو گئی۔ ڈھول اور تالیاں بجانے والے ہندو نوجوان کبھی کبھی کسی مبلغ کی دستار چھین لیا جاتے۔ یا عبا کا دامن چاک کر ڈالتے۔ بت پرستوں کی اس جارحیت پر حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ ہر قسم کو مبروض کی تلقین فرماتے۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ مگر ایک بھی ہندو، حلقہٴ اسلام میں داخل نہیں ہوا۔ بشریت کے تقاضوں سے مجبور آپ کے بھائی اور ساتھی بدل نظر آنے لگے۔ آخر ایک دن حضرت یعقوب زنجائیؒ نے بعدِ احترام عرض کیا۔

”اے ابا! محسوس ہوتا ہے کہ یہ سنگلاخ زمین اس قابل نہیں ہے کہ اس میں اسلام کی تخم کاری کی جاسکے۔“

حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ اپنے چھوٹے بھائی کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ مگر آپ نے اپنی رائے کا اظہار نہ کیا۔ دوسرے بھائی حضرت موسیٰ زنجائیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تم کیا محسوس کرتے ہو موسیٰ؟“

حضرت موسیٰ زنجائیؒ نے عرض کیا۔ ”شیخ! میری رائے تو یہی ہے کہ ہم لوگ واپس چلیں۔ پتھروں کو پوجتے یہاں کے لوگ بھی پتھر ہو گئے ہیں۔ بارش بھی جتنے ہوئے گرد و غبار کو صاف کر دیتی ہے، مگر پتھروں میں

نہیں ڈال سکتی۔“

دوسرے خدمت گاروں کی بھی یہی رائے تھی کہ جب یہ بہرے، سماعت کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تو پھر اہلِ انبیاؑ کی تقریریں ان پر کیا اثر کریں گی۔“

حضرت سید میراں حسینؒ نے اندازہ کر لیا کہ آپ کے تمام ساتھی اس کارِ تبلیغ کو لا حاصل سمجھ رہے ہیں۔ ایسی حالتِ سماعتوں میں بھی آپ نے اُمید کا دامن نہیں چھوڑا اور مبلغینِ اسلام کی نہایت مختصر جماعت کو مخاطب

نہ ہوئے فرمایا۔

”بے شک! ہمارے نرم و نازک الفاظ کی بارش ان پتھروں میں شکاف نہیں ڈال سکتی۔ مگر وہ جی و قیوم تو اس پر قادر ہے کہ زمین پر حشر برپا کر دے اور ایسا زلزلہ لے آئے کہ ان پتھروں کو پُور پُور کر دے۔ اسمائے حسنہ

یہ اسمِ پاک ”مقلب القلوب“ بھی ہے۔ دلوں کو پھیرنے والا، بدلنے والا۔ میں اپنے اللہ کے بے پناہ کرم پر

یقین رکھتا ہوں کہ وہ ایک نہ ایک دن ہماری ان حقیر کوششوں کو ضرور قبولیت کا شرف بخشے گا۔ یہ کہہ کر حضرت میرا حسین زنجانی نے کچھ دیر کے لئے سکوت فرمایا۔ اور اپنے ساتھیوں کے چہروں کا بغور جائزہ لینے لگے۔ حضرت شیخ کے احترام میں سب لوگ خاموش تھے۔ مگر ان کے چہروں پر جوش اور شادابی کے آثار نہیں تھے۔ ”ہو سکتا ہے کہ ہماری یہ تحریک ناکام ہو جائے۔ مگر ہمیں انجام اور نتائج سے بے نیاز ہو کر اپنا کام جاری رکھنا چاہئے۔“ حضرت سید میرا حسین زنجانی نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ”اگر تم لوگ اکتانے ہو تو اپنے گمراہ کو واپس جاسکتے ہو۔ مگر میں اپنے پیر و مرشد کے حکم کا پابند ہوں۔ جب تک بارگاہِ شیخ سے دوسرا حکم جاری نہیں ہوگا، اس وقت تک میں سرزمینِ لاہور نہیں چھوڑ دوں گا۔ یا تو حق تعالیٰ مجھ عاجز کی کوششوں کو بار آور کرے گا۔ یا مجرمیں یہیں پیوندِ خاک ہو جاؤں گا۔“

حضرت سید میرا حسین زنجانی کے یہ عزائم دیکھ کر آپ کے دوسرے ساتھی بھی اپنے اپنے جہول میں ایمان کی نئی حرارت محسوس کرنے لگے۔

پھر اس رات جب حضرت میرا حسین زنجانی سوئے تو آپ نے خواب میں اپنے پیر و مرشد کو دیکھا۔ حضرت شیخ ابوالفضل ختمیؒ آپ کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔

”فرزند! ہمیں تمہاری یہ استقامت پسند آئی ہے۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟“

حضرت سید میرا حسین زنجانی نے پیر و مرشد کی بارگاہ میں عرض کیا۔ ”سیدی! آخر مجھ سے کیا کوئی کامیابی ہو رہی ہے، جو یہاں کے لوگ میری بات سننا تک گوارا نہیں کرتے۔“

حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”فرزند! تم سے کارِ تبلیغ میں کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی۔ اللہ کے یہاں ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ تمہارے صبر کی آزمائش تھی، سو اس میں تم پورے اترے۔ اب ہمیں لازم ہے کہ جمعۃ المبارک کے دن تبلیغ کے لئے گلی کوچوں میں نکلا کرو۔ باقی دنوں میں اپنے گھر میں قرا رکھو۔ اور انتظار کرو کہ پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ میں شب و روز دعا کرتا ہوں کہ تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس عاجز کی دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔“ ان کلمات خیر کے ساتھ حضرت شیخ ابوالفضل ختمیؒ رخصت ہو گئے۔ حضرت سید میرا حسینؒ کی آنکھ کھلی تو فجر کا وقت قریب تھا۔ آپ نے ”سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر“ کہتے ہوئے اپنے خالق کی کبریائی بیان کی۔ اور فوری طور پر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔

پھر صبح کو حضرت سید میرا حسینؒ نے اپنا خواب دوسرے ساتھیوں کے سامنے بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میرا تم سے نہیں کہتا تھا کہ پیر و مرشد ہمارے حالِ زار سے بے خبر نہیں ہوں گے۔ اہل ایمان کو راہِ حق میں نئی کوششوں کا نوید ہو۔“

حضرت سید میرا حسین زنجانیؒ کا خواب سن کر حضرت یعقوب زنجانیؒ، حضرت موسیٰ زنجانیؒ اور دیگر مخلصوں کے چہرے اس طرح کھل اُٹھے، جیسے رحمتِ حق کی تیز بارش نے خشکست و ناکامی کا غبار دھو دیا ہو۔ اور انہیں یوں محسوس ہونے لگا، جیسے ان کے دلوں کو کسی دستِ نادیدہ نے تھام لیا ہو۔ اور وہ آن کی آن میں استقامت و ہمت کا کوہِ گرا بن گئے ہوں۔

پھر اسی روز سے حضرت سید میرا حسین زنجانیؒ کا معمول بن گیا کہ آپ جمعۃ المبارک کے دن نماز فجر ادا کر کے تبلیغ کے لئے اپنی خانقاہ سے نکلتے۔ پھر گھر واپس آ کر نمازِ جمعہ ادا کرتے۔ اس کے بعد دوبارہ اللہ کا فضلِ ستارہ کرنے کے لئے لاہور کے گلی کوچوں میں نکل جاتے۔

لی چوں ہی گزرے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جس نے لاہور کی جمود زدہ فضاؤں میں ارتعاش پیدا

دلوں میں ہوا کہ لاہور کا ایک آسودہ حال راجپوت بیمار پڑ گیا۔ شہر کے تمام ویدوں (طبیعوں) نے اس کا
مرض کی تشخیص بھی کی اور بہترین دوائیں بھی تجویز کیں۔ مگر اس راجپوت کو ذرہ برابر بھی افادہ نہیں ہوا۔
دکان کے ساتھ ساتھ اس کا مرض روز بہ روز بڑھتا چلا گیا۔

جب تم لوگ مرض کو پہچان بھی گئے اور تمہارے بقول تم نے بہترین دوائیں بھی تجویز کی ہیں تو پھر میں
نہیں نہیں ہوتا؟“ بیمار راجپوت نے انتہائی غضب ناک لہجے میں اپنے معالجین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
”مرض کی تشخیص بھی ہو چکی ہے اور بہترین دوائیں بھی استعمال کرائی جا رہی ہیں۔“ تمام ویدوں (طبیعوں)
یک زبان کہا۔ ”اب اگر آپ صحت یاب نہیں ہوتے تو پھر بھگوان جانیں کہ ان کی کیا مرضی ہے؟“

ہیول سے مایوس ہو کر راجپوت نے مندروں میں اپنے خرچ سے ”ہون“ اور ”بھجن“ کرائے۔ لاہور کے تمام
پائے پڑھتوں اور معزز برہمنوں کو لذیذ کھانے کھلائے۔ غریبوں میں نقد پیسے تقسیم کئے۔ مگر مریض کو کوئی فائدہ
نہ ہوا۔ وہ روز بہ روز اس پودے کی طرح سوکھتا جا رہا تھا، جو پانی سے محروم ہو گیا ہو۔ پروہتوں اور نجومیوں کو
پان لوگوں نے اپنے اپنے حساب کے مطابق اندازے لگائے اور بیمار راجپوت کے عزیزوں سے دبے دبے
دوائی کہہ دیا کہ مریض بس کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ زندگی کے دفتر سے اس کا نام کٹ چکا ہے۔

ہر طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد بیمار کے رشتے داروں نے آپس میں مشورہ کیا۔ ”اب لاہور میں وہی
ہالہ دے گئے ہیں، جو سینکڑوں خداؤں کا انکار کرتے ہوئے ایک خدا کا اقرار کرتے ہیں۔“ بیمار راجپوت کے
بہن نے حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ اور ان کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان سے بھی
پارے لے لیں، جو کی نایدہ طاقت کے آگے سر جھکاتے ہیں۔“

افرت پرستوں کی مجبوریاں انہیں ایک خدا پرست کے دروازے پر لے گئیں۔ حضرت سید میراں حسین
ہالہ نے بیمار راجپوت کے غم زدہ ماں باپ کو اپنے سامنے دامن پھیلائے کھڑا دیکھا تو سکراتے ہوئے فرمایا۔

”غیر کے پاس کیا مانگنے آئے ہو؟ اس جگہ کا داتا تو کوئی اور ہے۔ اُسی کے دوار (دروازے) پر جاؤ اور اسی
نے تمہارے“ حضرت سید میراں حسینؒ نے ہندو راجپوتوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کی۔ اور واضح کر دیا کہ دینے
والی ہی ہے اور اسی کے اختیار میں ان کے بیٹے کی زندگی بھی ہے۔

”تم اپنے سارے دیوی دیوتاؤں کو پکار چکے۔ مگر کسی نے ہماری نہیں سنی۔“ بوڑھے ماں باپ اپنی بے کسی پر
نہ گئے۔

”نئے والا ایک ہے اور تم لوگ سینکڑوں کو پکارتے ہو۔“ حضرت میراں حسین زنجانیؒ نے پُر جلال لہجے میں

”تم اس ایک کو نہیں جانتے۔“ بوڑھی ہندو عورت نے کہا۔ ”تم اسے جانتے ہو تو تم ہی اسے پکارو۔ ہمیں تو
بیٹے کی زندگی چاہئے۔“

حضرت سید میراں حسینؒ، بت پرستوں کو مختصر آپنیام تو حید سنا چکے تھے۔ پھر آپ نے اپنے ایک ساتھی سے پانی
لیا اور اس پر سورۃ فاتحہ دم کر کے وہ پیالہ بوڑھی عورت کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ پانی اپنے بیٹے کو پلا دو۔ وہ جو
بے ہے اور اکیلا ہی اس دنیا کا مالک ہے، تمہارے بیٹے کو شفا بخشے گا۔“

بوڑھے ماں باپ نے شدید حالتِ جبر میں وہ پانی اپنے بیٹے کو پلا دیا جو ایک غیر مذہب کے ماننے والے نہ دم کر کے دیا تھا۔

پھر وہ پانی، موت کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک بیمار کے لئے آبِ حیات ثابت ہوا۔ نوجوان راجپوت چند دنوں میں صحت یاب ہو گیا۔ اور اپنے پیروں پر چل کر حضرت سید میراں حسین زنجائی کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ ”میں اپنے دیوی دیوتاؤں کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں جھکا۔ مگر آپ کے قدموں پر سر رکھتا ہوں۔“ نوجوان راجپوت نے رقت آمیز لہجے میں کہا اور حضرت سید میراں حسین زنجائی کے پیروں کی طرف جھکنے لگا۔

”میں تمہیں یہی راز تو سمجھانے آیا ہوں کہ ایک انسان کا سر نہ دوسرے انسان کے آگے جھکا ہے اور نہ عورتوں کے سامنے۔ سجدہ گزاری کے لائق تو بس وہ ایک ہی ہے، جو اپنی ذات میں واحد ہے۔“

”آج میں بھی سینکڑوں کی نفی کر کے اسی ایک کی بندگی کا اقرار کرتا ہوں۔“ نوجوان راجپوت نے عزت میراں حسین زنجائی کی تلقین پر کلمہ طیبہ پڑھا اور داخلِ اسلام ہو گیا۔

اذیتوں کے تپتے ہوئے صحرا میں ساڑھے تین سال گزارنے کے بعد ٹھنڈی ہوا کا یہ پہلا جھونکا تھا جسے حضرت سید میراں حسینؒ اور آپ کے ساتھیوں نے محسوس کیا۔ یہ پہلا پتھر تھا، جو اہل ایمان کی سامانوں کی حرارت سے پکھلتا تھا۔

راجپوت گھرانے کے قبولِ اسلام کے بعد یہ خبر بہت تیزی کے ساتھ پورے لاہور میں پھیل گئی۔ ہر مریض کے لئے علاج مریض تھے، وہ حضرت سید میراں حسینؒ کی خانقاہ کی طرف دوڑے ہوئے جانے لگے۔ ان میں سے ہر مریض بہت زیادہ بے باک ہوتے۔ وہ حاضر ہوتے ہی صاف صاف کہہ دیتے۔ ”ہم صحت یاب ہونے کے بعد تمہارا مذہب قبول نہیں کریں گے۔“

جواب میں حضرت میراں حسینؒ فرماتے۔ ”جو تمہیں شفا بخشے گا، وہی ہدایت بھی دے گا۔ میں کسی ہمارے کو نہ دے سکتا ہوں اور نہ ہدایت۔“

آخر وہی لوگ شفا یاب ہو کر ایمان لے آتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر وہ لوگ بھی اسلام کی طرف رجوع کرنے لگے، جو چند سال پہلے راجپوتوں کے تشدد کے باعث ہندو مذہب کی طرف لوٹ گئے تھے۔ اپنی مغفوں کو درہم برہم ہوتا دیکھ کر ہندوؤں نے یہ افواہ پھیلانی شروع کر دی کہ حضرت میراں حسین زنجائیؒ کا دم کیا ہوا پانی دراصل جادو کی پانی ہے۔ جس سے اہل ہندو کی ماہیتِ قلب بدل جاتی ہے۔ وہ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر ایک نادیدہ خدا پر ایمان لے آتے ہیں۔ بت پرستوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ یہ تم کی۔ مگر اس کا کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوا۔ خود کفار کے حلقے سے کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے اپنے بڑاؤ کی مخاطب کر کے کہا۔

”پانی پر تو تم لوگ بھی پھونکیں مارتے ہو۔ مگر اس سے کوئی مریض شفا یاب نہیں ہوا۔ اگر وہ مسلمان فقیر، جاہل ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ وہ تم سے بڑا ساحر ہے۔“



صنم کدوں کی دیواریں، جو بظاہر بہت مضبوط نظر آتی تھیں، ان میں ”ضربِ لا الہ“ سے ہلکے ہلکے شکاف پڑ گئے۔ پھر اس خوف سے کہ کہیں یہ شکاف بڑھتے بڑھتے بت خانوں کی بنیادوں کو نہ ہلا دیں، لاہور کے ہندوؤں نے حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ اور ان کے ساتھیوں کے قتل کا منصوبہ بنا ڈالا۔ اس کام کے لئے چار ایسے راجپوت

نہیں کو ختب کیا گیا، جو شمشیر زنی کے فن میں ماہر تھے۔

ہر ایک رات، جب چاند کی آخری تاریکیں تھیں اور فضا پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی، یہ چاروں شمشیر بکف، رات کے قریب حضرت میراں حسین زنجانی کی خانقاہ میں داخل ہوئے۔ انہیں معلوم تھا کہ حضرت شیخ نمازِ عشاء کو پڑھنے کے لئے آرام فرماتے ہیں۔ اور پھر تہجد کی نماز کے لئے اٹھ جاتے ہیں۔ اس وقت بس ایک نگار بیدار ہوتا ہے اور باقی درویش محو خواب ہوتے ہیں۔ راجپوت نوجوانوں کی یہ ساری جاسوسی اور خبر گیری نے فی کے خانقاہ کے دوسرے خدمت گار، قاتلوں کے راستے میں مزاحم نہ ہوں اور حضرت سید میراں حسین کو اٹھانے کے ساتھ قتل کیا جاسکے۔

مکمل منصوبہ بندی کے بعد چاروں راجپوت نوجوان اپنی بے نیام شمشیریں لئے ہوئے حضرت میراں حسین کے کمرے میں داخل ہوئے، جو آپ کی ریاضت و عبادت کے لئے مخصوص تھا۔ اس وقت حضرت شیخ اسم "اللہ" پڑھ رہے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ آہستہ آہستہ پڑھتے رہتے، پھر اچانک زوردار ضرب لگاتے۔ جب وہ راجپوت نوجوان، حجرے میں پہنچے تو حضرت سید میراں حسین کی پشت مبارک ان ہی کی طرف تھی۔ قتل کے ارادے سے انہوں نے زورداروں کو اپنی منزل بہت آسان نظر آ رہی تھی۔ چاروں شمشیر بکف راجپوت نوجوان دبے قدموں حضرت کے قریب پہنچے۔ اور پھر جیسے ہی ان کے طاقتور بازو، ایک مردِ مومن پر وار کرنے کے لئے فضا میں اڑے، حضرت میراں حسین نے "اللہ" کی ضرب لگائی۔ اور وہ چاروں نوجوان، بینائی سے محروم ہو گئے۔

وہ راجپوت اپنی اس حالتِ زار پر چیخنا چاہتے تھے، مگر اس خوف سے چپ رہے کہ کہیں ان کی چیخوں سے خانقاہ کے دوسرے خدمت گار بیدار ہو کر ان پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹے اور انہوں نے یہاں تک نیت کی کہ وہ حضرت سید میراں حسین زنجانی کو قتل نہیں کریں گے۔ اس خیال کے آتے ہی ان چاروں نے ہتھکڑیاں لٹائی۔ پھر مسلح راجپوت واپس جانے لگے۔ مگر دروازے کے قریب پہنچتے ہی اچانک ان کے ہاتھ بدل گئے۔

"ایک حادثہ بھی ہو سکتا ہے کہ چند لمحوں کے لئے ہماری آنکھوں کی روشنی غائب ہو گئی ہو۔ اور پھر اسی حادثاتی لحاظ سے کھلوٹ آئی ہو۔" راجپوت نوجوانوں نے دروازے سے باہر جا کر آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔

"اصل میں ایک حادثہ تھا، جسے ہم نے مسلمان سادھو (حضرت سید میراں حسین زنجانی) کا چٹکار (کرامت) سمجھا۔" دوسرے راجپوت نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ "یہ بڑا دھوکا ہے۔ واپس چلو اور اس کا کام تمام کر دو۔ ایسا موقع نہیں ملے گا۔"

راجپوتوں کے دلوں میں بھی شیطان نے دوسرے ڈالے۔ اور پھر ان کے دماغوں کو مکمل طور پر منتشر کر دیا۔ چاروں مسلح نوجوانوں نے اپنی تلواریں سونت لیں اور دبے قدموں آگے بڑھے۔ پھر جیسے ہی حضرت سید میراں حسین زنجانی کے قریب پہنچے، ان کی دوبارہ وہی حالت ہو گئی۔ آنکھوں کی روشنی سے یکسر محروم۔ جیسے وہ پیداہی رہے ہوں۔ یہ افادتا گہائی دیکھ کر ان چاروں نے دوبارہ دل میں عہد کیا کہ وہ مسلمان بزرگ کو قتل نہیں کریں گے۔ راجپوتوں کا خیال تھا کہ یہ عہد کرتے ہی پہلے کی طرح ان کی بینائی لوٹ آئے گی۔ مگر خلاف توقع اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔

چاروں زیر لب بار بار عہد و پیمان کرتے رہے کہ آئندہ ادھر کا رخ بھی نہیں کریں گے۔ مگر ان کی آنکھوں کی بینائی لوٹ کر نہیں آئی۔ "بھگوان کے لئے ہمیں ہمارے گھر کا راستہ بتا دو۔ ہم اندھے ہو چکے ہیں۔"

راجپوت نوجوانوں کا شور سن کر حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ مراقبے کی حالت سے باہر آئے۔ ملے اٹھے اور حیرت زدہ نظروں نے ان چاروں نوجوانوں کو دیکھنے لگے، جو دروازے تک جانے کے لئے خانہ کا دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔

حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ مسلح راجپوتوں کے قریب آئے اور آپ نے انتہائی بڑے جلال لہجے میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تم لوگ کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟“

حضرت سید میراں حسینؒ کی آواز سنتے ہی چاروں نوجوانوں کے ہاتھوں سے تلواریں چھوٹ کر گر گئیں۔ بابک مرد درویش کا روحانی جلال تھا، جو اپنے حجرے میں تنہا بھی تھا اور غیر مسلح بھی۔

مسلح راجپوت نوجوانوں کی بات سن کر حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ مسکرائے۔ ”آنکھوں سے غم ہونا کے بعد تم مجھے کیسے قتل کر سکو گے؟ تمہیں تو اپنا ہدف بھی نظر نہیں آئے گا۔“

اپنے سینوں میں پتھر جیسا دل رکھنے والے بہادر راجپوتوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”ہمیں ہماری آنکھیں لوٹا دو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ پھر کبھی ادھر کا ارادہ نہیں کریں گے۔“

چاروں قاتل اُس بے دست و پا شخص سے امان کے طالب تھے، جو کچھ دیر پہلے اُن کی شمشیروں کی زد میں تھا۔ ”میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔“ حضرت سید میراں حسینؒ نے فرمایا۔ ”نہ میں کسی کو کچھ دے سکتا ہوں اور نہ کسی سے کچھ چھین سکتا ہوں۔ پھر بھی دونوں جہان کے مالک سے تمہاری آنکھوں کی روشنی کے لئے دعا کرتا ہوں۔“

ابھی حجرے میں حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کے الفاظ کی ہلکی سی بازگشت باقی تھی کہ بجھے ہوئے چراغ روشن ہو گئے۔ چاروں مسلح راجپوت نوجوانوں کی بینائی ایک بار پھر لوٹ آئی۔

”ہم آپ سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگتے ہیں۔“ چاروں راجپوت بڑے عاجزانہ انداز میں سر جھکا ہوئے کھڑے تھے۔

”یہ درویش بے سرو سامان تمہارا میزبان ہے۔“ حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ نے اپنے مخصوص تہم تلوار کے ساتھ فرمایا۔ ”درویش اپنے مہمانوں کو تواضع کے بغیر جانے نہیں دیتے۔ تم لوگ میری جان لینے آئے تھے مگر پھر چھین جانے کے باعث تم اپنے ارادوں کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اسی وجہ سے میں نے حق تعالیٰ سے تمہارا آنکھوں کی روشنی کے لئے دعا کی تھی۔ تاکہ اُجالے میں تمہاری شمشیروں کو صحیح ہدف نظر آ سکے۔ اپنی تلواریں اُٹھاؤ اور انہیں بے دروغ میرے جسم پر آڑناؤ۔“

حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کے لہجے میں ایسی ہیبت پوشیدہ تھی کہ راجپوت نوجوانوں کے جھول پرند لرزہ طاری ہو گیا اور ان کے ہاتھ سے شمشیریں چھوٹ کر حجرے کے فرش پر گر پڑیں۔ پھر وہ چاروں آگے بڑھے حضرت سید میراں حسینؒ کے قدموں پر گر پڑے۔

”ہم قوم کے راجپوت ہیں۔ مگر بڑے سے بڑے راجہ کے سامنے ہمارا سر نہیں جھکا۔“ چاروں مسلح نوجوان گریہ و زاری کے انداز میں کہہ رہے تھے۔ ”اپنے قاتلوں کو معاف کرنے والا کوئی انسان نہیں، مہاتما ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم آپ کے پیروں پر اپنے سر رکھتے ہیں۔“

”اٹھو کہ سر جھکانے کے زمانے گزر گئے۔“ حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ نے اپنے روحانی جبروت کا مظاہر کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں بحکم اللہ تمہیں انسانوں اور پتھروں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے آیا ہوں۔“

حضرت سید میراں حسینؒ کا حکم سن کر چاروں راجپوت اُٹھ کھڑے ہوئے اور پھرائی ہوئی نظروں نے مسلمانوں کی طرف دیکھنے لگے۔

”ہم! اس حجرے میں تنہا اور تمہارے ارادوں سے بے خبر تھا۔ مگر پھر بھی تم مجھے قتل نہیں کر سکتے۔“ حضرت سید میراں نے رنجائی نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”آخر ایسا کیوں ہوا؟ تم نے سوچا؟“

”ہماری عقل عاجز و پریشان ہے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ چاروں راجپوت نوجوانوں نے بیک زبان کہا۔ ”تم مجھے قتل کر بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ میرا محافظ اعلیٰ ہے۔“ حضرت میراں حسینؒ نے اپنی شہادت کی انگلی، ان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم اُسی کے حکم سے اندھے ہوئے اور اُسی کے حکم سے تمہاری تلواریں ہاتھوں سے پھینک دیں۔ اور اب اُسی کے حکم سے تم پینا انسانوں کی طرح اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو دیکھ رہے ہو۔ یہ کائنات اُن کے حکم سے چل رہی ہے، جو اپنی ذات میں واحد ہے۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔ میں تم چاروں کا جرم معاف کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر حضرت سید میراں حسینؒ نے رنجائیؒ کی اپنی خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔

راجپوت نوجوانوں نے اپنی شبشیریں اٹھائیں اور سروں کو جھکائے ہوئے اس طرح چلے گئے کہ جیسے اُن کے زہر نے انہیں بدترین شکست سے دوچار کر دیا ہو۔

اور کے راجپوت سرداروں کا خیال تھا کہ ان کا منصوبہ کامیاب ہو چکا ہوگا۔ مگر جب حسبِ معمول شہر کی فضا پر نظر پڑی تو راجپوت سرداروں نے ان نوجوانوں کو طلب کر کے پوچھا۔

”اب تک مسلمان درویش کے خون سے دیوی دیوتاؤں کی سرزمین، رنگین کیوں نہیں ہوئی؟“

”اس لئے کہ وہ مسلمان سادھو، ہم سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔“ ایک راجپوت نوجوان نے اثر انگیز لہجے

کہا۔ ”اس کے پاس اتنی بڑی فوج ہے کہ تم ہندوستانی راجاؤں کی سپاہ ل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

ان نوجوان کا بیان سن کر راجپوت سردار گھبرا گئے۔ ”کہاں رہتی ہے اتنی بڑی فوج؟ اُس مسلمان سادھو کے تو ہتھیار تو بیک ہیں، جو وہیں جھونپڑی میں رہتے ہیں۔“

”سردار! وہ سینا (فوج) اُدور سے نظر نہیں آتی۔“ دوسرے راجپوت نوجوان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”زیادہ تو دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف سے مسلح سپاہی نکل آتے ہیں۔“

”تو پھر ہم سب کو جمع ہو کر مسلمان سادھو پر چڑھائی کرنی ہوگی۔“ ایک اور راجپوت سردار نے تشویش آمیز لہجے

کہا۔

”اس سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ آپ ہار جائیں گے۔“ تیسرے راجپوت نوجوان نے درپردہ حضرت سید میراںؒ کی رنجائی کی روحانی طاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

ایک مسلمان درویش کی تعریفیں سن کر راجپوت سردار غضب ناک ہو گئے۔ اور ان چاروں نوجوانوں کو

کہاتے ہوئے کہا۔

”تم بھی اس جادوگر کے طلسم میں گرفتار ہو گئے۔ لعنت ہو تم پر تمام دیوی دیوتاؤں کی۔“

وہ چاروں راجپوت نوجوان اُٹھے اور سیدھے حضرت سید میراں حسینؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پھر انہوں نے ہاتھی چم دار تلواریں ایک مرد درویش کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا۔

”اے مہاتما! ہم تیرے نادیدہ ہتھیاروں سے ہلاک ہو گئے۔ ہمیں نیا جیون پر دان (عطا) کیجئے۔“

حضرت سید میراں حسینؒ نے ان چاروں راجپوت نوجوانوں کو کلمہ طیبہ کی تلقین کی۔ اور پھر وہ دیکھتے ہی

دیکھتے جی اُٹھے۔

اس واقعے سے لاہور کے غیر مسلموں، خصوصاً راجپوتوں میں ہلچل سی مچ گئی۔

جن برہمنوں اور پنڈتوں نے حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کے قتل کے لئے راجپوت نوجوان کو متعین کیا تھا، اب وہی ہندو دھرم کے کرتا دھرتا، راجپوت سرداروں سے انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”جب مذہب کے نگہبان ہی دشمنوں سے جا ملیں تو پھر دیوی دیوتاؤں کی حفاظت کون کرے گا؟“

ہندوؤں میں سب سے زیادہ جفاکش، غیرت مند، جنگجو اور شجاع قوم ”راجپوت“ ہے۔ یہ برہمنوں کی بیان ہے کہ مذہب کی حفاظت کی ذمہ داریاں راجپوتوں کے کاندھوں پر رکھ کر خود مندروں کے سنگھاسن (تخت) پر بیٹھ گئے۔ خون بہانے کے لئے راجپوت۔ اور سادہ لوح عوام کے دلوں پر حکومت کرنے کے لئے برہمن۔ آج جب راجپوت زادوں نے اپنی تلواریں، حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کے قدموں میں رکھ دیں تو لاہور کے پنڈتوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ان چاروں کے باپوں اور دیگر رشتے داروں کو بڑے مندر میں طلب کر کے ان لوگوں سے انتہائی سخت لہجے میں باز پرس کی گئی۔ اور آخر میں پنڈتوں نے فیصلہ سنا دیا۔

”ان چاروں راجپوت نوجوانوں کو ہندو دھرم سے بغاوت کرنے کے جرم میں سب عام دردناک سزائیں دی جائیں گی۔ تاکہ پھر کوئی ہندو اپنے مذہب سے برگشتہ ہو کر اسلام قبول نہ کرے۔“

یہ فیصلہ بڑا جارحانہ تھا۔ وہ چاروں نوجوان الگ الگ راجپوت خاندانوں سے تھے۔ اپنی جوان اولادوں کے خلاف یہ سنگ دلانہ فیصلہ سن کر چاروں راجپوت خاندان برہمن ہو گئے۔ پھر ان لوگوں نے بیک زبان مندر میں کھڑے ہو کر پنڈتوں کے سامنے فیصلہ سنا دیا۔

”بے شک! ہمارے بچوں سے ایک بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ اور اس کی پاداش میں ہم ان چاروں سے رزک تعلق کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کسی برہمن نے ان میں سے کسی کو ہاتھ بھی لگایا تو لاہور کے کلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔“

اس سلسلے میں لاہور کے دوسرے راجپوت خاندانوں نے بھی ان چاروں کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ ”بھائیو! پاپی ہیں۔ بس ان کی یہ سزا کافی ہے کہ انہیں ہمیشہ کے لئے ہندو دھرم سے نکال دیا جائے۔ اگر انہیں جانی نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو لاہور کے اور پنجاب کے تمام راجپوت مل کر اس کے خلاف شدید مزاحمت کریں گے۔“

شاہر پنڈتوں نے بڑی چالیں چلیں۔ مگر برہمن سیاست ناکام ہو گئی۔

وہ چاروں نو مسلم راجپوت اپنے سابقہ مذہب کے قوانین کے مطابق راندۂ درگاہ ٹھہرے۔ اور انہیں ہندو پرادری نے ”اچھوت“ بنا کر رکھ دیا۔ مگر جب وہ ایک بوریا نشین مرد کے ساتھ فرشِ خاکی پر بیٹھے تو انہیں اندازہ ہوا کہ کل تک وہ غلام تھے۔ اور آج پہلی بار ان کی آنکھوں کے سامنے خورشیدِ حریت طلوع ہوا ہے۔ وہ حریت، جس میں واحد نادیدہ طاقت کی بندگی ہے۔ اور باقی تمام قوتوں کی نفی۔

کچھ دن بعد ان چاروں نوجوانوں کے ماں باپ بھی حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور باپ دادا کے صدیوں پرانے صنم خانے چھوڑ کر مسجد کے فرش پر اس معبود کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، جس کی کوئی شکل و صورت نہیں تھی۔ اور جو انہیں ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آ رہا تھا۔



اس واقعے کے بعد حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کی روحانی طاقتوں کا ذکر، صفِ دشمنان میں بھی ہونے لگا۔

ان اور راجپوت مل کر اپنی صفوں کو درست کرنے لگے۔ مگر حضرت میراں حسینؒ کی ”ضربِ الا اللہ“ سے ان کے ہمارے پڑنے لگے۔ پھر ایک نئے واقعے کی گونج نے بت پرستوں کو حیران و عاجز کر دیا۔

حضرت سید میراں حسینؒ زنجائی کی خانقاہ سے کچھ فاصلے پر ایک ہندو کسان رہتا تھا۔ زمین میں بیج بونا اور پھر اپنی اُس کا ذریعہ معاش تھا۔ ہندو کاشتکار کے تین بیٹے تھے۔ اور وہ خود ”دے“ کے اذیت ناک مرض میں مبتلا تھے۔

ایک دن ہندو کسان کو اُس کے ایک ہم مذہب نے سمجھایا۔ ”تمہارے پڑوس میں اتنا بڑا وید (طیب) رہتا ہے کہ ہر مریض اس سے آزار جھیل رہے ہو؟“

ہندو کسان نے حیران ہو کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ ”میرے پڑوس میں تو ایک مسلمان سادھو رہتے ہیں۔ ان سے کیا تعلق؟“

”وہ ہاتھ می ہیں اور بہت بڑے طیب بھی۔ ایک بار ان کے پاس جا کر تو دیکھو۔“ اس شخص نے نہایت بات نہاد لہجے میں کہا۔

ہندو کسان اپنے عقیدے میں بڑا کٹر تھا۔ مگر شب و روز کی یہ تکلیف اسے ایک غیر ہندو طیب کے دروازے پر جانے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔

پانچ دنوں کی کھات ہے کہ ”دو دم کے ساتھ“ جدید میڈیکل سائنس کی ترقی کے باوجود یہ مرض آج بھی علاج ہے۔ ہندو کسان کو بھی یقین نہیں تھا کہ اُسے اُس بیماری سے نجات مل جائے گی۔ لیکن وہ صرف ایک دن درویش کو آزمانے کے لئے حضرت سید میراں حسینؒ کی خانقاہ میں حاضر ہو گیا۔

”اے تو تمہاری بیماری لا علاج ہے۔ مگر دنیا میں صرف ایک حکیم ایسا ہے، جو تمہیں چند لمحوں میں مکمل صحت عطا کرے۔“ حضرت میراں حسینؒ زنجائی نے ہندو کسان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”اے اُس حکیم کا پتہ بتا دیں۔“ تکلیف کی شدت سے مجبور ہو کر ہندو کسان نے حضرت سید میراں حسینؒ زنجائی سے کہا۔

”وہ حکیم ان بیماروں سے نہیں ملتا، جو سینکڑوں خداؤں کی پوجا کرتے ہیں۔“ حضرت سید میراں حسینؒ زنجائی نے نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ آپ غیر مسلمہ دلوں کو تبلیغ کرتے وقت بہت نرم رویہ اختیار کرتے تھے۔ ”اگر تم پہلے سے ایک خدا پر ایمان لے آؤ تو یہ اذیت ناک بیماری تمہارا پیچھا چھوڑ دے گی۔“

”کیا میں صحت یاب ہو جاؤں گا؟“ ہندو کسان تذبذب اور یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

”تم اپنی اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھو گے۔“ حضرت سید میراں حسینؒ زنجائی نے تبسم و دلاؤ کے ساتھ فرمایا۔

”میری دلی تم دیانت داری اور خلوص کے ساتھ ٹوٹے بچاؤں سے نکل کر ایک خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو گے۔“ ہندو کسان کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ اُسے آبائی مذہب چھوڑتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا تھا۔ لوگ کیا سمجھیں گے؟ یہی سچ کیا سلوک کریں گے؟ پوری ہستی میں اچھوت بن کر رہ جاؤں گا۔ ہندو کسان کے دماغ پر فحشا کی یلغار تھی۔ آخر اُس کا ذہن ایک منافقانہ فیصلے پر جم گیا۔

”میں زبان سے مسلمان ہو جاتا ہوں۔ مگر دل سے اپنے دیوتاؤں کا پجاری رہوں گا۔ کسی کو کیا خبر ہو گی؟“

اس منافقانہ فیصلے کے بعد ہندو کسان نے حضرت سید میراں حسینؒ زنجائی کی تلقین پر کلمہ طیبہ پڑھ لیا۔ پھر جیسے

ذاتِ خالی کی ذاتِ اقدس اور حضور اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر گواہی دینے کا عمل مکمل ہوا، ہندو

کسان کو اپنے جسم کے اندر غیر معمولی تغیر کا احساس ہونے لگا۔ مرض کی شدت کے باعث اُس کی سانس بند جاتی تھی اور آنکھیں اُگل پڑتی تھیں۔ حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ سے گفتگو کرتے وقت ہندو کسان اچانک خاموش ہو جاتا تھا۔ پھر بڑی مشکل سے سانس پر قابو پاتا اور اپنی بات جاری رکھتا۔ مگر جیسے ہی اُس نے کو کبر پڑھا، سانس کی تکلیف اس طرح ختم ہو گئی، جیسے اُسے یہ مرض کبھی تھا ہی نہیں۔

ہندو کسان نے جوشِ عقیدت میں حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور واپس جانے لگا۔ بہت خوش تھا۔ ہاتھ سے ہندو دھرم بھی نہیں گیا اور برسوں پرانے اذیت ناک مرض سے نجات بھی مل گئی۔ بہن آسان نسخہ تھا۔ اور نہایت سست سودا۔

مگر جب ہندو کسان، خانقاہ کے دروازے پر پہنچا تو حضرت سید میراں حسینؒ نے اُسے مخاطب کر کے فرمایا۔ ”ایک بات یاد رکھو! میں نے تمہیں جس مذہب کی تلقین کی ہے، وہ اپنے ماننے والوں سے پوری چلی چلا ہے۔ ظاہر و باطن کی یکسانیت۔ اسلام، زبان اور دل دونوں کی گواہی مانگتا ہے۔ تم نے میرے سامنے اقرار کیا کہ انا ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے رسول ہیں۔ لیکن باہر جا کر تمہارے دل۔ انکار کر دیا تو پھر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ جان لیوا بیماری دوبارہ اسی شدت کے ساتھ اُبھر آئے گی۔ تمہاری تمام روحانی اور جسمانی بیماریوں کا ایک ہی علاج ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے جو عہد کیا ہے، اس پر آخری سانس تک پورے یقین اور استقامت کے ساتھ جے رہو۔“

ہندو کسان حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی منافقت ایک مرد روشن ضمیر پر عیاں ہو گئی تھی۔ ہندو کسان لرزتے قدموں کے ساتھ پلٹا اور حضرت سید میراں حسینؒ کے سامنے اپنے منصوبے کا اعتراف کرنے لگا۔

اپنے اس گناہ کی معافی اس ذاتِ پاک سے مانگو، جو تمہارے تمام اندیشوں اور وسوسوں سے باخبر ہے۔ اور ان خیالات کو بھی جانتا ہے، جو ابھی تمہارے ذہن میں پیدا نہیں ہوئے ہیں۔“ حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ نے حق تعالیٰ کی بے پناہ قدرت کو اس قدر موثر لہجے میں بیان کیا کہ ہندو کسان رونے لگا۔ پھر اس نے سب کے سامنے اپنے اس منافقانہ عمل سے توبہ کی۔ اور جب وہ اپنے گھر کی طرف واپس جا رہا تھا تو اس نے اپنے دماغ، دل اور زبان کو بہت ہلکا محسوس کیا۔ جیسے کوئی بہت بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔ اور برسوں پرانا تہہ در تہہ جما ہوا میل کچل اُتر گیا ہو۔ ہندو کسان کی تبدیلیِ مذہب کو اُس کی بیوی اور بیٹوں نے قبول نہیں کیا۔ وہ سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ مگر جدا جدا۔ کسان نے اپنی بیوی اور بچوں کو بھی مذہب اسلام کی تلقین کی..... مگر وہ پتھر نہیں پگھلے اور بدستور پتھر کی پوجا کرتے رہے۔

مسلمان ہونے کے بعد کسان، عقیدت اور خدمت کے طور پر اناج اور سبزیاں، حضرت سید میراں حسینؒ کی خانقاہ میں بھیجا کرتا تھا تا کہ درویشوں کی اس جماعت کو غذائی قلت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بیوی بچے، کسان کے اس طرزِ عمل پر سخت لعنت ملامت کرتے تھے۔ مگر وہ پوری خوش عقیدگی اور استقامت کے ساتھ اپنے راستے پر چلا رہا۔ مسلمان ہونے کے بعد مادی طور پر سب سے بڑا انقلاب اس طرح رونما ہوا تھا کہ اُس کی زمینیں سونا اگلنے لگی تھیں۔ ایک بیگمہ زمین، جو کچھ دن پہلے بیس من اناج اُگاتی تھی، اسی زمین سے چالیس پچاس من اناج پیدا ہونے لگا۔ کسان کے پاس جو بنجر زمین تھی، اُسے بھی خالقِ کائنات نے قوتِ مومخشی دی تھی۔ کسان کے بیوی بچے کھلی آنکھوں سے ان نشانوں کو دیکھ رہے تھے، مگر پھر بھی وہ اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے۔

ان کسان کا آخری وقت آپہنچا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کو جمع کر کے بڑے رقت آمیز لہجے میں وصیت کی کہ بہت چاہا کہ تم بھی اس حقیقت پر ایمان لے آؤ، جسے تسلیم کرنے میں انسان کی نجات ہے۔ مگر تم نے ایک نئی نئی اور میرے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک روا رکھا۔ میں بہت جلد اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔ لیکن کئی بات بہت غور سے سنو! جس طرح میں سید صاحب کی خدمت میں اپنے کھیتوں کا اناج اور سبزیاں پیش کرنا ہی طرح تم بھی میرے بعد اس عمل کو جاری رکھنا۔ بد قسمتی سے تمہیں آخرت تو حاصل نہ ہو سکی۔ مگر سید صاحب اس خدمت کے ذریعے دنیا ضرور مل جائے گی۔“

ان کے بعد وہ کسان مر گیا۔ حضرت سید میراں حسین زنجائی نے اُس کی نماز جنازہ پڑھائی، دعائے مغفرت کی، اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ کسان کے بیٹوں بیٹے یہ منظر دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں اپنے باپ کا انجام پر افسوس کرتے رہے۔ ان کے خیال اور عقیدت کے مطابق آگ میں جلنے اور انسانی جسم کی راکھ کو بکھلے ہی سے نجات حاصل ہوتی تھی۔

مگر اب ان کے کھیت اناج اور سبزیوں سے بھر گئے تو کسان کے بیٹوں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ہاں باپ حق تھا کہ اس نے سید صاحب کے پیچھے اپنی آخرت بھی برباد کر لی اور دنیا بھی۔ اگر وہ سارا اناج اور سبزیوں کو نہ بھیجی جاتیں تو آج ہمارے پاس کتنا پیسہ جمع ہوتا؟ ہم وہ حماقت کبھی نہیں دہرائیں گے۔“ بیٹوں نے بیک زبان کہا۔ اپنے لہلہاتے کھیتوں پر آخری نظر ڈالی اور گھر چلے گئے۔

مگر دوسرے دن بیٹوں بھائی اپنے کھیتوں پر آئے تو ان کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ عجیب ناقابل یقین منظر انہیں کی بائیں اس طرح مرجھائی ہوئی تھیں، جیسے ایک رات میں انہیں بادِ مصر نے کھالیا ہو۔ اور یہی حال ہزاروں کا تھا۔ سوکھی ہوئی اور بے جان۔

غیر بھائیوں پر کچھ دیر تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر وہ لڑکھڑاتی زبانوں کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ ”فصلوں کو کیڑا ابھی لگتا ہے۔ وہ برباد بھی ہو جاتی ہیں۔ مگر ایک رات میں یہ کیا ہو گیا؟ کھیت اتنی برباد ہو گئیں سوکتے۔“

غیر بھائی کئی گھنٹے تک حیران و سرگرداں اپنے ایک ایک کھیت اور ایک ایک کیاری کو دیکھتے رہے اور کفِ نہیں ملے رہے۔ فصلوں کی بربادی کے سبب انہیں ہر طرف بے زری اور بھوک منڈلاتی نظر آ رہی تھی۔ آخر اسی بھوک کے عالم میں ایک بھائی کو اپنے باپ کی وصیت یاد آئی۔

”بد قسمتی سے تمہیں آخرت تو حاصل نہ ہو سکی، مگر سید صاحب کی اس خدمت کے ذریعے دنیا ضرور مل جائے گی۔“ ان خیال کے آتے ہی اس نے اپنے دونوں بھائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں سید صاحب کی بددعا کے باب تو ہمارے کھیت برباد نہیں ہو رہے ہیں؟“

مگر یہ بیٹوں بھائی، خانقاہ میں حاضر ہو کر حضرت سید میراں حسین زنجائی سے اپنی بد قسمتی کی معافی مانگنے لگے۔ جواب میں حضرت زنجائی نے فرمایا۔ ”ہم اہل ایمان کسی کو بددعا نہیں دیتے۔ تمہارا باپ، ہمارا دینی بھائی تھا اور بہت عقیدت سے نذر پیش کیا کرتا تھا۔ حق تعالیٰ نے بھی اسے آخرت اور دنیا کی دولتوں سے نوازا۔ جب تک وہ زندہ رہا، اس کے کھیت بھی ہرے بھرے رہے۔ اب اگر فصلیں تباہ ہو رہی ہیں تو اس میں موسم کا کوئی قصور نہیں۔ اب کہہ مرضی موٹی کے زیر اثر ہے۔ وہ جسے چاہے، سرسبز و شاداب بنا دے اور جسے چاہے، بھجر کر دے۔ ان دنوں کو کوئی انسان رزق فراہم نہیں کرتا۔ دینے والا ہمیں اپنے دو غیب سے دیتا ہے۔“ یہ کہتے کہتے حضرت سید

میرا حسین زنجانی کے چہرہ مبارک پر رنگ جلال اُبھر آیا تھا۔

تینوں بُت پرست، حضرت سید میرا حسینؑ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگے۔

آخر سید میرا حسینؑ نے اُن کو معاف کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تمہارا باپ، اہل ایمان میں سے تھا۔ ہماری دعا ہے کہ اس کی زمینیں آباد اور فصلیں سرسبز و شاداب رہیں۔“ یہ کہہ کر حضرت میرا حسینؑ اپنے حجرہٴ خاص میں ٹھہر لے گئے۔

پھر دوسرے دن جب وہ تینوں بھائی اپنے کھیتوں پر گئے تو فضا بدلی ہوئی تھی۔ مرجھائی ہوئی گیہوں کی بالیں اور سبزیاں اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ چند دنوں میں سارے کھیت اسی طرح لہلہانے لگے۔ حضرت سید میرا حسینؑ کی یہ کرامت دیکھ کر کسان کے بیٹے بھی ”شہرِ بچاں“ سے ”دارالامان“ کی طرف چلے آئے تھے۔ ان کے دلوں کے پتھر بھی موم ہو گئے تھے اور زبانوں پر کلمہ طیبہ جاری ہو گیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اسی فراستِ مومن کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

سرورِ کائنات حضورِ اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مقدس ہے۔ ”مومن کی فراست سے ڈر کر وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔“

اور یہ اللہ کے نور ہی کی طاقت ہے کہ وہ لحوں میں کفر و باطل کے اندھیروں کو زائل کر دیتا ہے۔



اس واقعے کے بعد حلقہٴ کفار میں حضرت سید میرا حسین زنجانیؑ کی روحانی طاقت کا مزید چرچا ہوا۔ اور ایک مردِ مومن کے بڑھتے ہوئے اثرات کو رد کرنے کے لئے لاہور کے پنڈت، پردہت اور جوگی نئے انداز سے منصوبہ بندی کرنے لگے۔ مگر ہر بار انہیں ذلت آمیز ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور ہر مرتبہ حضرت سید میرا حسین زنجانیؑ کا حرام و سرخوردہ۔ علامہ اقبالؒ کے بقول۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا

کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتابِ آخر

بعض تذکرہ نگاروں کی روایت کے مطابق اندرونِ شہر ایک ہندو عورت، بلونت کور رہا کرتی تھی۔ اُس کی شادی کو کئی سال ہو چکے تھے۔ مگر وہ بے اولاد تھی۔ بلونت کور نے شروع میں تو اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ مگر جب سسرال والوں نے طعنہ زنی کی تو وہ لاہور کے تمام بڑے پنڈتوں کے پاس پہنچی اور اولاد کے لئے ان سے دعائیں کرائیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق اپنے دیوی دیوتاؤں کے قدموں میں نذرانے رکھے۔ اور ان کے نام پر چڑھائے چڑھائے۔ اپنے مقاماتِ مقدسہ کا شی، متھرا اور ہردوار یا ترا (سفر) کی منٹیں مانیں مگر اس کی گود ہری نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ شعبدہ بازوں سے جادو ٹوٹنے اور ٹوٹکے بھی کرائے۔ مگر ہر تدبیر رائیگاں گئی اور ہر کوشش بے اثر ٹھہری۔ بڑے پنڈتوں اور گیانوں سے لے کر ادنیٰ مداربوں تک سب نے ایک ہی بات کہی۔

”بھگوان نے تیری قسمت میں اولاد نہیں لکھی۔ پھر ہم کیسے مٹا سکتے ہیں تقدیر کے لکھے کو؟ تو پیدا ہئی ابھانگ

ہے۔“

دھرم ادھیکاریوں (اجارہ داروں) کے فیصلے سن کر بلونت کور پر قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ اور وہ مایوس ہو کر گھر کے

بھڑکی۔ پھر جب حضرت سید میراں حسین زنجانی کی بعض کرامتوں کا ذکر عام ہوا تو بلونت کور کی پڑوسی نے ایک دن اس سے کہا۔

”ایک سال سنایا، دریائے راوی کے کنارے رہتے ہیں۔ سنا ہے کہ ان کے دیئے ہوئے پانی سے لاعلاج بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ پھر تو بھی کسی دن قسمت آزماء کر دیکھ۔ عجب نہیں کہ تیرا دامن مراد بھی بھر جائے۔“
بلونت کور ایک کڑھند عورت تھی۔ لیکن اولاد کی طلب، دل کی خلش اور دنیا دالوں کے طعنے اُسے حضرت حسین زنجانی کے آستانہ عالیہ پر لے گئے، جولاہور کے گلی کوچوں میں گھوم کر علی الاعلان، خدائے واحد کی تعلق کرتے تھے اور اہل ہندو کے سینکڑوں خداؤں کی نفی۔ یہ بڑا مشکل کام ہوتا ہے کہ ایک انسان اس بے حد طلب کرے، جس کے مذہبی نظریات، سائل کے عقائد سے اس قدر متصادم ہوں کہ دونوں ایک دوسرے کو مٹانے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ مگر ضرورت اور مجبوری اتنی شدید تھی کہ بلونت کور نے حضرت سید حسین زنجانی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

حضرت سید میراں حسین نے کچھ دیر مراقبہ کیا۔ پھر بلونت کور کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”خاتون! لوح محفوظ لکھنے کی تمہاری قسمت میں اولاد کی نعمت تحریر نہیں کی۔ تمہارا بانجھ ہونا آسمانی فیصلہ ہے۔ اس عبارت کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ بلکہ وہ خود بخود اپنے دست قدرت سے ان الفاظ کو حذف کر دے اور اس کی جگہ نئی عبارت لکھ دے۔“

حضرت سید میراں حسین کی بات سن کر بلونت کور کا چہرہ شدت کرب سے دھواں ہو گیا۔ ”میری قوم کے گیانی بن نہ کی بھی کہتے ہیں۔ پھر ان میں اور آپ میں کیا فرق ہے؟“ یہی کہتے کہتے بلونت کور رو پڑی۔
”ہاں! کیوں کہتے ہیں کہ آپ کے دیئے ہوئے پانی سے لاعلاج مریض صحت یاب ہو جاتے ہیں؟“ بلونت کور نے اس کی بات پر شدید اعتراض کیا۔

”میرے پانی میں کوئی تاثیر نہیں۔“ حضرت سید میراں حسین زنجانی نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا۔ ”وہ کس کی بات ہے؟ جس کی بیماری چاہتا ہے، دُور کر دیتا ہے۔“

بلونت کور کو یہ وار اپنی جگہ سے اٹھی اور حضرت سید میراں حسین کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ”اے مہاتما! میں تو بے گناہ ہوں۔ لیکن مجھے اس پانی کی بھیک دے، جس میں شفا کی تاثیر ہے اور جو جہنم جہنم کے لئے امرت ہے۔“

حضرت سید میراں حسین زنجانی نے بلونت کور کو بہت سمجھایا۔ مگر اس نے آپ کے پائے مبارک نہیں چھوڑے۔ بلکہ بات پراڑی رہی۔ ”اس وقت تک فریاد کرتی رہوں گی، جب تک آپ دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھائیں۔“

بلونت کور کا شور و غل اس قدر تیز تھا کہ حضرت سید میراں حسین کو اس سے وعدہ کرنا پڑا۔ ”ہم تیری خاطر قسم دیتے ہیں کہ تمہاری دعا کے بعد بلونت کور اپنے گھر چلی گئی۔“

پھر اسی رات حضرت سید میراں حسین زنجانی نے تہجد کی نماز ادا کرنے کے بعد بلونت کور کے لئے انتہائی رقت رنج میں دعا کی۔

”اے مالکِ مجرد! وہ بت پرست عورت سمجھتی ہے کہ مجھے تیری ذاتِ اقدس سے ایک نسبتِ خاص ہے۔ ورنہ

اے عالم الغیوب! تو خوب جانتا ہے کہ میں تو خود تیرے کوچہ رحمت کا ادنیٰ ترین گداگر ہوں اور ہر وقت تمہارے مغفرت کا سوال کرتا ہوں۔ مگر اے اپنے بندوں کو بے حساب دینے والے! بلونت کو کو بھی اپنے فضل و کرم سے نزیہ بخش دے کہ تو اپنی قدرت کے ہر زاویہ اظہار پر قادر ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھ میں اور اس کے نمایاں مل جل فرق ہے؟ اے حق و باطل کے فرق کو خوب خوب ظاہر کرنے والے! اب اس فرق کو بھی ظاہر کر دے، جو تیرے ہاتھ بندے سید حسین اور لاہور کے ہندو گیانیوں کے درمیان ہے۔“

پھر اسی دعا کے درمیان حضرت سید میراں حسین زنجائی کی آنکھ لگ گئی۔ اور آپ نے خواب میں ہاتھ نیکی صدا سنی۔

”سید حسین! تمہاری دعا، قبول بارگاہ حق ہوئی۔ اہل لاہور عنقریب کھلی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ ان گنت خداؤں کے پجاریوں میں اور ایک خدا کی عبادت کرنے والوں میں کیا فرق ہے۔“ ان الفاظ کے تم ہونے ہی ہاتھ نیکی کی آواز معدوم ہو گئی۔

پھر حضرت سید میراں حسین زنجائی نے اسی عالم میں ایک اور عجیب منظر دیکھا۔ اس بانجھ عورت، بلونت کو اسے ساتھ ایک خوب صورت بچہ ہے، جو با آواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کر رہا ہے۔

اس کے بعد وہ عارضی نیند، جو قدرت حق سے طاری ہوئی تھی، یک بہ یک زائل ہو گئی۔ حضرت سید میراں حسین زنجائی فوراً سجدے میں چلے گئے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور زبان پر کلمات شکر جاری تھے۔ ”بہ شک! تو اپنے نام لیواؤں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔“

دوسرے دن بلونت کور، خدمت عالیہ میں حاضر ہوئی تو حضرت سید میراں حسین زنجائی نے اسے مخاطب کرنے ہوئے فرمایا۔ ”سننے والے نے اس عاجز کی دعا سن لی۔ اور تیرے حوالے سے لوح محفوظ پر نئی عبارت لم کر دی۔ تجھے خوش خبری ہو کہ تیرے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ مگر میری آنکھیں اُسے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے دیکھتی ہیں۔“ عقیدتاً مسلمان ہوگا۔“

اولاد زینہ کی نوید سن کر بلونت کور، وارفتہ ہو گئی۔ اور جوش جذبات میں حضرت سید میراں حسین زنجائی کے مبارک قدموں سے لپٹ گئی۔ ”میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ میرے ویران اور اجڑا باغ میں ایک پھول کھل جائے۔ اب یہ پھول کی قسمت کہ اسے کون سے چمنستان کی آب و ہوا اس آتی ہے۔“

پھر کوئی ایک سال بعد اس شاخ پر پھول کھل گیا، جو اہل دنیا کی نظر میں خشک ہو گئی تھی۔ حضرت سید میراں حسین زنجائی کی پیش گوئی کے مطابق بلونت کور کے یہاں ایک خوب صورت لڑکا پیدا ہوا، جس کے خدا خال تو بالیام سے ملتے تھے، مگر دلکشی کے اعتبار سے وہ الگ نظر آتا تھا۔ لڑکے کے چہرے میں ایک خاص کشش تھی۔ بلونت کور کے خاندان اور آس پڑوس والوں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ اس ”انہونی“ پر ہر شخص سرگرمیاں اور انگشت ہناتا تھا۔ چند روز بعد بلونت کور اپنے بچے کو لے کر حضرت سید میراں حسین کے سلام کے لئے حاضر ہوئی۔ حضرت بچے کو دیکھ کر مسکرائے۔ پھر عجیب کیف و جذب کے عالم میں فرمایا۔ ”بچے! تم وہی ہو، جس کے بارے میں میں نے دی گئی تھی۔ تم کہیں بھی رہو، ہمارے ہی رہو گے۔ اللہ تمہاری حفاظت فرمائے۔“

بلونت کور اور اس کا شوہر ایک عارف کی باتوں کے اسرار و رموز سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ تو بے اولاد و بے خوشی سے سرشار تھے۔ پھر اسی نشے میں جھومتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے۔ روز و شب کا قافلہ اپنی مقررہ راہ آگے بڑھتا رہا۔ دو سال بعد بلونت کور شدید بیمار پڑی۔ اور چند روز میں دنیا سے چلی گئی۔ بچے کی پیدائش سے۔

تک بلونت کرنے کئی بار سوچا کہ وہ حلقہ بٹیاں سے نکل کر ”موحدوں کی بستی“ میں چلی جائے۔ مگر کچھ تو بڑے پیرائی اثرات اور کچھ ہم مذہبوں کا خوف۔ غرض اسی کشمکش میں دن رات تیزی سے گزر گئے۔ اور بالآخر پراپنچا۔ اس نے اہل ایمان کی کرامت اپنی آنکھوں سے دیکھی، مگر خود ایمان نہ لاسکی۔ یہاں تک کہ ہاسوں کا شمار ختم ہو گیا۔

بے بے ماں کے بچے کو بڑی محبت سے پرورش کیا۔ پھر جب وہ لڑکا چھ سات سال کا ہوا تو ایک دن اس پر غاب دیکھا۔

ایک مقام پر تنہا کھڑا ہے۔ یکایک ایک نورانی صورت مسلمان بزرگ نمودار ہوتے ہیں اور لڑکے کے سر پر لکے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہتے ہیں۔ ”پڑھو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔“

لڑکے نے حیرت سے مسلمان بزرگ کی طرف دیکھا۔ ”میں تو ہندو ہوں اور میرے ماں باپ نے مجھے یہی بتایا ہے۔ ام۔ ہرے کرشنا، ہرے رام۔“ (اہل ہندو کے عقائد کے مطابق یہ اُن کا کلمہ ہے۔ جسے پڑھ کر وہ ہندو مت داخل ہوتے ہیں۔)

لڑکے کی بات سن کر مسلمان بزرگ نے فرمایا۔ ”تم ہندو نہیں ہو، مسلمان ہو۔ اور تمہارا کلمہ یہ ہے۔ اللہ ایک ہے۔ صلی علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔“ مسلمان بزرگ نے دوبارہ کلمہ طیبہ کی تلقین کی۔ اور حیرت پور لڑکے نے بڑی روانی کے ساتھ وہ الفاظ ادا کر دیے، جنہیں دہرانے کے بعد ایک غیر مسلم، حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔

لڑکے کی آنکھ کھل گئی۔ اور اس نے دوسرے دن باپ کو اپنا خواب سناتے ہوئے کہا کہ اب وہ ہندو نہیں رہا بلکہ مسلمان ہو گیا ہے۔

یہ کی بات سن کر باپ بدحواس ہو گیا۔ اور فوری طور پر اسے لے کر لاہور کے سب سے بڑے پنڈت کے پاس لڑکے کی زبان سے پورا واقعہ سنا۔ اور پھر اس کے باپ سے کہنے لگا۔

”بہت کچھ بیرونی اثرات کا نتیجہ ہے۔ مسلمان تیرے بیٹے کی تاک میں ہیں۔ وہ اسے خوابوں میں آکر بہا کر رہے ہیں تاکہ یہ ہندو دھرم سے بیزار ہو کر باہر سے آنے والوں کا مذہب قبول کر لے۔“

باپ پریشان ہو گیا اور اپنے دھرم ادھیکاری سے اس کا توڑ پوچھنے لگا۔ مہا پنڈت نے اپنی مذہبی کتابوں ”گیتا“ اور ”کیم شلوک (آیات) پڑھ کر پانی پر دم کئے اور پھر اپنے ہاتھ سے وہ پانی لڑکے کو پلا دیا۔ اور بڑے سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”میں نے باہر سے آنے والوں کی بندش کر دی۔ اب نہ وہ خوابوں میں آئیں گے اور نہ جاگتے میں لڑکے پرانے زمان کا اثر ہوگا۔“

باپ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ پھر جب لڑکا سویا تو اسے وہی مسلمان بزرگ خواب میں نظر آئے۔ اور دوسری بار کلمہ طیبہ کی تلقین کی۔ لڑکے نے بڑی روانی اور ذوق و شوق سے کلمہ طیبہ پڑھا۔ بزرگ نے جاتے وقت ایک بار پھر فرمایا۔

”تم ہمارے ہو۔ اور تمہیں ہم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔“

لڑکے نے صبح اٹھتے ہی اپنا وہی خواب، باپ کے سامنے بیان کر دیا۔ مگر اس بار لڑکے کے چہرے پر پریشانی نہ تھی بلکہ اطمینان اور خوشی کے آثار تھے۔ اس نے پُر اثر لہجے میں اپنے باپ کے روبرو کلمہ طیبہ دہرایا اور بڑی محبت کے ساتھ کہا۔ ”پتا جی! مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ بھی پڑھیں۔“

باپ اور زیادہ پریشان ہو گیا اور دوبارہ مہاپنڈت کے پاس پہنچا۔ جواب میں مہاپنڈت نے نئے اٹھلک بڑا کر پانی پر دم کر دیا اور ہدایت کی کہ تھوڑا تھوڑا پانی لڑکے کو چائیس دن تک پلایا جائے۔ پھر اسے بیردنی اڑان سے مکمل نجات مل جائے گی۔

ایک ہندو باپ کی طرف سے یہ دفاعی تیاریاں جاری تھیں کہ ہونے والی ہو پڑی۔ اور لاہور کے تمام پرست دیکھتے ہی رہ گئے۔

حسب معمول حضرت سید میراں حسین زنجانی جمعے کے دن شہر کی گلیوں میں تبلیغ کر رہے تھے کہ اتفاقاً بلون لڑکا لڑکا بھی ادھر آ نکلا۔ جیسے ہی اُس کی نظر حضرت سید میراں حسینؒ کے چہرہ مبارک پر پڑی، وہ تیزی سے آگے بڑھا اور حضرت مسیحؑ کے قریب پہنچا اور بڑے والہانہ انداز میں کہنے لگا۔

”میں نے آپ کو پہچان لیا۔ آپ وہی ہیں، جو میرے خوابوں میں آتے ہیں۔“

حضرت سید میراں حسینؒ زنجانیؒ نے نہایت شفقت و محبت کے ساتھ بلونت کور کے لڑکے کو گلے سے لگنا ہوئے فرمایا۔ ”ہاں! ہم وہی ہیں۔ جب ہم نے تمہاری ماں سے کہہ دیا تھا کہ تم ہمارے ہو، تو پھر ہم نہیں کیسے پہچان سکتے تھے؟“

لڑکے نے بت پرستوں کے ہجوم میں با آواز بلند کلمہ طیبہ پڑھا اور حضرت سید میراں حسینؒ سے عرض کرنا لگا۔ ”مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔“

حضرت سید میراں حسینؒ، لڑکے کے ساتھ اس کے گھر تشریف لے گئے۔ باپ نے جب حضرت مسیحؑ کو دیکھا حیران رہ گیا۔

”ہم نے تمہیں بچے کی پیدائش سے پہلے آگاہ کر دیا تھا کہ تمہارے گھر پیدا ہونے والا لڑکا، مسلمان ہوگا۔“ حضرت سید میراں حسینؒ زنجانیؒ نے بلونت کور کے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”سواب وقت آ گیا ہے کہ اس بچے کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ اگر تم خوشی سے اپنے بیٹے کو جانے کی اجازت دے دو گے تو تمہارا بچہ بھلا جائے گا۔ اور اگر تم نے اسے روکنے کی کوشش کی تو یہ تمام بندشیں، دیواریں اور زنجیریں توڑ کر ہمارے پاس آ جائے گی۔“



ابھی اس واقعے کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسرے واقعے نے بت پرستوں کی صفوں میں انتشار برپا

دیا۔

لاہور کے وسطی علاقے میں ایک امیر و کبیر شخص، رام چندر رها کرتا تھا۔ عالیشان مکان، نوکر چاکر، بیوی بچے دنیا کی ہر آسائش۔ مگر وہ خود اپنی طویل و عریض کونجی کے چھوٹے سے کمرے میں اکیلا پڑا رہتا تھا۔ نوکر و نوکرانہ کھانا لا کر اس کے سامنے رکھ دیتے تھے اور تیزی کے ساتھ واپس چلے جاتے تھے۔ بیوی بچہ کبھی کبھی دروازے کھڑے ہو کر جھانک لیتے تھے۔ اور رام چندر انہیں پکارتا رہ جاتا تھا۔

”کچھ دیر تو میرے پاس بیٹھو۔ مجھ سے باتیں کرو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ پھر تم لوگ میرے ساتھ چلو۔ جیسا سلوک کیوں کرتے ہو؟“ یہ کہتے ہوئے رام چندر رو پڑتا تھا۔

بہت سے یار دوست، جو اس کے ساتھ دونوں وقت دسترخوان پر موجود رہتے تھے، اب اُن کا ذوریک پڑ گیا تھا۔ عیش و عشرت کی ساری محفلیں اُڑ کر رہ گئی تھیں۔ اور اب رام چندر ایک کوٹھڑی میں اکیلا پڑا اپنے باطنی کوکھ رہتا تھا۔ بیوی بچوں اور یار دوستوں نے ملنا جلتا اس لئے بند کیا تھا کہ رام چندر، جذام (کوڑھ) کے خوف

نہایت سبکدوش و دیدوں سے علاج کرانے کے باوجود اس کی بیماری روز بہ روز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ہر کارا پرانہم جذام کی پلیٹ میں تھا۔ زخموں سے بہنے والی پیپ اس قدر متعفن تھی کہ کوئی شخص چند لمحوں کے لیے اس چدر کے پاس کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا چہرہ بگڑ کر مسخ ہو گیا تھا اور ہاتھ پیروں کی انگلیاں بھی گھٹا ہو چکی تھیں۔

بہن کی نایاب (حکیم) رام چندر کے علاج کی غرض سے اس کے پاس آتا تو وہ رو رو کر ایک ہی بات کہتا۔ ”میری ساری دولت لے لو۔ مگر اس عذاب سے نجات دلا دو۔ میں سخت مزدوری کر لوں گا۔ مگر لوگوں کو اپنا بدنکاروں گا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تو کھا سکوں گا۔“

لے لے دے دید جھوٹی تسلیاں دے کر چلے جاتے۔ حقیقتاً اُن کے پاس جذام کی کوئی دوا نہیں تھی۔ اور یہ راز ہر آدمی جانتا تھا کہ اس کا مرض لاعلاج ہے وہ روزانہ اس موت کا مشاہدہ کرتا تھا، جو اُس کے جسم پر آہستہ نازل ہو رہی تھی۔ پھر ان ہی دنوں کسی نوکر نے رام چندر کو یلونت کور کے لڑکا پیدا ہونے اور اس لڑکے کے ہونے جانے کا واقعہ سنایا۔ یہ ایک انہونی تھی۔ اور اس انہونی کا قصہ سن کر رام چندر مضطرب ہو گیا۔

”میں نے اس میچا کے پاس لے چلو، جس کی دعاؤں سے ایک بانجھ عورت کے یہاں بھی اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔“ رام چندر کی جسمانی حالت یہ تھی کہ وہ زخموں کی کثرت کے باعث پورے کپڑے بھی نہیں پہن سکتا تھا۔ مگر ایک دن درویش کی خانقاہ میں جانے کے لئے رام چندر نے مکمل لباس پہنا اور پھر اپنے نوکروں کے ہمراہ پاکی میں رو کر حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوا کہ دروازے پر پاکی رکھا کر حضرت شیخؒ کو بتایا۔

”تم اندر آنے کے لائق نہیں ہوں۔ براہ کرم خانقاہ سے باہر آنے کی زحمت گوارا کیجئے۔ اور بس مجھے ایک نظر دیجئے۔“

حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ نے رام چندر کی درخواست سنی اور اپنے ایک خدمت گار کو حکم دیا۔ ”آنے کے لیے کہہ دو بے تحجک اندر چلا آئے۔ ہمارے یہاں چھوٹ کا کوئی گزر نہیں۔“

رام چندر نے ایک مسلمان درویش کا پیغام سنا تو شدت جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر جب حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کے روبرو پہنچا تو زخموں کی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ ”اے مہادانی (مردِ نجات)! مجھے نجات کی ہیک دے۔ اس حالت میں تو میرے بیوی بچے بھی مجھ سے دور بھاگنے لگے ہیں۔“

حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”انسان کو جو کچھ ملتا ہے، اُس کا قدر مطلق کی بارگاہِ ربانہ ہے، جو اپنی ذات میں واحد ہے اور جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اگر انسان کسی کو کچھ دینے کے لیے غائب ہو جائے تو یہاں تک بیماری دور ہو چکی ہوتی، ہم بھی دوسرے آدم زادوں کی طرح عاجز و مجبور ہیں۔ مگر تمہاری قربانی کے لئے خالقِ عالم اور شافیِ مطلق کی بارگاہِ کرم میں اپنا دامن پھیلاؤ گے۔ مبرا اور یقین کے ساتھ انتظار کرو۔ اللہ رب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“

اس کے بعد حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ نے تھوڑا سا پانی دم کر کے جذام کے مریض کو دیا۔ رام چندر نے پانی پیا، اس کے زخموں کی سوزش ختم ہو گئی اور اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں نظر آنے لگے۔ پھر نے اپنی شکر گزاری کے لہجے میں کہا۔

”مہاتما! آج کے بعد مجھے تیری یہ سجا (محفل) اپنے گھر سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میرے اہل خانہ، زخموں

سے اٹھنے والے تعفن کے باعث میرے قریب بھی نہیں آتے تھے۔ مگر تجھے اور تیرے سیوکوں (خدمت گاروں) اسلام کہ کسی نے میرے ساتھ چھوٹ چھات نہیں برتی۔ اگر میں اس عذاب ناک مرض سے نجات پا گیا تو وعدہ کیا ہوں کہ اپنی ساری دولت تیرے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔“

رام چندر کا جوش جذبات دیکھ کر حضرت سید میراں حسین زنجائی نے تبسم فرمایا۔ ”ہم اہل ایمان کسی معاوضے اور اُجرت کے لئے بیمار انسانیت کی خدمت نہیں کرتے۔ تمہاری دولت کے ڈھیر، تمہیں مبارک۔“ یہ کہہ کر حضرت نے کچھ اور پانی دم کر کے رام چندر کو دے دیا اور ہدایت کی کہ جب بھی وہ غسل کرے تو اس پانی کے چند قطرے غسل کے پانی میں ملا لے۔

رام چندر نے حضرت سید میراں حسین زنجائی کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور دس دن کے اندر مکمل صحت یاب ہو گیا۔ اب اُس کے جسم پر کوڑھ کا ہلکا سا نشان بھی نہیں تھا۔ رام چندر کے بیوی بچوں اور احباب کے لئے یہ بات ناقابل یقین تھی۔ مگر انہیں یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہے۔ رام چندر کو لا علاج بیماری سے نجات حاصل ہو چکی تھی۔

پھر اہالیان لاہور نے وہ عجیب منظر دیکھا، جب اس شہر کا رئیس اعظم اپنے ملازمین اور بیوی بچوں کے ساتھ حضرت سید میراں حسین زنجائی کی خانقاہ کی طرف جا رہا تھا۔ ملازموں کے سر پر کئی خوان رکھے ہوئے تھے۔ رام چندر اور اس کے بیوی بچے، شاندار گھوڑا گاڑیوں میں سوار تھے..... اور خوان بردار ملازمین پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ پھر خانقاہ پہنچ کر رام چندر نے وہ سارے خوان، حضرت سید میراں حسین زنجائی کے قدموں میں رکھ دیئے۔ ان خوانوں میں سونے اور چاندی کے سکے بھرے ہوئے تھے۔

”اے مہاتما! میرے تن کا رنگ جاتا رہا۔ اب میں اپنا وعدہ وفا کرنے آیا ہوں۔ میرے پاس جو کچھ تھا، وہ آپ کی نذر کر رہا ہوں۔“

حضرت سید میراں حسین زنجائی نے خوان پوش اُلٹ کر دیکھا۔ سونے اور چاندی کے سکے دک رہے تھے۔ ”میں اپنے وعدے کے سچے تھے، سو تم نے اپنا عہد نبھایا۔“ حضرت میراں حسین زنجائی نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”فقیر نے بھی تمہیں بہت پہلے آگاہ کر دیا تھا کہ اہل ایمان کسی معاوضے یا اُجرت کے لئے بیمار انسانیت کی خدمت نہیں کرتے۔“

رام چندر نے بہت خوشامد کی کہ کسی طرح حضرت میراں حسینؒ اُس کی نذر قبول کر لیں۔ یہاں تک کہ اس نے حضرت شیخ زنجائیؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ مگر ایک مردِ قلندر کے ہونٹوں پر حرف انکار ہی روشن رہا۔ پھر جب رام چندر، گریہ و زاری کرنے لگا تو حضرت سید میراں حسینؒ نے اُس کی تالیفِ قلب کے لئے فرمایا۔ ”اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو پھر کچھ نقد رقم اور کپڑے محتاجوں میں تقسیم کر دو۔ پھر اپنے طور پر کچھ لینا کم۔ نے تمہاری نذر قبول کر لی۔“

رام چندر نے وہ نقد رقم، خانقاہ کے خدمت گاروں کو دینی چاہی۔ مگر حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ ”میرے ساتھی بہت آسودہ حال ہیں۔ اس صدقہ و خیرات پر تو محتاجوں کا حق ہے۔“

حضرت شیخؒ کی شانِ استغنا دیکھ کر رام چندر نے عرض کیا۔ ”میں خود کو تو غلامی کے لئے پیش کر سکتا ہوں۔ کیا مجھے بھی قبول نہیں فرمائیں گے؟“ یہ کہتے کہتے رام چندر، شدتِ جذبات سے مغلوب ہو گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ہا اترم چاہو تو اس فقیر سے نیا رشتہ قائم کر سکتے ہو۔“ حضرت سید میراں حسین زنجانی نے اپنے مخصوص کے ساتھ فرمایا۔

بہن بی بی رام چندر نے اپنی کمر اور گردن کے گرد پڑا ہوا جینو (منہی دھاگا) توڑ ڈالا اور ماتھے کے قشے (پتھر) کو کھرج ڈالا۔ پھر اللہ کی وحدانیت اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اس طرح گواہی دی کہ بت پرست ملتے جلتے حیرت زدہ رہ گئے۔ آج ان کی صفوں کا ایک ممتاز رکن، سینکڑوں خداؤں کا انکار کرنا، ہن خداے واحد پر ایمان لے آیا۔ بلکہ لاہور کا رئیس اعظم، ایک درویش بے سروسامان کے آستانے پر بیٹھا تھا۔ جب بت پرست، رام چندر کو جادوب کشتی کرتے دیکھتے تو بے اختیار پکار اٹھتے۔

جیسا جادو ہے کہ اپنا مذہب بھی ترک کر دیا۔ اور دنیا کے عیش چھوڑ کر ایک سادھو کے سونے کھڑے گوارہ کر

نہا اسلام کے بعد حضرت سید میراں حسین زنجانی نے رام چندر کا نام ”عبداللہ“ رکھ دیا تھا۔

حضرت شیخ زنجانی کی بڑی کرامت تھی۔ اور رام چندر، لاہور کا پہلا مسلمان تھا، جس نے اسلام کی خاطر اپنی دولت کو خیر باد کہا تھا۔



ایک دن حضرت سید میراں حسین کے چھوٹے بھائی، حضرت یعقوب زنجانی آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ ہارادان دونوں بھائی، مذہبی امور پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر حضرت میراں حسین نے برادرِ خورد سے پوچھا۔

”تمہارے علاقے میں اہل ہندو کا کیا حال ہے؟“

جواب میں حضرت یعقوب زنجانی نے اُداس لہجے میں عرض کیا۔ ”ساری تقریریں اور وعظ رائیگاں جاتے ہیں۔ بغیر اہل پرکلام نرم و نازک کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ میں تو بس آپ کے حکم کی وجہ سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ اگر بہت دیر تو وطن واپس لوٹ جاؤں۔“

چوٹے بھائی کی یہ حالت دیکھ کر حضرت سید میراں حسین زنجانی نے فرمایا۔ ”ہم اللہ کے حکم سے یہاں ٹھہرے ہیں۔ اسی حکم سے اس کا پیغام گھر گھر پہنچاتے ہیں۔ بت پرست تو یہی چاہیں گے کہ وہ اپنے کانوں، دلوں، گردن کے دروازے بند کر لیں۔ اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ مسلسل دستک دیتے رہے۔ اب یہ تقدیر الہی پر منحصر ہے کہ کاروان ہند اپنے دروازے کھولتے ہیں یا انہیں مقفل کر لیتے ہیں۔ ہدایت تو اللہ ہی دیتا ہے۔ ہمارا کام تو اُن کو راہ مسافروں کو سمجھانا ہے کہ ان کے راستے میں کبھی نہ بجھنے والی آگ کا ایک گڑھا ہے۔ سنبھل کر چلیں اور بچاؤ کو اس کا ایندھن بننے سے بچائیں۔“ حضرت سید میراں حسین زنجانی نے چھوٹے بھائی کو تسلی بھی دی اور گزراں میں تلخ کا طریقہ بھی بتایا۔

الغرض اسی قسم کی گفتگو میں پورا دن گزر گیا۔ یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔ پھر حضرت یعقوب زنجانی نے بڑے بھائی کی امامت میں نماز ادا کی۔

نماز کے بعد بھی کچھ دیر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا اور رات کا اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا۔ آخر حضرت یعقوب زنجانی نے اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا۔ ”تاریکی زیادہ ہو گئی ہے۔ کل نماز فجر کے بعد چلے جانا۔“

حضرت یعقوب زنجانی ٹھہر گئے۔ مگر فوراً ہی عرض کیا۔ ”آپ رات کا کھانا کس وقت کھاتے ہیں؟“

حضرت نے جواب دیا۔ ”میں کو شہید بھوک لگی تھی، اس لئے اپنی خواہش کا اظہار دوسرے انداز سے کیا۔“

حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ دل میں خیال کر چکے تھے کہ اگر آج گھر میں کچھ کھانے کو ہوتا تو وہ بھائی زنجائیؒ کی تواضع کرتے۔ پھر جب چھوٹے بھائی نے خود ہی کھانے کے بارے میں سوال کر ڈالا تو حضرتؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”آج رزاقی عالم کا خاص فضل ہے۔“ جب کبھی فاقہ ہوتا تھا تو حضرت میراں حسینؒ شکرانے کے طور پر مخصوص جملہ دہرایا کرتے تھے۔

حضرت یعقوب زنجائیؒ بڑے بھائی کے اس لطیف ترین اشارے سے یہی سمجھ کر آج حضرتؒ نے ان کی دعوت کا خاص اہتمام کیا ہے۔ ”تو پھر کسی خادم سے کہیے کہ فوراً دسترخوان لگائے۔ بھوک اپنے عروج پر ہے۔“ چھوٹے بھائی کی بات سن کر حضرت شیخ زنجائیؒ کے ہونٹوں کا تبسم مزید نمایاں ہو گیا۔ ”فضل خاص کا منہ بھر ہے کہ آج فقیر کے گھر فاقہ ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو روٹی کا بھی محتاج نہیں کیا۔ بے شک! وہ غنی ہے اور اپنے نام لیواؤں کو بھی مستغنی کر دیتا ہے۔“

بڑے بھائی کے ارشادات سن کر حضرت یعقوب زنجائیؒ نے بھی با آواز بلند کہا۔ ”الحمد للہ!“ اس کے ساتھ آپ کے چہرہ مبارک پر اطمینان و سکون کے آثار نمایاں ہو گئے۔ جیسے بھوک کی شدت میں بہت زیادہ کی آگ ہو۔ ابھی چند لمحے گزرے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ حضرت میراں حسینؒ نے چھوٹے بھائی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”یعقوب! ذرا دیکھو۔ اس وقت کوئی ضرورت مند آیا ہے؟“

حضرت یعقوب زنجائیؒ تیزی سے اٹھے اور آپ نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ ایک شخص بہت بڑا سا خوان! کھڑا تھا۔ حضرت یعقوب زنجائیؒ کو سامنے پا کر اس اجنبی شخص نے خوان آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”دریٹوں! لئے کچھ کھانا لایا ہوں۔ قبول فرمائیں۔“

حضرت یعقوب زنجائیؒ نے اجنبی شخص کا لایا ہوا خوان لے لیا۔ اور کھانا لانے والے سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا ہے؟“

”شیخ مجھے جانتے ہیں۔“ اجنبی شخص نے آہستہ سے کہا۔

حضرت یعقوب زنجائیؒ، خوان لے کر اندر گئے اور حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ حضرت شیخؒ نے خوان پوش ہٹایا تو اکیس روٹیاں، سالن اور بیٹھے چاول موجود تھے۔ اور حیرت انگیز بات یہ کہ سب کے سب تازہ تھے اور ان سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ روٹیاں ابھی تنور سے نکالی گئی ہیں۔ اور سالن بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ چولہے پر چڑھی ہوئی ہانڈی یا دیگ سے نکالا گیا ہے۔

”یہ کون مہربان دے گیا ہے؟“ حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ نے چھوٹے بھائی سے سوال کیا۔ ”اس نے اپنا نام تو نہیں بتایا مگر اتنا ضرور کہا کہ شیخ مجھے جانتے ہیں۔“ حضرت یعقوب زنجائیؒ نے عرض کیا حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ بہت تیزی سے اٹھے اور خانقاہ سے باہر نکل کر دیکھا۔ چاندنی رات تھی۔ تک کسی انسان کا عکس بھی نظر نہیں آیا۔ اس وقت حضرت شیخ زنجائیؒ، دریائے راوی کے کنارے قیام فرماتے ویران مقام پر آپ کی خانقاہ کے علاوہ کوئی دوسرا مکان بھی نہیں تھا۔ اس لئے کھانا لانے والا کوئی بڑی بھی ہو سکتا تھا۔ حضرت شیخ زنجائیؒ کچھ دیر تک چاروں طرف دیکھتے رہے۔ پھر خاموشی سے واپس تشریف لے آئے اپنے تین چار خدمت گاروں کو طلب کر کے ان کے ساتھ کھانا کھانے لگے۔

”بڑا متواضع انسان تھا۔“ حضرت یعقوب زنجائیؒ نے اجنبی شخص کے لائے ہوئے لذیذ کھانے کی

ہوئے کہا۔

”آئی تم جو ہمارے مہمان تھے۔“ حضرت سید میراں حسین زنجائی نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”مہمانوں کا تو خیال ہی رہتا ہے۔ ورنہ وہ جب بھی آتا ہے، ہمارے لئے تو روکھی سوکھی غذا ہی لے کر آتا ہے۔ آج تمہارے لیے کئی بڑا کھانا مل گیا۔“

”ہاں تو دور تک کوئی مکان نہیں۔“ حضرت یعقوب زنجائی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”وہ شخص بہت دور سے آیا، لہذا اس قدر گرم کیوں تھا؟ پڑوس سے آنے والا کھانا بھی اس قدر تازہ نہیں ہوتا۔“

حضرت یعقوب زنجائی، کھانا لانے والے شخص کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ مگر حضرت سید میراں حسینؒ نے جرح خاص میں تشریف لے گئے۔ آپ اپنے چھوٹے بھائی پر یہ راز فاش کرنا نہیں چاہتے تھے کہ کھانا کس شخص، رجال الغیب (مردانِ غیب) میں سے تھا۔

اس طرح اپنی کائنات کا انتظام جاری رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بے شمار فرشتے متعین فرمائے ہیں، اسی طرح امور کی انجام دہی کے لئے ”رجال الغیب“ کو بھی مقرر کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اپنی ظاہری ساخت کے لیے انسان ہی ہوتے ہیں۔ مگر دوسرے انسانوں کی آنکھ سے روپوش رہتے ہیں۔ ہاں! جب حق تعالیٰ کی مرضی سے ان کا ظاہر بھی ہو جاتا ہے۔ فرشتوں کی طرح ”مردانِ غیب“ کو بھی بہت سی طاقتیں عطا کی جاتی ہیں۔ اگر باوجود چارے تو سینکڑوں میل کا فاصلہ چند منٹوں میں طے کر سکتا ہے۔

”رجال الغیب“ کی یہ طاقت اسی روحانی عمل کے مطابق ہے، جس کا مظاہرہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے آصف ابن برخیاہ نے سرور بار کیا تھا۔ آصف ابن برخیاہ، کتاب کا علم رکھتے تھے۔ اور اسی علم کے ذریعے آپ عظیم کائنات کا تخت پلک جھپکتے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے حاضر کر دیا تھا۔ اس واقعے کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔

حضرت یعقوب زنجائی کے لئے لایا جانے والا کھانا بھی اسی لئے گرم تھا کہ اسے ایک ”مردِ غیب“ لے کر آیا۔ ”رجال الغیب“ کے لئے زمان و مکاں کے طویل فاصلے اور وقت، چند قدموں اور چند لمحوں میں سمٹ کر رہ سکتے ہیں۔

حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ کے حوالے سے ”دستِ غیب“ کے کئی واقعات مشہور ہیں۔ مذکورہ واقعہ اس میں مل جاتا تھا، جب حضرت شیخؒ اور آپ کے چند خدمت گار، لاہور کے بت پرستوں کی جارحیت کا ہدف بنے۔ آپ نے اور انہما کی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں تک کہ کئی کئی وقت کھانے کو مٹھی بھر چنے بھی نہیں دیتے۔



بہشتی اسی زمانے کا واقعہ ہے، جب لاہور کے کفار اپنی مادی طاقت کے نشے میں حضرت سید میراں حسین زنجائیؒ سے غار بن گئے۔ ایک دن آپ کسی ضروری کام سے راوی کے کنارے کھڑے تھے۔ اور دریا کے پار جانا چاہتے تھے۔ مگر وہاں کوئی کشتی موجود نہیں تھی۔ حضرت شیخؒ کو کھڑے کھڑے بہت دیر ہو گئی۔ آخر ملاح، ستورا رام کی کشتی نظر آئی۔ آپ نے پار سے مسافروں کو لے کر ادھر آ رہی تھی۔ پھر جب کشتی خالی ہو گئی تو حضرت شیخ زنجائیؒ نے ملاح ستورا رام سے فرمایا۔

”مہمان! ہمیں بھی دریا کے پار چھوڑ دو۔“

”تم بھی بیٹھ جاؤ۔ ہمارا تو کام ہی لوگوں کو دریا کے پار اُتارتا ہے۔“ ہندو ملاح نے بے دلی سے کہا۔ وہی مقامی بت پرستوں کی طرح حضرت سید میراں حسین زنجانی کو پسند نہیں کرتا تھا۔

”مگر ہمارے پاس کرائے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔“ حضرت میراں حسین زنجانی نے صاف گوئی سے کام بلے ہوئے فرمایا۔

”پھر کیوں میرا وقت برباد کرتے ہو؟“ ملاح سننورام نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”اگر میں اسی طرح لوگوں کو مفت میں دریا پار کراتا رہا تو روٹی کہاں سے کھاؤں گا؟ کوئی اور کشتی تلاش کر لو۔“ یہ کہہ کر سننورام نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

حضرت سید میراں حسین زنجانی چند قدم آگے بڑھے۔ اور ہندو ملاح کے سامنے آکر فرمانے لگے۔ ”ہم اس دریائی سفر کی اجرت کے بدلے تمہیں دعائیں دے سکتے ہیں۔ اور دعائیں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ ابھی تمہیں اس کا اندازہ نہیں۔“

حضرت میراں حسین زنجانی کی بات سن کر ملاح سننورام ہنسا۔ ”دعائیں کسی بھوکے کا پیٹ نہیں بھر سکتیں۔“

”پیٹ تو بہت معمولی چیز ہے۔ دعاؤں سے انسان کا دامن مراد بھر جاتا ہے۔“ حضرت سید میراں حسین زنجانی نے انتہائی دلنشین لہجے میں فرمایا۔

”اگر مجھے دعاؤں کی ضرورت پڑ ہی گئی تو میں اپنے سادھو سنتوں سے دعا کراؤں گا۔“ ملاح سننورام نے استہزاءیہ لہجے میں کہا۔ ”تمہاری دعاؤں میں تو اتنا بھی اثر نہیں کہ تمہیں کشتی کا کرایہ ہی مل جائے۔“

حضرت سید میراں حسین زنجانی کچھ دیر اس انتظار میں کھڑے رہے کہ شاید سننورام، آپ کو اپنی کشتی میں بٹھا لے۔ مگر دولت پرستی اور مذہبی عصبیت کے باعث اس نے ایک مسلمان درویش کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ کشتی، ہندو مسافروں سے بھر گئی۔ اور حضرت سید میراں حسین زنجانی اپنی خانقاہ کی طرف تشریف لے گئے۔

پھر جب آخری مسافر بھی سننورام کی کشتی میں بیٹھ گیا تو اس نے چپو سنبھالے۔ اور ملاحوں کا مخصوص گیت گانے ہوئے اپنی ناؤ کھینے لگا۔ جب کشتی روانہ ہوئی تھی تو آسمان صاف تھا اور ہوا بہت آہستہ چل رہی تھی۔ مگر جب سننورام کی ناؤ بیچ دریا میں پہنچی تو لاہور کا موسم ناقابل یقین تغیر کی پلیٹ میں آ گیا۔ چند لمحوں میں سیاہ آندھی اٹھی اور شہر کے بام و در پر چھا گئی۔

ہوا کے خوف ناک جھکڑوں نے دریائے راوی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ سننورام کی کشتی کئی بار اُلتے اُلتے بچی۔ تمام مسافر اپنے دیوی دیوتاؤں کو پکار رہے تھے۔ گہری تاریکی کے باعث سننورام نے کشتی کھینا بند کر دی تھی۔ پھر جب آندھی کا زور مزید بڑھا تو ناؤ کے مسافر اپنی زندگی سے مایوس ہو کر رونے لگے۔ ایسے عکین لحات میں سننورام کو حضرت سید میراں حسین زنجانی یاد آئے۔ اس نے انتہائی شکستہ لہجے میں فریاد کرتے ہوئے کہا۔

”میری مت ماری گئی تھی۔ اور میں زیادہ پیسہ کمانے کی دھن میں اندھا ہو گیا تھا۔ یہ سب اسی کا ثمر (بددعا) ہے۔ کاش! میں اس مسلمان سادھو کو اپنی کشتی میں بٹھا لیتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

جیسے ہی سننورام کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، اسے ایک صدائے عجیب سنائی دی۔ ”گھبراؤ نہیں سننورام! سب کی کشتیاں پار لگتا ہے، وہی تمہاری بتیا کو بھی کنارے تک پہنچائے گا۔“

”یہ آواز اسی مسلمان سادھو کی ہے۔“ سننورام نے سوچا اور چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھ نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ حضرت سید میراں حسین زنجانی اسے اپنے قریب ہی دریا میں نظر آئے۔ آپ

ہمارے کر کنارے کی طرف لے جا رہے تھے۔ اور نہایت مہربان لہجے میں فرما رہے تھے۔ ”سنو رام! انسان پر بہادری بھی آجاتا ہے، جب سارے مادی سہارے ناکام ہو جاتے ہیں اور اسے صرف دعاؤں کی ضرورت رہے۔ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

حضرت سید میراں حسین زنجانی آہستہ آہستہ کشتی کو سہارا دیتے رہے۔ یہاں تک کہ کشتی کنارے لگ گئی۔ پھر آندھی رگ گئی اور موسم بھی صاف ہو گیا۔ سنو رام نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ مگر حضرت سید میراں حسین نے فرمایا۔

”یہ کانوں اور آنکھوں کا دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے۔“ سنو رام نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ مگر پھر خود ہی اپنے بات کی تردید کر دی۔ ”اگر وہ مہمان، دریا میں میرے ساتھ نہیں تھے تو پھر کشتی، کنارے کیسے پہنچی؟“

آز سنو رام کو یقین آ گیا کہ وہ حضرت میراں حسین زنجانی ہی تھے، جو اس کی کشتی کو سہارا دے کر کنارے تک لے گئے۔ اس یقین کے ساتھ ہی سنو رام کی ذہنی اور دلی کیفیات بھی تبدیل ہو گئیں۔ دوسرے دن وہ حضرت سید میراں حسین کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ناروا سلوک کی معافی مانگنے لگا۔

حضرت سید میراں حسین زنجانی نے اپنا دستِ کرم، ملاح سنو رام کے سر پر سایہ فگن کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ہم ہمارے، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔ تم نے ہمیں کنارے پر چھوڑ دیا تھا، مگر ہم نے جنگم خدا طوفان میں بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔“

پھر حضرت سید میراں حسین زنجانی کا انداز تبلیغ کہ جس نے ایک بت پرست کا دل فتح کر لیا..... ملاح سنو رام کو طیبہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ اور اس کے مشرکانہ عقائد کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو توحید کا سہارا مل گیا۔



بعض تذکرہ نگاروں نے اس قسم کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے، جس سے حضرت سید میراں حسین زنجانی کی معانی مانت کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک بار آپ کا ایک عقیدت مند اپنے کسی کام سے دریائے راوی کے پار گیا۔ پھر کام ختم کر کے گھر واپسی کے لیے سے دریا کی طرف چلا۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ یکایک موسم میں تغیر رونما ہوا اور تیز ہوائیں چلنی شروع ہو گئیں۔ اس شخص نے جیز تیز قدم اٹھائے۔ مگر موسم کچھ اور بگڑ گیا۔ تیز ہواؤں نے سیاہ آندھی کی شکل اختیار کر لی اور اس کے ساتھ ہی بارش شروع ہو گئی۔ اس شخص نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ مگر طوفانِ باد باراں کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ وہ گمراہ رہتا رہتا دریائے راوی کے کنارے تک تو پہنچ گیا۔ مگر یہ دیکھ کر اسے شدید مایوسی ہوئی کہ دریا میں کوئی کشتی نہ ہوگی۔ بگڑے ہوئے موسم کو دیکھ کر تمام ملاح اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔

”شخص حیرت و پریشانی کے عالم میں دریائے راوی کے کنارے کھڑا رہا۔ بارش لُٹھ بے لُٹھ تیز ہوتی گئی۔ ایک اُغرب کا وقت، دوسرے موسم کی خرابی۔ نتیجتاً رات سے پہلے رات ہو گئی اور ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔ عجیب بہانے کا عالم تھا۔ وہ شخص نہ پیچھے لوٹ سکتا تھا اور نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ موسلا دھار بارش میں کہیں کوئی پناہ گاہ نہیں لگ بھڑکی وہ ہر گز کے ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ جنگل کی رات، ہو کا عالم، درندوں اور زہریلے مہل کی خوف۔ اُس شخص کو احتجاج ہونے لگا۔ اپنے خوف کو دور کرنے کے لئے وہ زور زور سے آیاتِ قرآنی پڑھنے لگا۔ یکایک اُسے اپنی سانس رکتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ دس پندرہ گز کے فاصلے پر اسے دو چھوٹے چھوٹے ہاں نظر آئے، جو آہستہ آہستہ اسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ شخص نو مسلم تھا۔ چراغوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر یہی

سمجھا کہ کوئی بھوت پریت ہے۔ مگر جب اچانک پُر ہول فضا میں غزائٹ کی آوازیں گونجنے لگیں تو اس پر ہولناک حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ چراغ نہیں، رات کی تاریکی میں چمکنے والی کسی درندے کی آنکھیں ہیں۔ موت کو اپنے قریب پا کر اس شخص نے انتہائی پُرسوز لہجے میں اپنے خالق کو پکارا۔

”اے اللہ! اگر سید صاحب تیرے سچے ولی ہیں تو انہیں میری مدد کے لئے بھیج۔ اور مجھے اس درندے سے بچا رکھ۔“ اس کا اشارہ حضرت سید میراں حسین زنجانی کی طرف تھا۔

ابھی اس شخص کی دعا جاری تھی کہ اسے اپنے قریب کسی انسان کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ”کون ہے؟“ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میں حسین بن علی ہوں۔ مجھے اللہ نے تمہاری مدد کے لئے بھیجا ہے۔“ حضرت میراں حسین زنجانی نے فرمایا۔

آگے بڑھتا ہوا درندہ اچانک رک گیا تھا۔ اس شخص نے لڑکھرائی ہوئی زبان میں کہا۔ ”وہ درندہ.....“

”اس دن اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا۔“ (ترجمہ)

حضرت سید میراں حسین زنجانی نے قرآن کریم کی یہ آیت مقدسہ تلاوت کی اور اپنے عقیدت مندے فرمایا۔

”میرا ہاتھ پکڑ لو اور اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

اس شخص نے حضرت شیخ زنجانی کے حکم پر عمل کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر حضرت میراں حسین نے ”ام اللہ“ کی ضرب لگائی، جس کے جلال سے پورا جنگل گونج اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت شیخ نے فرمایا۔ ”آنکھیں کھول دو۔“ اس شخص نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو چند لمحوں کے لئے اسے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ حضرت سید میراں حسین کے حجرہ مبارک میں کھڑا تھا۔ نئی زندگی ملنے کی خوشی میں جوشِ عقیدت سے مضطرب ہو کر وہ شخص حضرت شیخ زنجانی سے لپٹ گیا اور گلوگیر لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”سید صاحب! اگر آج آپ نہ ہوتے تو اللہ ہی جانتا ہے کہ میرا کیا حشر ہوتا؟“

”وہی ہوتا، جو اس وقت تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔“ حضرت سید میراں حسین زنجانی نے نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا۔ ”حسین بن علی نہ ہوتا تو اس کا کوئی اور بندہ ہوتا۔ انسان کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب کوئی نہیں تھا، تب بھی اللہ ہی تھا۔ اور جب کوئی نہیں ہوگا، اس وقت بھی اللہ ہی ہوگا۔ اول و آخر اور بائیں و ظاہر، اللہ ہی ہے۔ ہم لوگ تو اس کے عاجز و ناتواں کارندے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے، سرفراز کر دیتا ہے۔ بس وہی دیکھ رہے، وہی مشکل کشا اور وہی مددگار۔“

واضح رہے کہ حضرت سید میراں حسین زنجانی ”اسم اللہ“ کا بہت زیادہ ورد کرتے تھے۔ صوفیائے کرام اور علمائے اسلام کی اکثریت نے اسم ”اللہ“ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہی ”اسم اعظم“ ہے۔



بعض تذکروں میں حضرت سید میراں حسین زنجانی کی ایک ایسی پیش گوئی کا ذکر بھی ملتا ہے، جس سے ”فراستِ مومن“ کی شان ظاہر ہوتی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ جب حضرت شیخ زنجانی بیمار رہنے لگے تھے اور آپ کا آخری وقت قریب آ پہنچا تھا۔ تمام خدمت گار اور عقیدت مند، بسترِ علالت کے قریب جمع تھے۔ کسی خادم یا مرید نے نہایت شکستہ لہجے میں عرض کیا۔

”سیدی! اگر آپ داغِ مفارقت دے گئے تو لاہور ویران ہو جائے گا۔“

”منزلِ فراق سے تو ہر انسان کو گزرنا ہے۔“ حضرت سید میراں حسین زنجانی نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ نے جہان

بہارِ مکیہ ہوگا۔ اور میرا محبوب وطن، زنجباز بھی آباد رہے گا۔ جب میری سانسوں کا شمار ختم ہو جائے گا، اسی زمانہ میں ایک شیخ پیدا ہوں گے، ان کے والد کا نام بھی علی ہوگا۔ اور وہ علم معرفت میں بلند درجے پر فائز رہیں گے۔“

حضرت سید میرا حسین زنجباز کی یہ پیش گوئی، عالم اسباب میں ظاہر ہوئی۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق آپ مال کے بعد شہر زنجباز میں حضرت سعد بن علی پیدا ہوئے۔ سعد بن علی کا علمی مقام یہ ہے کہ آپ کو ”والدہ“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ان رہے کہ حضرت میرا حسین کے والد محترم کا نام بھی علی تھا۔ اسی لئے بعض تذکروں میں آپ کو حسین بن علی نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ظہورِ بزرگ، حضرت ابوالمظفر، حضرت شیخ سعد بن علی کے مرید تھے۔ حضرت ابوالمظفر اپنے ذاتی حوالے ایک عجب واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد مکہ مکرمہ سے براہِ راست ہجرت کر حضرت شیخ سعد بن علی کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ پھر جب میری روانگی کا دن طے پا گیا تو اسی رات نے ایک عجب خواب دیکھا۔

میری والدہ بہت پریشان ہیں..... ان کے بال کھلے ہوئے ہیں..... اور وہ ہاتھ اٹھا کر شدید اضطراب میں پڑ رہی ہیں۔ ”میرے بیٹے! فوراً اپنے وطن ”مرو“ پہنچو..... اب مجھ سے تمہاری جدائی برداشت نہیں ہوتی۔“

میں ”مرو“ ایران کا مشہور قدیمی شہر تھا۔ حضرت ابوالمظفر بیان کرتے ہیں کہ میں نے والدہ کے پکارنے کو محض خواب سمجھا۔ اور اس خواب کو کوئی خاص نہ لیا۔ پھر میں نے اپنے منصوبے کے مطابق سفر کی تیاری شروع کر دی۔ خانہ کعبہ پر آخری نظر ڈالی اور ان کی طرف روانہ ہو گیا۔ شوق کا عجیب عالم تھا۔ دل چاہتا تھا کہ جلد از جلد فاصلے سمٹ جاؤں اور خدمتِ شیخ میں رہ کر شہ جزیوں کو سیراب کروں۔

پھر جب میں حضرت شیخ سعد بن علی زنجباز کی خانقاہ کے قریب پہنچا تو عقیدت مندوں کا ایک جھوم نظر آ گیا۔ ان شیخ کے گرد طالبانِ شوق اتنی تعداد میں جمع تھے کہ میری باری بہت دیر میں آئی۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت شیخ سعد بن علی زنجباز نے فرمایا۔

”ابوالمظفر! تمہیں مرو جانا تھا..... اور تم میرے پاس چلے آئے؟“

”سیدی! میرے دل و نگاہ کا مرکز تو آپ ہی کی ذات گرامی تھی۔“ میں نے بصد شوق عرض کیا۔ ”یہی عہد تھا کہ زنجباز سے شرف ہوتے ہی شیخ کی خدمت میں حاضری دوں۔“

”تمہیں کسی اور نے بھی تو آواز دی تھی۔“ حضرت شیخ سعد زنجباز نے فرمایا۔ ”پھر تم نے اُس پکار کو کیوں نہ لیا؟“

میں حضرت شیخ کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ ”سیدی! وہ کس کی آواز تھی، جس نے مجھے پکارا تھا؟“

”کیا تمہاری مادرِ گرامی نے تمہیں آواز نہیں دی تھی؟“ حضرت شیخ سعد زنجباز کے لہجے سے روحانی جلال

بال تھا۔

حضرت شیخ کے اشارے کے ساتھ ہی مجھے اپنا خواب یاد آ گیا، جس میں والدہ محترمہ مجھے مخاطب کر کے فرما رہی

تھیں۔ ”میرے بیٹے! جلدی پہنچو..... اب مجھ سے تمہاری جدائی برداشت نہیں ہوتی۔“ اس خواب کے آنے پر میرا سر، بارندامت سے جھک گیا۔

”جب تمہیں خواب میں سب کچھ دکھا دیا گیا تھا تو اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟“ حضرت شیخ سعد زنجانی نے فرمایا۔ ”نوراً مرد روانہ ہو جاؤ۔ پہلے والدہ محترمہ کے دلی مضطرب کو سکون پہنچاؤ، اس کے بعد میرے پاس آؤ۔“ حضرت شیخ سعد بن علی زنجانیؒ کے اس حکم میں یہ خاص نکتہ بھی پوشیدہ تھا کہ والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کتنی ضروری ہے۔ اگر ماں باپ کا حکم، شریعت کے خلاف نہ ہو تو اس کی تعمیل میں تاخیر، اولاد کے لئے وبال بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں والدین کے حقوق پوری صراحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت ابوالفضلؑ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے وطن ”مرو“ روانہ ہو گئے اور حضرت شیخ سعدؒ نے اپنے تمام مریدوں، خدمت گاروں اور عقیدت مندوں کے سامنے اس راز کو فاش کر دیا کہ بعض حالتوں میں والدین کا دیدار، مرشد کے دیدار سے افضل ہے۔ عظیم صوفی، حضرت شیخ یازید بسطامیؒ کو والدہ ماجدہ کی دعاؤں ہی سے ولایت عظمیٰ حاصل ہوئی تھی۔

سلسلہ چشتیہ کے عظیم و جلیل بزرگ، حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کا مشہور قول مبارک ہے۔ ”ماں باپ کی طرف محبت سے دیکھنا بھی عبادت ہے۔“

بعض روایتوں کے مطابق حضرت شیخ سعد بن علی زنجانیؒ کا انتقال 471ھ میں ہوا۔ اگر اس تاریخ کو درست مان لیا جائے تو حضرت سعد بن علی زنجانیؒ کا انتقال چالیس سال کی عمر میں ہوا۔ حضرت سید میرا حسین زنجانیؒ 431ھ میں عالم فانی سے رخصت ہوئے تھے۔ اور حضرت شیخ سعد زنجانیؒ، آپ کے وصال کے بعد عالم اسباب میں ظاہر ہوئے تھے۔ ہماری تحقیق کے مطابق حضرت شیخ سعد زنجانیؒ نے تقریباً ساٹھ سال کی عمر پائی تھی۔ اس طرح آپ، حضرت میرا حسین زنجانیؒ کے انتقال سے بہت پہلے دنیا میں تشریف لے آئے تھے۔ یہ کتابت کا سہو ہے یا بحر تذکرہ نگاروں سے سن و سال کی تحقیق میں کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔ بہر حال اس روایت کے بیان کرنے کا ایک مفید تھا کہ اہل دنیا پر ایک ”ولی کامل“ کی قوت کشف کو ظاہر کیا جاسکے۔



معتبر روایتوں کے مطابق حضرت سید میرا حسین زنجانیؒ نے چوالیس سال تک لاہور میں قیام فرمایا۔ اس نصف صدی میں آپ کے شب و روز کا ایک ایک لمحہ ذکر الہی اور تبلیغ اسلام میں بسر ہوا۔ یہاں تک کہ آپ بیمار ہو کر بستر علالت پر دراز ہو گئے۔ مریدین اور معتقدین نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا۔ دنیا میں ہر بیماری کی دوا موجود ہے۔ مگر ”مرض الموت“ لا علاج ہے۔ اسی آفاقی اصول کے مطابق حضرت سید میرا حسین زنجانیؒ سفر آخرت کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ پھر اس قدر لاغر و نحیف ہو گئے کہ سہارے کے بغیر آپ کے لئے بیٹھنا بھی دشوار تھا۔

آخر ایک دن حضرت میرا حسینؒ کے سب سے بڑے عقیدت مند، رام چندر (عبداللہ) نے عرض کیا۔ ”شیخ میری عین خواہش ہے کہ غریب کدے پر تشریف لے چلیں۔“ عبداللہ نے یہ درخواست اس لئے کی تھی کہ حضرت میرا حسین زنجانیؒ، لاہور تشریف لانے کے بعد زندگی بھر فرش خاک پر سوئے۔ بس ایک چٹائی اور چادر، آپ بستر ہوتا تھا۔ بڑھاپے اور بیماری میں سخت زمین، انسانی جسم کو بہت اذیت پہنچاتی ہے۔ اسی خیال سے عبداللہ (رام چندر) نے التجا کی تھی کہ حضرت شیخؒ اس کے گھر منتقل ہو جائیں، جہاں ہر قسم کی ظاہری آسائش میسر تھی۔

جواب میں حضرت سید میرا حسینؒ نے فرمایا۔ ”عبداللہ! اب اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کہ میں دریائے رادی کے کنارے ہوں یا شہر میں۔ میرا بستر، فرش خاک پر ہو یا حریر و اطلس و کم خواب کی نرم چادروں پر..... مالک

نہا ہے۔ بندے کو جانا ہی پڑے گا۔ انسان کو اوّل و آخر زیرِ زمین جانا ہے۔ سو یہی بہتر ہے کہ بسترِ خاکی پر نہ لگا پھر میں اسی خاک میں ملا دیا جاؤں۔“

اللہ (رام چندر) حضرت میرا حسینؑ کے قدموں سے لپٹ گیا اور گریہ و زاری کرنے لگا۔ ”بس میرے ہاتھ کو یہ شرف بخش دیں کہ آپ وہاں تشریف لائیں اور مہینوں کو یہ اعزاز عطا کر دیں کہ ان گناہ گاروں نے اللہ کے ایک دوست کی خدمت کی۔“

حضرت میرا حسین زنجائیؒ، عبد اللہ کے جوشِ عقیدت اور شدتِ جذبات سے مجبور ہو کر اس کے گھر تشریف لائے جہاں دنیا کے سارے عیش و آرام میسر تھے۔ عبد اللہ کے بیوی بچوں نے دن رات خدمت کی۔ لاہور اور بارہڑہ کے بڑے بڑے ویدوں (حکیموں) کو بلایا گیا۔ طبیبوں نے اپنے اپنے نسخوں میں سرِج الاثر دوائیں لکھ کر جوتے کئے۔ مگر ایک وقت مقررہ پر ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اور ذی روح کو اپنے رب کی یاد رکھنا ہے۔ 19 شعبان 431ھ کو حضرت سید میرا حسین زنجائیؒ بھی عالمِ خاکی سے عالمِ بالا کی طرف کوچ فرمائے۔ آخری لفظ جو آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوا، وہ ”اللہ“ تھا۔



اب یہاں اس تاریخ ساز واقعے کی تفصیلات ضروری ہیں، جو برصغیر کے حوالے سے ”کتابِ تصوف“ کا پہلا باب ہے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت سید میرا حسین زنجائیؒ، حضرت شیخ ابوالفضلؒ کے بنے۔ اور حضرت شیخؒ ہی کے حکم سے آپ نے ”زنجان“ کو خیر باد کہہ کر لاہور کو اپنا مستقل مسکن بنایا تھا۔ اسی نام و نسبت کے عامل و عالم، عظیم صوفی بزرگ حضرت سید علیؒ جویریؒ (داتا گنج بخشؒ) بھی حضرت شیخؒ کے مرید تھے۔ پھر حضرت سید علیؒ جویریؒ کی روحانی تربیت مکمل ہو گئی، تو ایک دن حضرت شیخؒ نے آپ کو بلا کرے ہوئے فرمایا۔

”سید علیؒ اب وقت آ گیا ہے کہ تم بھی سفرِ ہجرت اختیار کرو..... اور لاہور پہنچ کر بت خانہ ہند میں اذان دو۔“ علمِ شیخؒ نے کہ حضرت سید علیؒ جویریؒ (داتا گنج بخشؒ) نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”سیدی! وہاں رہے بھائی، میرا حسینؑ موجود ہیں۔“

حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے فرمایا۔ ”وہ اپنے رازوں کو خود ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر فی الوقت مشیتِ الہی یہی ہے کہ میں قیام کر کے بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلاؤ۔“

اب جب حضرت سید علیؒ جویریؒ، لاہور میں داخل ہوئے تو حضرت میرا حسین زنجائیؒ کا جنازہ ”باغِ زنجان“ میں لے جایا جا رہا تھا۔ یہ وہی باغ تھا، جہاں حضرت میرا حسینؑ اکثر ذکرِ الہی کیا کرتے تھے۔ لوگ زار و قطار ہتھے۔ اور شدتِ الم سے ان کا برا حال تھا۔

حضرت سید علیؒ جویریؒ نے شرکائے میت سے پوچھا۔ ”یہ کس کا جنازہ ہے؟“

وہوں نے جواب دیا۔ ”یہ حضرت سید میرا حسین زنجائیؒ ہیں..... مبلغِ اسلام..... اللہ کے دوست۔“ ان کا اظہار پر حضرت سید علیؒ جویریؒ حیران رہ گئے۔ اب آپ کو اندازہ ہوا کہ علمِ شیخؒ میں یہ مصلحت پوشیدہ تھی۔ بھائی، حضرت میرا حسین زنجائیؒ کے وصال کی خبر سن کر حضرت سید علیؒ آبدیدہ ہو گئے اور نہایت رقت آمیز بافرمایا۔

”حسین بن علیؑ سے مجھے نسبتِ خاص ہے۔ یہ میرے مرشد کی نشانی ہیں۔“

شرکائے جنازہ نے اس اتفاقی امر کو بڑے تعجب سے دیکھا۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ یہ کوئی اتفاق نہیں۔ قدرت کا ایک طے شدہ منصوبہ تھا، جس میں نہ ایک لمحے کی غفلت ہو سکتی ہے اور نہ تاخیر..... جیسے ہی معرفت کا باب خورشید ضیاء بارغروب ہوا، دوسرا طلوع ہو گیا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے حضرت میراں حسین زنجانیؒ کے جنازے کو کاغذ ہادیا۔ پھر آپ ہی نے اپنے بھائی کی نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت میراں حسین زنجانیؒ کا آخری دیدار کرتے ہوئے فرمایا۔

”آپ نے اللہ کے لئے ہجرت اختیار کی۔ بت پرستوں کے جو دستور و ستم برداشت کئے۔ مگر اپنا راستہ نہیں بدلا۔ آپ اس دنیا سے بامراد و کامران گئے۔ اللہ آپ پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے۔“

پھر حضرت میراں حسینؒ کو بارغ زنجانی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

”حدیثۃ الاولیاء“ کے مؤلف مفتی غلام سرور لاہوری، حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ”قدیمی بزرگوں میں یہ بزرگ، صاحب رشد و ہدایت تھے۔ نہایت زاہد و متقی اور صاحب کرامت تھے۔ ان کا روحانی شجرہ، حضرت جنید بغدادیؒ کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ سید یعقوب زنجانیؒ کے ہمراہ لاہور آئے اور ہنگامہ شیخت گرم کیا۔ تمام عمر ہدایت خلق میں گزاری۔ آخر 400ھ میں وفات پائی۔“

اگر مفتی غلام سرور لاہوری کی روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو حضرت میراں حسین زنجانیؒ، حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) کی وفات کے 169 سال بعد دنیا سے رخصت ہوئے۔ پھر دہ ساری روایات مجہول قرار پاتی ہیں، جن کے مطابق حضرت سید میراں حسینؒ حضرت شیخ ابوالفضل ختلیؒ کے مرید اور حضرت سید علی ہجویریؒ کے پیر بھائی تھے۔

اس کے برعکس ”ماثر لاہور“ میں منشی محمد الدین فوق کی روایت ہے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ، پیر دمر شاہؒ کے مطابق لاہور پہنچے اور حضرت میراں حسین زنجانیؒ کے جنازے میں شریک ہوئے۔ سلطان محمود غزنویؒ نے 395ھ کے بعد راجہ لاہور کو شکست دے کر پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ بنا دیا تھا۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ حضرت سید حسین زنجانیؒ 395ھ کے بعد لاہور تشریف لائے اور 431ھ میں آپ کا وصال ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب سلطان محمود غزنویؒ کے بیٹے، سلطان مسعود کی حکومت اپنے آخری لمحے گزار رہی تھی۔ حضرت شاہ حسین زنجانیؒ فرزند چھتیس سینتیس سال لاہور میں رہے۔ اور اس طویل عرصے میں ہزاروں غیر مسلم، آپ کے ”پرچم توحید“ کے پرچم لائے۔ اور ہزار ہا تشنگان حقیقت، جام توحید سے سرشار ہوئے۔

لاہور سے متعلق ایک اور تاریخ ”ماثر لاہور“ بھی موجود ہے، جسے سید ہاشمی فرید آبادی نے ترتیب دیا ہے۔ ۱۱ تالیف کی روایت کے متعلق ”فوائد الفواد“ میں حضرت سید میراں حسین زنجانیؒ کو حضرت سید علی ہجویریؒ کا پیش رو بھائی کہا گیا ہے۔

”فوائد الفواد“ محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات عالیہ کا مجموعہ ہے، جسے آپ کے مرید نامہ حضرت خواجہ امیر حسن خجریؒ نے ترتیب دیا ہے۔

”ثمرات القدس“ کے مؤلف لعل بیگ نے اپنی تالیف میں ”فوائد الفواد“ کی اسی روایت کو نقل کیا ہے۔ ”ماثر لاہور“ میں سید ہاشمی فریدی نے اپنی تحقیقات کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ معاصرین صوفیاء میں اس نام کے کسی بزرگ کا ذکر نہیں کرتے۔ ”آئین اکبری“ اور بعد کے تذکروں میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے حضرت میراں حسین زنجانیؒ کی ملاقات کا ذکر موجود ہے۔ ان ہی تذکروں میں حضرت

جن کا سال وفات 600ھ یا کچھ بعد تحریر کیا گیا ہے۔

”ابن ابی لاہور“ کی روایت کے مطابق حضرت سید میراں حسین زنجائی، حضرت یعقوب زنجائی کے ہمراہ ہزار ہوئے۔ حضرت شیخ کی ہزاروں کرامات مشہور ہیں۔ آپ کی وفات 604ھ میں ہوئی۔

”تہذیب الاصفیاء“ کے مؤلف مفتی غلام سرور لاہوری نے ”تحفۃ الاولیاء“ کے حوالے سے ایک اور بزرگ کا بیان کیا ہے، جن کا اسم گرامی، حضرت شاہ اسماعیل محدث ہے۔ شاہ صاحب، سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ 395ھ میں شریف لائے۔ آپ اپنے وقت میں حدیث و فقہ کے امام تھے۔ آپ کے وعظ کی تاثیر سے ہزاروں کفار نے اسلام ہوئے۔

”تہذیب الاولیاء“ کے مؤلف کا بیان ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل محدث پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے لاہور میں نبی کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی۔ یہ آپ کی قرأت کا جلال تھا کہ اس ہجوم میں سے ڈھائی سو بت نکالیں لے آئے۔

”تہذیب الاولیاء“ کے مصنف رائے بہادر کنہیا لال کی روایت کے مطابق حضرت شاہ اسماعیل محدث 411ھ میں شریف لائے۔

ان تمام روایتوں سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت سید علی، جویری اور حضرت میراں حسین زنجائی نے اپنی کئی کئی بزرگ ”بت خانہ لاہور“ میں اذان دے چکے ہیں۔



مفسد روایتوں کے باوجود حضرت سید میراں حسین زنجائی ایک مرد باعفا اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ آپ کی معرفت کے لازوال نقوش، لاہور کی فضاؤں میں موجود ہیں۔ جب اہل دل کے قافلے ہمارے ارد گرد پر جنوب کی طرف آتے ہیں تو انہیں دور سے ایک سبز گنبد نظر آتا ہے۔ یہی حضرت میراں حسین زنجائی کی آخری آرام گاہ ہے۔ ”باغ زنجان“ میں صدیوں تک آپ کا حزار مبارک ایک بلند چوڑے پر مربع خلافت کا ایک چار دیواری بنادی گئی۔ مگر کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس چار دیواری کا معمار کون ہے؟ پھر جب ”تہذیب الاولیاء“ کو ”لوکھا باغ“ میں ضم کیا گیا، اُس وقت بھی یہ چار دیواری موجود تھی۔ بعد میں گنبد تعمیر کیا گیا۔

حضرت سید میراں حسین زنجائی کی صوفیانہ تعلیمات، شریعت و سنت کے عین مطابق تھیں۔ آپ کا لہجہ نرم، زبان ابرہہ تا ثیر تھا۔ حضرت شیخ کے چند ارشادات گرامی، حسب ذیل ہیں۔

”ایمان کی بنیاد، دل کی تصدیق، زبان کا اقرار، جسم کا عمل اور سنت کی متابعت ہے۔ ایسا ایمان محکم اور محفوظ ہے۔“

”ایک دریا ہے۔ اس دریا کا کنارہ آخرت ہے۔ اور تقویٰ کشتی ہے۔ جس کے بغیر دنیا کے دریا کو پار نہیں کیا جاتا۔“

”قرآن کا عامل ہونا اور دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنا، تبلیغ اسلام کا سب سے بڑا اصول ہے۔“

”خوش جوانی میں فرمان خداوندی کو نظر انداز کرتا ہے، خدا سے بڑھاپے میں ذلیل و خوار کرتا ہے۔“

”انسان کی زبان، بے کار باتوں کے لئے اس وقت آمادہ ہوتی ہے، جب قوت عمل اور اطاعت کا جذبہ مفقود ہو۔ مفتی الہی، بے کار باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔ عشق کی فطرت تسلیم درضا ہے۔“

”صاحب ہدایت اپنے مشاہدے کے ذریعے جو کچھ دیکھتا ہے، وہ معراج ہے۔ اور صاحب بدعت جو کچھ دیکھتا

ہے، وہ سراسر گمراہی ہے۔“

”شرابیوں کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نصیب نہیں ہوگا“

”اہل بدعت اور بے نمازیوں کا ذکر و فکر قبول نہیں ہوتا۔“

”مفت خوری کی وجہ سے معاشرے میں آوارگی اور بداطواری پھیلتی ہے۔“

”محنت کی عادت روز بہ روز زوال پذیر ہو رہی ہے۔ کامل اور بدست لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بے دخلی

اور فحاشی کو ترقی ہو رہی ہے۔“

حضرت میراں حسین زنجانی کے ارشادات گرامی کی روشنی میں موجودہ معاشرتی نظام کا جائزہ لیجئے۔ ہر آپ!

اندازہ ہوگا کہ ”فراست مومن“ کیا شے ہے۔ اور اللہ کے ایک دوست کی آنکھ، صدیوں کا جگر چاک کر کے کئی ذرہ

تک دیکھ سکتی ہے۔

اپنے آخری اقوال میں حضرت میراں حسین زنجانیؒ نے انسانی معاشرے کی جس زیوں حالی کی عکاسی کی ہے

علامہ اقبالؒ نے اسی پستی اور زوال کا نقشہ اپنے شعر میں اس طرح کھینچا ہے۔

خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور

کہ بچ کھائے مسلمان کا جامہٴ احرام



حضرت سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ چشتیہ کو جو شہرت و محبوبیت حاصل ہوئی، وہ کسی ہی سلسلہ طریقت کو میسر نہ آ سکی۔ یہ اللہ کا اپنا نظام اور مصلحت ہے کہ وہ کس خطہ زمین کو کس فصل کے لئے بنائے اور مناسب سمجھتا ہے۔ ارض ہند میں تصوف کے جو بیج، مشائخ چشت نے بوئے، ان سے بڑے تناور درختوں کی پائے اُڑ رہے۔ اور ان ہی درختوں کے جاں فزا سائے میں مسافروں کی بڑی تعداد نے سکون و اطمینان پزیر کیا۔ امیر شریف (راجستھان) میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ..... دہلی میں حضرت خواجہ قطب الدین گہر کاٹی..... پاک پٹن (پنجاب) میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ..... سہارنپور (یوپی) میں حضرت مخدوم الدین صابر گھریٹی..... دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ..... ہانسی میں حضرت شیخ جمال الدینؒ..... پانی پت حضرت شمس الدین ترکؒ..... اور اسی شہر میں حضرت جلال الدین کبیر الاولیاؒ..... بہاولپور (پنجاب) میں حضرت سید جمال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ..... دہلی میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ..... گلبرگہ ہائی میں حضرت سید گیسو رازؒ..... کچھوچھ (یوپی) میں حضرت سید اشرف جہانگیر سنائیؒ..... حضرت شیخ احمد ہاشمی درویشیؒ..... حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ..... حضرت سلیم چشتیؒ..... دکن میں حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ..... بنگال میں حضرت شیخ علاء الدین چشتیؒ..... غرض آپ برصغیر کے طول و عرض میں کسی ان کی طرح طے حائیں، اکثر علاقوں میں سلسلہ چشتیہ ہی کی عظمتوں کے مینار نظر آئیں گے۔

ظہر در حکومت میں سلسلہ چشتیہ کے تین نامور بزرگوں نے اپنے مشائخ کی رسوم کو نہ صرف زندہ رکھا، بلکہ گہرا راسخ بھی دیا۔ ان صوفیاء میں پہلے درویش حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ تھے، جنہوں نے اپنے آبائی وطن، ہریانہ (دہلی) میں مقیم رہ کر سلسلہ چشتیہ کی اشاعت و تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ حضرت شیخ کلیم اللہ کے خلیفہ اکبر، حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ تھے۔ آپ پیر و مرشد کے حکم سے اورنگ آباد منتقل ہو گئے تھے اور ارض دکن کے ایک گوش کو منور کرتے رہے۔ حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند حضرت امام احمد الدین جہاں، دہلی تشریف لے گئے اور پورا شمالی ہندوستان آپ کی روحانیت کے زیر اثر رہا۔

مذکورہ نگاروں کے مطابق اس وقت پنجاب میں سلسلہ قادریہ اور سلسلہ سہروردیہ اپنے عروج پر تھے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور ان کے خلفائے عظام کے بعد اس علاقے کے لوگ سلسلہ چشتیہ کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ بعض مؤرخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ دوسرے سلسلہ ہائے تصوف سے تعلق رکھنے والے لوگ، خاندان

چشتیہ کی عظمتوں کے منکر ہو گئے تھے۔ اسی دوران پنجاب کی ایک بستی چوٹھالہ (مہارشریف) میں ایک لڑکا پیدا ہوا اور راجپوتوں کے حکمران قبیلے ”کھرل“ سے تعلق رکھتا تھا۔ لڑکے کے والد کا نام ہندوال یا ہندال تھا، جو محمود کھل کے پر پوتے تھے۔ والدہ کا نام عاقل خاتون تھا، جن کا سلسلہ نسب، نوشیروان عادل سے ملتا ہے۔ ماں باپ نے لڑکے کا نام باہل یا بہل رکھا۔ اس لڑکے کا فطری رجحان، مذہب کی طرف تھا۔ ابتدائی تعلیم مہار میں حاصل کی۔ پھر دارہ غازی خان جا کر اس وقت کے علماء سے درسی کتابیں پڑھیں۔ ظاہری تعلیم سے عقل کی پیاس تو بجھ گئی، مگر نوجوان کی روح پیاسی تھی۔ جب کسی بھی طرح روح کی تشنگی نہ مٹ سکی تو ایک بزرگ نے نوجوان کو مشورہ دیا۔

”اگر روح اور دل کی سیرانی چاہتے ہو تو دہلی چلے جاؤ۔ وہاں سلسلہ چشتیہ کے نامور بزرگ، مولانا فخر الدین فخر جہاں، سکون اور یقین کی دولت تقسیم کرتے ہیں۔ تم ان ہی کے آستانے پر پڑے رہنا۔ جس روز بھی مولانا کی نظر میں پڑ گئی، بامراد اور نہال ہو جاؤ گے۔“

مولانا فخر الدین فخر جہاں کا نام سن کر نوجوان بے قرار ہو گیا۔ دل کو ایسی لگی کہ ایک پل کے لئے بھی سکون میر نہیں آیا۔ آخر اسباب سفر باندھا اور دہلی روانہ ہو گیا۔ پھر مولانا فخر الدین فخر جہاں کی مجلس عرفان میں داخل ہوا تو در و دیوار سے آواز آنے لگی۔ ”یہی تیری منزل ہے۔“

”نوجوان! کیسے آئے ہو؟“ فخر الدین فخر جہاں نے آنے والے سے پوچھا۔

”دل و جاں کو سیراب کرنے۔“ نوجوان نے پرسوز لہجے میں کہا اور سر جھکا دیا۔

”دل و جاں کی پیاس ایسے نہیں بجھتی۔“ نوجوان کی عرضداشت سن کر حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں نے فرمایا۔ ”پہلے حسرت و ارمان کو قتل کیا جاتا ہے۔ پھر اپنے نفس کا خون پینا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر دل و جاں آسودہ ہوتے ہیں۔“

”اگر شیخ کی نظر کرم کے سائے میں رہا تو آزمائش کی ہر منزل سے گزر جاؤں گا۔“ نوجوان کے ہر لفظ سے انتہائی عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ چہرے پر سچی طلب کا رنگ نمایاں تھا۔ دل اور زبان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“ حضرت شیخ نے نوادر کو چہرے عشق سے پوچھا۔

”بہل۔“ نوجوان نے عرض کیا۔

”نام پسندیدہ نہیں ہے۔“ حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں نے فرمایا۔

”اگر شیخ کو پسند نہیں ہے تو نام بھی بدل ڈالوں گا۔“ نوجوان پر وارفتگی طاری تھی۔

”ہاں! اپنا نام بدل ڈالو۔“ حضرت مولانا فخر الدین نے فرمایا۔ ”آج سے تمہارا نام، نور محمد ہے۔“

نوجوان نے اپنے ماں باپ کا پسندیدہ نام بدل ڈالا۔ پھر مرشد نے نظر کرم کی تو دنیا ہی بدل گئی۔

بستی چوٹھالہ کا یہ نوجوان، سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ، حضرت خواجہ نور محمد مہاروی تھے جن کے فیض روحانی سے پورا برصغیر فیض یاب ہوا۔

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کو اپنے پیر و مرشد سے والہانہ محبت تھی۔ اسی طرح حضرت فخر الدین فخر جہاںؒ آپ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ حضرت شیخ جب آپ کو یاد کرتے تو یہ مصرع پڑھا کرتے تھے۔

مکھن لے گیا پنجابی، چھاچھہ پو سنسار

حضرت مولانا فخر الدینؒ کا مفہوم یہ تھا کہ علم طریقت کی روح (مکھن) تو حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ لے لے

پانچواں) دوسرے لوگ استعمال کر رہے ہیں۔

یہاں پر حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں نے یہاں تک فرمادیا۔ ”اگر یہ پنجابی میرے پاس نہ آتا تو میں دل ہی دل میں لے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتا۔“

ذات فخر نور محمد مہارویؒ کی طرف پیر و مرشد کاتھفات دیکھ کر حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ کے بعض بے حد کرنے لگے۔ ایک دن برسر مجلس کسی مرید نے حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی برائی کرتے ہوئے یہ فحش جو آپ کی خدمت میں آیا ہے، اس کی قوم کھل ہے۔ اسی کا ایک رشتے دار مرزا تھا، جو جھنگ بابک زمیندار کی خوبصورت لڑکی ”صاحبان“ کو اپنے ساتھ درغلا کرنے گیا تھا۔ اس لڑکی کے در ثاء کی فوج کے لڑکے سامنے کے جنگل میں اسے قتل کر دیا۔ یہ نور محمد اسی قوم سے ہے۔ اس کا آپ کی خدمت میں رہنا ”میں“۔

ابن کو جب حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی شخصیت میں اور کوئی عیب نظر نہیں آیا تو وہ ”مرزا صاحبان“ کے لئے لٹالے کو درمیان میں لے آئے۔ پنجاب کی لوک داستانوں میں عشق کی یہ کہانی آج بھی مشہور ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار، مرزا اسی قبیلے سے تھا، جو حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی قوم تھی۔

اس موضوع کے مطابق مرزا، حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کا رشتے دار تھا۔ بہر حال، حقیقت کچھ بھی ہو۔ دنیا بھر میں یہ کہ جب کسی شخص کی ذات میں کوئی خرابی یا کردار میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تو اہل دنیا بڑی بے رحمی و فحش کا شکار ایک ایسے خاندان یا فرد سے جوڑ دیتے ہیں، جو ماضی میں کسی لغزش کا شکار رہا ہو۔ حضرت خواجہ نور محمد صاحبان کے عشق کے حوالے سے ہدف تنقید بنایا گیا، تاکہ وہ اپنے منصب سے گرجائیں اور پیر و مرشدوں میں ان کی محبوبیت برقرار نہ رہے۔

یہاں تک کہ ذیل میں قرآن کریم کا واضح فیصلہ موجود ہے۔ ”ہر شخص کو اپنے اعمال کا بوجھ اٹھانا ہوگا..... اور کوئی دوسرے شخص کے گناہ کا ذمہ دار ہرگز نہیں ہوگا۔“

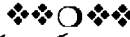
آپ اہل کا یہ فیصلہ ان لوگوں کو بھی معلوم تھا، جو حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ کے دربار روحانی سے وابستہ تھے۔ جہاں حد میں وہ سب کچھ بھول گئے اور حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے ایک ہم قوم یا رشتے دار کے گناہ کو آپ کی ریاستوں، سچائیوں اور عشق کی سرمستیوں پر پانی پھیرنے کی کوشش کی..... مگر حق تعالیٰ نے اپنے فیصلے اور عبادت گزار بندے کی عزت رکھی اور مخالفین کی کوششوں پر سیاہی پھیر دی۔

مولانا کا یہ اعتراض سن کر حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ مسکرائے اور بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔

”مرزا کھل نے تو صرف ایک ”صاحبان“ کو اپنے عشق میں مبتلا کیا تھا..... مگر ہمارا یہ پنجابی، انشاء اللہ! ایک اپنے عشق میں مبتلا کرے گا اور اپنے ساتھ جنت میں لے جائے گا۔“

حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ آپ کے محبوب مرید نے ان لوگوں کے دل و دماغ کو مسخر کر لیا۔ جب مہار شریفؒ میں حضرت خواجہ نور محمدؒ نے اپنی مجلس روحانی آراستہ کیا تو ان کی مجلسیں جگہ گئیں اور ایک درویش کا روشن چہرہ دیکھنے کے لئے مخلوق کا جہنم ٹوٹ پڑا۔

ہادیہ فیروز احمد نظامیؒ، تاریخ مشائخ چشت میں فرماتے ہیں۔ ”حضرت شاہ نور محمدؒ کی صحبت میں اس قدر کشش و ثبات تھی کہ جو اس محفل میں پہنچ جاتا، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اور جو شخص ان کے دست حق پرست ہو جاتا، اس کی زندگی میں حیرت انگیز انقلابی تبدیلیاں آ جاتیں۔“



پھر جب حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی روحانی تربیت مکمل ہو گئی تو ایک دن پیر و مرشد، حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
 ”نور محمد! اب تم اپنے وطن کی طرف لوٹ جاؤ اور خواجگانِ چشت کی تعلیمات سے پنجاب کے تاریک گوشہ روشن کرو۔“

پیر و مرشد کا حکم سن کر حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے سر تسلیم خم کر دیا۔
 پھر جب آپ پنجاب کی طرف عازم سفر ہونے لگے تو حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ نے اپنے محبوب رب ایک خاص ہدایت فرمائی۔

”نور محمد! میری بات غور سے سنو۔ ایک شہباز، کوہستانِ مغرب سے برآمد ہوگا۔ تمہیں چاہئے کہ جس طرف بھی ممکن ہو، تم اس شہباز کو اپنے دام میں لے آؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شہباز کسی دوسرے کے دام میں چلا جائے۔ کجا شہباز ہماری اور تمہاری روحانی نعمتوں کا مالک قرار پائے گا۔ اور وہ اپنے زمانے کا سلیمان ہوگا۔“
 پیر و مرشد کی اس ہدایت خاص پر حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ اپنے آبائی وطن تشریف لے آئے اور اس شہباز کی تلاش میں رہنے لگے، جسے زیر دام لانے کا حکم، حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ نے دیا تھا۔
 آپ اس ارادے سے اوج شریف اور کوٹ مٹھن وغیرہ کے علاقوں میں جاتے اور اکثر درویشوں پر نظر ڈالتے اور پھر انتہائی حسرت زدہ لہجے میں فرماتے۔

”یہ سب طالبانِ حق ہیں۔ مگر ان درویشوں میں میرا شہباز نہیں ہے۔“
 حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کو بہت دنوں تک اس ”شہبازِ طریقت“ کی جستجو رہی، مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ صورت حال دیکھ کر آپ پر شدید اضطراب طاری ہو جاتا اور خود کلامی کے انداز میں فرمانے لگتے۔
 ”کہیں میری جستجو میں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو اور وہ شہباز کسی دوسرے کے دام میں نہ چلا گیا ہو۔“
 پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے۔ ”جب پیر و مرشد نے فرما دیا ہے تو وہ شہباز کسی اور طرف کار نہیں کرے گا۔ انشاء اللہ! میرے ہی دام میں آئے گا۔“

ایک روز حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے اپنے ایک مرید، مولوی محمد حسین سے فرمایا، جو بہاولپور کے علاقے میں رہتے تھے۔

”میاں محمد حسین! تم جانتے ہو کہ میں ہر سال اس ملک (علاقے) میں کیوں آتا ہوں؟“
 مولوی محمد حسینؒ اس سوال پر حیران ہوئے۔ پھر نہایت ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔ ”پیر و مرشد! مجھے سمجھتے ہیں۔ ویسے یہ اس سرزمین کی خوش بختی ہے کہ وہ میرے شیخ کے قدموں کو چھوتی ہے۔“
 حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے فرمایا۔ ”میاں محمد حسین! یہ الگ بات ہے کہ میں تمہارے علاقے میں ایک شہباز کے شکار کے لئے آتا ہوں۔“

مولوی محمد حسینؒ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ”شیخ! آپ تو شکار نہیں کھیلتے۔“ مولوی محمد حسینؒ، پیر و مرشد کے اشارات و کنایات کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

اپنے مرید کو حیران پا کر حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے فرمایا۔ ”میاں محمد حسین! وہ شکار بھی ہے۔۔۔۔۔ شہباز بھی ہے۔“

انہوں نے سر جھکا دیا۔

تم سے وقفہ سکوت کے بعد حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے دوبارہ فرمایا۔ ”میں اسی شہباز کے شکار کے لئے علاقے میں آتا ہوں۔ اور اس شکار کا حکم مجھے پیر و مرشد حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ نے دیا ہے۔ ان کی دعا کرو کہ اللہ اس شہباز کو میرے دام میں لے آئے۔“

بہارات کے بعد مولوی محمد حسین سمجھ گئے کہ پیر و مرشد کس شکار اور کس شہباز کی بات کر رہے ہیں۔ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ مسلسل کئی سال تک اس شہباز کی تلاش میں مختلف علاقوں کے سفر اختیار کرتے رہے۔ شہباز آپ کو کہیں نظر نہ آیا۔ ایک روز آپ نے اپنے ایک دوسرے مرید، مولانا نور محمد حاجی پور والہ کو بھی بتا دیا۔

مولانا مجھے جس شہباز لاهوتی کو زیر دام لانے کی بشارت حضرت شاہ فخر جہاںؒ نے دی ہے، تم بھی اس کی تلاش کے علاقے کا سفر کیا کرو۔ شاید وہ کوہستان سے نکل کر تمہارے دام میں چلا آئے۔“

درویشی کی ہدایت کے مطابق مولانا نور محمد حاجی پور والہؒ بھی اسی شہباز کی تلاش میں دشوار گزار علاقوں کے سفر کرنے لگے مگر انہیں بھی طویل جستجو کے باوجود کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

اُن کی سال حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ حسب معمول اُدوج (بہاولپور) تشریف لے گئے۔ اس وقت کوٹ بہل حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے ایک مرید، میاں احمد علیؒ کی درس گاہ قائم تھی، جہاں سینکڑوں طالب علم زیر تعلیم تھے۔ جب میاں احمد علیؒ نے پیر و مرشد کی آمد کی خبر سنی تو اپنے شاگردوں کو لے کر اُدوج شریف روانہ ہو گئے۔ اُن کے شاگردوں میں ایک پندرہ سولہ افغان نوجوان بھی تھا۔ اس نوجوان نے دوسرے لوگوں سے سنا تھا کہ خواجہ نور محمد مہارویؒ، سماع سے غیر معمولی شغف رکھتے ہیں اور کبھی کبھی حزامیر (سازوں) کے ساتھ بھی سماع بہت ساروں میں ایک ساز ”سرود“ بھی تھا۔ اس نوجوان نے سوچا تھا کہ جب وہ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی دہلی حاضر ہوگا تو عرض کرے گا۔

مجاہد شریعت میں موسیقی حرام ہے تو پھر آپ سرود کیوں سنتے ہیں؟“

نوجوان نے کہا میں اپنے شاگردوں کے ساتھ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ آپ پیر و مرشد کے اگلی قطار میں بیٹھے اور شاگردوں کو سب سے پچھلی قطار میں نشستیں حاصل ہوئیں۔ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی مجلس عرفانی میں سب ادب سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اتنے میں میاں احمد علیؒ نے افغان شاگرد اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور اس نے بلند آواز میں حضرت شیخ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”مجاہد! کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ ”پوچھو! کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

نوجوان نے کہا کہ ان الفاظ میں کیا اثر تھا۔ نوجوان گنگ ہو کر رہ گیا اور اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے افغان طالب علم کی یہ حالت دیکھ کر فرمایا۔ ”نوجوان! میرے قریب آؤ۔ تمہاری بات سننے کا ڈالا ہے۔“

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے دیگر مریدوں اور حاضرین مجلس پر حیرت طاری تھی کہ آخر حضرت شیخ ایک طالب علم کی بات سننے کے لئے اس قدر قریب آئے۔ ”میرے قریب آؤ۔“

میاں احمد علیؒ نے عرض کیا۔ ”سرکار! یہ ایک بے باک نوجوان ہے۔ ابھی اسے بزرگوں سے گفتگو کرنے نہیں آتا۔“

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے اپنے مرید کی طرف دیکھا اور پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”میاں احمد علیؒ درمیان میں نہ بولو۔ یہ ہمارا اور نوجوان کا معاملہ ہے۔“

اتنے میں وہ نوجوان، لرزتے قدموں سے آگے بڑھا اور پھر جب حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے قریب پہنچا آپ نے بڑے دالہانہ لہجے میں فرمایا۔ ”تم ہی میرے شہباز ہو۔“

ابھی خانقاہ میں آپ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ افغان نوجوان بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ اپنی مسند سے اٹھے اور نوجوان کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ دوسرے ہی لمحے اس میں آگیا۔ مگر ابھی تک اُس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ حضرت شیخؒ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

”فرزند! گھبراؤ نہیں۔ تم غیروں میں نہیں، اپنوں میں ہو۔“

پھر جب میاں احمد علیؒ کے شاگرد کے حواس بحال ہوئے تو حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے نوجوان کو بچہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”فرزند! تم کوئی سوال کر رہے تھے۔ اب پوچھو! کیا پوچھنا چاہتے تھے؟“

افغان نوجوان نے حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھنے کی کوشش کی، مگر جب نمایاں ہونے کے سبب اس کی نظریں تاب نہ لاسکیں اور فرش پر جم گئیں۔

”شیخ! اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہا کہ میں کیا پوچھنا چاہتا تھا۔“ افغان نوجوان نے نظریں جھکا کر لرزتے ہوئے لہجے میں عرض کیا۔ ”شیخ! میں تو اپنے سارے سبق ہی بھول گیا۔“

افغان طالب علم کی بھی یہی کیفیت تھی کہ اپنے ذہن میں کئی سوالات اور توجیہات لے کر بارگاہِ شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا مگر جب حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے زوئے مبارک پر نوجوان کی نظر پڑی تو وہ سارا علم ہی بخود اپنے وجود کو بھی فراموش کر بیٹھا۔ اسی طرح ہندوستان کی نابھہ روزگار شخصیت، حضرت امیر خسروؒ جب بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلطان المشائخؒ نے آپ کی طرف ایک نظر تو دنیاوی علوم اور نظریات کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہی۔ حضرت امیر خسروؒ اپنی تمام تر ذہانت، شاعرانہ اور اصلاحیت اور ساری فصاحت و بلاغت بھول گئے۔ ایک مردِ حق کے سامنے کچھ نہیں رہا۔ جو رہی تو بے خبری رہی۔

میں حضرت امیر خسروؒ نے اپنے پیر و مرشد، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی منقبت لکھی، جس کا ایک سائے سات سو سال گزر جانے کے باوجود ساری دنیا کی وسعتوں میں گونج رہا ہے۔

چھاپ تلک سب چھین لی مو سے نیناں ملائے کے

(تیری نظر تو وہ نظر ہے کہ تُو نے ایک ہی نظر میں میرے ماتھے سے کفر کی ساری نشانیاں کھرچ ڈالیں)

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ بھی سلسلہٴ چشتیہ نظامیہ کے وارث تھے۔ اس لئے جب آپ نے ایک طالب علم پر نظر ڈالی تو وہ اپنی ”مسطقیّت“ ہی نہیں بلکہ یاد کئے ہوئے سارے سبق بھی بھول گیا۔

”اب کیا چاہتے ہو فرزند؟“ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے افغان نوجوان سے پوچھا۔

”اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ کے آستانہ کرم کے سامنے میں پڑا رہوں۔“ افغان طالب علم، حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

حضرتؒ نے نوجوان کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور پھر اپنے حلقہٴ ارادت میں شامل فرمایا۔
 اس کے بعد حضرت خواجہ نور محمدؒ اپنے نوجوان مرید کو لے کر مہار شریف کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر جب آپ
 پہنچے تو اپنے دوسرے مرید، مولوی محمد حسینؒ سے فرمایا۔
 ”مولوی صاحب! ہمیں مبارک باد دو۔ وہ شہباز، جس کے شکار کے لئے ہم ہر سال اس علاقے میں آتے
 تھے، اس سال وہ ہمارے دام میں آ گیا۔“

مولوی محمد حسینؒ نے افغان طالب علم کی طرف دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ سے
 نہ ہونے کے بعد افغان نوجوان کے چہرے پر عجیب سی روشنی نظر آرہی تھی۔

”آپ کو یہ شہباز مبارک ہو۔“ مولوی محمد حسینؒ نے اپنے پیرومرشد کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کی۔
 حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے اپنے خلیفہ مولانا نور محمد حاجی پور والہ کو ایک خط تحریر کیا۔

”مولانا! جس شہباز کو زیر دام لانے کے لئے حضرت شاہ فخر جہاںؒ نے حکم دیا تھا..... اور جس کی تلاش میں ہم
 سالوں سے رہتے تھے، اللہ کے فضل سے وہ شہباز لاہوتی، ہمارے حلقے میں شامل ہو چکا ہے۔ اب آپ کو اس
 نعمت میں گنجانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کے بعد حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ پھر کبھی سنگھوہ کے علاقے میں تشریف نہیں لے گئے۔

حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ نے جس شہباز کو زیر دام لانے کی ہدایت کی تھی، وہ وہی طالب علم تھے، جو
 پچاس برس پہلے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی مساعیٰ جمیلہ سے سلسلہٴ چشتیہ نظامیہ کو
 زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ، حضرت
 نظام الدین اولیاءؒ کے سلسلے میں بیعت تھے..... مگر چونکہ سلسلہٴ نظامیہ کی بنیاد، سلسلہٴ چشتیہ ہے، اس لئے
 حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ، چشتی نظامی کہلاتے تھے۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ جب حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے
 بانی پر بیعت ہوئے تو اس وقت آپ کی عمر مبارک پندرہ یا سولہ سال تھی۔

اب حضرت شاہ فخر جہاںؒ نے حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کو ہدایت کی تھی تو واضح الفاظ میں فرما دیا تھا کہ وہ
 ان کا ”سلیمان“ ہوگا۔ حالانکہ اس وقت حضرت فخر جہاںؒ نے خواجہ سلیمانؒ کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ مگر حق تعالیٰ
 ہی کی قسم بصیرت پر نہ صرف اس نوجوان کا چہرہ روشن کر دیا تھا، بلکہ اس کا نام بھی ظاہر کر دیا تھا۔



حضرت خواجہ سلیمانؒ کا خاندانی نام، محمد سلیمان تھا۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی زکریا تھا اور آپ عبد الوہاب
 کے ماہر زادے تھے۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کی والدہ ماجدہ کا نام بی بی زلیخا تھا۔ آپ نسلی اعتبار سے
 تھے۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ کا تعلق خاندانِ جعفریہ سے تھا، جو قبیلہ ”رمدانی“ کی ایک شاخ تھا۔ اس خاندان
 سے میں کہا جاتا ہے کہ رمدانی قبیلہ، رحیم داد خان جعفر کی اولاد سے ہے۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ، عوام میں
 بلکہ نام سے پکارے جاتے تھے۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ 1184ھ کے درمیان قصبہ ”گڑگوچی“ میں پیدا ہوئے جو ”کوہ درگ“ میں واقع ہے اور
 تربت سے مغرب کی سمت میں تیس کوس کے فاصلے پر آباد ہے۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے والد محترم،
 انتقال اس وقت ہو گیا، جب آپ شیر خواری کے دور سے گزر رہے تھے۔ اس نازک اور سنگین مرحلے میں
 خواجہ سلیمانؒ کی والدہ ماجدہ، بی بی زلیخا نے غیر معمولی صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اسی تاریخ سے یہ نہیں

چلتا کہ جناب زکریا کے انتقال کے وقت اس خاندان کی مالی حیثیت کیا تھی۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ کے شب و روز کو دیکھ کر بس اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کسی آسودہ حال خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ غربت و افلاس کی اس فضا میں یہ بڑے حوصلے کی بات تھی کہ بی بی زلیخا نے اپنے یتیم فرزند کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔

جب حضرت خواجہ سلیمانؒ کی عمر چار سال ہوئی تو والدہ محترمہ نے آپ کو ابتدائی تعلیم کے لئے ملا یوسف جعفری خدمت میں بھیجا۔ ملا یوسف جعفری، حضرت خواجہ سلیمانؒ کے پہلے استاد تھے۔ آپ نے اپنے شاگرد کو بم اللہ شرمدا کرائی اور قرآن کریم کے تقریباً پندرہ پارے پڑھائے۔

ابھی قرآن کریم کا درس ختم نہیں ہوا تھا کہ حضرت خواجہ سلیمانؒ اپنے ایک ہم قوم، حضرت حاجی صاحب کے مکتب میں داخل ہو گئے۔ کسی تذکرہ نگار نے اس تبدیلی کی وجہ بیان نہیں کی۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت حضرت خواجہ سلیمانؒ کی عمر مبارک چھ سات سال ہوگی۔ اس کم سنی میں حضرت خواجہ سلیمانؒ نے حصولِ علم کے لئے جو مشقت برداشت کی، اسے تاریخ تصوف میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ حاجی صاحب کے یہاں کچھ گامی اور دوسرے جانور پلے ہوئے تھے۔ جب حضرت خواجہ سلیمانؒ ان کے مدرسے میں داخل ہوئے تو پہلے ہی دن حاجی صاحب نے اپنے نو عمر شاگرد کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

”محمد سلیمان! تم ان گائے بکریوں کو جنگل میں چرایا کرو..... اور یاد رکھو کہ ان تمام جانوروں کو تازہ مٹاس ملی چاہئے۔ یہاں تک کہ یہ شکم سیر ہو جائیں۔“

اہل نظر غور کریں کہ جو بچوں کے ضد کرنے اور ماں باپ کی محبت کے سائے میں بیٹھنے کی عمر ہوتی ہے، اہل علم میں حضرت خواجہ سلیمانؒ نے مولیٰ چرائے۔ سورج کی تیش اور موسم کی دوسری سختیاں برداشت کیں۔ سارا سارا دن جنگلوں میں پھرتے رہے، منگریزوں اور خادوش سے گزرتے ہوئے آپ کے پائے نازک، آبلوں سے بھر کر کٹی ہو جاتے تھے..... مگر ایک دن بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ کبھی کسی کوتاہی اور سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور کبھی استاد گرامی سے یہ نہیں کہا کہ اب مجھ سے یہ گائے بکریاں نہیں چرائی جاتیں۔

تمام معتبر تاریخیں اس امر پر گواہ ہیں کہ حضرت خواجہ سلیمانؒ دن بھر حاجی صاحب کے مولیٰ چراتے تھے اور رات کو سبق لیا کرتے تھے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ حضرت خواجہ سلیمانؒ کس طرح اپنا سبق یاد کرتے تھے اور رات میں کتنی دیر جاگتے تھے۔ دیکھنے والوں نے تو بس اتنا دیکھا کہ فجر کی اذان کے وقت وہ چھ سات سالہ بچہ بیدار ہوتا تھا..... پھر وہی بچہ نماز ادا کرتا..... اور اس کے بعد اپنے استاد گرامی کے جانوروں کو لے کر جنگل کی طرف چلا جاتا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ مگر ایک دن حضرت خواجہ سلیمانؒ کو حاجی صاحب کا مکتب بھی چھوڑنا پڑا۔ اس کی وجہ حاجی صاحب کی غصہ ور اور بد مزاج بیوی تھیں، جو بات بات پر شوہر سے بھی لڑتی تھیں اور حضرت خواجہ سلیمانؒ کو بھی ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ وہ بڑا عجیب وقت ہوتا تھا، جب حضرت خواجہ سلیمانؒ دن بھر کی شدید مشقت کے بعد گھر لوٹے، استاد گرامی سے سبق لیتے اور پھر اسے یاد کرنے کی کوشش کرتے۔ اسی دوران حاجی صاحب کی تندہی بولی آ جاتیں اور حضرت خواجہ سلیمانؒ کو کسی دوسرے کام پر لگا دیتیں۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے مولیٰ چراتے میں گامی کوتاہی نہیں برتی۔ لیکن اگر سبق یاد کرنے کے دوران حاجی صاحب کی بیوی کوئی نئی ذمہ داری سپرد کر دیتیں تو آپ کو ان کا یہ طرز عمل ناگوار گزرتا۔ مگر زبان سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ بس اتنا فرماتے۔

”میں اپنا سبق یاد کر کے آپ کا یہ کام بھی انجام دے دوں گا۔“

حاجی صاحب کی بیوی کو تاخیر گوارا نہ ہوتی۔ اور اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ ان کا مخاطب ایک معصوم بچہ ہے اور

بازار کی ضرورت ہے، حضرت خواجہ سلیمانؒ پر بری طرح برس پڑتیں۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ سر جھکائے ان کے بغیر غلط الفاظ سنتے رہے۔ کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا کہ وہ بد مزاج خاتون آخر ان کے استاد گرامی کی بیات تھیں۔

حاجی صاحب کچھ دنوں تک اپنی بیوی کے اس ناروا سلوک کو برداشت کرتے رہے۔ زوجہ کو سمجھانے کی کوشش کر غلط و غضب کی اس چٹان پر غنچہ و گل جیسی باتیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ آخر ایک روز تنگ آ کر حاجی نے اپنے شاگرد کو خلوت میں طلب کیا اور پھر نہایت مشفقانہ لہجے میں کہا۔
”یہ اہم کی دوسرے کتب میں چلے جاؤ۔“

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے استاد گرامی کا حکم سنا اور انتہائی دل گرفتہ لہجے میں عرض کیا۔ ”استاد محترم! کیا مجھ سے چلے ہو گئی ہے؟“

”نہیں۔ تم بہت سعید بچے ہو۔“ حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”میں تم جیسے فرمانبردار شاگرد سے بہت خوش ہوں۔“
”تو ہر آپ مجھے اپنے قدموں سے کیوں جدا کر رہے ہیں؟“ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے غم زدہ لہجے میں عرض کیا۔

”میں تمہاری بھلائی ہے۔“ حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”میں اپنی بیوی کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا، مگر ایک دن کی غلط کو نہیں بدلا جاسکتا۔ جب تم اس کی بد مزاجی کا ہدف بنے ہو تو میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اب مجھ کو یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا قلق رہے گا کہ میں اپنے شاگرد کو مزید درس نہ دے سکا۔“

”آپ ہی فرمائیں کہ میں کہاں جاؤں؟“ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے عرض کیا۔
”سلیمان! تم تو نہ چلے جاؤ۔“ حاجی صاحب نے اپنے ہونہار شاگرد کی رہنمائی کی۔ ”تو نہ میں میاں حسن علی کے گاہ گاہ۔ وہ تمہارے لئے بہتر استاد ثابت ہوں گے۔“

حضرت خواجہ سلیمانؒ، کوہ درگ سے نکل کر تو نہ شریف پہنچے۔ یہاں ایک ”مسجد سفید“ تھی جو تو نہ کے بازار میں واقع تھی۔ میاں حسن علیؒ اسی مسجد میں اپنے طلباء کو درس دیا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے گاہ میں داخل ہوئے تو میاں حسن علیؒ نہایت شفقت سے پیش آئے۔



میاں حسن علیؒ ایک عالم و فاضل انسان تھے۔ مگر ان کے مکتب کا ایک عجیب اصول تھا۔ تمام طلباء جو اس مدرسے میں داخل کرتے تھے، وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے یا تو بھیک مانگا کرتے تھے یا پھر انہیں مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ بعض کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، مگر طالب علموں سے گداگری کرانا، خلاف عقل نظر آتا ہے۔ ایک عالم دین اپنے شاگرد کو بھیک مانگنے کی تعلیم کس طرح دے سکتا ہے؟ کسی تذکرہ نگار یا مؤرخ نے میاں حسن علیؒ کے مدرسے کی عجیب اور مخصوص رسم کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی۔ جس کی وجہ سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے ذہن الجھ رہے ہیں۔ میں اپنی نامص معلومات کے باوجود یہ بات وثوق سے کہتا ہوں کہ میاں حسن علیؒ اس طرح اپنے شاگردوں کی کردار سازی کرتے تھے۔

طالب علموں سے محنت مزدوری کرانے کا مفہوم یہ تھا کہ وہ بچپن سے محنت و مشقت کے عادی بنیں اور آسانی کا ہر لمحہ عمدہ زندگی کی سخت آزمائشوں سے گزر جائیں۔ اب رہا بھیک منگوانے کا سوال، تو یہ بھی ایک قسم کا امتحان

تھا۔ جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے دست طلب دراز کرتا ہے تو اس کی عزت نفس جُروح ہوتی ہے اور یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ میاں حسن علیؒ اپنے بعض شاگردوں کو گداگری پر اس لئے مجبور کرتے تھے کہ وہ ان کے ذوق طلب کی آزمائش کر سکیں۔ اگر کوئی طالب علم اپنی دھن کا پکا ہوتا تو وہ استاد کی بات مانتے ہوئے مشکل سے کر بھیک مانگنے کے لئے گلی گلوچوں میں نکل جاتا..... اور جس کا ذوق طلب خام ہوتا، وہ میاں حسن علیؒ کا مدر چھوڑ کر چلا جاتا۔

رسم گداگری کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس طرح انسانی نفس کی سرکشی ختم ہوتی ہے۔ شرعی طور پر اس رسم کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ مذہب اسلام میں تو بھیک مانگنے کو ایک بڑی لعنت سمجھا جاتا ہے۔ البتہ بعض صوفیاء نے اپنے بکو مریدوں کے دماغوں سے نخوت و کبر کا غبار دھونے کے لئے ان کے ہاتھوں میں کاسے گدائی دے دیا تھا۔ پھر جب ان کے نفس امارہ کا زور ٹوٹ گیا تو انہیں خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھا کر دوسری ریاضتوں پر لگا دیا گیا۔ مگر یہ کہ میاں حسن علیؒ بھی اپنے شاگردوں کی اصلاح اور تربیت کے لئے اسی طریقے کو بروئے کار لاتے ہوں۔ ورنہ ایک مذہبی عالم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی خاص مقصد کے بغیر اپنے شاگردوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کرتا ہو۔ بہر حال، جب حضرت خواجہ سلیمانؒ میاں حسن علیؒ کی درس گاہ میں داخل ہوئے تو استاد نے کہا۔ ”سلیمان! تم تو نہ کی گلیوں میں جا کر بھیک مانگو۔“

حضرت خواجہ سلیمانؒ ایک غیور قوم اور معزز خاندان کے فرد تھے۔ استاد گرامی کا حکم سن کر حیران رہ گئے۔ ”کیا تمہیں گداگری میں کوئی تاثر ہے؟“ میاں حسن علیؒ نے حضرت خواجہ سلیمانؒ کو خاموش پا کر پوچھا۔ ”استاد محترم! میں نے آج تک بھیک نہیں مانگی۔“ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے جھجکتے ہوئے عرض کیا۔ ”مجھے شرم آتی ہے۔“

میاں حسن علیؒ نے بہت غور سے نووارد طالب علم کی طرف دیکھا۔ ”شرم آتی ہے تو پھر کسی دوسرے کتب میں چلے جاؤ۔ اس مدر سے کا تو یہی دستور ہے۔“

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے علم کی طلب میں غریب الوطنی اختیار کی تھی۔ اس لئے کاسے گدائی ہاتھ میں لیا اور درس گاہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ اتفاق سے جو پہلا گھر سامنے پڑا، وہ ایک ہندو، بقال کا تھا۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے دیکھا کہ بقال کی بیوی، چو کے (باورچی خانے) میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے بادل ناخواستہ صدا لگائی۔ ”مائی! اللہ کے نام پر کچھ کھانے کو دو۔“

بقال کی بیوی نے سنی ان سنی کر دی اور روٹی پکانے میں مصروف رہی۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے دوبارہ سوال نہیں کیا۔ بقال کے گھر میں داخل ہوئے اور باورچی خانے سے روٹی اٹھا کر چلے آئے۔ بقال کی بیوی چیختی رہ گئی، مگر آپ نے اس کی آوازوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ رات کو جب شوہر گھر آیا تو بیوی نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ ہندو بقال اسی وقت مدر سے پہنچا اور میاں حسن علیؒ سے ان کے شاگرد کی شکایت کی۔

کچھ دیر بعد ہی میاں حسن علیؒ نے حضرت خواجہ سلیمانؒ کو طلب کر کے سخت لہجے میں کہا۔ ”میاں رو، پہلے ایرتم نے کیا کیا؟ تمہیں گداگری کا حکم دیا گیا تھا، چوری کرنے کے لئے کس نے کہا تھا؟“

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر عرض کیا۔ ”استاد محترم! میں نے عورت سے سوال کیا تھا۔ مگر جب اس نے میری بات نہیں سنی تو میں روٹی اٹھا کر چلا آیا۔“

نے نواز شاگرد کا جواب سن کر میاں حسن علی ہنس پڑے۔ ”روہیلے! تمہیں تو بھیک مانگنی بھی نہیں آتی۔ تم کل دیہات کے لئے نہیں جاؤ گے۔“

دن میاں حسن علی نے حضرت خواجہ سلیمانؒ کو حکم دیا۔ ”روہیلے! تم گداگری کے بجائے مزدوری کرو۔ تمہاری روٹی اور کپڑے کا خرچ نکل سکے۔“

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے استاد گرامی کا حکم سن کر سر جھکا دیا اور تھوڑی دیر بعد در سے مزدوری کی تلاش میں نکلے۔ تیسرے شریف کے علاقے میں تاج خان نامی ایک شخص تھا، جس کی مگرانی میں بہت سے مزدور کام کرتے تھے۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ، تاج خان سے ملے اور اپنا مدعا بیان کیا۔

تاج خان نے بہت غور سے ایک نوجوان طالب علم کو دیکھا اور پھر کام کی شرط بتاتے ہوئے بولا۔ ”لڑکے! یہ تمہاری مزدوری کے دوائے ملیں گے۔“

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے تاج خان کی بات سنی اور مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ مگر پورے دن ایک پتھر پر بیٹے۔ اگر کوئی مزدور کام کرنے کے لئے کہتا تو آپ اس کے پتھر مارتے۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ کا یہ عجیب و غریب عمل دیکھ کر مزدوروں نے ٹھیکیدار تاج خان سے آپ کی شکایت کی۔

تاج خان نے کہا۔ ”اگر وہ مزدوری نہیں کرتے تو انہیں مجبور نہ کرو۔“

پہلے شام آئی اور مزدوروں کو ان کے کام کی اجرت دی جانے لگی تو تاج خان، آپ کے پاس آیا اور دو دوائے لے کر بولا۔ ”لڑکے! یہ ہے تمہاری دن بھر کی مزدوری۔“

حضرت خواجہ سلیمانؒ دوائے لے کر رات کے وقت قصبہ ”مٹگوٹھ“ میں تشریف لائے اور پوری رقم کا آٹا خریدا۔

پہلے ہی روٹیاں پکائیں۔ کچھ خود کھائیں اور باقی فقراء میں تقسیم کر دیں۔

دوسرے دن صبح استاد گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میاں حسن علیؒ نے آپ سے پوچھا۔ ”روہیلے! کل تم مزدوری کی تھی؟“

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے اثبات میں جواب دیا اور سر جھکا لیا۔

”اس کی اجرت کہاں ہے؟“ میاں حسن علیؒ نے اپنے شاگرد سے دوسرا سوال کیا۔

”میں نے دوائے کا آٹا خریدا۔ اس کی روٹیاں پکائیں۔ کچھ خود کھائیں اور باقی دوسرے ضرورت مندوں میں بانٹ دیں۔“ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے بے نیازانہ جواب دیا۔

میاں حسن علیؒ، خواجہ سلیمانؒ کے اس جواب پر برہم ہو گئے اور ڈانٹتے ہوئے بولے۔ ”روہیلے! تمہیں معلوم ہے کہ ایک نلکے قدر ارزاق ہے؟“

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے نہایت سادگی کے ساتھ عرض کیا۔ ”استاد گرامی! واقعہً مجھے معلوم نہیں تھا کہ اتنا اس ارزاق سے مزدوری دیتے وقت مجھ سے تو تاج خان نے یہی کہا تھا کہ دو دوائے سے تمہاری آج رات کی روٹی بجائے گی۔“

اپنے شاگرد کی معصومانہ گفتگوں کو میاں حسن علیؒ نے فرمایا۔ ”اب تم مزدوری پر نہ جانا اور کھانا ہمارے گھر کھا لیتا۔“

اس طرح حضرت خواجہ سلیمانؒ کو فکر روزگار سے نجات حاصل ہوئی اور آپ پوری یکسوئی کے ساتھ تحصیل علم میں غرق ہو گئے۔ پھر میاں حسن علیؒ کی مگرانی میں آپ نے قرآن مجید ختم کیا۔ اس کے بعد ہند نامہ عطار اور حضرت شیخ

علاء الدین محدثؒ کی مغلستان اور بوستان پڑھیں۔



حضرت خواجہ سلیمانؒ، میاں حسن علیؒ کے مکتب میں زیر تعلیم تھے کہ اسی دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ کو ایک کتاب کی ضرورت تھی۔ آپ وہ کتاب خریدنے کے لئے موضع ”سوکڑ“ پہنچے جو تشریف سے جنوب کی طرف دو کوس پر واقع ہے۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے مطلوبہ کتاب خریدی اور جب واپس آنے لگے آپ کی ملاقات ایک بزرگ، میاں نور محمد نارووالہ سے ہوئی۔ میاں نور محمدؒ اس وقت گھوڑے پر سوار تھے۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ کو دیکھ کر نیچے اتر آئے۔ میاں نور محمدؒ کے ایک مرید، میاں احمد کھوکھر، گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ انہیں پیرومرشد کے اس عمل پر سخت تعجب ہوا۔

حضرت میاں نور محمدؒ نے گھوڑے سے اتر کر حضرت خواجہ سلیمانؒ کو سلام کیا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے سلام کا جواب دیا اور بڑی گرجوشی کے ساتھ ایک اجنبی بزرگ سے مصافحہ کیا۔ ”صاحبزادے! اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔“ میاں نور محمدؒ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے حیرت سے اجنبی بزرگ کی طرف دیکھا۔ میاں نور محمدؒ کمزور بھی تھے اور بڑے بھی۔ ”ایک گھوڑے پر دو آدمی کس طرح سوار ہوں گے بزرگ؟“ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے فرمایا۔ ”یہ سواری صرف تمہارے لئے ہے۔“ میاں نور محمد نارووالہ کے لہجے سے گہری عقیدت جھلک رہی تھی۔ ”اور آپ؟“ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے حیرت سے عرض کیا۔ ”میں تمہارے گھوڑے کی لگام پکڑ کر چلوں گا۔“ میاں نور محمد نارووالہ نے فرمایا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“ حضرت خواجہ سلیمانؒ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپ کی بزرگی اور پھر یہ ثقاہت..... مجھے اس کام سے معذور سمجھیں۔“

”یہ اس بوڑھے کی خواہش ہے، صاحبزادے!“ میاں نور محمد نارووالہ نے فرمایا۔ ”اور ایک بوڑھے کی خواہش کی تکمیل، تمہارا فریضہ ہے۔“

میاں نور محمد نارووالہؒ نے کچھ اس انداز سے درخواست کی کہ حضرت خواجہ سلیمانؒ مجبور ہو گئے۔ پھر راہ گیروں نے دیکھا کہ ایک چودہ پندرہ سالہ تومند افغان نوجوان، گھوڑے پر سوار تھا۔ اور ایک اتنی سالہ بوڑھا، گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ راستے سے گزرنے والا ہر شخص، نوجوان کی اس حرکت پر طعنہ زن دکھائی دیتا تھا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ ”لو! کہ تمہیں ایک بوڑھے شخص کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا؟“

حضرت خواجہ سلیمانؒ، راہ گیروں کے طعنوں کا کیا جواب دیتے؟ خاموشی سے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے رہے اور لوگوں کی طنز آمیز باتیں سنتے رہے۔ خود میاں نور محمد نارووالہؒ کے مرید، میاں احمد کھوکھر کو بھی نوجوان پر شدید نفہر تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد میاں احمد کھوکھر اس منظر کو برداشت نہ کر سکے۔ آخر انہوں نے پیرومرشد سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”شیخ! یہ کھیم و کھیم روہیلہ، گھوڑے پر سوار ہے اور آپ اس عالم ضعیفی میں پیدل چل رہے ہیں۔“ میاں نور محمد نارووالہؒ نے شدید غضب ناک نظروں سے اپنے مرید، میاں احمد کھوکھر کی طرف دیکھا اور انتہائی ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔ ”تمہیں اس سے کیا غرض ہے کہ کون گھوڑے پر بیٹھا ہے اور کون پیادہ پا چل رہا ہے میرے پاس سے دور ہو جاؤ اور خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہو۔“

ہاں احمد کوکھر، شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے مگر پیر و مرشد کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

انہیں نور محمد نارود اللہ، تونسہ شریف پہنچے اور نو جوان افغان کو بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ رخصت کیا۔ اس نے میاں نور محمد نارود اللہ کو تھکا دیا تھا۔ اپنے گھر پہنچتے ہی چار پائی پر لیٹ گئے۔ پیر و مرشد کی یہ کیفیت دیکھ کر پیر و مرشد اور خدمت گار دوڑ پڑے اور میاں نور محمد نارود اللہ کے پاؤں دبانے لگے۔

ہاں احمد کوکھر شدید ندامت کی وجہ سے دور کھڑے رہے۔ آخر جب تمام لوگ چلے گئے تو میاں نور محمد نارود اللہ اپنے خادم خاص، میاں احمد کوکھر کو قریب بلایا اور نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔

”تم نے راستے میں مجھ سے جس عقیدت کا اظہار کیا، میں اس سے بہت خوش ہوں۔ ایک مرید کو اپنے پیر و مرشد کے ساتھ ایسی ہی عقیدت ہونی چاہئے۔“

”شاہنشاہ تواب بھی حیران ہوں کہ آپ نے ایک عام سے نو جوان کو اتنی اہمیت کیوں دی؟“ میاں احمد کوکھر نے بت بہ عرض کیا۔

”میاں احمد! وہ کوئی عام نو جوان نہیں۔“ مرید کی بات سن کر میاں نور محمد نارود اللہ نے فرمایا۔ ”تم اس روہیلے کی عظمت و شان کے بارے میں نہیں جانتے۔ کچھ دن بھی نہ گزریں گے کہ ایک جہان اس کی روحانیت کے نور سے نور ہو جائے گا۔ میں نے اس افغان زادے کی اسی روحانیت کا احترام کیا ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں افضل و مآثر کی تم بھی اس کی عظمت و جلال کو تسلیم کرو گے۔ بات یہیں نہیں ٹھہرے گی۔ ایک روز تم اور تمہارے گھر والے اس حلقہ بیعت میں شامل ہو جائیں گے۔“

ہاں احمد کوکھر کو اپنے پیر و مرشد کی بات سن کر بڑی حیرت ہوئی۔

چونکہ بعد میں نور محمد نارود اللہ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی، حضرت خواجہ نور محمد مہاروی، حضرت قریب پر بیعت ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں آپ کے کشف و کرامت کے چرچے عام ہو گئے۔ ہر ایک دن میاں احمد کوکھر بھی حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے اور پھر اسی زمانے کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ خود بھی مرید ہوئے اور اپنے بیٹوں اور خاندان کے دوسرے افراد کو بھی حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کا مرید کرادیا۔ اس وقت میاں احمد کوکھر کی سماعت میں اپنے پیر و مرشد، میاں نور محمد نارود اللہ کے تذکرے رہے تھے۔

”ایک روز تم اور تمہارے گھر والے اسی لڑکے کے حلقہ بیعت میں شامل ہو جائیں گے۔“



میاں علی حسن کے مدرسے میں تعلیم پانے کے بعد حضرت خواجہ سلیمان تونسوی حریذ علم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان پہنچے۔ یہ مقام، تونسہ شریف سے مشرق کی سمت میں پانچ کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں ایک عالم و اہل بزرگ، میاں ولی محمد کا مدرسہ تھا۔ حضرت خواجہ سلیمان نے اسی مکتب میں فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ اس کے بعد آپ کو عربی کی تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ نتیجتاً آپ ”کوٹ مٹھن“ تشریف لائے اور حضرت خواجہ محمد علی کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت حضرت خواجہ عاقل انتقال فرما چکے تھے اور ان کے صاحبزادے قاضی محمد، مدرسے کے مگران تھے۔

حضرت خواجہ محمد عاقل 1151ھ میں بمقام کوٹ مٹھن پیدا ہوئے۔ آپ نے حضرت مخدوم محمد شریف سے تعلیم حاصل کی، جو اپنے وقت کے بہت بڑے محدث تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ حضرت خواجہ نور محمد مہاروی

کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اور شدید ترین ریاضتوں کے بعد پیر و مرشد سے فرقہ خلافت حاصل کیا۔ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے حکم پر حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کئی بار حضرت فخر الدین فخر جہاںؒ کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ پہلی بار جب پیر و مرشد کے ہمراہ دہلی جانے لگے تو پیدل سفر کیا۔ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے وجہ پوچھی تو عرض کیا۔

”میں نے اللہ تعالیٰ نے عہد کیا تھا کہ حضرت شاہ فخر جہاںؒ کی خدمت عالیہ میں پیادہ پا حاضری دوں گا۔ تکمیل عہد کی خاطر حضرت خواجہ محمد عاقلؒ نے مہار سے دہلی تک کا طویل سفر پیدل طے کیا۔

دوسری بار آپ اپنے مرشد سے ملنے کے لئے مہار حاضر ہوئے تو پتہ چلا کہ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ حضرت فخر الدین فخر جہاںؒ کی زیارت کرنے دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت خواجہ محمد عاقلؒ، بیکانیر کے راستے سے دہلی پہنچے۔ آپ حضرت شاہ فخر جہاںؒ کی خدمت میں نذر پیش کرنا چاہتے تھے۔ مگر آپ کے پاس وضو کرنے کے ایک لوٹے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دہلی کی حدود میں حاضر ہو کر حضرت خواجہ محمد عاقلؒ نے چند پیسوں میں اپنا لوٹا فروخت کر دیا اور اس رقم سے حضرت فخر الدین فخر جہاںؒ کے لئے مٹھائی خریدی۔

حضرت فخر جہاںؒ آپ کا یہ جذبہ عقیدت دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس ملاقات میں حضرت شاہ فخر جہاںؒ نے حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کو تصوف کے بعض اہم مسائل سمجھائے اور چار نادر و نایاب کتابیں مطالعے کے لئے عطا کیں۔ حضرت خواجہ محمد عاقلؒ نے سخت ریاضتیں کیں مگر آپ کو ”ذکر بالجبر“ سے عشق کی حد تک شغف تھا۔ (ذکر بالجبر میں حق تعالیٰ کا نام بلند آواز سے لیا جاتا ہے..... اور ذکر خفی میں زبان خاموش رہتی ہے مگر قلب، اللہ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے۔) آخری عمر میں حضرت خواجہ محمد عاقلؒ بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن ”ذکر بالجبر“ اسی پابندی اور زور و شور سے کرتے تھے۔ نواب غازی الدین خان کا بیان ہے۔

”حضرت خواجہ محمد عاقلؒ اتنی بلند آواز سے ذکر کرتے تھے کہ آپ کی آواز ”مہار“ سے شہر فرید تک جاتی تھی۔“ واضح رہے کہ شہر فرید، مہار سے تین چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بڑے سے بڑے طاقتور شخص کی آواز اتنا طویل فاصلہ طے کر کے انسانی سماعتوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ مگر یہ حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کا روحانی تصرف تھا کہ میلوں کی دوری پر رہنے والے لوگ ایک ضعیف و ناتواں درویش کی آواز کو صاف صاف سنتے تھے۔ اور یہی حضرت خواجہ عاقلؒ کی سب سے بڑی کرامت بھی تھی۔

تمام تذکرہ نگاروں نے حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کی زندگی کا یہ عجیب واقعہ تحریر کیا ہے۔ جس سے آپ کے مہر و استقامت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس وقت نواب جے خان خراسانی، اس علاقے کا صوبیدار تھا۔ حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کے بڑے بھائی، قاضی نور محمدؒ نے نواب جے خان سے چند دیہات ٹھیکے پر لئے۔ حضرت خواجہ محمد عاقلؒ ان کے ضامن تھے۔ بعض مجبوریوں کے سبب قاضی نور محمدؒ، ٹھیکے کی رقم ادا نہ کر سکے۔ نواب جے خان کے کارندوں نے حضرت خواجہ محمد عاقلؒ سے مطلوبہ رقم مانگی۔ آپ نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں ایک غریب انسان ہوں۔ اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر قاضی نور محمدؒ کی ضمانت کیوں لی تھی؟“ نواب جے خان کے کارندوں نے سوال کیا۔

”وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔“ حضرت خواجہ محمد عاقلؒ نے جواباً فرمایا۔ ”اگر میں بھی ان کی ضمانت نہیں لیتا تو پھر کون لیتا؟“

”تو پھر تمہیں یہ قانون بھی معلوم ہو گا کہ تمام اونچ نیچ کا ذمہ دار، ضامن ہی ہوتا ہے۔“ نواب جے خان

کارندوں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں تمہیں قید بھی

دینا مجرمہ عاقل نے اثبات میں جواب دیا مگر سرکاری کارندوں سے کسی قسم کی رعایت یا مہلت نہیں مانگی۔
بچے خان خراسانی کے کارندوں نے اپنی طرف سے حضرت خواجہ محمد عاقل کو ایک دو دن کی مہلت دی اور
بچے چلے گئے۔ ”اگر تم نے مقررہ وقت پر مطلوبہ رقم ادا نہیں کی تو پھر کوئی معذرت قبول نہیں کی جائے گی اور
کارندوں کو دیا جائے گا۔“

کارندے، یہ نتیجہ کر کے چلے گئے۔ مگر حضرت خواجہ محمد عاقل نے رقم کے سلسلے میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں
کرائی۔ ان سے ایک گوشے میں بیٹھے ذکر الہی کرتے رہے۔ آپ کو معلوم تھا کہ بڑے بھائی، قاضی نور محمد یہ رقم
نے قاصر ہیں، اس لئے آپ نے ان سے بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔
”غیر وقت گزر گیا اور نواب جے خان خراسانی کے کارندے آپہنچے۔“ رقم ادا کرو گے یا جیل جانا پسند کرو
کارندوں نے درشت لہجے میں کہا۔

رقم کی ادائیگی میری استطاعت سے باہر ہے۔ اس لئے مجھے قید خانے لے چلو۔“ حضرت خواجہ محمد عاقل نے
بہرہ وکلن سے فرمایا۔

کارندے آپ کو بیڑیاں پہنا کر قید خانے لے گئے اور زنداں کی تاریکیوں کے حوالے کر دیا۔
بھائی، قاضی نور محمد کو خبر ہوئی تو وہ سیدھے جیل پہنچے اور شکایت آمیز لہجے میں بولے۔ ”عاقل! تم نے مجھ
بات کا ذکر تک نہیں کیا۔“

نائب امرا الہی تھا۔ پھر کسی سے کیا ذکر کرتا؟“ حضرت خواجہ محمد عاقل نے فرمایا۔ ”رقم کی ادائیگی پر آپ کو اختیار
نہا اگر میں ان سارے معاملات کا ذکر کر دیتا تو آپ اور پریشان ہو جاتے۔ آخر بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی
بڑا ہے۔“

مرث خواجہ محمد عاقل کا جواب سن کر قاضی نور محمد رونے لگے۔

مرث خواجہ محمد عاقل نے نو ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں نہایت خوش دلی کے ساتھ برداشت کیں اور ایک دن بھی
کارندوں کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ آپ کا سارا وقت، عبادت میں گزرتا تھا۔

بآپ کے پیرو مرشد کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو حضرت خواجہ نور محمد مہاروی نے اپنے خادم خاص کو چند
دو ٹاف بنا کر قید خانے بھیجا۔

”مرد مرشد کا حکم ہے کہ تم یہ دو ٹاف پڑھا کرو۔ انشاء اللہ! بہت جلد قید سے رہائی پاؤ گے۔“

مرث خواجہ محمد عاقل نے حضرت خواجہ نور محمد مہاروی کے تحریر کردہ دو ٹاف لے لئے مگر ان کا ورد نہیں کیا۔

لیکن کسی ساتھی قیدی نے آپ سے پوچھا۔ ”شیخ! آپ اپنے پیرو مرشد کے عطا کردہ اوراد و دو ٹاف کیوں
پڑھتے؟ یہ تو کھلی ہوئی نافرمانی ہے۔“

”یہ نافرمانی ہرگز نہیں ہے۔“ حضرت خواجہ محمد عاقل نے نہایت پر جلال لہجے میں جواب دیا۔ ”میں اپنے مرشد

پر ایمان بھی دے سکتا ہوں۔“

”اب آپ دغیفہ پڑھنے سے گریزاں کیوں ہیں؟“ قیدی ساتھی نے پوچھا۔

مرث خواجہ محمد عاقل نے انتہائی پرسوز لہجے میں فرمایا۔ ”مجھے اپنی رہائی کے لئے کلام الہی پڑھتے ہوئے شرم

آتی ہے۔ میں نے جرم کیا ہے تو مجھے اس کی سزا کتنی ہی چاہئے۔“

جب حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کو خلافت سے سرفراز فرمایا تو آپ ایک عربی ”ذکر“ میں مشغول رہے اور ”سلسلہ نظامیہ“ کی تعلیمات کو عام کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ جب حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو آپ نے حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کے نام ایک خط تحریر کیا، جس کے الفاظ بہت سخت تھے۔

”خواجہ عاقل! مجھے اس بات کا جواب دو کہ تم اپنے سلسلہ روحانی کو عام کیوں نہیں کرتے؟ میں تمہیں آخری ہدایت کر رہا ہوں کہ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں تمہاری اس کوتاہی کی خبر، حضرت شاہ فخر جہاں، تک پہنچا دوں گا۔“

پیر و مرشد کا خط پڑھ کر حضرت خواجہ محمد عاقلؒ نے جواباً عرض کیا۔ ”کون ہے جو اس مقصد کے لئے میرے پاس آیا ہو اور میں نے اس سے انکار کیا ہو؟ اگر مرضی مبارک ہو تو میں خود لوگوں سے کہوں۔“

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کا خط پڑھا تو جوش میں آ کر فرمایا۔ ”میاں صاحب! ایک دن وہ آئے گا کہ فرشتے آسمان پر تمہارے نام کی منادی (اعلان) کریں گے..... اور مخلوق خدا، مشرق و مغرب سے آ کر تمہارے آستانے پر حاضری دے گی۔ سبحان اللہ! تم یہ کہتے ہو کہ میرے پاس کوئی نہیں آتا۔“

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کا یہ فرمانا تھا کہ خاص و عام، حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کی طرف متوجہ ہو گئے اور آپ کے آستانہ عالیہ پر انسانوں کا ہجوم رہنے لگا۔

حضرت خواجہ محمد عاقلؒ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ مغرب کی نماز کے بعد ذکر میں مشغول ہو جاتے تھے۔ پھر کھانا کھاتے اور عشاء کی نماز، جماعت کے ساتھ ادا فرماتے۔ نماز عشاء کے بعد عیدوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہو جاتا، جو آدھی رات تک جاری رہتا۔ تہجد کی نماز ادا کرنے کے بعد ذکر بالجہر کرنے اور قرآن مجید کی تلاوت فرماتے۔

حضرت خواجہ محمد عاقلؒ ہر حال میں شریعت اور سنت کا اتباع کرتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کو سرور کوئین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے بے پناہ عشق تھا۔

وفات سے چند روز پہلے حضرت خواجہ محمد عاقلؒ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ برکاتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

”تم نے ہماری سنتوں کو زندہ کر کے ہمیں بے حد خوش کیا ہے۔“

اس خواب کے بعد حضرت خواجہ محمد عاقلؒ بہت سرشار رہا کرتے تھے..... اور آخری سانس تک فرماتے تھے۔

”آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کی سند بخش دی ہے..... اب مجھے اپنی نجات کی کوئی فکر نہیں ہے۔“

حضرت خواجہ محمد عاقلؒ چار ماہ بیمار رہے۔ وفات کے دن آپ نے فرمایا۔ ”آج کے روز میں نے سز کی تمام تکالیف برداشت کر لیں۔ بہت ہی اچھا ہوا کہ میں اللہ کے فضل سے منزل تک پہنچ گیا۔“

حضرت خواجہ محمد عاقلؒ نے 4 رجب 1129ھ کو انتقال فرمایا۔

مغل شہنشاہ اکبر ثانی، حضرت خواجہ محمد عاقلؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے شہزادہ جہاں خرد اور کاؤس شکوہ کو آپ کے حلقہ ارادت میں شامل کرایا تھا۔

بہادر شاہ ظفر بھی آپ کے ادنیٰ نیاز مندوں میں شامل تھا۔ مغل شہنشاہ نے ایک شعر میں اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

دل فدا کرتے ہیں نام فخر دیں پر اے ظفر
ہم ہیں عاقل، ربط عاقل سے دلی رکھتے ہیں ہم
اُڑی سے حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں مراد ہیں۔ اور عاقل سے مراد حضرت خواجہ محمد عاقل ہیں۔
حضرت خواجہ محمد عاقل کو درس و تدریس اور مکتب قائم کرنے کا بے حد شوق تھا۔ آپ نے کوٹ مٹھن میں بھی
بہت بڑا مدرسہ قائم کیا تھا..... اور حضرت خواجہ سلیمان تونسوی اسی مدرسے میں عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے
آئے تھے۔



حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے حضرت خواجہ محمد عاقل کے صاحبزادے قاضی علی احمد سے عربی درسیات اور فقہ
مہم حاصل کی۔

حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کو ابتدا ہی سے شریعت کا بہت خیال رہتا تھا۔ اگر کسی کو خلاف شریعت عمل کرتے
دیکھتے تو بہت رنجیدہ ہو جاتے۔ اور نو عمری کے باوجود آپ اس شخص کو نصیحت کرتے۔ یہ اس زمانے کا قصہ
ہے کہ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کی عمر مبارک بمشکل چودہ پندرہ سال ہوگی اور آپ حضرت خواجہ محمد عاقل کے
میں زیر تعلیم تھے۔ ایک روز آپ کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھے کہ ایک ہم کتب ساتھی نے آکر کہا۔
”سلیمان! تماشاً دیکھنے چل رہے ہو؟“

حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور حیرت زدہ لہجے میں
کہا۔ ”کیا تماشاً؟“

”کوٹ مٹھن کے بازار میں ایک لڑکا رقص کر رہا ہے۔“ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے ساتھی نے کہا۔

”لڑکے بھی رقص کرتے ہیں؟“ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

”وہ لڑکا، عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کر کے سر بازار ناچ رہا ہے۔“ ساتھی نے وضاحت کی۔

ایک لڑکے کے رقص کرنے کی خبر سن کر حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔ آپ نے ہاتھ
کتاب رکھ دی اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہم ابھی اس بد بخت کا علاج کرتا ہوں۔“

غور کی دیر بعد حضرت خواجہ سلیمان تونسوی اس حالت میں کوٹ مٹھن کے بازار کی طرف روانہ ہو گئے کہ آپ
ہات مبارک میں ایک تیز چٹنی تھی۔

حضرت خواجہ سلیمان کا ساتھی آپ کے اس طرز عمل پر حیران تھا۔ ”سلیمان! تم اس لڑکے کا علاج کس طرح کرو
گے؟“

”تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کہ میں اس کا علاج کس طرح کرتا ہوں۔“ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے تیز
اُڑی کے ساتھ چلتے ہوئے فرمایا۔

ہر جب آپ اپنے ہم کتب کے ہمراہ کوٹ مٹھن کے بازار میں پہنچے تو وہ خوب صورت لڑکا ناچ رہا تھا اور
گراں تماشائی اس کے رقص سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی، بھیڑ کو ہٹاتے ہوئے
گھر سے اور لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”اے بد بخت! تجھے معلوم ہے کہ تُو کتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے؟“

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کا لہجہ اس قدر جلال تھا کہ تماشائی چونک اٹھے اور ناپنے والا لڑکا ہم کر گھریا۔
 ”کیسا گناہ؟“ رقص لڑکے نے بڑی حیرت سے اس نوجوان کی طرف دیکھا، جو اسی کا ہم عمر تھا۔
 ”عورتوں کی طرح شکل بنانا ایک گناہ۔ اور رقص کرنا دوسرا گناہ۔“ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے غضب لے لہجے میں فرمایا۔

”یہ لوگ نہیں جانتے کہ میں گناہ کر رہا ہوں۔“ رقص لڑکے نے تماشائیوں کے ہجوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں ان لوگوں کو کیا کہوں؟“ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے انسانی ہجوم کی طرف نظر کرتے ہوئے فرمایا۔
 ”یہ لوگ تو خوفِ خدا سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔“

”پھر تم خدائی فوج دار بن کر کہاں سے آ گئے؟“ رقص لڑکے نے تیز لہجے میں کہا۔
 ”مجھے حکم ہے کہ اگر میں طاقت رکھتا ہوں تو گناہ کو روک دوں۔“ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے فرمایا اور آگے بڑھ کر رقص لڑکے کی ایک طرف کی زلفیں کاٹ دیں۔ ناپنے والا لڑکا بہت زور سے چیخا۔ اس کے کان سے خون بہہ رہا تھا۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے غور سے دیکھا تو زلف کے ساتھ لڑکے کے کان کا ایک حصہ بھی کٹ گیا تھا۔ بازار، رقص کی دلدوز چیخوں سے گونجتا رہا اور حضرت خواجہ سلیمانؒ اسے متنبہ کرتے ہوئے با آواز بلند فرماتے رہے۔
 ”اگر تُو نے ناچنا نہیں چھوڑا تو میں دوبارہ آؤں گا۔“

پورا مجمع دم بخود تھا۔ تماشائیوں پر حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کا ایسا رعب طاری ہوا کہ ہر شخص اپنی جگہ کی جگہ کی طرح ساکت کھڑا رہا۔

واپسی میں حضرت خواجہؒ کے ساتھی نے پوچھا۔ ”سلیمان! تم اتنے بڑے ہجوم سے خوف زدہ نہیں ہوئے؟“
 ”اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کرتے وقت میرے دل میں کوئی دوسوہ پیدا نہیں ہوا۔“ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے فرمایا۔
 اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نو عمری کے باوجود نہ صرف شریعت کے پاس تھے، بلکہ مذہبی احکام کے نفاذ میں غیر معمولی جرأت و شجاعت کا مظاہرہ بھی کرتے تھے۔



حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ ذاتی طور پر سماع کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ کے استاد گرامی، قاضی علی احمدؒ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ سے بیعت تھے..... اور حضرت خواجہ نور محمدؒ سماع سے بے حد شغف رکھتے تھے۔ جب کبھی قاضی علی احمدؒ اپنے مرشد کی مجلس سماع کا ذکر فرماتے تو حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ، استاد محترم سے ایک سوال کرتے۔

”جب مذہب میں سماع جائز نہیں تو آپ کے پیرو مرشد ایسی مجلسیں کیوں آراستہ کرتے ہیں؟“
 حضرت قاضی علی احمدؒ اپنے نو عمر شاگرد کا سوال سنتے مگر کوئی جواب نہ دیتے۔ پھر جب حضرت خواجہ سلیمانؒ تونسویؒ زیادہ اصرار کرتے تو استاد گرامی فرماتے۔ ”جب قبلہ عالم یہاں تشریف لائیں گے تو تم خود ہی ان سے پوچھ لینا کہ وہ سماع کیوں سنتے ہیں؟“

پھر ایک روز حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ، اوج شریف (بہاول پور) تشریف لائے۔ قاضی علی احمدؒ، ہیرام کے دیدار کے لئے حاضر ہوئے تو ان کے ہمراہ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ بھی تھے۔ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ چہرہ مبارک پر نظر پڑتے ہی حضرت خواجہ سلیمانؒ سب کچھ فراموش کر بیٹھے اور ہمیشہ کے لئے اسی آستانے کے

ہوئے۔

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے حضرت خواجہ سلیمانؒ کو حضرت سید جلال الدین بخاریؒ (مخدوم جہانیاں جہاں نما کے مزار مبارک کے احاطے میں بیعت سے سرفراز فرمایا۔ پھر دو تین دن بعد حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ ہائیف سے اپنے وطن مہاروانہ ہو گئے۔ روانگی سے پہلے حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے حضرت خواجہ سلیمانؒ کو اپنے ہونے فرمایا۔

”سلیمان! تم پہلے یہاں سے دہلی جاؤ اور حضرت شاہ فخر جہاںؒ کی خدمت میں حاضری دو۔ پھر میرے پاس رات“

حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاںؒ نے حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کو ہدایت فرمائی تھی کہ کسی طرح کوہستانی نواز کو اپنے دام میں اسیر کرو۔ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے برسوں اس شہباز کی جستجو کی اور جب حضرت خواجہ بہانؒ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تو حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کی کوششیں باب ہوئیں۔ حضرت خواجہ نور محمدؒ نے حضرت خواجہ سلیمانؒ کو اسی لئے حضرت فخر جہاںؒ کی خدمت میں بھیجا تھا کہ پورٹھالی شہباز کو اپنی چشم مبارک سے دیکھ لیں..... اور دوسری طرف حضرت خواجہ سلیمانؒ بھی ایک مرد کامل کی مدد سے فیض یاب ہو جائیں۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ 1199ھ میں دہلی روانہ ہوئے۔ اس وقت شدید گرمی کا موسم تھا۔ آپ دلاور اور جودھپور ہوئے ابھیر شریف پہنچے اور سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک پر حاضری دی۔ ان کے بعد جے پور اور یواڑی کے راستے سے دہلی میں حاضر ہوئے۔ اس طویل سفر میں حضرت خواجہ سلیمانؒ کوئی نو سو کی تختیاں اور راستے کی بے شمار صعوبتیں برداشت کیں مگر حضرت فخر الدین فخر جہاںؒ کے شوق دیدار نمائے بڑی سے بڑی تکلیف کا احساس تک نہیں کیا۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ تو نسویؒ کی خوشی ناقابل بیان تھی مگر جب آپ حضرت فخر الدین فخر جہاںؒ کی خانقاہ میں آئے تو آپ کو ایک جاگندہ خبر، آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ کے دہلی پہنچنے سے تین دن پہلے حضرت مولانا فخر جہاںؒ وصال فرما چکے تھے۔ آپ اپنی محرومی پر بہت دل گرفتہ ہوئے، مگر صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آنحضرت خواجہ سلیمانؒ تو نسویؒ نے اپنی محرومی کا اس طرح ازالہ کیا کہ حضرت شاہ فخر جہاںؒ کے مزار مبارک پر پہلی روز تک معذرت رہے۔ اس کے بعد آپ پیر و مرشد کے حکم کے مطابق مہار شریف حاضر ہوئے اور مختلف باتوں اور مجاہدوں میں مشغول ہو گئے۔



حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ اپنے تمام مریدوں میں سب سے زیادہ آپ پر توجہ فرماتے تھے۔ خود حضرت خواجہ بہانؒ تو نسویؒ کو بھی اپنے پیر و مرشد سے اس قدر عشق تھا کہ ان جذبات کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ایک نئے نئے بھی حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر عشق کی یہ کیفیت اس قدر بڑھی کہ حضرت خواجہ سلیمانؒ والدہ ماجدہ کو یہ اطلاع دینا بھی بھول گئے کہ آپ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ جب ایک طویل عرصے تک مادر مہربان کو اپنے بیٹے کی کوئی خبر نہیں ملی تو وہ حضرت خواجہ سلیمانؒ کی تلاش میں گڑ گوجی سے سو کر تشریف لائیں۔ جب یہاں بھی آپ کا کوئی پتہ نہ ملا تو والدہ محترمہ نے اپنے داماد کو فرزند کی تلاش میں آگے روانہ کیا۔ آخر حضرت خواجہ سلیمانؒ تو نسویؒ کے بہنوئی، آپ کی جستجو کرتے کرتے مہار شریف پہنچ گئے۔

”آپ یہاں کیسے؟“ بہنوئی کو دیکھ کر حضرت خواجہ سلیمانؒ حیران ہوئے۔

”تمہیں خبر بھی ہے کہ اُم محترم، تمہاری جدائی میں کس قدر مضطرب اور پریشان ہیں؟“ بہنوئی نے والدہ محترمہ کی بے قراری کی کیفیت بیان کی تو حضرت خواجہ سلیمانؒ غمزدہ ہو گئے۔

پھر آپ پیر و مرشد سے اجازت لے کر مادر گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ حضرت خواجہ سلیمانؒ کو پیر و مرشد کی یاد ستانے لگی۔ آپ نے مہار شریف دہلی جانے کی اجازت طلب کی تو مادر گرامی نے فرمایا۔

”سلیمان! تم جانتے ہو کہ میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔“

والدہ محترمہ کا جواب سن کر حضرت خواجہ سلیمانؒ خاموش ہو گئے۔ مگر آپ کے چہرہ مبارک سے شدید اضطراب کی کیفیت نمایاں تھی۔ جب کچھ عرصے تک آپ کی یہی حالت رہی تو ایک روز والدہ ماجدہ نے دریافت کیا۔

”سلیمان! آخر تم کیا چاہتے ہو؟“

”اُم محترم! آپ میری گفتگو کو خوب جانتی ہیں۔ نہ میں آپ کے بغیر رہ سکتا ہوں اور نہ پیر و مرشد کی جدائی برداشت کر سکتا ہوں۔“ حضرت خواجہ سلیمانؒ تو تسوئی نے سر جھکائے، ادب سے عرض کیا۔

آخر والدہ محترمہ نے بیٹے کی روحانی تربیت کے لئے اپنے دل پر پتھر رکھ لئے اور اس شرط کے ساتھ دہلی جانے کی اجازت دے دی کہ آپ ایک ایک ماہ میں ایک بار ضرور گڑگوچی آیا کریں گے۔ پھر حضرت خواجہ سلیمانؒ تو تسوئی کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ آپ ایک ماہ تک پیر و مرشد کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور اس کے بعد کچھ دنوں کے لئے اپنے آبائی وطن پہنچ کر والدہ محترمہ کے دیدار سے شرف یاب ہوتے تھے۔

پیر و مرشد سے آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اکثر مہار شریف پیدل روانہ ہو جاتے اور راستے کی تمام تکالیف فنی خوشی برداشت کرتے۔ ایک بار ایک سفر کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت خواجہ سلیمانؒ تو تسوئی نے فرمایا۔

”دسوں ناخن میرے پیروں سے جدا ہو گئے۔“

یہی وہ جذبہ عقیدت تھا، جس نے حضرت خواجہ سلیمانؒ تو تسوئیؒ کو اپنے پیر و مرشد، حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی نظروں میں محبوب بنا دیا تھا۔



مہار شریف میں حضرت خواجہ سلیمانؒ تو تسوئیؒ کا قیام، مسجد خدا بخش میں تھا۔ آپ بیشتر وقت عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن پیر و مرشد کی زیارت اور حصول علم کے لئے روزانہ بڑی پابندی کے ساتھ خانقاہ عالیہ میں حاضر ہوتے تھے۔

کبھی کبھی حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ بھی اپنے مرید کی دلجوئی اور دلداری کے لئے مسجد خدا بخش تشریف لے جاتے۔ ایک دن حضرت خواجہ سلیمانؒ تو تسوئیؒ مسجد کے محن میں بیٹھے، بڑی خوش الحانی کے ساتھ دیوان حافظ پڑھ رہے تھے کہ اچانک حضرت خواجہ نور محمدؒ تشریف لے آئے۔ پیر و مرشد کو دیکھ کر آپ شرم سے خاموش ہو گئے۔

”میاں سلیمان! کیا پڑھ رہے تھے؟“ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔

پیر و مرشد کے حکم پر حضرت خواجہ سلیمانؒ تو تسوئیؒ نے حافظ شیرازی کا یہ شعر سنایا۔

”مشاطہ (آراستہ کرنے والی عورت) کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ بد صورت کو بھی خوب صورت بنا دیتی ہے۔“

(ترجمہ)

اور مذہبی شعریں کر بہت خوش ہوئے۔ ”میاں سلیمان! ہم سے بھی ایک شعر سن لو۔“ پھر حضرت خواجہ نور محمد نے یہ شعر پڑھا۔
 ”بت کہہ کہ کٹو بوڑھا ہو گیا ہے اور تیرا ذوقِ عشق باقی نہیں رہا۔ تجھے کیا خبر کہ ہماری پرانی شراب کچھ اور ہی پانی ہے۔“ (ترجمہ)



حضرت خواجہ سلیمان تونسوی تقریباً سولہ سال کی عمر میں حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے دستِ حق پرست پر آئے۔ آپ چھ سال تک اپنے پیر و مرشد کی خدمتِ عالیہ میں رہے اور علومِ ظاہری کے ساتھ روحانی تربیت حاصل کرتے رہے۔ بائیس سال کی عمر میں حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔
 اگلے بعد پیر و مرشد نے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کو حکم دیا کہ تونسہ میں قیام فرمائیں اور رشد و ہدایت کی راہِ راستہ کریں۔ تونسہ شریف، ڈیرہ غازی خان سے تیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس وقت یہ چھوٹا سا ایک علاقہ تھا۔ حضرت خواجہ سلیمان، تونسہ پہنچے اور ایک جھونپڑی ڈال کر اس میں رہنے لگے۔ پھر جب اس علاقے کا پتہ خان، آپ کے حلقہٴ ارادت میں شامل ہوا تو اس نے عرض کیا۔

”مخترم! میری خواہش ہے کہ میں آپ کے لئے ایک مکان تعمیر کرادوں۔“

”کان تو موجود ہے۔“ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے اپنی جھونپڑی کے در و دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”پھر اصراف بے جا کی کیا ضرورت ہے۔“

”حضرت! خار و خس کی یہ جھونپڑی، موسم کی سختیوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔“ الف خان نے اپنی خواہش کے حق میں مضبوط دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔

”میری نظر میں قصر زرنگار اور یہ جھونپڑی دونوں برابر ہیں۔“ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے درویشانہ بے پناہی کے ساتھ فرمایا۔ ”بلکہ اس خار و خس کے مکان میں مجھے زیادہ آرام ہے۔“

الف خان، اپنے پیر و مرشد سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے انکار کے انکار کے بعد اپنے پختہ مکان تعمیر کرادیا۔



مذکرہ نگاروں نے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے تونسہ شریف میں سکونت اختیار کرنے کے تین اسباب بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے آپ کو حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

”تمہارے رہنے کے لئے کوہستان کا علاقہ مناسب نہیں ہے۔ وہاں ہر شخص خود مختار ہے۔ ایسے لوگوں کی مجلس میں شورشِ زیادہ ہوتی ہیں اور سکون کم۔ اسی لئے تم کسی ایسی جگہ رہائش اختیار کرو، جہاں مکمل اطمینان کی فضا ہو۔“

بعض مؤرخین کے مطابق حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ نے کسی پُر سکون علاقے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے ذاتی طور پر تونسہ شریف کا انتخاب کیا۔ بہر حال، حقیقت کچھ بھی ہو، حضرت خواجہ سلیمان نے اپنی اہل خانہ کو چھوڑ کر تونسہ شریف کو اپنا مستقل مسکن بنالیا اور اپنے وجودِ مسعود سے اس گناہ اور چھوٹے سے مکان کو شہرت و اہم بخش دی۔

مذکرہ نگاروں نے ترکِ وطن کی دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلسلہٴ نظامیہ کی خلافت سے سرفراز

ہونے کے بعد حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے اپنے آبائی وطن گڑگوجی میں قیام فرمایا اور مجلس روحانیت آراستہ کی۔ جب طالبانِ حق کو خبر ہوئی کہ ایک مردِ حق، مادہ پرستی کی تیز آندھیوں میں چراغِ معرفت جلا رہا ہے تو صاحبانِ دل کے قافلے دور دراز علاقوں سے نکل کر گڑگوجی کی طرف بڑھنے لگے۔ یہاں کے راستے اس قدر خطرناک تھے کہ اکثر مسافروں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر حضرت خواجہ سلیمانؒ نے ترکِ وطن کیا اور تونہ میں قیام فرمایا۔

ترکِ وطن کا تیسرا سبب یہ تھا کہ جب حضرت خواجہ سلیمانؒ، خلافت سے سرفراز ہو کر اپنے وطن گڑگوجی تشریف لائے اور لنگر جاری کیا تو آپ کی قوم کے لوگ اس ہر دلچیزی اور محبوبیت سے حسد کرنے لگے۔ یہاں تو ہر دمنا میں بونے اقتدار تھی اور ہر سر میں حکومت کا سودا سایا ہوا تھا۔ اس لئے ایک مردِ درویش کی مقبولیت کیسے برداشت کرتے؟ نتیجتاً کچھ مقامی لوگ، حضرت خواجہ سلیمانؒ کے درپے ایذا ہو گئے۔ مجبوراً آپ نے گڑگوجی سے ہجرت کی اور تونہ چلے آئے۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ کے قدم رکھتے ہی اس بے رونق زمین کی قسمت ہی بدل گئی۔ اور دُور دُور سے لوگ وہاں آکر آباد ہونے لگے۔



تونہ شریف میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد طالبانِ حق کا ہجوم یہاں تک بڑھا کہ خراسان اور عرب و عجم کے لوگ بھی آنے شروع ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں حضرت خواجہ سلیمانؒ کو لنگر خانے کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آپ نے پیارا نامی ایک ہندو، بقال کو لنگر خانے کا موادی مقرر کیا۔ موادی اُس شخص کو کہتے ہیں، جو ادائیگی کرتا ہے۔ ساری رقوم پیارا کے پاس جمع ہوتی تھیں، جو بہت غریب انسان تھا۔ صدیق محمد نامی ایک شخص، منشی کے عہدے پر فائز تھا۔ لنگر خانے میں قیام کرنے والوں کی خدمت کے لئے مقامی نیل گروں (رنگ ریزوں)، دھوپوں، لوہاروں اور دوسرے پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو مقرر کیا۔ اس کے علاوہ ایک حکیم کو بیماروں کے علاج کے لئے مقرر فرمایا۔

موادی کو حکم دیا گیا کہ جب بھی تمہارے پاس کوئی مریض، نسخہ لے کر آئے، اسے کسی اجازت کے بغیر دواؤں کے لئے رقم فراہم کی جائے۔

خدا بخش لاگری، لنگر خانے کے منتظم تھے۔ ایک دن خدا بخش لاگری نے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ سے عرض کیا۔ ”شیخ! اس بار فقراء کی دواؤں پر بہت زیادہ خرچ ہو گیا ہے۔“

یہ سن کر حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کی پیشانی مبارک پر بل پڑ گئے۔ ”کتنا خرچ ہوا، میرے درویشوں پر؟“ ”موادی کے دفتر میں سات سو روپے کا حساب آیا ہے۔“ خدا بخش لاگری کو خمدوم کی برہی کا اندازہ ہو گیا تھا، اس لئے انہوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

جیسے ہی خدا بخش لاگری کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے نہایت غصہ ناک لہجے میں فرمایا۔ ”کیا میں نے تم لوگوں سے یہ نہیں کہا تھا کہ اس سلسلے میں میری طرف سے کسی اجازت اور حکم کی ضرورت نہیں؟“

خدا بخش لاگری نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کا غصہ عروج پر تھا۔ ”خدا بخش! تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم درویشوں کی دواؤں کا حساب مجھ سے بیان کرتے ہو۔ میرے سامنے سے دُور ہو جاؤ۔“

دیش کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، کانپتے قدموں کے ساتھ واپس جانے لگا تو نابھ سلیمان تونسویؒ نے اسی برہمی کے عالم میں فرمایا۔

اگر قرہ کی دواؤں پر سات ہزار روپے ماہانہ بھی خرچ ہوں تو مجھے اطلاع نہ دو۔ درویشوں کی جان کے بدلے میرے کی کوئی حیثیت نہیں۔“

نابھ قیام کرنے والے درویشوں کے لئے روزانہ تین پاؤ آٹے کی روٹی مقرر تھی۔ چھ ماہ میں ہر درویش کے لئے بنائے جاتے تھے..... اور جب جوتے پرانے ہو جاتے تو نئے لادئے جاتے تھے۔

جب میں جوعلاء، مدرس کے منصب پر فائز تھے، ان کے لئے ایک سیراناچ مقرر تھا۔ ہر ایک کو ماہانہ ایک سیرانہ مل دیا جاتا تھا۔ ہر چھ ماہ بعد ان کے لئے جوڑے بنائے جاتے تھے۔ ہر عالم کے لئے سالانہ ایک بکری اور بکری کی گئی تھی۔

اگر کسی عالم یا درویش کی شادی ہوتی تو حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ اپنے دست مبارک سے رقم عطا فرماتے۔ حسب لیاقت ہوتی جو دس روپے سے چار سو تک ہوتی۔ شادی کا سامان، زیور اور پوشاک علیحدہ سے مرحمت کیا۔ ہر ایک دن وہ بھی آیا کہ آپ کے آستانہ عالیہ پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔ نتیجتاً حضرت خواجہ بن تونسویؒ کے مکان کے شمالی اور جنوبی دروازے کھول دیئے جاتے تھے۔ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوتے اور دوسرے دروازے سے نکل جاتے۔



ہندوستانی ریاستوں کے نواب اور جاگیردار، آپ کی بارگاہ کرم میں حاضری دینے کو اپنی زندگی کی بہت بڑی بات سمجھتے تھے۔ اکثر نوابین اور جاگیردار، گدی پر بیٹھتے وقت آپ ہی کے دست مبارک سے دستار بندھواتے اور بڑائی اقتدار و عمر کے لئے آپ سے دعا کراتے۔ علی گڑھ تحریک کے بانی، سر سید احمد خان نے آپ کا زمانہ یاد رکھا ہے۔ اس لئے سید صاحب فرمایا کرتے تھے۔ ”حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کی شہرت قاف سے قاف نہ ہے۔ یہ ایک محاورہ ہے۔ جس کا مفہوم ہے، حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کی شہرت دنیا بھر میں تھی۔“

افغانستان کا حکمران، شاہ شجاع الملک بھی حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ پھر جب شاہ الملک گردش تقدیر کے زیر اثر، کاہل کے اقتدار سے محروم ہو گیا تو ایک دن حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

حضرت شجاعؒ نے ازراہ مہمان نوازی، شجاع الملک کو اپنے مُصلے پر بٹھالیا اور اس کی آمد کا سبب دریافت کیا۔ شجاع الملک نے اپنے زوال کا قصہ سنا دیا۔ کاہل کے اقتدار سے محروم ہو کر وہ ہندوستان میں پناہ گزین ہو گیا۔ انہوں نے انگریزوں اور ہندوستان کے مقامی نوابوں سے مدد لے کر دوبارہ کاہل فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ بالآخر لے کر کاہل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ راستے میں حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کی خانقاہ پڑتی تھی۔ شجاع الملک نے آپ کی بہت شہرت سنی تھی۔ اس لئے دعا کرانے کی غرض سے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

حضرت شجاعؒ نے شجاع الملک کے تمام حالات سننے کے بعد فرمایا۔ ”شاہ شجاع! تم کس کی پناہ میں جا رہے ہو؟“ کہن دل خان اور پردل خان، طاقتور افغان سردار تھے۔ ان دونوں نے شجاع الملک کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے شجاع الملک سے تین بار ایک ہی سوال کیا۔ ”شاہ شجاع! تم کس کی حمایت میں جا رہے ہو؟“

رہے ہو؟“

اگر وہ کہہ دیتا کہ میں اللہ کی پناہ میں جا رہا ہوں تو نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ مگر شجاع الملک کو انگریزوں اور افغان سرداروں کی حمایت پر بہت زیادہ بھروسہ تھا، اس لئے وہ بار بار ان ہی کے ناموں کی گردان کرتا رہا۔ شاہ شجاع الملک کی روداد سن کر حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے فرمایا۔ ”اللہ بے نیاز ہے۔ وہ جس طرح چاہے اپنے بندوں کو سرفراز کر دے۔“ حضرت شیخؒ نے شجاع الملک کو مبہم سی تسبیحہ فرمائی۔ ”حاضرین مجلس بھی حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے الفاظ پر دھیان نہ دے سکے۔

پھر جب شجاع الملک، خانقاہ سے اٹھ کر چلا گیا تو حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اب تک اس کی تقدیر کی گردش دُور نہیں ہوئی اور مستقبل میں بھی ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ کیونکہ شاہ شجاع اللہ کے بجائے کہن دل اور پُر دل خان پر بھروسہ رکھتا ہے۔“

شاہ شجاع الملک کی مختصر سرگزشت یہ ہے کہ وہ محمود شاہ کو معزول کرنے کے بعد تخت نشین ہوا۔ شیر محمد خان اس کا معمر وزیر تھا۔ مگر جب شجاع الملک نے ایک بزرگ شخصیت، میر واعظ کو قتل کر دیا تو شیر محمد خان اس کا مخالف ہو گیا۔ پھر جب شجاع الملک، حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کی خانقاہ میں حاضری دے کر پشاور کی طرف روانہ ہوا تو شیر محمد خان اسے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا۔ ”جہکال“ کے مقام پر شجاع الملک اور شیر محمد خان کی فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ جہکال، پشاور سے مغرب کی جانب دو کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس لڑائی میں شیر محمد خان کو شکست ہوئی اور وہ معرکہ آرائی کے دوران مارا گیا۔ ابھی شجاع الملک، پشاور ہی میں مقیم تھا کہ سردار فتح محمد خان نے معزول حکمران، محمود شاہ کو دوبارہ کابل کے تخت پر بٹھایا اور خود ایک لشکر جہاز لے کر پشاور روانہ ہوئے۔

پھر پشاور کے علاقے میں شاہ شجاع الملک اور سردار فتح خان کے لشکروں کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی۔ ممکن تھا کہ اس لڑائی میں شجاع الملک اپنے حریف پر غالب آ جاتا، مگر اپنے وزیروں اکرم خان اور غفور خان کے مارے جانے سے اس کے لشکر میں بددلی پھیل گئی۔ نتیجتاً شاہ شجاع الملک کو میدان جنگ سے فرار ہونا پڑا۔ پھر اس نے دریائے اٹک کو عبور کر کے لاہور میں رنجیت سنگھ کے پاس پناہ لی۔ کچھ دن کشمیر میں قید رہا، پھر کشمیر سے نکل کر لدھیانہ چلا گیا۔ آخر اسے شجاع الدولہ کے حوالے کر دیا گیا۔ شجاع الملک 23 صفر 1258ھ کو قتل ہوا اور اسے اپنے باپ، تیمور شاہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

پھر جب حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کو شاہ شجاع الملک کے قتل کی خبر پہنچی تو بعض مریدوں نے عرض کیا۔ ”حضرت نے تو پہلے ہی فرما دیا تھا کہ وہ اللہ کے بجائے افغان سرداروں کی پناہ میں جا رہا ہے۔ اسی لئے اسے عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔“

اپنے مریدوں کی گفتگو سن کر حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے فرمایا۔ ”میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ تو کیا انسان کا اندازہ تھا۔ اللہ اپنے فیصلوں کو بہتر سمجھتا ہے۔ شاہ شجاع کی قسمت میں یہی تحریر تھا۔ ویسے وہ بڑی ہی متدبران جوان تھا۔ اس نے حصول مقصد کی خاطر اپنی جان تک نذر کر دی۔ دراصل انسان وہی ہے، جو مقصد کو حاصل کر کے لئے اپنی زندگی بھی گنوا دے۔ اللہ، شاہ شجاع کی مغفرت کرے۔“

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے ارشاد گرامی میں مریدوں کے لئے ایک بڑا سبق بھی موجود تھا۔ وہ یہ کہ انسان، کارزارِ حیات میں اپنی جانوں کو عزیز رکھتے ہیں، انہیں زندگی کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ ہمیشہ راضی بہ رضا تھے۔ اور آپ کی تعلیمات میں اسی نکتے کو نمایاں حیثیت حاصل بلکہ بارگاہِ اقدس اور دوسرے علاقوں میں بارش نہیں ہوئی۔ خشک سالی سے پریشان ہو کر مقامی لوگ آپ کی بنیاد میں حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی۔ جواب میں حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے فرمایا۔ ”بندوں پر اللہ کی رضا میں راضی رہنا چاہئے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے کاموں میں کوئی کام بھی حکمتِ عملی کے بغیر نہیں ہوتا۔“ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کا جواب سن کر لوگوں نے عرض کیا۔ ”شیخ! اگر بارش نہ ہوئی تو ہمیں بہت سے زان کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس چیز میں تمہارا نقصان ہے اور کس بات میں تمہارا فائدہ پوشیدہ ہے۔“ حضرت بنی تونسویؒ نے فرمایا۔ اور پھر بارش کی دعا کرانے کے لئے آنے والے لوگوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ایک واقعہ سنایا۔

”اُس سال بھی شدید قحط سالی پڑی تھی۔ آخر عوام تنگ آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ”اے اللہ کے رسول! دعا فرمائیے کہ آسمان اپنے دہانے کھول دے۔ ورنہ ہماری جانوں کو سنگین خطرات پہنچ جائیں گے۔“

لوگوں کی گریہ و زاری سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پھر جیسے ہی اللہ کے عظیم و جلیل رسول کی دعا ختم ہوئی، حضرت جبریل علیہ السلام وحی لے کر آئے اور فرمایا۔ ”اُن مقام پر ایک غریب و ضعیف بڑھیا رہتی ہے۔ اس کی گھاس پھوس کی جھونپڑی اتنی خستہ ہو چکی ہے کہ اگر بارش نہ آئے تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے بارش کو روک رکھا ہے۔“

یہ کہہ کر جبریل امینؑ واپس تشریف لے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چند آدمیوں کو بڑھیا کی جھونپڑی کی طرف روانہ کیا۔ پھر جب لوگوں نے مل کر بڑھیا کی جھونپڑی کو اچھی طرح درست کر دیا تو اسی وقت تیز بارش شروع ہوئی۔ اور سیاہ بادل اس قدر ٹوٹ کر برسے کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔“

یہ واقعہ سننے کے بعد حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، جو بارش کے لئے دعا کی درخواست لے کر آئے تھے۔ ”یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی بڑی حکمت یا مصلحت ہوتی ہے، ہماری ناقص عقل سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔“



حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے جب رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت نہ صرف مسلمانوں کا سیاسی زوال ہو چکا تھا بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی وہ انحطاط پذیر ہو چکے تھے۔ اسی لئے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے اپنی نہایت میں اخلاق کی درسگی اور پاکیزگی پر سب سے زیادہ زور دیا۔ آپ اپنی تقریروں میں فرمایا کرتے تھے۔ ”مرد کو نین حضور اکرم ﷺ کی اتباع کے بغیر انسان میں اچھی خصلتیں پیدا نہیں ہو سکتیں اور وہ نیک اعمال تک رہائی حاصل نہیں کر سکتا۔“

اس کے بعد آپ فرمایا کرتے تھے کہ اس فتنہ انگیز دور میں آدمی ہونا بہت مشکل ہے۔

آپ ہی کا قول مبارک ہے کہ اس دنیا میں بے شمار آدمی ہیں، لیکن آدمیت کم ہے۔

ایک موقع پر حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں برسرِ مجلس فرمایا۔ ”ضیاء بخشی نے اپنی مشہور کتاب ”سلک السلوک“ میں انسان کی جو صفات تحریر کی ہیں، وہ مجھ میں بھی نہیں پائی جاتیں۔“ اس واقعے

سے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے انکار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک موقع پر اپنے مریدوں کو خصوصی نصیحت کرتے ہوئے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے فرمایا: ”جو شخص اپنے آپ کو دوسروں سے کم جانتا ہے، وہ مقبول اور حق تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔“

ایک بار آپ نے معرفت کا ایک خاص نکتہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”سہاگ کو چاہئے کہ وہ تمام لوگوں کو خود وہ شریف ہوں یا خبیث، شفقت و رحمت کی نظر سے دیکھے تاکہ حق تعالیٰ بھی اس پر رحمت کرے۔“

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ اپنے مریدوں کو خاص طور پر غیبت سے باز رہنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر آپ نے بڑے عجیب پیرائے میں غیبت سے حاصل ہونے والے نقصان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ”یاد رکھو! غیبت، چوری سے بھی بڑا گناہ ہے..... کیونکہ چوری میں چور کوئی چیز تو حاصل کر لیتا ہے، لیکن غیبت میں انسان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا بلکہ غیبت کرنے والے کے تمام اعمال خاکستر ہو جاتے ہیں۔“

ایک اور موقع پر غرور و تکبر اور حسد میں مبتلا رہنے والے انسانوں کے متعلق فرمایا: ”اس زمین میں توحید کا پھول نہیں اُگتا، جس میں شرک و حسد اور کبر و ریا کے کانٹے موجود ہوتے ہیں۔“

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے زمانے میں اکثر صوفیاء، اوراد و وظائف پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ آپ کو اپنے ہم عصر درویشوں کی یہ روش پسند نہیں تھی۔ آپ اپنے مریدوں کو بار بار تنبیہ فرمایا کرتے تھے: ”سہاگ کو چاہئے کہ وہ عملیات میں اپنا وقت ضائع نہ کرے کہ یہ طریقہ، فقر کے راستے کا ڈاکو ہے۔ بندے کا اصل مقصد تو حق تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔“

وظائف و اوراد کی جگہ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ ”ذکر بالجبر“ پر زیادہ زور دیا کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے فرمایا: ”کلمہ لا الہ الا اللہ کا ذکر جہر تمام اوراد و وظائف سے بہتر ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سب سے افضل ذکر لا الہ الا اللہ ہے۔“

طریقت کی راہ میں ریاضتیں اور مجاہدے اپنی جگہ، مگر ایک عام مسلمان کی سلامتی اور نجات کے لئے آسان طریقہ یہی ہے جن کی طرف حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے اشارہ فرمایا۔

آپ کے زمانے میں اس گمراہ کن روش کی ابتدا ہو گئی تھی کہ مریدوں نے اپنے پیروں کو ذریعہ نجات سمجھا شروع کر دیا تھا اور خود عمل کے راستے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ موجودہ عہد میں تو یہ روش اور بھی زیادہ خطرناک ہو گئی ہے کہ کسی پیر کے حلقہ بیعت میں شامل ہوئے اور جنت کا پروانہ حاصل کر لیا۔ خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں۔ ایک دن حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے کسی مرید نے عرض کیا:

”خ! فلاں شخص ایک بے عمل شخص ہے مگر صوفیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اگر اسے اس کی بے عملی پر ٹوکا جائے تو کہتا ہے کہ اس کا شیخ ایک مردِ کامل ہے۔ وہ حشر کے دن ہمیں بخشوا لے گا۔“

یہ بات سن کر حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا: ”اللہ کی قدرت میں کسی کو غفل نہیں۔ قیامت کے دن ہر انسان کے اعمال پر اس کے نتائج مرتب ہوں گے۔ بندے کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہئے۔“

ہمارے سامنے شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال موجود ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنی محبوب دختر کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

”فاطمہ! اس گمان میں نہ رہنا کہ تمہارا باپ پیغمبر ہے اور وہ حشر کے دن تمہیں حق تعالیٰ کی گرفت سے بچالے

ایک اہل ایمان ہی تمہارے لئے نجات کا ذریعہ بنیں گے۔“

اسی طرح حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ دنیا دار علماء پر بھی سخت تنقید کیا کرتے تھے۔ آپ کا مشہور قول ہے۔
”لَعَلَّ الْعَالَمَ فُسَادُ الْعَالَمِ“ (عالم کا فساد، عالم کا فساد ہے)

ایک بار آپ نے علماء کے متعلق فرمایا۔ ”جہاں اُن کی ہدایت سے عالم فیض یاب ہوتا ہے، وہیں اُن کی گمراہی سے دنیا کو نقصان عظیم پہنچتا ہے۔ وہ نہ تو جنت میں تنہا جائیں گے اور نہ دوزخ میں۔ دونوں جگہ کثیر جماعت ان کے ساتھ ہوگی۔“



حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کو اپنے مریدوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ قاضی حسن علیؒ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

”ایک بار میرے دل میں خیال آیا کہ حضرت شیخؒ مجھ پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔“

اسی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھ پر گہری نیند طاری ہوگئی۔ پھر حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ خواب میں تشریف لائے اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”حسن علی! تم توجہ کی بات کرتے ہو، مجھے تو یہ بھی خبر ہے کہ تمہارے دانتوں میں سے ایک دانت ہلتا ہے۔“ یہ بزرگ و مرشد واپس تشریف لے گئے۔ گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنے اُس دانت کو انگلی سے دبایا، جو نکل رہا تھا۔ مجھے اس خیال پر بڑی ندامت محسوس ہوئی۔

ایک روز حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ اپنے مریدوں کے حلقے میں تشریف فرما تھے اور تصوف کے کسی خاص نمبر پر گفتگو کر رہے تھے۔ اچانک حاضرینِ محفل نے دیکھا کہ آپ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل گیا اور فکر و بات کے آثار نظر آنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے سر جھکا لیا اور بہت دیر تک مراقبے حالت میں بیٹھے رہے۔ حاضرینِ مجلس پر حیرت و سکوت کی کیفیت طاری تھی کہ انہوں نے آج تک حضرت شیخؒ کو حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ پھر کافی دیر بعد حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے سر اٹھا کر با آواز بلند فرمایا۔

”اے اللہ! تمام تعریفیں اور بڑائیاں، آپ ہی کے لئے ہیں اور آپ ہر حال میں اپنے بندوں کے کفیل ہیں۔“ اس کے بعد حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ مسند سے اٹھے اور مجلس کے ایک گوشے میں دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر ارسلند پر تشریف فرما ہو گئے۔

حاضرینِ مجلس کو آپ کے چہرہ مبارک کے متغیر ہونے پر بڑا تعجب تھا، مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آپ کا تغیر کا سبب دریافت کر سکتا۔ اتفاق سے اس مجلس میں نور خاں گرمانی بھی موجود تھا۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے نور خاں پر بے حد عنایت فرمایا کرتے تھے اور وہ حضرت شیخؒ کی بارگاہ میں کسی قدر بے تکلف بھی تھا۔ آخر رے لوگوں کے کہنے پر نور خاں گرمانی نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”شیخ! اچانک آپ کا رنگ متغیر کیوں ہو گیا تھا اور ہمارے پریشانی کے آثار کیوں نظر آنے لگے تھے؟“

جواب میں حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے فرمایا۔ ”مکول میں ایک شخص، عمر خان رہا کرتا تھا۔ وہ اس وقت طغیانی اوراد میں داخل ہوا، جب میں نوجوان تھا۔ عمر خان خاصا متمول شخص تھا۔ اس نے مجھے ایک گھوڑی تحفہً بڑے لئے چند مکانات تعمیر کرائے اور کچھ کونوئیں بھی میری نذر کئے مگر میں نے گھوڑی کے سوا کچھ قبول نہیں کیا اور گھوڑی بھی اس لئے قبول کی کہ عمر خان کا اصرار بہت زیادہ تھا۔ میں اس کے لئے ہمیشہ دعائے خیر کرتا تھا۔

اور عمر خان بھی اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرنے کے لئے میرے پاس اکثر توجہ آیا کرتا تھا۔ اس میں بہت سی خوبیاں تھیں مگر سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ بالکل ان پڑھ تھا۔ آخری عمر میں اس کے دشمنوں نے اُس کی اسی جہالت سے فائدہ اٹھایا۔

”عمر خان! تم نے ایک افغان روہیلہ کی مریدی اختیار کی ہے۔ جبکہ تمہارے اپنے شہر میں بڑے بڑے مشائخ موجود ہیں۔“

عمر خان اپنے جہل کے باعث لوگوں کے بہکاوے میں آ گیا۔ پھر وہ مجھ سے بدعقیدہ ہو گیا اور اس نے توجہ نہ جانا بند کر دیا۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد عمر خان سخت بیمار پڑا اور اس کی شکل سب سے گئی۔ جن لوگوں نے عمر خان کو میری طرف سے بدگمان کیا تھا، وہ اس کی بگڑی ہوئی صورت دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا۔ پھر اچانک عمر خان کی ذہنی رو بہک گئی۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور گلیوں میں پاگلوں کی طرح پھرنے لگا۔ وہ کچھ دن تک اسی حالت میں رہا۔ پھر ایک روز اس نے کتے کی طرح بھونکنا اور لوگوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔ اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ اس کی زبان پر کفر کے کلمات جاری ہو گئے تھے۔

عمر خان کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ایک دوست، موسیٰ کو ترس آ گیا۔ ”تم نے اپنے مرشد کی توہین کی ہے۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔“ موسیٰ نے عمر خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اگر تم اب بھی توبہ نہ کر کے اپنے مرشد کی طرف رجوع کر لو تو تمہاری ساری سختیوں دور ہو جائیں گی۔“

اللہ نے عمر خان پر کرم کیا کہ شدید ذہنی بگاڑ کے باوجود اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔ پھر وہ اپنی بدعقیدگی سے تائب ہو گیا اور اللہ نے اس کی ساری مشکلات آسان کر دیں۔ کفر کے کلمات اس کے ذہن سے محو ہو گئے اور دوبارہ زبان پر کلمہ طیبہ جاری ہو گیا۔ ”یہ کہہ کر حضرت خواجہ سلیمان تونسوی خاموش ہو گئے۔ پھر مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد آپ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”آج اسی عمر خان پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے جاں کنی کی شدید تکلیف میں مجھے یاد کرتے ہوئے کہہ تھا۔ ”شیخ! میرے حق میں دعائے خیر فرمائیے۔“

میں نے عمر خان کے حق میں دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس پر اتنا کرم فرمایا کہ وہ مرتے وقت خالی ہاتھ نہیں گیا۔ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے۔ اس لئے میں نے نماز شکر ادا کی تھی۔“

اس کے بعد حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے فرمایا۔ ”ایک مرشد کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے مرید خیاں رکھے۔“



حضرت خواجہ سلیمان تونسوی سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں مگر اس میں آپ کے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ میاں یار محمد بلخانی کی روایت ہے کہ ایک بار حضرت خواجہ سلیمان تونسوی، درگ میں قیام فرماتے تھے۔ ایک دن ایک شخص اپنی بیوی کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو کر عرض کرنے لگا۔

”حضرت! میری بیوی پر جن مسلط ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ شدید اذیت میں مبتلا ہے اور اس کی ادب میں سخت پریشان ہوں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ! کسی طرح اس کا علاج کر دیجئے۔“

اس شخص کی روداد الم سن کر حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے کچھ دیر کے لئے توقف فرمایا، پھر نہایت پُر جلال!

”جس نے اس عورت کو ناحق ستایا ہے، وہ ہماری خدمت میں حاضر ہو۔“
 پھر مجلس حیران تھے کہ ایک جن، حضرت شیخ کی بارگاہ میں کس طرح حاضر ہوگا؟ ابھی چند لمحے بھی نہ گئے کہ وہاں موجود لوگوں نے محسوس کیا کہ جیسے ہوا کا کوئی تیز جھونکا ان کے قریب سے گزرا ہے۔ پھر انہیں یاب کی آواز سنائی دی۔

”تائیں حاضر ہوں۔“ اگرچہ جن انسانی زبان میں بول رہا تھا، مگر اس کا لہجہ انسانوں سے مختلف تھا۔
 تم نے اس بے چاری عورت کو کیوں گرفتار کر رکھا ہے؟“ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے جن کو مخاطب بنائے فرمایا۔ ”میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس عورت کو اسی وقت آزاد کر دو۔“

جن نے عرض کیا۔ ”اے خواجہ! چند دنوں سے میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بچے کے لئے تعویذ حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر مجھے کامیابی نہیں ملتی تھی۔ مجبوراً میں نے اس عورت کو گرفتار کیا۔ آپ کے دیلے سے مجھے آپ کا دیدار بھی ہو جائے اور میرا کام بھی بن جائے۔“
 حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے فرمایا۔ ”تم تعویذ کس طرح حاصل کرو گے؟“

آپ تعویذ فلاں پتھر کے نیچے رکھ دیں۔ میں وہاں سے حاصل کر لوں گا۔“ جن نے عرض کیا۔
 حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے تعویذ لکھ کر اس پتھر کے نیچے رکھ دیا، جس کی طرف جن نے اشارہ کیا تھا۔ اس بدولت مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی اور ہنسی خوشی اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی۔

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے علاوہ جن بھی حضرت خواجہ سلیمان تونسوی سے فیض یاب ہوتے ہیں ان پر بے حد عظیم و جلیل پیغمبر، حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت، انسانوں کے ساتھ جنوں پر بھی تھی۔ اپنے بے گزیدہ نام کی نسبت کے طفیل اللہ تعالیٰ نے سلسلہ چشتیہ کے ”سلیمان“ کو بھی یہ فضیلت بخشی تھی۔



بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت خواجہ سلیمان تونسوی پیدائشی ولی تھے۔ حق تعالیٰ نے انتہائی نوعمری میں آپ کو دنیا کی آلائشوں سے محفوظ رکھا۔ حضرت شیخ اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔

”ایک بار مقامی رئیسوں نے کسی شادی کی تقریب کے موقع پر طوائفوں کا مجرا کرایا، جسے دیکھنے کے لئے دور کے علاقے کے لوگ جمع ہوئے۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی اپنی کم سنی کے باعث اس بات سے بے خبر تھے کہ وہاں کا مجرا سننا، گناہ عظیم ہے۔ آپ نے اسے محض ایک تماشا سمجھا اور رقص کی محفل میں چلے گئے۔ لوگوں کے دیکھنے پر حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کو بیٹھنے کی جگہ نہ مل سکی اور آپ ایک گوشے میں کھڑے ہو کر طوائفوں کا ناچ گانا سنے لگے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی پر گہری نیند طاری ہو گئی اور آپ رقص و سرور سے ناواقف ہو گئے۔ پھر آپ نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا، جو نہایت برہم نظر آ رہے تھے۔

”سلیمان! تمہیں نہیں معلوم کہ تم کس غلیظ جگہ پر کھڑے ہو؟“ بزرگ کا غضب ناک رویہ دیکھ کر حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے عرض کیا۔ ”میں تو اسے ایک محفل سمجھا اور تماشا دیکھنے چلا آیا تھا۔“

”یہ بہت بڑا گناہ ہے۔“ بزرگ نے انتہائی غصے کی حالت میں فرمایا اور ایک زوردار تھپڑ، حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے رخسار پر مارا۔ ”تم اسی وقت اپنے گھر جاؤ اور آئندہ ایسی محفلوں کا رخ نہ کرنا۔“ یہ کہہ کر وہ بزرگ غائب ہو گئے۔

حضرت خواجہ سلیمان تونسوی فرماتے ہیں۔ ”جب میری آنکھ کھلی تو محفل ختم ہو چکی تھی اور طوائفیں جا چکی تھیں۔

مگر مجھے اپنے رخسار پر درد کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر کسی دوست نے مجھ سے پوچھا۔ ”سلیمان! تمہارے رخسار پر انگلیوں کے نشانات کیسے ہیں؟“

پھر کئی سال بعد جب میں قبلہ عالم حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ سے بیعت ہوا تو مجھے اپنے بچپن کا خواب یاد آیا۔ یہ وہی بزرگ تھے، جنہوں نے میرے تھپڑ مارا تھا اور طوائفوں کا رقص دیکھنے پر مجھے سرزنش کی تھی۔



ایک بار ایک نہایت دولت مند شخص، حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ ”خواجہ! یا تو مجھے حضرت موسیٰؑ بنا دو یا پھر فرعون۔“

بڑی عجب درخواست تھی۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے سکوت اختیار فرمایا۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ یکایک اُس والدہ اور غرور و کبر میں مبتلا شخص کا قلب بدل گیا۔ پھر اُس نے اپنی مائتہ دولت، غریبوں میں تقسیم کر دی اور حضرت خواجہ سلیمانؒ کے آستانہ عالیہ پر گدا گروں کی طرح رہنے لگا۔

پھر ایک دن حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے اسے اپنے حلقہ بیعت میں شامل فرما کر دولت روحانی سے مالا مال کر دیا۔ ایک موقع پر آپؒ نے اسی شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اسندہ ایسی خواہش مت کرنا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ عین کرم ہے کہ اس نے تمہیں اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لیا..... ورنہ تم فرعون بنا دیئے جاتے اور دنیا کے تمام تمہاری آخرت بھی برباد ہو جاتی۔“



حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ اپنی سخاوت کی وجہ سے پورے برصغیر پاک و ہند اور عرب و عجم میں ایک نام شہرت رکھتے تھے۔ ایک بار آپؒ کی خدمت میں محمد واصل نام کا ایک سیاح حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! میں نے عرب و عجم کی سیاحت کی ہے، مگر آپ جیسا مرد سچی نہیں دیکھا۔ آپ لوگوں کو اوٹ اور گھوڑے بھی دیتے ہیں ان کے لئے اناج اور لباس بھی فراہم کرتے ہیں۔ بیمار لوگوں کو دوائیں عنایت کرتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر لوگوں کو فلاح کا راستہ بھی دکھاتے ہیں۔ بے شک! آج روئے زمین پر آپ جیسا کوئی دوسرا موجود نہیں۔“

سیاح محمد واصل کی گفتگو سن کر حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”میاں واصل! میری بار بہت دھیان سے سنو۔ جب میں اپنے وطن سے علم حاصل کرنے کے لئے شہر آکر ”مسجد سفید“ میں سکونت پذیر ہوا ایک نوربان نے میرے دونوں وقت کا کھانا مقرر کر دیا۔ میں روزانہ اپنا کھانا لینے کے لئے نوربان کے گھر جاتا ہوں۔ ایک کتا تھا، جو دروازے پر کھڑا رہتا تھا۔ مجھے اس کتے سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اگر کتا دروازے پر نہ ہوتا تو میں وہ کتا کھانے آتا..... ورنہ سارا دن فاتے میں گزر دیتا۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ خاموش ہو گئے۔

حاضرین مجلس پر گہرا سکوت طاری تھا اور سیاح محمد واصل بڑی حیرت سے آپ کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر مختصر سے سکوت کے بعد حضرت خواجہ سلیمانؒ دوبارہ اپنے مہمان سیاح سے مخاطب ہوئے۔ ”میاں محمد واصل! میں تو سلیمان ہوں کہ جسے ایک وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کہاں کی داد و دوش اور کیم سخاوت؟ یہ تو حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے اپنی رحمتوں سے نواز دیا ہے۔“

یہی وہ انکسار تھا، جس نے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کو کروڑوں انسانوں کے جہنم میں سر بلند کیا۔



نہ خواجہ سلیمان تونسویؒ کی ساری زندگی اتباع سنت میں بسر ہوئی۔ آپ نے کوئی نماز دیر سے نہیں پڑھی۔ بڑا نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ آخری عمر میں حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ پر استغراق کا غلبہ رہتا تھا مگر ان کے باوجود کبھی آپ کی زبان مبارک سے خلاف شریعت کلمہ ادا نہ ہوا۔ آپ اپنی تقریروں میں ایک ہی بات کرتے تھے۔

”مردم! میں نے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے۔ اگر تمہیں کوئی شخص، ہوا میں فرمائے مگر اس کا کوئی فعل، خلاف سنت ہو تو ہرگز اُس کی پیروی نہ کرنا۔ کیونکہ عبادات کی معراج و تکمیل یہاں اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ادائیگی سے ہوتی ہے۔ نماز اور روزہ، حق تعالیٰ کی عبادات ہیں اور ان کی ادائیگی ہم پر فرض ہے۔ مگر ان کی ادائیگی میں ہمیں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ تاکہ انسانی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور فرمودات کی پوری پابندی کریں۔“

بہائی سال تک شریعت و سنت کے آبِ مصفا سے سنگلاخ زمینوں کی آبیاری کرنے اور ان میں نرمی و گداز کی لانے کے بعد یہ مردِ حق دنیا سے رخصت ہو گیا۔ حضرت خواجہ سلیمانؒ نے 1267ھ میں انتقال فرمایا اور تونسہ میں اسوۂ خاک ہوئے۔ وصال سے پہلے آپ یہ شعر کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔

اگر گیتی سراسر بادِ گیرد
چراغِ مقبلاں ہرگز نمیرد

”یہ زمین سراسر ہوا بن جائے، تب بھی اُن لوگوں کا چراغ نہیں بجھے گا، جو مقبول بارگاہِ خداوندی ہیں (حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کا مشہور قول ہے۔ ”اگر کوئی اس زمانے میں پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھتا ہے یا ہے“ آپ نے یہ بات ڈیڑھ سو سال قبل کہی تھی۔ اہل نظر اسی ایک قول سے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔



حضرت امام بری قادری رحمۃ اللہ علیہ

یہ مغلیہ دور حکومت کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ طویل قید بند کی صعوبتیں برداشت کر کے گوالیار کے قید خانے سے باہر آ چکے تھے اور نور الدین جہانگیر جیسا باجرت حکمران اپنے باطل عقائد سے تائب ہو کر ”مجدد اسلام“ کے سامنے خم ہو چکا تھا اور اسلامیان ہند کو مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے قائم کردہ نئے مذہب ”دین الہی“ سے مکمل نجات حاصل ہو چکی تھی۔

حکومت ہندوستان کو ایک جام شراب کے بدلے میں ملکہ نور جہاں کے ہاتھوں فروخت کرنے والا جہانگیر موت سے شکست کھا کر زیر زمین جا چکا تھا۔ اور اب نیک دل حکمران شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں، تخت ہندوستان پر جلوہ افروز تھا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے، جب شاہ جہاں کسی انتظامی مہم کے حوالے سے سرحدی علاقے ”ہزارہ“ آیا ہوا تھا۔ ولی عہد سلطنت، شہزادہ محی الدین اور نگ زیب عالمگیر بھی شہنشاہ کے ہمراہ تھا۔ ہزارہ کے انتظامی امور سے فارغ ہو کر شہنشاہ شاہ جہاں، دارالحکومت دہلی کی طرف روانہ ہونے ہی والا تھا کہ چند شاہی جاسوسوں نے خبر دی کہ مذہب کے نام پر حکومت کے خلاف ایک زیر زمین سازش تیار کی جا رہی ہے۔

شہنشاہ شاہ جہاں یہ خبر سن کر چونک اٹھا۔ ”وہ کون لوگ ہیں جو حکومت کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں؟“ جاسوسوں نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا، جو اُن کے ساتھ دست بستہ کھڑا تھا۔ ”یہ مقامی جاگیردار ہے۔ اور سلطنت مغلیہ کا ادنیٰ نمک خوار..... اسی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔“

شہنشاہ شاہ جہاں نے ہزارہ کے جاگیردار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”میرے والد کو آپ کے دادا محترم جنت مکانی شہنشاہ جلال الدین اکبر نے جاگیر عنایت کی تھی۔ اس لئے میں بھی حضور کے خاندان عالی مقام کا نمک خوار ہوں..... اور حق نمک ادا کرنے کی حقیر سی کوشش کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر جاگیردار افضل خان، شہنشاہ شاہ جہاں کے سامنے اس قدر جھک گیا کہ اس کا سر، زمین سے ٹکرائے گا۔

”سازش کی تفصیل بیان کرو۔“ شاہ جہاں کی باز عیب آواز گونجی اور افضل خان سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”یہاں ہزارہ میں ایک درویش برسوں سے مقیم ہے۔“ افضل خان نے کہنا شروع کیا۔ ”کوئی نہیں جانتا کہ کہاں سے آیا ہے؟ سادہ لوح عوام اُس کی عقیدت میں انتہائی مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ ہزاروں انسانوں کا کہہ کہ وہ درویش ان کا بادشاہ ہے، جو ناث کے بورے پر بیٹھتا ہے..... اور کھل اوڑھتا ہے۔“

کلمات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ شاہ جہاں نے تدبر اور فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے کہا۔
 ”شاہ جہاں! ساری دنیا کے بادشاہ! اس کبیل پوش درویش کے ارادے نیک نہیں۔“ جاگیردار افضل خان
 ہند کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

”اے اس فقیر کے ماننے والے ہزاروں ہیں، کل لاکھوں ہوں گے..... اور اس کے بعد حضور دالا پر خور و نوش
 کے معتقدین کی تعداد کتنی ہوگی؟ اسی طرح شاہانِ وقت کے خلاف بغاوتیں ہوتی ہیں..... اور اسی انداز
 غالب آتے ہیں۔“

شہنشاہ جہاں نے دلی عہدِ سلطنت کی طرف دیکھا۔ ”اورنگ زیب! اس واقعے کی تحقیقات کرو۔ اگر وہ
 ناپاک و نامعزز ہے اور اس سازش میں ملوث قرار پایا جائے تو اسے پایہٴ زنجیر کر کے ہمارے حضور میں پیش کرو۔“



نصف اور صوفیاء کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند کے عوام کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کی بڑی
 بہت ”پرست“ ہے۔ پیر پرست سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے ”شیخ“ یا ”پیر و مرشد“ کے علاوہ کسی
 بزرگ کی روحانی حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اور اگر تسلیم کرتے بھی ہیں تو بہت جبر و اکراہ کے
 اندر۔ وہ بھی اس طرح کہ دوسرے سلسلے کے بزرگوں کو اپنے شیخ سے نہایت کم تر جانتے ہیں۔ اسی ”مبالغہ
 مانا“ اور ”ذاتیات پرستی“ کی وجہ سے اکثر تاریخی واقعات بری طرح منسوخ ہو کر رہ گئے ہیں..... اور پھر جب آنے
 والے ان منسوخ شدہ واقعات کا مطالعہ کرتی ہیں تو اسے ایک مستند تاریخی دستاویز سمجھ کر نہ صرف قبول کر لیتی
 بلکہ آگے بھی بڑھا دیتی ہیں۔ نتیجتاً غیر ذمے داریوں کا یہ سفر آج بھی اسی رفتار کے ساتھ جاری ہے۔

ہم شہنشاہ جہاں، دلی عہدِ سلطنت شہزادہ اورنگ زیب اور ہزارہ کے جاگیردار کے حوالے سے کس تاریخ ساز
 کا ذکر کر رہے ہیں، اسے پاکستانی تذکرہ نویسوں نے اپنی کتابوں میں اس طرح بیان کیا ہے۔

شاہ جہاں بادشاہ، ہزارہ کی کسی مہم پر آیا ہوا تھا۔ اس شہر کے کچھ حاسدین نے درویش کے خلاف شاہ جہاں کے
 دہرے..... اور ایک بوریا نشیں فقیر کو حکومت کے لئے خطرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بادشاہ بھی ان لوگوں کی
 ہمتاؤں کا کیا اور اس نے ایک فوج تیار کی، جو اس درویش کی خانقاہ پر جا کر اسے اور اس کے معتقدین کو گرفتار کر
 لے کر شاہ جہاں نے اس کام کے لئے شہزادہ اورنگ زیب کی ڈیوٹی لگائی۔

برکاب، جس سے ہم نے مذکورہ اقتباس اخذ کیا ہے، اس کے مصنف ایک علامہ ہیں..... اور ان کی تصنیف،
 ہندوؤں کی اکثریت میں مقبولیت کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ ہمارے قارئین اس روایت کی ظاہری ساخت سے اندازہ
 لے سکتے ہیں کہ وہ درویش اپنی خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر کس انداز کی منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ اس کی بغاوت
 پکے کے لئے شہنشاہ جہاں جیسے طاقتور بادشاہ کو ایک نئی فوج ترتیب دینی پڑی۔ اس قسم کی غیر ذمے دارانہ
 بیانیہ اور غیر محققانہ روایتوں سے برصغیر پاک و ہند کے صوفیائے کرام کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہمارے نزدیک
 ان زمانہ طرازی اور مبالغہ آرائی ہے فارسی زبان کا ایک مشہور مقولہ ایسے ہی مواقع پر صادق آتا ہے۔

”جہاں نمی پند بلکہ مرید ال می پرانند۔“

(جہاں نہیں اڑتے ہیں بلکہ ان کے مرید انہیں اڑاتے ہیں۔ ترجمہ)

واقعہ صرف اتنا تھا کہ ہزارہ کا جاگیردار ایک ہوس پرست اور ادبِ انسان تھا۔ جب اس درویش کے کشف و
 بات کی شہرت عام ہوئی تو وہ بھی فقیر کے آستانے پر حاضر ہوا۔

درویش نے آمد کا مقصد دریافت کیا تو افضل خان نے دعا کے لئے درخواست کی۔ ”آپ ایک متجرب الدعوات بزرگ ہیں۔ میرے حق میں بھی دعائے خیر فرمائیں۔“

درویش نے ایک نظر افضل خان پر ڈالی اور اسے ٹالنے کے لئے سرسری انداز میں کہہ دیا۔ ”اللہ تمہیں ہدایت دے۔“

افضل خان ایک دنیا پرست انسان تھا۔ وہ فقیر کی دعا کی جامعیت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ ”میں ہدایت مانگے نہیں، دنیا طلب کرنے آیا ہوں۔“

”انسان نہ کسی کو کچھ دے سکتا ہے اور نہ کسی سے کچھ چھین سکتا ہے..... دینے والا بھی اللہ..... اور لینے والا بھی اللہ۔“ درویش نے جذب کے عالم میں کہا۔

”قدرت نے تجھے تیری حیثیت سے زیادہ عطا کر دیا۔ ان نعمتوں پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کر اور اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آ۔“

افضل خان پھر بھی بیٹھا رہا۔ ”آپ یہ دعا کریں کہ شہنشاہ شاہ جہاں مجھے پورے سرحدی علاقے کا حاکم بنادیں۔“ ”جو کچھ تیرے پاس ہے، اسے غنیمت جان..... ورنہ یہ بھی چھین جانے والا ہے۔“ درویش نے ہر حال لے لے میں کہا۔ ”میرا زیادہ وقت برباد نہ کر کہ فقیر کے دروازے پر اور بھی ضرورت مند کھڑے ہیں۔“ یہ کہہ کر درویش نے اپنے خادم خاص سے کہا۔ ”جو پہلے آیا ہے، اسے پہلے بھیجو۔“

خادم چلا گیا۔ مگر افضل خان اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔

چند لمحوں بعد ایک شکستہ حال اور بوسیدہ لباس شخص، خانقاہ میں داخل ہوا۔ درویش نے بڑی محبت سے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور اس طرح مزاج پرسی کرنے لگا، جیسے آنے والا اُس کا قریبی دوست یا عزیز ہو۔

افضل خان سے درویش کی یہ شان بے نیازی برداشت نہ ہو سکی اور وہ غصے میں اٹھ کر چلا گیا۔

پھر وہ مغل شہنشاہ، شاہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک درویش بے مایہ کے حوالے سے بعثات و سرکشی کا افسانہ تراش ڈالا۔

شاہ جہاں نے افضل خان کی تمام گفتگو پوری توجہ کے ساتھ سنی..... اور کسی خاص بروہملا کا اظہار نہیں کیا۔ بل ایک رکی کارروائی کے انداز میں اپنے سب سے بڑے بیٹے، ولی عہد سلطنت شہزادہ اورنگ زیب کو حکم دیا۔

”تم بہ نفس نفیس اس درویش کی خانقاہ میں جاؤ اور اپنی تحقیقات سے ہمیں باخبر کرو۔“

یہ تھی اس واقعے کی حقیقت، جسے ہمارے ”مبالغہ پسند“ تذکرہ نویسوں نے ایک سنسنی خیز داستان بنا ڈالا۔



شاہ جہاں کے حکم کے مطابق شہزادہ اورنگ زیب اس درویش کی خانقاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت شہزادے کے ساتھ سینکڑوں مسلح سپاہی بھی تھے۔ جسے ہمارے تذکرہ نویسوں نے اس انداز میں پیش کیا ہے، جیسے اورنگ زیب نے درویش کی خانقاہ پر لشکر کشی کر دی ہو۔ حالانکہ یہ محض ایک سیاسی ”پروٹوکول“ تھا۔ جیسے آج کل صدر یا وزیر اعظم اپنے سکیورٹی گارڈز کے ساتھ ”قصر صدارت یا وزارت“ سے کسی عام جگہ پر جاتے ہیں۔ شہزادہ اورنگ زیب بھی ”آئین جہان بانی“ کے مطابق اپنے مسلح فوجی دستوں کے ساتھ درویش کی خانقاہ تک پہنچا تھا۔

درویش اس وقت درس میں مشغول تھا..... اور اس کے سامنے طالبان حق، سر جھکائے ہوئے، دو زانو دست بستہ بیٹھے ہوئے تھے۔

بائیں گردوغبار چھانے لگا اور گھوڑوں کی ٹاپوں کے شور سے پورا علاقہ گونجنے لگا تو درویش کا خادم اے میں داخل ہوا اور خوف زدہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”کڑی شای، خانقاہ کی طرف آ رہا ہے۔“

”درویش نے بے نیازانہ کہا اور دوبارہ درس میں مشغول ہو گئے۔

بہنی کے سوار، خانقاہ کے دروازے پر پہنچے۔ شہزادہ اورنگ زیب، گھوڑے کی پشت سے اُترا اور خادم بائیں ہو کر بولا۔ ”اپنے شیخ کو اطلاع دو کہ شہزادہ اورنگ زیب آئے ہیں اور خانقاہ میں حاضر ہونے کی ہوتے ہیں۔“

بہنیاں خاص نے ولی عہد سلطنت کی آمد کی خبر دی تو درویش نے اپنا درس روک کر کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں بار بار تنگ نہ کرو۔ اگر شہزادے کو درس سننا ہے تو اندر آ جائیں..... اور طالبانِ حق کی صف میں بٹیں۔“ یہ کہہ کر درویش نے دوبارہ اپنا درس شروع کر دیا۔

یہ کہہ کر اورنگ زیب اپنی نوعمری ہی سے انتہائی نیک، روزہ و نماز کا پابند اور فقیر دوست شہزادہ تھا۔ طلبہ کی یہی وہ بلند کرداری تھی، جس نے اسے مجبور کیا کہ وہ ایک درویش بے سروسامان کے دروازے کو اندر آنے کی اجازت طلب کرے..... ورنہ مزاجِ شامی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر مقام پر اپنی خواہش اور طاقت سے ہیں۔ اگر کوئی مزاحمت کرتا ہے تو صفحہ ہستی سے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا جاتا ہے۔ اگر یہ بھی دنیا پرست شہزادہ ہوتا تو اب تک اس کے گھوڑے کے سم، خانقاہ کے تقدس کو پامال کر چکے ہوتے۔ ہاتھ کے بغیر درویش کے حجرے میں پہنچ جاتا۔ یا پھر درویش کو اپنے استقبال کے لئے خانقاہ کے دروازے لے لیتا۔

نامِ خاص کے واپس آنے سے پہلے شہزادہ اورنگ زیب نے سوچا تھا کہ اطلاع پاتے ہی درویش خود دوڑا چلا جائے۔ مگر جب خادم خاص اکیلا ہی واپس لوٹا تو اورنگ زیب نے بڑی حیرت کے ساتھ اسے دیکھا۔ شہزادے نے حیرت سے کہا۔

نامِ خاص نے اورنگ زیب کے قریب آ کر کہا۔ ”شہزادہ معظم! میرے شیخ نے آپ کو اندر آنے کی اجازت دی ہے۔“ یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت وہاں موجود لوگوں نے اس کے لہجے میں لرزش محسوس کی۔ خادم بائیں شای سے سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔

شہزادہ ذی حشم! یہ تو آپ کے عہدہ و منصب کی توہین ہے۔ اسے خود آپ کے استقبال کے لئے حاضر ہونا چاہیے۔ اورنگ زیب کے ایک مصاحب نے اپنی خوشامد کے ذریعے ولی عہد سلطنت کو فقیر کے خلاف درغلانے کی کوشش کی۔

”ناش ہو جاؤ۔“ شہزادہ اورنگ زیب نے سخت لہجے میں اپنے مصاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”درویش ایک شان ہوتی ہے۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو۔“ یہ کہہ کر اورنگ زیب، چار سپاہیوں کے ہمراہ خادم خاص کے حجرے میں داخل ہوا، جہاں درویش، طالبانِ حق کو درس دے رہا تھا۔

بعض اوقات درویش کی کرامت کہ جب شہزادہ اورنگ زیب، مدرسے میں داخل ہوا تو درویش، قرآن حکیم پڑھتے ہوئے تلاوت کر رہا تھا۔

”اللہ روز اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔“ ترجمہ۔

جب درویش یہ آیت مقدسہ تلاوت کر چکا تو اس نے ایک خاص شان بے نیازی کے ساتھ ولی عہد سلطان کی طرف دیکھا، جو مدر سے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ ”شہزادے! اگر فقیر کی مجلس میں کچھ دیر بیٹھنا چاہو تو بیٹھ جاؤ۔“ اور نگ زیب کا خیال تھا کہ درویش اس کے احترام میں اپنی منہ سے اٹھ جائے گا..... مگر درویش نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔

درویش کچھ دیر پہلے قرآن کریم کی ایک آیت مقدسہ تلاوت کر چکا تھا۔ اس کے جواب میں شہزادہ اور نگ زیب نے بھی کلام الہی کی ایک آیت مبارکہ پڑھی، جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔
”اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی بھی، جو تم میں صاحبانِ امر ہوں یعنی امام وقت۔“ ترجمہ۔

جیسے ہی آیت مقدسہ کی تلاوت ختم ہوئی، درویش نے نہایت پرسوز لہجے میں کہا۔ ”میرے محترم شہزادے! اگر تو میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت میں غرق ہوں، اس سے فرصت ملے تو اپنے امیر کی طرف دیکھوں۔“
درویش کا جواب سن کر شہزادہ اور نگ زیب حیران رہ گیا۔

پھر درویش نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے کہا۔

”تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جو لائقِ حمد و ثناء ہے۔ وہ ہر شے پر قادر و قابض ہے۔ اس کا نور چہاروں پہلو ہوا ہے۔ اس کا کوئی شریک و ثانی نہیں۔ وہ ہر برائی اور عیب سے پاک ہے۔“

جیسے ہی درویش خاموش ہوا، شہزادہ اور نگ زیب عاجزانہ انداز میں چلتا ہوا طالب علموں کی قطاریں نکلتا ہوا درویش سے مصافحہ کر کے دیگر طلباء کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے درویش کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کرتے ہوئے کہا۔

”شیخ! میرے حق میں دعائے خیر فرمائیے۔“

شہزادہ اور نگ زیب کی اس خواہش پر سب سے پہلے درویش نے دعا کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے آقا سرورِ کونین ﷺ کا ارشادِ مقدس ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دعا سے زیادہ کوئی شے پسند نہیں۔ جو شخص دعا مانگا، اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے۔ دعا مومن کا ہتھیار ہے..... اور دعا اس یقین کے ساتھ مانگی جائے کہ ضرر قبول ہوگی۔“

شہزادہ اور نگ زیب نے سوال کیا۔ ”دعاؤں کے نام قبول ہونے کے اسباب کیا ہیں؟“
جواب میں درویش نے کہا۔ ”دعا کی قبولیت کے لئے رزقِ حلال بنیادی شرط ہے۔ ایک بار ایک صحابی عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ! میری کوئی دعا قبول نہیں ہوتی۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔“
صحابی کی درخواست کے جواب میں سرورِ کونین ﷺ نے فرمایا۔ ”حلال روزی کا بندوبست کرو۔ ایک لقمہ زور سے چالیس دن تک دعا قبول نہیں ہوتی۔“

دعا کی قبولیت کے سلسلے میں درویش نے دوسرا نکتہ اس طرح بیان کیا۔ ”جب کوئی بندہ اپنے گناہوں پر نادم کر تو بہ و استغفار کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخش دیتا ہے۔ اس کے برعکس کوئی انسان گناہوں میں بھی ملوث رہے..... اور دعائیں بھی کرتا رہے تو وقت کی بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔“

شہزادہ اور نگ زیب، درویش کے کردار اور گفتگو سے بے حد متاثر ہوا۔ پھر اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ شخصِ جلالِ شاہی سے متاثر نہ ہو، وہی حقیقی درویش ہے..... اور درویش تحت و تاج کا طالب نہیں ہوتا۔ پھر وہ

نہ کے خلاف بغاوت کیوں کرے گا؟ بغاوت تو وہ لوگ کرتے ہیں، جن کے دلوں میں حرص و طمع کی آگ روشن ہے۔ اس درویش کے سینے میں تو نفس جل کر راکھ ہو چکا ہے۔

ایک شہزادہ اورنگ زیب ان ہی خیالات میں اُلجھا ہوا تھا کہ درویش کی پُر جلال آواز سے خانقاہ کے در و بام ہل اٹھے۔

”شہزادے! تم تختِ ہندوستان کے وارث ہو، اس لئے جہاں بھی جاؤ گے، مہمان خاص کہلاؤ گے۔“ درویش نے اس کی محبت بھی تھی اور جذب و کیف بھی۔ ”آج اتفاق سے تم ایک ایسے شخص کے مہمان بنے ہو، جو تمہارے بہانہ میزبانی بھی نہیں کر سکتا۔“ فقیر اپنی بے سرو سامانی پر شرمندہ نہیں تھا بلکہ اس کے لہجے سے شانِ فقر و فاقہ ظاہر ہو رہی تھی۔

”میری یہی توقع کافی ہے کہ آپ نے ملاقات کا شرف بخشا اور معرفت کے اسرار و رموز ظاہر کئے۔“ شہزادہ نے لبِ کالجہ عاجزانہ تھا۔ ”حکمت کا ایک نکتہ بیان کرنا، لاکھوں سچے موتیوں کی نذر پیش کرنے پر بھاری ہے۔ حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ابھی میری حدودِ سلطنت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔“

دلی عبدِ سلطنت کا یہ انداز دیکھ کر درویش کے چہرے پر بے پناہ مسرت کا رنگ اُبھر آیا۔ پھر اس فقیر بے مایہ نے ناہم شادی کے لہجے میں کہا۔ ”سیم و زر اور لعل و جواہر کا نہ سہی، درویش کے پاس دعاؤں کا تحفہ تو موجود ہے۔“ اپنے شہزادے کی نذر کرتا ہوں۔ اہل دنیا کو کتنا ہی ناگوار گزرے، مگر دستِ قدرتِ تمہارے سر پر تاجِ شاهی ہمارے گا۔ پھر جب ارض و سما کا مالک تمہیں صاحبِ اختیار بنا دے تو رزقِ حلال تلاش کرنا اور بندگانِ خدا کا بار بھارتا۔“

بدرویش خدا مست، سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ حضرت امام بری رحمہ اللہ تھے۔



حضرت امام بریؒ کا خاندانی نام سید عبداللطیف تھا۔ آپ مغل شہنشاہ، نور الدین جہانگیر کے دورِ حکومت میں پیدا ہوئے۔ سید امام بریؒ کی تاریخِ پیدائش 1026ھ ہے۔ پاکستانی شہرِ جہلم کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی خاک سے مرقدِ قادریہ کا یہ آفتابِ معرفت طلوع ہوا۔ ضلعِ جہلم کی ایک تحصیل چکوال ہے۔ اسی کے ایک موضع ”کر سال“ میں حضرت سید امام بریؒ نے آنکھیں کھولیں۔

مغلِ جہلم کی اعتبار سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ افغان حکمران شیر شاہ سوری، جس نے مغل شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان کی سلطنت حاصل کی تھی اور پھر اپنے طویلِ تعمیراتی سلسلے کے تحت جہلم میں ایک عظیم ترین قلعہ ”رہتاس“ تعمیر کروایا تھا، جس کے حقیقی خدوخال کو تو صدیوں کی گرد چاٹ گئی، مگر اس کے واضح آثار اب بھی موجود ہیں جو حکومتوں کی بے توجہی کے سبب روز بہ روز زوال پذیر ہیں۔ پھر بھی اس شکستہ قلعے کے در و دیوار، ہندوستان میں مسلمانوں کے جلال و جبروت اور شاندار ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔

مغلِ جہلم کی تحصیل ”چکوال“، کل تک ایک عام سی جغرافیائی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر جب سے پاکستان کے مایہ ناز شہزادہ نواسہ دان، ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے طویل تحقیق و جستجو کے بعد شہاب الدین غوری کا مقبرہ دریافت کر کے دوبارہ تعمیر کرایا ہے، اسی روز سے اس چھوٹی سی تحصیل چکوال نے تاریخی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ شہاب الدین غوری وہ عظیم مسلم سالار ہے، جس نے تران (اجمیر) کے میدان میں راجپوت حکمران پرتھوی راج چوہان کو ہرا کر ملک دے کر ہند کے کفرستان میں اسلامی اقتدار کے دروازے کھولے۔

اور اسی ضلع جہلم کے ایک موضع ”کرسال“ میں سلسلہ قادریہ کے عظیم فرزند، سید عبداللطیف (امام بری) پیدا ہوئے۔

حضرت امام بری کے والد محترم کا اسم گرامی، سید محمود شاہ تھا۔ بعض کتابوں میں سید سخی محمود تحریر کیا گیا ہے۔ حضرت امام بری کا سلسلہ نسب، حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا ہے۔



تمام تذکروں میں بڑے تواتر کے ساتھ یہ روایت موجود ہے کہ حضرت امام بریؒ کا بچپن عام بچوں سے بہت مختلف تھا۔ سید سخی محمودؒ پیشے کے اعتبار سے ایک کاشتکار تھے اور اس کے ساتھ ہی موسیقی بھی پالتے تھے۔ مگر خانہ سالوات سے تعلق رکھنے کے باعث آپ علم کی اہمیت و افادیت سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ اس لئے آپ نے کم زمانہ کے مطابق اپنے فرزند، اکبر شاہ عبداللطیف (امام بریؒ) کو کتب میں داخل کرا دیا۔ حضرت امام بریؒ، کتب سے فارغ ہو کر گھر آتے اور موسیقی لے کر کھیتوں کی طرف نکل جاتے۔

محلے کے ہم عمر بچے۔ حضرت امام بریؒ کو فضول کھیلوں کی طرف بلاتے، مگر آپ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ تمام معتبر روایتوں میں آپ کے بچپن کے حالات اس طرح تحریر کئے گئے ہیں۔

بشری اور عمر کے تقاضوں کے باوجود حضرت امام بریؒ کبھی منہ پھاڑ کر نہیں ہستے تھے۔ اگر کسی بات پر آپ کو ملنی بھی جاتی تو بس ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تنہم ابھر کر ڈوب جاتا۔ آپ نے عام بچوں کی طرح کبھی شرارت نہیں کی۔ جھوٹ نہیں بولا۔۔۔۔۔ اور کسی کی چغلی نہیں کھائی۔ بہت چھوٹی عمر سے نماز کی پابندی کرتے تھے۔۔۔۔۔ اور آپ کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ نماز پڑھنے کے بعد بہت دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھے رہتے۔ گویا مراقبے میں مصروف ہوں۔ حضرت امام بریؒ کی ان ہی عادات و معمولات کو دیکھتے ہوئے بعض تذکرہ نویسوں نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ آپ بچپن ہی سے گوشہ نشینی اور ترک دنیا کی طرف مائل تھے۔

اس وقت حضرت امام بریؒ کی عمر مشکل سے سات آٹھ سال ہوگی کہ ایک دن اک عجیب واقعہ پیش آیا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے سید سخی محمودؒ ترک سکونت پر مجبور ہو گئے تھے اور کرسال (جہلم) کو چھوڑ کر موضع ”باغ کلاں“ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہی موضع ”باغ کلاں“ آج کل اسلام آباد کا مشہور علاقہ ”آب پارہ“ ہے۔

یہاں آکر بھی سید سخی محمودؒ نے زراعت اور موسیقیوں کی تجارت جاری رکھی۔ ایک دن حضرت امام بریؒ تقریباً بھینیس چرانے کے لئے پہاڑ کے دامن میں چلے گئے۔ آپ کی عادت تھی کہ جانوروں کو گھاس چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے اور خود آنکھیں بند کر کے اپنے اللہ کو یاد کرنے لگتے تھے۔ اس روز بھی آپ نے ایسا ہی کیا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر یاد الہی میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپ کی آنکھ لگ گئی۔ جانور قریب کھیت میں گھر گئے اور فصل کو تباہ کرنے لگے۔

کھیت کا مالک یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا سید سخی محمودؒ کے پاس پہنچا اور انتہائی گستاخانہ لہجہ میں اپنے کھیتوں کی بربادی کا ذکر کرنے لگا۔ یہ واقعہ سن کر سید سخی محمودؒ کو شدید اذیت پہنچی۔ تاہم آپ نے اپنے مصو بیٹے کی وکالت کرتے ہوئے کھیت کے مالک سے کہا۔

”عبداللطیف ابھی بچہ ہے، اس سے کوتاہی اور غفلت ہوگئی۔ میں آئندہ کے لئے اسے سرزنش کروں گا۔“

”سید صاحب! بچے کو ڈانٹنے ڈپٹنے سے کیا ہوگا؟ میری لہلہاتی فصل تو واپس نہیں آجائے گی۔“ کھیت

الکافہ بدستور تھا۔

سید خئی محمودؒ نے کھیت کے مالک کی تالیفِ قلب کے لئے معذرت بھی کی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا۔ ”میرے بابائے آزدہ نہ ہو، تمہارا جس قدر نقصان ہوا ہے، اسے میں اپنی جیب سے پورا کر دوں گا۔“
 پھر سید خئی محمودؒ، کھیت کے مالک کے ہمراہ اس جگہ پہنچے، جہاں حضرت امام بریؒ ایک درخت کے سائے میں لہجائے سورہے تھے۔ شفیق دمہریان باب نے حضرت امام بریؒ کے اس طرح بے خبر سونے کو بچپن کی بے خبری بل لیا اور قریب جا کر بیٹے کو آہستہ سے جھنجھوڑا۔

حضرت امام بریؒ نیند سے بیدار ہو گئے اور آنکھیں مل مل کر والد گرامی کی طرف دیکھنے لگے، جیسے نیند کے غلبے کا اثر بچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”کیا دیکھ رہے ہو، عبداللطیف! یہ میں ہوں، تمہارا باب۔“ سید خئی محمودؒ نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔
 ”بابا! آپ نے مجھے بے وقت جگا دیا۔“ حضرت امام بریؒ کے لہجے سے افسوس کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”میں اس لذت کی سیر کر رہا تھا۔“

”تم تو جنت کی سیر کر رہے تھے، مگر اس بے چارے کی کھڑی فصلوں کو دوزخ کے حوالے کیوں کر دیا؟“ سید خئی محمودؒ کے لہجے سے گہری کئی جھلک رہی تھی۔

حضرت امام بریؒ، والد گرامی کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے..... اور حیرت سے سید خئی محمودؒ کی طرف الجھے۔

”تم خود تو درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں پڑ کر سو گئے اور اپنے جانوروں کو اس غریب دہقان کے کھیت چرنے کے لئے چھوڑ دیا؟“ سید خئی محمودؒ نے کھیت کے مالک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”میں نے اپنے جانوروں سے کہہ دیا ہے۔ وہ کسی کے کھیت کا نقصان نہیں کر سکتے۔“ حضرت امام بریؒ نے اپنے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

سید خئی محمودؒ بیٹے کے اس پُر یقین انداز پر حیرت زدہ رہ گئے..... مگر کھیت کا مالک برہم ہو گیا۔

”چلا! میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ تمہارے جانوروں نے میرے ہرے بھرے کھیت کو کس طرح اُجاڑا ہے۔“

حضرت امام بریؒ، کھیت کے مالک کی برہمی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے اور دہقان کے ساتھ اس کھیت میں پہنچے، جس کی بربادی کا کچھ دیر پہلے ذکر ہو رہا تھا۔

سید خئی محمودؒ اور دہقان، کھیت میں پہنچ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ فصل اسی طرح لہلہا رہی تھی۔ بربادی تو بہت دور کی بات ہے، کھیت کی چکی زمین پر جانور کے گزرنے کے آثار تک نہیں تھے۔

”تم نے اتنا بڑا جھوٹ بول کر مجھے اذیت کیوں پہنچائی؟“ سید خئی محمودؒ نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

فرد حیرت سے دہقان کو سکتہ سا ہو گیا تھا..... اور وہ مسلسل اپنے کھیت کی طرف دیکھے چلا جا رہا تھا۔ سید خئی محمودؒ کے دوبارہ مخاطب کرنے پر وہ خیالات کی دنیا سے باہر آیا اور لڑکھڑائی زبان کے ساتھ کہنے لگا۔

”کچھ دیر پہلے تو میں نے کھلی آنکھوں سے تباہی و بربادی کا منظر دیکھا تھا..... مگر اس وقت میری آنکھیں کچھ اور دکھ رہی ہیں۔“

”بابا! میں نے تو آپ سے عرض کیا تھا کہ میرے جانور یہ کام نہیں کر سکتے۔ وہ میری بات خوب مانتے ہیں۔“
 حضرت امام بریؒ کے لہجے میں جذب کی سی کیفیت تھی، جسے سید خئی محمودؒ نے فوری طور پر محسوس کر لیا۔ پھر بیٹے کی

پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگے۔

”معاف کرنا بیٹے! ہم لوگوں نے تمہاری بات پر اعتبار نہیں کیا..... مگر تم سچے ہو۔“ سید سخی محمود کو پہلی بار محسوس ہوا کہ ان کا سات آٹھ سالہ بیٹا، عام بچوں سے بہت مختلف ہے۔

من وعین یہی واقعہ حضرت بابا بلے شاہؒ کی ذات گرامی سے بھی منسوب ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایک نیا واقعہ کئی انسانوں کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔ بس کردار اور مقامات بدل جاتے ہیں۔ مگر واضح رہے کہ حضرت امام بریؒ، حضرت بابا بلے شاہؒ سے 75 سال پہلے دنیا میں تشریف لائے تھے۔

پھر اسی رات سید سخی محمودؒ نے خواب میں روشن چہرہ بزرگ کو دیکھا، جو انہیں مخاطب کر کے کہہ رہے تھے۔ ”محمود! تمہارا بیٹا مولیٰ جرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کی تعلیم پر پوری توجہ دو۔“

یہ کہہ کر وہ نورانی صورت بزرگ غائب ہو گئے..... اور سید سخی محمودؒ کی آنکھ کھل گئی۔ سید محمودؒ ان بزرگ سے واقف نہیں تھے۔ مگر اس حقیقت کو فوراً ہی پانگے کی غیبی اشارہ ہے..... اور پھر اس ہدایت غیبی پر عمل کرنے کے لئے سید محمودؒ نے اپنا سارا ظاہری سرمایہ وقف کر دیا۔



سب سے پہلے حضرت امام بریؒ کو ”غور غستی“ بھیجا گیا، جو اس وقت ایک بڑا دینی مرکز تھا۔ ”غور غستی“ ضلع کیمبل پور کی تحصیل ہے۔ یہاں آپؒ نے تفسیر، حدیث، فقہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر آپؒ کشمیر، بدخشاں، کر بلائے معلیٰ، بغداد، بخارا، مصر اور دمشق کی سیر و سیاحت کرتے رہے۔ اس کے بعد حضرت امام بریؒ مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ بعد ازاں آپؒ نے سرور کوئین حضور اکرم ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضر ہو کر درود و سلام کا نذرانہ پیش کیا۔

بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت امام بریؒ کا یہ دور سیاحت دس سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ مگر کسی مستند تاریخ سے یہ سراغ نہیں ملتا کہ آپؒ کن کن اساتذہ کی بارگاہِ علم میں حاضر ہوئے۔ بس ایک عام اندازہ ہے کہ حضرت امام بریؒ نے مذہبی علوم کے ساتھ اس زمانے کے مروجہ فنون بھی حاصل کئے تھے..... اور ان ہی روایتوں کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ آپؒ ایک عالم اور باخبر صوفی تھے۔

الغرض پچیس سال کی عمر میں حضرت امام بریؒ اپنے وطن واپس تشریف لائے..... اور جو کچھ بزرگوں سے حاصل کیا تھا، اسے بندگانِ خدا میں تقسیم کرنے کا اہتمام کیا۔

علم، ہمتیوں اور درس گاہوں کے بغیر تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اسی آفاقی اصول کے تحت حضرت امام بریؒ نے سب سے پہلے ایک مدرسہ تعمیر کیا۔ جس کی دیواریں اُنھانے اور چھت ڈالنے میں آپؒ نے کسی مقامی امیر یا جاگیردار سے کوئی مالی معاونت طلب نہیں کی۔ اگر کسی نے اخراجات کے بارے میں پوچھا تو حضرت امام بریؒ نے بس اتنا فرمایا۔

”دینے والا دیتا ہے..... اور میں اسی کی راہ میں خرچ کر دیتا ہوں۔ زمین و آسمان میں سارے خزانے اسی کے تو ہیں۔“

اسی روایت کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ حضرت امام بریؒ کو ”دستِ غیب“ حاصل تھا۔

درس گاہ قائم ہونے کے بعد نزدیک و دور کے طالبانِ علم ایک مردِ درویش کی طرف رجوع کرنے لگے۔ حضرت امام بریؒ نے غیر مقامی طالب علموں کے لئے درس گاہ سے ملحقہ کچھ کمرے بھی تعمیر کرائے تھے۔ ایسے تمام طلباء ان کمروں میں تعلیم مکمل ہونے تک قیام کرتے تھے۔ قیام کے ساتھ طلباء کے طعام کا انتظام بھی حضرت امام بریؒ نے کیا

تہا اس سلسلے میں طلباء سے کسی قسم کا معاوضہ وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ ایک خالص دینی خدمت تھی، جسے حضرت امام بریلوی صرف اللہ کے لئے تنہا انجام دے رہے تھے۔

اب یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے مدرسے میں طلباء کی کثیر تعداد کی رہائش اور کھانے کا نام ظاہری وسائل کے بغیر کس طرح ممکن تھا؟ اس کا ایک جواب تو وہی ہے کہ حضرت امام بریلوی کو ”دستِ غیب“ ملتا تھا، جسے ایک مردِ درویش کی کرامت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

بال ظاہر کے لئے اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت امام بریلوی نے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر مدرسے کی ہر کام شروع کر دیا تھا اور اخراجات کے لئے کسی صاحبِ ثروت کے سامنے دستِ طلب دراز نہیں کیا تھا۔ پھر لبّے اسبابِ فراہم ہوتے چلے گئے اور ایک دن یہ کارِ دشوار بحسن و خوبی تکمیل پا گیا۔ تصوف میں ایک لفظ ”فوتحاتِ غیبی“ بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ وسیلے کے بغیر فرشتے یا رجالِ نبی (مردانِ غیب) براہِ راست اس درویش کی مدد کرتے رہتے ہیں۔

”فتوحاتِ غیبی“ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ بعض امور میں درویش کوئی ظاہری کوشش نہیں کرتا لیکن اللہ تعالیٰ، ماہرانِ اختیار کے دلوں میں یہ بات ڈال دیتا ہے کہ وہ خود اپنے قدموں سے چل کر درویش کی خانقاہ تک پہنچ جائے اور جو نذر پیش کرنا ہوتی ہے، انتہائی خاموشی سے پیش کر دیتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں ایک مقام پر حق تعالیٰ اپنی اس رحمت بے کنار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم انسان کو الٰہی جگہ سے رزق فراہم کرتے ہیں، جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ حضرت امام بریلوی کی فتوحاتِ غیبی بھی اسی انداز کا نظم کہ دنیا داروں کو ظاہری اسباب نظر نہیں آتے تھے مگر خلاقِ عالم ان کی کار سازی فرماتا رہتا تھا۔



ابھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن والدہ محترمہ نے فرمایا: ”عبداللطیف! حق تعالیٰ نے تمہاری ماری خواہشات پوری کر دیں اور تمہیں علم کی دولت سے مالا مال فرما دیا۔ اب تم از دو اجی زندگی اختیار کر کے ماں کی خواہش بھی پوری کر دو۔“

حضرت امام بریلوی دنیا داری کے کاموں سے فطرتاً ہی اجتناب کرتے تھے، اس لئے بڑے ادب سے عرض کرنے لگے: ”مادرِ گرامی! شادی، درویش کے لئے ایک بندھن ہے..... اور شادی کی زنجیروں میں رہ کر بھی اپنی آزادی ہزار رکھی ہے۔“ والدہ ماجدہ نے ایک طاقتور دلیل پیش کی۔ اُردو کے مشہور شاعر جگر مراد آبادی نے اسی مضمون کو بے دُکھ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

اس حُسنِ برق و ش کے دل سوختہ وہی ہیں !!

شعلوں سے بھی جو کھیلیں، دامن کو بھی بچالیں

”وہ بڑے صاحبِ ہمت اور جانباز درویش تھے۔ اس لئے دونوں ذمے داریاں نبھائے۔ مگر میں ایک کمزور انسان ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ توازن برقرار نہ رکھ سکوں..... اور لڑکھڑا کر بیچ راستے میں ہی گر جاؤں۔“ حضرت امام بریلوی نے نہایت شائستہ انداز میں معذرت کی۔

”ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ وہ تمہیں ہر مشکل مقام پر سہارا دے کر گرنے سے بچالیں گی۔“ والدہ محترمہ کے ایک ایک لفظ سے شدتِ جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔

آخر حضرت امام بریلوی نے اپنی ذاتی خواہش کو والدہ ماجدہ کی آرزو پر قربان کر دیا..... اور ہزارہ کے ایک معزز

سردار سید نور محمد کی صاحبزادی، بی بی دامن خاتون سے شادی کر لی۔

ایک سال بعد حضرت امام برٹی کے یہاں ایک خوب صورت لڑکی پیدا ہوئی جو صرف چند ماہ زندہ رہ سکی۔ آپ اپنی نو مولود صاحبزادی سے بہت محبت فرماتے تھے کہ گھر کے ملازم نے بچی کے انتقال کی خبر دی۔ حضرت امام برٹی نے یہ جانگذاختن کر نہایت صبر و تحمل کے ساتھ فرمایا۔
”جو کچھ ہے، اللہ کی طرف لوٹ کر جانے والا ہے۔“

پھر حضرت امام برٹی نے اپنی محبوب نشانی کو اپنے ہی ہاتھوں سے قبر میں اتار دیا۔ یہ پہلی آزمائش تھی، جس میں آپ ثابت قدم رہے۔ اولاد جیسی نعمت سے محروم ہو جانے کے بعد بھی حضرت امام برٹی نے خالق کائنات کا شکر ادا کیا کہ تسلیم و رضا ہی معرفت کی آخری منزل ہے۔

بی بی دامن خاتون نے بیٹی کی موت کا بہت زیادہ اثر قبول کیا اور وہ اس صدمے سے بیمار پڑ گئیں۔ حضرت امام برٹی نے شریک حیات کی تیمارداری کے ساتھ ساتھ صبر و رضا کی تلقین کی۔ مگر مشیت الہی کچھ اور ہی تھی۔ ایک حواس ماں، اولاد کی جدائی برداشت نہ کر سکی۔ انجام کار ایک سال کی علالت کے بعد بی بی دامن خاتون بھی انتقال کر گئیں۔ یہ صدمے اور غم کی دوسری شدید ضرب بھی، جو درویش کے دلِ نازک پر پڑی۔ مگر اسے بھی برداشت کرنا پڑی۔ کیونکہ مرضی مولا..... از ہمداد لی.....

پاکباز بیوی اور معصوم بچی کی دائمی جدائی کا غم کوئی معمولی نہیں تھا۔ حضرت امام برٹی اُداس رہنے لگے۔ چند ماہ بعد آپ کے والد محترم سید خنی محمودؒ نے دوسری شادی کے لئے اصرار کیا۔ جواب میں حضرت امام برٹی نے نہایت ادب کے ساتھ فرمایا۔ ”اگر یہ دنیاوی خوشیاں میرے مقدر میں ہوتیں تو بیوی اور بچی مجھ سے بچھڑتیں ہی کیوں؟“

والدین سمجھ گئے کہ بیٹے نے مہذب اور شائستہ لہجے میں دوسری شادی سے انکار کر دیا۔ اس لئے سید خنی محمودؒ خاموش ہو گئے اور بیوی کو کبھی سمجھا دیا کہ وہ اس سلسلے میں عبداللطیفؒ پر زیادہ زور نہ دیں..... اور انتظار کریں کہ پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟



اور پھر پردہ غیب سے وہ بات ظاہر ہو گئی، جس کی کسی کو اُمید نہیں تھی۔ حضرت امام برٹی نے بہت علم حاصل کیا تھا اور بے شمار کتابیں پڑھی تھیں۔ عقل کی غذا مل گئی تھی۔ مگر روح بھوکی تھی۔ ذہن حرفوں اور کاغذوں کا انبار دیکھ کر مطمئن تھا، مگر کسی کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔

ایک دن حضرت امام برٹی کی ملاقات سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ شیخ حیات المیرؒ سے ہوئی۔ آپ نے گفتگو کے دوران عرض کیا۔ ”شیخ! مجھ پر ایک اضطراب مسلسل طاری رہتا ہے۔ کسی بھی حالت میں سکونِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔“

حضرت شیخ حیات المیرؒ نے جواب میں قرآن حکیم کی یہ آیتِ مقدسہ تلاوت فرمائی۔ ”دلوں کو سکون تو اللہ ہی کے ذکر سے ملتا ہے۔“

حضرت امام برٹی نے بھی بارہا اس آیتِ مقدسہ کی تلاوت کی تھی۔ مگر جب یہی کلامِ الہی ایک مردِ حق پرست کی زبان سے سنا تو آپ کے دل کی حالت غیر ہو گئی اور بے اختیار رونے لگے۔

حضرت شیخ حیات المیرؒ نے اپنا دستِ کرم حضرت امام برٹی کے سر پر رکھتے ہوئے فرمایا۔ ”اے جانِ بے قرار!

بڑے سکون حاصل کر۔“

میرے ذمہ ذکر کا طریقہ بتائیے۔ حضرت امام بریؒ نے درخواست پیش کی۔

اب درخواست قبول کر لی گئی..... اور حضرت شیخ حیات المیرؒ نے آپ کو سلسلہ قادریہ میں بیعت فرمالیا۔

حضرت امام بری قادریؒ کے پیر و مرشد حضرت شیخ حیات المیرؒ کے بارے میں عام تذکرہ نویسوں نے اس سے باز نہیں کیا کہ آپ غوث اعظم سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پوتے تھے۔ اگر اس روایت کو درست لیا جائے تو پھر حضرت حیات المیرؒ اور حضرت امام بریؒ میں پیری اور مریدی کا یہ رشتہ قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ حضرت حیات المیرؒ، حضرت غوث اعظمؒ کے پوتے ہونے کے سبب 600ھ کے بزرگ ہیں..... اور حضرت مائنا پیدائش مبارک بعض روایتوں کے مطابق 1026ھ میں ہوئی۔ اس طرح دونوں بزرگوں کے زمانوں کا چار سو سال کا فرق ہے۔ مگر یہ روحانی سلسلہ کس طرح قائم ہوا؟

ہمارے نزدیک اس واقعے کی ایک توجیہ ہو سکتی ہے۔ وہ یوں کہ جب ہم کسی شخص کا نسب نامہ تحریر کرتے ہیں تو ”دادا“ تک براہ راست رشتہ لکھتے ہیں..... اور اس کے بعد جس قدر بزرگوں کے نام آتے ہیں، ان کے نام ”دادا“ ہی تحریر کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے دادا کے اوپر رشتے گنوانے کے لئے ”پردادا“..... ”مگردادا“ ”دادا“ جیسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ مگر یہ سارے الفاظ کچھ غیر معروف سے ہیں، اس لئے زیادہ مستعمل کے مجبوراً نملائے تحقیق نے ”دادا“ سے اوپر آنے والے رشتوں کو بھی ”دادا“ ہی کہہ کر پکارا۔ اسی طرح اگر کوئی نسلدان میں چار سو سال کے بعد پیدا ہوتا ہے تو وہ بھی رشتے کے اعتبار سے ”پوتا“ ہی کہلائے گا۔ حضرت مائنا کے پیر و مرشد حضرت شیخ حیات المیرؒ چونکہ حضرت غوث اعظمؒ کی نسل میں تھے، اس لئے انہیں بھی آپ کا نام تحریر کیا گیا۔

لہذا تحقیق کے دوران ایک اور عجیب روایت سامنے آئی، جو بڑی ہی حیران کن ہے۔

ظہیر الحق اعجاز الحق قدوسی اپنی تالیف تذکرہ صوفیائے پنجاب میں حضرت امام بریؒ کے حوالے سے اس طرح لکھتے ہیں۔

”شہ لطف بریؒ پنجاب کے مشہور صوفیائے کرام میں سے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی زندگی کے حالات ہمیں نامعلوم نہیں ملتے۔“

میرے یہ کہ یہاں اعجاز الحق قدوسی کی مراد قدیم اور معتبر تذکروں سے ہے، جن میں حضرت امام بریؒ کے زندگی نظر آتے۔ یعنی کسی قدیم تذکرہ نگار نے مغربی پنجاب کے اس عظیم بزرگ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ ہمارے ہاں کوئی تعجب کی بات نہیں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے حقیقی بھانجے اور سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ ابن حمزہ علاء الدین صابر کلیریؒ کے نام نامی سے ایک عالم واقف ہے۔ مگر صوفیاء کے قدیم تذکروں میں کہیں آپ کا ذکر مبارک نہیں ملتا۔ کچھ یہی صورت حال حضرت شاہ عبداللطیف امام بریؒ کے ساتھ بھی ہے۔

اے گل کر اعجاز الحق قدوسی صاحب تحریر کرتے ہیں۔ ”تذکرہ نگاروں میں مفتی غلام سرور لاہوری نے اپنی ”معارف الاولیاء“ میں شاہ لطف بریؒ کا تذکرہ صرف چند سطروں میں کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”شہ لطف قادریؒ قدس سرہ بزرگان پنجاب سے، یہ حضرت بڑے بزرگ مشہور ہیں۔ حضرت کے خوارق و بات ہزاروں مشہور ہیں۔ حضرت بڑے عابد و زاہد، گوشہ نشین، مست و مجذوب تھے۔ ان کے ہزاروں مرید، شاہنشاہ تھے۔ حضرت نے نعمت باطنی، حضرت حیات المیرؒ زندہ پیر سے پائی، جو حضرت غوث اعظمؒ کے پوتوں

میں سے زندہ جاوید ہیں۔“

غلام مفتی سرور لاہوری نے بس یہی چند سطر میں حضرت امام بریؒ کے بارے میں تحریر کی ہیں۔ جن سے آپ کے زہد و تقویٰ، کثرت عبادت و ریاضت اور کرامات کی صرف نشاندہی ہوتی ہے۔ رہے باقی حالات زندگی تو کسی ایک گوشے پر برائے نام بھی روشنی نہیں پڑتی۔ بہر حال آج جس قدر بھی کتابیں یا مضامین حضرت امام بریؒ کے حوالے سے موجود ہیں، ان میں حضرت حیات المیرؒ کا اسم گرامی تو موجود ہے، مگر جس طرف مفتی غلام سرور لاہوری نے اشارہ کیا ہے، اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ”حدیثۃ الاولیاء“ ہی میں پہلی بار حضرت حیات المیرؒ کے ساتھ ”زندہ پیر“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ”زندہ پیر“ کی وضاحت خود مفتی غلام سرور لاہوری نے اس طرح کی ہے کہ حضرت غوث اعظمؒ کے پوتے حضرت حیات المیرؒ زندہ جاوید ہیں۔ یعنی بظاہر آپ نے اہل دنیا کی نظروں سے پردہ فرمایا ہے، لیکن حقیقتاً آپ زندہ ہیں اور آپ کا فیض جاری و ساری ہے۔

”حیات بعد الموت“ مسلمانوں کے ایمان کا ایک نہایت اہم حصہ ہے۔ جب کوئی مسلمان، اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اسے تمام سابق انبیائے کرام اور آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے صدقِ دل سے یہ اقرار بھی کرنا پڑتا ہے کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی بھی موجود ہے جو آخرت کی دائمی زندگی ہے اور جس کا خاتمہ کبھی نہیں ہوگا۔ یہ زندگی ”رو و محشر“ اور دنیا میں کئے جانے والے اعمال کی ”سزا و جزا“ سے وابستہ ہے۔ اہل ایمان اور نیک کام کرنے والے ”جنت“ کے مستحق ہوں گے، جہاں دوسری بے شمار نعمتوں کے ساتھ روح افزاء باغات ہوں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اس کے برعکس اہل کفر اور بدکار لوگ اس طرح دوزخ میں ہوں گے، جس کی آگ کبھی نہیں بجے گی۔ مختصر یہ کہ دنیا کی ظاہری موت کے بعد ایک اور زندگی موجود ہے۔ انسان کی اسی حالت کو ”حیات بعد الموت“ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا واضح حکم موجود ہے۔ ”ہر جاندار کو ایک مقررہ دن پر موت کا ڈالنا چھوڑنا ہے۔“ یعنی ایک طے شدہ وقت کے مطابق ہر جاندار (انسان اور حیوان) کی سانسوں کا شمار ختم ہو جاتا ہے اور اسے اپنی اپنی مذہبی رسم کے مطابق یا تو سپردِ خاک کر دیا جاتا ہے یا پھر آگ میں جلا کر اس کی راکھ پانی میں بہا دی جاتی ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام ہی اللہ کے محبوب اور مقرب ترین بندے ہیں۔ جب انہیں بھی قدرت کے اس مخصوص قانون کے مطابق موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا ہے تو پھر عام انسانوں کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اپنے اسی قانون کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے ”سورہ رحمن“ کی آیت مقدسہ میں بھی کی ہے۔

”سب کچھ فنا ہونے والا ہے..... اور باقی رہنے والی ذات اسی رب ذو الجلال والا کرام کی ہے۔“ ترجمہ۔
ان آیات مقدسہ کی روشنی میں کسی پیر یا ولی کا مرنے کے بعد زندگی کی طرح رہنا، ایک انتہائی ناقابلِ فہم بات ہے۔ تصوف کی طویل و مخنیم تاریخ میں کئی بزرگوں کے ناموں کے ساتھ ”زندہ پیر“ کا لقب وابستہ کر دیا گیا ہے۔ ایسے واقعات پڑھنے کے بعد عام انسانی ذہن الجھ جاتا ہے..... اور پھر ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس قدر متحیر ہو جاتا ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ پھر یہ خوش عقیدگی ایسے ایسے واقعات تراش لیتی ہے کہ مسلمان صوفیاء پر طلسماتی شخصیات یا جادوئی پیکر ہونے کا گمان گزرنے لگتا ہے۔

حضرت امام بریؒ کے پیر و مرشد، حضرت شیخ حیات المیرؒ کو بھی ”زندہ پیر“ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ مفتی غلام سرور کی روایت کے مطابق حضرت غوث اعظمؒ کے پوتے ایک زندہ جاوید ولی ہیں۔ سینکڑوں سال پہلے دنیا سے گزر جانے کے باوجود حضرت شیخؒ نے گیارہویں صدی ہجری میں حضرت امام بریؒ کی روحانی تربیت کی۔

دن کی دنیا میں کچھ ایسے معتبر واقعات بھی نظر آتے ہیں کہ ایک طالب معرفت کسی مرحوم بزرگ سے والہانہ ہمت لے لے کر اسے یہ خواہش شدید اضطراب میں مبتلا کرتی ہے کہ کاش وہ ان بزرگ کو اپنے سامنے موجود پاتا۔ ان کی دست مبارک پر بیعت ہو جاتا۔ چونکہ بزرگ کا انتقال ہو جانے کے باعث ظاہری طور پر یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ لیکن اس لئے حق تعالیٰ اس بے قرار معرفت کی تسکین کے لئے غیب سے یہ انتظام فرماتا ہے کہ وہی رازب کے ذریعے اس شخص سے ملاقات کرتے ہیں اور پھر ان کی روحانی تاثیر اس شخص میں منتقل ہو جاتی۔ ان میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جن پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں حضرت شیخ حیات المیرؒ کے حوالے سے دو ہی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اگر ان غوثِ اعظمؒ کے عظیم و جلیل پوتے، حضرت شیخ حیات المیرؒ صدیوں پہلے دنیا سے گزر چکے تھے تو آپ نے بے ذریعے حضرت امام برہنہ کی روحانی تربیت کی..... اور اگر آپ گیارہویں صدی ہجری میں ہندوستان کے علاقے میں بہ نفس نفیس موجود تھے تو آپ براہِ راست حضرت غوثِ اعظمؒ کے پوتے نہیں تھے..... بلکہ سینکڑوں سال بعد پیدا ہونے والے خاندانِ قادریہ کے ایک محترم فرزند تھے، جو عام روایتی زبان میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ”پوتے“ کہلائے۔

ہماری تحقیق کے مطابق حضرت غوثِ اعظمؒ نے چار شادیاں کیں..... اور ان چاروں ازواج سے آپ کے پانچ بچے ہوئے۔ حضرت شیخ عبدالوہابؒ، حضرت شیخ عبدالرزاقؒ، حضرت شیخ عبدالجبارؒ، حضرت شیخ عبدالعزیزؒ اور حضرت شیخ موسیٰؒ۔ ممکن ہے کہ حضرت غوثِ اعظمؒ کے اور صاحبزادے بھی ہوں مگر عام طور پر معتبر تذکروں میں ان پانچ صاحبزادوں کے اسمائے گرامی نمایاں نظر آتے ہیں۔ کسی بھی معتبر تاریخ کے حوالے سے ان صاحبزادوں کے بارہا نام کی لڑکے کا نام حیات المیرؒ نہیں ہے۔ اس تحقیق سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امام برہنہ کے پیرو اور حضرت شیخ حیات المیرؒ چھٹی صدی ہجری میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ورنہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے نسب نامے میں براہِ راست آپ کا نام موجود ہوتا۔

ہماری اس تحقیق کو ایک اور معروف طریقے سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔ سلسلہ قادریہ میں بیعت ہونے والے اوقات، دعا کے وقت جو اپنا روحانی شجرہ پڑھتے ہیں، ان میں حضرت غوثِ اعظمؒ کے دو صاحبزادوں حضرت شیخ عبدالوہابؒ اور حضرت شیخ عبدالرزاقؒ کے اسمائے گرامی موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان ہی دو صاحبزادوں کے ذریعے سلسلہ قادریہ کو فروغ حاصل ہوا۔ اس روحانی شجرے میں بھی حضرت شیخ حیات المیرؒ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

الغرض ان ہی تاریخی حقائق کی روشنی میں ہمیں ایک بات طے کرنی پڑے گی کہ حضرت شیخ حیات المیرؒ گیارہویں صدی ہجری کے بزرگ تھے، جن سے حضرت امام برہنہ کی ملاقات ہوئی تھی..... اور پھر آپ سلسلہ قادریہ میں بیعت ہو گئے تھے۔ حضرت شیخ حیات المیرؒ کے بارے میں تحقیق نہ ہونے کے باعث ہم نہیں کہہ سکتے کہ سلسلہ قادریہ کے یہ عظیم فرزند، ہندوستان میں کس مقام پر سکونت پذیر تھے اور حضرت امام برہنہ نے کس طرح آپ تک رسائی حاصل کی تھی۔ بس مفتی غلام سرور لاہوری کے تذکرے ”حدیثۃ الاولیاء“ میں اتنا ہی درج ہے کہ حضرت امام برہنہ نے حضرت غوثِ اعظمؒ کے پوتے حضرت شیخ حیات المیرؒ زندہ پیر سے فیضِ روحانی حاصل کیا۔

”حدیثۃ الاولیاء“ کے بعد جس قدر بھی تذکرے یا انفرادی مضامین تحریر کئے گئے، ان کی بنیاد محض قیاسات اور خوش عقیدگی پر ہے۔ ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں اسی خوش عقیدگی نے اپنے اپنے سلسلے

کے بزرگوں کے عجیب عجیب پیکر تراشے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اسلامی تصوف، دیو مالائی داستان بن کر رہ جاتا ہے۔

”تذکرہ اولیائے پاکستان“ 1987ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کی ایک روایت کے مطابق حضرت شیخ حیات الہمیرؒ کے دست مبارک پر بیعت ہونے کے بعد حضرت امام بریؒ نے سخت ریاضتیں کیں۔ اس وقت حضرت امام بریؒ ”موضوع لللاں بھوتو“ میں قیام پذیر تھے۔ آپ کی روحانی شہرت عام ہوتی جا رہی تھی، جس کے نتیجے میں یہاں بہت سے اہل عقیدت جمع ہو گئے تھے۔ اسی مقام پر ایک ندی بہتی تھی۔ حضرت امام بریؒ نے اس ندی کو پانی ”چلہ گاہ“ بنالیا۔ روایت کے مطابق حضرت امام بریؒ بارہ سال تک پانی کے اندر ذکر الہی میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ دریا کی مچھلیاں حضرت امام بریؒ کے جسم مبارک کا گوشت تک نوچ کر کھا گئیں مگر آپ کو ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ نقابت اپنی انتہا کو پہنچ گئی..... اور ایک دن حضرت امام بریؒ بے ہوش ہو کر پانی میں گر پڑے۔

راوی کے بقول موضوع ”للاں بھوتو“ میں آپ کے ہزاروں عقیدت مند موجود تھے۔ اصولی طور پر تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ جس وقت حضرت امام بریؒ بے ہوش ہو کر گرے تھے تو عقیدت مند آپ کو اٹھا کر پانی سے باہر لے آتے۔ مگر ”تذکرے“ میں واضح طور پر تحریر ہے کہ حضرت امام بریؒ پانی ہی میں بے ہوش پڑے رہے۔ اس وقت آپ کے پیرو مرشد حضرت شیخ حیات الہمیرؒ حسن ابدال میں مقیم تھے..... آپ نے اپنے کشف کے ذریعے حضرت امام بریؒ کی یہ حالت زار دیکھی تو فوراً حسن ابدال سے موضع ”للاں بھوتو“ تشریف لائے۔ اس وقت تک حضرت امام بریؒ ہوش میں آچکے تھے۔

حضرت حیات الہمیرؒ نے دریا کے کنارے پر کھڑے ہو کر اپنے محبوب مرید کو مخاطب کیا۔ ”عبداللطیف! پانی سے باہر آؤ۔ تمہارا چلہ تکمیل کو پہنچا۔“

جواب میں حضرت امام بریؒ نے عرض کیا۔ ”سیدی! مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ اپنے پیروں سے چل سکوں۔“ حضرت حیات الہمیرؒ نے حضرت امام بریؒ کے ایک مرید کو حکم دیا۔ وہ شخص دریا میں اُتر اور حضرت امام بریؒ کو سہارا دے کر باہر لایا۔

ہم نے تذکرہ اولیائے پاکستان کی اس روایت کو حرف بہ حرف نقل کر دیا ہے۔ اب اس روایت کا ضعف اور قہم ملاحظہ کیجئے۔ روایت کی ظاہری ساخت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امام بریؒ مسلسل بارہ سال تک پانی کے اندر رہ کر ذکر الہی میں مشغول رہے یہاں تک کہ بے خبری کے عالم میں دریائی مچھلیاں آپ کے جسم مبارک کا گوشت بھی کھا گئیں۔ حقیقتاً واقعہ صرف اتنا ہے کہ بعض وظائف اور اعمال کسی خاص مقصد کے تحت پانی میں کھڑے ہو کر بھی پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی مدت چالیس دن سے لے کر کئی سال بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ چلہ کش سالک مسلسل کئی سال تک پانی کے اندر ہی رہے۔ وظیفے کا ایک وقت اور تعداد مقرر ہوتی ہے۔ اس کے بعد مکمل پڑھنے والا، پانی سے باہر آ جاتا ہے اور اپنے دیگر کاموں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ عقل تسلیم کرتی ہے کہ حضرت امام بریؒ نے بھی دریا میں اپنی ریاضت کا سلسلہ جاری رکھا ہوگا۔ مگر اس طرح نہیں، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ پانی کے اندر کھڑے ہو کر نماز کے ظاہری ارکن کسی طرح بھی ادا نہیں کئے جاسکتے..... اور حضرت امام بریؒ جیسے عالم و باخبر صوفی کسی حال میں بھی اپنی نماز ترک نہیں کر سکتے تھے۔ پانی میں کھڑے ہو کر تو بس اشاروں ہی سے نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ رکوع و سجود تو ممکن ہی نہیں۔ یہ صورت حال تو مردِ مومن کو اس وقت پیش آتی ہے، جب وہ ضعف و ناتوانی سے تھک کر بستر پر گر جائے۔ پھر حضرت امام بریؒ اس چلہ کشی پر اپنی نمازوں کو کس طرح قربان کر سکتے تھے؟ واضح

ہالک اور صوفی، معرفت کا یہ بنیادی نکتہ جانتا ہے کہ مومن کے لئے سب سے بڑی ریاضت ہی نماز ہے۔
نہ کے دوران پچھلیوں کے گوشت کھا جانے کی روایت خلاف عقل بھی ہے اور خلاف شریعت بھی۔ خلاف
ان پچھلیوں کو اپنے جسم کا گوشت کھانا حضرت امام بری کی ریاضت کی شرط نہیں تھی..... ورنہ یہ چلہ کشی
لوفا کہ اس کے بغیر وظیفہ مکمل نہیں ہوتا۔ اگر کہیں ایسی کوئی مثال پائی جاتی ہے تو اس ”رسم جال سوزی“
کا تعلق نہیں ہے۔ اللہ کے آخری دین میں جان دینے کا واضح حکم موجود ہے۔ مگر صرف میدان جہاد
کے مقابل، اللہ کی کبریائی بیان کرتے ہوئے.....

پاکستان کی طرح سے اذیتیں پہنچانا ہندو جوگیوں اور دیگر مذاہب کے راہبوں کا طریقہ ہے۔ جب سرور
عزت اور ذکر الہی میں بہت زیادہ مشقت فرماتے تھے، جس کے نتیجے میں آپ کے پائے اقدس متورم
تھے اللہ کی طرف سے یہ حکم بھی نازل ہوتا تھا۔

حبیب الرحمن! آپ کی جان کا بھی آپ پر حق ہے۔ یعنی آرام کے وقت آرام بھی فرمایا کریں۔“
ابن الام ابوحنیفہ کے متعلق یہ معتبر روایت مشہور ہے کہ آپ نے چالیس سال تک عشاء کی نماز کے وضو سے
بالا کی۔ اس سلسلے میں ہمارے خوش عقیدہ لوگوں کا کہنا ہے کہ چالیس سال تک حضرت امام اعظم کو دوسرے
رات ہی پیش نہیں آئی۔ ایک مشہور روایت کی اس طرح توجیہ کرنے والوں نے یہ سوچنے کی زحمت بھی
نہ کی کہ وہ جس طرح اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں، اس سے انسانی فطرت کے بنیادی اصول متاثر
نہیں۔ اور روایت خلاف عقل قرار پاتی ہے۔ عشاء سے فجر تک وقت بہت طویل ہوتا ہے۔ اس دورانیے میں
بازار میں کا وضو ساقط بھی ہو سکتا ہے۔ اسے دوسری ضروریات بھی پیش آ سکتی ہیں، جنہیں کسی بھی حال میں
پہلے۔ اگر امام اعظم حضرت ابوحنیفہ نے کسی رات میں دو تین مرتبہ وضو کر لیا (اور یقیناً کیا ہوگا) تو کیا اس
بے عظمت میں کمی واقع ہوگئی؟ مبالغے کی حد تک خوش عقیدہ لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ عشاء کے وضو سے
بڑا کارنامہ ایک کارنامہ ہے..... مگر اس سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چالیس سال تک شب بیدار رہ کر
ہلک اور خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے رب کے حضور میں کھڑے رہنا۔

ابن ابوحنیفہ کی اس شب بیداری کے بارے میں آپ کے ایک یہودی پڑوسی کا بیان ہے۔
مات نے ہر مذہب و ملت میں عبادت گزار لوگ دیکھے ہیں۔ مگر ابوحنیفہ جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ امام نماز کی
ہر ایک سچ یا عمارت کا ستون نظر آتے تھے۔“ اس مثال سے اس یہودی کی مراد یہ تھی کہ جب حضرت امام
راکب نیت باندھ لیتے تھے تو پھر رکوع و سجود کے علاوہ اپنی جگہ سے ذرا سی بھی جنبش نہیں کرتے تھے۔ جبکہ
ہات گزار لوگ نماز کے دوران کبھی نہ کبھی تھوڑا بہت پہلو ضرور بدل لیتے ہیں۔

یہودی پڑوسی کا کہنا ہے کہ امام اپنے مکان کی چھت پر رات کی عبادت کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار یوں
نفا کہ نماز پڑھتے وقت امام پر اس قدر گرہ طاری ہو جاتا تھا کہ انہیں دیکھ کر مجھے رونا آ جاتا تھا۔
ہندوؤں کے ساتھ یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ دن کے وقت تین چار گھنٹے آرام بھی فرمایا
نہیں۔ اور یہ آرام اس حکم الہی کے مطابق تھا کہ تم پر تمہاری جانوں کا بھی حق ہے۔

حضرت امام بری بھی اپنے وظیفے یا عمل کا دورانیہ ختم ہونے کے بعد پانی سے باہر تشریف لاتے تھے۔ نمازیں
بالا کرتے تھے اور آرام بھی فرمایا کرتے تھے۔ مگر ہمارے خوش عقیدہ لوگوں نے آپ کی ریاضت و عبادت کو
کی نعمت بنا کر رکھ دیا۔ باری تعالیٰ اپنی کتاب مقدسہ میں بار بار ارشاد فرماتے ہیں۔

”اللہ تو تمہارے لئے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے۔“

مگر ہمارے تذکرہ نگار، بزرگانِ دین کے ناموں کے ساتھ دشوار ترین اعمال وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور بھی اس قدر محیر العقول انداز میں کہ اگر آج کا کوئی صاحبِ ہوش انسان ان واقعات کو پڑھے تو بے سار ہو جائے۔
اُٹھے۔ ”ایں چہ بوالعجبی۔“

”تذکرہ اولیائے پاکستان“ کی اس روایت کا دوسرا حصہ پہلے سے بھی زیادہ عجیب تر ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔
حضرت شیخ حیات الہمدانیؒ کے حکم سے جس مرید نے حضرت امام بریؒ کو دریا سے باہر نکالا تھا، وہی آپ کا بیٹا مہمان بنا کر لے گیا۔ وہ مرید ایک چھوٹا موٹا کاشتکار تھا اور اس کے یہاں 70 بھینسیں تھیں۔ چونکہ راوی کے بقول حضرت امام بریؒ، بارہ سالہ چلہ کشی کے بعد بہت زیادہ نحیف و لاغر ہو گئے تھے، اس لئے مرید نے اپنے پیروں کی صحت کی بحالی کی غرض سے روزانہ ایک بھینس کا دودھ پلانا شروع کیا۔ جو لوگ مویشی پالتے ہیں، ان کے بچے کے حساب سے بعض اعلیٰ نسل کی بھینسیں صبح شام دس بارہ گلو دودھ دیتی ہیں۔ عام نسل کی اور کمزور بھینسیں دو وقت چار پانچ گلو دودھ ضرور دیتی ہیں۔..... ورنہ انہیں قصاب کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ یہ ساری تعلیمات پالنے کرنے کا ایک ہی مقصد ہے کہ حضرت امام بریؒ کا وہ مرید روزانہ اپنے پیروں پر دس گلو دودھ پلائے۔ بزرگ، جو اپنی نفس کشی اور شدید ریاضت کے لئے ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کی روزانہ غذا چار پانچ گلو دودھ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ دودھ کی اتنی مقدار تو عموماً پہلوان لوگ ہی استعمال کرتے ہیں۔ حضرت امام بریؒ جیسے صوفی کے نام کے ساتھ ایسے واقعات کا منسوب کرنا ایک گستاخانہ برأت کے سوا کچھ نہیں۔

روایت ہے کہ جب وہ مرید، شام کا دودھ دودھ لیتا تھا تو بھینس بیمار ہو کر اسی رات مرجاتی تھی۔ پہلی بار جب واقعہ پیش آیا تو حضرت امام بریؒ کے مرید نے اسے ایک اتفاقاً حادثہ سمجھا۔ دوسرے دن دوسری بھینس کا دودھ مرشد کی خدمت میں پیش کیا اور رات تک وہ بھینس بھی پہلی بھینس کی طرح مر گئی۔ اب کی بار مرید کے چہرے پریشانی اور فکر کا ہلکا سا رنگ اُبھرا۔ مگر اس نے فوراً ہی اپنے ذہن کو اس قسم کے اندیشوں سے پاک کر لیا۔

پھر تیسرے دن تیسری بھینس بھی مر گئی۔ اب مرید کو یقین ہو چلا تھا کہ پیروں پر دس گلو دودھ پینے اور بھینس مرنے میں کوئی خاص تعلق ضرور ہے۔ چوتھے دن چوتھی بھینس بھی مر گئی۔ تمام جانوروں کے مرنے کا ایک ہی انداز تھا۔ جب وہ شام کا دودھ دودھ لیا کرتا تھا تو بھینس فوراً ہی بیمار پڑ جاتی تھی..... اور پھر چند گھنٹے بیمار رہ کر مرجاتی تھی۔ چوتھی بھینس کے مرنے کے بعد حضرت امام بریؒ کے مرید پر یہ راز فاش ہو چکا تھا کہ اگر وہ اسی طرح اپنے شیخ دودھ پلاتا رہے گا تو ایک ایک کر کے ساری بھینسیں مرجائیں گی۔ ایک کاشتکار یا دودھ کا کام کرنے والے دیہاتی کا تو سارا سرمایہ ہی اس کے جانور ہوتے ہیں۔ وہ مرید خوش عقیدت اپنی آنکھوں سے اپنے جانوروں کو مرنے دیکھ رہا تھا اور جو باقی بچے تھے، ان کا انجام بھی اس پر ظاہر تھا۔ ایسے سنگین اور نازک وقت میں بہت سے ذہین منتر ہو جاتے ہیں..... اور انسانی عقائد میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ پھر مرید یا تو حلقہ ارادت سے نکل کر فرار ہو جاتا ہے..... یا خاموش رہ کر قربانیوں سے جی چرانے لگتا ہے..... اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو نقصان کی آخری حد سے گزرنے کے بعد بھی ثابت قدم رہتے ہیں۔ وہ مذہب ہو یا مادہ پرستانہ نظام، انسانی فطرت ان ہی تین مراحل سے دوچار ہوتی ہے۔

حضرت امام بریؒ کے اس مرید خاص کے لئے بھی یہ فیصلہ کن مرحلہ آ گیا تھا۔ وہ اسی طرح اپنے پیروں پر دس گلو دودھ پلائے۔ اپنی بھینسوں کا دودھ پلاتا رہے اور صلے کے طور پر ان کی لاشیں اٹھا کر جنگل میں پھینکنا رہا۔ یا پھر بہانہ سازی سے کام

رواں کالیوں میں کہہ دے کہ اب اس کے پاس دودھ پلانے کا کوئی انتظام نہیں ہے..... یا پھر پیر و مرشد پکار کر ”اے والدینا“ کی محبت غالب آجائے اور وہ حلقہ ارادت توڑ کر ہمیشہ کے لئے اس زنجیر غلامی سے آزاد ہو

”اے والدینا“ پاکستان کے مطابق حضرت امام برٹی کا وہ گمناں مرید انتہائی راسخ العقیدہ بھی تھا اور پیر و مرشد مرید مرشد بھی۔ اس نے اپنا مادی نقصان برداشت کر لیا مگر پیر و مرشد کی خدمت سے منہ نہیں موڑا۔ وہ مرید امام برٹی کو ایک بھینس کا دودھ پلاتا رہا۔ یہاں تک کہ ستر دن میں اس کی ستر بھینسیں مر گئیں۔ اب وہ مرید کا مفلس ترین شخص تھا۔

”اے والدین، جب حضرت امام برٹی نے اپنے مرید سے پینے کے لئے دودھ مانگا تو وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر مرید نے دودھ کے لئے اصرار کیا تو مرید اپنی بے چارگی پر رونے لگا۔ حضرت امام برٹی نے رونے کا سبب پوچھا تو مرید عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ ستر بھینس، وہ ایک ایک کر کے مر گئیں۔“

”اب تمہارے پاس کوئی جانور نہیں ہے؟“ حضرت امام برٹی نے اپنے مرید سے سوال کیا۔

”نہیں ایک بھینسا ہے۔“ مرید نے انتہائی غم زدہ لہجے میں کہا۔ ”افسوس کہ دودھ نہیں دے سکتا۔“

”اے والدین! دودھ لے آؤ۔“ حضرت امام برٹی نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”اے والدین! بھینسا کس طرح دودھ دے سکتا ہے؟“ مرید نے عرض کیا۔

”اے والدین! جو کہا جا رہا ہے، اس پر عمل کرو۔“ حضرت امام برٹی نے فرمایا۔

یہ بات فرما کر انہیں تھا کہ پیر و مرشد سے حجت کرتا۔ مگر اس کا ذہن منتشر ہو گیا کہ یہ ”انہونی“ کس طرح ہوگی؟ والدین ہی پریشان خیالات میں، باڑے تک پہنچا۔ پھر جب اس نے بھینس پر نظر ڈالی تو اسے کچھ دیر کے لئے نہ ہو گیا۔ وہ جس ”انہونی“ کے بارے میں سوچ رہا تھا، وہی ”انہونی“ اس کی آنکھوں کے سامنے ”ہونی“ ہو گیا۔ پھر بھینسا دیکھتے ہی دیکھتے ایک تندرست و توانا بھینس میں تبدیل ہو گیا۔ مرید نے حسب سابق اپنی آخری بار دودھ بھی پیر و مرشد کی خدمت میں پیش کر دیا۔

پھر بھینس بھی دوسرے جانوروں کی طرح چند گھنٹے بیمار رہ کر مر گئی۔

”اے والدین! صبح اُدا اس چہرے کے ساتھ حضرت امام برٹی کی خدمت میں حاضر ہوا اور انتہائی غم زدہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”شیخ! آپ کی دعا سے جو بھینسا، بھینس کی شکل میں ڈھل گیا تھا، وہ بھی رات کے پچھلے پہر مر گیا۔“

حضرت امام برٹی، مرید کی بات سن کر مسکرائے اور فرمانے لگے۔ ”تم اس ندی کے کنارے جاؤ، جہاں میں نے پانی کی گئی۔ ایک نظر ندی کے پانی پر ڈالو، پھر پانی کی طرف اپنی پشت کر لو۔“ حضرت امام برٹی اپنے مرید کو بات دے رہے تھے۔ ”پھر اپنی بھینسوں کے نام لے کر انہیں پکارو..... مگر خبردار! پیچھے کی طرف مڑ کر نہ دیکھنا۔“

مرید نے بڑی حیرت سے پیر و مرشد کی بات سنی اور سر جھکائے ہوئے ندی کی جانب چلا گیا۔ یہ وہی ندی تھی، جسے ”اے والدین! پاکستان“ کی روایت کے مطابق حضرت امام برٹی نے بارہ سال تک چلے کسی کی تھی..... اور

ندی کی مچھلیوں نے آپ کے جسم مبارک کا گوشت تک کھا لیا تھا۔

مرید نے حسب ہدایت پانی پر ایک نظر ڈالی اور ندی کی طرف پشت کر کے با آواز بلند کہنے لگا۔ ”اے میری والدین! اے والدین! آجاؤ۔“

پھر جیسے ہی مرید کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کی بازگشت ختم ہوئی، ندی کے پانی میں ایسا شور مچا رہے کسی بڑے جانور کے گزرنے سے ایک مخصوص آواز پیدا ہوتی ہے۔ مرید نے مڑ کر نہیں دیکھا اور چند لمحوں میں ایک مُردہ بھینس اپنے مالک کی نظروں کے سامنے سے گزر کر جنگل کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ پھر اسی طرح مڑ کر بھینس زندہ ہو گئیں۔

ہم نے اس سلسلے میں انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے حضرت امام برٹی کے اس مرید سے ایک ہی بار آواز دوائی ہے۔ اس کے برعکس ”تذکرے“ میں یہ روایت یوں بیان کی گئی ہے۔

”مرید، ندی کے قریب پہنچا اور بھینسوں کا نام لے کر اس نے پکارنا شروع کیا۔ وہ جس بھینس کا نام لیتا، وہ پانی سے نکل کر اس کے قریب آتی اور چپ چاپ کھڑی ہو جاتی۔ اسی طرح ساری مُردہ بھینس زندہ ہو کر پانی سے نکلیں۔“

اس روایت کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر، یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اس شخص نے اپنی ستر بھینسوں کے الگ الگ نام رکھ چھوڑے تھے..... اور وہ کس روانی کے ساتھ اپنی بھینسوں کے نام لے رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ انسانی میں بعض بڑے قوی الحافظہ لوگ گزرے ہیں اور ان کے ذہنوں میں کسی واقعے کی چھوٹی چھوٹی جڑ بات بھی محفوظ رہا کرتی تھیں۔ مگر ان خال خال مثالوں کا اطلاق عام انسانی معاشرے پر نہیں ہوتا۔

عرب کے ایک بادشاہ کا مشہور واقعہ ہے۔ اس نے چار شادیاں کی تھیں۔ چاروں بیویوں سے دس دس، بارہ بارہ لڑکے تھے۔ اس طرح اس بادشاہ کے لڑکوں کی تعداد چالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ جب یہ تمام بیٹے بچت باپ کے سامنے موجود ہوتے تو بادشاہ کو انہیں پہچاننے میں شدید دشواری پیش آتی۔ وہ اکثر بیٹوں سے سوال کرنا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ یہ واقعہ سعودی عرب کے بادشاہ عبدالعزیز یا شاہ سعود کے نام سے منسوب ہے۔ جب ایک حکمران کو اپنے بیٹوں کے نام یاد رکھنے میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا تو پھر ایک دیہاتی شخص کس طرح اپنی 70 بھینسوں کو نام بہ نام پکار سکتا تھا۔ خیر! یہ تو ایک عقلی اعتراض تھا۔ اب اس روایت کا آخری حصہ دیکھتے جو اور بھی پُر اسرار اور ناقابل یقین ہے۔

آخر میں حضرت امام برٹی کے مرید نے اپنے بھینسے کا نام لے کر پکارا۔ بھینسا کھلتا ہوا پانی سے نکل ہی رہا کہ اچانک مرید نے پلٹ کر ندی کی طرف دیکھا۔ جیسے ہی اس کی نظر اپنے بھینسے پر پڑی، وہ اسی وقت پتھر کا ہو گیا۔ بھینسے کا آدھا جسم، پانی کے اندر تھا اور آدھا باہر۔ پتھر کا یہ بھینسا بہت دنوں تک اسی حالت میں رہا..... مگر اندازہ زمانہ سیلاب کے باعث اب یہ بھینسا غائب ہو چکا ہے۔

یہ پوری روایت ہی ایک طلسمی کہانی نظر آتی ہے۔ آخر میں پتھر کے بھینسے کو اس لئے غائب کیا گیا کہ نئے زمانے کے آنے والے زائرین کو اس روایت پر کسی قسم کا شک نہ ہو..... اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی جائے کہ حضرت امام برٹی کی کرامت کے نتیجے میں پتھر بن جانے والے اس بھینسے کو سیلاب کا پانی بہا کر لے گیا۔ چونکہ وقت بڑی بڑی نشانیوں کو منادیتا ہے، اس لئے آسانی سے اس عذر کو بھی تسلیم کر لیں گے۔

”ہم نہیں جانتے کہ یہ روایت کس خوش عقیدہ شخص نے تراشی اور اس کے پیچھے اس کے کیا عزائم تھے؟ ظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جس انداز کا نظام خانقاہ رائج ہے، یہ سب اسی کی کرشمہ سازی ہے۔ آپ کسی بھی درگاہ پر حاضر ہوں، وہاں جو مجاورین بیٹھے ہیں، وہ آپ کو مذکورہ مزار سے متعلق ایسے ایسے واقعات سنا دیں گے، جنہیں سن کر عقل انسانی دنگ رہ جائے گی۔ اگر آپ ان مجاورین کرام سے کسی واقعے کی سند مانگیں گے کہ

جنہاں میں درج ہے تو وہ حوالہ پیش کرنے سے صاف انکار کر دیں گے اور اپنی بات کو منوانے کے لئے اس بات پر اصرار کریں گے کہ سننے والا دم بخود رہ جائے گا۔ مجھ گناہ گار و عاجز کو بھی کئی بار ایسی ہی صورت حال باوجود پڑ چکا ہے۔ ایسے مواقع پر بزرگانِ دین کے مزاراتِ مبارکہ کی درباری کرنے والے حضرات کچھ اس انداز میں بات کرتے ہیں۔

”لے بڑے بزرگ کی ذات سے ہزاروں کرامات ظاہر ہوئی ہیں۔ ان تمام واقعات کو تاریخ کے محدود صفحات اندر کسی طرح سمیٹ سکتے ہیں؟ اس کا طویل کے لئے تو ایک ضخیم دفتر درکار ہوگا۔“

بلا رہیں کرام کی یہ دلیل تو بڑی حد تک درست ہے کہ کسی عظیم شخصیت کی ذات سے وابستہ تمام واقعات کو تاریخ نویس لکھ لیا جاسکتا۔ پوری تاریخِ انسانی میں یہ منفرد اعزاز صرف سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ کتبِ درودِ مقدس کے ایک ایک لمحے کا ریکارڈ رکھا گیا ہے..... اور اس ذیل میں آج تک آپ کے جاں بحق و جنتو جاری ہے۔

بلا رہیں مزارات کی طرف سے یہ معقول دلیل دینے کے بعد جو دوسری دلیل پیش کی جاتی ہے، وہ بہت ہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ روایت سینہ بہ سینہ، نسل در نسل اور خاندان در خاندان ہم تک پہنچی ہے۔ جب کسی کی بنیاد ”سینہ بہ سینہ“ پر رکھی جاتی ہے تو پھر بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ ذمے دار لوگ خاموشی سے سنتے رہتے مگر ذمے داروں کو واپس چلے جاتے ہیں اور وہ اپنے فرض کو محسوس کرتے ہوئے اس قسم کی روایتوں کو آگے نہیں لے کر کچھ سادہ لوح انسان، جنہیں الفاظ کی ضرور رسانی کا اندازہ نہیں ہوتا، وہ ان سینہ بہ سینہ بیان کی جانے والی کو ضبطِ تحریر میں لے آتے ہیں..... اور پھر یہی غیر مستند واقعات، تاریخ بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ”بڑی“ اور ”عدم آگہی“ کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس زمرے میں اکیلے حضرت امام برٹی ہی نہیں، پاک کے بہت سے اولیائے کرام ہیں، جن کی حیاتِ مبارکہ کا تذکرہ ایک طلسمی داستان بن کر رہ گیا ہے۔

اگرچہ کہ سینہ بہ سینہ بیان کی جانے والی روایات میں حقائق بھی شامل ہوتے ہیں اور مفروضہ واقعات..... دنیا میں جب بھی اور جہاں کہیں بھی مفروضہ واقعات تراشے جاتے ہیں، ان کے پیچھے ہمیشہ انسان کے باہمی اقتصادی مفادات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ پاک و ہند کا موجودہ خانقاہی نظام بھی ان ہی مفادات کے ہے۔

جنہاں خانقاہ سے وابستہ افراد اپنے سلسلے کے بزرگوں کو سر بلند رکھنے کے لئے کچھ ایسے واقعات بھی تراش لیتے ہیں کہ حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ پھر ان واقعات کو تشہیر دینے کی غرض سے بڑی کتابیں اور پُر اثر تحریریں لکے جاتے ہیں۔

اے اس اظہارِ خیال پر قارئین کو بہت تعجب ہوگا..... اور وہ سوچیں گے کہ کیا بزرگانِ دین کے بارے میں ایسا جھوٹ بولا جاسکتا ہے؟ جبکہ وہ تمام بزرگ ذاتی طور پر سچائی قائم کرنے کے لئے اپنی جانیں تک گنوا رہے ہیں۔ یہ بہت نازک اور بحث طلب مسئلہ ہے۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں صرف وہی مثالیں کافی ہوں جنہاں اور منتشر ذہنوں کو سکون بخش دیں گی۔

برادرِ شکی اس دنیا میں ”تحریف“ اور ”تبدیلی“ کا عمل صدیوں سے جاری ہے۔ اللہ اپنے برگزیدہ رسولوں اور کے ذریعے آسمانی صحیفے اور کتابیں، بنی نوعِ آدم کی ہدایت کے لئے زمین پر نازل کرتا تھا..... اور شیطان کے ان توانمیں مقدس میں تحریف کر دیا کرتے تھے۔ بعض آسمانی آیاتِ مقدسہ کو اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق

بدل ڈالتے تھے۔ ان کام کاریتوں مشہور آسمانی کتابیں، توریت، زبور اور انجیل مقدس اپنے صحیح خدا خال کے ساتھ اس زمین پر کہیں بھی موجود نہیں واحد قرآن کریم ہے، جو تحریف کے عمل سے محفوظ رہا کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے قبول کی ہے۔

جب تحریف کرنے والے، اللہ کی آخری کتاب میں ایک حرف بھی تبدیل نہ کر سکے تو وہ سرور کونین ﷺ کی احادیث مبارکہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے تراشے ہوئے ہزاروں کلمات، حضور اکرم ﷺ کے ارشادات مقدسہ میں شامل کر دیئے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ حق تعالیٰ نے تحریف کرنے والوں کے مقابل وہ جانناز محدثین کرام بھی پیدا کئے، جنہوں نے ناقابل بیان آفات و مصائب برداشت کرتے ہوئے انسانی ذہن کے تراشے ہوئے اقوال، احادیث کی کتابوں سے نکال پھینکے اور اپنے آقا ﷺ کے فرمودات مقدسہ کو صاف و شفاف کر دیا۔

ان دونوں مثالوں کی موجودگی میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ بزرگان دین کے معاملات میں بھی اسی تحریف سے کام لیا گیا ہے۔ بالفرض اگر ایسا کوئی واقعہ تراشا جاتا ہے، جو اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہو، تو اسے نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس شخص نے جھوٹ بولا۔ مگر اس جھوٹ سے ملت اسلامیہ کے عقائد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ تصوف کی کتابوں میں ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں، جو براہ راست اسلام کی روح کو مجروح کرتے ہیں۔ یہ ایک کھلا ہوا ظلم ہے، جس کے اثرات سے سادہ دل اور بے خبر مسلمانوں کے ایمان متزلزل ہونے لگتے ہیں..... اور وہ صراطِ مستقیم سے دُور جا پڑتے ہیں۔

سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کا مشہور قول ہے۔ ”جاہل صوفی، مخرہ شیطان ہوتا ہے۔“

اسی طرح جاہل عقیدت مند خود بھی زندگی بھر بے راہ روی کا شکار رہتا ہے..... اور جس بزرگ سے انہماک عقیدت کے لئے اس نے بے سرو پا واقعات تراشے ہوتے ہیں، اس کا وبال بھی اسی کی گردن پر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے ماننے والوں نے ”خدا کا بیٹا“ کہہ کر پکارا۔ اسی واقعے کی طرف قرآن کریم میں واضح اشارہ کیا گیا ہے کہ حشر کے دن یہ عظیم و جلیل انبیاء ہماری بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کریں گے۔

”اے اللہ! تو ہمارے دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔ ہم اس سے بری الذمہ ہیں۔“ یعنی ہم نے ان سے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ یہ خود ہی اپنے ذہنوں سے جھوٹی باتیں تراشتے تھے اور ہمیں خدا کا بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی طرح اولیائے کرام کی بھی ایک بڑی جماعت سر محشر اپنے رب کے سامنے پکار پکار کر کہے گی۔ ”ان کی عقیدتیں ان کے ساتھ۔ ہم ایسی تمام باتوں سے بری الذمہ ہیں۔ تیری ہی پناہ مانگتے ہیں..... اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔“

اب ہم حضرت امام برہنہ کی ذات گرامی سے وابستہ اس روایت کے آخری حصے پر مختصر بحث کریں گے، جس میں کہا گیا ہے کہ مرنے والی تمام بھینسیں زندہ ہو گئیں۔

”مردوں کا دوبارہ زندہ ہونا۔“ یہ تمام مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے، جس کا اقرار کے بغیر کسی کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ ”حیات بعد الموت“ کا عمل مکمل طور پر قیامت کے دن دہرایا جائے گا۔ سارے انسان اپنی قبروں سے نکل کر اُنھ کھڑے ہوں گے اور اپنے پیدا کرنے والے کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفات عالیہ پر پیدا کیا ہے، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بطور خاص یہ معجزہ بخشا گیا تھا کہ آپ مردہ انسانوں کو

ذرا دبا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا طریقِ کاریہ تھا کہ جب کسی مُردہ انسان کو آپ کے روبرو لایا جاتا ہے۔

”وہاں اللہ کے حکم سے۔“ اور مردہ کھڑا ہو جاتا..... اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ بھی عطا کیا ”اب مٹی کے پرندے بناتے، پھر ان پر پھونک مارتے..... اور وہ پرندے ہوا میں اُڑنے لگتے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھا۔ معتبر روایتوں سے ثابت ہے کہ حضرت غوث اعظم سیدنا شیخ ابوالحسن علیہ الرحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک عیسائی پادری کے باپ کو یہی آیت مقدسہ پڑھ کر زندہ کیا تھا۔ مگر تھوڑی دیر میں اس کرامت کا اظہار حضرت غوث اعظمؒ کی ایک ضرورت تھی۔ اس وقت آپ ایک بہت بڑے

پہلی سے مناظرہ کر رہے تھے..... اور مناظرے کے دوران ایک ایسا موڑ آ گیا تھا، جہاں حضور اکرم ﷺ اور اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے حضرت غوث اعظمؒ کو اپنی اس مشہور کرامت کا سہارا لینا پڑا۔

حقیق کے مطابق حضرت امام بریؒ کی ذات گرامی سے وابستہ اس کرامت کی بس اتنی حقیقت ہے کہ جو لپٹا اپنی جس بھینس کا دودھ پلاتا تھا، وہ کسی بیماری کی وجہ سے مرگئی تھی۔ اتفاق سے وہی بھینس اس کا مکمل جبب مرید نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا تو حضرت امام بریؒ نے اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ نتیجتاً

عالمی اسباب ظاہر ہوئے کہ وہ شخص کئی بھینسوں کا مالک بن گیا..... اور یہ سب کچھ ایک ولی اللہ کی خدمت کا نئے ہمارے کم فہم تذکرہ نگاروں نے دیو مالائی قصہ یا ”طلسم ہوشربا“ کا ایک باب بنا کر رکھ دیا ہے۔ ”طلسم ہوشربا“ جلال الدین اکبر کے ایک با اثر درباری عالم ابو الفضل نے فارسی زبان میں تحریر کی تھی۔ یہ دنیا ہائوں میں ایک دلچسپ ترین داستان تھی، جس کی بنیاد محیر العقول اور جادوئی واقعات پر رکھی گئی تھی۔

مقابلہ قرآن کریم کے حوالے سے اپنے ایک شعر میں اسی انداز کی غیر ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر

تاویل سے قرآن کو بنا دیتے ہیں یا ژند

علامہ اقبالؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ کے احکام برحق ہیں، مگر ان کی تفسیر کرنے والے ایسی تاویلات پیش کرتے ہیں جو حکیم کو بھی ”پاؤنڈ“ بنا دیتے ہیں۔ ایران کے ایک شخص زرتشت نے نبوت کا دعویٰ کر کے آتش پرستی کا پکار بکا تھا۔ آگ کی عبادت کرنے والے، زرتشت کو اپنا پیغمبر مانتے ہیں اور اس کی لکھی ہوئی کتاب ”پاؤنڈ“ یا بالآخر آسمانی کتاب تصور کرتے ہیں۔



لباس پہننے کا واقعہ، جو حضرت امام برقیؒ کی دعا سے زندہ ہو گیا تھا۔ مگر مرید کے پلٹ کر دیکھنے سے وہ پتھر بن گیا۔ اہل ذیل میں تذکرہ نگاروں کی روایت ہے کہ وہ پتھر کا بھینسا بہت دنوں تک موجود رہا۔ پھر اسے سیلاب نے لے گیا۔ اہل تحقیق کے نزدیک اس روایت کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ پھر بھی اگر ہمارے تذکرہ نگار بضد ہیں کہ فرشتے آیا تھا تو ہم ان کو صوفیائے ہند کی تاریخ سے ایک اور اہم واقعہ یاد دلاتے ہیں، جو تقریباً سوا آٹھ سو سال پہلے آیا تھا اور جس کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔

۱۷۱۱ء جنگ ترائن 583ھ میں شہاب الدین غوری اور راجپوت حکمران سمراٹ پرتھوی راج چوہان کے درمیان

ہوئی تھی۔ اس جنگ میں ایک بزرگ سید میراں حسین خٹک سوار بھی لشکرِ کفار سے نبرد آزما تھے۔ پرتھوی راج چوہان، شہاب الدین غوری سے کھلے میدان میں شکست کھا کر فرار ہوا، مگر ”سرجندی“ کے کنارے غوری کے سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔

خاص اجیر سے دو تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ تارا گڑھ ہے، جس کی بلند چوٹی پر پرتھوی راج کا مضبوط ترین قلعہ تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ سید میراں حسین خٹک سوار اپنے سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر اس پہاڑ کی طرف بڑھے۔ جب قلعے کے محافظوں کو خبر ہوئی کہ ان کا راجہ پرتھوی راج، شکست کھا کر دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو چکا ہے اور مسلح جانباز انتہائی دُشوار گزار راستوں کو عبور کرتے ہوئے قلعے کی طرف بڑھ رہے ہیں تو ایک روایت کے مطابق ہندو محافظوں نے چند جادو گروں کو طلب کیا اور ان سے مسلمانوں کی لٹاؤ کو روکنے کی تدبیر پوچھی۔ جواباً جادو گروں نے اپنے سحر کی طاقت سے ایک بہت بڑی چٹان کو سید میراں حسین خٹک سوار کی طرف لڑھکایا۔ اس چٹان کے بارے میں مشہور ہے کہ پانچ سو طاقتور سپاہی مل کر بھی اسے اپنی جگہ سے جھٹ نہیں دے سکتے تھے۔

اس جادوئی چٹان کا نشانہ مسلمانوں کے فوجی دستے کے سالار حضرت سید میراں حسین خٹک سوار تھے۔ جب وہ جادوئی چٹان، لشکرِ اسلام جانبازوں کی طرف بڑھی تو کسی مسلمان سپاہی کی نظر پڑ گئی۔ اس نے چیخ کر سید میراں خٹک کو خبردار کیا۔ چٹان تیزی سے نشیب کی طرف آ رہی تھی۔ حضرت سید میراں حسین نے چٹان کو دیکھ کر با آواز بلند فرمایا۔

”اگر تو خدا کے حکم سے ہماری طرف آ رہی ہے تو ہمارے سروں پر آ جا..... اور اگر یہ جادوگری کی شہیدہ بازی ہے تو میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ وہیں ٹھہر جا۔“ اتنی دیر میں چٹان سید میراں حسین کے بالکل قریب آ چکی تھی۔ آپ نے فوری طور پر اپنی تلوار اس چٹان کی طرف بڑھائی..... اور آپ کا گھوڑا دونوں اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ چٹان ایک مرد مجاہد کی تلوار اور گھوڑے کے سموں سے ٹکرا کر وہیں رک گئی۔ یہ انتہائی ڈھلان کا حصہ تھا، اس لئے اس جگہ کوئی معمولی سا پتھر بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ مگر وہ چٹان اس طرح ٹھہر گئی، جیسے اسے کسی نادیہ ہاتھ نے روک لیا ہو۔ دیکھنے والوں کو وہ چٹان معلق نظر آتی تھی۔ اور یہی ایک مرد بزرگ کی کرامت تھی۔

حضرت سید میراں حسین خٹک سوار کے حوالے سے اس واقعے کو آٹھ صدیاں گزر چکی ہیں۔ مگر وہ چٹان آج بھی موجود ہے۔ میں نے ایک مرد شہید کی اس کرامتی نشانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میری طرح برصغیر پاک و ہند میں کروڑوں گواہ موجود ہوں گے، جنہوں نے اس حیرانغول واقعے کا چشمِ خود مشاہدہ کیا ہے۔ آٹھ صدیوں کی گردش اور امتدادِ زمانہ سے صورتِ حال میں بس اتنا فرق آیا ہے کہ وہ چٹان معلق شکل میں موجود نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ درختوں کی طرح پہاڑ بھی بڑھتا رہتا ہے۔ درخت تو ایک خاص حد تک پہنچ کر رک جاتے ہیں..... مگر پہاڑ ایک طویل مدت میں بہت آہستہ آہستہ اپنی ظاہری شکل اور حجم بدلتا ہے۔ آٹھ سو سال گزر جانے کے بعد تارا گڑھ پہاڑ میں بھی تبدیلی واقع ہوئی اور وہ معلق چٹان، پہاڑ کا ایک حصہ بن گئی۔ مگر اس تبدیلی کے باوجود زائرین کو وہ چیزیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اب بھی چٹان کا رخ نیچے کی طرف ہے۔ دوسری یہ کہ اس چٹان پر حضرت سید میراں حسین کی تلوار اور گھوڑے کی دونوں ٹانگوں کے نشانات موجود ہیں۔ یہ نشانات اس قدر واضح ہیں کہ دیکھنے والوں کو پہچاننے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آتی۔

یہ واقعہ ہم نے اس لئے تحریر کیا ہے کہ جب اللہ کا کوئی ولی کسی مقصدِ عظیم کی خاطر اپنی کرامت کا اظہار کرتا ہے تو

انے غیرات، سیلابوں اور طوفانوں کی شدت کے باوجود اس نشانی کے خدو خال کسی نہ کسی صورت میں باقی رہے ہیں۔ اگر حضرت امام برہنہ کی کرامت کے نتیجے میں وہ بھینسا، پتھر کا بن جاتا تو اس کی کوئی نہ کوئی شکل آج بھی رہتی۔ یہی ہمارے تذکرہ نگاروں کی کمزوری ہے کہ وہ کسی تحقیق کے بغیر کسی بزرگ سے ایک محیر العقول واقعہ کہہ کر رہتے ہیں۔ مگر جب بعد میں آنے والے اہل عقیدت اس کی تصدیق کے لئے مذکورہ مقام تک پہنچتے ہیں تو انہیں اس کرامت سے متعلق کوئی نشانی نظر نہیں آتی۔ ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ لوگ سچائی اور بے باکی سے اس کا اعلان کرتے ہیں کہ روایت کے اس حصے کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں..... مگر وہ جوش عقیدت میں ان تذکرہ نگاروں سے بھی چند قدم آگے بڑھ جاتے ہیں..... اور پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ وہ پتھر کا بھینسا موجود تھا، مگر بابائے بہا کر لے گیا۔ پھر یہی عقیدت، روایت کا حصہ بن جاتی ہے اور بعد میں آنے والے تذکرہ نگار، بہت مندوں کے تبصروں کو بھی روایت میں ڈھال دیتے ہیں۔ نتیجتاً روایتوں کا انبار لگتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس انبار کے نیچے اور بنیادی روایت کا ڈھونڈنا ایک کار دشوار ہوتا ہے۔ انجام کار کچھ لوگ، صوفیاء کی ذات گرامی سے بدظن بن جاتے ہیں اور سرے سے ہی تصوف کا انکار کر دیتے ہیں اور عقیدت مندوں کی اکثریت، مبالغے کے طلسم میں ڈال ہو کر نئے نئے زاویے تراشنے میں تیزی کے ساتھ مصروف عمل ہو جاتی ہے۔ پھر ہر کوئی محفل سماع میں مست و بے خود ہو کر رقص کرنے لگتا ہے۔ کسی کو اپنے جذباتوں پر اختیار نہیں رہتا تو وہ احترام کے نام پر قبر کو سجدے کرنے لگتا ہے..... اور کوئی حیران اور پریشان کھڑا یہی سوچتا رہتا ہے کہ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

علامہ اقبالؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بارے میں عقل و ہوش اور کیف و مستی کے تمام تقاضوں کو جمع کرنے کے بعد فرماتے ہیں ۔

دل بے تاب جا پہنچا دیارِ پیرِ خیر میں

میسر ہے جہاں سامانِ دروِ ناشکیبائی!

پھر اہل تعلیم کے لئے لندن جانے سے قبل محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دربارِ گوہر بار میں اپنی فرات ”اتجائے مسافر“ لے کر حاضر ہوتے ہیں اور گریہ و زاری کرتے ہوئے یہ دعا مانگتے ہیں ۔

فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں

تری دعا سے عطا ہو وہ زردباں مجھ کو

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے

کہ سمجھ منزل مقصود، کاررواں مجھ کو

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کو صوفیاء میں ”سلطان الہند“ کا مقام حاصل ہے۔ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو دارالعالَم ”محبوب الہی“ کے لقب سے پکارتا ہے۔ علامہ اقبالؒ ان دونوں اکابر صوفیاء کی بارگاہِ جلال میں ایک خاص مقام عقیدت کے ساتھ حاضر ہوئے۔ مگر جب یہی علامہ اقبالؒ اپنے دور کے نظامِ خانقاہی کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار پلاٹتے ہیں ۔

یہ معاملے ہیں نازک، جو تری رضا ہو تو کر

کہ مجھے خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

علامہ اقبالؒ کے اس کرب و اضطراب کی ایک ہی وجہ تھی کہ ان کے زمانے میں نظامِ خانقاہی کے حقیقی خدو خال اُبھ چکے تھے اور ”صوفیت“ نئے نقش و نگار کے ساتھ نئی شکل میں ڈھل گئی تھی۔ پھر علامہ کا یہ اضطراب بڑھتا ہی چلا

گیا۔ آخر ان کے لہجے سے شدید طنز کا اظہار ہونے لگا۔

عقل عیار ہے ، سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملتا ہے ، نہ صوفی ، نہ حکیم

حالانکہ ”عشق اور صوفی“ دونوں لازم و ملزوم ہیں..... مگر علامہ اقبالؒ کے زمانے میں ”صوفیت“ عشق کی دولتِ لازوال سے محروم ہو کر ”عقل“ کی تابع ہو گئی تھی۔ اس لئے انہوں نے عیسائیت کو بنیاد بنا کر ”پیرانِ کلیسا“ پر شدید تنقید کی۔ اس وقت پادریوں کے جاہ و جلال اور مذہبی حیثیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے وسیلے کے بغیر کوئی بندہ اپنے خدا کی قربت حاصل ہی نہیں کر سکتا تھا۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے

پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو !!

عیسائیت کی طرح بیسویں صدی کے بعض غیر ذمے دار مسلمان صوفیاء نے بھی نظامِ خانقاہی کو ایک دنیا دارانہ کاروبار بنا کر رکھ دیا تھا..... اور ان کے انتہا سے زیادہ خوش عقیدہ مریدوں نے اس تصور کو عام کر دیا تھا کہ ”خیر“ کے بغیر قربتِ الہی اور بخشش و نجات ممکن ہی نہیں۔ ملتِ اسلامیہ کی یہی حالت زار دیکھ کر علامہ اقبالؒ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ

اس دور میں اب تیرا مسلمان کدھر جائے

روایت کے سلسلے میں ہم آخری دلیل پیش کر کے اس بحث کو ختم کریں گے۔ موجودہ نظامِ خانقاہی میں اس بات کو بھی بہت ہوا دہی گئی ہے کہ کسی بھی بزرگ سے کوئی بھی روایت منسوب ہو، اس پر آنکھیں بند کر کے ”ایمان“ کی حد تک اعتبار کیا جائے۔ اگر کوئی عقیدت مند ایسا نہیں کرے گا تو وہ نہ صرف فیضِ روحانی سے محروم ہو جائے گا بلکہ اُلٹا کسی عذاب میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔ اس قسم کی ”تہدید“ اور تنبیہ آمیز باتوں سے سادہ لوح اور کم علم مسلمان خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور پھر وہ بے سرد پارادائموں کو بھی اپنے ایمان کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد بے راہ روی کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

جب کسی مسئلے میں امامِ اعظمؒ حضرت ابوحنیفہؒ کو قرآن و حدیث سے کوئی مثال نہیں ملتی تو آپؒ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل کو دیکھتے کہ ان ہدایت یافتہ اصحاب نے اس سلسلے میں کیا روش اختیار کی تھی۔ پھر جب صحابہ کرامؓ کے عمل مبارک سے بھی اس سوال کا جواب نہیں ملتا تو حضرت امام ابوحنیفہؒ قیاس سے کام لیتے اور اجتہاد فرماتے۔ پھر حاضرینِ مجلس سے اس طرح مخاطب ہوتے۔

”آپ حضرات پر اللہ کی سلامتی ہو۔ اس مسئلے میں میری رائے یہ ہے۔“

حاضرین میں سے کوئی شخص اپنی نشست پر کھڑا ہوتا اور عرض کرتا۔ ”امام! اگر آپ کی رائے قرآن و حدیث اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے متصادم ہو تو پھر ہم لوگوں پر کیا لازم ہے؟“

یہ سوال سن کر حضرت امام ابوحنیفہؒ کسی جھجک اور توقف کے بغیر فرماتے۔ ”پھر میری رائے کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ اسے کسی پس و پیش کے بغیر دیوار پر مار دو۔“

تمام صوفیائے کرام کسی نہ کسی فقہ کے پابند تھے۔ جب روایت کے سلسلے میں تمام آئمہ کرام کا یہ فتویٰ موجود ہے تو ہمارے تذکرہ نگاروں پر بھی لازم ہے کہ جب وہ کسی روایت کو کسی بزرگ کے شایانِ شان نہ پائیں تو اسے کسی

نہ غیر مسز و کر دیں۔



اب ہم مختصر طور پر ایسی چند اور روایتوں کا ذکر کریں گے، جو حضرت امام بریؒ کی ذات گرامی سے منسوب کر دی گئی ہیں۔

اولیٰ کے ایک بزرگ پھنے شاہ بخاریؒ نے جب حضرت امام بریؒ کی کرامات کا شور سنا تو برہم ہو کر فرمایا۔
”اے اولیاء میں ایک مشہدی کیسے داخل ہو گیا؟ ہم اس کی تمام روحانی قوتیں سلب کر لیں گے۔“
اس کے بعد پھنے شاہ بخاریؒ اپنے مریدوں کی ایک لاکھ فوج لے کر راولپنڈی کی طرف بڑھے۔

حضرت امام بریؒ نے کشف کے ذریعے پھنے شاہ بخاریؒ کے کوچ کا منظر دیکھا تو اپنے مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”پھنے شاہ بخاریؒ اپنے ایک لاکھ مریدوں کا لشکر لے کر ادھر آ رہا ہے، تم لوگ ہوشیار ہو جاؤ۔“
جب پھنے شاہ بخاریؒ اپنے ایک لاکھ مریدوں کے ہمراہ شہر جہلم کے نزدیک پہنچے تو حضرت امام بریؒ نے جہلم کی دیوار کے اپنی شہادت کی انگلی اٹھائی۔ یکایک پھنے شاہ بخاریؒ کا آدھا جسم بے کار ہو گیا۔

پھنے شاہ بخاریؒ کے ساتھ ان کے مرید بھی اس واقعے پر حیران رہ گئے۔ پھر جب پھنے شاہ بخاریؒ کو اس کی کوئی اور وجہ نظر نہیں آئی تو انہوں نے اپنے مرشد، حضرت مہر شاہ خراسانیؒ کی طرف رجوع کیا۔

حضرت مہر شاہ خراسانیؒ بھی کشف کی حالت میں یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ آپ نے فوراً ہی حضرت امام بریؒ سے درخواست کی کہ پھنے شاہ بخاریؒ کی اس گستاخی کو معاف کر دیا جائے۔

حضرت امام بریؒ نے حضرت مہر شاہ خراسانیؒ کی درخواست پر پھنے شاہ بخاریؒ کی گستاخ کو معاف کر دیا۔ جس نتیجے میں ان کا آدھا مفلوج جسم معمول کے مطابق کام کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت امام بریؒ نے ایک اور کے ذریعے پھنے شاہ بخاریؒ کو یہ پیغام بھی بھیجا۔

”اگر ہمارے پاس آنا ہے تو ایک مہمان کی حیثیت سے آؤ۔“

الغرض پھنے شاہ بخاریؒ ایک مہمان کی حیثیت سے حضرت امام بریؒ کی خانقاہ میں اس طرح حاضر ہوئے کہ آپ پر ہوا تھے اور ہاتھ میں سانپ کا کوڑا تھا۔

حضرت امام بریؒ کے مریدوں نے یہ منظر دیکھا تو بہت زیادہ پریشان ہوئے اور اپنے مرشد سے عرض کرنے لگے۔ ”حضرت! ان ایک لاکھ مہمانوں کی تواضع کا انتظام کس طرح ہو گا؟“

حضرت امام بریؒ نے فرمایا۔ ”تم لوگوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ یہ کہہ کر آپ نے مریدوں کو ایک کڑا اور تھوڑا سا آٹا لانے کا حکم دیا۔

پھر حضرت امام بریؒ نے اپنے ہاتھ سے آٹا گوندھا اور اس پر اپنا رومال ڈال دیا۔ ”اس میں سے آٹا لیتے جاؤ اور مہمانوں کے لئے روٹیاں پکاتے رہو۔ مگر خبردار! رومال ہٹا کر نہ دیکھنا۔“ یہ کہہ کر حضرت امام بریؒ اپنے حجرے میں فریٹ لے گئے، جہاں پھنے شاہ بخاریؒ بھی موجود تھے۔

حضرت امام بریؒ کے مرید روٹیاں پکاتے رہے..... اور پھنے شاہ بخاریؒ کے ایک لاکھ مریدوں کو کھلاتے رہے۔ خود پھنے شاہ بخاریؒ نے حضرت امام بریؒ کے حجرہ مبارک میں کھانا کھایا اور پھر فرمانے لگے۔

”شیخ! اس تواضع کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے تو پیٹ بھر کے کھانا کھالیا، مگر میرا شیر اور سانپ بھوکے ہیں۔ ان کی غذا کا بھی انتظام فرما دیجئے۔“

حضرت امام بریؒ نے فوراً اپنے ایک مرید کو طلب کر کے حکم دیا۔ ”شیخ کے شیر اور سانپ کی ضیافت کے لئے ایک گائے اور مرغ کا انتظام کیا جائے۔“

مختصر یہ کہ شیر اور سانپ کی غذا کا انتظام کر دیا گیا۔ صبح ہوئی تو پھنسنے شاہ بخاریؒ یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کا شیر اور سانپ غائب تھے..... اور حضرت امام بریؒ کی بھیجی ہوئی گائے اور مرغ موجود تھے۔ فوراً ہی سمجھ گئے کہ گائے نے شیر کو اور مرغ نے ان کے سانپ کو نگل لیا ہے۔ کچھ دیر تک حیرت اور خاموشی سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ پھر حضرت امام بریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر فرمانے لگے۔

”شیخ! یہ کیسا اندازِ میزبانی تھا کہ آپ کے بھیجے ہوئے سامانِ دعوت نے خود اپنے مہمانوں کو کھا لیا؟“
حضرت امام بریؒ فوراً ہی اس مقام پر تشریف لائے، جہاں یہ حیران کن واقعہ پیش آیا تھا۔ واقعتاً آپ کی بھیجی ہوئی گائے اور مرغ موجود تھے۔ حضرت امام بریؒ نے گائے اور مرغ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
”یہ ہمارے مہمان ہیں۔ تم دونوں ان کی امانتیں واپس کرو۔“

ابھی فضا میں حضرت امام بریؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ گائے نے شیر کو اور مرغ نے سانپ کو اگل دیا۔ اور وہ دونوں دوبارہ زندہ ہو گئے۔

یہ ہے وہ روایت، جو غیر تاریخی اور غیر فطری واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ تصوف کی طویل تاریخ میں کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں، جن سے صوفیائے کرام کی حدودِ ولایت کا پتہ چلتا ہے۔ مشہور چشتی بزرگ حضرت خدوم علاء الدین صابر کلیریؒ نے اپنے منہ بولے بیٹے اور خلیفہ اکبر، حضرت شمس الدین ترکؒ کو ولایت دے کر پانی پت کے علاقے کی طرف روانہ کیا۔ یہاں پہلے ہی سے دنیائے تصوف کے مشہور قلندر حضرت بوعلی شاہؒ موجود تھے۔ حضرت شمس الدین ترکؒ، پانی پت کے مضافاتی علاقے میں قیام پذیر ہوئے اور پیر و مرشد کے حکم کے مطابق رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کر دیا۔

پھر کچھ دن بعد جب حضرت شمس الدین ترکؒ کا شہرہ عام ہوا اور یہ خبریں حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ تک پہنچیں تو آپ نے ایک مرید کو حکم دیا کہ وہ ایک بڑا پیالہ دودھ سے لبریز کرے اور اسے حضرت شمس الدین ترکؒ کی خدمت میں پیش کرے۔

اس وقت حضرت شمس الدین ترکؒ اپنے مریدوں اور دیگر طالبانِ شوق کو درس دے رہے تھے۔ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا مرید حاضر ہوا اور اس نے سلام کے بعد دودھ سے لبریز پیالہ حضرت شیخؒ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔

”میرے پیر و مرشد نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ دودھ نذر کیا ہے۔“

حضرت شمس الدین ترکؒ دودھ سے لبریز پیالے کو دیکھ کر مسکرائے اور اپنے قریب رکھا ہوا گلاب کا ایک پھول، دودھ کے پیالے میں ڈال دیا، جو سطح پر تیرنے لگا۔ اس کے بعد آپ نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے مرید سے فرمایا۔
”اپنے مرشد کی خدمت میں ہمارا سلام شوق بھی پیش کرنا۔ ہمیں ان کی عظمت و بزرگی کا بہت احساس ہے۔“

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے مرید نے دودھ سے بھرا ہوا پیالہ واپس لا کر شیخؒ کی خدمت میں پیش کر دیا اور اس کے ساتھ ہی حضرت شمس الدین ترکؒ کے احساسات و جذبات کی ترجمانی بھی کر دی۔ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے گلاب کا پھول اٹھا کر سونگھا اور نہایت والہانہ لہجے میں فرمایا۔ ”تموئے دوست آتی ہے۔“

یہ منظر دیکھ کر آپ کے ایک مرید نے عرض کیا۔ ”سیدی! آپ نے حضرت شمس الدین ترکؒ کی خدمت میں

لبریز پیالہ ارسال کیا، جواب میں شیخ نے گلاب کا پھول ڈال کر بھیج دیا۔ خادم ان اسرار و موز کو سمجھنے سے

”اب میں حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”دودھ کے لبریز پیالے سے مراد تھی کہ یہ فیض روحانی سے لبریز ہے۔ آپ اپنی روحانی تبلیغ کے لئے کسی دوسرے علاقے کا انتخاب فرمائیں۔
جانشین نے گلاب کا پھول بھیج دیا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ پھول، دودھ کی سطح پر الگ تھلگ تیر رہا ہے۔ اس کا پیالے سے کوئی تعلق نہیں۔ شیخ نے درپردہ ہمارے سوال کا یہی جواب دیا ہے کہ ہم آپ کے علاقے میں بے بھی لائق رہیں گے۔“

مفت شمس الدین ترکؒ اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا یہ مشہور واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح بے کرام کی ریاضت و عبادت عامیانہ نہیں ہوتی، اسی طرح ان کے اختلافات بھی سطحی نہیں ہوتے۔ ان کی نابینائی کا اندازہ بھی مہذب ترین لوگوں سے ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے۔ پچھنے شاہ بخاریؒ بھی حضرت امام بریؒ کی آمد لبریز کا کوئی پیغام بھیج سکتے تھے۔ مگر جو روایت ان کے نام سے منسوب ہے، وہ کسی صوفی کے شایان شان ہرگز ہو سکتی۔ یہ دو بزرگانِ دین کا قصہ نہیں، روایتی دشمنوں کا جنگلی منظر دکھائی دیتا ہے۔

بابت مسور کے حکمران نواب حیدر علی کی سلطنت 80 ہزار مربع میل پر مشتمل تھی اور انتہائی معتبر روایتوں کے بقول حیدر علی کے سپاہیوں کی کل تعداد 80 اور 90 ہزار کے درمیان تھی۔ اس کے برعکس پچھنے شاہ بخاریؒ کے ہاتھ لاکھ افراد پر مشتمل تھا۔ صوفیاء کی پوری تاریخ میں کسی بزرگ کو یہ اعزاز حاصل نہیں کہ اس کے ولادت میں ایک لاکھ انسان شامل ہوں۔ عقیدت مندوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے، مگر مریدوں کی تعداد خلاف عقل ہے اور انتہائی مبالغہ آرائی کی طرف کھلا ہوا اشارہ کرتی ہے۔

ہر ایک لاکھ مرید، حضرت امام بریؒ کی خانقاہ میں کس طرح ٹھہرے ہوں گے؟ اتنے انسانوں کے اجتماع کے لئے کئی طویل و عریض میدان درکار ہوں گے۔ روایت کا یہ حصہ تو درست ہو سکتا ہے کہ اللہ نے تھوڑے سے آٹے پر معمولی برکت عطا کر دی۔ خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے اپنی غربت کا ذکر کیا تو آپؐ ان کی آٹا پسینے کی چکی میں اپنے دستِ اقدس سے مٹھی بھر جو یا گندم ڈال دیئے اور فرمایا۔
”نہیں جس قدر آٹے کی ضرورت ہو، اس کے مطابق چکی چلا لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت روائی فرمائے

ان واقعے کے بعد عرصہ دراز تک وہ صحابی اس چکی کے آٹے سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اگر کبھی اتفاق سے پھر وہ مہمان آجاتے تو چکی سے حسب ضرورت اتنا ہی آٹا نکل آتا۔ کئی سال بعد ان صحابی کے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ کہاں سے آتا ہے؟ نتیجتاً اپنے تجسس کی تسکین کے لئے انہوں نے چکی کے دو پاٹ علیحدہ کر دیئے۔ اور اور کمالیہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چکی کے درمیان گندم اور جو کا ایک دانہ بھی بھی موجود نہیں تھا۔ صحابی یہ منظر دیکھ کر اٹھے اور پھر فوراً ہی سرور کو نین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض حال کیا۔

جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اگر تم یہ جاننے کی کوشش نہ کرتے کہ آٹا کہاں سے آتا ہے تو لمبا وقت تک جاری رہتا اور تمہاری تسلیں بھی اللہ تعالیٰ کی اس بخشش و عطا سے فیض یاب ہوتیں۔“
اگر حضرت امام بریؒ نے اپنے دستِ مبارک سے تھوڑا سا آٹا گوندھا اور وہ مہمانوں کی ایک بڑی تعداد کے لئے ہو گیا تو قارئین کو اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ خال خال سہی، مگر ایسی مثالیں تو آج بھی نظر آ جاتی ہیں۔

اس روایت کا ناقابل فہم پہلو ایک لاکھ انسانوں کا آنا اور پھر ان کی ضیافت کا اہتمام کرنا ہے۔ گائے کا شیر کو نگل جانا تو اتنا عجیب تر ہے کہ ہم اسے طلسمی داستان کے سوا کوئی دوسرا نام دے ہی نہیں سکتے۔ پھر اس واقعے کا سب سے اذیت ناک پہلو یہ ہے کہ دو بزرگانِ دین کو اس طرح ایک دوسرے کے مقابل دکھایا گیا ہے، جیسے وہ عام دنیا دار انسان ہوں اور ذاتی نمود و نمائش کے لئے اپنی روحانی طاقتوں کا استعمال کر رہے ہوں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارے تذکرہ نگار اس قسم کی روایتیں بیان کر کے اسلام اور تصوف کی کون سی خدمت انجام دے رہے ہیں؟ ان واقعات کی موجودگی میں تو حضرت امام برٹی کی ذاتِ گرامی، دیو مالائی طرز کی کہانیوں کا ایک کردار بن کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے عاقبت نا اندیش تذکرہ نگاروں کو معلوم ہونا چاہئے کہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ان کی تحریروں سے اسلامی معاشرے میں انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں جو پہلے ہی اسلامی نظام کو ناقابل عمل ثابت کرنے کے لئے خطرناک تشہیری مہم چلا رہی ہیں، ایسے واقعات ان کے پروپیگنڈے کو مزید تقویت بخشیں گے۔ اور وہ مسلمان جو اپنے ذہنی انتشار کے سبب فرار حاصل کرنے کا جواز تلاش کر رہے ہیں، وہ ان ہی واقعات کو بنیاد بنا کر صراطِ مستقیم سے مزید دُور ہوتے جاتے ہیں۔

ماضی میں ایک ایسی ہی محاذ آرائی، حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ اور سندھ کے مشہور بزرگ حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے درمیان بھی دکھائی گئی ہے۔ جس میں دونوں طرف سے شیر، گائے اور سانپ کا استعمال دکھایا گیا ہے۔ تذکرہ نگاروں کے نزدیک یہ دو قلندروں کی جنگ تھی۔ سندھ کے تذکرہ نگاروں نے اس جنگ میں حضرت لعل شہباز قلندرؒ کو فائز اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کو مفتوح دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور آخری بات یہ کہ اوج شریف (بہار پور) کے صوفیائے کرام کی طویل فہرست میں کسی پھنے شاہ بخاری کا ذکر موجود نہیں ہو سکتا ہے کہ ”سینہ بہ سینہ“ ملنے والی روایتوں کے مطابق اس نام کے بھی کوئی بزرگ گزرے ہوں۔ مگر حضرت امام برٹی کے حوالے سے یہ روایت بہت ہی ضعیف اور نامعتبر ہے۔



حضرت امام برٹی کی ایک کرامت بہت مشہور ہے، جس کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ”نور پور شاہاں“ کی شمالی پہاڑیوں کے نزدیک ایک جگہ ”لوئی دندی“ ہے۔ اس مقام پر ایک لسا سا پتھر، پہاڑی کے ساتھ منقطع ہے۔ اس پتھر کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ ایک مفسد اور شریر دیوتھا، جو اکثر حضرت امام برٹی کی عبادت و ریاضت میں خلل انداز ہوتا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے اس دیو کو کئی بار سمجھایا کہ وہ اپنی ان حرکتوں سے باز آجائے۔ مگر دیو نے ایک مردِ خدا کی اس تنبیہ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ آخر ایک دن حضرت امام برٹیؒ حالتِ جلال میں آ گئے اور آپ نے دیو کی گردن پکڑ کر ہوا میں اُچھال دیا۔ پھر جب وہ زمین پر گرا تو پتھر کا بن گیا۔ ”تذکرہ اولیائے پاکستان“ کی روایت کے مطابق یہ پتھر آج بھی موجود ہے، جو زائرین کو حضرت امام برٹیؒ کی کرامت کی یاد دلاتا رہا ہے۔ غالباً یہاں ”دیو“ سے مراد وہ ”جن“ ہے جو انسانی شکل میں نمودور ہو کر حضرت امام برٹیؒ کو ستاتا تھا۔ اور جنوں کی انسانی فضیلت قرآن کریم سے ثابت ہے۔



حضرت امام برٹیؒ کے والد محترم، حضرت سید سخی محمودؒ پٹنہ کے اعتبار سے زمیندار تھے۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو حضرت امام برٹیؒ تمام زمینوں کے وارث قرار پائے۔ حضرت مسیحؑ کو ریاضت و عبادت سے ہی فرمت نہیں تھی تو پھر آپ آبائی کھیتوں کی دیکھ بھال کس طرح کرتے؟ نتیجتاً حضرت امام برٹیؒ نے اپنے تمام کھیت مقامی کسانوں کو بٹائی

دے تھے۔ موضع باغ کلاں کا ایک کسان آپ کی کچھ زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایک سال اس نے مالک کی فصل بوئی جو نہایت شاندار رہی۔ مگر کسان کی نیت میں فتور آ گیا اور اس نے حضرت امام بریؒ سے صریحاً کہا: ”اے مالک۔“

”شیخ اس سال ماش کی فصل بالکل تباہ ہو گئی۔“

حضرت امام بریؒ نے یہ خبر سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور کسان کو بھی ہر حال میں راضی بہ رضارہنے کی تلقین کی۔ پھر سالانہ حضرت امام بریؒ اسی کسان کے گھر تشریف لے گئے۔ کسان نے تواضع کے طور پر کھانا پیش کیا، جس میں (آدرا) بھی موجود تھے۔ حضرت امام بریؒ نے حیرت سے دیکھا اور کسان سے سوال کیا۔ ”جب تمہاری فصل تباہ ہوئی تو یہ ماش کہاں سے آئے؟“

کسان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اور اس نے اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لئے دوسرا جھوٹ بولا۔ ”میں یہ ماش دوسرے گاؤں سے لے کر آیا ہوں۔“ اتفاق سے حضرت امام بریؒ کی نظر سامنے والی کوٹھڑی پر پڑ گئی، جہاں ماش بھری کئی بوریاں چنی ہوئی تھیں۔ آپ نے کسان سے فرمایا۔ ”ان بوریوں میں کیا ہے؟“

کسان بوکھلا گیا، مگر اس نے فوراً ہی نیا بہانہ تراش لیا۔ ”ان بوریوں میں کنکریاں بھری ہیں۔“

حضرت امام بریؒ نے بے ساختہ فرمایا۔ ”تم کہتے ہو تو پھر کنکریاں ہی ہوں گی۔“ یہ کہہ کر آپ نے کھانا کھایا اور ختم لے گئے۔

حضرت امام بریؒ کے جانے کے بعد کسان کو کچھ خیال آیا اور اس نے ایک بوری کھول کر دیکھی۔ واقعاً اس میں گریباں بھری ہوئی تھیں۔ کسان پر دہشت طاری ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر تمام بوریاں دیکھ ڈالیں۔ ان سب میں ماش کی جگہ جھوٹے چھوٹے پتھر بھرے ہوئے تھے۔ اپنے جھوٹ اور بدنیتی کا یہ انجام دیکھ کر کسان خوف زدہ ہو گیا۔ اور پھر وہ اس خوف کی حالت میں حضرت امام بریؒ کے دربر و حاضر ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگنے لگا۔

حضرت امام بریؒ نے فرمایا۔ ”میں تمہیں صرف ایک شرط پر معاف کر سکتا ہوں کہ تم آئندہ کے لئے جھوٹ اور جاپ دہی سے توبہ کرو۔“

کسان نے حضرت شیخؒ کے سامنے توبہ کی اور آئندہ جھوٹ اور فریب کاری سے دور رہنے کا عہد کیا۔

قصوف کی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات موجود ہیں، جب ایک دنیا دار شخص نے کسی بزرگ کے سامنے مانا یا ارادتا جھوٹ بولا۔ اور پھر اسی جھوٹ کے مطابق کوئی واقعہ رونما ہو گیا۔ مثال کے طور پر سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سنائیؒ کی روحانیت کو آزمانے کے لئے کچھ شرارت پسند لوگوں نے اپنے ایک ساتھی کو کہہ پتا کر گوارے میں لٹا دیا اور پھر وہ حضرت شیخ جہانگیر سنائیؒ کے پاس پہنچے اور اُداس لہجے میں کہنے لگے۔

”حضرت! ہمارے ایک ساتھی کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھا دیں۔ تاکہ ایک بزرگ کی ہاٹوں کی برکت سے مرنے والے کی بخشش ہو جائے۔“

حضرت سید اشرف جہانگیر سنائیؒ نے اُن شریروں کو ٹالنے کے لئے فرمایا۔ ”اس شہر میں مجھ سے بڑے عالم موجود ہیں۔ ان سے اپنے دوست کی نماز جنازہ پڑھوا لو تاکہ مرحوم کو زیادہ برکات حاصل ہوں۔“

مگر شریروں کا گروہ حضرت شیخؒ کی خوشامد میں لگا رہا۔ آخر سید اشرف جہانگیر سنائیؒ نے وضو کیا اور نماز جنازہ پڑھانے کے لئے تشریف لے گئے۔

شریروں کی اس جماعت کا منصوبہ یہ تھا کہ جیسے ہی حضرت شیخؒ نماز جنازہ پڑھا کر بیٹھیں گے، وہ نقلی مُردہ، گہوارے

میں اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔ اور پھر یہ کہہ کر سید اشرف جہانگیر سمنائی کا مذاق اڑایا جائے گا کہ ”آپ کیسے روشن قبر بزرگ ہیں کہ ایک زندہ انسان کی نماز جنازہ پڑھا دی؟“

الغرض حضرت سید اشرف جہانگیر سمنائی نے اُس نقلی مُردے کی نماز جنازہ پڑھائی اور اپنی خانقاہ کی طرف تشریف لے جانے لگے۔ شریکوں کا خیال تھا کہ نماز جنازہ ختم ہوتے ہی ان کا دوست اٹھ بیٹھے گا۔ مگر جب اس کے جسم کو کوئی حرکت نہیں ہوئی تو شریکوں نے کفن کھول کر دیکھا۔ واقعتاً وہ شخص مر چکا تھا۔ بالآخر مفسدوں کے اس گروہ نے حضرت سید اشرف جہانگیر سمنائی سے انتہائی صدقِ دل سے اپنی اس نازیبا حرکت کی معافی مانگی۔ تب کہیں جا کر اُس مُردہ شخص کی سانسیں دوبارہ بحال ہوئیں۔

حضرت امام برنی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا کہ ایک کسان نے فریب دے کر آپ کی دل آزاری کی۔ انجام کار اللہ نے اسی کے قول کے مطابق پوری فصل کو نگر یوں میں تبدیل کر دیا۔

اصولی طور پر جب حضرت امام برنی نے اس کسان کو معاف فرما دیا تھا تو نگر یوں کو بھی ماش میں تبدیل ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر روایت اس طرح ہے کہ معافی کے باوجود وہ ماش، نگر یوں ہی کی شکل اختیار کئے رہے۔ پھر اس روایت میں مزید زور اور وزن پیدا کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ نگر یوں آج بھی موجود ہیں، جو حضرت امام برنی کے والد محترم، حضرت سید شاہ محمودؒ کے مزار مبارک کے قریب پڑی ہوئی ہیں۔

یہ روایت اپنی جگہ خواہ کتنی بھی درست ہو، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نگر یوں حضرت شاہ محمودؒ کے مزار تک کیسے پہنچیں؟ شاہ محمودؒ کا انتقال حضرت امام برنیؒ کی زندگی میں ہو گیا تھا۔ اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ والد محترم کے مزار کی تعمیر بھی آپ نے اپنی نگرانی میں کرائی ہوگی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مرد باصفا جو ہمیشہ نام و نمود سے بیزار رہا، ان نگر یوں کو لے جا کر اپنے ہاتھ سے مزار مبارک کے قریب سجا دیتا تاکہ دیکھنے والے کہیں کہ یہ دی ماش ہیں، جو حضرت امام برنیؒ کی کرامت کے سبب نگر یوں بن گئے۔ اگر واقعہ یوں نہیں ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ حضرت امام برنیؒ کے وصال کے بعد وہ نگر یوں حضرت شاہ محمودؒ کے مزار مبارک کے قریب ڈالی گئیں۔ اب یہاں یا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کسان نے ایک طویل عرصے تک ان نگر یوں کو کیوں محفوظ رکھا؟

در اصل عقیدت کا یہی وہ نازک مقام ہے، جہاں سے روایت سازی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور پھر ہمارے تذکرہ نگار، واقعات کو اس طرح الجھا دیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو حقیقت کا سرا نہیں ملتا۔ حضرت امام برنیؒ تو وہ بزرگ ہیں، جن کے مزار مبارک کے قریب پڑا ہوا خاک کا ہر ذرہ، خاندانِ قادری کے اس عظیم و جلیلِ فرزند کی بے شمار کرامتوں پر گواہی دیتا ہے۔



بعض تذکروں میں حضرت امام برنیؒ کی ایک اور کرامت کو بھی نمایاں طور پر جگہ دی گئی ہے۔ غالباً یہ اس زمانے کا واقعہ ہے، جب آپ راولپنڈی کے قریب، چور پور گاؤں میں قیام پذیر تھے۔ پنجاب کے کسی دیہات میں ایک بوڑھا بے اولاد جوڑا رہتا تھا۔ دونوں میاں بیوی میں شدید محبت تھی مگر لاوارث ہونے کا غم اکثر انہیں اُواس رکھتا تھا۔ نزدیک و دُور کے تمام طبیبوں اور ویدوں سے علاج کرانے کے بعد مایوسی کے سوا ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ طبی نقطہ نظر سے ہر معالج کا ایک ہی فیصلہ تھا کہ وہ ماں باپ نہیں بن سکتے۔ یہاں تک کہ دونوں بوڑھاپے کی حدود میں داخل ہو گئے۔

پھر ایک دن عورت نے کسی پڑوسی سے سنا کہ راولپنڈی کے گرد و نواح میں دو ایسے بزرگ رہتے ہیں، جن کی

کچھ خواتین کی گود بھی ہری ہو جاتی ہے۔ بے اولاد میاں بیوی کے لئے یہ ایک مژدہ جانفز تھا۔ آخر وہ بے اولاد شوار گزار سفر طے کر کے راولپنڈی پہنچے۔ یہاں ایک بزرگ، شاہ چن چراغؒ رہتے تھے۔ کسی شاہ چن چراغؒ کے حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔ اس طرح یہ بات بھی پردہ راز میں ہے کہ ان کی روحانی سلسلے سے تعلق تھا؟ الغرض میاں بیوی، حضرت شاہ چن چراغؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور لائبرین کے لئے دعا کے طالب ہوئے۔

چن چراغؒ نے کچھ دیر مراقبہ کیا۔ پھر فرمایا۔ ”تمہاری قسمت میں اولاد ہے، مگر لڑکی ہے۔“ راکوت اور مرد اُدا اس ہو گئے۔ عام انسان، لڑکے ہی کی خواہش رکھتے ہیں کہ لڑکا بڑھاپے کا سہارا بھی دے۔ اس سلسلہ نسب بھی آگے بڑھتا ہے۔

بیلوں میاں بیوی، لڑکے کی تمنا لئے حضرت امام بریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے بھی صوفیائے رایت کے مطابق مراقبہ کیا اور میاں بیوی کو بیٹے کی نوید دی۔ عورت، بزرگانِ دین سے بہت زیادہ متقی تھی۔ حضرت امام بریؒ کا ارشاد گرامی سن کر کہنے لگی۔

تیری قسمت میں بیٹا نہیں ہوا، تب بھی مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا سے میری مراد پوری کر

دے گی۔ خوش عقیدگی سے حضرت امام بریؒ بہت متاثر ہوئے۔ پھر آپ نے نہایت کیف و جذب کے عالم میں ”اے فقیر کو بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت بے کنار پر یقین ہے کہ وہ تمہیں محروم نہیں رکھے گا۔“

اب ایک سال بعد قدرت نے اس عورت کو بڑھاپے میں بیٹا عطا کیا تو وہ حضرت امام بریؒ کی بارگاہ میں بیعت سے روانہ ہوئی۔ راولپنڈی پہنچ کر اسے شاہ چن چراغؒ کا خیال آیا تو وہ ان کی خانقاہ میں چلی گئی اور بیٹے لگی۔

آپ نے تو کہا تھا کہ میرے لڑکی پیدا ہوگی۔ مگر حضرت امام بریؒ کی دعا سے اللہ نے مجھے لڑکا عطا کیا ہے۔“ اب میں شاہ چن چراغؒ نے فرمایا۔ ”تیری نظروں کو دھوکا ہوا ہے۔ غور سے دیکھ! تیری گود میں بیٹا نہیں، بیٹی

زنت نے گھبرا کر دیکھا۔ واقعتاً اُس کی آغوش میں لڑکی تھی۔ پھر وہ حیرت و غم میں ڈوبی ہوئی حضرت امام بریؒ کے پاس حاضر ہوئی اور اس نے رورود کر سارا واقعہ بیان کر دیا۔

حضرت امام بریؒ نے مسکراتے ہوئے، بے حال ماں کو تسلی دی۔ ”تیری گود میں بیٹی نہیں، بیٹا ہی ہے۔“ لڑکا ہاں کی گم شدہ مسرت لوٹ آئی۔ اب اسے اپنی آغوش میں لڑکا نظر آ رہا تھا۔

اور عورت دوبارہ شاہ چن چراغؒ کی خانقاہ میں پہنچی۔ آپ نے اپنے وہی الفاظ دہرا دیئے۔ ”یہ تیرا فریب ہے۔ لڑکی کبھی لڑکا نہیں بن سکتی۔“

ان واقعات اس کی گود میں لڑکی ہی تھی۔ عورت پر پھر سراپسنگی اور وحشت طاری ہو گئی۔ وہ دوبارہ گریہ و زاری کرتی رہی۔ حضرت امام بریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

حضرت امام بریؒ نے عورت کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا۔ ”تجھے بیٹا مبارک ہو۔ مگر اب شاہ چن چراغؒ کے

نہانا۔“ لڑکھو، بیٹا لے کر خاموشی کے ساتھ اپنے گاؤں واپس چلی گئی۔

یہ ہے وہ کرامت، جسے بیان کرتے وقت تذکرہ نگاروں نے حسبِ عادت حضرت امام برٹی کے مقابل ایک دوسرے بزرگ، شاہ چراغؒ کو لاکھڑا کیا ہے۔ روایت بیان کرنے والوں نے ایک سیدہ سادے دامنے کو اس قدر بیچ و خم دیئے ہیں کہ اس پر کسی طلسمی افسانے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایک بزرگ کو مراقبہ میں لڑکی نظر آئی ہے اور دوسرے کو لڑکا۔ پھر جب شاہ چراغؒ کی پیش گوئی درست ثابت نہیں ہوئی تو وہ حضرت امام برٹیؒ کی دعا سے پیدا ہونے والے لڑکے کو لڑکی بنا دیتے ہیں۔ یہ بات ایک کم علم مسلمان کے لئے بھی ناقابلِ فہم ہے۔ بزرگانِ دین کی روایت یہ رہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے۔ فقیہانِ کرام اور محدثینِ عظام صرف اللہ کے دین اور قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفہیم کے لئے ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے۔ جہاں تک ذاتی معاملات کا تعلق ہے تو وہ انتہائی کشادہ دل اور روشن دماغ ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کے لئے ایثار اور قربانی کا حق قدر اعلیٰ جذبہ رکھتے تھے کہ جس کی مثال، اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں میں نہیں ملتی۔ اس فہم کی تنگ نظری اور محاذ آرائی صرف دنیا پرست علماء میں ملتی ہے، جن کے لئے قرآن کریم نے گدھوں پر کتابیں لادنے کی تشبیہ استعمال کی ہے۔ یہی لوگ ملت فروش کہلاتے ہیں۔ اور یہی ناموسِ دینِ مصطفیٰ پیچتے ہیں۔ صوفی تو کہلاتا ہی وہ ہے، جس کا دل آخری حدوں تک صاف و شفاف ہو جائے اور اس میں میل جیل کا زور بھی باقی نہ رہے۔



قرآن کریم نے اہل ایمان کی ایک اور خاص علامت کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔
”یہ لوگ کفار کے حق میں بہت سخت دل اور شدت پسند ہوتے ہیں۔ مگر آپس میں انتہائی نرم خور و محبت کرنے والے۔“

جب اللہ کی آخری کتاب مقدس میں اہل ایمان کی یہ نشانی بیان کر دی گئی تو ہمیں صوفیائے کرام کے بارے میں بھی اسی حسنِ ظن سے کام لینا چاہئے۔ حضرت امام بری قادریؒ اور شاہ چراغؒ کا یہ واقعہ حقیقی تھا یا فرضی، اس سے قطع نظر، یہ ایک بڑی کرامت تھی کہ ایک اہل اللہ کی دعا سے ایک بوڑھی عورت کی بانجھ گود ہری ہو گئی۔ یہ ایسا ہے، جیسے کسی پتھر جلی زمین میں گندم بوئی جائے اور پھر کچھ دن بعد لوگ اپنی آنکھوں سے گیہوں کی شاندار فصل لہلہاتے ہوئے دیکھیں۔

جدید میڈیکل سائنس کی نئی تحقیق کے مطابق تقریباً پینتالیس سال کی عمر میں عورت اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ جو عورت، حضرت امام برٹیؒ کی دعا سے بامراد ہوئی، اس کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی۔

سائنسی تحقیقات اپنی جگہ، مگر اللہ تعالیٰ، جس کے ”اسائے حسنی“ میں ایک نام ”صمد“ (بے نیاز) بھی ہے، جس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ خالق کائنات جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کسی ظاہری سبب یا وسیلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس کے نتیجے میں تمام فکری اور سائنسی کلیات اُلٹ جاتے ہیں۔ اپنی اسی شان بے نیازی کو ظاہر کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے مشہور روہیلہ سردار، حافظ رحمت خان کو اس وقت پیدا کیا، جب ان کے والد محترم، شاہ عالم خان کی عمر تقریباً سو سال تھی۔ اور والدہ کی عمر ستر اسی سال کے قریب۔ تاریخ میں ایسی اور بھی بہت سی مثالیں نظر آجائیں گی، جب قدیم طب یونانی اور جدید میڈیکل سائنس کی تمام تر ریسرچ حرفِ غلط ثابت ہو جاتی ہے۔

بعض روایتوں کے مطابق، اللہ کے برگزیدہ نبی حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر مبارک ایک سو بیس سال کے قریب ہو چکی تھی۔ اور آپ بے اولاد تھے۔ باری تعالیٰ نے اس واقعے کو قرآن کریم میں جس طرح بیان فرمایا ہے،

اُردی ج ذیل ہے۔

اے پیغمبر! تیرے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر جو مہربانی کی تھی، یہ اس کا بیان ہے۔ جب ایسا ہوا بانے چکے چکے اپنے پروردگار کو پکارا۔ اس نے عرض کیا۔ ”پروردگار! میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے۔ میرے سر بھاپے سے سفید ہو گئے ہیں۔ خدایا! کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تیری جناب میں دعا کی ہو اور محروم رہا نے مرنے کے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے (کہ نہ معلوم وہ کیا خرابی پھیلائیں) اور میری بیوی بے بیٹا اپنے خاص فضل سے مجھے ایک وارث بخش دے۔ ایسا وارث، جو میرا بھی وارث ہو اور خاندان کی برکتوں کا بھی۔ اور پروردگار! اسے ایسا کر دیجو کہ تیرے اور تیرے بندوں کی نظر میں پسندیدہ ہو (ہو) اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہیں۔ اس کا نام یحییٰ رکھا جائے۔ اس لڑکے نے کسی کے لئے یہ نام نہیں ٹھہرایا۔ زکریا نے متعجب ہو کر کہا۔ ”پروردگار! میرے یہاں لڑکا کہاں سے برپا ہوگا؟ ہونچا اور میرا بڑھاپا دور تک پہنچ چکا۔ ارشاد ہوا۔ ایسا ہی ہوگا۔ تیرا پروردگار فرماتا ہے کہ ایسا کرے لے مشکل نہیں۔ میں نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا۔ حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان نہ تھا۔ اس پر لڑکھن کیا۔ ”خدایا! میرے لئے اس بارے میں ایک نشانی ٹھہرا دے۔“ فرمایا۔ ”تیری نشانی یہ ہے کہ صبح اور تہ بننے کے باوجود تین رات لوگوں سے بات نہ کرے گا۔“ پھر وہ حجرے سے نکلا اور اپنے لوگوں میں جلال نے ان سے اشارے سے کہا۔ ”صبح شام خدا کی پاکی و جلال کی صدائیں بلند کرتے رہو۔“ (سورہ مریم) اراکی واقعے کو ”سورہ انبیاء“ میں اس طرح بیان فرمایا گیا۔

اُردی طرح زکریا (کا معاملہ یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا۔ خدایا! مجھے اس دنیا میں اکیلا نہ چھوڑو، ہم سب کا بہتر وارث ہے۔ تو دیکھو، ہم نے اس کی پکار سن لی۔ اور اسے (ایک فرزند) یحییٰ عطا کر دیا۔ اس کی بیوی کو اس کے لئے تندرست کر دیا۔ یعنی اس کا بچہ پن دُور کر دیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں پر تھے۔ اور ہمارے فضل سے اُمید لگائے ہوئے اور ہمارے جلال سے ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور مانگے مجھ کو نیاز سے جھکے ہوئے تھے۔“ (سورہ انبیاء)

”سورہ مریم“ اور ”سورہ انبیاء“ کے علاوہ ”سورہ آل عمران“ میں بھی حضرت زکریا علیہ السلام کی حیات مقدسہ کا اہم ترین واقعے کا ذکر ہے۔ ایک مقام پر تو اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبی، حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں یحییٰ اس طرح بیان فرمائی ہے۔

”اے میرے رب! میری ہڈیاں تک کھوکھلی ہو چکی ہیں۔“

آیت مقدسہ کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے بڑھاپے کی زیادتی کے سبب خود حضرت زکریا علیہ السلام کو بھی صاحبِ دل کا یقین نہیں تھا۔ اس لئے دعا مانگتے ہوئے یہ بھی دیکھ لیا کرتے تھے کہ کہیں کوئی دوسرا شخص ان کی اس آگاہی تو نہیں رہا ہے۔

دہری طرف حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ محترمہ قدرتی طور پر بانجھ تھیں۔ اب اگر ہم جدید سائنس کی لہاں واقعے کا جائزہ لیں تو تصورات کی حد تک بھی اولاد کی پیدائش کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے حق نے ”مردوزن“ دونوں کے ناکارہ پن کا بیان فرمایا۔ پھر ایک طرف اپنی عظیم الشان قدرت کا مظاہرہ کرتے عزت یحییٰ علیہ السلام جیسے عظیم و جلیل نبی کو عالم اسباب میں ظاہر کیا۔ اور دوسری طرف قیامت تک کے لئے ہمارے والے انسانوں کو یہ حقیقت بھی بتادی کہ دعا میں کتنی تاثیر ہوتی ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مقدس ہے کہ دعا سے موت بھی مل جاتی ہے۔ اگر اس حدیثِ مبارک کے معانی کی گہرائی پر غور کیا جائے تو یہ عجیب پہلو بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دعا سے انسان کو نئی زندگی بھی مل جاتی ہے۔ اور نئی زندگی سے اس بچے کی پیدائش بھی مراد ہے، جس کے بارے میں طبّی سائنس حکم لگا چکی ہے کہ اب وہ دنیا میں نہیں آئے گا۔

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے مشہور بزرگ، حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی دعاؤں سے مغل شہزادہ سلیم پیدا ہوا تھا۔ اس لئے شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اپنے بیٹے کا نام حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے نام پر سلیم رکھا۔

اسی طرح ریاست میسور کا حکمران، حیدر علی اولادِ زینہ سے مایوس ہو چکا تھا۔ انجام کار وہ ارکات کے مشہور بزرگ حضرت ٹیپو مستانؒ کے حرازِ مبارک پر حاضر ہوا اور فرزندے لئے دعا کی۔ پھر جب حیدر علی کے لڑکا پیدا ہوا تو اس نے اپنے بیٹے کا نام حضرت ٹیپو مستانؒ کی نسبت سے ٹیپو سلطان رکھا۔ یہ صرف ان چند لوگوں کے نام ہیں، جو دنیا کی تاریخ کے اوراق پر ثبت ہیں۔ اگر ہم عام دنیا میں بھی ایسی مثالیں ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے تو ہمیں بہت سے لوگ نظر آجائیں گے، جن کے بارے میں طبّی سائنس نے فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ کبھی ماں باپ نہیں بن سکتے۔ پھر جو کچھ پردہ غیب سے ظاہر ہوا، وہ مادہ پرستوں کے لئے مقامِ حیرت بھی ہے اور مشعلِ ہدایت بھی۔ مختصر ان تمام واقعات میں دعا کی غیر معمولی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

اب اگر حضرت امام برّیؒ کی دعا سے وہ بوڑھی عورت، صاحبِ اولاد ہو گئی تو اہل یقین کو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ روایت کے باقی حصے فسانہ طرازی ہیں جن سے حضرت امام برّیؒ کی بزرگانہ شان میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔



عام طور پر تمام تذکرہ نگاروں نے حضرت امام برّیؒ کی حیاتِ مبارکہ کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور وہ ہے، جس میں آپؒ نے طویل سیاحت کی اور مختلف اساتذہ سے دینی اور دیگر مرتبہ علوم حاصل کئے۔ یہ وہی دور ہے، جب حضرت امام برّیؒ نے وطن واپسی کے بعد اپنا مدرسہ قائم کیا، جس سے ہزاروں غریب اور نادار طلباء فیض یاب ہوئے۔

دوسرا دور وہ ہے، جب آپؒ حضرت شیخ حیات المیرؒ کے دستِ مبارک پر سلسلہ قادریہ میں بیت ہوئے۔ اور پھر حضرت امام برّیؒ نے تزکیہٴ نفس کے لئے شدید ریاضتیں شروع کیں، جن کے تصور ہی سے عام انسانوں کے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔

ان ہی ریاضتوں کے دوران حضرت امام برّیؒ، راولپنڈی کے نزدیک چور پور کے جنگل میں مقیم تھے۔ اس زمانے میں یہاں ہندوؤں کی کثیر تعداد آباد تھی۔ ایک دن حضرت امام برّیؒ، شیشم کے ایک ایسے درخت کے نیچے بیٹھے ذکرِ الہی میں مشغول تھے، جو مکمل طور پر سوکھ چکا تھا اور سالِ خوردگی کے سبب اس کا تناکھو کھلا ہو چکا تھا۔ اچانک ادھر سے ہندو یا تریوں کا ایک قافلہ گزرنا جو اپنے ساتھ بہت سا ساز و سامان اٹھائے ہوئے تھا۔ حضرت امام برّیؒ نے ایک عمر رسیدہ ہندو سے پوچھا۔

”تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟ کیا ترکِ وطن کا ارادہ ہے؟“

”تم نے کیسے ندازہ لگایا کہ ہم اپنا علاقہ چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو رہے ہیں؟“ بوڑھے ہندو نے ایک

نافر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ہم تو اثنان (عسل) کرنے جا رہے ہیں۔“
”عسل کرنے کے لئے ساز و سامان لے جانے کی ضرورت تو پیش نہیں آتی۔“ حضرت امام بریؒ نے اپنی
دیکھا بھار کرتے ہوئے فرمایا۔

”ہم اثنان کے لئے ”پریاگ“ جاتا ہے۔ یہاں سے بہت دور۔“ بوڑھے ہندو نے بطور فخر کہا۔
”کیا یہاں کے دریا خشک ہو چکے ہیں؟“ حضرت امام بریؒ نے تبسم فرمایا۔
”دیا تو لبریز ہیں، مگر ان کے پانیوں میں پاک کرنے اور پاپ دھونے کی صلاحیت نہیں ہے۔“ بوڑھے ہندو
بنا کے لہجے سے تمسخر کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ جیسے وہ ایک مسلمان درویش کی کم علمی کا مذاق اڑا رہا ہو۔ ”وہاں گنگا اور
یاغم ہے۔ ہندوستان میں بس یہی دو دریا، انسان کے پاپ دھونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“
”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ حضرت امام بریؒ نے فرمایا۔ ”اگر انسان کا عقیدہ درست نہ ہو تو دنیا بھر کے دریاؤں
پانی بھی انسان کو پاک نہیں کر سکتا۔“

اس سے پہلے کہ وہ بوڑھا ہندو، حضرت امام بریؒ کی بات کا جواب دیتا، ایک لمبے بالوں اور بے ترتیب داڑھی
نہ پر ہنر شخص آگے آیا اور حضرت امام بریؒ سے طنزیہ لہجے میں کہا۔
”اگر گنگا اور جمن کا پوتر جل (پاک پانی) انسان کے پاپوں کو نہیں دھو سکتا تو پھر اسے کیا چیز پاک کر سکتی ہے؟“
”خدا نے واحد پر ایمان، خاموشی سے اس کا ذکر اور بنی نوع انسان کی خدمت۔“ حضرت امام بریؒ نے ہندو
بہت (پجاری) کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ”بس یہی تین اعمال ایسے ہیں، جن کے ذریعے انسان
نہوں کی کثافت و غلاظت کو دور کر کے صاف و شفاف ہو سکتا ہے۔“

ہندو پر وہت نے حضرت امام بریؒ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم اس سوکھے درخت کے نیچے بیٹھے جل رہے
ہو تمہارے خدا نے اب تک تم پر اتنا بھی رحم نہیں کھایا کہ اس شیشم کے درخت کو ہرا بھرا کر کے تم پر سایہ ہی کر دیتا۔“
حضرت امام بریؒ نے ہندو پر وہت کے اس تمسخر آمیز لہجے کے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرے خدا کی
بے مثال ہے۔ وہ زندوں کو مردہ بنا دیتا ہے۔ اور پھر ایک دن مردوں میں دوبارہ جان ڈال دے گا۔ جب وہ کسی
مذہب سے وجود میں لے آتا ہے تو پھر اس موجود سوکھے ہوئے درخت کو سرسبز و شاداب کر دینا اس کے لئے کیا
کٹ ہے؟“

ہندو پر وہت نے ایک مسلمان درویش کی بات کی گہرائی کو سمجھنے کے بجائے مزید مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”تو
تمہارے خدا نے اس بیڑ کو ہرا بھرا کیوں نہیں کیا؟“
”اس کی مرضی۔“ حضرت امام بریؒ نے نہایت جذب و شوق کے لہجے میں فرمایا۔ ”بندے کو ہر حال میں راضی
بنا دینا چاہئے۔ وہ دھوپ ہو یا سایا بنان، اس کے ماننے والوں کے لئے سب حالتیں یکساں ہیں۔“
”تم ہمیشہ اسی حالت میں رہو گے۔ کیونکہ تمہارے مذہب میں کوئی سچائی نہیں۔“ ہندو پر وہت کے لہجے میں
نہ کے ساتھ حقارت کا رنگ بھی شامل ہو گیا تھا۔

”ہندو دھرم ہی سچا ہے۔ وہی اپنے ماننے والوں کو پاک بھی کرتا ہے اور انہیں مکتی بھی دیتا ہے۔“
”جاؤ! اپنی راہ لو۔“ حضرت امام بریؒ نے بے نیازانہ کہا۔ ”عنقریب تم لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ سچائی کیا
ہندو یا تیروں کا قافلہ اپنے دیوتاؤں کو پکارتا اور بلند آوازوں میں بھجن گاتا ہوا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔“

حضرت امام بریؒ نے ان گم کردہ راہوں پر ایک نظر ڈالی اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”بے شک! اُو جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گم راہ کر دے۔ سب کچھ تیرے ہی اختیار میں ہے۔ پھر بھی ان بت پرستوں کے سامنے اپنے نام لیا کو شرمندہ نہ کر۔“

ہندو یاتریوں کا قافلہ کئی ماہ بعد لنگا نہا کر اور بزعم خود اپنے پاپ دھوکرواپس لوٹے تو حضرت امام بریؒ کو اسی شیشم کے درخت کے نیچے ذکر الہی میں غرق پایا۔ مگر اس بار صورت حال بدلی ہوئی تھی۔ تمام ہندو یاتری شدید حیرت کے عالم میں شیشم کے اس درخت کو دیکھنے لگے، جو چند ماہ پہلے سوکھ چکا تھا اور اب جس میں نئی شاخیں اور پتے پھوٹ آئے تھے اور جن کا سایہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

حضرت امام بریؒ نے ہندو یاتریوں کی طرف دیکھا۔ آپ کے ہونٹوں پر وہی تبسم دلنواز تھا، جو ایک عارف کی بنیادی پہچان ہوتی ہے۔ ”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ کیا تم لوگوں نے اپنے پاپ دھو ڈالے؟..... اور تم اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ سچائی کیا ہے؟“

”سچائی یہی ہے، جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔“ پروہت نے شیشم کے گھنے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر وہ تمام ہندو یاتری، حضرت امام بریؒ کے دست حق پرست پر ایمان لے آئے۔ گردن اور کمر کے گرد پڑے ہوئے جینو (ڈورے) کو توڑ ڈالا اور ماتھے پر لگے ہوئے نشقے (چھاپ تلک کے نشان) کو کھرچ ڈالا۔



اس واقعے کے بعد حضرت امام بریؒ ”دھیر کوٹ“ تشریف لے گئے۔ اس علاقے کی بیشتر آبادی بت پرستوں اور مشرکوں پر مشتمل تھی۔ حضرت امام بریؒ گمراہوں کے ہجوم میں کھڑے ہو کر خدائے واحد کی پاکی بیان کرتے۔ آپ کی تقریریں اور وعظ اس قدر اثر انگیز ہوتے کہ پتھر کے پجاریوں کے دلوں میں چھپے ہوئے صدیوں پرانے پتھر پکھلنے لگے اور وہ نفس کے صنم خانوں کو مسمار کرتے ہوئے گواہی دینے لگتے۔

”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔“

حضرت امام بریؒ کی تبلیغ کے نتیجے میں سینکڑوں اہل ہنود، حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ روایت کے مطابق دھیر کوٹ میں بت پرستوں کی ایک قوم ”ستی“ آباد تھی، جس کے بیشتر افراد نے اپنے آبائی مذہب سے تائب ہو کر ”دینِ حنیف“ قبول کر لیا۔

پھر جب حضرت امام بریؒ کی تبلیغ کا دروازہ وسیع ہوا تو مشرکین کی ایک اور قوم ”تہوڑ“ آپ کی دشمن ہو گئی۔ تہوڑوں کا سردار سینکڑوں مسلح افراد کے ساتھ حضرت امام بریؒ کی جھونپڑی میں داخل ہوا اور انتہائی تنبیہ آمیز لہجے میں آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”میں تمہیں بس دودن کی مہلت دیتا ہوں۔ اپنی جھونپڑی مسمار کر دو۔ اور ساز و سامان اٹھا کر یہاں سے دُور چلے جاؤ۔ ورنہ اس جھونپڑی میں رہنے والوں کو نذرِ آتش کر دیا جائے گا۔“ تہوڑ قوم کے سردار کا اشارہ حضرت امام بریؒ اور آپ کے خدمت گاروں کی طرف تھا۔

حضرت امام بریؒ نے برگشتہ اور غضب ناک ”تہوڑوں“ کو نہایت شفقت آمیز لہجے میں سمجھایا۔

”میں تو تمہیں اس دائمی آگ سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں، جس کا ایندھن صرف انسان اور پتھر ہیں۔ مگر تم مجھ ہی کو نذرِ آتش کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہو۔ میری بات غور سے سنو! اسی میں تمہاری نجات ہے۔“

نہاڑوں کا سردار ایک مسلمان کا درس سن کر اور بھی غضب ناک ہو گیا۔ ”ہم آگ کی پوجا ہی اس لئے کرتے کہ وہ ہمیں عذاب کے دن سے بچا سکے۔ یہ آگ بھی بھگوان ہی کا ایک روپ ہے۔“

”جو آگ ایک لوٹا پانی سے بجھ جائے، وہ بھگوان کس طرح ہو سکتا ہے؟“ حضرت امام بریؒ نے مشتعل نہاڑوں کو عقلی دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر قرآن کریم کے مطابق یہ لوگ وہ تھے، جن کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے تھے اور دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں۔ نہ یہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔ مگر سردار کا چھوٹا بھائی، حضرت امام بریؒ کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔

الغرض وہ سردار، آپ کو یہاں سے چلے جانے کی دھمکی دے کر اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ لوٹ گیا۔ حضرت امام بریؒ کے چند ناتواں خدمت گار، موت کے تصور سے لرزے لگے تھے۔ سب نے دست بستہ عرض

”شیخ! اس کے تیور بہت خراب ہیں۔ ہمیں کسی دوسری محفوظ جگہ کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنالینا چاہئے۔“

”کیا وہ جگہ خطرات سے خالی نہیں ہوگی؟“ حضرت امام بریؒ نے اپنے خدمت گاروں کی درخواست کے جواب میں نہایت اطمینان سے فرمایا۔ ”تمہاری تبلیغ کا ہدف، مشرکین ہی کی کوئی نہ کوئی بستی ہوگی۔ ”ضرب لا الہ“ ماننے والے جب پتھر ٹوٹیں گے تو شور بھی برپا ہوگا۔ اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ضرب لگانے والے اپنی زلے سے بھی گزر جاتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ حیات چند روزہ عزیز ہے تو مجھے تنہا چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میرے لئے اللہ نا ہے اور وہی بہترین کار ساز ہے۔“

حضرت امام بریؒ کے اس ارشاد گرامی کے بعد کچھ خدام تو موت کے خوف سے چلے گئے، مگر چند جاں نثاروں نے آڑی سانس تک اپنے شیخ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

”تہاڑ سرداروں کے چھوٹے بھائی کے دل و دماغ میں شدید کشمکش جاری تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں حضرت امام ہارادانیؒ کا چہرہ دیکھ کر متاثر ہو گیا تھا۔ پھر جب اس نے آپ کی زبان مبارک سے دلائل حق سننے تو حیرت زدہ رہ

”جن آگ کو ایک لوٹا پانی بجھا سکتا ہے، پھر وہ بھگوان کس طرح ہو سکتا ہے؟“ سردار کا چھوٹا بھائی نصف شب نمانے میں حضرت امام بریؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ کو بار بار دہرا رہا تھا۔ پھر اپنے آپ سے کہتا تھا۔ ”یہ بات اب تک آگ کے پجاریوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟“

مبارزات ڈھلتے ڈھلتے تہوڑ قوم کا ایک با اثر اور ممتاز رکن، صدیوں پرانے اندھیرے کے حصار سے باہر آچکا تہاڑ مورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی نور ہدایت اس کا مقدر بن چکا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس پہنچا اور ہاتھ ملنے میں بولا۔

”مسلمان درویش کی بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔ اس لئے میں باپ دادا کا دھرم چھوڑ کر ان کے پاس جا رہا

نہاڑوں کے سردار نے چھوٹے بھائی کو بہت سمجھایا۔ مگر اس کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ جس انقلاب نے ذہن ہارادے پر دستک دی تھی، اب وہ دل کے نہاں خانوں میں داخل ہو چکا تھا۔ نتیجتاً ”تہوڑ“ قوم ددھووں میں نہوئی۔ چھوٹا بھائی اپنے ماننے والوں کو لے کر اپنی آبائی حویلی سے نکل آیا اور رخصت ہوتے وقت اپنے بڑے بھائی کے ہاتھ لے کر ان کے ساتھ چلا گیا۔

”اب وہ مسلمان منیاسی میرے گرد ہیں۔ اگر کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو وہ مجھے اپنے مخالف کھڑا ہوا پائے گا۔ میں اپنے گرد کی رکھشا (حفاظت) اس وقت تک کروں گا، جب تک میری جان میں جان ہے۔“

پھر وہ چھوٹا سردار، حضرت امام برٹی کی خدمت میں حاضر ہو کر دولتِ ایمانی سے شرف یاب ہوا۔ ہندوؤں کی ایک قوم ”ستی“ پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔ تہواڑوں کے ایمان لانے سے کلمہ گویوں کی طاقت میں مزید اضافہ ہوا۔ تہواڑوں کا سردار اپنے عقیدے پر قائم رہا۔ ایک روایت کے مطابق کچھ دن بعد حق و باطل میں خونریز جنگ ہوئی۔ انجام کار وہ سرکش سردار مارا گیا۔ کچھ تہواڑ فرار ہو گئے اور باقی حضرت امام برٹی کے پیروکاروں میں شامل ہو گئے۔ اس طرح ایک محتاط اندازے کے مطابق حضرت امام برٹی کی تبلیغی کوششوں کے نتیجے میں ہزاروں بت پرست، خدائے واحد کے آگے سجدہ ریز ہوئے۔ اور پھر ان لوگوں نے داخلی (قلبی) بت خانوں کے ساتھ خارجی صنم خانے بھی مسمار کر ڈالے۔

بعض محققین کے مطابق ”پونٹھوار“ کے علاقے میں اسلام کی جو روشنی پائی جاتی ہے، وہاں کفر کی طوفانی ہواؤں میں پہلا چراغ حضرت امام برٹی نے ہی جلایا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے بقول ۔

ہوا ہے گو شید و تیز، لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش، جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ



حضرت امام برٹی کی حیات مبارکہ کا تیسرا اور آخری رنگ ہے، جذب و کیف اور شوق و مستی کا رنگ۔ راولپنڈی کا نواحی علاقہ، جو بھی ”چور پور“ کہلاتا تھا، وہ حضرت امام برٹی کے قدموں کی برکت سے ”نور پور“ بن گیا تھا۔ یہاں ”نور پور“ کے ایک غار میں حضرت امام برٹی نے طویل چلہ کشی کی۔ یہ غالباً وہ زمانہ ہے، جب آپ کی زوجہ محترمہ اور کم سن بچی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ پھر عائلی رشتوں کی زنجیر سے آزاد ہونے کے بعد آپ نے اپنے پیرو مرشد کے حکم پر یکسوئی حاصل کرنے کے لئے ایک غار کو اپنا مسکن بنایا تھا۔

غار کے باہر حضرت امام برٹی کے مرید اور خدمت گار فروکش تھے۔ جو حسبِ ضرورت اپنے شیخ کے لئے ”آب و دانہ“ کا انتظام کرتے تھے۔

روایت کے مطابق حضرت امام برٹی نے اس چلہ کشی میں کئی سال گزار دیئے۔ پھر آپ کے پیرو مرشد حضرت شیخ حیات المیرؒ تشریف لائے اور غار کے دہانے پر کھڑے ہو کر اپنے مرید صادق کو پکارا۔

”شاہِ لطیف! تمہاری ریاضت مکمل ہوئی۔ اب غار سے باہر آؤ۔ آج کا دن بڑا ہی مبارک ہے۔“

پیرو مرشد کی صدائے دلنوا سن کر حضرت امام برٹی اپنی چلہ گاہ سے باہر آئے اور حضرت شیخ حیات المیرؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر عرض کیا۔ ”یہ سب میرے شیخ کے فیضِ روحانی اور التفاتِ خاص کا صدقہ ہے کہ یہ خادم اپنی منزل مقصود کو پہنچا۔“

حضرت شیخ حیات المیرؒ نے خوش ہو کر حضرت امام برٹی کو گلے لگایا۔ پھر انتہائی پر شوق لہجے میں فرمایا۔

”عبداللطیف! مبارک ہو کہ تمہیں حق تعالیٰ نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے معمور کر دیا اور معرفت کے اسرار و رموز کھول دیئے۔ آج سے تم ”امام بر“ ہو۔“

”بر“ عربی زبان میں خشکی کو کہتے ہیں۔ اور خشکی سے مراد ہے دنیا۔ اسی رعایت سے حضرت شیخ حیات المیرؒ نے اپنے مرید جانثار کو ”امام بر“ یعنی دنیا کے امام کا لقب دیا۔ پھر اس لقب نے شہرت دوام حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ

ہندوؤں کی اکثریت آپ کے خاندانی نام کو بھی فراموش کر بیٹھی۔ بس اُسے ”بری امام“ یاد رہ گئے۔



اب ہم حضرت امام بریؒ کے حوالے سے چند ایسے تاریخی واقعات کا ذکر کریں گے، جو ہمارے تذکرہ نگاروں بالائی کے سبب آپس میں خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اور جن سے ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں، جو تاریخ کے طلباء کے لئے شدید ذہنی الجھنوں کا سبب بنتی ہیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ ایک طویل لڑائی کے بعد اورنگ زیب کے بڑے بیٹے شہزادہ اعظم شاہ کو شکست ہوئی۔ اور چھوٹا بیٹا، بہادر شاہ فاتح قرار پایا۔ تخت نشین ہوا۔ بہادر شاہ کو شاہ عالم اول کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

تذکرہ نگاروں نے بڑے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ ہندوستان کا اقتدار سنبھالنے کے بعد بہادر شاہ (شاہ عالم) نے امام بریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ روایت کے مطابق یہ اس زمانے کا واقعہ ہے، جب حضرت امام بریؒ نے روبرو (ساتھ چور پور) میں مستقل سونت اختیار کر لی تھی..... اور اس کے ساتھ ہی آپ نے طالبانِ شوق کو سیراب کرنے کے لئے ایک مدرسہ بھی بنا ڈالا تھا۔

مغل شہنشاہ، بہادر شاہ نہایت بزرگ و احتشام کے ساتھ دارالحکومت دہلی سے روانہ ہو کر اپنے لشکر کے ہمراہ روبرو پہنچا۔ حضرت امام بریؒ کے خدمت گاروں نے آپ کو بادشاہ ہند کی آمد کی خبر دی۔ اس وقت حضرت امام بریؒ اپنے طلباء کو درس دے رہے تھے۔ خدام کی دی ہوئی اطلاع پا کر آپ نے فرمایا۔
”اگر بادشاہ اس فقیر کی مجلس درس میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو خوشی سے چلے آئیں۔“

حضرت امام بریؒ کے بعض مریدوں نے عرض کیا۔ ”سیدی! بادشاہ ہند کا استقبال ضروری ہے۔“ مریدوں کی بات کا مفہوم یہ تھا کہ پیرومرشد، خانقاہ سے نکل کر بہادر شاہ کو خوش آمدید کہیں۔ یا کم سے کم، خانقاہ کے دروازے پر غرغرف لے جا کر فرماں روائے ہند کا استقبال کریں۔

حضرت امام بریؒ نے مریدوں کی اس درخواست کو بے نیازانہ سنا اور بے باکانہ فرمایا۔ ”فقیر کی طرف سے شہنشاہ کا استقبال یہی ہے کہ میں انہیں اپنی خانقاہ میں آنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ رہی رسم دنیا تو اس کے نبھانے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

بہادر شاہ (شاہ عالم اول) حضرت امام بریؒ کی خانقاہ سے کچھ فاصلے پر خیمہ زن ہو گیا تھا۔ جب حضرت امام بریؒ کے خدمت گاروں نے بہادر شاہ کو اپنے شیخ کے فرمان سے آگاہ کیا تو والی ہندوستان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ گردہ پھر بھی حضرت امام بریؒ سے ملاقات کے لئے خانقاہ میں حاضر ہوا۔

جب درس ختم ہو گیا تو حضرت امام بریؒ نے اپنی نشست سے اٹھ کر بادشاہ ہند سے مصافحہ کیا اور مزاج پرسی کی۔ بہادر شاہ نے اپنی آنکھوں سے ایک مردِ قلندر کی شان بے نیازی دیکھی اور بہت زیادہ متاثر ہوا۔ پھر اس نے خانقاہ کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہوئے اپنے خدام کو اشارہ کیا، جن کے ہاتھوں میں غلاف پوش خوان تھے۔ شہنشاہ ہند کے خدام، ادب سے آگے بڑھے اور سارے خوان، حضرت امام بریؒ کے سامنے رکھ دیئے۔

”یہ کیا ہے؟“ حضرت امام بریؒ نے بہادر شاہ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔
”شیخ کے لئے نذر لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اسے قبول فرمائیے۔“ شہنشاہ ہند نے پُر جلال لہجے میں کہا۔ اس کے لڑ گنگو سے شانِ امارت ظاہر ہو رہی تھی۔

حضرت امام برٹی نے ایک نظر بہادر شاہ کو دیکھا اور خوانوں پر پڑے ہوئے غلاف ہٹا دیے۔ تمام خوان، اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر حضرت امام برٹی کے چہرہ مبارک پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔

”فقیران چیزوں کی حاجت نہیں رکھتا۔ یہ دنیا کے کتوں کے لئے ہیں۔“ حضرت امام برٹی کے لہجے سے جلال روحانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

ایک مرد درویش کا یہ انداز دیکھ کر فرماں روا نے ہند کے دل میں شدید ناپسندیدگی کے جذبات اُبھرے۔ مگر اس نے اپنی زبان سے اظہار نہیں کیا۔ بس خاموش بیٹھا حضرت امام برٹی کے چہرہ مبارک کا جائزہ لیتا رہا۔ جس پر اب بھی ناگواری کا گہرا رنگ موجود تھا۔

حضرت امام برٹی اپنی قوت کشف کے ذریعے بہادر شاہ کے جذبات سے آگاہ ہو گئے تھے۔ آپ نے اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”شہنشاہ کے خیالات فاسد ہیں۔ فقیر تو ان زرد جواہر کو ریت کے ذرّوں کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔“

بادشاہ ہند ایسی گفتگو سننے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ یہ فقیر اپنے احساسِ محرومی کو چھپانے کے لئے دولت کے انبار کو حقیر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

حضرت امام برٹی، بہادر شاہ کے اس خیال سے بھی باخبر ہو گئے نتیجتاً آپ نے اپنے مُصلّے کا کونا اٹھا دیا۔ حیرت سے فرماں روا نے ہند کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ درویش کی چٹائی کے نیچے زرد جواہر کا ایک دریا بہتا ہوا نظر آیا۔ تذکرہ نگاروں کی روایت کے مطابق یہ منظر دیکھ کر مغل شہنشاہ، بہادر شاہ کے چہرے پر ندامت کے آثار اُبھر آئے اور پھر وہ سب کے سامنے ایک مردِ قلندر سے معافی کا خواست گار ہوا۔

حضرت امام برٹی نے جواب میں بادشاہ ہند کو نصیحت فرمائی۔ ”دنیا کے پتھروں سے زیادہ قیمتی وہ جواہر ہیں، جو عبادتِ خداوندی سے حاصل ہوتے ہیں۔“ اس کے بعد آپ نے ایک مسلمان حکمران کو آئینِ شریعت کی روشنی میں ہدایات فرمائیں۔ ”جب حق تعالیٰ کسی مومن کو اقتدار عطا کرے تو اُس پر لازم ہے کہ وہ ارکانِ اسلام کو قائم کرے اور دین کے اصولوں کو فروغ دے۔ راگ رنگ اور لہو و لعب سے پرہیز کرے۔ جوئے اور شراب کے نزدیک نہ جائے۔ اپنی ذات کو عوام الناس کے لئے کردار کا اعلیٰ نمونہ بنائے تاکہ رعایا، بادشاہ کو دیکھ کر راہِ راست پر گامزن ہو سکے۔“

یہ ہے وہ روایت، جس کو ہم نے اپنے قارئین کی خدمت میں من و عن پیش کر دیا ہے۔ بس اس قدر تحریف کی ہے کہ تذکرہ نگاروں نے حضرت امام برٹی کی زبان سے بہادر شاہ کے لئے گستاخانہ الفاظ ادا کرائے تھے، جو ایک مردِ مومن کے شایانِ شان نہیں۔ عام مسلمان کے لئے بھی ”شیریں کلامی“ اختیار کرنے کا حکم ہے۔ پھر اللہ کا ایک دوست، تلخ گو اور ہنسد خوش طرح ہو سکتا ہے؟ بہادر شاہ ”اولی الامر“ تھا۔ اور قرآن کریم کے مطابق حضرت امام برٹی پر دہلی ہندوستان کا ظاہری احترام لازم تھا۔

بہر حال، ان تمام باتوں سے قطع نظر، اس روایت کا بنیادی نقص یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے حضرت امام برٹی اور بہادر شاہ کی ملاقات ثابت نہیں ہوتی۔ حضرت امام برٹی کا انتقال 1117ھ میں ہوا تھا۔ اور بہادر شاہ کی رسمِ تاجپوشی 1119ھ میں ہوئی تھی۔ اس طرح جب اورنگ زیب عالمگیر کا چھوٹا بیٹا تخت نشین ہوا تو حضرت امام برٹی گو جہان فانی سے رخصت ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔



ہم اس مضمون کی ابتدا میں پوری تفصیل کے ساتھ شاہ جہاں اور عالمگیر کے حوالے سے اس واقعے کو بیان کر

ہے، جس میں شاہی جاسوسوں نے خبر دی تھی کہ حضرت امام برہنہ بادشاہ دقت کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ پھر شاہ جہاں کے حکم پر شہزادہ عالمگیر اس صورت حال کی تحقیق کرنے کے لئے حضرت امام برہنہ کی رات میں حاضر ہوا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت امام برہنہ اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ ایک ہی ہے۔ اس عظیم مغل شہنشاہ نے 1107ھ میں دنیا کو خیر باد کہا اور سلسلہ قادریہ کے عظیم و جلیل فرزند حضرت امام برہنہ نے عالمگیر کے قتل کے دس سال بعد عالم بالا کی طرف کوچ کیا۔ اس حقیقت کے باوجود دونوں تاریخ ساز شخصیتوں کے درمیان بات بات نہیں ہوتی۔ یہ ہمارے تذکرہ نگاروں کی غیر محققانہ نظر ہے، جس نے ناموں کی یکسانیت کی وجہ سے انہیں اکٹھا اور پھر ایک بے بنیاد روایت صوفیاء کے حلقے میں سفر کرنے لگی۔

مشہور مؤرخ نظام الملک خانی نے اپنی تاریخ ”منتخب الملباب“ میں ان بزرگان دین کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے جن کی خدمت میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نہایت عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتے تھے۔ شیخ محمد وارثؒ، بابا بزرگ، سید حسن رسول نمنا، شیخ برہانؒ، سید نصیر الدین بدویؒ، سید سعد اللہ اور میر مرتضیٰ واعظؒ ان صوفیائے کرام کی رت میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

یہاں حضرت شیخ برہانؒ کا مختصر ذکر بہت ضروری ہے۔ آپ برہان پور کے مشاہیر میں سے تھے۔ حضرت شیخ برہانؒ نے مشہور بزرگ حضرت شیخ عیسیٰؒ کی بہت خدمت کی تھی۔ یہاں تک کہ آپ اپنے مرشد کے لئے استنجے کے عطیک اٹھا کر لاتے تھے اور محفل سماع میں بھی برابر حاضر رہتے تھے۔ اسی خدمت کی وجہ سے حضرت شیخ برہانؒ کی مذکورہ کبر بدل گئی اور آپ کا شمار بھی بڑے بزرگان دین میں ہونے لگا۔ اس برگزیدہ مرد حق کے اوصاف و محاسن کو خود بھی بیان کیا جائے، کم ہے۔ ہر خاص و عام سے حضرت شیخ برہانؒ کا حسن سلوک ایسا تھا کہ ہر قوم کے آدمی اسے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ لوگوں نے ان کی بے شمار کرامتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔

جس زمانے میں حضرت خلد مکاں اورنگ زیب عالمگیر، داراشکوہ کے مقابلے پر نکلے تھے تو حضرت شیخ برہانؒ کی رت میں حاضر ہونا چاہتے تھے۔ چونکہ شیخ برہانؒ، بادشاہوں سے ملاقات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے بادشاہ عالمگیرؒ کو اطلاع دیئے بغیر رات کے وقت بھیس بدل کر لوگوں کے مجمع میں جا کر بیٹھ گئے۔

حضرت شیخ برہانؒ نے بادشاہ ہند سے نام پوچھا تو فرماں روا نے ہند نے عرض کیا۔ ”اورنگ زیب۔“ عالمگیر کے اس جواب پر حضرت شیخ برہانؒ خاموش ہو گئے اور عالمگیر سے پھر کوئی بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ کو اپنی مجلس کا تبرک بھی نہیں دیا۔

دوسرے دن عالمگیر اسی طرح بھیس بدلے ہوئے حضرت شیخؒ کی مجلس میں دوبارہ حاضر ہوا۔ حضرت شیخ برہانؒ نے اورنگ زیب کو دیکھ کر بے ساختہ فرمایا۔

”اگر یہ جگہ بادشاہ کو پسند آگئی ہے تو بتا دیں۔ ہم فقیر اپنے لئے کوئی دوسرا نکیہ تلاش کر لیں۔“ (واضح رہے کہ اردنوں کی قیام گاہ کو نکیہ بھی کہا جاتا ہے)

عالمگیر کا کام و نامراد چلا گیا۔ حضرت شیخ برہانؒ کے خادم خاص کا نام مالو تھا۔ اورنگ زیب نے ان ہی خادم کو شہنشاہ کے لئے واسطہ بنایا۔ آخر حضرت شیخ برہانؒ نے شیخ نظامؒ کے توسط سے بادشاہ کو ملاقات کی اجازت لے لی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ جب حضرت شیخؒ نماز کے لئے خانقاہ سے باہر نکلیں تو شہنشاہ ہندوستان، خانقاہ کے دروازے پر حاضر رہے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے ایسا ہی کیا۔ پھر جب حضرت شیخ برہانؒ، شیخ نظامؒ، شیخ میرؒ اور میر

میراں کے ہمراہ خانقاہ سے باہر نکلے تو بادشاہ ہند دروازے پر موجود تھا۔ (یہ وہ زمانہ تھا، جب تخت ہندوستان کے لئے اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بڑے بھائی شہزادہ داراشکوہ کے درمیان معرکہ آرائی جاری تھی)

حضرت شیخ برہان نے کھڑے کھڑے اورنگ زیب کی مزاج پرسی کی۔ عالمگیر نے عرض کیا۔ ”شہزادہ داراشکوہ دین اور شرع میں بے احتیاطیاں کر کے اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حسبِ مقدور دین محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمت کر سکوں۔ اس لئے شیخ کی خصوصی توجہ اور دعاؤں کا طلب گار ہوں۔“

جواب میں حضرت شیخ برہان نے فرمایا۔ ”ہم بے اعتبار فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے؟ تم بادشاہ ہو۔ عدل انصاف اور رعایا پروری کے لئے اپنی نیت درست کر کے دعا کرو۔ ہم بھی ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔“

پھر جب حضرت شیخ برہان کی دعا ختم ہوئی تو شیخ نظامؒ نے اورنگ زیب سے سرگوشی میں کہا۔ ”شہزادے! آپ کو بادشاہی مبارک ہو۔“

اور پھر اس معرکہ آرائی میں شہزادہ داراشکوہ کو شکست ہوئی اور تخت ہندوستان نے اورنگ زیب عالمگیر کے قدموں کو بوسہ دیا۔

آگے چل کر نظام الملک خانی خان ایک اور اہم واقعہ تحریر کرتا ہے۔ حضرت شیخ برہان کے خاص مریدوں کی ایک جماعت، جو دن رات خانقاہ میں رہتی تھی، عقیدت کی انتہا کو پہنچ کر ”غنائی الشیخ“ ہو چکی تھی۔ پھر جب ان مریدوں پر بے خودی کا عالم طاری ہوتا تو وہ حضرت شیخ برہان کو خدا کہہ کر پکارنے لگتے۔ آخر حضرت شیخ نے ان مریدوں میں سے چند کو خانقاہ کے اندر قید کر دیا۔ پھر جب کچھ دن بعد ان لوگوں نے اپنے فاسد عقیدے سے توبہ کر لی تو انہیں رہا کر دیا گیا۔ حضرت شیخ برہان کی انتہائی کوششوں کے باوجود چند مرید اپنے عقیدے سے باز نہیں آئے۔ انجام کار آپ نے انہیں قاضی شہر کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا۔

”جس طرح بھی ہو سکے، انہیں ہوش میں لانے کی تدبیر کرو۔ پھر بھی اگر یہ نہیں مانیں تو ان پر احکام شرع جاری کر دو۔“

قاضی شہر نے ان مریدوں کو قید میں رکھ کر اصلاح کی کوشش کی مگر جب وہ کسی صورت میں تاب نہ نہیں ہوئے تو انہیں قتل کر دیا گیا۔

یہ تھے حضرت شیخ برہان جن کی خانقاہ کے دروازے پر اورنگ زیب جیسا باجروت اور پرہیزگار بادشاہ بھی نیاز مندانہ کھڑا رہتا تھا۔

آخر میں ہم ایک اور بزرگ حضرت شیخ عبداللطیفؒ کا ذکر کریں گے، جو برہان پور میں ”دریائے حق“ کے کنارے دولت مندوں کے محلے میں رہا کرتے تھے۔ اور حضرت شیخ برہان کے ہم عصر تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کو حضرت شیخ عبداللطیفؒ سے بھی بے پناہ عقیدت تھی۔ مورخ خانی خان کے بقول کوئی مہینہ اور ہفتہ نہیں جاتا تھا، جس میں بادشاہ ہند، دستِ خاص سے شیخ کی خدمت میں فرمان نہ بھیجتا ہو۔ حضرت شیخ عبداللطیفؒ سنت رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بہت زیادہ سخت تھے۔ آپ سماع اور موسیقی وغیرہ کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ حضرت شیخ کے پڑوس میں کوئی بھی گانے بجانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی خانقاہ کے سامنے سے کسی امیر کی بارات بھی نقارے اور آرائش کے ساتھ نہیں گزر سکتی تھی۔ کسی غریب کا تو شمار ہی کیا۔ حضرت شیخ عبداللطیفؒ کسی کو اپنا مرید نہیں بناتے تھے۔ مذہبی امور میں آپ کی شدت پسندی کا یہ عالم تھا کہ ابتدا میں حضرت شیخ برہان جیسے بزرگ کو بھی ”بدعتی“ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

جب عقیدت مندوں نے حضرت شیخ عبداللطیفؒ کے اس طرزِ عمل کی شکایت کی تو حضرت شیخ برہانؒ نے نہایت بڑے جوش میں فرمایا۔ ”ہم تو اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم ایسے حق پرست اور باشرع بزرگ کے دور نازدہ ہیں۔“

بعد میں حضرت شیخ عبداللطیفؒ میں بہت نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ اور آپ، حضرت شیخ برہانؒ کے عقیدت مندوں کا حال ہو گئے تھے۔

یہی وہ حضرت شیخ عبداللطیفؒ تھے جن کی بارگاہِ جلال میں شہنشاہِ ہندوستان، اورنگ زیب عالمگیر بصدِ احترام حاضر ہوا کرتا تھا۔ چونکہ حضرت امام بریؒ کا خاندانی نام بھی عبداللطیفؒ تھا، اس لئے ہمارے تذکرے نگاروں نے ہوں کی یکسانیت کے باعث مغالطہ کھایا۔ اور آپ کی ذاتِ گرامی سے ایسے واقعات منسوب کر دیئے، جن کی تاریخ کی کوئی سند نہیں ملتی۔

مشہور محقق اعجاز الحق قدوسی نے مفتی غلام سرور لاہوری کی کتاب ”حقیقۃ الاولیاء“ کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ حضرت امام بریؒ نے 964ھ میں وفات پائی۔ اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر کچھ اور بھی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

بہر حال ان تمام مباحث سے قطع نظر، حضرت امام بریؒ کی عظمت و ولایت پر یہی ایک دلیل کافی ہے کہ آپ کے قدموں کی برکت سے ”چور پور“، ”نور پور“ کہلایا۔ اور پھر اسی ”نور پور شاہاں“ میں آپ آسودۂ خاک ہوئے، جو اسلام آباد کا ایک محلہ ہے۔ اور اسلام آباد 1971ء تک دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کا دارالحکومت تھا۔ دو نام ہو جانے کے باوجود آج بھی اس خطے کو چھٹی ایٹمی طاقت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اور یہ سب اس مردِ خدا کا فیضِ روحانی ہے، جو خاندانِ قادریہ سے ایک نسبتِ خاص رکھتا تھا۔



حضرت شاہ دولا گجراتی رحمۃ اللہ علیہ

یہ اس شکستہ حال لڑکے کا قصہ ہے، جسے گردشِ ماہ و سال نے اس بے رحم دنیا میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی عمر مشکل سے نو دس سال ہوگی، وہ یتیم بھی تھا اور لیبر بھی۔ کچھ دُور کے رشتے دار بھی تھے، مگر اُس کے حال سے بے نیاز و بے خبر..... رہنے کے لئے کھڑا تھا، مگر کسی عزیز نے اس پر قبضہ کر لیا اور لڑکارات گزارنے کے لئے کسی درخت کے نیچے پڑ کر سو جاتا تھا..... یا پھر کسی مسجد میں رات گزار دیا کرتا تھا۔ اگر سردیوں کا موسم ہوتا تو نمازیوں کے چلے جانے کے بعد صفوں (چٹائیوں) میں لیٹ کر سو جاتا۔ دو دو، تین تین وقت فاقے سے رہتا۔ مگر لڑکے کی خاص عادت تھی کہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا۔ کوئی بھوکا سمجھ کر کھانا کھلا دیتا تو خاموشی سے کھا لیتا۔ پھر کھانا کھانے والے کے حق میں دعائے خیر کرنے کے لئے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا دیتا۔

لڑکے کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اکثر اوقات خاموش ہی رہتا۔ اگر کوئی شخص سوال کرتا تو بہت مختصر جواب دیتا۔

ایک بار اس لڑکے کو دو دن سے کھانے پینے کو نہیں ملا تھا۔ بھوک کی شدت اور ناتوانی نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور وہ تھک کر عام گزرگاہ کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی آرہی تھی، جس میں ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا، جو اپنے ظاہری لباس سے آسودہ حال نظر آتا تھا۔ جیسے ہی گاڑی اس نڈھال لڑکے کے قریب پہنچی، اس شخص نے کوچوان سے گاڑی روک دینے کے لئے کہا۔ پھر تیزی کے ساتھ گاڑی سے اتر کر لڑکے کے پاس گیا اور ہمدردانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

”میرے بچے! تم مجھے بھوکے نظر آتے ہو۔“

لڑکے نے حسبِ عادت سر اٹھا کر اجنبی شخص کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

اجنبی شخص، لڑکے کے کچھ اور قریب ہو گیا۔ پھر نہایت شفقت سے فاقہ زدہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”مجھے سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔“

لڑکے نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”میرے ماں باپ اس دنیا میں نہیں ہیں۔“

اجنبی شخص نے اس بے سہارا بچے پر اپنی عنایتوں کی بارش کر دی..... اور پھر اسے گاڑی میں بٹھا کر گھر لے گیا۔ پھر لڑکے کو بہترین کھانا کھلایا اور سونے کے لئے نرم بستر دیا۔ شکم اور جسم کو آسائش پہنچی تو وہ بے سہارا لڑکارات بھر گہری نیند سو تا رہا۔

ہوتے ہی وہی شخص دوبارہ لڑکے کے پاس آیا اور اسے گہری نیند سے اٹھایا۔ لڑکا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پیٹ بھر ناندرات کی گہری نیند کے سبب لڑکے کے چہرے سے آسودگی اور خوشی کا رنگ نمایاں تھا۔

لڑکے! اگر میں کسی مجبوری کی وجہ سے اپنے گھر میں مزید نہ رکھ سکوں تو تمہیں کوئی ڈکھ تو نہیں ہوگا؟“ اس نے ایک ایسے لڑکے سے یہ عجیب سوال کر ڈالا تھا، جو بے سہارا بھی تھا اور بے گھر بھی..... اور جسے ایک وقت نانے کے لئے ایک روٹی بھی میسر نہیں تھی۔ سوال کرنے والے شخص کا خیال تھا کہ وہ مجبور و مظلوم لڑکا، گدا گروں کا صاحب خانہ کی خوشامد کرے گا، قدموں سے لپٹ جائے گا اور مراعات حاصل کرنے کے لئے پیروں پر سر لے گا..... مگر خلاف توقع اس لڑکے نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ بس چند لمحوں کے لئے کمرے کی طرف دیکھا، جیسے وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا ہو۔ پھر اس نے بہت دھیمی آواز میں مالک مکان سے کہا۔ ”میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔“ لڑکے کا جواب مایوسانہ تھا..... مگر اس سے صبر و قناعت کا رنگ بھی جھلک رہا تھا۔ صاحب مکان نے لڑکے کا جواب سنا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”بچے! دراصل میری بیوی بہت شید خوار و ناگرت ہے۔ وہ اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی ہے، آج شام تک آجائے گی اور تمہیں دیکھتے ہی غضب ناک ہو جائے گی، میں نہیں چاہتا کہ وہ تم پر کس قسم کا تشدد کرے..... اور تمہارا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دے۔“

”میں ان کے آنے سے پہلے ہی چلا جاتا ہوں۔“ یہ کہتا ہوا، لڑکا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مالک مکان نے آگے بڑھ کر لڑکے کے کاندھے پر محبت سے ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم دوبارہ اپنی زندگی بسر کرو۔ مجھے تمہاری تکلیفوں کا بڑی شدت سے احساس ہے۔ اس لئے میں نے ایک اور بہتر جگہ تلاش کرنے کا انتظام کر دیا ہے۔“

ان کی ٹھوکریں کھانے والے لڑکے کے چہرے پر ایک بار پھر خوشی کا رنگ ابھر آیا اور وہ سولایہ نظروں سے یہ مکان کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں تمہیں جس جگہ لئے جا رہا ہوں، وہ بہت مالدار لوگ ہیں۔ وہاں تمہیں اچھا کھانے کو بھی ملے گا اور پہننے کو۔ تمہاری زندگی سنور جائے گی۔“ یہ کہہ کر اس شخص نے لڑکے کو اپنی گھوڑا گاڑی میں بٹھایا اور پھر گاڑی تیز رفتاری سے ایک نیک طرف روانہ ہو گئی۔

راتے میں وہ شخص بے تکان باتیں کرتا رہا۔ مگر لڑکا خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ نصف فاصلہ طے ہو جانے کے بعد اس شخص نے لڑکے سے ایک عجیب سوال کیا۔

”اگر اس موقع پر تمہارے والدین زندہ ہوتے اور وہ تمہیں کسی کام کا حکم دیتے تو تم کیا کرتے؟“ لڑکے نے کسی تاخیر اور جھجک کے بغیر جواب دیا۔ ”میں خوشی خوشی ان کے حکم کی تعمیل کرتا۔“ اس شخص نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ لڑکے کا کاندھا تھپتھپایا۔ ”مجھے تم سے یہی امید تھی۔ یقیناً تم بڑے لڑکی کی اولاد ہو۔ اب میں تمہیں جن لوگوں کے پاس لئے جا رہا ہوں، انہیں بھی تم اپنے ماں باپ کی طرح سمجھنا ان کے احکام پر خوشی خوشی عمل کرنا۔“

جب اس شخص کی ہدایات ختم ہوئیں تو گھوڑا گاڑی ایک شاندار حویلی کے سامنے رک گئی۔ اجنبی شخص، لڑکے کو ہاتھ لے کر حویلی میں داخل ہوا۔ پھر اس نے خدمت گاروں کی زبانی پیغام بھجوایا۔ ”اپنے مالک سے جا کر کہو کہ علی نقی حاضر ہوا ہے۔“

لڑکا بڑی حیرت سے حویلی کی آرائش دیکھ رہا تھا۔ قیمتی ساز و سامان، ادھر ادھر دوڑتے ہوئے ملازم اور ان کے

جسموں پر خوش رنگ لباس۔ لڑکے نے اپنی زندگی میں پہلی بار خوشحالی کے یہ مناظر دیکھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد خدمت گار واپس آ گیا۔ ”میرے مالک آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

علی نقی نے لڑکے کو مچن میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔ اب وہ ایک تنومند انسان کے سامنے کھڑا تھا۔ جو لی کا مالک ایک مالدار ہندو تھا اور اس وقت اپنے دیوتاؤں کی پوجا میں مشغول تھا۔ پھر جب وہ پوجا سے فارغ ہوا تو علی نقی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”بیٹھ جاؤ! کھڑے کیوں ہو؟“

علی نقی بیٹھ گیا تو ہندو لالہ نے پوچھا۔ ”آج کل تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟“

علی نقی، پست ہمت اور گداگروں کے لہجے میں اپنی پریشان حالی کا ماتم کرنے لگا۔ ”لالہ جی! کاروبار بالکل ختم ہو گیا ہے۔ بچوں کے سلسلے میں شاہی قوانین بھی سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ بڑی تلاش کے بعد یہ لڑکا ہاتھ لگا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ کوئی اور دھندا دیکھوں۔ بردہ فروشی میں اب کچھ نہیں رکھا ہے۔“

ہندو لالہ مسکرایا۔ ”ذرا اس لڑکے کو تو دکھاؤ۔“

علی نقی تیزی سے اٹھا اور لڑکے کو لے کر اندر آیا۔ لڑکے کا لباس پھٹا پرانا اور میلا تھا۔ مگر اس غربت میں بھی اس کے خدوخال روشن تھے۔ ہندو لالہ، خریداری کی نظروں سے کچھ دیر تک لڑکے کا جائزہ لیتا رہا، پھر اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”لڑکے! تم باہر جا کر بیٹھو۔“

لڑکا خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

”اتنے دنوں میں یہ ناکارہ چیز لے کر آئے ہو علی نقی؟“ ہندو لالہ نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”یہ کمزور

اور گونگا لڑکا ہمارے کام کیسے کرے گا؟“

”لالہ جی! اس کی کمزوری پر نہ جائیں۔ برسوں کا فاقہ زدہ ہے۔ آپ کے یہاں اچھی غذا ملے گی تو چند دنوں میں ہاتھ پاؤں توانا ہو جائیں گے۔“ علی نقی اس طرح گفتگو کر رہا تھا، جیسے کوئی شخص خرید و فروخت کے وقت اپنے مال کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ ”یہ لڑکا گونگا نہیں، کم گو ہے۔ مگر نہایت فرماں بردار۔ ایسا نوکر ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔“

”چلو! پھر دام بتاؤ۔“ ہندو لالہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں اس لڑکے کی پانچ سو اشرفیاں لوں گا۔“ علی نقی نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”ہرگز نہیں!“ پانچ سو اشرفیوں کا ذکر سن کر لالہ بری طرح چونک اٹھا۔ ”تم نے زبان کھولنے سے پہلے اپنے مال کی طرف نہیں دیکھا۔ میں تمہیں دو سو اشرفیوں سے زیادہ نہیں دوں گا۔ اگر سودا نا منظور ہے تو لڑکے کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

آخر تھوڑی سی رد و قدح کے بعد علی نقی نے اس بے سہارا لڑکے کو دو سو اشرفیوں میں ہندو لالہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔



ہندو لالہ ایک متعصب انسان تھا۔ اس نے جان بوجھ کر ایک مسلمان لڑکے کو دو سو اشرفیوں میں خریدا تھا، تاکہ زندگی بھر وہ اسے ایک غلام کی حیثیت سے اپنے سامنے کھڑا رکھ سکے۔ لالہ کی بیوی، شوہر سے بھی زیادہ متدحرج تھی۔ وہ بار بار لڑکے کو اس بات کا احساس دلاتی۔

”ہمارا نوکر نہیں، غلام ہے۔ ہم نے تجھے دو سواشر فیوں کے بدلے میں خریدا ہے۔ اب تو یہ گھر چھوڑ کر کہیں جا سکتا۔“

”مالکن! میں کہیں اور جانے کو کب کہہ رہا ہوں؟“ لڑکا بڑی سعادت مندی سے جواب دیتا۔
”تو جا بھی سکتا ہے۔“ وہ سنگ دل ہندو عورت ایک بے سہارا لڑکے کی مجبوریوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے نئے نئے انداز سے چھیڑتی۔

”وہ کس طرح؟“ لڑکا معصومیت سے پوچھتا۔

”اگر تو ہماری دو سواشر فیاں واپس لوٹا دے تو ہم تجھے آزاد کر دیں گے۔“ ہندو عورت ہنستے ہوئے کہتی۔
لڑکا بے چارگی سے عورت کی طرف دیکھتا تو وہ خود ہی اپنے اس سوال کا جواب دے دیتی۔ ”اگر تو بھیک بھی لے کر آئے تو تجھے دو چار پیسے سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ پھر ہماری دو سواشر فیاں کہاں سے لوٹائے گا؟ اس لئے تجھے ہر غلام ہی رہنا ہے۔“

”مجھے کس نے بچا ہے آپ کے ہاتھ؟“ لڑکے نے اذیت ناک لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ آپ مال باپ کی طرح مہربانی سے پیش آئیں گے۔“

”جو تجھے یہاں لے کر آیا تھا، اسی نے تیرا سودا کیا ہے۔“ ہندو عورت نے علی نقی کے بارے میں بتاتے ہوئے بدنامی سے لڑکوں کو درغلا کر لاتا ہے اور انہیں بچ کر چلا جاتا ہے۔

پاکستان سن کر لڑکے کو شدید اذیت پہنچی۔ پھر اس نے مالکن سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اور اپنے کام میں لگ گیا۔

ہندو لالہ اور اس کی بیوی نے جان بوجھ کر نو دس سال کے ایک لڑکے پر کاموں کا پہاڑ لا دیا تھا۔ وہ گاؤں کے نکلے دن میں دو بار پانی بھر کر لاتا۔ گھر کے سارے برتن مانجھتا۔ پھر میاں بیوی کے کپڑے دھوتا۔ دن بھر لے جانے والوں کی خدمت کرتا۔ اور پھر سارے کاموں سے فارغ ہو کر رات کو اس وقت تک لالہ کے پاؤں دھو کر دیکھتا۔ اس طرح رات کا ایک حصہ گزر جاتا۔ پھر وہ لڑکا کھانا کھا کر اپنی کوٹھڑی میں چلا جاتا اور بہت دیر تک نماز پڑھتا رہتا۔

ایک رات اتفاق سے لالہ کی آنکھ کھل گئی۔ پھر اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ اٹھ کر اپنی حویلی میں ٹہلنے لگا۔ پھر لڑکے کو کوٹھڑی کی طرف چلا گیا۔ لڑکا اس وقت نماز پڑھ رہا تھا۔ لالہ بڑی حیرت سے لڑکے کو نماز پڑھتے دیکھا۔ پھر جب لڑکا نماز سے فارغ ہو گیا تو لالہ اس کے قریب آیا اور کہنے لگا۔

”یہ تم کیا کر رہے تھے؟“ لالہ کے لہجے سے شدید حیرت نمایاں تھی۔

”اپنے اللہ کی عبادت۔“ لڑکے نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تمہارا اللہ کہاں ہے، جو اس کی عبادت کر رہے ہو؟“ لالہ نے لڑکے کے طریقہ عبادت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

”میرا اللہ ہر طرف ہے۔“ لڑکے کے لہجے میں سوز و گداز جھلک رہا تھا۔

”ہم تو اپنے بھگوان کو سامنے رکھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔“ لالہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک نوعمر لڑکا ہے، اس کی زبان کے سامنے لا جواب ہو جائے گا۔ ”جس کی پوجا کی جائے۔ اور وہ سامنے نہ ہو تو پھر پوجا کیسی؟“

”ہمارا اللہ، ہمارے دل میں رہتا ہے۔“ لڑکے نے معصومیت اور سادگی کے ساتھ کہا۔

بی لالہ کو سکتہ سا ہو گیا۔ علی نقی اسی طرح قتل ہوا تھا، جیسا کہ لڑکے نے بیان کیا تھا۔ پھر جب لالہ کے بابت زائل ہوئی تو وہ بے اختیار اٹھا اور اس نے لڑکے کے پاؤں پکڑ لئے اور رقت آمیز لہجے میں معافی

مگھان کے لئے مجھے اور میری بیوی کو معاف کر دیں۔ ہم دونوں نے آپ کو بہت دکھ پہنچائے ہیں۔“ لڑکے نے غیر معمولی تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ ”تم لوگوں نے وہی کیا، جو مالکوں کا حق تھا۔ اور میں نے وہی برداشت کیا، جو غلاموں کا فرض ہوتا ہے۔“

”اے غلام (تو ہم ہیں۔“ لالہ، لڑکے کے پاؤں پکڑے ہوئے رو رہا تھا۔ ”ہم آپ کو پہچانے نہیں تھے۔“ لڑکے نے آپ لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ لڑکے نے بے نیازانہ کہا۔ ”مجھے اللہ نے جس کام پر مامور کیا ہے وہی انجام دیا۔ اور تم لوگوں کو جو ذمے داریاں سونپی گئی تھیں، تم نے انہیں اچھی طرح پورا کیا۔“ لالہ بات پر بضد تھا کہ لڑکا کسی طرح زبانی طور پر اسے اور اس کی بیوی کو معاف کر دے۔ اس لئے وہ اس کے پاؤں پکڑے ہوئے معافی مانگتا رہا، جب تک لڑکے نے لالہ کی تمام زیادتیوں کو معاف نہ کر دیا۔

رات حویلی والوں کے لئے بڑی عجیب تھی، جب لالہ، اس کی بیوی اور پہرے دار، لڑکے کے سامنے ہاتھ پکڑے تھے۔ لالہ کی بیوی نے بڑے لذیذ کھانے پکائے تھے، جیسے آج کسی مہمان خاص کی دعوت ہو۔ اور وہ ہاتھ کوئی دوسرا نہیں تھا، بلکہ وہی غلام لڑکا تھا، جو اکیلا دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ اور حویلی کے تمام رہنے والے کارڈ ملازموں کی طرح کھڑے تھے۔ لڑکا انہیں بار بار دیکھتا اور مسکرا کر رہ جاتا۔

لڑکے نے لڑکا کھانا کھا چکا تو لالہ اور اس کی بیوی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”آج سے آپ آزاد ہیں۔ اگر چاہیں تو لڑکے کی طرح یہاں رہ کر حویلی کو رونق بخش سکتے ہیں۔“

لڑکے نے بہت غور سے اپنے مالکان کی بات سنی۔ پھر نہایت پُرسوز لہجے میں کہا۔ ”جب آپ لوگوں نے مجھے بی دبا ہے تو میں اس کی تلاش میں نکلوں گا، جس کی یادیں مجھے ایک پل کے لئے چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔“ بے حویلی کے مالکان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ عارف لڑکا مزید قیام نہیں کرے گا تو لالہ نے آخری درخواست ہوئے کہا۔ ”میرا چھوٹا بھائی برسوں سے غائب ہے۔ میں تو اس کی زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں۔ پھر بھی انتہائی کہہ دینا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا؟“

لڑکے نے التجا سن کر لڑکے کے لئے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ کمرے کی فضا پر گہرا سکوت طاری تھا۔ لالہ کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لڑکے کی زبان سے کیا انکشاف ہوگا؟ چھوٹے بھائی کی زندگی کی نوید یا موت ہناک خبر؟

لڑکے نے بعد لڑکے نے آنکھیں کھولیں اور لالہ سے مخاطب ہوا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

لڑکے نے بے قرار ہو کر کہا۔ ”میں اپنے بھائی کی زندگی چاہتا ہوں اور اس طویل جدائی کا خاتمہ۔“ لڑکے نے ایک خاص جذب کے عالم میں کہا۔ ”انشاء اللہ! کل تک تمہارا پیچھا ہوا بھائی، تم سے آٹے گا۔“ لڑکے اور اس کی بیوی رات بھر جاگتے رہے۔ حالانکہ کئی بار لڑکے کی پیش گوئیاں درست ثابت ہو چکی تھیں۔ مگر اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک شخص، جو برسوں سے بے نشان ہے، وہ کس طرح اچانک واپس آ کر غرض اسی گفتگو میں رات گزر گئی۔

رہنما صبح کا سورج طلوع ہوا، جو ایک غلام لڑکے کے لئے آزادی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ لالہ اور اس کی بیوی

نے لڑکے کے لئے چند جوڑی کپڑے تیار کئے اور نقد رقم پیش کی۔ لڑکے نے یہ تحائف لینے سے انکار کرنے ہوئے کہا۔

”مجھے میرا اللہ کافی ہے۔“

لالہ اور اس کی بیوی نے بہت خوشامد کی تولڑکے نے وہ تحائف قبول کر لئے۔ پھر اس حویلی سے رخصت ہو گیا، جہاں اس نے اپنی غلامی کے کئی سال گزارے تھے۔

پھر شام کے وقت اس وقت بالچل مچ گئی، جب لالہ کا چھوٹا بھائی، حویلی میں داخل ہوا۔ لڑکے کی پیش گوئی پوری ہو چکی تھی۔

لالہ کے پوچھنے پر اس کے چھوٹے بھائی نے بتایا۔ ”میں تو یہاں سے بہت دور تھا۔ اگر دن رات چلتا رہتا تو دن میں اپنے گھر پہنچتا۔ ابھی میں راستے میں تھا کہ یکایک سیاہ آندھی نے مجھے گھیر لیا۔ پھر یوں لگا کہ جیسے میرے قدم زمین سے اُکھڑ گئے ہیں۔ میں چیخ چیخ کر اپنے بھگوان کو مدد کے لئے پکارتا رہا۔ پھر جب آندھی رکی تو جیت اُنکیز طور پر حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔“

یہ واقعہ سن کر لالہ اور اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ با آواز بلند کہنے لگے۔ ”بھگوان ہمارے گناہوں کو معاف کرے کہ ہم نے ایک خدا رسیدہ لڑکے کو اتنے دن غلام بنائے رکھا اور اسے طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔“

ایک طویل عرصے تک غلامانہ زندگی بسر کرنے والے، سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ، حضرت سید کبیر الدین شاہ دولہا گجراتی رحمہ اللہ تھے۔



حضرت شاہ دولہا کے حالات زندگی پر گردشِ ماہ و سال نے ایک گہرا پردہ ڈال دیا ہے۔ بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ آپ بغداد میں پیدا ہوئے۔ مگر تاریخِ ولادت کا کسی کو پتہ نہیں۔ انتہا یہ ہے کہ آپ کے باپ دادا اور خاندان کا بھی کوئی حوالہ موجود نہیں۔ حضرت شاہ دولہا ہندوستان کس طرح پہنچے، اس سلسلے میں کسی تاریخ سے نشاندہی نہیں ہوتی۔

کچھ تذکرہ نگاروں نے آپ کا خاندانی نام، سید کبیر الدین تحریر کیا ہے۔ اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو حضرت شاہ دولہا کا تعلق آلِ سادات سے ہے۔

اس کے برعکس عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت شاہ دولہا، سلطان بہلول لودھی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد مرحوم ایک صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد شاہ دولہا پر کسی عزیز یا رشتے دار نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پڑوسی کبھی کبھی آپ پر ترس کھا کر اپنے آگے کا بچا کھچا کھانا دے دیا کرتے تھے۔ اس قسم کے واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ دولہا نے کیسی کمپرسی کے عالم میں اپنا بچپن گزارا تھا۔

ایک تذکرہ نگار کے مطابق حضرت شاہ دولہا، مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اس روایت کی روشنی میں بغداد والی روایت خود بہ خود ساقط ہو جاتی ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ دولہا یا تو آگرہ میں پیدا ہوئے تھے یا پھر دہلی میں۔ اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ لودھی خاندان کے افراد، دارالحکومت آگرہ میں آباد تھے۔ اور سلطان بہلول لودھی کا پایہ تخت دہلی تھا۔

ظہیر الدین بابر نے پانی پت کے میدان میں سلطان ابراہیم لودھی کو شکستِ ناکش دے کر ہمیشہ کے لئے

ناماندان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ حضرت شاہ دولّا بھی دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔

اس امر پر تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ حضرت شاہ دولّا کی حیات مبارک کے کئی سال دور غلامی میں گزرے۔ بعض روایتوں کے مطابق والدین کے انتقال کے بعد چند اوباش لوگوں نے آپ کو ایک ہندو بیٹے کے ہاتھوں بٹ کر دیا تھا۔ جس نے کئی سال بعد حضرت شاہ دولّا کو کسی بات سے خوش ہو کر آزاد کر دیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ شقی القلب انسان، علی نقی تھا، جس نے ہندو بیٹے سے حضرت شاہ دولّا کی غلامی کے عوض دو سواشریاں لے لی تھیں۔ اور پھر ایک مغل شہزادے کے ہاتھوں عبرت ناک موت سے دوچار ہوا تھا۔



ہندو بیٹے کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد حضرت شاہ دولّا سیالکوٹ پہنچے، جہاں سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت سید سرمستؒ کا فیض روحانی عام تھا۔ حضرت شاہ دولّا کئی سال تک حضرت سید سرمستؒ کی خدمت میں رہے اور بیعت سے مشرف ہوئے۔

کئی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت شاہ دولّا نے علوم ظاہری و باطنی، کن کن اساتذہ سے حاصل کئے۔ مگر تذکرہ نگاروں نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت شاہ دولّا نے سلسلہ چشتیہ سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ اس ذیل میں ”معراج الولايت“ کے مصنف تحریر کرتے ہیں۔ ”میں حسن ابدال جاتے ہوئے حضرت شاہ دولّاؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ مراقبہ کی حالت میں تھے اور قوال ایسا کلام گا رہے تھے، جن میں پیرانہ بٹ کی تعریف کی گئی تھی۔ میں بہت دیر تک دست بستہ بیٹھا رہا۔ پھر جب حضرت شاہ دولّاؒ نے آنکھیں کھول کر ہر طرف نظر کی تو میں نے خدمت عالیہ میں سلام عرض کیا۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے حضرت شاہ دولّاؒ نے فرمایا۔ ”کیسے آئے ہو؟“

”شیخ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔“ میں نے عرض کیا۔

حضرت شاہ دولّاؒ نے حاضرین مجلس میں تقسیم کی جانے والی مٹھائی میں سے ایک دانہ اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے عرض کیا۔ ”شیخ! میں اس ظاہری نعمت کا نہیں، باطنی دولت کا طلب گار ہوں۔“

حضرت شاہ دولّاؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”مٹھائی تو کھاؤ۔ بفضل تعالیٰ، باطنی نعمت بھی مل جائے گی۔“

معراج الولايت کے مصنف کا بیان ہے کہ مٹھائی کے حلق سے اترتے ہی میرے دل و دماغ روشن ہو گئے۔ اور حضرت شاہ دولّاؒ کی ایک ادنیٰ کرامت تھی۔



حضرت شاہ دولّاؒ کو خلافت ملنے کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ اتفاق سے حضرت سید سرمستؒ کے مریدوں میں ”دولّا“ ام کے دو مرید تھے۔ جب حضرت سید سرمستؒ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے چاہا کہ خرقہ خلافت اور ناماندان سہروردیہ کے دیگر تہذکات دوسرے ”دولّا“ کو عنایت کر دیئے جائیں۔ اس خیال سے پیر و مرشد نے آواز دی۔ ”دولّا! یہاں آؤ۔“

حضرت شاہ دولّاؒ، پیر و مرشد کے قریب ہی تھے۔ فوراً دست بستہ کھڑے ہو گئے اور عرض کیا۔ ”سیدی! غلام حاضر ہے۔“

حضرت سید سرمستؒ نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور نجیف آواز میں فرمایا۔ ”میں تمہیں نہیں، دوسرے دولّا کو آواز

دیتا ہوں۔“

حضرت شاہ دولّا نے عرض کیا۔ ”وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ حکم ہو تو انہیں ڈھونڈ کر لے آؤں۔“
حضرت سید سرمستؒ نے فرمایا۔ ”تمہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر انہیں آنا ہو گا تو خود ہی آجائیں گے۔ یہ کہہ کر پیر و مرشد نے آنکھیں بند کر لیں اور غافل ہو گئے۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد حضرت سید سرمستؒ نے دوسری بار آواز دی۔ ”دولا! میرے قریب آؤ۔“
اس وقت بھی دوسرے ”دولا“ موجود نہیں تھے۔ حضرت شاہ دولّا پھر دست بستہ کھڑے ہو گئے اور سر جھکاتے ہوئے عرض کیا۔ ”سیدی! غلام، حکم کا منتظر ہے۔“

حضرت سید سرمستؒ نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور فرمایا۔ ”میں تمہیں نہیں، دوسرے دولّا کو پوچھتا ہوں۔“
حضرت شاہ دولّا نے پھر عرض کیا کہ اگر مرشدی کا حکم ہو تو انہیں ڈھونڈ کر لے آؤں۔“
جواب میں حضرت سید سرمستؒ نے وہی الفاظ دہرا دیئے کہ اگر انہیں آنا ہو گا تو وہ خود آجائیں گے۔
پھر طویل وقفے کے بعد حضرت سید سرمستؒ نے تیسری بار بھی یہی الفاظ دہرائے۔ اتفاق سے اس وقت بھی دوسرے دولّا موجود نہیں تھے۔ حضرت شاہ دولّا نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا۔

”اگر حکم ہو تو انہیں تلاش کروں یا پھر ان تک سیدی کا حکم پہنچا دوں؟“
”انہیں جو کچھ پہنچنا تھا، پہنچ گیا۔ انسان کتنی بھی کوششیں کر لے، کتنی بھی دعائیں مانگے، تقدیر الہی کو نہیں بدل سکتا۔“ حضرت سید سرمستؒ نے فرمایا۔ اور اپنے دیگر خدمت گاروں کو طلب کر کے فرقہٴ خلافت اور خاندانِ سہروردیہ کے دوسرے تہمکات لانے کا حکم دیا۔

پھر حضرت سید سرمستؒ سہارے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھے۔ اور آپ نے اپنے دستِ مبارک سے حضرت شاہ دولّا کو فرقہٴ خلافت پہنایا۔ پھر نہایت جذب و سوز کے عالم میں فرمایا۔
”جس کو حق تعالیٰ سرفراز فرماتا ہے، وہی شاہ دولّا کہلاتا ہے۔“

اسی روز سے آپ ”شاہ دولّا“ کہلائے۔ اور تین سو سال گزر جانے کے بعد یہ روحانی شہنشاہیت آج بھی برقرار ہے۔



روایت ہے کہ ”خلافتِ سہروردیہ“ سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت شاہ دولّاؒ پر ایک طویل عرصے تک ”سکر“ (بے خودی) کی کیفیت طاری رہی۔ آپ سیالکوٹ سے نکل کر ویرانوں اور جنگلوں کی طرف چلے گئے۔ صحرا و نوردی کے ان حالات پر بھی گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔ حضرت شاہ دولّاؒ کی دشتِ پیما کی کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی؟ کسی تاریخ سے اس کی نشاندہی بھی نہیں ہوئی۔ بعض روایتوں کے مطابق جب کیف و جذب کا غلبہ کم ہوا تو حضرت شاہ دولّاؒ، گجرات تشریف لائے۔ اور یہاں ایک حجرہ قائم کر کے اپنی عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔

پھر آپ نے اپنے مدرسے سے ملحقہ ایک مدرسہ قائم کیا۔ ریاضت و عبادت سے فارغ ہو کر آپ چھوٹے بچوں کو مذہبی تعلیم دیتے تھے۔ شروع میں گجرات کے لوگوں نے یہی سمجھا کہ کوئی ضرورت مند مولوی ہے جو اس طرح بچوں کو پڑھا کر اپنا پیٹ بھرنا چاہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ گجرات کے لوگ عام طور پر علم و روشنی سے دُور تھے..... دوسرے یہ کہ ان کے اقتصادی حالات بھی کمزور تھے۔ اس لئے وہ اپنے بچوں کے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جس کے نتیجے میں حضرت شاہ دولّاؒ کا قائم کردہ مدرسہ طالب علموں سے آباد نہیں ہو سکا۔

ایک دن آپ نے بڑی حیرت کے ساتھ اپنے خدمت گار سے پوچھا۔ ”کیا یہاں کے لوگوں کو اپنی مذہبی تعلیم کی کوئی دلچسپی نہیں ہے؟ میں انہیں علم کی طرف بلاتا ہوں اور وہ جہالت کی جانب بھاگے چلے جاتے ہیں۔“

خدمت گار نے گاؤں میں گھوم کر لوگوں کی رائے معلوم کی تو کم و بیش سب نے ایک ہی رائے کا اظہار کیا۔ ”ہم (اور پیشہ لوگ ہیں، اللہ سے اسی لئے اولاد مانگتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ اگر ہم انہیں کچھ دیر لے لے مدرسے بھیج بھی دیں تو مولوی صاحب کا محنتانہ کون ادا کرے گا؟“

خدمت گار نے مقامی لوگوں کے خیالات سے پیر و مرشد کو آگاہ کیا۔ جواب میں حضرت شاہ دولّا نے فرمایا۔

”جب قوموں پر برا وقت آتا ہے تو ان کی مثبت سوچ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور وہ منفی راستوں پر جا پڑتے ہیں۔ جاؤ! شہر کے لوگوں سے کہہ دو کہ یہ فقیرانہ سے علم سکھانے کی کوئی اُجرت طلب نہیں کرے گا۔“

خدمت گار نے قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں یہ اعلان کیا تو حضرت شاہ دولّا کے مدرسے میں بہت سے بچے جمع ہوئے۔

پھر آپ نے ان بچوں کی تدریس کے لئے دو تین معلم مقرر کر دیئے۔ حضرت شاہ دولّا ان معلموں کی تنخواہ اپنی بیہ خاص سے ادا کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو تعجب ہوا کرتا تھا کہ حضرت شاہ دولّا بظاہر کوئی ملازمت یا تجارت نہیں کرتے ہیں، پھر یہ تنخواہ کہاں سے آتی ہے؟

جب حضرت شاہ دولّا کا ایک مدرسہ، طالب علموں سے آباد ہو گیا تو آپ نے اپنے دست مبارک سے مدرسے کا سنگ بنیاد رکھا۔ پھر جب مدرسے کی عمارت تعمیر ہونا شروع ہوئی تو مقامی لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

”شاہ دولّا کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی کہ وہ ایک عمارت کے بعد دوسری عمارت بنارہے ہیں۔“

دنیا دار لوگ ٹوہ میں لگ گئے کہ شاہ دولّا ایسا کون سا کام کرتے ہیں، جس سے انہیں اتنی زیادہ آمدنی حاصل ہوتی ہے؟ مگر یہ فکر جستجو بے کار گئی۔ لوگوں کو ایسا کوئی سراغ نہیں مل سکا، جس سے دنیا داروں کو ایک درویش کے (زیرِ روزگار کا پتہ چل سکتا۔

کچھ دن بعد دوسرا مدرسہ بھی تیار ہو گیا اور طالب علم بچے، قطار در قطار آنے لگے۔ ذی فہم لوگ خوش تھے کہ ایک ایسی درویش نے ان کے علاقے میں علم کی شمع جلا کر صدیوں کی جہل زدہ بہت سی تاریکی کو دور کر دیا۔ یہ ایک مرد حق پرست کا احسانِ عظیم تھا۔ مگر تنگ دل لوگوں نے اس خدمتِ خلق کو محسوس کرنے کے بجائے اپنے تجسس کی رفتار بڑھادی۔ وہ شب و روز اسی تنگ و دو میں لگے رہتے تھے کہ ظاہری اسباب نہ ہونے کے باوجود حضرت شاہ دولّا اتنی بات کس طرح خرچ کر رہے ہیں؟

پھر یہی تجسس لوگ، حضرت شاہ دولّا کے خادم خاص تک پہنچ گئے اور اس سے پوچھنے لگے۔ ”شاہ دولّا کی اس شان و خراج کا کیا راز ہے؟“

خادم خاص ایک سیدھا سادہ انسان تھا۔ اس نے صاف صاف بتا دیا۔ ”مجھے تعمیری اور دوسرے کاموں کے صلے میں جتنی رقم درکار ہوتی ہے، میں پیر و مرشد سے عرض کر دیتا ہوں۔ پھر حضرت شیخ، مصلے کے نیچے سے مطلوبہ رقم نکال کر مجھے فراہم کر دیتے ہیں۔“

تجسس لوگوں کو مطمئن ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر ان کے دلوں میں ٹیڑھ تھی۔ چند لوگوں نے آپس میں مشورے کے بعد ایک منصوبہ بنایا اور دوسرے دن حضرت شاہ دولّا کی خدمت میں حاضر ہو کر نہایت عاجزی کے ساتھ عرض

کرنے لگے۔

”شیخ! ہمیں اس اعزاز سے سرفراز فرمائیے کہ ہم آپ کی خدمت کر سکیں۔“

اس وقت حضرت شاہ دولہا سر جھکائے کسی خیال میں مستغرق تھے۔ آپ نے ایک نظر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”خدمت کے دو اصول ہوتے ہیں۔ پہلا معروف اصول یہ ہے کہ انسان پہلے اپنی خدمت کرے۔ اور اپنی خدمت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر خفیہ المقدور عمل کرے۔ اپنے اہل خانہ اور پڑوسیوں کے حقوق ادا کرے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ جب ان حقوق کی ادائیگی کے بعد اس شخص کے پاس وقت بچ جائے تو وہ مخلوق خدا کی طرف متوجہ ہو۔ میں نہ تمہارے اہل خانہ میں سے ہوں اور نہ پڑوسیوں میں سے۔ اس لئے تم پر میری خدمت واجب نہیں۔ اگر تم لوگ واقعتاً نجات کے طالب ہو تو خدمت کے پہلے اصول پر عمل کرو۔“

حضرت شاہ دولہا کا جواب سن کر وہ لوگ مایوس ہو گئے۔ تاہم ایک شخص نے چرب زبانی اور لفاظی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی محبت اور عقیدت ہمارے دلوں کو اس طرف پھینکتی ہے۔ اگر آپ نے اپنے آستانے سے ہمیں ناکام و نامراد لوٹا دیا تو ہمارا شمار بضع انسانوں میں ہوگا اور ہم اپنی زندگی کی بہت بڑی سعادت سے محروم ہو جائیں گے۔“

دوسرے شخص نے انتہائی منافقانہ اور خوشامد انداز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے در سے تو کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ پھر ہم پر باب کرم کیوں بند کیا جا رہا ہے؟“

حضرت شاہ دولہا نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”چلو! تم اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔ مگر یاد رکھو! کہ بجز زمینوں میں شوق کی فصل کبھی نہیں بھڑکتی۔“

دنیا دار لوگ ایک عارف کے بیان کردہ اس نکتے کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ انہیں تو بس ایک بات کی خوشی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور انہیں وہ راستہ مل گیا تھا، جس پر چل کر وہ حضرت شاہ دولہا کی دولت کا سراغ لگا سکتے تھے۔



وہ لوگ کچھ دن تک پُر جوش سرگرمیوں کا مظاہرہ کرتے رہے۔ دن میں مدرسے کے انتظامات دیکھتے، پھر عصر کے وقت سے حضرت شاہ دولہا کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ حضرت شاہ دولہا کا معمول تھا کہ آپ نماز عصر کے بعد سے مغرب کی اذان تک اپنے مریدوں اور خدمت گاروں کو مختصر درس دیتے۔ انہیں امور شرعیہ کے بارے میں تفصیل سے سمجھاتے اور پھر خدمت خلق کے فوائد بیان فرماتے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے۔ ”ایمان لانے کے بعد سب سے بڑی دانش مندی یہ ہے کہ خلق خدا سے محبت کی جائے۔“

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارکہ پر سب سے زیادہ عمل اولیائے کرام ہی نے کیا ہے۔ حضرت شاہ دولہا بھی رسالتِ تاب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی قول مقدس کی روشنی میں خدمتِ خلق پر بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے۔

وہ لوگ جو ایک خاص منصوبے کے تحت حضرت شاہ دولہا کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تھے، آپ کی تقریریں کر خوب سردھنا کرتے تھے۔ جیسے وہی ایک مردِ دولہا کے اقوال عارفانہ کو سمجھنے اور ان کے اثرات قبول کرنے والے

پھر جب وہ لوگ خانقاہ کے دوسرے خدمت گاروں میں خوب کھل مل گئے اور اپنا اعتبار قائم کر لیا تو انہوں نے بہارات نیا منصوبہ بنایا۔ حضرت شاہ دولہا کا معمول تھا کہ آپ نماز عشاء ادا کرنے کے بعد عبادت کے حجرے سے ڈاکرائی خواب گاہ میں تشریف لے جاتے تھے۔ پھر چار پانچ گھنٹے سو کر ڈیڑھ دو بجے کے قریب تہجد کی نماز کے اٹھ جاتے تھے۔ اور فجر کی اذان تک اپنے اوراد و وظائف میں مشغول رہتے تھے۔

اس رات جب حضرت شاہ دولہا، سونے کے کمرے میں تشریف لے گئے تو وہ منصوبہ ساز لوگ، عبادت کے کمرے میں پہنچے۔ اسی حجرے میں حضرت شاہ دولہا کا مصلیٰ بچھا ہوا تھا اور آپ اسی مصلیٰ کے نیچے سے مطلوبہ رقم نکال کر ضرورت مندوں کو دیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے حجرے میں داخل ہو کر چراغ روشن کیا اور بڑے بے تابانہ انداز میں مصلیٰ کا کونا الٹ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مصلیٰ کے نیچے دولت کا دریا بہہ رہا ہو گا اور وہ اس سے فیض یاب ہو کر اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔ مگر اس وقت ان لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب حضرت شاہ دولہا کے مصلیٰ کے نیچے چکی زمین کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ناکامی کا منہ دیکھ کر ان لوگوں کو اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر حرص و طمع نے ان کی آنکھوں اور دماغوں پر گہرے پردے ڈال دیئے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ زیر زمین کوئی خزانہ چھپا ہوا ہے، سو انہوں نے چراغ کا دیم روشن کی میں آہستہ آہستہ زمین کھوئی شروع کر دی۔ وہ اپنے اس عمل کو تیز بھی کر سکتے تھے۔ مگر رات کے سناٹے میں آواز گونج رہی تھی، جس کے سبب خانقاہ کے دوسرے خدمت گاروں کے اٹھ جانے کا اندیشہ تھا۔ مجبوراً وہ لوگ ستروی کے ساتھ خزانے کی تلاش میں زمین کھودتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ دولہا، تہجد کی نماز کے لئے بیدار ہو گئے۔ پھر جب آپ اپنے عبادت کے حجرے میں تشریف لائے تو بدینتوں کا وہ گروہ، زمین کھودنے میں مصروف تھا۔ حضرت شاہ دولہا کے قدموں کی آہٹ بھی انہیں ہوشیار نہ کر سکی۔ آپ چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑے ہوئے ان کی اس حرکت کا جائزہ لیتے رہے، پھر فرمایا۔

”اے طلب گار! دنیا! تم اس یقین کے ساتھ زمین کھود رہے تھے کہ اس کے نیچے کوئی خزانہ پوشیدہ ہے۔“
حضرت شاہ دولہا کی آواز سن کر وہ لوگ اُچھل پڑے..... ان کے ہاتھوں سے تیشے گر گئے..... اور شدتِ راف کے باعث پتھرائی ہوئی آنکھوں سے صاحب خانقاہ کی طرف دیکھنے لگے۔

”اگر تم اسی یقین کے ساتھ دل کی زمین کھودو گے تو اس کی گہرائیوں میں دولت کا دریا پاؤ گے، جو کبھی خشک نہیں ہو گا۔“ یہ کہہ کر حضرت شاہ دولہا وضو کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور ان لوگوں پر ایسی ندامت طاری ہوئی کہ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

”افسوس! خزانہ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ اور ہم، شاہ صاحب کی نظروں سے بھی گر گئے۔ یہ کیسی ناکامی و نامرادی ہے؟“
دوسرے دن جب حضرت شاہ دولہا درس دے رہے تھے، وہ لوگ مجلس میں حاضر ہوئے اور سینکڑوں انسانوں کے سامنے حضرت شیخ کے قدموں پر گر کر معافی مانگنے لگے۔

حضرت شاہ دولہا کا دستِ کرم دراز ہوا۔ اور ان لوگوں کے سروں پر سایہِ قلن ہو گیا، جو فطرنا حریص اور چور تھے۔
”میں تمہیں بھلا کے خزانے کی خبر دیتا ہوں، جسے کبھی فنا کے ہاتھ نہیں چھو سکتے۔ اور جسے جتنا خرچ کرو، اتنا ہی بڑھتا رہتا ہے۔ آؤ نماز کی طرف..... آؤ بھلائی کی طرف۔“

اور پھر واقعتاً وہ لوگ، حضرت شاہ دولہا کے روحانی تصرف کے طفیل خزانہ لازوال پا گئے۔



مدرسوں کی تعمیر کے بعد حضرت شاہ دولّہ نے کئی عمارتیں تعمیر کرائیں، جن میں خانقاہ، سماع کا طویل و عریض کمرہ اور لنگر خانہ شامل تھے۔ ان تمام عمارتوں کی ظاہری دلکشی دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ ان کا معمار کوئی امیر و کبیر انسان ہے۔ حضرت شاہ دولّہ کا مزاج تھا کہ آپ کسی رئیس کی نذر قبول نہیں کرتے تھے۔ اور نہ صاحبانِ اقتدار سے کسی قسم کی رسم و راہ رکھتے تھے۔ پھر جب آپ کی کرامات اور فیوض و برکات روحانی کا شہرہ عام ہوا تو دور دراز کے علاقے کے لوگ بھی گجرات آکر آپ کے آستانے کی کیمیا اثر خاک کو اپنے چروں پر ملنے لگے۔ اہل ثروت کو یہ بات بہت گراں گزرتی تھی۔ اور وہ ایک مردِ درویش کی محبوبیت سے نالاں رہتے تھے۔ آخر دنیا داروں کی اسی تنگ دلی نے حسد کی شکل اختیار کر لی۔

پھر یہ حسد اس وقت اور بڑھ گیا، جب یتیموں، مسکینوں اور حاجت مندوں کے لئے حضرت شاہ دولّہ کے لنگر خانے کے دروازے کھولے گئے۔

ایک دن بہت سے محتاج اور مسکین، لنگر میں شریک تھے اور خانقاہ کے منتظمین حیر و رفتاری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ کھانا کھانے والے، قطار و قطار بیٹھے تھے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ یکایک ایک قطار سے ایک بد حال شخص اٹھا اور صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ پھر اس نے ایک منتظم کے ہاتھ سے سالن کا طباق چھین لیا اور دوسرے کے ہاتھ سے روٹی۔ لنگر خانے کے منتظمین کو اس شخص کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ ایک منتظم نے اسے غضب ناک لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”جب تمہیں لنگر خانے کے آداب معلوم نہیں تو پھر یہاں آتے کیوں ہو؟“

منتظمین کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اس شخص کی اس حرکت پر تحقیر و تذلیل کی۔ کئی وقت کی بھوک کا ستایا ہوا انسان، لوگوں کی طعنہ زنی برداشت نہ کر سکا اور کھانا چھوڑ کر یہ کہتا ہوا لنگر خانے سے چلا گیا۔

”جب تم لوگوں میں کھلانے کا حوصلہ نہیں ہے تو پھر دعوت عام کیوں کرتے ہو؟“

دوسرے منتظمین نے فوراً ہی حضرت شاہ دولّہ کو اس واقعے کی خبر دی، جسے سن کر آپ کے چہرہ مبارک پر گہری افسردگی کا نگ اُبھر آیا۔ پھر اسی وقت لنگر خانے کے اس منتظم کو طلب کیا گیا، جس کی سخت تنبیہ کے باعث وہ شخص بھوکا اٹھ کر چلا گیا تھا۔

”کیا تمہیں ہدایت نہیں کر دی گئی تھی کہ لنگر خانے میں آنے والے، سب کے سب معزز مہمان ہیں؟“ حضرت شاہ دولّہ نے ناگوار لہجے میں منتظم سے پوچھا۔

”اس شخص نے بد نظمی اور بد تہذیبی کا مظاہرہ کیا تھا جس سے لنگر خانے کا وقار مجروح ہوا۔“ منتظم نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

”تم نے اپنے لنگر خانے کے وقار کو دیکھا، مگر اس کی بھوک پر نظر نہیں کی۔“ حضرت شاہ دولّہ نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تمہیں کیا معلوم کہ اس کی بھوک کتنی شدید تھی۔ حق تعالیٰ اپنی کتاب مقدس میں فرماتا ہے کہ اگر تم پر حالاتِ اضطراب طاری ہو جائے تو مردار بھی کھا سکتے ہو۔ اس شخص نے مردار تو نہیں کھایا تھا، بس اپنی بے قراری کا اظہار کیا تھا۔ مگر تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ اپنے بھائی کے اضطراب کو بھی برداشت نہ کر سکے۔ جاؤ اور اسے مٹا کر لاؤ۔“

حضرت شاہ دولّہ کا خادم، مرشد کا حکم سن کر گھبرا گیا۔ اور اس شخص کو ڈھونڈنے کے لئے نکلا۔ وہ تین وقت کا فاتح

زہ انسان، لنگر خانے سے نکل کر قریب کے ایک باغ میں اس اُمید پر چلا گیا کہ شاید وہاں جنگلی پھل ہاتھ آجائیں اور وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکے۔ اتفاق سے وہ پھلوں کا موسم بھی نہیں تھا۔ آخر وہ شخص تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ لنگر خانے کا منظم پاگلوں کی طرح بہت دیر تک ادھر ادھر دوڑتا پھرا۔ مگر اس شخص کا دُور دُور تک پیہ نہ تھا۔ منظم کا دل ڈوبنے لگا کہ اب وہ پیر و مرشد کو کیا جواب دے گا؟ یکایک اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ کہیں وہ ٹھل باغ میں موجود نہ ہو۔ خادم بھاگتا ہوا باغ کے اندر پہنچا تو وہ فاتحہ زہ انسان، بھوک کی شدت سے نڈھال ایک درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ دراصل یہ بھی حضرت شاہ دولّا کا روحانی تصرف تھا کہ خادم کے ذہن میں باغ کا خیال آیا اور وہ مطلوبہ شخص تک پہنچ گیا۔

پھر خادم کی بڑی خوشامد کے بعد وہ شخص دوبارہ خانقاہ پہنچا۔ اب کی بار وہ حضرت شاہ دولّا کے روبرو بیٹھا تھا۔ اور حضرت ساج سے اپنے دست مبارک سے کھانا کھلا رہے تھے۔ پھر جب وہ کھانا کھا چکا تو حضرت شاہ دولّا نے مکرانے ہوئے فرمایا۔

”اب بتاؤ کہ ہم میں کھانا کھلانے کا حوصلہ ہے یا نہیں؟“

یہ سنتے ہی وہ شخص رونے لگا۔ ”شیخ! آپ میں بہت حوصلہ ہے۔ اور آپ ہی کا یہ حوصلہ، ہم غریبوں کا سرمایہ ہے۔“

پھر وہ شخص اسی آستانہ کرم کا غلام ہو کر رہ گیا اور حضرت شاہ دولّا کی توجہ سے درجہ کمال کو پہنچا۔



حضرت شاہ دولّا نے مخلوق خدا کی آسائش کے لئے گجرات میں کئی کنویں، پل اور سرائے تعمیر کرائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ”سماع خانہ“ بھی تعمیر کرایا تھا، جسے دیکھ کر کسی شاہی عمارت کا گمان ہوتا تھا۔ حضرت شاہ دولّا کو سلمہ جثیہ سے وابستہ ہونے کے سبب سماع سے بے حد شغف تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ جس روز آپ محفل سماع آراستہ نہ کرتے ہوں۔ آپ کے اس ذوق و شوق کو دیکھ کر دور دراز کے علاقوں سے نامور قوال آتے اور داغنی پانے کے ساتھ ساتھ مالی منفعت بھی حاصل کرتے۔ حضرت شاہ دولّا کا معمول تھا کہ محفل سماع کے دوران آپ آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھے رہتے۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ اس وقت آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہے۔ دوسرے حاضرین بھی شیخ کی پیروی کرتے ہوئے ”ہاؤ ہو“ سے گریز کرتے۔ کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنی طرف سے قوالوں کو کسی قسم کی نذر پیش کرے۔ ان مواقع پر حضرت شاہ دولّا فرمایا کرتے تھے۔

”یہ میرے بلائے ہوئے مہمان ہیں اور ان کی تواضع مجھ پر قرض ہے۔“

پھر جب محفل سماع ختم ہو جاتی تو آپ مصلے کے نیچے سے رقم نکالتے اور قوالوں کو دیتے جاتے۔ اس سلسلے میں حیرت انگیز بات یہ ہوتی کہ ہر قوال کو اس کی فنکارانہ حیثیت کے مطابق رقم دیتے۔ جبکہ رقم دیتے وقت آپ اسے شمار بھی نہیں کرتے تھے۔ سینکڑوں بھوکوں کو دونوں وقت کھانا کھانا اور قوالوں کو بے حساب رقم دینا، یہ ایسے واقعات تھے جو عام لوگوں سے لے کر خواص تک کی نظروں میں کھلتے تھے۔ اگر حضرت شاہ دولّا کا کوئی ظاہری کاروبار ہوتا یا آمدنی کے دیگر ذرائع ہوتے تو شاید ان کے تجسس میں اتنی شدت پیدا نہ ہوتی۔ کیا غریب اور کیا امیر، ہر شخص کی زبان پر ایک ہی سوال تھا کہ حضرت شاہ دولّا کی داد و بخش کے یہ انداز کیسے ہیں۔ اور ایک درویش بے سروسامان کے پاس کتنا بڑا خزانہ موجود ہے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔

پھر ایک وقت وہ آیا کہ گجرات کے غریب اور سادہ دل بندے تو یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ حضرت شاہ دولّا

ایک مرد باکرامت ہیں۔ اور سخاوت کے یہ دریا اسی کرامت کے زیر اثر بہہ رہے ہیں۔ مگر مقامی امراء کی شاہانہ نشستوں کو ایک فقیر کی خانقاہ نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ حضرت شاہ دولہا کی گجرات آمد سے پہلے یہی امراء جاگیردار اور زمیندار غریبوں کے ”ان داتا“ اور ”حاجت روا“ کہلاتے تھے۔ مخلوق خدا ان بدست سرمایہ داروں کے دروازوں پر سر جھکائے اور ہاتھ پھیلائے کھڑی رہتی تھی۔ اور یہ قومی خزانے کے ذخیرہ اندوز، جس کے دامن میں چاہتے تھے، چند کے ڈال دیتے تھے۔ اور جسے چاہتے تھے، سختی اور نفرت کے ساتھ جھڑک دیتے تھے۔ پھر جب حضرت شاہ دولہا نے گجرات میں خانقاہ تعمیر کی اور صدیوں سے ٹھکرائے جانے والے انسانوں کو گلے لگا کر اپنے برابر بٹھایا تو امراء کی محفلیں ویران ہو گئیں۔

بالآخر ایک مرد فقیر کی یہ محبوبیت، گجرات اور قرب و جوار کے امراء سے برداشت نہ ہو سکی۔ بدکاروں اور بدگمانوں کا یہ گروہ، حضرت شاہ دولہا پر یہ الزام تو عائد نہ کر سکا کہ ایک درویش اپنے عقیدت مندوں کو جمع کر کے حکومت کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ماضی میں حضرت سیدی مولہ جیسے بزرگوں کے ساتھ اسی قسم کی سازشیں کی جا چکی تھیں۔ مگر حضرت شاہ دولہا کے خلاف ایک نئے انداز کی سازش ترتیب دی گئی۔ اس سازش کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ گجرات اور قرب و جوار میں رہنے والے امراء، جاگیردار اور زمیندار، حاکم لاہور کے پاس پہنچے اور اس کے سامنے ایک درخواست پیش کی۔ درخواست کا مضمون حسب ذیل تھا۔

”چند برسوں سے یہاں شاہ دولہا نام کا ایک شخص آیا ہوا ہے، جو خود کو صوفی کہلاتا ہے۔ بظاہر کوئی کام کاج نہیں کرتا۔ مگر اس کے دن رات کے آخر جات، شاہوں جیسے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس فقیر کے ہاتھ کوئی دھینے آگیا ہے۔ اور خفیہ دھینے، حکومت کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس لئے شاہ والا سے درخواست ہے کہ بلا تاخیر اس اہم ترین معاملے پر توجہ دے کر تحقیقات کرائی جائے۔“

حاکم لاہور نے اس درخواست پر مقامی امراء سے دستخط کرائے اور اسے مغل شہنشاہ، شہاب الدین شاہ جہاں کے ملاحظے کے لئے دہلی بھیج دیا۔ کچھ روایتوں کے مطابق شاہ جہاں نے اس درخواست کو حرف بہ حرف بہت غور سے پڑھا، پھر کچھ دیر تک مسکراتا رہا۔ اور آخر میں درخواست کو درمیان سے چاک کرتے ہوئے اس کے کئی ٹکڑے کر دیئے۔ اور شاہی کارندے سے مخاطب ہو کر بولا۔

”حاکم لاہور کو فوری طور پر لکھ دیا جائے، یہی اس کا جواب ہے۔“

بعض روایتوں کے مطابق شہاب الدین شاہ جہاں نے درخواست کو بغور پڑھا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

”ابھی ہماری مملکت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔“

پھر اس نے بڑی رازداری کے ساتھ اپنے نمائندہ خاص کو طلب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اس وقت گجرات روانہ ہو جاؤ اور ایک عام آدمی کے لباس میں شاہ دولہا کی خدمت میں حاضری دو۔ پھر کھلی آنکھوں سے شیخ کے روز و شب کا مشاہدہ کرو۔ اور ہمیں اطلاع دو کہ تم نے انہیں کیسا پایا؟“

دوسرے دن مغل شہنشاہ، شاہ جہاں کا نمائندہ خاص، دہلی سے گجرات روانہ ہو گیا۔ اور ایک مفلوک الحال انسان کی حیثیت سے حضرت شاہ دولہا کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ اور کئی دن لنگر خانے سے کھانا کھا کر سماع کی محفلوں میں شرکت کرتا رہا۔

پھر جب ایک دن حضرت شاہ دولہا اپنے حجرہ خاص کے اندر عبادت میں مصروف تھے، مغل شہنشاہ شاہ جہاں کا

نمائندہ خاص، جو درپردہ شاہی جاسوس تھا، اندر داخل ہوا اور ایک گوشے میں دست بستہ کھڑا رہا۔
حضرت شاہ دولہا اپنے معمول کے اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔ پھر جب فارغ ہوئے تو اس شخص کو اپنے
قریب بلا کر فرمایا۔

”میرے بھائی! مجھے معاف کرنا کہ تمہیں انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔“
شاہ جہاں کے نمائندہ خاص نے انتہائی عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔ ”شیخ! میں اس بات سے واقف ہوں کہ یہ
ات آپ کی عبادت کے لئے مخصوص ہے۔ مجھے بڑی شدت سے احساس ہے کہ میں آپ کے معمولات میں خلل
انداز ہوا ہوں۔ اور اس گستاخی کا سبب میری مجبوریاں ہیں۔ مجھے دوسرے لوگوں کے سامنے دست طلب دراز
کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایک غریب اور بے روزگار انسان ہوں۔ آپ کی فیاضیوں اور سخاوتوں کا شہرہ سن کر
ماضی ہوا ہوں۔“

حضرت شاہ دولہا نے شاہ جہاں کے نمائندے کی بات بہت غور سے سنی اور پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”حق تعالیٰ
ال پر قادر ہے کہ وہ تم سے ساری شاہانہ مراعات چھین کر تمہیں گداگر بنا دے۔“
اس انکشاف پر شاہ جہاں کے خصوصی نمائندے کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ اور وہ رقت آمیز لہجے میں حضرت
شاہ دولہا سے معافی مانگنے لگا۔ ”شیخ! یہی میری مجبوری تھی کہ میں خود کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔“
”تو پھر جس کام سے آئے ہو، اسے جاری رکھو۔“ حضرت شاہ دولہا کے لبوں پر تبسم دلنواز ابھر آیا۔ ”اور ہمیں
ہمارا کام کرنے دو۔“

”شیخ! میرا کام تو ختم ہو گیا۔“ شاہی جاسوس نے حضرت شاہ دولہا کے دست مبارک کو بوسہ دیتے ہوئے عرض
کیا۔ ”بس اتنی التجا ہے کہ آئندہ بھی اس گناہ گار کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔“
پھر وہ نمائندہ خاص، فرماں روائے ہندوستان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ ”حضرت شاہ دولہا
ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ ہیں۔ اور میرے اندازے کے مطابق انہیں دست غیب حاصل ہے۔“
”میں سمجھتا تھا۔ مگر تمہیں اس لئے بھیجا کہ تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لو اور مکمل صورت حال سے باخبر
کو۔“ مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے انتہائی عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔ ”حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے عہد سلطنت
میں ایسے صاحب تقویٰ اور روشن ضمیر بزرگ موجود ہیں۔“



حضرت شاہ دولہا کی ذات گرامی سے ایک اور ناقابل فراموش واقعہ بھی منسوب ہے، جس نے تاریخ ہندوستان
پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔

چند روایتوں کے مطابق لاہور کا ہندو راجہ، ملک راجوڑ، حضرت شاہ دولہا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست
گزار ہوا۔ ”میں نے ہندوستان کے ایک ایک مندر میں پہنچ کر سینکڑوں دیوی دیوتاؤں کے چرنوں میں بھینٹ
چڑھائی، فقیں مرادیں مانگیں..... مگر بے اولاد تھا۔ اور بے اولاد ہی رہا۔“

”دیوی دیوتا تو اولاد دینے پر قادر نہیں ہوتے۔“ حضرت شاہ دولہا نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”بس وہ ایک ہی
ہے، جو سب کو دیتا ہے۔ اور ہر شخص کو مدد دیتا ہے مگر نادان و بے خبر سمجھتے ہیں کہ کسی اور نے دیا ہے۔“
”میں اس لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ اپنے اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے اولاد بخش دے۔“
ملک راجوڑ نے ٹھٹھکتے لہجے میں عرض کیا۔

حضرت شاہ دولہا نے کچھ دیر کے لئے مراقبہ کیا اور پھر آنکھیں کھولتے ہوئے فرمایا۔ ”اللہ نے تیری قسمت میں ایک لڑکی لکھی ہے۔“

حضرت شاہ دولہا کی زبان مبارک سے لڑکی کا نام سن کر ملک راجوڑ کا رنگ فق ہو گیا۔ اور کچھ دیر تک گھرے سکوت کے عالم میں خاموش بیٹھا رہا۔

حضرت شاہ دولہا کی نظروں سے ملک راجوڑ کی دلی کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ ”لگتا ہے کہ تمہیں اولاد نہیں چاہئے۔“ ملک راجوڑ، تصورات کی دنیا سے نکل آیا اور اس نے اشرہہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے اولاد چاہئے مگر لڑکی نہیں۔“ حضرت شاہ دولہا نے بے نیازانہ فرمایا۔ ”اگر کوئی ضرورت مند، کسی صاحب ثروت انسان کے دروازے پر دست سوال دراز کرتا ہے تو وہ دینے والے کی مرضی کا پابند ہو جاتا ہے۔ مالک مکان اس کے پھلے ہوئے دامن میں سوکھی روٹی ڈال دے یا مرغن غذا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گھر کا دروازہ بند کر لے۔ اور رسائل کو جھڑک کر نکال دے۔“

حضرت شاہ دولہا کے اس طرزِ خطاب کو دیکھ کر ملک راجوڑ کو اندازہ ہوا کہ ایک فقیر بے سروسامان کے دروازے پر اس کے دولت و اقتدار کی کیا حیثیت ہے؟

واقعہ ایک بھکاری ہی تھا، جو ایک مسلمان بزرگ کے آستانے پر اللہ سے اولاد مانگنے آیا تھا۔ پھر جب حضرت شاہ دولہا نے اسے لڑکی کی پیدائش کی نوید سنائی تو اس کا چہرہ بچہ کر رہ گیا۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ ملک راجوڑ کے خاندان میں عربوں کے ایام جاہلیت کی طرح یہ وحشیانہ رسم جاری و ساری تھی کہ لڑکی کے پیدا ہوتے ہی اس معصوم جان کو گڑھا کھود کر دبا دیا جاتا تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق قتل کر دیا جاتا تھا۔ جب حضرت شاہ دولہا نے ملک راجوڑ سے یہ فرمایا کہ اس کے مقدر میں بس ایک لڑکی ہے تو وہ بدحواس ہو گیا اور بہت دیر تک اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا۔

حضرت شاہ دولہا نے ملک راجوڑ کو ذہنی کشمکش میں مبتلا دیکھ کر دوبارہ فرمایا۔ ”اگر لڑکی منظور ہے تو میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاؤں، ورنہ فقیر کا وقت کیوں برباد کرتے ہو؟“

آخر ملک راجوڑ کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ ”شیخ! مجھے لڑکی کی دعا کرانے میں اس لئے تامل ہے کہ ایک طرف لڑکی، تخت کے وارث کے تقاضے پورے نہیں کرتی اور دوسری طرف میرے خاندان کی رسم کے مطابق پیدا ہونے والی لڑکی کو قتل کر دیا جائے گا۔“

یہ انکشاف سن کر حضرت شاہ دولہا کے چہرہ مبارک پر شدید اذیت و کرب کا رنگ اُبھر آیا۔ اور آپ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ”رحم کرو۔ اللہ کی مخلوق پر رحم کرو۔ لوگ تو اس طرح جانوروں کو بھی قتل نہیں کرتے۔ اور تم اپنی ہی اولادوں پر مشقت ستم کرتے ہو۔“

حضرت شاہ دولہا کی حالت جلال دیکھ کر ملک راجوڑ سہم گیا۔

”اب میں اسی وقت دعا کروں گا، جب تم مجھ سے انسانوں پر رحم کھانے کا وعدہ کرو گے۔“

حضرت شاہ دولہا نے بلند آواز میں ملک راجوڑ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں خود انسان دوست ہوں۔ اور انسان دوستوں سے محبت کرتا ہوں۔“

حضرت شاہ دولہا کی اثر انگیز گفتگو سن کر ملک راجوڑ نے سر جھکا لیا۔ ”شیخ! میں بھی اپنے خاندان کی اس وحشیانہ رسم سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔“ آخر پتھر پھل گیا۔

تو بھر جاؤ۔ اور اس لڑکی کا انتظار کرو، جو تمہارے مقدر میں کی گئی ہے۔“ حضرت شاہ دولّا نے پُر جلال لہجے میں خالقِ خدا سے محبت کرو اور پھر دیکھو کہ پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“

ملک راجوڑ، حضرت شاہ دولّا کو نذر پیش کرنے کے لئے دو خوان لے کر آیا تھا۔ ایک میں نقرئی (چاندی کے) لٹائے۔ اور دوسرا خوان، اشرفیوں سے لبریز تھا۔ حضرت شاہ دولّا نے ان دونوں خوانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ”فقیر کی خانقاہ کے باہر تمہیں جو ضرورت مند بھی نظر آئے، اس کی حاجت ردائی کرنا۔ مگر محبت کے ساتھ۔“

ملک راجوڑ واپس چلا گیا اور حضرت شاہ دولّا کے حکم کے مطابق راستے میں جو بھی غریب اور مفلوک الحال شخص بائیسے حسب ضرورت سونے اور چاندی کے سکے دیتا چلا گیا۔ پھر جب اپنے محل پہنچا تو خاندان کی تمام خواتین اسے گھیر لیا اور درویش کی خانقاہ میں ہونے والی گفتگو کی تفصیلات پوچھنے لگیں۔

ملک راجوڑ نے لڑکی کی خوشخبری سنائی تو کچھ دیر کے لئے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ پھر راجہ کی ماں نے نہایت لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں بے اولاد دیکھنا پسند کروں گی۔ مگر مجھے اپنے خاندان میں کسی لڑکی کی پیدائش گوارا نہیں۔“

الوقت وہاں ملک راجوڑ کی بیوی بھی موجود تھی، جس کے بارے میں ہندوستان کے تمام دیدار حکیم دعویٰ کر رہے کہ وہ پیدائشی بانجھ ہے اور دنیا کا کوئی طریقہ علاج اس کی گود ہری نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی ساس اور دیگر خواتین کو ملن کر رونے لگی۔ یہاں تک کہ طعن و طنز کے نشتروں سے زخمی ہو گئی اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔

رانی کے جاتے ہی اس کی ساس اور بھی چراغ پا ہو گئی۔ اور اپنے بیٹے، ملک راجوڑ سے کہنے لگی۔ ”جب سارے باہم علاج کرتے کرتے تھک گئے، ہمارے تمام سادھو سنت، مہاتی، دھرماتی، بھجن، ہون، منتر پاٹھ کرتے کرتے تھک گئے تو پھر ایک مسلمان فقیر کی دعائیں کیا کریں گی؟“ ملک راجوڑ کی ماں انتہائی متکبرانہ لہجے میں بول رہی تھی۔

یہ ان جھگڑوں میں پڑنے کے بجائے دوسری شادی کر لو۔“

ملک راجوڑ، ماں کا نہایت فرماں بردار تھا۔ مگر یہ تند و تیز اور جارحانہ گفتگو سن کر خاموش نہ رہ سکا۔ ”ماں آپ بھی بگڑت ہیں۔ دوسری عورت کے لئے کچھ تو ہمدردی کا اظہار کریں۔“

”میں عورت نہیں، صرف مہارانی ہوں جسے تاج و تخت کے سوا کوئی دوسری شے عزیز نہیں۔“ ملک راجوڑ کی ماں زور کا دہی عالم تھا۔ ”میں ریاست کا وارث چاہتی ہوں۔ اور وہ کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ تمام پروہتوں اور جوتشیوں کا پتہ دیا ہے کہ اگر پیدا ہونے والی لڑکی کو زندہ رکھا گیا تو تاج و تخت برباد ہو جائیں گے۔ اور راج پاٹ ہمیشہ کے لئے اس خاندان سے چلا جائے گا۔“

ملک راجوڑ نے ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”چھما کیجئے ماتا جی! میں شاہ صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں کہ لڑکی پیدا ہوگی، مگر زندہ رہے گی۔“ آخر ملک راجوڑ نے اپنا حکم سنا دیا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

راجہ کے جاتے ہی خاندانی رسموں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی خواتین کے درمیان طویل مشورے شروع ہو گئے۔ ملک راجوڑ کے چھوٹے بھائی کی بیوی نے کہا۔ ”ماتا جی! آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ ایک بانجھ عورت کے سنان (اولاد) ہو ہی نہیں سکتی۔ چاہے کوئی کتنا ہی بڑا دھرماتی ہو۔ اور کتنی ہی پراہتھنائیں کیوں نہ کرے۔“

ملک راجوڑ کی ماں اپنی چھوٹی بھوی کی بات سن کر مسکرائی۔

”اور اگر یہ چسکار (کرشمہ) ہو بھی گیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟“ چھوٹی بھوی بڑے ظالمانہ انداز میں مسکرائی

”اگر یہ جیون پر تو آپ کا ادھیکار (قبضہ) ہوگا۔ جب چاہیں، اس کا گلا دبا دیں۔ اور مہاراج کو خبر کر دیں کہ مُردہ

لڑکی پیدا ہوئی ہے۔“ چھوٹی بہو نے بڑی بے رحمی سے اپنی خاندانی رسم کو بچانے کے لئے نیا منصوبہ پیش کر دیا۔ جسے سن کر مہارانی کی وحشت ختم ہو گئی۔ اور اس کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ ابھر آئی۔



کچھ ہی دن بعد حیرت انگیز طور پر رانی کے یہاں اولاد کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اس خبر کے ساتھ ہی ملک راجوڑ کی ماں اور دیگر خواتین کے چہروں پر فکر و پریشانی کے سائے بھی لرزنے لگے۔ رانی اُداس ہوتی تو ملک راجوڑ، بیوی کو نہایت محبت آمیز لہجے میں تسلیاں دیتا۔

”مجھے شاہ صاحب کی باتوں پر پورا بھروسہ ہے۔ تم بھی بھگوان کی لیلیا (قدرت) کا انتظار کرو۔“

آخر وہ دن آ گیا، جب دیدوں اور حکیموں کے سارے طبی (سائنسی) کلیات اُلٹ گئے۔ ملک راجوڑ کے یہاں ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی پیدا ہوئی۔ اگرچہ راجہ کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی اچھی شکل و صورت کے لوگ تھے، مگر وہ لڑکی ان سب کے درمیان بالکل علیحدہ نظر آتی تھی۔ اس قدر دلکش خدوخال کی مالک کہ چہرے سے روشنی سی بھوٹی نظر آتی تھی۔ چھوٹی بہو کے منصوبے کے مطابق لڑکی کو ماں کے پہلو سے جدا کر کے ایک الگ کمرے میں لے جایا گیا۔

ملک راجوڑ کی ماں نے بڑے سفاکانہ لہجے میں دایہ کو حکم دیا۔ ”لڑکی کا گلا گھونٹ دے۔“

وہ بوڑھی عورت، اس خاندان کی پرانی دایہ تھی۔ وہ کئی بار اسی قسم کا قاتلانہ فعل انجام دے چکی تھی۔ مہارانی کا حکم سن کر بوڑھی دایہ اپنے دونوں ہاتھ کھول کر کسی خوں آشام بلا کی طرح اس معصوم لڑکی کی طرف بڑھی، جسے اس دنیا میں آئے ہوئے ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے۔ پھر جیسے ہی دایہ کے ہاتھ، ملک راجوڑ کی بچی کی گردن کے قریب پہنچے، اس پر دہشت طاری ہو گئی۔ خوف سے آنکھیں اُبل پڑیں۔ اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ راجہ کی ماں اور دیگر خواتین بڑی حیرت سے دایہ کی اس کیفیت کو دیکھ رہی تھیں۔ دایہ سنبھل کر دوبارہ بچی کی طرف بڑھی۔ اس مرتبہ اس پر مزید دہشت طاری ہوئی۔ اور اسے اپنا ارادہ تبدیل کر دینا پڑا۔

پھر جب ملک راجوڑ کی ماں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ اتنا معمولی سا کام انجام نہیں دے سکتی تو دایہ، مہارانی کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگی۔ ”راج ماما! میں نے اس بچی کو مارنے کی تین بار کوشش کی، مگر ہر بار میری سانس رکنے لگی۔ اگر اب کی مرتبہ اس نیت سے آگے بڑھی تو مجھے یقین ہے کہ کوئی نایدہ طاقت میرا گلا گھونٹ دے گی۔“

راج ماما کے ساتھ کسی نے بھی دایہ کی بات پر یقین نہیں کیا اور سب اُسے لعنت و ملامت کرتے رہے۔ پھر اس خاندان کی چھوٹی بہو آگے بڑھی اور اُس کی بھی وہی حالت ہوئی۔ آخر تمام خواتین کو اندازہ ہو گیا کہ یہ بچی، حضرت شاہ دولہا کی دعاؤں کے سائے میں ہے۔

ملک راجوڑ کی بیوی اس بات سے بے خبر تھی کہ بچی، بے ہوشی کی حالت میں اس کے پہلو سے اٹھالی گئی ہے۔ اور اسے ہلاک کرنے کے منصوبے پر عمل کیا جا رہا ہے۔ پھر جب وہ لوگ ناکام ہو گئے تو چپ چاپ بچی کو ماں کے قریب لٹا دیا گیا۔ اور اس کے بعد ملک راجوڑ کو اطلاع دی گئی کہ اس کے یہاں ایک لڑکی کی ولادت ہوئی ہے۔ چند لمحوں کے لئے ملک راجوڑ کے چہرے پر حسرت و یاس کا رنگ نمایاں ہوا۔ پھر وہ سنبھل گیا اور حضرت شاہ دولہا کی خدمت میں حاضر ہوا۔

”شاہ صاحب! آپ کے خدا نے آپ کی دعا سن لی اور مجھے جس بیٹی کی نوید دی گئی تھی، کل رات وہ دنیا میں آ

”ملک راجوڑ کے لہجے سے اُداسی جھک رہی تھی۔ مگر وہ جبراً مسکرا رہا تھا۔
 ”اللہ!“ حضرت شاہ دولّا نے اپنے اللہ کی کبریائی بیان کی۔ پھر قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔
 ”ہک الله احسن الخالقین۔“

ملک راجوڑ بڑی خاموشی سے حضرت شاہ دولّا کے چہرے پر نمایاں ہونے والی کیفیات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔
 فقر سے سکوت کے بعد حضرت شاہ دولّا، ملک راجوڑ سے مخاطب ہوئے۔ ”تمہاری ماں اور خاندان کی دوسری
 بیٹی نے اس بچی کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر جب اللہ نے اپنی قدرتِ لازوال سے ان کے منصوبوں پر
 مالدی اور انہیں ان کے مذموم ارادوں میں ناکام بنا دیا تو وہ عاجز و درماندہ ہو کر تمہارے پاس آئے اور تمہیں
 بے پیدا ہونے کی خبر دی۔“

حضرت شاہ دولّا کے اس انکشاف پر ملک راجوڑ بدحواس ہو گیا۔ ”شاہ صاحب! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔
 آپ سے کہے ہوئے وعدے کا پابند ہوں۔ میرے دل میں لڑکی کے قتل کا خیال تک نہیں آیا۔“
 ”تمہاری نیت بخیر تھی۔ مگر ان لوگوں کے دلوں میں بچی کے خلاف نفرتوں کا زہر بھرا ہوا ہے۔“ حضرت شاہ دولّا
 ہلالِ لہجے میں فرمایا۔ ”انہیں سمجھاؤ کہ وہ اللہ کے غضب کو دعوت نہ دیں۔“
 حضرت شاہ دولّا کا یہ رنگِ جلال دیکھ کر ملک راجوڑ لرز اٹھا۔ ”شاہ صاحب! میں ان لوگوں کی طرف سے معافی
 مانگا ہوں۔“

”کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔“ حضرت شاہ دولّا نے فرمایا۔ ”بچی کو ہمارے پاس لے کر آؤ۔ اور
 خاندان کی خواتین کو آخری بار تنبیہ کر دو۔ انہیں دوبارہ مہلت نہیں دی جائے گی۔“
 ملک راجوڑ واپس چلا گیا۔ پھر جب اس نے اپنی والدہ اور خاندان کی دوسری خواتین کے سامنے یہ واقعہ بیان
 وہ موت کے خوف سے لرز اٹھیں۔ پھر ان سب نے ملک راجوڑ کے سامنے عہد کیا کہ وہ لڑکی کو کوئی گزند نہیں
 رکھی۔

ہندوڑ بعد ملک راجوڑ، بچی کو لے کر حضرت شاہ دولّا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخؒ نے ایک نظر بچی کے دلکش
 بے پردہ لہجے کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”کیا تیری قدرت ہے؟ بے شک! تُو جسے چاہے، دشمنوں
 خیم میں زندہ رکھے۔ اور جسے چاہے، بے حساب عزت و رزق عطا کرے۔“

پھر حضرت شاہ دولّا نے بچی کو پیار کرتے ہوئے، اس کے چہرے پر دم کیا۔ اس کے بعد ملک راجوڑ کو مخاطب
 کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ہم اس بچی کا نام ”بائی“ تجویز کرتے ہیں۔ آج سے اس کو اس نام سے پکارا جائے۔“
 حضرت شاہ دولّا کا حکم سن کر ملک راجوڑ نے سر جھکا دیا۔

”جب یہ بچی بات کرنے لگے تو اسے دوبارہ ہمارے پاس لے کر آنا۔“ حضرت شاہ دولّا نے مزید فرمایا۔
 نے اپنے مندروں اور دوسرے مذہبی مقامات پر لے کر نہ جانا۔ اور اس کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کرنا، جس
 منہا رہے رسم و رواج کا تعلق ہو۔ اسے بڑے ناز و نعم کے ساتھ پرورش کرنا۔ جو اسے دکھ پہنچائے گا، وہ مجھے دکھ
 پہنچائے گا۔ جو اسے خوش کرے گا، وہ مجھے خوش کرے گا۔“

ملک راجوڑ، بچی کو لے کر واپس چلا گیا۔ اس نے حضرت شاہ دولّا کی ایک ایک بات پورے دھیان سے سنی
 مگر وہ شیخؒ کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔

خاندان کی دیگر خواتین تو لڑکی کو جبراً برداشت کر رہی تھیں۔ مگر ماں بہت خوش تھی کہ اس کی سونی گود آباد ہو

گئی تھی۔



پھر جب لڑکی چار سال کے قریب ہو گئی اور روانی سے گفتگو کرنے لگی تو ملک راجوڑ اسے لے کر دوبارہ حضرت شاہ دولہا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخؒ، بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے والہانہ لہجے میں فرمایا۔

”اے مالکِ ارض و سما! جو کچھ اس عاجز فقیر کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، اسے سلامتی کے ساتھ زمین پر نازل فرمادے۔“

اس کے بعد حضرت شاہ دولہا نے بچی کو کلمہ طیبہ کی تلقین کی۔ لڑکی، حضرت شاہ دولہا کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ کو دہراتی رہی۔

”میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور گواہی دیتی ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔“

ملک راجوڑ کسی پتھر کے محستے کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ اس کے نزدیک حضرت شاہ دولہا کا ہر عمل ناقابلِ فہم تھا۔ جب لڑکی کلمہ طیبہ پڑھ چکی تو حضرت شاہ دولہا، ملک راجوڑ سے مخاطب ہوئے۔ ”اگر اللہ تعالیٰ کو اسے زندہ رکھنا منظور نہ ہوتا تو اب تک تم لوگ اپنی بچی کو قفل کر چکے ہوتے۔ ویسے بھی تم میں سے کسی نے بانی کو دل سے قبول نہیں کیا۔ بس یوں سمجھ لو کہ تمہاری دانست میں یہ مرچکی ہے۔ اب ہم جانیں اور ہمارا کام۔“

ملک راجوڑ، فرط حیرت سے حضرت دولہا کے چہرہ مبارک کو دیکھتا رہا۔ نہ اس کا ذہن کام کر رہا تھا، نہ زبان۔ وہ سر سے پاؤں تک تحیر و استعجاب کی تصویر نظر آ رہا تھا۔

”ہم نے تمہاری بیٹی کو جبراً مسلمان نہیں کیا ہے۔“ حضرت شاہ دولہا نے فرمایا۔ ”بے شک! یہ تمہارے گھر میں پیدا ہوئی۔ مگر تم میں سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق ہم سے ہے۔ اس لئے ہم نے اسے اپنے حلقے میں شامل کر لیا۔ یہ اس فقیر کی جھونپڑی میں بھی پرورش پاسکتی ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے اسے ہندوستان کی ملکہ بنایا ہے۔ سو یہ عارضی طور پر تمہارے محل میں رہے گی۔ پھر جب وقت آئے گا تو یہ شہنشاہ ہندوستان کے قصر زرنگار میں چلی جائے گی۔ اب تمہیں جو کچھ ملے گا، اس کے نصیب سے ملے گا۔ اس کی عزت کرو گے تو خود بھی محترم ہو جاؤ گے۔ اسے خوش رکھو گے تو تمہارا دامن بھی مرادوں سے بھر جائے گا۔“

ملک راجوڑ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی بیٹی، ملکہ ہندوستان کس طرح بنے گی؟ ملک راجوڑ کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔

پھر حضرت شاہ دولہا کی پُر جلال آواز نے اس کا طلسم خانہ تصورات توڑ دیا۔ اور حقائق کی دنیا میں لوٹ آیا۔ حضرت شیخؒ اپنے ایک عالم و فاضل مرید کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے تھے۔

”یہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔ اور آئندہ یہی بانی کی تعلیم و تربیت کریں گے۔“

یہاں قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت شاہ دولہا نے لڑکی کا نام ”بانی“ کیوں رکھا؟ واضح رہے کہ ہندوؤں میں ”بانی“ کا لفظ عزت دار خواتین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے والی مشہور خاتون، جھانسی کی رانی کا خاندانی نام، رانی لکشمی بانی تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس لفظ کا غلط استعمال ہونے لگا۔ اور بدنام طبقے کی عورتیں بھی اپنے ناموں کے ساتھ

”لکھنے لگیں۔“



ایک سال بعد ملک راجوڑ کے بیٹا پیدا ہوا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا، جس نے پوری ریاست کو حیرت میں ڈال دیا۔ لایاؤں، حکیموں اور چوتھیوں کے یہ دعوے کہ مہارانی، اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور کہاں یہ نہ حال کہ ایک لڑکی کے بعد تخت کا وارث بھی دنیا میں آ گیا۔ پہلے لڑکے کی پیدائش کے بعد راجہ کی ماں اور دیگر خاندان کے اراکین شاہ دولہا کی روحانی طاقت کی قائل ہو گئی تھیں۔ مگر اب انہیں یہ قلق تھا کہ ان کی نسل سے تعلق رکھنے والی ہندو لڑکی، مسلمان کیوں ہو گئی تھی؟

اور بانی کا یہ حال تھا کہ وہ راج محل کی ہنگامہ آرائی کے باوجود سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ مندر کی گھنٹیوں کا آواز اور اپنے خاندان کے افراد کو بتوں کے سامنے سر جھکاتے دیکھتی تو اسے سب کچھ عجیب سا لگتا۔ پھر وہ اپنے خاندان سے سوال کرتی۔

”میں ایک اللہ کی عبادت کرتی ہوں۔ اور یہ لوگ پتھر کی بہت سی صورتوں کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ آخر ہمارے کیوں نظر نہیں آتا، جس پر میں چل رہی ہوں؟“

بانی کے اہل بیت جو حضرت شاہ دولہا کے ایک مرید تھے، اس قسم کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہتے۔ ”یہ وہ ہیں، جو آنکھیں ہوتے ہوئے اندھے، کان ہوتے ہوئے بہرے، زبان ہوتے ہوئے گونگے اور دماغ ہوتے ہوئے فاجر احمق ہیں۔“

بانی اپنی نوعمری کے سبب ان باتوں کی گہرائی کو سمجھنے سے قاصر رہتی۔

وقت اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ اس دوران بانی، حضرت شاہ دولہا سے ملنے گجرات بھی آئی۔ اور آپ بانی کے ہی سوالات کرتی۔

”بیٹی! مبرو محل کے ساتھ اپنے راستے پر چلتی رہو۔ وقت تمہیں سب کچھ سمجھا دے گا۔“ حضرت شاہ دولہا انتہائی ناز و لطف سے بانی کو سمجھاتے۔ اور اس کے حق میں دعائے خیر فرماتے۔

ملک راجوڑ کے یہاں ایک بیٹے کے بعد کئی بیٹے پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ دولہا کی زبان مبارک سے ادا ہونے والی ایک لفظ عالم اسباب میں ظاہر ہو چکا تھا۔ اللہ نے ملک راجوڑ کا خالی دامن مرادوں سے بھر دیا تھا۔ اور اسے بے کئی وارث عطا کر دیئے تھے۔ اب اسے بس ایک ہی بات کا انتظار تھا کہ اس کی بیٹی، ہندوستان کی ملکہ کس بنے گی؟

مردہ وقت بھی آ گیا۔ فرماں روا ہندوستان، شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں، موسم گرما گزارنے کے لئے کشمیر پہنچا۔ شاہ جہاں کے ہمراہ اس کا بیٹا محی الدین اورنگ زیب عالمگیر اور برادر نسبتی (ممتاز محل کا بھائی) نثار بھی تھا۔

اہل دلی ہند، کشمیر ہی میں مقیم تھا، حضرت شاہ دولہا نے اپنے ایک خدمت گار کے ذریعے ملک راجوڑ کو گجرات کے لئے روانہ فرمایا۔

”ہماری بیٹی کے رخصت ہونے کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ شاہ جہاں، کشمیر میں مقیم ہے۔ کچھ دن بعد وہ لاہور کے قریب بانی کو اس کی خدمت میں پیش کر دینا اور اس کے ساتھ ہی اپنی خاندانی روایت بھی بیان کر دینا۔“

ملک راجوڑ ایک بار پھر حیرت میں ڈوبا ہوا لاہور چلا گیا اور پورا واقعہ اپنی بیوی سے بیان کر دیا۔ پھر یہ خبر بانی

تک پہنچی تو وہ بہ نفس نفیس حضرت شاہ دولہا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگی۔

”میرے والدین کہتے ہیں کہ میری رخصتی کا وقت نزدیک آ گیا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میری منزل کہاں ہے؟ کیا میں آپ کے قدموں سے جدا ہو جاؤں گی؟“ یہ کہتے کہتے بائی رونے لگی۔

”بیٹیوں کو تو ایک نہ ایک دن، ماں باپ کے گھر سے رخصت ہونا ہی پڑتا ہے۔“ حضرت شاہ دولہا نے بہت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”تم ایک بادشاہ کی بیوی ہو۔ اور ایک بادشاہ کی ماں۔ یہی تمہاری منزل ہے۔ اللہ کی ان نعمتوں کا ہمیشہ شکر ادا کرتی رہنا۔ تم لاہور میں رہو یا دہلی میں۔ فقیر کی دعاؤں کے حلقے سے کبھی دور نہیں رہو گی۔“

پھر جب شاہ جہاں، کمیر کی سیر کے بعد لاہور پہنچا تو قرب و جوار کے تمام راجاؤں، حاکموں اور جاگیرداروں نے فرماں رواے ہندوستان کی خدمت میں نہایت قیمتی تحائف پیش کئے۔ ملک راجوڑ، حضرت شاہ دولہا کے حکم کے مطابق اپنی بیٹی، بائی کو لے کر شاہ جہاں کی خلوت میں حاضر ہوا۔

”میں اپنی اس بیٹی کو شاہ والا کی خدمت کے لئے پیش کرتا ہوں، جو حضرت شاہ دولہا کی دعاؤں سے پیدا ہوئی اور ان ہی کی تربیت سے جوانی کی منزل تک پہنچی۔“ یہ کہہ کر ملک راجوڑ نے اپنے خاندان کی وہ سنگ دلانہ اور وحشیانہ رسم بھی بیان کر دی، جس کے تحت پیدا ہونے والی ہر لڑکی کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

یہ واقعہ سن کر شہاب الدین شاہ جہاں آبدیدہ ہو گیا۔ اور نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”شاہ دولہا آخر شاہ دولہا ہیں۔“

پھر مغل شہنشاہ، ملک راجوڑ کی بیٹی، بائی کو لے کر دہلی چلا گیا۔ اور چند دن بعد اس کی شادی، اورنگ زیب سے کر دی۔ پھر جب شاہ جہاں نے اپنے محبوب بیٹے، داراشکوہ کو ولی عہد سلطنت نامزد کیا اور عالمگیر کو اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا تو اس کی شریک حیات نے سسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے حضرت شاہ دولہا نے بشارت دی ہے کہ میں ایک شہنشاہ کی بیوی بنوں گی۔ اور دوسرے شہنشاہ کی ماں۔ مجھے یقین ہے کہ بحکم خدا، حضرت شیخ کی یہ پیش گوئی بھی عنقریب اہل دنیا پر ظاہر ہو کر رہے گی۔“ یہ کہہ کر بائی نے شوہر کو اپنی پیدائش سے لے کر شادی تک کے سارے واقعات بے کم و کاست سنا ڈالے۔

بیوی کے اس انکشاف پر اورنگ زیب کے دل میں حضرت شاہ دولہا کی زیارت کا شوق بہت شدت سے پیدا ہوا۔ پھر وہ اپنی بیوی، بائی کو لے کر گجرات روانہ ہوا۔

بعض روایتوں کے مطابق مغل شہزادے، اورنگ زیب عالمگیر نے حضرت شاہ دولہا کی خدمت میں حاضر ہو کر تین چیزیں پیش کیں۔ ایک زرد مرغ، دو دلائی بلیاں اور ٹکڑی کی ایک منقش چھڑی۔ یہ چیزیں پیش کرتے وقت اورنگ زیب نے دل ہی دل میں یہ سوچا تھا۔

”اگر حضرت شاہ دولہا نے مجھے میری چھڑی واپس کر دی تو یہ میرے حکمران بننے کی طرف اشارہ ہوگا۔“ شاید اورنگ زیب کے ذہن میں اس قسم کا خیال آنے کی وجہ یہ ہو کہ بہت سے لوگوں کے نزدیک چھڑی کو اقتدار کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔

آخر وہی ہوا، حضرت شاہ دولہا نے شہزادہ اورنگ زیب عالمگیر کے پیش کردہ دونوں تحفے قبول کر لئے اور نقش و نگار والی چھڑی واپس کرتے ہوئے کیف و جذب سے فرمایا۔

”شہزادے! دست قدرت تمہارے ہی سر پر تاج زرنگار رکھے گا۔ انشاء اللہ۔ اہل دنیا کو کتنا ہی ناگوار گزرے اور کتنے ہی دشمن سرگرم عمل ہو جائیں مگر اس تاج کو کوئی اُتار نہیں سکے گا۔“

ہا کے بعد شہزادہ داراشکوہ اور اورنگ زیب میں اقتدار کی ایسی ہولناک کشمکش شروع ہوئی کہ اورنگ زیب کی بادی یقینی نظر آنے لگی۔ شاہی وسائل کے ساتھ ماں باپ کی ساری ہمدردیاں بھی شہزادہ داراشکوہ کو حاصل کر جب معرکہ برپا ہوا تو اورنگ زیب کو نمایاں فتح حاصل ہوئی۔ اور وقت نے اس کے ماتھے پر اقتدارِ اعلیٰ کا دریا بہا دیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا، بہادر شاہ اول تخت نشین ہوا۔ بہادر شاہ اسی بابائی کے بطن ایک بادشاہ کی بیوی، ایک بادشاہ کی ماں۔ ایک روشن ضمیر کی آنکھوں نے گردشِ ماہ و سال کے پردے میں جو بلکھا، وہ نصف صدی کے بعد اس زمین پر ظاہر ہوا۔ یہ حضرت شاہ دولہا کی سب سے بڑی کرامت شمار کی



ہا بار گجرات اور مغربی پنجاب میں شدید قحط پڑا۔ تالاب اور کنوئیں خشک ہونے سے پیاسے جانور مرنے لگے۔ محل کی تباہی کے ساتھ آئندہ فصل کے بھی کوئی امکانات نہیں تھے۔ اس سنگین صورتِ حال کے پیشِ نظر گجرات ہزاروں کے لوگ حضرت شاہ دولہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بارش کے لئے دعا کی درخواست کی۔ حضرت شاہ دولہا نے جواب فرمایا۔ ”تم لوگ سمجھتے ہو کہ سننے والا میری دعائیں سنتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بار کب آج کل وہ میری بالکل نہیں سنتا۔“

حضرت شاہ دولہا کے گریز کا ایک انداز تھا تاکہ اہل طلب مایوس ہو کر چلے جائیں۔ مگر قحط کی شدت اور دیگر مایوسانہ کوششوں نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ ایک خدا رسیدہ بزرگ کے آستانہ کرم پر مسلسل التجائیں کر رہے۔

حضرت شاہ دولہا مجبور ہو گئے اور پھر اپنے ایک خدمت گزار کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ”میرے اوڑھنے کی چادر بہت میلی ہو گئی ہے، اسے لا کر دھوپ میں ڈال دو۔ شاید اسے رحم آ جائے۔ اور اس کے سوارحم کرنے والا کون؟“

خدمت گار نے فوراً حضرت شاہ دولہا کی ایک میلی چادر لا کر تیز دھوپ میں ڈال دی۔ پھر آپ نے دعا کے لئے مانجے۔ اور حاضرین سے بھی دعا مانگنے کے لئے کہا۔

اولیٰ نے سنا، حضرت شاہ دولہا نہایت رقت آمیز لہجے میں دعا مانگ رہے تھے۔ ”اے دیکھنے والے! تُو دیکھ رہا ہے۔ اور اے سننے والے! تُو سن بھی رہا ہے۔ تیرے عاجز بندے کی یہ چادر، میل کچیل سے اٹی ہوئی ہے۔ اپنے تو بارشِ کرم سے اسے اُجلا کر دے۔ ورنہ تُو بے نیاز ہے۔ اور ہم گناہ گار، سب سے زیادہ مجبور ہوئے۔“

لی حضرت شاہ دولہا دعا مانگ رہے تھے کہ اچانک اُفقِ مشرق پر ہلکے ہلکے بادل نمودار ہونا شروع ہوئے۔ پھر بادل دیکھتے پورے آسمان پر سیاہ گھٹائیں چھا گئیں۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی تیز بارش شروع ہو گئی۔

ہا بار بارش کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ کھیت، ٹوچے، گھیاں اور راستے زیرِ آبلے۔ ندیوں کے کنارے اُبل پڑے اور پورے علاقے میں سیلاب کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ قحطِ آب بھی مٹا تھا۔ کثرتِ آب بھی ایک قہر۔ موسم کا توازن بگڑا تو زمین پر رہنے والوں کی زندگی ایک دبا ل ہو گئی۔ نتیجتاً اُبل، جو بارش کی دعا کے لئے حضرت شاہ دولہا کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تھے، اب وہی لوگ بارش کے قہم کے لئے ایک مردِ درویش کی دعاؤں کا سہارا لینے پریشان چہروں کے ساتھ حاضر ہوئے تھے۔

حضرت شاہ دولّا نے حاضرین کی درخواست کے جواب میں فرمایا۔ ”تم پر لازم ہے کہ جب بھی دعا مانگو، مانگو اور خیر کے ساتھ مانگو۔“

پھر آپ نے اپنے خادم سے فرمایا۔ ”میری چادر اٹھا لاؤ۔ اس کا میل کچیل تیز بارش میں ڈھل گیا ہوگا۔“
حضرت شاہ دولّا کی چادر کے ہتے ہی آہستہ آہستہ بارش کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اور تیز دھوپ نکل آئی۔



آخر میں حضرت شاہ دولّا کی ایک اور کرامت، جو آج بھی جاری ہے۔ مگر ہزار کوششوں کے باوجود کوئی ذہن اس کی توجیہ تلاش نہیں کر سکا۔

ایک بار کسی علاقے کی مہارانی، حضرت شاہ دولّا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست گزار ہوئی۔ ”شاہ صاحب! بھگوان نے مجھے دنیا کی ہر نعمت عطا کی ہے۔ مگر اولاد سے محروم رکھا ہے۔ مشہور ہے کہ آپ کی دعاؤں سے خالی دامن، مرادوں سے بھر جاتے ہیں۔ میں بھی اسی یقین کے ساتھ حاضر ہوئی ہوں۔“

حضرت شاہ دولّا نے مضطرب مہارانی کی التجا سن کر فرمایا۔ ”حق تعالیٰ اپنے بے مثال کرم کے صدقے میں تمہیں اولاد تو بخش دے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ تمہیں اپنی پہلی اولاد ہماری خانقاہ کے لئے وقف کرنی ہوگی۔“

رانی نے جوش جذبات میں حضرت شاہ دولّا کی شرط منظور کر لی اور اپنے محل واپس لوٹ گئی۔ پھر ایک سال بعد جب خلاف توقع اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو رانی کی نیت میں خلل واقع ہو گیا اور اس نے سوچا کہ میں کس طرح اپنے مگر گوشے کو ایک فقیر کی خانقاہ کے لئے وقف کر دوں؟ ممکن ہے کہ اس لڑکے کے بعد میرے کوئی اولاد ہی پیدا نہ ہو۔ اور اگر بھی تو وہ لڑکی ہو۔ الغرض مہارانی نے اپنے شوہر اور محل کے دیگر خدمت گاروں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کر دی کہ لڑکے کی ولادت کو پوشیدہ رکھا جائے۔

جب مہارانی اس خبر کو راز میں رکھنے کی ساری تیاریاں مکمل کر چکی تو دوسرے دن حضرت شاہ دولّا، مہارانی کے خواب میں تشریف لائے اور نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔

”یہ کھلی ہوئی بد عہدی ہے۔ اور مردانِ حق سے بد عہدی کرنے والے کبھی بامراد نہیں ہوتے۔ تم جس لڑکے کو ہم سے چھپا رہی ہو، وہ تمہارے کسی کام کا نہیں ہے۔ مگر مجبوظ العقل لڑکا، ہماری خانقاہ ہی کے لئے مناسب ہے۔“ اتنا کہہ کر حضرت شاہ دولّا تشریف لے گئے۔

خوف سے مہارانی کی آنکھ کھل گئی۔ پھر جب اس نے دن کے اُجالے میں اپنے نوزائیدہ لڑکے کو دیکھا تو حیرت کی شدت سے کچھ دیر کے لئے اسے سکتے سا ہو گیا۔ لڑکے کا سر غیر معمولی طور پر چھوٹا تھا۔ پھر مہارانی نے قرب و جوار کے تمام ویدوں اور حکیموں کو طلب کر کے نومولود لڑکے کا معائنہ کرایا۔ پھر طب کے سارے ماہرین نے بیک زبان فیصلہ سنایا۔

”یہ ایک مجہول بچہ ہے۔ طویل معالجے کے بعد بھی اس کے اعضاء اور دماغ درست حالت میں نہیں آسکیں گے۔“

آخر مہارانی شرمسار ہوئی اور اس مجہول بچے کو خانقاہ میں چھوڑ کر خالی دامن چلی آئی۔ چند سال بعد کے بعد دیگرے مہارانی کے کئی لڑکے پیدا ہوئے، جو سب کے سب توانا اور صحت مند تھے۔ اور ان میں کوئی جسمانی نقص محسوس نہیں تھا۔

اُس روز سے یہی رسم جاری ہے کہ بے اولاد لوگ، حضرت شاہ دولّا کے مزار مبارک پر حاضر ہو کر اولاد کے لئے

نا کرتے ہیں اور پہلی اولاد کو خانقاہ کے لئے وقف کرنے کا عہد کرتے ہیں تو ان کا پہلا بچہ مجہول ہوتا ہے۔ سر بہت بڑھا ہوتا ہے۔ اور اس کی زبان گنگ ہوتی ہے۔ اب اس قسم کے بچوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔ یہ بچے، حضرت شاہ دولّہ کے چوہے کہلاتے ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کیا راز ہے؟ انسانی عقل تو اس کی ذہیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔



حضرت شاہ دولّہ، نماز کی بہت تاکید فرماتے تھے۔ ”جب تک فرض نمازیں ادا نہیں کرو گے، اس وقت تک تمہیں اُٹل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔“

حضرت شاہ دولّہ کا مشہور قول ہے۔ ”پختہ کار انسان کو ”حرصِ خام“ کا آرزو مند ہونا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔“ آپ فرمایا کرتے تھے کہ طلب کی انتہا سلوک ہے اور سلوک کی انتہا معرفت۔ اور معرفت کی کوئی انتہا نہیں۔ رُفّت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ عار کے لئے اس دروازے سے گزرناروا ہے۔ تجلی غیر مکرر ہے۔ اور یہ امر طے نہ ہے کہ یہ تجلی ہر وقت تازہ بہ تازہ ہے۔ اور یہ تازگی، انسان کے اندازہ و قیاس سے بالا ہے۔ حضرت شاہ دولّہ نے 1085ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کا حزارِ مبارک، گجرات میں مرکزِ دل و نگاہ ہے۔ حزارِ ہلاک پر یہ شعر درج ہے۔

یہ توحید آں عارف حق گزیدہ

بگو شاہ دولّہ بخت رسیدہ

حزارِ مبارک پر ایک خوب صورت گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک مسجد بھی ہے۔



حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح سندھ بھی کفر و شرک اور توہم پرستی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر کوہ فاران سے اسلام کا سورج طلوع ہوا..... اور اس کی روشنی اپنے اطراف میں پھیلنے لگی۔ اپنے وقت کی دونوں سپر پاورز ایران اور روم نے اسلام کی برتری تسلیم کر لی۔ قیصر و کسریٰ کے محل زمیں بوس ہو گئے۔ توحید و رسالت کی بارش اتنی تیز تھی کہ ایران میں صدیوں سے روشن آتش کدے بجھ گئے..... اور وہاں شرک و بت پرستی کی راکھ باقی رہ گئی۔ پھر عرب کی جانب سے آنے والی تیز ایمانی ہوائیں اس راکھ کو بھی اڑا کر لے گئیں۔

پھر یہ ہوائیں سندھ کی طرف بڑھیں، جہاں ایک برہمن حکمران راجہ داہر، کفر و ضلالت کے ساتھ جور و ستم کے چراغ جلا رہا تھا۔ قبیلہ بنو ثقیف کے مایہ ناز اور نو عمر سالار، محمد بن قاسم نے سندھ میں داخل ہو کر راجہ داہر کا چراغ ہستی کل کر دیا..... اور بت خانہ سندھ میں توحید و رسالت کی شمعیں فروزاں کر دیں۔ روشنی کا یہ سفر تیرہ سو پچیس سال سے جاری ہے۔ سندھ جو کبھی باطل پرستوں کا مضبوط ترین قلعہ تھا، اہل ایمان کی سرفروشانہ کوششوں سے ”باب الاسلام“ کہلایا۔

اس کے بعد سرزمین سندھ نے کئی سیاسی انقلاب دیکھے۔ بنو امیہ کے بعد عباسی برسرِ اقتدار آئے تو سندھ کے انتظامی معاملات، عباسی گورنروں کے سپرد کر دیئے گئے۔ بغض تنگ نظر اور متعصب مؤرخین نے ان انتظامی امور کو غلط سیاسی رنگ پیش کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

”سندھ، عباسی خلیفہ کا خراج گزار تھا..... لیکن علاقے کا نظم و نسق تمام تر مقامی لوگوں کے ہاتھ میں تھا..... اور ان میں سے اکثر لوگوں نے مختلف وجوہ کی بنا پر مذہب اسلام قبول کر لیا تھا۔“

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی آبادی نے جبراً اسلام قبول کیا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ ایک تاریخی بددیانتی ہے۔ بے شک! مسلمانوں اور مقامی ہندو راجاؤں کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی تھی..... اور جنگ میں ہمیشہ مردِ جہاں کے استعمال ہوتا ہے۔ مگر جنگ جب کسی نتیجے پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے تو مفتوح حکمران کو قتل کر دیا جاتا ہے یا اسے پابند سلاسل کر کے زندان کے اندھیروں میں گم کر دیا جاتا ہے۔ مگر اسلام کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ مفتوح آبادی کی شرگوں پر اپنی تلواریں رکھ دے۔ اور ان سے قہرناک لہجے میں کہے۔

”اپنا آبادی مذہب ترک کر دو..... اور اسلام کا کلمہ پڑھو۔“

دین اسلام میں ہرگز جبر و اکراہ نہیں ہے۔ اسی اصول کے تحت سندھ کے عوام کو بھی ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا

تھا۔ پھر جب کچھ دن بعد مقامی باشندوں پر اسلام کی حقانیت منکشف ہوئی اور انہوں نے فاتح مسلمانوں کا شفقانہ طرز عمل دیکھا تو خود ہی اپنے گلے سے کفر کا طوق اور پیروں سے شرک کی انجیر اُتار بیٹھی اور قطار در قطار حلقہٴ اسلام میں داخل ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے سندھ کے باشندوں کو تلوار سے نہیں، اپنے کردار سے فتح کیا تھا۔ اس کی سب سے روشن مثال وہ عظیم الشان واقعہ ہے، جسے امانت کے طور پر تاریخ آج بھی اپنے سینے میں محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ محمد بن قاسم کی فتوحات، سندھ اور ملتان سے گزر کر راجستھان تک پہنچ گئی تھیں۔ پھر جب خلیفہ کے حکم پر محمد بن قاسم واپس چلا گیا اور اس عظیم فاتح کو واسطہ کے قید خانے میں سخت اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا گیا تو یہ جا نگداز خبریں کیرج (راجستھان) کے باشندوں تک پہنچیں۔ یہاں کے لوگ، محمد بن قاسم کو دیوتاؤں کا درجہ دیتے تھے۔ بھرکیرج کے باشندوں نے محمد بن قاسم کا ایک قد آدم مجسمہ تعمیر کیا اور اسے شہر کے چوراہے پر نصب کر دیا۔ اس کے بعد شہر کے تمام اہل ہنود جمع ہوئے اور انہوں نے اپنے ”دیوتا“ کا ماتم کیا۔ پھر یہ رسم پچاسوں برس جاری رہی کہ محمد بن قاسم کے یوم شہادت پر کیرج کے باشندے، مجسمے کے قریب جمع ہوتے تھے۔ اور اس سالار اعظم کی دردناک موت کے حوالے سے مرثیے پڑھتے تھے..... اور اس کی صفات عالیہ کا ذکر کر کے دیر تک ماتم کیا کرتے تھے۔

اہل نظر اس واقعے سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے سندھ کے باشندوں پر جبراً دین اسلام مسلط نہیں کیا تھا۔

مورخین نے اپنے تعصب سے مجبور ہو کر عباسی گورنروں کو غاصب قرار دیا اور سندھ کے باشندوں کو خراج گزار..... ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ خراج، غیر مسلم آبادی سے وصول کیا جاتا ہے۔

پھر یہی مورخین، سلطان محمود غزنوی کو بھی ایک جابر و ظالم حکمران قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”گیارہویں صدی کے اوائل میں محمود غزنوی نے سندھ کو فتح کیا اور تاراج کیا۔ اس نے اس علاقے کو جہاد اور مال غنیمت کے حصول کے لئے استعمال کیا، تاکہ مشرقی ایران میں بھرپور فوجی کارروائی کی جاسکے۔ اسے سندھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی..... اور یہ اس کی حربی کارروائی کا مرکز بھی نہ تھا۔“

اس موقع پر بھی مورخین نے اپنی تنگ دلی اور کوتاہ نظری سے کام لیتے ہوئے تاریخی حقائق کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی کو سندھ کے خزانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اولوالعزم سلطان ہمیشہ ”قراٹھ“ کے تعاقب میں ہندوستان پر حملہ آور ہوتا تھا۔ ”قراٹھ“ باطنیوں کا ایک فرقہ ہے، جس نے اسلام کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اسی فرقے کے لوگوں نے ”خانہ کعبہ“ پر بھی یلغار کی تھی..... اور ”حجر اسود“ تک اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ قراٹھ کا مرکز ”ملتان“ تھا۔ سلطان محمود غزنوی ان ہی کی سرکوبی کے لئے ملتان آیا تھا..... اور ملتان تک پہنچنے کے لئے اُسے سرزمین سندھ سے گزنا پڑا تھا۔ اگرچہ سندھ میں اسلام کو فروغ حاصل ہو چکا تھا..... لیکن ابھی کچھ ایسے منافقین موجود تھے، جو اپنی استیوں میں بت چھپائے ہوئے تھے اور پردہ ”قراٹھ“ کی مدد کیا کرتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی نے ان ہی منافقین کے خلاف تلوار اٹھائی مگر ہمارے مورخین نے سلطان کے اس اقدام کو سندھ کے لوٹنے اور مال غنیمت جمع کرنے سے تعبیر کیا۔ واضح رہے کہ مال غنیمت کا لفظ بھی اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے، جب تک مسلمان سالار کسی کافر قوم سے سرسری پیکار ہو۔ عباسی گورنروں کے لئے ”خراج“ کا لفظ اور سلطان محمود غزنوی کے لئے ”مال غنیمت“ کا لفظ استعمال کرنے سے مورخین کا ایک ہی مقصد ہے کہ سندھ کے باشندے اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے۔ ایک طرف عباسی گورزان سے خراج وصول کر رہے تھے اور دوسری طرف سلطان محمود غزنوی ان پر حملے کر کے مال غنیمت جمع کر رہا تھا۔

پھر یہی مؤرخین تحریر کرتے ہیں کہ 1032ھ میں ایک مقامی سردار، ابن سومر نے غزنوی کے اقتدار کا سندھ سے خاتمہ کر دیا۔ اس کے وارثوں نے تین صدیوں تک ”زیریں سندھ“ پر حکومت کی..... لیکن اپنے اقتدار کو بالائی سندھ اور ملتان تک وسعت نہ دے سکے۔ بالائی سندھ کا علاقہ غوری، خلجی اور تغلق خاندانوں کے زیر نگین رہا۔ ایک مقامی سما خاندان نے سومر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کا دارالسلطنت ”ٹھٹھہ“ تھا۔ اس نے سلاطین تغلق کی بالادستی قبول کر لی تھی اور انہیں سالانہ خراج دیتا تھا۔ آخر اقتدار ”سما“ سے کلہوڑہ خاندان میں منتقل ہوا۔ یہ خاندان اپنے سیدے سادھے طرز زندگی اور فقر و قناعت کے لئے مشہور تھا۔ کلہوڑہ حاکم بظاہر مغلوں کے حلقہ بگوش تھے۔ مگر انہوں نے ہمیشہ اپنے آقاؤں کی حکم عدولی کی۔ جس کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ کلہوڑہ خاندان کے نور محمد نے پورے سندھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی دوران نادر شاہ نے سندھ پر حملہ کیا۔ نور محمد کلہوڑہ نے والی ایران کے خلاف شدید مزاحمت کی۔ مگر بالآخر شکست کھائی اور نادر شاہ نے اسے سندھ کے قلعے میں قید کر دیا۔ پھر ایک بڑی رقم کی ادائیگی کے بعد اس شرط پر رہائی حاصل کی کہ اس کے تین بیٹے یرغمال کے طور پر نادر شاہ کے پاس رہیں گے۔ 1747ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد یہ تینوں شہزادے سندھ واپس آئے۔

کفر کی تاریکی سے اسلام کی روشنی تک..... یہ ہے سندھ کی سیاسی کشمکش کا مختصر جائزہ۔



مغل شہنشاہ، محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا۔ جب ہالہ (حیدر آباد سندھ) میں ایک سید خاندان، گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے شاہی عطیات کی حاجت تھی اور نہ امرائے وقت کے التفات کی۔ اس خاندان کے سربراہ سید حبیب شاہ تھے۔

جب صاحبزادے امیر تیمور نے ”ہرات“ کو تسخیر کیا تو اس نے سید حبیب شاہ کے مورث اعلیٰ اور ان کے چھ فرزندان کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ بعد میں پانچ فرزندان، ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں حاکم مقرر کر دیئے گئے۔ اور سب سے چھوٹے بیٹے، سید حیدر شاہ، امیر تیمور کے دربار سے وابستہ رہے۔

پھر سید حیدر شاہ اپنے والد محترم سے اجازت لے کر ہندوستان تشریف لائے۔ اور اپنے بھائیوں سے ملاقاتیں کیں۔ پھر سید حیدر شاہ ”ہالہ“ (حیدر آباد) تشریف لائے اور یہاں کی معروف شخصیت، شاہ محمد کے یہاں مقیم ہوئے۔ شاہ محمد نے سندھ کی روایتی مہمان نوازی اور میزبانی کا مظاہرہ کیا۔ جس کے جواب میں سید حیدر شاہ نے شاہ محمد کی امداد و معاونت کی۔ جس کے نتیجے میں یہ دوستی روز بہ روز گہری ہوتی گئی۔ بالآخر شاہ محمد نے اپنی صاحبزادی کا عقد، سید حیدر شاہ سے کر دیا۔

شادی کے بعد سید حیدر شاہ ”ہالکنڈی“ میں آباد ہو گئے۔ پھر اسی خاندان کے کچھ لوگ ”بلوی“ میں آباد ہو گئے، جو حیدر آباد سندھ کے جنوب میں واقع ہے۔ اسی شاخ میں سید عبدالکریم معلووی بھی شامل ہیں، جو سید حبیب شاہ کے والد محترم تھے۔

سید حبیب شاہ ایک عابد و زاہد بزرگ تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں فرزند کی دولت سے سرفراز کیا اور 1102ھ میں ان کے یہاں ایک خوب صورت لڑکا پیدا ہوا۔ والدین نے نومولود کا نام عبداللطیف رکھا۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے واسطے سے حضور اکرم ﷺ تک جا پہنچتا ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیفؒ کے والد محترم سید حبیب شاہ ایک صاحبِ حال صوفی تھے۔ اکثر اوقات آپ پر استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا کہ جب شاہ عبداللطیفؒ والد گرامی کی خدمت میں حاضر

ہوئے تو سید حبیب شاہ اپنے فرزند سے دریافت کرتے۔
 ”صاحبزادے! تم کون ہو؟ اپنا تعارف تو کراؤ۔“

جواب میں حضرت شاہ عبداللطیفؒ بصد نیاز عرض کرتے۔ ”حضور کا غلام، عبداللطیف ہوں۔“
 بیٹے کا نام سن کر سید حبیب شاہ فرماتے۔ ”معاف کرنا، میں تمہیں نہیں پہچانتا۔“
 قارئین اسی ایک واقعے سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت شاہ عبداللطیفؒ کس عظیم المرتبت صوفی کے فرزند تھے۔



حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے ابتدائی حالات پردہ راز میں ہیں۔ اسی لئے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ شاہ صاحب مصنف کئی تعلیم حاصل کی..... اور آپ کے اساتذہ کون تھے؟ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیفؒ نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی، بلکہ آپ ”ان پڑھ“ تھے۔ ایک محقق جو تونی، شاہ صاحبؒ کی تعلیم کے حوالے سے تحریر کرتا ہے۔

”میر علی شیر قانع ٹھٹھوی، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے زبردست مداح تھے۔ میر علی شیر نے فرط عقیدت میں شاہ صاحبؒ کو ”امی“ کہہ کر پکارا۔ چونکہ ”امی“ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب تھا، اس لئے میر علی شیر قانع، حضرت شاہ عبداللطیفؒ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر کر کے ثابت کرنا چاہتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب بزرگ تھے انہیں الہام ہوتا تھا۔“

میر علی شیر قانع کی عقیدت اپنی جگہ، مگر بعد میں آنے والے محققین نے دلائل سے اس حُسن عقیدت کو مسترد کر دیا۔

جرمن عالم، ارنسٹ ٹرمپ نے 1866ء میں ”شاہ جو رسالو“ شائع کیا۔ اس کے مقدمے میں ٹرمپ لکھتا ہے۔
 ”شاہ جو رسالو میں عربی، فارسی اور سندھی زبانوں کے ضرب الامثال، محاوروں اور اقوال کا استعمال جس عالمانہ اور
 ذکاوانہ انداز سے ہوا ہے، وہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے علم و فن کی دلیل ہے۔“
 جرمن عالم، ارنسٹ ٹرمپ کی تائید کرتے ہوئے ایک اور محقق، شہوانی لکھتا ہے۔

”حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کو عربی زبان پر دسترس حاصل تھی۔ شاہ صاحبؒ اپنے شاعرانہ کلام میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ پیش کیا کرتے تھے۔ آپ مثنوی مولانا رومؒ و دیوانت کے فلسفے اور اپنے دادا محترم، شاہ سید عبدالکریمؒ کے رسالے سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو سفر میں اپنے ساتھ یہ کتابیں کیوں رکھتے؟“

محقق شہوانی اس سلسلے میں ایک اور نہایت مضبوط دلیل پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سندھ کے حکمران، نور محمد کلہوڑہ نے حضرت شاہ عبداللطیفؒ کو مثنوی مولانا رومؒ کا ایک نسخہ پیش کیا، جسے سونے کے پانی سے لکھا گیا تھا اگر شاہ صاحبؒ ”ان پڑھ“ ہوتے تو اتنا قیمتی تحفہ انکی نذر نہ کیا جاتا۔

ایک اور محقق گر بھٹانی، جرمن عالم کے نظریے کی تائید کرتا ہے۔ پھر گر بھٹانی کی تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے محقق جو تونی لکھتا ہے۔

”آخوند نور محمد بھٹی، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے استاد گرامی تھے..... اور آخوند نور محمد نے اپنے شاگرد کو ایسی تعلیم دی تھی کہ شاہ صاحبؒ اپنے زمانے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ آپ اپنی مادری زبان، سندھی پر زبردست قدرت رکھنے کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور اس وقت کی دوسری مروجہ زبانوں پر بھی

دسترس رکھتے تھے۔



حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے واقعات ”روز و شب“ کے غبار میں گم ہیں۔ مگر پھر بھی ایک ایسے انقلاب آفریں سانحے کی تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، جس نے آپ کی زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔

اس وقت حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی عمر مبارک بیس سال تھی جب آپ مرزا مغل بیگ کی صاحبزادی پر فریفتہ ہو گئے۔ مرزا مغل بیگ، شاہ صاحب کے والد محترم حضرت سید حبیب شاہ کے مرید تھے۔ وہ ارغون قبیلے کے معزز سردار تھے اور ان کا سلسلہ، چنگیز خان سے ملتا تھا۔

ایک بار مرزا مغل بیگ کی جواں سال اور حسین و جمیل بیٹی، سعیدہ بیمار ہو گئی۔ مرض کی ابتداء میں والدین نے طبیبوں سے علاج کرایا مگر کوئی افادہ نہیں ہوا۔ آخر لڑکی کے باپ، مرزا مغل بیگ اپنے پیر و مرشد حضرت سید حبیب شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔

”طیب تو دوائیں دیتے دیتے عاجز آ گئے۔ اب آپ ہی بچی پر دم فرمادیں کہ اسے اس اذیت ناک بیماری سے نجات حاصل ہو۔“

حضرت سید حبیب شاہ اس وقت خود بھی بہت زیادہ علیل تھے، اس لئے آپ نے اپنے مرید مرزا مغل بیگ کے گھر جانے سے معذرت کر لی۔

بیٹی کی محبت نے مرزا مغل بیگ کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ پیر و مرشد کی بیماری کے باوجود وہ یہی اصرار کرتا رہا۔ ”شیخ! آپ کے جائے بغیر یہ بیماری نہیں ٹلے گی۔“

آخر سید حبیب شاہ نے اپنے جواں سال بیٹے، حضرت شاہ عبداللطیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اگر تم بھند ہو تو میرے بیٹے کو لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ برکت عطا کرے گا۔“

مرزا مغل بیگ، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو ساتھ لے کر گھر پہنچا۔ پھر شاہ صاحب کو زنان خانے میں طلب کیا گیا۔

اہل خانہ میں سے کسی کو خبر نہیں تھی کہ ایک بہت بڑا حادثہ ان کا انتظار کر رہا ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف مریضہ کو دیکھنے کے لئے اس کے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں لڑکی کی والدہ اور خاندان کی دیگر خواتین موجود تھیں۔ حضرت شاہ عبداللطیف نے غیر ارادی طور پر لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتے ہی رہ گئے۔ اکثر مومنین نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف پہلی ہی نظر میں مرزا مغل بیگ کی بیٹی پر عاشق ہو گئے۔ آپ نے مریضہ پر دم کرنے کے بجائے اس کی چھٹکی پکڑ لی اور بے اختیار فرمایا۔

”جس کی انگلی، سید سے مل گئی، اسے کوئی نقصان نہیں ہو گا۔“

چونکہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی دارفانی کے عالم میں تھے، اس لئے خود پر قابو نہ رکھ سکے..... اور آپ نے با آواز بلند اپنے دل کی بات کہہ دی۔

مرزا مغل بیگ اور خاندان کی دوسری خواتین نے شاہ صاحب کے الفاظ سنے..... اور سب کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں۔

”مخدوم زادے! اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔“ مرزا مغل بیگ نے کسی تکلف کے بغیر کہا اور پیر و مرشد سے

نام نہتوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نہایت شکستہ حالت میں اس مکان سے نکل آئے، جس کے رہنے والے روحانی انبار سے ان کے خدمت گار تھے۔ مگر جب غصہ جاگا تو ایک مغل زادے نے سب کے سامنے ایک سید زادے کی غیر کردی۔ جو ہر لحاظ سے لڑکی کے والدین کے لئے نہایت معزز و محترم تھا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے اکثر سوانح نگاروں نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرزا مغل بیگ اور ان کے خاندان والوں نے شاہ صاحبؒ کے الفاظ کو اپنی سخت توہین سے تعبیر کیا۔ اور پھر ان کے درپے ایذا ہو گئے۔ مگر حضرت شاہ صاحبؒ کے اس جملے پر تنجیدگی سے غور کیا جائے تو اس میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی خاندانی طور پر سید عالی نسب تھے۔ تمام مسلمان اپنے آقا سرور کو مین صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نسبت خاص پر ہمیشہ نازاں رہے ہیں۔ اگر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جذب و کیف کے عالم میں یہ بات کہہ دی تھی کہ جس کی انگلی، سید سے مل گئی، اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا، تو کون سی قیامت نازل ہو گئی تھی۔ یہ ایک نہایت شائستہ اور لطیف بات تھی۔ تاریخ تصوف کے علاوہ عام دنیا میں بھی ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی کہ کسی شخص نے فخر موجودات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے کے باعث، سید زادے کا احترام کیا اور اسے اپنی دلی مراد حاصل ہو گئی۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

مرزا مغل بیگ پر دو طرح سے حضرت شاہ صاحبؒ کا احترام لازم تھا۔ ایک یہ کہ شاہ صاحبؒ نجیب الطرفین سید تھے۔ دوسرے یہ کہ مخدوم زادے تھے۔ بالفرض ان سے ایک ایسی غلطی سرزد ہو گئی تھی، جو مرزا مغل بیگ کو سخت گراں گزری تھی لیکن احترام مرشد کا تقاضا تھا کہ ارغون قبیلے کا سردار یا تو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے الفاظ کو نظر انداز کر دیتا یا پھر زیادہ سے زیادہ پیر و مرشد کے سامنے مخدوم زادے کی شکایت کر دیتا۔ پھر بھی اگر خدا نخواستہ حضرت شاہ لطیفؒ اپنے عشق کے مظاہرے سے باز نہ آتے تو مرزا مغل بیگ کو حق حاصل تھا کہ وہ ان کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرتا۔

کسی سوانح نگار نے اس واقعے کا تفصیلی ذکر تو نہیں کیا ہے..... مگر تمام معتبر روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا مغل بیگ نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اور آپ کے پورے خاندان کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ یہاں تک کہ سید حبیب شاہؒ کو کوٹری چھوڑ کر بہت دور جانا پڑا کہ ارغون قبیلے کی دراز دستی سے محفوظ رہ سکیں۔

اس واقعے کا ایک انتہائی پیچیدہ اور ناقابل فہم پہلو یہ ہے کہ جو کچھ پیش آیا، وہ مرزا مغل بیگ کے گھر کی چار دیواری میں وقوع پذیر ہوا۔ پھر یہ راز طشت از بام کس طرح ہوا؟ اور ایک نازک بات، زبان خلق تک کس طرح پہنچی؟ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ سید حبیب شاہؒ کے کوٹری چھوڑنے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ارغون قبیلہ کھلی دشمنی پر اُتر آیا تھا اور خاندان سادات سے تعلق رکھنے والوں کو اپنی جانوں کے زیاں کا خطرہ لاحق ہو چلا تھا۔ اسی لئے سب لوگوں کو ترک سکونت کرنی پڑی۔

اگر اس صورت حال پر غور کیا جائے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بات لڑکی کو دیکھنے اور مخصوص الفاظ ادا کرنے تک محدود نہیں رہی تھی..... بلکہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا عشق، جنون کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہے۔

ایک اور روایت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عشق کی چوٹ کھانے کے بعد حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی بے حال ہو گئے تھے۔ اپنے اس زخم کا مرہم تلاش کرنے کے لئے شاہ صاحبؒ کئی بار مرزا مغل بیگ کے دروازے پر سوالی بن کر

حاضر ہوئے تھے اور سعیدہ کے لئے شادی کا پیغام دیا تھا۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سید حبیب شاہ نے بھی اپنے مرید مرزا مغل بیگ سے اس رشتے کی بات کی ہوگی..... لیکن ارغون قبیلے کے سردار نے کسی کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ شاہ صاحب کے دیگر عزیز و اقارب نے مرزا مغل بیگ کو بہت سمجھایا، مگر اس کی آنکھوں پر پردے اور دل پر تالے پڑ گئے تھے۔ خاندان سادات سے یہ رشتہ اس کے لئے بڑا اعزاز و شرف تھا..... لیکن مرزا مغل بیگ، دوستی خریدنے کے بجائے دشمنی پر اتر آیا تھا۔ بالآخر سید حبیب شاہ کو بیٹے کی خاطر در بدر ہونا پڑا۔

اس روایت کو مرزا قلیج بیگ آڈوانی اور دیگر سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ گردش زمانہ کے سبب ان روایتوں میں مبالغے اور افراط و تفریط کا عنصر ضرور شامل ہوا ہوگا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو عشق ہوا تھا اور آپ فراقِ یار میں شدید اذیت و کرب بے گزرے تھے۔ جب شاہ صاحب کی شکستگی دیکھ کر دوست احباب ”خیالِ یار“ سے باز رہنے کی تلقین کرتے تو یہ جاننا ضروری ہے اختیار پکارا اٹھتا۔

”ہر گھڑی شعوری کا دھوٹوں کے باوجود، میں ایک لمحے کے لئے بھی دوست کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتا۔ جتنا باز رہنے کی کوشش کرتا ہوں، اتنی ہی شدت سے زخمِ رسنے لگتا ہے۔“ (ترجمہ)

اگرچہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے کوچہ یار سے نکلنے کے بعد دنیا کی ہر شے کو ترک کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی انہیں یقین تھا کہ وہ ایک دن اپنے محبوب کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ شاہ صاحب اپنے ان جذبات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں۔

”اُزل و آخر میری کاوشیں، محبوب کے لئے ہیں۔ اے خدا! ایک محنت کش کی محنت کو رازِ گاہاں نہ جانے دینا اور میرے اوپر یہ کرم کر دینا کہ مجھے اپنی زندگی میں دیدارِ یار نصیب ہو جائے۔“ (ترجمہ)

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نہ صرف صوفیاء کی اولاد تھے بلکہ بنیادی اور فطری طور پر خود بھی صوفی تھے..... لیکن گردشِ وقت نے انہیں ”عشقِ مجازی“ کے گرداب تک پہنچا دیا تھا۔ پھر غم و اندوہ کی سرکش موجیں کبھی انہیں سمندر کی تہ میں لے جاتیں اور دنیا والے سمجھنے لگتے کہ شاہ صاحب ”غرق“ ہو گئے..... مگر پھر دیکھنے والے دیکھتے کہ وہ عاشقِ جانناز، ڈوب کر ابھر آیا ہے اور سر ساحل تڑپ رہا ہے۔

”غم و اندوہ! تم میرے محبوب کی طرح مجھے داغِ فراق نہ دینا..... میں اپنے محبوب کی عدم موجودگی میں تم ہی سے ہم کلام ہوتا ہوں۔“ (ترجمہ)

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے فراقِ یار کی اذیتوں کو عجب عجیب انداز سے اور لہجہ بدل بدل کر بیان کیا ہے۔ ”اے غم! مجھے اپنی لذتوں سے محروم نہ کرنا کہ ابھی میرا دل بھر نہیں ہے..... اے درد! مجھ سے جدا نہ ہونا اور نہ کسی لمحے مجھے چھوڑنا..... بے شک! وصالِ یار کے بعد تم جدا ہو جانا۔“ (ترجمہ)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔ ”گریہ و زاری مجھے سکون بخشنے ہیں..... قہقہہ میرا دل جلاتا ہے..... میری آنکھوں کو سکون تو دیدارِ یار ہی بخش سکتا ہے۔“ (ترجمہ)

پھر یہ وحشتِ دل اس قدر بڑھی کہ حضرت شاہ عبداللطیف ”گھر چھوڑ کر جنگلوں اور صحراؤں میں نکل گئے۔ اسی عشق کے حوالے سے ایک مشہور روایت ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی یادِ یار میں غرقِ ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھے تھے۔ لوگ آتے رہے، جاتے رہے۔ ادھر سے گزرنے والے جانور شور مچاتے مگر اس جاں سوختہ عشق کو کسی چیز کا ہوش ہی نہیں رہا۔ پھر شاہ صاحب کو اسی بے خودی کے عالم میں تین دن گزر گئے۔ صحرا کی تند و تیز ہوائیں

بہ اڑا کر لاتی رہیں اور ایک عاشق زار کے چہرے اور لباس کو آلودہ کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ الطیف بھٹائی کے گرد ریت کا ڈھیر جمع ہو گیا اور شاہ صاحب اس ریت میں دفن سے ہو گئے۔ بس آپ کے ان کا ایک ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔

انفاقا اھر سے اسی گڈریے کا ذکر ہوا جو تین دن پہلے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو یہاں بیٹھے ہوئے دیکھ کر یاد حواسی کے عالم میں بھاگتا ہوا سید حبیب شاہ کے پاس پہنچا اور انہیں اس واقعے کی اطلاع دی۔

سید حبیب شاہ بیٹے کی گمشدگی سے پہلے ہی پریشان تھے..... اور انہیں قرب و جوار میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک پڑے۔ گڈریے کی زبانی اطلاع پا کر سید حبیب شاہ اس جگہ پہنچے اور اپنی آنکھوں سے یہ جانگداز منظر دیکھا کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی ریت کے اس ٹیلے کا ایک حصہ بن چکے تھے۔

گر بھٹائی، مرزا قلیچ بیک اور آڈوانی کی روایتوں کے مطابق سید حبیب شاہ نے خیال کیا کہ ان کا بیٹا مرچکا ہو انہم ایک اُمید پر بے قرار باپ نے بے ہوش بیٹے کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا۔
”اتنی ہوا چلی کہ نشانات بھی مٹ چکے ہیں۔“ (ترجمہ)

غم زدہ باپ کی آواز سن کر دفعۃً حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ہوش میں آ گئے اور آپ نے نہایت غم ناک اور ذہنیں لہجے میں کہا۔

”لیکن محبوب کے وصال کی اُمید پر سانس چل رہی ہے۔“

بعض محققین نے اس روایت کو مبالغہ آمیز قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو مکمل تصویر درو بہنا کر پیش آنے والوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ریت کے اندر دفن ہو جانے کے بعد کوئی انسان کس طرح زندہ رہ سکتا ہے؟ اصل اسی جوش عقیدت اور مبالغہ آمیزی نے تاریخ کے خدو خال بگاڑے ہیں اور حقائق کو مسخ کیا ہے۔ بات اتنی سچی کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ساری دنیا سے کنارہ کش ہو کر صحرا میں ایک ریت کے ٹیلے پر جا بیٹھے۔ یاد یار کا ملہ چھڑا تو اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو گئے۔ دوست کے تصور میں ایسے کھوئے کہ تین دن تک اُٹھ نہیں پائے۔ لعل بھوک اور پیاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کمزوری کے باعث بے ہوش ہو گئے۔ صحرا میں ہواؤں کا کام ہی اڑانا ہے۔ سو بہت سی ریت اس بے ہوش عاشق پر بھی جمع ہو گئی۔

رہا اس کا سوال کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی والد محترم کی آواز سنتے ہی ہوش میں کیسے آ گئے؟ تو قارئین کو یہ بتانا چاہئے کہ سید حبیب شاہ ایک صاحب کرامت بزرگ تھے۔ ایک صوفی کی روحانی طاقت..... اور ایک بابت محبت کرنے والے باپ کی پُر اثر آواز..... دونوں طاقتوں نے مل کر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی پر چھائی ہلکے خودی کے اثرات کو زائل کر دیا اور وہ ہوش میں آ گئے۔



اس واقعے کے بعد وحشتِ دل اور بڑھی۔ پہلے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، کوچہ یار سے نکلے، پھر شہر بدر آئے..... اور آخر میں آپ نے وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا۔ یہاں سے حضرت شاہ کے ایک نئے سفر کا آغاز ہوا، جس نے آپ کی زندگی اور شاعری پر نہ مٹنے والے اثرات چھوڑے۔ اس وقت شاہ صاحب کی عمر مبارک بیس سال تھی۔ انہماکِ شباب کا زمانہ۔

شہوانی کے خیال کے مطابق حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی گھر کو خیر باد کہہ کر شاہی سڑک (ہال روڈ) کے ذریعے بدر آباد پہنچے۔ اس کے بعد ایک انتہائی دُشوار گزار سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اُونچے نیچے پہاڑی راستے..... بے آب و

گیاہ ریگستان..... راستے میں بچھے ہوئے نوکیلے پتھر اور کانٹے۔ ان نختیوں، مصیبتوں اور دشواریوں کے واضح آثار شاہ صاحب کے کلام میں نظر آتے ہیں۔

راستے میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ”ہیلا یا“ کی پہاڑیوں اور کینچھر جمیل سے گزرے اور جمیل پر ایک گل کے آثار دیکھے۔ ”نوری“ اور سندھ کے سمو حکمران ”جام تماچی“ کی عشقیہ داستان کا تعلق اسی محل سے ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے مشاہدات کو اس طرح شاعری کا دلکش پیرہن پہنایا ہے۔

”کیکر (بول) کے شگوفوں کے نیچے پانی بہہ رہا ہے..... دریا کے کنارے کنول تیر رہے ہیں..... موسم بہار میں کینچھر جمیل شیریں اور معطر ہواؤں سے لبریز ہوتی ہے..... میرے پہلو میں میری محبوبہ ہے..... میری بے شمار تمنائیں بر آئیں اور کوئی بھی پوری ہوئے بغیر نہیں رہی۔“ (ترجمہ)

”نوری“ کی شکل میں شاہ صاحب کو اپنی محبوبہ یاد آئی..... اور پھر آپ اسی کی یادوں کے سہارے یہ دشوار گزار سفر طے کرتے ہوئے کراچی کی طرف بڑھے۔ راستے میں شاہ صاحب نے ”بھنجھور“ دیکھا۔ یہ شہراب کھنڈر بن گیا ہے مگر ”سسی پتوں“ کی عشقیہ داستان کے حوالے سے خاص شہرت رکھتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب بھی سسی کی طرح مضطرب الحال تھے اور اپنے محبوب کے متلاشی..... سسی کو اپنے جذبہ عشق کی تکمیل کے لئے بڑے بڑے ریگستانوں اور پہاڑوں کو سر کرنا پڑا تھا۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اپنی اہلہ پائی کے ساتھ اسی مرحلے سے گزر رہے تھے۔ اپنے ایک شعر میں سسی کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔

”اے خاتون! بھنجھور میں ہرگز قیام نہ کر۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے آواز دے اور جستجو کر..... پہاڑ تجھے اُونٹوں کے بارے میں بتائیں گے۔ سسی! جا اور پتوں کو تلاش کر۔ چاہے تجھے سر کے بل جانا پڑے۔“

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ایک اور مقام پر سسی کے ذوقِ طلب اور شوقِ جستجو کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”کوہستانی سفر کی صعوبتوں اور اذیتوں نے سسی کو بہت دکھ دیئے..... لیکن اس کے باوجود وہ اپنے محبوب کی جانب رواں دواں ہے۔ ریگستانوں نے سسی کو زیورات اور ریشمی کپڑوں سے محروم کر دیا ہے..... اس کو اس کا محبوب، دکھوں کی بدولت ملا ہے..... نہ کہ سکھوں کی بدولت۔“ (ترجمہ)

سسی کے دکھ بیان کرتے وقت حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو اپنے رنج و الم بھی یاد آتے ہیں۔ جس طرح عشق کے سفر میں سسی زیورات اور ریشمی لباسوں سے محروم ہو گئی تھی۔ اسی طرح شاہ صاحب کا پیرہن بھی آزمائش کے کانٹوں میں الجھ کر تار تار ہو گیا تھا۔

بعض روایتوں کے مطابق حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اس طویل سفر میں ”ملیر“ اور ”قمر“ سے بھی گزرے تھے۔ ”عمر ماروی“ کی مشہور عشقیہ داستان کا تعلق ان ہی علاقوں سے ہے۔ شاہ صاحب اپنی زمین اور مٹی سے بے پناہ محبت کرنے والے انسان تھے۔ چنانچہ آپ اپنے ان جذبات کو ”ماروی“ کی زبان سے اس طرح ادا کراتے ہیں۔

”اگر میں اپنے وطن کی محبت میں جان دے دوں تو میرے جسم کو میری جنم بھومی (مارو وطن) قمر لے جانا تاکہ کم سے کم میرا مردہ جسم قمر کی مٹی میں دفن ہو جائے..... اور اگر میری لاش ملیر لے جائی جائے تو میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں گی۔“



تمام محققین اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی تین سال تک ہندو جویوں کی محبت میں رہے۔ یہ وہی زمانہ ہے، جب شاہ صاحب ”مرزا مغل بیگ کی بیٹی کے عشق میں مبتلا ہوئے اور پھر سوزِ عشق سے بے

ار آپ نے طویل عرصے تک صحرا نوردی کی۔

صحرا نوردی کی تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بیس سال کی عمر میں ایک محروم بالاطرح خفیہ طور پر کوٹری کو خیر باد کہا۔ پھر آپ ”ہالہ“ کے ساتھ ساتھ حیدر آباد سندھ کی طرف بڑھے۔ یہاں بالاطلس پر ”گنجو کٹر“ ہے۔ اور اسی پہاڑ کے قریب ”کالی دیوی“ کا مندر تھا۔ یہی وہ مرکزی مقام تھا، جہاں اس کے جوگی جمع ہوتے تھے..... اور پھر ”ہنگلاج“ کے سفر کی تیاریاں کرتے تھے۔

کالی کے مندر میں، جن جوگیوں سے ملاقات ہوئی تھی، ان ہی کے ہمراہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے یہ ہزار اختیار کیا۔ تمام معتبر روایتوں کے مطابق اس سفر میں شاہ صاحب نے جوگیوں کا لباس پہنا، جو ہندوؤں بلحاظ یہ ایک نارنجی (گیروا) رنگ کا لباس تھا، جو ہندو سادھوؤں اور جگوں کی خاص پہچان ہے۔ اس سفر میں صاحب نے جو لباس زیب تن کیا تھا، وہ آج بھی ”بھٹ شاہ“ میں موجود ہے۔

اگرچہ کسی تذکرہ نگار نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے اس لباس کے پہننے کی وضاحت نہیں کی لیکن قیاس بالمشابہہ کہ آپ اپنے لباس میں جوگیوں کے ساتھ یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ شاہ صاحب بہت قریب سے ہندو جوگیوں کی مذہبی رسموں کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے، اسی لئے آپ نے لباس جیسے کپڑے پہنے تاکہ کسی رکاوٹ کے بغیر مندروں اور ہندوؤں کے دوسرے متبرک مقامات میں داخل ہو سکیں۔ بالآخر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی سفر کے لئے ضروری اشیاء لے کر جوگیوں کے ساتھ ہنگلاج کی طرف لے گئے۔

شاہ صاحب نے اپنی شاعری میں کئی جگہ ”گنجو کٹر“ پہاڑی کے حوالے دیئے ہیں۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔
”تمہارے ”گنجو کٹر“ پر آنے کی کیا وجہ ہے؟“

پہاڑوں کا نظارہ، آدمی کو بے چین کر دیتا ہے۔ معمولی پہاڑیوں کے نزدیک تم (اپنی منزل کو) ہرگز تلاش نہ کر سکتے..... دنیا کی تمام چیزوں کو حرام سمجھ کر اپنے آپ کو جلا ڈالو گے..... تب ہی تم کھا ہوڑی ہو سکتے ہو۔“ (ترجمہ)
”کھا ہوڑی“ جوگیوں کی ایک خاص قسم ہوتی ہے، جو کبھی صبح و سالم کپڑا استعمال نہیں کرتے۔

ہندو زائرین کا یہ راستہ، مکران کے ساحل سے کراچی ہوتا ہوا میانہ اور ہنگلاج جاتا ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس طویل راستے کا بیشتر حصہ پیدل چل کر طے کیا ہوگا۔ اس سے سفر کی دشواریوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے کلام میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

”وہ اپنے ساتھ گھوڑے اور اونٹ نہیں لے گئے۔ اور دُور دراز علاقوں میں چلے گئے۔“ ”ڈو تھی“ ریمکس میں بڑا حاصل کرنے کے لئے) جنگلی پودے تلاش کر رہے ہیں..... کھا ہوڑی کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے جسم پر ثابت پڑائیں ڈالتے۔“

ہندو زائرین نے مختلف مقامات پر نذرانے چڑھائے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی خاموشی کے ساتھ ان ہول کا مشاہدہ کرتے رہے۔ پھر یہ قافلہ ایک تیرتھ (ہندوؤں کے مقام مقدس) پر پہنچا۔ اس تیرتھ کی خاص بات یہ ہے کہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک سرسبز و شاداب وادی میں واقع ہے۔ گہرے نشیب میں ”نانی“ کی آرام گاہ ہے۔ یہ ایک مٹی کا قلعہ ہے، جس میں لکڑی کے بنیاد دروازے لگے ہیں۔ ایک میڑی نشیب میں نیم دائرے کی شکل والی ہوئی شکاف تک آتی ہے۔ یہ شکاف اس قدر تنگ ہے کہ زائرین زمین پر لیٹ کر ریختے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

اس شکاف سے ایک عجیب روایت منسوب ہے کہ صرف نیک لوگ ہی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی گناہ گار اندر جانے کی کوشش کرے گا تو ناکام ہو جائے گا..... یعنی شکاف اور سمٹ جائے گا اور اس کی ٹنگی پہلے سے زیادہ بڑھ جائے گی۔

کسی مادی شے سے وابستہ اس قسم کی روایتیں ہندوؤں ہی میں نہیں، مسلمانوں میں بھی عام ہیں۔ مثالی طور پر حضرت نظام الدین اولیاء کے آیاؤ اجداد کی سرزمین، بدایوں میں ایک گناہ بزرگ کا مزار ہے۔ جہاں مزار سے کچھ فاصلے پر منتظمین نے ایک بھاری پتھر رکھ دیا ہے، جو چکی کے پاٹ کی طرح گول ہے۔ اور جس کے درمیان میں ایک بڑا سوراخ ہے۔ جب زائرین اس مزار پر حاضر ہوتے ہیں تو ایک گائیڈ (منتظم) انہیں بتاتا ہے کہ جو شخص اس گول پتھر کو اپنی گردن میں ڈال کر آسانی سے اٹھا لے گا، اس کی مراد فوراً پوری ہو جائے گی۔ جو دشواری سے اٹھائے گا، وہ بہت دیر میں اپنی مراد کو پہنچے گا..... اور جو اس پتھر کو اٹھانے میں ناکام ہو جائے، وہ نامراد رہے گا۔ میں نے بذات خود اس قسم کے مناظر کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو لوگ بظاہر تومند اور طاقتور نظر آتے تھے، وہ اس چکی کے پاٹ نما پتھر کو اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود نہ اٹھا سکے اور پسینے پسینے ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ مگر بعض انسان جو بظاہر بہت لاغر و نحیف نظر آتے تھے، انہوں نے بڑی آسانی سے پتھر کو اٹھا لیا۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کیا راز ہے۔

اور جہاں تک اس تیرتھ کے شکاف کا سوال ہے تو اس سے وابستہ روایت انتہائی مہمل اور لغو ہے۔ کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ یا مقام مقدس ہو، وہاں لوگوں کا اجتماع اسی لئے ہوتا ہے کہ تمام عابد و زاہد اور گناہ گار، فیض و برکات روحانی حاصل کر سکیں۔ دنیا کا کوئی مذہبی اجتماع، حج بیت اللہ کے اجتماع سے بڑا نہیں ہوتا۔ جب اللہ کے گھر میں ہر نیک اور بد داخل ہو سکتا ہے تو ”نانی“ کی آرام گاہ کی کیا حیثیت ہے؟

کسی تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ اس ”تیرتھ یا ترا“ میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی شکاف کے اندر داخل ہوئے یا نہیں؟ مگر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب اس شکاف سے ضرور گزرے ہوں گے۔ ایک جگہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں۔

”کن کٹ، کا پٹ، کا پڑی، کنوٹیا، کن دھار اور بابو اپنی چیزیں چھوڑ کر ہنگراج جا رہے ہیں جو کوئی چیز بھی قبول نہیں کرتے۔ چلو چل کر ان کا مسکن دیکھیں۔“ (ترجمہ)

کن کٹ، کا پٹ، اور کا پڑی وغیرہ ہندو جوگیوں کی قسمیں ہیں۔



”ہنگراج“ سے واپسی پر زائرین، مہادیو کے مندر پر قیام کرتے تھے۔ روایت ہے کہ مہادیو، ہنگراج کی دیوی کا بھائی تھا۔ یہ ”کوٹسوار“ میں ایک قدیم اور مشہور تیرتھ تھا۔ وہاں سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ”نکر ٹھٹھہ“ تشریف لے گئے۔ یہ ایک قدیم قصبہ ہے۔ ”نکر ٹھٹھہ“ گورکھ ناتھ، جوگیوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ ہم نے اپنے گزشتہ مضمون میں ”حضرت شاہ حسین لاہوریؒ“ کے حوالے سے جوگی گورکھ ناتھ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہ جوگی پہلے لاہور کے ایک مضافاتی علاقے میں رہتا تھا۔ اور اپنے جیلوں کے ساتھ ایک طویل و عریض مکان کی چار دیواری میں ”تپتیا“ (ریاضت) کیا کرتا تھا۔ جب دریائے راوی کے سیلاب نے حضرت شاہ حسینؒ کے مزار کو نقصان پہنچایا تو آپ کی وصیت کے مطابق جسد مبارک کی تدفین اسی جوگی گورکھ ناتھ کے ”منہ“ (قیام گاہ) میں ہوئی تھی۔ حضرت شاہ حسینؒ کی کرامت دیکھ کر جوگی گورکھ ناتھ کا ایک چلا مسلمان ہو گیا تھا

ابن حضرت شاہ حسینؒ کے خلیفہ کی حیثیت سے دنیا سے رخصت ہوا۔
نعت شاہ حسینؒ کی تدفین کے بعد جوگی گورکھ ناتھ اپنے چیلوں کو لے کر سندھ کی طرف چلا گیا تھا۔ اور پھر مگر
ابن اس نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ہنگراج جاتے ہوئے ہندو زائرین، ٹھٹھہ سے دو طرح کی مالائیں
لاتے تھے۔ یہ مالائیں (تیمیں) مقامی لوگ سخت پیلے چوٹے کے پتھر سے بناتے تھے۔ ہنگراج پہنچ کر زائرین
ادیوی کے مجسمے پر چڑھاتے تھے۔ پھر اسے اتار کر برکت کے لئے اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ واپسی پر مگر ٹھٹھہ
ناپوری دیوی کے مندر پہنچ کر دوسری مالا چڑھاتے تھے اور اسے بھی اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔

نعت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنے کلام میں ہندوؤں کے سب سے اہم تیرتھ ”کاشی“ کا بھی ذکر کیا ہے۔
زے متعلق محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت شاہ لطیفؒ ”کاشی یاترا“ پر نہیں
گئے۔ اس کے برعکس کچھ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، گورکھ ناتھ کے ساتھ
لہاں بھی گئے تھے۔ اور آپ نے اہل ہندو کے مختلف بتوں کو دیکھنے کے ساتھ ان کی مذہبی رسوم کا بھی مشاہدہ

ابن محققین کا دعویٰ ہے کہ اس طویل ”یاترا“ (سفر) میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے صرف گیروا
نارنگ کا لباس پہنا تھا۔ یہ ہندو جوگیوں اور سنیا سیوں کے لئے مخصوص تھا۔ اور یہ روپ بھی اس لئے دھارا
نا کہ تیرتھوں اور مندروں کے محافظ پجاری، شاہ صاحبؒ کو بھی اپنا ہم مذہب سمجھیں۔ اور بے تکلفانہ انداز میں
اپنی عبادت گاہوں کے اندر جانے دیں۔ اگر ہندو مذہب کے نگہبانوں کو ذرا بھی شک ہو جاتا کہ نوجوان سادھو
ن میں سندھ کا ایک سید زادہ ہے تو وہ شاہ صاحبؒ کو ہرگز اپنی عبادت گاہوں میں داخل نہ ہونے دیتے۔
بلکہ راز فاش ہو جانے کی صورت میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔
کچھ محققین کا خیال ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے جوگیوں کا لباس پہننے کے ساتھ ساتھ، جوگیوں کی
کی ادا کی تھیں۔

ن طویل بحث سے قطع نظر، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ مسلسل تین سال تک جوگیوں کے ہمراہ رہے اور ان
نوں (متبرک مقامات) کی سیر کرتے رہے۔ واضح رہے کہ جوگیوں کے ساتھ سفر کرنے کا واقعہ اس وقت
اہ جب حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ صرف بیس سال کے تھے۔ یہ انسانی زندگی کا سب سے نازک دور ہوتا
نن نا پختہ اور جسم میں دوڑنے والے خون کی گردش تیز تر ہوتی ہے۔ اگر عمر کے اس نازک ترین دور میں انسانی
ن ان کی حادثے سے متاثر ہو جائیں تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

نعت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پر سندھ کے بڑے بڑے دانشوروں نے تحقیق کی ہے۔ اور یہ تحقیق ابھی تک
ہے۔ مگر کسی دانشور یا اسکالر نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ”تیرتھ یاترا“ کی بنیادی وجہ بیان نہیں کی ہے۔
شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے حالات زندگی پڑھتے ہوئے ایک عام انسان کے ذہن میں بھی یہ سوال اٹھتا ہے۔
نعت شاہ صاحبؒ، خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بزرگ نہ صرف عالم و فاضل تھے، بلکہ
پنے وقت میں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہ چکے تھے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے والد محترم،
سید حبیب شاہؒ ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ پھر آخر وہ کون سی مجبوری تھی کہ شاہ صاحبؒ، ہندو
کے ساتھ ہو گئے۔ اور تین سال تک ناقابل بیان تکالیف برداشت کرتے رہے۔ خارزاروں، بیابانوں اور
بانوں سے گزرے۔ بھوکے پیاسے رہے۔ یہاں تک کہ کپڑے بھی تار تار ہو گئے۔ آخر یہ کیسا ذوق طلب

تھا، جو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو بت پرستوں کے ساتھ اڑائے لئے جا رہا تھا؟ آخر شاہ صاحبؒ کے آبائی مذہب اسلام میں ایسی کون سی کمی رہ گئی تھی کہ انہیں اپنا مشاہدہ وسیع تر کرنے کے لئے ”دیوتاؤں“ کے درشن کرنے پڑے؟

یہی وہ سوالات ہیں، جو ایک معمولی علم رکھنے والے مسلمان کو بھی ذہنی انتشار میں مبتلا کرتے ہیں۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی پر تحقیق کرنے والے تمام اہل علم نے اس ”تیرتھ یاترا“ کی ایک ہی وجہ بیان کی ہے کہ آپ، جو گیوں کے ذریعے اپنی آنکھوں کو مزید کشادگی اور علم و مشاہدے کو زیادہ وسعت دینا چاہتے تھے۔ ہمارے خیال میں ایک سید زادے کے حوالے سے ”تیرتھ یاترا“ کی یہ توجیہ مناسب نہیں۔

ہم گزشتہ اوراق میں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو ارغون قبیلے کے سردار، مرزا مغل بیگ کی حسین و جمیل بیٹی، سعیدہ سے والہانہ عشق ہو گیا تھا۔ پھر اس کی قربت حاصل کرنے کے لئے شاہ صاحبؒ نے اپنے والدین کے ذریعے شادی کا پیغام بھی بھیجا تھا، جسے مرزا مغل بیگ نے مسترد کر دیا تھا۔ اور انشاء خاندان سادات کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ نتیجتاً حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندان والوں نے ترک سکونت کی۔ پھر ایک دن حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی خفیہ طور پر رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت آپ کی ظاہری حالت نہایت شکستہ تھی۔ تذکرہ نگاروں کے بقول، محبوب کی جدائی کے اثر سے پیدا ہونے والے آتش فراق نے شاہ صاحبؒ کے سینے کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ پھر یہی سوزش مسلسل انہیں دشت و بیاباں کی جانب لے گئی۔ اسی وحشت و اضطراب کے عالم میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی نظر ان خانماں برباد جو گیوں پر پڑی، جو خود بھی سر سے پاؤں تک تصویر درد بنے ہوئے تھے۔ دیران چہرے، سوکھے ہوئے جسم، برہنہ پاؤں، بچھے ہوئے کپڑے۔ حضرت شاہ صاحبؒ اپنی نوعمری کے باعث جو گیوں کی جماعت کو بھی سوختہ جاں عاشقوں کا گروہ سمجھے۔ اور حقیقتاً جوگی، عاشق ہی ہوتے ہیں جو اپنے ”مطلوب و مقصود“ کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جان ناتواں پر سخت آزار کھینچتے ہیں۔ چونکہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، زندگی سے بیزار ہو چکے تھے، اس لئے جب آپ نے کچھ ”تارک الدنیا“ لوگوں کو دیکھا تو اپنا غم بھلانے کے لئے ان ہی کے ساتھ ہو لئے۔

ہمارے نزدیک بس یہی ایک وجہ ہے کہ جس کے زیر اثر، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جو گیوں کے ساتھ اپنی زندگی کا خطرناک ترین سفر اختیار کیا۔ اور جن اہل تحقیق نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اپنے علم و مشاہدات کی وسعت کے لئے جو گیوں کے ہم سفر ہوئے، وہ صریحاً غلطی پر ہیں۔ اگر یہ ”تیرتھ یاترا“ پچاس ساٹھ سال کی عمر میں کی جاتی تو ”مشاہدے کی وسعت“ کا جواز تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک بیس سالہ عشق گزیدہ انسان، جو دو سال یار کے لئے تڑپ رہا تھا، اسے ان جاگداز لحوں میں علم اور مشاہدے کی توسیع کا ہوش ہی کہاں تھا؟ وہ تو خیال یار سے پیچھا پھرانے کے لئے ترک دنیا کی راہیں تلاش کر رہا تھا۔ اتفاق سے اسے جو گیوں کی جماعت نظر آ گئی۔ جو تارک الدنیا انسانوں کا جیتا جاگتا اور بہترین نمونہ تھا۔

اگر ہمارا یہ اندازہ درست نہیں تو پھر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی حیات مبارکہ کے حوالے سے ایک اور نازک صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اور جو گیوں کے مراسم پہلے سے تھے۔ اور جوگی مختلف مواقع پر ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے مذہب کی برتری و فضیلت بیان کرتے رہتے تھے۔ انجام کار شاہ صاحبؒ کے دل میں ہندوؤں کے تیرتھ اور مندروں کی گھنٹے کا شوق پیدا ہوا اور اپنے اسی تجسس کی بنیاد پر آپ نے یہ

لڑکر اور طویل سفر اختیار کیا۔

”ہندو جوگیوں سے مراسم اور تعلقات“ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ”کتاب حیات“ کا اہم ترین باب ہے۔ اس سلسلے میں مختلف دانش مندوں اور محققوں نے اپنے اپنے نظریات بہت کھل کر پیش کئے ہیں۔ مسلمان عالم، مرزا قلیچ بیگ کا دعویٰ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے صرف مشاہدے کی غرض سے ”مندروں“ کی سیر کی تھی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے اہل ہندو کی مذہبی رسوم کو دیکھ سکیں۔ مرزا قلیچ بیگ کے اس دعوے پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر ہندوانہ رسوم کو دیکھنا ہی مقصود تھا تو یہ کام سندھ، مہاراشٹر، مہاراشٹر میں جانے کے بعد بہت آسانی سے ہو سکتا تھا اور اس کے لئے خطرناک سفر اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جوگیوں کے مختلف فرقوں سے زبانی بات کی جاسکتی تھی۔

اسی حوالے سے یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، جوگیوں کا لباس پہن کر تیرتھوں اور مندروں میں کیوں داخل ہوئے؟ لباس کی اس تبدیلی سے تو عام ہندو زائرین کو یہی تاثر ملتا تھا کہ نارنجی کپڑوں پہنانے والا سید زادہ نہیں، کوئی نوجوان برہمن ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تبدیلی لباس میں کیا مصلحت تھی، اس پر کوئی تارخ روشنی نہیں ڈالتی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا زمانہ تو بہت بعد کا زمانہ ہے۔ آٹھ سو سال پہلے ہندوستان آنے والے مسلمان صوفیاء اہل ہندوؤں کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کی مذہبی رسمیں دیکھا کرتے تھے۔ اور پھر کسی تکلف کے بغیر مندروں کے بڑے پجاریوں اور ہندو دھرم کے پیشواؤں کو اسلام کی دعوت پیش کیا کرتے تھے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے کسی مسلمان صوفی کو لباس بدلنے اور خود کو ہندوؤں کے ہم رنگ بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پھر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے یہ روش کیوں اختیار کی؟ یہ سوال ڈھائی سو سال سے قائم ہے اور آج بھی تشنہ جواب ہے۔



مرزا قلیچ بیگ کے اس دعوے کو کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی محض مشاہدات کی خاطر ہندوؤں کے تیرتھوں اور مندروں پر تشریف لے گئے تھے، ایک ہندو عالم آجوانی نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ آجوانی لکھتا ہے۔ ”مرزا قلیچ بیگ نے حقیقت کو جان بوجھ کر مخ کیا ہے۔ اہل ہندو میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری اسی لئے مقبول ہے کہ شاہ صاحبؒ پر ”ویدانت“ اور ”یوگی“ فکر و فلسفے کے اثرات نمایاں تھے۔“ آگے چل کر آجوانی تحریر کرتا ہے۔ ”وہ شخص جو ہندو جوگیوں کی گرفت میں رہا ہو، جس نے ان کے ساتھ برسوں باتیں کی ہوں، ہنگولاج، دوکارا اور ہندوؤں کے دوسرے مقامات مقدسہ کی یا تراکی ہو، جس نے کسی معمولی جھگڑے کے بغیر سماع، رقص اور موسیقی کے متعلق اسلامی قوانین کو توڑ ڈالا ہو، جس نے موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی جان دی ہو، اور جو شخص اس متعصبانہ دور میں اس حد تک جاسکتا ہو کہ اس نے متعصب مسلمانوں کے جم غفیر سے ایک غریب ہندو کو بچا لیا ہو، جسے وہ لوگ جبراً مسلمان بنا رہے تھے۔ ایسے شخص کو بمشکل ہی مسلمان تسلیم کیا جاسکتا ہے۔“

ہندو عالم آجوانی کا یہ بیان تعصب اور شدت پسندی کی کھلی مثال ہے۔ وہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو واضح الفاظ میں ”ہندو“ تو قرار نہیں دے سکا، مگر اس کے ساتھ ہی وہ شاہ صاحبؒ کو مسلمان بھی بڑی مشکل سے تسلیم کرتا ہے۔

اپنی دلیل میں رنگ بھرنے کے لئے آجوانی نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حوالے سے دو اہم واقعات پیش کئے ہیں۔

یہ اہم واقعہ 1157ھ میں پیش آیا۔ اس وقت حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی عمر مبارک 55 سال تھی۔ اور پورا ہندوستان، مسلمانوں کے زیر نگیں تھا۔ ایک تذکرہ نگار لکھتا ہے کہ اسلام کی رواداری ان دو آیات مقدسہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

”لا اکراہ فی الدین۔“ (دین میں کوئی جبر نہیں ہے)

”لکم دینکم ولی دین۔“ (تم اپنے دین پر اور ہم اپنے دین پر)

اس کے باوجود مختلف بہانوں سے لوگوں کو تنگ کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ”بنینے“ کا لفظ ہر ہندو کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ حالانکہ ”بنیا“ ہندوؤں کا ایک مخصوص طبقہ ہے، جس کا عام پیشہ دکانداری ہے۔ ایک محفل میں مسلمانوں کے ساتھ کچھ ہندو بھی بیٹھے تھے اور ان ہی میں بال چند نامی ایک ہندو بھی موجود تھا۔ گفتگو کے دوران بال چند نے کہا۔

”میں بنیا نہیں ہوں۔“ اس سے بال چند کی مراد تھی کہ وہ دکانداری نہیں کرتا ہے۔ اس وقت ”بنیوں“ کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

بال چند کی زبان سے یہ اعتراف سن کر مسلمانوں نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔ بال چند نے کسی جھجک بغیر کہا کہ وہ بنیا نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہاں موجود مسلمانوں نے بال چند سے کہا۔ ”جب تو بنیا نہیں ہے تو پھر مسلمان ہے۔ اس لئے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر۔“

مسلمانوں کا مطالبہ سن کر بال چند بدحواس ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگا۔ ”میں مسلمان کس طرح ہو گیا؟“ جواب میں مسلمانوں نے دلیل پیش کی۔ ”جب تو نے بنیا (ہندو) ہونے سے انکار کیا تو پھر مسلمان ہو گیا۔“ بال چند یہ کہنا چاہتا تھا کہ بنیا قوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مگر چونکہ بنینے کا لفظ ہر ہندو کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، اس لئے بال چند کی بات کا غلط مفہوم سمجھا گیا۔ یہاں تک کہ مقامی مسلمان، بال چند کو پکڑ کر اسلامی عدالت میں لے گئے اور قاضی کے سامنے ان کے ایمان اور مذہب کا مقدمہ پیش کر دیا۔

روایت کے مطابق ٹھٹھہ کے مخدوم ضیاء الدین، مخدوم حاجی محمد ہاشم، مفتی شیخ عطاء اللہ، مفتی شیخ عنایت اللہ، قاضی عبدالرحیم اور ”کوٹری“ کے مخدوم محمد عاقل نے مقدمے کی سماعت کی اور پھر بیک زبان و قلم فتویٰ دے دیا۔

”بال چند مانے یا نہ مانے، مگر یہ الفاظ کہنے کے بعد مسلمان ہو چکا۔ آئندہ سے اس پر اسلام کے احکام نافذ ہوں گے۔ انکار کی صورت میں بال چند کو مرتد شمار کیا جائے گا۔ اور مرتد کی سزا قتل ہے۔“

ہمارے نزدیک یہ واقعہ کسی متعصب ہندو کے ذہن کی نہایت جاہلانہ اور مہمل تخلیق ہے تاکہ اسلام کو بدنام کیا جاسکے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلامی فقہ جاننے والے مفتی اور قاضی ایک سرسری اور رکی بات پر بال چند کو مسلمان قرار دے دیتے۔ اس بے ہودہ روایت کے تراشنے والے نے یہ نہیں سوچا کہ صرف ”بنیا“ کہہ دینے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا۔ آج بھی جب کوئی غیر مسلم، اسلام قبول کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنے علاقے کے کسی معتبر عالم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ پھر وہ عالم اس شخص کو کلمہ طیبہ کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے بعد حلقہ اسلام میں داخل ہونے کی خواہش رکھنے والا شخص، حاضرین کی موجودگی میں پورا کلمہ شہادت با آواز بلند ادا کرتا ہے۔ پھر وہ نافر

کے حصار سے نکل کر اہل ایمان میں شامل ہوتا ہے۔ اسی طرح مرتد بھی اس شخص کو کہتے ہیں، جو ایک طویل عرصے تک مسلمان رہنے کے بعد یکایک اسلام سے منحرف ہو جائے۔ بال چند تو مسلمان ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر اس پر "ارتداد" اور قتل کا فتویٰ کیسے لگ گیا۔

ہمارے نزدیک اس واقعے کی حقیقت بس اتنی ہے کہ بال چند کا معاملہ اسلامی عدالت تک نہیں پہنچا تھا۔ جن کم اور بے خبر مسلمانوں نے بال چند کی زبان سے "بنیا" نہ ہونے کا اقرار سنا تھا، خود ان ہی لوگوں نے اس پر اپنی لڑ سے مسلمان ہونے کا فتویٰ عائد کر دیا تھا۔ اور بال چند کو جبراً مسلمان بنا رہے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ جب اس واقعے کی خبر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو ہوئی تو آپ نے مداخلت کر کے بال چند کو ان جاہل مسلمانوں سے ہڑالیا۔

متعصب محقق، آجوانی نے اس واقعے کو نہایت غلط انداز میں پیش کیا۔ اور یہ ثابت کرنے کی احمقانہ کوشش کی کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، ہندو مذہب سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اس لئے آپ نے ہندو، بال چند کو متعصب مسلمانوں کے تشدد سے بچایا۔ اگر آجوانی کو تصوف یا صوفی ازم کا معمولی سا ادراک بھی ہوتا تو وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے اس طرز عمل کو "ہندو نوازی" سے تعبیر نہ کرتا۔ صوفیاء تو نظام جبر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ خواہ جبر کا کار کوئی مسلمان ہو یا ہندو۔

ہندو محقق آجوانی نے اپنے بیان میں شدت پیدا کرنے کے لئے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ذوقِ سماع اور شوقِ موسیقی کو بھی ہدفِ تنقید بناتا ہے کہ انہوں نے کسی جھجک یا تکلف کے بغیر اسلامی قوانین کو توڑ ڈالا تھا۔ اس لئے شاہ صاحبؒ کو بمشکل ہی مسلمان تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

آجوانی کو اسلامی تصوف سے آگہی حاصل نہیں تھی، اس لئے وہ اپنی بے خبری کے باعث حضرت شاہ لطیفؒ پر اہم تراشی کرتا ہے۔ اسلام میں "سماع" ایک متنازع مسئلہ ہے۔ اکابر صوفیاء کی ایک بڑی تعداد نے سازوں کے بغیر "سماع" کو جائز قرار دیا ہے۔ اور بعض نامور صوفیاء نے اس سے مکمل اجتناب کی تلقین کی ہے۔ رہا موسیقی سے رُبت کا معاملہ تو شرعی اعتبار سے اس پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس قدر شدید بھی نہیں کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو اسلام ہی سے خارج کر دیا جائے۔ یہ تعصب کی بدترین مثال ہے۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا انتقال، سماعِ سننے کی حالت میں ہوا تھا۔ آجوانی اس واقعے کو بنیاد بنا کر ثابت کرنا چاہتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ایمان مکمل نہیں تھا۔ ہمارے نزدیک یہ جارحانہ اور غیر منصفانہ تنقید بھی آجوانی کے تعصب اور جہل کی دلیل ہے۔ نہ وہ سماع کا مطلب سمجھتا ہے اور نہ عارفانہ کلام کی حقیقت جانتا ہے۔ جس کلام کو سنتے ہوئے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے، وہ کسی ادا باش اور دنیا پرست شاعر کی سو قیانہ شاعری نہیں تھی۔ وہ کوئی تہمید باری تعالیٰ تھی، کوئی نعتِ مبارک تھی یا کسی صوفی شاعر کا عارفانہ کلام، جسے سنتے ہوئے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی سانسیں، فرشتہ اجل کے سپرد کی تھیں۔

سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ، حضرت سیدنا خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا انتقال بھی سماع کی حالت میں ہوا تھا۔ اس وقت قوال، حضرت شیخ احمد جامؒ کا یہ شعر سنا رہا تھا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را

ہر زماں از غیب جان دیگر است

”جو لوگ تسلیم و رضا کے خنجر سے قتل کر دیئے گئے، ان پر کبھی موت طاری نہیں ہوتی۔ وہ ہر زمانے میں زندہ رہتے ہیں اور انہیں غیب سے نئی زندگی بخش دی جاتی ہے۔“ (ترجمہ)



ہندو محقق، آجوانی کا تعصب یہیں ختم نہیں ہوتا۔ آگے چل کر وہ نئے انداز سے بہتان تراشتا ہے۔ ”شاہ لطیف“ نے متعصب سیدوں اور فقیروں کی صحبت میں رہ کر جو خامیاں اور بے ضابطگیاں حاصل کی ہوں گی، وہ سب کی سب ”یوگا بھگتی“ اور ”ویدانت“ کے مکتبہ فکر میں قدم رکھتے ہی صاف ہو گئیں۔ ہندوستان کا روایتی فلسفہ یہ ہے کہ سب لوگ تصوف اختیار کر لیں۔ اسے ہندوستان نے ہزاروں سال میں جمع کیا ہے۔

”ویدانت“ اور ”یوگا“ کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی روحانی طاقتوں کا سرچشمہ قرار دینے کے بعد آجوانی کہتا ہے۔ ”اگر شاہ نے تمام عظیم سندھ کا دورہ نہ کیا ہوتا اور تین قیمتی سہل ہندو سنیا سیوں، جو گیوں میں نہ گزارے ہوتے، ان کا طرز بود و باش (رہن سہن کا طریقہ) اور انداز عبادت نہ اختیار کیا ہوتا۔ نیز ان میں سے ایک نہ ہو گئے ہوتے تو وہ سندھ کے اتنے بڑے شاعر اور سچے صوفی ہوتے بھی یا نہیں؟

آجوانی کی تنگ نظری اور سیاہ قلبی کا یہ عالم ہے کہ وہ سیدوں اور فقیروں کو متعصب کہہ کر پکارتا ہے۔ ”سیدوں اور فقیروں“ سے اس کی مراد اسلامی تعلیمات ہیں۔ جن کی وجہ سے آجوانی کے بقول حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ذات میں ”خامیاں اور بے ضابطگیاں“ پیدا ہو گئی تھیں۔ اور ان خرابیوں کو ”ویدانت“ اور ”یوگا“ کی تعلیمات نے دور کیا۔ مزید یہ کہ ہندو جو گیوں اور سنیا سیوں کی صحبتوں نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو سندھ کا عظیم شاعر اور سچا صوفی بنایا۔

ایک مسلمان، عالم بلوچ نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی پر بہت سے مقالے تحریر کئے ہیں اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاہ صاحب پر قرآن کریم، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور فارسی شعری کے بنیادی اثرات ہیں۔ بلوچ نے ہندو سے اثر پذیری اور جو گیوں کے مسئلہ کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے بلوچ کے مقالے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر ہندو فلسفے کے اثرات اور جو گیوں سے تعلقات کو یکسر نظر انداز کر دینا حقائق کے خلاف ہے اور جانب داری کی دلیل ہے۔

ایک اور ہندو مصنف، جوتوانی بلوچ کی تحقیق کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہتا ہے۔

”شاہ عبداللطیف بھٹائی کا فلسفہ ”ہندویت“ سے متاثر ہے۔ ”رسالو“ کے دوسرے خاص طور پر ”سرکھا ہوڑی“ اور ”سرام کلی“ شاہ صاحب کے مذہب، ہندوستانی کردار اور فلسفے کی پوری پوری تصدیق کرتے ہیں۔

ہندو مصنف اپنے الفاظ کے بیچ و خم کے سہارے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شخصیت کو مکمل طور پر ہندو مذہب کے زیر اثر ثابت کرنا چاہتا ہے، جو سراسر زیادتی اور اتہام ہے۔ شاید جوتوانی کو یہ مغالطہ اس لئے ہوا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے ہندو جو گیوں کو اپنی شاعری میں ایک بلند درجے پر فائز کیا ہے۔

تین سالہ صحبت کے دوران حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جو گیوں کے متعلق پوری معلومات حاصل کی تھیں۔ ایک مقام پر جو گیوں کے شب و روز کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں۔

”جونیا سی اور جوگی، تارک الدنیا ہو جاتے ہیں، وہ اپنی ضروریات کو محدود کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ صرف ایک کاسہ گدائی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ایک ”تزرنگھا“ بھی ہوتا ہے، جو لکڑی یا سینک کا بنا ہوتا ہے۔ جوگی اس ”تزرنگھے“ کو کھانے سے قبل اور اپنی پوجا کے بعد بجاتے ہیں۔ ان کے پاس ایک گدڑی بھی ہوتی

ہے، جس میں وہ خیرات میں ملا ہوا کھانا رکھتے ہیں۔ جوگیوں کے پاس ایک ڈنڈا بھی ہوتا ہے، جس پر وہ مراقبہ کے دوران اپنی ٹھوڑی اور بازو دکا دیتے ہیں اس کے علاوہ وہ ایک چمنا بھی رکھتے ہیں۔“

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو جوگیوں کے طرز معاشرت اور طریقہ عبادت سے مکمل آگاہی حاصل تھی۔

اب جوگیوں اور سنیا سیوں سے اس عقیدت کا تذکرہ، جس کی بنیاد پر آجوانی اور جوتوانی جیسے متعصب ہندو مصنفوں نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مسلمان ہونے پر شک کا اظہار کیا ہے اور انہیں ہندو مذہب سے قریب تر قرار دیا ہے۔

”انہوں نے کاسہ ہائے گدائی، زمین پر دے مارے۔“ ”زنگھا“ سے نجات حاصل کی اور عصا (ڈنڈے) کو ترک کر دیا۔ ان میں کوئی عیب نہیں اور وہ دوبارہ گناہ گار نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے خواہشات کی دنیا کو تھوڑا دیا ہے اور انہیں اپنے کل کا وصال حاصل ہو گیا ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ایک اور مقام پر جوگیوں کی کیفیات اس طرح رقم کرتے ہیں۔

”جو خواہشات اور آرام پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں، وہ دنیاوی راہوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ (جوگی) چشم بینا رکھتے ہیں لیکن ناپیناؤں کی طرح صحرا میں کھڑے ہیں۔ ان کے کان بند ہیں۔ وہ گوشتوں کی طرح چاروں طرف چکر لگاتے ہیں۔ وہ بہرے ہیں اور خدا سے جدائی کے فرمان کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔“

”لاہوت“ کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو فنا کر دیا ہے۔ خواب میں بھی یہ اسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

”کھاہوڑی“ کسی لمحے بھی تلاش کو ترک نہیں کر سکتے۔

”کھاہوڑی“ جوگیوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ایک اور مقام پر جوگیوں کو اس طرح خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

”انہوں نے رضا کارانہ طور پر پہاڑوں میں اپنی راہ گم کر دی ہے۔ وہ صحیح سمت میں جانے کے بجائے غلط سمت پر رواں دواں ہیں۔ انہوں نے راہ راست اختیار نہیں کی۔ جوگیوں نے دونوں جہانوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ اور وہ سیدھے راستے کا سوال نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے محبوب کی خاطر جسم اور چہرے پر بھسوت (راکھ اور مٹی) مل لی ہے۔ کھاہوڑیوں کو لاہوت کا کچھ علم ہوتا ہے۔“

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جوگیوں نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا۔ اور وہ ”صراطِ مستقیم“ سے بھٹک گئے تھے۔ پھر ایسے گم کردہ راہ لوگ کس طرح لائق ستائش ہو سکتے ہیں؟

مقام حیرت ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ، جوگیوں کو بھٹکا ہوا پاتے ہیں مگر پھر بھی اپنی شاعری کے حوالے سے ان کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ خود جوگیوں کو تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”اگر تم جوگی بننا چاہتے ہو تو کمروہات دنیاوی کو فنا کر دو۔ اپنے دل میں محبت کی شمع روشن کر لو۔ اپنے دل میں محبت کا دھواں جلاؤ۔ اپنے من سے تسبیح پھیرو۔ خدا جو کچھ تمہیں دے، اس کا شکر ادا کرو اور اس پر قانع رہو۔“

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، جوگیوں کی بہت سی قسموں سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے صرف جوگیوں کے ظاہری طور طریقوں کا مشاہدہ نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے عقائد اور فلسفہ کو بھی پوری گہرائی کے ساتھ سمجھا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے خصوصی طور پر ”کن پھنے“ جوگیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ جوگی ہڈی، سینک، ہاتھی دانت، شیشہ، پتھر اور مختلف دھاتوں کی بالیاں کانوں میں پہنتے تھے۔ حضرت شاہ عبداللطیف

بھائی ”سررام کلی“ میں کن پٹے جو گیوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

”کن کٹ، کا پٹ، کا پڑی، کنوٹیا، کن چیر، وہ عاشق ہمیشہ شامی ہواؤں کے رخ پر بیٹھتے ہیں۔ وہ بھوکے رہتے ہیں اور طرح طرح سے اپنے جسموں کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو فنا کر لیا ہے۔ ہمیں ان فقیروں کی خانقاہوں کی زیارت کرنی چاہئے۔“

یہ عجیب تضاد ہے کہ ایک طرف حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، جو گیوں کو ”گم کردہ راہ“ قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کی نشست گاہوں کی زیارت کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان میں عظیم الشان صوفیاء کے مزاحمت مبارکہ ہیں۔ اور ان سے وابستہ خانقاہیں بھی۔ لیکن جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس ذوق و شوق کے ساتھ کسی مسلمان صوفی کی زیارت کے لئے سفر نہیں کیا۔ اور اپنے عقیدت مندوں کو بھی اس کی تلقین نہیں کی۔

اور اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے تذکرہ نگار بھی ان جو گیوں کا ذکر بڑے دلکش پیرائے میں کرتے ہیں۔ مشہور سیاست رنما، جی ایم سید کی صاحب زادی، ڈاکٹر در شہوار سید نے شاہ صاحبؒ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ اپنی کتاب ”شاہ لطیف، شاعری اور فکر“ میں صفحہ 105 پر اس طرح رقم طراز ہیں۔

”جہاں تک حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری میں ان کے جو گیوں کے ساتھ روئے کا تعلق ہے تو عام طور پر شاہ صاحبؒ، جو گیوں کی بڑی عزت اور تعریف کرتے تھے۔ جو گیوں نے تصوف کے حوالے سے جو روحانی کمالات حاصل کئے تھے، شاہ صاحبؒ اُن کے قدردان تھے۔

اب اللہ ہی جانتا ہے کہ ڈاکٹر در شہوار سید کی نظر میں جو گیوں کے وہ کون سے روحانی کمالات تھے، جن کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اعتراف و قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب مسلمان صوفیاء نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو ان جو گیوں کے روحانی کمالات، ہندو قوم کے کسی کام نہیں آئے۔ ”تاریخ ہند“ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب بھی یہ جوگی، مسلمان صوفیاء کے مقابل آئے، اپنی زندگی بھر کی تپتیا (ریاضت) کی تاثیر اور روحانی ہنر کھو بیٹھے۔ یہاں تک کہ انہیں ایک مرد حق پرست کے دست کار کشا پر ایمان لائے ہی بنی۔ حضرت امیر خسروؒ نے اپنے پیر و مرشد، محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں ایک بے مثال منقبت تحریر کی ہے۔ جس کی گونج آج بھی سارے عالم میں سنائی دیتی ہے۔

چھاپ تلک سب چھین لی رہے

مو سے نیناں ملائے کے

”تو تو وہ ہے کہ جس کی ایک نظر نے میرے قلب کو بدل ڈالا اور کفر کی ساری نشانیاں چھین لیں۔“ (ترجمہ)

”چھاپ اور تلک“ مخصوص نشانات ہیں جنہیں ہندو قوم اپنے ماتھے پر سجاتی ہے۔ حضرت امیر خسروؒ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ مرد مومن کی ایک نظر میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ صدیوں پرانے ”کفر و شرک“ کے نشانات ایک لمحے میں مٹ جاتے ہیں۔ اگر جگہ کی کمی آڑے نہ ہوتی تو ہم سینکڑوں ایسے جو گیوں کے واقعات رقم کر دیتے، جو مسلمان صوفیاء کے سامنے جسے راکھ کا ایک ڈھیر نظر آتے ہیں۔ پھر راکھ کے ڈھیر کی زیارت ہی کیا؟ اگر ہندو جو گیوں کے روحانی کمالات فی الواقع کمالات ہوتے تو آج برصغیر پاک و ہند میں پچاس کروڑ سے زیادہ مسلمان نظر نہ آتے۔ دراصل یہ ہندو جو گیوں کی ”بے کمالی“ تھی جس کی وجہ سے بے شمار ہندوؤں نے اپنے ماتھوں سے نقشہ کھرچ

ڈالا اور گردنوں میں پڑے ہوئے زنار (جینو) توڑ ڈالے۔

ایک اور مقام حیرت یہ ہے کہ بعض مسلمان صوفیاء نے بھی تمام عمر صحرا نوردی کی ہے۔ درختوں کی چھالیں اور پتے کھائے ہیں۔ خدا طلبی کی راہ میں بڑے بڑے آزار جھیلے ہیں۔ پابند سلاسل ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو ان صوفیاء کی ریاضتیں اور مشقتیں کیوں یاد نہیں آئیں؟ یہ بھی ایک نہایت اہم سوال ہے جس کا جواب ان لوگوں پر قرض ہے، جو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی پر مسلسل تحقیق کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر درشہوار سید اپنے مقالے میں ایک جگہ تحریر کرتی ہیں۔

”حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا خیال تھا کہ ہندو جوگیوں کی صحبت میں رہنا انتہائی خوش قسمتی کی دلیل ہے۔“ اس کے بعد ڈاکٹر درشہوار، حضرت شاہ صاحب کا یہ اقتباس پیش کرتی ہیں۔

”اے ماں! میں نے انہیں دیکھا ہے جو محبوب کا جلوہ دیکھ چکے ہیں۔ ایسے بہادر لوگوں کی صحبت میں رات گزارنا بڑی قابلِ قدر چیز ہے۔ ان سے واقفیت ایسی ہتوار ہے، جو گہرے سمندروں کو عبور کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔“

اس عبارت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی نظروں میں جوگیوں اور سنیا سیوں کی کیا قدر و قیمت تھی؟

ایک اور موقع پر حضرت شاہ صاحب ”جوگیوں اور سنیا سیوں کا ذکر بڑی بلند آہنگی سے کرتے ہیں۔

”سامی ذبح ہو کر اپنے محبوب کی محبت میں کباب کی طرح جل رہے ہیں۔ ان کی نظر میں خدا پرستی اور لادینی ایک ہوتے ہیں۔ وہ آنکھ سے خون برسا رہے ہیں۔ ایسے لوگوں سے رنگ و نسل کے بارے میں کون سوال کر سکتا ہے؟“

جو لوگ ”خدا پرستی“ اور لادینیت میں کوئی فرق ہی نہیں سمجھتے، اسلامی شریعت انہیں فاجر العقل، مجنون یا پاگل قرار دیتی ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی محبت کیا اور ان کا کباب کی طرح جل جانا کیا؟ اگر ہم دنیا داری کے حوالے سے بات کریں تو انسانی تاریخ میں ایسے بے شمار لوگ نظر آجائیں گے، جنہوں نے اپنے محبوب کی خاطر جوگیوں اور سنیا سیوں سے زیادہ لرزہ خیز تکالیف برداشت کی ہیں۔ اس کے برعکس جب ہم اسلامی تصوف کی بات کرتے ہیں تو پھر عشق کا معیار یکسر بدل جاتا ہے۔ اللہ لطیف ہے، اس لئے پاکیزگی نفس کے ساتھ جسم کی ظاہری پاکیزگی کو بھی پسند فرماتا ہے۔ اسلام میں صفائی نصف ایمان ہے۔ اور جوگی، ظاہری کثانتوں کا مجموعہ۔ اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور ہندو جوگی سر سے پاؤں تک رہبانیت (ترک دنیا) کی تصویر پھر ایک مسلمان عارف کا بت پرست جوگیوں کو اس جوش اور جذبے کے ساتھ خراجِ ششیں پیش کرنا بڑا حیران کن ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جوگیوں اور سنیا سیوں سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی عقیدت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایک مقام پر شاہ صاحب کہتے ہیں۔

”وہ اپنے چہروں کو گھٹنوں میں ڈالے بیٹھے ہیں۔ وہ زیارت کر رہے ہیں اور الوہیت کو پہنچنے ہوئے ہیں۔“

الہی الفاظ سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ”عقیدہ غلول“ کے قائل تھے۔ ”حلول“ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز میں اس طرح پست یا داخل ہو جانا کہ دونوں میں فرق محسوس نہ کیا جاسکے۔ مگر جب ہم روحانیت کے حوالے سے ”حلول“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی

بدل جاتے ہیں۔ یعنی خدا، بندے میں حلول کر گیا ہے۔ اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔
نبض روایات کے مطابق حضرت منصور حلاجؒ بھی حلول کے قائل تھے اور اسی بنیاد پر ”انا الحق“ کا نعرہ لگاتے تھے۔ یعنی میں حق ہوں۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عقیدت مند ان الفاظ کی زیادہ سے زیادہ یہ توجیہ کر سکتے ہیں کہ شاہ صاحب فلسفہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اور اسی رعایت سے جوش عقیدت میں جوگیوں کے ”مقام علوی“ کا تعین کرتے وقت ”الوہیت“ کا لفظ استعمال کر گئے۔ ”وحدت الوجود“ پر بحث کرنا ہمارا موضوع بھی نہیں اور ہم خود کو اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ اس مشکل ترین مسئلے پر لب کشائی کر سکیں۔ مگر اتنا ادراک ضرور رکھتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہے، وہ قدرت الہی کا مظہر ہے۔ اور جہاں تک ذات باری تعالیٰ کا تعلق ہے تو وہ ہر حال میں ”واحد“ اور ”سبحان“ (پاک) ہے۔ واحد کا مطلب ہے ایک۔ یعنی اس جیسا کوئی دوسرا نہیں۔ اور پاک کا مفہوم بھی یہی ہے کہ اس میں کسی آلودگی اور آمیزش کا گزر ممکن نہیں۔ اگر ہم سورہ اخلاص میں پوشیدہ نکات پر غور کریں تو حلول کا عقیدہ خود بہ خود دم توڑ دیتا ہے۔

”اللہ ایک ہے۔ بے نیاز ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔“ (ترجمہ)
قرآن کریم کی ایک آیت مقدمہ کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ بڑے سے بڑا پیغمبر بھی اللہ کی بارگاہ میں لرزتا ہوا آتا ہے۔ یہ حق تعالیٰ کے جاہ وجلال کی طرف اشارہ ہے۔ جب بارگاہ حق میں ایک نبی یا رسول کی یہ حالت ہوتی ہے تو جوگی اور سنیا سی، الوہیت کے مرتبے تک کیسے پہنچ گئے؟
حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، جوگیوں کے انداز نشست اور مراقبہ کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔
”جوگیوں کے گھٹنے محراب ہیں۔ ان کا جسم مسجد ہے۔ وہ اپنے قلب کو قبلہ سمجھتے ہیں اور اس میں طواف کرتے ہیں۔ انہوں نے سچائی کی ”تکبیر“ کہی۔ اور اپنے جسموں کو نظر انداز کر دیا۔ گناہ کی ان کے سامنے کیا حیثیت ہے۔ مرشدان کے قلوب میں داخل ہو گیا ہے۔“

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جن سنیا سیوں اور جوگیوں کو اپنی آنکھوں سے بتوں کی پوجا کرتے دیکھا ہے، وہ ان کے جسموں کو مسجد، گھنٹوں کو محراب اور دل کو کعبہ قرار دیتے ہیں۔ اور جوگیوں کی روحانی عظمت پر یہ دلیل لاتے ہیں کہ ان کے سامنے گناہ کی کیا حیثیت ہے؟ اس سے شاہ صاحب کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جوگیوں کی ذات میں گناہوں کا گزر ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ جوگی تو خود ”مسجد“ اور ”کعبہ“ بن گئے ہیں، وہاں گناہ کا تصور اور وجود کیا حیثیت رکھتے ہیں؟

جوگیوں کی پوجا کو کعبہ و مسجد سے تشبیہ دینے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ”ہند ازم“ اور ”اسلام“ میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کیا جائے، انسان اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔
ایک اور مقام پر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی فرماتے ہیں۔

”اگر تم جوگی بننا چاہتے ہو تو فنا کا جام پی لو۔ تلاشی ہو اور عدم کو حاصل کرو۔ خودی کو ترک کر دو۔ اے تلاش کرنے والو! تب ہی تم اتحاد کی دولت حاصل کر سکو گے۔“ یہاں اتحاد سے مراد حلول ہے۔

تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے یہ اشعار، جوگیوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہے تھے کہ حقیقی جوگی کس طرح بنا جاسکتا ہے۔ ہم اس تحقیقی تجربے کو تسلیم کئے لیتے ہیں۔ مگر ایک مسلمان صوفی، ہندو سنیا سیوں کو اتحاد (حلول) کی دولت حاصل کرنے کا مشورہ کس طرح دے سکتا ہے؟ حلول ایک بے حقیقت شے

ہے۔ شیطانی دوسرے ہے۔ بدترین فریب اور گمراہی ہے۔ مسلمان علماء تو اسے کھلا ہوا کفر اور شرک قرار دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندو جوگی، حلول کے عقیدے پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ اس لئے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے انہیں ان کے عقیدے کے مطابق ہی مشورہ دیا۔ یہ ایک دنیا دارانہ منطقی دلیل تو ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص، شراب نوشی کا عادی ہے مگر اسے مسلسل شراب پینے کے باوجود حقیقی نشہ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر ایک تجربہ کار بادہ نوش آتا ہے اور نشے کی کیفیت سے محروم شرابی کو مشورہ دیتا ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق شراب پی جائے گی تو پینے والا حقیقی کیف و سرور سے ہم کنار ہو جائے گا۔ مگر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی تو ایک مسیحا اور طبیب تھے۔ اس لئے ان پر لازم تھا کہ وہ شراب نوشوں کو شراب کی فطری ہلاکت خیزی کے بارے میں کھل کر بتاتے کہ شراب سے نشہ تو حاصل ہو جائے گا مگر مستی کی یہ حالت بالآخر انسانی زندگی کے خاتمے پر منتج ہوگی۔ ہندو جوگی، اتحاد یا حلول کو یقیناً معرفت کی معراج اور ذریعہ نجات سمجھتے ہوں گے۔ مگر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی تو بحیثیت مسلمان، حقیقت آشنا تھے کہ ”عقیدہ حلول“ بدترین شرک ہے۔ اور اس کا صلہ نجات و عافیت نہیں، دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

اب اللہ ہی جانتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ہندو جوگیوں کو اتحاد (حلول) کی دولت حاصل کرنے کا مشورہ کیوں دیا؟ یہ الفاظ ایک صوفی کی حالتِ سکر کے ترجمان ہیں یا ایک شاعر کا مراد و کنایہ؟ اس کی تشریح تو اہل علم ہی کر سکتے ہیں۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، جوگیوں کے حوالے سے اتحاد (حلول) کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

”جہاں نہ عرش ہے، نہ آسمان ہے، نہ زمین کا کوئی ذرہ ہے، نہ طلوع ہوتا ہوا چاند ہے، نہ سورج کی کوئی علامت، وہاں آدیسویں (جوگیوں) کی جائے قیام ہے۔ وہاں سے وہ فاصلے کو دیکھتے ہیں اور وہاں سے وہ ناتھ میں حلول کر جاتے ہیں۔“

فاضل نقاد یا تبصرہ نگار نے ”ناتھ“ کی تشریح کرتے ہوئے ”شیو“ اور ”خدا“ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ناتھ دراصل سنسکرت کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب ہے مالک۔ اسی رعایت سے ہندو عورتیں اپنے شوہروں کو بھی ”پران ناتھ“ (جان کا مالک) کہتی ہیں۔ پھر یہ لفظ اپنے معانی میں وسعت اختیار کرتے کرتے کائنات کا مالک بھی بن جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ”ناتھ“ کو ”شیو“ بھی کہا گیا ہے اور ہندو عقائد کے مطابق ”شیو“ اس کائنات کا خالق ہے۔ ہمارے تبصرہ نگار نے ناتھ کا ترجمہ کرتے ہوئے پہلے ”شیو“ کا لفظ استعمال کیا۔ اور پھر ”شیو“ کو ”خدا“ بنا دیا۔ کسی ماورِ موقع پر تو ”ناتھ“ کی یہ توضیح مناسب ہو سکتی ہے، مگر جب حلول کا مسئلہ ہو تو اس کے ساتھ ”خدا“ کا لفظ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

الفرض حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اس مقامِ خاص کی نشاندہی کرتے ہیں، جہاں پہنچنے کے بعد جوگی ”ناتھ“ اور ”شیو“ میں حلول کر جاتے ہیں۔

آگے چل کر ڈاکٹر درشہوار سید تحریر کرتی ہیں۔

”حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کام (شاعری) کا یہ تجربہ جوگیوں اور ان کی مشقوں کے حوالے سے ظاہر کرتا ہے کہ ہمارا شاعر ”یوگا“ کے طریقوں سے کچھ واقفیت رکھتا ہے۔ گو کہ اس نے یوگا کی آٹھوں مشقوں کو نہ ترتیب وار بیان کیا ہے اور نہ ان کی درجہ بندی کی ہے۔ پھر بھی شاہ صاحب نے ”سرکھا ہوڑی“ اور ”سررام کلی“ میں یوگا کی کچھ مشقوں کا ذکر کیا ہے۔“

اس کے بعد ڈاکٹر صاحبہ نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر (شاہ لطیف) حقیقی جوگیوں کا بہت بڑا مداح ہے۔ جنہیں اس نے مذکورہ بالا سُرود میں زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا فلسفہ بے خودی، انہما یا عدم تشدد ہے۔ جو خودی اور تشدد کے برعکس ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شاہ صاحب کے خیال میں تمام جوگی سچے ہوتے ہیں۔ انہوں نے جعلی (نعلی) جوگیوں کی مذمت بھی کی ہے۔“

ڈاکٹر در شہوار مزید تحریر کرتی ہیں۔ ”اس کے علاوہ شاہ صاحب کے کلام میں ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہوئی، جس سے ظاہر ہو کہ وہ (عبداللطیف بھٹائی) ”آواگون“ کے قائل تھے۔ جہاں تک روحانی سفر کا تعلق ہے کہ ہمارا شاعر، جوگیوں سے متفق ہے تو اس سفر کو مسلمان صوفیاء نے بھی تسلیم کیا ہے۔“

”آواگون“ عقیدہ تنازع کو کہتے ہیں۔ اس عقیدے کے مطابق روح انسانی ایک جسم سے جدا ہو کر دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور انتقال روح کا یہ سفر اس وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک انسان ”نزدان“ (نجات) حاصل نہ کر لے۔ اس عقیدے کی مختصر تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ اگر ایک انسان نے اپنی زندگی میں نیک اعمال کئے ہیں تو مرنے کے بعد اس کا دوسرا جنم زیادہ بہتر شکل میں ہوگا۔ یعنی اس کی نیکیوں کا صلہ یہ ہوگا کہ اسے رشی منی یا سادھو جوگی بنا کر دوبارہ اس دنیا میں بھیج دیا جائے گا۔ روح وہی ہوگی، مگر جسم بدلا ہوا ہوگا۔

اس کے برعکس اگر کسی انسان نے اپنی پہلی زندگی میں بدکاری کی روش اختیار کی ہے تو اسے دوسرے جنم میں سزا دینے کے لئے کتا بھی بنایا جاسکتا ہے۔ پھر وہ کتا مرنے کے بعد نسبتاً کسی بہتر جانور کی شکل میں پیدا ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ بار بار پیدا ہوتا اور مرتا رہے گا۔ پھر جب اس کے گناہوں کی سزا پوری ہو جائے گی تو وہ دوبارہ انسان کا قالب اختیار کر لے گا۔

اسلامی نظریات کے مطابق جسم فنا ہو جاتا ہے اور روح باقی رہتی ہے۔ مگر وہ ایک خاص مقام پر مقید رہتی ہے۔ نہ اسے دنیا میں آنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ وہ دوبارہ کسی دوسرے انسانی جسم میں منتقل کی جاتی ہے۔ اور جہاں تک فاضل مقالہ نگار کی اس رائے کا تعلق ہے کہ مسلمان صوفیاء نے بھی جوگیوں کے اس روحانی سفر کو تسلیم کیا ہے، تو ہم اتنا ہی عرض کریں گے کہ ڈاکٹر در شہوار کو اسلامی تصوف سے مکمل آگہی حاصل نہیں۔ ورنہ وہ یہ راز جان سکتیں کہ جس عمارت کی بنیاد میں ہی کچی ہو، اس پر اٹھائی ہوئی دیواریں کبھی سیدھی اور درست نہیں ہو سکتیں۔ اگر کسی مسلمان درویش نے گیر واد (تارخشی) رنگ کے کپڑے پہن لئے، مختلف پتھروں کی لمبی لمبی تسبیحیں اپنے گلے میں ڈال لیں، انسانی آبادی سے نکل کر کسی جنگل یا غار میں گوشہ نشین ہو گیا اور ترک لذات کر کے درختوں کے پتے یا پھل کھانے لگا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوا کہ وہ مسلمان صوفی کسی ہندو جوگی کا ہم سفر ہو گیا۔ ظاہری طور پر اس مسلمان صوفی کا حلیہ کسی ہندو جوگی سے ملتا ہے۔ مگر باطن میں وہ ایک بت پرست انسان سے بالکل جدا ہے۔ علامہ اقبال کے بقول۔

نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو مجازی ہے مری

”تمام راستے ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہیں۔“ دراصل یہی وہ گمراہ کن فلسفہ ہے، جس نے بے شمار انسانوں کو متاثر کر کے انہیں غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔ اور اس راستے کو درست کرنے کے لئے ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء اور رسول دنیا میں بھیجے گئے۔ روحانی سفر کا تعلق بے لباہی اور جسمانی مشقتوں سے نہیں ہوتا۔ یہ خالص عقائد کا مسئلہ ہے۔ اور عقائد کے حوالے سے ایک مسلمان صوفی اور ایک ہندو جوگی میں کوئی مماثلت نہیں ہو سکتی۔ بالفرض اگر کوئی مسلمان صوفی کسی ہندو سنیاسی کی روحانیت سے متاثر ہو جاتا ہے تو پھر اس کی اپنی ”صوفیت“ بے حقیقت قرار

پانی ہے۔ آخر اسلامی تصوف میں وہ کون سی کمی تھی، جو ایک درویش کو کسی جوگی کے دروازے پر لے گئی؟ آپ جب بھی اسلامی عقائد کی روشنی میں اس سوال کا جواب تلاش کریں گے تو ایک ہی حقیقت سامنے آئے گی کہ روحانی سفر میں مسلمان صوفی اور ہندو جوگی، ہم سفر نہیں ہو سکتے۔ یہ دو الگ الگ راستے ہیں، جو اس زمین کے طول و عرض میں کسی بھی موڑ پر جا کر مل نہیں سکتے۔ اگر کوئی ملانے کی کوشش کرے گا تو وہ صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کوئی نیا راستہ تراش لے گا۔ اور ساری زندگی اسی راستے کے پیچ و خم میں غلطیاں و پچھتاہیاں رہ کر ہلاکت و بربادی کی منزل سے جا ملے گا۔ حضرت شیخ سعدیؒ کے بقول۔

خلاف پیمبر کے رہ گزید

کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

”اگر کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے خلاف کوئی راستہ اختیار کیا تو وہ ہزار ریاضتوں اور مجاہدوں کے باوجود منزل تک نہیں پہنچے گا۔“ (ترجمہ)

ہم مسلمان صوفیاء کے مجاہدات اور ہندو جوگیوں کی ریاضت کا فرق ظاہر کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ایک بار ایک بزرگ، ہندوستان کے کسی علاقے سے گزر رہے تھے کہ ایک جوگی، آگ کے سامنے بیٹھا اپنی تپسیا (ریاضت) کر رہا تھا۔ مسلمان بزرگ اس جوگی کو دیکھ کر ٹھہر گئے۔

پھر کچھ دیر تک دونوں میں مناظرہ ہوتا رہا۔ مسلمان بزرگ اپنے مذہب اسلام کی حقانیت بیان کرتے رہے۔ اسی طرح ہندو جوگی بھی پریقین لہجے میں اپنے ہندو دھرم کی برتری ثابت کرتا رہا۔

پھر ایک موقع پر ہندو جوگی نے ازراہ تمسخر مسلمان بزرگ سے کہا۔ ”آخر تمہیں اسلام کی پیروی نے کیا دیا؟“

”روشنی اور سکونِ قلب۔“ مسلمان بزرگ نے کہا۔

”یہ جوتی اور شانتی (روشنی اور سکون) تو مجھے بھی حاصل ہے۔“ ہندو جوگی کا استہزاء کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ”بات جب ہے کہ تم مجھے کھلی آنکھ سے اپنی روحانیت کا مشاہدہ کراؤ۔“

”تم نے جس آگ کی پوجا میں اپنی ساری زندگی بسر کر دی۔ وہی آگ میرے جسم کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔“ یہ کہہ کر مسلمان بزرگ نے اپنا دایاں ہاتھ بھڑکتے ہوئے شعلوں پر رکھ دیا۔

حیرت انگیز طور پر آگ نے مسلمان بزرگ کے ہاتھ پر ذرا بھی ضرر نہیں پہنچایا۔

ہندو جوگی نے بھی اپنا ہاتھ مسلمان بزرگ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور وہ بھی آگ کی سوزش سے محفوظ رہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ آگ کے شعلوں سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ کمال تو میں نے بھی دکھا دیا۔ پھر تم میں اور مجھ میں کیا فرق ہے؟“

مسلمان بزرگ کو شدید ندامت کا احساس ہوا۔ پھر وہ دل ہی دل میں حق تعالیٰ سے مخاطب ہوئے۔ ”میں نے

زندگی بھر آپ کی وحدانیت پر گواہی دی۔ اب یہ جوگی کہتا ہے کہ مجھ میں اور اس میں کیا فرق ہے؟ آپ ہی بتائیے کہ میں اسے کیا جواب دوں؟“

چند لمحوں بعد مسلمان بزرگ نے ایک پُر جلال صدا بے غیب سنی۔ ”تم اُور یہ جوگی کسی بھی حال میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ وہ اس لئے آگ کے شعلوں سے محفوظ رہا کہ اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ پر تھا۔ اگر وہ تمہارا آگ کو چھوئے گا تو اپنا انجام بھی دیکھے گا۔“

اس صدائے غیب نے مسلمان بزرگ کو مطمئن کر دیا۔ پھر انہوں نے جوگی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ہم دونوں الگ الگ اس آگ کو چھوتے ہیں۔ پھر جو نتیجہ ظاہر ہوگا، اسے ہم دونوں تسلیم کر لیں گے۔“
 جوگی کو حقیقت حال کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ اس نے مسلمان بزرگ کو پہلے اس آزمائش کی دعوت دی۔
 مسلمان بزرگ نے کسی جھجک کے بغیر اپنا دایاں ہاتھ شہادت کی انگلی بلند کر کے آگ میں ڈال دیا۔ نتیجہ حسب سابق رہا۔ انہیں یہی محسوس ہوا کہ جیسے ان کا ہاتھ پھولوں پر رکھا ہوا ہے۔

جوگی بھی اپنی تپیا اور جوگ (ریاضت) پر نازاں تھا۔ اس نے بھی مسلمان بزرگ کی طرح بے دھڑک ہو کر آگ کے شعلوں کو چھونے کی کوشش کی، مگر دوسرے ہی لمحے فضا میں اس کی چیخ اُبھری۔ آگ کے بھڑکتے شعلوں نے جوگی کے ہاتھ کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

یہ مختصر سا واقعہ اہل ایمان اور اہل باطل کے فرق کو خوب نمایاں کرتا ہے۔ دراصل آخرت میں انسان کی حیات ابدی کا انحصار آگ ہی پر ہوگا۔ کچھ لوگوں کو آگ جلا ڈالے گی۔ اور کچھ لوگوں پر یہی آگ حرام کر دی جائے گی۔ آگ سے بچ جانے والے وہی ہوں گے، جنہوں نے اپنے عقیدے اور اعمال سے دنیا میں اللہ کی وحدانیت کو ثابت کیا ہوگا۔ اور آگ کا ایندھن بننے والے وہی نامراد افراد ہوں گے، جنہوں نے اپنی آنکھوں اور نفس کو دھوکا دینے کے لئے بہت سے خدا ترانے بنائے ہوں گے۔ خواہ ان لوگوں نے جوگیوں اور منیاسیوں کی روش اختیار کر کے اپنے لاغر و نحیف اجسام کو بے شمار ازیتیں پہنچائی ہوں۔ واضح رہے کہ اس سزا سے وہ جوگی محفوظ رہیں گے، جو اپنے عقائد میں ”موحد“ ہوں گے۔ ایسے جوگی خال خال نظر آتے ہیں۔ کسی تاریک غار میں گم۔ اور درختوں کے پتوں کے انبار میں دبے ہوئے۔ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز۔ وہ جوگی اس زمرے میں نہیں آتے، جو ”تیرتھ یاترا“ کرتے ہیں۔ اور مندروں میں جا کر بتوں کے قدموں میں سر جھکائے پڑے رہتے ہیں۔ یہی جوگی کافر بھی ہیں اور مشرک بھی۔

اسی ذیل میں ایک اور واقعہ بھی خاص شہرت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے کسی دریا کے کنارے کوئی جوگی پڑا تھا۔ اور اس نے اپنے جسم کو سخت آزار پہنچا کر سارا گوشت گھلادیا تھا اور ظاہری طور پر خشک چڑا بن کر رہ گیا تھا۔ ہمارے فاضل مقالہ نگار کے بقول اس جوگی نے اس قدر روحانی ترقی کی تھی کہ وہ ناتھ (شیو) میں حلول کر گیا تھا۔ اسی دوران ایک مسلمان بزرگ نے اس نجات یافتہ جوگی سے ملاقات کی۔

دونوں میں بہت دیر تک مناظرہ ہوتا رہا۔ آخر جوگی نے مسلمان بزرگ سے کہا۔ ”کوئی ایسی ظاہری دلیل، جس کو دیکھ کر آنکھیں مطمئن ہو جائیں۔“

مسلمان بزرگ نے جوگی کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اُٹھے اور سامنے بچتے ہوئے دریا میں اتر گئے۔ تین غوطے لگا کر غسل کیا اور دریا سے باہر نکل آئے۔ جوگی بڑی حیرت سے مسلمان بزرگ کا یہ عمل دیکھ رہا تھا۔

پھر مسلمان بزرگ نے اپنا پیرہن (کرتہ) اتارا اور اسے جوگی کے سامنے نچوڑ دیا۔ جیسے ہی ایک صوفی کے پیرہن کا پانی زمین پر گرا، چاروں طرف تیز خوشبو پھیل گئی۔ ایسی خوشبو، جو عام خوشبوؤں سے مختلف تھی۔

جوگی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک اس خوشبو کو شدت سے محسوس کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خوشبو، ہواؤں میں منتشر ہو گئی۔

مسلمان بزرگ نے جوگی سے کہا۔ ”تم نے میرے ایمان کی دلیل دیکھی؟“

جوگی کیا جواب دینا؟ شدید حیرت کے عالم میں خاموش بیٹھا رہا۔

”اب تم بھی تو اپنے نظریات کی سچائی کا کوئی ثبوت پیش کرو۔“ مسلمان بزرگ نے فرمایا۔

کرامت تو مسلمان صوفیائے کرام کی ذات سے وابستہ ہوتی ہے۔ جوگی جو اپنی طویل تپیا اور گیان کے باوجود لکئی شعبہ دکھانے سے بھی قاصر تھا، مجبوراً اٹھا اور اس نے بھی مسلمان بزرگ کی تقلید میں دریا کے اندر کئی ڈبکیاں لگائیں۔ پھر باہر آ کر اس نے بھی اپنے انگوچھے (رومال) کا پانی نچوڑا۔ اور دوسرے ہی لمحے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ ناگوار بدبو نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ اور یہ بدبو اس پانی کا حاصل تھی، جو ہندو جوگی کے رومال سے نکلتا تھا۔

مسلمان بزرگ نے فرمایا۔ ”ہم دونوں کے جسموں پر لباس ہیں۔ جن میں ہماری روحانیت جذب ہو رہی ہے۔ ہر دریا کا شفاف پانی ہمارے لباسوں کو چھوتا ہے۔ اور اس کی تاثیر بدل جاتی ہے۔ یہ تمہارے اندر کا کفر ہے، جس کی بدبو نے فضا کو ناقابلِ برداشت بنا دیا ہے۔ اور یہ میرے اندر کا ایمان تھا، جسے چھو کر دریا کا پانی بھی مہک اٹھا۔ یہاں یہی فرق ہے، حق اور باطل میں۔“

بعد میں وہ جوگی، مسلمان بزرگ کے دستِ حق پرست پر ایمان لے آیا۔ پھر اسے حکم دیا گیا کہ وہ دوبارہ غسل کرے۔ جوگی پانی میں اتر آ۔ اور جب باہر آ کر اس نے اپنے اسی رومال کو نچوڑا تو فضا خوشبو سے مہک اٹھی۔ چند لمحوں کی بات تھی۔ ایک کے اقرار اور باقی کے انکار نے سب کچھ بدل ڈالا تھا۔

مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں کے حوالے سے تاریخ ہندوستان میں سینکڑوں واقعات موجود ہیں۔ مگر یہ دو مثالیں ہی ”صوفیت“ اور ”جوگیت“ کے بنیادی فرق کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ہمارے فاضل مقالہ نگار کی یہ رائے درست نہیں کہ جوگیوں کی ان مشقتوں اور ریاضتوں کو مسلمان صوفیاء نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اگر ”یوگا“ سے مراد جسمانی ورزش ہے تو صحت و توانائی برقرار رکھنے کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ آج کل ”جوڈو کراٹے“ کا جیڈو، لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ان چیزوں کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔



حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی پر تحقیقی کام کرنے والے اہل دانش متفقہ طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ شاہ صاحب مسلسل تین سال تک جوگیوں کے ساتھ رہے۔ اس سلسلے میں مرزا قلیچ بیگ کا طرزِ فکر کچھ عجیب سا ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔

”بے شک! شاہ صاحب نے جوگیوں کے ساتھ سیاحت کی۔ ہندوؤں کے متبرک مقامات کی یاترا کی۔ جوگیوں کے حوالے سے دوسرے بھی لکھے۔ مگر شاہ صاحب نے جوگیوں کی مذہبی رسوم کو مسترد کر دیا تھا۔“

آگے چل کر مرزا قلیچ بیگ ایک اور دعویٰ کرتے ہیں۔ ”جیسے ہی حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے پہلی بار ہندو جوگیوں کی مذہبی رسمیں دیکھیں، ان پر اعتراض کیا اور ترک تعلق کر لیا۔“

مرزا قلیچ بیگ کی روایت کا تضاد یہ ہے کہ وہ ایک طرف حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی جوگیوں کے ساتھ سیر و سیاحت کا ذکر بھی کرتے ہیں اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ جیسے ہی شاہ صاحب نے جوگیوں کی مذہبی رسمیں دیکھیں، ان سے قطع تعلق کر لیا اور روانہ ہو گئے۔ اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی جوگیوں کے ساتھ تین سالہ صحبتوں اور سیاحتوں کو کس زمرے میں شمار کریں گے؟

ایک اور محقق، دین محمد وفائی نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے تین سال تک جوگیوں کے ساتھ رہنے کے بعد ان سے جدائی اختیار کرنے کے ممکنہ اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے۔

”شاہ صاحبؒ نے ہندوؤں کی مذہبی رسموں اور پوجا پر بحث کی ہوگی۔ جس کے نتیجے میں انہیں اہل ہند سے ترک تعلق کرنا پڑا۔“

دین محمد وفاقؒ اپنی اس تحقیق کو تقویت دینے کے لئے ایک اور محقق، مشتاق معلوی کا مندرجہ ذیل اقبال پیش کرتے ہیں۔

”شاہ عبداللطیفؒ ہندوؤں کے مندر کی زیارت کو ”نانی“ گئے۔ وہاں پر اپنی صوفیانہ کرامات سے جوگیوں کی تذلیل و تحقیر کی۔ تاکہ انہیں ان کی غلط روی کا احساس دلا سکیں۔ مگر چونکہ جوگیوں کی جبلت (فطرت) میں جہالت بھری ہوئی تھی، اس لئے وہ لوگ شاہ صاحبؒ کے نقصان کے درپے ہوئے اور انہیں ایذا پہنچانی چاہی۔ پھر جب شاہ صاحبؒ کو اس کا احساس ہوا تو وہ زمین میں سما گئے۔ اور اپنے علاقے میں برآمد ہوئے۔

مشتاق معلوی کی روایت کا یہ حصہ درست ہو سکتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے ہندو جوگیوں کو اسلام کا پیغام وحدانیت دیا، ان سختی مناظرے کئے اور پھر جب بت پرستوں کے پتھر دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تو شاہ صاحبؒ خاموشی کے ساتھ ان کے علاقوں سے رخصت ہو گئے اور یہ تین سالہ تعلقات کا دور ختم ہو گیا۔ اور جہاں تک جوگیوں کی تذلیل و تحقیر کرنے کا واقعہ ہے، شاہ صاحبؒ کا کلام اس دعوے کی نفی کرتا ہے۔ ایسی کئی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔

مشتاق معلوی نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی جس کرامت کا ذکر کیا ہے، وہ بھی ایک طلسمی افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ صاحب مضمون نے شاہ صاحبؒ کی کرامت بیان کرتے وقت جوگیوں ہی کا طریق کار اختیار کیا۔ بعض جوگی ”جس دم“ (سانس روکنے) کے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ کئی کئی گھنٹے سانس روکے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ وہ روحانیت میں کمال رکھتے ہیں۔ ”جس دم“ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جوگیوں کے معاون ایک گہرا گڑھا کھودتے ہیں۔ پھر کوئی جوگی سر کے بل اس گڑھے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے خدمت گار اس گڑھے کو مٹی سے پاٹ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمین میں دھنس جانے والے جوگی کے صرف پاؤں نظر آتے رہتے ہیں۔ اور وہ اندر ہی اندر سانس لیتا رہتا ہے۔ عام ہندو، جن میں ضعیف الاعتقاد لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے، یہ منظر دیکھ کر جوگیوں کو کوئی مانوق الفطرت مخلوق سمجھ لیتے ہیں۔ پھر اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے فنی شدہ جوگی کے قریب حسب استطاعت چڑھاوے چڑھاتے ہیں، پیسے ڈالتے ہیں۔ پھر جب رات کا اندھیرا پھیل جاتا ہے تو جس دم کا وہ ماہر جوگی باہر آ جاتا ہے اور سارے چڑھاوے سمیٹ لیتا ہے۔ پھر دوسرے دن بھی کاروبار شعبہ بازی شروع کر دیتا ہے۔ آج بھی ہندوستان کے بعض علاقوں میں ایسے جوگی پائے جاتے ہیں۔ ٹانگیں اوپر کرنے سے جوگی کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کے اندر سما گیا ہے۔ مشتاق معلوی نے بھی ہندو جوگیوں کے اسی ہنر کو بنیاد بناتے ہوئے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی کرامت کا اظہار کیا۔ صاحب مضمون اس واقعے کو اس طرح بھی بیان کر سکتے تھے کہ جب حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کو جوگیوں کے ہاتھوں اپنی جان کا خطرہ ہوا تو آپ، روحانی طاقت کے ذریعے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ زمین کے اندر سما جانا اور پھر اپنے علاقے میں برآمد ہونا، کوئی دانش مندانہ انداز بیان نہیں ہے۔

شاید مشتاق معلوی کی بیان کردہ اسی روایت سے متاثر ہو کر ایک اور محقق، علی شیر قانع مضمونی نے اپنی کتاب ”تحفۃ الکرام“ میں تحریر کیا ہے۔ ”حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی کرامت، سورج کی کرنوں کی طرح ہیں۔ یعنی بے شمار ہیں۔ اگر ان کا ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے گا۔“

مگر مقام حیرت ہے کہ میر علی شیر قانع نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی کوئی دو لفظی کرامت بھی بیان نہیں کی۔

مختصر یہ کہ جب حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جوگیوں کے ساتھ سفر اختیار کیا تھا تو اس وقت شاہ صاحبؒ کی عمر مبارک بیس سال تھی۔ اور آپ نے اپنے قلب حساس پر تازہ تازہ عشق کی چوٹ کھائی تھی۔ پھر تین سال بعد اپنے علاقے میں واپس تشریف لائے تو اس چوٹ کی سوزش کسی قدر کم ہو گئی تھی، مگر زخم پھر بھی ہر اتھا۔



اس حادثے کے بعد ایک اور الم ناک حادثہ پیش آیا۔ جس کی تلخ اور اذیت رساں یادوں کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ زندگی بھر فراموش نہ کر سکے۔ اس اندوہ ناک واقعے کا تعلق سندھ کے مشہور بزرگ، صوفی شاہ ثناء اللہؒ کی ذات گرامی سے ہے۔

حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ 1065ھ میں بمقام ”میراں پور“ پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگوں کا تعلق بغداد سے تھا، جو بعد میں ترک سکونت کر کے اوج شریف (ضلع بہاولپور) میں آباد ہوئے۔ صوفی شاہ عنایتؒ کو مرشد کی تلاش ہوئی تو آپ ملتان تشریف لائے اور ایک بزرگ، شمس شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا مدعا بیان کیا۔ حضرت شمس شاہؒ کچھ دیر مراقبہ کی حالت میں رہے، پھر ایک نو عمر طالب معرفت کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”عنایت! اگر تمہیں واقعی مرشدِ کامل کی تلاش ہے تو دکن جاؤ اور شیخ وقت، حضرت شاہ عبدالملک برہان پوریؒ کی خدمت میں حاضری دو اور اپنا دامن اس وقت تک پھیلاتے رہو، جب تک حضرت شیخؒ تمہارے دامن کو گوبر مقصود سے بھر نہ دیں۔“

حضرت شمس شاہؒ کی ہدایت کے مطابق حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ، حضرت شیخ عبدالملک برہان پوریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ”بیعت“ سے سفرِ بازو ہوئے۔ پھر روحانی تربیت کی تکمیل کے بعد صوفی شاہ عنایتؒ، پیر و مرشد کے حکم پر دہلی تشریف لائے۔ یہاں حضرت شاہ غلام محمدؒ مقیم تھے، جو علوم ظاہری کے بڑے عالم تھے۔ حضرت صوفی شاہ عنایتؒ نے کئی سال تک حضرت شاہ غلام محمدؒ سے علوم ظاہری کی تعلیم حاصل کی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت صوفی شاہ عنایتؒ دنیادی علوم میں حضرت شاہ غلام محمدؒ کے شاگرد تھے۔ مگر جب شاہ غلام محمدؒ نے اپنے شاگرد کا زہد و تقویٰ دیکھا تو وہ روحانی تعلیم حاصل کرنے کے لئے صوفی شاہ عنایتؒ کے مرید ہو گئے۔

علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ عبدالملک برہان پوریؒ کی اجازت سے حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ ٹھٹھہ تشریف لائے۔ شاہ غلام محمدؒ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔

صوفی شاہ عنایتؒ نے ٹھٹھہ میں خانقاہ قائم کی اور پورے زور و شور کے ساتھ اپنی روحانی تعلیمات اور رشد و ہدایت کا آغاز کرنا چاہا۔ مگر کچھ دن بعد ہی علمائے ٹھٹھہ سے آپ کے اختلافات شروع ہو گئے۔ پھر یہ اختلافات اس قدر بڑھے کہ ہنگامہ آرائی کی صورت اختیار کر گئے۔

بعض روایتوں کے مطابق حضرت صوفی شاہ عنایتؒ، سجدہ تعظیمی کو جائز سمجھتے تھے۔ علمائے ٹھٹھہ اور صوفی شاہ ثناءؒ کے درمیان اختلاف کا بنیادی سبب یہی سجدہ تعظیمی تھا۔

شاہ غلام محمدؒ جو صوفی شاہ عنایتؒ کے مرید بھی تھے، پیر و مرشد کی محبت و عقیدت میں سجدہ تعظیمی ادا کرتے تھے۔ جب علمائے ٹھٹھہ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو شاہ غلام محمدؒ کو اسلامی عدالت میں طلب کر کے کہا۔

”آپ اس غیر شرعی رسم سے باز آ جائیں اور توبہ کر لیں۔“

شاہ غلام محمدؒ نے یا آواز بلند کہا۔ ”میں سجدہ تعظیمی کو گناہ نہیں سمجھتا۔ پھر کس چیز سے توبہ کروں؟“ ابھی یہ بحث و مباحثہ جاری تھا کہ حضرت صوفی شاہ عنایتؒ عدالت میں تشریف لائے۔ اپنے پیرومرشد کو دیکھ کر شاہ غلام محمدؒ والہانہ انداز میں آگے بڑھے اور علمائے ٹھٹھہ کے سامنے حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ کو سجدہ تعظیمی ادا کیا۔

شاہ غلام محمدؒ کے اس طرز عمل پر علمائے ٹھٹھہ برہم ہو گئے۔ اور شاہ غلام محمدؒ کو سزا دی۔ کسی تذکرہ نگار نے سزا کی تفصیل نہیں لکھی۔ مگر بعد میں صوفی شاہ عنایتؒ اور شاہ غلام محمدؒ کو ٹھٹھہ بدر کر دیا گیا۔ ٹھٹھہ سے نکلنے کے بعد صوفی شاہ عنایتؒ نے شاہ غلام محمدؒ کو دہلی جانے کی ہدایت کی اور خود میراں پور تشریف لے آئے۔ میراں پور ”جھوک“ کے نام سے مشہور ہے۔



جھوک میں آنے کے بعد حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ نے دوسری خانقاہ قائم کی، جو بہت جلد عوام کے دل و نگاہ کا مرکز بن گئی۔ اور ہزاروں طالبان حق دور دراز کا سفر طے کر کے جھوک میں جمع ہونے لگے۔

حضرت صوفی شاہ عنایتؒ کی تعلیمات کا مختصر جائزہ یہ ہے کہ آپ اونچ نیچ کے فرق کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ امیر و غریب ایک صف میں کھڑے ہو کر قومی مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔ آپ کی تعلیمات میں عوام کے لئے ایک خاص کشش تھی۔ نتیجتاً دوسری خانقاہوں کی سرگرمیاں سرد پڑنے لگیں۔

حضرت شاہ صوفی عنایت اللہؒ کی آمد سے قبل اس علاقے میں سادات بلری کی خانقاہ بہت مشہور تھی۔ صوفی شاہ عنایتؒ کے ذاتی زہد و تقویٰ اور تعلیمات نے مقناطیس کا اثر دکھایا اور ”سادات بلری“ کے مرید بھی خانقاہ عنایتیہ کا رخ کرنے لگے۔

جب میر کارواں میں خوئے دلنوازی موجود نہ ہو تو لوگ کارواں سے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ آخر سادات بلری کے مریدوں کی ایک بڑی تعداد حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ کی خانقاہ میں جمع ہو گئی۔ تذکرہ نگاروں کے بقول بلری کے شیخ کو اپنی دکان بند ہونے کا اندیشہ ہوا تو وہ براہ راست صوفی شاہ عنایتؒ کے پاس پہنچ گئے۔ اور تنبیہ آمیز لہجے میں کہنے لگے۔

”آپ سادات بلری کے مریدوں کو اپنی خانقاہ میں آنے سے روکیں۔ اور جو آگئے ہیں، انہیں بلا تکلف یہاں سے اٹھا دیں۔“

حضرت صوفی شاہ عنایتؒ نے ”بلری کے پیر“ کی بات سنی اور اپنے مخصوص تبسم دلنواز کے ساتھ فرمایا۔ ”فقیر کے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں۔ اگر کوئی کافر بھی میرے گھر آئے گا تو میں اس کے ساتھ بھی بدسلوکی نہیں کروں گا۔ وہ بیٹھے یا چلا جائے۔ میں تو صرف پیغام حق سنانا ہوں۔ کوئی سنے یا اپنی سماعت بند کر لے۔ اور جو بیٹھ گئے، سو بیٹھ گئے۔ میں کون ہوتا ہوں انہیں اٹھانے والا۔“ سادات بلری کے شیخ مایوس ہو کر چلے گئے۔ اور ”صوفیت“ سیاست میں بدل گئی۔ سادات بلری میں سید عبدالواسع نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور اس وقت ”شیخ محترم“ سمجھے جاتے تھے۔

سید عبدالواسع نے بڑی ذہانت سے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ گرد و نواح کے زمینداروں کو اپنے ساتھ ملایا اور گورنر ٹھٹھہ، میر لطف علی خان کے پاس جا پہنچے اور صوفی شاہ عنایتؒ کی شکایتیں شروع کر دیں۔

میر لطف علی خان ایک زمانہ ساز اور عیار حاکم تھا۔ اس نے اپنی سیاست کو تزیین چکانے کے لئے سید عبدالواسع

لساٹھا دیا۔ کیونکہ ان کی پشت پر با اثر زمیندار بھی تھے۔ ایک حاکم کی حیثیت سے میر لطف علی خان کا فرض تھا کہ وہ اپنی دیانت داری کے ساتھ واقعے کی تحقیقات کراتا اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق اپنا فیصلہ سناتا۔ مگر ایک بے خبر حاکم نے انتہائی سنگ دلا نہ روش اختیار کی اور سید عبدالواسع سے صاف صاف کہہ دیا۔

”پہلے تم آپس میں سمجھ لو۔ بعد میں ہم دیکھ لیں گے۔“

در پردہ ایک درویش کے خلاف جارحیت کی قانونی اجازت دے دی گئی تھی۔

درویش، پیغام حق سننے میں مصروف تھا اور دنیا دار پیر اس کے خلاف منصوبہ سازی میں غرق تھے۔ آخر سازش کے خدو خال میں فتنہ انگیزی کے رنگ بھر دیئے گئے۔

ان زمینداروں میں پرگنہ پلچا کا رہنے والا ایک شخص، نور محمد بھی تھا، جس کے متعلق بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ ابوجہل کی اولاد میں سے تھا۔ نور محمد نے آس پڑوس کے علاقوں سے طاقتور اور جوان سال لوگ بلائے اور انہیں لے کر حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ کی خانقاہ پر چڑھ دوڑا۔

قرآن و سنت کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے درویش، ستم گروں کے یہ انداز دیکھ کر حیران رہ گئے۔ حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ نے نور محمد کے مسلح آدمیوں کو بہت سمجھایا۔

”میرے اور تمہارے درمیان کیا جھگڑا ہے؟ تم جن لوگوں کو قتل کرنے آئے ہو، ذرا انہیں ایک نظر دیکھ تو لو۔ ان کے سامنے قرآن کریم اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے نسخے کھلے ہوئے ہیں اور وہ اس کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ تم کن لوگوں سے جنگ کرنے آئے ہو؟“

نور محمد اور اس کے مسلح غنڈوں پر ایک درویش کے کلام نرم و نازک کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر مجبور ہو کر حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ نے اپنے شاگردوں کو حکم دے دیا۔

”اللہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ ہم نے کسی کی حق تلفی نہیں کی۔ اپنے دفاع کے لئے تم بھی ہتھیار اٹھا لو۔“ اس لڑائی میں حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ کے چند فقراء شہید ہوئے۔ دوسری طرف نور محمد کے بھی کچھ آدمی زخمی ہوئے مگر کسی کی موت واقع نہیں ہوئی۔

جب یہ ہنگامہ سرد پڑ گیا تو حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ نے بادشاہ کی عدالت میں مرنے والوں کے قصاص کا مقدمہ دائر کیا۔ کچھ دن بعد عدالت عالیہ سے حکم صادر ہوا کہ مجرموں کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے۔ میر لطف علی خان گورنر ٹھٹھہ، مجرموں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اس نے نور محمد سے کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو لے کر کچھ دن کے لئے روپوش ہو جائے۔ پھر جب سارے مجرم محفوظ پناہ گاہوں میں چلے گئے تو میر لطف علی خان نے بادشاہ کے نام پر چڑھ لکھا۔

”حضور! میرے سپاہیوں نے جگہ جگہ چھاپے مارے، مگر مجرم فرار ہو چکے ہیں۔ اس لئے مجھے حکم کی تعمیل سے معذور سمجھا جائے۔“

عدالت عالیہ نے جلد ہی دوسرا فیصلہ سنا دیا۔ ”قاتلوں کی زمینداری“ ”خون بہا“ کے طور پر مقتولین کے درماء کے حوالے کر دی جائے۔“

میر لطف علی خان اس حکم کو ٹالنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ مجبوراً اس نے نور محمد اور دوسرے قاتلوں کی زمینیں ضبط کر کے درویشوں کے وارثوں کے سپرد کر دیں۔

نور محمد اور اس کے ساتھیوں کے دفع ہو جانے کے بعد ان غریب لوگوں نے سکون کی سانس لی جو ایک زمانے

سے جابر زمینداروں کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ تمام لوگ، حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے اور درود کر عرض کرنے لگے۔

”شیخ! آپ کی ذات بابرکات کے طفیل میں زمینداروں اور جاگیرداروں کی چیرہ دستیوں سے نجات حاصل ہوئی۔“

جواب میں حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ نے فرمایا۔ ”حق تعالیٰ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں تمہاری معاشی تنگی کے ساتھ دلوں کی تنگی بھی دور فرما دے۔ رزق کے ساتھ ہدایت کے دروازے بھی کھول دے۔“



اس الم ناک واقعے کے بعد حضرت صوفی شاہ عنایت کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا اور طالبانِ حق کا ہجوم اور بڑھ گیا۔ اپنے آستانے پر مشتاقانِ دید کی بھیڑ دیکھ کر آپ بھی فرمایا کرتے تھے۔
”میں بازارِ عشق میں شہرت کا یہ سودا (سامان) لے کر نہیں آیا تھا۔ اور نہ اس شور و شغب کی آرزو رکھتا تھا کہ میرے سامنے ہنگامہ دار دگیر برپا ہو۔

مقامی باشندے سمجھ رہے تھے کہ نور محمد اور اس کے ساتھیوں کی جاگیریں ضبط ہونے کے بعد میراں پور (جھوک) کی فضا ہمیشہ کے لئے پرسکون ہو گئی ہے۔ مگر کسی کو خبر نہیں تھی کہ زمین کے اندر ہی اندر لاوا پک رہا ہے۔ اور ایک نیا آتش فشاں پھٹنے کے انتظار میں ہے۔

1127ھ میں میر لطف علی خان کا تاجدار ہو گیا۔ اور نواب اعظم خان، ٹھٹھہ کا گورنر بن کر آیا۔ نور محمد کے دوستوں میں ایک شخص حمل جٹ بھی تھا جو حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ اور اس وقت کی تلاش میں رہتا تھا کہ کب موقع ملے اور کب وہ فتنے کی آگ دوبارہ بجڑ کائے۔ پھر جیسے ہی نواب اعظم خان، ٹھٹھہ پہنچا، حمل جٹ نے گورنر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔

”حضور! آپ آئے ہیں تو یہ امید پیدا ہو چلی ہے کہ اس علاقے کا ظلم و نسق بحال ہو جائے گا۔“
نواب اعظم خان نے سوالیہ نظروں سے حمل جٹ کی طرف دیکھا۔ ”بد نظمی سے تمہاری کیا مراد ہے؟“
”حضور! آپ سے پہلے میر لطف علی خان، حاکم ٹھٹھہ تھا۔ یہ سارا انتشار اور بد نظمی اسی کی نااہلی کے سبب ہے۔“
حمل جٹ نے بڑی عیاری کے ساتھ اپنے سازشی منصوبے کا آغاز کیا۔ ”میر لطف علی خان نے جھوک کے درویشوں کو اتنی چھوٹ دے دی ہے کہ وہ روز بہ روز طاقت پکڑتے جا رہے ہیں۔“

نواب اعظم خان نے دوسرے جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرف دیکھا، جو نئے حاکم کے سلام کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے حمل جٹ کی ہاں میں ہاں ملائی اور صوفی شاہ عنایت اللہ کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔

ایک درویش سے جاگیرداروں کی عداوت کا ایک ہی سبب تھا کہ حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ کے آتے ہی اس علاقے کی پوری فضا بدل گئی تھی۔ مقامی زمینداروں نے صدیوں سے مزدوروں اور کسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ غریبوں کے ذہن و دل سے غیرت و حمیت اس حد تک رخصت ہو چکی تھی کہ وہ ادبِ جاگیرداروں کو اپنا آقا اور ”ان داتا“ سمجھنے لگے تھے۔ حضرت صوفی شاہ عنایت کی تعلیمات نے انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ سینوں میں دفن ”غیرت و خودداری“ کے مردہ جذموں کو دوبارہ زندہ کیا۔ یہاں تک کہ جھکے ہوئے سرواٹے ہوئے۔ اور بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طنائیں کاٹ کر پھینک دیں۔ پہلے رئیسوں اور جاگیرداروں کی محفلوں میں

سوالیوں کا جہوم رہتا تھا۔ اب یہی بھیڑ، حضرت صوفی شاہ عنایتؒ کی خانقاہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ بس یہی بات مقامی جاگیرداروں اور زمینداروں کو گراں گزری تھی۔ اسی لئے وہ نواب اعظم خان کے سامنے ایک مرد درویش پر بہتان تراش رہے تھے۔

اس محفل میں ”سادات بلری“ کے سربراہ، شیخ محترم سید عبدالواسع بھی موجود تھے۔ اور انہیں بھی حضرت شاہ عنایتؒ سے پرانا حساب بے باق کرنا تھا۔ اور وہ حساب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ان کے بہت سے مرید نوٹ کر حضرت شاہ عنایتؒ سے جا ملے تھے۔ نتیجتاً سید عبدالواسع نے بھی شاہ عنایتؒ کی سرکشی کے افسانے خوب خوب بیان کئے۔

پھر کچھ زمینداروں نے دروغ گوئی کی انتہا کر دی۔ ”حضور! یہ درویش، مرکز کے خلاف بغاوت کی خفیہ تیاریاں کر رہے ہیں۔“

دنیا کے ہر حاکم کے لئے سب سے ناپسندیدہ لفظ بغاوت ہی ہوتا ہے۔ نواب اعظم خان بھی بغاوت کا نام سن کر ہلکا اٹھا۔ اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے فوجی دستے کے ہمراہ ”جھوک“ روانہ ہو گیا۔



”جھوک“ پہنچتے ہی نواب اعظم خان، مقامی زمینداروں سے ملا۔ زمینداروں نے نواب اعظم خان کو ایک ایسی ترکیب بتائی کہ جس سے ان کے ذاتی مقاصد بھی پورے ہو جاتے اور حکومت کی کارروائی پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔ نواب اعظم خان نے مقامی درویشوں کو طلب کر کے ان سے زمینوں کی مالگاری طلب کی۔

جواب میں فقراء نے کہا، ”شہنشاہ ہند کے حکم سے فقراء کی مالگاری معاف کی جا چکی ہے۔ پھر اس کے طلب کرنے کا کیا جواز ہے؟ اگر والی ہند نے اپنا پہلا حکم منسوخ کر دیا ہے تو وہ حکم نامہ ہمیں دکھا دیا جائے۔ ہم اس پر بلا تاخیر عمل کریں گے۔“

جھوک کے درویشوں نے نہایت معقول بات کہی تھی۔ مگر مقامی زمینداروں نے نواب اعظم خان کے کان بھرے۔ ”آپ نے دیکھا کہ یہ درویش ایک طرف اپنے زہد و تقویٰ کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ سے حکم شای طلب کرتے ہیں۔ یہ ان کے دلوں کی کجی اور ذہنوں کی ٹیڑھ ہے، جو دراصل بغاوت کی ابتدا ہے۔“

نواب اعظم خان ایک دنیا دار حاکم تھا۔ زمینداروں کے فریب میں آ گیا۔ اور اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فرماں روانے ہندوستان کی خدمت میں عریضہ ارسال کر دیا۔

”یہ لوگ بظاہر درویش ہیں..... مگر عیش و آرام کے سبب دنیا داری ان کے رگ و پے میں اتر چکی ہے۔ مجھے کچھ ایسی خفیہ اطلاعات بھی ملی ہیں کہ یہ فقراء درپردہ اپنی افرادی قوت بڑھا رہے ہیں اور مرکز کے خلاف ان کے ارادے نیک نہیں ہیں۔“ مختصر آئیہ کہ نواب اعظم خان نے اپنے مکتوب میں جھوک کے درویشوں کو باغی ثابت کر دیا تھا۔

اس وقت شہنشاہ عالمگیر، دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے بڑے بیٹے، شاہ عالم کو شکست دے کر چھوٹا بیٹا جہاندارشاہ، برسر اقتدار آچکا تھا..... اور وہ ایک نہایت ادبаш حکمران تھا۔ جہاندارشاہ نے اس علاقے کے حاکم، یار محمد کلہواڑ کے نام فرمان شای بھیج دیا۔

”فوری طور پر اس فتنے کا انسداد کیا جائے۔“

چند فقیروں کی بات تھی..... مگر جہاندارشاہ نے شراب کے نشے میں اسے کوئی بڑی سنگین بغاوت سمجھ لیا اور ایسا

حکم جاری کر دیا کہ نواب اعظم خان کو کھلی چھوٹ مل گئی اور اس نے خدایار خان عباسی کو درویشوں کے پیچھے لگا دیا۔ خدایار خان عباسی، حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ سے پر خاش رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ہم نواز زمینداروں کو ملا کر ایک بڑی فوج کے ساتھ درویشوں کی بستی پر یلغار کر دی۔

یہ صورت حال دیکھ کر حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ کے مریدوں نے پیر و مرشد سے درخواست کی کہ منافقین کی آمد سے پہلے مدافعتی راستہ اختیار کیا جائے۔ مگر حضرت شاہ عنایت نے انکار کر دیا کہ صوفیاء کے لئے یہ اقدام جائز نہیں۔

آخر خدایار خان عباسی اور مقامی زمینداروں نے آگے بڑھ کر مکمل طور پر درویشوں کی بستی کا محاصرہ کر لیا۔ جب درویشوں کی جماعت محصور ہو گئی تو مجبوراً حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ نے اپنے مریدوں کو اجازت دے دی کہ مدافعت کے اصول کے مطابق وہ حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔

حملہ آوروں کے پاس اس وقت کے مطابق جدید ترین اسلحہ تھا..... اور درویشوں کے پاس صرف تلواریں یا برچھے..... بعض تاریخی روایتوں کے مطابق درویش بڑی شجاعت سے لڑے۔ کئی بار خدایار خان عباسی اور مقامی زمینداروں کے سپاہیوں کو پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ محاصرہ تقریباً چار ماہ تک جاری رہا۔

آخر 9 صفر 1130ھ کو حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ بھی اپنے مریدوں کے ساتھ مقابلے کے لئے نکلے..... اور شدید جنگ چھڑ گئی۔ کچھ مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ اور ان کے رفقاء بڑی جانبازی سے لڑے۔ جس کے باعث مقابل فوج بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ آخر محمد خان اور شہداد بلوچ نے جو اس فوج کے سالار تھے، نئی چال چلی۔ یہ دونوں سفید پرچم لئے ہوئے آگے بڑھے جیسے مقابل کے لئے صلح کا پیغام لے کر آ رہے ہوں۔

جنگ عارضی طور پر روک دی گئی۔ محمد خان اور شہداد خان، حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قرآن حکیم کو سامنے رکھ کر قسم کھائی۔ ”اگر آپ خود کو نواب اعظم خان کے سامنے پیش کر دیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے جان و مال محفوظ رہیں گے۔“

حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ نے اس معاہدے کے مطابق 15 صفر 1130ھ کو ہتھیار رکھ دیئے اور خود کو نواب اعظم خان کے حوالے کر دیا۔

جیسے ہی حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ، حاکم ٹھٹھہ کے سامنے آئے، نواب اعظم خان نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ ”تمہیں تو درویشی کا دعویٰ ہے۔ پھر تم نے یہ شورش کیوں برپا کی؟ تمہاری جگہ تو گوشہ خانقاہ میں تھی۔ پھر تم میدان جنگ میں کیوں نکلے؟“

اعظم خان کے پہلے ہی سوال سے ظاہر ہو گیا تھا کہ قرآن کریم کو سامنے رکھ کر کیا جانے والا معاہدہ ایک فریب تھا۔ اگر محمد خان اور شہداد بلوچ کے الفاظ میں ذرا بھی صداقت ہوتی تو نواب اعظم خان اس قدر جارحانہ رویہ اختیار نہ کرتا۔

حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ ایک صاحب کشف بزرگ تھے۔ وہ صورت حال کو سمجھ گئے تھے۔ اس لئے آپ نے بے باکانہ لہجے میں فارسی زبان کا یہ شعر پڑھا۔

ایں بود نصیب ما ز دیوان قضا

ما را چہ گناہ ، قسمت ما ایں کرند
(میرا یہ نصیب، قضا کے دفتر میں لکھ دیا گیا تھا۔ اس لئے میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا، میری قسمت نے کیا۔ ترجمہ)

درباری شاعر، شیخ محمد رضا، نواب اعظم خان کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے حاکم ٹھٹھہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنا شعر با آواز بلند پڑھا۔

”خواب کی دنیا سے نکل کر ہوش میں آؤ اور کوئی بے ہودہ بات نہ کر کہ تیرا حساب ہونے والا ہے۔“ (ترجمہ)
خوشامدی شاعر کا شعر سن کر حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ نے ایک اور شعر پڑھا۔
”میں نے تو اپنی ساری زندگی نیک نامی کے گلوچے میں گزاری۔ اگر تم اسے پسند نہیں کرتے تو میری تقدیر کو بدل ڈالو۔“ (ترجمہ)

”اب تم اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہو۔“ نواب اعظم خان نے تند و تیز لہجے میں کہا۔
حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ نے نواب اعظم خان سے اس بدعہدی کی کوئی شکایت نہیں کی کہ محمد خان اور شہداد بلوچ، قرآن کریم کی قسم کھا کر سزا نہ دینے کا یقین دلا کر یہاں لائے تھے، پھر میرے ساتھ یہ کیا سلوک ہو رہا ہے؟ بس ایک صوفی جان باز کے لہجے میں اتنا ہی فرمایا۔

”مصائب، اولیاء اللہ کے لئے ایسے ہی ہوتے ہیں، جیسے سونے کے لئے آگ۔“
حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ کے اس قول مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح آگ، سونے کو تپا کر کندن بنا دیتی ہے، اسی طرح شدید مصائب بھی اولیاء کو آزمائش کے مرحلے سے گزار کر انہیں منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔
نواب اعظم خان نے حضرت صوفی شاہ عنایتؒ سے مزید جرح کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اپنے آپ کو بدنام نہ کرتے تو یہ بلائیں بھی تم پر نازل نہ ہوتیں۔ قانون سلطنت میں تمہاری ان حرکات کی ایک ہی سزا ہے کہ تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔“

جواب میں حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ نے نہایت شجاعت و استقامت کے لہجے میں فرمایا۔ ”تمہارا قانون سلطنت، قتل تو کر سکتا ہے..... مگر مجھ پر موت وارد نہیں کر سکتا۔“

ہرگز نمیر دآں کی دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(جن کے دل، عشق کے جذبہ صادق سے زندہ ہو جاتے ہیں، انہیں موت کے ہاتھ ہرگز نہیں چھو سکتے..... اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ دنیا کے جریڈے پر ہماری حیات دوام کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ترجمہ)

مختصر آئیے کہ اس بحث و مباحثے کے بعد نواب اعظم خان نے حضرت صوفی شاہ عنایتؒ کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ پھر جب قاتل، برہنہ شمشیروں کے ساتھ حضرت شاہ عنایتؒ کے سامنے نمودار ہوئے تو آپ نے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ قاتلوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

رہا بندی مرا از قید ہستی
جزاک اللہ فی الدارين خیرا

(تم نے مجھے زندگی کی قید سے رہائی دے دی۔ اللہ دونوں جہان میں تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ ترجمہ)
اس کے بعد حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ شہید کر دیئے گئے۔ سندھ کی تاریخ کا یہ اندوہناک واقعہ صفر

1130ھ کی آخری تاریخوں میں پیش آیا۔

”تحفۃ الکرام“ کے مصنف، شیر علی قانع نے ان واقعات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”9 صفر 1130ھ کو حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ گرفتار کئے گئے اور نواب اعظم خان، آپ کو اسی حالت میں لے کر ٹھٹھ پہنچا۔ جب شاہ عنایت کی گرفتاری کی خبر عام ہوئی تو ٹھٹھ کے ایک اور جلیل القدر عالم، مخدوم رحمت اللہ، نواب اعظم خان کے پاس پہنچے اور نہایت پُر زور الفاظ میں مخالفت کی۔

”آپ کو شاہ صاحب کی گرفتاری سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ سوائے اس کے کہ چند ادبаш زمیندار اور جاگیردار خوش ہو جائیں گے کہ شاہ صاحب ان کے ظلم و تشدد کے راستے کی دیوار ہیں۔ اگر علم اور روحانیت کی یہ دیوار گر گئی تو مخلوق خدا کو شدید نقصان پہنچے گا..... اور آپ بھی نیک نام نہیں ٹھہریں گے۔“

مگر نواب اعظم خان پر دولت و اقتدار کا نشہ طاری تھا۔ مخدوم رحمت اللہ کی ایک ایک بات رائیگاں گئی نواب اعظم خان کا خیال تھا کہ صوفی شاہ عنایت ایک کمزور انسان ہیں۔ وہ خود کو مجبور پا کر حاکم ٹھٹھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں گے اور زندگی بخش دینے کی درخواست کریں گے۔ مگر جب صوفی شاہ عنایت نے ایک درویش کی زبان میں گفتگو کی اور اپنی جان کے زیاں کو بے حقیقت جانا تو حاکم ٹھٹھ کی انا پر شدید ضرب لگی اور اس نے ایک مرد قلندر کے قتل کا فیصلہ کر لیا۔

مخدوم رحمت اللہ، نواب اعظم خان کے دربار سے نکل کر میدانِ عمل میں آئے اور حاکم ٹھٹھ کے اس ظلم کے خلاف پوری شدت سے آواز بلند کی۔ دیگر صاحبانِ اقتدار کو پکارا۔

”ایک مرد خدا اپنے خون میں نہا جانے کو ہے..... اور تم اپنے اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے ہو۔ نواب اعظم خان کی دراز دتی کو روکو۔“

مگر حضرت مخدوم رحمت اللہ کا یہ احتجاج بھی بے سود ثابت ہوا۔ پھر آپ ٹھٹھ شہر چھوڑ کر جانے لگے کہ شاید اس طرح ایوانِ اقتدار میں بالکل ہو..... اور نواب اعظم خان اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ مگر یہ ایک درویش کی معصومیت تھی۔ امراء کے طبقے نے اس خبر کو سنا اور ان کی سردمہری میں مزید اضافہ ہو گیا..... بلکہ کسی حد تک خوشی ہوئی کہ ان کے راستے کی ایک اور دیوار خود بخود ٹوٹ گئی۔

میر شیر علی قانع کے بقول نواب اعظم خان پر مخدوم رحمت اللہ کے احتجاج اور شہر چھوڑ کر چلے جانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ کو چند روز قید میں رکھا، طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں، اور پھر شہید کر دیا۔

نواب اعظم خان کے اس ظالمانہ طرزِ عمل سے مقامی درویش، علماء اور عوام اس سے سخت نفرت کرنے لگے۔ حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ کی شہادت کے بعد ایک اور حکم جاری کیا گیا۔ ”اگر کوئی شخص، اللہ کا نام اپنی زبان سے نکالے گا، اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔“ اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص بھی با آواز بلند ”اللہ“ کا نام لے گا، اسے زندگی سے محروم کر دیا جائے گا۔

کسی مؤرخ یا تذکرہ نگار نے نواب اعظم خان کے اس حکم کی توجہ پیش نہیں کی۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ اور ان کے مرید و عقیدت مند کسی خاص موقع پر ”اللہ“ کا نعرہ لگاتے تھے، جس کی گونج دُور تک سنائی دیتی تھی۔ نواب اعظم خان نے دراصل اسی نعرے پر پابندی لگائی تھی کہ حضرت شاہ عنایت کی تحریک دم توڑ دے اور حاکم ٹھٹھ کے خلاف عوامی نفرت میں اضافہ نہ ہو سکے۔

حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ کا مزار، جھوک میں ہے..... اور یہ درگاہ، سندھ کی بڑی درگاہوں میں شمار ہوتی ہے۔



حضرت شاہ عنایتؒ کی شہادت کے وقت حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی عمر مبارک اٹھائیس سال تھی۔ شاہ صاحبؒ اور جوگیوں کا ساتھ تین سال رہا۔ آپ 1122ھ میں طویل سیر و سیاحت پر نکلے تھے اور 1124ھ میں اپنے گھر واپس لوٹ آئے تھے۔ اس وقت ہر طرف حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ کی روحانیت کی دھوم تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ بھی ان اثرات سے محفوظ نہیں رہے ہوں گے..... اور حضرت شاہ عنایتؒ کی بارگاہ جلال میں ضرور حاضر ہوئے ہوں گے۔ تاریخی حوالوں سے تو ان ملاقاتوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا..... لیکن درمیان میں ایک ایسا سلسلہ ضرور موجود ہے، جو دونوں بزرگوں کے ربط خاص کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک اور بزرگ، حضرت شاہ صوفی اسماعیلؒ بھی تھے جو حضرت شاہ عاشق اللہؒ کے مرید تھے۔ مگر حضرت شاہ عنایتؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور اکثر شاہ عنایتؒ کی روحانی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہی شاہ اسماعیل صوفیؒ، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے بھی خاص دوست تھے۔ اگر کسی خاص مجبوری کے تحت حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، حضرت شاہ عنایتؒ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے ہوں گے تو شاہ اسماعیل صوفیؒ نے اس مرد شہید کی روحانی عظمتوں کا ذکر ضرور کیا ہوگا۔ اور پھر یہی غائبانہ ذکر، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کو حضرت شاہ عنایتؒ کے قریب لے گیا ہوگا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پر تحقیقی کام کرنے والوں نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ”شاہ جو رسالو“ میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں، جن کے متعلق خیال گزرتا ہے کہ وہ صوفی شاہ عنایتؒ کی شہادت سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔

ایک درویش تو کسی چیونٹی کے مسلے جانے پر بھی اُداس ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ عنایتؒ کا قتل تو ایسا الم ناک واقعہ تھا کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اسے محسوس کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ نتیجتاً آپؒ کی اُداسیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ عشق کی ناکامی نے آپؒ کو جوگیوں کے ساتھ در بدر پھرایا۔ اور جب وطن میں واپس لوٹے تو حضرت شاہ عنایتؒ کی شہادت نے آپؒ کے قلب حساس میں نیا شکاف ڈال دیا اور آنکھوں کو خوں بار بنا دیا۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پہلے ہی دنیا سے بیزار ہو چکے تھے۔ اس واقعے نے آپؒ کی اُداسیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ حضرت صوفی شاہ عنایت اللہؒ ایک غریب درویش تھے۔ ان پر اُمراء کے طبقے نے ناقابلِ تلافی ستم ڈھایا۔ اسی طرح خود حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ بھی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ صاحبؒ کو اپنی غربت کا احساس اس وقت ہوا، جب ان کے بزرگوں نے ارغون قبیلے کے سردار، مرزا مغل بیگ کی بیٹی کے لئے اپنے بیٹے کا رشتہ بھیجا۔ اگر شریفانہ انداز میں انکار کر دیا جاتا تو شاید بات اتنی نہ بگڑتی۔ لیکن جس طرح حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کو اذیتیں پہنچانی گئیں، اس نے ایک صوفی کو اُمراء کے طبقے سے ہمیشہ کے لئے متفر کر دیا۔ شاہ صاحبؒ کی زندگی کا یہی وہ نازک موڑ ہے، جس نے آپؒ کے دل میں سوز و خلش کے بیج بوئے۔ پھر جب فصل تیار ہوئی تو آپؒ ”درد“ کی لازوال دولت سے مالا مال ہو چکے تھے۔ اور پھر اسی درد نے آپؒ کو تمام دنیا کے غریبوں کا ترجمان بنایا اور زبان شاعر سے وہ کلمات ادا ہوئے، جن پر سندھی شاعری ہمیشہ نازاں رہے گی۔ یہ ٹھکرائے جانے کا ردِ عمل ہی تھا کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے اندر سویا ہوا عظیم شاعر بیدار ہوا۔ اگر مرزا مغل بیگ آسانی کے ساتھ اپنی لڑکی کے

لئے حضرت شاہ صاحبؒ کا رشتہ قبول کر لیتا تو بہت ممکن تھا کہ ہم اس عظیم شاعر کے افکار سے محروم رہ جاتے۔ نہ قلب شاعر پر اس شدت سے چوٹ لگتی اور نہ سوز و ساز کے یہ آثار پھوٹتے، جو تین سو سال سے عشاق کے تشنہ کام قافلے کو سیراب کر رہے ہیں۔



حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے عشق کی ناکامی آپ کو ان ٹھکرائے ہوئے انسانوں کے قریب لے گئی، جو محبت کی ایک نظر اور اپنائیت کے ایک لفظ کے لئے صدیوں سے ترس رہے تھے۔ ایک بار شاہ صاحبؒ، شاہ بندر کے علاقے کی طرف سے گزر رہے تھے۔ ایک رات آپ نے ایک ایسے گاؤں میں قیام کیا، جہاں شتر بانوں کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ ان خانہ بدوش اور غریب لوگوں میں گھل مل گئے اور شتر بانوں سے ان کے حالات دریافت کرتے رہے۔

پھر صبح ہوئی تو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے ایک نہایت تکلیف دہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ چند اونٹ آپ کے قریب سے چیختے ہوئے گزرے۔ کچھ دور جا کر وہ اونٹ دوبارہ پلٹے۔ ان کی چیخوں سے پورا میدان گونج رہا تھا۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ حیرت و تکلیف کے ساتھ یہ منظر دیکھتے رہے۔ پھر جب ان چیختے ہوئے اونٹوں کو کسی طور قرار نہیں آیا تو شاہ صاحبؒ نے اونٹوں کے مالکوں سے پوچھا۔

”آخر ان بے چاروں کو کیا تکلیف ہے کہ یہ پورے میدان میں بلبلاتے پھر رہے ہیں..... اور کسی طرح بھی ان کی چیخیں نہیں رکتیں؟“

اونٹوں کے مالکوں نے نہایت غم زدہ لہجے میں صورت حال بیان کرتے ہوئے عرض کیا۔

”یہاں قریب ہی ڈیرہ نام کا ایک گاؤں ہے اور اس کا حاکم بہت ظالم انسان ہے۔ اس کے گاؤں کی طرف سے جو اونٹ بھی گزرتا ہے، وہ اسے اپنے آدمیوں سے پکڑا لیتا ہے۔ پھر وہ روٹی اور کپڑے کے گولے بنا کر اونٹوں کی دُموں میں بندھوا دیتا ہے۔ اس کے بعد اپنے آدمیوں سے گولوں میں آگ لگوا دیتا ہے۔۔۔ پھر جب اس آگ کی سوزش سے اونٹ چیختے ہوئے ادھر ادھر بھاگتے ہیں تو وہ حاکم اپنی خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

”یہ میرے لئے ایک پُر لطف تماشا ہے، جس سے مجھے قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔“

یہ واقعہ سن کر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور اذیت کے آثار صاف نظر آنے لگے۔

”کیا ان اونٹوں کے ساتھ بھی یہی ظالمانہ سلوک کیا گیا ہے؟“

”یہ بد نصیب اونٹ راستہ بھٹک کر گھاس کی تلاش میں ڈیرہ گاؤں چلے گئے تھے۔“ شتر بانوں نے اداس لہجے میں کہا۔

”اور اس ظالم کو تماشا دیکھنے کا موقع مل گیا۔“

یہ سن کر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ جوشِ اضطراب میں کھڑے ہو گئے۔ اور پھر آپ نے نہایت پُر سوز لہجے میں یہ اشعار پڑھے۔

”خیموں والے آباد رہیں..... جبکہ حلوں والے برباد ہو جائیں..... میں نے اونٹوں کا دودھ پیا ہے..... میں

اس کی شیرینی کو کبھی نہیں بھول سکتا..... شتر بان ہمیشہ شادمان رہیں..... اور انہیں ستانے والے، دودھ کو ترسیں۔“

اس کے بعد حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں شتر بانوں کو مخاطب کرتے ہوئے

فرمایا۔ ”میرے بیٹو! صبر کرو..... بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ یہ محل اُڑنے ہی والے ہیں۔ پھر سارا گاؤں، اونٹوں کی نشست گاہ بن جائے گا۔“

شتر بانوں کو بیٹا کہہ کر پکارنا، اسی دردمندی کی دلیل ہے جو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو غریب طبقے سے تھی۔ پھر کچھ دن ہی گزرے تھے کہ پورا ”ڈیرہ“ گاؤں تباہ ہو گیا۔ مکان ایسے اجڑے کہ میدان بن کر رہ گئے..... اور جب دیکھنے والوں نے دیکھا کہ میدانوں میں ہر طرف اونٹ ہی اونٹ نظر آتے تھے۔ ایک صوفی کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ نے خدوخال اختیار کر لئے تھے۔ اس واقعے کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی بڑی کرامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔



اسی دردمندی نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ذہن و دل کو وسعت بخشی، جو ایک صوفی کی بنیادی پہچان ہوتی ہے۔ مرزا مغل بیگ نے آپ کو جس قدر اذیتیں پہنچائیں، وہ گزشتہ سطور میں رقم کی جا چکی ہیں۔ اگر ان اذیتوں کے جواب میں حضرت شاہ لطیف بھی مغل سردار کو اتنی ہی اذیتیں پہنچاتے تو آپ کا یہ عمل حق بجانب ہوتا اور شریعت اسلامیہ کے عین مطابق۔ کیونکہ قرآن حکیم میں واضح حکم موجود ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ..... اور جان کے بدلے جان..... مگر اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی موجود ہے کہ اگر تم معاف کر دو، تمہارے حق میں یہ بات زیادہ بہتر ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اسی آخری حکم پر عمل کیا۔

اگرچہ حضرت شاہ صاحب مادی اعتبار سے کمزور ہونے کے باعث مرزا مغل بیگ کو اذیت پہنچانے پر قادر نہیں تھے..... لیکن شاہ صاحب ”گواس“ پر تو قدرت حاصل تھی کہ آپ اپنے ”دشمن جان“ سے شدید نفرت کرتے۔ مگر تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا، جس سے برائے نام بھی یہ تاثر ملتا ہو کہ آپ نے مرزا مغل بیگ سے نفرت کی تھی یا کسی موقع پر اسے برے کلمات سے یاد کیا تھا۔

اس کے برعکس شتر بانوں والا واقعہ پوری صحت کے ساتھ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے کہ آپ بے زبان اونٹوں کی تکلیف دیکھ کر خود بھی تڑپ اٹھے تھے اور ڈیرہ کے حاکم کو ایسی بددعا دی تھی کہ پوری بستی ہی ویران ہو کر رہ گئی۔

اس واقعے سے انسانی کردار کا ایک اور اہم پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ فطری طور پر انسان خود پرست ہوتا ہے..... اور اسی تکلیف کو تکلیف سمجھتا ہے، جو اس پر گزر چکی ہوتی ہے۔ باقی تکالیف اُس کی نظر میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ مرزا مغل بیگ کے حوالے سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو مشق ستم بنایا گیا۔ مگر آپ نے اُف تک نہیں کی۔ ہر اذیت کو خاموشی سے برداشت کیا۔ مگر جب کچھ جانور چیتنے ہوئے آپ کے سامنے سے گزرے تو اس قدر بے قرار ہو گئے کہ ستانے والوں کے حق میں بددعا کر بیٹھے۔ ایک صوفی کی یہی شان ہوتی ہے کہ مخلوق خدا کی تکلیف دیکھ کر مضطرب ہو جاتا ہے اور ذاتی غم کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ اور اگر اہل دنیا کا شکوہ بھی کرتا ہے تو صرف حق تعالیٰ کی بارگاہ میں..... وہ بھی سرگوشیوں میں..... اور رات کے سناٹوں میں۔

جب حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی تین سالہ سیاحت کے بعد اپنے علاقے میں واپس تشریف لائے تو کچھ دن بعد ہی مرزا مغل بیگ کا انتقال ہو گیا۔ شاہ صاحب کے ایک خدمت گار یا مرید نے آپ کو خوش کرنے کے لئے مرزا مغل بیگ کی تاریخ وفات کہی۔

بود خبیث

1224ھ

یعنی مرنے والا، مرزا مغل بیگ، خبیث انسان تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہم نے یہ عبارت ”تذکرہ صوفیائے سندھ“ سے حرف بہ حرف نقل کی ہے۔ جو لوگ علم الاعداد سے واقف ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ”خبیث بود“ کے اعداد 1224ھ کے بجائے 1124ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔

جب حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے یہ الفاظ سنے تو اس شخص کو ٹوکتے ہوئے فرمایا۔
 ”ایسا نہ کہو۔ بلکہ یوں کہو۔“
 ”یک مغل بہ بود۔“

1224ھ

یہاں بھی کتابت کی صریح غلطی موجود ہے۔ ”یک مغل بہ بود“ کے اعداد 1119ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس فنی بحث سے قطع نظر، اس شخص نے مرزا مغل بیگ کو ”خبیث“ کہہ کر پکارا تھا۔ کیونکہ وہ تمام صورت حال سے باخبر تھا اور اس نے اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لئے مرنے والے کو بہت برے الفاظ میں یاد کیا تھا۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس طرز کلام کو ناپسند قرار دیتے ہوئے فرمایا۔ ”یوں کہو کہ وہ ایک مغل تھا۔“ اس واقعے سے حضرت شاہ صاحب کی اعلیٰ ظرفی اور درویشانہ شان ظاہر ہوتی ہے۔



مرزا مغل بیگ کا انجام بھی بڑا عبرت ناک تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا، اس نے دولت و اقتدار کے غبار میں سانس لی۔ پھر ایک دن سانسوں کا یہ شمار بڑے دردناک انداز میں ختم ہو گیا۔ ایک رات، ارغون قبیلے کا سردار، مرزا مغل بیگ اپنی شاندار حویلی میں سویا ہوا تھا کہ سندھ کے جنگل سے خوفناک ڈاکوؤں کا ایک گروہ نمودار ہوا، جس کا رخ کوٹڑی کی طرف تھا۔ تیز رفتار گھوڑوں نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے راستوں کو پامال کر ڈالا۔ پھر وہ مرزا مغل بیگ کی حویلی میں داخل ہوئے اور قتل و غارت کا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مرزا مغل بیگ اور اس کے خاندان کے دیگر مردوں نے ڈاکوؤں سے اپنی جان کی امان مانگتے ہوئے کہا۔
 ”تمام مال و زر لے جاؤ مگر ہماری زندگیاں ہمیں بخش دو۔“

ڈاکوؤں نے ارغون قبیلے کے مردوں کی گریہ و زاری سن کر اپنے کان بند کر لئے اور خون آشام ہاتھوں کو کھول دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پوری حویلی خون سے رنگین تھی اور مرزا مغل بیگ کے ساتھ اس خاندان کے دوسرے مردوں کی لاشیں زمین پر ترپ رہی تھیں۔ پھر ان ڈاکوؤں نے تمام نقد دولت اور زیورات سمیٹے اور جنگل میں روپوش ہو گئے۔ اکثر روایتوں کے مطابق ارغون قبیلے کے سارے ہی مرد تہ تیغ کر دیئے گئے۔ اور حیرت ناک بات یہ تھی کہ ڈاکوؤں نے گھر کی خواتین میں سے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں تھا۔ اس ہنگامے میں جو لوگ بچ گئے تھے، انہوں نے برملا اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
 ”یہ قرآنی نہیں تھی، تمہرے خداوندی تھا۔ اس بدسلوکی کی خوں رنگ سزا تھی، جو ایک سید خاندان کے ساتھ روا رکھی گئی تھی۔“

اور مقامی باشندوں کا بھی عام خیال یہی تھا کہ جس طرح سید عبدالکریم اور سید حبیب شاہ کے خاندان کو در بدر کیا گیا تھا، اسی طرح قدرت نے مرزا مغل بیگ کے خاندان کو دنیا بدر کر دیا۔ ارغون قبیلے کی خواتین کی شدید خواہش تھی کہ مرزا مغل بیگ کی لڑکی سعیدہ خاتون کی شادی حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ہو جائے۔ یہ وہی لڑکی تھی، جس کے عشق میں شاہ صاحب نے ترک وطن کیا تھا اور جو گویں

کے ساتھ انتہائی خوف ناک مقامات سے گزر رہے تھے۔

الغرض یہ شادی ہو گئی۔ مگر اس شادی کے بارے میں محققین مختلف رائے رکھتے ہیں۔

ایک محقق کا کہنا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اظہار ہمدردی کے طور پر مرزا مغل بیگ کی لڑکی سعیدہ خاتون سے شادی کی۔ اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر شاہ صاحب کا وہ عشق کہاں باقی رہے گا، جس نے ایک بار انہیں صحرا کی ریت میں کم و بیش دفن کر دیا تھا۔

کچھ محققین کا کہنا ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار گزری۔

اس کے برعکس مرزا قلیچ بیگ کہتے ہیں۔ ”حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کسی عورت کو، یہاں تک کہ اپنی زوجہ کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔“

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مرزا قلیچ بیگ، حضرت شاہ صاحب کے مندرجہ ذیل ارشادات پیش کرتے ہیں۔
 ”طالب کو تجربہ کی زندگی بسر کرنی چاہئے۔ جب سالک عاکلی (ازدواجی) زندگی اختیار کرتا ہے تو اس کی حالت شہد میں تھڑی ہوئی اس کبھی کی طرح ہو جاتی ہے، جو نہ اڑ سکتی ہے اور نہ آزاد ہو سکتی ہے۔ گھریلو زندگی کی مصروفیات اسے مادی مسائل میں الجھا دیتی ہیں اور اس کے روحانی ارتقا کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔“
 بعض محققین کہتے ہیں کہ حضرت عبداللطیف بھٹائی کا عمل ان الفاظ کے برعکس تھا۔ آپ نے شادی کے بعد قصبہ ہالا کے نزدیک ”بھٹ“ کو اپنا مستقر بنایا اور مریدوں کے ساتھ مل کر گاؤں تعمیر کیا۔



دین محمد وفائی اور مرزا قلیچ بیگ کی روایات کے مطابق حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے، جس کی بنیاد ان کے مورث اعلیٰ غوث اعظم حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی نے گیارہویں صدی عیسوی میں رکھی تھی۔

شاہ صاحب ”وحدت الوجود“ کے فلسفے سے بھی بہت زیادہ متاثر تھے، جس کے بانی شیخ اکبر محی الدین ابن عربی تھے۔ اس نظریے نے برصغیر میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ محققین کی اکثریت، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو ”قادری“ قرار دیتی ہے۔ مگر اس کے برعکس آڈوانی کہتا ہے کہ شاہ صاحب کا تعلق ”اویسی“ سلسلے سے تھا۔ آڈوانی کی رائے زیادہ معتبر نہیں کہ وہ اہل ہندو میں سے تھا اور اسلامی تصوف کے بارے میں اس کی تحقیق نامکمل اور ناقص ہے۔

بعض اہل تحقیق کے نزدیک حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سندھ میں معروف چاروں سلسلوں قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ سے فیض حاصل کیا تھا۔ مگر وثوق کے ساتھ پتہ نہیں چلتا کہ شاہ صاحب کے شیوخ کون تھے؟

بعض اہل دانش کے مطابق سلسلہ چشتیہ میں موسیقی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسی لئے ”بانسری“ نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی زندگی میں بہت اہم کردار انجام دیا ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نزدیک مذہب انفرادی، شخصی یا ذاتی معاملہ تھا۔ انسان خواہ کتنی ہی ملمع کاری کرے، سجدوں سے اپنے ماتھے پر نشان بنائے، رمضان میں تیس دن کے روزے رکھے..... مگر یہ سب کچھ اس وقت تک بیکار ہے، جب تک وہ دل کی گہرائیوں سے اسے تسلیم نہ کرے۔ ان ہی خیالات کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اپنے اشعار میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”ایمان والے اس طرح نہیں ہوتے کہ خود کو کلمہ گو کہیں..... اور شیطان ان کے دل میں پنچے گاڑے بیٹھا ہو..... اور تم خدا کے ناموں کی تسبیح پڑھتے رہو۔ اس طرح تم بظاہر تو مسلمان ہو گئے لیکن باطن میں آذر ہی رہو گے۔“

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اعمالِ ظاہری کے بجائے قلب کی طہارت اور کردار کی درستی پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

”جب تک تم از خود رفته (بے خود) نہیں ہو جاتے، رکوع و سجود بیکار ہیں۔ پہلے اپنے آپ کو فنا کر دو۔ جب ہی تم تکبیر کے اہل ہو سکتے ہو۔“

علامہ اقبالؒ کے بقول۔

ترا دل تو ہے صنم آشنا
تجھے کیا ملے گا نماز میں؟

محققین کے مطابق حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی مذہبی زندگی کا بنیادی عنصر راگ اور موسیقی سے عشق تھا۔ وہ ”ایک تارے“ پر اپنا کلام گایا کرتے تھے اور اکثر کئی کئی دن سماع کی محفلوں میں گزار دیا کرتے تھے۔ اس وقت شاہ صاحبؒ مکمل حالتِ بے خودی میں نظر آتے..... اور آپ کی آنکھوں سے اشک رواں ہوتے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی محفلوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک ہوتے اور نہایت ذوق و شوق کے ساتھ آپ کے الہامی اشعار سنتے، جن میں امن و آشتی، محبت اور بھائی چارے کا درس دیا جاتا۔

اہلِ ہندو میں تو موسیقی، عبادت کا درجہ رکھتی ہے مگر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے معاصر مسلمان بزرگ آپ کے شوقِ موسیقی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار علمائے سندھ کی ایک جماعت شاہ صاحبؒ کے پاس آئی۔ ان علماء میں ٹھٹھہ کے مشہور بزرگ، محمد ہاشم بھی تھے۔

تمام علماء نے بیک زبان ایک ہی بات کہی۔ ”شاہ صاحب! آپ کا موسیقی سے یہ لگاؤ غیر اسلامی ہے۔ اسے ترک کر دیں۔“

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے علمائے سندھ سے بحث کرنے کے بجائے تمثیل کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

”ایک درخت، لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے ہے..... مگر پانی کی قلت کا شکار ہے۔ اگر اس پیڑ کو پانی نہیں ملے گا تو ایک دن وہ سوکھ جائے گا۔ اور اس طرح بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ فرض کر دو کہ ایک گندے تالاب کے سوا کہیں پانی دستیاب نہیں ہے۔ اس صورت میں آپ حضرات درخت کے سوکھ جانے کو ترجیح دیں گے یا گندے تالاب کے پانی سے اسے سیراب کرنے کا مشورہ دیں گے تاکہ درخت کو بچایا جاسکے؟“

تمام علماء نے اس بات سے اتفاق کیا کہ درخت کو تالاب کا گندہ پانی دے کر بچالیا جائے۔

پھر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے علماء کی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میرا دل، محبتِ خداوندی کا درخت ہے جو موسیقی سے سیراب ہوتا ہے۔ اگر اسے راگ کی غذا نہ ملے تو وہ سوکھنا شروع ہو جاتا ہے۔“

واقعہ نگار کے مطابق اس جواب کے بعد علمائے سندھ مزید بحث نہ کر سکے اور بے نیل و حرام واپس چلے گئے۔ واضح رہے کہ یہ واقعہ نگار کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ علمائے سندھ نہ بحث کرنے سے قاصر تھے اور نہ لا جواب ہوئے تھے۔ جب ایک شخص، کیف و بے خودی کی اس منزل میں پہنچ جاتا ہے تو اس سے بحث کرنا لا حاصل ہوتا ہے۔ یہی سوچ کر علمائے سندھ واپس تشریف لے گئے تھے۔ شاہ صاحبؒ کے اس جواب سے موسیقی کا شرعی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ان کا انفرادی عمل تھا، جس کی مثالیں بعض صوفیاء کی جداگانہ روش سے دی جاسکتی ہیں۔ اکابر صوفیاء کا تو

”سماع“ پر بھی اجماع نہیں، پھر وہاں موسیقی کا گزر کیسے ممکن ہے؟

ڈاکٹر در شہوار سید اپنے تحقیقی مقالے میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

”بھٹ“ کی تعمیر کے بعد حضرت شاہ عبداللطیفؒ نے کوٹری کی رہائش ترک کر دی تھی۔ وہ اپنے خاندان اور فقراء کے ساتھ اس الگ تھلک جگہ پر مقیم ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے موسیقی کے ماہر گلوکار اکثر وہاں آیا کرتے تھے۔ ان میں دہلی کے معروف موسیقی نواز، چنچل اور اٹل شامل ہیں۔ یہاں شاہ صاحبؒ کا بیشتر وقت موسیقی اور سماع میں گزرتا تھا۔“

آگے چل کر ڈاکٹر صاحبؒ تحریر کرتی ہیں۔ ”ایک بڑے شاعر اور مقدس آدمی کے طور پر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شہرت دور دور پھیل گئی تھی۔ سندھ کے مختلف علاقوں پر ہندوستان سے جوق در جوق لوگ آپ سے فیض حاصل کرنے اور دعائے برکت لینے حاضر ہوتے تھے۔ ان کے محبت اور بھائی چارے پر مبنی اشعار نے جو بلا تخصیص رنگ و نسل ہر ایک کے لئے تھے، انہیں ہندو اور مسلمان دونوں میں مقبول اور مسلم الثبوت روحانی پیشوا بنا دیا۔“

روایت ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ آخری عمر میں کربلائے معلیٰ جانا چاہتے تھے..... مگر جب آپ عازم سفر ہوئے تو مریدین نے عرض کیا۔

”آپ نے تو ہم سے وعدہ فرمایا ہے کہ یہیں، بھٹ شاہ میں قیام فرمائیں گے۔“

مریدوں کی درخواست کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اکیس دن مراقبہ کی حالت میں گزارے۔ اس کے بعد آپ اٹھے، غسل کیا، سفید چادر اوڑھی اور درویشوں کو موسیقی کا حکم دیا۔ تین دن تک موسیقی کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر جب درویشوں نے موسیقی بند کی تو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ انتقال فرما چکے تھے۔

محبت کا خورشید ضیا بار کیا غروب ہوا کہ ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ اس صدمہ جانگداز کے اثر سے کئی مریدوں نے مرشد کے قدموں میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

14 صفر 1165ھ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا یوم وفات ہے۔ آپ کی عمر مبارک تریٹھ سال تھی۔



سندھ کے ایک رئیس میاں نور محمد کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے بے حد عقیدت تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ سے انتہائی عقیدت رکھتے ہیں۔ اسی خیال سے نور محمد نے ”مثنوی مولانا رومؒ“ کا ایک قیمتی نسخہ منگوا کر حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا۔ نور محمد بے اولاد تھا۔ اس نے اولاد نرینہ کے لئے شاہ صاحبؒ سے دعا کی درخواست کی۔ جواب میں آپ نے فرمایا۔

”حق تعالیٰ تمہیں بہت جلد باہر اد کرے گا۔“

پھر جب نور محمد کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو اس نے شاہ صاحبؒ کی نسبت سے بیٹے کا نام غلام شاہ رکھا۔ یہی غلام شاہ، جوان ہو کر سندھ کا حکمران بنا۔

غلام شاہ نے آپ کی قبر مبارک پر خوب صورت روضہ تعمیر کرایا اور سکھر کے مشہور خطاط سے نقاشی کرائی۔ راجہ جیسلمیر نے مزار مبارک کے لئے نوبت نذر کی۔

بھٹ شاہ کے قریب کرار نامی ایک جھیل ہے، جس کا پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا ہے۔ زائرین اسی جھیل کے

کنارے خیمہ زن ہوتے ہیں اور طویل سفر کی تھکن دور کرتے ہیں تاکہ عرس میں شرکت کے لئے تازہ دم ہو جائیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوؤں کی بھی ایک کثیر تعداد عرس میں شرکت کرتی تھی۔ عرس کے دنوں میں بھٹ شاہ کی پُرسکون بستی دُور دُور تک وسیع ہو جاتی ہے۔ قدم قدم پر زائرین کے خیمے نظر آتے ہیں اور قصبے کے اطراف میں کسی بڑے شہر کی سی رونق دکھائی دیتی ہے۔

مزارِ مبارک کے صحن میں موسیقی کی محفل منعقد ہوتی ہے، جس میں پاکستان بھر کے قوال حصہ لیتے ہیں۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی کبھی ہوئی لوک کہانیاں، دوے اور کافیاں گا کر سنائی جاتی ہیں۔ اس موقع پر عقیدت مند ایک خاص کیفیت سے سرشار ہو کر ”واہ سائیں“ اور ”مٹھا سائیں“ کے نعرے بلند کرتے ہیں۔



حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عارفانہ مقام پر زیادہ تحقیق نہیں کی گئی۔ اس لئے آپ کی عبادت و ریاضت اور اوراد و وظائف کی تفصیلات بھی نہیں ملتی۔ مگر ایک عظیم صوفی شاعر کی حیثیت سے شاہ صاحبؒ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سندھ کی لوک داستانوں عمر ماروی، سستی پنوں، مول رانو، لیلاں اور چنیر کو بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے اور دنیاوی حُسن و عشق کو موضوع بنا کر معرفت کے بعض بڑے گہرے راز فاش کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تین سو سال گزر جانے کے بعد بھی شاہ صاحبؒ کا کلام اسی ذوق و شوق کے ساتھ سنا جاتا ہے۔ بلکہ ماہ و سال گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تازگی اور معنی آفرینی میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔



حضرت عبداللہ شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ

”رن کچھ“ کو چھوڑ کر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دو بڑی جنگیں ہو چکی ہیں۔ 1965ء کی جنگ کا انجام برابری پر ہوا تھا، پھر بھی مبصرین کا کہنا ہے کہ اس جنگ میں پاکستان کا پلہ بھاری رہا تھا..... مگر 1971ء کی جنگ میں ہم اپنے ملک کے نصف حصے سے محروم ہو گئے تھے۔ بین الاقوامی سازشوں سے قطع نظر، اس وقت خود ہماری صفوں میں بھی انتشار برپا تھا۔ بہر کیف، ان دونوں جنگوں کے دوران بلیک آؤٹ کی وجہ سے روشنیوں کا شہر کراچی مکمل تاریکی میں ڈوبا رہتا تھا۔ پھر بھی ایک مقام ایسا تھا، جہاں بلیک آؤٹ کے باوجود روشنی ہوتی رہتی تھی۔ دیکھنے والوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا کہ ظاہری سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد بھی یہ روشنی کس طرح قائم ہے؟ اس روشنی کا مرکز کلفٹن (کراچی) کے علاقے میں واقع ایک اونچا گنبد ہے، جو میلوں دور کے فاصلے سے صاف نظر آتا ہے۔ یہ گنبد اس مردِ جلیل کے مزارِ مبارک کا ہے، جسے اہالیانِ پاکستان، حضرت عبداللہ شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتے ہیں۔

واقعہ اس طرح ہے کہ جب 1971ء میں پاک و ہند کے درمیان جنگ چھڑی تو دوسرے بڑے شہروں کی طرح کراچی میں بھی بلیک آؤٹ کر دیا گیا۔ حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزارِ مبارک کے مجاورین نے بھی حکومت کے احکام کے مطابق شام ہونے سے پہلے ہی احتیاطاً بجلی کے تمام سوئچ بند کر دیئے۔ مغرب کی اذان تک عموماً فضاؤں میں ہلکا سا آجالا ہوتا ہے۔ اس لئے حاضرین اور مجاورین کو کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی..... مگر جیسے ہی مغرب کی اذان ختم ہوئی، مزارِ مبارک کے گنبد کا بڑا بلب جل اٹھا۔ امام نے نماز پڑھائی، پھر جب نماز ختم ہوئی تو کچھ لوگ باہر سے آئے اور انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ مزارِ مبارک کا بلب جل رہا ہے۔ چونکہ حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کا مزارِ مبارک کافی بلندی پر واقع ہے، اس لئے اطراف میں رہنے والوں کو بھی وہ روشنی صاف نظر آرہی تھی۔

پھر ایک پمپل سی مچ گئی اور لوگ مزارِ مبارک کی طرف دوڑ پڑے۔ مجاور حیران و پریشان تھا۔ بجلی کے تمام سوئچ بند تھے، پھر یہ روشنی کہاں سے آرہی تھی؟ آخر میں کٹ آؤٹ بھی نکال دیا گیا..... مگر گنبد کا بلب جلتا رہا۔ یہ ایک خلاف عقل بات تھی۔ لوگ سر بہ گریباں تھے..... اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں تحیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خوش عقیدہ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ اللہ کے ایک ولی کی کرامت ہے..... اور کرامت اسی کو کہتے ہیں، جو انسانی عقل کو عاجز کر دے۔

پھر اس واقعہ کی پورے شہر میں دھوم مچ گئی۔ لوگ قطار در قطار، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں، حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کی یہ کرامت دیکھنے آتے رہے۔ جنگی سائرن بجتے رہے اور بھارتی فضا نیہ کے ہوائی حملے جاری رہے۔ بہت

سے لوگوں کو یاد ہوگا کہ اسی جنگ کے دوران بھارتی پائلٹوں نے آگرہ تاج کالونی کی ایک عمارت پر بم گرایا تھا..... اور کورنگلی کریک کی ایک آئل ریفائنری کو نشانہ بنایا تھا جس کے نتیجے میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

میں اس وقت کراچی کے ایک اخبار میں کالم نگار اور ثقافتی رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ میں نے بھی اس خبر کی بازگشت پوری شدت کے ساتھ سنی۔ کچھ چٹم دیدگاہوں سے ملاقات بھی کی..... مگر اپنی مصروفیات کی وجہ سے خود اس منظر کو دیکھنے مزارِ مبارک پر حاضری نہ دے سکا۔ 1971ء کی جنگ تقریباً پندرہ سولہ دن جاری رہی تھی۔ حفظِ مآقدم کے طور پر کراچی میں جنگ بندی کے بعد بھی کوئی دو تین ہفتے بلیک آؤٹ کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ اس طرح ایک ماہ سے زیادہ کسی ظاہری وسیلے یا سسٹم کے بغیر حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار کا چراغ جلتا رہا۔ اس روشنی کے بارے میں دنیا داروں، مادہ پرستوں اور ترقی پسندوں نے بڑے جارحانہ تبصرے کئے۔

”یہ سب افواہیں اس لئے پھیلائی جا رہی ہیں کہ خائفوں سے متعلق لوگ اپنی دکان چکا سکیں۔“ میں نے اس قبیل کے لوگوں سے ایک سوال بھی کیا۔ ”آپ لوگوں نے اس واقعے کی تصدیق کی ہے؟“ اس جماعت میں میرے کچھ بے تکلف دوست بھی تھے۔ ایک صاحب نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم دقیانوسی لوگ ہو اور یہ سائنس کا زمانہ ہے۔ ایسی بے سروپا خبروں کی تصدیق کرنا بھی حماقت ہے۔“

میں اپنے اُن دوستوں سے زیادہ بحث نہ کر سکا۔ اور علامہ اقبالؒ کا یہ شعر پڑھتے ہوئے درمیان ہی سے اٹھ گیا۔

بیان میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کیجئے

اور جہاں تک روشنی کے حوالے سے اس قسم کے محیر المعقول واقعات کا تعلق ہے تو پاک و ہند کی تاریخ میں ایسی بے شمار روشنیاں نظر آئیں گی۔ آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے سلطان غیاث الدین بلبن کا لشکر ایک طویل وعریض میدان میں خیمہ زن تھا۔ یکایک اس پورے علاقے کو ایک خوفناک آمدھی نے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ بہت سے خیمے اکٹھر گئے..... اور تمام چراغ بجھ گئے۔ ہوا کے اس طوفان میں کوئی شمع اور کوئی فانوس اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا..... مگر پھر بھی ہزاروں خیموں میں ایک خیمہ ایسا بھی تھا، جس کے چراغ کی لوتک نہیں کاٹی..... اور وہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلتا رہا۔ یہ خیمہ مشہور بزرگ، علاء الدین صابر کلیریؒ کے خلیفہ حضرت شمس الدین ترک پانی پٹیؒ کا تھا جو اس وقت سلطان غیاث الدین بلبن کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے ملازم تھے۔

میں یہاں ایک اور روشنی کا ذکر بھی ضروری سمجھوں گا، جو معتقدین کے ساتھ معترضین کو بھی دعوتِ عام دے رہی ہے۔ یہ 1968ء کا واقعہ ہے۔ مجھے سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے آستانہ مبارک پر حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تو میں راجپوت حکمران، سمرات پرتھوی راج چوہان کی باقیات دیکھنے کے لئے تارا گڑھ پہاڑ پر پہنچا۔ پرتھوی راج نے 583ء کے قریب ترائن کے میدان میں شہاب الدین غوری سے شکست کھائی تھی۔ تارا گڑھ پہاڑ، سطح زمین سے کئی ہزار فٹ بلند ہے..... مگر جس مقام پر سمرات پرتھوی راج چوہان کا قلعہ واقع ہے، وہ جگہ ایک ہزار فٹ اونچی ہے۔ جو لوگ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے روضہ مبارک کی زیارت کو حاضر ہوتے ہیں، وہ راجپوت حکمران کے تباہ شدہ قلعے کو بھی دیکھنے جاتے ہیں۔ دیگر تفصیلات سے قطع نظر، اس قلعے کے عین درمیان میں مشہور بزرگ حضرت سید میراں حسین خٹک سوارؒ کا مزارِ مبارک ہے۔ اکثر روایتوں کے مطابق جہاں حضرت میراں حسینؒ کی قبر ہے، وہاں اسی جگہ 582ء میں پرتھوی راج چوہان اپنا دربار لگایا کرتا تھا۔ مزارِ مبارک کے اطراف میں دیگر شہداء کی قبریں ہیں۔ جو لوگ حضرت میراں حسین خٹک سوارؒ کی زیارت کو حاضر ہوتے ہیں، وہ پورا دن اس علاقے

میں گزارتے ہیں..... اور سورج ڈھلنے سے پہلے اجیر شریف کی طرف واپس لوٹنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ مزار مبارک کے قریب رات گزارنے کا کوئی انتظام نہیں۔ صرف ایک مجاور کا گھر ہے، جہاں چند متعلقین رہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی دن کے اُجالے میں اجیر شریف کے بازار سے ضرورت کا سامان خرید کر اندھیرا ہونے سے پہلے اپنے گھر کو لوٹ آتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تیس اکتیس سال میں وہاں کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ 1968ء میں یہی صورت حال تھی، جو میں نے بیان کی ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد حضرت میرا حسین خٹک سوار کا مزار مبارک بند کر دیا جاتا ہے۔ عام طور پر مزار مبارک کے احاطے میں کوئی زائر قیام نہیں کرتا ہے..... اگر کوئی ٹھہرتا بھی ہے تو کچھ فاصلے پر آباد مجاوروں کے مختصر سے محلے میں۔

میں نے تارا گڑھ پہاڑ پر ایک رات گزاری ہے..... اُس رات پتہ چلا کہ شہداء کی بستی کیا ہوتی ہے..... اللہ کے راستے میں قتل ہو جانے والوں کا جلال و جبروت کیا ہوتا ہے۔ ساری رات ایصالِ ثواب اور خوف و اضطراب میں گزاری۔ ہر قدم اور ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی قریب کھڑا ہے..... یا میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے اکبری دروازے میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ کبھی بلندی کی طرف..... اور کبھی نشیب کی طرف۔ بہت فاصلے پر کچھ ایسی روشنیاں نظر آئیں، جو متحرک تھیں۔ جیسے دُور کوئی لائٹیں لئے جا رہا ہے۔ (واضح رہے کہ 68ء میں تارا گڑھ پہاڑ پر بجلی کا کوئی انتظام نہیں تھا)

دوسرے دن صبح واپس آ کر میں نے حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے مزار مبارک پر قیام کرنے والے چند درویشوں سے ان روشنیوں کا ذکر کیا تو مجھے بتایا گیا۔

”وہ شہداء ہیں، جو پہاڑوں کے پیچ و خم میں بھٹک جانے والوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔“
اب اگر 1971ء کی جنگ میں حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ کے گنبد مبارک پر روشنی ہوتی رہی تو اہل دنیا کو حیرت کیوں ہے؟ حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے گنبد مبارک پر بلب جلنے کا ایک منہ بوم یہ بھی ہے کہ ایک دن سارے پاور ہاؤس فیل ہو جائیں گے اور تمام بلب بجھ جائیں گے..... لیکن مرد درویش کا چراغ جلتا رہے گا..... اور معرفت کے کونچے میں کبھی اندھیرا نہیں ہوگا۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسرانہ



بے شک! کراچی اور اس کے گرد و نواح کی حد تک حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ کو بے پناہ شہرت حاصل ہے۔ آپ اندرونِ سندھ میں بھی مقبول ہیں..... اور پاکستان کے دیگر علاقوں کے باشندے بھی کسی قدر آپ کے اسم گرامی سے واقف ہیں..... مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ اتنے بڑے بزرگ ہونے کے باوجود آپ کی شخصیت اور روحانی کمالات پر زیادہ تحقیق نہیں کی گئی۔

میرے نزدیک اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ جب حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ سندھ کی حدود میں داخل ہوئے، اس وقت اسلامی اقتدار اپنے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ اگرچہ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کا قصہ پاک کر کے اس علاقے میں ہمیشہ کے لئے بت پرستی کے چراغ بجھا دیئے تھے لیکن پھر بھی بہت سے دل و دماغ میں ہندوانہ رسم و رواج کے اندھیرے باقی تھے۔ جیسے عرب کے وہ قریش جو نمازیں پڑھتے تھے مگر ان کی آستینوں میں بت بھی موجود

ہوتے تھے۔ سندھ میں بھی یہی صورت حال تھی۔ اگر محمد بن قاسم کی زندگی وفا کرتی اور اسے چند سال کی مزید مہلت مل جاتی تو وہ مردِ جانناز، سندھ کے مکانون میں چلنے والے چراغوں کی روشنی کو اس روشنی سے ہم کنار کر دیتا، جو فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوئی تھی اور جس کا مرکز، مکہ و مدینہ تھے..... لیکن وہ سالارِ اعظم اندرونی سیاست کا شکار ہو کر خلیفہ سلمان بن عبد الملک کی جابرانہ ادا پر قربان ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے اپنی فتوحات کا سلسلہ مختصر سے عرصے میں ملتان اور کیرج (جے پور راجستھان) تک پہنچا دیا تھا..... مگر اس کے شہید ہوتے ہی اس قدر سیاسی انتشار برپا ہوا کہ بساطِ اقتدار سینٹے سینٹے سندھ کے چند علاقوں تک محدود رہ گئی۔ عامل پر عامل تبدیل ہوتے رہے اور مملکت اسلامیہ، انقلاب کا ہدف بنی رہی۔ جس کے نتیجے میں حضرت عبداللہ شاہ غازی کی شخصیت بھی سیاسی غبار میں گم رہی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ حکومتِ وقت کے معتب تھے، اس لئے مقامی لوگ بھی خلیفہ کی خوشنودی کے لئے آپ سے دُور دُور بھاگتے رہے۔ پھر کون آپ کے روحانی کمالات دیکھتا اور کون آپ کے عادات و خصالِ قلم بند کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے حالات زندگی پر گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ پاک و ہند میں مروجہ نظامِ خانقاہی سے وابستہ نہیں تھے۔ نہ آپ نے کوئی خانقاہ بنائی، نہ مریدوں کا حلقہ قائم کیا..... اور نہ سماع سنا۔ پاکستان اور ہندوستان میں اسی طرز کا نظامِ خانقاہی مقبول ہے اور یہی صوفیاء کی پہچان ہے۔ اس کے برعکس حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ ایک مجاہد تھے، جن کی اکثر نمازیں شمشیروں کے سائے میں ادا ہوتی تھیں۔ طبلِ جنگ ان کا ساز تھا، تلواروں کی جھنکار، صوت و آہنگ..... اور بکیر سماع۔ میدانِ جنگ میں زخموں سے پُور ہو کر لڑکھڑانا اُن کا وجد و حال تھا۔ ہندوستان کے لوگوں نے تو جس دم کے ماہروں، بھصوت مل کر تنگ دھڑنگ پھرنے والوں، غاروں میں بیٹھ کر گھاس پھوس کھانے والوں ہی کو رشی منی اور سادھو سنت سمجھا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس دور کے نو مسلموں نے بھی حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کو صوفی بزرگ نہ سمجھا ہو۔ کیونکہ اس زمانے کے لوگوں کی نظر میں رہبانیت ہی کا دوسرا نام صوفیت تھا۔

اب رہے وہ عربِ مسلمان، جو حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے ہمراہ یہاں آئے تھے۔ ان کے نزدیک تصوف کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس لفظ سے بھی نا آشنا تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مصریوں کی قدیم رسم تھی کہ جب دریائے نیل خشک ہو جاتا تھا اور ملک کے طول و عرض میں قحط کے آثار نمایاں ہونے لگتے تھے تو مقامی لوگ ایک خوبصورت دوشیزہ کو دریا کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے..... اور دیکھتے ہی دیکھتے نیل، موجیں مارنے لگتا تھا۔ اس قدر زور کی طغیانی آتی کہ پانی، دریا کے کناروں سے اُبل پڑتا..... اور مصریوں کی کھیتیاں سیراب ہو جاتیں۔ پھر قریہ قریہ خوشی کا جشن برپا ہوتا کہ دیوتا اُن سے راضی ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس وحیاناہ رسم کی خبر ہوئی تو آپ نے جبراً بھینٹ چڑھانے والوں کو روک دیا۔ قحط کے آثار روز بہ روز بڑھتے جا رہے تھے۔ مصریوں نے گورنر سے شدید احتجاج کیا کہ اگر انہیں بھینٹ چڑھانے کی اجازت نہ دی گئی تو پورا علاقہ شدید خشک سالی کا شکار ہو جائے گا اور بے شمار انسانی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔ گورنر مصر، امیر المومنین حضرت عمرؓ کی بارگاہِ جلال میں مدینہ منورہ حاضر ہوا اور مصریوں کی تکالیف بیان کیں۔

جواب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک خط تحریر فرمایا، جس کا مضمون حسبِ ذیل تھا۔

”مکتوب امیر المومنین بنام دریائے نیل! اگر تُو خدائے واحد کے حکم سے بہتا ہے تو اپنے دہانے کھول دے اور اہل مصر کو سیراب کر دے۔“

گورنر مصر کو یہ خط دے کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ”میرے خط کو دریائے نیل میں ڈال دو۔ انشاء اللہ! قحط زدہ لوگوں کو اس عذاب سے نجات مل جائے گی۔“

پھر جیسے ہی ہزاروں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی موجودگی میں امیر المومنین کا مکتوب، دریائے نیل کے سپرد کیا گیا، سورج کی تہاڑے سے ترختی ہوئی زمین نے اپنے دہانے کھول دیئے۔ یانی کی سرکش موجیں، کناروں سے نکل گئیں اور مصر کے سارے علاقے جل تھل ہو گئے۔

دنیا کے تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے پہلے دریائے نیل کا یہ مزاج تھا کہ وہ ہر دو تین سال بعد خوف ناک خشک سالی کا شکار ہو جاتا تھا۔ مگر جس روز سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قلم کی روشنائی، نیل کے پانی میں شامل ہوئی ہے، اس روز سے آج تک یہ شہرہ فاق دریا خشک نہیں ہوا۔ بڑے بڑے بزرگانِ دین نے اس واقعے کو حضرت عمرؓ کی کرامتِ جاہلیہ سے تعبیر کیا ہے..... مگر جہاں تک اس دور کے عربوں کا تعلق ہے تو وہ کرامت کے لفظ سے بھی نا آشنا نظر آتے ہیں۔

نظامِ خانقاہی، صوفیت اور کشف و کرامات بہت بعد کے زمانے کی باتیں ہیں۔ چونکہ حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ دوسری صدی ہجری کے بزرگ ہیں، اس لئے آپ کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال درپیش تھی۔ نتیجتاً آپ اپنی حیاتِ مبارک میں عوام الناس کی نظروں کا مرکز نہ بن سکے۔ اور پھر خارقِ عادات روایتیں بھی زبان زدِ خاص و عام نہ ہو سکیں، جنہیں آج کل کے زمانے میں ولایت کا معیار سمجھا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ پر تحقیق نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ مقامی دانشمندوں نے باہر سے آنے والے اہلِ کمال کی طرف سے تصدایے تو جی برتی ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال 1973ء یا 1974ء کا وہ واقعہ ہے، جب پاکستان میں سرکاری سطح پر حضرت امیر خسروؒ کا سات سو سالہ یادگاری جشن منایا جا رہا تھا۔ عجب اتفاق ہے کہ اسی سال روس کی کیونسٹ حکومت نے بھی حضرت امیر خسروؒ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا تھا جس میں بین الاقوامی معیار کے اسکالر اور اہلِ دانش جمع ہوئے تھے۔ حکومت روس کو اس بات پر فخر تھا کہ حضرت امیر خسروؒ جیسے نابغہ روزگار انسان نے تاشقند میں بھی کچھ دن گزارے ہیں۔ منگولوں کے ساتھ ایک جنگ میں حضرت امیر خسروؒ گرفتار ہوئے تھے اور پھر انہیں لے جا کر روس کے علاقے تاشقند میں قید کر دیا گیا۔ ہندوستان میں بھی اس جشن کے حوالے سے خوب ہنگامہ آرائی تھی۔

ایسے تاریخ ساز موقع پر سجدہ کے مشہور محقق، پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے روزنامہ جنگ میں ایک مضمون تحریر کیا تھا، جس میں بقولِ مختصہ پیر صاحب نے حضرت امیر خسروؒ کی قبائے عظمت و جلال کو تار تار کر کے رکھ دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی حکومت پاکستان پر بھی سخت نکتہ چینی کی تھی کہ اس نے ایک خوشامدی شاعر کا جشن منا کر ملک کا کثیر سرمایہ برباد کر ڈالا۔

پیر حسام الدین راشدی کا مضمون پڑھ کر ہمارے صوفی حضرات بھی خاموش رہے اور علمائے اسلام بھی۔ اگر کوئی بولا تو بس ایک ابنِ انشاء مرحوم۔ حالانکہ ابنِ انشاء کا تعلق ترقی پسند گروپ سے تھا۔ وہ صوفیاء سے کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے..... مگر ایک عالمی شہرت رکھنے والے عظیم شاعر کی تذلیل برداشت نہ کر سکے۔ وہ امیر خسروؒ جن کے بارے میں غالب جیسا سرکش شاعر بھی یہ کہنے پر مجبور تھا۔

”پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں خن کے پاؤں۔“

ابنِ انشاء نے حسام الدین راشدی کے مضمون کا بھرپور جواب لکھتے ہوئے آخر میں یہ جملہ تحریر کیا تھا۔

”پیر صاحب نے تو امیر خسرو کو غریب خسرو بنا دیا۔“

اس واقعہ کی روشنی میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں جو لوگ تحقیق کے منصب پر فائز تھے، انہوں نے بعض بڑی ہستیوں کے معاملے میں شدید بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ کے عارفانہ اور مجاہدانہ حالات گردشِ ماہ و سال کے دبیز پردوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ بس قیاس آرائیاں اور اندازے ہیں، جن کے ذریعے ایک مردِ جلیل کو نام تمام خراجِ عقیدت پیش کیا جاسکتا ہے۔

حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے بارے میں تاریخی اعتبار سے دو روایتیں مشہور ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ دونوں روایتیں آپس میں متضاد ہیں۔ پہلی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ دراصل عبداللہ بن جہان ہیں جو گورنر عراق، حجاج بن یوسف کے سپہ سالار تھے اور دہلی کی پہلی مہم میں مقامی ہندو سپاہیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔

دہلی، قدیم سندھ کی مشہور بندرگاہ تھی۔ بعض تحقیق کرنے والوں کے نزدیک گراچی ہی کا پرانا نام دہلی تھا۔ عبداللہ بن جہان کی شہادت کی تفصیل اس طرح ہے کہ 91ھ میں عرب تاجروں کا ایک قافلہ، راجہ سراندیپ (سری لنکا) کے قیمتی تحائف لے کر بصرہ جا رہا تھا۔ راجہ سراندیپ نے یہ تحائف عاملِ عراق، حجاج بن یوسف کے لئے ارسال کئے تھے۔ جب عرب تاجروں کی کشتیاں، دہلی کی بندرگاہ کے قریب پہنچیں تو سمندری لٹیروں نے حملہ کر کے کشتیوں پر قبضہ کر لیا اور بیشتر تاجروں کو قتل کر کے قیمتی تحفے، راجہ داہر کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔ اُس وقت برہمن نسل کا ایک شخص داہر، سندھ کا حکمران تھا۔ اور سمندری لٹیروں نے اُس کی ساز باز سے تاجروں کا سامان لوٹا کرتے تھے۔ قیدی تاجروں میں ایک عرب لڑکی بھی تھی، جس نے کسی نہ کسی طرح حجاج بن یوسف کے نام خط لکھا، جس میں صرف ایک ہی جگہ از جملہ تحریر تھا۔

”یا حجاج اشنی۔“ (اے حجاج! میری فریاد کو پہنچیں)

عورت کی اس فریاد نے حجاج بن یوسف جیسے تند خو اور سخت مزاج انسان کی دنیا بدل ڈالی۔ اس نے بڑی مشکل سے خلیفہ ولید بن عبدالملک کو سندھ پر لشکر کشی کے لئے آمادہ کیا۔ اور پھر اپنے جانباز سالار، عبداللہ بن جہان کی قیادت میں پہلی جنگی مہم، دہلی (سندھ) کی طرف روانہ کی۔

عبداللہ بن جہان، برقی رفتار کی طرح کے ساتھ دہلی پہنچے اور مقامی ہندو راجہ کی کثیر فوج سے نبرد آزما ہو گئے۔ مسلمان سپاہیوں کی کم تعداد اور دشوار گزار راستوں نے عبداللہ بن جہان کو شدید دشواریوں میں مبتلا کر دیا۔ محاذِ جنگ کے بیچ و خم سے ناواقف ہونے کے سبب عبداللہ بن جہان، دشمنوں کے زرنے میں آ گئے۔ وہ صفیں توڑ کر کئی بار نکلے مگر میدانِ جنگ سے فرار ہونا انہیں گوارا نہیں تھا۔ شاہین کی طرح بار بار اپنے شکار پر چھپتے..... شجاعت کی نئی تاریخ رقم کی..... مگر کہیں گاہ میں چھپے ہوئے ایک دشمن کا تیرا چاکہ کمان سے نکلا اور عبداللہ بن جہان کے گلے میں پوست ہو گیا۔ اسلام کا ایک غازی، گھوڑے کی پشت سے سندھ کی خاک پر گرا، اللہ کی وحدانیت اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی رسالت پر گواہی دی..... اور آخری بار آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اے اللہ! میں تیری رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ میرے اس حقیر نذرانہ جاں کو قبول فرما۔ اور اپنے اُن جاں بازوں کو یہاں بھیج، جو اس بتِ کدے میں اذان دے سکیں۔“ اس دعا کے ساتھ ہی عبداللہ بن جہان کی آنکھیں بند ہو گئیں..... اور ایک مردِ شہید کا مقدس خون، خاکِ سندھ میں جذب ہو گیا۔

عبداللہ بن جہان کی شہادت کا واقعہ 92ھ میں پیش آیا۔

ڈاکٹر عمر بن داؤد پوتہ کی تحقیق کے مطابق عبداللہ بن نہمان کے جد مبارک کو ایک پہاڑی پڑپسر و خاک کیا گیا۔ وہی پہاڑی، موجودہ کلغٹن ہے..... اور تیرہ سو اٹھائی (1328) سال پہلے بنائی جانے والی ایک عام سی پتھر کی قبر، آج ایک شان دار مزار میں تبدیل ہو گئی ہے..... اور اس مزار میں ابدی نیند سونے والے، حضرت عبداللہ شاہ غازی دراصل عبداللہ بن نہمان ہیں۔

اس روایت میں بنیادی طور پر کئی خامیاں موجود ہیں۔ پہلی یہ کہ عربوں میں ناموں کے ساتھ ”شاہ“ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ شاہ، خالص فارسی زبان کا لفظ ہے جو ایران سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ پھر پنجاب اور سندھ میں سادات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ شاہ کا لفظ کثرت سے استعمال ہونے لگا۔ ممکن ہے، بعد میں آنے والے مقامی لوگوں نے عقیدتاً عبداللہ بن نہمان کو عبداللہ شاہ کہہ کر پکارا ہو..... اور پھر یہی لفظ، شہرت عام حاصل کر گیا ہو۔

دوسرے یہ کہ عبداللہ بن نہمان شہید تھے جبکہ غازی کا لفظ اُن کے نام کا ضروری حصہ بن گیا ہے۔ اس طرح روایت مشکوک اور ضعیف ہو جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ جب عبداللہ نہمان، شہید ہوئے، اُس وقت کراچی کی بندرگاہ کا وجود تک نہیں تھا۔ پھر اُس مرد شہید کا جد مبارک کلغٹن کی پہاڑی تک کیسے پہنچا؟ اور وہ کون لوگ تھے، جو ایک شہید کی لاش کو میدان سے اٹھا کر ایک بلند ٹیلے تک لائے اور اُسے تہا دفن کر دیا؟ جبکہ عبداللہ بن نہمان کے ساتھ اور بھی سینکڑوں مسلمان شہید ہوئے تھے۔ پھر ایک اکیلی قبر کیوں؟ دیگر شہداء کی قبروں کے آثار نہیں ملتے۔ اس طرح جو بزرگ، کلغٹن کے مزار میں محو خواب ہیں، وہ حجاج بن یوسف کے سپہ سالار، عبداللہ بن نہمان نہیں ہو سکتے۔

تحقیق ڈاکٹر عمر داؤد پوتہ کو یہ مغالطہ ”فتوح البلدان“ کی ایک روایت کی وجہ سے ہوا۔ ”فتوح البلدان“ میں بلاذری نے تحریر کیا ہے کہ جب میں 30 229ھ میں ادھر آیا تو دیبل میں وہ قبر موجود تھی۔ ڈاکٹر عمر داؤد پوتہ نے اس قبر کو عبداللہ بن نہمان کی قبر سمجھا۔ حالانکہ بلاذری نے دیبل بن طہفہ کی قبر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عبداللہ بن نہمان کی شہادت کی خبر سن کر حجاج بن یوسف انتہائی غضب ناک ہو گیا تھا..... اور پھر اُس نے اپنے دوسرے جانباز سالار، بدیل بن طہفہ کو اس تنبیہ کے ساتھ سندھ روانہ کیا تھا۔

”بدیل! تجھ پر اُس وقت تک روز و شب کا سکون حرام ہے، جب تک تُو سندھ کے کفار سے اپنے دینی بھائی، عبداللہ بن نہمان کی موت کا انتقام نہ لے لے۔“

بدیل بن طہفہ، اہل ایمان کی روایتی شجاعت کے ساتھ لڑے مگر عبداللہ بن نہمان کی طرح اُن کا مقدر بھی شہادت تھی۔ بدیل بن طہفہ، نیرون کوٹ (حیدر آباد) کے قریب شہید ہوئے۔ اس لئے اُن کی قبر بھی یہیں کہیں قرب و حوار میں موجود ہونی چاہئے۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر عمر داؤد پوتہ کو عبداللہ بن نہمان اور بدیل بن طہفہ کے ناموں اور قبروں کو تلاش کرنے میں شدید مغالطہ ہوا۔

عبداللہ بن نہمان اور بدیل بن طہفہ کی شہادتوں کے بعد حجاج بن یوسف کے داماد، محمد بن قاسم، سپہ سالار کی حیثیت سے سندھ میں داخل ہوئے۔ اور اپنے دینی بھائیوں کی شکست کا اس قدر شدید انتقام لیا کہ 10 رمضان المبارک 93ھ کو سندھ سے ہمیشہ کے لئے مشرکانہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا..... اور صدیوں سے ”دیوتاؤں کا دوار“ کہلانے والا علاقہ ”باب الاسلام“ قرار پایا۔



حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے سلسلے میں دوسری تاریخی روایت اس طرح مشہور ہے۔

”آپ صوبہ سندھ کے سب سے قدیم بزرگ ہیں۔ آپ کا اسم گرامی سید عبداللہؒ ہے اور کنیت ”الاشتر“..... آپ کے والد ماجد کا نام سید محمد تھا، جو تاریخ میں ”نفس زکیہ“ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔ آپ حضرت امام حسنؑ کی اولاد میں سے ہیں، اس لئے حبشی سید کہلاتے ہیں۔

آپ کی ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی۔ 98ھ آپ کا سال ولادت ہے۔ حضرت سید عبداللہؒ کی تربیت آپ کے والد محترم، حضرت محمد نفس زکیہؒ کی زیر نگرانی ہوئی۔

دوسری صدی ہجری کے آغاز میں بنو اُمیہ کی خلافت ختم ہو چکی تھی..... اور اب بنو عباس کا خلیفہ منصور، تخت خلافت پر متمکن تھا۔ حضرت محمد نفس زکیہؒ ”علوی“ ہونے کے سبب خلافت کو اپنی میراث یا خاندانی حق سمجھتے تھے۔ اپنے اسی حق کو حاصل کرنے کے لئے حضرت نفس زکیہؒ نے تحریک خلافت کا آغاز کیا۔ اُن کے چھوٹے بھائی حضرت ابراہیم بن عبداللہؒ اسی مقصد کے لئے بصرہ منتقل ہو چکے تھے..... اور زور و شور سے تبلیغ کر رہے تھے کہ ”خلافت صرف علویوں کا حق ہے۔“ اس تحریک کو مزید تقویت دینے کے لئے نفس زکیہؒ نے 138ھ میں اپنے صاحب زادے، حضرت سید عبداللہؒ کو چچا کے پاس بصرہ بھیج دیا۔

حضرت ابراہیم نے اپنی تحریک کو مزید وسعت دینے کے لئے حضرت سید عبداللہؒ کو سندھ روانہ کر دیا۔ اس وقت سندھ میں مضبوط اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ حضرت سید عبداللہؒ خراسان سے ہوتے ہوئے سندھ کے مضبوط علاقے میں داخل ہوئے۔ اُس وقت آپ کی عمر مبارک چالیس سال تھی۔

کسی تاریخ میں اس بات کی نشاندہی نہیں ہوئی کہ حضرت سید عبداللہؒ نے سندھ کے کس مقام کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا۔ میرزا اپنا اندازہ ہے کہ بدین کا ساحلی علاقہ رہا ہوگا۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت سید عبداللہؒ تبلیغ اسلام کے لئے سندھ تشریف لائے تھے۔ سیاسی تحریک سے آپ کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر جب ہم حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دعویٰ درست نظر نہیں آتا۔

”سوانح حضرت لعل شہباز قلندر“ کے مصنف نے واضح طور پر لکھا ہے کہ عباسیوں اور علویوں کے درمیان خلافت کے لئے شدید کشمکش جاری تھی اور سادات کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ایسی سنگین فضا میں حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ نے سوچا کہ اگر وہ تبلیغ اسلام کی غرض سے سندھ میں داخل ہوئے تو عباسی خلیفہ، منصور کے مقرر کردہ گورنر اُن کے خلاف انتقامی کارروائی کر سکتے ہیں۔ اس لئے سید عبداللہؒ نے اپنا طریق کار بدل دیا۔

آپ پہلے اپنے بیس مریدین کے ساتھ بصرہ سے کوفہ پہنچے۔ وہاں آپ نے بہت سے عربی گھوڑے خریدے۔ اور گھوڑوں کے تاجر کی حیثیت سے سندھ میں دخل ہوئے۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سید عبداللہؒ سیاسی عزائم رکھتے تھے۔ تمام معتبر مؤرخین کے مطابق حضرت محمد نفس زکیہؒ نے حضرت سید عبداللہؒ کو اسی مقصد خاص کے لئے سندھ بھیجا تھا کہ وہ اُن کی تحریک خلافت کو مزید وسعت دیں۔

”تحفۃ الزائرین“ کے مصنف کے مطابق تاجر کے لباس میں ہونے کے باعث خلیفہ منصور کے گورنروں نے حضرت سید عبداللہؒ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور آپ آسانی کے ساتھ سندھ میں داخل ہو گئے..... اور خفیہ طور پر

”علوی“ خلافت کی تبلیغ کرنے لگے۔

اس وقت عمر بن حفص، سندھ کا گورنر تھا۔ جب سید عبداللہؒ کی تبلیغ کا حلقہ وسیع ہونے لگا تو حکومت کے ایک منجر (جاسوس) نے عمر بن حفص سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”گھوڑوں کی تجارت تو محض ایک بہانہ ہے۔ حید عبداللہؒ بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے والد، نفس زکیہؒ کی خلافت کے لئے سندھ میں زمین ہمواد کر رہے ہیں۔“

عمر بن حفص، عباسیوں کا گورنر تھا مگر اُس کا دل علویوں کے ساتھ تھا اس لئے عمر بن حفص نے سختی کے ساتھ اپنے جاسوس کی اطلاع کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔

”تمہاری آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے۔ عبداللہؒ خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے ہیں، تبلیغ اسلام کے سوا اُن کا کوئی مقصد نہیں۔“

اُس کے بعد گورنر عمر بن حفص، حضرت سید عبداللہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کر لی۔ عمر بن حفص کی حمایت کے باعث سید عبداللہؒ کی تحریک کو کئی تقویت حاصل ہوئی۔



ادھر مدینہ منورہ میں حضرت محمد نفس زکیہؒ کی سیاسی تحریک روز بہ روز طاقت پکڑتی رہی۔ خلیفہ منصور نے خط و کتابت کے ذریعے نفس زکیہؒ کو بہت سمجھایا۔ بے شمار مراعات کی پیشکش کی..... مگر نفس زکیہؒ خلافت کو اپنا موزوں حق سمجھتے تھے، اس لئے کسی تحریص و ترغیب سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد نفس زکیہؒ نہایت پرہیزگار اور عالم و فاضل انسان تھے۔ سیاست کی زہریلی ہوائیں ان کے لئے سازگار نہیں تھیں۔

انجام کار خلیفہ منصور اور محمد نفس زکیہؒ کے درمیان 145ھ میں خونریز جنگ ہوئی۔ اس جنگ کا سب سے اذیت ناک پہلو یہ ہے کہ رمضان المبارک، جو امن اور سلامتی کا مہینہ ہے، اسی مقدس مہینے میں مسلمانوں کا خون بہت ارزانی کے ساتھ بہا گیا۔ حضرت نفس زکیہؒ بڑی شجاعت و مردانگی کے ساتھ لڑے..... مگر جب یہ لڑائی اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والی تھی، حضرت نفس زکیہؒ کے بعض حلیفوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ نتیجتاً حضرت محمد نفس زکیہؒ محمد بن قحطیہ کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ آپ کا سر مبارک کاٹ کر عباسی خلیفہ منصور کے دربار میں بھیج دیا گیا۔ منصور نے حضرت نفس زکیہؒ کے سر کو نیزے پر بلند کر کے پہلے کوفے کے کوچہ و بازار میں، پھر مملکت اسلامیہ کے دوسرے اہم مقامات پر پھرایا تاکہ حکومت کے دیگر مخالفین کو عبرت حاصل ہو۔ یہ خلیفہ منصور کا انتہائی جاہلانہ اور وحشیانہ عمل تھا، جس کے ذریعے عالی نسب سید زادے کی تذلیل کی گئی..... اور سیاست کی طویل داستان میں سفاکی کے ایک اور باب کا اضافہ ہوا..... مگر مقامِ افسوس یہ ہے کہ اس باب کا لکھنے والا، حضرت عباسؒ کی نسل سے تھا۔ اور حضرت عباسؒ، حضور اکرم ﷺ کے حقیقی چچا تھے۔

حضرت نفس زکیہؒ کے خطرے سے نجات حاصل کرنے کے بعد خلیفہ منصور اُن کے چھوٹے بھائی حضرت ابراہیم بن عبداللہؒ کی طرف متوجہ ہوا، جو حضرت نفس زکیہؒ کے نام پر لوگوں سے بیعت لے رہے تھے اور روز بہ روز طاقت پکڑتے جا رہے تھے۔

آخر دونوں فوجیں ”احمز“ کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں۔ یہ ذی الحجہ 145ھ کا واقعہ ہے۔ حضرت ابراہیم بن عبداللہؒ کے ساتھ ایک لاکھ جاں نثار تھے۔ خلیفہ منصور کے لشکر کی قیادت، سالار بن عیسیٰ بن

موسیٰ کر رہا تھا۔ حضرت ابراہیم کے پہلے حملے میں عیسیٰ کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اگر خلیفہ منصور کی قسمت یادری نہ کرتی تو اس کی شکست یقینی تھی۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے بڑی احتیاط اور منصوبہ بندی کے ساتھ دوسرا حملہ اتنی شدت سے کیا کہ بساط جنگ الٹ گئی۔ حضرت ابراہیم کی فوج کے قدم اکھڑ گئے..... آپ چھ سو جاں نثاروں کے ساتھ نہایت استقامت و شجاعت کے ساتھ لڑتے رہے۔ ٹانگہاں دشمن کا ایک تیر، حضرت ابراہیم کی گردن میں پھنسا ہو گیا۔ آپ لڑکھڑاتے ہوئے گھوڑے کی پشت سے زمین پر گرے..... اور اپنی زبان سے یہ تاریخ ساز الفاظ ادا کئے۔

”میں کچھ چاہتا تھا..... اور اللہ کی مرضی کچھ اور تھی۔“

آخر حضرت نفس زکیہ کی طرح حضرت ابراہیم بن عبد اللہ کا سر کاٹ کر خلیفہ منصور کے دربار میں بھیج دیا گیا۔ اس الم ناک واقعے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب حضرت نفس زکیہ اور حضرت ابراہیم، منصور کے خلاف صف آراء تھے، اس وقت ان کے والد محترم حضرت عبد اللہ بن حسن، منصور کی قید میں بدترین مظالم برداشت کر رہے تھے۔ جب دونوں بیٹے، خاک و خون میں نہا گئے تو حضرت عبد اللہ بن حسن کو بھی قتل کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ حضرت عبد اللہ بن حسن، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے استاد گرامی تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سادات سے تعلق ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کیسا عظیم علمی خانوادہ تھا، جس کے تین محترم افراد صرف تین مہینے کی مختصر مدت میں سیاست کی نذر ہو گئے۔



چند ماہ بعد ایک تاجر، پجری جہاز کے ذریعے سندھ پہنچا۔ وہ گورنر عمر بن حفص کی بیوی کا خط لے کر آیا تھا، جس میں حضرت نفس زکیہ اور حضرت ابراہیمؒ کی شہادت کی خبر تھی۔ سادات سے قلبی تعلق ہونے کے باعث عمر بن حفص بہت رویا۔ پھر اس نے حضرت سید عبد اللہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دلی تعزیت پیش کی۔ باپ اور چچا کا قتل ایک سانحہ عظیم تھا۔ مگر حضرت سید عبد اللہؒ نے بڑے صبر و استقلال کے ساتھ اس جانکاہ صدمے کو برداشت کیا۔ مگر علوی تحریک کا وہ چراغ، جسے سندھ میں روشن رکھنے کی کوشش کی تھی، اب وہ تیز ہواؤں کی زد میں تھا۔ گورنر عمر بن حفص نے حضرت سید عبد اللہؒ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو سندھ کے ایک ہندو راجا کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ وہ راجہ اپنے مذہب پر قائم ہونے کے باوجود پیغمبر اسلام سے بے حد محبت کرتا ہے۔ وہاں آپ کو اپنی تحریک جاری رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

چنانچہ حضرت سید عبد اللہؒ اپنے مریدوں اور رفیقوں کے ساتھ ہندو راجہ کے پاس چلے گئے۔ کسی تاریخ سے راجہ اور ریاست کے ناموں کا پتہ نہیں چلتا۔ ہندو راجہ نے حضرت سید عبد اللہؒ کو شہزادوں کی طرح رکھا۔ نتیجتاً آپ کی تحریک کامیابی کے ساتھ جاری رہی۔

پھر ایک دن خلیفہ منصور پر یہ راز فاش ہو گیا کہ نفس زکیہ کے بیٹے، حضرت سید عبد اللہؒ سندھ میں ہیں اور عباسی خلافت کے لئے خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ منصور نے فوری طور پر عمر بن حفص کو تبدیل کر کے افریقہ بھیج دیا اور اس کی جگہ ہشام بن عمرو تغلیٰ کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ ہشام کی پہلی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ حضرت عید عبد اللہؒ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے بغداد روانہ کر دے..... مگر ہشام ذاتی طور پر سادات سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا، اس لئے مختلف بہانوں سے حضرت سید عبد اللہؒ سے چشم پوشی کرتا رہا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں سندھ کے ایک علاقے میں بغاوت کے آثار نمایاں ہوئے۔ یہ علاقہ اُس ہندوراج کی ریاست کے قریب تھا، جہاں حضرت سید عبداللہ مقیم تھے۔ ہشام نے اپنے بھائی شیخ کو بغاوت کچلنے کے لئے روانہ کیا۔ جب وہ فسادِ علاقے کے قریب پہنچا تو اسے کچھ سوار نظر آئے۔ یہ حضرت عبداللہ تھے جو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دیائے سندھ کے کنارے شکار کھیلنے کی غرض سے آئے تھے۔ شیخ نے باغیوں کا دستہ سمجھ کر ان پر حملہ کر دیا۔ حضرت عبداللہ اور ان کے تمام ساتھی بڑی شجاعت سے لڑے مگر شیخ کی فوج کا مقابلہ نہ کر سکے..... اور علوی تحریک کے تمام علمبردار اپنے خون میں نہا گئے۔ جب ہشام کو یہ الم ناک خبر ملی تو وہ ہٹا دل پکڑ کر رہ گیا۔ اور اس کی زبان سے ادا ہونے والے یہ تاسف آمیز کلمات، تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ گئے۔

”قدرت کے فیصلے کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔“

اس کے بعد منصور کے حکم سے ہشام نے ہندوراج کی ریاست پر حملہ کر دیا۔ ایک خونریز جنگ کے بعد راجہ نے شکست کھائی۔ حضرت سید عبداللہ کی بیوی اور صاحب زادے، سید محمد، راجہ کی پناہ میں تھے۔ ہشام نے ان دونوں کو خلیفہ منصور کے پاس بغداد بھیج دیا۔ بعد میں منصور نے ان دونوں محترم ہستیوں کو ان کے آبائی وطن، مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ ہشام کے حملے کے وقت ہندوراج کی ریاست میں حضرت سید عبداللہ کے چار سو معتقدین بھی موجود تھے۔ ان میں سے اکثر مارے گئے..... اور جو بچ گئے، وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ ہم نے یہ روایت تاریخِ سندھ کے مطابق بیان کی ہے جو ہمارے نزدیک زیادہ معتبر اور مستند ہے۔

اس کے برعکس بزرگانِ دین پر لکھی جانے والی کتابوں میں اس واقعہ کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے، ملاحظہ کیجئے۔

”حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کا نہ تو جنگ کا ارادہ تھا اور نہ آپ، مسلمانوں کی آپس کی خون ریزی کو پسند کرتے تھے..... مگر جب شیخ کی فوج نے ہلہ بول دیا تو آپ اپنے مریدوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں کود گئے۔ اور اس طرح ڈٹ پڑے کہ دشمن کے قدم اکھڑنے لگے۔ اتنے میں کسی خال کی تلوار آپ کے سر مبارک پر پڑی اور آپ زخموں سے نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑے۔ مگر لڑائی کا نقشہ کچھ اس قسم کا ہوا کہ دشمن کی فوج حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس وقت جو مرید بچ گئے تھے، انہوں نے آپ کے جسم کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو روح پر واز کر چکی تھی۔ پھر مریدوں نے آپ کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس خیال سے کہ دشمن کی فوج پلٹ کر واپس نہ آجائے، آپ کی نقش مبارک کو لے کر قریب کی جھاڑیوں میں روپوش ہو گئے۔ پھر جب اطمینان ہوا تو آپ کی لاش لئے جنگلوں، وادیوں میں سے ہوتے ہوئے ساحل پر ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ وہاں قریب ہی ایک پہاڑ تھا، جس کے اوپر لے جا کر آپ کے جدِ خاکی کو قبر کے سپرد کر دیا۔ یہ واقعہ 151ھ کا ہے۔ آپ کے وصال یعنی شہادت کے بعد آپ کے مریدوں کی دعا اور آپ کی برکت سے مزار شریف کے نزدیک میٹھے پانی کا ایک چشمہ نکلا۔ ہر سال 21 ذی الحجہ کو آپ کا عرس، کائنات گراچی میں بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے۔“

مذکورہ عبارت ایک کتاب ”تحفۃ الزائرین“ سے ماخوذ ہے۔ جسے ہم نے حرف بہ حرف نقل کر دیا ہے۔ اس عبارت کے مصنف نے حضرت سید عبداللہ ”الاشترؒ“ کی زندگی کے سارے واقعات تاریخی کتابوں سے اخذ کئے۔ مگر شہادت کے واقعات اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیئے۔ کیونکہ انہیں ہر حال میں حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کو حضرت عبداللہ الاشترؒ ثابت کرنا تھا۔

تاریخی اعتبار سے ہشام تغلی کی فوج نے ہندوراج کی اینٹ سے اینٹ بجادی..... مگر ”تحفۃ الزائرین“ کے

مصنف نے گورنر سندھ کی فوج کے قدم اکھاڑ دیئے اور اسے میدان جنگ سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا..... کیونکہ اس کے بغیر حضرت سید عبداللہ الاشترؒ کی لاش پر قبضہ کر کے اسے کلغٹن کراچی کی پہاڑی تک نہیں لایا جاسکتا تھا۔ مصنف نے جغرافیائی صورت حال کو سمجھنے کے لئے ”فتح نامہ سندھ“ کا مطالعہ بھی نہیں کیا، جو عرف عام میں ”چیچ نامہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ ”چیچ نامہ“ میں کراچی کے متعلق واضح طور پر یہ عبارت موجود ہے۔

”کراچی سب سے آخر میں بندرگاہ بنا اور 1725ء سے پہلے اس مقام پر کوئی بندرگاہ نہیں تھی۔ اسی طرح کلغٹن اور گدڑی، دونوں نئی آباد بستیاں ہیں، جہاں کوئی قابل ذکر آثار موجود نہیں۔“

حضرت سید عبداللہ الاشترؒ کی شہادت کا واقعہ 768ء میں پیش آیا..... اور کراچی کی بندرگاہ 957 سال بعد وجود میں آئی۔ پھر وہ گاؤں کہاں سے آگیا، جہاں حضرت سید عبداللہؒ کے مرید آپ کی نقش مبارک لے کر پہنچے تھے۔ اس الم ناک واقعے کا ایک اور پہلو تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ جب حضرت عبداللہؒ شہید ہو گئے تو شیخ نے اپنے بھائی ہشام کو اطلاع دی۔ تمام تاریخوں سے یہ ثابت ہے کہ گورنر سندھ، ہشام بن عمرو قسطلی، خاندان سادات سے گہری عقیدت رکھتا تھا۔ حضرت سید عبداللہؒ کی شہادت کی خبر سن کر یقیناً وہ خاموش نہیں بیٹھا ہوگا۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ہشام اس مقام پر پہنچا ہوگا اور اس نے پورے عزت و احترام کے ساتھ حضرت سید عبداللہؒ کی آخری رسوم ادا کی ہوں گی۔ اگر حضرت نفس زکیہؒ اور حضرت ابراہیمؒ کی طرح حضرت سید عبداللہؒ کا سرتن سے جدا کیا جاتا تو کوئی نہ کوئی مؤرخ اس کا حوالہ ضرور پیش کرتا۔ جب اس سلسلے میں تمام تاریخیں خاموش ہیں تو ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ حضرت سید عبداللہؒ سندھ کی سرزمین ہی میں مدفون ہیں..... مگر ان کی آخری آرام گاہ سے کوئی واقف نہیں۔

اب رہا کلغٹن کے مزار کا معاملہ، تو اس کا تعلق نہ عبداللہ بن مہمان سے ہے..... اور نہ حضرت عبداللہ بن الاشترؒ سے۔ ”چیچ نامہ“ کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کوئی اور بزرگ ہیں، جن کا تعلق سادات بخارا سے ہے اور ”بخاری سید“ صدیوں بعد سندھ میں داخل ہوئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(تمت بالخیر)